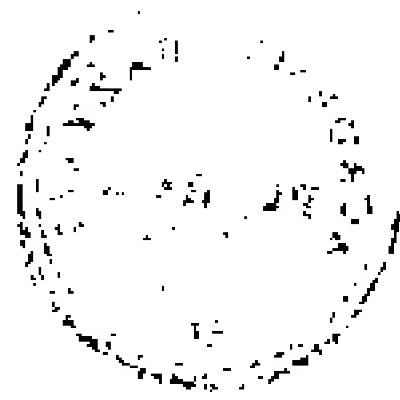
دو ناول

- صدیوں کی زنجیر
- یہ خواب سارے

رضیہ فصیح احمد

دوناول



رضیہ فصیح احمد

اکادمی بازیافت

ترتیب

رضیہ فصیح احمد کے دو ناول

انسانوں کی طرح کتابیں بھی اپنی تقدیر اپنے ساتھ لے کر آتی ہیں۔ جس طرح کچھ لوگوں کی قسمت ہر قدم پر یاوری نہیں کرتی اور انھیں زندگی کے سفر میں بڑی تگ و دو کرنی پڑتی ہے، اسی طرح کا مسئلہ بعض کتابوں کے ساتھ بھی ہوتا ہے کہ انھیں اپنا آپ منوانے کے لیے وقت کی کٹھن مسافت بڑی ثابت قدمی سے طے کرنی پڑتی ہے۔ یہی مسئلہ رضیہ فصیح احمد کے ناول ''صدیوں کی زنجیر'' کے ساتھ پیش آیا ہے۔ یہ ناول اردو کے سنجیدہ فکشن قارئین کے حلقوں میں تو ضرور مذکور رہا ہے لیکن حقیقتاً اس کی جتنی پذیرائی بجا طور پر ہونی چاہیے تھی، وہ نہیں ہوئی ہے۔ اس کے کئی اسباب رہے ہیں جیسا کہ آئندہ سطور میں ہم دیکھیں گے۔

میں نے یہ ناول اشاعت (۱۹۸۸ء) کے فوری بعد کے دنوں میں پہلی بار پڑھا تھا اور اس اوّلین قرأت نے ہی میرے دل و دماغ پر اس کا ایک نقش چھوڑا تھا۔ اس سے کچھ پہلے قرۃ العین حیدر کا ناول ''گردشِ رنگِ چمن'' شائع ہوا اور اُس زمانے میں اس کی خاصی گونج تھی۔ اس کی دو وجہیں تھی: اوّل یہ کہ کئی برس کے وقفے کے بعد قرۃ العین حیدر کا کوئی ناول چھپا تھا۔ دوم یہ کہ اس ناول نے پہلی بار ہمارے فکشن میں تشخص کے بحران کے مسئلے کو چھیڑا تھا اور انگریزی استعمار کے برصغیر کی لوئر کلاس ہی نہیں بلکہ مڈل اور اپر کلاس کی نسلوں تک کے آگے بڑا سا سوالیہ نشان لگا دیا تھا۔ یہ سوالیہ نشان برصغیر کی مابعد تہذیبی، معاشرتی اور اخلاقی قدروں کی تبدیلی سے مزید سنجیدہ اور غور طلب ہوا۔ قرۃ العین حیدر نے اس ناول کے سوالوں کو تہذیب سے معاشرت اور سیاست سے تصوف تک برصغیر کی زندگی کے ابعاد میں پھیلا کر دیکھا تھا۔ چناں چہ اُس زمانے میں ہمارے ادبی حلقوں میں اِس

چلی جاتی ہیں۔ لکھنے والا اپنے کرداروں کی کہانی کہتے ہوئے اپنے سوالوں کے جواب پانے کی کوشش کرتا ہے لیکن ایک جواب کے آخری سرے پر پھر کوئی نیا سوال اس کے سامنے آ کھڑا ہوتا ہے۔ فن کا سفر جاری رہتا ہے، لیکن کسی ایک مرحلے پر آ کر کردار رخصت طلب کر لیتے ہیں یا پھر خود لکھنے والا اپنے سوالوں کو آگے سرکا کر خود کہیں چلا جاتا ہے — عدم کے پردے میں — کسی بڑی حقیقت کی طرف۔

ہمارے یہاں برصغیر کی تقسیم کے موضوع پر بہت کچھ لکھا گیا اور اس کے بعد مشرقی پاکستان کے حوالے سے بھی خاصی کہانیاں لکھی گئی ہیں، ناول بھی شائع ہوئے ہیں۔ بیش تر لکھنے والوں نے اس قضیے کو خاص جغرافیائی اور سیاسی سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھا ہے۔ کہانیاں وہ بھی کم زور نہیں ہیں۔ ان میں سوالوں کا سامنا بھی کیا گیا ہے، حقائق سے رُوگردانی بھی نہیں کی گئی لیکن ایسا محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے بالعموم بنگال کے مسئلے کے صرف ایک رُخ کو کھولتے یا پھر زیادہ سے زیادہ دوسرے کی طرف محض اشارہ کر کے رہ جاتے ہیں۔ اس کے برعکس رضیہ فصیح احمد نے ''صدیوں کی زنجیر'' میں اس مسئلے کو اُن خطوط پر دیکھا ہے جو کبھی متوازی نظر آتے ہیں، کبھی متخالف سمتوں میں اور کبھی ایک دوسرے کو قطع کرتے ہوئے۔ اس ناول کی کہانی بنگال کے ساتھ ساتھ پاکستان کے دوسرے صوبوں سندھ اور پنجاب ہی نہیں بلکہ قبائلی علاقوں کے مخصوص مسائل اور رویوں کو پیش کرتے ہوئے آگے بڑھتی ہے۔ یہ سب علاقے مصنفہ کی سیر و سیاحت اور ناول کی وسیع جغرافیائی حدود کو ہی بیان نہیں کرتے بلکہ کہانی کی معنویت اور کرداروں کی زندگی اور مسائل سے اس طور وابستہ و پیوستہ ہیں کہ ان کے بغیر نہ تو اس کہانی کا تصور قائم ہو سکتا ہے اور نہ ہی اس کے کرداروں کی معنویت واضح ہو سکتی ہے۔ یہ سب ایک دوسرے کا جزوِ لاینفک ہیں اور باہم مل کر ایک نامیاتی وحدت تشکیل دیتے ہیں۔

یہاں ہمارے ذہن میں ایک سوال آتا ہے کہ پاکستان، بنگلہ دیش اور ہندوستان کے وہ لوگ جو مشرقی پاکستان کے مسئلے سے علاقائی، لسانی، سماجی، نظریاتی، تہذیبی یا مذہبی کسی بھی طرح کا ربط رکھتے ہیں اُن کے لیے رضیہ فصیح احمد کے اس ناول کی قدر و قیمت قائم ہے لیکن وہ لوگ جو اِن ملکوں میں نہیں امریکا، کینیڈا، برطانیہ یا امارات میں کسی جگہ آباد ہیں اور اس سارے معاملے کو کسی بھی طرح کی جذباتی وابستگی کے بغیر دیکھتے ہیں، کیا یہ کہانی ان کے لیے بھی کسی گہری معنویت کی حامل ہے؟ میرے پاس اس سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ وہ یوں کہ گو اس ناول میں علاقائی حوالے بہت اہمیت رکھتے ہیں لیکن اُن پر تقدم حاصل ہے اُس انسانی صورتِ حال کو جو الم و نشاط، وصال و ہجر اور نیکی بدی کی ماہیت کو جاننے کے لیے رضیہ فصیح احمد نے ہمارے سامنے پیش کی ہے۔ اب اگر ایک لمحے کو یہ کہا جائے کہ اس ناول میں جغرافیائی حوالوں میں مصنفہ سے بعض جگہ فروگزاشت ہوئی ہے تو بھی ناول کی

قدر و منزلت میں فرق نہیں آتا۔ اس لیے کہ یہ ناول ہے، جغرافیہ سمجھانے والی گائیڈ بک یا تاریخ پڑھانے والی کتاب نہیں۔ اگر اسے تاریخی ناول تسلیم کیا جائے تو اور نہ کیا جائے تو بھی دونوں ہی صورتوں میں اس کی ادبی قدر و قیمت کا تعین ادبی اصولوں کی رُو سے ہوگا۔ یہاں ایک اور بات بھی یاد رکھنے کی ہے، وہ یہ کہ تمام تر نظریاتی اتفاق کے باوجود تاریخ کی پوری کتاب بسا اوقات انسانی احساس کے اُس تار میں لرزش پیدا کرنے سے قاصر رہتی ہے جو ادبی پیرائے میں لکھے گئے کسی ایک انسانی واقعے سے لرزتی نہیں شدت کے ساتھ جھنجھنا اٹھتی ہے —— اور پھر انسانی جذبہ و فکر کی کایا کلپ ہو جاتی ہے۔

پھر ایک دلچسپ صورتِ حال اس ناول کے کرداروں کی ہے، جو مختلف علاقوں، مختلف زبانوں، مختلف طبقوں اور مختلف نظریات سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کرداروں کی بابت سوچتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ کچھ عرصہ قبل ایک بار پھر ہمارے یہاں پاکستانی ادب کا سوال جو پہلے پہل محمد حسن عسکری نے پاکستان بننے کے بعد اٹھایا تھا، تازہ ہوا ہے۔ دیکھا جائے تو ''صدیوں کی زنجیر'' کو اس اعتبار سے خالص پاکستانی ناول قرار دیا جاسکتا ہے کہ اس میں پاکستانی معاشرت کے جتنے رنگوں کو سمیٹا گیا ہے اور وہ جیسی زندہ اور باہمی تفاعل کی کیفیت کو پیش کرتے ہیں وہ کسی دوسرے اردو ناول میں شاذ ہی نظر آئے گی اور نہایت اہم بات یہ ہے کہ رضیہ فصیح احمد نے اوپری محنت سے ایک خارجی سانچا بنا کر یہ کہانی اور اس کے کردار اس میں جما جما کر بٹھانے کی کوشش نہیں کی ہے بلکہ اُنھوں نے جس مسئلے کو اس ناول کے لیے اپنا موضوع بنایا اور اُسے جتنے وسیع تناظر میں دکھانے کی کوشش کی ہے وہ اتنا پیچیدہ اور ہمہ گیر تھا کہ کرداروں کی اس رنگا رنگی اور وسیع و عریض علاقائی حوالوں کے بغیر گرفت میں آ ہی نہیں سکتا تھا۔ رضیہ فصیح احمد کا یہ تجربہ معنوی اور فنی دونوں لحاظ سے بے حد کامیاب نظر آتا ہے۔

اس کتاب میں شامل دوسرا ناول ہے ''یہ خواب سارے۔'' اپنی کہانی، مزاج، اسلوب اور فنی سانچے یعنی ہر اعتبار سے یہ ناول ''صدیوں کی زنجیر'' سے بالکل مختلف ہے۔

یہ ناول ۱۹۹۱ء میں شائع ہوا تھا۔ آج ہم جس گلوبل دنیا میں رہتے ہیں، اُس کا تذکرہ چودہ پندرہ برس پہلے اتنا عام نہیں تھا۔ نئی دنیا اور جدید طرزِ زندگی کی بیش تر باتیں خواص تک محدود تھیں، عوام میں ان کا چرچا نہیں ہوا تھا۔ بدلتی دنیا اور اُس میں آنے والی تبدیلیوں کے تذکرے ضرور ہونے لگے تھے لیکن ان تبدیلیوں کا ذکر بڑی حد تک محض تخیلاتی قسم کا تھا۔ لیکن وہ جو کہا جاتا ہے کہ لکھنے والا اگر اپنے عہد کا گہرا ادراک رکھتا ہے تو اس کی چشمِ تخیل آنے والے زمانے کے کچھ نہ کچھ خدوخال بھی دیکھ لیتی ہے۔ مثال کے طور پر غالب کا کلام اور اس کے خطوط پڑھیے تو اندازہ ہوگا کہ اس کا تخلیقی وجدان آئندہ

کی بدلی ہوئی دنیا کے نقشے کو صاف دیکھ رہا تھا۔ قرۃ العین حیدر کے ناول ''آگ کا دریا'' کے آخری حصے میں اور اسی طرح ان کے ناولٹ ''ہاؤسنگ سوسائٹی'' میں انسانی رویوں کی کایا کلپ کا جو احوال ہمارے سامنے آتا ہے، آئندہ زمانوں میں ہمارے معاشرے کی صورتِ حال سے اس کی مماثلت واضح ہو جاتی ہے۔ اسی طرح مثال کے طور پر غور کیجیے دستوئیفسکی کا ناول ''برادرز کرامزوف'' تین بھائیوں کے اچھے برے کرداروں کی کہانی ہے جو اُن کی تاریخ اور روایات کے سیاق و سباق میں لکھی گئی ہے یا پھر یہ بھائی روس کی قلبِ ماہیت کے بعد نمایاں ہونے والے انسانی رویوں کا استعارہ بن جاتے ہیں۔ کسی طرح کی تطبیق یا تقابل مقصود نہیں، میں نے یہ حوالے صرف اپنے نقطۂ نظر کی صراحت کے لیے بیان کیے ہیں۔ رضیہ فصیح احمد نے بھی ''یہ خواب سارے'' میں اپنے کرداروں کے احوال اور کہانی کے بہاؤ میں صرف ان کے عہد کے حوالوں اور سوالوں کو نہیں دیکھا ہے بلکہ مستقبل کے انسانی رویوں اور انسانی صورتِ حال کی تبدیلیوں کو بھی ادراک کی گرفت میں لانے کی کوشش کی ہے۔ اب یہ کوشش کس درجہ کامیاب رہی ہے، اس کا اندازہ عصرِ حاضر کے تناظر میں بخوبی کیا جا سکتا ہے۔ نئے انسان کا اپنی جڑوں سے کٹنا، مختلف مذاہب کے لڑکے لڑکیوں کی آپس میں شادی، پرانی اور نئی نسلوں کے درمیان بڑھتا ہوا فاصلہ، زندگی کی تیز رفتاری اور مادّیت کا روز افزوں رجحان —— پندرہ بیس سال پہلے یہ باتیں ہمارے یہاں کے بہت سے لوگوں کے لیے محض سنی سنائی حکایتیں ہوں گی لیکن آج کتنے ہی لوگ ان حقائق کو اپنے تجربے سے جان چکے ہیں۔ یہ سب ہماری دنیا اور ہماری اپنی زندگی کا روزمرہ چاہے ابھی نہ بنا ہو لیکن اتنا ضرور ہے کہ اب ان میں سے کچھ بھی ہمارے لیے اجنبی نہیں رہا ہے۔ رضیہ فصیح احمد نے ان سارے مسائل کو اپنے ناول میں فن کارانہ سلیقے سے گوندھا ہے، اس طرح کہ ان کرداروں اور ان کی بپتا سے ہمیں کوئی لاتعلقی اور ذہنی بُعد محسوس نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس ہم اُن سے اپنا رشتہ دریافت کرتے اور پھر اسی نسبت سے انھیں سمجھتے چلے جاتے ہیں۔

ہنری کلارج نے ''وار اینڈ پیس'' کے ضمن میں ایک جگہ کہا ہے کہ ''ٹولسٹوئے کے نزدیک ناول کے لیے پلاٹ بنیادی چیز نہیں، بلکہ اصل شے کہانی ہے اور یہاں جو کہانی وہ ہمیں سناتا ہے وہ نہایت عمدگی کے ساتھ سادگی کے اُس معیار پر پوری اترتی ہے جو اُس کے خیال میں حقیقی دانش کو آگے بڑھاتی ہے۔'' یہ بڑی اہم بات ہے۔ ناول میں پلاٹ، کردار اور زمان و مکان سب کی اپنی ایک جگہ اور اہمیت ہوتی ہے لیکن ان سب پر مقدم ہے کہانی —— جو اپنی ساری پیچیدگی اور گمبھیرتا کے باوجود ایک ایسی سادگی بھی رکھتی ہے کہ اُس کے بہاؤ میں حقیقی دانش و بصیرت کی موجِ رواں پڑھنے والے تک پہنچ کر رہتی ہے۔ ''یہ خواب سارے'' میں رضیہ فصیح احمد نے تکنیک کا ایک الگ تجربہ کیا ہے۔ یہ تجربہ کہانی

کی معنویت کی ترسیل و تفہیم میں کیا کردار ادا کرتا ہے، یہ اپنی جگہ غور طلب بات ہے لیکن اس تکنیک کے ساتھ ہی ساتھ انھوں نے کرداروں کی وسعت، ان کے زمانی سیاق اور مکانی پھیلاؤ کو جس طرح بہم مربوط کیا ہے وہ اس ناول کو ایک ایسی کہانی بنا دیتا ہے جس کے سارے داخلی و خارجی حوالے ہنرمندی کے ساتھ منضبط ہوئے ہیں۔ کہانی کے سانچے میں اس کے سارے اجزا اس طرح جڑے ہیں کہ ان میں کوئی ایک بھی ایسا محسوس نہیں ہوتا کہ جس کے بغیر کہانی کو اِس شکل میں سوچا جا سکے۔

اِس ناول میں معاشرے کے ادنیٰ طبقے کے افراد سے اعلیٰ طبقے کے نمائندوں تک اور جہانِ سوم سے لے کر جہانِ اوّل تک سب کے سب اپنی اپنی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ کہانی کی بنت میں سموئے گئے ہیں۔ اپنے اپنے طبقاتی احساس، اخلاقی اقدار اور سماجی شعور سے بہرہ مند یہ افراد ناول نگار کی وسعتِ نظر، عمیق مشاہدے اور فنی شعور کا بیّن ثبوت ہیں۔ یہاں افراد کی خواہشیں، حسرتیں، محرومیاں اور معذوریاں بساطِ حیات پر ان کی تگ و تاز کو اس طرح پیش کرتی ہیں کہ وہ انسانوں کی دنیا کے مختلف طبقات کے پروٹو ٹائپ بن جاتے ہیں۔ فنی اعتبار سے یہ بات بھی اہمیت کی حامل ہے کہ ناول نگار نے ان کرداروں اور زندگی میں ان کی خواہش و جستجو کو ان کی طبعی اور فطری کیفیات کے ساتھ پیش کیا ہے۔ کسی طرح کی غیر حقیقی اور مصنوعی صورتِ حال میں رکھ کر ان کو معنی پہنانے کی کوشش نہیں کی گئی۔ یہاں ایک سوال ہمارے سامنے آتا ہے اور وہ یہ کہ اگر اس ناول کے کردار، معاشرتی طبقات اور انسانی صورتِ حال کا پورا نقشہ اصل کے ایسا ہی مماثل ہے تو پھر کیا اس ناول اور اس کہانی میں وہ جو ماورائے حقیقتِ حال یا حسی تجربے سے بلند و برتر معنی ہوتے ہیں اور جو فن کو larger than life بناتے ہیں، ان کی کیا گنجائش رہی ہوگی؟ بات یہ ہے کہ حقیقتِ حال یا حسی تجربے سے ماورا معانی کا تعین کرداروں کی جمع تفریق یا ان کے باہمی تعامل سے نہیں ہوتا بلکہ وہ متعین ہوتے ہیں اُس تصورِ حقیقت سے جو کہانی کار کے تخلیقی و فنی شعور کے باطن میں کارفرما ہوتا ہے۔ فن کار اسی تصورِ حقیقت سے زندگی کی ماہیت کو جانتا اور اسی کی بنیاد پر اپنے کرداروں کی باطنی کیفیات اور ان کی تقدیر کو اُجاگر کرتا ہے۔ رضیہ فصیح احمد نے اس ناول میں بلکہ اپنے ان دونوں ناولوں میں کرداروں کو بنانے اور پیش کرنے میں تصورِ حقیقت کے اصول ہی سے کام لیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کردار اپنی اپنی الگ معنویت بھی رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ناول کے مجموعی تناظر میں اپنی تقدیر کے ساتھ وہ معنویت بھی تشکیل دینے میں بخوبی کامیاب رہتے ہیں جو ہمارے حسّی تجربے سے ماورا ہوتی ہے۔

آخر میں ان دونوں ناول کے حوالے سے مجھے ایک بات اور کہنی ہے۔ گزشتہ برسوں میں ہمارے یہاں نسائی ادب اور نسائی شعور کی بابت گفتگو نمایاں موضوعات میں نظر آتی ہے۔ میں ادب

میں زنانہ مردانہ کمپارٹمنٹس کی علاحدگی کا قائل نہیں ہوں۔ لکھنے والا بنیادی طور پر انسانی تجربے اور انسانی احساس کو بیان کرتا ہے اور اس کے فن کی قدر و قیمت کا فیصلہ بھی محض اسی اصول کے تحت ہونا چاہیے۔ عورت کے باغیانہ خیالات اور صنفی برابری/برتری کے تصور کو نسائی شعور سے جو مربوط کیا گیا ہے اس کا تعلق ادب سے نہیں بعض سیاسی اور سماجی مسائل سے ہے اور اس کے حاصلات بھی سیاسیات و سماجیات کے دائروں ہی میں ممکن ہیں ادب میں نہیں۔ جہاں تک ادب میں نسائی شعور کا تعلق ہے، وہ اگر کسی خارجی ایجنڈے کے تحت نہیں ہے اور ادب کے جمالیاتی معیارات کے ساتھ رونما ہوتا ہے تو یقیناً اہمیت کا حامل ہے اور ادب کی تفہیم میں مثبت کردار ادا کرتا ہے۔ رضیہ فصیح احمد نے ان دونوں ناولوں میں نسوانی کرداروں کو جن صورتوں میں پیش کیا ہے، ان کی داخلی کیفیات، اُن کے مخصوص رویوں کی جیسی ترجمانی کی ہے اور ان پر گزرنے والی سرد و گرم لہروں، بیتنے والی ابتلاؤں اور صدیوں کی تاریخ کے سفر میں ان کی تقدیر کا احوال جس عمدگی، فن کارانہ پختگی اور تخلیقی ہنر مندی کے ساتھ بیان کیا ہے، وہ صحیح معنوں میں گہرے اور بلیغ نسوانی احساس کا حامل ہے۔ رضیہ فصیح احمد کے یہاں مشرقی عورت اپنی وارفتگی، ایثار، وفاداری کے ساتھ عمر کے مختلف حصوں میں اپنی مخصوص کیفیات کے ساتھ نظر آتی ہے۔ نظریاتی یا سیاسی نعرے بازی کے بغیر انھوں نے اپنے نسائی کرداروں میں ہماری تہذیب و معاشرت کی ساخت اور اُس کے اقداری مزاج کو خوب صورتی سے سمویا ہے۔

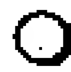
رضیہ فصیح احمد کے ان دونوں ناولوں کی بابت میں نے اپنے تاثرات کا اظہار تو کر دیا لیکن میں سمجھتا ہوں کہ دونوں ناولوں اور خصوصاً ''صدیوں کی زنجیر'' کا الگ اور باضابطہ سنجیدہ تنقیدی مطالعہ ہونا چاہیے تاکہ دیکھا جاسکے کہ ان کا فنی و ادبی سفر اب کس منزل پہ ہے اور عصری اردو فکشن میں ان کا کیا مقام ہے؟ مجھے ذاتی طور پر تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ رضیہ فصیح احمد نے اپنے ادبی کیریئر کا جو آغاز ''آبلہ پا'' سے کیا تھا، اب وہ اس سے کہیں آگے کی منزلوں میں ہیں۔

مُبین مرزا

صدیوں کی زنجیر

پہلی اشاعت: ۱۹۸۸ء

فہرست



صدیوں کی زنجیر

ہر شخص اپنے گرد حفاظت کے تین حصار کھینچتا ہے۔

بہت سے لوگ ان تین حصاروں کے اندر ہی اپنی زندگی تیر کر دیتے ہیں لیکن وہ شخص جو سوچتا ہے، کبھی باری باری انھیں پار کرتا ہے۔ ضروری نہیں کہ وہ ان تین حصاروں کو پار کر کے کسی کی قید میں جائے۔ وہ ان کو عبور کر کے آزاد بھی ہو سکتا ہے۔

یہ تین حصار جو اس کی حفاظت کے ضامن ہیں، ایک طرح سے قید بھی تو ہیں۔

ہر حصار کو پار کرنے کی ایک جھجک ہوتی ہے، اور آخری حصار کو پار کر لینا سب سے دشوار ہے۔

آدمی جب تیسرا حصار پار کرتا ہے تو اس کی زندگی میں کوئی بڑا انقلاب آتا ہے۔ کوئی راون اسے اٹھا لے جاتا ہے، یا وہ خود ہی اٹھ کر کہیں چلا جاتا ہے۔

رضیہ فصیح احمد

عرضِ مصنّفہ

یہ ناول چار پانچ سال میں مکمل ہوا ہے۔ اس پر میں نے محنت کی ہے۔ عمرِ عزیز کے کئی سال لگائے ہیں۔ ارادہ تھا کہ اس کے تینوں حصّوں کو آزاد چھوڑ دوں۔ ان پر نمبروں کا بار نہ ڈالوں۔ پڑھنے والے جس حصے کو چاہیں پہلے پڑھ لیں۔ کتابت اور اشاعت کی عملی دشواریاں آڑے آئیں۔ بہر حال پڑھنے والوں کو آزادی ہے کہ انھیں جو حصّہ زیادہ دل چسپ معلوم ہو، اسے پہلے پڑھ لیں۔ کہانی کے پرت آہستہ آہستہ کھلتے جائیں گے۔

اس ناول میں بہت سے کردار ہیں۔ ان کے آپس میں نسلوں کے خاندانی رشتے ہیں، جذباتی اور ذہنی رشتے ہیں۔ دوستی کے بھی دشمنی کے بھی۔ ان رشتوں کے تانے بانے کا نام ہی ناول ہے جو صدیوں کی زنجیر سے بندھا ہوا ہے۔ مختلف کرداروں کی فکر، ان کی یک رنگی، رنگا رنگی، روپ بہروپ، سب سامنے آئیں گے۔ سب انھی کے مطابق اپنی اپنی بولیاں بولیں گے۔ مصنّفہ ان میں سے کسی کی ذمہ دار نہیں ہے۔ وہ اس بات کی ذمہ دار ہے کہ کوئی کردار اپنے خاص روپ میں اس خاص وقت میں جو بات کہے وہ اس کے حسبِ حال ہو اور ان حالات میں سچ ہو۔

ناول کی ہیئت رسمی اور روایتی ہے تو، اور نئی ہے تو، کسی تجربے کی خاطر یا چونکانے کی کوشش نہیں ہے، تحریر کو زیادہ مؤثر بنانے کے لیے ہے۔ اپنی طرف سے جو کچھ بھی ہے دل میں اتارنے کے لیے ہے، شعبدہ بازی نہیں ہے۔ کہیں تحریر گنجلک ہے تو ان لوگوں کے لیے جو اسے پسند کریں۔ اس کے اندر اتریں، اسے ٹٹولیں، اس کی چولوں کو بٹھائیں۔ ساری چولیں اپنی جگہ بیٹھیں گی۔ اس لیے کہ تصویر

کو مکمل کر کے کاٹا گیا ہے اور سارے ٹکڑے اسی میں موجود ہیں۔

اعتراض برائے اعتراض ہمیشہ ہوتے ہیں، ان کے لیے ایک لفظ ''خوش آمدید'' ــــ لیکن جلد بازی سے کام نہ لیا جائے تو بہتر ہے۔ بعض اوقات اعتراض کرنے والے تحقیق نہیں کرتے جب کہ لکھنے والے تحقیق اور جانفشانی کرتے ہیں۔ ایک جگہ سے تعلق رکھنے والے یہ زعم رکھتے ہیں کہ ہم سب کچھ جانتے ہیں جب کہ وہ بہت کچھ نہیں بھی جانتے۔

میں نے اس ناول میں دو نئے الفاظ ڈھالے ہیں۔ ایک گل دائرہ Wreath کے لیے۔ اب تک پھولوں کی چادر یا گلدستہ وغیرہ مستعمل ہیں۔ گل دائرہ چیز کی صحیح نمائندگی کرتا ہے، آسان ہے اور خوب صورت بھی۔ دوسرا لفظ تکون ہے۔ چیڑ کے Cone کے لیے ــــ Cone کے معنی مخروطی سہی، مگر اس کچے یا پکے پھل کے لیے جو درخت میں لٹک رہا ہوتا ہے، تکون زیادہ مناسب ہے، اس لیے بھی کہ انگریزی کا لفظ Cone اس میں موجود ہے۔

آپ کہہ سکتے ہیں کہ ناول اُدھورا ہے۔ کرداروں کا ملنا، بچھڑنا، بند لفافہ، علامتیں بھی ہوسکتی ہیں۔ آنے والے زمانوں کا اشاریہ۔ تخلیق کار کو اعتراف ہے کہ اسے علم نہیں اس کے کرداروں کے ساتھ آگے جا کر کیا معاملات پیش آئے۔ اس نے ناول کو ایک خاص جگہ لا کر چھوڑ دیا ہے جس کے بعد وہ ان کا ساتھ دینا نہیں چاہتی۔ ہر شخص اپنے چاہنے والوں، دوستوں سے کبھی نہ کبھی بچھڑتا ہے ــــ زندگی کے ایک موڑ پر اپنے سارے کرداروں کو چھوڑ کر مصنف انھیں خدا حافظ کہتا ہے ــــ زندگی جاری و ساری ہے ــــ کہانیاں چل رہی ہیں، ساگا بن رہی ہے۔ زندگی کی زنجیر میں صدیاں، کڑیاں بن گئی ہیں۔ یہ صدیاں millennium میں منتقل ہو رہی ہیں ــــ ہوتی رہیں گی ــــ لکھنے والا کہاں تک ان کا ساتھ دے سکتا ہے۔ ایک نہ ایک دن سب کو بچھڑنا ہے۔

رہے نام اللہ کا۔

سپاس نامہ

میں ان تمام خواتین و حضرات کی شکر گزار ہوں جنھوں نے میرے اس ناول کے سلسلے میں میری مدد کی۔ سب سے پہلے بیگم حیات اور بیگم یوسف کا، جن کی گفتگو سے ناول لکھنے کا خیال ذہن میں آیا، اور ان سے کئی بار گفتگو رہی۔ شہناز پروین اور ادیب سہیل نے بھی اس سلسلے میں مدد کی۔ شہزاد منظر صاحب نے خطوط لکھ کر بطورِ خاص بنگلہ دیش جانے کا انتظام کیا۔ بنگلہ دیش کے ان تمام اہلِ قلم حضرات کی بے حد شکر گزار ہوں جنھوں نے ہر طرح میرے ساتھ تعاون کیا۔ خصوصاً امتیاز فاروقی اور بیگم ثریا فاروقی جنھوں نے میری میزبانی کی اور وہ تمام جگہیں دکھائیں جو میں دیکھنا چاہتی تھی اور وہ تمام باتیں بتائیں جو میں جاننا چاہتی تھی۔ اس سلسلے میں رضا دائروی صاحب نے بہت سے لوگوں کے ساتھ انٹرویو کا انتظام کیا۔ غلام محمد اور نوشاد نوری نے اخبارات کے دفتروں تک راہ نمائی کی۔ میجر یحییٰ خاں سے بار بار فوجی رموز سمجھنے میں مدد لی۔ صدیق سالک کی کتاب سے اور خود ان کی باتوں سے استفادہ کیا۔ پاکستان، سابق مشرقی پاکستان اور بنگلہ دیش کے بہت سے عام لوگوں سے گفتگو رہی۔ میں ان سب کا تہِ دل سے شکریہ ادا کرتی ہوں۔

امتیاز فاروقی صاحب کا ایک سے زائد مرتبہ شکریہ اس لیے واجب ہے کہ انھوں نے آخر میں مسودہ دیکھنے کی زحمت فرمائی اور بیگم فاروقی کی مدد سے بنگلہ الفاظ کا املا بطورِ خاص درست کیا۔

رضیہ فصیح احمد

منظر

گنڈ، کنول کے پھولوں سے اٹا پڑا تھا۔ مانجھی بڑی مہارت سے بجرہ ان چھتریوں ایسے سبز پتوں سے بچا کر نکال رہا تھا جو پانی کی سطح پر نفاست سے بچھے ہوئے تھے۔ کھلتے ہوئے سبز رنگ کے چوڑی نسوں والے نشیب میں شبنم کے شفاف موتی پڑے ہل رہے تھے۔ رانی کی سکھیوں میں سے ایک نے دل کی شکل کا بڑا سا کنول کا پتا توڑا تھا اور ڈنڈی سے پکڑ کر چھتر کی طرح سر پر چھا لیا تھا۔ دھوپ نہیں تھی۔ آسمان پر ہر طرف گھرے کالے بادل چھائے ہوئے تھے اس لیے اس حرکت پر ساری سکھیاں کھل کھلا کر ہنسیں جیسے محل میں...... کھیلتے سے کوڑیاں آپس میں ٹکرا کر کھل کھل بولتی تھیں اور پھر پچیس، تیس یا چودہ کے پانسے پر کھل کھلا کر ہنس پڑتی تھیں۔ رانی بھی مسکرائی تھی۔ وہ جو چودہ پندرہ سال کی ہنستی مسکراتی کنول کی گلابی کلی سمان تھی۔ اس کا پنڈا کنول کے کچے ڈنٹھل ایسا نازک، دانت کنول گٹوں کی طرح سفید، اور سفید کوڑیوں ایسے برابر تھے۔

یوں ہی تیرتا تیرتا بجرہ بَن کی اور، دور نکل گیا تھا۔ ڈھاک، بانس، ڈاب، آم اور جامن کے درختوں سے ڈھکے اور بہار کے پھولوں سے مہکتے اس بَن میں قاسم خاں، کہ خود عین جوانی کی بہار میں پھلتا پھولتا ایک جوانِ رعنا تھا، ناریل کے درخت پر چڑھا ایک ڈاب توڑنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اس نے خواب سے زیادہ حسین یہ منظر دیکھا تو مبہوت رہ گیا۔ اس منی سی سانولی سلونی رانی میں کس بلا کی پھبن، اور کس قیامت کی آن بان تھی۔ اپنی سکھیوں کے بیچ وہ اتنی سندر لگ رہی تھی جیسے جل کھمبیوں اور کچوڑی پانا سے پٹے پانیوں میں کاسنی پھولوں کے برابر کھلا ہوا کنول کا پھول۔

اسی دم قاسم خاں کے ذہن سے ایک آواز نکلی تھی جو ڈھاک، ڈاب اور بانس کے بَن میں گونجتی، سیٹی سی بجاتی، محل تک چلی گئی تھی۔ ''چیتا تیار ہے۔'' قاسم خاں نے گھبرا کر اِدھر اُدھر دیکھا تھا اور پھر بجرے کی اور نگاہ کی تھی جہاں سب اسی طرح کھل کھل ہنس رہی تھیں اور ایک دوسرے پر پانی اچھال رہی تھیں۔ واپس ٹھکانے پر آ کر قاسم خاں نے اپنے ساتھی سپاہیوں سے اس آواز کے بارے میں پوچھا تھا مگر یہ صدا اس کے سوا کسی نے نہیں سنی تھی۔ وہ اپنے ذہن سے نکلی اور کانوں سے سنی اس گونج سے حیران ہوا تھا اور اس نے سوچا تھا — اس اچنبھے بھرے ''بنگ'' دیس میں جو نہ ہو، تھوڑا ہے۔

قاسم خاں بختیار خلجی کے ساتھ تلیا گڑھ کے درّے سے اُس دیس میں وارد ہوا تھا۔ کل اٹھارہ گھڑسواروں نے حملہ کیا تھا، جن میں وہ خود بھی شامل تھا۔ یہ اٹھارہ گھڑسوار اس قدر تیز اڑے تھے کہ باقی فوج پیچھے رہ گئی۔ ان طویل القامت ترک گھڑسواروں کو گھوڑوں کا تاجر سمجھ کر کچھ نہ کہا گیا۔ محل میں پہنچتے ہی انہوں نے مارکاٹ شروع کر دی۔ تہلکہ مچ گیا۔ بوڑھا راجا لکشمن سین جو اس وقت کھانا کھا رہا تھا، پچھلی کھڑکی سے کود، کشتی میں بیٹھ کر بھاگ گیا۔ اس نے جگن ناتھ کا رخ کیا۔ باقی فوج کے آتے آتے محل فتح ہو چکا تھا۔ سپاہیوں اور پہرے داروں نے ہتھیار ڈال دیئے تھے — رانیاں رفتہ رفتہ حرم میں داخل کر لی گئیں۔

قاسم خاں اس وقت بھی بختیار خلجی کے ساتھ تھا جب اس نے شمال میں دیناج پور کے علاقے پر قبضہ کیا تھا اور دیوکوٹ کے مقام پر اپنی چوکی قائم کی تھی، مگر جب وہ تبت کی مہم پر گیا تو قاسم خاں ساتھ نہ جا سکا کہ اس وقت وہ صاحبِ فراش تھا۔ خدا جانے اس خوب صورت دیس کے پانی میں کیا اثر تھا کہ باری باری سارے گبھرو جوان بیمار پڑے تھے لیکن قاسم خاں کی بیماری طول کھینچ گئی تھی اور وہ اس مہم پر جانے سے رہ گیا تھا۔ صحت یاب ہونے کے بعد سیاحت کا جنون، جو اس کی سرشت میں تھا، عود کر آیا تھا اور وہ اس عجیب و غریب دیس کو جاننے نکل کھڑا ہوا تھا۔ مگر یہ سندر ناریوں کی طرح کا پُراسرار اور پُرپیچ سا دیس اس کے ذہن کی گرفت میں نہ آتا تھا۔ یہ بیک وقت جنت بھی تھا اور دوزخ بھی...... خوب صورت درختوں، پھلوں اور پھولوں سے پٹا ہوا، ندی نالوں اور تالابوں سے اٹا ہوا۔ بے ضرر پیارے جانوروں اور رنگین چہچہاتے پرندوں کے ساتھ ہاتھی، شیر، چیتے اور سانپ بھی دندناتے پھرتے۔

اس دیس کے کھوج میں وہ بھٹکے ہوئے ہرن کی طرح کوسوں دور نکل گیا۔ اس کی گھوڑی کے سُم ہوا پر اڑتے تھے۔ موسم نہایت سہانا تھا۔ ہر طرف پھل پھلار، چڑیوں کے چہچہے، اور گنگناتا پانی تھا۔ وہ خود بھی ترکی اور فارسی اشعار گنگناتا اپنی گھوڑی کو ایڑ دیے چلتا رہا۔ مختصر سا زادِ راہ اس کے ساتھ تھا۔ روز وہ واپس جانے کی بات سوچتا تھا مگر کچھ اور آگے بڑھ جاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ بختیار خلجی کی مہم

کی واپسی تک وہ بھی لوٹ کر اس سے جا ملے گا۔

مگر ابھی وہ اس دیس کو پوری طرح کھوج نہ پایا تھا کہ ساون کا مہینہ آن پہنچا۔

اُمڈ اُمڈ کے کالے کالے بادل آتے اور برستے۔ ابھی بادلوں کا ایک دستہ رخصت نہ ہوتا کہ دوسرا دستہ حملہ کر دیتا۔ پہلے ہی دن کئی گھنٹے لگاتار بارش ہوئی۔ رات کو بھی جھڑی لگی رہی۔ بجلی کے لہریے چمکتے اور میگھ دیوتا گرجتے رہے۔ جس باشا میں اس کا قیام تھا اس میں ہزار سوراخ ہو گئے اور ہر سوراخ میں سے پانی اندر آتا رہا۔ چٹائی کی دیوار پر لپی مٹی یوں گھل گئی جیسے نمک ہو۔ سارے ندی نالے، تالاب اور زمین ایک ہو گئے۔ قاسم خاں علی الصبح اپنی گھوڑی کی خیریت معلوم کرنے نکلا تو دیکھا کہ جس درخت تلے گھوڑی بندھی تھی، اس پر بجلی گر پڑی ہے۔ درخت دونیم ہو چکا ہے اور گھوڑی اس کے نیچے دبی کھڑی ہے۔ جیسے ہی قاسم خان نے گھوڑی کو تھپتھپایا، وہ پکے ناریل کی طرح دھپ سے زمین پر گر پڑی۔ یہ گھوڑی اس کی نہایت قیمتی متاع تھی جو یوں رات بھر میں لٹ گئی۔ اس کے علاوہ جھونپڑی میں جو کچھ کھانے پینے کا سامان تھا، سب بہہ گیا اور اس کی ساری عبائیں اور قبائیں پانی سے تر ہو گئیں۔

قاسم خاں نے چاروں طرف دیکھا۔ کھیت غرقاب ہو گئے تھے۔ کہیں کہیں تو پانی کے اوپر صرف درختوں کی پھننگیں نظر آ رہی تھیں۔ کسان کشتیوں پر بیٹھ کر اپنے پاٹ اور دھان کے کھیتوں کو دیکھنے نکلے تھے۔ کچھ لوگ مٹی کے گھڑوں پر تیر رہے تھے اور کچھ مٹی کے بڑے بڑے کھلے دہانوں والے برتنوں میں بیٹھے تھے جو کشتی کی طرح تیرتے چلے جا رہے تھے۔ بچے بالے کیلے کے گول تنوں پر بیٹھے پانی میں یوں پھر رہے تھے جیسے مگرمچھ کے بچوں پر سواری کر رہے ہوں۔ بعض نے بانس اور تختوں کو باندھ کر بجرے بنا لیے تھے اور ان پر بہتے چلے جا رہے تھے۔ جدھر دیکھتا تھا گھروں کی چھتیں اڑ گئی تھیں اور آدھی پونی دیواریں بے آسرا کھڑی تھیں۔

قاسم خاں نے دل میں سوچا کہ ذرا اِدھر اُدھر جا کر دیکھے کہ لوگ اس قیامتِ صغریٰ پر کیا واویلا مچا رہے ہیں۔ مگر اسے یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ کہیں کوئی گریہ وزاری نہیں تھی۔ لوگ صبر و شکر سے ناکافی پناہ گاہوں کے نیچے، کسی درخت یا چھپر تلے اپنے جانوروں اور بچوں کے ساتھ پڑے تھے۔ مائیں خود شرابور تھیں اور اپنی گیلی ساریوں میں شیر خوار بچوں کو چھپانے کی ناکام کوشش کر رہی تھیں۔ لڑکے چوڑا بنے ایندھن جمع کرنے اور بکریوں کا دودھ دوہنے میں مصروف تھے۔ لڑکیاں گیلے ایندھن کو جلا کر چاول ابالنے کی کوشش کر رہی تھیں تاکہ اپنے بڑے سے کنبے کا پیٹ بھر سکیں۔

قاسم خاں سوچ رہا تھا۔ اللہ اللہ یہ وہی جنت ہے جہاں ہر وقت گنگنانے کو جی چاہتا تھا۔ جہاں کے پرندے سریلی آواز میں سیٹیاں بجاتے تھے۔ بچے بانسری پر راگ الاپتے تھے۔ مانجھی کشتیاں

چلاتے بلند آواز سے گاتے جاتے تھے۔ یہ جنت کیسی طوفانِ نوح کی لپیٹ میں آ گئی تھی۔ بہت جلد قاسم خاں کو پتا چل گیا کہ یہ ایک دن کی بات نہیں، روز کا معمول تھا۔ مینھ برستا تو کئی کئی گھنٹے، کئی کئی دن اور کئی کئی ہفتے بھی برستا، اور جب تھمتا تو ہر طرف کیچڑ ہوتی۔ لوگ گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ اور کمر کمر پانی میں اِدھر سے اُدھر جاتے۔ سڑتے ہوئے جانوروں اور پتوں کی سڑاند کہ ناک نہ دی جاتی۔ اور مچھر جو قاسم خاں کو دن رات اپنے بدن پر سوئیوں کی طرح چبھتے ہوئے محسوس ہوتے۔ پہلے اس کا بدن پھنسیوں سے پھل اٹھا۔ پھر ملیریا نے گھیرا۔ چند قدم کے فاصلے پر ایک کنبے نے اس پر ترس کھایا۔ دونوں وقت بھات، دودھ اور ترکاری پہنچاتا، حالاں کہ ان کے اپنے پاس کھانے پینے کو کچھ زیادہ نہ تھا۔ ان کی دادی ماں نے آن کر قاسم خاں کا علاج کیا۔ دادی ماں کامروپ کی رہنے والی تھی جو جادو کا گڑھ تھا اور خود بھی جادو جانتی تھی۔ قاسم خاں دادی ماں کے علاج سے اچھا ہو جاتا مگر کوئی اور آزار اسے گھیر لیتا۔ وہ کون سا مرض تھا جو قاسم خاں نے اپنی جان پر نہ جھیلا۔ برسات کے بعد ہیضہ آگ کی طرح پھیلا۔ سیکڑوں اس کی لپیٹ میں آئے اور مر گئے۔ قاسم خاں تیمارداروں کی کوششوں سے اس جان ہار مرض سے بھی بچ گیا۔ اس سے سنبھلا تو میعادی بخار نے آلیا۔ اس سے نکلا تو آئے دن کی پیچش نے رہا سہا رنگ روپ چوسنا شروع کر دیا۔

قاسم خاں اس علاقے کو چھوڑ دینا چاہتا تھا مگر اس دیس کی مٹی، جو پہلے ہی نرم اور چکنی تھی، برسات کے بعد ایسی قیامت ہوگئی تھی کہ پیروں سے چمٹے جاتی تھی اور چھٹائے نہ چھٹتی تھی۔ پھر یہاں کے پھلوں، کٹھل، انارش اور ڈاب میں اتنا رَس اور زبان میں اتنی مٹھاس تھی کہ جی چاہتا تھا کہ آدمی چھک کے پی لے تو چلے۔ کئی دفعہ اس نے واپسی کا ارادہ کیا مگر کسی اور دن پر ٹال گیا۔

پھر ایک دن جب جنگل میں شدید آگ لگی ہوئی تھی۔ تپش سے بانس دھائیں پھٹ رہے تھے۔ پرندوں نے آسمان پر حشر برپا کر رکھا تھا۔ چرند پرند بوکھلا کر جان بچانے کو بھاگے تھے تو ایک سانپ نے قاسم خاں کو ڈس لیا۔ اس سے پیشتر کہ دادی ماں کو پتا چلے اور علاج شروع ہو، اس کی پوتی مُوگل نے اسے پاٹ کے سنہری ریشے پر لٹا کر اس کی گوری پنڈلی سے منھ لگا کر سارا زہر چوس کر تھوک دیا۔ قاسم خاں کو شدید نیند آ رہی تھی جیسے گہرے پانیوں میں جل پریاں اسے کھینچے لیے جا رہی ہوں، مگر مُوگل نے اس سے باتیں شروع کر دیں۔ اسے معلوم تھا کہ سانپ کا کاٹا اگر سو جائے تو پھر نہیں اٹھتا اور اس کے کہنے پر مُوگل کے چھوٹے بہن بھائیوں نے ڈھول بجا کر ناچنا شروع کر دیا۔ یوں وہ جاگتا رہا اور زندہ بچ گیا۔

اس جان کاہ حادثے سے بچ نکلنے کے بعد وہ مستقل طور پر دادی ماں کی پناہ میں آ گیا تھا اور

مُوکل کو، جو واقعی ایک کلی کی طرح نرم و نازک تھی، اپنی پناہ میں لے لیا تھا کہ اتنے بہت سے احسانوں کا بدلہ اتارنے کا کوئی اور طریقہ اسے نظر نہ آتا تھا۔ شادی کے روز مُوکل نے وہ ساری نہیں باندھی تھی جسے روز دھو کر اور سکھا کر نہانے کے بعد پہن لیتی تھی بلکہ نئی خوب صورت ساری پہنی تھی۔ اس روز اس نے بے حد خوب صورت گجرے اور سیپیوں کے ہار پہنے تھے۔ ہاتھوں میں کوڑیوں کے بنے ہوئے کڑے اور بوکُل کے پھولوں سے بنی ہوئی چوڑیاں تھیں۔ کانوں میں گندھوراج پھولوں کی بالیاں تھیں۔ بالوں میں رجنی گندھا پھول گندھے ہوئے تھے کہ گھر کے چاروں طرف جنگل میں خود رو پھولوں کی افراط تھی۔

مُوکل کا رنگ سانولا تھا مگر اس کی آنکھوں میں ستاروں کی جوت چھپی ہوئی تھی۔ اس کے بازو اتنے نازک اور ہاتھ اتنے چھوٹے تھے کہ قاسم خاں چھوتے ہوئے ڈرتا تھا۔ مگر یہی ہاتھ سارا دن کام کرتے نہ تھکتے تھے۔ اب قاسم خاں لنگی پہنتا تھا اور ڈاب پیتا تھا۔ اور ایک غیر ملکی زبان اپنی زبان کے ساتھ ملا کر بولتا تھا۔ ان دو زبانوں کا ملاپ اتنا ہی عجیب لگتا تھا جتنا طویل قامت سفید فام قاسم خاں اور منی سی سانولی مُوکل کا ملن۔

دادی ماں قاسم خاں پر بہت مہربان تھی۔ اسے معلوم تھا کہ وہ ترک سپاہی بچہ ہے اور کھیتوں میں گھٹنوں گھٹنوں پانی میں کھڑے ہو کر اوس دھان بونا اس کے بس کا نہیں ہے۔ اس لیے وہ چاہتی تھی کہ قاسم خاں کو جادو سکھا دے (جسے اب وہ جادو کے بجائے 'عمل' کہتی تھی) اور وہ سارے نسخے اسے بتا دے جن میں کچھوے کے ناخن، کوے کا خون، مگرمچھ کے دانت، چمگاڈر کے پَر، کالے کُتے کا پِتّا اور اُلو کا بھیجا استعمال ہوتا ہے۔ ان نسخوں کے استعمال سے بانجھ عورتوں کے بچے پیدا ہوتے تھے اور ہر مخالفت کے باوجود محبوب کی محبت حاصل کی جا سکتی تھی۔ مگر قاسم خاں کو ان نسخوں پر ذرا بھی اعتماد نہ تھا۔ اس نے یہ ہنر سیکھنے کی بجائے خالی اوقات میں شاعری شروع کر دی جس میں اُس کے اپنے ملک کے گل و بلبل اور بادہ و ساغر کے بجائے دریا، طوفان اور کشتی زندگی کے رمزیہ اشارے بن گئے۔ یہاں تک کہ رُوح کی سرشاری اور سرمدی کیفیات کے بیان کے لیے بھی وہ انھیں لہروں اور بجروں کا سہارا لینے لگا۔

مُوکل کی دادی ماں ہزار بار قاسم خاں کو بتاتی تھی کہ دیکھو بھلے کام کے لیے جا رہے ہو اور راستے میں ٹوٹا ہوا گھڑا مل جائے تو لوٹ آؤ کہ برا شگون ہے۔ دوپہر کے وقت گیدڑوں کا بولنا کسی آفت کا پیش خیمہ ہے۔ مغرب میں لمبی دُم والی چڑیا نظر آئے تو آدمی کے امیر ہونے کے امکانات ہیں، جنوب میں نظر آئے تو بیماری اور مصیبت کا سامنا ہوگا۔ قاسم خاں نے محسوس کیا تھا کہ دادی ماں کے

نزدیک اچھے شگون کم تھے اور برے زیادہ۔ فقیر عورت کا راستے میں ملنا، چلتے وقت قدم لڑکھڑا جانا، یا کسی کا چھینک دینا، سانپ کا دائیں سے بائیں گزر جانا، یا عین روانگی کے وقت پیچھے سے کسی کا آواز دے لینا، سب برے شگون تھے۔ مگر قاسم خاں ان سب میں سے کسی بات کو ماننے کو تیار نہ تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس دیس میں بابا آدم شہید، سلطان رومی، شاہ سلطان ماہی سوار جیسے صوفی بزرگوں نے لوگوں کو مسلمان بنایا تھا اور وہ ان وہموں کے ہرگز قائل نہ تھے لیکن مقامی لوگوں کے ذہنوں سے صدیوں پرانے توہمات کسی طرح نہ نکلے تھے۔ جس طرح اپنی چھوڑی ہوئی منزلوں کی سرد خشک آب و ہوا کو وہ اب تک نہ بھولا تھا۔ جیسے انگور کے خوشے، سیب کی لدی ہوئی ڈالیاں اس کے تصور میں گردش کرتی تھیں اور آڑو اور خوبانیوں کو اس کی زبان ترستی تھی اور ان سب کو یاد کر کے وہ آہیں بھرا کرتا تھا۔ تنگ آ کر ایک دن دادی ماں نے کہا تھا، ''بیٹے! آدمی جس سے محبت کرتا ہے اس کا مقابلہ کسی سے نہیں کرتا۔''

دادی ماں کی اس بات نے قاسم خاں کو بہت قائل کیا تھا۔ ہاں، یہاں کے بسنے والے کبھی کسی اور جگہ سے اس کا مقابلہ نہیں کرتے تھے۔ یہ ''پورنی مات'' (پُرنعمت) تھی تو اُن کی تھی اور ''دوجخ'' تھا تو ان کا اپنا دیس تھا۔ اس کی ٹھنڈی پھواریں اور پھول پات ان کے تھے تو سیلاب اور طوفان بھی ان کے تھے جبھی تو یہ لوگ منھ سے اُف کیے بغیر انتہائی ناکافی کپڑوں میں یہ سب یوں جھیل جاتے تھے جیسے سیلاب اور طوفان نہ ہوں، سورج نکلا ہو اور چھپ گیا ہو، بالکل روزمرہ کی بات۔ لیکن قاسم خاں کے لیے یہ روزمرّہ کی بات نہیں تھی۔ بارش اور سیلاب اس کے اندر کے اضطراب کو بڑھا دیتے تھے۔ ایسے میں اس کے اندر بجلی کے لہریے سے لپکتے تھے اور کچوکے دیتے تھے کہ وہ بختیار خلجی کی چھوٹی سی فوج کی سپہ سالاری کا ارمان لیے نکلا تھا۔ وہ تو سیاحِ زماں بننا چاہتا تھا اور اب ایسی شاعری کرتا تھا کہ دربار میں ملک الشعرا کے عہدے پر فائز ہو سکتا تھا۔ یہ دیس تو اس کی منزل کبھی بھی نہ تھا۔

اُس دن سفر پر روانہ ہوتے وقت سارے ہی برے شگون ہوئے تھے۔ عین روانگی کے وقت مُوکل کا بھائی شاپن چھینک دیا تھا اور انھی دادی ماں نے، جو شگونوں پر اتنا یقین رکھتی تھیں، مارے گھبراہٹ کے اسے پیچھے سے آواز دے کر بھات بھرتے اور اچار کی پوٹلی زادِ سفر کے طور پر دی تھی اور ابھی چند قدم چلا ہوگا کہ دریا کے کنارے جھومتے بانسوں کے کنج سے نکل کر ایک سانپ دائیں سے بائیں گزرتا چلا گیا تھا۔ ایک سال پیشتر کے نشانِ راہ تلاش کرتا چلا جارہا تھا کہ دفعتاً قاسم خاں کو وہ درخت نظر آیا، جس پر بجلی گری تھی اور جس کے نیچے دب کر اس کی پیاری گھوڑی ''برق پا'' لقمۂ اجل ہوگئی تھی۔ گھوڑی کی قبراب زمین کے برابر ہونے والی تھی۔ قاسم خاں نے گھوڑی کی قبر کو دوبارہ درست کیا اور نزدیک درختوں کے جھنڈ میں رات گزاری۔ اجل رسیدہ درخت ابھی تک دو نیم تھا۔ اس کی دونوں شاخیں ٹوٹے بازوؤں کی طرح زمین پر پڑی تھیں اور ان کے بعض حصوں سے نئی کونپلیں پھوٹ رہی تھیں۔

علی الصبح وہ پھر عازمِ سفر ہوا۔ جب وہ ڈھاک، ڈاب، بانس، آم اور جامن سے ڈھکے اسی بَن میں پہنچا جہاں کنول کنڈ اس نے دیکھا تھا تو یکا یک پھر وہی آواز اسے سنائی دی ''چتا تیار ہے'' مگر اس دفعہ وہ اس کے ذہن سے نہیں نکلی تھی بلکہ دریا کی لہروں کے مچلتے کنارے سے ابھر کر درختوں میں چھپے محل تک چھا گئی تھی۔ اس علاقے کا راجا پچھلی رات سورگ سدھارا تھا، اور اس کی ارتھی کے ساتھ ستی ہونے والی رانی کے لیے بانس کے اسی بَن سے چتا چُنی گئی تھی۔ چتا پر گھاس پھوس اور صندل کی لکڑیاں چنی جارہی تھیں۔ گائے کے مکھن سے بنا ہوا خالص گھی ڈالا جارہا تھا اور لوبان سلگایا جارہا

تھا۔ اسی وقت محل میں سکھیاں اس کنول رانی کو ستی کے لیے تیار کر رہی تھیں جسے ایک سال پہلے قاسم خاں نے بجرے میں بیٹھے مسکراتے دیکھا تھا اور اس کے حسن سے مسحور ہو کر رہ گیا تھا۔ کالی گھٹاؤں ایسے سیاہ بالوں میں موتی پروئے جا رہے تھے۔ کچے کنول ایسے پنڈے پر ابٹن ملا جا رہا تھا اور نین کنول میں کاجل کی دھاریاں ڈالی جا رہی تھیں۔

قاسم خاں اس آواز کو سنتے ہی لپک کر ناریل کے ایک اونچے درخت پر چڑھ گیا تھا۔ اس درخت میں کچے کچے، ہرے ہرے ڈاب لٹک رہے تھے جن میں سفید ناریل ابھی بن رہا تھا اور اس سفید ادھ کچرے ناریل کے بیچ سفید دودھیا پانی تھا جیسے کچی ناریوں کے پہلوٹھی کے بچوں کے وقت ان کے سفید کچے سینوں میں اترتا ہے۔ اسی درخت سے اس نے کنول کے ڈنٹھل ایسی لچکیلی بدن والی کو سرخ ساری میں لپٹے دیکھا تھا۔ وہ آج کنول کے پھول سے بھی زیادہ سندر لگ رہی تھی۔ پیشانی پر ماتھا پٹی تھی۔ اس کے گلے میں اور ہاتھوں میں پھولوں کے گجرے تھے۔ لوگ جوارتھی کے اور رانی کے چاروں طرف گھیرا ڈالے ہوئے تھے، اپنے مرے ہوئے پیاروں کے نام پیغام اس ستی ستونتی کو دے رہے تھے اور وہ ان سب کو اشیرباد دے رہی تھی۔ پھر وہ اپنے پتی کا سر گود میں رکھ کر بیٹھ گئی تھی، ڈھول پیٹے جا رہے تھے اور چتا کو آگ دکھا دی گئی تھی۔

قاسم خاں کو یک بیک بدھ جی کے شہر 'گیا' کا وہ گیانی گرو یاد آیا تھا، جس نے اُسے بتایا تھا کہ ویدک عہد سے پہلے بھارت ورش میں ستی کا رواج تھا مگر ویدوں نے اس رواج کو ختم کر دیا ہے۔ ستی کا مطلب ہے وہ سچی اور وفادار عورت جو اپنے خاوند کی چتا کے ساتھ مرنے کو تیار ہو۔ اس لیے وہ سولہ سنگھار کر کے اپنے پتی کے برابر چتا پر لیٹتی ہے مگر پھر ایک شخص آن کر اسے چتا پر سے اتارتا ہے اور اُسے آگے بڑھا لے جاتا ہے۔ اب یہ شخص اس کا دوسرا شوہر ہو جاتا ہے۔ قاسم خاں ناریل کے درخت پر چڑھا انتظار کرتا رہا کہ کون خوش بخت آگے بڑھے گا اور کنول رانی کو ''اگری'' بڑھا لے جائے گا، مگر کوئی بھی نہ آیا۔ جب شعلے اس سندری کے لمبے بالوں کو چاٹنے لگے تب اس نے سوچا کہ وہی جا کر اس ناری کو آگے بڑھا لے جائے۔ وہ بے قرار ہو کر اُترا مگر پہرے داروں نے اسے آگے نہ جانے دیا۔ وہ کنول چہرے والی اپنے مردہ پتی کے ساتھ جل کر بھسم ہو گئی اور وہ کچھ نہ کر سکا۔

تب قاسم خاں نے اپنی سنگِ مرمر ایسی سفید پیشانی سے خجالت اور پشیمانی کا پسینہ پونچھا۔ ہر چند کہ اس پتونتی کے ستی ہونے میں قاسم خاں کا کوئی ہاتھ نہ تھا لیکن مرد ہونے کے ناتے اس نے خود کو اس کارِ شر میں شریک جانا اور اس انجانی رانی کے لیے گریہ کیا اور پھر جل میں ہنستے کنول اور جنگل میں کھلے بن پھول ایسے اس دیس سے اس کا جی نہ پھر گیا۔ اس نے بختیار خلجی کے پاس دیوکوٹ جانے

کے بجائے بیر بھوم میں جھر کنڈ کے کے جنگل کا رُخ کیا تاکہ بنگ دیس کو خیر باد کہہ کے پھر ایک بار بُدھ جی کے شہر گیا تک پہنچے۔

جنگل بہت گھنا اور بہت خوب صورت تھا۔ دھوپ شرماتی ہوئی مکھ پر گھونگٹ ڈالے تھوڑی دیر کو یہاں داخل ہوتی تھی۔ ہرن، چیتل، خرگوش اور گلہریاں آزادی سے پھرتے تھے۔ چڑیوں کی چہکار سے کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی۔ قاسم خاں نیا دانہ کھاتا، نیا پانی پیتا آگے بڑھتا گیا۔ اپنی حفاظت کے لیے اس کے پاس تلوار بھی تھی اور تیر کمان بھی۔ رات کو سوتے وقت وہ اپنے اِرد گرد الاؤ جلاتا اور پھر ''چتا تیار ہے'' کی آواز اس کے کان میں گونجتی، اور کنول کے کچے ڈنٹھل ایسا پنڈا بھڑ بھڑ جلتا دکھائی دیتا اور یہ پورنی مات (پُرنعمت) جنگل اسے دوذخ (دوزخ) محسوس ہونے لگتا۔ صبح کو وہ نیا دانہ کھاتا، نیا پانی پیتا آگے بڑھ جاتا۔

یہاں تک کہ وہ بُدھ جی کے شہر گیا میں پہنچا اور اس گیانی گرو کو ڈھونڈا جس نے اسے رگ وید اور اتھر وید کے اَشلوکوں اور سوکتوں کے معنی سمجھائے تھے۔ قاسم خاں نے اس سے کہا، ''اے مردِ دانا! جنھیں تو آسمانی کتابیں مانتا ہے، ان کے غلط معنی بتانے میں تیری کیا مصلحت تھی؟'' اور سارا قصہ اس کنول رانی کے زندہ جل جانے کا اسے سنایا۔ تب اس گیانی نے کہا کہ میں نے تو تجھے ٹھیک بتایا تھا کہ ویدوں میں عورت کا پتی کے برابر لیٹنا ہی ستی کہلاتا ہے۔ پھر ایک شخص آگے آ کر اس سے کہتا ہے، ''اے عورت اٹھ، زندوں میں آ، تو مَرے ہوئے کے ساتھ لیٹی ہے۔ اب اس کے پاس آ جس نے تیرا ہاتھ تھاما ہے، تیرا دوسرا خاوند، اب تم زن و شوہر کے رشتے میں داخل ہو گئے ہو۔'' یہ عبارت اتھر وید کی ہے۔ رگ وید اور اتھر وید، دونوں میں درج ہے کہ نیا شوہر عورت کو چتا پر سے اٹھا کر لے جاتا ہے۔ اسی طرح ویدک عہد میں سَتی کی رسم نے ہی دوسری شادی کا رنگ اختیار کر لیا تھا۔ لیکن تجھے معلوم ہے کہ مذہب میں ملاوٹ کرنے والے ہمیشہ سے موجود ہیں اور ہمیشہ موجود رہیں گے۔ یہ لوگ مذہب کو اپنی ذاتی پونجی سمجھتے ہیں۔ کسی کو اس چھپے خزانے میں جھانکنے کی اجازت نہیں دیتے۔ خود ہی نکال کر کسی کو اشرفی دے دیتے ہیں اور جب چاہتے ہیں اپنے مفاد کی خاطر اس میں تبدیلیاں کر لیتے ہیں۔ ایسے ہی برہمنوں نے ویدوں کے الفاظ بدل کر 'اگری' کو 'اگنی' کر دیا۔ ایک دوسرے کو دھوکا دینے کے لیے یہ ظاہر کرتے ہیں کہ اس طرح ان کے ذات پات کے بندھن مضبوط رہیں گے، ورنہ عین ممکن ہے کہ بیوہ عورتیں نیچ ذات سے شادی کر کے اس نظام کو دھکا پہنچائیں اور نسلیں خراب کریں۔ لیکن ان کا اصل مقصد یہی ہے کہ پتی کے ساتھ بیوہ بھی مرے تو اس کا اور یتیموں کا مال کھانے میں آسانی ہو۔ بچہ! تُو دیکھے گا کہ جہاں جہاں برہمنوں کا زور بڑھ گیا ہے یعنی گنگا کی وادی

میں اور بنگ اگدھ میں وہاں ستی کی رسم کی آگ دوبارہ بھڑک اٹھی ہے۔ اب تو جب برہمنوں کا زور ٹوٹے گا تب خلقت کو اس آگ سے نجات ملے گی۔

یہ گیانی برہمن نہیں تھا لیکن بچپن سے اسے علم حاصل کرنے اور عالم بننے کی دُھن تھی۔ اس نے چھپ چھپ کر ویدوں کا مطالعہ کیا تھا اور اپنی ذات چھپا کر دور دراز کے پنڈتوں سے علم حاصل کیا تھا۔ وہ ویش تھا۔ برہمنوں نے ویش جاتی کو بھی شودر برابر کر دیا تھا۔ انھیں دینی علم حاصل کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ اگر پنڈتوں پروہتوں کو معلوم ہو جاتا کہ یہ ملیچھ دینی خزانے کے موتی رولتا رہا ہے اور آسمانی کتابوں کو اپنے ناپاک ہاتھوں سے چھو کر پڑھتا رہا ہے تو یقیناً اسے سزائے موت دے دی جاتی ——اور زندہ آگ میں جھونک دیا جاتا۔

جب تین دن گزرے اور قاسم خاں اپنی باشا میں نہ پہنچا تو مُوگل نے روتے روتے دادی ماں سے کہا، ''او چولے گا چھے (وہ چلا گیا)۔ وہ کہا کرتا کہ اس کے کانوں میں ایسی آوازیں آتی ہیں جیسے دور کوئی اسے بلا رہا ہو۔ مجھے معلوم تھا وہ ایک نہ ایک دن چلا جائے گا اور کبھی لوٹ کر نہیں آئے گا۔''

دادی ماں نے کہا، ''وہ ہم سے اور ہم اس سے بہت مختلف ہیں بیٹی۔ اسی لیے وہ ہمیں اچھے لگتے ہیں اور وہ بھی ہماری طرف کھنچتے ہیں۔ لیکن وہ ہوا میں اڑتے پرندے ہیں، ہم گہرے تال میں کھلے کنول ہیں، ہمارا ان کا میل کیسے ہو؟ وہ تال میں خوش خوش کھلے رہنے کی بات نہیں سمجھتے۔ نہ ہم انھیں سمجھا سکتے ہیں اور نہ اُن کے ساتھ ہوا میں اڑ سکتے ہیں۔ یہ ہماری فطرت نہیں ہے۔ ہماری جڑیں یہاں کی زمین اور پانی میں ہیں، ہم کیسے اڑ سکیں گے!''

''ہاں دادی ماں، ان کو یہ دیس اچھا تو لگتا ہے مگر بہت سی باتیں بُری بھی لگتی ہیں۔ ہمارے لیے تو یہ دیس ماں کی طرح ہے، جو مارے، ڈانٹے یا پیار کرے، ماں ہے۔ اسے چھوڑ کر جانے کی بات تو کوئی سوچ بھی نہیں سکتا۔'' مُوگل نے روتے روتے اپنا چہرہ دادی ماں کی گود میں چھپا لیا۔ ''تو سچ کہتی ہے بیٹی، پر بہتر ہوتا کہ تُو اسے بتا دیتی کہ تُو اس کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔ تجھے نہیں معلوم کہ بچے ماں اور باپ کے بیچ کتنی بھاری زنجیر ہوتے ہیں۔ اس زنجیر کو توڑنا آسان نہیں ہوتا۔ خیر وہ چلا تو گیا مگر اس دیس کی چکنی مٹی اس کے پیروں میں لگی ہوئی ہے، اور پھر عمل بھی تو جانتی ہوں میں، تُو اپنا دل چھوٹا نہ کر، وہ ایک نہ ایک دن لوٹ کر ضرور آئے گا۔'' ''ہاں دادی ماں! ہو سکتا ہے تمھارے عمل سے صدیوں بعد اس کی نسل میں سے کوئی یہاں آئے، مگر اب ہمارے لیے صبر کے سوا کیا چارہ ہے۔''

وہ دن جب زری اور شمس الرحمٰن مشرقی پاکستان کے لیے روانہ ہوئے، سردیوں کا ایک بے حد ٹھنڈا اور بے درد سا دن تھا۔ کراچی میں سمرقند و بخارا سے آنے والی ہوا برفیلی اور کٹیلی تھی جس کے اثر سے چہرے کی جلد کھنچتی اور پھٹتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ زری نے موسم کو کوسا کاٹا تو شمس الرحمٰن نے خوش دلی سے کہا، ''فکر نہ کرو زری جان! ڈھاکا میں موسم بہت شان دار ہوگا بلکہ شوندر، گرمی کے کپڑے بھی لے چلیں گے۔''

زری نے یہ سن کر اپنی پسند کا کڑھا ہوا کرتہ شلوار پہن لیا اور اوپر سے شال اوڑھ لی تاکہ ڈھاکا پہنچتے ہی اتار کر رکھ سکے۔ شمس الرحمٰن کا جی چاہا کہ زری ساری پہنے، لیکن اسے معلوم تھا کہ زری کو سفر میں ساری باندھے رکھنے سے الجھن ہوتی ہے۔

ایئرپورٹ پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ جہاز میں کوئی خرابی تھی، وہ اب دور ہوگئی ہے۔ جہاز آخری ٹیسٹ کے لیے گیا ہوا ہے۔

''شمس جہاز میں کوئی خرابی ہے اور مجھے جان عزیز ہے۔ کیوں نہ آج کا یہ سفر ملتوی کیا جائے۔''

''بالکل نہیں، جہاز ٹھیک ہو چکا ہے اور ہم تیار ہو چکے ہیں...... بہتا دریا رک نہیں سکتا، لاکھوں طوفان آئیں......'' شمس الرحمٰن نے بڑے جوش و عزم سے کہا۔

''کچھ دیر میں بالکل اندھیرا ہو جائے گا اور مجھے رات کا سفر اچھا نہیں لگتا۔'' زری نے کہا۔

''ارے ہم جو ساتھ ہیں، شمس یعنی سوریہ دیوتا۔ روشنی ہی روشنی ہوگی ہر طرف۔''

''افوہ— تم تو بے حد خوش معلوم ہو رہے ہو۔'' زری نے کہا۔

''تم جیسی بیوی ساتھ ہو تو آدمی مسرور بھی ہوتا ہے اور مغرور بھی۔'' شمس الرحمٰن اِترایا۔

''واقعی، تم تو اردو میں بھی شاعری کر سکتے ہو، سچ مچ شمس تمھاری اردو پر تو بڑے بڑے اردو داں رشک کر سکتے ہیں، لیکن میری بنگلہ پر تو لگ ہنسیں گے۔''

''کیوں ہنسیں گے؟ اصل چیز زبان کی درستی نہیں، نیت ہے۔ تم ان کی زبانوں بولو گی تو وہ جان لیں گے کہ تم دوسروں کی طرح ان کو حقیر نہیں سمجھتیں، اُن میں اُن کی بن کر رہنا چاہتی ہو اور یہی اصل بات ہے۔''

''تو وہ مجھے اپنا لیں گے؟'' زری کے لہجے میں شک تھا۔

''یقیناً، تم نے ان کے اپنے شخص کو اپنا لیا، ان کے دیس میں آ گئیں۔ ان کی زبان بولنے لگیں، اور کیا چاہیے۔''

ہاں اور کیا— وہ ایک نئی زندگی کی ابتدا کرنا چاہتی تھی، بالکل مختلف زندگی کی۔ لوگ اس بات کو غیر فطری کیوں سمجھتے ہیں کہ اس نے شمس الرحمٰن سے شادی کر لی— پہلے بھی ایسی شادیاں ہوتی رہی ہیں— آسمانی صحیفوں میں ایسی شادیوں کا ذکر ہے۔ تاریخ میں ایسی شادیاں رقم ہیں۔ شادیاں اور ہجرتیں۔ ایبٹ آباد سے چلتے وقت چاچا جی نے اپنے پرکھے قاسم خاں کی داستان کا ایک ٹکڑا نقل کر کے زری کو دیا تھا، آج زری جہاز میں دوبارہ پڑھنے کے لیے اسے ساتھ لیتی آئی تھی۔

جہاز ٹیسٹ ہو کر آیا۔ پہلے عملہ گیا۔ شاید کچھ کام ابھی باقی تھا۔ خاصی سٹر پٹر کے بعد مسافروں کو اذنِ باریابی ملا۔ سورج کو تانبے کا تھال بن کر ڈوبے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی مگر اندھیرا ہو چکا تھا۔ زری کھڑکی کے پاس بیٹھی، شمس الرحمٰن برابر میں۔ تیسری کرسی خالی تھی۔ جہاز کے اڑنے کے بعد زری بار بار باہر جھانکتی۔ شدید اندھیرے میں جہاز کے پروں پر صرف ایک سبز روشنی نظر آتی۔

''شمس، باہر بے حد تاریکی ہے، آج سارے ستارے کہاں چلے گئے؟'' زری نے غیر معمولی سراسیمگی سے کہا۔

''چھٹی پر ہوں گے۔'' شمس الرحمٰن نے مذاق کیا، پھر زری کو سنجیدہ پا کر کہا، ''پریشانی کی کیا بات ہے، باہر مت دیکھو۔''

زری نے پردہ کھینچ دیا اور مشرقی پاکستان کے بارے میں سوچنے لگی۔ پورا ملک ایک زیرِ تشکیل ڈیلٹا ہے۔ تمام شہر، قصبے اور گاؤں اس ڈیلٹا کے درمیان آباد ہیں، کتنی عجیب بات ہے۔ گنگا اور برہم پتر کے عظیم دریائی سلسلے ہر سال لاکھوں من مٹی پھیلا کر خلیج بنگال میں جا گرتے ہیں اور یوں زمین کو اتنا

زرخیز کر دیتے ہیں کہ سال میں تین فصلیں اُگتی ہیں۔ ہزاروں ندیاں آمد و رفت کا ذریعہ ہیں۔ اوسطاً بارش ۸۸ انچ سالانہ اور شرحِ آبادی ۹۲۲ کس فی مربع میل۔ افوہ، کتنے زیادہ لوگ ہیں — سیلاب، طوفان اور موسلا دھار بارشیں وسیع علاقے کو برباد کر دیتی ہیں۔ ہر چیز اس کے اپنے علاقے سے کتنی مختلف ہے۔ ہاں اسے ایسی ہی جگہ کی تلاش تھی جو بالکل مختلف ہو۔ لیکن اس کے دوست اور خیر خواہ ہراساں کیوں ہیں، جیسے وہ حقیقت سے سراب کی طرف سفر کر رہی ہو۔

زری نے قاسم خاں کی داستان نکال کر پڑھنی شروع کر دی۔ شمس الرحمٰن آنکھیں موندے بیٹھا تھا۔

آج رات آسمان پر ستارے کتنے نیچے اتر آئے تھے۔ قاسم خاں کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ چاہے تو ہاتھ بڑھا کر انگور کے خوشوں کی طرح تاروں کے گچھوں کے گچھے توڑ سکتا ہے۔ کتنے دن بعد اس نے اتنا شفاف آسمان دیکھا تھا۔ گیا کا آسمان، جہاں گوتم کو گیان حاصل ہوا تھا۔ تاروں کی چھاؤں میں لیٹا قاسم خاں سوچ رہا تھا کہ کہاں کا انسان کہاں جا پہنچتا ہے۔ اس کے پرکھے ترکی سے چل کر ایران اور پھر ہندوستان میں وارد ہوئے تھے۔ بختیار خلجی کو جب دہلی دربار میں جگہ نہ ملی تھی اور اس نے اپنی الگ فوج بنا کر بہار اور بنگال پر حملہ کیا تھا، تو قاسم خاں اس چھوٹی سی فوج کی سپہ سالاری کا ارمان لیے اس میں شامل ہو گیا تھا لیکن اس وقت وہ گیا کے آسمان تلے پڑا تھا۔ عجیب طرح کی سوچ اس کے ذہن پر سوار تھی کہ آدمی آخر کیوں کچھ بننا چاہتا ہے!! — یہ کھولن اس کے اپنے اندر ہوتی ہے یا باہر سے کسی شخص کو دیکھ کر وہ اس ابتلا میں پڑتا ہے، یا یہ خواہشیں غیر شعوری طور پر ساتھ لے کر پیدا ہوتا ہے۔ ممکن ہے اس کے پردادا کی کوئی بے پناہ خواہش پوری نہ ہوئی ہو اور وہ خون کے ساتھ نسلوں میں سفر کر رہی ہو۔

اگر یہ تمنائیں میں سمجھ دار ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہیں تو آدمی سمجھ دار کس عمر میں ہوتا ہے؟ ہر عمر میں وہ سمجھتا ہے کہ وہ اب عقل مند اور ہوشیار ہو گیا ہے لیکن مرتے وقت شاید اسے پتا چلتا ہو کہ اس وقت مرنا سمجھ داری کی بات نہیں، بہتر ہوتا کہ مرنے سے پہلے وہ اپنے سارے کام نمٹا لیتا — مگر کیا دنیا کے کام نمٹ سکتے ہیں؟ کیا دنیا میں کوئی شخص ایسا گزرا ہے جس نے کسی رات کھڑکی سے جھانکتے چاند سے کہا ہو، دیکھنا بھائی اگر آسمان پر کہیں ملک الموت نظر آئے تو اسے بھیج دینا، میں اس کے ساتھ جانے کو بالکل تیار ہوں۔ میں نے آج سارے کام نمٹا دیے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ دنیا میں ایسے ولی اور قطب گزرے ہیں جو اپنے مریدوں سے کہتے تھے کہ ''ہم چلے۔'' وہ پتھر پر سر رکھ دیتے تھے اور ان کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر جاتی تھی۔ مگر یہ تو تعمیلِ حکم ہوئی۔ جس طرح کوئی باادب بچہ یا فرماں بردار نوجوان اپنے باپ کے بلاوے پر کھیل یا کام ادھورا

چھوڑ کر فوراً چلا آئے۔ یا جیسے سقراط — کہ جب اس کو بتایا گیا اس کی زندگی کا پیالہ لبریز ہو گیا ہے تو اس نے چند ثانیے تاخیر کرنا بھی خود کو حقیر کرنے کے مترادف جانا، جیسے چھیننے والے نے ایسی بے حقیقت چیز کے لیے ضد کر کے خود اپنے کو چھوٹا کر دیا ہو۔ اور دینے والا پھر بھی برتر ہو — اور پھر ایک نئی سوچ کی لانبی ڈور۔

کیا دینے والا لینے والے سے ہمیشہ برتر ہوتا ہے — مگر لین دین کا یہ اصول اتنا سادہ تو نہیں جو کچھ دیتا ہے وہ کچھ لیتا بھی تو ہے۔ مالک پیسے دے کر خدمت لیتے ہیں۔ زمین انسان کو خوراک دیتی ہے تو اس سے بیج لیتی ہے، کھاد لیتی ہے اور خون پسینہ لیتی ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی کسی سے لے کر کسی اور کو لوٹا دے۔ صرف اللہ ہے جو کسی سے کچھ نہیں لیتا جو کسی سے کچھ نہ لے، صرف دے، وہ یقیناً سب سے برتر ہے۔ لوگ احسان مندی میں اسے بھی دینا چاہتے ہیں، کیوں کہ وہ لین دین کے عادی ہوتے ہیں، اور پھر اپنی تسلی کے لیے خود کو یقین دلاتے ہیں کہ اُسے اُس چیز کی ضرورت تھی ورنہ بے قدر، بے مصرف چیز دینے سے تو دلی مسرّت نہیں ملتی — پھر دلی مسرّت کس چیز سے ملتی ہے؟ دینے سے — خدا سے لے کر دوسروں کو دینے سے، خواہ وہ علم ہو؟ حکمت ہو یا دولت ہو۔

یہی تو وہ شہر ہے جہاں گوتم کو گیان حاصل ہوا تھا — ''فتح کی پہلی ہی شام اس کا خیال مجتمع، خالص، کامل اور روشن ہو گیا۔ ہر قسم کے میل سے پاک اور آلائش سے مبرا۔ انھیں اس بات کا ادراک ہوا کہ دنیا میں برائی کی جڑ خواہشِ نفسانی ہے۔ اور خواہشِ نفسانی کی جڑ مایا ہے۔ یہ خواہشِ نفسانی (کی آگ) پیدائش کے وقت سے ہر فرد بشر پر مسلط ہو جاتی ہے اور انسان کے دل کو چاروں طرف سے دبا لیتی ہے اور کبھی بجھتی نہیں ہے — گر یہ سب دھوکے کی ٹٹیاں ہیں۔ انسان کا بہترین عمل یہ ہے کہ وہ اس خواہشِ نفسانی کو مار دے، جس کے ساتھ اس دھوکے کے عالم اور تمام مصیبتوں کا خاتمہ ہو جائے۔'' للت دستر کے بائیسویں باب میں درج تھا — چناں چہ کچھ بننے کی ساری تمنائیں مایا ہیں خواہ وہ کھولن انسان کے اپنے اندر ہو، یا کسی اور کو دیکھ کر پیدا ہوئی ہو یا نسلوں میں سفر کر رہی ہو۔

ساری رات ایسے ہی خیالوں اور خوابوں میں کروٹیں لیتے گزری۔ صبح دم خنک ہوا کے جھونکوں میں نیند آ گئی — یا ہنوز جاگ رہا تھا یا غنودگی میں تھا۔ شاید عالمِ رویا میں ایک جگہ دکھائی دی جہاں پُر پیچ راستوں کے بیچ ایک پہاڑی تھی جس پر تین چنار سر جوڑے کھڑے تھے۔ چاروں طرف گہری کھائی تھی اور اس کے بعد پہاڑوں کے سلسلے تھے جو دور برفانی چوٹیوں سے جا ملے تھے۔ پھر کسی اَن جانی آواز نے حکم دیا کہ ''اس جگہ کو تلاش کر کے آباد کر، اور خلقِ خدا کے کام آ — علم حاصل کر جس طرح اس دلیش گیانی نے سر دھڑ کی بازی لگا کر علم حاصل کیا، اور اسے عام کر — ''

قاسم خاں کی آنکھ کھلی تو دل میں پہلا سا اضطراب نہ تھا۔ اس نے بسم اللہ کر کے شمال مغرب کی سمت سفر شروع کیا۔ نیا دانہ کھاتا اور نیا پانی پیتا چلتا رہا۔ یہاں تک کہ ایک جگہ آئی جہاں چاروں طرف اونچے پہاڑ تھے، درمیان میں کھائی تھی اور نیچی پہاڑیوں کے سلسلے کی ایک چوٹی پر تین چنار سر جوڑے کھڑے تھے۔ قاسم خاں نے یہ جگہ پہچان لی اور وہاں اپنا کچا جھونپڑا چھایا۔ پہاڑ کے پتھر برابر کر کے ایک چبوترہ بنایا، اسے مٹی سے لیپا اور وہاں رہنا شروع کر دیا۔ زیادہ وقت عبادت، ریاضت اور کتابیں لکھنے پر صرف ہوتا۔ ہوتے ہوتے اس کی شہرت دور تک پھیلی۔ دور و نزدیک کے لوگ کھائی عبور کر کے درس و تدریس کے لیے آنے لگے اور قاسم خاں ''میاں صاحب'' کے نام سے مشہور ہوا۔

یہ میاں صاحب، جونہایت نیک اور پارسا تھے، اپنی بنائی ہوئی چھوٹی سی مسجد میں بیٹھے لوگوں کو نیک راہ دکھایا کرتے تھے۔ انھی دنوں ریاست چترال کے بادشاہ کو ان کی صورت خواب میں دکھائی دی اور کہا گیا کہ تیری دلی مراد اس شخص کی دعا سے حاصل ہوگی۔ بادشاہ کی کئی حسین وجمیل بیٹیاں تھیں مگر بیٹا کوئی نہ تھا۔ وہ سلطنت کے وارث کی خواہش میں گھلا جارہا تھا۔ بادشاہ نے اپنے خواب کی شبیہ اپنے دربار کے مشہور معروف مصور سے بنوائی، اور ایک وفد کو مقرر کیا کہ وہ صاحبِ تصویر کو جہاں سے ممکن ہو، تلاش کر کے لائے۔ چوطرفہ لوگ دوڑائے گئے۔ آخر میاں دم کی ایک چھوٹی سی مسجد میں میاں صاحب بیٹھے ہوئے مل گئے جو اپنی اعلیٰ قابلیت اور علم وفضل کی وجہ سے بہت عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ ہو بہو وہی شبیہ — قبل اس کے کہ بادشاہ کے سفیر ان سے مدعا بیان کریں، وہ مسکرائے اور کہا، ''چند دن قیام کر کے آپ بہ اطمینان واپس جائیں، جب تک آپ پہنچیں گے، بادشاہ کی مراد برآ چکی ہوگی۔''

آنے والوں نے کہا کہ ہم تو آپ کو لینے آئے ہیں، خالی ہاتھ نہ جائیں گے۔ مگر میاں صاحب ساتھ جانے پر آمادہ نہ ہوئے۔ سفیر چند دن رہ کر رخصت ہوئے۔ دل ہی دل میں خوف زدہ تھے کہ میاں صاحب کے بغیر پہنچے تو بادشاہ ناراض ہوگا۔ بادشاہ کی ناراضگی کا مطلب جان سے ہاتھ دھونا بھی ہوسکتا ہے۔ مگر وطن واپسی پر جب دور ہی سے ڈھول تاشوں کی آواز سنی تو جان میں جان آئی۔ بادشاہ کے بیٹا تولد ہوا تھا اور اس نے خزانے کا منھ کھول دیا تھا۔ وفد نے جا کر بتایا کہ میاں صاحب کو ان

کے آنے کی اطلاع تھی۔ بے شک وہ صاحبِ کشف ہیں۔ تب بادشاہ نے بے شمار تحفے تحائف اُن کے لیے تیار کروائے۔

چند دِن بعد ایک قافلہ تحفوں کا انبار لے کر روانہ ہوا۔ تحفوں میں نادر گھوڑے، زروجواہر، خلعتیں، مشک وعنبر، کیا کچھ نہ تھا۔ مگر سب سے بیش بہادانہ، بادشاہ کی چودہ سالہ بیٹی تھی جو انھوں نے میاں صاحب کی ''نذر'' کردی تھی۔ دیکھنے میں حور— عادات و خصائل میں لاثانی— ٹھسا ایسا کہ دیکھنے والے کا پتّا پانی ہو۔ اس کے ساتھ پہرے داروں اور کنیزوں کی ایک فوج بھی روانہ کی گئی۔ میاں صاحب نے تحفہ تحائف کو نظر اٹھا کر نہ دیکھا۔ زبان سے کہا، ''ہم نے قبول کیے اب واپس لے جاؤ، ہمیں یہ سب نہیں چاہیے۔ ہاں، ہماری امانت ہمارے پاس چھوڑ جاؤ۔'' اس طرح وہ شاہزادی، دوخادمائیں اور ایک دربان وہاں رہ گیا باقی سب واپس چلے گئے۔ میاں صاحب نے اپنے بڑے بیٹے کی شادی اس شاہزادی سے کردی۔

شروع میں تو وہ شاہزادی بے حد ہراساں رہی۔ کہاں وہ محل کے ٹھاٹھ باٹھ اور چہل پہل اور کہاں یہ ویرانہ— مگر رفتہ رفتہ اس کا جی لگ گیا اور پھر اس نے ساری عمر اسی کٹیا کو اپنا گھر جانا۔ اس بیٹے سے جو نسل چلی اس میں جہاں ترکی رنگ روپ اور افغانی قد آوری آئی، وہیں کہیں کہیں ترچھی چترالی آنکھوں اور زرد رنگ کی آمیزش بھی ہوئی۔

ایک دن چار آدمی چارپائی پر ایک قریب المرگ لڑکی کو لے کر آئے۔ میاں صاحب نے اس لڑکی کو دیکھا تو انھیں چتاوالی لڑکی یاد آئی۔ ان دونوں میں کچھ اَن جانی مشابہت تھی۔ وہ بنگالہ کے پانی سے سنچا ہوا اور وہاں کی دھوپ کھایا ہوا کنول تھی، اور یہ برفانی ہواؤں کا پالا ہوا نرگس کا پھول— نرگس کا ڈنٹھل بھی تو کنول کے ڈنٹھل کی طرح سبز ہی ہوتا ہے، اور اتنا ہی نرم و نازک— سفید پنکھڑیوں میں جڑا زرد کٹورہ بھی کنول کی طرح آنکھ سے مشابہت رکھتا ہے۔ پھول تو پھول ہی ہے چاہے جہاں بھی ہو۔ میاں صاحب نے نبض دیکھی۔ لڑکی کو لانے والے اب اسے مردہ سمجھ کر رونے پیٹنے میں لگے ہوئے تھے— میاں صاحب نے قریب بہتے ہوئے شفاف ٹھنڈے چشمے کا پانی اس پر چھڑکا اور کچھ دم کر کے حلق میں ڈالا۔ کچھ اور دوا دارو کی اور وہ لڑکی بھلی چنگی ہوگئی۔ ان کے پاس میاں صاحب کی مسیحائی کا معاوضہ دینے کو کچھ نہ تھا۔ میاں صاحب لینا بھی نہ چاہتے تھے مگر جب اُنھوں نے ضد کی کہ میاں صاحب کوئی ایسی فرمائش ضرور کریں جسے وہ پورا کرسکیں تو میاں صاحب نے اس لڑکی سے نکاح پڑھوا دینے کی درخواست کی کہ اس جگہ کی تنہائی انھیں کھاتی تھی اور انھیں کھانے کی بھی تکلیف تھی۔ اس طرح سوسن جان کے ساتھ ان کا نکاح ہوگیا اور یہ جگہ جہاں عام خیال کے مطابق انھوں نے ایک

لڑکی پر دَم کر کے اسے زندہ کر دیا تھا "میاں دَم" کہلانے لگی۔

سوسن جان سے قاسم خاں کے چند نہایت حسین وجمیل بچے پیدا ہوئے۔ بچے بھی انھیں میاں صاحب کہتے تھے۔ میاں صاحب خود انھیں تعلیم دیتے تھے اور کٹھن چڑھائیوں پر چڑھ کر دوسرے بچے بھی ان سے درس لینے آتے تھے۔ اور تعظیماً ان بچوں کو صاحب جی کہتے تھے جن سے ان کی مراد صاحبِ علم تھی۔ میاں صاحب چھینٹ کے ڈھیلے ڈھالے سواتی کرتے اور پشواز میں ملبوس سوسن جان کو ہری بھری دھواں دیتی شاخوں پر روٹی پکاتے دیکھ کر اکثر سوچتے کہ انھیں سوسن جان سے پوچھنا تو چاہیے تھا کہ وہ اپنے سے دُگنی عمر کے مولوی میاں کے ساتھ خوش ہے یا نہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اپنے ہم عمر کسی کھلنڈرے سے گڈریے کو دل دیے بیٹھی ہو، جو پشم کی ٹوپی اوڑھے اس کے ساتھ بھیڑ بکریاں چرانے جاتا ہو، مگر پھر اور بہت سی باتوں میں وہ یہ بات بھول بھال جاتے جس طرح وہ مُوگل کو، اس کی دادی ماں اور اس جادو کے دیس کو بھول گئے تھے۔

ہاں، وہ ایک جملہ نہیں بھولے تھے جو ڈھاک اور بانس کے بَن سے لے کر محل تک گونجا تھا۔ ایسی ہی ایک گونجتی ہوئی آواز اس طوفانی رات میں بھی سنائی دی تھی جس صبح سوسن جان نے دَم توڑا تھا۔ وہ نیچے گھاٹی سے دائی کو لینے گئے تھے۔ بارش اور ہوا سے سائیں سائیں کرتے چیڑ کے درختوں میں سے ایک آواز سنسناتی ہوئی نکلی چلی گئی تھی، جیسے کہہ رہی ہو "چتا تیار ہے" اور جب وہ اپنے جھونپڑے میں پہنچے تھے تو سوسن جان ان کے آخری بچے کو جنم دے کر آخری سانس لے رہی تھی۔ میاں صاحب نے فجر کی نماز کے ساتھ اس کی نمازِ جنازہ پڑھا کر سوسن جان کو اپنی جھونپڑی کے پاس ہی دفن کر دیا تھا، اور پھر اس بچے کو بھی جو ماں کے بغیر دو دن سے زیادہ نہ جیا تھا کہ پہاڑ پر رہنے والے تنہائی کے ماروں کو اپنے مردے بڑے عزیز ہوتے ہیں۔ غریب غربا بھی اپنے پیاروں کی قبریں پختہ کر لیتے ہیں اور ان پر سایہ دار درخت لگا دیتے ہیں۔ جمعرات کی شام جب ان قبروں پر دیے جلائے جاتے ہیں تو پہاڑوں کے کٹورے میں چھوٹی جگمگاتی ایک بستی سی بن جاتی ہے۔ بلندی سے دیکھیں تو یوں لگتا ہے جیسے پریاں ہتھیلیوں پر چراغ دھرے رقص کر رہی ہوں۔

یہ شاہزادی باوجود سیکڑوں مرتبہ بلائے جانے کے پھر کبھی اپنے میکے نہ گئی — ہاں کبھی کبھار میکے سے کوئی ملنے آ جاتا تھا۔ بعد ازاں میاں صاحب کا یہ بیٹا، جو صاحب زادہ کہلاتا تھا، دریائے سندھ کے کنارے جا آباد ہوا۔ پھر اس کے بیٹوں نے دریائے سندھ کے کنارے تربیال، کوٹھہ، ٹوپی، پیہود، غازی اور دریائے کابل کے کنارے نوشہرہ، دریائے سندھ اور کابل کے درمیان خیر آباد، ضلع صوابی میں مردان اور چارسدہ کے علاقے میں بہت سی بستیاں بسائیں۔ زرخیز زمینوں میں گنا، مکئی، سرسوں، تمباکو اور افیون

کی کاشت کرتے تھے اور کھاتے پیتے زمیں داروں میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ انھی میں چند ایسے بھی تھے جو دیس چھوڑ کر گئے تو ہمیشہ کے لیے دور دراز بستیوں میں رہ پڑے۔ ایسے بھی تھے جنھوں نے حملہ آوروں کے ساتھ مل کر فوج کشی کی اور ہزارہ کے علاقے کے، ہزار فوج کا دستہ رکھنے والے سپہ سالاروں میں شامل ہوئے۔ وہ بھی تھے جو انگریزوں کے خلاف تحریکوں میں شریک ہوئے، اور وہ بھی جنھوں نے انگریزی دربار سے خطابات اور خلعتیں پائیں اور انتظامیہ میں بڑے بڑے عہدوں پر پہنچے۔

آخری پیراگراف چاچا جی نے اپنی طرف سے اضافہ کیا تھا۔

زری نے جہاز کی کھڑکی کا پردہ ہٹا کر ایک بار پھر باہر نظر ڈالی۔ بادل چھٹ گئے تھے پھر بھی غیر معمولی تاریکی تھی۔ سیاہ مخمل جیسی دبیز اور ملائم، جیسے زری چاہے تو اسے ہاتھ سے چھو سکتی ہو۔ اس سیاہ مخملیں چادر کے پس منظر میں ایک بے حد نارنجی چپٹا چاند ایڈورڈ منچ کی تصویروں کی طرح کا، خلا میں لڑھکتا پھر رہا تھا۔ کبھی ایک دم جہاز کے پروں کے بہت نیچے پاتال میں اتر جاتا اور کبھی آسمان پر چڑھ جاتا۔

''تم پھر باہر دیکھ رہی ہو۔'' شمس الرحمٰن نے اس طرح کہا جیسے زری کو چوری کرتے پکڑ لیا ہو۔

''ہاں، میں نے کتنی بار جہاز سے سفر کیا ہے لیکن آج ہر بات انوکھی ہو رہی ہے۔''

''یہ کیا کم انوکھی بات ہے کہ زری خان، زری شمس الرحمٰن بن کر مشرقی پاکستان جا رہی ہے۔''

''شمس! چاچا جی کہا کرتے ہیں کہ قدرت بیجوں کے لیے جو کام ہوا سے لیتی ہے وہ کام نسلوں کی ہجرت سے ہوتا ہے، کبھی معاشی، کبھی سیاسی حالت کی وجہ سے لوگ ہجرت کرتے ہیں، نئی جگہ جاتے ہیں، ان کی جگہ دوسرے لوگ لیتے ہیں، یوں نسلوں کے اختلاط سے بڑھنے، پھلنے اور پھولنے کا عمل جاری رہتا ہے۔ لیکن ابھی یہ ہجرت خانہ جنگیوں، جنگوں اور قحطوں سے وابستہ ہے۔ جب انسان زیادہ ترقی یافتہ ہو جائے گا تو یہ ہجرتیں کمپیوٹر کی مدد سے ہوا کریں گی۔ کمپیوٹر آپ کا پورا شجرہ دیکھ کر بتائے گا کہ کتنے عرصے بعد آپ کو کہاں اور کس طرف چلا جانا چاہیے۔''

''تو زری بیگم، تمھارے دماغ کے کمپیوٹر نے یہ بتایا کہ اب تمھیں مشرق کی طرف ہجرت کر لینی چاہیے۔'' شمس الرحمٰن ہنسا۔

وقت گزاری کے لیے زری، شمس الرحمٰن کو قاسم خاں کی داستان سنانے لگی۔

داستان کے خاتمے پر شمس الرحمٰن نے کہا کہ یہ قصہ ایک انجیلی واقعے سے بے حد مشابہت رکھتا ہے۔

''سنو شمس!'' زری نے کہا، ''اگر میں اس شاہزادی کی جگہ ہوتی تو ہرگز اس بات پر راضی نہ ہوتی

کہ لونڈیوں کی طرح مجھے تحفے میں پیش کیا جائے، میں وہاں جانے سے صاف انکار کر دیتی۔"

"تو تمھارے والدِ محترم اس نافرمانی کی پاداش میں تمھیں کسی ویرانے میں ڈلوا دیتے جہاں کوئی سفید ریچھ تمھیں کھا جاتا اور یہ داستان وہیں ختم ہو جاتی۔" شمس الرحمٰن نے کہا۔

"اگر ایسا ہوتا تب بھی یہ داستان غلامی کی اس داستان سے کم اَلم ناک ہوتی۔" زری نے سنجیدگی سے کہا۔

"مگر ایسا نہیں ہوا، اور آج اس خاندان کی ایک لڑکی کو مشرقی پاکستان ہجرت کرنا پڑ رہی ہے — اور میں پیش گوئی کر رہا ہوں کہ یہ لڑکی پہلی ہی نظر میں اس صوبے پر عاشق ہو جائے گی اور کہے گی — وہ جو کرسچین شادیوں کے موقع پر پیمان وفا نہیں باندھتے ہیں —

For better and for worse

In sickness and in health

I'll love you and cherish you

Till death do us part.

وغیرہ وغیرہ۔

"اچھا!" — زری نے قدرے اچنبھے سے کہا، "مگر تم نے میرے شہر اور میرے گاؤں سے یہ سب کیوں نہ کہا؟"

"کہا تھا — تمھیں کیا خبر!" شمس الرحمٰن جذباتی ہو گیا اور جب وہ جذباتی ہو جاتا تو بڑا بے وقوف سا لگتا۔

"میں نے تمھارے ایبٹ آباد کے ایک ایک درخت سے یہی بات کہی، اور تمھارے والدین کی قبروں سے۔"

"میرے والدین کی قبروں سے بھی! مگر تم تو ان سب چیزوں کو چھوڑ کر چلے آئے۔" زری نے اسے غور سے دیکھا۔

"اس سے کیا ہوتا ہے۔" شمس الرحمٰن نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، "جن چیزوں سے دلی لگاؤ ہو، وقتی طور پر انھیں چھوڑ دینے سے محبت بڑھتی ہے، کم تھوڑا ہی ہوتی ہے — تم بتاؤ کیا تم ان چیزوں کو واقعی چھوڑ سکتی ہو؟"

زری گھبرا گئی۔ اس کے دل کا چور پکڑا گیا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے وہ خود کو یقین دلا رہی تھی کہ وہ ان سب چیزوں کو بھول کر ایک نئی مختلف دنیا بسانے جا رہی ہے۔ مگر شمس الرحمٰن نے اَن جانے میں

دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

"شمشل!— ہمیں ایئرپورٹ پر لینے کے لیے تمھارا کوئی عزیز آئے گا نا!" زری نے موضوع بدل دیا۔

"بھئی سلہٹ تو ڈھاکا سے بہت دور ہے اور میرا برسوں سے کسی سے رابطہ نہیں۔ سوتیلا بھائی ڈھاکا یونی ورسٹی میں ہے۔ اسے خط لکھ دیا ہے شاید وہ آجائے، ورنہ محکمے کے لوگ تو ہوں گے ہی۔"

"ہاں، ٹھیک ہے۔ یہی اچھا ہے دنیا میں نہ تمھارا کوئی قریبی عزیز ہے نہ میرا، ورنہ شاید ہم مل نہ پاتے۔"

"واہ، یہ کیا بات ہوئی۔ اب اسی پر کڑھ رہی ہو کہ ہم تم مل کیوں گئے۔ ارے بھئی یہ شمشل تمھارا ہے کہ نہیں—"

"یہ تو وقت بتائے گا۔"

"ہاں وقت— چلو وقت ہی سہی۔" شمس الرحمٰن نے کہا۔ زری محسوس کر رہی تھی کہ اپنے وطن جاتے ہوئے خوشی اس کے لہجے سے ننھی بوندوں کی پھوار کی طرح برس رہی تھی۔ بے اختیار اس کی زبان سے "شوندر شمش" جیسے الفاظ نکل رہے تھے اور لہجے میں بنگالی انداز جھلکنے لگا تھا۔

یکایک جہاز میں مائک کی آواز توجہ کی طالب ہوئی اور اعلان ہوا کہ جہاز ڈھاکا ایئرپورٹ پر اترنے والا ہے۔ مسافروں کے چہرے خوشی سے کھل اٹھے جن لوگوں نے بہت دیر سے چپ سادھ رکھی تھی، پھر باتیں کرنے لگے۔

"اب تم باہر دیکھ سکتی ہو۔" شمس الرحمٰن نے کہا، "دن ہوتا تو تمھیں بوڑھی گنگا لہراتی ہوئی نظر آتی۔ گھاس کے قطعے، تالاب اور سڑکیں—"

زری نے پردہ سرکا کر باہر دیکھا۔ عین زمین پر سونے کے تھال ایسا چاند چمک رہا تھا۔ زری نے حیران ہو کر اوپر نگاہ کی تو ایک چاند وہاں بھی موجود تھا۔ معمّا شمس الرحمٰن کے سامنے رکھا تو وہ ہنس پڑا۔

"یہاں تمھیں مستقل دو چاند ملیں گے۔ ایک تم اور ایک میں!— ارے پگلی، یہ دریاؤں کا دیس ہے۔ پانی میں چاند کا عکس نظر آرہا ہے۔"

"اُف کتنا خوب صورت!" زری نے سانس روک لیا اور یکایک اس کا موڈ بھی بے حد شگفتہ ہوگیا۔

ڈھاکا شہر کی روشنیاں مختلف انداز میں جھلملا رہی تھیں۔ کہیں سڑکوں پر روشن قطاریں تھیں۔ کہیں رنگین نگینوں کے زیور الجھے ہوئے پڑے تھے۔ کہیں اِکا دُکا روشنیاں تھیں جیسے کسی نے دیے

جلا کر چوکھٹ پر دھرے ہوں۔

جہاز رن وے کی روشنیوں کے درمیان اترا۔ نارنجی اور نیلی بتیوں کے جلو میں سبک خرامی کرتا ہوا بالآخر کھڑا ہو گیا۔ ڈھاکا شہر کی ساری روشنیاں زری کے دل میں امیدوں کے چراغ بن کر جھلملانے لگیں۔ یہ اس کی امیدوں اور آرزوؤں کا شہر تھا۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔

ڈھاکا ایئرپورٹ روشنیوں میں دمک رہا تھا۔ عمارت کی پیشانی پر نیلی پُرسکون عبارت کو دیکھتے زری اور شمس الرحمٰن آگے بڑھے۔ شیشوں سے روشنیاں جھانک رہی تھیں۔ نزدیک ہی نئی تعمیر شدہ ایک اور عمارت تھی۔ وہ بھی جگمگا رہی تھی۔ لاؤنج آدمیوں سے پُر تھا۔ بنچیں بھی بھری ہوئی تھیں۔ مسافروں میں اور ایئرپورٹ پر کام کرنے والوں کے سانولے سلونے چہرے الگ پہچانے جاتے تھے۔ سب چہروں پر جو ناک نقشے کے لحاظ سے ایک دوسرے سے بہت مختلف تھے، اس علاقے کی اپنی ایک چھاپ تھی۔

شمس الرحمٰن اور زری سامان لے کر عمارت سے باہر نکلنے ہی والے تھے کہ ایک چھوٹے سے لڑکے نے شمس الرحمٰن کو ایک پرچہ دیا۔ زری نے صرف یہ دیکھا کہ اس پرچے پر بنگلہ میں کچھ لکھا ہوا ہے۔ پرچہ پڑھ کر شمس الرحمٰن نے کہا، ''زری تم یہیں ٹھہرو، میں ابھی ایک منٹ میں آتا ہوں۔''

کینٹین کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے شمس الرحمٰن نے دوبارہ پرچے پر نظر ڈالی۔

''میں کینٹین میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ مگر آپ اکیلے ہی آئیں۔''

روبجھو

شمس الرحمٰن اوپر پہنچا تو کھڑکی کے پاس کھڑا ایک لڑکا آگے بڑھا اور اس سے لپٹ گیا: ''شمسو بھائی! سلام علیکم!'' اس نے کہا۔

شمس الرحمٰن روبجھو سے گلے ملا اور پھر اسے سامنے کھڑا کر کے غور سے دیکھا۔ اس کا قد شمس

الرحمٰن ہی کی طرح لمبا تھا۔ رنگ بھی تقریباً ویسا ہی تھا لیکن مستقل طور پر مشرقی پاکستان میں رہنے کی وجہ سے زیادہ سانولا نظر آتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں ایک پُراسرار اور پُرغروری سی چمک تھی جس کی وجہ سے وہ کبھی بہت ذہین نظر آتا تھا اور کبھی تیز و چالاک۔

''بہت بڑے ہوگئے ہو تم!'' شمس الرحمٰن نے خوش ہوکر کہا۔ آج بہت دن بعد وہ بے تکان بنگلہ بول رہا تھا (ورنہ زری کے ساتھ اسے بڑے سنبھل سنبھل کے بولنی پڑتی تھی، تاکہ وہ سمجھ سکے)۔

''آدمی وقت کے ساتھ بڑا ہی تو ہوتا ہے۔'' روبنجھو نے سفید سفید دانت نکال کر کہا۔ اس کی آنکھوں کی پراسرار چمک کچھ اور بھی بڑھ گئی تھی۔ ''آیئے چائے پییں۔''

''تمھاری بھابی نیچے اکیلی ہیں۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''اچھا، تو وہ میری بھابی ہیں؟ــــ روبنجھو کے لہجے کی جھنکار دھما دھم کئی سیڑھیاں نیچے اتر گئی۔

''آپ نے خط میں نہیں لکھا۔'' آخری جملے میں شکایت نہیں مایوسی تھی۔

''میں تمھیں سرپرائز دینا چاہتا تھا۔'' شمس الرحمٰن کا لہجہ اب تک خوش گوار تھا۔ شاید اس نے روبنجھو کی مایوسی کو محسوس ہی نہیں کیا تھا۔

''سرپرائز تو اچھی چیزوں کا ہوتا ہے۔'' روبنجھو کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ شمس الرحمٰن نے دیکھا کہ اس کا چہرہ اُترا ہوا ہے۔ وہ کچھ شرمندہ بھی تھا مگر اس نے معذرت نہیں کی۔

یک لخت ساری بات شمس الرحمٰن کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے قدرے غصے سے کہا، ''جب میں نے اس سے شادی کی ہے تو وہ یقیناً اچھی ہوگی، تمھیں اس میں شک کیسے ہوا۔''

''آئی ایم سوری۔'' روبنجھو نے کہا۔ مگر اس کے انداز میں افسوس یا شرمساری کے کوئی آثار نہ تھے۔

''میں ان سے نہیں مل سکتا، اور شاید آپ وہاں نہ ٹھہرسکیں جہاں میں نے انتظام کیا تھا۔''

''میرے ٹھہرنے کی تم فکر نہ کرو، مگر مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم اتنے متعصب ہو۔'' شمس الرحمٰن نے جان بوجھ کر اپنا لہجہ کڑوا بنائے رکھا۔ وہ اپنا بڑا بھائی ہونے کا حق جتانا چاہتا تھا۔

''ابھی تو آپ کو اور بھی بہت کچھ معلوم ہوگا۔ ہزاروں میل دور بیٹھا آدمی بہت سی باتوں سے لاعلم ہوتا ہے۔'' روبنجھو کے پراسرار لہجے میں اب صاف طنز جھلک رہا تھا۔ ''شاید آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ قومی یک جہتی کی کاؤنسل میں کام کرنا اب کوئی فخر کی بات نہیں ــــ''

''اچھا! ــــ کیوں؟''

''یہی تو بتا رہا ہوں کہ آپ کو بہت سی نئی باتیں معلوم ہوں گی۔ بہت سی باتیں عجیب لگیں گی، مگر صورتِ حال ایسی ہی ہے۔''

''صورتِ حال کیسی بھی ہو، ایک بات جان لو کہ تم اپنی بھابی سے کوئی واسطہ نہیں رکھنا چاہتے تو مجھ سے بھی کوئی تعلق نہ رکھ سکو گے۔''

''جیسی آپ کی مرضی — میں یونی ورسٹی میں اقبال ہال میں رہتا ہوں، اگر کبھی میری ضرورت محسوس ہو تو — '' رونجھو نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ دونوں کے درمیان ناگوار سی خاموشی چھا گئی۔ خاموشی کا یہ وقفہ طویل ہونے سے پہلے شمس الرحمٰن نے کہا، ''اچھا خدا حافظ۔'' اور تیزی سے جانے کے لیے مڑا۔

اسی وقت رونجھو کی آواز آئی، ''شائستہ آپا سے ملنا ہوا تھا۔ آپ کے بارے میں پوچھ رہی تھیں۔''

شمس الرحمٰن کے قدم ٹھٹکے۔ دماغ میں گھنٹی سی بجی۔ کتنے سوال ایک نام کے ساتھ ابھرے، مگر رونجھو سے گفتگو کے دوران جو کڑواہٹ اس کے دل و دماغ میں بھر گئی تھی، اس میں پلٹ کر دیکھنا اور کچھ پوچھنا اسے گوارا نہ ہوا۔ وہ تیزی سے سیڑھیاں اتر گیا۔

زری سامان کے ساتھ حیران پریشان کھڑی تھی۔ شمس الرحمٰن اسے تنہا چھوڑنے پر شرمندہ سا ہوگیا۔ ''رونجھو تھا۔ وہ تمھارے سامنے آنا نہیں چاہتا تھا، میں نے اس سے کہہ دیا ہے کہ اس صورت میں اس کا اور میرا کوئی تعلق نہیں رہ سکتا۔''

زری کا چہرہ اُتر گیا۔ ''تو نوبت یہاں تک پہنچی کہ میرے شوہر کا بھائی میری صورت دیکھنے کا روادار نہیں ہے۔''

''غم کرنے کی ضرورت نہیں۔'' شمس الرحمٰن نے تسلی دی۔ ''ہم کبھی نزدیک نہیں رہے — وہ میرا سگا بھائی بھی نہیں ہے۔ ہوسکتا ہے وہ مجھ سے کوئی تعلق نہ رکھنے کے لیے تمھاری آڑ لے رہا ہو۔ آؤ چلیں۔''

''ہوسکتا ہے۔'' زری نے بھی تنکے کا سہارا لیا۔ خدا معلوم اس کا دل بجھا کیوں جا رہا تھا۔

زری اور شمس الرحمٰن دونوں کے محکمے کے چند لوگ انھیں لینے آئے ہوئے تھے۔ ''آج پورے شہر میں ہڑتال تھی۔'' ان میں سے ایک نے اطلاع دی۔ ''شام کو ہڑتال تو ختم ہوگئی، پھر بھی ہم احتیاطاً کالے جھنڈے گاڑی پر لگا کر آپ کو لینے آئے ہیں۔''

زری کا تبادلہ محکمۂ سیاحت میں ہوا تھا۔ لیکن ان دنوں وہ شمس الرحمٰن کی قومی کاؤنسل برائے یک جہتی کے لیے بڑے شد و مد سے کام کر رہی تھی۔ شمس الرحمٰن اور زری مل کر اخباروں کے لیے مضامین لکھتے اور ایک دوسرے کی مدد سے اردو اور بنگلہ میں ایسی چیزوں کا ترجمہ کرتے جو یک جہتی کے کام میں معاون ہو سکیں۔ زری اکثر اس سلسلے میں ریڈیو اور ٹی وی پر تقریریں کرتی تھی لیکن شمس الرحمٰن محسوس کر رہا تھا کہ اس کے محکمے کے لوگ، صحافی اور یونی ورسٹی کے لیکچرار اس سے یوں باتیں کرتے ہیں جیسے وہ اصحابِ کہف میں سے ہو۔ ایک صدی پہلے کے گزرے ہوئے وقت میں کھونے کے بعد دوبارہ نکل آیا ہو۔ اس پر ترس کھا کر وہ بتانا چاہتے تھے کہ دنیا بہت آگے نکل گئی ہے، اس کی جیب کے سکّے اب متروک ہو چکے ہیں، تب ایئر پورٹ پر رونجھو کی کہی ہوئی بات کا رمز کچھ کچھ اس پر کھلتا تھا کہ ''ابھی تو آپ کو بہت کچھ معلوم ہوگا، ہزاروں میل دور بیٹھے آدمی کو کیا معلوم ہوتا ہے۔''

شمس الرحمٰن کو اکثر اپنی میز پر انگریزی اور بنگلہ زبان کے ایسے کتابچے رکھے ہوئے ملتے تھے جو ماضی میں مختلف اوقات میں پاکستان میں تقسیم کیے گئے تھے۔ اس میں ۱۹۶۵ء کی ہندوستان سے جنگ کے دوران صدر ایوب کی حکومت کے خلاف پروپیگنڈہ، شیخ مجیب الرحمٰن کی گرفتاری کے بعد عام ہڑتال کے دوران جھڑپوں میں مرنے والوں اور زخمیوں کی سیکڑوں تک پہنچتی تعداد کا ذکر، چھ نکات کی وضاحت، اعداد و شمار کے ساتھ مغربی اور مشرقی پاکستان کی اقتصادی حالت کا موازنہ، کہیں دونوں جگہوں کی قیمتوں کا فرق، اور کہیں سرکاری اور فوجی ملازمتوں کے تفاوت کا ذکر تھا۔ ڈھاکا کا رسالہ

''شگھا'' اور کلکتہ کا ''سوگات'' سرکاری طور پر یہاں نہیں رکھے جاسکتے تھے، لیکن عملہ اکثر اس کی کاپیاں پڑھتا نظر آتا تھا۔

اُن کتابچوں کو شمس کبھی پڑھتا اور کبھی یوں ہی ردّی کی ٹوکری میں ڈال دیتا — اس سلسلے میں وہ کسی قسم کی سختی نہیں کرنا چاہتا تھا مگر اس موضوع پر بات کرنا چاہتا تھا۔ اس کے عملے کے لوگ کھل کر بات کرتے ہوئے کتراتے تھے۔ شاید یہاں کے لوگ اسے اعتماد میں لینا نہیں چاہتے تھے کیوں کہ وہ اب تک یک جہتی کا قائل تھا، جب کہ مشرقی پاکستان کی نئی نسل کو یک جہتی سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ جب بھی وہ اس سلسلے میں کوئی بڑا اور سنجیدہ قدم اٹھانا چاہتا تو وہ معاملہ عدم تعاون کا شکار ہو جاتا۔ پیٹھ پیچھے یوں باتیں ہوتیں جیسے وہ گھسا پٹا لطیفہ دُہرا رہا ہو۔

اس کے ساتھی چاہتے تھے کہ یک جہتی کا ؤنسل فرخ احمد کے ایسے قومی ترانوں کی جگہ جو اردو اور بنگلہ رسم الخط میں بغیر تبدیلی کے لکھے جاسکیں، بنگلہ میں ٹھوس کام پر زور دے۔ علامہ اقبال کی کتابوں اور مرقعِ چغتائی کے معیار کی کتابیں چھاپی جائیں۔ بنگالی ثقافت کو اجاگر کرنے کے لیے مرکز سے باقاعدہ جنگ کی جائے ورنہ اس ادارے کو بند کر دیا جائے کہ اردو کی کتابوں کی ترویج ان کے 'کاز' کو نقصان پہنچا رہی تھی۔

ابتدا میں شمس الرحمٰن نے سمجھا کہ یہ وہی روایت اور جدیدیت کی ٹکر ہے جو پاکستان بننے سے پہلے سے چل رہی تھی لیکن جلد ہی اسے احساس ہوا کہ بات کچھ اور آگے بڑھ چکی ہے۔ کچے ذہنوں میں حقارت اور نفرت کے بیج بوئے جا چکے تھے۔ کشتی میں سوراخ ہو جائے تو کشتی کو درست کرنا بہتر ہے کہ نئی کشتی میں سوار ہو جانا۔ ساتھی اسے اس انداز میں سوچنے کی تلقین کرتے تھے۔

بینو چپ چاپ بالکنی میں کھڑی تھی۔ ناریل کے درخت کے لمبے لمبے مورچھل ریلنگ سے لگ کر پھڑ پھڑا رہے تھے۔ ذرا دور تالاب کے سبز پانی کے کنارے حسبِ معمول چند بوڑھی عورتیں کپڑوں سمیت ڈبکیاں لگا رہی تھیں۔ دوسرے کنارے پر چند بچے تیر رہے تھے۔ بینو نے بارش سے بوجھل خوش گوار ہوا کو اپنے ننگے بازوؤں پر محسوس کیا اور اندر ہونے والی گفتگو پر کان لگائے۔ آج پہلی مرتبہ اس کی دوست پتل اس کے پاس نہیں تھی بلکہ بڑے بوڑھوں میں بیٹھی بھائی کا رشتہ لانے کی رسم نبھانے کی کوشش کر رہی تھی۔

سامنے افق پر بادلوں کے پرے تیرتے ہوئے جا رہے تھے۔ بینو کے ذہن کے سامنے سے کچھ مناظر یوں لپاک جھپاک گزرے جیسے چلتی ٹرین سے بجلی کے تاروں پر لٹکتے بارش کے قطرے، یا لمبی دموں والی کالی چڑیاں دکھائی دیتی ہیں اور غائب ہو جاتی ہیں۔ یونی ورسٹی کا آخری دن تھا۔ ہلڑ بازی ہو رہی تھی۔ موتیا، قادر، بینا چودھری اور وینا حق لڑکیوں میں پیش پیش تھیں۔ آج اسے امی نے یونی ورسٹی آنے سے منع کیا تھا کہ تم موئے ہندوؤں کی طرح کیچڑ میں رنگ گھول کر ایک دوسرے پر پھینکو گے۔ وہ اس بات پر بگڑی تھی کہ اس کی امی ہر بات کو کھینچ تان کر موئے ہندوؤں تک لے جاتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں، مٹی کی محبت بھی تم لوگوں نے ہندوؤں سے سیکھی ہے۔ مسلمان دھرتی کو ماتا واتا نہیں مانتا۔ امی کی مخالفت کے باوجود وہ آ گئی تھی۔ مگر اب چند لڑکیوں کے ساتھ بڑ تلے کھڑی تماشا دیکھ رہی تھی۔ مودھو کینٹین سے ایک لڑکا نکلا اور اسے ایک پرچہ تھماتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ کیچڑ بھرے

ہاتھ سے جلد جلد کسی نے ٹیگور کی نظم بنگلہ میں گھسیٹی تھی۔

''وہ بچہ جو شاہزادوں کا لباس پہنے، جس کی گردن کے گرد مالائیں لپٹی ہوں، کھیل کا کیا لطف اٹھا سکتا ہے۔

ماں!— شاہانہ پوشش کی یہ بندشیں، ان کا کوئی فائدہ نہیں۔

یہ صحت مند مٹی سے آدمی کو دور رکھتی ہیں۔

زندگی کے میلے ٹھیلوں اور ہنگاموں میں شام ہونے سے روکتی ہیں۔''

ذرا دیر بعد اکرام الحق کو اپنی طرف آتے دیکھ کر اس نے درخت کی آڑ میں ہونے کی کوشش کی ۔وہ سمجھ گئی تھی کہ یہ طنزیہ اکرام ہی کی طرف سے آیا ہے۔

''تم ہر چیز میں شریک ہوتی ہو تو اس میں حصہ کیوں نہیں لیتیں؟'' نزدیک آ کر اکرام الحق نے کہا۔

''بس ویسے ہی آمی لجا پائی۔'' بینو نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

''تمھیں دیس کی مٹی سے کھیلتے شرم آتی ہے، گھن آتی ہے۔ تم بھی بہاریوں کی طرح اپنے آپ کو بڑا سمجھتی ہو۔''

بینو چونک پڑی۔ کیا اکرام الحق واقعی نہیں جانتا کہ وہ بنگالن نہیں ہے۔ اکرام نے ہاتھ پکڑ کر اسے گھسیٹا۔ تب بینو نے جلدی سے ہاتھ چھڑا کر کہا، ''اکرام، میں تمھیں بتانا چاہتی ہوں کہ میرے ابو اور امی بنگالی نہیں ہیں۔'' اکرام کی آنکھوں میں ایک کٹھور سی حیرت دیکھ کر اس نے کہا، ''مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، میں تم لوگوں کے ساتھ ہوں۔''

بڑے درخت پر کوئی پرندہ پھڑ پھڑایا۔ اکرام جو اب تک حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا، ہوش میں آیا۔ اس نے جھک کر تھالے سے تھوڑی سی مٹی اٹھائی اور بینو کے ہاتھ میں دے دی۔ ''بولو، ماٹی چھوئے بولتے چھی'' (مٹی کی قسم کھا کر کہتی ہوں)۔ بینو نے دُہرایا۔ ''ماٹی چھوئے بولتے چھی۔''

''کہ میں اس دیس کو ہمیشہ دیس سمجھوں گی، یہیں جیوں گی اور یہیں مروں گی، اور وہی کروں گی جس میں اس کی بھلائی ہوگی۔''

''یہ بھی کوئی کہنے کی بات ہے— یہ تو ظاہر ہے۔'' بینو نے کہا۔

''اقرار کر لینے میں کوئی حرج ہے؟'' اکرام الحق نے برا مانا۔

بینو نے اس کے الفاظ دُہرائے تو اس نے اضافہ کیا۔ ''میں اکرام الحق سے محبت کرتی ہوں اور اس سے شادی کا وعدہ کرتی ہوں۔''

بڑ کے پتوں میں کسی پرندے نے شرارت سے سیٹی بجائی یا شاید کوئی لڑکا تھا۔ بینو نے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

''آج کے لیے کافی سبق ہوگیا، باقی آئندہ۔''

اکرام الحق کی سنجیدہ صورت دیکھ کر وہ گھبرا گئی، لگا جیسے اس نے ذرا ردّوکد کی تو وہ سیدھا صدر گھاٹ جا کر بوڑھی گنگا میں کود جائے گا۔ بینو نے اپنے دل میں جھانکا۔ وہاں اقرار موجود تھا۔ بات صرف زبان کے 'ہاں' کی تھی۔ چناں چہ بینو نے اکرام الحق کے الفاظ دہرائے۔

لیکن آج مسزحق سے رشتے کی بات سن کر اس کی امّی جیسے پتھر کی ہوگئی تھیں۔ انھوں نے خالص بنگالی جاتی میں رشتہ کرنے کی بات کبھی سوچی بھی نہیں تھی۔ اکرام الحق کے والد چاٹگام کے قریب ایک گاؤں کے رہنے والے تھے۔ ابتدا میں چند سال وہ بھی چاٹگام میں رہی تھیں اور وہاں کے لوگوں کو بطورِ خاص ناپسند کرتی تھیں۔ بڑے دیہاتی گنوار — عورتیں بُرقع اوڑھ کر چھتری لے کر نکلتی ہیں۔ مرد پردہ کراتے چلاّتے جاتے ہیں۔ اپنے گھروں میں عورتوں کو ساری کے نیچے بلاؤز تک پہننے کی تمیز نہیں۔ گھروں کے سامنے تالابوں میں نہاتی ہیں، وہیں سے پینے کے لیے گھڑے بھرے جاتے ہیں، وہیں لڑکے کھڑے مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ کیا وہ اپنی بچی کی قسمت ان گندے ملیچھوں میں پھوڑیں گی۔ ان کی صورت دیکھ کر مرزا صاحب جلدی سے درمیان میں آئے اور جواب کے لیے چند دن کی مہلت مانگ لی۔

مہمانوں کے جاتے ہی بیگم مرزا پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ وہی ساری باتیں جو چند منٹ پیشتر ان کے ذہن میں گردش کر رہی تھیں، بین کے انداز میں ان کے منھ سے نکلنے لگیں۔ مرزا صاحب کچھ دیر تو سنتے رہے، پھر جھلاّ گئے۔

''بس بس رہنے دو — ساری نفاست تم ہی لوگ کا حصّہ ہے۔ اتنی سی بات تمھاری سمجھ میں نہیں آتی کہ اپنے ہاں کے کھاتے پیتے طبقے کا مقابلہ وہاں کے غریب گاؤں والوں سے کرتی ہو۔ کیا تمھارے ہاں کے دیہاتوں کا معیارِ زندگی وہی ہے، جو تمھارا ہے۔ مجھے بتاؤ کہ تم میں اور بیگم حق میں کیا فرق ہے؟''

مرزا صاحب نے سدا بیوی کو ہتھیلی کا پھپھولا بنا کر رکھا تھا۔ آج تو پہلے ہی غم سے نڈھال تھیں، اونچی آواز میں بولے تو ان پر دورہ پڑ گیا۔ روتے روتے ان کے دانت بھنچ گئے — غم سا غم — ایک کالی کلوٹی ٹھگنی سی عورت کا مقابلہ کر کے کہہ دیا کہ تم میں اور اس میں کیا فرق ہے۔ بینو سب کچھ سنتی رہی اور خاموشی سے بالکنی میں کھڑی رہی۔ اس کے جانے سے صورتِ حال بگڑ جانے کا اندیشہ تھا۔ سیلاب کا پہلا ریلا ہے۔ یوں ہی بہہ جائے تو اچھا ہے۔ اس نے سوچا۔

جس دن سے بیگم مرزا کی بہن بیگم احسن اور بچیاں شیزی اور نیلی لاہور سے آئی تھیں، اس دن سے

بیگم مرزا، سورج، الیاس اور بینو کو اٹھتے بیٹھتے ڈانٹتی تھیں۔ الیاس کو سورج سے بانسری سیکھتا دیکھتیں تو غضب ناک ہو جاتیں۔ ''سورج کے منھ سے بانسری نکال کر منھ میں لگا لیتے ہو، تمھیں گھن نہیں آتی۔''

ان کو وہم تھا کہ بینو کے سنولا جانے میں اس صوبے کی آب و ہوا کی سازش تھی، ورنہ وہ بھی شیزی اور نیلی کی طرح گوہرِ آب دار ہوتی۔ اب انھوں نے بہت سنجیدگی سے مغربی پاکستان چلے جانے کے بارے میں سوچنا شروع کر دیا تھا۔

مرزا صاحب دفتر جانے کے لیے تیار ہو کر نکلے تو بیگم مرزا نے ہاتھ پھیلا دیا، ''لاؤ شاپنگ کے لیے پیسے دو۔''

''ارے بھئی، تمھارا اکاؤنٹ موجود ہے، جتنے چاہو، نکلوالو۔''

''نہیں مجھے نقد چاہییں، اب کون چیک لکھتا پھرے۔''

''بس اب تم ثروت کو بھی خراب کروگی۔ صبح ہوئی نہیں کہ شاپنگ شروع۔ روز دو تین بجے تک شاپنگ ہوتی ہے ان کی۔'' آخری جملہ انھوں نے اپنی سالی بیگم احسن کو مخاطب کر کے کہا۔ مگر اس میں شکایت نہیں تھی، جیسے انھیں اس عادت سے سمجھوتا کیے بھی ایک عمر ہو چکی ہو۔

''تو اور کیا کروں؟'' بیگم مرزا بولیں۔ ''مہیلا پریسد کے جلسوں میں حلق پھاڑ پھاڑ کر چلاؤں۔''

''ہاں ہاں اور کیا۔ ان کو بھی شکایت ہے کہ غیر بنگالی عورتیں ہماری انجمن کی ممبر نہیں بنتیں۔ وہ عورتوں کے تحفظ کے سلسلے میں جلوس نکالنے والی ہیں، تم بھی اس میں شرکت کرو۔''

''رہنے دو۔ میں جلوسوں میں ماری ماری نہیں پھر سکتی، مجھے اپنے حق کا تحفظ کرنا آتا ہے۔''

''تمھارا تو حق ہی صرف ایک ہے، شاپنگ کے لیے پیسے، یہ لو۔'' مرزا صاحب نے مختصر سی ایک گڈی بیوی کے ہاتھ پر رکھ دی۔

''یہ کیا دے رہے ہو۔'' بیگم مرزا بگڑ کر بولیں، ''بچیاں لاہور سے آئی ہیں، ان کے لیے کچھ خریدوں گی۔''

''بچیوں کی پسند کی چیزیں دیکھ لو، پھر کسی دن چل کر خرید دیں گے۔'' مرزا صاحب نے کہا۔

''نہ دو پیسے، ایک ایک دکان دار مجھے جانتا ہے، چاہوں تو بیس پچیس ہزار کا سامان کھڑے کھڑے خرید لاؤں۔ پیسے تو تمھیں ہی بھرنے پڑیں گے۔''

''عورتیں جو کچھ بھی کریں، بھرنا تو آخر مردوں کو ہی پڑتا ہے۔ کیوں ثروت!''

''جی ہاں بھائی جان! ہم تو کہتے ہیں کہ مردوں کو ٹھیک رکھنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ سر سہلاؤ، بھیجا کھاؤ۔''

''تم نے احسن کا سارا بھیجا کھالیا یا کچھ رہ گیا ہے؟'' مرزا صاحب ہنسے۔

''تھا ہی کہاں بھائی جان!'' بیگم احسن نے کہا۔

''دیکھو دیکھو، یہ تمھاری بہن کتنی گستاخ ہوگئی ہے، اب بچیاں بڑی ہو رہی ہیں نا۔ پہلے میرے سامنے بولتی تک نہیں تھی۔'' مرزا صاحب بیوی سے مخاطب ہوئے۔

''خوب بولتی تھی۔ نہ بولے تو تم خود اکساتے ہو، تم نے تو اپنے بچوں تک کو شیر بنا دیا ہے۔ بینو کو دیکھو، کسی کے کہنے ہی میں نہیں۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ جاؤ تم شاپنگ کر آؤ۔'' انھوں نے جیب سے ایک اور گڈی نکال کر بیگم کے ہاتھ پر رکھی۔ ''ہاں بھئی سورج ناشتا۔''

''ناشتا میز پر رکھا ہے شاب۔'' سورج نے کہا۔

''بینو کہاں ہے؟''

''یونی ورسٹی گئی ہوگی۔ جس دن یونی ورسٹی نہ جائے، شاید اس کے لیے قیامت ہی کا دن ہوگا۔'' بیگم مرزا نے تلخی سے کہا۔

''آؤ بھئی ناشتا کرو — شیزی اور نیلی بیٹی کو بلاؤ۔''

بیگم احسن نے دیکھا کہ ناشتے میں رات کا تمام کھانا مع بھات کے رکھا ہے۔ اس کے علاوہ پوریاں، پراٹھے، ڈبل روٹی اور انڈے بھی تھے۔ انسان کس طرح اسی علاقے کے رنگ میں رنگا جاتا ہے جہاں وہ رہتا ہے۔ دونوں وقت بھات، پچیندے، پل ول کی بھجیا اور پتلی پانی ایسی دال بھلا کب ہم لوگوں سے کھائی جا سکتی تھی۔

مرزا صاحب چلے گئے تو بیگم مرزا اپنی بہن اور بھانجیوں کو دوسری کار میں لے کر نیو مارکیٹ جانے کے لیے نکلیں۔ زیادہ خرید و فروخت کی وجہ سے سارے دکان دار انھیں جانتے تھے۔ مغربی پاکستان سے آنے والوں کی اکثر فرمائشی شاپنگ بھی ان کے ہاتھوں ہوتی تھی اس لیے دکان دار ان کا لحاظ بھی کرتے تھے۔ اپنے بھاری بھرکم بدن کے ساتھ ہانپتی کانپتی وہ کپڑوں کی ایک دکان میں جا کر

بیٹھ گئیں۔ دکان دار نے فوراً سب کے لیے کوکا کولا منگوایا۔ بیگم مرزا نے جامدانی، کانجی ورم، راج شاہی سلک کی پچاسوں ساریاں نکلوائیں، کھلوائیں، قیمت پوچھی اور چھوڑ دیں۔ بیگم احسن نے کہا کہ جانے دیجیے، جب خریدنی ہوں گی تب دیکھیں گے۔ وہ ان کا ہاتھ دبا کر کہتی رہیں، ''ارے دیکھ لو، یہ لوگ بڑے شوق سے دکھاتے ہیں۔'' پھر انھوں نے پینترا بدلا۔

''اچھا، قالین خریدو گی، بڑے اچھے قالین آئے ہوئے ہیں جوٹ کے بنے ہوئے، بہت سستے ہیں۔''

''مگر قالین جائیں گے کیسے؟''

''سب چلے جائیں گے۔ آئے دن مغربی پاکستان سے فرمائشیں آتی رہتی ہیں۔ ارے بھئی، کراکری، کٹلری، ڈنر سیٹ، قالین، فرنیچر، کاریں، کیا چیز ہے جو یہاں سے نہیں جاتی۔ یہاں چیزیں سستی ملتی ہیں خریدنے والا کوئی ہے نہیں سوائے ہم دو چار مغربی پاکستانیوں کے۔''

''تو اتنا سامان منگواتے کیوں ہیں؟'' بیگم احسن نے پوچھا۔

''ارے بھئی وہی برابری — ہر چیز میں مغربی پاکستانیوں کی ریس کرتے ہیں۔ وہی مثل ہے، سدا نہ سوئے بوریے اور سپنے آئی کھاٹ۔''

''ہاں آنٹی، اتنی خوب صورت جگہ کی سیر تو کروائی نہیں آپ نے۔'' نیلی نے کہا۔

''اچھا چلو، لڑکیاں بور ہوگئیں۔ ان کو رشو گلے دلوائیں اور سیر کے لیے چلیں۔''

کئی درجن منشی گنج کے کیلے، ساور اور شنگی کے کٹھل اور ڈاب سے گاڑی بھری جا رہی تھی کہ یکایک کچھ فاصلے پر دھماکے کی آواز آئی۔ ڈھاکا کالج کی طرف سے گاڑھا گاڑھا دھواں اٹھ کر آسمان کے بادلوں سے ملنے لگا۔ دکان داروں نے کھٹا کھٹ دکانیں بند کرنی شروع کیں۔ ایک دکان کا بنگالی لڑکا بھاگا ہوا آیا۔'' ''اماں! دکان کے اندر آ جائیے۔ باہر کھترہ ہے، ہنگامہ ہو رہا ہے۔''

بیگم مرزا نے بہن کی طرف دیکھا۔ بیگم احسن کا رنگ فق تھا، انھوں نے آنکھ کے اشارے سے انکار کیا۔ بیگم مرزا نے ڈرائیور سے پوچھا۔

''شاہین! کسی دوسری طرف سے نکال کر لے جا سکتے ہو؟''

''ہاں بیٹھیے، میں دوسری طرف سے نکال لوں گا۔''

دکان دار لڑکا واپس چلا گیا۔ لوٹتے لوٹتے اس نے بیگم احسن کو کہتے سنا، ''دکان میں جانا ٹھیک نہیں تھا۔ ان بنگالیوں کا کیا اعتبار۔'' لڑکے نے پلٹ کر غصے سے دیکھا۔ کچھ کہنا چاہتا تھا مگر ان کو متوجہ نہ پا کر چپ چاپ چلا گیا۔ کسی نے اس کی طرف دھیان نہیں دیا۔ سب جلدی جلدی گاڑی میں

بیٹھنے میں مصروف تھے۔ ڈرائیور نے گاڑی موڑ لی۔

''لال باغ قلعے لے چلو۔'' بیگم مرزا نے کہا۔

عظیم پورہ کے پاس عورتوں کا ایک جلوس ملا۔ سفید کنی دار ساریوں میں ملبوس، بالوں کے سادہ سے جوڑے بنائے معمر عورتوں کے سر ڈھکے ہوئے تھے اور چہروں پر بردباری تھی، جوان نسل ننگے سر تھی۔ ان کے ہاتھوں میں بنگلہ میں لکھے ہوئے پلے کارڈ، چہروں پر عزم، آنکھوں میں جوش اور ولولے کی چمک تھی۔

''آنٹی! ان کارڈوں پر کیا لکھا ہے؟'' نیلی نے پوچھا۔

''خدا خبر بیٹی، بنگلہ پڑھنا مجھے آتی نہیں، البتہ سمجھ لیتی ہوں۔''

''اتنے سالوں میں آپ نے بنگلہ پڑھنی بھی نہیں سیکھی آنٹی!'' شیزی نے کہا۔

''نہیں، بوڑھے توتے بھی کہیں پڑھتے ہیں، اور مجھے کیا ضرورت تھی پڑھنے کی۔ ابھی کل تو یہ سب بڑے شوق سے اردو پڑھتے تھے، نوکر تک صاف اردو بولتے تھے۔ اب خدا جانے کیسے دماغ اوندھ گیا ہے۔ کہتیہیں ہم سے ہماری زبان میں بات کرو۔''

''ٹھیک تو ہے۔ وہ اردو جانتے ہیں تو ہمیں بھی بنگلہ آنی چاہیے۔'' شیزی نے کہا۔

''واہ، یہ اچھی دھونس ہے۔'' بیگم مرزا بگڑیں۔

''آنٹی آہستہ بولیے۔'' نیلی نے سرگوشی کی اور ڈرائیور کی طرف اشارہ کیا۔

''ارے میں کیا ڈرتی ہوں ان دو ٹکے کے لوگوں سے۔'' بیگم مرزا ہنکاریں۔ ''سنا شاپن! ذرا جلوس سے بچا کر گاڑی لے چلو۔''

''اچھا بیگم شاب۔'' ڈرائیور نے موڑ کاٹا اور گاڑی کا راستہ بدل دیا۔

بینو یونی ورسٹی سے جلد لوٹ آئی۔ گھر میں نوکروں کے سوا کوئی نہ تھا۔ اس نے سورج سے پوچھا کہ سب لوگ کہاں ہیں۔ وہ ملازموں سے ہمیشہ بنگلہ میں بات کرتی تھی۔

''مہمان اماں کے ساتھ بازار گئے ہیں۔'' سورج نے کہا، ''الیاس بھائی اپنے اسکول گئے ہیں۔''

''کچھ کھانے کو ہے؟'' بینو نے بید کے مونڈھے پر بیٹھ کر پاؤں ایک اسٹول پر ٹکائے۔

''کھانا تیار ہے۔'' سورج نے کہا۔

''نہیں بھئی، کھانا تو مہمانوں کے ساتھ ہی کھانا پڑے گا۔''

''انارش لاؤں؟''

''کہاں سے آیا؟ ابھی تو موسم نہیں۔'' بینو نے پلٹ کر پوچھا۔

''کوئی صاحب سلہٹ سے آئے تھے، تحفے میں لائے ہیں۔'' سورج نے بتایا۔

''اچھا لاؤ۔'' بینو نے پاکستان آبزرور اٹھا کر پڑھنا شروع کیا۔

سورج نے اناس کے قتلے کاٹے۔ ان پر نمک مرچ چھڑک کر بینو کے آگے لا رکھے۔ ''بینو آپا!— بوئی نی اے آشبو، آپنی ایکھن پوڑا بین؟''

''ہاں لاؤ، ابھی وقت ہے، تمھیں پڑھا دوں۔ وہاں برآمدے میں بیٹھیں گے۔'' یہ اس کی پسندیدہ جگہ تھی۔ یہیں تخت پر بیٹھ کر وہ روز ستار پر ریاض کیا کرتی تھی۔

وہ برآمدے میں بیٹھ گئی۔ باغ کے کنارے پر تاڑ اور سپاری کے درخت ہوا سے دھیرے

دھیرے ہل رہے تھے۔ تاڑ کے درخت پر ایک لمبا تاڑ کے قد برابر بانس لگا ہوا تھا اور پتوں کے پاس ایک ہانڈی میں رس جمع ہو رہا تھا۔ سامنے باغ کے حوض میں کنول کے پھول تیر رہے تھے۔ اس وقت فوارہ بند تھا مگر نل میں سے ٹپ ٹپ پانی ٹپک رہا تھا جس سے حوض میں چھوٹی چھوٹی لہریں پھیل کر کناروں تک پہنچ رہی تھیں۔ بینو نے بے خیالی میں اپنے جوڑے کی پنیں نکالیں اور لانبے سیاہ بالوں کو جھٹکا۔ اپنے بالوں کو خاص ادا سے جھٹکتے رہنا اس کا محبوب مشغلہ تھا۔

سورج اپنی کتاب لے آیا اور اس کے نزدیک شیتل پاٹی پر بیٹھ کر کتاب کھول لی۔ وہ بینو سے انگریزی کا درس لیا کرتا تھا۔ الیاس کی پرانی کتاب میں سے سبق دینے اور کاپی پر مشق کے لیے چند الفاظ دینے کے بعد وہ کتاب الٹ پلٹ کر دیکھتی رہی کہیں سمندر میں چٹانیں تھیں، کہیں سمندری بگلے اڑ رہے تھے، کہیں کالی گھٹاؤں اور طوفان کے آثار تھے۔ سورج کو تن دہی سے انگریزی الفاظ لکھتے دیکھ کر وہ سوچنے لگی، کہاں کا آدمی کہاں جا پہنچتا ہے۔ یہ سورج میاں سندیپ جزیرے کے ایک نہایت خوف ناک طوفان کے بعد یہاں آیا تھا۔ اس سال طوفان اور سیلاب سے گنتی کے آدمی بچے تھے۔ شروع میں بینو اور الیاس اکثر اس سے طوفانوں کی داستانیں بڑے شوق سے سنا کرتے تھے۔ وہ بتاتا تھا کہ کس طرح سمندر میں طوفان کی لحظہ بہ لحظہ بڑھتی لہریں بارش اور تیز ہوا کے ساتھ ایک دیوار کی طرح آگے بڑھتی ہیں جیسے کسی قلعے کی فصیل چلی آ رہی ہو، اور ہر چیز کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ ہر چیز تہس نہس ہو جاتی ہے۔ ایسے میں انسان بالکل بے بس ہوتا ہے۔ احتیاطاً لوگ گھروں کی چھتوں یا بانس کی مچانوں پر جا بیٹھتے ہیں۔ لڑکے بالے ناریل کے درختوں پر چڑھ کر خود کو درختوں سے باندھ لیتے ہیں۔ اگر پانی کا زور کم ہو اور ہوا کی رفتار بھی زیادہ نہ ہو تو یہ لوگ بچ جاتے ہیں۔ جھونپڑوں کی چھتوں پر بیٹھے ہوئے آدمی اور جانور رافٹ کی طرح تیرتے رہتے ہیں، ورنہ سو میل فی گھنٹے کی رفتار سے چلنے والی ہوا اور طوفان کے آگے نہ درخت ٹھہرتے ہیں، نہ مچانیں۔ طوفان کے بعد کا منظر بے حد بھیانک ہوتا ہے۔ ہر طرف پانی ہی پانی۔ انسانوں اور جانوروں کی تیرتی ہوئی نعشیں۔ کہیں کہیں خشکی کے لانبے پتلے ٹکڑے رہ جاتے ہیں، جن پر انسان اور جانور پناہ گزیں ہوتے ہیں۔ کوئی درخت ظاہر ہو تو اس پر نعشیں اور مرے ہوئے سانپ لپٹے دکھائی دیتے ہیں۔ کھانے کے لیے ایک دانہ رزق کا اور پینے کے لیے ایک بوند میٹھا پانی نہیں ہوتا۔ امدادی پارٹیاں آتی ہیں اور بچے کھچے لوگوں کو نکال کر لے جاتی ہیں یا ان کے کھانے پینے کا سامان لا کر انھیں دوبارہ بسانے کی کوشش کرتی ہیں۔ کبھی کبھی اجل بادگولوں کی شکل میں حملہ آور ہوتی ہے۔ تیز ہوا کے ایک بڑے بگولے میں پورا جھونپڑا مکینوں اور سامان سمیت چکر کھاتا اوپر چلا جاتا ہے اور پھر کہیں دور دور انسانوں کی نعشیں پڑی ملتی ہیں۔

''آخر لوگ وہاں رہتے کیوں ہیں، ایسی جگہوں کو چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟'' امیؔ ہمیشہ ایک ہی بات کہتی تھیں جس پر سورج انھیں اس طرح دیکھتا تھا جیسے اس کی مالکن چھوٹی سی بے وقوف بچی ہوں۔ وہ انھیں سمجھانے کی کوشش کرتا تھا کہ 'چر' کی جو مین (زمین) نہایت زرخیز ہوتی ہے۔ وہاں مچھلیاں وافر ملتی ہیں۔ جہاں تک موت کا سوال ہے وہ تو ہر جگہ آئے گی، اس سے ڈر کے انسان اپنی 'جو مین' کیسے چھوڑ دے گا؟

''گویا تم لوگ موت کو اہمیت نہیں دیتے۔ آدمی تمھارے نزدیک کیڑا ہے۔ تم خود کیڑوں کی طرح پیدا ہوتے ہو، کیڑوں کی طرح مرتے ہو۔ امی اکثر اس طرح کی باتیں کہہ گزرتی تھیں۔ وہ امی کو ٹوکتی رہ جاتی تھی۔ سورج اپنے سفید سفید دانت نکال کر ہنستا رہتا تھا یا بے حد سفید آنکھوں کے سیاہ ڈھیلے گھما کر حیرت سے ان کی طرف دیکھتا رہتا تھا جو اس کی بات کسی طرح نہیں سمجھتی تھیں۔ ان کا فلسفہ یہ تھا کہ تم لوگ موت کو اہمیت نہیں دیتے اسی لیے روز ہنگامے کرتے ہو، مار کاٹ کرتے ہو اور موت کو اہمیت اس لیے نہیں دیتے کہ آئے دن چاروں طرف لوگ مرتے دیکھتے ہو۔ فطرت تمھارے ساتھ زیادتی کرتی ہے، تم دوسروں کے ساتھ وہی سلوک کرتے ہو۔ بینو، الیاس اور سورج، یہاں کوئی بھی ان کے اس خیال سے متفق نہ تھا۔ مگر یہ ضرور ہے کہ مرنے کی بات سورج بالکل عام لہجے میں کرتا تھا۔ ایک سائیکلون میں چچا، چچی اور ان کے کئی بچے گئے، دوسرے میں اس کے والد اور دو بھائی مرے۔ نوا کھالی میں اس کے ماموں کا گھر مع خاندان کے لوگوں کے اور بھرے اناج سمیت اُڑ گیا۔ آخری سائیکلون میں، جس میں بالآخر اسے نکلنا پڑا، اس کے خاندان کا کوئی شخص بھی نہ بچا سوائے ماں اور ایک بہن کے، جو اپنے بھائی کے پاس کاکس بازار چلی گئی اور وہ روزگار کی تلاش میں ڈھاکا آ گیا۔ اس کی قسمت اچھی ہے جو وہ ان لوگوں میں آ گیا۔ یہ بات وہ بینو اور الیاس سے اکثر کہا کرتا تھا۔ وہ اس گھر پر نہ صرف بھروسا کرتا ہے بلکہ بڑا مان کرتا ہے۔ بینو نے سوچا، امی کو کس بیٹھے انداز میں اماں کہتا ہے جیسے وہ سچ مچ اس کی ماں ہو۔ حالاں کہ امی اکثر اس کے ساتھ زیادتی کرتی ہیں۔ بینو آپا کہتے وقت اس کے منھ سے ڈاب کی شیرینی اور اناس کی خوشبو محسوس ہوتی ہے۔ وہ الیاس کے سے کپڑے پہنے اس کا بھائی لگے نہ لگے، میرا بھائی ضرور لگتا ہے۔ وہ دھیرے سے مسکرائی۔ اس نے سورج کی طرف دیکھا۔ بینو کو محسوس ہوا جیسے سورج کا ذہن کہیں اور ہے۔ وہ پونڈ اور پین لکھنے کی بجائے سامنے حوض پر نگاہیں جمائے کچھ سوچ رہا تھا۔

''تمھارا دھیان کہاں ہے سورج؟'' بینو نے دھیرج سے پوچھا۔

''آپا! ادھر جو سپائی (سپاہی) آیا ہے نا، وہ ہمارے پوکر اور کھال کی بڑی مچھلیوں کو بندوق سے

مارتا ہے، ٹھائیں ـــ اور گھسیٹ کے لے جاتا ہے۔"

"ہمارے اپنے پوکھر کی؟" بینو نے پوچھا۔

"نہیں نہیں، گاؤں کے شب لوگ کی۔ وہ بولتا ہے، دنبہ بکری اور مرغی، شب سپائی لے گیا۔ شب کھا گیا۔"

"اچھا، تم لکھو۔" بینو نے سختی سے کہا۔ دل ہی دل میں وہ پریشان ہو رہی تھی۔ ان سپاہیوں سے اس کا کیا رشتہ ہے؟ کوئی ان کی برائی کرتا ہے تو اس کو الجھن کیوں ہوتی ہے؟ وہ کیوں خلجان میں مبتلا ہو جاتی ہے، جیسے ان کی غلط کاریوں میں اس کا بھی ہاتھ ہو۔ یہ خود مجرمی کی سی کیفیت آخر کیا ہے اور کیوں ہے!؟

اسی وقت کار بیگم مرزا اور مہمانوں کو لے کر لوٹی۔ بیگم مرزا نے سورج کو بینو کے پاس بیٹھے دیکھا تو پارہ ایک دم چڑھ گیا۔ "جاؤ جا کر کھانا رکھواؤ۔ جس کو دیکھو، وہ سیاست دان بن رہا ہے۔ چھ نکات اور گیارہ نکات چلا رہا ہے۔"

سورج اپنی کتابیں لے کر چلا گیا تو بینو نے لہجے کو سنبھالے رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، "سیاسی شعور ہونا کوئی بری بات نہیں ہے امی۔"

"نہ ـــ نہ" بیگم مرزا نے تلخی سے کہا، "تمھارے نزدیک تو یہ مارکاٹ، روز کا سر پھٹول سب جائز ہے۔"

"کچھ سیر و یر بھی کی؟" بینو نے موضوع بدل کر شیزی سے پوچھا۔

"ایک چکر چوک لال باغ اور احسن منزل کا لگایا مگر اچھی طرح تو آپ اور الیاس کے ساتھ جا کر دیکھیں گے۔" شیزی نے کہا۔

"بھئی سیر و یر کا اب زمانہ نہیں، خواہ مخواہ خطرہ مول لینے سے فائدہ۔ کیا معلوم کب کوئی بم پھینک جائے۔" بیگم احسن سخت ہراساں تھیں۔

"آنٹی! خطرے کی کیا بات ہے۔ ذرا سے جلوس سے گھبرا گئیں آپ؟"

"گولیاں چل رہی تھیں، آگ لگی ہوئی تھی۔"

"یہ بھی ہوتا ہی رہتا ہے آنٹی۔ پہلے دن لڑکوں کو زخمی دیکھ کر میں نے رونا شروع کر دیا تو یونی ورسٹی میں میرا خوب مذاق اڑایا گیا تھا۔" بینو نے کہا۔

"ہاں، کیوں نہیں۔ پھٹے ہوئے سر دیکھ کر رونا بری بات ہے، سر پھاڑنا اچھی بات ہے۔" بیگم مرزا نے تلخی سے کہا۔

''امی آپ خوب جانتی ہیں کس کے ڈنڈوں سے کس کے سر پھٹ رہے ہیں۔ پھر ایسی بات کہنے سے فائدہ!'' بینو نے تیزی سے کہا اور پھر بیگم احسن سے گویا ہوئی، ''آنٹی، آپ گھبرائیں نہیں، ایک دفعہ الیکشن ہو گئے تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

''میں نے سنا ہے تم اپنے ابو امی کو مغربی پاکستان چلے جانے کا مشورہ دیتی رہتی ہو۔'' بیگم احسن نے پوچھا۔

''ہاں آنٹی، بہت لوگ جا رہے ہیں، امی کے سارے رشتے دار بھی تو وہیں ہیں۔'' بینو نے کہا۔

''اور تم؟'' بیگم احسن بولیں۔

''میں؟'' بینو حیران سی ہو گئی۔ میرا کیا ذکر ہے، اس نے دل میں سوچا۔ تعجب ہے ان لوگوں کو ابھی تک یہ نہیں معلوم کہ مجھے یہاں کیا خطرہ ہو سکتا ہے۔

''اب تو کوئی دن نہیں جاتا کہ کہیں نہ کہیں ہنگامہ نہ ہو۔'' بیگم مرزا بڑبڑا رہی تھیں۔ ''الیاس اسکول سے لوٹا یا نہیں!''

''جی آ گئے، کھانا بھی میز پر رکھا ہے۔'' سورج نے اعلان کیا۔

وہ سب کھانے کے کمرے کی طرف بڑھے جہاں بھنی ہوئی ایلش مچھلی کے ساتھ طرح طرح کے مغربی اور مشرقی پاکستانی کھانوں کی خوشبو اڑ رہی تھی۔

مصباح الحق صاحب کئی مرتبہ مرزا صاحب کو کنبے کے ساتھ اپنے آبائی گاؤں آنے کی دعوت دے چکے تھے۔ اب مرزا صاحب اور بیگم احسن نے بیگم مرزا کو اس بات پر راضی کرلیا تھا کہ وہ مصباح الحق کے آبائی گھر جا کر ان کا رہن سہن دیکھیں اور اس کے بعد بینو کے رشتے کا فیصلہ کریں۔ ان کا گاؤں 'روزن' چٹا گانگ سے ذرا دور تھا۔ پہلے وہ ان ہی کے ایک پرانے گھر میں چٹا گانگ میں رہے۔ شام سے بادل اُمڈ اُمڈ کر آ رہے تھے۔ رات ہوئی تو بادلوں کی گرج نے دند مچادی اور بجلی کی چمک نے چکا چوند کردی۔ بیگم مرزا اور بیگم احسن دونوں جاگتی اور باتیں کرتی رہیں۔ بیگم احسن بڑی بہن کو سمجھاتی رہیں۔ بینو کی مرضی ہے تو خوشی سے اکرام الحق سے شادی کر دیجیے۔ ایسا نہ ہو، میری طرح آپ بھی پچھتائیں۔"

"کیا ہوا ۔۔۔ شیزی خوش نہیں ہے اپنی شادی سے؟"

"آپ سے کیا چھپاؤں آپا، دونوں ہی خوش معلوم نہیں ہوتے، مگر نہ ایک کچھ بتاتا ہے نہ دوسرا۔" شیزی کراچی گئی ہوئی تھی، زری کے گھر ٹھہری تو میں نے جواد کو اسے لینے کے لیے بھیج دیا۔ وہ اس کے ساتھ نہیں آئی۔ تب سے دونوں میں سرد جنگ سی چل رہی ہے۔ جواد نے خط بھیجنا اور آنا چھوڑ دیا ہے۔ لیکن وجہ ہمیشہ کوئی نئی مصروفیت ہی بتاتا ہے۔ شیزی بھی کسی سے کچھ نہیں کہتی لیکن میں جانتی ہوں کہ معاملہ کچھ اور ہے۔ دیکھیے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ کبھی کبھی تو انجام کا سوچ کر میری راتوں کی نیند اڑ جاتی ہے۔ مصباح الحق صاحب کا کھاتا پیتا، تعلیم یافتہ گھرانا ہے اور لڑکی کی خوشی بڑی بات ہے۔"

''سب کچھ ہے، مگر دل نہیں مانتا۔ اب بھلا بتاؤ یہ سوتی ساریاں باندھے عورتیں کہاں سے ایم اے پی ایچ ڈی لگتی ہیں؟ ہمارے ہاں کی تو مائیاں بھی ان سے زیادہ بن سنور کر رہتی ہیں۔ میں تو جانوں یہ لوگ کنجوس ہیں۔''

''آپ تو اتنے سال سے یہاں رہ رہی ہیں، آپ کو اندازہ نہیں ہوا کہ ان کا رہن سہن ہی ایسا ہے۔'' بیگم احسن نے کہا۔

''ہاں ہے تو۔ یہی تو سوچتی ہوں کہ ہمارے اور ان کے کلچر میں بڑا فرق ہے۔''

''آپ کی بیٹی اسی کلچر میں پلی بڑھی ہے اور اسے پسند کرتی ہے۔'' بیگم احسن نے کہا، ''لوگ پُرخلوص ہیں، لڑکا بھی اچھا ہے، نمکین نمکین——''

''وہ کیا کم نمکین ہے——'' بیگم مرزا ہنسیں، ''ہماری بیٹی!'' یکایک ایک خیال ان کے ذہن کے افق پر طلوع ہوا، ہاں جوڑی بری نہیں ہے۔ مغربی پاکستان میں کون قبولے گا کالی کلوٹی۔ اپنے اس خیال پر وہ دل کھول کر مسکرائیں۔

''نیتِ شب حرام—— اب سو جاؤ، صبح اٹھ کر بات کریں گے'' انھوں نے بہن سے کہا۔

رات کو نیلی بھی بہت دیر تک جاگتی رہی تھی اور کھڑکی کے پاس کھڑی باہر کا منظر دیکھتی رہی تھی۔ تیز ہوا میں چھالیہ کے درخت زمین تک جھک کر کورنش بجالاتے اور پھر سیدھے کھڑے ہو جاتے۔ رات بھر بارش ہوتی رہی تھی اور جل تھل ایک ہو گئے تھے۔ ہر طرف پانی ہی پانی تھا۔ بڑے بڑے درخت پانی میں ڈوب گئے تھے۔ جھونپڑیاں تالاب میں نہاتی لڑکیوں کی طرح گیلی چُوڑا کھڑی تھیں۔ کچھ جھونپڑیوں کی صرف چھت نظر آ رہی تھی جن پر مرغے، مرغیاں اور کوّے بیٹھے ہوئے تھے۔

اس وقت نہ سامنے کی سڑک کا اندازہ ہوتا تھا، نہ تالابوں کا، نہ دریا کا۔ لان سے لے کر حدِ نظر تک پانی ہی آبشار کی طرح گر رہا تھا۔ نیلی کو یاد آیا، ایک رات مری میں ساری رات برف پڑی تھی تو صبح کو اس نے دیکھا تھا کہ اس کے قدموں سے لے کر، جہاں تک نگاہ کام کرتی تھی، برف ہی برف تھی۔ سبزہ، سڑکیں، ندی، نالے اور وادیاں برف کی ایک بے انتہا بڑی سفید چادر میں ڈھنپی کھڑی تھیں۔ برف کے بانہیں پھیلائے درخت اور برف کی ٹوپیاں پہنے مکانات الگ ہوتے ہوئے بھی الگ نظر نہ آتے تھے۔

الیاس کو باہر برآمدے میں کھڑا دیکھ کر نیلی بھی باہر آ گئی۔

''دیکھنا ابھی منٹوں میں سارا پانی بہہ جائے گا اور چٹا گانگ صاف ستھرا اسی طرح نکل آئے گا۔ البتہ دیہاتوں میں جہاں جہاں سیلاب آتا ہے، وہاں پانی بہت دنوں تک کھڑا رہتا ہے اور بیماریاں

پھیلتی ہیں۔ ملیریا تو ہمیشہ ہی رہتا ہے۔ برسات کے بعد پیچش، ہیضہ، پھوڑے پھنسیاں اور پتا نہیں کیا کیا ہوتا رہتا ہے۔"

"میں بتاؤں یہ سب غریبی کی وجہ سے ہے۔" نیلی نے بڑی دانائی سے کہا، "لاہور میں ایک ہمارے اعجاز بھائی ہیں۔ انھوں نے ایک دفعہ بتایا تھا کہ کسی بڑے فلاسفر کا کہنا ہے کہ دنیا میں اتنی دولت اور اتنا کام ہے کہ دنیا کے سارے آدمیوں میں تقسیم کر دیا جائے تو نہ کوئی بے کار رہے نہ بھوکا۔ اور سب کو آرام بھی خوب ملے۔"

"دنیا کی کیا بات ہے، کیا پاکستان میں اتنی دولت نہیں ہے؟ لوگ بتاتے ہیں کہ کراچی میں اتنے عالی شان محل بن رہے ہیں، اور اسلام آباد تو ایسا لگتا ہے جیسے باہر کا کوئی شہر ہو۔"

"اچھا تو تم بھی مغربی پاکستانیوں سے جلتے ہو؟" نیلی نے اپنے اوپر سنجیدگی پوری طرح طاری رکھی۔

اکرام الحق کے دادا، جو بہت سویرے اٹھنے کے عادی تھے، باہر نکلے تو ان بچوں کو باتیں کرتا دیکھ کر ٹھٹک گئے۔ اس عمر میں اتنا سماجی اور سیاسی شعور ہم میں تو نہیں تھا۔ انھوں نے سوچا۔ یہ اور بات ہے کہ سب کو پاکستان زندہ باد کے نعرے لگاتے دیکھ کر ہم بھی لگا لیا کرتے تھے۔ وہ سامنے آئے تو دونوں نے انھیں سلام کیا۔ انھوں نے جواب دے کر کہا، "بیٹی سامنے دیکھ کر یہ بتاؤ کہ خشکی کہاں تھی اور تالاب کہاں تھا؟"

نیلی نے غور سے دیکھا۔ ہرے پتوں اور اودے پھولوں والی بیلیں اب بھی کئی جگہ تیر رہی تھیں جن پر چڑیاں اور سفید پرندے ڈبکیاں لگاتے اور اڑ جاتے تھے۔ زمین کی نشان دہی درختوں کی پھنگیں، بانس کی چھتریاں اور باشاؤں کی چھتیں کر رہی تھیں۔ نیلی نے یہ بات بتائی تو وہ بہت خوش ہوئے۔

"تم دونوں بہت ذہین بچے ہو اور سوچنے والے۔ یوں کرو، اوپر کی منزل میں میرے مطالعے کے کمرے میں جاؤ۔ دائیں طرف ایک بڑی سی الماری پر متفرقات لکھا ہوا ہے، اس میں سے ایک ایک کتاب اپنی پسند کی لے لو۔" ان کو تیزی سے زینے کی طرف جھپٹتے دیکھ کر انھوں نے کہا، "صرف ایک۔" اور بہت دیر تک مسکراتے رہے۔ انھیں ذہین اور کتابوں کے شوقین بچے بہت پسند تھے۔

مطالعے کے کمرے کی کھڑکی سے دور دور کا منظر نظر آ رہا تھا۔ نیلی کو یوں محسوس ہوا۔ جیسے یہ مکان نہیں، اسٹیمر ہو جو سمندر میں بہتا چلا جا رہا ہو۔ مطالعے کے کمرے میں چھت تک لگی الماریاں اور ان میں رکھی ہوئی پرانی کتابیں، بھورے چمڑے کی سیاہ پڑتی کرسیاں اس کمرے کے خاندانی ہونے کی دلیل تھیں۔ کتابوں میں عربی، فارسی، انگریزی، اردو اور بنگلہ کتابوں کے ساتھ پراکرت زبان کی کتابیں بھی تھیں۔ بدھ جی کی سوانح حیات، بدھ مذہب کی تاریخ، اور اس کی مختلف اقسام، بدھ

مذہب کے معرفتی نغمے ـــــ پھر تاریخِ اسلام اور فلسفۂ اسلام پر کتابیں، ہندو فلسفہ، مغربی فلسفہ۔ اس کے بعد اردو کا کلاسیکی ادب، پھر مغل دور کا پوتھی ادب جو عربی رسم الخط میں لکھا گیا تھا۔ الا دل کے گیت، مرشدوں کا مجموعہ، میر مشرف حسین کیقباد اور ٹیگور، پھر زندہ شاعروں کے مجموعے، باغی شاعر نذر الاسلام کی کتابیں، جو ابھی تک حیات تھے مگر شعر کہنے کے قابل نہ رہے تھے اور کلکتہ میں رہتے تھے۔ کوی جسیم الدین کی نکشی کا نتھار ماٹھ، بالوچر، رنگیلا نائر مانجھی اور ماٹیر کانتا، بیگم صوگیہ کمال کی ساجھیر مایا اور مایا کا جل بڑی طمطراق سے رکھی تھیں۔

نیلی نے انگریزی میں بنگال کی مختصر تاریخ پسند کی۔ الیاس نے ٹیگور کے خطوط پر مشتمل ایک بنگلہ کتاب اٹھالی۔

تیار ہو کر سب ناشتے پر اکٹھے ہوئے۔ گھر والے اور مہمان ملا کر خاصے لوگ تھے مگر ناشتا بھی وافر تھا۔ پتنا بھات اور مچھلی کے علاوہ لوچی پراٹھا، بھجیا، بھرتا، حلوہ، کھیر اور کئی پھل تھے۔ نوکروں کی ریل پیل تھی۔ بنگالی ملازم نہایت مؤدب طریقے سے پکوان پیش کرتے کسی وجہ سے کوئی چیز بائیں ہاتھ سے دیتے تو دائیں ہاتھ سے بائیں ہاتھ کی کہنی تھامے رکھتے تاکہ بائیں ہاتھ سے پیش کرنے کی گستاخی نہ ہو۔

دھوپ نکلی اور راستے قدرے خشک ہوئے تو یہ جیپ میں گاؤں کی طرف روانہ ہوئے۔ کیچڑ جیپ کے ٹائروں سے لپٹتی رہی۔ دھکوں سے اچھلتے خوش ہوتے، یہ سب گاؤں کی طرف رواں رہے۔ پانی کے گڑھوں میں چھوٹی چھوٹی کشتیاں کھڑی تھیں اور بچے ان میں جال ڈالے کھڑے تھے۔ کہیں سڑک کے دونوں طرف ٹیلے تھے جو مختلف قسم کے درختوں اور پودوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ بانس کے زردی مائل تازہ پتوں والے نازک درخت ہوا سے مست ہو کر جھوم رہے تھے۔ ربر کے سبز اور گلابی پتوں پر دھوپ پڑ رہی تھی۔ ذرا ذرا سے فاصلوں پر ایسے گاؤں ملتے تھے جو درختوں کے جھنڈ میں گھرے ہوئے تھے۔

''تیز ہواؤں اور طوفانوں میں یہ درخت گھروں کو ہوا کی زد سے بچاتے ہیں۔'' مرزا صاحب نے ان لوگوں کو بتایا۔ اب خاصی دھوپ نکل آئی تھی۔ ایک گاؤں کے آگے میلہ لگا ہوا تھا، اور ہارمونیم پر گانے کی آواز آ رہی تھی۔

سڑک پر جگہ جگہ دونوں طرف ہاٹ شروع ہو گئے تھے جہاں سبزی، پھل اور انڈے مرغیاں وغیرہ بیچی جا رہی تھیں۔

گاؤں کا گھر چھوٹا سا مگر خوب صورت تھا۔ باغ میں سیکڑوں درخت اور پودے تھے۔ لگان بلاش کی بیلیں، چنبیلی کے جھاڑ، لیچی، آم اور جامن کے پیڑ، ناریل اور کیلے کے درخت سب رات کی بارش

کی مار سے سنبھلنے کی کوشش میں مصروف تھے۔ گھر کے پچھلے صحن کے باہر خادمائیں گہری اودی، نیلی اور سبز کاہی ساریاں لپیٹے برتن دھونے، پانی بھرنے اور مچھلی صاف کرنے میں مصروف تھیں۔

بیگم مرزا نے بینو کے ساتھ آنے کی مخالفت کی تھی۔ ہونے والے سسرال میں لڑکی کا کیا کام۔ مگر حق صاحب نے بینو کے ساتھ آنے پر اصرار کیا تھا۔ سب سے زیادہ واسطہ تو اسی کا ہے اور اسی کو اس موقعے سے محروم کیا جائے۔ یہاں پہنچے تو دیکھا کہ پتل کا منگیتر میجر ظاہر بھی پہلے سے موجود ہے۔ وہ میرون پیراشوٹ (Maroon Para Chute) کا ماہر تھا۔ پشاور کے نزدیک چراٹ سے ٹریننگ لینے کے بعد کمانڈر ٹریننگ کے لیے امریکا جا رہا تھا۔ وہ باتوں سے تیز طرار اور جیالا لگ رہا تھا، اور اس میں کوئی بات ایسی تھی جو بیگم احسن کو جواد کی یاد دلاتی تھی۔ شاید اس کا اپنے اوپر اعتماد اور خود سے مطمئن نظر آنے کی ادا۔

ذرا دیر بعد لڑکے اور لڑکیاں جیپوں میں بھر کر دریا کی سیر کو نکل گئے۔ کھیتوں میں سے بہتا پانی دریا میں آن کر مل رہا تھا۔ کسان کشتیوں میں، ڈونگوں میں اور لانچوں میں دریا پار کر رہے تھے۔ پھر ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی۔ کسانوں نے گھاس کی بنی ہوئی تکونی ٹوپیاں سر پر رکھ لیں، اور ان کی کشتی دریا کے پانی پر ہلکے ہلکے رواں ہوئی۔

میجر ظاہر بہت دیر تک چپکے چپکے پتل سے بنگلہ میں باتیں کرتا رہا۔ پھر اسے اپنی بدتمیزی کا احساس ہوا اور اس نے شیزی سے معافی مانگی۔ پتل اسے کیپٹن جواد کے بارے میں بتا چکی تھی جس سے شیزی کا نکاح ہو چکا تھا۔ وہ شیزی سے جواد کے بارے میں سوال کرنے لگا تو شیزی نے بات ٹالنے کے لیے مشرقی پاکستان میں پھیلی ہوئی بے چینی کی بات چھیڑ دی۔ اسے معلوم تھا کہ نوجوان طبقہ اس موضوع پر بولنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔

''میں پاکستانی فوج میں ہوں اس لیے مجھے کہنا تو نہیں چاہیے، مگر ایک بنگالی کی حیثیت میں بھی یہی محسوس کرتا ہوں کہ یہاں آنے والے مغربی پاکستانی افسروں کا رویہ وہی ہے جو انگریزوں کا ہندوستانیوں کے ساتھ تھا۔ شروع میں ہندوستانی انگریزوں کی ہر بات کو بہت اچھا سمجھتے تھے، اسی طرح ہم بھی مغربی پاکستانیوں کو خود سے برتر جانتے تھے۔ کسی پر رُعب ڈالنا ہوتا تو بنگلہ کے بجائے اردو میں بات کرتے مگر گھپلا اس وقت ہوا جب ہمیں یہ احساس ہوا کہ وہ لوگ بھی خود کو برتر اور ہمیں حقیر سمجھتے ہیں حالاں کہ اس کی کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم جنگلی یا غیر مہذب ہیں۔ بات یہ ہے کہ یہاں کے لوگ اب ناز اٹھانے کو تیار نہیں ہیں۔ چناں چہ خلیج بڑھتی جا رہی ہے۔'' اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کو ملا کر دور کیا اور دور کرتا چلا گیا، ''میں امریکا سے لوٹوں گا تو نہ جانے کیا حالات ہوں گے۔ مجھے بڑی فکر

رہے گی۔" دفعتاً وہ پتُل کی طرف پلٹا اور اس سے بنگلہ میں کہا، "اگر حالات بگڑ گئے تو میں پیراشوٹ سے سیدھا اسی ونگ میں اسی گھر میں اتر دوں گا، سمجھیں۔"

"مگر میں تو ڈھاکا میں ہوں۔" پتُل بولی۔

"تو پھر وہاں سہی۔" ظاہر نے کہا۔ پتُل سپردگی سے مسکرائی اور شیزی کے دل میں یکایک درد سا ہوا۔ کسی سے محبت کرنا اور کسی کا محبوب ہونا زندگی میں بڑی بات ہے۔ وہ جھک کر دریا کی طرف دیکھنے لگی جہاں بے شمار کشتیاں، نوکے اور ڈونگے اِدھر سے اُدھر رواں تھے۔ چند لڑکے کھیت میں بھرے ہوئے پانی میں کیلے کے تنوں پر بیٹھے سواری کر رہے تھے۔ ایک آدمی مٹی کے بڑے سے گملے ایسے برتن میں بیٹھا چپو چلاتا چلا جا رہا تھا۔ الیاس، نیلی کو ٹیگور کا ایک خط سنا رہا تھا۔

"آج صبح تھوڑی سی دھوپ کی جھلک دکھائی دی لیکن آسمان کے کناروں پر گہری گھٹائیں چھائی ہوئی ہیں۔ یوں لگتا ہے جیسے بادلوں کا بڑا سا قالین آسمان پر ایک طرف گول کر کے رکھ دیا گیا ہے، کسی بھی وقت ہوا کا کوئی شریر جھونکا اسے کھول کر دوبارہ بچھا دے گا۔ نیلا آسمان اور رُوپہلی دھوپ چھپ جائے گی — اس سال پانی کا کتنا ذخیرہ آسمان پر کیا گیا ہوگا۔ پانی تو پہلے ہی کناروں سے چڑھ دوڑا ہے اور لگتا ہے کہ ساری کی ساری کھڑی فصلیں پانی میں ڈوب جائیں گی۔ بے چارے کسان ادھ پکی فصلیں کاٹ کاٹ کر کشتیوں میں لاد کر لا رہے ہیں۔ میری کشتی کے قریب سے گزرتے ہیں تو میں انھیں اپنی بدبختی کا رونا روتے ہوئے سنتا ہوں۔ پکنے سے پہلے فصل کو اس امید میں کاٹ لینا کہ شاید چند بالیاں چاولوں میں تبدیل ہو چکی ہوں، کتنا اندوہ ناک ہوتا ہے، اس کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ ٹیگور نے یہ خط ۴ر جولائی ۱۸۹۳ء کو لکھا تھا،" الیاس نے کہا، لیکن آج بالکل یہی منظر ہمارے سامنے ہے۔ لگتا ہے جیسے یہ خط آج ہی لکھا گیا ہو۔"

چائے اور ناشتے کا کچھ سامان ان کے ساتھ تھا۔ بوندیں ملی ہوئی چائے پیتے ہوئے وہ سب بے حد بشاش تھے۔ گھر پر بیٹھے ہوئے بزرگ ان کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔

"بینو کی شادی کے بعد آپ اطمینان سے مغربی پاکستان چلے جائیں۔ ابھی آپ کی بزنس اور مکان کے اچھے دام مل جائیں گے، بعد میں شاید یہ بات نہ رہے۔" مصباح الحق نے کہا۔

"آپ لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں تو ہمیں دکھ ہوتا ہے حق صاحب! ہم تو اپنی کشتیاں جلا کر یہاں آئے ہیں۔ بتائیے، میں مغربی پاکستان میں نئے سرے سے کیسے بزنس جماؤں گا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اردو تک بھول چکا ہوں۔ قمیص شلوار مجھے کاٹتی ہے۔ یہ ثروت بیٹھی ہے، اس سے پوچھ لیجیے گھر میں لنگی اور بنیان ہی پہنتا ہوں۔"

"یہ تو ٹھیک ہے، ہم کب دل سے چاہتے ہیں کہ آپ جائیں، مگر بات کچھ ایسی ہے۔"

"بات کیا ہے؟ کچھ ہمیں بھی بتایئے۔"

بھئی سنجیدہ طبقہ سوچ رہا ہے کہ مجیب الرحمٰن اب سائیکلون بن گیا ہے۔ سائیکلون آئے تو آن کر رہتا ہے، جو کچھ نقصان ہونا ہوتا ہے ہو کر رہتا ہے۔ سائیکلون گزر جائے، حالات بہتر ہو جائیں تو پھر آ جایئے۔"

دوپہر کے کھانے تک بچے سیر سے لوٹ آئے۔ پھر ڈھیروں کھانا چنا گیا۔ بھات بھی اور پلاؤ بھی۔ ایلش مچھلی، جو پورے بنگال کی مقبول ترین اور گراں ترین مچھلی ہے۔ کباب، کوفتے، چرچری، جھینگے، سلاد، تاڑ کے گڑ اور چاول میں پکی میٹھی ڈش اور رس گلے۔

بیگم مصباح الحق تمام لوگوں کو خود کھانا نکال کر دیتی رہیں کہ یہاں کا دستور یہی تھا۔

دوسری صبح گھر میں عجب تناؤ سا تھا۔ ایک قسم کی پُراسرار سرگوشیوں کی فضا —— گو بظاہر سب نارمل بننے کی کوشش کر رہے تھے۔ جب مصباح الحق صاحب اکرام کو الگ کمرے میں لے جا کر بہت دیر تک باتیں کرتے رہے تو بینو کو یقین ہو گیا کہ ضرور اس کی امی نے کچھ گڑبڑ پھیلائی ہے۔ ان سے پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی تو اس نے پتل کو اس کام پر مامور کیا۔ پتل نے اکرام الحق سے معلوم کر کے بینو کو اعتماد میں لے کر بتایا کہ بات کچھ اور ہی ہے۔ میلو نے (اکرام الحق کے چھوٹے بھائی نے جو ڈھاکا ہی میں تھا) اطلاع بھیجی تھی کہ ان کی پھوپھی پاول نے، جو پتل کی ہم عمر تھی اور باریسال میڈیکل کالج میں پڑھتی تھی، اپنے ایک کلاس فیلو سے (پچھمی پاکستانی آف کورس) شادی کر لی ہے اور دونوں ایک دوست کے گھر مقیم ہیں۔ تفصیلات یہ تھیں کہ ایک شام وہ کالج سے نہیں لوٹی تھی۔ ہاسٹل کی وارڈن نے پوچھ گچھ کی تو یہ بھید کھلا کہ چند دوستوں کی موجودگی میں کسی مقامی دوست کے گھر میں شادی ہوئی اور اب وہ ان ہی لوگوں کے ساتھ ٹھہری ہوئی ہے۔

مصباح الحق صاحب یہ بات بغیر تصدیق کیے اپنے والد کو بتانا نہیں چاہتے تھے، اس لیے وہ اکرام کو لے کر خود باریسال جا رہے تھے۔ مہمانوں کو انھوں نے بتایا کہ ازحد ضروری کام سے انھیں باریسال جانا پڑ گیا ہے لیکن وہ سب ان کی غیر موجودگی میں بھی اطمینان سے یہاں رہ سکتے ہیں۔

مرزا صاحب نے مزید قیام نہ کر سکنے کی معذرت کی۔ وہ چٹاگانگ میں اپنی بھتیجیوں کی پینٹنگز کی نمائش میں شرکت کرنا چاہتے تھے۔ جوں ہی مصباح الحق اور اکرام باریسال کے لیے روانہ ہوئے، مہمانوں نے بھی رختِ سفر باندھا اور چٹاگانگ کی راہ لی۔

شمس الرحمٰن اور زری ریل گاڑی سے چٹا گانگ جا رہے تھے۔ نرگس آج کل ایک آرٹ اسکول میں پرنسپل تھی۔ اس نے اپنی پینٹنگز کی نمائش میں حسبِ وعدہ شمس الرحمٰن اور زری کو ڈھاکا سے بلوایا تھا۔

زری کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔ چھوٹی لائن کے کمپارٹمنٹ بھی چھوٹے تھے اور گاڑی مغربی پاکستان کی گاڑیوں کی بہ نسبت آہستہ چل رہی تھی۔ ریلوے لائن سے شروع ہو کر حدِ نظر تک سبزہ ہی سبزہ تھا۔ جگہ جگہ درختوں کے جھنڈ تھے جو افق پر دائرے میں ناچتے ناچتے آنکھوں سے اوجھل ہو جاتے تھے۔ بانس کے شگفتہ کنج، تاڑ کے چھتری نما درخت، کیلے اور ناریل کے پتوں کے ہلتے ہوئے مورچھل اور چھالیہ کے لانبے پتلے درخت جھوم رہے تھے۔ جوں جوں چٹا گانگ نزدیک آ رہا تھا، پہاڑیوں کے سلسلے اور سبزہ بڑھتا جا رہا تھا۔ کہیں ٹیلوں پر پکی عمارتیں تھیں، کہیں دامن میں کچے جھونپڑے اور ٹین کی چھتوں کے مکانات تھے درختوں میں تقریباً چھپے ہوئے — پانی سے لبالب سبز تالاب، کھالیں اور پوکھر، چوڑی پتلی نہریں، ان پر بنے ہوئے بانس کے شاکھو، جن پر بانس کی مدد سے چلتے ہوئے بچے نٹ کا تماشا کرتے دکھائی دیتے تھے۔

یکایک زری کی نظر کھیتوں کے درمیان جاتی ایک ڈولی پر پڑی۔ وہ ڈولی سجی ہوئی نہیں تھی نہ اس کے ساتھ باراتی تھے۔ ڈولی پر چار خانے کی ایسی ہی چادر بندھی ہوئی تھی جیسی کہاروں کے بدن پر تھی۔ کہاروں کے پاؤں جوتوں سے محروم تھے اور وہ اوپر کے بدن سے ننگے تھے۔ البتہ ان کی گردنوں میں چاندی کے تعویذ تھے۔

''شمس! دیکھو وہ کھیتوں کے بیچ جاتی ڈولی کیسی پیاری لگ رہی ہے اور پانی میں ڈولی کا عکس کتنا خوب صورت لگ رہا ہے۔'' زری نے کہا۔

''اس چادر کے پیوند اتنی دور سے دکھائی نہیں دے رہے اور اس ڈولی میں جو بیمار عورت سوار ہے، ہوسکتا ہے وہ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی مر جائے کیوں کہ یہاں اسپتالوں کی تعداد بے انتہا کم ہے۔''

''شمس! تمھیں کیا ہوگیا ہے، تم قنوطی ہوتے جارہے ہو۔'' زری نے شکایتاً کہا۔

''یہ زندگی کی حقیقتیں ہیں جان، جنھیں میں جانتا ہوں۔ میں نے اپنے وطن کو صرف ہوائی جہاز اور ریل گاڑیوں ہی سے نہیں دیکھا، نزدیک سے بھی دیکھا ہے۔''

شمس الرحمٰن کی اس بات نے زری کی نظر کا زاویہ بدل دیا۔ وہ انسانوں کو دیکھنے لگی۔ سر پر تکونی ٹوپیاں اوڑھے گھٹنے گھٹنے پانی میں کھڑے لوگ۔ اسے ان کے چہروں پر ماضی کے دکھوں سے کھینچی گئی لکیریں بھی دکھائی دے رہی تھیں۔ اس نے تین چار مربع گز کی وہ کوٹھڑی بھی دیکھی جس کی چھت پر ایک پھٹا ہوا کمبل پڑا تھا اور اس کو جگہ پر رکھنے کے لیے چند پتھر، لکڑیاں اور بانس رکھ دیے گئے تھے۔ اسے پیٹ پھولے، سوکھے کے مرض میں مبتلا اور ملیریا کے مارے زرد رُو بچے بھی نظر آئے۔ مرے درخت کی چھال جیسی جلد والے بوڑھے اور سدا سے آدھے پیٹ کھانے والی لاغر اور صابر عورتیں بھی۔

''اچھا یہ بتاؤ، میں نے جہاز میں پیش گوئی کی تھی کہ تم بہت جلد مشرقی پاکستان کے عشق میں گرفتار ہوجاؤ گی، ایسا ہوا یا نہیں؟''

''یقیناً ہوا— میں تو سمجھتی ہوں کہ میں پہلی ہی نظر میں یہاں کے عشق میں گرفتار ہوگئی تھی۔ یہاں کے بے اندازہ حسن نے یہاں کی غربت کو، بیماری کو ہر طرح کی بدصورتی کو ڈھانپ سا لیا ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے کہ یہاں کے سارے درختوں میں ایک خاص مصورانہ دل کشی ہے۔ پانی کی زیادتی اور خوش گوار آب و ہوا کی وجہ سے پیڑ ہمیشہ ہی تازہ اور سرسبز نظر آتے ہیں۔ شاید سال میں تین فصلوں کی وجہ سے کھیت بھی سدا لہلہاتے ہی دکھائی دیتے ہیں۔''

''ہاں، اور پھر ہر درخت کی افادیت۔ ناریل کو لو، ڈاب، سوم رس سے بھی لذیذ تر۔ تیل بالوں میں لگاؤ، کھانا پکاؤ، کچے ناریل کی مٹھائی۔ بانس کو دیکھو، ہزاروں چیزیں اس سے بنائی جاتی ہیں۔''

''مگر مجھے جو پودا اور پھل سب سے زیادہ جی کو بھایا ہے وہ ہے اناس، یوں لگتا ہے جیسے زمین کے گل دان میں کوئی گل دستہ سجا ہوا ہو۔ چھوٹا سا پودا اور یہ بڑا پھل — جیسے کوئی کم سن ماں گود میں بچے کو لیے بیٹھی ہو۔''

''اور یہاں کے لوگ تمھیں کیسے لگے؟''

''لوگ!'' زری سانس لینے کو رکی، ''عام لوگ تو اچھے ہی لگتے ہیں۔ لیکن تمھارے بہت سے ہم وطن میری طرف شبہے کی نظر سے دیکھتے ہیں جیسے میں مغربی پاکستان کی جاسوس ہوں۔''

''خیال ہے تمھارا۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔ ''یہاں کی سب سے تکلیف دہ چیز؟''

''سائیکل رکشا۔'' زری نے جواب دیا۔

''واہ! وہ تو اتنی خوب صورت ہوتی ہیں، چمکتی دمکتی، بجی سجائی۔''

''مگر مجھے ان میں بیٹھتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے۔'' زری نے کہا۔ ان کو اتنے کمزور اور بوڑھے لوگ کھینچتے ہیں اور میلوں تک کیسے تیز تیز لے جاتے ہیں۔ شکر ہے مغربی پاکستان میں یہ لعنت ختم ہوگئی۔''

''یہاں بھی ختم ہونی چاہیے۔ مگر ہزاروں لاکھوں کی روزی کا سوال ہے۔'' وہ دکھی سا ہو گیا اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔

ایک جگہ خالی میدان میں کپڑوں کے تھان سوکھ رہے تھے۔ شمس الرحمٰن نے اپنی جیب سے ایک ڈائری اور قلم نکالا اور گھاس پر رنگ برنگے تھانوں کو دیکھتے ہوئے نظم کا پہلا خاکہ لکھا:

سُرخ، نارنجی، نیلے اور کاسنی
جیسے کسی بڑے آدمی کی گھر کی بگیا میں
رنگ برنگے پھول کھلے ہوں

ہمارے دلوں میں آشاؤں کے پھول ہیں
کاش ہمارے دیس میں پھول کھلتے رہیں
خزاں کی ہوائیں انھیں کبھی نہ چھو سکیں
کسی گل چیں کا ہاتھ ان کی طرف نہ اٹھے
اٹھے تو ہمارے بازوؤں میں اتنی طاقت ہو
کہ ہم اس بڑھتے ہوئے ہاتھ کو توڑ دیں

زری، شمس الرحمٰن کے قلم کو بائیں سے دائیں طرف چلتا دیکھتی رہی۔ اس کے رک رک کر لکھنے کے انداز سے وہ سمجھ سکتی تھی کہ وہ انگریزی میں کوئی نوٹ نہیں، بنگلہ میں نظم لکھ رہا ہے۔ اس کا جی چاہا وہ بھی ان خوب صورت مناظر کو قلم بند کر کے چاچا جی کو خط میں لکھ بھیجے لیکن وہ آلکسی سے بیٹھی کھڑکی سے باہر دوڑتے سبزے کو دیکھتی رہی۔ آسمان پر گھٹائیں گھر گھر کر آ رہی تھیں۔ چٹا گانگ — بارشوں کا دیس — کسی ست شہد کی مکھی کی طرح اپنی سیٹ پر چمٹی وہ سوچتی رہی۔

چٹا گانگ نزدیک آ گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں پر بسا ہوا بے حد سرسبز و شاداب یہ چٹو گراؤں

آرٹسٹوں کی جنت ہوگا۔ ابنِ بطوطہ نے اسے مدینۃ الاخضر کا خطاب دیا تھا۔ اس سبز شہر پر ہمہ وقت بادلوں کا سایہ رہتا ہے۔ بانسری کی آواز اس کی سانسوں میں بسی ہوئی ہے، یہی ہوا جب تیز چلنے لگتی ہے تو آندھیوں اور طوفانوں میں بدل جاتی ہے۔ باشائیں ڈھے جاتی ہیں۔ ٹین کی چھتیں اڑ جاتی ہیں۔ سمندر کے کنارے کھڑی کشتیاں تتر بتر ہو جاتی ہیں۔ ذرا سی دیر میں سارا ساحلی علاقہ یوں نظر آتا ہے جیسے سمندر کے ساحل پر لہروں میں بہہ جانے والے گھروندوں کے صرف آثار باقی رہ گئے ہوں۔ نرگس نے اپنی پینٹنگز میں یہاں کے حسن کو بھی سمیٹا ہوگا اور طوفانوں کی تباہی کو بھی — اس نے سوچا۔

کے این مجمدار کی ''راس لیلا'' جس میں بے شمار عورتیں، ان کے لہنگے اور ساریاں جوڑے اور موٹی چوٹیاں ہلکے ہلکے چغتائی طرز کے رنگوں میں رقص کر رہی تھیں۔ اے کے حولا دار کی ''بارش کے بعد'' نرم مترنم نارنجی، بھورے اور نیلے آبی رنگ ایک دوسرے سے ابھرتے اور ایک دوسرے میں مدغم ہوتے ہوئے — درخت کے خوب صورت جھکے ڈال پر ایک لانبی دُم والا مور جس کے پروں کے ملائم رنگ پس منظر کے دھندلے رنگوں میں گھل گئے تھے۔ درخت کی جڑ کے پاس پڑے ہوئے ٹوٹے ہوئے گھڑے تک پس منظر کا حصہ بن گئے تھے۔ ایم آر دیب کی ''کنول کا شہد'' ایک دبلی، بل کھاتی حسین لڑکی، بدن کے اوپری حصے میں اجنتا کی خوب صورتی اوڑھے، لہنگا اور دوپٹہ زیب بدن، ہاتھ میں ہانڈی — جیسے اپنے پس منظر کے خوابیدہ رنگوں کا کوئی غیر مرئی خواب — پھر بینر جی کی ''شام''۔ دریا کے کنارے درختوں کے سائے اور مویشیوں کی سنگت میں رادھا اور کرشن جی کا ازلی اور ابدی انتظار — جیسے شام کا سنہرا جھٹپٹا اور انتظار کا میٹھا کرب اسی لیے تخلیق کیا گیا ہو کہ ایک بھوپر میں رادھا کرشن جی کا انتظار کرتی دکھائی جائیں۔ ابھی مہمان خصوصی کے آنے میں دیر تھی اس لیے نرگس شمس الرحمٰن اور زری کو اپنا اسکول دکھانے لگی۔ بنگالی اسکول آف آرٹ کے شاہکار بطور خاص ایک کمرے میں رکھے تھے۔

''بنگالی اسکول مغل منی ایچر، جاپانی تصویر کشی، اجنتا فریسکوز اور جدید یورپی فن کا خوب صورت امتزاج ہے۔'' نرگس نے کہا۔ ''ان سب تصویروں سے جو تم دیکھ چکے ہو، میں بے حد متاثر ہوں۔ ان

کے علاوہ اسیت کمار، کنتھ ارناتھ، رابندر ناتھ ٹیگور، بوار سین، ایس این گپتا، جوگندر ناتھ ٹیگور اور زین العابدین کی ان پینٹنگز نے جو تم یہاں دیکھ رہے ہو، مجھے ایک نیا خیال سجھایا کہ میں عکس اور پرچھائیوں کو نمایاں کروں۔ مشرقی پاکستان میں پانی کی بہتات نے میرے اس کام کو نسبتاً آسان بنادیا ہے۔ بنگال کا سارا حسن اس کے پانیوں میں دیکھا جاسکتا ہے۔''

اور واقعی ایسا ہی تھا۔ چھوٹے بڑے گنبدوں والے مزار، مسجدیں، مخروطی مندر، بدھوں کے پیگوڈا، عمارتوں اور درختوں کا تھرتھراتا پُرسکوت عکس، ساحلِ سمندر پر پُرشور ہواؤں اور طوفانوں کا زور، ٹوٹی بکھری کشتیاں، اصل عمارتوں کے پس منظر میں اس نے ان عکسوں کو ابھارا تھا۔ پانی کی لہروں میں منظر کی دل کشی بڑھ گئی تھی۔ ان میں نمی کے ساتھ نرماہٹ کا احساس ہوتا تھا۔ کچھ مناظر دھوپ اور چاندنی میں پرچھائیوں کی شکل میں تھے۔ ان میں رنگ نہیں تھے لیکن سیاہ و سفید کے امتزاج، روشنی اور سائے نے چیزوں کو بامعنی بنادیا تھا، اور روشنی نے ان کو نئے نئے زاویے دے کر ایک جدت پیدا کردی تھی۔

وہ سب پینٹنگز میں ڈوبے ہوئے تھے کہ کسی نے زور سے نرگس کو آواز دی۔ نرگس کے ساتھ تقریباً سب لوگوں نے پلٹ کر دیکھا۔ مرزا صاحب دروازے میں مع بیوی بچوں اور اپنے مہمانوں کے کھڑے تھے۔ نرگس بھاگتی ہوئی گئی اور ان سے گلے ملی۔ بیگم مرزا نے گلے سے لگالیا اور اپنی بہن اور بھانجیوں کا تعارف کروایا۔ نرگس، مرزا صاحب کی بہن کی بیٹی تھی۔ شیزی نے زری کو دیکھا اور بے تحاشا ادھر لپکی۔ اس کو دیکھ کر نیلی بھی اس طرف بڑھی۔ زری دونوں سے بہت محبت سے ملی اور جھک کر پیار سے نیلی سے باتیں کرنے لگی۔

بیگم مرزا نے چپکے سے بہن سے کہا، ''ثروت تم تو زری سے ملتی نہیں ہو پھر تمھاری بچیاں کیوں اپنی جان اس پر نچھاور کررہی ہیں؟''

''وہی اس کی چالاکیاں۔ ان سے محبت جتاتی ہے کہ میں جلوں — جلے میری جوتی۔'' بیگم احسن نے بے حد جلے بھنے لہجے میں کہا۔

''میرا تو خیال ہے کہ اب پرانی باتیں بھلا کر اس سے مل لو۔ وہ غریب بچہ ختم ہوا۔ عدنان لاپتا ہے۔ چمن اتنی دور بیٹھی ہے۔ ہم تو بھئی پردیسی ہیں، جو بھی اپنا مل جائے اسے غنیمت سمجھتے ہیں۔''

''تو پھر آپ ملیے۔'' بیگم احسن نے طنز سے کہا، اور دوبارہ تصویروں کی طرف لوٹ گئیں۔ بیگم مرزا نے دیکھا کہ اب بینو، زری سے بے حد پیار سے باتوں میں مصروف تھی۔

''زری آنٹی! ساری دنیا آپ کو جانتی ہے، آپ نے پورے ڈھاکا میں اتنا ایکسائٹ منٹ

پھیلا رکھا ہے۔ ہر ایک پوچھتا ہے کہ وہ سندر مہیلا کون ہے جو ساری پہن کر، ماتھے پر ٹپ لگا کر جلسوں میں آتی ہے۔ ایک ہم ہی ہیں جن سے آپ نہیں ملتیں۔''

''ارے نہیں، میں تو خود تمھاری تلاش میں تھی۔ یہی سوچتی تھی کہ کبھی نہ کبھی تو ملوگی، کب تک چھپوگی۔ اتفاق دیکھو کہ چیٹ گانگ میں ملاقات ہوئی۔''

''یہ نرگس ہمارے ابا کی بھتیجی ہیں۔''

''ارے، مجھے معلوم ہی نہیں کہ نرگس سے تمھاری رشتے داری ہے۔''

وہ سب تصویریں دیکھتے جاتے تھے اور باتیں کرتے جاتے تھے۔ بینو نے زری کا اپنے والدین سے تعارف کروایا۔ وہ زری سے اچھی طرح ملے۔ بیگم احسن یوں آگے بڑھ گئیں، جیسے انھوں نے زری کو دیکھا ہی نہ ہو۔

''یہ میری پرانی شاگرد ہے، شوشی۔''

اسی وقت ایک کتابی چہرے والی بے حد خوب صورت جسم، کسی ہوئی ساری، جوڑے میں پھول، سبک قدم آگے بڑھی اور نرگس کو مبارک باد دی۔ نرگس نے شکریہ ادا کیا اور پاس کھڑے ہوئے کسی دوست سے تعارف کروایا۔

یکایک وقت شمس الرحمٰن کے لیے ٹھہر گیا۔ ہال میں موجود لوگ لمحہ بھر کے لیے معدوم ہوگئے۔ ایک آواز، ایک نام — شوشی! — ایک بدن۔ ایم آر دیب کے ''کنول کا شہد'' ایسی لڑکی کا — دبلا مگر بے حد بھرپور — ایک چہرہ — کتابی، امرتا شیرگل کی ''بینا بجانے والی'' جیسا مگر اس سے زیادہ پرکشش۔ ایک جذبۂ انتظار — بینرجی کی ''شام'' کا سا — جس میں شام کا سے ایک احساس، اور انتظار کا کرب بن گیا تھا، ابدی لامحدود — شوشی! — کب سنا تھا یہ نام — ازل سے بھی وہ یہ نام بھول ہی نہیں سکا۔ اس نے اپنے اور شائستہ کے درمیان کھڑے ہوئے لوگوں کے بیچ میں سے دیکھا — ہاں وہی تھی — اس کے پاس جائے؟ اس سے بات کرے؟ یہ موقع نکل گیا تو نہ جانے کتنی صدیاں انتظار کرنا پڑے۔ وہ اسے کیا کہہ کر پکارے، شوشی، شائستہ، شاما؟ اور زری کو کیا بتائے؟ شائستہ اپنے شوہر اور دو بچوں کے ساتھ پورے ہال کا چکر لگا رہی تھی۔ شمس الرحمٰن کے لیے یہ گردش اس کی تقدیر کی گردش تھی۔ وہ ایک پینٹنگ کی طرف منہ کیے اسی طرح کھڑا رہا۔ ڈھاکا کا بیت المکرم اور اس کی پرچھائیں — درمیان میں کعبہ کی سی اونچی دیوار، بیچوں بیچ گنبد — تین محرابیں — اس کے بعد دور تک چلی گئی پتلی محرابیں، جو کھڑکی کی جھلملیاں معلوم ہو رہی تھیں۔ جہاں ہمیشہ خریداروں کا ہجوم رہتا تھا۔ کاروں، موٹر سائیکلوں، ٹھیلوں اور رکشاؤں کے علاوہ پیدل چلنے والوں کی بھیڑ بھاڑ ہوتی تھی،

وہاں اس وقت الو بول رہا تھا۔ سنسان سڑک پر سیاہ، سرمئی اور سفید پرچھائیاں تھیں۔ تصویر کا عنوان تھا ''بیت المکرم، کرفیو کے دوران''۔ شمس الرحمٰن کے دل میں بھی اس وقت ایسا ہی نامعلوم خوف اور ایسا ہی بھیانک سناٹا تھا۔ کوئی بھی تو نہیں تھا۔ صرف ایک ہیولا، ایک پرچھائیں اور انتظار۔۔۔ ایک میٹھی حیرت زدہ سی آواز، سومش، یا سمشل۔۔۔ وہ اسے ضرور دیکھے گی، پھر نزدیک آ کر آواز دے گی۔

جب کئی صدیوں تک یہ آواز اس کے کانوں میں نہ آئی تب اس نے پلٹ کر دیکھا۔ شوشی اپنے شوہر اور منے بچوں کے ساتھ ہال سے باہر جا رہی تھی۔ کیا وہ دوبارہ اسے ہمیشہ کے لیے کھونے کا حوصلہ رکھتا ہے؟ نہیں۔۔۔ ان کے پیچھے آہستہ آہستہ وہ بھی باہر نکل گیا۔ کرشنا چوڑا کے درخت کے نیچے، جہاں سبز پتوں میں نارنجی پھول اپنی باہیں پھیلائے کھڑے تھے اور فاختہ دوپہر کا راگ الاپ رہی تھی، شمس الرحمٰن شوشی سے ملا۔ شوشی نے اپنے شوہر اور بچوں سے تعارف کرایا۔ شوہر نے گھر آنے کی دعوت دی۔ شمس الرحمٰن نے کہا کہ وہ زری کے ساتھ شام کو ان کے گھر آئے گا۔ شوشی اسے پتا سمجھاتی رہی۔ وہ اس چہرے کو مری کی پہاڑیوں پر اپنے ساتھ پھرتے، مسکراتے، ہنستے، روتے دیکھتا رہا۔ پھر لان میں پڑے دل کی شکل کے گرہل کے پھولوں کو روندتا وہ واپس نمائش کے کمرے میں آ گیا اور نرگس کی بنائی ہوئی تصویروں میں عکس اور پرچھائیں دیکھتا رہا۔

کرنافلی — کان کا خوب صورت پھول بسی ہے جو کسی حسین سانولے چہرے پر چپ چاپ مسکراتا رہتا ہے اور سمندر جیسا بپھرا دریا بھی جس کے سینے پر نوکا، فیریاں، شمپان اور اسٹیمر رواں رہتے ہیں۔ چٹاگانگ میں زری پر پہلی مرتبہ یہ انکشاف ہوا کہ یورپ کی طرح مشرقی پاکستان کا ہر بڑا شہر کسی نہ کسی دریا کے کنارے آباد ہے۔ شمس الرحمٰن اس وقت غیر معمولی خاموش تھا۔ نور اور نرگس نے اسے کئی بار ٹوکا— زری کا خیال تھا کہ ٹرین میں جو اشعار کی آمد شروع ہوئی تھی، شاید اس کا اثر باقی ہے اور بپھرتے دریا، لمبے چوڑے پل، بادلوں سے گھرے آسمان اور بالوچر کے حوالے سے کوئی نئی نظم نازل ہونے والی ہے۔

مرزا صاحب اور بیگم مع اپنے مہمانوں کے رخصت ہو چکے تھے۔ ان کا ارادہ رانگامتی، کپتائی اور چندر گونا پیپر مل دیکھنے کا تھا، اس لیے وہ نرگس اور نور کے گھر بھی نہیں گئے۔ جب کہ آج ان دونوں نے اپنے دوستوں کی دعوت کر رکھی تھی اور اس میں موسیقی کا پروگرام بھی تھا۔ شمس الرحمٰن نے بتایا کہ نمائش میں اس نے اپنے کسی دور کے عزیز سے شام کو آنے کا وعدہ کر لیا ہے، اسے اور زری کو وہاں جانا ہے۔ نور اور نرگس ہرگز وہاں جانے کی اجازت نہیں دے رہے تھے۔ خاصی ردّ و کد کے بعد فیصلہ ہوا کہ شمس الرحمٰن، زری کے بغیر جائے اور جلد ہی واپس آ جائے۔ وقتی طور پر اس فیصلے سے اسے اطمینان ہوا۔ سارا دن وہ اسی شش و پنج میں تو رہا تھا کہ شائستہ کو پہچاننے کے بعد زری کا ردِّ عمل کیا ہوگا۔

شمس الرحمٰن گھر لوٹا تو آدھی رات گزر چکی تھی۔ اس کے رشتے دار اسے کھانا کھلائے بغیر بھیجنے کو کسی طرح تیار نہیں تھے۔ پھر باتوں میں وقت کا پتا ہی نہیں چلا — وہ نور کی دعوت اور کئی اچھے گانے والوں کے نغموں سے محروم رہ گیا تھا۔ رسمی طور پر اس نے اظہارِ افسوس کیا لیکن زری کو محسوس ہوا جیسے اس کے اندر سے احساسِ محرومی کی جگہ تازگی اور توانائی پھوٹ رہی ہو۔

شمس الرحمٰن اور زری، نرگس کے والدین اور بہن بھائیوں سے ملے۔ نرگس کا چھوٹا بھائی جمیل بھی بہت اچھا آرٹسٹ تھا۔ شمس الرحمٰن اور زری کے ساتھ نرگس اور نور کاکسس بازار تک گئے۔ راستے کی خوب صورتی بے پناہ تھی۔ کاکسس بازار میں شمس الرحمٰن زری اور نور علی الصبح اٹھ کر خوب صورت سیپیاں چنتے اور سمندر کی سیر کرتے رہتے۔ نرگس ریسٹ ہاؤس کے ٹیرس پر بیٹھی اسٹڈیز بناتی رہتی۔ وہ کشتیاں جو رات بھر مچھلیاں پکڑنے کے بعد اس وقت لوٹتیں، سمندر پر اس طرح بکھری ہوتیں جیسے نیلے آسمان پر پتنگیں — وہ بڑی کشتیاں جو رات کو کسی وقت لوٹی ہوں گی، خشکی پر کھڑی نظر آتیں۔ ان کے باسی ناکافی لنگیاں اوڑھے آڑے ترچھے پڑے سو رہے ہوتے۔ بانس پر لالٹین ٹمٹما رہی ہوتی جو تیل ختم ہونے پر بھڑک کر بجھ جاتی۔ سمندر میں جوار آتا تو یہ کشتیاں جوان ملاحوں کا گھر بھی تھیں، خود بخود پانی میں چلی جاتیں۔

دوپہر کو وہ برمی باشائیں اور پگوڈا دیکھنے جاتے۔ نیچے کر گھے رکھے عورتیں اور مرد برمی لنگیاں بنانے میں مصروف ہوتے، اوپر درختوں کی چھاؤں میں ان کے ایک کمرے کے صاف ستھرے گھر ہوتے جن کی سیڑھیاں درخت کے تنوں کو کاٹ کر بنائی گئی ہوتیں۔ جس وقت نرگس جلد جلد ان کے اسکیچ بناتی، شمس الرحمٰن ان کے سوشل حالات جاننے کی سعی کرتا اور زری کاکسس بازار کی وجہِ تسمیہ تلاش کرتے کرتے کیپٹن کاکس کے حالاتِ زندگی جاننے کی کوشش کرتی۔ چند دن اتنے خوش گوار گزرے کہ انھوں نے اپنے اس دورے کو طویل ترین کر لیا۔ یہاں سے وہ سب مل کر میمن سنگھ جا پہنچے جہاں نرگس کی خالہ اور خالو رہتے تھے۔ میمن سنگھ کا پرانا نام مومن شاہی تھا مگر بعد میں ہندوؤں اور راجپوتوں کے اثر سے میمن سنگھ ہو گیا تھا۔ جاگیر دار ششی کانت کے محل میں جو اپنے زمانے میں مہاراجا کہلاتا تھا، یورپین ماسٹرز کی پینٹنگز سنہری چوڑے فریموں میں لگی ہوئی بوڑھی ہوتی ہوئی آنکھوں کی طرح آہستہ آہستہ دھندلا رہی تھیں۔ چھت کے خوب صورت نقش و نگار اپنا رنگ چھوڑ رہے تھے۔ قیمتی جھاڑ فانوس گرد سے اٹے ہوئے تھے۔ ایک بڑی جھیل اور بارہ دریاں تھیں۔ وسیع سبزہ زار میں افرد ڈائٹ کا حسین سنگِ مرمر کا مجسمہ تھا۔ کل کا یہ شانتی لاج آج خواتین کا ٹیچرز ٹریننگ کالج تھا۔ اس مجسمے کے حوض کی منڈیر پر بیٹھ کر بہت دن بعد زری نے اپنے ایبٹ آباد کے گھر کی باتیں کیں۔ اس

کی عمارت بھی تو اسی طرح کائی کی وجہ سے سبز اور سبز سے سیاہ پڑتی جا رہی تھی۔ پینٹنگز دھندلا چکی تھیں اور فانوس گرد سے اٹے ہوئے تھے۔

دریائے برہم پتر کے کنارے شمس الرحمٰن اور زری نور سے اس کی نظمیں سنتے رہے۔ نرگس نے پٹ سن کے اوپر سے بندھے گٹھوں کے پانی میں پڑتے عکس اور دھان اگاتے کسانوں کی اسٹڈیز بنائیں۔ اندھیرا ہونے پر نرگس اور نور شانگی پاڑہ کی نئی بستی میں اپنی خالہ اور خالو کے گھر چلے گئے۔ شمس الرحمٰن اور زری سرکٹ ہاؤس میں ٹھہرے، جہاں برہم پتر کی آواز کی مدھر لَے پر رات بھر کبھی سوتے اور کبھی جاگتے رہے۔

آج زری جلسہ گاہ سے لوٹی تو اس کا دل پریشان تھا۔ اسے احساس ہو رہا تھا کہ نفرت کا زہر اتنی دور تک پھیل گیا ہے کہ اب اس کا علاج مشکل ہے— بظاہر جو بم پھٹ رہے تھے اور جو احتجاج ہو رہے تھے وہ حکومتِ وقت کے خلاف تھے مگر اب خود کو مزید دھوکا دینا ناممکن تھا۔ یہ بات صاف تھی کہ اس سب کا نشانہ مغربی پاکستان کے لوگ تھے۔ یکایک یوں لگا جیسے اب تک وہ سمندر کی لہروں کی زد میں ریت کے گھروندے بناتی رہی ہو۔ اتفاق کی بات کہ شمس الرحمٰن نے اسے دیکھتے ہی کہا، ''تم جلسے میں ساری پہن کر کیوں نہیں گئی تھیں؟''

''ساری پہن لینے سے یہ حقیقت کہ میں مغربی پاکستانی ہوں، چھپ نہیں سکتی۔'' زری نے تلخی سے کہا، ''میرا قد کاٹھ، میری صورت، میرے بال، سب اس بات کی چغلی کھاتے ہیں۔''

''دوسروں کے جذبات کا احترام کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے، جیسا دیس ویسا بھیس۔''

''میں بھیس بدلنے کی قائل نہیں ہوں— مجھے اب خوب اندازہ ہو گیا ہے کہ لباس بدلنے کے بعد بھی ہم کبھی تم لوگوں کی ہمدردیاں حاصل نہ کر سکیں گے۔''

''تم لوگوں کی؟ کیا میں بھی اس میں شامل ہوں؟''

''جی ہاں، ورنہ تم بھی سب سے پہلی بات ساری کی نہ کرتے۔ مجھے دیر ہو رہی تھی، میں اٹھ کر اسی طرح چلی گئی۔ بہرحال گئی تو، اس کی داد کسی نے نہیں دی۔''

''کیا وہاں کسی نے کچھ کہا؟''

''کہا! ایک عورت نے میری بے حد توہین کی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ جلسہ شروع ہوئے کتنی دیر ہوئی تو اس نے میری طرف پیٹھ کرلی اور برابر بیٹھی ہوئی عورت سے کہا کہ ہمارے صوبے میں شلوار قمیص کو بین کردینا چاہیے۔''

''دیکھو میں پہلے بھی کہتا تھا کہ روز روز نئے ریشمی کپڑے اور زیور مت پہنو—ہاتھ بھر سونے کی چوڑیاں عورت کے لیے فخر کا مقام نہیں ہیں۔ یہ اس کی غلامی کا سمبل ہیں۔''

''کیسے؟''

''جیسے لوگ گایوں، گھوڑوں اور بچھڑوں کو سجا کر رکھتے ہیں اسی طرح پرانے زمانے میں عورتوں کو، جو مردوں کی ملکیت ہوتی تھیں، سجا بنا کر رکھا جاتا تھا۔ پھر گھنگروؤں کی آواز گھر کے باسیوں کو بتاتی رہتی ہے کہ جانور تھان پر بندھا ہوا ہے یا نہیں۔ اسی طرح پرانے زمانے کی ساسیں ہر وقت بہوؤں کو پائل اور چوڑیاں پہنائے رکھتی تھیں کہ انھیں خبر رہے کہ بہو اس وقت کہاں ہے۔''

''حد ہے۔'' زری ہنسی، ''تم بھی کسی طرح چاچا جی سے کم نہیں ہو، تھیوریاں بنانے میں۔ مگر ذرا غور کرو، ۱۸۵۷ء میں جب قلعے کی بیگمات افراتفری میں قلعے سے نکلی تھیں تو جو زیور پہن رکھے تھے اور جو موتی ان کے بالوں میں پروئے گئے تھے، مہینوں ان کے کام آئے تھے۔''

''ہاں۔'' شمس الرحمٰن نے کہا، ''ایسا ہوسکتا ہے کہ اس واقعے کے بعد سگھڑ ماؤں نے زیوروں کو عورت کے سہاگ کی نشانی بنادیا ہو۔ ایک طرف تو یہ مرد کی شان کے خلاف ہوا کہ وہ انتہائی ضرورت میں بھی بیوی کے زیور فروخت کرے، دوسرے ایک پیسا ہاتھ میں نہ رکھنے والی اور ہر دم غیر محفوظ رہنے والی بیوی کے بدن پر زیور کی شکل میں کچھ نہ کچھ رقم موجود رہے کہ کسی وقت شوہر غصے میں کھڑے کھڑے نکال دے تو غریب کے پاس کچھ تو ہو۔''

''واقعی میں تمھاری سوچ کی قائل ہوگئی۔ ماں نے لڑکی کو محفوظ کیا اور ساس نے بچھوؤں اور چوڑیوں سے چوکیداری کا کام لیا۔''

''سوال تو یہ ہے کہ تم پڑھی لکھی، بینک بیلنس رکھنے والی لڑکیاں کیوں زیوروں کے چکر میں پڑی رہتی ہو۔''

''اگر تمھاری تھیوری صحیح ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ عورت آج بھی اتنی ہی غیر محفوظ ہے جتنی ڈیڑھ سو سال پہلے تھی۔''

''مگر بنگال کی عورت زیوروں کی اتنی شوقین نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ خود کو اتنا غیر محفوظ نہیں سمجھتی۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''میرے مقابلے میں تم ہر وقت اپنے صوبے کی عورت کی طرف داری کرنے کو تیار رہتے ہو۔'' زری نے قدرے تلخی سے کہا۔

''ہاں ہوسکتا ہے۔'' شمس الرحمٰن سنجیدہ ہوگیا۔ ''زندگی میں پہلی مرتبہ میں نے اس لڑکے کے جبڑے پر گھونسا مارا تھا جس نے کہا تھا کہ مشرقی پاکستان میں ایک لڑکی ایک روپے میں ملتی ہے اور مغربی پاکستان سے بہت سے لوگ ویک اینڈ گزارنے محض اسی لیے جاتے ہیں۔''

''سچ ہوسکتا ہے۔ دنیا میں ہر جگہ ایسی لڑکیاں موجود ہیں۔'' زری نے کہا۔

شمس الرحمٰن نے اسے گہری نظر سے دیکھا۔ ''زری! اب تم بھی ایسی باتیں کرنے لگی ہو، کہاں کی لڑکی کیا حساب ملتی ہے، کیا اصل مسئلہ یہ ہے؟ جو مرد پانچ سو روپیہ کرایہ خرچ کرکے اس ایک روپیہ والی لڑکی کو حاصل کرنے آتا ہے، وہ قصوروار نہیں ہے؟ وہ لوگ قابلِ نفرت نہیں ہیں جو اس غربت کے ذمہ دار ہیں جس کی وجہ سے لڑکی اس حد کو پہنچی — زری بیگم سن لو کہ میری ہمدردیاں یقیناً ان بکنے والی لڑکیوں کے ساتھ ہیں، ان مردوں کے ساتھ نہیں ہیں جو انھیں خریدنے آتے ہیں۔''

''تو کس کم بخت کی ہمدردیاں ان مردوں کے ساتھ ہیں۔'' زری روکھی ہوگئی۔ ''میں تو یہ کہہ رہی تھی کہ جب یہاں کا بچہ بچہ یہ احساس دلائے کہ تم ہم میں سے نہیں ہو تو انسان اپنائیت کیسے محسوس کرسکتا ہے؟''

''تمھارے اپنے دل کا چور ہے۔ جب آدمی persecution menia میں گرفتار ہو تو اسے لگتا ہے کہ ہر شخص اسے جان سے مارنے کی کوشش میں لگا ہوا ہے۔''

''دیکھو، پھر تم نے مجھے الزام دیا۔'' زری منمنائی۔

''اچھا میری جان، غصہ تھوک دو۔'' شمس الرحمٰن نزدیک آکر اس کی طرف جھکا۔ ''اور اتنی جلد میرا ساتھ نہ چھوڑو۔ ہمارا تمھارا معاہدہ تھا کہ ہمیشہ سچ بولیں گے اور سدا سچ کی حمایت کریں گے، تھا یا نہیں؟''

''تو پھر کون پھرا اس معاہدے سے؟'' زری نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''کوئی بھی نہیں۔ لو سنو ایک بے حد اہم اعلان۔ میں نیشنل کاؤنسل سے استعفا دے رہا ہوں اور یونی ورسٹی کی ملازمت شروع کررہا ہوں۔''

''بس اکتا گئے یک جہتی کے کام سے؟'' زری نے دوبارہ وار کیا۔

''میں جو کام کرنا چاہتا ہوں وہاں رہ کر نہیں ہوسکتا۔ پابندیاں بہت ہیں۔ یونی ورسٹی میں آزادی ہوگی، گھر ملے گا۔'' وہ ٹہلتے ٹہلتے پلٹا۔ اخبار میں بھی لکھ سکوں گا۔ ہاں یاد آیا، آج شام کو پریس کلب

میں ایک تقریب ہے، وہاں جانا ہے۔"

شام کو پریس کلب کی تقریب میں زری نے ایک خوب صورت سوتی ساری باندھی، جوڑا بنایا، بڑی سی ٹپ ماتھے پر لگائی تو وہ شمس الرحمٰن کو حد سے پیاری لگی۔ پریس کلب میں بھی لوگ مڑ مڑ کر اسے دیکھتے رہے۔

۵ رمئی ۱۹۷۰ء— پتل کی دوست مُوکل ریڈیو پر آج کے پروگرام بتا رہی تھی— رابندر سنگیت، نذرل، گیتی— امار دیش— کیتا پاٹھ۔

بینو تان پورہ ہاتھ میں لیے تخت پر بیٹھی راگ دیس کا خیال الاپ رہی تھی۔ پیا بنا جیا مورا نا ہی کل پائے۔کوئی میرے پی کو دے یہ سندیسہ۔

شیزی اس کے پاس بیٹھی تان پورے پر چلتی مخروطی انگلیوں کو تک رہی تھی اور بینو کی آنکھوں کی گہرائیوں پر غور کر رہی تھی۔ شیزی کو بینو کی آنکھوں کی گہرائیاں اور ان میں تیرتی اودی، نیلی اور سبز پرچھائیاں بڑی بھلی لگتی تھیں۔ نہ جانے کہاں کہاں سے آ کے روشنیوں کے عکس اس کی آنکھوں میں جھلمل کرتے رہتے تھے جیسے میلوں دور کھڑے جہازوں کی روشنیوں کا عکس ساحلِ سمندر کے نزدیک پانی پر جھلملاتا رہتا ہے۔ بینو نے ریاض ختم کیا۔ریڈیو پر رابندر سنگیت کا نام سن کر اسے یاد آیا کہ تین دن بعد ٹیگور کی سالگرہ کا جشن ہونے والا ہے۔

''تم ٹیگور جینتی میں ساری پہن کے چلنا، سچ مچ بالکل زری شمس الرحمٰن لگو گی۔''

بینو ہنسی— بینو ہنستی تو اس کے سفید دمکتے دانتوں کی چمک کچھ اور بڑھ جاتی۔

''امی اور آنٹی راضی ہو جائیں گی؟''

''ارے ان کو راضی کر لیں گے۔کون سا مشکل کام ہے۔'' بینو نے یقین سے کہا اور اپنے لانبے بالوں کو اعتماد سے جھٹکا۔اس قسم کا اعتماد شیزی کو اندر سے ہلا دیتا تھا، جیسے اس کے اندر کوئی چیز ٹوٹنے

کی حد تک کمزور پڑ رہی ہو۔

''یہاں لوگ زری آنٹی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟'' شیزی نے پوچھا۔

''وہ شمس الرحمٰن کے ساتھ اکثر جلسے جلوسوں میں جاتی ہیں۔ کچھ لوگ اس بات کو اچھا سمجھتے ہیں، کچھ باتیں بناتے ہیں۔''

''تم ان سے ملی ہو؟''

''نہیں، کسی دن میں اکرام کے ساتھ ان کے گھر جاؤں گی۔ اکرام کی شمس الرحمٰن سے دوستی ہے اور وہ زری کو پسند کرتا ہے۔''

''میری امی تو انھیں بالکل پسند نہیں کرتیں، ہوسکتا ہے آنٹی بھی نہ چاہتی ہوں ورنہ اب تک ملنا جلنا شروع ہو جاتا۔''

''تو اس سے کیا ہوتا ہے۔ وہ اپنی عمر گزار چکیں۔ اب ہم جس طرح جینا چاہیں، ہمارا حق ہے۔''

شیزی نے بینو کی طرف دیکھا اور دیکھتی رہ گئی۔

''چلو اٹھو، رمنا تک گھومنے چلتے ہیں۔'' بینو نے کہا

''اِس وقت؟''

''ارے گھومنے پھرنے کا کوئی وقت نہیں ہوتا، اور ابھی تو شام ہی ہے۔ امّی کو بتا کر جائیں گے۔''

بینو اور شیزی رمنا پارک میں ایک بنچ پر بیٹھیں۔ چند دن بعد ٹیگور جینتی میں ڈانس ڈراما چترنگدا ہونے والا تھا۔ چترنگدا کا پارٹ بینو کی دوست چپّل کر رہی تھی اور بینو اس کی سہیلیوں میں سے ایک تھی۔ اس وقت وہ اسی ڈرامے کا ایک گانا دُہرا رہی تھی۔ سامنے نہر بہہ رہی تھی۔ نزدیک کے ریستوران کا سات آٹھ سالہ ایک مریل سا لڑکا ان کے لیے چائے شربت یا آئس کریم لانے کے لیے مرا جا رہا تھا۔ ان کے سر پر ایک عجیب سا درخت سایہ کیے تھا۔ اس درخت سے کسی بلوچی لڑکی کی بٹی ہوئی چوٹیوں ایسی سبز رسیاں سی لٹکی ہوئی تھیں۔ قریب ہی مولسری کے درخت سے ایک غریب عورت اور بچی تازے اور باسی پھول اتار رہی تھی۔ شیزی نے آئس کریم کے لیے اصرار کرنے والے بچے کو چند پیسے دے کر بھگایا اور آنکھیں بند کر کے بینو کے گانے کا لطف لینے لگی۔

توپ خانہ روڈ کی طرف سے دھماکے کی آواز آئی۔ بینو اسی طرح گاتی رہی۔ شیزی کچھ دیر سہمی بیٹھی رہی۔ گانا ختم ہوتے ہی وہ گھر جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اندھیرا ہو گیا تھا اور وہ اس طرح تنہا پھرنے کی عادی نہیں تھی۔ ریس کورس کے ''کرپا سدھی'' کے نزدیک سے گزرتی واپس ہوئیں اور رکشا لے کر گھر پہنچیں تو گھر میں سخت ہیجان برپا تھا۔ معلوم ہوا آج قومی یک جہتی کی کاؤنسل میں بم

پھٹا تھا اور الیاس اس وقت وہاں موجود تھا۔

''پورا قصہ سناؤ پلیز، بڑا ڈر لگا ہوگا'' نیلی نے بے حد ایکسائٹ منٹ سے کہا۔''ذرا بھی ڈر نہیں لگا۔'' الیاس نے عہدِ وسطیٰ کے جان بازوں کی طرح سینہ پھلالیا۔''میں اپنے ایک دوست منیر کے ساتھ بیٹھا لائبریری میں پڑھ رہا تھا کہ تین لڑکے انتہائی ڈرامائی انداز میں داخل ہوئے۔ وہ تینوں دروازے کے سامنے ٹھہر گئے اور بنگلہ میں کچھ کہا۔ لائبریری میں بہت سے لوگ تھے، میں ذرا دور تھا۔ مجھ تک ان کی آواز نہیں آئی۔ میں نے دیکھا کہ لوگ جلدی جلدی اخبار اور کتابیں رکھ کر باہر کی طرف لپک رہے ہیں۔ میں نے منیر سے پوچھا،'یار لوگ باہر کیوں بھاگ رہے ہیں؟' اس نے غصے سے مجھے دیکھا اور کہا،'سنا نہیں، وہ کہہ رہے ہیں، لائبریری خالی کرو ہم بم پھینکنے آئے ہیں۔''

ہم دونوں بھی باہر نکلے۔ نکلتے نکلتے ان تین لڑکوں میں سے ایک نے منیر کا گریبان پکڑا اور بنگلہ میں کہا،'تمھارا باپ یونین کاؤنسل کا چیئرمین تھا نا۔ یہاں آنا چھوڑ دو ورنہ —— اور تم بھی۔' دوسرے نے مجھ سے کہا۔

کیوں؟ بے وقوفی میں میرے منہ سے نکلا۔ اس لڑکے نے مجھے گھور کر دیکھا۔

اس وقت تک لائبریری خالی ہوچکی تھی۔ ان تینوں نے ہاتھ میں پکڑے ہوئے کاک ٹیل بم اٹھائے۔ میں اور منیر بے تحاشا سیڑھیوں کی طرف لپکے اور پھر ہم باہر نکل گئے۔ ہم ذرا دور گئے ہوں گے کہ دھماکے کی آواز آئی۔ کچھ دیر ہم پریس کلب کے احاطے میں کھڑے رہے کہ شاید پولیس آئے گی اور پکڑ دھکڑ ہوگی مگر جب دیکھا کہ کچھ بھی نہیں ہو رہا تو باہر نکل آئے۔ وہ تینوں لڑکے اسکوٹروں پر بیٹھ کر پہلے ہی جا چکے تھے۔''

''کسی نے ان لڑکوں کو پکڑا نہیں؟'' نیلی نے پوچھا۔

''نہیں، کسی نے بھی نہیں۔ راہ چلتے لوگ یوں آکر تماشا دیکھنے لگے جیسے آتش بازی چل رہی ہو۔''

''نقصان نہیں ہوا؟'' نیلی نے پوچھا

''فرنیچر اور کتابیں جلی ہوں گی۔ عمارت کو زیادہ نقصان نہیں ہوا۔''

''شمس الرحمٰن وہاں تھے کیا اس وقت؟'' بینو نے پوچھا۔

''نہیں۔ دفتر تو بند ہوچکے تھے۔''

''شکر ہے کہ انھوں نے نوٹس دے دیا، اگر ایسے ہی پھینک کر چلے جاتے تو کیا ہوتا؟'' بیگم احسن نے کہا۔

نیلی بیٹھی بیٹھی کانپ سی گئی۔ مرزا صاحب جواب تک خاموشی سے ساری کہانی سن رہے تھے

یکایک شیر کی طرح دھاڑنے لگے، ''آخر ایسی باتوں سے یہ لوگ کیا جتانا چاہتے ہیں؟''

الیاس اور بینو نے مدتوں سے مرزا صاحب کو اتنے غصے میں نہ دیکھا تھا۔ بیگم مرزا پہلے ہی اتنی دہلی ہوئی تھیں کہ منہ سے پوری بات نہیں نکل رہی تھی۔

''وہ صرف کاؤنسل سے اپنی مایوسی کا اظہار کر رہے تھے۔'' بینو نے دہشت کو کم کرنے کی کوشش کی۔ ''اسی لیے انھوں نے لوگوں کو نکال دیا تھا۔''

اس جواب سے مرزا صاحب اور بھڑک اٹھے، ''مایوسی کے اظہار کا یہ طریقہ ہے؟ احتجاج صرف بم ہاتھ میں لے کر کیا جا سکتا ہے اور کوئی طریقہ نہیں؟''

''اور سب فیل ہو گئے نا ابو۔'' بینو نے سر پر کفن باندھ کر کہا۔

''بس تم چپ رہو۔'' بیگم مرزا نے ڈانٹا۔ ''خبردار، جو تم نے غنڈوں کی طرف داری کی۔''

الیاس اور نیلی کے سامنے ڈانٹ کھانے میں بینو نے سبکی محسوس کی اور چپ چاپ اپنے کمرے میں چلی گئی۔ نیلی اور الیاس برآمدے کی سیڑھیوں پر آ بیٹھے۔ باغ پر اندھیرا اتر آیا تھا۔ پیچھے تالاب سے مینڈکوں کے ٹرانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آج دن میں دو مرتبہ بارش ہوئی تھی مگر اس وقت آسمان صاف تھا۔

بینو نے شیزی کو سرخ بلاؤز کے ساتھ سرخ بارڈر والی کریم رنگ کی راجشاہی سلک کی ساری بندھوائی تھی۔ ماتھے پر بندیا لگوائی تھی۔ بالوں کا جوڑا باندھا تھا۔ وہ دونوں ٹیگور جینتی میں جانے کے لیے باہر نکل رہی تھیں کہ نیلی نے اسے دیکھا اور دیکھتی ہی رہ گئی۔

''یو آر لکنگ بیوٹی فُل'' نیلی نے کہا۔ ''بینو آپا، شیزی کی تصویر ضرور کھنچوائیے گا۔''

''اچھا، مگر تم اتنی خوش کیوں ہو رہی تھیں؟''

''میرا برتھ ڈے کارڈ آیا ہے لاہور سے، میں تو بھول ہی گئی تھی کہ آج میری سالگرہ ہے۔''

''ارے ہاں ہم سب بھول گئے تھے، اعجاز کا کارڈ ہے، لاؤ دکھاؤ۔''

شیزی نے کارڈ لے کر دیکھا۔ ایک بڑا سا خرگوش ایک منّے سے خرگوش سے ہاتھ ملا کر اسے سالگرہ کی مبارک باد دے رہا تھا۔ اندر ایک چھوٹی سی انگریزی نظم تھی۔

''ہیپی برتھ ڈے نیلی!'' بینو نے جھک کر اس کے گال پر پیار کیا۔ روزن سے آنے کے بعد سے وہ بے حد خوش تھی۔

''جواد بھائی نے اس سال مجھے کارڈ نہیں بھیجا۔'' نیلی نے شکایتاً کہا۔ شیزی جھک کر اپنی ساری ٹھیک کرنے لگی۔

''الیاس! آج نیلی کی سالگرہ ہے، آ کر اسے مبارک باد دو۔'' بینو نے الیاس کو آواز دی۔

''سچ مچ ــــ تم رابی ٹھاکر کے جنم دن کے دن پیدا ہوئی تھیں، کتنی بڑی بات ہے۔''

''ارے پگلے یہ کون سی بڑی بات ہے۔'' بینو نے کہا۔
''مجھے تو یہ بڑی بات لگتی ہے کہ آدمی کسی بڑے آدمی کی پیدائش کے دن پیدا ہو۔ شاید قائداعظم کو بھی اس بات کی خوشی ہو کہ وہ حضرت عیسیٰؑ کی پیدائش کے دن پیدا ہوئے تھے۔''
''شاید اسی لیے وہ بڑے آدمی ہوئے۔'' نیلی نے خوش ہو کر کہا۔
''تم مجھے اپنا پتا دے کر جانا، میں تمھیں ٹھاکر کی سالگرہ کے دن کارڈ بھیجا کروں گا۔''
''ٹھاکر کی سالگرہ کے دن یا میری سالگرہ کے دن!'' نیلی ہنسی۔ الیاس جھینپ گیا۔
''میرا مطلب تھا تمھاری سالگرہ کے دن، مگر ٹھاکر کی وجہ سے مجھے تمھارا جنم دن کبھی نہیں بھولے گا۔''
شیزی نے کارڈ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ شاید کوئی نوٹ، کوئی پیغام — لفافے میں جھانک کر دیکھا — کوئی خط! — نہیں کچھ نہیں۔
''یہ کارڈ امی کو دکھا دو۔'' شیزی نے کہا؟
''آؤ چلیں۔'' بینو، شیزی کا ہاتھ تھام کر باہر نکل گئی۔
''کیا یہاں ٹیگور کو لوگ اتنا پسند کرتے ہیں؟ ہم تو سمجھتے ہیں کہ وہ ہندوؤں کے شاعر تھے۔''
''نہیں، وہ بنگلہ زبان کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ یہاں ہر گھر میں ان کی کتابیں اور تصویریں ہوتی ہیں۔ دیکھ رہی ہو ان کا ایک سونواں جنم دن کتنی دھوم دھام سے منایا جا رہا ہے، حالاں کہ ریڈیو اور ٹی وی پر انھیں بین کر دیا گیا ہے۔ مگر آج ریڈیو سے بھی رابندر سنگیت ہو رہا ہے۔''
''ریڈیو اور ٹی وی پر شاعروں کو بین کیوں کرتے ہیں؟'' نیلی نے پوچھا۔
''معلوم نہیں، میں نے تو ان کے حالاتِ زندگی پڑھے ہیں۔ مجھے تو وہ بہت اچھے لگتے ہیں۔''
''ہاں، میں نے بھی ان کی کہانیاں انگلش میں پڑھی ہیں، ''کابلی والا'' — اور وہ — کیا نام ہے اس کا جس میں ایک لڑکا ہاسٹل سے واپس آتا ہے۔''
''ہوم کمنگ (Home Coming)'' الیاس نے کہا۔ ''میرا بہت جی چاہتا ہے کہ ایک بار پھر ان کے گاؤں جا کر ان کی کوٹھی کا وہ کمرہ دیکھوں جہاں بیٹھ کر وہ شاعری کرتے تھے۔''
''تم نے دیکھا ہے — کیا ان کا گھر نزدیک ہے؟''
''ارے نہیں، بہت دور ہے۔ کشتیا میں پدّاندی سے دو فرلانگ پر، گھر کا نام ہے 'کوٹھی باڑی' بہت بڑا باغ ہے، جس میں آم اور دوسرے پھلوں کے بہت سے درخت ہیں۔ ان کے گھر میں کتنا مزہ آتا ہوگا۔ ان کے بزرگ گھر میں ڈرامے اسٹیج کرتے تھے جہاں بچوں کو جانے کی اجازت نہیں تھی، بے چارے رابی ٹھاکر بھی نہیں جا سکتے تھے۔

''مجھے تو یہ سوچ کر ہنسی آتی ہے کہ اتنی لمبی سفید داڑھی والے ٹیگور کبھی بچے ہوں گے۔'' نیلی اپنی اس بات پر خود ہی ہنستی رہی۔

''بڑے ہو کر انھوں نے خود بھی ڈراموں میں کام کیا۔'' الیاس نے بتایا۔

''کتنا اچھا ہوتا اگر بینو آپا ہمیں ساتھ لے جاتیں۔ ہم بھی دیکھتے ڈانس ڈراما کیسا ہوتا ہے؟''

''یہ تو میں بھی تمھیں بتا سکتا ہوں۔ راوی قِصّہ بیان کرتا ہے۔ ساتھ میں گانے اور رقص ہوتے ہیں کبھی کبھی مکالمہ بھی ہوتا ہے مگر گانے کے انداز میں۔''

''اور سین؟''

''ہاں سین اور کپڑے وغیرہ ڈرامے کے انداز کے ہوتے ہیں، مثلاً چتر نگدا کی کہانی تھوڑی سی تمھیں سناتا ہوں۔ ٹھاکر نے یہ کہانی 'مہا بھارت' سے لی ہے۔ چتر نگدا مونی پور کی شہزادی تھی جس کے باپ کو کسی دیوتا نے دعا دی تھی کہ اس کی نسل میں لڑکے ہی لڑکے پیدا ہوں گے —— پھر کسی وجہ سے مجھے یاد نہیں کہ کیوں ایک لڑکی پیدا ہوئی۔ پورے خاندان میں وہ واحد لڑکی تھی۔ خوب صورت بھی نہیں تھی۔ اس لیے اس کی پرورش لڑکوں کے انداز میں ہوئی۔ تیر اندازی، گھڑ سواری اور شکار۔ ایک دن وہ سہیلیوں کے ساتھ جنگل میں جاتی ہے۔ یہاں سے ڈراما شروع ہوتا ہے۔ یہاں ارجن گیان میں بیٹھے ہوں گے۔ اب سہیلیاں گانا گائیں گی، مثلاً آہستہ چلو تاکہ ہرن کی ڈاریں خوف زدہ نہ ہوں —— یا واپس چلو شام ہو رہی ہے۔ مگر وہ واپس جانے سے انکار کرے گی۔ تب سہیلیاں سمجھ جائیں گی کہ چتر نگدا راج کمار ارجن کو پسند کرنے لگی ہے۔ اس طرح وہ آتی رہے گی مگر ارجن اس کی طرف دھیان نہیں دیں گے کہ وہ برہمو چاریہ ہیں اور لڑکیوں میں دل چسپی نہیں لے سکتے۔ اس طرح کئی گانے اور رقص ہوں گے۔ پھر چتر نگدا دیوتا مدن سے جو پریم کے دیوتا ہیں، مدد مانگے گی —— کہے گی کہ یہ میری نہیں تمھاری توہین ہے۔ وہ اسے خوب صورت بنا دیں گے۔ اور جب وہ خوب صورت عورت بن کر گاتی اور ناچتی ہوئی ارجن کے سامنے آئے گی تو وہ اپنی تپسیا بھول جائیں گے اور اسے پسند کرنے لگیں گے۔''

''ٹیگور خود ارجن بنتے ہوں گے؟'' نیلی نے پوچھا۔

''ہاں، ہو سکتا ہے وہ خود ہی بنتے ہوں کیوں کہ وہ اپنے گانوں کو خود ہی کمپوز بھی کرتے تھے۔''

سادر کے پار سورج ڈوب گیا تھا۔ اندھیرا ہو گیا تھا۔

''آؤ اندر چلیں۔'' الیاس نے کہا۔

''تھوڑی دیر اور بیٹھو۔ اتنا اچھا لگ رہا ہے۔ بینو آپا آئیں گی تو میں سارا ڈراما ان سے سنوں

گی۔'' نیلی نے کہا۔

وہ دونوں سیڑھیوں پر بیٹھے رہے۔ الیاس گم صم اندھیرے میں چمکنے والے نیلی کے گول مٹول چہرے اور چمکتی آنکھوں کو دیکھتا رہا۔

بینو اور شیزی واپس آئیں تو بے حد خوش تھیں۔ چتر نگدا ڈانس ڈراما بے حد کامیاب رہا تھا۔ چتل، مُوکل اور بینو سب اپنی اپنی جگہ خوب چمکی تھیں۔ ڈاکٹر شہید اللہ تقریروں کے بعد اٹھ کر چلے گئے تھے کہ جوان لڑکیاں ناچیں گی، بری بات ہے۔ ڈھیلا پاجامہ، شیروانی پہنے چھوٹے سے قد اور لانبی داڑھی والے ڈاکٹر شہید اللہ شیزی کو بڑے 'کیوٹ' لگے تھے۔ کوی جسیم الدین بھی اسے بھائے تھے۔ سفید گنے چنے بال، آنکھوں پر موٹا سا چشمہ، جن کے پیچھے سوئی سوئی آنکھوں میں بڑی زندہ دلی تھی۔ کوٹ کے بٹن کھلے ہوئے تھے اور جیبوں میں ہاتھ ڈالے وہ عورتوں مردوں کے مجمع میں کھڑے ہنس رہے تھے کبھی انگریزی بول رہے تھے، کبھی بنگلہ اور کبھی ٹوٹی پھوٹی اردو۔ چلتے تو لگتا کہ جھوم رہے ہیں، اور کوٹ ان کے کندھوں پر جھول رہا ہے، خوش اور مگن — بنگال کے بڑے نام — اپنی آنکھوں سے ان کو دیکھنے کے بعد شیزی پھولی نہیں سما رہی تھی اور نیلی کو شدت سے احساسِ محرومی ہو رہا تھا۔ کیا تھا اگر بینو آپا اسے بھی لے جاتیں۔ نہ معلوم اسے کیوں ابھی تک بچہ سمجھا جاتا ہے۔

۳۰ر اپریل کو جالو پاڑہ پتھر گھاٹا چٹا گانگ میں آگ لگ جانے سے چالیس گھر جل گئے تھے۔ نرگس نے لکھا تھا کہ یہ آگ تندور کی وجہ سے لگی لیکن بیگم احسن بدحواس ہوگئی تھیں۔ روز کہیں نہ کہیں سے بم پھٹنے اور آگ لگنے کی خبریں آرہی تھیں۔ جس دن نیشنل کاؤنسل میں بم پھٹا تھا، اس دن کے بعد سے بیگم احسن قطعی یہاں رہنے کو تیار نہیں تھیں۔ شیزی بھی واپس جانا چاہتی تھی۔ اس کی پڑھائی کا حرج ہورہا تھا۔ بینو کو اس بات کا اندازہ تھا کہ وہ کیپٹن جواد کے مشرقی پاکستان آنے سے پہلے واپس جانا چاہتی ہے۔ شیزی نے اسے اپنا راز دار نہیں بنایا تھا مگر وہ اتنا ضرور جان گئی تھی کہ شیزی رشتے سے ہرگز خوش نہیں ہے۔

چناں چہ ٹیگور جینتی کے دوسرے ہی دن بیگم احسن، شیزی اور نیلی واپس لاہور روانہ ہوگئیں۔

اگلے ماہ کیپٹن جواد ڈھاکا پہنچا۔ بیگم احسن نے اسے خط میں اپنی بہن کا پتا لکھا تھا اور تاکید کی تھی کہ وہاں ضرور جائے۔ کئی ماہ تک تو جواد نے الیاس منزل کا رخ نہ کیا۔ پھر فوجی افسروں کو مقامی گھروں میں جاتا دیکھ کر اسے بھی شوق ہوا اور اس کے بعد تو وہ اکثر ادھر کا رخ کرنے لگا۔ گھر میں سب سے زیادہ بیگم مرزا اس کی پذیرائی کرتیں۔ بالکل روایتی ساس بن کر وہ داماد کے لیے طرح طرح کے پکوان پکواتیں اور ہر طرح اس کی خاطر کرتیں کہ بہن کو کوئی شکایت نہ ہو۔ مرزا صاحب کا رویہ نارمل تھا۔ بینو اور الیاس لیے دیے رہتے تھے۔ اس کے باوجود کیپٹن جواد وہاں جاتا تھا اور بیگم مرزا کو اکثر جتایا کرتا تھا کہ بینو کا جن لوگوں میں اٹھنا بیٹھنا ہے، وہ قابلِ اعتماد نہیں ہیں۔

اب وہ اپنی خالہ زاد بہن شیزی کو کس طرح بتائے کہ اس کے شوہر کیپٹن جواد نے اسے کس کس طرح ذلیل کرنے پر کمر باندھی ہے۔ بینو یہ سوچتی ضرور ہے۔ وہ اکثر امی سے کہا کرتی تھی کہ جواد بھائی کو یہاں آنے سے منع کردیں۔ ہمارے محلے والے اور دوست پوچھتے ہیں کہ یہ کون کیپٹن تمھارے ہاں آتا جاتا ہے؟ اور اس کی امّی فخر سے کہا کرتی تھیں، ان سے کہہ دو کہ وہ تمھارا بہنوئی ہے، ہاں نہیں تو، وہ میری بہن کا داماد ہے اس لیے میرا بھی داماد ہے۔ ہزاروں کے سگے رشتے دار دونوں طرف کے ہیں تو کیا ہمیشہ کے لیے ان سے رشتے توڑ لیں۔ کیا سبحان نے اپنی ساس سے منھ موڑ لیا ہے؟ کیا شوکت کی ساس اس کے گھر نہیں رہ رہی؟

''وہ سگے ہیں، انھیں ایک دوسرے سے پیار ہوگا۔ یہاں کچھ لوگ تماشا دیکھنے اور مخبری کرنے بھی آسکتے ہیں۔''

اور یہ بات جواد نے سن لی تھی جو ہمیشہ بغیر گھنٹی بجائے بے تکلفی سے بلا روک ٹوک گھر میں آیا جایا کرتا تھا۔ اس نے طنز سے کہا تھا، ''ذرا ان سے یہ تو پوچھ کر دیکھیے کہ ان کے اپنے کون ہیں؟ وہی نا جنھوں نے خفیہ انجمنیں بنا رکھی ہیں اور دوسرے ملکوں سے معاہدے کر رکھے ہیں، جنھوں نے 'اسد ڈے' پر اعلان کیا ہے کہ عوامی لیڈر اپنے راستے سے ہٹ رہے ہیں۔ عوام کا کارواں ان کو کوڑے کے ٹین میں پھینک کر آگے بڑھ جائے گا، اور وہی لاٹھیاں ان کے خلاف استعمال کی جائیں گی جو انھوں نے دشمنوں کے خلاف رکھنے کو کہا ہے۔ ان کی سہیلیاں پتّی، مُکل،

پاول وغیرہ سب ان میں شامل ہیں۔''

''آپ کو میری سہیلیوں کے خلاف کچھ کہنے کا حق نہیں ہے۔''

''مجھے آپ سے تو کچھ کہنے کا حق نہیں ہے مگر آنٹی سے کہتا ہوں کہ اپنے بچوں کو ذرا باندھ کر رکھیے گا۔اب ان کا شہید ڈے بھی آنے والا ہے۔''

''دیکھیے آپ میرے خلاف امی کو نہ بھڑکائیں، اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہوگا'' کہہ کر بینو تیزی سے باہر نکل گئی تھی۔

''آنٹی! جلسے جلوسوں کے بعد رات کو یہ لوگ مشعلیں لے کر ٹولیوں میں نکلتے ہیں اور گھروں میں مشعلیں پھینکتے جاتے ہیں۔ میں آپ کو سچ سچ بتا رہا ہوں کہ بینو کو ان لوگوں سے دور رکھیے ورنہ آپ کا پورا گھر لپیٹ میں آسکتا ہے۔''

''اللہ نہ کرے۔ چند دن کی بات ہے یہ اپنے گھر کی ہو جائے گی۔ پھر وہ جانیں اور یہ، ہم خیر سے مغربی پاکستان سدھاریں۔''

جواد باہر نکلا تو بینو کو شرارت سوجھی۔ وہ دوڑ کر گئی اور مٹھی میں کوئی چیز دبا کر الیاس کو دی کہ جواد کو دکھا کر واپس لے آئے۔ جواد گیٹ سے باہر نکل چکا تھا کہ الیاس نے اس کے ہاتھ میں ایک تصویر تھما دی۔''بینو آپا نے آپ کو دکھانے کے لیے بھیجی ہے۔'' یہ شیزی اور بینو کی وہ تصویر تھی جو ٹھاکر جینتی کے دن کھینچی گئی تھی۔ دونوں سرخ بارڈر کی زرد ساریاں باندھے، بندیا لگائے پاس پاس کھڑی ہنس رہی تھیں۔ جواد نے تصویر اپنی یونی فارم کی جیب میں رکھ لی اور بے نیازی سے ہاتھ کی ڈنڈی ہلاتا جیپ میں بیٹھ گیا۔

بینو ستار پر راگ مدھ ونتی کی مشق کر رہی تھی کہ کیپٹن جواد چپ چاپ اس کے پاس آن کھڑا ہوا۔ بینو نے اسے نظر انداز کرنے کی کوشش کی تو اس نے ستار کی آواز کو نظر انداز کر کے کہا،''تمھارا اٹھنا بیٹھنا غلط آدمیوں میں ہے بینو! میں تمھیں سمجھا رہا ہوں، ورنہ ایک وقت ایسا بھی آسکتا ہے جب میں تمھیں نہ بچا سکوں گا۔''

''اپنی ہم دردیاں اپنے پاس رکھیے، ہمیں آپ کی حفاظت کی ضرورت نہیں ہے۔'' بینو نے ستار پر اپنی انگلیاں روک لیں۔

''سوچ لو، حالات نازک ہیں، لوگ تو فوجی افسروں سے دوستی کرنے کی فکر میں رہتے ہیں اور تم گھر آئی لچھمی پر لات مار رہی ہو۔'' وہ جالی لگے برآمدے سے باہر شپلا کے پھولوں کو تکنے لگا۔

''اب یہ گورنری، یہ صدارت، یہ فوجی حکومت، سب تھوڑے دن کی ہے، ان پر اتنا نہ اترائیے۔'' بینو نے کہا۔

''تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ کسی فوجی کے سامنے ایسی باتیں کہنا غداری کے مترادف ہیں۔''
جواد نے غصے سے پلٹ کر دیکھا۔

''کیوں؟ الیکشن ہو چکے ہیں، حکومت تو عوام کو دینی ہی پڑے گی، اگر یہ غداری ہے تو جائیے مجھے پکڑوا دیجیے۔''

''ہوسکتا ہے لسٹ میں تمھارا نام ہو۔'' جواد نے ہاتھ کی بید اپنی اکڑی ہوئی پتلون پر مارتے ہوئے کہا۔

''کسی نہ کسی لسٹ میں آپ کا نام بھی ہوگا۔'' بینو نے دُوبدو جواب دیا اور دوبارہ ستار کی طرف متوجہ ہوئی۔

''ہمیں معلوم ہے، آئے دن جو یہ کاک ٹیل بم پھٹتے ہیں، یہ کالجوں اور یونی ورسٹیوں میں بنائے جاتے ہیں۔ کسی دن ریڈ ہینڈیڈ پکڑی گئیں تو تمھارے والدین کی وفاداریاں بھی کام نہ آئیں گی۔''

''اچھا یہ بتائیے، یہاں نکڑ پر جو گھر ہے اور اکثر آپ لوگوں کی جیپیں وہاں کھڑی نظر آتی ہیں ان کی وفاداریاں کس کے ساتھ ہیں؟'' بینو نے ستار ہاتھ سے رکھ دیا۔

''وہ آرٹسٹ لوگ ہیں۔ گانا وانا سننے بلاتے ہیں تو چلے جاتے ہیں، آخر ہم بھی انسان ہیں۔''

''انسان کیوں؟ مرد کہیے، اور مردوں کا کام کیا صرف آوارہ گردی ہونا چاہیے؟'' بینو نے غصے سے کہا۔

''تم اپنے محلے کی لڑکیوں کو بھی تو کچھ کہو۔'' جواد نے مسکرانے کی کوشش کی۔

''وہ میرے محلے کی لڑکیاں نہیں ہیں، وہ اس شہر کی لڑکیاں بھی نہیں ہیں۔ وہ کہیں باہر سے آئی ہیں۔ ہوسکتا ہے کسی دوسرے ملک کی ہوں، آپ مجھے وارن کر رہے تھے۔ میں نے سوچا، میں بھی بدلہ چکا دوں تو اچھا ہے۔'' بینو کی سیاہ آنکھوں میں طرح طرح کی روشنیاں ناچ رہی تھیں۔

''یہ تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ وہ یہاں کی نہیں ہیں؟'' جواد اس کے نزدیک کھسک آیا۔

''جس طرح آپ صورت سے پنجابی، پٹھان اور بلوچی کا اندازہ کر لیتے ہیں، ہم بھی جان لیتے ہیں کہ کون کہاں کا ہے — ڈھکیہ، مرشد آبادی، سلہٹی، چاٹ گامی، بہاری — سب کا پتا چل جاتا ہے۔''

''بہرحال، یہ لوگوں کے ذاتی معاملات ہیں، ہم کیا کہہ سکتے ہیں۔'' کیپٹن جواد فراخ دلانہ مسکرایا۔

''بعض اوقات ذاتی معاملات بڑے خطرناک بن جاتے ہیں۔ آپ کے ہاں کے بڑے لوگوں کی ساری عیاشی ان کا نجی معاملہ ہی تو ہے جس نے ملک کا یہ حال کر دیا ہے۔''

''دیکھو، اب تم حد سے بڑھ رہی ہو۔'' جواد سنجیدہ ہوگیا۔

''میں نے کوئی نئی بات نہیں کہی، بچہ بچہ جانتا ہے۔'' بینو بے نیازانہ باہر جھانکنے لگی۔

"یہ سب افواہیں ہیں جو مغربی پاکستانیوں اور فوجیوں کو بدنام کرنے کے لیے پھیلائی جا رہی ہیں، اور افسوس کہ ہمارے اپنے رشتے دار بھی ان میں شریک ہیں۔"

"تو آپ ایسے رشتے داروں سے دور رہیے — ہم تو خود اس لیے ڈرتے ہیں کہ آپ کے یہاں آنے جانے سے لوگ ہمارے گھر کو بھی کوئی ایسا ویسا—" بینو خاموش ہوگئی۔

"کہو" خاموش کیوں ہوگئیں۔

"میں جو کچھ کہنا چاہتی ہوں، آپ ضرور سمجھ گئے ہوں گے۔ ان معاملات میں فوجی سمجھ دار ہوتے ہیں۔"

"میں جیسا بھی ہوں مگر تم واقعی بے وقوف ہو بینو۔ لوگ تو چاہتے ہیں کہ ان کے ہاں فوجی افسروں کا آنا جانا رہے تاکہ غنڈے ڈر کر رہیں۔ کیا معلوم کل کس پر کیا وقت آئے؟" جواد نے سفید جھنڈا لہرایا۔

"کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ جب آپ کی مدد کی ضرورت ہو، آپ کو بلا لیا جائے۔" بینو نے کہا۔

"یہ تو وقت آنے پر معلوم ہوگا، ہماری یونٹ یہاں سے آگے جانے والی ہے۔"

"شکر خدا کا" بینو نے آہستہ سے کہا،" اچھا یہ بتائیے، میں نے سنا ہے کہ یہاں سے کوئی بھاگتا ہے تو آپ فوجی اس کی زمین جائداد کو اپنے کسی بھائی بند کے نام الاٹ کردیتے ہیں۔"

"تم ہمارے خلاف ساری افواہیں بڑے غور سے سنتی ہو، تم فوجیوں کی طرف سے اتنی بدگمان کیوں ہو؟ کبھی تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ سرحدوں پر دن رات کھلے آسمان کے نیچے فوجی بے چارے کس طرح رہتے ہیں۔ جنگ میں شہریوں کی حفاظت کی خاطر کیسے مارے جاتے ہیں۔ ٹریننگ اور ایکسر سائز کے دوران فوجی جس طرح زندگی گزارتے ہیں، آپ ایک ہفتہ گزار لیں تو اللہ کو پیاری ہوجائیں۔"

"یہ کوئی بات نہیں ہے، ہمارے ہاں کے کسانوں کی زندگی آپ چار دن گزار کر دکھا دیجیے۔ گھٹنے گھٹنے پانی میں دن رات کھڑے رہنے سے ان کی کھال بھی گل جاتی ہے۔ چاروں طرف مچھر، آئے دن بارشیں طوفان میں اڑ جاتی ہیں۔ بچے سیلاب میں بہہ جاتے ہیں، جانور مر جاتے ہیں اور جن کے پاس پہلے بھی کچھ نہیں تھا، اللہ کی رضا پر راضی ہوکر پھر جان مارنے لگتے ہیں، ایک دن اچانک درخت کے نیچے دب کر مرجانے کے لیے، سانپ سے ڈسے جانے کے لیے، یا بیماریوں میں بغیر دواؤں کے ختم ہوجانے کے لیے۔"

"تو یہ سب ہمارا قصور ہے؟" جواد نے تلخی سے کہا۔

"اور کس کا ہے؟ نومبر میں سیلاب آیا تھا۔ ایک لاکھ سے زیادہ آدمی مرے۔ دنیا بھر نے مدد کی اور ان لوگوں تک کچھ بھی نہیں پہنچا۔ سب بیچ میں ہضم ہوگیا۔"

''یہ سب پروپیگنڈہ ہے۔ امداد تو تقسیم ہی غیر ملکی ایجنسیوں سے کروائی گئی تھی، اور اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ پاکستانی حکومت کی ساکھ خراب ہو۔ تم بتاؤ تم نے ان لوگوں کے لیے کیا کیا تھا؟ صرف زبانی ہم دردی یا کچھ اور — تم جو اتنی بڑی کوٹھی میں رہتی ہو، دو دو کاروں کی مالک ہو، تمھارے ہونے والے سسرال میں بھی بہت زمینیں ہیں، وہ کیوں نہیں بانٹ دیتے غریبوں میں؟''

''اچھا تو میری سسرال کی بات بھی آپ تک پہنچ گئی۔ سنیے ہمارے ہاں تین مرتبہ زرعی اصلاحات ہوئی ہیں اور کسی کے پاس مغربی پاکستانیوں کی طرح سیکڑوں بیگھے زمین نہیں ہے۔''

''ہمارے ہاں تو تم اس طرح کہتی ہو جیسے سات پشتوں سے مشرقی پاکستان میں رہتی آئی ہو۔''

اسی وقت بیگم مرزا اندر آئیں۔ جواد نے سلام کیا۔

''ارے تم کھڑے کیوں ہو، بیٹھو نا۔''

''کوئی بیٹھنے کو کہے بھی۔'' جواد نے بینو کی طرف دیکھ کر کہا۔ بینو فوراً اپنا ستار لے کر برآمدے سے باہر چلی گئی۔

بیگم مرزا جواد سے اپنا رونا رونے لگیں، ''سنا ہے یونی ورسٹی میں بہت اسلحہ آ رہا ہے، سرحد پار سے بہت لوگ آ رہے ہیں، تم لوگوں کو کچھ پتا بھی ہے؟''

''سب پتا ہے آنٹی! سب ہوشیار ہیں، وقت آنے پر آپ دیکھیں گی کہ کیا ہوگا۔''

''نہ بھائی، مارکٹائی کے بغیر ہی حل نکالو۔''

''کوشش تو ہو رہی ہے، یہ نہ ہوا تو دوسرا حل بھی ہے ہمارے پاس۔''

''جگہ جگہ غیر بنگالی مارے جا رہے ہیں، پھر بھی سارا الزام فوج پر آ رہا ہے کہ یہاں گولی چلا دی، وہاں گولی چلا دی، ہر جگہ یہی سن رہی ہوں۔''

''دیکھ لیجیے۔''

سورج کسی کام سے اندر آیا اور جواد کو بغیر سلام کیے، مٹھوٹی چڑھائے، بیگم مرزا سے کوئی بات کر کے واپس چلا گیا۔

''آنٹی! یہ آپ کے ملازم تک ہمیں دیکھ کر منھ بنا لیتے ہیں۔ آپ انھیں کچھ نہیں کہتیں۔''

''کیا کہیں بھائی، زمانے کی ہوا بدل گئی ہے۔ جس کو دیکھو یہی کہتا ہے کہ پہلے مغربی پاکستانیوں نے ہمیں لوٹا — اب جو بچا کھچا رہ گیا ہے یہ فوجی لوٹ رہے ہیں۔ ہم تو سوچتے ہیں جب تک رہیں، عزت آبرو سے رہیں اور عزت آبرو سے جائیں۔''

''کیا ضرورت ہے آپ کو جانے کی۔'' جواد نے طنطنے سے کہا۔ ''ہم جو یہاں موجود ہیں، اتنی

دور سے آپ لوگوں کی خاطر ہی تو آئے ہیں۔" بینو کو اس طرف آتے دیکھ کر جواد نے اس کی طرف اشارہ کیا، "آپ کی خاطر۔"

"نہ بھائی! تم باہر سے آئے ہو، تمھیں یہاں کی فضا کا اندازہ نہیں، ہم تیس سال سے رہ رہے ہیں، ہوا کا رخ پہچانتے ہیں۔ ایک بدلی سے اندازہ کر لیتے ہیں کہ طوفان آنے والا ہے۔"

"طوفانوں کی بات ہم نہیں جانتے، مگر یہ جانتے ہیں کہ اگر سیدھی انگلیوں سے گھی نہ نکلا تو ہم ان سیاہ فام بونوں کو سیدھا کر دیں گے۔"

"دیکھو، میں پھر کہتی ہوں تم لڑائی بھڑائی کی باتیں نہ کرو۔ یہ لوگ بہت سیدھے سادے ہیں، دیکھنے میں کمزور لگتے ہیں مگر جوشیلے بہت ہیں۔ ایک دفعہ جوش آ جائے تو پھر کسی چیز سے نہیں ڈرتے۔"

"ٹینکوں توپوں سے بھی نہیں؟" جواد ہنسا۔

"ٹینکوں توپوں سے بھی نہیں۔" بیگم مرزا کے بجائے بینو نے پلٹ کر کہا جو چپ چاپ کھڑی کھڑکی سے باہر دیکھ رہی تھی۔

"تم چپ رہو بینو۔" بیگم مرزا نے بینو کو ڈانٹا۔

"کھانا کھا کر جانا۔" بیگم مرزا نے کہا

"نہیں، اس وقت موڈ نہیں —— خدا حافظ۔"

جواد باہر نکلا تو دیکھا کہ سورج اور الیاس دروازے پر کھڑے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔ جانے کیوں اسے یوں لگا جیسے وہ اس پر ہنس رہے ہوں۔

"اے، تم، ذرا جا کر ڈرائیور سے کہو جیپ یہاں لے آئے۔" جواد نے سورج سے کہا۔

جیپ چند قدم کے فاصلے پر تھی۔

سورج منہ بنا کر گیٹ سے باہر تو چلا گیا مگر جیپ ڈرائیور سے اس نے کچھ نہ کہا۔ ڈرائیور جواد کو باہر کھڑا دیکھ کر خود ہی جیپ لے گیا۔

پتل ایڈن کالج میں اپنے ڈیسک پر بیٹھی تھی۔ سب لڑکیاں حسبِ معمول حاضر تھیں مگر فضا روز سے مختلف تھی۔ سب کو کچھ ہونے کا انتظار تھا — آج 'اسد ڈے' تھا دو سال پہلے اسی دن ان لوگوں نے گورنمنٹ ہاؤس کی سڑک عوام کے لیے بند ہونے کے خلاف احتجاج کیا تھا۔ وہ بینو کو ساتھ لینے گئی تھی تو پہلے اس کی امی سے مڈھ بھیڑ ہوئی تھی۔

''کہاں جارہی ہو تم دونوں؟'' انھوں نے کڑے تیوروں سے پوچھا تھا۔

''گورنمنٹ ہاؤس آنٹی!'' اس نے ہنس کر جواب دیا تھا۔ بینو کی امی سیاست کی الف بے سے بھی ناواقف تھیں۔

''کیوں؟ — کیا انھوں نے تم لوگوں کو بات چیت کے لیے بلایا ہے؟''

''یہی سمجھ لیجیے۔'' اس نے کہا تھا۔ اسی وقت بینو سرخ کنی کی سفید ساری میں ملبوس، ماتھے پر بندیا لگائے آئی تھی۔ پتل نے بیگم مرزا سے بنگلہ زبان میں کہا تھا، ''آپ فکر نہ کریں آنٹی، ہم جلدی آجائیں گی۔''

''تمھیں اردو نہیں آتی پتل؟'' بیگم مرزا نے جل کر پوچھا تھا۔

''آتی ہے آنٹی! مگر پچھلے سال سے میں نے اردو بولنے کی قسم کھا رکھی ہے۔''

''وجہ؟'' بیگم مرزا تلملا گئی تھیں۔

''ہے ایک وجہ، کسی دن آپ کو بتاؤں گی۔ آؤ بینو چلیں۔''

''دیکھو بینو، تم کوئی ایسی بات نہیں کرو گی جس سے ہم دوسروں کے سامنے شرمندہ ہوں۔''

''امی اپنوں کے سامنے شرمندہ نہیں ہونا چاہیے، غیروں کا کیا ہے۔'' بینو نے لاپروائی سے کہا۔

''دیکھو زمانہ خراب ہے، ایسا نہ ہو کہ ہم نہ اِدھر کے رہیں نہ اُدھر کے۔''

''امی! ہمیں ایک طرف کا ہو کر رہنا ہے۔ دو کشتیوں میں پیر رکھ کر کوئی دریا پار نہیں کر سکتا۔'' بینو نے کہا تھا اور جلدی سے باہر نکل گئی تھی۔

اس دن جیسا جوش و خروش پتّل نے زندگی میں نہ دیکھا تھا۔ لڑکوں کا بپھرا ہوا دریا تھا جو وارننگ کے باوجود آگے بڑھتا جا رہا تھا۔ لڑکیاں خاصی پیچھے تھیں۔ پھر گولیاں چلنے کی آواز آئی — بھگدڑ مچی — افراتفری میں جس کا جدھر منہ اٹھا، بھاگنے لگا — وہ حیران سی کھڑی تھیں کہ میلو نظر آیا۔

''ایک لڑکا مارا گیا ہے۔'' میلو نے کہا، ''آپ لوگ واپس جائیں۔ کل آؤٹرا سٹیڈیم میں نماز جنازہ ہو گی۔''

''میلو، تم ہمارے ساتھ گھر چلو گے۔'' پتّل نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

''اکرام کہاں ہے؟'' گھبراہٹ میں بینو نے پوچھا۔

مجھے نہیں معلوم، وہ بھی جلوس میں تھے۔'' میلو ہاتھ چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا۔ ''تم ہمارے ساتھ گھر چلو، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' پتّل نے کہا۔

''تو آپ لڑکیاں گھر سے نکلتی کیوں ہیں؟'' میلو نے غصّے سے کہا، ''میں نہیں جا سکتا۔ میں دیکھنا چاہتا ہوں، کون لڑکا مرا ہے؟ کیا قصّہ ہے؟''

''سب پتا چل جائے گا، آؤ میلو پلیز۔ بھگدڑ مچ گئی ہے۔ سب اپنے اپنے گھر جا رہے ہیں۔'' بڑی مشکل سے میلو اُن کے ساتھ گھر تک آیا تھا۔ بینو کو بعد میں میلو اور اکرام اُس کے گھر چھوڑنے گئے تھے۔ دوسرے دن بینو کی امی نے سختی سے اُسے باہر نکلنے سے منع کر دیا تھا۔ بینو نے بعد میں سارا قصّہ اکرام اور پتّل کو سنایا تھا۔ اس کی امی بے حد ناراض تھیں اور اس دن بھی امی کے ساتھ بینو کی جھڑپ ہوئی تھی۔ اس کی امی نے کہا تھا، ''آج تم مغربی پاکستان میں ہوتیں تو وہاں کی لڑکیوں کی طرح سیدھی سادی ہوتیں۔ یہ تو یہاں کی ہوا میں جانے کیا زہر بھرا ہے کہ جس کو دیکھو، باغی ہوا جا رہا ہے۔''

''یہ زہر تو یہاں پھیلایا گیا ہے امی۔'' بینو نے جوش سے کہا تھا، ''جب کسی چیز کو دبایا جاتا ہے تو وہ اٹھتی بھی ضرور ہے۔ یہ تو ایکشن ری ایکشن کا سیدھا سا مسئلہ ہے۔''

''سیدھا ہو یا ٹیڑھا۔'' امی نے اسے غصّے سے دیکھا تھا، ''تمھیں اس سے کیا سروکار ہے، یہ تمھارا معاملہ نہیں ہے۔''

"ہے امی، بالکل ہے۔" بینو نے زور دے کر کہا تھا، "آپ اسے اپنا مسئلہ نہیں بناتیں، اسی لیے یہاں کے لوگ آپ کو اپنا نہیں سمجھتے۔ ایک وقت آئے گا جب ایسے لوگوں کو غدار سمجھا جائے گا۔"

"کیا بکتی ہو۔" امی چراغ پا ہوگئی تھیں۔ "ہم لوگوں کو سولی پر لٹکاؤ گے تم لوگ، ہم ملک کو ایک رکھنا چاہتے ہیں اور امن و امان سے رہنا چاہتے ہیں، ہم کون سی غداری کر رہے ہیں۔"

"کچھ لوگ ظالم ہیں اور کچھ مظلوم۔" بینو نے کہا، "جو ظالموں کا ساتھ دے، مظلوموں کے لیے وہ غدار ہے۔"

"اچھا اچھا بہت ہوا، آج سے تم کسی جلسے جلوس میں نہیں جاؤ گی۔ سارا دن سیاست یا پھر ٹن ٹن ٹن۔"

بیگم مرزا کو زیادہ غصے میں دیکھ کر بینو خود ہی وہاں سے ٹل گئی تھی۔

اس دن اسد الزماں کی خون آلود قمیص اٹھائے کیسا زبردست جلوس نکلا تھا۔ کوئی پچیس ہزار آدمیوں نے آؤٹر اسٹیڈیم میں نمازِ جنازہ ادا کی تھی۔ اسد کا نام اب ۱۹۵۲ء کے بھاشا اندولن میں شہید ہونے والے طلبہ کے ساتھ لیا جاتا تھا۔ پچھلے سال بھی 'اسد ڈے' سارے ضلعوں میں بڑی دھوم دھام سے منایا گیا تھا۔ اس دفعہ دیکھو کیا ہوتا ہے۔ پروگرام تو زبردست ہی ہے۔ پوربو بنگلہ بپلوبی چھاترو یونین اور بنگلہ چھاترو لیگ نے طلبہ سے ہڑتال کی درخواست کی ہے۔ شام کو پلٹن میدان میں جلسہ ہوگا۔ سنا ہے یونی ورسٹی میں بڑ تلے اور آرٹ فیکلٹی میں میٹنگ ہوگی۔ اگر بینو کو یونی ورسٹی آنے کی اجازت مل گئی تو پھر وہ جلوس میں ضرور شرکت کرے گی۔

نورالنہار آپا نے حاضری لینی شروع کی۔ پتل ہوشیار ہو کر بیٹھ گئی۔ اس کے نام پر انھوں نے پاس آنے کا اشارہ کیا اور چپکے سے ایک چھوٹا سا پرچہ اسے دیا۔ وہ پرچہ خاص خاص لڑکیوں میں بڑی صفائی اور ہنرمندی سے گھوم گیا۔

اسی وقت کالج کے گیٹ پر ہلچل سی مچی۔ لڑکیوں نے باہر جھانکنا شروع کیا۔ بیلا چودھری، جس کا داخلہ کالج میں ممنوع تھا، دربان سے لڑ جھگڑ کر اندر داخل ہو چکی تھی۔ دربان نے اندر سے قفل لگایا، پھر بے چارہ فریاد لے کر پرنسپل کے پاس بھاگا۔ بیلا ہاتھ ہلا ہلا کر جوشیلے انداز میں تقریر کرنے لگی۔ چند لڑکیاں، جو اسے گھیرے کھڑی تھیں، نعرے لگانے لگیں۔ پتل کو پرچی کی شکل میں اشارہ مل چکا تھا۔ وہ خاموشی سے اٹھی اور جا کر چھٹی کی گھنٹی بجادی۔ گھنٹی کی آواز سنتے ہی ساری لڑکیاں کلاسوں سے دڑاتی ہوئی نکلیں اور پہلے سے طے شدہ پروگرام کے مطابق ٹولیوں میں بٹ کر گانے اور نعرے لگانے لگیں۔

بیلا نے اپنی ساری کا پلو کھونسا، جوتے اتار کر ہاتھ میں لیے اور کالج گیٹ سے دوسری طرف کو دگئی۔ پتل اور مُوکل نے تقلید کی اور دیکھتے ہی دیکھتے کتنی لڑکیاں گیٹ پھلانگ کر سڑک پر جانے والے

جلوس میں شامل ہو گئیں۔ آرٹس کالج کی لڑکیوں نے شہید مینار کے سامنے سیڑھیوں پر بڑی بڑی خوب صورت، الپنائیں بنائی تھیں۔ وہ خوب صورت نقش جن پر دیویاں چلتی ہیں۔ تہواروں کے موقعے پر ہندو اپنے گھروں کو ان سے مزین کرتے ہیں تاکہ دیویاں ان کے گھر کا درشن کرسکیں۔ اب یہ الپنائیں خوش بختی کی علامت بن گئی ہیں۔ ایک گھر میں شادی ہوتی تو سارے فلیٹوں کے زینے پر ایک ایک سال تک سرخ، زرد اور سفید رنگوں میں یہ پھول ایسے جگمگاتے رہتے جیسے آج ہی بنائے گئے ہوں۔ شہید مینار سے لے کر عظیم پورہ قبرستان تک درختوں پر بڑے بڑے پوسٹر لگے ہوئے تھے جن پر سلام، برکت، رفیق کی تصویریں تھیں۔ شہید مینار پھولوں سے لدا ہوا تھا۔ جو لڑکے لڑکیاں اس طرف جا رہے تھے، ان کے ہاتھوں میں پھولوں کے ہار اور لبوں پر بنگلہ کے قومی نغمے تھے۔ سوگ سبھا کے منتظمین نے پہلے سے ساری تیاریاں کی تھیں۔

ماں کی آزادی کی قسم کھانے والو! رات کی تاریکی سے ہوشیار
صدیوں کی جکڑی ہوئی حسرتیں اور تمنائیں
آج بندھنوں کو توڑنے کے لیے بے تاب ہیں
مایوس سینوں میں نفرت کی آندھیاں
انگڑائیاں لے رہی ہیں
مانجھی! تجھے ان سب کی رہبری کرنی ہوگی اور انھیں
ان کا حق دلانا ہوگا
مانجھی! تُو نے ماں کو آزاد کرانے کی قسم کھائی تھی

ننگے پیر چلنے والے ماتمی لڑکے اور لڑکیوں کی پُرجوش آوازوں میں نذرل گیتی ڈوب اور ابھر رہا تھا۔

''بینو کہاں ہے؟ جلوس میں کہیں نظر نہیں آرہی، شہید مینار پر بھی نہیں تھی۔'' مُوکل نے پوچھا۔

''ہوسکتا ہے اس کی ماں نے نہ آنے دیا ہو۔ بہت کٹر بہاری ہے اس کی ماں۔''

''تو پھر تم ہر بات بینو کے سامنے کیوں کرتے ہو، ہوسکتا ہے کوئی ایسی ویسی بات اس کے منھ سے نکل جائے۔ اس کے رشتے دار فوج میں بھی ہوں گے۔''

''نہیں، بینو ایسی نہیں ہے۔'' پتل نے کہا، ''اس نے اپنے فوجی رشتے دار کو اپنے گھر آنے سے بھی روک دیا ہے۔''

''اچھا یہ بتا تیرا ظاہر آج کل کہاں ہے؟'' مُوکل نے پتل کے کان میں سرگوشی کی۔

''امریکا میں ہے۔'' پتل نے کہا۔ اس نے کسی کے ہاتھ جو خط مجھے بھجوایا ہے اگر کسی فوجی کے

ہاتھ لگ جائے تو اس کا فوری کورٹ مارشل ہو جائے۔"

"ہائے ماں، ایسے نہ بول۔ ہاں یہ بتا لکھا کیا ہے اس نے؟" مُوکل نے پوچھا۔

"اُس نے اپنا نام پتا کچھ نہیں لکھا مگر میں جانتی ہوں کہ وہ ظاہر کا خط ہے۔ اس نے لکھا ہے، تم کام کرتی رہو میں بہت جلد آزاد دیش میں تم سے آن کر ملوں گا۔ میں دنیا میں کہیں بھی رہوں یاد رکھنا کہ میں تمھارے ساتھ ہوں اور جو کچھ بھی کروں گا وہ 'ہمارے' حق میں ہوگا۔"

پتل اب ماحول سے پوری طرح بے نیاز ہو چکی تھی۔ "سوچو، یہ فوج کے ساتھ بغاوت ہے کہ نہیں کہ کوئی فوجی صرف بنگلہ دیش کے لیے کام کرے۔"

"او ماں، اسے لکھ دینا کہ وہ جلد بازی نہ کرے۔ ابھی کچھ پتا نہیں ہے کہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا، بہت خطرہ ہے بہت اور اسے یہ بھی لکھ دینا کہ کسی کو اپنا راز دار نہ بنائے۔" مُوکل نے اسے نصیحت کی۔

"وہ خود جانتا ہے۔ اس نے خط ایک بڑے ذمہ دار آدمی کے ہاتھ بھجوایا ہے اور اس میں اپنے شہر، ملک، کسی کا نام نہیں لکھا — نہ میرا نام ہے نہ اس کا۔"

"اچھا وہ شادی کرنے کب آئے گا؟" مُوکل نے پوچھا۔

"پتا نہیں۔ ہو سکتا ہے امریکا سے واپسی پر اسے چھٹی مل جائے۔"

"اس کو کوشش کرنی چاہیے کہ اس کا تبادلہ ڈھاکا کا ہو جائے، اور جب تمھاری اور اس کی شادی ہو جائے تو تم ہنی مُون کے لیے میرے گاؤں جا کر رہنا۔ او ماں! سنار گاؤں کتنا سندر ہے۔ سچ مچ تمھیں لگے گا جیسے تم شکنتلا ہو اور ظاہر راجا دشینت ہے۔ سڑک کے دونوں طرف شیشے لگے خوب صورت پرانے گھر ہیں۔ بل کھاتے رنگین ستون اور سرنگوں کی طرح ایک کے بعد ایک کمرہ۔ سڑک سے ذرا سا ہٹ کر ہمارا گھر ہے مگر درختوں میں چھپا ہوا۔ ہمارے جھونپڑے پر دھوپ کا گزر ہی نہیں ہوتا۔ باشا کے اوپر آم اور جام کے درخت ہیں۔ چاروں طرف کمرنگا، پے پے، پیارا اور جل پائی کے درخت اور سُرمی چندن کی بیلیں چڑھی ہوئی ہیں۔ سامنے ہرا پوکھر ہے مانو انگوٹھی میں جڑا زمرّد۔ وہاں میری ایک بیتا (ہم نام) رہتی ہے جس کا باپ مچھلیوں کے جال بنایا کرتا ہے۔ اس کی کوٹھری اور درختوں کے بیچ پھیلے جال سب درختوں میں چھپے ہوئے ہیں۔ گاؤں کی ہندو عورتیں آرتی اتار کر پھولوں کی پنکھڑیاں اسی پوکھر میں بہاتی ہیں۔ سارا دن مینا، کوئل، توتے اور چڑیوں کی آواز کہیں نہ کہیں سے آتی رہتی ہے۔ ہمارے گاؤں کے مقابلے میں ڈھاکا تو مجھے بالکل خشک اور بنجر نظر آتا ہے، جیسے مغربی پاکستان۔"

"تو کبھی مغربی پاکستان گئی ہے؟" پتل نے پوچھا۔

''نہیں، تصویر دیکھی ہے، ریت ہی ریت، جس میں ایک اونٹ چلا جا رہا ہے، اکلوتا — باپ رے باپ — اتنا مجھے ڈر لگتا ہے اس تصویر کو دیکھ کر۔''

''بے وقوف، وہ سندھ یا ملتان کا کوئی ریگستان ہوگا۔ مغربی پاکستان میں تو برف کے پہاڑ بھی ہیں، اور پنجاب کے بعض علاقے ہمارے مشرقی پاکستان کی طرح ہرے بھرے ہیں۔''

''اچھا، تو نے چی گویرا کی کتاب گوریلا وار فیئر پڑھی ہے؟ آج کل سارے ملک میں یہ کتاب بک رہی ہے۔ میرے بھائی بھی پڑھ رہے ہیں، کہتے ہیں بڑے کام کی کتاب ہے۔'' مُوکل نے کہا۔

''اچھا — تجھے معلوم ہے ظاہر ایس ایس جی کی ٹریننگ کے لیے ہی تو گیا ہوا ہے۔ اس کا تو کام ہی یہی ہے۔ ڈیڑھ سو دفعہ ہوائی جہاز سے پیراشوٹ سے چھلانگ لگائی ہے اس نے۔''

''پھر تو اسے چاہیے کہ یہاں آ کر ایک پکی گوریلا فوج بنا لے۔''

''ہاں آئے گا تو ضرور بنا لے گا۔''

''مگر یہ تو بتا کہ یہ جو ہمارے ہاں کی ایسٹ بنگال رجمنٹ اور ایسٹ پاکستان رائفلز ہیں، کیا یہ ہماری اپنی بنگلہ فوج نہیں ہے؟'' مُوکل نے پوچھا۔

''اس میں کس کس خیال کے لوگ ہیں کیا خبر، یہ تو وقت آنے پر ہی پتا چلے گا۔ سب ظاہر ہی کی طرح تھوڑی ہیں، ہزاروں غدار بھرے پڑے ہیں مگر سنا ہے کہ فوجی سپاہیوں میں بھی پروپیگنڈہ ہو رہا ہے۔ انکل عثمانی بہت کام کر رہے ہیں اور بریگیڈیر موجمدار — سُن! جب چٹا گانگ میں سینٹر میں سپاہیوں کی ٹریننگ ختم ہوئی تو بریگیڈیئر موجمدار نے سپاہیوں سے کہا، ''تم خوددار بنگالی سپاہی ہو، تم مغربی پاکستان وہاں کے پنجابی افسروں کے بوٹ صاف کرنے نہیں جا رہے، اب وقت آ رہا ہے کہ وہ تمھارے جوتے پالش کیا کریں گے۔''

''سچ مچ، یہ کہا انھوں نے۔ سو بولڈ آف ہم۔ پنجابی افسروں نے سنا ہوگا تو آگ لگ گئی ہوگی۔''

''لگنے دو، اور ہم چاہتے ہی کیا ہیں۔'' پتّل کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اچانک اسے یاد آیا کہ موقع نہایت سنجیدہ ہے۔ اس نے پلو سے سر ڈھانکا اور نہایت بردباری سے سب کے ساتھ آواز اور قدم ملا کر چلنے لگی۔

شہیدوں کی قبروں پہ پھول چڑھاتے ہوئے یکایک مُوکل نے پتّل کے کہنی ماری اور ایک طرف اشارہ کیا۔ پھر پیچھے سرک کر اس نے پوچھا۔

''یہ کون ہیں؟''

''شمس الرحمٰن اور اس کی بیوی۔''

''او ماں، کتنی سندر ہے — پر یہاں کھڑی کتنی odd لگ رہی ہے۔ غیر ملکی ہے؟''

''نہیں، مغربی پاکستانی — مگر کٹر بنگالی قوم پرست۔''

''ناممکن!'' مُوکل نے بے یقینی سے سر ہلایا۔ ''دھرتی قسم، مجھے تو ان لوگوں کا ذرا بھی اعتبار نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو شمس الرحمٰن بھی دھوکا کھائے۔''

''وہ دھوکا کھانے والوں میں سے نہیں ہے۔ اکرام کو بھی اس پر اعتبار ہے۔''

''اسے تو ہوگا ہی وہ جو خود اس کے نقش قدم پر چل رہا ہے۔ اللہ جانے کیا ہو گیا ہے ہمارے لڑکوں کو — جس گوری چمڑی سے نفرت کرتے ہیں، اسی پر گرتے ہیں۔''

''دیکھو، میرے بھائی کو کچھ نہ کہنا۔ بینو گوری نہیں ہے اور وہ میری بھی دوست ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم کہتی ہو تو نہ کہوں گی لیکن اور لوگ تو کہیں گے۔''

''ان سے ہم خود نمٹ لیں گے۔''

''اچھا پلٹن میدان چلو گی؟''

''چلو، اسی طرف سے نکل چلتے ہیں۔''

پلٹن میدان پہنچیں تو جلاؤ پڑاؤ کے نعرے لگ رہے تھے۔ مصطفیٰ جمال حیدر سابق طالب علم لیڈر للکار رہا تھا کہ پرانے لیڈر اپنے راستے سے ہٹنے نہ پائیں۔ ورنہ ہم جیسے جیالے عوام کا کارواں ان کو کوڑے کے ٹین میں پھینک کر آگے بڑھ جائے گا۔ جن لیڈروں نے کہا تھا کہ بانس کی لاٹھیاں اپنے پاس رکھو تاکہ استحصال کرنے والوں کے خلاف استعمال کرسکو، اب اگر وہ عوام کے مطالبات سے پیچھے ہٹے تو یہ لاٹھیاں عوامی لیگ کے ان لیڈروں پر استعمال کی جائیں گی۔ ان آتشیں تقریروں کے درمیان فلک شگاف نعرے بھی بلند ہو رہے تھے۔

شنگھوتی با (یا) شادھینتا؟ (یک جہتی یا آزادی؟) ایک پکارتا۔

شادھینتا شادھینتا — جواب میں آسمان اڑنے لگتا۔

پھر آواز آتی — شیخ مجیب منترا؟ (منتر)

جواب ملتا — سماج تنترا (سوشلزم)

پھر سب مل کر چلاتے۔

شنگھوتی کے لاتی مارو — بنگلہ دیش شادھین کورو — عتیق الرحمٰن سالو، دلاور حسین، پرویز قاضی، عبدالغفران اور مسز انورہ، سب نے اسی طرح جوشیلی تقریریں کیں — پھر جوش میں آکر پتل کی دوست مُوکل اسٹیج پر چڑھ گئی۔ اس نے کہا، بعض اوقات جے بنگلہ دیش کے ساتھ جے پاکستان کے نعرے بھی سننے میں آتے ہیں۔ اب ان نعروں کا وقت گزر چکا ہے، ایسے نعرے فی الفور بند کیے

جائیں اور بیورو آف ری کنسٹرکشن کے فنڈ کے بارے میں تحقیقات کی جائے۔ ہمارا پیسہ ہمارے ہی خلاف استعمال ہو رہا ہے۔'' مؤکل کی تقریر پر بے پناہ تالیاں بجیں اور فلک شگاف نعرے لگائے گئے۔

یہاں سے فارغ ہو کر انھوں نے یونی ورسٹی کی راہ لی۔ دیکھیں وہاں اکرام الحق اور بینو ہیں یا نہیں۔ بڑتلے ایسٹ پاکستان اسٹوڈنٹ لیگ کا جلسہ ہو رہا تھا۔ عبدالقدوس ماکھون، شاہ جہاں سراج وغیرہ تقریریں کر رہے تھے۔ اپنے ساتھیوں کی موت پر اظہارِ تعزیت اور اپنے ساتھیوں کو چھوڑنے کا مطالبہ۔ اسی وقت آرٹ فیکلٹی میں ایسٹ پاکستان اسٹوڈنٹ یونین کا جلسہ ہو رہا تھا۔ وہاں سے بھی یہی پکار سنائی دے رہی تھی کہ منتخب ممبران آزادی کے اصل مقصد کو بھولتے جا رہے ہیں جس کی خاطر مطی اور اسد نے اپنی جانیں دیں — نعرے — نعرے اور نعرے —

عظیم پور قبرستان سے نانی کا گھر زیادہ دور نہ تھا۔ نواب پور کے ہر گھر میں کوئی نہ کوئی تاریخی شخصیت پیدا ہوئی تھی۔ جلوس کے بعد اکرام الحق اور پتل نانی کے ہاں جا پہنچے۔ وہ تکیے سے ٹیک لگائے اردو کی کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں۔ نانی نے کلکتہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی تھی اور لکھنؤ یونی ورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا تھا۔ اکرام کرسی کھینچ کر نانی کے پاس بیٹھ گیا۔ بوڑھی گنگا سے ٹھنڈی ہوا کھڑکی میں لگی لوہے کی سلاخوں سے ٹکراتی اندر آ رہی تھی۔ گھر پرانی وضع کا تھا۔ صحن کے گملوں میں گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے۔

''آج بھی بینو کو لے کر نہیں آیا؟'' نانی نے مسکراتے ہوئے کہا۔ انھیں معلوم تھا کہ ان کا نواسہ اس لڑکی میں غیر معمولی دل چسپی لے رہا ہے۔ ''کہاں کے ہیں یہ لوگ؟''

''کہیں کے بھی ہوں نانی، مگر بینو آپ سے اچھی بنگلہ بولتی ہے، خالص ہماری بنگلہ۔'' اکرام الحق نے مذاق کیا۔

''بے شک بولتی ہوگی۔'' نانی نے سنجیدگی سے کہا، ''بھئی ہم لوگ تو کلکتہ میں اردو بولتے تھے۔ میں نے تو بنگلہ شادی کے بعد بولنی شروع کی جب ایک 'بنگالی' سے میری شادی ہوئی۔ بنگال کا مطلب ان دنوں مشرقی بنگال کا سیدھا سادا آدمی تھا۔ میں تو اب بھی اردو کی ہی کتابیں پڑھتی ہوں۔ یہ دیکھو تمھارے پرنانا کی سوانحِ حیات ہے۔ میں اس لیے اسے پڑھتی رہتی ہوں کہ اپنے بچپن کے سہانے زمانے کے واقعات اس میں مل جاتے ہیں۔ پڑھ کر بڑا مزا آتا ہے۔''

''بچپن کا زمانہ ہمیشہ سہانا ہی ہوتا ہے نانی؟'' پتل نے پوچھا۔

''جب ہماری عمروں کو پہنچوگی تو بچپن اور جوانی کی قدر ہوگی، ابھی کہاں؟'' نانی نے سامنے مسجد کے مینار پر اڑتے ہوئے کبوتروں کو حسرت سے دیکھا۔ ان کے بچپن میں بھی یہ کبوتر اسی طرح اڑا کرتے ہوں گے۔

''نانی مجھے اس بات پر بڑا اچنبھا ہوتا ہے کہ آپ بنگالن ہیں اور آپ کو بنگلہ زبان اتنی اچھی

طرح نہیں آتی جتنی اردو۔''

''ہاں، اب تو ان باتوں پر حیرت ہوتی ہے۔ کھاتے پیتے گھروں میں ایسے بچے عام تھے جنھیں انگریزی کے سوا کوئی بھی زبان اچھی طرح نہیں آتی تھی۔''

''ایسے گھرانے اب بھی ہیں نانی۔'' پتل نے کہا۔ ''اچھا، یہ بتایئے کہ اپنی یہ پری بی بی جن کا مزار لال باغ قلعے میں ہے، کیا بنگالن تھیں؟''

''تو اور کون تھیں؟'' نانی نے برا مانا۔ ''ساری عمر بنگال میں رہیں۔ یہیں مریں، یہاں کی مٹی میں دفن ہوئیں، تو کیا بنگالن نہیں ہوئیں؟''

''مگر شائستہ خاں کی بیٹی اور لقب دخترِ ایران۔''

''آج تم لوگ کیسی باتیں کر رہے ہو؟ میری سمجھ میں نہیں آ رہی ہیں۔'' نانی نے کہا۔

''کہا جاتا ہے نانی کہ ہر زمانے کے سوال اور ان کے جواب جدا ہوتے ہیں۔'' اکرام الحق نے کہا مگر نانی کچھ نہ سمجھیں۔ ''دیکھو جاتے ہوئے تم لوگ منوتی کی خیریت پوچھتے جانا۔'' نانی نے کہا، ''سنا ہے، بیمار ہے۔ کتنے پیار سے تم لوگوں کو پالا ہے اس نے۔''

کھانے کے بعد نانی نے ایک ٹوکری میں کیلے، بیل اور ناریل کی مٹھائی کیلے کے پتے سے ڈھانک کر ان کے حوالے کی۔ منوتی قلعے کی فصیل کے نیچے ٹین کے ٹکڑوں سے بنے ہوئے ایک چھوٹے سے گھر میں رہتی تھی۔ کائی جمے کچے آنگن میں ایک کنواں تھا جس کے پاس پانی کا ایک گڑھا تھا، جس پر مچھروں کی تہہ جمی ہوئی تھی، دو چار پتھروں کے برابر میں کائی لگا ایک لمبوترا سا گھڑا پڑا تھا۔ منوتی تخت پر دراز تھی۔ چھوٹے سے قد کی سوکھی ہوئی عورت۔ اس کی ساری اتنی مختصر تھی کہ اس کو تاہ قد کا ستر ڈھانپنے میں بھی ناکام تھی۔ گھر میں دو چار برتنوں اور کونے میں بچھی ہوئی سیتل پاٹی کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔

نانی کی سوغات دے کر اور منوتی کے گھر سے المونیم کے گلاسوں میں ڈاب کا پانی پی کر نکلے تو اندھیرا گہرا ہو چلا تھا، پتلی پتلی گلیوں میں ریڑھے پھنسے ہوئے تھے اور بچے اب تک باہر گلیوں میں شور مچا رہے تھے۔

میمن سنگھ روڈ پر ایک مشعل بردار جلوس ملا۔ کچھ لڑکے اسکوٹروں پر سوار تھے۔ اور نعرے لگاتے جا رہے تھے۔ سڑکوں پر گزرتے ہوئے وہ خاص خاص گھروں میں مشعلیں پھینکتے جاتے تھے جن سے آگ بھڑک اٹھتی تھی۔

''گھروں میں آگ لگانا تو اچھی بات نہیں ہے۔'' پتل نے دبی زبان سے کہا۔

''جو لوگ چنگاریاں بوتے ہیں، وہ شعلے ہی کاٹتے ہیں۔'' اکرام الحق نے تلخی سے کہا۔

اُسد ڈے کے ٹھیک ایک ماہ بعد رات کے ترازو کے پلڑے انصاف کے ترازو کی طرح برابر تھے کہ ایک پلڑا جھکا۔ صرف ایک منٹ ـــ ۲۱ رفروری، شہید ڈے کا آغاز ـــ ہزاروں لاکھوں نعرے ایک ساتھ بلند ہوئے۔ رات میں دن سے زیادہ چہل پہل تھی۔ شہید مینار سے لے کر عظیم پور تک سڑک پوسٹروں، تصویروں، اور ان پر پڑے ہاروں سے سجی ہوئی تھی۔ پھاگن کا پھولوں اور پھواروں سے پُر مہینہ تھا۔ مگر بہت سے پوسٹر آتش گیر مادّے کے خوب صورت رنگین کاغذوں کی طرح آرٹ میں لپٹے نہایت تند و تیز احتجاجی سلوگن تھے۔ کہیں ٹوٹتی زنجیریں تھیں، کہیں ہاتھوں میں مشعلیں تھیں۔ شہید مینار کے مقابل میڈیکل کالج کی دیوار پر ایک بڑا سا پوسٹر تھا، جس میں لوگ ایک بڑے سے گِدھ کو ڈنڈا اٹھائے مارنے آ رہے تھے۔ مارنے والے رقاصوں کا سا لباس پہنے ہوئے تھے۔ دوسری طرف ایک لڑکا اور ایک لڑکی بے حد خوف ناک ایک عفریت کو مارنے لپک رہے تھے۔ لڑکے کے ہاتھ میں کلھاڑا اور لڑکی کے ہاتھ میں درانتی تھی ٹھیک اسی وقت پریس کلب میں ان کے اپنے ممبران اور ایسٹ پاکستان یونین آف جرنلسٹ کی طرف سے جلسے کا آغاز ہوا۔ دھواں دھار تقریروں کے بعد ریڈیو اور ٹی وی کے بہترین گلوکاروں نے نغمے سنائے۔ شیخ لطف الرحمٰن، لیلیٰ ارجمند بانو، افسری خانم، سدھن داس، فردوسی رحمان، خوندکار فاروق احمد، اجیت رائے، بدرالدین احمد، خالد حسن اور پتن رائے۔

اس کے بعد شمس الرحمٰن اسٹیج پر آیا اور اس نے اعلان کیا کہ آج کے لیے اس کے دوست اور تیزی سے ابھرتے شاعر نورالاسلام نے ایک نظم کہی ہے۔ اب وہ یہ نظم پیش کریں گے۔ نور نے اسٹیج پر

آ کر چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ آسمان تاروں سے بھرا ہوا تھا۔ عیدالاضحیٰ کا چاند ڈوبنے کو تھا۔ اب محرم کا چاند طلوع ہوگا۔ رات بڑی سہانی ہے۔ یقیناً میری نظم اس گمبھیر ماحول اور اس وقت کے لیے موزوں ہے۔

تب اُس نے اپنی نظم کا عنوان بتایا۔

کنول

ہم کنول ہیں
کیچڑ میں کھلنے والے مگر صاف
زمین سے چمٹے ہوئے مگر آسمان کو تکتے ہوئے
کیچڑ کے اندر ہمارے پاؤں ہیں مگر آسمانوں پر ہماری نظر ہے
دلوں میں ولولے ہیں
ہمارے سر پر نیلے آسمان کا سایہ ہے
کالے بادلوں کا سایہ ہے
اور سفید بگلوں کا بھی
یہ بگلے بڑے صاف شفاف ہیں
ان کے خوب صورت پر، جیسے دبیز ساٹن کو کاٹ کر بنائے گئے ہوں
آسمانوں پر اڑتے ہیں
خدا جانے کہاں گھونسلے بناتے ہیں
یا دوسروں کے گھونسلوں ہی میں رہتے ہیں
نیچے آتے ہیں صرف کھانے کے لیے
غوطہ مار کر مچھلی پکڑنے کے لیے
تالابوں میں کنول کے بیج ڈھونڈ ڈھونڈ کر کھاتے ہیں
چاروں طرف کے حسین مناظر دیکھ کر اِٹھلاتے ہیں
پانی میں اپنا عکس دیکھ کر اِتراتے ہیں
اور کنول سے کہتے ہیں
دیکھو تو وہیں کا وہیں ہے
اور میں ـــــ ابھی یہاں، ابھی وہاں

ابھی زمین پر، ابھی آسمان
اور جب تالاب سوکھ جاتا ہے تو ہجرت کر جاتے ہیں
کہیں اور چلے جاتے ہیں
کہ دنیا میں بہت تالاب، بہت جھیلیں، بہت دریا اور سمندر ہیں
مگر کنول کے لیے تو وہ ایک ہی تالاب ہے، اور بس......
وہ تو وہیں جیتا اور وہیں مرتا ہے!

اس نظم پر جیسے طوفان برپا ہو گیا۔ نعروں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ کسی لڑکے نے ایک ہار نور کے گلے میں ڈال دیا۔ چند نے پھولوں کے گلدستے پیش کیے اور پھر یہ سارا مجمع شہید مینار اور عظیم پور قبرستان کے لیے روانہ ہوا۔ ایک گل دائرہ پریس کلب کی طرف سے دوسرا یونین آف جرنلسٹ کی طرف سے چڑھایا گیا۔ عوام اور طلبہ کا سیلاب ساتھ ساتھ رواں تھا۔ جاتے جاتے لوگ رمنا گرین کی نرسری سے شہیدوں کی قبروں پر چڑھانے کے لیے پھول توڑ کر لے جا رہے تھے۔ لاکھوں افراد ننگے پاؤں ہاتھوں میں ہار پھول لیے ایک ہی سمت رواں تھے۔ جب دریا کے بند ٹوٹتے ہیں تو اسی طرح رفتہ رفتہ لہریں بڑھتی چلی جاتی ہیں۔ یہاں تک کہ کنارہ نظروں سے غائب ہو جاتا ہے۔ ہر شخص چاہتا تھا کہ شہیدوں کی قبروں سے نزدیک تر رہے جہاں شیخ مجیب الرحمٰن منتخب شدہ ممبران اسمبلی کے ساتھ کھڑے تھے۔ وہ اس سیلِ بے پناہ کے رہبر تھے۔ ان کا دل ان لہروں کی مانند اوپر نیچے ہو رہا ہو گا جو بپھرے طوفانوں کو ساتھ لے کر چلتی ہیں۔ ان کی پارٹی کا نشان بھی تو کشتی تھا۔ نور نے سوچا۔

شیخ مجیب الرحمٰن نے تقریر شروع کی تو لاکھوں کے مجمعے کے ساتھ رات بھی ہمہ تن گوش تھی۔ درختوں پر چڑیاں بھی دم سادھے بیٹھی تھیں۔ ''ہم نے ۱۹۵۲ء میں بہت خون بہایا ہے اور وقت پڑا تو اور بھی بہائیں گے مگر اپنے مطالبوں پر سمجھوتا نہیں کریں گے۔'' اس کے بعد انھوں نے ہر بنگالی گھر کو قلعہ بنا دینے کی ہدایت کی کہ سازشوں کا حملہ کامیاب نہ ہو سکے۔

تقریر جاری رہی — لوگ سنتے رہے۔ نرگس اور زری گھر میں بیٹھی اپنے شوہروں کا انتظار کرتی رہیں۔ زری شمس الرحمٰن کے ساتھ اکثر جلسے جلوسوں میں شرکت کرتی تھی مگر آج وہ اسے ساتھ لے کر نہیں گیا تھا۔ زری نے اس بات کو بہت محسوس کیا تھا۔ چاچا جی اس کا دل بہلانے کی کوشش کر رہے تھے۔

''زری، تجھے زیب قادری اب بھی یاد آتی ہیں کبھی؟''

''ہاں چاچا جی، اور آپ کو؟''

''مجھے بھی اس کی کوئی بات یاد آتی ہے کبھی کوئی ادا۔ وہ بہت غیر معمولی عورت تھی زری۔ ایک

دن میں نے اس کی سنگھار میز پر خوشبوؤں کی ڈھیر سی بوتلیں دیکھ کر پوچھا، تم خوشبو لگاتی نہیں ہو تو اتنی بوتلیں جمع کیوں کی ہیں؟'' اس پر وہ کہنے لگی، ''میں رات کو سونے سے پہلے سارے کاموں سے فارغ ہو کر خوشبو لگاتی ہوں۔ سارے دن کی تھکن کے بعد، طرح طرح کے لوگوں میں پھرنے کے بعد خوشبو زیادہ مزہ دیتی ہے۔ وہ صرف میرے لیے ہوتی ہے۔ اس کی بھینی بھینی لہروں پر میں یوں بہتی ہوں جیسے آبی پرندہ سمندر کی لہروں پر بہتا ہے۔ پھر بولی، یہ ساری خوشبوئیں وہ ہیں جو میرے بدن کی کیمسٹری کے ساتھ لگا کھاتی ہیں۔ ہر خوشبو ہر شخص کے لیے مناسب نہیں ہوتی۔ کوئی خوشبو کتنی ہی قیمتی ہو آپ کے بدن کے ساتھ لگا نہ کھائے تو وہ اس طرح ضائع ہو جائے گی جس طرح کلامِ نرم و نازک مردِ ناداں پر بے اثر جاتا ہے۔ پھر وہ ہنسی تھی۔ اس کی ہنسی کا انداز آج تک میری نظروں میں پھرتا ہے، اور تجھے یاد ہے جب وہ سوچ کر بولتی تھی تو اس کی پیشانی کی رگ ذرا سی ابھر آتی تھی۔''

''نہیں چاچا جی، مجھے یہ باریکیاں یاد نہیں۔ بس ان کی شخصیت کا سحر یاد ہے۔ وہ باتیں بہت اچھی کرتی تھیں۔ اب آپ نے یہ بات بتائی تو سوچتی ہوں کہ اس میں کچھ سچائی ضرور ہے۔ میرا بھی تجربہ ہے کہ بعض خوشبوئیں چاہے قیمتی نہ ہوں لیکن کسی خاص شخصیت پر لگ کر اس طرح چمک اٹھتی ہیں جس طرح شمع کی روشنی میں آئینہ دمک اٹھتا ہے۔''

''خوشبو پر ہی کیا موقوف ہے۔'' چاچا جی نے کہا، ''دو خوشبوئیں ہوں یا دو روشنیاں، یا دو ذہن۔ ان کا ملاپ ان کے جمع کے کل سے زیادہ ہو، تب تو بات ہے۔ الجبرا میں دو نفی کے نشان مل جائیں تو ایک جمع کا نشان بن جاتا ہے — میرا خیال ہے قدرت دو چیزوں کو اس وقت ملاتی ہے جب ان سے کوئی بہتر کام لینا مقصود ہوتا ہے۔ بیج مٹی میں ملتا ہے تو پودا پھوٹتا ہے۔ مثبت تار منفی سے ملتا ہے تو بجلی پیدا ہوتی ہے۔ دو چھوٹے دریا ملیں تو بڑا دریا بنتا ہے۔''

''اس کا مطلب ہے'' نرگس بولی، ''جب بھی دو چیزوں کا میل ہو تو دیکھ لینا چاہیے کہ کوئی بہتر چیز بن رہی ہے یا نہیں؟ اگر نہیں تو ان کو یوں ہی چھوڑ دینا چاہیے۔ ہم پینٹنگ میں رنگوں اور لکیروں میں اس بات کا خیال رکھتے ہیں۔''

''ہر چیز کے ساتھ یہی رویہ ہونا چاہیے۔'' چاچا جی نے کہا۔

تو کیا میرا اور شمس الرحمٰن کا ملاپ؟...... زری سوچ رہی تھی۔

''چاچا جی! — لوگ اجتماعِ ضدّین کی بات کرتے ہیں۔ کیا دو متضاد چیزوں کا ملاپ ممکن ہے؟''

''اگر وہ صحیح معنوں میں ایک دوسرے کی ضد ہیں تو کبھی نہیں ملیں گی۔ اندھیرا اجالے کی ضد ہوتا تو اس کے اندر مدغم کیسے ہوتا۔ سفید رنگ سیاہ میں گھل جائے تو اس کی ضد تو نہ ہوا۔''

تو کیا میں اور شمس الرحمٰن اجتماعِ ضدّین ہیں؟

نوؔر اور شمس الرحمٰن صبح دَم لوٹے تو اطلاع دی کہ آج جگہ جگہ جلسے ہوں گے، جلوس نکلیں گے۔ شہر میں دو بجے تک ہڑتال رہے گی۔ کل پیر کے دن اسکول کالجوں کی چھٹی منائی جائے گی۔

آج وہ دونوں بے حد خوش تھے۔ شمس الرحمٰن بے خیالی میں نور کی نظم ''کنول'' کے بند دُہرا رہا تھا جو امید سے کہیں زیادہ کامیاب رہی تھی۔ نوؔر راتوں رات مشہور ہو گیا تھا۔

چند دن پہلے تک مینا مزے سے ''چھایا بیتھی'' میں رہا کرتی تھی۔ پلاش کے درخت پر لٹکا اس کا بید کا سفید پنجرہ ہنڈولے کی طرح ہلتا رہتا تھا۔ صبح صبح وہ چیتل کے ساتھ آواز ملا کر پکے راگوں کا ریاض کیا کرتی تھی۔ اسے صبح کا راگ بھیرویں بہت پسند تھا — دوپہر کو وہ ہر آنے جانے والے سے اپنی میٹھی آواز میں کہا کرتی تھی ''امار نام میرا موئے نا'' (مینا)۔ آنے جانے والے ٹھٹک کر ہنس پڑتے اور اس سے باتیں کرنے کی کوشش کرتے۔ شام کو وہ اپنی سریلی آواز میں پھر بولنا شروع کر دیتی، لیکن چند روز سے گھر کی فضا ایسی بدلی تھی جیسے کسی کو اس کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔ وہ گائے، اپنا نام بتائے یا کسی طرح لوگوں کی توجہ اپنی طرف کرانے کی کوشش کرے۔ ان کی چال ڈھال، ان کی سوچ کا انداز بتاتا تھا جیسے ان کے ذہن پر کوئی اور ہی بات مسلط ہے۔

نچلی منزل میں ہر وقت سیاست پر باتیں ہوتی تھیں اور یہی لوگ تھے جن کو اس کی باتیں سننے کی فرصت نہیں تھی۔ اوپری منزل میں مصباح الحق صاحب ہمیشہ کی طرح کتابیں پڑھتے رہتے تھے۔ آج کل پھر سے انھیں بنگال کی پرانی تاریخ پڑھنے کا سودا اٹھا تھا۔ مسلمانوں کی فتوحات سے پہلے مسلمان صوفی بزرگ یہاں آ چکے تھے۔ بزرگ صوفیوں کے نام بھی انھیں ازبر تھے۔ آٹھویں اور نویں صدی عیسوی میں مسلمانوں کا رابطہ بنگال سے تجارتی طور پر قائم تھا۔ پہاڑ پور راج شاہی ڈسٹرکٹ میں عباسی عہد کا سونے کا سکہ ملا ہے۔ پرتگالی سیاح باربوسا نے لکھا ہے کہ شہر بنگالہ میں اونچے طبقے کے لوگ اپنی عورتوں کو بند رکھتے تھے۔ وہ بہت قیمتی کپڑے پہنتی تھیں۔ جواہرات جڑے ہوئے سونے کے

زیورات کا شوق تھا اور بہت ٹھاٹھ باٹھ سے رہتی تھیں۔ ہندو عورتیں بھی پردے میں رہتی تھیں۔

مغل عہد میں تصوف اور ویدانت نے مل کر بنگلہ ادب کی صوفیانہ شاعری کی بنیاد رکھی مگر نثر میں پرتگالیوں نے تبلیغ کے لیے کتابچے لکھے۔ بنگلہ گرامر اور بنگلہ ڈکشنری بھی ایک پرتگالی فادر نے لکھی۔ پداولی صوفیانہ گیتوں کے ساتھ دوسری روایت دو بھاشی پوتھی ادب کی تھی۔ عربی اور فارسی کے قصے کہانیوں کو بنگالی میں منظوم کہانیوں کی صورت میں پیش کرنے کی رِیت چلتی رہی اور ایک وقت آیا جب بنگلہ زبان میں اسلامی ثقافت کا رنگ ڈال کر اسے مغربی بنگال کی بنگلہ زبان سے جدا کرنے کی شعوری کوشش کی گئی، اور اس میں کامیابی بھی ہوئی۔ شروع میں اسلامی ثقافت سے وابستگی بڑھ رہی تھی مگر اب دوسرا گروہ نوجوانوں کو اپنی طرف کھینچنے میں کامیاب ہو رہا ہے، پھر بھی میں تو یہی کہتا ہوں کہ بنگالیوں نے پاکستان بنایا ہے، وہ اسے کیسے توڑ سکتے ہیں۔ یہ سارے ہنگامے لڑکے بالوں کے حکومت سے اپنے مطالبے منوانے کے ہتھکنڈے ہیں۔''

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' بیگم مصباح الحق کہتیں، ''لیکن دل ڈرتا ہے۔ ڈاکٹر شہید اللہ نے جب کہا تھا کہ پاکستان میں اسلامی نظریۂ حیات پروان چڑھے گا اور ارضِ پاکستان میں خدا کی حاکمیت ہوگی، اس وقت بھی ان پر آوازے کسے گئے تھے۔''

پلاش کے درخت پر لٹکی مینا، خودمختاری اور آزادی کی بہت سی باتیں سنا کرتی تھی۔ چناں چہ ایک صبح جب اس نے اپنا پنجرہ کھلا دیکھا تو وہ باہر نکل آئی۔ کنول اور شاپلا کے پھولوں پر شبنم پڑی ہوئی تھی اور آزادی سے سانس لینے میں کتنی راحت تھی۔ وہ املتاس کے ایک جھنڈ میں چھپ گئی۔ پھر سرس کے گلابی پھولوں سے اٹے درخت کی اونچی سی شاخ پر بیٹھ کر آزادی کا پہلا نغمہ اس نے دَرت لے میں گایا۔ سارا دن وہ وہاں چھپی بیٹھی رہی۔ شام کو اس نے رمنا گرین جانے کی ٹھانی۔ راہ میں اس نے ایک جلوس دیکھا۔ شفاف سفید کپڑوں میں موٹر سائیکل سوار ونگل بجاتے آگے آگے جا رہے تھے۔ پیچھے ایک سیاہ چمکتی کار جھنڈا لہلاتی تیرتی جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے اور کاروں کے جلوس تھے۔ مینا اس جلوس کو دیکھنے نیچے آئی۔ کار کی، آئینے کی طرح شفاف چھت پر اسے اپنا عکس نظر آیا جیسے ''چھایا بیتھی'' کے حوض میں نظر آتا تھا۔ وہ کچھ اور نیچے اتری۔ اتنے میں کہیں سے ایک ہریل اڑتا ہوا آیا اور اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''اتنی نیچی اڑان نہ کرو، کہیں کوئی تمھیں مار نہ ڈالے۔ آؤ، ادھر درخت پر بیٹھ کر جلوس دیکھ لو اتنا ہی شوق ہے تو۔ یہ جلوس ایوانِ صدر سے آ رہا ہے۔''

''ایوانِ صدر کہاں ہے؟'' مینا نے پوچھا۔

''میں تمھیں وہاں لے چلوں گا۔'' ہریل نے مینا کو ایوانِ صدر کے سامنے درخت پر لا بٹھایا۔

پیپل کے تازہ پتے ایک دوسرے کی ہتھیلیوں پر ہاتھ مار کر تالیاں بجا رہے تھے جیسے لڈی ڈالنے والی لڑکیاں بجاتی ہیں۔

مینا نے ہریل کو بتایا کہ وہ ایک بھلے سے گھر میں پنجرے میں قید تھی اور سکھ سے رہتی تھی مگر شادھینتا (آزادی) کی باتیں سن سن کر اسے بھی آزادی کا چسکا لگ گیا۔ اب باہر نکل کر وہ بہت خوف محسوس کر رہی ہے۔

''تم واپس جانا چاہتی ہو تو چلو میں تمھیں اسی گھر میں چھوڑ آتا ہوں۔''

''نہیں اب میں واپس جانا نہیں چاہتی۔ رات کو رمنا گرین چلی جاؤں گی۔ وہاں سیکڑوں، ہزاروں درختوں میں کہیں نہ کہیں ٹھکانا مل ہی جائے گا۔ یہ بتاؤ تم ہریل ہو نا۔ سنا ہے تم کبھی دھرتی پر قدم نہیں دھرتے۔''

ہریل ہنس دیا۔ ''افواہوں کا زمانہ ہے تم ایسی باتوں پر کان نہ دھرو۔ پھر اس میں حرج ہی کیا ہے۔ رزق تو زمین سے اوپر بھی مل جاتا ہے۔''

''ہوسکتا ہے، لیکن مجھے تو دھرتی اچھی لگتی ہے۔ جن درختوں پر ہم بسیرا لیتے ہیں، وہ زمین پر ہی تو اگتے ہیں، جو اناج اور پھل ہم کھاتے ہیں وہ زمین ہی تو دیتی ہے۔''

''ہاں، یہ بھی ٹھیک ہے۔ اب اندھیرا ہوگیا ہے۔ آج تم میری مہمان ہو۔ عام آدمی کا اس علاقے میں گزر کم ہوتا ہے، تم محفوظ رہوگی۔ کل تم جہاں کہوگی چھوڑ آؤں گا۔'' مگر پھر وہ کہیں نہیں گئی تھی، ہریل کے ساتھ ہی رہنے لگی تھی۔ ان کی دوستی پرندوں میں ٹاک آف دا ٹاؤن بن گئی تھی۔ اکثر یوں ہوتا کہ ہریل صبح دانے دنکے کی تلاش میں دور نکل جاتا، مینا آس پاس کے درختوں پر منڈلاتی رہتی۔ شام کو ہریل اسے شہر کی سیاست سے آگاہ کرتا اور مینا اسے میٹھے میٹھے گیت سناتی۔

مگر اب کچھ دن سے وہ گیت جیسے بھول ہی گئی تھی۔ محرم کا مہینہ تھا۔ ہر گھر میں پٹس پڑی ہوئی تھی۔ لوگ پوچھتے تھے کوئی جائے امان ہے۔ ہر جگہ ماتم کے اور احتجاج کے کالے پرچم لہرا رہے تھے۔ ہر طرف سینہ کوبی تھی۔ خون بہہ رہا تھا اور دونوں طرف سے خون دیے جانے کی اپیل کی جارہی تھی۔ یہ اپیل کیا رنگ لائے گی، اس کا کسی کو اندازہ نہ تھا۔

اور ایک دن مجبور ہو کر بینو کو جواد سے دوستی کرنی پڑی تھی۔

یکم مارچ کو اسٹیڈیم میں کرکٹ میچ ہو رہا تھا۔ الیاس اپنے دوست کے ساتھ میچ دیکھنے گیا ہوا تھا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہونے کی خبر آئی۔ اسٹیڈیم میں ہنگامہ ہو گیا۔ شامیانوں میں آگ لگی، بھگدڑ مچ گئی۔ کھلاڑیوں کو کسی نہ کسی طرح ایم این اے ہاسٹل پہنچایا گیا۔ تماشائی گرتے پڑتے بھاگے۔

الیاس شام تک گھر نہ پہنچا تو گھبراہٹ شروع ہوئی، رات کو بے حد پریشانی رہی۔ دوسرے دن بیگم مرزا کو روتے روتے دورہ پڑا۔ مرزا صاحب نے جواد کو فون کیا۔ جواد نے انھیں تسلی دی اور اس کے بارے میں معلوم کرنے کا وعدہ کیا۔ الیاس اس وقت اپنے دوست کے ساتھ طاہر باغ لین کے ایک گھر کے اسٹور میں ٹھٹھرا ہوا بیٹھا تھا۔ الیاس کے دوست منیر کے ابا کہیں گئے ہوئے تھے۔ گھر میں وہ اکیلا تھا۔ اسٹیڈیم سے بھاگ کر دونوں یہیں چلے آئے تھے۔ ذرا دیر بعد باہر شور اور نعروں کی آواز آئی تو انھیں معلوم ہوا کہ بپھرے ہوئے لوگوں کا جلوس، جن کے ہاتھوں میں لمبے موٹے بانس اور لوہے کی سلاخیں ہیں، اسی طرف آ رہا ہے۔ منیر نے اپنے ایک رشتہ دار کو فون کیا جو فوج میں جونیئر کمیشنڈ افسر تھے۔ انھوں نے تلخ لہجے میں کہا، ''برخوردار تم گھر چھوڑ کر کہیں اور چلے جاؤ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ کچھ لوگوں کو قربانی کا بکرا بننا ہے، ہو سکتا ہے ان میں تم بھی ہو۔ ایسے نازک وقت میں ایسا تلخ جواب سن کر اس کے منھ کا مزہ کڑوا ہونے لگا تو انھوں نے وضاحت کی، ''فوج کو خاموش رہنے کا حکم ہے۔ خیال ہے کہ انھوں نے مداخلت کی تو حالات اور خراب ہو جائیں گے۔ بیٹے تمھیں کیا

معلوم، ہم لوگوں کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ گالیاں دی جا رہی ہیں۔ گزرتے ہوئے ہمیں جوتے دکھائے جاتے ہیں، اوپر سے ہمارے منھ پر تھوکا جاتا ہے، ہمیں حکم ہے کہ برداشت کریں۔'' فون ذرا سا کھنکارا اور خاموش ہو گیا۔

نعروں کی آواز نزدیک تر آ گئی۔ منیر نے دروازے کے اوپر شیشوں کے ہلال سے جھانک کر دیکھا۔ چند لوگ فون کے کھمبے کے نیچے کھڑے تھے اور ایک لڑکا اوپر چڑھا تار کاٹنے میں مصروف تھا۔

'جب کوئی مدد کے لیے نہیں آ سکتا تو فون کا مصرف کیا!' منیر نے تلخی سے سوچا۔

اندر سے دروازوں کی چٹخنیاں لگائیں، الیاس کو ساتھ لیا اور پچھلے صحن کے دروازے سے باہر جھانک کر دیکھا۔ ان کا پڑوسی لڑکا کاجل ہاتھ میں تالا لیے کھڑا تھا۔ منیر جھجکا۔ ممکن ہے کاجل حملہ آوروں کو آواز دے کہ تمھارا شکار بھاگا جا رہا ہے مگر اس نے نرمی سے کہا، ''تم دونوں جلدی سے ہمارے گھر میں چلے جاؤ، میں باہر تالا لگا دوں گا اور کہہ دوں گا کہ یہ لوگ کئی دن سے یہاں نہیں ہیں۔''

الیاس اور منیر کاجل کے گھر میں داخل ہو گئے۔ کاجل کے باپ نے انھیں دیکھا اور سارا معاملہ بھانپ کر بیٹی سے کہا، ''ان دونوں کو اسٹور میں چھپا دو۔''

الیاس اور منیر، چھایا کے ساتھ اسٹور میں چلے گئے۔ چھایا نے منیر کو ہمدردی سے دیکھا اور دھیرے سے دروازہ بند کر کے تالا ڈال دیا۔ اسٹور کا دروازہ لوہے کا بند دروازہ تھا۔ ہوا اور روشنی صرف اوپر کے ایک روشن دان سے آ رہی تھی یا دروازے کے نیچے جو تھوڑی سی جگہ تھی اس میں سے۔ سارا دن لوگ کاجل کے والد کے پاس آتے اور برآمدے کے تخت پر بیٹھے طرح طرح کی باتیں کرتے رہے۔ ''تم نے دیکھا قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی ہو گیا۔ ہم پہلے ہی کہتے تھے کہ یحییٰ اور بھٹو نے سازش کر لی ہے۔ یہ اجلاس ہرگز نہیں ہوگا۔''

''بنگو بندھو نے یہ خبر سنتے ہی کہا تھا کہ اگر اجلاس ملتوی کرنا ضروری ہے تو نئی تاریخ کا اعلان ضرور کیا جائے۔ مگر ان کی بات کا نوٹس نہیں لیا گیا — یہ ہنگامہ اسی کا نتیجہ ہے۔''

''تو طاہر باغ اور کشمیری بازار کے لوگوں کا اس میں کیا قصور ہے؟'' کاجل کے والد نے کہا۔

''غصہ تو کسی نہ کسی پر اتارا ہی جاتا ہے۔ بڑے لوگ ہاتھ نہیں آتے تو ان کے چیلے چانٹے سہی۔''

''آج میں پوربانی ہوٹل میں موجود تھا۔ جہاں بنگو بندھو پریس کانفرنس کر رہے تھے۔ باہر لوگ لاٹھیاں اور بلّم لیے نعرے لگا رہے تھے۔''

''باہر پاکستان کے جھنڈے کو آگ لگائی جا رہی ہے، اس کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں؟'' ایک غیر ملکی نامہ نگار نے ان سے پوچھا۔

''انھوں نے کہا، نو کمنٹ...... حالاں کہ چاہتے تو بہت کچھ کہہ سکتے تھے۔ اس کے بعد اس نے کہا، جو غیر بنگالی بنگال میں رہ رہے ہیں ان کا کیا ہوگا؟ انھوں نے جواب دیا۔ وہ بھی اس زمین کے بیٹے ہیں انھیں یہاں کے لوگوں کے ساتھ مل کر تحریک میں حصہ لینا چاہیے۔ سو یہ ہے ساری بات، مگر ہوتا کیا ہے۔ جب پی آئی اے کا بنگالی عملہ اس بات پر ہڑتال کرتا ہے کہ جس طیارے سے قومی مجلس کے اراکین کو آنا چاہیے تھا اس میں فوجی آرہے ہیں تو یہ بہاری فوج اور ایئر فورس کے ساتھ مل کر ہاتھ بٹاتے ہیں، یہ ہاناوار باہنی (قابض فوج) کے پٹھو ہیں۔''

''سنا ہے شفیع الاعظم صاحب نے زور دیا ہے کہ شہر کے حالات سنبھالنے کے لیے فوج کو آنا پڑے گا۔''

''نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔ فوج آئی تو حالات اور خراب ہوجائیں گے۔ شام کو فوجی جنرلوں کے اور بھٹو کے پتلے جلائے گئے ہیں۔ ان کے خلاف بے حد غم وغصہ ہے۔''

رات تک الیاس اور منیر اندھیرے، سیلے اور گھٹے ہوئے اسٹور میں یوں دبکے بیٹھے رہے جیسے دو چوہے بلی سے چھپ کر بیٹھے ہوں۔ رات گئے جب محلے والوں کی آمد ورفت بالکل بند ہوگئی تب اندر سے دروازہ بند کر کے اسٹور کھولا گیا اور چھایا رات کا کھانا لے کر اندر آئی۔ بھات، چرچری، ہری مرچ اور پیاز، آلو کا بھرتا اور دہی۔ وہ دونوں کھاتے رہے اور چھایا دھیمے لہجے میں باتیں کرتی رہی۔ تھوڑی دیر بعد کاجل بھی آ گیا۔ اس نے کوشش کی تھی کہ الیاس کے گھر والوں کو الیاس کے یہاں ہونے کی اطلاع دے آئے، مگر ناکام لوٹا تھا۔ اس کے بدلے میں وہ خبر لایا تھا کہ فارم گیٹ پر فوج نے گولی چلائی ہے اور بہت سے لوگ مارے گئے ہیں۔ شہر میں کئی مقامات پر مقامی لوگوں نے حملے کیے تھے۔ اصفہانی کالونی سے تمام لوگ بھاگ کر دوسرے علاقوں میں چلے گئے تھے۔ بہت سے لوگ چھاؤنی میں پناہ لے رہے تھے اور سیکڑوں لوگ ایئرپورٹ پر کیو لگائے پڑے تھے۔

دوسرے دن بھی الیاس اور منیر وہیں موجود تھے۔ شیخ مجیب نے پُرامن عوام پر گولیوں کی بوچھاڑ پر سخت صدائے احتجاج بلند کی تھی، اور مارشل لا کی فوراً منسوخی کے ساتھ ۷؍مارچ تک عوامی لیگ کے پروگرام کا اعلان کیا تھا جس میں ۳؍مارچ سے لے کر ۶؍مارچ تک ہر روز صبح چھ بجے سے دوپہر دو بجے تک کی مکمل ہڑتال بھی شامل تھی۔

دوسرے دن پھر کرفیو کی خلاف ورزی ہوئی۔ ہجوم نے پتھراؤ کیا۔ گورنمنٹ ہاؤس پر حملہ ہوا۔ گولیاں چلیں۔ کاجل خبر لایا کہ آٹھ نعشیں اقبال ہال میں لڑکوں کے قبضے میں ہیں۔ پانچ پلٹن میدان میں دیکھی گئی ہیں۔ تین گورنمنٹ ہاؤس پر حملہ کرنے والوں میں سے مرے ہیں۔ کئی اسپتالوں سے

زخمی لوگوں کے آنے کی اطلاع مل رہی ہے۔حکومت اور شیخ مجیب الرحمٰن دونوں خون کے عطیات کی اپیل کرر ہے ہیں۔ چٹا گانگ کی اصفہانی کالونی سے غیر بنگالیوں کے قتلِ عام کی اطلاع آئی تھی جس پر شمس الرحمٰن سمیت ڈھا کا یونی ورسٹی کے کئی بنگالی پروفیسروں نے احتجاج کیا تھا۔

آج کا جل، مرزا صاحب کوالیاس کے بارے میں بتانے میں کامیاب ہوگیا تھا۔رات کوگیارہ بجے کے قریب ایک جیپ باہر آن کر رکی تھی جس میں سے مرزا صاحب تیزی سے اترے تھے۔ جیپ میں کیپٹن جواد کے ساتھ ہتھیار بند سپاہی تھے۔مرزا صاحب اورالیاس درمیان میں بیٹھے، سپاہی دونوں طرف جواد ڈرائیور کے پاس بیٹھا اور جیپ ڈھا کا شہر کی پتلی پتلی گلیوں کو پار کر کے رمنا کے خوب صورت علاقے میں آئی۔ سڑکوں کے سایہ دار چھتنار درخت اندھیرے میں ڈوبے کھڑے تھے۔ خالی سڑکیں اس وقت اور بھی چوڑی لگ رہی تھیں۔ کہیں کوئی نظر نہ آتا تھا۔جگہ جگہ فوج کے ٹرک قدرے چھپے ہوئے کھڑے تھے۔اِکا دُکا جیپ گزرتی نظر آتی تھی۔

جیپ کی آوازسن کر بینو ننگے پیر بھاگتی ہوئی باہرنکلی اورالیاس کو سینے سے لگالیا۔پھردل ہی دل میں خدا کا شکرادا کرتی وہ جواد کے پاس گئی۔اپنے خاص انداز سے اس نے اپنے کھلے لمبے بالوں کو جھٹکا۔"تھینک یو جواد بھائی۔"

"یو آر ویل کم۔" جواد نے اس کی گہری آنکھوں میں جھانکا۔اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں ستارے سے ٹوٹ رہے تھے۔

اس رات پہلی مرتبہ بینو نے اپنے ہاتھ سے کافی بنا کر جواد کو پلائی تھی اور جواد کی کسی بات کی مخالفت نہیں کی تھی۔ یہاں تک کہ اس نے پیش کش کی کہ وہ چند دن کے لیے چھاؤنی اٹھ جائیں، تب بھی وہ خاموش رہی تھی۔ اور جس وقت وہ رخصت ہورہا تھا تو بوندا باندی کے باوجود باہر تک اسے چھوڑنے گئی تھی۔ گہری اندھیری رات بھیگی ہوئی تھی۔سڑک سنسان تھی۔ درخت دَم سادھے بھیگی ہوا میں بوجھل سے کھڑے تھے۔خدا حافظ کہتے وقت جواد نے اسے کچھ ایسی نظروں سے دیکھا کہ اسے جھرجھری سی آئی۔ وہ ان نگاہوں کا پیغام سمجھنے سے قاصر تھی۔

منیر کا جی چاہ رہا تھا کہ اپنا دل نکال کر اسے خوب نچوڑ کر کپڑے کی طرح دھوپ میں پھیلا دے، دھوپ اور ہوا کھا کر شاید کچھ تازہ ہو جائے۔ ہر وقت کی سیلی سیلی، سہمی سہمی تنہائی کی کیفیت نے بالکل تھکا دیا تھا۔ ایک چھایا تھی جو اس میں ہوا کا جھونکا بن کر کبھی کبھی داخل ہوتی تھی۔ مگر حالات ایسے تھے کہ وہ اس سے یہ بھی نہیں کہہ سکتا تھا کہ بس کھانا دینے اور کھانے کے برتن لینے آتی ہو، تھوڑی دیر تو اور ٹھہرو۔ اپنی مرضی سے کبھی کبھی وہ چند منٹ کاجل کے ساتھ بیٹھ جاتی تھی اور ایک دن جانے کہاں سے ڈھونڈ کر وہ اس کے لیے اردو کا ایک رسالہ لائی تھی، جسے وہ روشن دان سے آنے والی ناکافی روشنی میں پڑھنے کی کوشش کیا کرتا تھا۔ بالآخر آج رات اس نے اپنے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا تھا، کاجل نے کہا تھا اس کے والد ابھی نہیں آئے ہیں۔ اس نے ایک پرچہ لکھ کر ڈال دیا ہے کہ جب وہ آئیں تو سب سے پہلے ہم سے ملنے آئیں، ایک ضروری بات کہنی ہے۔ اگر وہ آتے تو یقیناً سب سے پہلے ان کے پاس آتے۔ اس کے باوجود آج رات منیر نے اپنے گھر پر گزارنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

اندھیرا ہونے کے بعد وہ کاجل کے ساتھ اپنے گھر آنے کے لیے نکلا۔ دروازے کی تین سیڑھیوں پر قدم رکھتے ہوئے وہ ٹھٹکا۔ سنا ہے آج کل مغربی پاکستانی لیڈروں کے پتلے جلائے جا رہے ہیں، کیا یہ بھی کوئی پتلا ہے؟ اس نے جھک کر غور سے دیکھا اور اس کا خون خشک ہو گیا ۔۔۔ وہ اس کے والد ظفر احمد تھے، جیسے سوکھا تا نت۔ ان کے جسم میں خون کی ایک بوند بھی نہیں تھی۔ اس کے باپ کا یہ بیش قیمت یا ارزاں خون ان کے اپنے لوگوں کے کام آئے گا، یہ دکھانے کے لیے انھیں

اپنے گھر کے آگے ڈالا گیا تھا۔ ورنہ ان کو کہیں بھی پھینکا جا سکتا تھا۔ خدا جانے یہ جو اتنا لہو بہہ رہا ہے، دریائے گنگا، میگھنا، پدّا، سُرما، ساری ندی نالے، جوہڑ، چھپڑ بھرے ہوئے ہیں، یہ کس کے کام آ رہا ہے؟ انسانوں کو مار کر انسانوں کا خون دو ـــــ یہ کون سے صحیفے میں آیا ہے؟! وہ وہیں زمین پر بیٹھ گیا۔ ٹھنڈی پھوار اس کے پتلے جیسے باپ کے بدن پر، اس پر اور کاجل پر پڑ رہی تھی۔ کاجل کاٹھ کے کیلاشی مجسموں کی طرح دروازے سے لگا خاموش کھڑا تھا۔

کیا منیر سوچ رہا تھا، کیا وہ سوچنے کے قابل تھا؟ نہیں ایک احساس تھا کہ جب اس کے والد کے جسم سے خون نکالا جا رہا ہوگا تو دل خود بخود نچڑتا جاتا ہوگا۔ انھیں نقاہت بھری نیند آ رہی ہوگی، جیسے طویل بیماری سے صحت یاب ہونے کے بعد آتی ہے کہ بس آدمی سوئے چلا جائے۔ پھر سفید باریک سر سراتا لبادہ پہنے ملک الموت آیا ہوگا۔ اس نے ان کا ہاتھ تھاما ہوگا۔ انھیں لگا ہوگا جیسے اس کے ہاتھ میں بڑی سی سرنج ہے، جسے اس نے بازو میں کھبو یا ہے۔ پھر ان کا سر ایک طرف کو ڈھلک گیا ہوگا۔ وہ اس سوکھی چربی کی طرح ہو گئے ہوں گے جس کو قصائی گوشت سے الگ کر کے پھینک دیتے ہیں۔ پھر وہ انھیں یہاں لا کر پھینک گئے ہوں گے۔ منیر کا سر ایک طرف کو ڈھلکا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔

۳ رمارچ کو قومی دن منایا گیا تھا۔ پلٹن میدان میں نُور عالم صدیقی کی صدارت میں طلبہ کا بہت بڑا اجتماع ہوا تھا۔ پٹل، اکرام الحق اور میلو جلسے سے لوٹے تو چپکے چپکے باتیں کر رہے تھے۔ میلو پہلی پہلی محبت کے تجربے سے گزرنے والے نوجوان کی طرح بے حد پُر جوش تھا اور خوف زدہ بھی۔ آج پہلی مرتبہ بنگلہ دیش کا قومی ترانہ گایا گیا تھا۔ میلو نے ترانے کے الفاظ دھیرے دھیرے اسی دھن میں دُہرائے۔

''آمار شونار بنگلہ آمی تمائے بھالو باشی۔''

(میرے سنہرے دیش! میں تم سے پیار کرتا ہوں)

آج ہی عوام کے سامنے بنگلہ دیش کا پرچم بھی پیش کیا گیا تھا۔ سبز زمین پر سرخ سورج اور اس کے درمیان بنگلہ دیش کا نقشہ تھا۔

''پتا ہے بنگو بندھو نے کہا ہے، جب تک اقتدار عوامی نمائندوں کو نہیں دیا جائے گا، اس وقت تک ٹیکس بھی نہیں دیے جائیں گے۔'' میلو زور زور سے چہک رہا تھا۔ اکرام الحق نے اسے زور سے بولنے سے منع کیا۔ میلو نے محسوس کیا اکرام اور پٹل سہمے ہوئے ہوں۔ انھوں نے گھر میں قومی ترانے اور جھنڈے کی بات کرنے سے منع کیا۔ ''دا پیپل'' اخبار پہلے ہی چھپا کر رکھا جاتا تھا۔ مصباح الحق صاحب کو پاکستان آبزرور دیا جاتا تھا اور وہ یہ دیکھ کر حیران تھے کہ اخبارات میں ساری خبریں عوامی لیگ کی تھیں اور شیخ مجیب الرحمٰن کی طرف سے ہدایات جاری ہو رہی تھیں۔ مکمل ہڑتال کرنے پر میں

عوام کو مبارک باد دیتا ہوں۔ میں یہ حکم دیتا ہوں کہ جن سرکاری اور غیر سرکاری محکموں میں تنخواہیں نہیں دی گئی ہیں، وہ تنخواہوں کی ادائیگی کے لیے ڈھائی بجے دن سے ساڑھے چار بجے تک کھلے رہیں گے۔ ان اوقات میں بینک بھی کھلے رہیں گے۔ تمام معاملات مشرقی بنگال کے دو بینکوں کی وساطت سے کیے جائیں گے۔ مگر ایک پیسہ بھی مغربی پاکستان منتقل نہیں ہوگا۔ غیر ملکی خطوط اور تار منیلا اور لندن کے راستے بھیجے جائیں گے۔

مصباح الحق صاحب کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہورہا ہے۔ اکرام نے انھیں سمجھایا تھا کہ فوج بیرکوں میں واپس چلی گئی ہے۔ شیخ مجیب کی طرف سے روز کی ہڑتال کا اعلان ہے اس لیے بینک، فیکٹریاں اور دکانیں شیخ کے کہنے پر ہی کھولی جاتی ہیں۔ حکومت اس معاملے میں جان بوجھ کر خاموش ہے۔ وہ سمجھتی ہے کہ اب مغربی پاکستانی لیڈروں اور شیخ سے مذاکرات کے بعد ہی کچھ نتیجہ نکلے گا۔

بھلا مصباح الحق صاحب کو کیا معلوم تھا کہ اب طالب علم لیڈروں کو چار خلیفہ کہا جانے لگا ہے اور نذرالاسلام کی نظم کھیا پار ریترنی میں چار خلفا کی جگہ سراج، رب، قدوس، نور عالم کے نام آنے لگے ہیں۔

اس چپو کے چلانے والے ہیں تو پھر خوف و اندیشہ کیسا!

اس کشتی کا ناخدا تجربہ کار ہے۔

سلہٹ، جیسور، کومیلا، ٹونگی، کھلنا، راج شاہی اور چاٹ گام میں گولیاں چلیں۔ رنگ پور میں کرفیو لگا۔ ڈھاکا میں اَن گنت جلسے ہوئے۔ کے جی مصطفےٰ کی زیرِ قیادت صحافیوں کے جلسے میں شمس الرحمٰن بھی موجود تھا۔ حسن امام اور غلام مصطفےٰ کی زیرِ قیادت بنگلہ اکیڈمی میں فن کاروں کا اجتماع ہوا، پتل اس میں شریک تھی۔ شہید مینار پر پوربو پاکستان چھاترو یونین کا جلسہ ہوا۔ میلو اس میں شریک تھا۔ عوامی لیگ کی خواتین کے جتھے نے شہید مینار پر اپنے ہاتھ بلند کرکے حلفِ وفاداری لیا۔ چیخ چیخ کر ان کی آوازیں بیٹھ گئیں۔ پتل کی دوست مُوکل سب سے آگے آگے تھی۔

میرے بہت پیارے چاچا جی!

میں آج آپ سے کوئی بات نہیں کروں گی، صرف آپ کے سینے پر سر رکھ کر رو دوں گی کہ آج میں بہت اداس ہوں۔ میں آپ سے یہاں آنے کی بات بھی نہیں کروں گی کہ جب آپ میری خاطر کبھی کراچی تک نہ آئے تو یہاں کیا آئیں گے لیکن میرا دل اور میری روح پکار پکار کر کہہ رہی ہے۔ اے کاش چاچا جی آج میرے پاس ہوتے۔ میں زندگی میں کبھی اتنی تنہا نہیں رہی۔ کبھی میں نے اور آپ نے اس بات پر فخر کیا تھا کہ ہماری زندگی میں پچھتاوے نہیں ہیں، لیکن اب پچھتاوے آسیبوں کی طرح میرے پیچھے لپک رہے ہیں۔ میں روز انجانی آفتوں اور نئے نئے کامپلکس کا شکار ہو رہی ہوں۔ میرا قد، میرا رنگ، میرے بال (جو کبھی میری خوبیوں میں شمار ہوتے تھے) میری زبان، میرا لباس، ہر چیز یہاں کے لوگوں کے لیے قابلِ نفرت ہے۔ کسی سے وقت پوچھوں تو جواب نہیں ملتا۔ راہ پوچھوں تو لوگ گونگے بن جاتے ہیں۔ نفرت کی یہ چنگاریاں میری روح کو جھلس رہی ہیں چاچا جی — اس لیے کہ میں تو ان کی جنگ لڑتی رہی۔ میں نے بنگلہ زبان سیکھی، یک جہتی کے لیے مضامین لکھے، ڈرامے کیے — مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم نے جو بویا ہے تو گندم کیسے کاٹو گے؟ نفرت کا بیج بویا ہے تو محبت کا پھل کیسے پاؤ گے — ایسے وقت جی چاہتا ہے کہ ان کی اور اپنی جان ایک کر دوں۔ مگر شس مجھے سمجھاتے ہیں کہ سب ٹھیک ہو جائے گا، ذرا دھیرج کی ضرورت ہے — مگر میں جانتی ہوں کہ میری وجہ سے لوگ اس کے سامنے کچھ نہیں کہتے — وہ ہم لوگوں سے شدید نفرت کرتے

ہیں۔ اس کے سامنے نقاب اوڑھے رکھنے والے میرے سامنے نقاب اتار دیتے ہیں اور میں دہل جاتی ہوں، خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔

چاچا جی ان کے جتنے بھی نکات ہیں، اس وقت ترازو کے باٹ ہیں۔ اگر عقل مندی سے کام لیا گیا تو مسئلہ حل ہوسکتا ہے۔ ورنہ یہ سارے باٹ ایک پلڑے میں رکھے جائیں گے اور پلڑا کس طرف کتنا جھکے گا اور اس کے بعد کیا ہوگا، یہ بات، اگر آپ یہاں ہوتے تو فوراً سمجھ لیتے۔ یہاں کی فضا میں کسی چیز کی بو ہے، شاید یہ بو آپ تک نہ پہنچتی ہو لیکن ہم تک خوب پہنچ رہی ہے۔

بس میں آپ سے ایک ہی بات کروں گی کہ جو کچھ ہونے والا ہے، دعا کیجیے کہ نہ ہو۔

آپ کی زری

اور چاچا جی نے جواب دیا تھا:

زری پتر!

تُو مجھے اس طرح پکارے اور میں نہ آؤں، یہ کس طرح ہوسکتا ہے۔ ایک دفعہ زیب قادری نے بھی مجھے اسی طرح پکارا تھا، زبان سے نہیں دل سے ـــ میں بے حس سہی، دنیا چھوڑ دی۔ لیکن جیتے جی یہ دنیا کسی سے چھوٹی نہیں۔

تو نے مجھے قلم سے نہیں، روح کی آواز سے پکارا ہے۔ میں بہت جلد پہنچوں گا تو فکر نہ کر ـــ

ـــ تیرا اور اب فقط تیرا، چاچا جی

شمس الرحمٰن، مصباح الحق صاحب کی کار میں نور اور نرگس کو چھوڑنے ایئرپورٹ جارہا تھا۔ شہر میں بے حد بے چینی کی فضا تھی۔ وہ شہر جو گہما گہمی سے ابلتا رہتا تھا، سہا ہوا تھا۔ فوج جگہ جگہ موجود تھی مگر محتاط اور چھپی ہوئی۔ سڑکوں پر جگہ جگہ بانس کی رکاوٹیں لگادی گئی تھیں، جہاں صوبے سے باہر جانے والوں کی چیکنگ ہوتی تھی۔ بہت عرصے پہلے غیر بنگالیوں سے کہا گیا تھا کہ تم جب بھی یہاں سے گئے، تین کپڑوں میں جاؤ گے۔ تمھیں یہاں سے مال و متاع، جمع پونجی اور جائداد بیچ کر پیسے نکال کر لے جانے کی اجازت نہیں ہوگی۔ آج یہ بات حرف بحرف سچ ثابت ہورہی تھی۔

فارم گیٹ کے بیریئر (Barrier) پر شمس الرحمٰن نے کار آہستہ کی اور باہر دیکھا۔ ایک سائیکل رکشا پر ایک برقع پوش عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ پاس کھڑے ہوئے پٹھان کی تلاشی لی جارہی تھی۔ شمس الرحمٰن اور نور کو دیکھ کر فوراً بانس کی رکاوٹ اونچی کردی گئی۔ بیریئر سے گزر کر شمس الرحمٰن نے کار کو آہستہ کر کے آئینہ میں سے دیکھا کہ پیچھے کیا ہورہا ہے۔ زری، نور اور نرگس نے بھی پلٹ کر دیکھا۔ پٹھان کی تلاشی لینے کے بعد بیریئر پر کھڑے شخص نے عورت کے گلے سے ہار اتارنے کے لیے اس کے سفید ٹوپی والے برقعے میں چھپی اس کی گردن کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ پٹھان زور سے گرجا،

''ہماری بیوی کو ہاتھ مت لگاؤ۔''

بیریئر پر کھڑے لوگوں نے اسے مارنا شروع کردیا۔ رکشا میں بیٹھی ہوئی عورت رونے چلانے لگی۔ رکشا والا اپنی سائیکل پر بیٹھ کر تیزی سے آگے بڑھا۔ جیسے ہی وہ کار کے نزدیک پہنچا، نرگس نے

کار کا دروازہ کھول کر برقعے والی عورت کو کار میں کھینچ لیا۔ پٹھان ابھی تک چلّا رہا تھا نہ معلوم اس نے کیا کہا تھا کہ لوگ زور زور سے ہنس رہے تھے اور اس کے چاروں طرف گھیرا ڈال لیا تھا۔ عورت روتی رہی۔ زری اور نرگس اسے تسلی دینے لگیں۔

''جو کچھ ہو رہا ہے یہ نہیں ہونا چاہیے شمس۔'' نزدیک بیٹھے ہوئے نور نے سرگوشی میں کہا۔ اس کے لہجے میں کرب تھا۔ ''اے کا بدلہ بی کو مار کر نہیں لیا جاسکتا۔ تم شیخ صاحب سے جا کر پوچھنا کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟''

''تمھارے خیال میں کیا شیخ صاحب کو معلوم نہیں ہے کہ یہ رکاوٹیں کس نے بنائی ہیں اور وہاں کیا ہو رہا ہے؟''

''کیا یہ سب ان کی مرضی سے ہو رہا ہے؟'' نور نے حیرت سے پوچھا۔

''یہ بات نہیں ہے۔ عوام نے سوچ لیا ہے کہ انقلاب کی ابتدا ہو چکی ہے۔ جب انقلاب آتا ہے تو اس میں کشت و خون تو ہوتا ہی ہے۔ بس ان کی نظر میں صرف ایک بات ہے، انقلاب کا ہر قیمت پر کامیاب ہو جانا۔''

''انقلاب کے لیے ایسے بیان دیے جاتے ہیں کہ لوگ عام آدمیوں، عورتوں اور بچوں کو مارنے لگیں۔'' نرگس نے غصّے سے کہا۔

''یہ تند و تیز بیان بڑی تباہی لاتے ہیں شمس۔'' نور نے کہا، ''ہٹلر کے زمانے میں دنیا بھر کی یہودی تنظیموں کی کانفرنس نیویارک میں ہوئی تھی۔ وہاں ایک لیڈر نے ساری یہودی آبادی کی طرف سے جرمنی کے خلاف جنگ کا اعلان کر دیا تھا۔ تمھیں معلوم ہے اس کا نتیجہ کیا ہوا تھا؟ ہٹلر نے جب یہ سنا تھا تو غصّے سے بلبلا اٹھا تھا۔ بے قابو ہو کر چیخنے چلانے لگا تھا کہ اب میں ان یہودیوں کو نیست و نابود کر کے چھوڑوں گا۔'' اس کے بعد اس نے یہودیوں کے کیمپ بنائے جہاں کروڑوں کے حساب سے قیدی مارے گئے، زندہ جلائے گئے اور گیس کی بھینٹ چڑھائے گئے۔ ایک وقت آیا جب کہا گیا کہ خون دیکھ کر نازی سپاہی یاسیت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ دوسرے مذہب میں خون بہانا منع ہے، اس لیے ان لوگوں کو گیس چیمبرز میں ہلاک کیا جائے گا۔ مذہب میں خون بہانا منع ہے اس لیے انھیں بغیر خون بہائے مارو۔۔۔ سنا تم نے؟''

''ہاں، ایسی باتیں کہنے سے یہ تو ہوتا ہی ہے۔ مغربی پاکستان کے ایک لیڈر نے بھی تو ایسے ہی محفوظ مقام پر بیٹھے بیٹھے خیبر سے کراچی تک آگ لگا دینے کی بات کی تھی اور اسمبلی میں جانے والوں کی ٹانگیں توڑ دینے کی دھمکی دی تھی۔''

''تو کیا شمس بھائی، آپ ان زیادتیوں کو جائز ثابت کرنا چاہتے ہیں۔'' نرگس نے کہا۔

''دیکھو، جہاں ایک طبقہ دوسرے طبقے کا حق پامال کرے گا، وہاں کبھی نہ کبھی کچلے ہوئے لوگ ابھریں گے اور استحصال کرنے والوں سے انتقام لیں گے۔ ایسے وقت میں بھلے لوگ بھی مارے جائیں گے، بے گناہ بھی مریں گے۔ ہر انقلاب میں یہی ہوتا ہے اور اس وقت جو تم یہاں سے جا رہے ہو تو میں یہی کہوں گا کہ یہ وقت جانے کا نہیں ہے۔ تمھاری نظم ''کنول'' میرے پاس ہے۔ میں اس کا انگریزی ترجمہ اخبار میں چھپواؤں گا اور نیچے نوٹ لکھوں گا کہ اس نظم کا کوی دیس سے دغا کر کے بھاگ گیا ہے۔''

''ارے خدا لگتی کہیے شمس بھائی۔'' نرگس نے دہائی دی، ''یہاں اصفہانی کالونی میں میرا خاندان مرتے مرتے بچا۔ ابا نے اسی لیے امّی اور بہن بھائیوں کو چاٹگانگ بلا لیا ہے۔ ہم گلشن کالونی میں کسی کے گھر چھپ کر رہ رہے ہیں۔ اب نیا پلٹن میں کسی اور کے فلیٹ میں سر چھپائے بیٹھے ہیں۔ جب مجھے سلیڈ اسکول میں داخلہ مل گیا ہے تو میں کیوں نہ جاؤں۔ ایسے غیر اطمینان بخش حالات سے بچنے کا بہترین موقع ہے۔''

''تو یوں کہو نا کہ یہاں کے غیر تسلی بخش حالات سے کوئی دلچسپی نہیں تمھیں۔ ہمارے مستقبل، ہماری آرزوؤں سے کوئی سروکار نہیں — میں زری سے یہی تو کہتا ہوں کہ یہ صوبہ تمھارے لیے پکنک اسپاٹ تھا۔ یہاں کا سبزہ، اناس، کٹھل اور لیچیاں تمھیں اچھی لگتی تھیں۔ اب پکنک نہ رہی تو یہاں رہنے سے فائدہ —''

''کیا کہہ رہے ہو شمس، تم تو ایسی جلی کٹی باتیں نہیں کرتے تھے۔'' نرگس نے کہا۔

''نہیں کرتے تھے تو اب کریں گے، سچ کب تک نہیں بولیں گے۔''

''زری! اپنے میاں کو سمجھاؤ، انھیں کیا ہو گیا ہے۔'' نرگس نے زری کو جھنجھوڑا جو پورے وقت خاموش رہی تھی۔

''میں کیا سمجھاؤں!'' زری روہانسی ہو رہی تھی۔ ''میری وجہ سے تو یہ تلخی آئی ہے۔ جب کسی کے دوست، احباب، رشتے دار، سب ایک شخص سے نفرت کرتے ہوں، تو وہ بے چارہ کب تک برداشت کر سکتا ہے؟''

''چپ رہو زری۔'' شمس گرجا، ''تم نے اور میرا دماغ خراب کر دیا ہے۔''

''یوں کرو شمس، تم بھی کچھ دن کے لیے باہر چلے چلو۔'' نور نے کہا۔

''ہرگز نہیں۔ تم جاؤ، مجھے اور میرے صوبے کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ اگر جانا چاہے تو زری کو

لے جاؤ۔''

''زری! بی بی گل—'' برقعے میں لپٹی روتی عورت نے زری کو غور سے دیکھا۔

''بی بی گل—'' زری چونکی— یہ بچپن کے، صدیوں پُرانے نام کی صدا کہاں سے سنائی دی۔

''میں زلیخا ہوں۔'' برقعے والی نے کہا، ''آپ کو یاد نہیں ہوگا، آپ کی امی مجھے اچھی طرح جانتی ہیں۔''

''میں تمھیں جانتی ہوں زلیخا'' زری نے کہا۔ ''میں نے اپنے گھر میں بہت دفعہ تمھارا ذکر سنا ہے۔''

''وہ میرا خاوند تھا عبدالغنی— وہ اسے مار دیں گے۔'' زلیخا نے کہا۔

''نہیں نہیں— میں ابھی اپنے شوہر کو بھیجتی ہوں، وہ اسے لے کر آجائیں گے۔''

زری کے اصرار پر شمس الرحمٰن فارم گیٹ تک واپس گیا۔ وہ پٹھان وہاں موجود نہیں تھا۔ البتہ سنگین سے نکالی گئی اس کی آنکھیں نالی میں پڑی بٹ بٹ آسمان کی طرف تک رہی تھیں۔ شمس الرحمٰن نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ اسے اپنی ہتھیلیوں پر کسی گرم نم سی چیز کا احساس ہوا۔ ڈرتے ڈرتے اس نے اپنی ہتھیلیوں کو دیکھا۔ وہاں خون تھا— نہیں وہ صرف آنسوؤں کی نمی تھی جو پہلی نظر میں شمس الرحمٰن کو خوناب سی دکھائی دی تھی۔

مارشل لا ہیڈ کوارٹر یہاں سے دور نہیں تھا۔ نعش کو فوجی جیپ میں ڈال کر لے گئے تھے۔ لیکن وہاں کھڑے لوگ ابھی تک حیرت سے اس پٹھان کی باتیں کر رہے تھے جو پاگلوں کی طرح چلا رہا تھا، ''تم ہماری بیوی کی طرف دیکھے گا تو ہم تمھاری آنکھ نکال لے گا— تم ہماری بیوی کی نقاب پر ہاتھ ڈالے گا تو خدا کی قسم، ہم تم کو ننگا کر کے چھوڑے گا۔'' اس وقت اس کی آنکھوں میں خون تھا اور وہ نہتا کتنے ہی آدمیوں سے بھڑ گیا تھا۔ چناں چہ اس کو مار کے خون نالی میں بہنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ سنگین سے اس کی آنکھیں نکال دی گئی تھیں اور اس کی سزا کو پورا کرنے کے لیے اسے ننگا کر دیا گیا تھا۔ اور اس وقت حیرت سے سب نے اسے دیکھا تھا۔ ایک مجمع اس کے چاروں طرف کھڑا ہو گیا تھا — یہ شخص ہندو تھا، مسلمان تھا یا سکھ تھا— یہ ہم نے کس کو مار دیا تھا— وہ سب حیران تھے۔ وہ ہندو یا سکھ تھا تو شٹل کاک برقعے والی کو اپنی بیوی کیوں بتا رہا تھا۔ ایک لڑکے نے اس کی جیب سے کاغذات نکالے۔ ہوائی جہاز کے ٹکٹ کے ساتھ پرانی سی ایک ڈائری تھی۔ ٹکٹ میں اس کا نام عبدالغنی تھا لیکن ڈائری میں اس کا نام دلدار سنگھ تھا۔ ڈائری میں کہیں پشتو ٹپے، کہیں گورمکھی میں چند سطریں اور کہیں اردو میں کوئی فلمی گانا لکھا ہوا تھا۔ خدا جانے کون شخص تھا، بہر حال اب مر گیا تھا اور اس پر وقت برباد کرنا بے سود تھا۔ وہ سب اپنے کاموں سے جانے لگے تھے۔ شمس الرحمٰن کی درخواست پر اس شخص

کا اور اس کی بیوی کا ٹکٹ اسے دے دیا گیا تھا۔

شمس الرحمٰن نے واپس جا کر زلیخا کو جھوٹی تسلی دی کہ عبدالغنی زخمی ہو گیا ہے اس لیے اسے چھاؤنی کے اسپتال میں داخل کر دیا گیا ہے، جیسے ہی وہ ٹھیک ہو گا، اسے مغربی پاکستان بھجوا دیا جائے گا۔ زلیخا روئے جا رہی تھی اور واپس جانے پہ بضد تھی۔ وہ عبدالغنی کے بغیر کسی صورت مغربی پاکستان جانے کو تیار نہ تھی۔ چاروں نے مل کر بڑی مشکل سے اسے راضی کیا۔ اسے بتایا کہ عبدالغنی کی خواہش یہی ہے کہ وہ اپنے گاؤں چلی جائے۔ اتفاق سے شمس الرحمٰن کے کوئی جاننے والے صاحب اور ان کی بیگم راول پنڈی جانے والے مسافروں میں شامل تھیں۔ شمس الرحمٰن نے ان سے استدعا کی کہ زلیخا کو اپنے ساتھ رکھیں، اور جب بھی ممکن ہو اس کو بحفاظت اس کے گاؤں تک پہنچا دیں۔

پی آئی اے کا سارا بنگالی اسٹاف ہڑتال پر تھا۔ ایئر فورس کے عملے کے ساتھ غیر بنگالی ان کی مدد کر رہے تھے۔ پورے پورے خاندان گھر کا اثاثہ لیے ایئر پورٹ پر پڑے تھے۔ لمبی لمبی قطاریں عمارت سے باہر سڑک تک چلی گئی تھیں۔ کچھ لوگوں نے اپنا گھر اور سامان اونے پونے بیچ دیا تھا اور چند نے اپنی نئی کاروں کے بدلے ہوائی جہاز کا ٹکٹ خرید لیا تھا۔

۶/مارچ کی رات شیخ مجیب الرحمٰن کی زندگی میں ایک اہم رات تھی۔ مکان نمبر ۶/۷۷ روڈ نمبر ۳۲، دھان منڈی میں آج بے حد رونق تھی۔ بہت سی کاریں کھڑی تھیں۔ کسی نامعلوم خوشی پر لوگ مٹھائی کے ڈبے لے کر آ رہے تھے۔ سامنے مصنوعی جھیل سے ٹھنڈی ہوا آ رہی تھی۔ چاروں طرف جھیل پر جھکے درخت اس وقت خوابیدہ تھے۔ گھر کے باغ کے آموں پر بور آیا ہوا تھا۔ گل چاندنی کے درخت پر سفید پھول چھلکے ہوئے تھے۔ ناریل اور چھالیا کے درخت ساکن تھے۔ برآمدے کی شطرنجی ٹائلیں مشرقی پاکستان کی سیاست کی طرح لمحے لمحے نیا ڈیزائن بناتی اور مٹاتی تھیں۔ کبھی زینے کی طرح اوپر چڑھتی ہوئی معلوم ہوتیں، اور کبھی نیچے اترتی۔ ڈرائنگ روم میں چینی مصور کی مشہور گھوڑے کی تصویر کے ساتھ ٹیگور اور نذر الاسلام کی تصاویر آویزاں تھیں۔ مہاتما بدھ اور سبھاش چندر بوس کے مجسمے خاموشی اور گمبھیرتا سے کھڑکی کے پٹ میں سجے ہوئے تھے۔

رونجھو نے اندر آتے ہوئے سب سے پہلے سیاہ گیٹ میں کانسی کا چمکتا ہوا بنگلہ دیش کا نقشہ دیکھا، جس کے چاروں طرف چھ ستارے چھ نکات کی علامت تھے۔ آتی جاتی کاروں اور اسکوٹروں کی روشنیاں اس پر نئے نئے زاویوں سے پڑ رہی تھیں۔ اس کے مختلف حصوں پر یکا یک روشنی کی چھوٹ پڑتی اور پھر وہ اندھیرے میں ڈوب جاتے۔

چھاترو لیگ کے تقریباً سارے سرکردہ راہنما موجود تھے اور شیخ مجیب پر آزادی کا اعلان کرنے کا دباؤ ڈال رہے تھے۔ اخباروں میں روز شیخ مجیب الرحمٰن کی طرف سے ہدایات شائع ہو رہی تھیں اور ان پر عمل

ہو رہا تھا۔ آزاد بنگلہ دیش کے قومی نغمے اور قومی پرچم کا انتظام ہو گیا تھا۔ اب دیر کس بات کی تھی۔ بحث جاری تھی کہ شیخ مجیب الرحمٰن کے سیکرٹری نے اطلاع دی کہ چند بڑے فوجی افسران سے ملنے آئے ہیں، انھیں ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا گیا ہے۔ فوری خیال یہی تھا کہ شاید وہ شیخ کو گرفتار کرنے آئے ہیں۔ مگر بعد میں پتا چلا کہ وہ جنرل یحییٰ خاں صدرِ پاکستان کا ایک پیغام لائے تھے۔ غیر ملکی اخباروں میں خبریں چھپ رہی تھیں کہ اتوار کو شیخ مجیب اپنے نئے دستور کا اعلان کریں گے اور ان اعلانات سے بوکھلا کر آدھی رات کو صدرِ پاکستان نے پیغام بھیجا تھا کہ شیخ مجیب جلدی میں کوئی قدم نہ اٹھائیں۔ صدر بہت جلد خود ڈھاکا آئیں گے اور ان کے ذہن میں ایک ایسا نقشہ ہے جو چھ نکات سے بھی بڑھ کر عوام کو مطمئن کر سکے گا۔"

پیغام دے کر اور مٹھائی کھا کر فوجی افسر رخصت ہوئے تو دوبارہ بحث کا آغاز ہوا۔ کچھ دیر بعد فیصلہ ہوا کہ سارے طالب علم لیڈر بنگو بندھو کی سات مارچ کی تقریر کے بارے میں تفصیل سے آپس میں بات چیت کریں اور پھر آن کر اُن سے بات کریں۔ طالب علم لیڈروں نے اقبال ہال کی راہ لی۔ شیخ نے اپنے بھانجے شیخ مونی سے تھوڑی دیر آرام کرنے کو کہا۔

شیخ دونوں طرف سے گھر چکے تھے۔ وہ برآمدے میں کھڑے شطرنجی ٹائلوں کو دم بدم شکلیں بدلتے دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے، کل یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا۔ پھر وہ اندر چلے گئے اور لائبریری میں بیٹھ کر اپنی تقریر کو دوبارہ پڑھنے لگے۔ اب ایک ہی ترکیب اُن کی سمجھ میں آتی تھی، کل وہ بنگلہ دیش کا اعلان نہ کریں۔ نہ اس کا نام لیں، لیکن اپنی تقریر کی ٹون کو سخت رکھیں۔ مغربی پاکستانیوں کے لیے مذاکرات کی راہ کھلی ہے۔ اپنے لوگوں کے لیے مزاحمت کی راہ کھلی ہے۔ اگر کوئی فیصلہ نہ ہوا تو مجبوری — مگر ابھی وقت ہے۔

اگر اس کے بعد ایک بھی گولی چلی، اگر ہمارے آدمیوں کو ظلم کا نشانہ بنایا گیا تو ہر گھر کو ایک قلعے کی شکل دے دیں گے۔ آپ لوگوں کے پاس جو کچھ ہے اس کی مدد سے دشمن کے مقابلے کے لیے سینہ سپر ہو جائیں۔ اور حکومت سے میں کہوں گا — گولیاں برسانے کی کوشش نہ کرو۔ تم سات کروڑ عوام کو دبا نہیں سکتے۔ جب ہم نے خون دیا ہے تو مزید دیں گے۔ انھوں نے اپنی تقریر کا یہ حصہ پڑھا۔

اور پھر ایک ترپ کا پتّا ہوگا جو اپنے لوگوں کو گرمانے کے لیے کافی ہوگا:

اے باریر شنگرام مکتیر شنگرام

اے باریر شنگرام شادھینتار شنگرام

جے بانگلہ

(اب کی تحریک مکتی کی تحریک ہے۔ اب کی تحریک آزادی کی تحریک ہے)

انھیں کچھ اطمینان ہوا — اس جملے کو اعلانِ آزادی بھی سمجھا جا سکتا ہے۔

تھوڑی دیر کے لیے وہ اوپر اپنی خواب گاہ میں چلے گئے۔ کھڑکی سے پُرسکون جھیل کا منظر اجلنا شروع ہو گیا تھا۔ ۷ر مارچ کا تاریخی دن طلوع ہوا چاہتا تھا۔ باہر سے کچھ شور کی آواز سنائی دی۔ یونی ورسٹی کے کچھ لڑکے ان کے گھر پر بنگلہ دیش کا جھنڈا لگانے میں مصروف تھے۔ وہ ابھی باہر کھڑے نعرے لگا رہے تھے کہ اطلاع ملی، امریکی سفیر فارلینڈ ملنے آئے ہیں۔

جلدی جلدی منہ پر پانی کا چھینٹا مارا۔ سفید دھلا ہوا پاجامہ، سفید کرتا اور واسکٹ پہن کر مسکراتے ہوئے وہ زینے سے اترے کہ رات کی پریشانی اور کسل مندی آشکارا نہ ہو اور کھانے کے کمرے سے گزرتے ہوئے ڈرائنگ رام میں داخل ہوئے۔ فارلینڈ نے خالص امریکی انداز سے مسکراتے ہوئے صبح بخیر کہا اور ہاتھ ملایا۔ بیٹھنے کے بعد مختصر سی بات، نپے تلے انداز میں کی کہ حکومت، امریکا کا موقف ہے کہ اگر آج مشرقی بنگال کی آزادی کا اعلان ہوا تو امریکا اس کی حمایت نہیں کرے گا۔ اپنی اسی مخصوص مسکراہٹ کے ساتھ، جو ہر خوشی اور غم کے موقعے پر ان کا ساتھ دیتی تھی انھوں نے رخصتی مصافحہ کیا۔ پورچ میں کھڑی اپنی گاڑی میں بیٹھے اور رخصت ہوئے۔ شیخ مجیب ایک مرتبہ پھر اسی برآمدے میں شطرنجی ٹائلوں کا کھیل دیکھنے میں مصروف ہوئے۔ لڑکے بنگلہ دیش کا جھنڈا لگا کر چلے گئے تھے۔

آج کے دن کا سورج ان کے لیے کیا لے کر طلوع ہوا ہے، شیخ کو کچھ معلوم نہ تھا۔ بہت عرصہ ہوا ایک جنک (نجومی) نے ان کا ہاتھ دیکھ کر کہا تھا، آپ کی زندگی میں بہت اونچ نیچ ہے — ہمالیہ کی سی چڑھائیاں اور گھاٹیاں ہیں۔ خدا معلوم آج کا دن انھیں بلندی پر لے جائے گا یا کسی گھاٹی کی طرف۔

اقبال ہال سے لوٹ کر شیخ مجیب الرحمٰن کی سڑک پر آتے ہوئے سراج العالم خاں روبجھو اور اے ایس ایم عبدالرب نے فارلینڈ کی کار جاتی دیکھی۔

''یہ بڑے ملکوں کے مہرے اپنی چالیں چلنے سے باز نہیں آتے۔'' روبجھو نے کہا۔

شیخ مجیب الرحمٰن کی لائبریری میں ایک مرتبہ پھر اجتماع ہوا۔ شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنی تقریر نئی شکل میں دکھائی جس میں تحریکِ عدم تعاون کے دس نکات کا اضافہ کیا گیا۔

''اب ہمیں اپنی پرائیویٹ فوج بنالینی چاہیے سر!'' روبجھو نے کہا، ''آپ کہیں تو کل میں چٹاگانگ جا کر کرنل عثمانی سے بات کروں۔''

''میرا خیال ہے عثمان نے اس سلسلے میں کچھ کام شروع کر دیا ہے تم جا کر ان سے مل لو۔'' وہ لڑکوں کو باہر تک چھوڑنے آئے۔ ان کے جانے کے بعد وہ کچھ دیر تک جھنڈے کے سائے میں کھڑے رہے۔ سبز رنگ میں سرخ دائرہ اور اس پر بنگلہ دیش کا نقشہ — انھیں ایک جھرجھری سی آئی۔ جھیل پر سے آنے والی صبح کی ہوا یکا یک بہت سرد ہو گئی تھی۔ وہ اندر چلے گئے۔

رمنا پارک کے نزدیک ریس کورس گراؤنڈ سے ۷/ مارچ کی تاریخی تقریر نشر ہونے والی تھی۔ اس وقت ریڈیو پر اس کا آنکھوں دیکھا حال بیان ہو رہا تھا۔ الیاس اور سورج کو ریس کورس جانے کی اجازت نہیں ملی تھی اس لیے وہ ریڈیو سے نشر ہونے والا آنکھوں دیکھا حال سن رہے تھے جو کوئی شخص نہایت جوش اور جذبے سے بیان کر رہا تھا۔ "اس وقت یہاں لاکھوں آدمیوں کا سمندر موجزن ہے

جس میں چاروں طرف سے نئی نئی لہریں آن کر مل رہی ہیں۔ سہ پہر کا وقت ہے۔ دھوپ میں تیزی نہیں ہے۔ ڈائس کے ایک طرف کھمبے پر جھنڈا لپٹا ہوا ہے۔ جس وقت بنگو بندھو کے ہاتھوں پرچم کشائی ہوگی تو ہم تفصیل سے اس کا حال بیان کریں گے۔ فی الحال ہم آپ کو یہ بتانا چاہتے ہیں کہ لاکھوں افراد، جو یہاں اپنے عزیز لیڈر......'' یکا یک ریڈیو کھڑکھڑایا ـــ پھر آواز بالکل بند ہوگئی۔

سورج اور الیاس نے باری باری کئی مرتبہ ریڈیو کھولا، اور بند کیا۔ سوئی گھمائی مگر کچھ فائدہ نہ ہوا۔ الیاس نے گھر کے تمام ریڈیو سیٹ پر ڈھاکا لگا کر دیکھا مگر کہیں سے کوئی آواز نہ آئی۔ ریڈیو اسٹیشن فون کیا تو وہاں سے کسی نے نہ اٹھایا۔ تب اس نے بینو سے مدد لینا چاہی مگر بینو گھر میں نہیں تھی۔ وہ پتل کے گھر گئی ہوئی تھی۔ وہاں فون کیا تو مصباح الحق صاحب نے فون اٹھایا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ خود ریڈیو سن رہے تھے جو اچانک بند ہوگیا۔

بینو، پتل اور اکرام الحق کہیں گئے ہوئے تھے، کہاں، انھیں معلوم نہیں تھا، سورج اور الیاس نے مسکوٹ کی اور کسی کو بغیر بتائے ریس کورس کی طرف چل دیے۔ جب وہ نزدیک پہنچے تو جلسہ ختم ہو چکا تھا۔ لوگ اپنے قد سے ایک ایک قد آدم لانبے بانس اٹھائے واپس آ رہے تھے لیکن ان میں کسی قسم کا اشتعال نہیں تھا بلکہ یک گونہ مایوسی تھی جس کا وہ کھلے بندوں اظہار نہیں کرنا چاہتے تھے۔ ہزاروں لوگوں کو یہی امید تھی کہ آج بنگلہ دیش کی آزادی کا اعلان ہوگا مگر پرچم لپٹا رہ گیا تھا۔ شیخ مجیب کی تقریر توپ و تفنگ نہیں، پٹاخے کی طرح پھس پھسا کر رہ گئی تھی۔ ان کا حکم تھا اس لیے لوگ بغیر کسی اشتعال اور شر انگیزی کے لوٹ رہے تھے۔

ہر جگہ ایک ہی بات کہی جا رہی تھی۔ بنگو بندھو نے اعلان کر دیا ہے:

اے بار یر شنگرام مکتیر شنگرام

اے بار یر شنگرام شادھینتار شنگرام

اس اعلان کے سائے میں آج ہی کے دن نئے گورنر جنرل ٹکا خاں اس سبز سرزمین پر اترے۔ انھیں ماحول نہایت حسین اور بھلا لگا۔ فضا کے کھنچاؤ یا فوجی افسروں کے اعصابی تناؤ کا انھیں کچھ اندازہ نہ تھا۔ ان کے سوٹ کا گہرا نیلا رنگ، ان کے سانولے چہرے کی بشاشت، ان کے کھچڑی بالوں کا جماؤ ان کے دلی اطمینان کا غماز تھا۔

جس طرح ٹھنڈی جگہ سے آنے والا گرم جگہ کی گرمی کو اور گرم جگہ سے پہنچنے والا ٹھنڈی جگہ کی ٹھنڈ کو ابتدائی چند لمحوں میں بالکل محسوس نہیں کرتا اسی طرح جنرل ٹکا خان نے ڈھاکا کی فضا میں رچی طوفانی گھٹن کو محسوس نہیں کیا۔ انھیں تعجب ہوا۔ جب ان سے پوچھا گیا کہ کیا وہ کار میں تشریف لے

جائیں گے۔ انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ایک ہیلی کاپٹر انھیں گورنمنٹ ہاؤس تک لے جانے کے لیے بہت دیر سے فضا کے چکر کاٹ رہا تھا۔ اس وقت وہ لاعلمی کی نعمت سے مالا مال ہشاش بشاش فوجی افسران کے جلو میں سیاہ چمکتی مرسی ڈیز میں بیٹھ کر روانہ ہوئے۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ ڈھاکا ایئر پورٹ کے تمام راستے بند کر دیے گئے ہیں۔ صرف پاکستان ایئر فورس والا صدر دروازہ کھلا ہوا تھا، جس کے باہر سڑکوں پر فوج موجود تھی اور ہر سڑک پر ایک مشین گن نصب تھی جس کا چلانے والا تیار پوزیشن میں تھا۔ ہوائی اڈے کی عمارت پر فوج متعین تھی چوکس اور مستعد۔ گیٹ کے اندر جانے کی سختی سے ممانعت تھی اور تمام ہوائی جہازوں کی پرواز روک دی گئی تھی۔ انھیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ راہ میں فارم گیٹ پر عوامی لیگ کی چیک پوسٹ قائم کر دی گئی ہے۔ جہاں ان کی گاڑی بھی روکی جا سکتی ہے۔

نہایت اطمینان سے، شاید اپنے ساتھیوں کے اترے ہوئے چہرے دیکھ کر انھیں خوش کرنے کے موڈ میں انھوں نے کہا، ''اوئے، یہ تم لوگوں نے یہاں کیا گند مچا رکھا ہے؟''

یکا یک فضا کسے ہوئے تار کی طرح تن گئی۔ جس طرح بھرے بیٹھے ہوئے بچے کو ہنسانے کی کوشش کی جائے تو وہ بھنا کر رو پڑتا ہے۔ جنرل خادم راجا نے بھڑک کر کہا، ''آپ اپنی رائے کچھ دیر کے لیے محفوظ رکھیے۔ ہم روز ایک نئے جہنم سے گزر رہے ہیں۔ ہمارے دن کا چین اور رات کی نیند حرام ہو چکی ہے۔ چند دن آپ یہ مزہ چکھ لیں، تب ہم آپ سے پوچھیں گے سر!'' آخر میں سر کا ٹکڑا یوں چپکایا جیسے کوئی قرض دار قرض کے کاغذات پر بادلِ ناخواستہ دستخط کرتا ہے۔

یہ کیا کہہ رہا ہے، میں مزہ چکھنے نہیں چکھنے آیا ہوں۔ جنرل ٹکا خاں نے دل میں سوچا مگر اپنے خیال کا اظہار نہ کیا۔ بہت جلد انھیں نازک صورتِ حال کا اندازہ ہو گیا اور یہ جان کر تعجب بھی ہوا کہ ان ساری باتوں سے مغربی پاکستان کے عوام ہی نہیں خواص بھی لاعلم ہیں۔ یہاں سے جانے والے جو کچھ وہاں جا کر بتا رہے ہیں، ان کو بہت حد تک افواہوں پر محمول کیا جا رہا ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ شیخ مجیب نے فرمایا تھا کہ ٹکا خاں بنگلہ دیش کے مہمان کی حیثیت سے تشریف لا سکتے ہیں اور اس کا عملی ثبوت یہ تھا کہ چیف جسٹس بی اے صدیقی نے گورنر کا حلف لینے کی ہامی نہ بھری تھی، اور بیماری کا بہانہ کر دیا تھا۔ سرکاری محکمے، بینک، اسکول، کالج، ریڈیو اور ٹی وی سب عوامی لیگ کے احکامات کے پابند تھے۔ چھاؤنیوں میں نہ صرف نان نفقہ بند کرنے کی پوری کوشش ہو رہی تھی، بلکہ اخباروں میں روز اس قسم کے اشتہارات چھپتے تھے۔ یہ کن لوگوں کی گاڑیاں ہیں جو چھاؤنی میں کھانے پینے کا سامان لے جاتی ہیں، نیچے ان ٹرک کے نمبر دیے جاتے تھے۔ عوامی لیگ کے کارکن دودھ، سبزی اور گوشت لے جانے والے چھکڑوں کو چھاؤنی جانے سے روک دیتے تھے۔ مغربی پاکستان

کے عوام کو ان حالات کا اس لیے بھی علم نہ تھا کہ یہاں سے جانے والے مسافروں کو کسی اخبار کا کوئی پرزہ لے جانے کی اجازت نہیں تھی۔

یونی ورسٹی بند تھی۔ شمس الرحمٰن ہمیشہ کی طرح اخباروں میں مضامین لکھتا تھا۔ ان ہی دنوں چودھری صاحب نے بلا کر اسے بطورِ خاص چند موضوعات پر لکھنے کو کہا جس کے لیے اسے مختلف جگہوں کا دورہ کرنا تھا۔ ۱۶ / مارچ سے ہونے والے یحییٰ مجیب مذاکرات کا بھی وہ قریب سے مطالعہ کر رہا تھا۔ عوامی لیگ کی حکومت کے دوران ان مذاکرات میں کس کے حوصلے بلند تھے، اس کا اندازہ سبھی کو تھا۔ ۱۷ / مارچ کو صدر یحییٰ خاں نے ان الفاظ میں ایوانِ صدر میں ان کا اظہار کیا تھا، ''شیطان مجھ سے اچھی طرح بات نہیں کر رہا ہے۔''

ٹکا خاں نے جی او سی کو فون پر حکم دیا تھا، ''خادم انتہائی قدم اٹھانے کے لیے تیار رہیں—''

عوامی لیگ میں نوجوانوں کو فوجی تربیت دینے کے کام کا آغاز ہو چکا تھا۔

۲۰ / مارچ۔ چوتھی بار شیخ مجیب الرحمٰن اور یحییٰ خاں کے درمیان ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات میں سیّد نذر الاسلام، تاج الدین احمد، قمر الزماں، منصور علی، خوندکار مشتاق احمد اور ڈاکٹر کمال حسین بھی موجود تھے۔

۲۳ / مارچ۔ شام کے وقت اپنے گھر میں ایک اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے شیخ مجیب الرحمٰن نے کہا، ہم کسی بھی قوت کے سامنے سر نہیں جھکائیں گے۔ ہمیں کوئی خرید نہیں سکتا۔ سات کروڑ بنگالی عوام مزید غلامی کی زندگی بسر نہیں کر سکتے۔

۲۴ / مارچ— آج صبح اور شام سیّد نذر الاسلام، تاج الدین اور ڈاکٹر کمال حسین نے یحییٰ خاں کے مشیروں سے ملاقات کی۔ ان کے مشیر تھے اے آر کارنیلیس، ایم ایم احمد، لیفٹیننٹ جنرل ایس جی ایم پیرزادہ اور کرنل حسن۔ تاج الدین نے اخباری نمائندوں سے صرف اتنا کہا، شیخ مجیب الرحمٰن اور جنرل یحییٰ خاں کے درمیان جو ملاقاتیں ہوئی ہیں، یہ ملاقات ان کا ایک حصہ ہے۔

اسی دن یحییٰ خاں اور ذو الفقار علی بھٹو کے درمیان علاحدہ ملاقات ہوئی۔ عوامی لیگ کی طرف سے دو دستوری کنونشن بنانے پر اصرار ہو رہا تھا۔ مسٹر تاج الدین نے اپنی پارٹی کی طرف سے اعلان کیا تھا کہ ہم نے ''آخری تجاویز'' پیش کر دی ہیں۔ یحییٰ خاں اور بھٹو اس بات پر متفق ہو گئے تھے کہ عوامی لیگ کی خود مختاری اب پاکستان کو دو ٹکڑے کرنے تک پہنچ چکی ہے۔

بینو دونوں ہاتھوں میں بھری ہوئی تصویریں اور قیمتی گلدان لے کر اپنی خواب گاہ کی طرف جا رہی تھی کہ اس نے جواد کو اندر داخل ہوتے دیکھا۔ وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ ''میں اس طرف آ رہا تھا۔ سوچا، کیوں نہ تمھیں ساتھ لیتا چلوں۔''

''مگر میرا کام ابھی ختم نہیں ہوا!'' بینو نے کہا۔

''کرلو، مجھے ایسی جلدی نہیں ہے، میں اپنا کام کر کے تھوڑی دیر میں آتا ہوں، تم تیار رہنا۔''

اس کے جانے کے بعد بینو نے اپنے ہاتھ کی ساری چیزیں وہیں تپائی پر ڈھیر کر دیں اور زری کو فون کیا۔

بالآخر جواد نے مرزا صاحب اور بیگم کو چند دن کے لیے اپنا گھر چھوڑ کر چھاؤنی جانے پر راضی کر لیا تھا۔ چھاؤنی میں اس نے کسی ایسے فلیٹ کا انتظام کر لیا تھا جو اس کے کمرے سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بینو وہاں جانا نہیں چاہتی تھی۔ اس نے زری سے بات کر لی تھی کہ چند دن کے لیے وہ ان کے گھر اٹھ آئے گی۔ طے ہوا تھا کہ شمس الرحمٰن اور زری شام کو اسے لینے آئیں گے۔ جواد کو اس بات کا علم نہیں تھا۔ ضروری چیزیں اور تصویریں سنبھال کر رکھنے کے بہانے وہ رہ گئی تھی اور جواد کو یہ تاثر دیا گیا تھا کہ وہ شام تک نئے گھر میں آئے گی۔ جواد کے اس وقت آ ٹپکنے پر بینو نے زری کو صورتِ حال سے آگاہ کیا۔ زری نے کہا، ''شمس الرحمٰن اخبار کے دفتر گیا ہوا ہے، جیسے ہی وہ آئے گا ہم تمھیں لینے پہنچ جائیں گے۔''

فون رکھ کر بینو نے تیزی سے کام کرنا شروع کیا۔ تمام قیمتی چیزیں الماری میں بند کرنے کے بعد

وہ جلدی جلدی تیار ہونے لگی۔ پیٹی کوٹ اور بلاؤز پہن کر اس نے ساری اٹھائی تھی کہ اسے محسوس ہوا جیسے کسی نے بیڈ روم کے دروازے کو دھکا دیا ہو۔ کون ہے؟ اس نے چلّا کر پوچھا۔ بغیر جواب دیے جواد اندر داخل ہوا۔ بینو نے غیر شعوری طور پر ساری اپنے سینے پر رکھ لی۔ اس کے تازہ لپ اسٹک لگے نارنجی ہونٹ ٹیولپ کی ان نازک پتیوں کی طرح کانپ رہے تھے جو صبح کی ہوا میں دھیرے دھیرے ہل رہی ہوں، چہرے پر گھرے سیاہ بالوں کا ہالہ تھا اور اس کی آنکھوں میں ایسی گہرائی پہلے کبھی جواد نے نہ دیکھی تھی۔ وہ لڑکھڑایا اور سنبھلا۔ بینو کو اپنے کانوں پر جواد کی گرم گرم سانس محسوس ہوئی۔ ''آئی لو یُو بینو ــــ'' اس نے کہا، ''تم مجھے ہمیشہ بے حد خوب صورت لگی ہو۔ اب مجھے پتا چلا ہے بنگال کا جادو کیا ہوتا ہے۔''

بینو ایک قدم پیچھے ہٹی اور اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کو جھٹک کر چلائی۔

''جواد بھائی پلیز ــــ'' اس کے لہجے میں انکساری نہیں غم اور غصّہ تھا اور اس کی آنکھیں غصّے اور نفرت سے ابل رہی تھیں۔

''میں جانتا ہوں تم مجھ سے نفرت کرتی ہو۔'' جواد کا لہجہ نرم تھا۔ ''مگر میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں کہ میں سر سے پیر تک تمھاری محبت میں ڈوب چکا ہوں۔''

یکا یک ساری بات بینو کی سمجھ میں آ گئی۔ وہ اس کی آج تک کی کہی گئی ساری باتوں کا انتقام لینے آیا تھا۔ آس پاس کے بہت سے گھر خالی ہو چکے تھے۔ پڑوسیوں میں اعتماد ختم ہو چکا تھا۔ گھر کے سارے نوکر جا چکے تھے اور گھر والوں کو وہ نئے مکان میں چھوڑ آیا تھا۔ جلدی اور لاپروائی میں بینو اندر سے دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔

''جواد بھائی ــــ'' بینو نے خود پر قابو پا کر ایک مرتبہ اور کوشش کی کہ لہجے کو نرم رکھے، ''میں آپ سے نفرت نہیں کرتی مگر میں اکرام سے محبت کرتی ہوں۔ آپ کو مجھ سے ایسی باتیں نہیں کرنی چاہییں ــــ شیزی کا خیال کیجیے، وہ میری کزن ہے۔''

''محبت میں آدمی کسی کا خیال نہیں کر سکتا۔'' جواد نے کہا، ''یہ اس کے اپنے بس کی بات نہیں ہے۔''

جواد نے اکثر بنگالی لڑکیوں کو گھر میں بلاؤز اور پیٹی کوٹ پہنے یا بغیر آستین کی ٹخنوں سے اونچی فراکیں پہنے دیکھا تھا لیکن بینو کو کبھی وہ اس طرح دیکھ سکے گا، اس کا تصور بھی نہ کیا تھا۔ اس کا ملیح بھرپور جسم دیکھ کر اسے بنگالی پینٹنگز کا خیال آیا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ جھوٹ نہیں کہہ رہا۔ وہ واقعی اس من موہنے چہرے کو، اس نرم و نازک سجیلے جسم کو چاہتا ہے اور اسے حاصل کیے بنا زندہ رہنا اس کے لیے مشکل ہے۔ ناقابلِ حصول چیز کے مل جانے کا نشہ اس کے حواسوں پر تند شراب کی طرح چڑھنے لگا۔

بینو نے جھونک کھا کر دروازے سے باہر نکل جانا چاہا۔ جواد نے پیچھے سے اس کی نازک کمر تھام لی اور اسے اپنی طرف گھمالیا۔ اب بینو نے زور زور سے چلانا شروع کر دیا۔ جواد نے کمرے کی چٹخنی لگادی اور اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر دھیرے دھیرے پلنگ کی طرف دھکیلنے لگا۔

پہلے زور زور سے دستک ہوئی اور پھر اتنی شدت سے دروازہ دھڑ دھڑایا جانے لگا جیسے ٹوٹ جائے گا۔

''کون ہے؟'' جواد نے کڑک کر پوچھا۔ گرفت ڈھیلی پا کر بینو اس کے چنگل سے نکل گئی۔

''میں ہوں میجر خالد دروازہ کھولو ورنہ توڑ دیں گے۔''

جواد گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ کیا وہ اس حلیے میں کسی افسر کا سامنا کر سکتا ہے۔

بینو دونوں ہاتھوں سے اپنا منہ چھپائے روتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی۔ زری اسے سہارا دے کر دوسرے کمرے میں لے گئی۔ وہ سارے بدن سے کانپ رہی تھی۔ شمس الرحمٰن کا دوست میجر خالد اتفاق سے ساتھ چلا آیا تھا۔ وہ شمس الرحمٰن کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔

''تم جیسے لوگوں نے ساری فوج کو بدنام کیا ہے کیپٹن۔'' میجر خالد نے کہا اور ریوالور اس کے پاؤچ سے نکال کر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

دوسرے کمرے سے بینو کے رونے اور زری کے تسلی دینے کی دھیمی دھیمی آواز آ رہی تھی۔

۲۳ر مارچ کو ہر یل سارے ڈھاکا کا چکر لگا کر آیا تھا۔ مارچ کی خوش گوار ہوا میں ہر جگہ بنگلہ دیش کے سبز و سرخ پرچم پھڑ پھڑا رہے تھے۔ کئی گھروں میں احتجاج کے سیاہ جھنڈے لگے ہوئے تھے۔ لڑکے بالے ہجومِ عاشقاں کی طرح اچھلتے کودتے جے بنگلہ کا نعرہ لگاتے پھر رہے تھے۔ پاکستان کا جھنڈا مارشل لا ہیڈ کوارٹر، گورنمنٹ ہاؤس، چھاؤنی، میر پور اور محمد پور کے دو چار گھروں پر تھا۔ اخباروں نے بنگلہ دیش کے ضمیمے چھاپے تھے اور مبارک باد کے پیغام دیے تھے۔ کئی اخباروں نے بنگلہ دیش کے جھنڈے کو کئی کئی کالموں پر پھیلا دیا تھا، صنعتی اداروں کی طرف سے تہنیت کے لمبے چوڑے اشتہارات تھے۔

آج مینا پھر ''چھایا بیٹھی'' گئی تھی۔ آج اس گھر میں بڑی رونق تھی۔ کیوں کہ نئی بہو گھر میں آ رہی تھی۔ بینو کی رخصتی زری کے گھر سے ہوئی تھی۔ بینو نے سرخ ساری پہن رکھی تھی اور ساری کے اوپر قیمتی جال دار سچے گوٹے کے کام کا دوپٹہ اوڑھ رکھا تھا۔ جھمکے، ٹیکہ بندی، پھولوں کے زیوروں اور خوشبوؤں میں بسی وہ دھیرے دھیرے قدم اٹھاتی اندر آ رہی تھی۔ ہوا کے تیز جھونکے کے ساتھ مولسری کے پھول اس پر برس گئے تھے۔ مینا نے پہلے بھی اسے اس گھر میں دیکھا تھا لیکن آج وہ بہت شوندر لگ رہی تھی۔ ایک طرف سے پتُل نے اور دوسری طرف سے اکرام الحق نے اسے سہارا دے رکھا تھا۔ بینو اور پتُل کی سہیلیاں گانا گا رہی تھیں۔ ''ہریالا بنا......'' امیر خسرو نے یہ گانا ابتدائی اردو زبان میں لکھا تھا۔

آتے جاتے دوسروں سے چھپا کر لیکن مینا کے سامنے اعلانیہ جو باتیں ہو رہی تھیں، اس سے مینا کو اندازہ ہوا کہ بینو کو شادی کے دن کالی ساری باندھنے پر اصرار تھا کیوں کہ اس کے خیال میں آج یومِ

احتجاج تھا۔ چند دن پہلے اس کے ساتھ جو زیادتی ہوئی تھی، ابھی اس کا اپنا دل سرخ ساری پہننے پر مائل نہ تھا لیکن اس کے سسرال والے وسیع القلب تھے۔ انھوں نے بڑے پیار سے اسے سرخ ساری پہنوائی تھی اور زیوروں میں لادا تھا۔ اور ان حالات میں شادی کا جتنا اہتمام ممکن تھا، کیا تھا۔ زیادہ لوگوں کو مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ پھر بھی خاص خاص رشتے دار اور دوست موجود تھے۔ نکاح مولانا ہی نے پڑھایا تھا۔

''مولانا اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا؟'' کسی نے سیاست پر بات چلائی تھی۔ ''آج قائداعظم کی تصویریں پھاڑی گئی ہیں اور پاکستان کے جھنڈے جلائے جا رہے ہیں۔''

''گرام گرام آگن لگبے آر — دھرتی اوپر زا کتو —'' انھوں نے بریانی کی پلیٹ سے نظر اٹھا کر کہا تھا اور پھر اس پر جھک گئے تھے۔

شادی کے گھر میں ایسا جملہ — جیسے چمکتی دھوپ میں یکا یک زور سے بادل گرج اٹھیں، پھاگون (پھاگن) کے مہینے میں طوفان آ جائے۔ پوچھنے والے صاحب بھی شرمندہ ہو گئے تھے اور موضوع بدل دیا گیا تھا۔

جس وقت دُولھا دُلھن اپنے کمرے میں گئے، بینا بھی شادی کا گیت گنگناتی اپنے ٹھکانے پر آئی۔ مارچ کی دھوپ میں پیپل کے تازہ شگفتہ پتے چمک رہے تھے۔ سڑکوں پر دیواروں سے لپٹی بوگن ولا سے جھڑ کر گرنے والی رنگین خوب صورت پنکھڑیاں قلابازی کھاتی پھر رہی تھیں۔ اسکول کے بچے سڑکوں پر گاتے پھر رہے تھے۔

امار شونار بنگلہ آمی تمائے بھالو باشی۔

آدھی رات کا وقت تھا۔ زری کے کانوں میں باتوں کی آواز آئی۔ اٹھ کر دیکھا تو چاچا جی اور مولانا باتوں میں مصروف تھے۔ زری بھی اب تک نہیں سوئی تھی۔ ۲۵ر مارچ کی یہ چاندنی رات اسے بہت بے کل کیے ہوئے تھی۔ شمس الرحمٰن کل سے چٹا گانگ گیا ہوا تھا، جاتے جاتے مولانا سے کہہ گیا تھا کہ جب تک وہ نہ لوٹے وہ یہیں رہیں۔

مولانا چھوٹے سے قد کے بنگالی استاد تھے۔ فرید پور کے رہنے والے اور کسی زمانے میں حکومت میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے مگر اب دنیا اور دنیا کے عہدوں سے بے نیاز رزقِ حلال کے لیے لوگوں کو عربی، فارسی، انگریزی یا بنگلہ پڑھا کر گزر بسر کرتے تھے۔ چند لوگوں سے بے تکلفی تھی وہ با اصرار اپنے ہاں ٹھہراتے تو وہیں پڑ رہتے ورنہ ایک مختصر سی باشا سر چھپانے کے لیے تھی۔ کھانے کے سوا ضروریاتِ زندگی نہ ہونے کے برابر۔

زری نے کھڑکی سے باہر جھانکا۔ سناٹا تھا مگر اس میں دہشت کی ایک گونج سی تھی جیسے کچھ ہونے والا ہو۔ درختوں پر چاندنی رحمت کی پھوار کی طرح گرتی نظر آتی تھی مگر سائے خوف سے کانپتے دکھائی دیتے تھے۔ ڈھاکا شہر کی طرف سے بے نام سی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ چھاؤنی کی طرف سے آنے والی ہوا میں ایک ان جانی سی بو تھی۔ یا یہ اس کا وہم تھا۔ کیا جا کر مولانا سے پوچھے۔ لوگ کہتے ہیں وہ غیب کی باتیں بھی جانتے ہیں۔

شروع میں مولانا زری کو پڑھانے کے فوراً بعد رخصت ہو جاتے تھے مگر جب سے چاچا جی

ایبٹ آباد سے آ گئے تھے اور انھوں نے بھی بنگلہ سیکھنی شروع کردی تھی تب سے وہ مولانا کے ساتھ الگ محفل جماتے تھے۔ حقہ پانی سے ان کی تواضع کرتے تھے اور گھنٹوں دونوں باتیں کرتے تھے۔

''آپ ہر چیز کو سطحی نظر سے دیکھتے ہیں بھائی عمر!'' مولانا کہتے۔

''بے شک آپ کی طرح چشم بینا تو میرے پاس ہے نہیں، دو گناہ گار آنکھیں ہیں، جن کی دید محدود ہے۔''

خیالات کے اختلافات کے باوجود دونوں کی دوستی پکی تھی۔ چاچا جی ان کے ساتھ ٹوٹی پھوٹی بنگلہ پر اصرار کرتے تھے اور گھر میں ان ہی کی طرح چار خانے دار تہمد اور بنیان پہن کر پھرتے تھے۔

زری اٹھ کر آ گئی۔ چاچا جی اور مولانا اکثر عجیب و غریب ماورائی باتیں کیا کرتے تھے اور کم ہی کسی بات پر متفق ہوتے تھے۔ زری نے سنا چاچا جی وہی اپنی زمین اور پودوں کا فلسفہ لیے بیٹھے ہیں، ''بات یہ ہے مولانا کہ جو پودے جلد بڑھتے ہیں ان کی جڑیں کمزور رہ جاتی ہیں، جو دھیرے دھیرے بڑھتے ہیں، وہ کھاد، پانی اور زمین کی خوراک کو اس طرح جذب کرتے ہیں کہ اس کی گہرائی میں دور تک اتر جاتے ہیں۔ وہ سالہا سال لہراتے ہیں اور کوئی انھیں اکھاڑنے کی ہمت نہیں کر سکتا۔''

مولانا نے کچھ کہنے کے لیے پہلو بدلا ہی تھا کہ یکایک توپ کے گولوں کے دھماکے سے در و بام لرزنے لگے۔ ایک گولا کہیں نزدیک ہی پھٹا تھا کہ گھر کے سارے دروازے چیخ اٹھے تھے اور زمین لرز گئی تھی۔ یونی ورسٹی ہاسٹلوں کی طرف سے تڑاتڑ گولیوں کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ زری کے منع کرنے کے باوجود چاچا جی باہر نکل گئے۔ کچھ اور لوگ بھی گھروں کے زینے پر یا دروازوں پر کھڑے حالات جاننے کی کوشش کر رہے تھے۔ برٹش کاؤنسل لائبریری کی طرف سے شیل آ رہے تھے جسے فوج نے اس وقت ٹھکانا بنایا تھا۔ ۵ر مارچ کو مقامی لوگوں نے یہاں آگ لگائی تھی۔ اقبال ہال اور جگن ناتھ ہال نشانہ تھے۔ جگن ناتھ ہاسٹل کی پرانی سرخ خستہ اینٹیں دہل دہل کر گر رہی تھیں۔ پرانا پائپ دیوار سے جدا ہو گیا تھا، ٹنکی کا پانی دیوانہ وار بہہ رہا تھا۔ لڑکے زینے کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اوپری منزل سے چند لڑکے سیڑھیوں کی طرف جانے کے بجائے درخت کی شاخیں پکڑ پکڑ کر لٹک کر اترے اور اندھیرے میں اِدھر اُدھر بھاگنے لگے۔ جگہ جگہ کالا دھواں اٹھ کر چاندنی رات کے چہرے پر کالک مل رہا تھا۔ چیخ پکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ کچھ بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوئے اور کھیتوں میں پناہ لی۔ جن کو موت نے مہلت نہ دی وہ اپنے کمروں میں بستروں پر، فرش پر، دہلیز پر، کھڑکیوں اور برآمدوں میں پڑے سلگ رہے تھے۔ ان کے گرم سینوں میں دھڑکتے دل ٹھنڈے ہو چکے تھے۔ کچھ نے جوابی کارروائی بھی کی۔ مارشل لا ہیڈ کوارٹر میں پیغام پہنچا کہ ہمیں

زبردست مزاحمت کا سامنا ہے۔ لیکن دو گھنٹے بعد ٹارگٹ فتح کرنے کی خبر آ چکی تھی۔

عظیم پور قبرستان کے پیچھے پیل خانہ میں ایسٹ پاکستان رائفلز اور راجر باغ میں پولیس ہیڈ کوارٹرز نشانہ تھے۔ ''دا پیپل'' اخبار کا دفتر اور اس کے ۲۳ مارچ کے وہ اخبار دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔ جن میں کئی کالموں پر پھیلے ہوئے بنگلہ دیش کے جھنڈے کے نیچے درج تھا: ''آج شہیدوں کے خون سے ایک نئے عَلَم نے جنم لیا ہے۔''

سکھاری پٹی کی تنگ گلی میں دھوتی لپیٹے، جنیئو پہنے مرد اور گہرے گہرے رنگوں کی ساریوں میں سیندور سے بھری مانگوں والی عورتیں گھبرا کر اپنے گھروں سے باہر نکلی تھیں مگر انھیں کوئی راہِ فرار نہیں ملی تھی۔ سکھاری پٹی کے لوگ آذری میں ماہر تھے۔ شاید ان کے آباؤ اجداد نے کبھی ہندو دیوتاؤں اور مہاتما بدھ کی نک سک سے درست مورتیاں بنائی ہوں گی۔ اس وقت ان کے وارثوں کے سنکھ پر بنے ہوئے خوب صورت کام اور سنکھ کی چوڑیاں، سرمہ دانیاں، باریک کام دار مجسمے اور مورتیاں راکھ اور سرمہ بن رہی تھیں۔ سڑک کے بیچوں بیچ مندر میں بڑی بڑی کھلی آنکھوں والی مورتی حیرت سے یہ سب دیکھ رہی تھی۔ گلی میں سامان ڈھونے والے ٹھیلے اوندھے پڑے تھے۔ دن میں جو گلی سائیکل رکشاؤں اور پیدل چلنے والوں سے بھری رہتی تھی وہ اس وقت دم بدم نعشوں سے پٹ رہی تھی۔

''یہ بہت برا ہوا'' مولانا نے کہا، ''بہت لوگ مارے جائیں گے، بہت بے گناہ مارے جائیں گے۔ سیاسی سمجھوتا ہو جاتا تو اچھا تھا۔'' پھر وہ آسمان کی طرف منہ کر کے خاموش بیٹھ گئے۔ خدا جانے شمس اس وقت کہاں ہوگا؟ زری سوچتی رہی۔ وہاں بھی اس وقت ایسے ہی دھماکے ہو رہے ہوں گے۔ زمین سے آگ کے شعلے اور شعلوں سے دھوئیں کے مرغولے اُٹھ کر بے داغ چاندنی کو داغ دار کر رہے ہوں گے۔ خوب صورت پہاڑی چاٹ گام — ہرا بھرا سرسبز چاٹ گام شعلوں میں گھرا کتنا عجیب لگ رہا ہوگا۔ ہوان سانگ نے جسے کہر اور پانی سے ابھرتا خوابیدہ حسن قرار دیا تھا۔ دھرم پال عہد میں مسلمان اسے ''سمندر'' کہتے تھے — اور ۹۵۳ء میں یہاں ایک بادشاہ نے فتح کا مینار بنوایا تھا، جس پر لکھوایا تھا: Tset-te-going جس کا مطلب ہے کہ ''جنگ کرنا بری بات ہے۔'' اور بعد میں یہی فقرہ بگڑ کر چٹا گانگ کا نام اختیار کر گیا تھا۔ آج اسی چٹا گانگ میں خانہ جنگی کے شعلے بھڑک رہے ہوں گے۔

''خدا کرے، شمس خیریت سے ہو'' چاچا جی نے کہا۔ پھر یکا یک وہ مولانا کی طرف پلٹے۔ ''مولانا، جب بڑے بڑے قتلِ عام ہوتے ہیں اور ہزاروں لوگ مارے جاتے ہیں تو آپ اس کی کیا توجیہہ کرتے ہیں؟'' چاچا جی کا لہجہ خاصا تلخ تھا۔

''اعمال۔'' مولانا نے مختصراً کہا۔

''آپ کا دل اس سے مطمئن ہو جاتا ہے؟'' چاچاجی قدرے جھلائے۔

''جب روحانی طور پر لوگ حد سے زیادہ گر جاتے ہیں تو مجموعی طور پر عذاب نازل ہوتا ہے۔ ہوسکتا ہے چند بے گناہ بھی مارے جاتے ہوں۔''

''مولانا، بڑے بڑے بھیانک جرم ہوتے ہیں، بری طرح لوگوں کو ذبح کیا جاتا ہے، کیا آپ جیسا صوفی یہ سب خاموشی سے دیکھتا رہے گا، اسے کچھ محسوس نہیں ہوگا؟''

''کیوں نہیں ہوگا؟ — وہ اپنی جگہ ہوتا رہے گا مگر سوال یہ ہے کہ وہ کیا کرسکتا ہے؟ کیا کوئی کام اللہ کی رضا سے باہر بھی ہوتا ہے! جاننے والے اندھوں کو روشنی دینے کی کوشش کرتے ہیں، لیکن وہ کنویں میں گرنے پر مصر ہوں تو وہ کیا کرسکتے ہیں؟ قومیں جب خشیت اللہ سے گریز کرتی ہیں تو ان پر عذاب آیا کرتے ہیں۔ باقی رہا یہ کہ ایک قوم پر کیوں عذاب آیا اور دوسری پر کیوں نہ آیا، اس کی توجیہہ ہو تو سکتی ہے مگر مکمل طور پر نہیں۔ انسانی اعمال اور روحانی گراوٹ کے ساتھ نہ صرف قومیں تباہ ہوں گی بلکہ cosmos میں تباہی آئے گی، زلزلے، بڑے بڑے سانحے، یہاں تک کہ قیامت.....''

''انسانی اعمال اور کاسموس کا تعلق؟'' چاچاجی نے پوچھا۔

''کچھ ہوگا ہی۔'' مولانا نے کہا۔

''اچھا یہ بتایئے، فطرت جو تباہی لاتی ہے وہ کسی کے آگے جواب دہ نہیں، نہ سائیکلون، نہ سیلاب، نہ زلزلے — پھر انسان کیوں جواب دہ ہیں؟''

''شعور — انسانی شعور —'' مولانا نے قطعیت سے کہا۔

''تو بھی تو کچھ بول۔'' زری کو ٹھوڑی پر ہاتھ ٹکائے ایک طرف گھورتے دیکھ کر چاچاجی نے کہا۔

''میرا ذہن بالکل کام نہیں کر رہا چاچاجی۔'' زری نے یوں جواب دیا جیسے سو رہی ہو۔ ''مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے یہ سب ہو نہیں رہا بلکہ صرف دکھایا جا رہا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' چاچاجی حیران ہوئے۔

''ہاں چاچاجی، مجھے یوں محسوس ہو رہا ہے جیسے یہ ساری کائنات پری ریکارڈڈ ہے، جسے خدایا تو خود دیکھ رہا ہے یا کسی کو دکھا رہا ہے۔ جیسے یہ سب کچھ اصل میں نہیں ہو رہا۔''

''تو رات بھر سوئی نہیں ہے نا، ذرا دیر لیٹ جا۔'' چاچاجی نے کہا۔

''اذان ہوگئی؟'' دفعتاً مولانا نے پوچھا۔

''نہیں، اذان نہیں ہوئی۔ کہیں سے اذان کی آواز نہیں آئی۔'' چاچاجی نے کہا۔

''افسوس! آج پہلا دن ہے کتنی صدیوں میں ڈھاکا میں جہاں سات سو سے زیادہ مسجدیں

ہیں، فجر کی اذان نہیں ہوئی۔ ٹھہرو۔ میں نزدیک کی مسجد میں اذان دے آؤں۔'' مولانا تیزی سے باہر کی طرف لپکے۔

''یہ کیا غضب کر رہے ہیں مولانا، باہر نکلنا بہت خطرناک ہے۔'' چاچا جی نے کہا۔

''موت اور زندگی خدا کے ہاتھ ہے عمر بھائی۔'' وہ ہاتھ چھڑا کر چھوٹے چھوٹے تیز قدموں سے گھاس پر سے گزرتے ایک طرف کو چل دیے۔

مولانا مسجد میں تنہا نماز پڑھ کر لوٹے تو چاچا جی نے ۲۳ مارچ کا ''دا پیپل'' ان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ یہ ابھی زری نے لا کر انھیں دیا تھا۔ ''آپ تو کہہ رہے ہیں کہ فوج زیادتی کر رہی ہے مگر یہ دیکھیے، اس اخبار نے ۲۳ مارچ کو ہر جگہ بنگلہ دیش ہی لکھا ہے۔ بنگلہ دیش کے نئے جھنڈوں کے ساتھ بڑے بڑے تجارتی اداروں اور بینکوں نے جو مبارک باد دی ہے، یہ یومِ پاکستان کی مبارک باد تو نہیں ہے۔'' چاچا جی نے کہا۔

''ہاں یہ سب ٹھیک ہے۔'' مولانا نے جواب دیا، ''مگر یہ بھی تو سوچو کہ تین ہفتے سے یہاں کیا ہو رہا ہے۔ عملی طور پر عوامی لیگ کی حکومت ہے۔ لوگ اس بات پر خوش ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ شروعات ہو چکی ہے اب صرف اعلان کی دیر ہے۔ انتہا پسند شیخ مجیب پر اس اعلان کے لیے زور دے رہے ہیں۔ تو ایسے اخباروں میں جو خود انتہا پسند ہوں ایسی خبریں چھاپی جانا تعجب کی بات نہیں ہے۔ رہ گئے تجارتی اداروں کے اشتہارات، تو یہ بے چارے سب کچھ اپنی بقا کے لیے کرتے ہیں۔ چڑھتے سورج کی پوجا ان کا دین ایمان ہے۔ ابھی حالات بدلیں گے تو یہ فوراً دوسری طرف جھک جائیں گے ــــ دیکھنا تو یہ ہے کہ کیا شیخ نے آزادی کا اعلان کیا؟ اگر ان کے دل میں کھوٹ ہوتی تو ان کو بہت سے مواقع ملے مگر انھوں نے فائدہ نہ اٹھایا۔ اب اگر لوگ انھیں مجبور کرتے رہے اور آخر وقت تک مذاکرات ناکام ہوئے تو اس میں ان کا کیا قصور!؟''

''سوال تو یہ ہے کہ جب پاکستان بنگالیوں کی مرضی اور حمایت سے بنا تھا وہی اس کو توڑنے پر تیار کیسے ہوئے؟''

''اس طرح کہ انھیں احساس ہوا یا دلایا گیا کہ پہلے انھیں ہندوؤں نے کچلا، پھر انگریزوں نے جی بھر کر دبایا۔ پاکستان بننے کے بعد اکثریت میں ہونے کی وجہ سے حکومت کرنے کا حق ان کا تھا۔ آپ نے وہ حق انھیں نہ دیا تو انھوں نے دوسرا حق استعمال کیا۔ آپ تشدد پر اتر آئے۔ حالاں کہ انصاف سے دیکھا جائے تو شروع میں بھی بہت سے بنگالی مسلمان لیڈروں نے آزاد ریاستوں کی طرف داری کی تھی اور دو ریاستوں کے خیال کو آگے بڑھایا تھا۔ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ پاکستان کے بعد

بھی یہ موضوع اکثر زیرِ بحث رہا۔''

''میں سمجھتا ہوں،'' چاچاجی نے کہا، ''قائداعظم نے بہت پہلے اس بات کو سمجھ لیا تھا تب ہی ۱۹۴۸ء کی مشہور تقریر میں انھوں نے کہا تھا کہ لوگ آپ کو غلط راہ دکھائیں گے، آپ کو توڑنے کی کوشش کریں گے۔ انھوں نے بار بار خبردار کیا تھا جیسے انھیں خوب معلوم ہو کہ آگے جا کر کیا ہونے والا ہے۔ آگے چل کر وہی ہوا جو انھوں نے کہا تھا۔ لوگوں نے اس زہر کو خوب پھیلایا جس کا تریاق کسی کے پاس نہیں تھا۔ قائداعظم کو اگر منتر یاد تھا تو وہ اسے اپنے ساتھ سینے میں لیے چلے گئے۔ قائداعظم کا خیال تھا کہ ایک سرکاری زبان کے بغیر کوئی قوم یک جا اور مضبوطی سے بندھی نہیں رہ سکتی۔ اب لوگ قائداعظم کے اقدام کی بھی مذمت کرتے ہیں۔''

''میرا خیال ہے کہ قائداعظم زندہ رہتے تو وہ پہلے ہی بہت سی چیزیں بھانپ لیتے۔ اگر وہ پوری قوم کو پاکستان بنانے پر متحد کر سکتے تھے تو پاکستان کی بہبودی اور استحکام کے مسئلے پر بھی یک جا کر سکتے تھے۔ اردو کا مسئلہ جوان کے سامنے اٹھا تھا، مجھے یقین ہے کہ وہ اس پر بہتر طریقے سے قابو پاتے۔ وہ عملی آدمی تھے، دوسروں کو قائل کرتے یا خود قائل ہو جاتے۔ کسی بھی مسئلے کو یوں لٹکتا نہ چھوڑتے کہ وہ گلے کی چھچھوندر بن جائے۔ ان پر لوگوں کو اعتماد بھی تھا۔ ان کی حیثیت بابائے قوم کی تھی۔ وہ پنجابی بھی نہیں تھے اور وہ ان کی مادری زبان نہیں تھی۔ سب کو یہ بات معلوم تھی کہ ان کو اپنی ذات کے لیے کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ طاقت، نہ شہرت، نہ پیسہ۔ وہ جو کچھ بھی کریں گے صرف ملک اور قوم کے مفاد میں ہوگا۔ ان کا وقت تک قوم کے لیے وقف تھا۔ اس میں حصہ بٹانے والے بیوی بچے بھی نہ تھے۔ لیڈر کی شخصیت سے بھی کتنا اثر پڑتا ہے۔ ثبوت موجود ہے۔ ایوب خاں کے دور میں ہر شخص یہ بات کہتا تھا کہ معاشی فائدے چند گھرانوں کو حاصل ہوئے جن میں ان کا بیٹا گوہر ایوب سرِفہرست تھا۔''

''حالاں کہ میں سمجھتا ہوں کہ ایوب خاں بھی پُرخلوص آدمی تھے۔ معاشی پہیہ تیز چلانے کی کوشش اس لیے تھی کہ معاشی خلیج کم ہوگی تو حالات بہتر ہو جائیں گے۔ ان کے زمانے میں مشرقی پاکستان کے پروگراموں کو سینٹرل حکومت سے بہت جلد منظوری بھی مل جاتی تھی مگر——''

''مگر یہی کہ وہ اعتماد کھو چکے تھے۔ انھوں نے طاقت کا مرکز ایوانِ صدر کو بنایا۔ ان کا خیال تھا کہ صوبے بھی اسی طرح مضبوط ہو سکتے ہیں، یک جہتی بھی اس کے بغیر ممکن نہیں۔ انھوں نے بنگالی بیوروکریٹ کی تعداد بھی بڑھائی مگر لوگوں نے کہا، یہ حکومت کے منظورِ نظر لوگ بہ طور سجاوٹ رکھے جا رہے ہیں۔''

''آیئے مولانا، آیئے چاچاجی، ناشتا.....'' زری دروازے میں کھڑی تھی۔ دونوں نے پلٹ

کر حیرت سے زری کو دیکھا۔ انھیں یوں لگا جیسے قیامت کا دن ہو، پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑتے جا رہے ہوں، سورج سوا نیزے پر کھڑا ہو، اور کوئی فرشتہ آن کر کہے، ''آیئے مولانا، آیئے عمر خان، ناشتہ۔''

گو اس قیامت میں انھیں اپنی بحث بالکل نارمل نظر آ رہی تھی۔

سڑک پر فوجی گاڑیاں دوڑتی پھر رہی تھیں۔ بوڑھی گنگا کی طرف سے ٹھنڈی خوش گوار ہوا کے ساتھ اسٹین کے برسٹ کی آواز رہ رہ کر آتی تھی۔

’’ہریل! دھویں میں میرا دم گھٹ رہا ہے، خدا کے لیے کہیں اور چلو۔‘‘ مینا نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔

’’کہاں جانا چاہتی ہو اس وقت آدھی رات میں؟‘‘

’’کہیں بھی، بس یہاں سے نکل چلو۔ میں نے تم سے شام ہی کو کہا تھا کہ بارود کی بو سب سے زیادہ اسی طرف سے آرہی ہے۔‘‘

’’اچھا چلو۔‘‘

دونوں نے اپنے پر پھڑ پھڑائے۔ کرزن ہال کے سرخ چھوٹے میناروں سے باہر نکلے اور بارود کی بو سے آلودہ ہوا میں سانس لیتے، دھویں سے الجھتے، ہوا میں اڑنے لگے۔ کچے بازار میں لکڑیوں کے ڈھیر سوکھے جھاڑ کی طرح دھڑا دھڑ جل رہے تھے۔ ان کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ ریلوے لائن کے پار بنی جھونپڑیوں میں آگ بھڑک رہی تھی۔ اس کے مکین گرتے پڑتے، چیختے پکارتے، بچوں کو سنبھالتے کھیتوں کا رخ کر رہے تھے — سرکنڈوں کے درمیان جل کھمبیوں سے بچے پوکھروں میں پناہ لے رہے تھے۔ ان کے کنارے گول چھتریوں کے تاڑ کے درخت اپنے جتنے لمبے بانسوں کو سینے سے لگائے چپ چاپ کھڑے تھے۔ اس کے لیے ہانڈیاں ان کی چھاتیوں سے باندھنے والے جانے اس وقت کہاں تھے۔

’’آؤ۔ رمنا پارک چلیں۔‘‘

رمنا کے درختوں پر تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ بڑ اور پیپل، سرس اور گلِ مہر، مولسری اور چنبیلی کے جھاڑ سب پرندوں سے اَٹے پڑے تھے۔

"آؤ، دھان منڈی چلیں۔" مینا نے کہا۔ رمنا کے نہر پہ چاند کی کرنوں کا عکس دیکھتے وہ ڈھاکا کلب، ریڈیو پاکستان، شاہ باغ ہوٹل، گرین روڈ کے خوب صورت گھروں کے اوپر سے گزرتے دھان منڈی پہنچے۔ دھان منڈی کی خوب صورت مصنوعی جھیل کے کنارے درخت خاموشی سے سر جھکائے کھڑے تھے۔ لکڑی کا ضرب کے نشان کا پُل اور درمیان کا جزیرہ نما کمرہ خواب کی طرح پُراسرار لگ رہا تھا۔ ابھی وہ شیخ مجیب الرحمٰن کے گھر سے ذرا دور تھے کہ انھوں نے اسٹین گن فائر کی آواز سنی اور پھر گلی میں ان کا بیٹا کمال بھاگتا ہوا گزرا۔

"بابا کے دھورے نی اے چھے۔" (بابا کو گرفتار کر لیا گیا ہے) دوڑتے ہوئے اس نے کہا۔

اس وقت کمانڈر پلاٹون اور حفاظتی رضا کاروں کی جھڑپ ختم ہو چکی تھی۔ کمانڈوز گھر میں داخل ہو چکے تھے۔ ہریل اور مینا وہیں آم کے ایک درخت میں چھپ گئے۔ تھوڑی دیر بعد کمانڈوز باہر نکلے۔ سفید قمیص پاجامے میں شیخ مجیب الرحمٰن اور چند ملازمین ان کے ساتھ تھے۔ ان کو جیپوں میں بٹھایا گیا اور پھر وہ چھاؤنی کی طرف روانہ ہوئے۔

ہریل کو لگا جیسے مینا بیٹھے بیٹھے مر گئی ہو۔ اس نے اپنی چونچ اپنے پروں میں چھپا رکھی تھی۔ وہ اس وقت جیتی جاگتی، سنہری آواز والی چڑیا نہیں، مٹھی بھر پروں کا ڈھیر معلوم ہو رہی تھی۔

یکایک اس نے جھرجھری لی اور بغیر کچھ کہے سنے ایک طرف کو اُڑ گئی۔

چند سپاہی شیخ مجیب الرحمٰن کے گیٹ کے باہر لگا ہوا پیتل کا بنگلہ دیش کا نقشہ اتارنے میں مصروف تھے۔

کیاریوں میں لگے ہوئے گل چاندنی آسمان کی طرف بے بسی سے تکتے تھے، جہاں دھویں کے بادل چھائے ہوئے تھے۔

ہریل نے واپس اپنے پرانے ٹھکانے پر جانے کا ارادہ کیا مگر اس سے پیشتر اس نے مارشل لا ہیڈ کوارٹر کا رخ کیا۔ جناح ایونیو کی بغل میں زیرِ تکمیل دارالحکومت ثانی میں جنرل ٹکا خاں کا ہیڈ کوارٹر تھا۔ اس کے سامنے جیپ میں شیخ مجیب الرحمٰن بیٹھے تھے۔ ان کی سفید قمیص درختوں سے چھنتی چاندی کی کرنوں میں چمک رہی تھی۔

"ہیلو ہیلو—" جنرل ٹکا خاں کے ہیڈ کوارٹر میں کھڑی جیپ کے وائرلیس پر ۵۷ بریگیڈ کے میجر کی آواز سنائی دی۔ "بڑا پرندہ پنجرے میں ہے، دوسرے اپنے گھونسلوں میں موجود نہیں ہیں، اوور۔"

"بڑے پرندے کو آپ کے پاس لایا جائے؟" اسٹاف افسروں میں سے ایک نے جنرل

ٹکا خاں سے پوچھا۔

''میں اس کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔'' جنرل ٹکا خاں نے نفرت سے منہ پھیر لیا۔

ہریل نہر سے ذرا دور رمنا گرین میں پیپل کے سبز تالیاں بجاتے درخت پر اترا۔ وہاں کی فضا بظاہر پرسکون تھی مگر ریس کورس سے اٹھنے والے دھویں کے بادل یہاں سے بھی دکھائی دے رہے تھے۔ یہاں بھی گولیوں کی تڑاتڑ سنائی دے رہی تھی۔ مگر آواز قدرے کم تھی۔

دوسرے دن ہریل صبح سویرے مینا کی تلاش میں نکلا۔ قدیم ڈھاکا کی نہر استخان کے مشرقی کنارے پر ہندوؤں کی بستیاں تھیں اور مغربی کنارے پر مسلمانوں کی، لیکن اب وہ کھال (نہر) بھر چکی تھی اور سارے علاقے ملے جلے نظر آرہے تھے۔ لکھی بازار، تانتی بازار، جولا نگر، شنکھری بازار (سکھاری پٹی) کمارنگر، پٹوہ ٹولی، پرانا قلعہ، لال باغ قلعہ، شائستہ خاں کا محل، شاہ شجاع کا بڑا کٹرہ، شائستہ خاں کا چھوٹا کٹرہ، اسلام پورہ، ارمنی ٹولہ جسے اٹھارھویں صدی میں آرمینین لوگوں نے آباد کیا تھا اور جہاں اس وقت بھی ان کا چرچ موجود تھا۔ پرانی ڈچ فیکٹری کی جگہ پر اب مٹ فورڈ اسپتال تھا۔ یہ سب علاقے دیکھنے کے بعد اس نے مختلف مسجدوں اور میناروں کا رخ کیا۔ کچا بازار ابھی تک سلگ رہا تھا۔ سکھاری پٹی کے سنکھ خاموش تھے۔ سونے کی دکانیں لوٹی جا چکی تھیں۔ اقبال ہال اور جگن ناتھ ہال کے سبزہ زاروں میں اجتماعی قبریں کھودی جا رہی تھیں۔ ان کے ادھ جلے اسلحہ خانے اور دروازے کھڑکیاں اب تک سلگ رہی تھیں۔ مقابلے کے لیے رائفلیں اٹھائے دست بدست لڑائی کی تمنا میں مرنے والے دروازوں کی چوکھٹ پر، برآمدوں میں، کھڑکیوں میں آدھے اندر اور آدھے باہر لٹکے ہوئے تھے۔ کئی جگہ سے اب تک دھواں اٹھ رہا تھا۔ چند روز پہلے ہریل نے میمن سنگھ روڈ پر نواب عسکری کی کوٹھی جلتی دیکھی تھی۔ میمن سنگھ روڈ جو کسی زمانے میں مغل ٹرنک روڈ کہلاتی تھی، اسے میر جملہ نے تعمیر کروایا تھا۔ اس نے برسوں تک مغل گھڑ سوار دستوں کی ٹاپیں سنی اور سہی تھیں۔ پھر انگریز آئے تھے اور عین اس جگہ۔ جہاں اب زراعتی فارم ہے، ان کی پہلی فیکٹری اور باغ تیار ہوا تھا۔ اور اب ایک اور انقلاب کی اتھل پتھل—— بوڑھی گنگا کے مختلف گھاٹوں پر، کھیتوں میں، کملا پور ریلوے اسٹیشن کی طرف، تیج گاؤں کی سمت ڈھاکہ سے باہر جانے والے تمام راستوں پر چھپ چھپ کر، رینگ رینگ کر انسان کیڑوں کی طرح چل رہے تھے مگر مینا کسی مینار، کسی درخت، کسی کنج اور کسی جھاڑی میں نہیں تھی۔

ہریل کو کیا معلوم تھا کہ وہ موگھ بازار کے نزدیک نیو اسکیٹن کے اپنے پرانے ٹھکانے ''چھایا نیتھی'' پہنچ گئی تھی۔

علی الصبح مختلف چڑیوں کی چہکار میں ایک مینا کی اداس صدا سن کر پُتل باہر باغ میں نکل آئی۔ گھاس اوس میں گیلی تھی۔ آسمان کے پھٹے پھٹے بادلوں میں اب تک جلنے والی عمارتوں کا دھواں شامل ہو رہا تھا۔ گولیاں چلنے کی آواز کسی نہ کسی طرف سے برابر آ رہی تھی۔ مینا اس قدر اندوہ ناک لے میں بھیرویں کا خیال گا رہی تھی جیسے رو رہی ہو۔ پُتل کو یقین ہو گیا کہ یہ وہی مینا ہے جو اس کے گھر کے پنجرے میں بند تھی اور صبح صبح اس کے ساتھ ریاض کیا کرتی تھی۔

''امار نام موے نا۔'' اس نے اپنی میٹھی آواز میں کہا۔

پُتل اسے ڈھونڈتی رہی۔ آم میں بند مٹھی کی شکل کی ننھی ننھی کیریاں لٹکی ہوئی تھیں مگر مینا آم کے درخت پر نہیں تھی۔ کرشن چوڑا میں وقت سے پہلے نارنجی پھولوں کے شگوفے کھل گئے تھے مگر وہ وہاں بھی نہیں تھی۔ اس کی درد بھری میٹھی آواز برابر کانوں میں آ رہی تھی۔ سورج دروازہ کھول کر باہر آیا اور کہا، ''پُتل آپا، آپ کو بینو آپا بلا رہی ہیں۔''

''اچھا!'' پُتل نے کہا اور الٹے قدموں واپس آئی۔ سورج ابھی ابھی بیل کے تازہ شربت کے دو گلاس لے کر آیا تھا۔

''میلو کو بھی یہیں بھیج دو۔'' پُتل نے سورج سے کہا۔

''میلو ــــ میلو بھائی گھر میں نہیں ہیں۔'' سورج نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''کہاں گیا؟ کہاں جا سکتا ہے اس وقت؟'' پُتل نے گھبرا کر کہا۔

''پتا نہیں، ابھی تھوڑی دیر پہلے تک تو تھے مگر شربت دینے کے لیے ڈھونڈ رہا تھا تو کہیں بھی نہیں ملے۔''

''ٹھہرو۔۔۔ میں دیکھتی ہوں۔'' پتّل ننگے پیر تیر کی طرح کمرے سے باہر چلی گئی۔ اکرام الحق کل کا گیا ہوا ابھی تک لوٹ کر نہیں آیا تھا۔ دو دن کی دُلہن بینو اور اس کی نند پتّل نے ساری رات ساریوں کے پلوؤں سے آنکھیں صاف کرتے گزار دی تھی۔ طرح طرح کے وسوسے انھیں گھیرے لے رہے تھے۔ شاید وہ رونجھو کے ساتھ ہو۔۔۔ کہیں وہ دھان منڈی میں شیخ مجیب الرحمٰن کے گھر پر نہ ہو لیکن وہ آپس میں باتیں کرتے اور کھل کر روتے ڈر رہی تھیں۔

''دیکھو سورج، تمھیں میری قسم ہے، سچ سچ بتاؤ، کہاں گیا ہے میلو؟'' بینو نے کہا۔

''بینو آپا جس وقت میں کالا جھنڈا اتارنے اوپر گیا تھا تو میلو بھائی اوپر والے اسٹور میں کھڑے کھڑکی کے شیشے سے باہر جھانک رہے تھے۔ میں بھی چپکے سے پیچھے کھڑا ہو گیا۔ سڑک پر رات کو ہم نے رکاوٹیں کھڑی کی تھیں نا۔۔۔ تو وہاں ایک فوجی جیپ آ کر رکی اسی وقت ایک بہشتی پانی کی مشک لیے سڑک پار کر رہا تھا۔ اس نے ان لوگوں کو دیکھا تو گھبرا گیا اور مشک پھینک کر وہیں زمین پر مردہ بن کر لیٹ گیا۔ فوجی اسے دیکھ چکے تھے یا نہیں، مجھے پتا نہیں، مگر اب ایک سپاہی اس کے پاس آیا، اسے جوتے سے ٹٹولا اور پھر اسے شوٹ کر دیا۔ مشک بھی پھٹ گئی اور خون ملا پانی سڑک پر بہنے لگا۔ میلو بھائی نے غصے سے دیوار پر دو چار مکے مارے۔ پھر پلٹ کر میری طرف دیکھا۔ ان کی آنکھوں میں خون اترا ہوا تھا۔ کہنے لگے، ''خدا کی قسم! اب میں مکتی باہنی میں جاؤں گا اور واپس آ کر ان سے لڑوں گا۔ اب کسی حالت میں یہ ملک ایک نہیں رہ سکتا۔'' یہ کہہ کر وہ اسٹور سے باہر نکل گئے۔

''تو تم نے اسی وقت ہمیں کیوں نہیں بتایا؟'' بینو نے کہا۔

''مجھے کیا معلوم تھا کہ وہ اسی وقت چلے جائیں گے۔'' سورج نے کہا، ''میں تو سمجھا ایسے ہی غصے میں کہہ رہے ہیں۔''

''تمھیں معلوم ہے سورج کرفیو لگا ہوا ہے۔ انھوں نے کہا ہے جو شخص باہر نکلے گا اسے گولی ماری جائے گی۔ اگر میلو کو کچھ ہو گیا تو......''

''میرا خیال ہے وہ پڑوس کے کسی گھر تک گئے ہوں گے، شاید چودھری صاحب کے گھر ہوں۔''

''ذرا فون کر کے پوچھو۔'' بینو نے کہا

''فون تو سارے رات ہی سے کٹے ہوئے ہیں۔'' سورج نے کہا۔

''اوہ۔۔۔'' بینو پھر گھٹنوں میں سر دے کر بیٹھ گئی۔ پتّل بھی نہ جانے کہاں چلی گئی۔

''ابّا کہاں ہیں؟'' اس نے سورج سے پوچھا۔

''وہیں اپنی لائبریری میں۔ رات بھر وہیں رہے ہیں۔'' سورج نے جواب دیا۔

''اور اماں؟''

''وہ تسبیح ہاتھ میں لیے جائے نماز پر بیٹھی رہی ہیں۔ شاید فجر کی نماز کے بعد اٹھ گئی ہوں۔''

''اچھا تم وہیں جاؤ، شاید انھیں تمھاری ضرورت ہو۔'' بینو نے کہا۔

باغ سے چڑیوں کے چہچہانے کی میٹھی آوازیں آرہی تھیں۔ مارچ کی نہایت خوب صورت صبح ہے مگر کیسی خوف ناک۔ بینو نے سوچا۔

''امار نام موئے نا۔'' باغ سے ایک نہایت سریلی آواز آئی۔

''بینو آپا! لوگ بھاگتے بھاگتے یہ کہتے جارہے ہیں، بہاری راملٹری شانگے ملے بنگالیر ہتا کرتے چھے'' (بہاری ملٹری کے ساتھ مل کر بنگالیوں کو ماررہے ہیں)

جب بینو نے کچھ جواب نہ دیا تو سورج چپکے سے وہاں سے سرک گیا۔ بینو پُتلی کی تلاش میں باغ میں چلی گئی۔

دو دن اخبار نہیں نکل سکے تھے۔ آج ۲۸ مارچ کا اخبار چاچا جی کہیں سے لے کر آئے تھے۔ اس میں صدر یحییٰ خاں کی نشری تقریر کی سرخی تھی۔ اس تقریر میں شیخ مجیب الرحمٰن کو غدار کہا گیا تھا اور یہ بھی اعلان کیا گیا تھا کہ ''اسے اس کے کیے کی سزا مل کر رہے گی۔''

کراچی ایئرپورٹ پر بخیریت جہاز سے اترنے اور سکھ کا پہلا سانس لینے کے بعد ذوالفقار علی بھٹو نے کہا تھا، ''شکر ہے پاکستان بچ گیا ہے۔''

اسی اخبار میں جنرل ٹکا خاں کی طرف سے مارشل لا احکامات کی بھرمار تھی اور صبح چھ بجے سے لے کر شام کے چھ بجے تک کرفیو کے نرم کرنے کی اطلاع تھی۔

یہ تین دن کیسے گزرے تھے، زری کو کچھ اندازہ نہ تھا۔ وہ بار بار دروازے تک جاتی تھی اور لوٹ آتی تھی۔ یونی ورسٹی کوارٹرز کی اندرونی سڑک پر اکا دکا سایہ ایک گھر سے نکل کر تیز تیز چلتا دوسرے گھر میں غائب ہوتا نظر آتا تھا۔ خواب گاہ سے جھانکتی تب بھی سناٹے سے مڈھ بھیڑ ہوتی۔ ڈاکٹر ہمایوں کبیر اور ان کے گھر کی درمیانی جگہ میں خود رو گھاس سبزۂ بیگانہ بنی ہوئی تھی۔ کائی لگی دیوار اور کیلے کے درختوں کے سائے میں لوکی کی بیلیں ایک دوسری میں الجھی ہوئی تھیں۔ بیری کے درخت پر جھولا ہوا سے آہستہ آہستہ ہل رہا تھا۔ آج اس پر بیٹھنے کے لیے لڑنے والے بچوں کا کہیں پتا نہ تھا۔ آم کے درخت کیریوں سے لدے ہوئے تھے۔ ایک درخت کے نیچے کسی پرند کا بید کا بنا ہوا پنجرہ خالی پڑا تھا۔ ذرا

دیر میں سورج ڈوب جائے گا اور رات اس کے دل میں سیاہ درانتی کی طرح آہستہ آہستہ گڑ جائے گی۔

چاچاجی اور مولانا بھی فکر مند تھے اور کسی نہ کسی بہانے بار بار دروازے تک جاتے تھے۔ چنبیلی کی خوشبو کبھی کبھی کھڑکی کے راستے آ کر کوئی بھولی بسری یاد دلا جاتی تھی یا فلر روڈ پر گزرتا ہوا کوئی فوجی ٹرک سناٹے کو روندتا ہوا گزر جاتا۔

شام کا اندھیرا اُترا ہی تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ چاچاجی نے مولانا کو اپنا کمرہ دے دیا تھا اور خود ان کی جگہ ڈرائنگ روم میں سوتے تھے۔ دروازے کی ہر دستک پر وہی باہر جاتے تھے۔ اردو کی کتابیں ڈرائنگ روم میں رکھی تھیں مگر بنگلہ کی کتابیں اٹھا دی گئی تھیں — دروازہ کھولتے ہی دو لڑکے ایک لڑکی اندر داخل ہوئے اور اپنے پیچھے جلدی سے دروازہ بند کر کے کنڈی لگا دی۔

''زری آپا کہاں ہیں؟'' ایک نے کہا۔

''تم بیٹھو میں زری کو بلاتا ہوں۔'' چاچاجی نے کہا۔

چاچاجی اندر گئے تو بڑے لڑکے نے مولانا سے کہا، ''ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، ہمیں بہت دور جانا ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ آپ فوراً ان دونوں کا نکاح پڑھا دیں۔''

اندر داخل ہوتے ہوئے زری اور چاچاجی نے یہ بات سنی اور حیرت سے ان لوگوں کو دیکھا۔

''ارے اکرام اور میلو تم؟'' زری نے نزدیک آ کر کہا۔

''ہاں — اور یہ میلو کی منگیتر ہے جہاں آرا، شاید آپ نے نام سنا ہو۔ رینو کہلاتی ہے۔''

''مگر اس وقت شادی؟''

ہاں زری آپا! ہم لوگ بہت دور جا رہے ہیں، شاید سرحد پار جانا پڑے۔ میں اپنے ہونے والے سسرال ملنے گیا تو رینو کے والد نے کہا، اس کو اپنے ساتھ لے جاؤ مگر اس سے نکاح کر لینا۔ مجھے یاد آیا کہ بینو آپا کا نکاح مولانا نے پڑھایا تھا اس لیے میں اسے لے کر یہاں آ گیا۔ اکرام بھائی اسی لیے میرے ساتھ آئے ہیں کہ آپ یہ نہ سمجھیں کہ میں اسے بھگا کر لایا ہوں۔'' وہ ہنسا۔

''مذاق کا وقت نہیں ہے۔'' اکرام نے سنجیدگی سے کہا۔ ''زری ٹھیک ہے، ان دونوں کو بہت دور جانا ہے۔ مولانا سے کہیے ان کا نکاح پڑھا دیں۔''

''کھانا کھایا ہے، کچھ سامان ساتھ ہے، کہاں سے آ رہے ہو؟'' زری نے ان کا اجاڑ حلیہ دیکھ کر پوچھا۔

''ہاں کھا لیا ہے کچھ نہ کچھ — ایک بیگ ساتھ ہے اور بس۔'' میلو نے اپنے کندھے پر پڑا ہوا تھیلا تھپتھپایا۔

مولانا عصر کی نماز سے فارغ ہو کر تہمد اور بنیان پہنے ٹانگ پر ٹانگ دھرے بیٹھے تھے۔ انھوں نے اپنے گیروے رنگ کا کرتا کرسی سے اٹھا کر پہنا اور ٹوپی سر پر جمانے لگے۔

''رات کو کیسے جاؤ گے؟ کرفیو کا وقت شروع ہونے والا ہے۔''

''یہ مغربی پاکستان نہیں ہے زری آپا، ہم لوگ گھر گھر کے اندر سے سرحد تک پہنچ سکتے ہیں اور نہ جانے کتنے پہنچ بھی گئے ہیں۔ آپ ہماری فکر نہ کریں۔'' میلو نے کہا۔

''زندہ رہنے کے لیے کبھی کبھی موت سے بھی آنکھ مچولی کھیلنی پڑتی ہے، زری۔'' اکرام نے کہا۔

''آپ دیکھ رہی ہیں کہ چاروں طرف کیا ہو رہا ہے، یہاں رہنا خطرناک ہے، بہت خطرناک، شمس تو نہیں ہے نا۔''

''نہیں، وہ کہاں ہے؟ خدا کے لیے مجھے بتاؤ۔'' زری نے اپنے سفید ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں۔

''وہ جہاں کہیں ہوگا خیریت سے ہوگا، آپ گھبرایئے نہیں۔ ایک دو دن میں آ جائے گا۔ ابھی ہر شخص سہما ہوا ہے، حالات کا رخ دیکھ رہا ہے۔''

''اچھا تم اندر آؤ۔'' زری سب کو چاچا جی کے کمرے میں لے گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔

ایجاب وقبول ہوا۔ مولانا نے نکاح پڑھایا۔ چاچا جی اور اکرام الحق گواہ ہوئے۔ زری کو اب بھی یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے یہ سب اس وقت اس کے سامنے نہیں ہو رہا ہے، کبھی پہلے کی کوئی واردات ہے جو اسے دکھائی جا رہی ہے۔ جیسے کوئی خواب ہے، جس میں اتفاق سے وہ بھی شریک ہے۔

مولانا، چاچا جی اور زری کے اصرار پر آج کی رات وہ تینوں یہیں ٹھہر گئے تھے مگر بے حد سہمے ہوئے تھے۔ یہ وہ علاقہ تھا جہاں گھر گھر تلاشیاں ہو رہی تھیں۔ زری نے دولھا دلھن کو اپنا کمرہ دے دیا تھا۔ اکرام الحق مولانا کے کمرے میں تھا اور زری چاچا جی کے پاس ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھی۔

چاچا جی کے بہت اصرار پر زری تھوڑی دیر کے لیے کمر ٹکانے صوفے پر لیٹ گئی تھی۔ ابھی اندھیرا تھا کہ وہ ہڑبڑا کر اٹھی۔ چاچا جی سو رہے تھے۔ وہ اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف گئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا اور وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

''وہ تینوں تو رات ہی کو چلے گئے۔'' مولانا نے بتایا۔ ''میں تہجد کے لیے اٹھا تب وہ جانے کے لیے تیار تھے۔''

''مگر رات کو تو کرفیو——'' زری نے کہا۔

''کچھ انتظام ہوگا۔ میں نے روکا مگر وہ مانے نہیں۔ کہنے لگے، ہزاروں لوگ چھپ چھپ کر کھیتوں اور جنگلوں میں پیدل اور بیل گاڑیوں میں سرحد کی طرف جا رہے ہیں۔ آپ کو کیا معلوم، ہم

صبح کا انتظار نہیں کر سکتے۔"

"کیا اکرام بھی ان کے ساتھ جا رہا ہے؟" زری نے پوچھا۔

"کچھ دُور تک ــــ" مولانا نے کہا اور فجر کی نماز کے لیے چلے گئے۔

زری اپنے کمرے میں داخل ہوئی۔ اُس کی سنگھار میز پر آئی بَرو پنسل سے بنگلہ دیش کا نقشہ بنا ہوا تھا اور سُرخ لِپ اسٹک سے لکھا ہوا تھا ــــ "جے بنگلہ۔"

زری کے دِل میں ایک وحشت نے گھر کیا ــــ وہ کہاں ہے! ــــ وہ کن لوگوں میں ہے ــــ دوستوں میں یا دشمنوں میں؟ اس کی منزل پاکستان ہے یا بنگلہ دیش؟ ــــ وہ کس طرف کھنچی جا رہی ہے۔ چاچا جی اسے کوئی راہ نہیں سجھاتے، مولانا اسے کچھ نہیں بتاتے ــــ وہ کیا کرے؟ ــــ کیا وہ اسی طرح ٹکڑوں میں بٹتے بٹتے ختم ہو جائے گی ــــ کوئی ایک سیدھا راستہ ہوگا، کوئی ایک بات صحیح ہوگی ــــ اگر پاکستان صحیح ہے تو بنگلہ دیش غلط ہے، اگر بنگلہ دیش صحیح ہے تو پاکستان غلط ہے ــــ یا تو وہ اِدھر کی غدّار ہے یا اُدھر کی ــــ کیا اس نے ان دونوں کو اپنے ہاں پناہ دے کر غدّاری کی ہے؟ کیا وہ اس لیے آدھی رات کو اس گھر سے بھاگ گئے کہ انھیں اس پر اعتماد نہ تھا! ــــ وہ یہ بات کس سے پوچھے ــــ شمس الرحمٰن اُسے بیچ منجدھار میں چھوڑ کر کہاں چلا گیا ہے۔

زری نے نیل پالش صاف کرنے والی شیشی آئینے پر اُلٹ دی اور تولیہ زور زور سے اُس پر رگڑنے لگی۔

اور پھر یہ صدا پہاڑ کی بازگشت کی طرح لوٹ کر آئی کہ بدقسمت زنجیرہ میں دس ہزار معصوم افراد مارے گئے ہیں، بوڑھے، عورتیں اور بچے، کچھ دانش ور بھی مارے گئے تھے۔ دس بارہ سال کے کسی لونڈے کے کہنے پر کہ وہاں شر پسند چھپے ہوئے ہیں، وہاں ایک بٹالین اور توپوں سے حملہ کیا گیا تھا۔ کرانی گنج اور زنجیرہ تباہ ہوگئے تھے۔ بوڑھی گنگا کے دوسری طرف بڑا کٹرہ کے مقابل زنجیرہ جانے کے لیے کبھی لکڑی کا پل تھا، اور ابراہیم خاں نے یہاں ایک شان دار محل بنوایا تھا۔ زنجیرہ کا پرانا نام جزیرہ تھا۔ یہ وہ منحوس جگہ تھی جہاں نواب سراج الدولہ کی ماں، خالہ اور بیوی کو رکھا گیا تھا۔ اور ایک دن کشتی کی سیر کرانے کے بہانے بوڑھی گنگا میں ہمیشہ کے لیے ڈبو دیا گیا تھا۔

''اب بنگلہ دیش بن جائے گا۔'' مولانا نے بڑے دکھ سے کہا۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟'' چاچا جی بوکھلائے۔

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔'' مولانا نے اپنے کمرے میں جا کر دروازہ اندر سے بند کرلیا۔

اسی دن ایک بہاری شاعر نے اپنے محمد پور کے فلیٹ کے ایک کونے میں رات گئے تک جاگنے کے بعد تخلیق کے درد سے بے تاب ہو کر ایک نظم کہی، جیسے کوئی ماں اپنے بچے کو سمجھا نہ سکے تو دیوار سے اپنا ہی ماتھا پھوڑے۔

اب دل آزار ہے ڈھاکا میں کراچی کا خیال

اب بہت دور ہے کاغان سے رانگا ماٹی
اب کوئی چارہ نہیں قطعِ محبت کے سوا
اب ادھر کچھ بھی نہیں جذبۂ نفرت کے سوا
اب کوئی حل ہی نہیں عام بغاوت کے سوا

میجر ظاہر قصیدۂ انقلاب پڑھ رہا تھا۔

تباہی کے خوف سے گھبراہٹ کیسی

تباہی — نئی تعمیر کا درد ہے

آتا ہے عصرِ جدید، نیست و نابود کرنے مردہ بد نما کو

اسی لیے وہ ایسی صورت اور لباس میں آتا ہے

اگرچہ تباہی بدوش آتا مگر لبوں پر ہنسی ہے

وہ ابدی حسین — توڑ کر پھر بنانا جانتا ہے

باغی شاعر نذرالاسلام کی جوشیلی اور انقلاب آفریں نظمیں اما وبر باندھے (ہمیں کون باندھے گا) اور رے نین اور رے آمار کا نچا (اے نوجوانو اے میرے نونہالو) بدروہی اور اگنی بینا کے بنداب کام آرہے تھے۔ پٹل، اس کی دوست مؤکل اور دوسرے، روز پرانے ریکارڈ کھنگالتے، اسکرپٹ لائبریری ٹٹولتے اور نہایت نادرِ روزگار چیزیں نکالی جاتیں۔ ان میں سے بہت سی چیزیں ہندوستان کی آزادی کے لیے لکھی گئی تھیں، کچھ ایسی بھی تھیں جو پاکستان میں یومِ آزادی کے لیے لکھی گئی تھیں، مگر ذرا سی کتر بیونت کے بعد وہ نہایت کارآمد ثابت ہو رہی تھیں۔ ان میں سے کچھ ڈرامے تو اتنے گرم تھے کہ اوپر سے پوچھ گچھ کے نوٹس آنے لگے تھے۔ یہ وارننگ نوٹس جیسے ان کے لیے حسنِ کارکردگی کے تمغے تھے۔ ان سے ڈراما پروڈیوسروں کو جو خوشی ہوتی تھی ان کا دل ہی جانتا تھا۔ وہ اس کا خوب چرچا

کرتے تھے۔ جواب دینے کو وہ کوئی الٹی سیدھی بات لکھ دیتے تھے۔ اوپر کوئی نہ کوئی ان کی بگڑی بات کو سنوار ہی لیتا تھا۔

کشتی انتخاب میں عوامی لیگ کا نشان تھی۔ بھٹیالی کے سمندر، کشتیاں، مانجھی، لہروں کا زور، سب انقلابی رُخ اختیار کر گیا تھا۔ اس گان کا اتار چڑھاؤ ـــــ جیسے طوفان بڑھ رہا ہو، بڑھتا جا رہا ہو ـــــ اور کوئی آواز دور سے طوفانی لہروں کے بہاؤ میں اترتی چڑھتی آپ کو پکار رہی ہو۔

چاہے آندھی آئے رے ـــ چاہے میگھا چھائے رے
ہمیں تو اس پار لے کے جانا مانجھی رے

اور دریائے جہلم کے کنارے بسے ہوئے جہلم شہر میں روز رات کو چپکے چپکے میجر ظاہر یہ نغمے ریڈیو پر سنا کرتا تھا۔ شام کو وہ دریا کے کنارے دیر تک تنہا ٹہلا کرتا تھا۔ جب اس مسجد کو دیکھتا جس کے قدموں کو دریا کا پانی چھوتا ہوا گزرتا ہے تو بوڑھی گنگا کی شاکھا کے نزدیک اسے ڈھاکا کی ست گنبد مسجد یاد آتی تھی۔ اس کے نزدیک نشیب میں اینٹ کھولا جہاں غریب مرد اور عورتیں دھوپ میں بیٹھی سرخ اینٹیں توڑا کرتی تھیں۔ وہ لنگی اور گنجی پہنے نحیف و نزار جسم، وہ فقط ساریوں میں اپنا پسینے میں بھیگا بدن چھپائے ادھیڑ عورتیں ـــــ ان کے سانولے محنت آشنا پیر گرم اینٹوں پر دھیرج سے دھرے رہتے۔ صبر ان کے خمیر میں ہے۔ طوفان آشنا روحوں میں طوفان بھی ہوتے ہیں اور دھیرج اور صبر بھی۔ جانے اب وہ لوگ کہاں ہوں گے؟ خدا جانے، اب اپنے دیس کو وہ کس حلیے میں دیکھے گا؟ مگر بہت جلد دیکھے گا، یہ تہیہ اس نے اپنے دل میں کر رکھا تھا۔ ظاہر نے ۲۵ / مارچ کے بعد اپنے دل میں اپنے علاقے کو بنگلہ دیش کے علاوہ اور کچھ نہ کہا تھا۔

۲۶/۲۵ / مارچ کی درمیانی رات ظاہر کوئٹہ کی سرد چاندنی رات میں سنسان سڑکوں پر مارا مارا پھر رہا تھا۔ دو دن پہلے اس نے اکرام الحق سے فون پر ڈھاکا بات کی تھی اور اسے شادی کی مبارک باد دی تھی۔ اس کے بعد اس نے اپنی منگیتر پُتل سے بھی بات کی تھی۔ پُتل بہت پریشان تھی۔

''کچھ ہونے والا ہے ـــ مجھے لگتا ہے بہت جلد کچھ ہونے والا ہے۔'' وہ صرف اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

''مت گھبراؤ۔'' ظاہر نے اس سے کہا تھا۔ ''جو کچھ ہوگا ہمارے لیے بہتر ہوگا۔''

''اردو میں بات کرو۔'' درمیان میں ایکس چینج نے سختی سے ٹوکا تھا۔

''کیا ہمارے ہم لباس بہت لوگ مارے جا رہے ہیں؟'' ظاہر نے انگریزی میں پوچھا تھا۔ ''ہم لباس'' لفظ اس نے جان بوجھ کر استعمال کیا تھا کہ پُتل سمجھ جائے مگر درمیان میں سننے والا نہ سمجھے۔

''ہاں'' پُتل کی آواز آئی تھی۔ وہ آگے بھی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر لائن ایک دم کٹ گئی تھی۔ یہ دو

دن ظاہر کے بہت بے چینی میں گزرے تھے اور آج کی رات تو قیامت تھی، کیوں کہ اسے معلوم ہو چکا تھا کہ جیسے ہی صدرِ پاکستان کا طیارہ کراچی کی حدود میں داخل ہوگا ڈھاکا میں فوجی کارروائی شروع ہو جائے گی، آرمی کریک ڈاؤن، رات بھر کوئٹہ کی سنسان سڑکوں پر دانت پیستے ہوئے پھرتے رہنے کے علاوہ اس نے یہ بھی سوچا تھا کہ اب اسے اپنی ایس ایس جی کی ٹریننگ اور دل میں بھڑکتی ہوئی انقلاب کی آگ کے سہارے سرحد پار کر لینی چاہیے۔

صبح وہ ناشتے کے لیے میس میں گیا تو سب افسر بے حد شادماں تھے۔ ہنسی، مذاق، چہچہوں اور قہقہوں کے درمیان اسے بتایا گیا کہ ڈھاکا میں ایک ہی رات میں باغیوں اور غداروں کو سیدھا کر دیا گیا تھا اور اب دوسرے ٹھکانوں کی باری تھی۔ اسے خاص طور پر مبارک باد دینے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ اس کا تعلق اسی کمانڈو یونٹ سے تھا جس کے ایک پلاٹون نے شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کیا تھا۔ اس نے یہ مبارک باد بغیر کوئی جواب دیے کڑوی گولی کی طرح نگل لی تھی۔

''میرا خیال ہے اب یہ لوگ کئی پشتوں تک سر نہ اٹھا سکیں گے۔'' ایک جواں سال میجر نے مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے کہا تھا۔

''ہوسکتا ہے یہاں آپ غلط ہوں۔'' ظاہر کے منھ سے بے اختیار انگریزی میں یہ جملہ نکل گیا تھا اور وہ بغیر ناشتا کیے اٹھ کر چلا آیا تھا۔

اس کا میس میں کہا ہوا یہ جملہ بڑی سنجیدگی سے لیا جا رہا تھا۔ اگر اس کی ہم دردیاں غدار بنگالیوں کے ساتھ ہیں تو کیا وہ فوج کا وفادار ہے؟ شام تک اس نے محسوس کیا کہ سارے جونیئر بنگالی افسر اس سے بات کرتے ہوئے کترا رہے ہیں اور سنیئر بنگالی افسر اس کی طرف دیکھتے تک نہیں ہیں۔ معاملہ سنگین ہے۔ اس نے سوچا تھا، مگر وہ مجبور تھا۔ اداکاری اس کے بس کا روگ نہیں تھی۔ دو دن بعد کورس ختم کر دیا گیا اور سارے افسروں کو ان کی یونٹوں میں بھیج دیا گیا۔ ظاہر کی یونٹ مشرقی پاکستان میں تھی لیکن اسے اسٹیشن ہیڈ کوارٹر کے ساتھ نتھی کر کے جہلم چھاؤنی بھیج دیا گیا۔ شاید اب اس کے بارے میں یہ تحقیق کی جائے گی کہ فوج کے بارے میں اس کی کھلم کھلا ناراضگی فوج سے بغاوت کے زمرے میں آتی ہے یا نہیں۔ لیکن وہ خوش تھا کیوں کہ اسے اندازہ تھا کہ جہلم اور سیالکوٹ سے سرحد پار کر لینا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ وہ جب بھی اپنے ہم وطن افسروں سے ملتا یہی کہتا، ''اس وقت ہمیں یہاں نہیں وہاں ہونا چاہیے۔ میں یہاں سے بھاگنے کی ہر ممکن کوشش کر رہا ہوں اور جو بھی ساتھ چلنا چاہے اس کی مدد کرنے کو تیار ہوں۔''

اس کے ساتھی افسر کچھ تو اس کی ہاں میں ہاں ملاتے اور کچھ سن کر خاموش ہو جاتے۔

جو مغربی پاکستانی اس زمانے میں مشرقی پاکستان سے بھاگ کر آرہے تھے، بتاتے تھے کہ دونوں طرف سے تباہی مچ رہی ہے۔ فوج شرپسندوں کے نام پر غدر مچا رہی ہے۔ مقامی لوگ حکومت سے عدم تعاون کا اعلان کر کے سڑکیں، پل اور ریلوے لائن توڑ رہے ہیں۔ ریل کے ڈبے اور بسیں جل رہی ہیں۔ گاؤں اور کھیت جل رہے ہیں۔ دونوں طرف کے لوگ مارے جا رہے ہیں، کبھی اِس بہانے، کبھی اُس بہانے۔

اُس رات شمس الرحمٰن پر بھی شاعری کی دیوی مہربان تھی۔ صبح ہوتے ہوتے اس نے کئی چھوٹی چھوٹی نظمیں کہی تھیں۔ نورالزماں ہوتا تو آج اس کبھی نہ ختم ہونے والی رات کی سی طویل نظم کہتا۔ اندھیرے میں اپنا سگریٹ لائیٹر جلا کر وہ ایک خیال کو نظم کا روپ دیتا تھا۔ چھوٹی چھوٹی تتلیوں کی طرح جذبے اس کے دل میں اور الفاظ اس کے ذہن میں پھڑ پھڑا رہے تھے:

ٹِڈی دَل اِک آیا تھا
سرسبز پتوں کا، سُرخ سُرخ پھولوں کا
ہنستی بستی کلیوں کا
پَل میں سب صفایا تھا

اور دوسری مختصر نظم —— ایک اور اڑتی پھڑ پھڑاتی تتلی:

ستارۂ سحر کی بات راز تھی
دمِ وداع کان میں یہ کون آ کے کہہ گیا
مری چمک فقط شکستِ ساز تھی
ٹھائیں ٹھائیں —— ٹھائیں ٹھائیں ——
کھٹ کھٹ —— کھٹ کٹ —— کھٹ کھٹا کٹ۔

کون ہے، کون دروازہ کھٹکھٹا رہا ہے؟ اپنے کمرے سے نکل کر وہ باہر کی طرف بڑھا۔ شوشی نے

اسے درمیان میں آلیا، ''خدا کے لیے شمسو تم چھپ جاؤ، ہاتھ جوڑتی ہوں۔ جو کوئی بھی ہوگا میں نمٹ لوں گی۔ کٹھ پتلی کی طرح نظر نہ آنے والا تار شاید اس کے ہاتھ میں تھا۔ دوچھتی میں سیڑھی کب کی لگی ہوئی تھی، اسے پتا نہیں — شوشی کے اشارے پر وہ چڑھ گیا۔

''پٹ بند کرو۔'' اس نے کہا اور پھر اسے سیڑھی ہٹانے کی آواز آئی۔ سیڑھی اس نے تخت کے نیچے ڈالی یا میدان کی طرف والے دروازے سے باہر پھینکی، کیا ہوا — اسے کچھ پتا نہیں۔ اندھیرے بکس جیسی دوچھتی میں وہ بند تھا جیسے قبر میں ہو۔ ہاں ہوسکتا ہے کوئی اس کی تلاش میں آیا ہو۔ کسی نے سلہٹ میں اس کی اور رونجھو کی ملاقات کا سراغ لگالیا ہو۔ تو کیا زری پر بھی آنچ آسکتی ہے؟ نہیں زری اپنی حفاظت کرسکتی ہے، چاچاجی اس کے ساتھ ہیں۔ میجر خالد یقیناً اچھا دوست ہے۔ میجر تجمل بحیثیت انسان برا نہیں ہے اور نیوی کا وہ ڈاکٹر ناصر — کیا وقتِ ضرورت ان لوگوں پر بھروسا کیا جاسکتا ہے؟ شاید اب نہیں — آج کی رات کے بعد نہیں۔ فنا اور بقا، ازل اور ابد کے درمیان ایک وقفہ ہے قیامت کا۔ جس کے بعد سب کچھ بدل جائے گا۔ آج وہ قیامت کی رات ہے۔ آج کے بعد سب کچھ بدل جائے گا۔ اب ہم — وہ — کوئی بھی دوبارہ اس جگہ پر نہ جاسکے گا جہاں سے چلا تھا — کیا میں اور زری بھی!! — کیا ہو رہا ہے؟ کچھ ہو رہا ہے۔ کسی کے چلنے پھرنے کی آواز آرہی ہے۔ بھاری بوٹوں کی صدائیں۔ چیزیں نیچے پھینکے جانے کی آواز — مجھے چاہیے اور پیچھے دبک جاؤں — ان ٹوٹی پھوٹی چیزوں کے پیچھے — یہ کیا ہے — رضائیاں، پردے — جو کچھ بھی ہے، ان کو اوڑھے لیتا ہوں — دم نہ گھٹ جائے — جب تک سانس آرہا ہے اسی طرح بیٹھنا ہوگا — جب تک سانس تب تک آس۔ خاصی دیر ہوگئی۔ اب کسی کو آنا چاہیے۔ شوشی کو یا راج میاں کو — کم از کم مجھے آکے اشارہ دو — کیا میں یہیں مرجاؤں — نہیں اب میں پٹ کھول کے جھانکتا ہوں — تھوڑا سا، برائے نام۔ کوئی نہیں ہے — الماری کی چیزیں نیچے پڑی ہیں۔ کھانے کے کمرے میں چھپنے کی زیادہ جگہ نہیں — دوچھتی کی طرف ان کا دھیان نہیں گیا۔ کھانے کے کمرے میں عموماً دوچھتی نہیں ہوتی — سننے کی کوشش کی — بالکل خاموشی تھی۔

فاصلہ خاصا ہے، چھلانگ لگانے سے ٹانگ ٹوٹ جانے کا اندیشہ ہے۔ دوچھتی کے کاٹھ کباڑ کو ہٹا کر جگہ بنائی۔ اپنے سر اور ہاتھوں کو جالوں سے صاف کرنے کی کوشش کی — اس کام کو ادھورا چھوڑ کر وہ الٹا لٹکا اور احتیاط سے کود گیا۔ آخر شائستہ کہاں ہے۔ کہیں وہ اسے ساتھ تو نہیں لے گئے۔ چاقو کی تیز دھار کی طرح یہ خیال اس کا دل چیر گیا۔ وہ بے تحاشا بھاگا اور جب اس نے بند دروازے سے لگی شائستہ کو زمین پر بیٹھے اپنے منہ پر ہاتھ رکھے بلکتے دیکھا تو بغیر کچھ کہے سنے بے اختیار اس کے

گھٹنوں پر سر رکھ دیا اور خود بھی رونے لگا۔ اسے بالکل معلوم نہیں تھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ شوشی کیوں رو رہی ہے، سراج کہاں ہے؟ ان دونوں کو روتے دیکھ کر شوشی کی گڑیا سی بچی (لیلیٰ) بھی رونے لگی۔

''کون تھا؟ کیا ہوا، کچھ بتاؤ۔'' آخر خود پر قابو پا کر شمس الرحمٰن نے پوچھا۔ شائستہ کو اٹھا کر صوفے پر بٹھا دیا۔ ''راج میاں کہاں ہیں؟''

جیپ سب سے پہلے انھوں نے ہی دیکھی تھی۔ وہ چھت پر جا کر برابر کے گھر میں کود گئے تھے۔ ہوسکتا ہے انھوں نے پناہ دے دی ہو یا وہاں سے کہیں اور نکل گئے ہوں۔

عجیب انسان ہے، شمس الرحمٰن نے غصّے سے سوچا، بیوی بچوں کو چھوڑ کر اپنی جان بچانے کی کوشش، اس لمحے شوشی کا شوہر اسے بے حد چھوٹا لگا پھر اسے یاد آیا— شوشی اور ننھی سی بچی کو چھوڑ کر وہ بھی تو دو چھتی میں دبکا بیٹھا رہا۔ خود تحفظ کی یہ انسانی جبلّت۔

''ہوا کیا؟'' شمس الرحمٰن نے پوچھا۔ ''کون لوگ تھے؟''

''ہوا یہ کہ انھوں نے کہا تمھارے گھر سے کسی نے ہماری جیپ پر گولی چلائی ہے، ہم تلاشی لیں گے۔''

''فوجی تھے؟''

''ہاں فوجی تھے۔ ایک افسر، ایک جے سی او، اور چند سپاہی۔'' شوشی دھیمے دھیمے لہجے میں اسے قصہ سناتی رہی۔ وہ حیرت اور غم سے اسے دیکھتا رہا۔ چاروں طرف بے ترتیب پڑی چیزیں اور تاریکی دہشت پھیلانے کو بہت تھیں۔ شوشی نے اپنی منی بچی کو گود میں بٹھا لیا تھا، اور بے خیالی میں کبھی اسے بھینچ لیتی تھی اور کبھی اس کے بالوں پر پیار کرتی جاتی تھی۔ ''میں نے ان سے کہا، ہمارے ہاں سے کون گولی چلائے گا، ہمارے ہاں کوئی ہتھیار نہیں ہے نہ مجھے بندوق چلانی آتی ہے۔ میں لہجے کو پُر اعتماد بنانے کی کوشش کر رہی تھی مگر اندر ہی اندر میرا دل دھائیں دھائیں کر رہا تھا۔''

''شاید تمھارے گھر میں کوئی چھپا ہوا ہو جس نے گولی چلائی ہو، تلاشی لو۔'' صوبے دار کو حکم دیا گیا۔ صوبے دار اور سپاہی اندر چلے آئے۔ میرا دل تمھاری طرف سے بڑا ڈر رہا تھا مگر میں بہادر بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ افسر خود ڈرائنگ روم کی طرف بڑھا اور ایک صوفے کو دھکیل کر راستہ بنا کر ایک پر بیٹھ گیا اور پوچھنے لگا کہ میں نے سارے صوفے درمیان میں کیوں رکھ دیے ہیں؟ میں نے بتایا کہ ہر وقت گولیوں کی آواز آتی ہے اس لیے ہم نے یہ انتظام کیا ہے۔ میں، خاوند اور بچی تینوں صوفوں کے درمیان میں زمین پر سوتے ہیں۔ اس نے چاروں طرف دیکھا اور کہا، ''تمھارا خاوند اور بچی کہاں ہے؟'' میں نے کہا، ''خاوند نیچے ہینڈ پمپ سے پانی بھرنے گئے تھے، آپ کو ملے ہوں گے۔'' اس نے کہا، ''ہمیں کوئی نہیں ملا۔'' پھر وہ اٹھا اور صوفے کے چاروں طرف چکر لگایا۔ ایک

صوفے کے پیچھے لیلیٰ سہمی ہوئی بیٹھی تھی، اس نے ہلکے سے اپنی چھڑی سے اسے چھوا اور کہا، ''باہر نکلو۔'' وہ کسمساتی ہوئی اٹھ کر آ گئی۔

''اس کا باپ کہاں کا رہنے والا ہے اور کیا کرتا ہے؟''

''سرگودھے کا ہے اور بزنس کرتا ہے۔ میں خود کلکتہ کی ہوں۔ میرے والد کشمیر سے وہاں آئے تھے۔'' میں نے بتایا۔ وہ مسکرانے لگا اور غور سے میری طرف دیکھنے لگا۔ میں نے نگاہیں جھکالیں تو اس نے پوچھا، ''گھر میں بجلی نہیں ہے؟'' میں نے کہا، ''بجلی اور پانی نہیں ہے۔ لالٹین جلاتے ہیں اور پانی نیچے ہینڈ پمپ سے بھر کر لاتے ہیں۔'' ''اور راشن؟'' ''راشن ایک دن پہلے ہی جا کر لائی تھی، اب تک چل رہا ہے۔'' ''گڈ'' اس نے کہا، ''اپنے شوہر سے کہنا، کل صبح مارشل لا ہیڈ کوارٹرز میں آن کر مجھ سے ملے۔ میں کوشش کروں گا بجلی پانی ٹھیک کرانے کی۔'' اتنے میں صوبے دار نے آن کر رپورٹ کی کہ کہیں کوئی چھپا ہوا نہیں ہے۔

''او کے، میں چلتا ہوں، دروازہ اندر سے بند کرلو۔'' اس نے کہا۔ چلتے چلتے ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ ''اچھا صاحب، آپ چلیں۔'' اس نے صوبے دار سے کہا۔ صوبے دار کے کہنے پر سپاہی بھدر بھدر سیڑھیاں اتر کر سڑک پر چلے گئے۔ ان کے پیچھے صوبے دار بھی چلا گیا۔ وہ چند لمحے کھڑا رہا، پھر بولا، ''میں پھر آؤں گا۔ اپنے شوہر کو مارشل لا ہیڈ کوارٹر بھیجنا نہ بھولنا۔'' اس کے جانے کے بعد نہ جانے کس طرح میں نے دروازے کی چٹخنی لگائی اور وہیں گر پڑی۔

''شاما!— ہمیں ہر قیمت پر آج رات یہاں سے نکلنا ہوگا— تم میرے ساتھ ڈھاکا جاؤ گی۔''

''ان حالات میں؟''

''ہاں— چھ لوگ ہیں جن کا نام لے کر ہم بچ سکتے ہیں— زری کا نام میری وفاداری کی ضمانت ہے۔ کچھ اور لوگ بھی ہیں مگر یہاں رہنا ٹھیک نہیں ہے۔''

''اور ابوظفر؟''

''اگر وہ صبح تک نہ آیا تو ہمیں اس کے بغیر جانا ہوگا۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔ ''کسی وجہ سے وہ تمھیں تنگ کرنا چاہتے ہیں۔''

میں نے تمھیں نہیں بتایا شمسو کہ ابوظفر ابھی تک ہندوستان کا شہری ہے۔ یہاں بہت لوگ یہ بات جانتے ہیں۔ وہ فطرتاً بھی بہادر نہیں ہے اور اس بات نے اسے بہت زیادہ خوف زدہ کر رکھا ہے۔''

''خیر، جو کچھ بھی ہو، کل ہم ڈھاکا جا رہے ہیں، یہ بات طے ہے۔''

دوسرے دن وہ ڈھاکا روانہ نہیں ہوئے۔ تین دن تک انھوں نے ابوظفر کے والدین کے

گھر اس کا انتظار کیا۔ شوشی کا خیال تھا کہ وہ خود آئے گا یا کوئی پیغام بھیجے گا۔

آخر شمس الرحمٰن نے ہمت کی۔ وہ مکتی باہنی کے سیکٹر ہیڈ کوارٹر گیا۔ مسکہ ہوٹل کے سامنے بنا یہ ریسٹ ہاؤس اچھا خاصا پُر فضا تھا۔ زری کے ساتھ شروع میں ایک مرتبہ وہ اس ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرا تھا اور مسکہ ہوٹل میں کھانا کھایا تھا۔ اب یہ ہوٹل سنسان پڑا تھا۔ ریسٹ ہاؤس کے آگے دو جیپیں اور ایک ٹوٹی ہوئی کار کھڑی تھی۔ شمس الرحمٰن نے دروازہ کھولا تو جوتوں کو کسی چپکتی چیز نے پکڑ لیا۔ اس نے جھک کر دیکھا اور لرز کر رہ گیا۔ وہ ٹخنوں ٹخنوں خون میں ایستادہ تھا۔ مکتی باہنی کے افسر کے سامنے دو آدمی کھڑے تھے جن سے وہ کچھ پوچھ گچھ کر رہا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا اور خون کی ناگوار بو پھیلی ہوئی تھی۔ کیا اسے یہاں سے بھاگ جانا چاہیے؟ مگر اب بھاگنا نہایت خطرناک تھا — جما ہوا خون اس کے جوتوں کو جکڑے ہوئے تھا۔

''لیکچر بند کرو اپنا۔'' افسر گرج رہا تھا۔ یقیناً اس کا مخاطب سامنے کھڑا ہوا شخص تھا۔ جس کے کھڑے ہونے کے انداز میں سرکشی تھی۔ پستول اس کے سامنے تان کر اس نے کہا، ''بولو اب کیا چاہتے ہو، مختصر ترین بات؟''

''قرآن مجید ہاتھ میں لے کر مرنا چاہتا ہوں۔''

''سوری، ہمارے پاس نہیں ہے۔'' ٹھائیں —

شمس الرحمٰن نے بے اختیار اسے روکنے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ''میں انھیں جانتا ہوں، یہ بہت شریف لوگ ہیں۔'' شمس الرحمٰن نے گھگھیائی ہوئی آواز میں کہا۔ ایک دو تین گولیاں ثناء اللہ صاحب کے سینے میں لگیں اور وہ اوندھے منہ گرے۔ ''یہ مشہور شاعر نورُ الزماں کے سسر ہیں۔ نورُ الزماں — مشہور نظم ''کنول'' وہ کہتا رہا۔

''اور آپ کون ہیں؟'' افسر نے رُکھائی سے کہا۔

''میں — میں رونجھو کا بھائی ہوں، شمس الرحمٰن۔''

''اچھا!'' لہجہ یکا یک خوش گوار ہو گیا۔ بیٹھیے کیسے آنا ہوا؟

''آپ ان دونوں کو چھوڑ دیں — میں ضمانت دیتا ہوں، یہ شر پسند نہیں ہیں۔ سیدھے سادے شہری ہیں۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''ایک تو اب مر گیا ہوگا، بڈھا وکیل ہے یا کون ہے۔ چند دن پہلے تک گاڑی پر پاکستان کا جھنڈا لگا کر پھرتا تھا۔ ہمارے لڑکوں نے منع کیا تو کہتا ہے کہیں لکھا ہوا دکھاؤ کہ گاڑی پر پاکستان کا جھنڈا لگانا منع ہے — شالا موڑا (بہاریوں کے لیے تضحیک آمیز لفظ) آپ کے کہنے پر اسے چھوڑے دیتا

ہوں۔" اس نے کمال کی طرف اشارہ کیا، "اور آپ کیسے آئے۔"

ایک سپاہی کھینچتا ہوا کمال کو لے گیا اور دروازے سے باہر نکال کر چھوڑ دیا۔ کمال ایک درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ اب تو جب شمس الرحمٰن باہر نکلے گا تو اس کی پناہ ہی میں گھر جائے گا۔ ابّا سے کتنا کہا کرتا تھا، اتنی رسک نہ لیجیے مگر انھوں نے زندگی بھر کسی کی بات نہ سنی۔ اب اگر وہ لاکھ کہے کہ میری ہم دردیاں تم لوگوں کے ساتھ ہیں تو کون مانے گا؟

"میرے بہنوئی ابوظفر معراج الدین تین دن سے گھر نہیں آئے ہیں۔ ان کی طرف سے پریشانی ہے۔ اگر ان کی بابت کچھ معلوم ہو سکے۔"

"نام پتا لکھوانے کے بعد مایوس، نڈھال، خون سے چپکتے جوتے اور دل میں نور کے والد کا غم لیے شمس الرحمٰن باہر نکلا۔ نور نے چلتے وقت کہا تھا، "شمس میرے والدین اور بہن بھائیوں کا خیال رکھنا۔" اس کے دل میں سائیں سائیں ہونے لگی، درخت بھی تیز ہوا سے ہل رہے تھے۔ کمال مردے کی طرح درخت کی اوٹ سے نکلا۔ شمس الرحمٰن اس وقت اسے گلے سے نہیں لگا سکتا تھا۔ برف کی طرح سرد ہاتھ تھام کر اس نے کمال کو ابوظفر کی کار میں بٹھایا اور کار اسٹارٹ کی۔

دن اور نجات کی طرح تقدیر اور حالات کے ترازو کے پلڑے بھی اوپر نیچے ہوتے رہتے ہیں۔ منیر کے والد کے انتقال کے بعد اس کے تایا، تائی اور ان کا بیٹا افضل میر پور نمبر چھ سے اٹھ کر ان کے برابر کے گھر میں کرائے پر رہنے لگے تھے تاکہ منیر اور ماں کو تسلی رہے۔ ابھی اس واقعے کو ایک مہینہ بھی نہیں گزرا تھا — اسی ''چیترو'' کے مہینے میں حالات نے ایسا پلٹا کھایا کہ چھایا کو منیر کے ہاں پناہ لینی پڑی۔

ایک دن پاکستانی فوج کے چند سپاہی اور ایک نان کمیشنڈ افسر آئے۔ چھایا کے والد اور کاجل کو باہر ہی سے پوچھ گچھ کے لیے لے کر چلے گئے۔ چھایا کو پتا چلا تو وہ ڈرتی سہمتی منیر کے گھر میں داخل ہوئی۔ منیر کی ماں سے بات چیت کر رہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی اور وہ پھرتی سے کمرے میں پڑے ہوئے اونچے سے تخت کے نیچے چھپ گئی۔ منیر نے جلدی سے تخت پوش گرا دیا اور تخت پر چڑھ کر بیٹھ گیا۔ منیر کی امی پان بنانے اندر چلی گئیں تو افضل نے کہا، ''ارے بھائی تم جن کو چوکی کے نیچے سلاتے ہو ہم تو ان کو تخت کے اوپر سلانے کو تیار ہیں۔ ایسا نہ ہو تخت کے نیچے بے چارے لوگوں کا دم گھٹ جائے۔''

''بے شرم — اب بڑوں کا شرم لحاظ بھی ختم ہو گیا۔'' منیر کی ماں نے دوسرے کمرے میں پان میں چونے کی ڈلی ڈالتے ہوئے کہا۔

''دیکھو، آہستہ بولو — وہ ہماری پڑوسن ہے۔'' منیر نے کہا۔ منیر کی ماں جلدی سے باہر نکلیں اور انھوں نے کہا، ''افضل! وہ تمھاری بہن کے برابر ہے، خبردار جو اس کے بارے میں کوئی ایسی ویسی

بات سوچی۔''

''منیر کی پڑوس اور میری بہن۔'' افضل ہنسا۔''میں دشمنوں کی لڑکیوں کو بہن بنانے کا قائل نہیں ہوں۔ تعجب ہے چچی کہ چچا کے قاتلوں کو آپ پناہ دیتی ہیں۔''

''بکواس مت کرو۔ تمھیں کیا معلوم کہ یکم مارچ کے بعد انھوں نے ہماری کتنی مدد کی ہے۔''

''یہ مدد کرنے والے نہیں مخبری کرنے والے ہیں۔ ان ہی لوگوں کی شہ پر لوگ دس دس ہاتھ کے بانس لے کر آپ کو مارنے آئے تھے۔''

''اچھا اس وقت جاؤ، میرا دماغ نہ چاٹو۔''

''چلا جاتا ہوں، لیکن جب دوبارہ آؤں گا تو آپ دیکھیں گی کہ میرے ساتھ کون ہوگا۔''

وہ دندناتا ہوا باہر نکل گیا تو منیر نے اٹھ کر دروازہ بند کیا، چٹخنی لگائی اور تخت پر بیٹھ گیا۔ نزدیک کی کھڑکی سے بارش کی ہلکی سی پھوار اندر آئی تو یکایک اسے اپنے ابا کی زرد نعش پر پڑتی پھوار کا خیال آیا اور وہ سارے بدن سے کانپ گیا۔ چھایا تخت پوش ہٹا کر باہر نکلی اور منیر کی ماں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر بولی، ''چاچی! وہ ضرور کالے کپڑے والوں کو لے کر آئے گا۔ مجھے یہاں سے جانے دو۔''

''کالے کپڑے والے کون؟'' منیر نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم — پچھمی پاکستان سے آئے ہیں۔ بے حد لمبے چوڑے، بڑی بڑی مونچھوں والے ہیں — ہم لوگوں کو ہندو سمجھتے ہیں۔ کسی کو نماز پڑھتے دیکھ لیں یا گھر میں قرآن مجید دیکھ لیں تو حیران ہو جاتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ہمیں تو بتایا گیا ہے کہ وہاں کا فر فتنہ پھیلا رہے ہیں، ان کو جا کر مارو — پچھلے دنوں انھوں نے بہت سے گھروں میں بڑی گڑبڑ پھیلائی۔ سامان لوٹا، لڑکیوں کو لے گئے۔ سنا ہے وہ اتنے جاہل ہیں کہ انھیں یہ بھی نہیں معلوم کہ رابندر ناتھ ٹھاکر کی تصویر کون سی ہے اور کبی اقبال کی تصویر کون سی ہے؟ داڑھی دیکھ کر وہ رابی ٹھاکر کی تصویر کو چھوڑ دیتے ہیں اور اپنے کبی کی تصویر کو پھاڑ کر پھینک دیتے ہیں — سب لوگ ان سے ڈرتے ہیں۔ مجھے بھی ان سے بڑا ڈر لگتا ہے۔''

''سب جھوٹ ہے۔ افواہیں ہیں۔'' منیر نے کہا۔

''اچھا یہاں سے نکل کر کہاں جائے گی تو؟'' منیر کی ماں نے پوچھا۔

''کہیں بھی، کوئی اور پناہ ڈھونڈ لوں گی۔''

منیر نے اسے زخمی نگاہوں سے دیکھا۔ منیر کی ماں نے کہا، ''نہیں نہیں۔ ایسے کیسے میں جوان بچی کو گھر سے نکال دوں۔ تم یہیں رہو۔ منیر کے تایا آئیں گے تو ضرور کوئی نہ کوئی بندوبست کر دیں گے اور افضل کا مزاج بھی درست کر دیں گے۔''

"تایا جی گئے کہاں ہیں؟"

"تمھارے والد اور کاجل کا پتا لگانے گئے ہیں۔"

"وہ میرے ابا کو ماریں گے تو نہیں؟" چھایا نے پوچھا۔

"کیوں ماریں گے خواہ مخواہ — ہم انھیں بتائیں گے کہ تم لوگوں نے کتنے دن ہمارے منیر کو پناہ دی ہے۔"

"چھایا — تم اوپر والی کوٹھری میں چلی جاؤ نا، وہ محفوظ ہے۔" منیر نے کہا۔

"نہیں، وہاں اکیلے میں مجھے ڈر لگے گا، میں یہیں ٹھیک ہوں۔" چھایا دوبارہ تخت کے نیچے دبک گئی۔ منیر نے ایک چادر اور تکیہ اسے دیا اور سارا دن گھر سے باہر نہ نکلا۔

شام کو منیر کے تایا آئے تو انھوں نے کہا کہ چھایا کے والد اور کاجل کو پوچھ گچھ کے بعد جلد چھوڑ دیں گے لیکن جب تک چھایا کو کسی محفوظ جگہ رکھنا ضروری ہے۔ ان کا گھر اس لیے محفوظ نہیں ہے کہ محلے والے اسے یہاں آتا دیکھ چکے ہیں۔ بہت سوچ بچار کے بعد طے ہوا کہ چھایا کو اس کے اپنے مکان کے اسی اسٹور میں رکھا جائے جہاں منیر رہا کرتا تھا اور باہر سے اسی طرح تالا ڈال دیا جائے جیسے پہلے پڑا رہتا تھا۔ کسی کو شبہ بھی نہیں ہوگا کیوں کہ سب کو معلوم ہے کہ آج کل اس گھر میں کوئی نہیں ہے۔ چھایا نے تنہائی کے خیال سے تھوڑی سی حیل و حجت کی مگر اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ طے ہوا کہ دوپہر کا کھانا منیر اور رات کا کھانا منیر کی ماں پہنچایا کریں گی۔ کسی وقت کھانا نہ بھیجا جا سکے تو اس کے لیے اسٹور میں موڑھی (چاول کے بنے ہوئے مُرمُرے)، چوڑا، گڑ وغیرہ اور پانی کا ایک مٹکا بھر کر رکھ دیا گیا۔

اسٹور میں صرف ایک روشن دان تھا جو پچھلے ادھ بنے زینے کی طرف کھلتا تھا، اس کو بھی نصف بند کر دیا گیا تا کہ کوئی باہر سے جھانک کر کسی کی موجودگی کا احساس نہ کر سکے۔ اسٹور کے آگے چارپائی کھڑی کر کے پرانی لنگیاں، گنجیاں ڈال دی گئیں۔ زنگ آلود ٹین، پرانے گھڑے اور گھر کی مختلف چیزیں اس طرح رکھ دی گئیں کہ کوئی غیر گھس آئے تو اسے یہ اندازہ نہ ہو کہ اس چارپائی یا ان چیزوں کے پیچھے کوئی دروازہ بھی ہے۔

اندر جاتے جاتے چھایا باورچی خانے سے چھری اور سبزی بنانے کی کرات بھی ساتھ لیتی گئی کہ وہ اسٹور میں پڑے ہوئے تکیوں کو 'ڈمی' بنا کر ان سے لڑنے کی مشق کرے گی۔

چھایا کی منتقلی کے دوسرے دن علی الصبح افضل کی چھوٹی بہن اندر آئی۔ کونے بچالوں اور دروازوں کے پیچھے جھانکتے ہوئے یکایک اس نے تخت پوش اٹھایا اور تخت کے نیچے جھانکنے لگی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' منیر کی ماں نے قدرے غصّے سے کہا۔

''میری بلی یہاں آ گئی تھی، شاید تخت کے نیچے چلی گئی ہو۔'' اس نے کہا۔

''یہاں کوئی بلی نہیں ہے سنا تم نے۔'' منیر کی ماں نے کہا، ''جس کسی نے تمھیں بلی کی تلاش میں بھیجا ہے، اس سے کہنا کہ ہم نے بلی کو بورے میں ڈال کر کسی دوسرے شہر بھیج دیا ہے—''

''چادر اور تکیہ اوپر رکھ دوں؟'' بچی نے کہا۔ ''اور یہ پلیٹ بھی۔''

''ہاں۔''

لڑکی نے چادر اور تکیہ تخت پر رکھے۔ اسٹین لیس اسٹیل کی کٹاؤ دار پلیٹ، جس میں رات کو چھایا نے بھات کھایا تھا، باورچی خانے میں رکھی اور واپس اپنے گھر چلی گئی۔

چھایا کی آنکھ کھلی تو اسے پتا نہ چلا کہ وہ کہاں ہے؟ وہ جہاں کہیں بھی تھی، شدید اندھیرا تھا۔ کنویں جیسے اندھیرے میں وہ ہلکے پر کی طرح گول گول گھومتی تہ میں اترتی جارہی تھی۔ جس کنویں کی تہ میں وہ گری وہاں پانی نہیں، خون تھا۔ وہ دوبارہ بے ہوش ہوگئی۔

پھر ہوش آیا تو اس نے کسی کی سسکیوں کی آواز سنی۔ کوئی آہستہ آہستہ رو رہا تھا اور کہہ رہا تھا، ''چھایا! امی تما کے بھالو باشی — امی تُما کے بھالو باشی —'' یہ آواز اک درندے کی نہیں تھی، یہ تو منیر کی سی آوز تھی۔ وہ کہاں ہے! — اللہ یہ آواز کہاں سے آرہی ہے! — کیا وہ قبر میں ہے! — یہ تاریکی قبر کی ہے اور منیر قبر کے باہر بیٹھا گریہ کرر ہا ہے — یا یہ آواز اس کے ذہن سے آرہی ہے۔ انسان کتنا پاگل ہے — مرنے کے بعد بھی خواب دیکھنے سے باز نہیں آتا۔

دھیرے دھیرے اندھیرے سے مانوس ہوتی ہوئی آنکھوں سے اس نے دیکھا کہ وہ ابھی تک اپنے گھر کے اسٹور میں ہے اور کوئی شخص دوزانو اس کے پاس بیٹھا ہے۔ یہ کم بخت اب تک مرا نہیں ہے۔ چھایا کا جی چاہا اٹھ کر اس کا گلا دبوچ لے۔ مگر اس میں اتنی طاقت نہیں تھی۔ اپنے جسم و جان کی پوری طاقت کو وہ کام میں لاکر اردو میں چلائی۔ ''تم دفعان نہیں ہو گے یہاں سے، مردود — پاپی!!''

''میں منیر ہوں چھایا! افضل ہم دونوں کو باہر سے بند کر کے چلا گیا ہے۔''

''افوہ! کتنی گھٹن ہے — کیا یہاں تازہ ہوا آنے کا کوئی راستہ نہیں ہے؟''

''ٹھہرو، میں کوشش کرتا ہوں روشن دان کھولنے کی۔ لالٹین کا تیل بھی ختم ہوگیا ہے۔''

اس نے دیوار پر ہاتھ مار کر بتی جلانے کی کوشش کی۔ پھر اسے یاد آیا کہ تایا نے گھر کا مین سوئچ بند کروادیا تھا۔ اندھیرے میں منیر نے اسٹور میں پڑے ہوئے بکس روشن دان کی طرف کھسکائے۔ ان پر پرانے بستر ڈالے اور لوہے کی جالی میں سے ہاتھ ڈال کر پٹ کھولنے کی کوشش کرنے لگا۔

پہلے ایک پتھر گرا، پھر آہستہ آہستہ سارے پتھر اور اینٹوں کے ٹکڑے گر گئے۔ پٹ کھلا تو گلی کے کھمبے سے روشنی کی ایک کرن کہکشاں کی طرح اندر داخل ہوئی۔ بکس سے کود کر منیر دوبارہ چھایا پر جھکا اور اسے آوازیں دینے لگا، چھایا! — چھایا — ٹوٹی شاخ اب پوری طرح مرجھا چکی تھی۔

پچھلے تین دن کے واقعات دھنکی ہوئی روئی کی طرح اس کے ذہن میں گردش کر رہے تھے۔

تین دن خیریت سے گزر گئے تھے مگر چھایا کے والد اور بھائی ابھی تک نہ لوٹے تھے۔ چھایا کا ضبط قابلِ تعریف تھا مگر محسوس ہوتا تھا جیسے یہ ذہنی دباؤ وہ زیادہ برداشت نہ کر سکے گی۔ وہ ٹوٹی ہوئی شاخ کی طرح سوکھتی چلی جارہی تھی۔ منیر اسے دیکھتا تو تڑپ کر سوچتا کیا کوئی ایسی صورت نہیں ہے کہ وہ اس کے لیے کچھ کر سکے۔

رات کو تائی منیر کی ماں کے پاس بیٹھی دیر تک باتیں کرتی رہیں۔ منیر پل پل گنتا رہا۔ چھایا تنہا اور بھوکی ہوگی۔ شام کا کتنی بے چینی سے انتظار کرتی ہوگی، پھر اندھیرا ہونے کا تاکہ کچھ دیر کے لیے باہر کی ہوا میں سانس لے سکے۔ بلاناغہ وہ رات کو ماں کے ساتھ چھایا کے پاس آتا تھا۔ جب خاصی رات ہوگئی تو منیر کی ماں جیٹھانی کے پاس سے اٹھ کر آئیں اور منیر سے چپکے سے کہا کہ آج وہ ہی چھایا کو کھانا دے آئے۔ منیر نے جلدی جلدی کھانا نکالا۔ تھوڑے سے پھل بھی لیے۔ گلی میں دائیں بائیں دیکھا اور تالا کھول کر چھایا کے گھر میں داخل ہوا۔ اسے معلوم تھا کہ اس کے سوا اس گھر میں کوئی نہیں ہے، پھر بھی آج سناٹا عجیب طرح سے ڈراتا ہوا آ کر اس سے لپٹ گیا۔ صحن میں کچھ بے ترتیبی تھی شاید کوئی دیوار پھاند کر آیا تھا۔ گلاب کے جس گملے میں وہ اسٹور کی چابی دبا کر رکھتا تھا وہ ٹوٹا ہوا ایک طرف کو اوندھا پڑا تھا۔ جان بوجھ کر بے ترتیبی سے رکھی ہوئی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔

منیر کا دل بیٹھنے لگا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ وہ اسٹور کی طرف بڑھا۔ دروازہ آدھا کھلا ہوا تھا۔ جلدی سے وہ اندر داخل ہوا۔

گھر میں کسی کے رہنے کا احساس نہ ہو اس لیے چھایا رات کو لالٹین دھیمی جلا کر رکھتی تھی، اس وقت بھی کونے میں دھری لالٹین دھیمے دھیمے جل رہی تھی۔ منیر نے لو اونچی کی۔ زمین پر چھایا پڑی نظر آئی۔ وہ چھایا تھی یا اس کی نعش — وہ درندہ جس کا نام افضل تھا، کوٹھری میں موجود تھا، شاید اسے اپنی فتح کی خوش خبری سنانے کے لیے بیٹھا تھا — نہیں وہ بری طرح زخمی تھا۔ چھایا نے باورچی خانے

سے جو درانتی لاکر رکھی تھی وہ اپنا کام کر گئی تھی۔ منیر دوزانو زمین پر بیٹھ گیا اور جھک کر غور سے چھایا کو دیکھنے لگا۔ اسے اندازہ نہ ہوا کہ وہ مر چکی ہے یا زندہ ہے—ٹوٹی شاخ پورے طور پر کملا چکی ہے یا ابھی زندگی کی کوئی رمق باقی ہے۔ اس کا ذہن ماؤف تھا۔ نہ اس نے کسی ڈاکٹر کی مدد لینے کی بات سوچی—نہ اس نے ماں کے پاس جانے کا ارادہ کیا—نہ وہ رویا نہ ہنسا—وہ اسی طرح بیٹھے کا بیٹھا رہ گیا۔ اسے ذرا بھی پتا نہ چلا کہ کب افضل نے آنکھ کھولی، حالات کا جائزہ لیا، کب گھسٹتا ہوا وہ کمرے سے باہر نکلا۔ وہ دروازہ بند ہونے کی آواز سے چونکا تو افضل باہر سے تالا ڈال چکا تھا۔ اسی زخمی حالت میں اس نے چارپائی کھڑی کی۔ باہر کے زینے پر چڑھ کر چھوٹا سا روشن دان بند کر کے اس کے آگے پتھر اور اینٹیں لگائیں اور چپ چاپ گلی کے اندھیرے میں غائب ہو گیا۔

رات کو جب منیر کے تایا اسے ڈھونڈتے پھر رہے تھے تب—"مجھے نکالو، مجھے نکالو" کی ڈوبتی ہوئی آواز سن کر وہ اپنے پڑوسی کے گھر میں داخل ہوئے۔ اسٹور کے باہر تالا لگا ہوا تھا لیکن آواز یہیں سے آ رہی تھی۔ تالا توڑ کر اسے باہر نکالا گیا تو وہ اور بھی زور زور سے چلانے لگا۔ "مجھے نکالو، خدا کے لیے مجھے باہر نکالو—یہاں بہت گھٹن ہے۔ میرا دم گھٹ جائے گا۔"

ڈاکٹر نے منیر کو دیکھا اور نیند کا انجکشن دے دیا وہ اور بھی گہرے گڑھے میں اترنے لگا۔ گرتے گرتے اسے لگا جیسے اس تاریک کنویں سے جسے جسم کہتے ہیں، وہ اب کبھی نہ نکل سکے گا۔ پھر بھی وہ مدد کے لیے پکارتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کی زبان بھاری ہو گئی۔ الفاظ منھ ہی منھ میں گول ہو کر رہ گئے اور وہ گہری نیند میں ڈوب گیا۔

نور اور نرگس کے جانے کے بعد ثناء اللہ صاحب نے اپنے کنبے کو چٹا گانگ بلا لیا تھا۔ جہاں انھوں نے ایک کمپنی میں کام کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا قیام جمال خاں روڈ پر تھا۔ محلے میں بنگالی بھی تھے بہاری بھی۔ ثناء اللہ صاحب کا بھی بہت سے لوگوں کی طرح یہی خیال تھا کہ وہ کسی گڑبڑ میں حصہ نہیں لیں گے اور اپنے کام سے کام رکھیں گے تو ان کی ذات اور عزیزوں کو کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔

''سوات'' جہاز اسلحہ سے بھرا چٹا گانگ کی بندرگاہ پر کھڑا تھا۔ بنگالی مزدوروں نے اس کا بوجھ ہلکا کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ فوج نے اس کام کے لیے رضا کار مانگے تھے۔ ہوتے ہوتے پیغام ثناء اللہ صاحب تک بھی پہنچا تھا۔ وہ پکے پاکستانی تھے لیکن کوئی کام ایسا نہ کرنا چاہتے تھے جو ان کے بچوں کے لیے خطرے کا باعث ہو، اس لیے ایک رات انھوں نے لڑکوں کے کمرے میں باہر سے تالا ڈال دیا تھا۔ اور پھر اپنے گھر میں باہر سے قفل لگا کر پچھلی گلی سے اندر آن کر دروازہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ وہ محلے والوں کو یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ وہ گھر بند کر کے کہیں چلے گئے ہیں۔ ان کا بنگالی نوکر بھی کئی دن پہلے جا چکا تھا۔

دوپہر کا وقت تھا کہ دروازے پر زور زور سے دستک دی جانے لگی۔ ثناء اللہ صاحب نے جھانک کر دیکھا۔ باہر ایک ٹرک کھڑا تھا۔ محلے کے چند لوگ اس کے پاس کھڑے تھے۔ بیوی روکتی رہ گئیں مگر وہ پچھلی گلی سے نکل کر باہر چلے گئے۔

''ٹرک سے سامان اتار کر پچھلی گلی میں لے جانا ہے۔ گلی تنگ ہے وہاں ٹرک نہیں جا سکتا اس

لیے کریٹ آپ کے گھر میں سے گزار کر گلی میں لے جائیں گے۔'' ایک تیز طرار لڑکے نے کہا۔ ایک ہی نظر میں انھوں نے بھانپ لیا تھا کہ ٹرک میں اسلحہ تھا۔

''لے جایئے۔'' انھوں نے ایک لحہ توقف کے بعد کہا۔

''جمال اور کمال کہاں ہیں، ان سے کہیے کہ وہ سامان اتروانے میں ہماری مدد کریں۔'' دوسرے لڑکے نے کہا۔ ''میں خود پریشان ہوں۔ کئی دن سے دونوں لڑکے غائب ہیں، لڑکیاں اپنی پھوپھی کے گھر گئی ہوئی ہیں۔'' انھوں نے کہا۔ ان کی ہدایت پر بیوی دونوں بچیوں کو لے کر ایک کوٹھری میں چھپ گئی تھیں۔

ثناء اللہ صاحب برآمدے میں چپ چاپ کھڑے رہے۔ نوجوانوں نے کریٹ ان کے صحن سے گلی میں نکال کر پچھلی گلی کے ایک خالی مکان میں رکھے۔ جب ٹرک خالی ہوگیا تو اس مکان میں تالا لگا کر اور ثناء اللہ صاحب کا شکریہ ادا کر کے وہ واپس چلے گئے۔

''اب یہاں رہنا خطرے سے خالی نہیں۔'' ثناء اللہ صاحب نے کہا۔ ''وہ صرف یہ دیکھنے کے لیے آئے تھے کہ یہاں کون کون ہے۔''

گھر کا جو آدمی جمال اور کمال کے پاس جاتا چیخ شروع ہو جاتی ـــــ ''آخر ہمیں کیوں عورتوں کی طرح بند کر رکھا ہے؟ عجیب بات ہے، بیٹیاں آزاد ہیں، بیٹے بند ہیں۔''

''لڑکیاں سارے زمانے میں بھاگتی نہیں پھرتیں، ہماری نگاہوں کے سامنے رہتی ہیں۔ تم لوگ موقعے کی نزاکت کو سمجھ نہیں رہے ہو۔'' بیگم ثناء اللہ کہتیں۔

''آپ موقعے کی نزاکت کو دیکھ رہی ہیں، حالات کا تقاضا یہ ہے کہ ہم پاکستان کو بچانے کے لیے جو کچھ کر سکتے ہیں کریں، ورنہ کل لوگوں کو کیا منھ دکھائیں گے۔'' جمال کہتا۔

''پاکستان کو تم بچا چکے ـــــ اپنی خیر مناؤ ـــــ جس صوبے کا کھاتے ہو اس کو بچانے کی فکر کرو ورنہ یہاں کے لوگ تمھیں کبھی معاف نہیں کریں گے ـــــ'' ''امی! ابو سے کہیں وہ رائفل حفاظت سے رکھیں۔''

''کون سی رائفل؟''

''انھوں نے دی تھی کہ کسی وقت بھی فوج کا حملہ ہو سکتا ہے۔ گھروں کی حفاظت کے لیے پورے محلے میں اسلحہ تقسیم کیا تھا۔''

''تمھیں کیا ضرورت تھی لینے کی؟''

''نہ لیتا تو اسی وقت نام دشمنوں کی لسٹ میں لکھوا لیتا۔ ابو پر تو وہ ویسے ہی شک کرتے رہتے ہیں۔''

''کس بات کا شک؟'' بیگم ثناء اللہ غصے سے بولیں۔

''پاکستانی ہونے کا شک۔'' جمال نے تمسخر سے کہا۔ ''پاکستانی ہونا بہت بڑا جرم ہو گیا ہے۔''

''تم چپ رہو۔''

''امی یہ بحث کا وقت نہیں ہے۔''

''ہمیں ان کا ساتھ دینا ہے جن کے ساتھ ہم رہتے ہیں۔''

''یہ ناممکن ہے — یہ غداری ہے۔'' جمال گرجا۔

''یہ غداری نہیں، غداری وہ ہے جو تم کر رہے ہو۔''

''اچھا بس چپ رہو — زیادہ بحث مت کرو۔'' بیگم ثناء اللہ دروازہ بند کر کے چلی جاتیں اور وہ دونوں اسی طرح غراتے رہ جاتے جیسے شیر اور ہاتھی کو ایک ہی پنجرے میں بند کر دیا گیا ہو۔

جس دن سے کمال کے پاس رائفل دیکھی تھی ثناء اللہ صاحب بڑے شش و پنج میں تھے۔ رائفل تو انھوں نے اس سے لے لی تھی مگر ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا کیا کریں۔ اسے فوج کے حوالے کر دیں، گھر ہی میں رکھیں یا کسی اور کو دے دیں۔ آخر ایک دن اندھیرا ہوتے ہی ثناء اللہ صاحب رائفل اور کارتوس کا ڈبا اٹھا کر اپنے عیسائی پڑوسی مسٹر مائیکل کے گھر چلے گئے۔

''یہ آپ اپنے گھر رکھ لیجیے۔ میں کوئی ایسی چیز اپنے گھر میں نہیں رکھنا چاہتا جو شبے کا باعث ہو۔''

''میرا خیال ہے آپ کی حفاظت کے لیے گھر میں ہتھیار کا ہونا ضروری ہے۔'' مسٹر مائیکل نے کہا۔

''بغیر لائسنس کے ہتھیار رکھنا خطرے سے خالی نہیں۔ اسی لیے آپ کے پاس لایا ہوں۔ آپ کے ہاں تلاشی کا خطرہ نہیں ہے، اگر آپ نہ رکھنا چاہیں تو واپس لیے جاتا ہوں۔''

''یہ بات نہیں ہے ثناء اللہ صاحب، میں تو آپ کے گھر والوں کی حفاظت کے خیال سے کہہ رہا تھا۔''

''میرے پاس ایک چھوٹی سی پستول ہے۔ وقت پڑنے پر اپنی بیوی اور بچوں کو مارنے کے لیے کافی ہے۔''

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟''

''حالات آپ کے سامنے ہیں۔''

''آپ اپنے بیوی بچوں کو ہمارے گھر بھجوا دیجیے۔ ہمارا گھر محفوظ ہے۔ کسی نوکر کا آنا جانا بھی نہیں ہے۔''

''شکریہ مسٹر مائیکل۔ میں آپ کا احسان کبھی نہیں بھولوں گا۔ ایسے وقت میں کسی کی مدد کرنا آسان نہیں ہے۔''

''آخر ہماری بھی تو کوئی ڈیوٹی ہے پڑوسی کی حیثیت سے۔'' مسٹر مائیکل نے کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ دونوں بیٹوں کو بھی آپ کے گھر منتقل کردوں۔ آپ فکر نہ کریں میں انھیں مقفل رکھوں گا۔''

آدھی رات کے بعد ثناء اللہ صاحب نے لڑکے لڑکیوں کو مسٹر مائیکل کے گھر منتقل کر دیا۔ جمال اور کمال کو ہزار احتجاج کے باوجود پھر بند کر دیا گیا۔ ثناء اللہ صاحب اپنی بیگم کو لے کر گھر واپس آ گئے۔

علی الصبح بیگم ثناء اللہ سب کے لیے کھچڑی پکا رہی تھیں اور ثناء اللہ صاحب کوئی پرانا رسالہ دیکھ رہے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ثناء اللہ صاحب نے اندر ہی سے پوچھا۔ ''کون ہے؟''

بیگم ثناء اللہ سینے پر ہاتھ رکھ کر چپ چاپ برآمدے میں جا کر کھڑی ہوگئیں۔ ثناء اللہ صاحب نے دروازے کی درز میں سے جھانک کر دیکھا اور بادلِ ناخواستہ دروازہ کھول دیا۔ محلے کے چند لڑکوں کے ساتھ اجنبی لوگوں کا ایک گروہ تھا۔

''ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ کے لڑکے فوج سے ملے ہوئے ہیں۔ ان کے پاس ہتھیار بھی ہیں ——''

''جی نہیں، آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔'' ثناء اللہ صاحب نے کہا۔ ''آپ محلے والوں سے پوچھ لیجیے۔''

''ہم تلاشی لینا چاہتے ہیں۔'' ان کے تیور بگڑے ہوئے تھے۔

''لے لیجیے، مگر اتنے آدمی نہیں۔ دو حضرات اندر آ سکتے ہیں۔''

اس دوران بیگم ثناء اللہ ایک غسل خانے میں بند ہو چکی تھیں۔

ثناء اللہ صاحب کے لہجے کی قطعیت نے ان لوگوں کو مرعوب کیا۔ کچھ دیر تذبذب میں کھڑے رہے۔ پھر دو آدمی آگے بڑھے، باقی باہر کھڑے رہے۔

''آپ کے بیٹوں کا کمرہ کون سا ہے اور وہ خود کہاں ہیں؟'' ایک نے پوچھا۔

''کل جب ٹرک سے اسلحہ اتار کر ہمارے گھر سے گزار کر لے جایا گیا تھا اس وقت بھی انھیں بہت تلاش کیا گیا لیکن ان کا پتا نہیں چلا۔ ہو سکتا ہے وہ آگرآباد اپنی پھوپھی کے پاس چلے گئے ہوں۔ دونوں لڑکیاں بھی وہیں گئی ہوئی ہیں۔ میری بہن کی شادی پتھر گھاٹا والوں میں ہوئی ہے۔''

اس تفصیل کے باوجود آنے والوں نے لڑکوں کے کمرے کی تلاشی لی۔ دوسرے کمروں میں جھانک کر دیکھا اور واپس چلے گئے۔

''کیا یہ رائفل اس لیے دی گئی تھی کہ بعد میں انھیں پکڑا سکیں؟'' بیگم ثناء اللہ کانپتی ہوئی بولیں۔

''خدا معلوم —— میری تو عقل کام نہیں کرتی۔ یہ وہی محلے والے ہیں جو میری اتنی عزت کرتے تھے، اب ایسی آنکھیں پھیری ہیں کہ بات تک نہیں کرتے۔ کل رات میں حاجی شمس الدین کے پاس

گیا — گھنٹوں میرے ساتھ شطرنج کھیلتے تھے، کل ایک بات کرتے ہوئے پہلو بدل رہے تھے۔ بولے، میں آپ کو رائے دوں گا کہ کسی اور محلے میں چلے جایئے۔ میں نے کہا، کیوں — پاکستان کے حامیوں میں سے تو آپ بھی ہیں۔ کہنے لگے۔ بھائی ہمیشہ آپ کی منطق نہیں چل سکتی۔'' یہ کہہ کر دروازہ بند کرلیا۔

''تو پھر معراج اور شوشی کے گھر چلے چلتے ہیں۔''

''تم جہاں جانا چاہو، جاؤ۔ میں تو یہیں رہوں گا۔''

''میں کمال کو بھیج کر معراج سے کہلواتی ہوں کہ وہ آ کر ہمیں لے جائے۔'' بیگم ثناء اللہ نے کہا۔

''کمال کا بھروسا نہیں۔ وہ بند کمرے سے نکلے گا تو سب سے پہلے اپنے دوستوں میں پہنچے گا۔''

''تو آپ اس کے ساتھ چلے جایئے۔'' بیگم ثناء اللہ نے کہا۔

دوسرے دن ثناء اللہ صاحب اور کمال اور معراج اور شائستہ کے گھر جانے کے لیے نکلے تو لوٹ کر نہیں آئے۔ بیگم ثناء اللہ کی نظریں دروازے پر لگی ہوئی تھیں۔ نہ جانے کتنے لوگوں کی نگاہیں دروازوں پر اور کان اپنے پیاروں کے قدموں کی آہٹ پر لگے ہوئے تھے۔

رات کا وقت تھا۔ شمس الرحمٰن گھر میں ایک عورت اور ایک چھوٹی سی بچی کو لے کر داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر زری کی جان میں جان آئی۔ زری سے اس نے صرف اتنا کہا، یہ اس کے دوست کی بیوی اور بچی ہے اور چند دن یہاں رہے گی۔ مولانا سے رات گئے تک مشورہ ہوتا رہا۔ کوئی فون آتا تو شمس الرحمٰن خود اٹھاتا۔ غسل خانے جانے لگا تو اس نے زری سے کہا، ''فون پر یا باہر آ کر کوئی ابوظفر معراج کے بارے میں پوچھے تو یہ کہہ دینا کہ وہ یہاں نہیں ہے اور تم اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتیں۔''

''ظاہر ہے کہ میں یہی کہوں گی — میں نے تو آج ہی یہ نام سنا ہے۔''

''اس کی بیوی بچوں کے بارے میں بھی یہی کہنا۔''

''اچھا، یہ شوشی ہے؟'' زری نے پوچھا اور شمس الرحمٰن اس کا منہ تکنے لگا۔

''ہاں یہ شوشی ہے۔'' شمس الرحمٰن قدرے شرمندہ ہوا۔ ''اس کا شوہر ابھی تک بھارتی شہری ہے اور آج کل سخت پریشان ہے کئی دفعہ لوگ اسے پوچھنے آ چکے ہیں۔ اس لیے وہ خود کہیں چھپ گیا ہے، اس کی بیوی بچی کو میں لے آیا ہوں۔ وہ موقع پا کر کسی وقت یہاں آئے گا، اور یہ سب کسی نہ کسی صورت سرحد پار کریں گے۔ مشکل یہ ہے کہ ان کا بیٹا شوشی کی بہن کے پاس پٹنہ میں ہے اور شوشی اسے لیے بغیر جانے کو تیار نہیں۔ اس لیے پہلے یہ لوگ وہاں جائیں گے پھر آگے بڑھ جائیں گے۔''

''کیا اس سے بہتر نہ ہوتا کہ وہ چٹا گانگ یا ڈھاکا میں کسی جگہ چھپ جاتے۔'' زری نے کہا۔

''ہاں، بھاگنے میں زیادہ خطرہ ہے مگر وہ ڈرپوک آدمی ہے۔ وہ کہتا ہے جب تک میں سرحد پار نہ

کرلوں مجھے چین نہیں آئے گا۔ اگر اسی طرح لوگ مجھے پوچھتے رہے تو میرا ہارٹ فیل ہوجائے گا۔"

زری کی ملازمہ اپنے والدین کے ساتھ گاؤں چلی گئی تھی۔ شوشی کھانا پکانے اور رکھنے میں زری کی مدد کرتی رہی، وہ کبھی اردو اور کبھی بنگلہ میں آپس میں باتیں کررہی تھیں۔ شمس الرحمٰن نے ان دونوں پر نظر ڈالی۔ زری سرو کا درخت تھی، جما ہوا، متوازن اور مضبوط — شوشی گلاب کی لمبی جھولتی ٹہنی تھی، جس پر پودنی بھی بیٹھے تو جھونک کھا کر اڑ جائے۔ وہ اپنے گھر کی طرح یہاں بھی ننگے پاؤں پھر رہی تھی۔ باورچی خانے سے کھانے کے کمرے تک آتی جاتی تو یوں لگتا جیسے ہوا کا جھونکا اِدھر سے اُدھر نکل گیا ہو۔

دوسرے دن شمس الرحمٰن کیپٹن خالد کے پاس جا پہنچا۔ "خالد! تم میرے دوست ہو۔ اگر تم مجھے زندگی میں ہنستا کھیلتا اور خوش دیکھنا چاہتے ہو تو اِس شخص کو ڈھونڈ کر نکالو۔" شمس الرحمٰن نے پرچا اس کی طرف بڑھایا جس پر معراج کا پورا نام اور پتا لکھا ہوا تھا۔ "یہ بہت ضروری ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ اس کا نام فوج کی فہرست میں صرف اس لیے ہے کہ یہ شخص ابھی تک بھارت کا باشندہ ہے۔ مگر میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ یہ شرپسند نہیں ہے — میں اس کی ضمانت لیتا ہوں کہ تم کبھی اس کو اپنے خلاف کچھ کرتا نہ پاؤ گے — اور اگر کبھی اس نے کچھ کیا تو تم اس کے بدلے مجھے گرفتار کرسکتے ہو۔"

"ٹھیک ہے — اتنے جذباتی کیوں ہورہے ہو، میں کوشش کرتا ہوں۔"

"کوشش نہیں۔ وہ جہاں کہیں ہو تمھیں اس شخص کو نکلوانا ہے۔ چٹاگانگ میں بھی تمھارا رابطہ ضرور ہوگا — میں جانتا ہوں تمھارے لیے یہ کام مشکل نہیں ہے۔"

"اچھا!"

"اچھا نہیں، وعدہ کرو — سپاہی کا وعدہ۔"

"چلو سپاہی کا وعدہ — اگر یہ شخص زندہ ہے اور تمھارے کہنے کے مطابق معصوم ہے تو آجائے گا۔"

"تم جن لوگوں کو پکڑتے ہو ان کے ساتھ سلوک کیا کرتے ہو؟" شمس الرحمٰن نے پوچھا۔

"ہم ان کا بیان لیتے ہیں۔ پھر تحقیق کرتے ہیں — نام کے آگے تین کالم ہوتے ہیں۔ سیاہ، سرمئی اور سفید۔ سفید ثابت ہونے پر لوگوں کو اسی وقت چھوڑ دیا جاتا ہے۔ سرمئی لوگوں کی نگرانی کی جاتی ہے اور سیاہ لوگوں کو جیل میں رکھا جاتا ہے۔"

"جیل میں رکھا جاتا ہے یا ندی کنارے کھڑا کرکے بنگلہ دیش پہنچا دیا جاتا ہے۔"

"ہاں شاید، دیہاتوں میں ایسا ہوتا ہے لیکن بڑے شہروں میں جب تک کہ جرم بہت سنگین نہ ہو انھیں جیلوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔"

''میرا اس وقت یہ منصب نہیں ہے لیکن دوست کی حیثیت سے کہہ رہا ہوں کہ اتنے بڑے پیمانے پر پکڑ دھکڑ اور گاؤں دیہات صاف کرنے کی مہم نقصان کرے گی۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

دو دن بعد شمس الرحمٰن کو اطلاع ملی کہ معراج سنار گاؤں کی ایک جھونپڑی میں کل شام موجود ہوگا۔ ایک شخص دوپہر کے گیارہ بجے سے دو بجے تک بس اسٹینڈ پر ہوگا جو شوشی اور اس کی بیٹی کی وہاں تک راہنمائی کرے گا اور وہ بنگالی ہوگا۔ اس کے باوجود شمس الرحمٰن نے مولانا کو ساتھ بھیجنے کا فیصلہ کیا۔ ''مولانا مجھے آپ پر جتنا اعتماد ہے کسی اور پر نہیں ہے، معراج اور شوشی جو بھی فیصلہ کریں۔ جہاں تک جانا چاہیں آپ انھیں چھوڑ آئیں۔ آپ کا سارا خرچ میرے ذمے ہوگا۔ یہ میری خواہش اور خوشی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ زندگی کے بارے میں آپ کا رویہ آپ کی حفاظت کرے گا۔ آپ مولانا — صوفی صافی آدمی ہیں — عربی، فارسی، اردو، انگریزی اور بنگلہ ساری زبانیں جانتے ہیں۔ آپ اپنی حفاظت بھی کرسکیں گے اور ان کی بھی — میں آپ کی واپسی کا انتظار کروں گا۔''

چلتے وقت شوشی کا سر دروازے سے ٹکرایا تو شمس الرحمٰن کے دل کی دیوار سے بچپن کا ایک خوف جھانکا۔ ماں کہتی تھی، سفر کے لیے نکلتے وقت دروازے سے سر ٹکرانا اچھا شگون نہیں ہے۔ ''یہ سب غیر مسلموں کے توہمات ہیں۔'' اس کے ابا کہا کرتے تھے، ''دروازے کے آگے دھرا گھڑا ٹوٹ جائے، عورت کے سر سے سیندور جھڑ جائے یا کنگن کھل جائے یا شنکرا ٹوٹ جائے تو برا شگون ہے۔ ہم مسلمان ایسی باتوں کو نہیں مانتے۔''

''کیوں نہیں مانتے ابا؟'' وہ ضد کرتا۔

''مسلمان توہمات کے بت توڑنے آیا ہے، بنانے نہیں۔ تمھاری ماں کبھی چولھے کے گرد سات چکر کاٹ کر اگنی دیوتا کے آگے پرارتھنا شروع کردے تو گھبرانا مت، اس سے کوئی بعید نہیں ہے — ضعیف الاعتقاد عورت۔''

محبتیں انسان کو ضعیف الاعتقاد بنا دیتی ہیں۔ شاید آج زندگی میں پہلی مرتبہ شمس الرحمٰن نے سوچا۔ شوشی شمس الرحمٰن کے پیروں کی طرف جھکی۔ زری نے اسے گلے سے لگایا۔ شمس الرحمٰن نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے اسے ممنون ہوکر دیکھا اور آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں۔ شمس الرحمٰن نے چپکے سے مولانا کو پیسوں سے بھرا ہوا ایک بٹوہ دیا۔

رات کو شمس الرحمٰن دیر تک جاگتا رہا اور اپنے بچپن کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اس نے بتایا، چٹاگانگ جانے سے پہلے وہ اپنے دادا سے ملنے چاند گھاٹ گیا تھا۔ وہ اب بہت بوڑھے ہو چکے ہیں اور بیمار رہتے ہیں۔ اسی لیے سلہٹ چھوڑ کر اپنے آبائی گھر میں چلے گئے ہیں۔

چلتے وقت دادا نے چاندی میں منڈھا ہوا تعویذ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ کہنے لگے، ''بیٹے تم نے اپنے بچپن میں یہ بات کسی نہ کسی سے ضرور سنی ہوگی کہ ہم لوگ کسی ترک سپاہی کی نسل سے ہیں۔ میں نے کبھی اس کی تصدیق نہیں کی لیکن یہ بات سچ ہے۔ ہماری جن سگو دادی کی شادی اس سپاہی سے ہوئی تھی، ان کی دادی ماں نے اس سپاہی کے جانے کے بعد بیٹی کے نکاح نامے کو بہت سنبھال کر رکھا تھا تاکہ لوگ ان کی پوتی کے بچے کو خدانخواستہ حملہ آور سپاہیوں میں سے کسی کی دین نہ سمجھیں۔ اس نکاح نامے کی اصل جواب شاید برائے نام ہی رہ گئی ہے اور نقل اس تعویذ میں موجود ہے۔ یہ ان دادی ماں کی وصیت تھی کہ ہر نسل اس نکاح نامے کی ایک نئی نقل کروا کے اپنے سب سے بڑے بیٹے کو دے۔ تمھارا باپ مرتے وقت اسے دوبارہ میرے حوالے کر گیا تھا۔ اب یہ تمھاری امانت ہے۔ اسے سنبھال کر رکھنا۔''

''دادا!'' میں نے کہا، ''آخر اتنی صدیوں پرانی بات کو گلے سے لگائے رکھنے کی کیا ضرورت ہے۔ سات سو سال سے ہم یہاں رہ رہے ہیں۔ ہمارے دادا — پردادا — ماں باپ، سب بنگالی ہیں اور ہم خود کو بنگالی ہی سمجھتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے بنگالی سمجھو — لیکن اپنے پرکھوں کی ایک نشانی جو خاندان میں موجود ہے، اسے رکھنے میں کیا حرج ہے۔''

''نہیں، مجھے اس کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ ہر آدمی کہیں نہ کہیں سے آتا ہے۔'' میں نے کہا، ''آپ اسے اپنے پاس ہی رہنے دیجیے۔ آخر ہم سب لوگ جنت سے آئے ہیں تو کیا سب جنتی ہیں۔ جس جگہ کا ہم تصور بھی نہ کر سکیں اس کو اپنا وطن کیسے سمجھ سکتے ہیں؟''

میں نے تعویذ واپس کرنے کی بہت کوشش کی۔ میرا خیال تھا کالے دھاگے میں چاندی کا پرانا تعویذ دیکھ کر تم ہنسو گی اور کبھی بھی اپنے بیٹے کے گلے میں ڈالنا پسند نہیں کرو گی، مگر دادا نہ مانے۔ کہنے لگے، ''تو چاہے اسے اپنے بیٹے کو دے، چاہے پھینک دے، لیکن نسلوں کی امانت میرے منھ پر مار کر نہ جا۔ مجھے یہ اطمینان رہے کہ میں نے امانت پہنچا دی ہے۔ مجبور ہو کر میں لے آیا۔''

''تو اس میں حرج کیا ہے۔'' زری نے کہا۔

''اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے؟'' شمس الرحمٰن نے روٹھے لہجے میں کہا۔ ''سات آٹھ صدیاں پہلے ہمارے بزرگ کہاں سے آئے تھے۔''

''اب تو یہ ثابت ہو گیا ہے کہ ہم جو کچھ بھی ہیں اپنے بزرگوں کی دی ہوئی جین (gene) کی دین ہیں تو اپنی جڑیں پہچاننے کے لیے ہمیں اپنے ماضی میں دیکھنا پڑے گا۔'' زری نے کہا، ''نہیں،

میں خود کو ترک نہیں مان سکتا۔ میں بنگالی ہوں۔ بنگالی ہی رہوں گا۔" شمس الرحمٰن نے ضد کی۔

اگر ساری دنیا کے لوگ یہ مان لیں کہ وہ آخر تو ایک ہی جوڑے کی اولاد ہیں تو رنگ و نسل کے یہ جھگڑے، یہ نفرتیں، یہ قتل و غارت ختم نہ ہو جائے۔ زری نے سوچا۔ شمس الرحمٰن سیدھا لیٹا چھت کو تک رہا تھا۔ سلاخیں لگی کھڑکی سے باغ کی خوش گوار ہوا ٹھہر ٹھہر کر اندر آ رہی تھی۔ زری کو معلوم تھا کہ وہ شوشی کے بارے میں سوچ رہا ہے۔ وہ تمھاری آدھی بہن، جو اس وقت سنار گاؤں کی کسی کٹیا میں سہمی ہوئی بیٹھی ہے اور اس کا شوہر ابو ظفر معراج، جو کسی ناکردہ گناہ کی پاداش میں چھپتا پھر رہا ہے، خدا جانے اس کے آبا و اجداد کہاں سے آئے ہوں گے۔

مولانا اور شوشی کھیتوں اور پانی سے پٹے راستے سے گزر کر تیزی سے دریا پار کر کے سنار گاؤں پہنچے تھے۔ سنار گاؤں تین خوب صورت دریاؤں میگھنا، برہم پترا اور سیتا لکھیا کے سنگم پر واقع تھا اور بُدھ، ہندو اور مسلمانوں کے عہد میں بھی دارالخلافہ رہا تھا۔ سلطان اعظم شاہ نے حافظ شیرازی کو اپنے دربار میں مدعو کیا تھا اور حافظ نے ایک غزل اس کے دربار کی شان میں لکھ کر بھیجی تھی اور یہ جگہ شیراز کے رکن آباد سے کم خوب صورت نہ تھی۔

مولانا اور شوشی کو ان کے رہبر نے ٹین کے ٹکڑوں سے بنی ہوئی ایک جھونپڑی میں لا کر رکھا تھا۔ یہ جھونپڑی درختوں سے سر تا سر ڈھکی ہوئی تھی۔ درختوں میں زیادہ تر آم کے درخت تھے جہاں دل کی شکل کی ننھی ننھی کیریاں لٹکی ہوئی تھیں۔ سیکڑوں درختوں اور بیلوں کا ایک جال سا بنا ہوا تھا جہاں کسی گھر کے ہونے کا گمان بھی نہیں ہوتا تھا۔ جھونپڑی کے سامنے لپے ہوئے چبوترے پر دھوپ کا گزر نہیں تھا۔ ایسے ہی چبوتروں پر بیٹھ کر دو ہزار سال پہلے بھی یہاں کی لڑکیاں صبح دم اور شام کی اوس سے بھیگی ہوا میں چرخا کاتتی اور انگوٹھی میں سے نکل جانے والے ململ کے تھان کے لیے تارِ نظر جیسا باریک تار نکالتی تھیں۔ نم ہوا میں دھاگا ٹوٹتا نہ تھا اور جوان عورتوں کی تیز نگاہیں اور نازک ہاتھ جو کپڑا بنتے تھے وہ یورپ کی اونچی سوسائٹی میں کم خواب و اطلس سے زیادہ مقبول تھا۔

یہاں مٹی کے دو چولھے بنے ہوئے تھے جو درمیان میں رکھے ہوئے ایک ہی ایندھن سے جلتے تھے۔ جھونپڑی میں کھانے پینے کا کچھ سامان تھا۔ شوشی تھوڑا سا بھات پکا لیتی اور کچے آم کی چٹنی رگڑ

لیتی یا کھیت کی بیلوں میں سے کوئی ساگ ترکاری توڑ کر پکا لیتی۔ ان کا رہبر روز سڑک تک جاتا کہ معراج کی رہبری کر کے یہاں تک لا سکے لیکن ناکام لوٹتا۔

شوشی مایوس نہیں تھی۔ وہ کسی نہ کسی کام میں لگی رہتی۔ چھوٹی بچی کا اسے بڑا سہارا تھا جو طرح طرح کے سوالات پوچھ کر اسے زچ کرتی مگر دل بھی بہلا رہتا۔ کبھی کبھی جب مولانا اور ان کا رہبر، درختوں کے سائے میں بیٹھے باتیں کرتے تو انجانے میں سترھویں اٹھارھویں صدی کے لوک گیت خود بخود اس کے ہونٹوں تک آ جاتے، نہ جانے کب کے سنے ہوئے، کب کے پڑھے ہوئے۔ ''وہ ایک دن کھجور کی روٹی پکاتی ہے، دوسرے دن مکئی کے دانے بھون کے رکھتی ہے۔ میٹھا دہی، چھینکے میں ڈال لٹکا دیتی ہے۔ چھینکے میں چیڑا بھی محفوظ رکھتی ہے، طرح طرح کے کھانے پکاتی ہے مگر افسوس کہ اس کا پیارا شوہر واپس نہیں آتا۔ آج بھی اس کے لوٹ آنے کی امید میں اس نے مزے دار سالن، مچھلی اور مرغی پکائی ہے۔''

حقیقت یہ تھی کہ شوشی نے وہیں آس پاس سے سری چندن توڑ کر اس کی بھجیا پکائی تھی۔ اور راہبر نے اسے ایک پکا ہوا پیلا پپیتا لا کر دیا تھا۔ اسی وقت پرانے تہ خانوں جیسے گھروں سے ایک بوڑھی عورت توتے کے رنگ کی ساری پہنے نکلی تھی۔ اس کی مانگ میں سیندور تھا۔ تھالی میں چند پھولوں کی پتیاں اور کاغذ کے پرزے تھے۔ وہ اس نے پوکھر میں بہا دیے۔ پھر نہ جانے کس طرح اسے شوشی کی موجودگی کا علم ہو گیا اور وہ ان کے پاس چلی آئی۔ اس کا نام مایا تھا۔ وہ ہندو تھی لیکن ہرگز اپنے شوہر اور بال بچوں کے ساتھ بھاگنے کو آمادہ نہ ہوئی تھی۔ وہ تنہا وہاں رہتی تھی۔ اسے بھگوان پر وشواش تھا کہ کوئی اس کا بال بیکا نہیں کر سکتا۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس گھر گئی اور شوشی کی بیٹی کے لیے دودھ اور ان لوگوں کے لیے مان کچھ کا اچار لے کر آئی۔

دوسرے دن شوشی اس کے گھر گئی تھی۔ پرانے گھر کا آنگن کھیتوں میں اور اگلا کمرہ سڑک پر کھلتا تھا مگر اس نے سڑک پر کھلنے والے کمرے مکمل طور پر بند کر دیے تھے۔ کمروں میں اتنا اندھیرا تھا کہ دن میں بھی چراغ جلانے کی ضرورت پڑے مگر مایا کی آنکھیں تیز تھیں۔ وہ رات کو بھی چراغ نہیں جلاتی تھی۔ سرِ شام اپنا کام ختم کر کے، بکری کو آنگن میں باندھ کر، پوجا پاٹھ سے فارغ ہو کر سو جاتی تھی۔

گھر کے آگے درخت میں ایک کل سی لگی ہوئی تھی۔ اس کے گھر والے تارے سے جالیاں بناتے تھے جن سے بجری اور مٹی چھانی جاتی تھی۔ ایک کمرے کے کونے میں جالی لپٹی ہوئی رکھی تھی۔ مایا نے اسے اپنے کھیتوں کے اندر ٹیلے کے نیچے بنا ہوا ایک کمرہ دکھایا جو آثارِ قدیمہ معلوم ہوتا تھا۔ نیچی چھت تھموں پر ٹکی ہوئی تھی۔ اندر مکمل اندھیرا تھا۔ آگے درخت اور جھاڑیاں تھیں۔ چھت پر کچی زمین جس پر جھاڑیاں اُگی تھیں۔ یہ کمرہ غار نما تھا اور مایا نے سوچ رکھا تھا کہ اگر کبھی کوئی گھر کی تلاشی

لینے آیا تو یہاں آ کر چھپ جائے گی۔

شوشی کا دل بہت چاہا کہ وہ سنار گاؤں سے نزدیک ہی سردار باڑی کی عمارتوں میں جائے، جہاں وہ اپنے بچپن میں ماں باپ اور شمس الرحمٰن کے ساتھ آئی تھی۔ راجا کے محل کے نقش و نگار اور دروازے پر بنی ہوئی مورتیاں دیکھنے کے بعد دو سیڑھیاں اُتر کر تالاب کے کنارے گئے تھے۔ شمس الرحمٰن چپکے سے سفید گھوڑے کے سفید سوار والے مجسمے پر چڑھ کر بیٹھ گیا تھا اور ڈر کے مارے شوشی کا خون خشک ہو گیا تھا۔

پھر وہ نہر کے کنارے گئے تھے جہاں سرخ رنگ کی گھر کی دیوار کے سائے سے آم کی ایک ٹہنی جھک کر پانی تک چلی گئی تھی۔ اس ڈھلوان پر وہ کئی مرتبہ بھاگتے ہوئے آئے تھے اور ٹہنی کو پکڑنے کی کوشش کی تھی اور بالآخر دونوں نہر میں غڑاپ سے گر گئے تھے۔

یہ وہی سنار گاؤں تھا مگر آج حالات کتنے مختلف تھے۔ مولانا اپنے رہبر کو بتا رہے تھے، ''تمھیں پتا ہے ڈھاکا ہی تو ہمیشہ سے دارالخلافہ نہیں رہا۔ ساور، بکرم پور، جہانگیر نگر اور سنار گاؤں بھی صدر مقام رہے ہیں۔ تم کہاں کے رہنے والے ہو؟''

''ہم منشی گنج میں ادرک پور فورٹ کے پیچھے رہتے ہیں، جہاں درختوں کا گھن نظر آتا ہے، ہمارے گھر سے ادرک پور قلعے کی فصیل اور کنارے کا گول برج نظر آتا ہے۔ خدا جانے میرے بال بچے وہیں ہیں یا کہیں بھاگ گئے ہیں۔ معراج صاحب آئیں تو میں آپ کو ان کے سپرد کر کے جاؤں۔''

معراج اس دن بھی نہیں آیا۔ ایک شخص اس کا پیغام لے کر آیا کہ وہ سنار گاؤں نہیں آ سکتا۔ شوشی خود کسی نہ کسی طرح سرحد پار کر کے کلکتہ پہنچ جائے، وہ وہاں اسے ملے گا۔ پہلے رہبر نے اجازت چاہی اور جو شخص پیغام لے کر آیا تھا، ان کو ایک بھاری رقم کے بدلے سرحد تک لے جانے پر راضی ہو گیا۔ طے ہوا کہ پہلے شوشی پنبہ سے اپنے بیٹے کو لے گی پھر ضلع کشتیا سے یا کھلنا سے جس میں آسانی ہو گی، وہ سرحد پار کر لیں گے۔ رہبر جس کا نام شوپن تھا کسی گاڑی کا انتظام کرنے گیا۔ شام تک نہ لوٹا تو مولانا اس کی تلاش میں نکلے۔ بس اسٹینڈ سے ذرا ہٹ کر سڑک کے کنارے اس کی نعش پڑی تھی۔ سینے کے جمے ہوئے خون پر مکھیاں اتنی تعداد میں بیٹھیں تھیں جیسے مکھیوں کا چھتا ہو۔ وہ الٹے پیروں پھرے۔ شوشی سے چلنے کو کہا۔ شوشی نے اپنا سامان گٹھری میں باندھا۔ پکا ہوا بھات ایک پوٹلی میں لپیٹا۔ زیور کمر کے گرد باندھا اور چلنے کو تیار ہوئی۔

مولانا نے ایک بیل گاڑی والے سے بات کی جو انھیں پنبہ کی سمت کچھ دور تک ساتھ لے جانے پر راضی ہو گیا۔ بیل گاڑی دھان کے پودوں کے درمیان کچی سڑکوں سے گزرتی رہی۔ دھکے کھاتے کھاتے وہ ادھ موئے ہو گئے۔ بچی تھک کر روتی تو کبھی مولانا بہلاتے کبھی شوشی۔ جب خوب اندھیرا ہو گیا تو اس نے ایک جگہ بیل گاڑی روکی۔ اور دور قدرے اونچائی پر بنی ہوئی ایک جھونپڑی کی طرف

اشارہ کیا کہ وہاں تک انھیں پیدل جانا ہوگا۔ ڈھیر سے پیسے لینے کے بعد وہ ان کے ساتھ آیا۔ بانسوں کی بنی ہوئی لمبی سی ایک باشا تھی جو مختلف حصوں میں منقسم معلوم ہوتی تھی۔ اس کے بالکل آخری کونے میں اس نے ان تینوں کو گھسا دیا کہ رات یہاں بسر کریں۔ اس کے علاوہ اور کوئی جگہ نہیں ہے۔ کئی مرتبہ کہنے کے بعد وہ ایک دھندلی سی لالٹین جلا کر دے گیا۔

دوپہر سے اب تک انھوں نے کچھ کھایا پیا نہیں تھا لالٹین کی روشنی میں شوشی نے دیکھنے کی کوشش کی کہ کوئی صاف برتن ہو تو بچا کھچا بھات نکالے۔ معلوم ہوا کہ یہ کمرہ تو شاید مہینوں سے ناقابلِ استعمال ہے۔ کونوں میں جالے لگے ہوئے تھے۔ زمین پر مٹی میں کیڑے مکوڑے رینگ رہے تھے۔ کھجور کی ایک سوکھی ہوئی شاخ سے، جو کونے میں پڑی تھی، شوشی نے کمرے کی صفائی کی۔ ایک پرانی ساری بچھائی اور پوٹلی کھول کر اس پر رکھ دی۔ بچی بے حد تھکی ہوئی تھی فرش پر گر کر سو گئی۔ مولانا اور شوشی نے چند لقمے کھائے۔ پانی کہیں نہیں تھا۔ مولانا نے اپنے کندھے پر پڑی ہوئی چارخانے کی چادر ایک طرف بچھائی اور نماز پڑھنے لگے۔ شوشی گھٹنوں میں سر دیے بیٹی کے پاس چپ چاپ بیٹھی رہی۔ کیا اس طرح وہ کبھی منزلِ مقصود تک پہنچ سکے گی۔

جب لالٹین بھڑک کر بجھ گئی تب وہ بیٹی کے پاس قدرے ٹیڑھی ہو کر لیٹ گئی۔ مولانا اب تک نماز میں مصروف تھے۔ ہر طرف گہری تاریکی تھی۔ اس تاریکی اور خاموشی میں ہلکی سی ایک خوف ناک آواز ابھری پھر کچھ کھسر پھسر سنائی دی۔ مولانا کے کان کھڑے ہوئے انھوں نے غور سے سننے کی کوشش کی۔ یہ یقیناً درانتی کے پتھر پر گھسنے کی آواز تھی۔ مولانا اٹھے اور تیزی سے دروازے کو زور سے دھکا دیتے ہوئے کہ اس کے پیچھے کوئی شخص ہو تو گر پڑے، باہر بھاگے اور زور زور سے مدد کے لیے پکارنے لگے۔ اسی وقت گھر کے دوسرے حصے سے ایک بوڑھا لالٹین کی لو اونچی کرتا ہوا نکلا۔ مولانا نے جلدی جلدی اسے سارا ماجرا سنایا۔ وہ لالٹین لے کر ان کی کوٹھڑی میں آیا اور تسلی دی۔ پھر ان سب کو اپنے صاف ستھرے کمرے میں لے گیا۔ بیوی کو اٹھا کر اسے کھانا گرم کرنے کو کہا۔

''یہاں آپ کو بالکل کوئی خطرہ نہیں ہے۔ اگر آپ نے درانتی کی آواز سنی ہے تو وہ یقیناً میرے بیٹے اور اس کے ساتھیوں کی سازش ہوگی۔ میرا بیٹا چور اچکوں سے مل گیا ہے۔ اسے اندازہ ہو گیا ہوگا کہ آپ کے پاس روپیہ ہے۔ وہ گھر کے کسی حصے کو توڑ کر آپ کے پیسے نکالنے کی فکر میں ہوگا مگر یہاں اس کا بس نہیں چلے گا۔ ویسے بھی میں رات بھر جاگ کر پہرہ دوں گا۔'' بوڑھے نے کہا۔

انھیں کھانا کھلا کر اور سیتل پاٹی پر آرام سے سونے کے لیے کہہ کر وہ اپنی بیوی کو لے کر دوسری کوٹھڑی میں چلا گیا۔ رات بھر تیز ہوا کے ساتھ بارش ہوتی رہی۔ طرح طرح کے جانوروں کے بولنے کی آوازیں آتی

رہیں۔ منہ اندھیرے مولانا اٹھ کر باہر گئے کہ ذرا دیکھیں کہ وہ کہاں ہیں اور آگے جانے کی کیا سبیل ہے۔

اس باشا کا کچھ حصہ بطور کیمپ استعمال کیا جا رہا تھا۔ گھروں سے بھاگے ہوئے بارہ سے پندرہ سولہ سال تک کے بچوں کو کھیتوں میں عارضی ٹریننگ دی جا رہی تھی۔ یہ سب سرحد پار جا رہے تھے جہاں سے ان کو باقاعدہ ٹریننگ لے کر لوٹنا تھا۔ یہ چھوٹی عمر کے بچے شادھین کے معنی نہ جانتے تھے مگر شادھینتا کے نشے میں سرشار تھے۔ اپنے ہاتھوں میں رائفلیں لیے پھولے نہ سماتے تھے۔ رات کو خواب میں دشمنوں پر فائر کرتے اور کشتوں کے پشتے لگاتے تھے۔

صبح بارش کے بعد یکایک حبس ہو گیا تھا۔ ندی پر کہرے کی چادر سی تنی ہوئی تھی۔ ذرا فاصلے پر ایک لانچ آ کر رکی۔ ایک بچے نے درخت کی آڑ سے اسے تاڑا اور بھاگتا ہوا آیا۔ اپنے ساتھیوں کو اطلاع دی کہ اس لانچ پر ہانادار (پاکستانی فوجی) سوار ہیں۔ لڑکوں نے آؤ دیکھا نہ تاؤ، سب رائفلیں تان کر ایک قطار میں کھڑے ہو گئے۔ مولانا نے دیکھا تو بھاگے ہوئے گئے اور لڑکوں کو ڈانٹا۔

"اگر واقعی فوجی ہوئے تو ایک گولی کی آواز سنتے ہی تم سب کو بھون کر رکھ دیں گے، چلو تم اندر جاؤ۔"

پھر وہ درختوں کی آڑ لے کر خود آہستہ آہستہ دریا کے کنارے گئے۔ لانچ میں عام مسافر سوار تھے اور یہ لانچ پنبہ کی طرف جا رہی تھی۔

شوشی یہ خبر سنتے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔ جلدی جلدی چیزیں سمیٹیں۔ باشا کے مالک کی بیوی ان کے لیے ناشتا لے کر آ رہی تھی۔ انھوں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور تیزی سے لانچ کی طرف لپکے۔ لانچ میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مولانا نے سارنگ کی خوشامد کی۔ بڑی مشکل سے اجازت ملی۔ پہلے بچی کو چڑھایا، پھر شوشی کو، اس کے بعد وہ بمشکل اپنے ایک پیر پر دوسرا پیر رکھ کر کھڑے ہو گئے۔ لانچ مچھلیوں سے بھرے ہوئے ٹرالر کی طرح آدمیوں سے ٹھنسی ہوئی تھی۔ سانس لینے میں بھی دشواری ہو رہی تھی۔ ہوا بند تھی۔ مسافر اور ملاح پسینے میں ڈوبے ہوئے تھے۔ مگر اس وقت سب کو اپنی جان کی فکر تھی۔ سنا تھا فوجی گاؤں دیہاتوں کی تلاشی لے رہے ہیں اور ان کی گن بوٹ دریاؤں میں دشمنوں کی بو سونگھتی پھر رہی ہیں۔

شوشی نے زندگی میں سیکڑوں مرتبہ ندی پر سفر کیا تھا اور دن رات میں ہمیشہ لطف اٹھایا تھا مگر آج سوائے بچی کی اور اپنی حفاظت کے کوئی خیال اس کے ذہن میں نہیں تھا۔

آج ہر ندی ایک پل صراط تھی۔ نہیں معلوم پار اترنا قسمت میں تھا یا ڈوب جانا۔

لمبی باشا، رات کی بارش اور ہوا سے گری ہوئی کچی کیریاں دور پر پیچھے رہ گئی تھیں۔ سانولے دُبلے، بڑی بڑی آنکھوں والے، لڑکپن سے لڑ کر بڑے ہونے کی کوشش کرتے لڑکے رائفلیں تھامے باشا کے سامنے کھڑے اب تک ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

مارچ کا مہینہ گزر چکا تھا۔ اپریل کا پہلا ہفتہ ختم ہونے کو آیا تھا مگر شوشی ابھی تک منزلِ مقصود پر نہ پہنچی تھی۔ کوئی لانچ سرِراہ اتار دیتی تھی، کبھی مولانا خود خطرے کی بو سونگھ کر اتر پڑتے تھے۔ پنبہ میں اس کی بہن کا گھر خالی تھا۔ ایک پڑوسی نے صرف اتنا بتایا تھا کہ وہ لوگ بہن کی سسرال تنکیل چلے گئے ہیں۔ جمنا ندی پار کر کے کئی دن میں تنکیل پہنچے تو وہ وہاں بھی نہیں تھے۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ یہاں سے کہاں گئے ہیں۔ سوچ سوچ کر شوشی کا دماغ تھک چکا تھا۔ مولانا کوئی رائے نہ دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے، ''شمس الرحمٰن نے کہا تھا، جہاں شوشی جانا چاہے وہاں تک پہنچا کر آئیں۔ تم جہاں کہو گی میں چلا چلوں گا۔ جب تم کہو گی میں واپس چلا جاؤں گا۔''

ایک دن پریشان ہو کر شوشی رو پڑی تو مولانا نے کہا، ''بیٹی! خدا سب جگہ ہے۔ موت برحق ہے۔ وہ اسی وقت، اسی ثانیے آئے گی، جب آنی ہے، نہ لحہ بھر پہلے نہ لحہ بھر بعد۔ تو سوچو سارے صوبے میں بھگوڑوں کی طرح بھاگتے رہنے کا کیا فائدہ ہے۔ میرا خیال ہے گھر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ سے سلامتی کی دعا مانگو تو بہتر ہے۔''

''میں چاٹ گام نہیں جا سکتی دادا — وہاں جانے سے ڈر لگتا ہے۔ شمس الرحمٰن کے اوپر بار بننا نہیں چاہتی۔ میں کلکتہ اپنی سسرال جانا چاہتی تھی مگر وہاں پہنچ نہیں پا رہی۔''

''بھٹکتے رہنے کے لیے ایک ملک اور ایک دنیا ہی کافی ہے بیٹی، انسان دونوں دنیاؤں اور دو ملکوں میں کیوں بھٹکے۔ میری مانو تو اپنے میکے چلی جاؤ، کوئی تو ہو گا ہی وہاں۔''

''ہاں دادا، میں اپنے گاؤں چلی جاتی ہوں۔ بڑی خوب صورت جگہ ہے، میں مدت سے وہاں نہیں گئی۔مگر وہ یہاں سے بہت دور ہے، آپ کو تکلیف ہوگی دادا۔''

''مجھے کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ وہاں سے سرحد بھی نزدیک ہے۔ ہوسکتا ہے معراج کی کوئی اطلاع مل جائے۔''

''تو پھر مجھے وہاں پہنچادیں داد، میں اپنا ملک کیوں چھوڑوں۔معراج نے مجھ سے یہاں آ کر شادی کی تھی، اسے ہی دوبارہ آنا ہوگا۔کیوں دادا، ٹھیک ہے نا۔اپنے ملک میں رہ کر تو مرنا بھی اچھا ہوتا۔''

''ہاں۔'' مولانا نے ٹھنڈا سانس لیا۔

''ماں۔ایرا آماں کے کوبے ماربے'' (ماں! یہ ہمیں کب ماریں گے) لیلیٰ نے کہا۔

''مورے تورشوترو۔'' (مریں تیرے دشمن) شوشی نے کہا۔'' دادا! لیلیٰ دن میں کتنی ہی مرتبہ پوچھتی ہے۔وہ ہمیں کب ماریں گے ماں؟— ہم کتنی دیر میں مریں گے ماں؟''

''دیکھو بچی کے ذہن پر کیا اثر ہورہا ہے؟ اس کا ننھا دماغ نہ جانے کیا کیا سوچتا ہوگا؟ بڑی ہوگی تو ساری عمر خوف سے لرزتی رہے گی۔'' مولانا نے کہا۔

شوشی خاموش ہوگئی۔ دل میں سوچتی رہی۔عورت کے لیے تو ساری زندگی خوف سے لرزتے رہنا ہی اس کی تقدیر ہے۔ برہم پتر کے بپھرتے پانی سے گزر کر وہ اپنے علاقے میں پہنچی تھی۔ کتنے مجلگوں بعد اس نے یہ سب جگہیں دوبارہ دیکھی تھیں۔شائستہ گنج، حبیب گنج، مولوی بازار، کٹیارہ ندی کے دونوں کناروں پر دو گاؤں، شیر پور اور شادی پور، پھر سلہٹ، جلال الدین تبریزی کا مزار— وہی اس کے کبوتر، وہی تالاب میں پلی مچھلیاں، گھنا گھر— پہاڑوں سے اترتے سرسبز لباس پہنے چائے کے باغات اور پھر چاند گھاٹ— اس کا گاؤں۔ بوڑھے دادا نے محسوس کیا تھا جیسے شوشی کی شکل میں رحمت کا فرشتہ ان کے گھر اترا ہو۔ اللہ کتنا کارساز ہے، بجھتی آنکھوں کی جوت جگانے اپنے پیاروں کو بھیج دیتا ہے۔شوشی کی بیٹی ان کی آنکھ کا تارا بن گئی۔ ننھے فرشتے، جو بوڑھی بجھتی آنکھوں کی آنکھیں اور سوکھتے ہاتھوں کے تروتازہ ہاتھ بن جاتے ہیں۔ اللہ کی دین ہے۔اس کی کرامت ہے، اس کی مہربانی ہے—'' وہ ٹھنڈی سانسوں کے درمیان کہتے رہے۔

ایک وقت آتا ہے جب بوڑھے لوگ زندگی کی ہر نعمت کو اپنے اوپر احسان سمجھنے لگتے ہیں۔ یہی دادا جب جوان ہوں گے تو دنیا کی ہر نعمت پر اپنا حق جتاتے ہوں گے— شوشی نے سوچا۔

''شائستہ بیٹی، میں نے تجھے ٹھکانے پر پہنچا دیا ہے۔ یہ جگہ محفوظ ہے۔آسام کی سرحد یہاں سے نزدیک ہے۔ یہاں سے کلکتہ پیغام بھی جا سکتا ہے۔تو ایک خط شمس الرحمٰن کو بھی لکھ دینا کہ

خیریت سے پہنچ گئی ہوں۔ خط پہنچنا نہ پہنچنا خدا کے ہاتھ ہے۔ انسان کو اپنا فرض ادا کرتے رہنا چاہیے۔'' مولانا نے کہا۔

''آپ ڈھاکا جائیں گے تو میری خیریت کی اطلاع مل جائے گی۔'' شوشی نے کہا

''نہیں، ابھی ڈھاکا نہیں جاؤں گا۔ میمن سنگھ میں اور دوسری کئی جگہوں پر میرے جاننے والے ہیں، ان سے ملتا ہوا، ان کی خیریت پوچھتا ہوا جانے کب پہنچوں۔ وہاں اس طرف کوئی جانے والا مل گیا تو پیغام بھیج دوں گا۔ کیا معلوم کون کب اتفاق سے مل جائے۔''

''اتنے خطرناک حالات میں دادا آپ اِدھر اُدھر کیوں جارہے ہیں۔ میرے ساتھ آپ نے کیا کم تکلیف اٹھائی ہے۔'' شائستہ نے کہا۔

''اللہ مالک ہے بیٹی، سب کچھ اسی کی طرف سے ہے۔'' مولانا نے کہا۔ ''انسان نہ کسی کو تکلیف پہنچا سکتا ہے نہ راحت۔''

''ماں، آمرا کو بے موری بو؟'' شائستہ کی بیٹی نے پھر پوچھا۔

''ہم نہیں مریں گے بیٹی۔۔۔ ہم نہیں مریں گے چندا۔ آمانکے کے مارتے پارے۔'' شائستہ نے بیٹی کو سینے سے لگالیا۔

بوئی شاکھ (بیساکھ) بنگلہ سال کا پہلا مہینہ ہے۔ بنگالیوں میں پہلی بیساکھ کا دن تہوار کی طرح منایا جاتا ہے۔ اس روز حساب کے پرانے کھاتے پتر بند کر کے نئے کھاتے پتر کھولے جاتے ہیں۔ بیساکھی کا میلہ کہیں کہیں دس دن تک چلتا ہے۔ لڑکیاں کریم کلر کی سرخ بارڈر والی ساریاں، سُرخ بلاؤز کے ساتھ پہن کر نکلتی ہیں اور باغوں میں سبزے پر ٹہلتی ہوئی یوں معلوم ہوتی ہیں جیسے ہری ہری گھاس پر سرخ سرخ بیر بہوٹیاں ہوں۔

جگہ جگہ اسٹیج بنائے جاتے ہیں جہاں ڈرامے دکھائے جاتے ہیں۔ ٹولیاں آ کر باغوں میں گانے گاتی ہیں۔ آؤ آؤ بیساکھی آؤ۔۔۔ ٹیگور کا گیت جو بارش کا سواگت کرتا ہے، اور دوسرے عوامی گیت۔۔۔ وہ دیکھو کال بیساکھ کے طوفان میں نیا پرچم اڑ رہا ہے (نذر الاسلام)۔ دھوپ بڑھ جاتی تو ٹولیاں بکھر جاتیں۔ بچے میلوں سے اپنی پسند کے مٹی کے کھلونے خریدتے ہیں۔ اپنی پسند کے کھانے کھاتے اور ہنستے کھیلتے چلے جاتے ہیں۔ گاؤں کا سنگیت کار درخت کے نیچے بیٹھا ہارمونیم بجاتا اور گانا گاتا رہتا ہے۔ شہروں میں مختلف اداروں کے زیرِ اہتمام تقاریب ہوتی ہیں اور خوب چہل پہل رہتی ہے۔ مشہور ہے کہ اس دن موسم کی پہلی لیچی، پہلا خربوزہ اور پہلا تربوز بازار میں آتا ہے۔ پہلی بیساکھ کو سارا دن دکانیں کھلی رہتی ہیں۔ دکان دار ایک دوسرے کو دہی اور مٹھائی کھلاتے ہیں۔ بہت سے دکان داروں کا عقیدہ ہے کہ آج کے دن لکشمی دیبی مہربان رہی تو سارا سال خوش حالی اور کشادگی رہے گی۔ یہ عقیدے تھوڑی بہت کمی بیشی کے ساتھ، ہر مذہب میں کسی نہ کسی دن کے ساتھ وابستہ رہے ہیں، اس لیے جو

اس دن کو اس طرح نہیں مانتے، وہ بھی اس کا احترام کرتے ہیں۔ عوام کو میلے ٹھیلے کبھی برے نہیں لگتے — کسی بہانے ہوں ان کی تکلیف دہ پُرالم زندگی میں تھوڑا سا رنگ گھول جاتے ہیں، مگر اس سال پہلی بیساکھ کا دن، جو پندرہ اپریل کو پڑا تھا، یوں ہی گزر گیا تھا۔ نہ میلے نہ ٹھیلے، نہ راگ نہ رنگ۔ ہر سال بارش ضرور پڑتی تھی مگر اس سال وہ بھی نہ ہوئی تھی۔ ہاں کہیں کہیں خون کے چھینٹے پڑے تھے۔

پانچ دن پہلے ضلع کشتیا کے سرحدی گاؤں مہر پور کو مجیب نگر بنا کر اعلانِ آزادی کر دیا گیا تھا۔ آزاد بنگلہ دیش حکومت کے کارندوں نے حلف لیا تھا اور اس طرح آزاد بنگلہ دیش قائم کرنے کے بعد یہ جلا وطن حکومت کلکتہ کے فورٹ ولیم میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔ اس حکومت کا ایک ہی کام تھا کہ دنیا بھر کی رائے عامہ کو بنگلہ دیش کے حق میں ہموار کرے۔ اس کے لیے وہاں سے پروپیگنڈا لٹریچر تیار کر کے بھیجا جاتا تھا اور شادھین بنگلہ بیتار کیندرو (آزاد بنگلہ دیش ریڈیو) غیر ملکی لوگوں میں بنگلہ دیش کی آزادی کی ضرورت کا احساس جگاتا تھا۔ مشرقی پاکستان میں طرح طرح کی افواہیں پھیلانے، یعنی نفسیاتی لڑائی لڑنے، مکتی جودھا کا حوصلہ بڑھانے اور نوجوانوں کو بیش از بیش مکتی باہنی میں شامل ہونے کی دعوت دیتا تھا۔ اردو بولنے والوں کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے یہ ایک گھنٹے کا پروگرام اردو زبان میں بھی کرتا تھا۔

یوں تو ۲۶ر مارچ کو آزادی کا اعلان میجر ضیاء الرحمٰن نے چٹا گانگ کے ٹرانس میٹر اسٹیشن سے کر دیا تھا اور اس اعلان کی رُو سے بھی بنگلہ دیش کی آزادی کا اطلاق ۲۶ر مارچ سے ہوتا تھا۔ اس حکومت اور جدوجہدِ آزادی کو قانونی بنانے کے لیے ہر طرح کے قانونی نقطۂ نظر کا خیال رکھا گیا تھا۔ شیخ مجیب کو صدر بنا کر تمام قانونی اور انتظامی امور ان کے سپرد کرنے کا اختیار تھا۔ ٹیکس لگانے، پیسہ خرچ کرنے، دستور ساز اسمبلی بلانے اور ملتوی کرنے کا حق بھی ان کا تھا۔ اس کے ساتھ یہ شق بھی تھی کہ صدر کسی وجہ سے یہ عہدہ نہ سنبھال سکے تو اس کی جگہ نائب صدر یہ عہدہ سنبھالے گا اور صدر کا قائم مقام ہوگا۔ اس اعلانِ آزادی کی قانونی حیثیت یہ ظاہر کی گئی کہ یحییٰ خاں نے ۳ر مارچ کو جو قومی اسمبلی بلوائی تھی اور بعد میں سازشوں کا شکار ہوگئی تھی، اس اسمبلی کے بنگالی ممبران نے جو اکثریت میں تھے، یہ اسمبلی برپا کر کے آزادی کا اعلان کیا تھا۔ دوسرے دن ان کا کہنا تھا کہ اس طرح کے اعلانِ آزادی کی مثال امریکا میں موجود تھی، جہاں تھامس جیفرسن، جان ایڈمز، بنجمن فرینکلن، راجر تھامسن اور رابرٹ لونگ اسٹون وغیرہ نے برطانیہ سے آزاد ہونے کا اعلان کیا تھا۔

اس حکومت کی طرف سے اصل لڑائی مکتی باہنی کر رہی تھی جس میں ایسٹ پاکستان رائفلز، ایسٹ بنگال رجمنٹ، پولیس اور انڈین بورڈر فورس کے لوگ شامل تھے۔ اعلانِ آزادی سے انھیں جنگ کا قانونی حق مل گیا تھا اور اپنی طرف سے انھوں نے بنگلہ دیش کے خلاف ہر شخص کو مارنے کا حق حاصل

کرلیا تھا۔ مولانا نے اس ایک مہینے میں میمن سنگھ، دیناج پور، ایشرڈی اور شانتاہار کے وہ حالات دیکھے تھے جو ان کی کتابِ زندگی کے ورق ورق کو جھلس گئے تھے — وہ جہاں کہیں جاتے تھے لوگ انھیں طرح طرح کے رشتوں سے پکارتے تھے اور اپنی داستانِ الم سناتے تھے۔ ''دادا، میری آٹھ ماہ کی حاملہ بیوی کو پیٹ چاک کرکے پہلے معصوم بچے کو سپنولیا کہہ کر مارا اور پھر اس نیک بخت کو قتل کردیا۔''

''تایا! شانتاہار کی ۲۳ ہزار کی آبادی کو ختم کردیا۔ جن لوگوں نے اسٹیشن پر پناہ لی ہفتوں پانی پینے کو نہ ملا۔ گھر جانے کو کہا اور جب لوگ گھر چلے گئے تو وہاں بھیڑیوں کی طرح ٹوٹ پڑے۔ پانچ چھ دنوں میں رات دن قتلِ عام میں کتنے آدمی مرے ہوں گے، آپ خود سوچ لیجیے — جو کچھ کیا ہے میں آپ کو بتا نہیں سکتا۔'' پھر بتانے والا منہ چھپا کر سسکیاں بھرنے لگا۔ ''چچا! سلہٹ میں پنجابی کو قتل گاہ تک لے جانے کا انعام ایک سو روپے ہے اور مہاجر کو لے جانے کا انعام اسّی روپیہ ہے۔''

''بھائی! اب سے نہیں، ایک عرصے سے یہ نعرے روز سن رہے ہیں — ایکٹا دوئی ٹا موڑا دھوو — شکال بکال ناشتا کورو — ہم سے کہتے ہیں۔ کتار بچارا بنگلہ بولتے پارے نا — حالاں کہ آپ جانتے ہیں کہ ہم سب بنگلہ ہی بولتے ہیں، کبھی کبھی آپس میں اردو میں بات کرلیں تو ان کے آگ لگ جاتی ہے۔''

''مولانا! قسم اللہ کی، اس میں شمہ برابر جھوٹ نہیں۔ میرے اپنے نواسوں کو میرے سامنے ہلاک کیا — قتلہ قتلہ کرکے۔'' ان کی داڑھی روتے روتے بھیگ گئی۔

دن بھر کے بیانات رات بھر مولانا کے سینے پر دھموکے دیتے تھے۔ ہاتھ چلا چلا کر، انگلیاں اٹھا اٹھا کر دھمکاتے تھے۔ تیز ہوا اور بارش کے ساتھ آسیبی آوازیں ان کے کانوں سے ٹکراتی تھیں۔ وہ لڑکیاں جو راتوں کو غائب ہوتی ہیں، ان سے کہا جاتا ہے کہ اب نسلیں بدلی جائیں گی۔ سنگینوں سے جھنڈے جسموں پر گودے جائیں گے۔ بچوں کی پیدائش کی جگہ سے نئے پرچم پیدا ہوں گے۔ نوے نوے سال کے ہر مرد کو ختم کیا جائے گا — اور چاروں طرف یہی ہو رہا تھا۔ بھوک پیاس سے بے تاب لوگ گندے نالوں کا پانی پیتے اور گھاس پھوس کھاتے تھے۔ زخمی اپنے آس پاس گڑھوں میں جمع ہوا خون چلوؤں سے پی لیتے تھے، اور آنکھیں بند کرکے چپ چاپ مرجاتے تھے۔

اجتماعی قتل — اجتماعی زنا — اجتماعی قبریں — ان کا ذمہ دار کون! ان کا جواز کیا — ان آوازوں نے مولانا کا جینا حرام کردیا تھا۔

۷/اپریل کی رات کو شانگی پاڑہ کی طرف سے آہ و بکا کی صدائیں آرہی تھیں۔ مولانا کو لگ رہا تھا، کال بیساکھ کی تیز ہوا اور پہلی بارش کے ساتھ خون کی بوندیں برس رہی تھیں۔ جیپ میں بیٹھے ہوئے ڈپٹی کمشنر اور ایس پی خاموشی سے یہ آوازیں سن رہے تھے۔ مولانا خون کی بوندوں کے درمیان کھڑے

لوگوں کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے — یوں قتلِ عام نہ کرو۔ معصوم لوگوں کو نہ مارو۔ خدا تمھیں کبھی معاف نہیں کرے گا — جوان بپھرا ہوا خون مولانا کو ڈانٹ رہا تھا — ''یہ معصوم نہیں ہیں — یہ مخبر ہیں — ان کے لڑکے 'البدر' اور 'الشمس' میں شامل ہو کر ہمارے دیہاتوں کو ختم کروا رہے ہیں۔ انھوں نے ہمیں زیر و زبر کر دیا ہے۔ یہ ہوائی جہازوں کو جھنڈے دکھاتے ہیں۔ یہ ہمارے دشمن ہیں۔''

''کیا ان میں عورتیں اور معصوم بچے بھی شامل ہیں؟'' مولانا نے پوچھا۔

ایک دم خاموشی چھا گئی۔ اتمامِ حجت کے طور پر کسی نے کہا۔

''جایئے مولانا! اگر آپ کر سکتے ہیں تو ساری عورتوں اور بچوں کو مسجدوں میں لے جایئے، ہم انھیں کچھ نہ کہیں گے۔''

کچھ لوگ اشتعال میں مولانا کو برا بھلا کہہ رہے تھے۔ انھیں بھی فوجی دلاّل کے لقب سے پکار رہے تھے۔ ایک آدمی انھیں مارنے لپکا تھا مگر دوسرے نے روک دیا تھا۔ وہ انھیں جانتا تھا۔ بوڑھے، پرانے زمانے کے آدمی ہیں۔ انھیں چھوڑ دو۔ یہ کتنی عورتوں اور بچوں کو نکال کر لے جائیں گے۔

مولانا نے جا کر گھروں کے دروازے کھٹکھٹانے شروع کیے تھے، ''دُرجا کھولو۔'' پھر انھیں اپنی غلطی کا احساس ہوا اور انھوں نے اردو میں کہا، ''ذرا دروازہ کھول دیجیے۔ میں آپ کی حفاظت کے لیے آیا ہوں۔''

اندر سے آواز آئی، ''مولانا پہلے اپنے ہاتھ دکھایئے، خالی ہیں۔''

مولانا نے اپنے ہاتھ بلند کیے۔ دروازہ کھلا۔ مولانا اندر گئے۔ صاحبِ خانہ نے معذرت کی۔

''اب کسی کا اعتبار نہیں رہا۔ چٹا گانگ سے میرا بھانجا آیا ہے۔ کہتا ہے کہ مسجدوں کے امام نے دروازے کھلوائے اور داؤ سے لوگوں کو مارا۔ ایک امام نے اعلان کیا جو بنگالی ایک بہاری کو مارے گا اس کو ایک حج کا ثواب ملے گا اور خود دو مہاجروں کو قتل کیا۔''

''آیئے آیئے باتوں کا وقت نہیں ہے جلدی مسجد کی طرف قدم بڑھایئے۔''

وہ سب تاریکی میں مولانا کے ساتھ مسجد کی طرف چلے گئے تھے مگر جمال گھر ہی میں رہ گیا تھا۔ میں رضا کار ہوں، وہ مجھے ہرگز نہ چھوڑیں گے۔ آپ باہر سے تالا لگا کر چلے جایئے جمال چٹا گانگ سے اپنی خالہ کو لینے آیا تھا تاکہ مغربی پاکستان جا سکیں۔

رات بھر مولانا لوگوں کو اپنی حفاظت میں کوارٹروں سے نکال کر مسجد میں پہنچاتے رہے تھے۔ صبح دم برستی گولیوں کی بوچھاڑ سے گزر کر انھوں نے ایک کوارٹر کا دروازہ کھٹکھٹایا تھا، اور ایک لرزتی ہوئی آواز سنی تھی — ''اے اللہ، لوگ تجھ سے کیا کیا مانگتے ہیں، دعاؤں کی طرح نہیں مطالبوں کی طرح — جوئے اور گناہوں کے موقعے پر تجھ سے دعا کے طالب ہوتے ہیں۔ میں نے تجھ سے صرف مٹھی بھر آرام، سفید

پوشی اور عزت کی دعا کی تھی۔ پہلے سکون و آرام گیا، پھر سفید پوشی کے لالے پڑے اور اب عزت اور جان بھی خطرے میں ہے۔ سب کچھ تیرا ہی دیا ہوا تھا۔ عزت کے ڈر سے آج میں اپنی اور اپنی آل اولاد کی جان اپنے ہاتھ سے تیرے حوالے کرتا ہوں۔ میرے مولا تو گواہ رہنا— میرے مولا تو مجھے معاف کر دینا۔"

مولانا دروازہ کھٹکھٹاتے رہے، دہائی دیتے رہے، پکارتے رہے۔ کسی نے دروازہ نہ کھولا— اندر سے اتنے فائروں کی آواز آئی جتنے افراد اس گھر میں تھے اور پھر سناٹا چھا گیا۔ وقت سولی پر ٹنگی نعش کی طرح اندھیرے میں لٹکا رہا۔

مولانا نے اس دروازے کی چوکھٹ پر ماتھا ٹیک دیا اور رونے لگے، "بارِ الٰہ! میں نے تو دنیا کو ظِل سمجھا تھا— نورِ آفتاب سے سایہ پہچانا جاتا ہے اور سائے سے نورِ آفتاب— مگر یہ سب، جو چاروں طرف ہو رہا ہے، کیا ہے؟"

دوسرے دن مولانا کا کہیں پتا نہیں تھا۔ ڈپٹی کمشنر اور ایس پی نے بھی انھیں تلاش کروایا تھا۔ مسجد میں پناہ لینے والوں کی نگاہیں بھی انھیں ڈھونڈتی تھیں۔ شمبھو گھاٹ، خیری اسٹیشن پر انھیں بطور خاص ڈھونڈا گیا۔ مگر نہ معلوم انھیں زمین کھا گئی تھی یا آسمان نگل گیا تھا۔ ان کی بہادری کی داستان دور دور تک پہنچی تھی اور اس کے اثر سے سرحدی گاؤں حلوا گھاٹ کے مولوی نے سیکڑوں لوگوں کو مسجد میں پناہ دی تھی اور جان پر کھیل کر ان کی جان بچائی تھی۔

میجر تجمل کے اردلی حضرت گل نے آ کر اطلاع دی کہ مقامی چرچ کے باہر دروازے پر ایک نہایت قابلِ اعتراض پوسٹر لگا ہوا ہے اور چرچ میں دہشت پسند چھپے ہوئے ہیں۔ میجر تجمل اس اطلاع پر کیپٹن جواد، حضرت گل اور چند جوانوں کو لے کر وہاں گیا۔ نزدیک درختوں کے جھنڈ میں چند سپاہیوں نے پوزیشنیں سنبھالیں، باقی میجر تجمل کے ساتھ جیپ میں آگے گئے۔ چرچ کا صدر دروازہ اور تمام کھڑکیاں اندر سے بند تھیں۔ دروازے پر ایک کاغذ چپکا ہوا تھا جس پر رومن اردو میں! بائبل کی چند آیتیں درج تھیں۔ ارمیا باب ۱۵۔۱۱-۱

''اگر وہ تجھ سے کہیں، ہم کہاں جائیں تو ان سے کہہ، خداوند یوں فرماتا ہے کہ جو موت کے لیے ہیں وہ موت کے اور جو تلوار کے لیے ہیں وہ تلوار کے، اور جو کال کے لیے ہیں وہ کال کے اور جو اسیری کے لیے ہیں وہ اسیری کے حوالے کیے جائیں گے۔ اور میں چار قسم کی آفتیں ان پر بھیجوں گا (یوں خداوند کا فرمان ہے) یعنی تلوار جو قتل کرے، کتے جو پھاڑ ڈالیں، ہوا کے پرندے جو کھا جائیں اور زمین کے درندے جو تلف کریں۔''

''ان کی بیوائیں میرے آگے ساحل کی ریت سے زیادہ ہوں گی۔ میں ان کے نوجوانوں کی ماؤں پر دوپہر کے وقت غارت گر لاؤں گا اور ان پر ناگہانی ہول اور دہشت ڈالوں گا۔ سات بچوں کی ماں غش کھائے گی۔ اس کی جان جاتی رہے گی اور اس کا سورج دن ہی کو غروب ہو جائے گا اور وہ شرم سے خجل ہو گی اور میں ان کے باقی ماندوں کو ان کے دشمنوں کے آگے تلوار کے حوالے کر دوں گا۔ (یوں خدا کا فرمان ہے۔)

بہت دیر تک چرچ کا دروازہ کھٹکھٹانے کے بعد اوپر کی منزل سے ایک کھڑکی کھلی اور اس میں سے ایک نن اپنے پینگوئنا، انداز میں جھانکی۔

''میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں افسر؟''

''آپ پلیز دروازہ کھلوادیں، آپ سے ایک بات کرنی ہے۔'' میجر تجمل نے کہا۔

''اگر آنے کا مقصد یہیں سے بتادیں تو بہتر ہو۔'' نن نے کہا۔

میجر تجمل نے بتایا کہ ان کی اطلاع کے مطابق یہاں دہشت پسند چھپے ہوئے ہیں اور وہ چرچ کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔

''میں تمھیں یقین دلاتی ہوں کہ یہاں کوئی دہشت پسند نہیں ہے۔''

''پھر بھی اپنے اطمینان کے لیے اگر آپ ہمیں دیکھ لینے کی اجازت دیں سسٹر۔'' میجر تجمل نے نہایت ملائمت اور شائستگی سے کہا۔

نن نے چند منٹ اندر کسی سے مشورہ کیا پھر کہا، ''آل رائٹ میجر، آپ دیکھ سکتے ہیں لیکن صرف آپ اور بغیر کسی ہتھیار کے۔''

اب چرچ کے باہر مشورہ اور بحث مباحثہ شروع ہوا۔ کیپٹن جواد اس کے تنہا جانے کے خلاف تھا۔ اگر اندر دہشت پسند ہوئے تو اس کا زندہ سلامت لوٹ آنا ممکن نہیں ہے۔ اور بغیر ہتھیار کے جانا تو کسی طرح مناسب نہیں ہے۔ میجر تجمل نے کہا کہ وہ ہتھیار لے کر جائے گا، اگر پون گھنٹے تک وہ واپس نہ آئے تو یہ لوگ ضروری کارروائی کر سکتے ہیں۔

''صاب! میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔'' حضرت گل نے ایک اسمارٹ سلیوٹ کے ساتھ استدعا کی۔

''نہیں حضرت گل! میں اکیلا ہی جاؤں گا۔ تم فکر نہ کرو۔''

''مجھے آپ کی ایک شرط منظور ہے۔'' میجر تجمل نے نن سے کہا، ''میں تنہا آؤں گا مگر ہتھیار کے ساتھ۔ آج کل ہم اپنا ہتھیار چھوڑنے کے مجاز نہیں ہیں۔''

''او کے، اپنے ساتھیوں سے کہیے کہ چرچ کے باہر ذرا دور جا کر کھڑے ہوں۔'' جب میجر تجمل کے ساتھی چرچ سے ذرا فاصلے پر درختوں کے ایک اور چھوٹے جھنڈ کے نیچے جا کر کھڑے ہو گئے تب اسی نن نے آ کر دروازہ کھولا اور اسے اندر لے گئی۔ چہار طرف آگ اور خون سے ابلتے دنوں میں چرچ میں بے حد ٹھنڈک اور سکون تھا۔ نیم تاریکی میں ایزل اپنی صفائی اور نفاست میں پڑے دمک رہے تھے۔ حضرت عیسیٰ اور بی بی مریم کے مجسمے خاموشی سے ایستادہ تھے۔ بڑے بڑے گلدانوں میں تازہ پھول، شمع دانوں میں شمعیں اور رنگین کھڑکیاں، سب بے حد شانت تھیں۔

پورے گرجا کا چکر لگانے کے بعد میجر تجمل نے رہائشی حصہ دیکھنے کی فرمائش کی۔ نن ٹھٹکی، کچھ دیر سوچتی رہی۔ پھر اس نے کہا، ''کیا یہ بہت ضروری ہے۔''

''ضروری نہیں، میری مجبوری سسٹر — ایسی اطلاع پر ہمیں کارروائی کرنی پڑتی ہے، ورنہ میرا کورٹ مارشل ہوسکتا ہے۔''

''ایسا ہے تو آؤ۔''

وہ میجر تجمل کو رہائشی علاقے میں لے گئی۔ اس کے جیسے لبادے پہنے دوسری ننیں تیز تیز قدموں سے اپنے کام کرتی پھر رہی تھیں۔ کسی نے میجر تجمل کی آمد پر حیرت یا دل چسپی کا اظہار کیا نہ کوئی سوال پوچھا۔

''ہمارے ہاں اس طرح کے بیڈ روم ہوتے ہیں، ہر نن کا الگ کیوبکل۔'' نن نے بتایا۔ ایک کمرے میں چار سلاخوں کے درمیان دودھ ایسے پردے پڑے ہوئے تھے — ان کے پیچھے نسوانی وجود کا احساس تو ہوتا تھا مگر بلوائیوں کا نہیں۔

''عام حالات میں یہاں کسی کو آنے کی اجازت نہیں ہوتی۔'' سسٹر نے کہا۔

میجر تجمل نے انھیں زحمت دینے پر افسوس کا اظہار کیا۔ سسٹر باہر چھوڑنے آئی تو میجر تجمل نے دروازے پر لگا ہوا پوسٹر اسے دکھایا۔ وہ تھوڑی اردو اور بنگلہ جانتی تھی۔

''مجھے بہت افسوس ہے میجر، لیکن یہ کام ہمارے چرچ کے کسی آدمی کا نہیں ہے، کسی باہر والے کا ہے۔ تمھیں معلوم ہے نا کہ مکتی باہنی میں کالج اور یونی ورسٹی کے لڑکے ہیں، وہی یہ کام کر رہے ہیں۔ گھروں پر، مسجدوں پر، مندروں اور گرجاؤں پر ایسے پوسٹر لگائے جاتے ہیں۔ میں اسے صاف کروادوں گی۔''

''شکریہ سسٹر۔''

''تمھارا نام کیا ہے میجر؟''

''تجمل۔''

''تجمل'' — نن نے کہا، ''تم بہت اچھے آدمی ہو۔ تم سے میں ایک بات کہنا چاہتی ہوں۔ تم اپنے ماتحتوں سے بھی کہنا کہ دنیا میں انتقام سے برا کوئی جذبہ نہیں ہے — ایسا انتقام جس میں خطا کار اور بے خطا کی قید مٹ جائے۔ ایسا انتقام اندھا، بہرہ اور گونگا ہوتا ہے۔ وہ صرف خون کا پیاسا ہوتا ہے اور جتنا خون چاٹتا ہے اس کی پیاس بڑھتی جاتی ہے — خون کا ایک قطرہ گرتا ہے تو بارش کے پہلے قطرے کے بعد آنے والے قطروں کی طرح لہو کا مینہ برساتا ہے۔ کوشش کرو کہ خون کی یہ بارش رک جائے۔''

''ہم کوشش کریں گے سسٹر، آپ ان لوگوں کو بھی تو سمجھائیے۔''

''ان کو بھی سمجھاتے ہیں۔ ان سے بھی کہتے ہیں کہ دیکھو ہٹلر اور مسولینی جیسے لوگ حب الوطنی، اپنے حقوق، اور اپنی قوم کے نام پر بے دریغ لوگوں کو مرواتے ہیں۔ وہ لوگوں کے ذہنوں کو اس بات پر بھی تیار کر لیتے ہیں کہ اپنے حق کے لیے چند لاکھ جانیں لے لینا کوئی بات نہیں ہے۔ خدا ایسے

لوگوں کو سمجھ دے۔ او کے میجر، گاڈ بلیس یو۔'' سسٹر نے تجمل سے ہاتھ ملایا۔ سفید، نرم شفقت بھرا ہاتھ۔

ہمارے لائق کوئی کام ہو تو ہم ہر وقت تیار ہیں میجر۔'' پھر اس نے کہا۔

''میرے لائق کوئی خدمت ہو تو میں بھی حاضر ہوں۔'' میجر تجمل نے جواب دیا۔

وہ ٹھٹکی میجر تجمل کو غور سے دیکھا اور بولی، ''وعدہ!''

''میری ڈیوٹی کے خلاف کوئی کام نہ ہوا تو وعدہ۔''

''ہمارے ہاں دہشت پسند تو کوئی نہیں ہے، ایک لڑکی ہے — اس کا شوہر اپنے گھر والوں کو ملنے دیناج پور گیا تھا۔ وہ ابھی تک نہیں لوٹا ہے — کیا تم اس کا پتا لگا سکتے ہو — اس کے یہاں ہونے کی اطلاع اس کے والدین تک پہنچا سکتے ہو؟''

''ہاں ہاں سسٹر، ضرور کیوں نہیں۔''

''اچھا تو ایک منٹ کے لیے اندر آؤ، میں تمھیں اس کا پتا دے دوں۔''

''ذرا ٹھہریے سسٹر، میں اپنے ساتھیوں کو اطلاع دے آؤں۔ ایسا نہ ہو کہ مجھے دیر ہو جائے اور وہ چرچ پر حملہ کر دیں۔'' تجمل نے ہنس کر کہا۔

''او کے، ساتھیوں کو بتا کر آنا، مگر تنہا۔''

میجر تجمل نے باہر جا کر ہاتھ سے اشارہ کیا۔ کیپٹن جواد تیز تیز چلتا اور حضرت گل بھاگتا ہوا اس تک پہنچا۔

''سب ٹھیک ہے۔ میں ابھی دو منٹ میں آتا ہوں۔''

''اندر کون لوگ ہیں؟'' کیپٹن جواد نے پوچھا۔

''کوئی نہیں ہے۔ سسٹرز ہیں اور ایک لڑکی ہے''

''کون ہے وہ؟ بنگالی ہے؟'' کیپٹن جواد کے لہجے میں اصرار تھا۔

''کوئی بھی ہو، دہشت پسند نہیں ہے۔ بے چاری اپنی ہی مصیبت میں گرفتار کوئی کمزور سی لڑکی ہے۔''

''آپ کو نہیں معلوم، یہ کمزور سی بے چاری لڑکیاں پانی کے جہازوں کے نیچے ڈائنا مائٹ چپکانے کی ٹریننگ لے رہی ہیں۔ باقاعدہ مکتی باہنی میں شریک ہیں۔''

''ہر ایک نہیں، اگر ان کو ایسا کرتے دیکھو تو ضرور مارو لیکن ...... تم چلو میں ابھی آتا ہوں۔''

وہ سسٹر کے ساتھ دوبارہ چرچ میں گیا۔ سسٹر نے دروازہ مقفل کیا اور اسے لے کر اپنے دفتر میں آئی۔ صاف شفاف خنک چھوٹا سا دفتر تھا۔ جہاں میز کرسیاں اور ٹائپ رائٹر تھے اور مذہبی قسم کی کتابوں، رسالوں اور کتابچوں کے ڈھیر تھے۔

میجر تجمل کو بٹھا کر وہ اندر گئی اور تھوڑی دیر بعد ایک اور سسٹر کو اندر لے آئی۔

''میجر تجمل — مہرن سا۔'' سسٹر نے تعارف کروایا۔

میجر تجمل نے اس کی طرف دیکھا اور فوراً تاڑ لیا کہ وہ سسٹر نہیں، دبلی پتلی کومل سی بنگالی لڑکی تھی جسے سفید راہبانہ لباس پہنا دیا گیا تھا۔

''مہرالنساء۔'' لڑکی نے دُہرایا۔ ''ویسے مجھے پاول کہتے ہیں۔''

''تم اپنے شوہر اور والدین کا پتا یہاں بیٹھ کر لکھ دو۔'' سسٹر نے میز کرسی کی طرف اشارہ کیا۔

لڑکی نے شوہر کا نام پتا لکھ کر اس کی طرف بڑھا دیا۔

''والدین کا؟'' میجر تجمل نے پوچھا۔ لڑکی کے سانولے چہرے پر گلابی لہر سی دوڑ گئی۔ اس نے نظریں جھکا کر آہستہ سے اردو میں کہا، ''میں نے اپنی مرضی سے ایک کلاس فیلو سے شادی کر لی تھی۔ میرے بڑے بھائی آئے، انھوں نے کہا، تم ہمارے ساتھ چلو۔ ہم گھر سے باقاعدہ تمھاری شادی کریں گے مگر میں نے ساتھ جانے سے انکار کر دیا کہ شادی ہو ہی چکی ہے تو ان تکلفات کا کیا فائدہ۔ اب گھر جانے کی مجھ میں ہمت نہیں ہے — البتہ اگر آپ کچھ دیر ٹھہریں تو ایک خط اپنی بھتیجی کو لکھ دوں جو میری دوست ہے۔ آپ کسی طرح وہ خط اس کے ہاتھ میں پہنچا سکیں۔''

''ہاں کوشش ضرور کریں گے، آپ لکھ دیں۔''

پاول جلدی جلدی بنگلہ میں خط گھسیٹنے لگی۔ میجر تجمل دروازے کے باہر جھومتے، درو دیوار اور چھت کو چھو کر گزرتے ہوئے ناریل کے درختوں کی سرسراہٹ سنتا رہا۔ سامنے لان میں کھجور کے درخت میں کھوٹ ملے سونے کے رنگ کی کھجوروں کے گچھے لٹک رہے تھے۔ سسٹر نے ایک پیالی چائے میجر تجمل کو لا کر دی۔ اس نے کھڑے ہو کر شکریے کے ساتھ لی اور آہستہ آہستہ پینے لگا۔

کتنی ان ہونی سی بات ہے کہ پاکستانی فوج کا ایک میجر اس وقت ایک چرچ میں ایک بنگالی لڑکی کے برابر میں بیٹھا ہوا چائے پی رہا ہے۔ ان حالات میں کوئی اس بات کو فطری اور قدرتی نہیں کہے گا — کم از کم اس کا ٹو آئی سی کیپٹن جواد تو ہرگز اس پر صاد نہیں کرے گا۔ وہ گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

پاول نے خط لکھ کر اور لفافے پر چھاپا بھتیجی کا پتا لکھ کر تجمل کے حوالے کیا۔

''اوکے سسٹر، آپ نے جو کام میرے سپرد کیے ہیں ان کا کوئی نتیجہ نکلا تو میں اطلاع دوں گا۔'' میجر تجمل تعظیماً اٹنشن ہوا۔

''تھینک یو میجر، گاڈ بلیس یو۔''

پاول نے کچھ نہ کہا۔ صرف ممنون نظروں سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

میجر تجمل کے چلے جانے کے بعد سسٹر نے چرچ کا صدر دروازہ اندر سے اچھی طرح مقفل کر لیا۔

جمال میڈیکل ریلیف کی ایک ٹیم کے ساتھ اپنی دوسری خالہ اور گھر والوں کی تلاش میں دیناج پور آیا تھا۔ ان کا کوارٹر دوسرے سارے گھروں کی طرح خالی پڑا تھا۔ جلے ہوئے کاغذوں کی راکھ ہر طرف اُڑ رہی تھی۔ انسانی کھوپڑیاں لڑھکتی پھر رہی تھیں اور جنگلی جانور خوراک کی افراط کے سبب اب اس سے بے نیاز ہوکر اِدھر اُدھر گھوم رہے تھے۔ ان لاشوں کے چہروں کا کرب اور ان کی آنکھوں کے سوال جمال کے دل کو کچوک رہے تھے۔ یوں محسوس ہوا کہ فوری طور پر اس نے کچھ نہ کیا تو اس کا دل پھٹ جائے گا۔ وہ کیا کرے — وہ ان گزرے ہوئے لوگوں کے لیے اب کیا کرسکتا ہے؟ پاگلوں کی طرح اِدھر اُدھر چکر کاٹتے ہوئے اس نے ایک کوئلہ اٹھایا اور کمرے کی دیوار پر تصویر بنانے لگا۔ اس کام میں اسے کچھ سکون سا محسوس ہوا۔ کیا آرٹسٹ بننے کی یہ خواہش میرے پرکھوں سے مجھے ملی ہے؟ اس نے سوچا — ہوسکتا ہے میرے آباؤ اجداد میں کوئی بڑا فن کار گزرا ہو — پہلے، بہت پہلے شاید رامائن، مہابھارت، اوستا یا انجیل کو پہلے مصور کرنے والوں میں سے کوئی میرا نگڑ دادا رہا ہو — یوں سلسلہ ملاتے چلے جاؤ تو شاید غار کے اس عظیم کلاکار سے بھی مل جائے گا جو شکار سے اُکتا کر مشعل کی روشنی میں غار کی دیواروں پر تصویریں کھودا کرتا تھا۔ اور اس تصویر کھودنے والے کو یہ کب معلوم ہوگا کہ آنے والے طویل کل میں اس کا شمار فن کاروں میں ہوگا، زندگی کرنے والوں میں نہیں ہوگا۔ آج کل کے فن کار تو زندگی سے کٹ گئے ہیں جیسے نرگس باجی زندگی سے دور فن کاری میں مصروف ہیں — اور جو لوگ زندگی کررہے ہیں وہ فن سے الگ ہیں۔ لیکن ممکن ہے اُس زمانے میں بھی یہی

ہوتا ہو۔ جب سارے غار والے شکار کے لیے جنگل میں چلے جاتے ہوں تب غار کا پوتی فن کار اٹھتا ہو اور اوزار اٹھا کر دیواروں پر جانوروں کی تصویریں بنانے لگتا ہو۔ اسے اصل جانوروں سے زیادہ وہ جانور عزیز ہوں جو اس نے دیوار پر بنائے ہیں۔ اسے ہرے بھرے نرسلوں سے زیادہ وہ سرکنڈے اچھے لگتے ہوں جو اس نے خود کھودے ہیں۔ وہ باہر نکل کر ان سرکنڈوں کو ذہن میں محفوظ کرنے کے لیے غور سے دیکھتا ہوگا تاکہ جب وہ اس کے سفید پھول پتھروں میں منتقل کرے تو دیکھنے والوں کو اس کی گرمی اور نرمی اپنے پوروں پر محسوس ہو۔

یہ فن کار ہرگز کسی شکار کو اپنے ہاتھ سے نہ مارتا ہوگا بلکہ مرتے وقت مردہ بیل کی آنکھوں کے اس کرب کو دیکھتا ہوگا جو زندگی کے آخری لمحوں میں ہی پیدا ہو سکتا ہے۔ جینے کی بے پناہ خواہش کے ساتھ موت کی آگاہی اور اتھاہ مایوسی۔

اس نے بھی بے شمار انسانوں کو مرتے دیکھا تھا اور ان کی آنکھوں کے کرب کو دیوار پر اتارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ یکایک دروازے کے باہر اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔

''کون ہے، کون ہے اندر؟'' صاف اردو میں کسی نے ڈپٹ کر پوچھا۔

''رضا کار۔'' جمال نے سوچا۔ اسپتال سے ریلیف کمیٹی کا کوئی آدمی اسے ڈھونڈتا ہوا آیا ہے۔

دفعتاً چ بنگلہ کی آواز کے ساتھ تیزی سے دروازہ کھلا اور اس سے قبل کہ وہ کونے میں رکھی ہوئی رائفل کی طرف دیکھ پاتا، آنے والا فائر کر چکا تھا۔ اب جمال کی اپنی آنکھوں میں وہی سوال، وہی کرب تھا جو وہ دیوار پر منتقل کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

پانی میں ایک کنکری پھینکی جاتی ہے تو چھوٹا سا ایک دائرہ بنتا ہے، پھر یہ دائرہ بڑھتا جاتا ہے، ایک اور — ایک اور — دائرے بنتے جاتے ہیں، پھیلتے جاتے ہیں۔ یہ چین ری ایکشن ہے۔ مارچ میں ڈھاکا اور چاٹگانگ میں موت کے جو دائرے بنے تھے وہ اب بڑھتے جا رہے تھے۔ کشتیا، جیسور، پبنہ، پاکسی، سلہٹ، میمن سنگھ، راج شاہی، ٹھاکر گاؤں، برہمن باڑی، بوگرا، رنگ پور، شانتا ہار اور دیناج پور — ہر طرف موت تھی جس کے بہت سے نام تھے۔ بغاوت، عملِ صفائی، سزا اور انتقام — ان میں سے کسی ایک نام سے موت ہر ایک کا پیچھا کر رہی تھی، وحشی کتے کی طرح — کیا وہ صرف ایک موت تھی — موت سے زیادہ اذیت ناک اس کا تصور تھا، اس سے بھاگنے کی ذہنی تکلیف تھی۔ اپنے بدن پر اس کے تیز نوکیلے دانتوں کی پکڑ، اس کی لال انگارہ آنکھوں اور لہو ٹپکتی زبان کا تصور اور خوف!

اور وہ سب جو بالآخر اس تصور کو جھیل گئے تھے، ایک قطار میں کھڑے تھے۔ ان میں مرد، عورتیں بوڑھے، جوان اور بچے، سب ہی تھے۔ بچے، جنھوں نے بمشکل چلنا شروع کیا تھا، بچے جو ابھی پیدا

ہوئے تھے، ماں باپ جوان کا سہارا تھے اور بزرگ جو پوری نسل کے لیے چھتنار درخت کا سایہ تھے۔

ان میں سے ایک نے بتایا کہ اس کی دونوں ٹانگوں کو دو مختلف سمت جانے والی جیپوں میں باندھا گیا تھا۔۔۔ پھر بے انتہا جسمانی اور ذہنی کرب، اس کے دو الگ الگ حصے، جن میں سے ایک حصے میں دل کی دھڑکن بہت دیر تک باقی رہی تھی۔ اور ذہن انتہائی کرب کے ساتھ فوری طور پر دھند میں ڈوب گیا تھا۔۔۔ دونیم ہو جانے کا شدید احساس بھی باقی تھا۔

دوسرے نے بتایا۔۔۔ اس کو درخت سے لٹکا دیا گیا تھا۔ قصائی کی چھری سے سوت سوت بھر کھال اتاری گئی تھی جیسے کسی بکرے کی اتاری جاتی ہے پھر اس کی بوٹیاں بنائی گئی تھیں اور چیل کوّوں کو کھلائی گئی تھیں۔

کھیلوں کے دور آتے ہیں، کبھی کرکٹ کا سیزن ہوتا ہے۔ رمنا میں، پلٹن میدان میں، قلعے کے چمن زاروں میں، شہر کی گلیوں گلیاروں میں اور دیہات کے میدانوں میں۔۔۔ آج کل انسانی لاشوں کو سجانا اور کھوپڑیوں کے مینار بنانے کا فیشن تھا۔ میں بھی اس کھیل کا ہدف بنا تھا۔ میرا سر کٹا بدن اور دوسرے سروں پر سجا میرا سر، دونوں ہی نہایت بھیانک لگ رہے تھے۔ سر جو آہستہ آہستہ کھوپڑی میں تبدیل ہو رہا تھا۔ اپنی آنکھوں، گوشت پوست اور نقش و نگار سے محروم ہو رہا تھا مگر جس کو زندگی سے محروم ہونے میں دو سیکنڈ سے زیادہ نہیں لگے تھے۔ ایک دانش ور نے بتایا۔

اور وہ اپنی ماں کی مخملیں کوکھ کے اندھیرے میں محفوظ بے جان بھی تھا اور جان دار بھی تھا۔۔۔ پھر اس کی ماں کو بے حرمت کیا گیا تھا، اس سے وہ کچھ کہلوایا گیا تھا جو وہ کہنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ دیکھنے پر مجبور کیا گیا تھا جو دیکھنا نہیں چاہتی تھی۔ اسے مخملیں اندھیرے سے نکال کر نیزے کی نوک پر بلند کیا گیا تھا اور پھر اسی نیزے سے اس کی ماں کو قطرہ قطرہ، بوند بوند ہلاک کیا گیا تھا۔

اور وہ ایک اچھا آرٹسٹ تھا۔ اس نے سفید کینوس پر گڑھل کے سرخ پھول کی تصویر بنائی تھی۔ اس کا قاتل اس تصویر سے بہت متاثر ہوا تھا۔ اس نے آرٹسٹ کے دل کو نکال کر اسی انداز سے اس کی قاشیں بنائی تھیں اور گڑھل کے پھول کی طرح کھول کر چاقو میں سجا کر کینوس پر رکھ دیا تھا۔ دل سے رسنے والا خون پوری تصویر پر سے ہوتا ہوا زمین پر گرا تھا اور قاتل نے اپنی اس جدت پر قہقہے لگائے تھے۔

اور وہ ایک شریف، محنتی اور با اصول آدمی تھا۔ اس کے لہو کے چڑھتے دریا کو سرنج کے ذریعے کھینچا گیا تھا اور بدن کے سوکھے تانت کو اس کے اپنے گھر کے سامنے پھینکا گیا تھا تاکہ لوگ دیکھیں کہ شرافت اور بااصولی کی کیا سزا ہو سکتی ہے۔۔۔ اس نے اپنے جسم سے خون نکلتے اور خود کو لمحہ بہ لمحہ، خون بہ خون، قطرہ بہ قطرہ مرتے دیکھا تھا۔ ایک لڑکی نے کہا، وہ کنواری، خوب صورت اور جوان

تھی — مرنے سے پہلے اس نے انسانی جسم کی جو ذلت دیکھی — انسان کو جس حد تک گرتے دیکھا، اس کے نتیجے میں مرنے کی شدید خواہش کی اور مرتے وقت اتھاہ مسرت محسوس کی — اور ایک آخری خواہش کہ انسان کسی کے ہاتھوں اتنا ذلیل نہ ہو کہ اسے انسانی وجود سے بلکہ ہر ہر وجود سے نفرت ہو جائے اور موت زندگی کی سب سے بڑی چاہت، یہاں تک کہ محبوب بن جائے۔

اور وہ ایک کسان تھا۔ اس نے کہا، میرے بدن کے ٹکڑوں کو کھیت میں بکھیرا گیا تھا۔ مجھ جیسے ہزاروں کے اعضا کھیتوں میں اس طرح پڑے تھے جیسے گنے کے کھیت کاٹے جانے کے بعد ان کے ٹکڑے پڑے رہ جاتے ہیں — شکر ہے کہ ان بریدہ سروں، کٹی انگلیوں اور ٹوٹی پسلیوں سے کوئی فصل نہ اُگی۔

مجھے انجن کے جلتے ہوائکر میں جھونکا گیا تھا ایندھن کی طرح — ریلوے کے ایک ملازم نے بتایا۔ میرے جسم کی ہڈیاں کوئلے کی طرح چٹخی تھیں۔ مجھ سے پہلے بھی سیکڑوں اس بھٹی میں جھونکے گئے تھے۔ گوشت بھنتا رہا تھا، بو پھیلتی رہی تھی جیسے انسانی جسموں کے کباب بنائے جا رہے ہوں۔ شاید اس ایندھن میں جھونکنے والے لوگوں کی ناک نے سونگھنا، آنکھ نے دیکھنا اور دل نے محسوس کرنا چھوڑ دیا تھا۔

لیکن اسے یوں لگا جیسے اس کے دل نے آہستہ آہستہ دھڑکنا اور آنکھ نے پھر دیکھنا شروع کر دیا ہے۔

''کہاں گئے وہ سب لوگ۔'' جمال نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کون لوگ؟'' ایک جانی پہچانی آواز آئی۔ ''جمال، یہ میں ہوں کمال۔''

''اچھا! — تو یہ گولی تم نے چلائی تھی۔ میری قسمت میں تھا کہ سگے بھائی کے ہاتھوں مارا جاؤں۔''

''نہیں، وہ میرا ساتھی تھا میلو — وہ اپنے بہنوئی کی تلاش میں یہاں آیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ سرکٹ ہاؤس میں فوج موجود ہے — مجھے اسی لیے ساتھ لایا تھا کہ کوئی پوچھے تو ہم خود کو رضا کار ظاہر کر سکیں۔ لیکن تمھارے منہ سے رضا کار کا لفظ سنتے ہی جیسے وہ دیوانہ ہو گیا۔ اور جب اسے پتا چلا کہ تم میرے بھائی ہو تو وہ ڈر کر بھاگ کھڑا ہوا کہ کہیں غصے کے مارے میں اسے قتل نہ کر دوں۔''

''تو تم نے ابا کے مارے جانے کے بعد بھی ان کا ساتھ دیا؟''

''ہاں، میں سمجھتا رہا کہ شاید ہماری نجات اسی میں ہے۔''

''تم یہاں کیوں آئے تھے؟''

''میں خالہ، خالو اور بچوں کی تلاش میں یہاں آیا تھا، تمھیں یاد نہیں کہ ہماری ایک خالہ دیناج پور میں بھی تھیں مگر یا تو وہ سب مارے جا چکے ہیں یا قید کر لیے گئے ہیں۔''

''تو تم اس خالی گھر میں کیا کر رہے تھے؟''

''میں پکاسو کی گورنیکا جیسی ایک تصویر بنا رہا تھا— ظلم، تشدد اور انتقام کے خلاف — ایک آرٹسٹ اپنی کٹی پھٹی خون رستی انگلیوں سے تصویر بنا رہا ہوگا— کسی شخص کے بال کسی ان دیکھے شخص کے ہاتھ میں ہوں گے۔ اس کی آنکھیں خوف سے ابل رہی ہوں گی۔ دیوار پر بچے کا بھیجا چپکا ہوگا۔ چاروں طرف لپٹے ہوئے برقعے اور لپٹی ہوئی ساریاں ہوں گی۔ شہوت زدہ ہاتھ، جن سے لانبی لانبی خون آلود زبانیں لٹک رہی ہوں گی، برہنہ جسموں کی طرف لپک رہے ہوں گے۔ ان سب کی آنکھیں آسمان پر گڑے سرخ سورج کو تک رہی ہوں گی۔ دوسری طرف چاند کے گول چہرے سے شعلے بلند ہو رہے ہوں گے جیسے کسی بھٹی کے دہانے سے آگ نکلتی ہے اور اس دہانے میں انسانی ہڈیاں ایندھن کی طرح ٹھونسی جا رہی ہوں گی اور......اور...... آہستہ آہستہ اس کی آواز مدھم ہو کر ڈوب گئی۔''

کمال نے انتہائی دکھ سے اپنی آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیے۔

سارے گھر میں کھلبلی سی مچی ہوئی تھی۔ بیگم مصباح الحق بے حد بوکھلائی ہوئی تھیں۔ ابھی ابھی مصباح الحق صاحب نے آ کر اطلاع دی تھی۔

''باہر ایک میجر آیا ہے اور پتل سے ملنا چاہتا ہے۔''

سورج کو میجر کا نام پوچھنے کے لیے بھیجا گیا۔ میجر خالد!— بینو کو نام سنا ہوا لگا۔

''میں پوچھتی ہوں کہ پتل سے کیا کام ہے؟'' بینو نے کہا اور آگے بڑھ کر دروازے تک گئی۔ مصباح الحق صاحب چند گز پیچھے کھڑے رہے۔ ان کے پاس سورج کھڑا تھا۔ بیگم حق دروازے کے پیچھے سے جھانک رہی تھیں اور دل ہی دل میں دعائیں پڑھ رہی تھیں۔

''مہر النسا پاول نے ایک خط دیا ہے نور جہاں حق کے نام۔ ان کا اصرار ہے کہ خط نور جہاں ہی کو دیا جائے۔''

''اچھا ٹھیک ہے؟۔'' بینو نے چپکے سے مصباح الحق صاحب سے کچھ کہا۔ مصباح الحق صاحب نے قدرے اطمینان کا سانس لیا۔

''تم یوں کرو کہ باہر باغ میں جو کرسیاں پڑی ہیں، میجر کو وہاں بٹھا دو— پتل کو وہیں بلا لو۔''

''آپ گھبرائیے نہیں، میں اس کے ساتھ رہوں گی۔'' بینو نے کہا

بینو نے میجر خالد کو گل مہر کے سائے میں بٹھایا۔ اسے یاد آ گیا تھا کہ شمس الرحمٰن اکثر میجر خالد کا ذکر کیا کرتا تھا۔ پتل اور بینو دونوں باہر آئیں اور کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ میجر خالد نے پوچھا، ''آپ

دونوں میں سے نور جہاں حق کون سی ہیں؟''

''میں۔'' پتل نے کہا۔''یہ میری بھابی ہیں اور دوست بھی — پاول تو خیریت سے ہیں، وہ آپ کو کہاں ملیں؟''

''مجھے نہیں ملیں، میرے ایک دوست میجر تجمل نے کسی کے ہاتھ یہ خط بھجوایا ہے۔ تفصیلات خط میں ہوں گی۔''

پتل خط پڑھتی رہی۔ بینو اور میجر خالد، شمس الرحمٰن اور زری کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ سورج چائے لے کر آیا۔ ایک پلیٹ میں ایک رس گلا اور گلاب جامن دوسری پلیٹ سے ڈھکی ہوئی رکھی تھی۔ ذرا دیر میں مصباح الحق صاحب بھی ٹہلتے ہوئے آئے اور موسم کے بارے میں باتیں کرتے رہے۔ میجر خالد نے صرف چائے پی اور اجازت چاہی۔

اس کے جانے کے بعد بیگم مصباح الحق بھی وہاں آ گئیں۔ باری باری سب نے وہ خط پڑھا۔ پاول نے لکھا تھا:

پتل پیاری! میں خیریت سے ہوں مگر بے حد پریشان ہوں۔ میرا شوہر یوسف چند روز ہوئے، دیناج پور گیا تھا مگر ابھی تک نہیں لوٹا ہے نہ اس کی کوئی اطلاع آئی ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ اسے مکتی فوج گرفتار کر کے سرحد پار لے گئی ہے۔ کسی جاننے والے کے ذریعے سے یوسف کا پتا لگواؤ۔ میں آج کل ایک چرچ میں رہ رہی ہوں۔ اگر یوسف کا پتا نہ چلا تو سدا کے لیے نن بن جاؤں گی۔ ممکن ہو تو ابا، امی، بھائی اور بھابی کو میرے بارے میں کچھ نہ بتانا۔ انھیں دکھ ہوگا۔

تمھاری پاول

میلو کا خط پاول کے نام آیا تھا۔

''پھوپھو! میں دیناج پور گیا تھا، وہاں کتے اور گدھ لوٹ رہے تھے۔ اتنا تعفن کہ کھڑا رہنا دشوار تھا۔ کنچن ندی کی سفید ریت سرخ ہو رہی تھی۔ ۲۸ر مارچ کی رات کو ایسٹ پاکستان رائفلز کے لوگوں نے اپنی رجمنٹ میں شامل پنجاب رجمنٹ کے لوگوں کو ختم کر دیا تھا۔ ۲۱ر اپریل تک ایک بہاری بھی نہیں چھوڑا تھا۔ شہر میں جھاڑو پھیر دی تھی۔ اکا دکا کوئی بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گیا ہو تو نہیں کہہ سکتے۔ بنگالیوں نے اپنے بیوی بچوں کو پہلے ہی بھیج دیا تھا۔ جب پاکستان کی فوج شہر میں داخل ہونے لگی تو رہے سہے بنگالیوں کو اکٹھا کر کے بھارت پہنچا دیا گیا۔ چناں چہ یہاں سوائے نعشوں، گدھوں اور کتوں کے کچھ نہ رہا — اقبال ہائی اسکول میں اجتماعی قبروں میں نعشیں بھری پڑی تھیں۔ نیوٹاؤن کا جو پتا تم نے لکھا تھا وہاں کوئی نہ تھا۔ البتہ نیوٹاؤن کیمپ میں چند بہاری تھے۔ میرے ساتھی نے وہاں

جا کر پوچھا، وہ تمھارے نام نہاد شوہر کے بارے میں کچھ نہ بتا سکے۔ چہل غازی کے مزار کے پاس جنگل میں کچھ بچے جنگلی خرگوشوں کی طرح گھوم رہے تھے، چند بڑی بوڑھیاں پھٹے کپڑوں میں اور ایک بوڑھا مجذوب، جس نے میرے بارے میں پیش گوئی کی کہ جلد ہی مجھے کوئی تمغا ملے گا مگر افسوس کہ تمھارے شوہر کے بارے میں وہ بھی کچھ نہ بتا سکا۔ غرض تمھارے کہنے سے میں اپنی جان خطرے میں ڈال کر اپنی سی کوشش کر لی۔ ایک رضا کار کو بھی ٹھکانے لگایا۔ یہ ایک دل چسپ اور عجیب قصہ ہے جو کبھی زبانی سناؤں گا۔

پھوپھو! گو میں چھوٹا ہوں مگر آج کل ایک بڑا کام کرنے میں مصروف ہوں اس لیے تمھیں نصیحت کرنے کا حق رکھتا ہوں۔ وہ نصیحت یہ ہے کہ اب تم اپنے شوہر کو بھول جاؤ اور دیش کے لیے کام کرو۔ یہ وقت انفرادی دکھوں پر کڑھنے کا نہیں، اجتماعی طور پر کام کرنے اور قربانیاں دینے کا ہے۔ ہوسکتا ہے تم اپنے حصّے کی قربانی دے چکی ہو۔ مجھے یقین ہے کہ تمھاری قربانی قبول ہوئی۔

اب کام کا وقت ہے۔ چرچ میں رہتے ہوئے تم ہماری بہت مدد کر سکتی ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تمھیں یہ موقع دیا ہے کہ ہمیں پیسوں کی، شرنارتھیوں کے لیے کپڑوں اور دواؤں کی، پاکستانی فوج کے بارے میں انفارمیشن کی ہر چیز کی ضرورت ہے۔ اس میں سے جو بھی تم مہیا کر سکو— ہمارا آدمی وقتاً فوقتاً تمھارے پاس آتا رہے گا۔

یہاں دو قسم کا کام ہو رہا ہے۔ ایک امدادی کام، دوسرے دیش کو آزاد کرانے کے لیے باقاعدہ جنگ کی تیاری— میں نے کچھ دن پہلا کام کیا اور مرتے مرتے بچا۔ پوچھو کیوں؟ اس لیے کہ بھارت کے سرحدی علاقوں میں ڈم ڈم سے لے کر رانا گھاٹ تک ہیضہ پھیلا ہوا تھا اور میں امدادی کام کر رہا تھا۔ اسکول اسپتال میں تبدیل کر دیے گئے تھے۔ یقین کرو پھوپھو، میں نے زندگی میں ایسا بھیانک منظر نہیں دیکھا۔ ایک دن میں کیمپ کے کیمپ صاف ہو جاتے تھے۔ اسپتال میں زمین پر قطاروں میں مریض پڑے ہوتے تھے جو اسی طرح وہاں پڑے پڑے مر جاتے تھے۔ بڑے آدمی جو معائنے کے لیے آتے تھے، کھانا کھا کر اور پانی ساتھ لے کر آتے تھے۔ وہاں لقمہ بھی نہیں توڑتے تھے۔ لیکن ہم لوگ مریضوں کو اٹھاتے بٹھاتے، دوائیں دیتے اور ٹیکے لگواتے تھے۔

پھوپھو، ایک وقت آیا کہ کرشن گڑھ میں مرنے والوں کو دفنانے کا کام ٹھیکے پر دیا گیا۔ تین چار میل دور بڑی بڑی قبریں کھودی گئیں اور لاشوں کو ٹھیلوں پر لکڑیوں کی طرح لاد کر ہندو، مسلمان، بوڑھے، بچے ایک ساتھ دفن کر دیے گئے۔ میں بھی اس مرض کا شکار ہوا۔ مگر بچ گیا۔

پھوپھو! تم نے یو۔ این والوں کی وہ خبر بھی اخباروں میں ضرور پڑھی ہوگی کہ سرحدی علاقوں میں

اگلے دس دن میں ایک لاکھ بچے مرجائیں گے۔ کھانے کی کمی، بیماریاں اور ذہنی پریشانیاں ایسی کہ حساب نہیں۔ جس کو کیمپ میں جگہ ملتی ہے اس کو راشن کارڈ مل جاتا ہے۔ کیمپ کے باہر سیکڑوں افراد یوں ہی پڑے ہوئے ہیں۔ اور لوگ برابر چلے ہی آرہے ہیں۔ مرد لنگیاں باندھے ننگے بدن، سر پر بستروں کا لپٹا ہوا بنڈل، عورتیں گود میں گرسنہ بڑی بڑی آنکھوں والے بچے اٹھائے۔ ننگے لڑکے ہاتھ میں ایک آدھ سامان لیے دریا پار کر کے، یا بیل گاڑیوں میں بیٹھے چلے آرہے ہیں — حال میں محصور، مستقبل سے بے خبر — پھوپھو! اتنی کم عمری میں بہت کچھ دیکھ لیا۔ لگتا ہے ابھی بہت کچھ دیکھنا قسمت میں ہے۔ جب ہم فاتح بن کر داخل ہوں گے تو ہم سب کی محبوبائیں، بیویاں اور بہنیں ہار لیے ہمارا سواگت کریں گی۔ یہ امید بھی ہے اور یقین بھی، جس کے سہارے گھروں سے الگ کٹھنائیاں جھیل رہے ہیں۔

آپ کے جواب کا منتظر

آپ کا میلو

''میں مجیب نگر سے تمھارے لیے ایک تحفہ لایا ہوں۔'' میجر ظاہر سابق پاکستانی فوجی نے بریگیڈیر قدر سے کہا جو کاسٹرو آف تنکیل کہلاتا تھا۔ تئیس سالہ شرمیلا سا، بی اے کا طالب علم، اکنامکس ، سوکس (Civics) اور اسلامی تاریخ جس کے مضامین تھے جس کے گرد اس وقت سولہ ہزار مکتی فوج جمع تھی جو قادر باہنی کہلاتی تھی اور جس نے اس علاقے میں تہلکہ مچا رکھا تھا۔ میجر ظاہر نے بنگلہ دیش کے اعلانِ آزادی کی ایک کاپی اسے دی۔

''تھینک یوٗ'' قادر نے کہا۔

اعلان خاصا طویل تھا۔ قادر نے جلدی جلدی اس پر ایک نظر ڈالی۔ جب کہ ۷؍دسمبر ۱۹۷۰ء سے ۱۷؍دسمبر ۱۹۷۰ء تک انتخاب ہوئے تاکہ منتخب ممبران قانون بناسکیں اور...... اور آٹھ ''اوروں'' کے بعد۔۔۔ کے تمام منتخب ممبران کا یہ فرضِ منصبی ہے جو کہ بنگلہ دیش کے عوام نے انھیں سونپا ہے کہ وہ اپنی ایک دستور ساز اسمبلی بنائیں۔ اور آپس کے مشورے سے طے پایا ہے کہ بنگلہ دیش کے عوام کی برابری، انسانی وقار اور سماجی انصاف کا تقاضا ہے کہ بنگلہ دیش کو پیپلز پبلک بنا کر اس کا اعلان کر دیا جائے جیسا کہ شیخ مجیب الرحمٰن بنگو بندھو پہلے ہی کر چکے ہیں۔ اور ہم یہ بھی اعلان کرتے ہیں کہ یہ اعلانِ آزادی ۲۶؍مارچ ۱۹۷۱ء سے تسلیم کیا جائے گا۔ وغیرہ وغیرہ۔

''اس کا مطلب ہے کہ اس اعلانِ آزادی کو قانونی طور پر تسلیم کیا جاسکتا ہے۔''

''کوشش تو یہی کی گئی ہے مگر تم نے سنا ہوگا، Nothings succeeds like success اصل

جیت فاتح کی ہوتی ہے۔ قانون بھی اسی کا ہوتا ہے۔ فتح یافتہ ہوں گے، بنگلہ دیش ہمارا ہوگا تو اعلانِ آزادی کی ضرورت بھی نہیں ہوگی دوسرے ملک ہمیں تسلیم کرنے میں آگے آگے ہوں گے۔ اگر خدانخواستہ یہ نہ ہوا تو اعلانِ آزادی ہماری فردِ جرم ہوگا جس کے ساتھ ہمارے سر ہوں گے، پھانسیاں ہوں گی اور فائرنگ اسکواڈ ہوں گے۔"

"بات تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو مگر مجھے اس میں بدشگونی کی بو آرہی ہے۔" قادر نے کہا۔

"کوشش بہتری کی اور تیاری ہر ابتری کی ــــ یہ ہمارا موٹو ضرور ہے۔ مگر ہمیں تو آس ہے کہ جب بنگلہ دیش کی آزادی کے بارے میں کتابیں چھپیں گی تو ہمارا نام سنہری حروف سے لکھا ہوگا۔ بریگیڈیر قادر، کاسٹرو آف تنگیل۔" قادر خوش ہوکر مسکرایا۔

"کیوں نہیں۔" میجر ظاہر نے کہا۔ "مگر یار تاریخ بڑی چھل والی چیز ہے، جو لوگ کام کرتے ہیں بعض اوقات ان کے نام سرے سے غائب ہو جاتے ہیں، جنھوں نے کچھ نہیں کیا ان کو بڑے بڑے تمغے مل جاتے ہیں اور ان کے نام تاریخوں میں آجاتے ہیں۔ کم از کم ایک لڑائی میں یہ دیکھا ہے میں نے ــــ" میجر ظاہر نے کہا۔

"خیر ــــ شیخ مجیب کا نام تو بنگو بندھو اور قوم کے باپ کی حیثیت سے ہی آئے گا نا۔" قادر بولا۔

میجر ظاہر نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں۔ یہاں دیواریں نہیں ہیں، شاید آم اور کٹھل کے درختوں کے بھی کان ہوتے ہوں۔ لیکن یہ بات تو سب ہی جانتے ہیں کہ شیخ نے پاکستانی فوج کے سامنے ہتھیار ڈالے۔ انھوں نے تمھاری طرح جان پر کھیل کر سرحد پار کرنے کی کوشش نہیں کی، نہ میری طرح پاکستان سے فرار ہونے کی کوشش۔ ورنہ آج وہ مغربی پاکستان میں قید ہونے کے بجائے ہماری قیادت کر رہے ہوتے اور وہ افراتفری جو مکتی جودھا میں نظر آتی ہے، وہ نہ ہوتی۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟" قادر نے چونک کر کہا۔

"تمھیں معلوم ہے میں جو کچھ کہہ رہا ہوں، ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میجر عثمانی جو ۱۹۶۵ء کی جنگ میں بیدیاں سیکٹر سے ایک ٹینک مار کر لائے تھے اور چٹاگانگ کے ایسٹ بنگال رجمنٹ میں سجا دیا تھا اس سے انھیں گوریلا وارفیئر کا اتنا تجربہ تو نہیں ہوگیا کہ انھیں جنرل اور کمانڈر اِن چیف بنا دیا جائے ــــ کہنے کی بات نہیں ہے لیکن سب جانتے ہیں کہ جن لوگوں کو انھوں نے اپنی طرف سے فوج سے الگ کر دیا ہے وہ اپنے طور پر لڑ رہے ہیں۔"

"سب ہی اپنے طور پر لڑ رہے ہیں۔" قادر نے کہا۔

"تم نہیں جانتے ــــ سرحد پار جو ٹریننگ دی جا رہی ہے وہ گوریلا وارفیئر کی ٹریننگ نہیں ہے، میں اپنی

آنکھوں سے دیکھ کر آ رہا ہوں۔ پیسے اور آدمی کا اتنا زیاں ہو رہا ہے کہ دل خون کے آنسو روتا ہے— سو کالڈ لبریشن فورس سوفی صد بھارتی بورڈر فورس اور بھارتی فوجیوں پر بھروسا کرتی ہے، اور میں سمجھتا ہوں یہ خطرناک بات ہے۔ میں نے جنرل عثمانی سے یہ بات کہی تو میرے خیالات سے وہ بہت پریشان ہوئے۔ پھر کہنے لگے تم جس سیکٹر میں رہنا چاہو، خود منتخب کر لو۔ میں نے تمھارے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔'' میجر ظاہر نے کہا۔

''کیوں؟''

''میں نے تمھارے بارے میں کلکتہ میں اخبار میں ایک مضمون پڑھا تھا اور تمھاری تصویر دیکھی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ تم نے تنکیل سے ڈھاکا تک ہر چھ میل پر ملنے والے دریاؤں کے سارے پل توڑ دیے ہیں۔ نہ معلوم کتنی کشتیاں اور اسپیڈ بوٹ ڈبوئی ہیں اور پکڑی ہیں اور بے شمار فوجیوں کو قیدی بنایا ہے— میں نے سوچا گوریلا وار لڑنی ہے تو وہاں چلو۔''

''اور مائی کاٹا میں ایک تین منزلہ اسٹیمر پکڑا جس میں ایک ہزار ٹن بارود تھا۔'' قادر نے فخر سے کہا۔ ''میرے آدمیوں کو دس گھنٹے اسے اتارنے میں لگے اور ننانوے کشتیوں میں لاد کر لائے۔''

''تو تمھیں ٹائیگر کا خطاب صحیح ملا ہے۔ کیا میں تمھیں ٹائیگر کہہ کر مخاطب کر سکتا ہوں؟'' میجر ظاہر نے کہا۔

''بے شک، یہ تو میری عزت افزائی ہوئی— اچھا یہ بتاؤ اور تم نے وہاں کیا دیکھا، سرحد پار، میرا مطلب ہے۔''

بنگلہ دیش کی حکومت کے بڑے بڑے نام کلکتہ کے فورٹ ولیم میں چین کی بانسری بجا رہے ہیں۔ محنت سے جمع کیا ہوا روپیا اڑا رہے ہیں۔ کلکتہ ریڈیو کے اسٹوڈیوز سے فری بنگلہ دیش کے پروگرام کرنے والے پیٹ بھرے لوگ کل کو بنگلہ دیش میں بڑی بڑی کرسیاں پانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔''

''ہم بھی دیکھیں گے کہ بنگلہ دیش میں کس کو کیا عہدہ ملتا ہے؟'' قادر جوش میں آ گیا۔ رات رات بھر تو ہم جاگتے ہیں۔ ہمارے لوگوں نے اپنی جانیں ہتھیلی پر رکھی ہیں۔ ایک دفعہ میں کتنے کتنے میل کی مار کرتے ہیں۔ جب وقت آئے گا تو ہم اپنے حق کے لیے بھی لڑیں گے لیکن ابھی وہ وقت دور ہے۔ ابھی تو ہم سب کو مل کر کام کرنا ہے۔''

''نہیں، ملنے کا کوئی طریقہ نہیں ہے۔ ابھی سب کو الگ الگ رہ کر کام کرنا ہے۔ ضیاء الرحمٰن کی 'Z' باہنی۔ خالد شرف کی 'کے فورس' (K.FORCE) شفیع اللہ کی ایس فورس (S. FORCE) تمھاری قادر باہنی اور مجیب باہنی، یہ سب الگ الگ چلتی رہیں گی۔ منزل ایک ہو تو ایک نہ ایک دن

سب مل ہی جائیں گے ___ تم میجر نجم کو جانتے ہو، پاکستانی فوج میں کیپٹن تھا۔ اس کے پاس سو آدمیوں کی ایک باقاعدہ کمپنی ہے اور سات ہزار گاؤں والوں کو ٹریننگ دے لی ہے۔"

"کیا کبھی ان مغربی پاکستانیوں نے سوچا ہوگا کہ بھوکا بنگالی جو نگارہ کر دن رات بانسری بجاتا تھا یوں بندوق اور گرینیڈ ہاتھ میں لے کر لڑے گا اور ان کا جینا حرام کر دے گا۔"

"ہر چھ ہفتے کے بعد دو ہزار لوگ توڑ پھوڑ کے لیے بھیجے جاتے ہیں۔ گوریلا تو میں انھیں نہیں کہوں گا، بہر حال اپنا کام کر رہے ہیں۔ ان میں دیہاتوں کے پڑھے لکھے لڑکے اور کچھ ہندو لڑکے بھی شامل ہیں۔ شروع میں انھیں صرف رائفلیں اور سب مشین گنیں دی گئی تھیں مگر اب توپیں اور مارٹر بھی دے دی گئی ہیں۔ ایسٹ بنگال رجمنٹ کے باقاعدہ یونٹ اور سب یونٹ بنا دیے گئے ہیں۔ مغربی پاکستان سے بھاگ کر آنے والے بھی شامل ہو رہے ہیں جن میں پائلٹ، انجینئر اور کمانڈوز شامل ہیں۔ نیوی کے لوگ بھی ہیں جنھوں نے چٹا گانگ اور چالنا میں لمپٹ مائن لگا کر کئی جہازوں کو ڈبویا۔ یہ لوگ کھلنا سے کشتیاں چراتے ہیں اور چالنا کی بندرگاہ پر آنے والے جہازوں پر شیلنگ کرتے ہیں۔ ان میں کچھ لوگ بظاہر پاکستان کے ساتھ ہیں۔"

"اُنیس کے اُنیس ضلعوں میں گوریلا کارروائیاں ہو رہی ہیں۔ لوگوں کے دلوں میں دہشت تو بٹھا ہی دی ہے۔" قادر نے کہا۔ "ایک دفعہ دہشت بیٹھ جائے تو کام آسان ہو جاتا ہے۔"

"بالکل ___ مغربی پاکستانی بری طرح بھاگ رہے ہیں۔ ہندوستان کے وزیرِ دفاع نے فنانشل ٹائمز کو بیان دیا ہے کہ دس ہزار پاکستانی سپاہی بنگالی گوریلا کے ہاتھوں مارے گئے ہیں۔"

"سیاسی سطح پر کیا ہو رہا ہے؟" قادر نے پوچھا۔

فوجی کارروائی سے نقصان تو بہت ہوا مگر ایک فائدہ ہوا کہ اس نے ساری مخالفتوں کو ختم کر کے بنگالیوں کو یک جا کر دیا۔ نو مہینے میں تین ملین لوگ مارے گئے۔ اس سے دنیا کی ہم دردی حاصل ہو گئی۔ کلکتہ میں بیٹھے لوگ ایک ہی تو کام کر رہے ہیں کہ بیرونی رابطے سنبھال رہے ہیں۔ آزادی کے نام پر لوگوں کی ہم دردیاں حاصل کر رہے ہیں۔ آزادی ایک ایسا لفظ ہے جس سے آپ فوراً دوسروں کو اپنا طرف دار بنا سکتے ہیں۔ بھارت کا پروپیگنڈہ اتنا زبردست ہے کہ حد نہیں۔ بہت سے بھارتی اور بنگلہ دیشی دوسرے ملکوں میں پیسا جمع کر رہے ہیں۔ ڈاکٹر تری گونا سین نے بنگلہ دیش دوست سوسائٹی قائم کی ہے۔ جس نے بہت پیسا اور ہتھیار جمع کیے ہیں۔ خصوصی اسپتال اور زخمیوں کے صحت یاب ہونے تک کے لیے آرام گاہیں کھولی گئی ہیں۔ بھارت اور روس کا معاہدہ ہو گیا ہے۔ بھارت بنگلہ دیش کو اسلحہ دے گا اور روس بھارت کے اسلحے کی کمی کو پورا کر دے گا۔

''پاکستان کے دوستوں کی پوزیشن کیا ہے؟'' قادر نے پوچھا۔

''ہمارا اندازہ ہے کہ سب زبانی جمع خرچ ہے۔ امریکا نے پاکستان سے کوئی معاہدہ نہیں کیا۔ پرانے معاہدے کی رُو سے وہ صرف اس صورت میں پاکستان کی مدد کرے گا جب کوئی کمیونسٹ ملک براہِ راست پاکستان پر حملہ کرے۔ اس طرح اس کی مدد کی امید نہیں۔ امریکی حکومت تھوڑی سی زبانی ہم دردی کر رہی ہے لیکن امریکی عوام جمہوریت اور آزادی کے ساتھ ہیں اور دل سے سمجھتے ہیں کہ بنگالیوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ ان کے جو رپورٹر سرحدوں پر آتے ہیں، بڑے رقت خیز مضامین لکھ کر بھیجتے ہیں۔ اندرا گاندھی نے پوری دنیا میں جمہوریت کی ساکھ بٹھا رکھی ہے جب کہ پاکستان بے چارہ مارشل لا کی وجہ سے پہلے ہی بدنام ہے۔''

''چین کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

''چین کے بارے میں بھی لوگ یہی کہتے ہیں کہ وہ اپنے ملک کو بنانے میں مصروف ہے۔'' وہ ابھی کسی بین الاقوامی جنگ میں کودنے کو تیار نہیں ہے۔ روس نے ایک طرح سے دھمکی بھی دے دی ہے۔ بھارت نے یہ انتظام کر لیا ہے کہ حملہ ایسے وقت کیا جائے جب چین مداخلت کرنا بھی چاہے تو نہ کر سکے۔ اس کی طرف سے ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہے۔ پریشانی صرف یہ ہے کہ دوسروں کی مدد سے جیتی ہوئی جنگ اور آزادی ہمیں راس آئے گی یا نہیں ___ کچھ لوگ کہتے ہیں، میں نام نہیں لوں گا، کہ تاج الدین وغیرہ نے بھارت کے ساتھ جو معاہدے کیے ہیں وہ کہیں بنگلہ دیش کو نقصان نہ پہنچائیں۔ ایک کے چنگل سے نکل کر دوسرے کے چنگل میں پھنس جائیں ___ یہ نہ ہو کہ وہ کیا کہتے ہیں، پوکھر کاٹ کر مگر مچھ کو دعوت دینا۔'' ظاہر نے اطمینان کے لیے پھر اِدھر اُدھر دیکھا۔ بات جاری رکھتے ہوئے اس نے کہا، ''مجیب نگر میں ایک سکھ مجھے ملا تھا۔ اس نے پتا ہے کیا کہا۔ کہنے لگا، اپنی جنگ خود لڑو۔ ہر ملک کو اور ہر طبقے کو اپنی جنگ خود لڑنی چاہیے۔ ہم سکھ بھی اپنی جنگ خود ہی لڑیں گے۔''

''کہتا تو ٹھیک ہے لیکن یہ ممکن نہیں ہے۔ سالوں لڑنا پڑے گا اور سارا ملک تباہ ہو جائے گا۔'' قادر نے کہا۔

''میں کہتا ہوں اگر دس سال بھی لڑنا پڑے تو ہمیں خود ہی لڑنا چاہیے۔ باہر کی مدد مانگنا اپنے پاؤں پر کلھاڑا مارنے کے برابر ہے۔'' ظاہر بپھر گیا۔

''اچھا آؤ، میں تمھیں اپنے کارناموں کی چند تصویریں دکھاؤں۔'' قادر نے کہا۔ وہ آم کے جھنڈ تلے سے اٹھے اور تالاب کے کنارے درختوں سے ڈھکے اپنے عارضی ہیڈ کوارٹر کی طرف بڑھے۔

''قادر!'' ظاہر نے کہا، ''میں تمھیں ایک راز کی بات بتاؤں۔ میں نے اور میری منگیتر چنّی نے فیصلہ کیا ہے کہ جب تک بنگلہ دیش آزاد نہیں ہو جائے گا ہم شادی نہیں کریں گے۔''

ظاہر کا سینہ فخر سے پھولا ہوا تھا۔

''یہ پتل روز کہاں جاتی ہے؟'' ایک دن مصباح الحق صاحب نے پوچھا۔

''یہیں، پڑوس میں، اپنے جسٹس صاحب کے ہاں۔''

''وہاں کیا ہوتا ہے؟ میں اپنی لائبریری سے دیکھتا ہوں، وہاں اکثر لڑکے لڑکیاں جمع ہوتے ہیں اور اس طرح آتے ہیں جیسے چھپ کر آتے ہوں۔''

''کرنا کیا ہے، کالج یونی ورسٹی بند ہیں، اکٹھے ہو کر باتیں واتیں کرتے ہوں گے۔ ریڈیو اور ٹیلی وژن کے لیے پروگرام بناتے ہوں گے۔''

''تم پتل سے پوچھنا تو سہی۔''

پتل واپس آئی تو بیگم مصباح الحق نے اس سے یہ سوال کیا۔ اس نے کہا، ''ہم ریلیف کا کام کرتے ہیں امی — آپ کو معلوم ہے مارچ میں کیا کچھ ہوا ہے۔ رامیشوری میں ایک گھر میں تمام ایسی لڑکیاں رہتی ہیں جن کو گھر والوں نے ساتھ رکھنے سے انکار کر دیا ہے یا وہ خود گھر جانا نہیں چاہتیں۔''

بینو نے سنا تو سن سے کوئی چیز اس کے دل سے گزر گئی۔ ''پتل، تم مجھے وہاں لے چلو، میں بھی ان کے لیے جو کچھ ہو سکے گا، کروں گی۔'' بینو نے کہا۔

''نہیں بھابی! وہ لڑکیاں بہت حساس ہیں۔ کہتی ہیں، ہم تماشا نہیں ہیں۔ میں بھی وہاں اپنی ایک بے حد عزیز سہیلی سے ملنے جاتی ہوں جس کے والدین تک کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے؟''

''کون منگل؟'' بے اختیار بینو کے منہ سے چیخ کی طرح نکلا۔ پھر اس نے دانتوں سے اپنی

زبان کاٹ لی اور اپنا منہ بند کرلیا۔ مگر چتل کے چہرے پر کھنڈی زردی دیکھ کر وہ سمجھ گئی کہ اس کی زبان سے جو نام نکل گیا ہے، وہ غلط نہیں ہے۔"

اس کا منگیتر سراج اسے پاگلوں کی طرح ڈھونڈ رہا ہے بودی، میں نے اس سے جھوٹ موٹ کہہ دیا ہے کہ وہ میلو اور رینو کے ساتھ چلی گئی ہے۔ زین العابدین صاحب نے جو کچھ آرٹ اکیڈمی کے برآمدوں میں ہوتے دیکھا تھا نا، اور صبح کو بہت سی لڑکیوں کو اسپتال میں چھوڑا گیا تھا ان میں مُکل بھی تھی۔ اس نے مجھے قسم دلا دی ہے کہ میں سراج کو کچھ نہ بتاؤں بلکہ اسے یقین دلا دوں کہ وہ ماری جا چکی ہے ـــ مگر مجھ سے یہ نہیں ہو سکا۔"

"ہاؤ سیڈ۔" بینو کی پلکیں بھیگ گئیں۔

بھابی شروع شروع میں دونوں وقت ملتے روز اسے دورہ پڑا کرتا تھا۔ اس وقت یکایک بیٹھے بیٹھے وہ کسی سے اس طرح باتیں کرنا شروع کر دیتی تھی جیسے اس کا مخاطب سامنے موجود ہے۔ کبھی سراج سے کبھی اپنے کسی بہن بھائی یا دوست سے۔ کبھی ہنستی تھی کبھی روتی تھی، کھلی آنکھوں سے، اپنی ساری ان ہی اداؤں کے ساتھ جس طرح وہ بات کرتی ہے۔ کوئی اور دیکھتا تو یقیناً یہی سمجھتا کہ وہ ایکٹنگ کر رہی ہے مگر ہمیں معلوم ہے کہ وہ ایکٹنگ نہیں کرتی تھی۔ کبھی کبھی وہ بڑے باریک نکتے اٹھاتی تھی۔ لگتا ہے بینو ہم سب کے اندر کوئی سوچنے والا شخص چھپا بیٹھا ہے جسے باہر آنے کا موقع نہیں ملتا، وہ ہوش میں آتی تو اسے کچھ یاد نہ ہوتا۔ حیران ہو کر پوچھتی کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ کیسے آ گئی، وہ لیٹ کیسے گئی، اس کے سر کے نیچے تکیہ کیسے آ گیا، وغیرہ جب اسے دورہ پڑتا تھا اور میں وہاں ہوتی تھی تو دوسری لڑکیاں ہٹ جاتی تھیں۔ انھیں معلوم تھا کہ میں اس کی راز دار سہیلی ہوں۔ ایک دن کی بات تمھیں بتاؤں، اس نے وہ سارا واقعہ، جو زندگی بھر کسی کو نہ سنا سکے گی، رو رو کر مجھے سنایا۔ وہ میرا نام بھی لیتی تھی مگر مجھے معلوم تھا کہ وہ بے ہوشی کے عالم میں ہے۔ پھر کہنے لگی، یہ کام دنیا میں ہوتا آیا ہے ـــ یوں ہی ہوتا ہوگا ـــ دو پریمی اس صورت میں ہوتے ہیں تو یہ سورگ ہوتا ہے اور زبردستی ہو تو نرکھ، نرکھ ـــ پھر وہ خوب روئی ـــ بولتی چلی گئی ـــ چتل تم تو گاتی ہو، تمھیں راگ ملہار بہت پسند ہے۔ لیکن مجھے بتاؤ کہ تمھیں زنجیروں سے باندھ کر بٹھا دیا جائے، سامنے ریچھ اور گیدڑ بٹھا دیے جائیں اور کہا جائے کہ اپنا پسندیدہ راگ سناؤ تو کیا تم گا سکو گی؟ یا تم اسے انجوائے کر سکو گی؟ یا فرض کرو تمھاری کوئی بہت قیمتی متاع ہے۔ تم اسے بے عزیز رکھتی ہو۔ کوئی عزیز از جان ہستی اس کی تعریف کرے تو تم بخوشی اسے وہ چیز دے دو گی، اصرار کرو گی۔ لیکن کوئی چور اچکا لے جائے، یا کوئی ایسا شخص جس سے تمھیں نفرت ہے تو یہی دل چاہے گا کہ اس کا سر پھاڑ دو، قتل کر دو۔ اس کا خون پی جاؤ۔ اسی

قسم کی جانے کیا کیا باتیں کرتی رہی۔لیکن جب ہوش میں آئی تو اسے کوئی بات یاد نہ تھی اور جب میں نے جان بوجھ کر یہ موضوع چھیڑنے کی کوشش کی تو اس نے سختی سے مجھے ڈانٹ دیا۔تمھیں شرم نہیں آتی، دوست ہو کر دوست کے زخم کریدتی ہو۔اس نے کہا۔ میں نے اسے نہیں بتایا کہ وہ بے ہوشی میں اپنے زخموں کو کس بری طرح کریدتی ہے کہ ہم سب بھی اس کے ساتھ روتے ہیں۔

اب کچھ اس کا دل ٹھہرا ہے اور دورہ بہت کم ہو گیا ہے۔ہم لڑکیاں کوشش کرتی ہیں کہ اس خاص وقت اسے کسی ایسے کام میں لگا دیں کہ اسے کچھ سوچنے کا وقت نہ ملے۔ابھی کل کی بات ہے، بیٹھے بیٹھے ہنسنے لگی—پھر بولنے لگی— کلی تو اپنے آپ سے کھلتی ہے (تم تو جانتی ہو نا کہ مؤکل کا مطلب کلی ہوتا ہے) اسے زبردستی کھولنے کی کوشش کرو تو وہ کھلتی نہیں، ٹوٹ جاتی ہے۔پھر وہ ہنسی۔اچھا جب وہ ہنستی ہے تو یوں لگتا ہے جیسے وہ پورے ہوش وحواس میں ہو۔روزمرہ زندگی میں اس کی ایک خاص ادا ہے کہ وہ ناک کو ایک خاص انداز سے انگلی سے چھو کر ہنستی ہے، بے ہوشی میں بھی وہ بالکل اسی طرح ہنسی۔اس نے کہا، یہ بات کسی شاعر نے ضرور کہی ہوگی، یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ یہ نکتہ پہلے پہل میرے ہی ذہن میں آیا ہو۔پھر اس نے سراج کا نام لے کر پوچھا کہ یہ بات پہلے بھی کسی نے کہی ہے—اور یکایک اس طرح بلک بلک کر روئی کہ ہم سب کی آنکھیں بھیگ گئیں۔''

پتل نے ساری کے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کیں اور کہنے لگی:

''یوودی—ایک بات بتاؤ—'' پتل کبھی بینو کو بھابی کہتی کبھی نام لے کر پکارتی اور کبھی جب بہت محبت ٹوٹتی تو یوودی پکارتی۔''کیا میں سراج کو پتل کے بارے میں بتا دوں؟''

بینو کچھ دیر سوچتی رہی۔''ابھی خاموش رہو۔کچھ دن اور گزر جائیں تو اکرام سے کہیں گے کہ سراج سے بات کر کے دیکھے۔'' بینو نے کہا۔

''مگر کسی طرح مانے تو.....'' پتل نے کہا۔

''جب سراج منائے گا تو من جائے گی۔ابھی اسے سراج کی محبت پر اعتماد نہیں ہے۔وہ سوچتی ہے اگر اس نے مجھے قبول نہیں کیا تو.....'' بینو نے کہا۔

''کیا ایسا بھی ہوسکتا ہے؟'' پتل نے کہا،''پھر وہ محبت کیا ہوئی؟''

''ایسا بھی ہوسکتا ہے۔پتل—تم خود ہی تو کہہ رہی تھیں کہ کچھ لڑکیوں کو ان کے گھر والوں نے قبول نہیں کیا۔''

''اگر میرے ساتھ ایسا ہوتا تو میں ظاہر سے کہتی، بولو تم مجھے قبول کرتے ہو یا نہیں۔اگر وہ انکار کرتا تو میں اس کے ایک تھپڑ مار کر الگ ہو جاتی کہ مجھے ایسی محبت نہیں چاہیے۔''

''پتل ایسا نہ کہو— انسان بہت نا قابلِ فہم چیز ہے۔ تمھیں نہیں معلوم کون کن حالات میں کیا کرتا— صرف خدا کا شکر کرو اور دعا کرو کہ وہ سب کو اپنی امان میں رکھے۔''

''اب تم بالکل بڑی بھابی کی طرح بول رہی ہو۔'' پتل نے کہا۔

''نہیں— میں دل سے کہہ رہی ہوں۔ دنیا بہت بری جگہ ہے، جو ایک شخص کے ساتھ ہوسکتا ہے وہ کسی کے ساتھ بھی ہوسکتا ہے۔ بولو، ہوسکتا ہے یا نہیں— اتفاق ہی تو ہے کہ میرے تمھارے ساتھ نہیں ہوا، اس کے ساتھ ہوا۔'' بینو نے کہا۔

ابھی سورج بھاگتا ہوا اندر آیا اور یہ اندوہ ناک خبر لایا تھا کہ الیاس کو سڑک پر کسی نے گولی ماردی۔ لمحے بھر کو کسی نے اس کی بات کا یقین نہیں کیا۔ پندرہ سالہ، ہنس مکھ، بے ضرر لڑکے سے کسی کی کیا مخاصمت ہو سکتی تھی۔ وہ تو آج تک کسی جلسے جلوس میں بھی شریک نہیں ہوا تھا۔ سوائے مطالعے کے اسے کسی چیز سے دل چسپی نہیں تھی۔ آج تو وہ پرچہ دینے گیا تھا۔ سنا ہے پرچہ مشکل تھا۔ کچھ لڑکے پرچے کا بائیکاٹ کرنے کے لیے باہر نکل آئے تھے۔ ان کی دیکھا دیکھی اور بہت سے لڑکے اٹھ گئے تھے۔ الیاس یہی سمجھتا رہا کہ جن کو پرچہ مشکل معلوم ہو رہا ہے، وہی ہنگامہ کر رہے ہیں۔ چند لڑکے بیٹھے تھے، الیاس بھی ان میں شامل تھا۔ پھر جب اس نے نظر اٹھا کر دیکھا تو ہال خالی ہو چکا تھا۔

''کیا میں بھی پرچہ دے دوں؟ — میں نے پورا نہیں کیا مگر کر سکتا ہوں۔'' اس نے نگراں سے پوچھا۔

''تمھارا کیا خیال ہے، تم اکیلے پاس ہو جاؤ گے، باقی سب فیل ہو جائیں گے۔'' بنگالی نگراں کے لہجے میں کاٹ تھی۔ ''ظاہر ہے کہ امتحان دوبارہ ہوگا۔''

نگراں کا اشارہ پا کر الیاس نے پرچہ اس کے حوالے کیا اور باہر نکل آیا۔ باہر ایک ہنگامہ برپا تھا۔ لڑکے ٹولیوں میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ کچھ کھڑے شور مچا رہے تھے۔ کچھ آہستہ آہستہ سڑکوں پر نکل گئے تھے اور تین تین چار چار کی ٹولیوں میں زور زور سے باتیں کرتے گھروں کی سمت جا رہے تھے۔ الیاس گیٹ کی طرف بڑھا۔ کسی سے زیادہ دوستی نہ تھی، ماں نے سختی سے اِدھر اُدھر جانے اور لڑکوں سے ملنے ملانے سے منع کر دیا تھا۔ باہر نکلا تو سامنے سورج کھڑا تھا۔

''تم کیسے آئے سورج؟'' الیاس نے پوچھا۔

''میں اس طرف سے گزر رہا تھا کہ دیکھا لڑکے امتحان دیے بغیر باہر نکل رہے ہیں آپ کے انتظار میں کھڑا ہو گیا لیکن آپ تو بہت دیر میں نکلے۔''

''پرچہ اتنا مشکل نہیں تھا، میں پورا کر سکتا تھا مگر جب سب نکل گئے تو میں نے سوچا، میں ہی کیوں اپنا دماغ کھپاؤں۔''

''تو کسی نے پورا پرچہ نہیں کیا؟''

''نہیں۔''

''اور ماسٹر نے کچھ نہیں کہا؟''

''وہ کیوں کہتے ــــ وہ تو خود چاہتے ہیں کہ لڑکے امتحان نہ دیں۔''

الیاس بھائی! اگر میں باقاعدہ پڑھتا رہتا تو اب اپ کی طرح میٹرک میں ہوتا نا؟'' سورج نے کہا۔

''اور کیا۔'' الیاس نے تائید کی۔

اسکول کیمپس سے نکل کر وہ سڑک پر آ چکے تھے۔ سڑک پر آم اور کٹھل کے درختوں کا سایہ تھا۔ نیلے آسمان پر چیلیں اڑ رہی تھیں۔ فضا میں روشن دوپہر کی خوب صورتی بھی تھی اور بے نام سی اداسی بھی ــــ دفعتاً ایک چیل غیر معمولی نیچے آئی اور الیاس کی طرف اس طرح بڑھی کہ وہ جھونک کھا کر پیچھے ہٹا۔ پھر اس نے اوپر کی طرف دیکھا۔ گلابی پف ایسے ملائم گچھوں اور چھوٹے چھوٹے پتوں کے درمیان ایک گھونسلا تھا۔

''تم بینو آپا سے پڑھتے رہنا اور دو تین سال بعد میٹرک کا امتحان دے دینا۔'' الیاس نے اوپر سے نظر ہٹا کر کہا۔

''مگر اتنی دور میں اُن سے روز پڑھنے جاؤں گا تو امی ناراض ہوں گی۔''

''بات یہ ہے۔'' الیاس نے انکشاف کیا ''جب ہم مغربی پاکستان چلے جائیں گے نا تو تم بینو آپا اور اکرام بھائی کے ساتھ رہو گے۔''

''اچھا تو آپ لوگ چلے جائیں گے۔'' سورج نے دُکھ سے کہا۔

''ہاں تم ہی نے تو امی کو بتایا تھا کہ گھر کے نوکر آپس میں چیزیں بانٹ لینے کی بات کر رہے تھے۔ وہ گھبرا گئیں۔''

''ہاں الیاس بھائی، میں نے غلط نہیں کہا تھا۔ وہ کہہ رہے تھے کہ باہر کے لوگوں کو سامان نہیں لینے دیں گے، ہم آپس میں بانٹیں گے۔ وہ تو کمرے اور کاریں بھی بانٹ رہے تھے۔ شاہین کہہ رہا تھا، صاحب کی بڑی کار میں لوں گا اور چھوٹی سورج کو دے دیں گے۔''

''پھر تم نے کیا کہا؟'' الیاس نے پوچھا۔

''میں چپ رہا۔ اس لیے کہ کچھ کہتا تو وہ سمجھتے کہ میں شکایت کردوں گا۔''

''تم نے عقل مندی کی۔'' الیاس نے کہا۔

''اچھا الیاس بھائی! اگر میں روز تھوڑی دیر کے لیے بینو آپا کے پاس چلا جاؤں تو وہ مجھے پڑھا دیا کریں گی؟''

''معلوم نہیں، یہ تو ان ہی سے پوچھنا پڑے گا۔ آؤ ان کے گھر ہوتے چلیں۔''

''چھایا بیٹھی'' پہنچے تو دیکھا کہ بینو اور پٹل ٹیگور جینتی کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ ٹیگور جینتی کا نام سنتے ہی الیاس کو نیلی یاد آ گئی۔ الیاس نے وعدہ کیا تھا کہ ہر سال گرہ پر اسے کارڈ بھیجے گا۔ ۵رمئی آج نیلی کو یہاں سے گئے ہوئے ایک سال ہو چکا تھا۔ بینو روکتی رہ گئی لیکن الیاس اسی وقت سورج کے ساتھ خوب صورت سا برتھ ڈے کارڈ خریدنے نیو مارکیٹ چلا گیا۔ اے کے ہالدار کی پینٹنگ ''بارش کے بعد'' کا یہ کارڈ الیاس کو بہت خوب صورت لگا۔ درخت پر ایک خوب صورت مور بیٹھا تھا جس کی دم نیچے دور تک پھیلتی چلی گئی تھی — اس کو دیکھ کر یقیناً نیلی کی آنکھیں مور کے پروں پر بنی ہوئی طاؤسی آنکھوں کی طرح گہری اور بیضوی ہو جائیں گی — الیاس نے سوچا۔

دھان منڈی کی طرف پیدل چلتے ہوئے سورج نے ایک بار پھر پوچھا۔

''آپ سچ مچ چلے جائیں گے؟''

''میرا دل تو نہیں چاہتا مگر جانا ہی پڑے گا۔ امی امتحانوں کی وجہ سے ٹھہری ہوئی تھیں مگر اب امتحانوں میں بھی گڑبڑ شروع ہو گئی ہے۔ دیکھو کیا ہوتا ہے۔'' الیاس نے کہا۔

''آپ سب مجھے بہت یاد آئیں گے۔'' سورج نے کہا — یکایک اسے محسوس ہوا جیسے جھیل کے کنارے درخت کی آڑ سے کوئی شخص ان کی طرف رائفل تانے ہے۔

''الیاس بھائی! وہ بندوق آپ کی طرف......'' سورج نے گھبرا کر کہا۔ الیاس نے اگلا قدم بڑھایا تھا کہ گولی بغل کی طرف سے سینے کے پار ہوئی اور وہ زمین پر ڈھیر ہو گیا۔ پل بھر میں راہ گیر اور مچھلیاں پکڑتے لوگ چاروں طرف جمع ہو گئے۔ سورج چاروں طرف بے بسی سے دیکھ رہا تھا کہ ایک رکشا آن کر رکا۔ سورج کے کہنے پر رکشا والا اسے لے جانے پر تیار ہو گیا۔ دونوں نے بمشکل اسے رکشا میں ڈالا۔ الیاس کی طرف سے توجہ ہٹا کر لوگوں نے قاتل کو دیکھنے کی کوشش کی تو وہ غائب ہو چکا تھا۔

گھر پہنچنے سے پہلے ہی الیاس کی روح جسمِ فانی سے کوچ کر چکی تھی اور ماں باپ، بہن بہنوئی اور احباب کے لیے ایک سوالیہ نشان چھوڑ گئی تھی۔ اس معصوم بچے کو، جس کا تعلق کسی سیاسی پارٹی سے نہیں تھا، کس

نے مارا اور کیوں؟۔ سورج، الیاس کے ہاتھ میں تھاما ہوا کارڈ، جس پر خون کے دھبے تھے، ساتھ لیتا آیا تھا۔

مرزا صاحب کے گھر پر طرح طرح کے لوگ آ جا رہے تھے مگر ہر شخص کی زبان پر تالا تھا۔ کون ہم درد تھے، کون مخبر تھے، کون ٹوہ لینے آئے تھے، کون محض تجسس کے مارے آ گئے تھے، کسی کو کچھ اندازہ نہ تھا۔ بیگم مرزا کو بار بار بے ہوش ہونے سے فرصت نہ تھی۔ مرزا صاحب تصویر کی صورت گم سم بیٹھے تھے۔ بینو نے کمرہ اندر سے بند کر لیا تھا۔ الیاس کو آخری منزل تک پہنچانے کے کام شمس الرحمٰن اور زری نے اکرام الحق کی مدد سے کیے۔ جس وقت میت کو لے کر چلے اس وقت بھی ماں بے ہوش تھی۔ باپ اسی طرح کرسی پر بیٹھے تھے۔ بہن نے آخر بار چہرہ دیکھنے کے بعد پھر خود کو کمرے میں بند کر لیا تھا۔

جاتے جاتے بوکل کے درخت نے چند سفید پھول الیاس کی میت پر نچھاور کیے۔ سورج بلکتا ہوا پیچھے پیچھے جا رہا تھا، اور بڑبڑا رہا تھا۔ ''وہ گولی مجھے کیوں نہ لگ گئی، وہ گولی مجھے کیوں نہ لگ گئی۔''

تنہائی میں بینو نے صرف اکرام کے سامنے منھ کھولا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے، آنکھیں رو رو کر سرخ ہو رہی تھیں۔ سفید کنی کی ساری میں ننگے پاؤں کمرے میں ٹہلتے ہوئے اس نے کہا، ''اکرام! جو شخص مجھے مارنا چاہتا تھا اس نے میرے بھائی کو مار دیا۔'' پھر بھاگ کر وہ اکرام کے سینے سے لگ گئی۔ اپنے ناخن اکرام کے بال بھرے سینے میں گڑو کر روتے ہوئے کہنے لگی، ''اس نے میرے بھائی کو، میرے معصوم بھائی کو کیوں مارا؟ اب میں اس سے ضرور بدلہ لوں گی۔''

اکرام نے اسے اپنے سینے کے ساتھ بھینچا اور کہا، ''ہمت سے کام لو۔ بدلہ لینے والے تو بڑے حوصلے کے لوگ ہوتے ہیں۔ ہمیں ایک کا نہیں، ہزاروں کا بدلہ لینا ہے۔''

دوسرے دن بینو نے اپنے کمرے میں پڑا ہوا وہ کارڈ دیکھا جو الیاس نیلی کو بھیجنے کے لیے لایا تھا۔ ٹوٹے ہوئے گھڑے سے جیسے خون بہہ رہا تھا اور مور کے پروں پر بیضوی دائروں کے ساتھ الیاس کے انگوٹھے سے خون کی مہریں لگ گئی تھیں۔ بینو نے وہی کارڈ الیاس کی موت کی اطلاع درج کر کے لاہور روانہ کر دیا۔

الیاس کے چالیسویں کے بعد مرزا صاحب اور بیگم مرزا مغربی پاکستان کے لیے روانہ ہو گئے۔ مرزا صاحب جو ہمیشہ مغربی پاکستان جانے کی مخالفت کرتے تھے، اب ایک دم ہی بددل ہو گئے تھے۔ وہ ۱۹۴۹ء میں بینو کو گود میں لے کر یہاں آئے تھے، الیاس یہاں پیدا ہوا تھا۔ مگر اب وہ خالی گود اور خالی ہاتھ یہاں سے جا رہے تھے۔ کاروبار اپنے بنگالی منیجر کی نگرانی میں اکرام الحق کے حوالے کر دیا تھا۔ کیا نئی جگہ جا کر وہ نئے سرے سے جم سکیں گے — بوڑھے درخت بھی کہیں جڑ پکڑتے ہیں — وہ دل ہی دل میں سوچتے — اور ہم جیسے لوگ، جن کے اندر زندگی کا رس ہی سوکھ چکا ہو — جینے کا ولولہ ہی ختم ہو چکا ہو۔

پس منظر

اس رات، کھانا کھا کر چاروں اندر بیٹھے باتیں کر رہے تھے کہ ڈھول کی تھاپ اور تالیوں کی گونج سن کر کمرے سے باہر نکل آئے۔ چناروں کے سائے میں ایستادہ خیموں سے باہر بارڈر پولیس کے لوگ خٹک ڈانس کرنے میں مصروف تھے۔ دور کہیں پہاڑیوں کے پیچھے چاند کہر کے غبار کی چادر سے جھانکنے میں مشغول تھا۔ ان لوگوں کے پست قد مثلث جیسے سفید تنوں کے درمیان گڑیا گھروں کی طرح پھیلے ہوئے تھے جن میں سے کسی کسی میں لالٹین کی روشنی ٹمٹما رہی تھی۔ یہ غریب سپاہی بہت عرصے سے یہاں پڑے ہوئے تھے۔ اب چوں کہ راتوں میں سردی کی کاٹ نمایاں ہو چلی تھی، خنک راتوں میں لہو گرم رکھنے اور یکسانیت دور کرنے کے لیے کبھی کبھی راتوں کو خٹک ناچ سے دل بہلاتے تھے۔

باہر نکل کر احاطے کی دیوار کے اوپر سے دیکھا تو ان سب کو یہ منظر بہت خوب صورت لگا۔

''میرا جی چاہ رہا ہے کہ میں بھی ان کے ساتھ ڈانس کروں۔'' اعجاز نے کہا۔

''کیوں نہیں، یہ کوئی ایسا مشکل رقص نہیں ہے۔'' زری بولی۔

''مگر میں نے تو زندگی بھر کبھی رقص کا کوئی قدم نہیں اٹھایا۔''

''واقعی؟'' شمس الرحمٰن کی حیرت اپنی جگہ تھی۔ ''مشرقی پاکستان میں مسلمانوں میں بھی رقص کرنا کوئی اتنی غیر معمولی یا معیوب بات نہ تھی، اور غالباً اپنی حیرت کو بجا ثابت کرنے کے لیے وہ دیوار میں بنے ہوئے چھوٹے سے دروازے سے نکلا اور سفید شلوار قمیص پہنے ہوئے ان سپاہیوں میں جا شامل ہوا۔ شمس الرحمٰن کو اپنے رقص کے دائرے میں آتا دیکھ کر سپاہیوں نے خوشی سے ایک نعرہ لگایا، ہو، ہا۔۔۔۔

اور زیادہ جوش و خروش سے رقص کرنے لگے۔ چاندنی میں دائرے میں گھومتے سفید لباس ایسے نظر آتے تھے جیسے بہت سے سفید گلِ داؤدی ہوا سے جھوم رہے ہوں، یا چینی چھتریاں گھمائی جا رہی ہوں۔

''میں جب بھی کھلی فضا میں کوئی رقص دیکھتی ہوں، مجھے آسٹریا یاد آ جاتا ہے۔'' زری نے کہا۔ اس کے لہجے کی خوش گوار جھنکار نے اعجاز کے دل کے تاروں کو بھی جھنجھنا دیا۔ زری کی ہنسی، زری کا غم، اس کی آواز کی سچے سونے کی سی کھنکناہٹ، یہاں تک کہ اس کی آواز کی جھلاہٹ جسے چھپانے کے لیے وہ دبی دبی ہنسی کا سہارا لیتی تھی، اعجاز کے دل میں تموّج پیدا کیے بغیر نہ رہتی تھی۔ اس کے لیے یہ تجربہ بہت ہی انوکھا اور دل کش تھا۔

''کیا آسٹریا میں آپ کا وقت بہت اچھا گزرا؟'' اعجاز نے پوچھا۔

''ہونہہ — تمھارا!'' زری نے تنبیہ کی۔ وہ اعجاز کو ساتھیوں سے آپ جناب سے بات کرنے پر ہمیشہ ٹوکتی تھی۔ ''ہاں، معلوم نہیں کیوں آسٹریا میں میرا قیام ایک خواب کی طرح لگتا ہے، جس کی ابتدا ہوتی ہے نہ اختتام، نہ جانے کہاں سے شروع ہوا اور کہاں ختم ہوگیا — مگر تھا یقیناً خوش گوار خواب، جس کی تفصیل نہ بھی یاد ہو تب بھی دل اس کے اثر سے مسرور سا رہتا ہے۔''

''کیا آسٹریا خوب صورت ملک ہے؟'' نرگس نے پوچھا۔

''ہاں بہت — آسٹرین گاؤں کچھ ہمارے ملک کے گاؤں سے ملتے جلتے ہوتے ہیں مگر بہت صاف ستھرے اور خوب صورت — پہاڑ کی اونچی نیچی ڈھلوانوں پر مخمل کی طرح بچھا ہوا سبزہ بہت ہی اچھا لگتا ہے۔ پھر یورپ کے زیادہ تر شہر دریاؤں کے دونوں کناروں پر آباد ہیں۔ اس سے ان شہروں کا حسن بڑھ گیا ہے۔ آسٹریا میں عمارتوں پر باہر کی جانب بڑی بڑی خوب صورت پینٹنگز بنائی جاتی ہیں جن سے گھر بہت شان دار لگتے ہیں۔ مجھے اکثر وہ پینٹنگز یاد آتی ہیں جن میں رتھوں کی دوڑ دکھائی گئی ہے۔ اتنے خوب صورت رتھ اور گھوڑے کہ بیان سے باہر — نرگس تم بھی اپنے گھر کے آگے ایک ایسی پینٹنگ بناؤ، تمھاری دیکھا دیکھی شاید اور لوگ بھی اس طرف توجہ کریں۔ پتا ہے جب میں وہاں تھی تو میں نے سوچا تھا کہ پاکستان جاتے ہی کھڑکیوں کے باہر جیرنیم کے گملے لٹکانے کی رسم شروع کروں گی۔ یورپ میں ان پھولوں کی وجہ سے پرانے بدرنگ فلیٹ بھی خوب صورت لگتے ہیں، شاید ہمارے ہاں بھی یہ رواج شروع ہو جائے مگر آنے کے بعد بھول بھال گئی۔''

''ہاں یہی ہوتا ہے — آدمی کتنی ہی باتیں شروع کرنے کی سوچتا ہے اور بھول بھال جاتا ہے۔''

''مگر کبھی تم نے ایک بات محسوس کی کہ خوب صورت مناظر میں یہ خوبی ہوتی ہے کہ وہ انسان کے کسی بھی موڈ کے ساتھ نہیں ٹکراتے۔ انسان خوش ہو تو اس کی خوشی کو دوبالا کرتے ہیں، دل افسردہ ہو

تو وہ اس کے زخموں پر مرہم رکھتے ہیں اور دکھن کم ہو جاتی ہے۔"

"بالکل سبز پتوں کی طرح۔" نرگس اپنی مصوری کی زبان بولنے لگی۔ "ہر رنگ کا پھول سبز پتوں میں نکھر آتا ہے چاہے وہ سرخ ہو، گلابی ہو، زرد ہو یا کاسنی ہو۔"

اعجاز کو نرگس کی یہ بات بھی آج رات کی طرح بہت خوب صورت لگی۔ مگر زری کے ماضی میں جھانکنے کا جو موقع ہاتھ آیا تھا اس سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے زری سے پوچھا، "کیا آپ، سوری، تم ان دنوں افسردہ تھیں؟"

"ہاں، میں کچھ پریشان سی تھی۔ ویسے بھی مجھے جرمن زبان کم آتی تھی اور ساتھیوں کو انگریزی بالکل نہیں آتی تھی۔ اس لیے میں تنہا اِدھر اُدھر ماری ماری پھرتی۔ مگر اس میں بھی مزہ آتا تھا۔ پھر زبان کے کورسز شروع ہوئے تو وہ بھی زیادہ تر عمارتوں سے باہر کھلی جگہ میں ہوتے تھے۔"

"تو ان دنوں کوئی دوست نہیں بنایا تم نے؟" اعجاز نے بظاہر سادگی سے پوچھا۔ زری مسکرائی۔ اعجاز نے محسوس کیا تھا کہ زری کی مسکراہٹ میں دلآویزی کے ساتھ ایک خاص معنویت ہوتی ہے جس میں دیکھنے سننے والوں کو اپنے اپنے ڈھب کے مطلب نظر آتے ہیں۔ مسکراہٹ اس کی آنکھوں کی جھلملاہٹ اور لہجے کی کھنک کے ساتھ مل کر زیادہ بامعنی بن جاتی ہے۔

"ہاں، ایک لڑکا، میرے ساتھ دوستی کرنے کی فکر میں پھرتا تھا۔ میں اس سے کنی کاٹتی تھی مگر وہ کسی نہ کسی طرح مجھے ڈھونڈ نکالتا تھا۔ سالز برگ کے قلعے کی سیر کے لیے میں اکثر جاتی تھی اور وہ ہمیشہ مجھے وہاں مل جاتا تھا۔ وہ سیڑھیوں سے چڑھتا تو میں ٹرالی سے چڑھتی۔ کبھی اس سے چھپ کر بے شمار سنگی زینوں میں سے کسی ایک میں بیٹھ جاتی اور کبھی آخری منزل کی بلند ترین کھڑکی سے دور دور تک پھیلے ہوئے میدانوں میں دھوپ چھاؤں کا کھیل دیکھتی۔ کبھی کسی تکونے روشن دان کے دہانے پر کھڑی توپ کے پیچھے چھپ کر اس موکھے سے سرسر آنے والی تیز ہوا کے مزے لیتی، مگر وہ کہیں نہ کہیں پکڑ ہی لیتا اور پھر لڑتا کہ میں اس سے چھپتی کیوں ہوں۔"

"تو پھر اس لڑکے سے تمھاری دوستی ہوئی یا نہیں؟" نرگس کے اس سوال پر اعجاز نے ممنونیت سے نظریں جھکالیں، یہی وہ سوال تھا جو باوجود کوشش کے اس کی زبان پر نہ آ سکا تھا۔

"بھئی سالز برگ قلعے کے ایک کمرے میں ایک آرٹسٹ لڑکی رہتی تھی۔ سریمک کا کام کرتی تھی ورٹائلز میں بے حد خوب صورت ڈیزائن بناتی تھی۔ خدا جانے اسے قلعے میں رہنے کی اجازت کیسے مل گئی تھی۔ میں خالی اوقات میں چیزوں کی فروخت میں اس کی مدد کرتی تھی کیوں کہ اسے انگریزی نہیں آتی تھی اور انگریزی بولنے والے سیاحوں سے بات چیت نہیں کر سکتی تھی۔ وہ بالکل تنہا تھی اور خوب

صورت تھی۔ میں نے ان دونوں کی دوستی کروادی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ ان دونوں نے شادی کر لی ہوگی اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہنسی خوشی رہنے لگے ہوں گے۔''

زری ہنسی تو اعجاز کو یوں لگا جیسے آسمان پر ڈھیروں ستارے یکایک جگمگ جگمگ کرنے لگے ہوں اور فضا منور منور ہوگئی ہو۔ ہنستے ہنستے زری نے اعجاز کی طرف دیکھا جیسے اس سے پوچھ رہی ہو، بس یا کچھ اور — رقص کے دوران شمس نے زری کی ہنسی کی آواز سنی تو یکایک اسے اجنبی لوگوں کے ساتھ مل کر یوں رقص کرنے لگنا بڑا بے معنی سا لگا۔

''ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے وہ لڑکا تمھیں اب بھی یاد آتا ہو۔'' نرگس نے کہا۔ اعجاز کو محسوس ہوا جیسے نرگس نے پھر اعجاز کے دل کی بات کہہ دی ہو۔

''یاد —'' زری نے اپنے بال جھٹک کر پیچھے کیے۔ ''یاد تو مجھے اپنی زمر (zimmer) پر بیٹھا ہوا تنہا کوا بھی آتا ہے۔ زمر اُن کمروں کو کہتے ہیں جو وہاں کرائے پر دیے جاتے ہیں۔''

''اچھا، تو اور کیا یاد آتا ہے تمھیں؟'' اعجاز نے دھیرے سے پوچھا۔

''مجھے جھیل کے کنارے تیرتی ہوئی گردن موڑے بالکل 'ایس' کی شکل کی بطخیں یاد آتی ہیں۔ اور وہ خوب صورت تن درست خچر جو سیاحوں کو سیر کروانے والی سجی بنی گاڑیوں میں جتے ہوتے تھے۔''

''تو تمھیں صرف جانور ہی یاد آتے ہیں؟'' نرگس نے اسے چھیڑا۔ زری خوش دلی سے ہنس دی۔ ''نہیں، مجھے وہ خوب صورت اور پیاری لڑکیاں بھی یاد آتی ہیں جو شیشے کی پیاری پیاری گھنٹیاں گلابی ربن میں بندھی ہوئی بیچا کرتی تھیں۔ سچ پوچھو تو مجھے آسٹریا کے زمین آسمان، اپنے ساتھی اور استاد، سب ہی یاد آتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہاں کے عجائب گھروں میں رکھی ہوئی چیزیں بھی کبھی ذہن میں ایک چیز کی جھلک سی دکھائی دیتی ہے اور غائب ہو جاتی ہے۔''

وہ رقص جو تھوڑی دیر پہلے اس کے لہو میں گردش کر رہا تھا، اب اعجاز اسے قطعاً فراموش کر چکا تھا اور زری کے ساتھ آسٹریا کی سیر میں وہ سوات سے بہت — بہت دور جا چکا تھا۔ اچانک جیسے ہی ڈھولک کی تھاپ، چلتے قدموں اور تالیوں کی آواز بند ہوئی، وہ منگورہ میں چنار کے سائے میں بنی ہوئی دیوار تلے لوٹ آیا۔ چاند کچھ اور اوپر آ گیا تھا اور ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی۔ رقص کرنے والے اپنے اپنے خیموں کو لوٹ رہے تھے۔ واپس آتے ہی جیسے شمس الرحمٰن کو معلوم ہوا کہ زری، اعجاز اور نرگس ابھی آسٹریا کی باتیں کر رہے تھے۔ اس نے پوچھا۔ ''زری آسٹریا میں تو تم بھی ڈانس کرتی ہوگی؟''

''نہیں مجھے ڈانس نہیں آتا۔ مگر کھلی فضا میں شام کو سیکڑوں کی تعداد میں لوگوں کو ٹوائے لائٹ (Twilight) میں گرتی اوس سے بے خبر رقص کرتے ہوئے دیکھنے میں بھی مزہ آتا تھا۔ اس وقت وہ

لوگ اتنے آسودہ اور پُرسکون لگتے تھے جیسے انھیں کوئی غم نہیں ہے۔"

"بھئی وہاں جو یہ گانے ناچنے اور شوروغوغا کا سلسلہ ہے تو اس سے جذبات کی حدت اور غم و غصہ کی رو مدھم پڑجاتی ہے۔ شمس الرحمٰن نے انگریزی میں کہا، "ہم لوگ جو ہر وقت جذبات سے مغلوب رہتے ہیں، ہر وقت ایک دوسرے کو کاٹنے کو دوڑتے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ ہمارے جذبات کے نکاس کا کوئی راستہ نہیں ہے۔"

اعجاز کو محسوس ہوا جیسے شمس الرحمٰن نے یہ بات اسے سنانے کے لیے کہی ہو، شاید اس لیے کہ تھوڑی دیر پہلے اس نے اقرار کیا تھا کہ اس نے آج تک کسی بھی رقص کا کوئی قدم نہیں اٹھایا۔

"ہمارے ہاں ایسے لوگ ہیں۔" اب شمس الرحمٰن اردو بول رہا تھا، "جو تہواروں پر اچھے کپڑے پہننے، ایک دوسرے کے گھر جانے اور دعوت کرنے کو بھی برا سمجھتے ہیں حالاں کہ تھوڑی سی تفریح کسی بھی مذہب میں گناہ نہیں ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اتنے چھوٹے دل کے لوگ جب حج کرنے جاتے ہیں تو ان کی ساری توجہ شیطان کو کنکریاں مارنے......"

"شمس پلیز! کیا مذہب کو درمیان میں لانا بہت ضروری ہے۔" نرگس نے اسے ٹوکا۔

"آخر ہم کس موضوع پر بات کریں نرگس بیگم؟" شمس الرحمٰن یکایک بے حد جوش و خروش سے بولنے لگا، "زبان پر بات کریں تو متعصب، مذہب پر بات کریں تو دہریے، سیاست پر بات کریں تو جاسوس۔"

"جس بات سے دوسروں کے جذبات مجروح ہوں ایسی بات کرنے سے فائدہ؟" اعجاز نے کہا۔ اسے احساس تھا کہ شمس الرحمٰن کی مخالفت میں نرگس اس کے ووٹ کی پوری پوری حق دار ہے۔

"کیا ہم ان باتوں کو نظر انداز نہیں کرسکتے؟"

"میں اس کا قائل نہیں ہوں۔ کیا ہمارے جذبات شیشے کے بنے ہوئے ہیں کہ ہر وقت ان کے ٹوٹنے کا ڈر رہتا ہے۔" شمس الرحمٰن بے حد جوش میں بول رہا تھا، "رہی نظر انداز کرنے کی بات، تو آدمی ہر بات نظر انداز کرسکتا ہے لیکن اس کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ یہ نظر انداز کرنے ہی کا نتیجہ ہے کہ ہمارے ہاں کوئی فلاسفر نہیں ہے، کوئی لیڈر نہیں ہے، جو جس کا جی چاہے کرتا ہے۔ دونوں صوبوں میں ایک دوسرے کے خلاف زہر پھیل رہا ہے اور کسی کو فکر نہیں ہے۔ بیماری کو نظر انداز کیا جائے تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ مجھے بتاؤ، کیا طوفانوں، زلزلوں اور سیلابوں کی طرف سے آنکھیں بند کی جاسکتی ہیں؟"

"بھئی خدا کے لیے شمس الرحمٰن، اس وقت تو ایسی باتیں نہ کرو۔ یہ چاندنی رات اور ایسا خوب صورت منظر ابھی تو ہمیں سکون سے لطف اٹھانے دو۔" زری نے اپنی جبلی خوش دلی سے کہا اور اعجاز کو

لگا جیسے زری نے صاف صاف اس کی حمایت کا اعلان کر دیا ہے۔

''زندگی کے بارے بس کبھی نہ سوچنے والے ہمیشہ پُرسکون رہتے ہیں۔'' شمس الرحمٰن نے چوٹ کی۔

''زندگی کو صرف محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اچھی شاعری کی طرح نہ اسے سمجھا جا سکتا ہے نہ اس کے بارے میں سوچتے رہنے کا کوئی فائدہ ہے۔'' اعجاز نے کہا۔

''میرے خیال میں زندگی اس نظم کی طرح ہے جس میں لوگ حسبِ منشا اپنا مُدعا تلاش کر لیتے ہیں اور شاعر بیٹھا ان کے احمق پن پر مسکراتا رہتا ہے۔'' زری نے کہا۔

''یہ زندگی کی توہین ہے اور اس کے خالق کی بھی۔'' نرگس نے کہا۔

''اُفوہ، تم اس قدر چڑ کیوں رہی ہو نرگس؟ زندگی کے بارے میں ہمارے شاعروں نے کیا کچھ نہیں کہا ہے۔ زندگی کا ہے کو ہے خواب ہے دیوانے کا۔ اور علامہ اقبال اللہ تعالیٰ سے کہتے ہیں، مجھے فکرِ جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا — یا غالب فرماتے ہیں، دوزخ میں ڈال دے کوئی لے کر بہشت کو، اس زمانے میں یہ باتیں کہی جا سکتی تھیں مگر اب کوئی ایسی بات کہنے کی ہمت نہیں کر سکتا، آخر کیوں؟'' زری نے سوال اٹھایا۔

''بات یہ ہے کہ ہم کہتے ہیں کہ ہم ایک عظیم قوم کے عظیم افراد ہیں جب کہ ہم ایک چڑچڑی اور مایوس قوم کے چڑچڑے افراد ہیں۔ کیوں اعجاز؟'' شمس الرحمٰن نے براہِ راست اعجاز کو مخاطب کیا۔

''میرا خیال ہے کہ اگر ہم اپنی گفتگو کو افراد تک محدود رکھیں تو بہتر ہے۔ شاید ہم، قوم اور مذہب کے بارے میں بولنے کے اہل نہ ہوں۔'' اعجاز نے لہجے کو گمبھیر بنا کر کہا۔

''ارے بھئی کیوں نہیں، ہم سب بھی خدا کو مانتے ہیں، دہریے نہیں ہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ خدا ہم سے کتنا ہی مایوس کیوں نہ ہو جائے ہم اس سے مایوس نہیں ہیں۔'' شمس الرحمٰن کا لہجہ اب خوش گوار ہو چلا تھا۔

''کبھی کبھی میں سوچتی ہوں۔'' زری نے کہا، ''چڑچڑے پن کا تعلق بھی تو حالات سے ہوتا ہے۔ جہاں ہر وقت غیر یقینی کی کیفیت ہو، جہاں کوئی کام وقت پر نہ ہوتا ہو۔ جہاں قدم قدم پر پریشانیاں اور ناکامیاں ہوں وہاں آدمی ضرور چڑچڑا ہوگا۔''

باتوں کی گرم جوشی میں وہ آگے بڑھتے گئے۔ زری نے کہا، ''آسٹریا میں مجھے یہ خیال بھی آتا تھا کہ انسان کے مزاج کا کچھ نہ کچھ تعلق موسم سے بھی ضرور ہے۔ ٹھنڈے موسم میں جہاں گرمی نہ ستائے، پسینہ نہ آئے، جہاں خود کو گرم رکھنے کے لیے ہر وقت مصروف رہنا ضروری ہو آدمی کو غصہ بھی کم آتا ہے۔ گرم ملک میں جہاں آدمی گرمی اور گندگی سے بولا رہا ہو، ذرا سی بات پر خون کھول جاتا ہے۔''

''گرمی تو خیر ٹھیک ہے لیکن گندگی کو آپ کس خانے میں ڈالیں گی؟'' شمس الرحمٰن نے طنز سے کہا۔ آج صبح ہی جب وہ دریائے سوات کے کنارے گئے تھے تو وہاں کی خوب صورتی یورپ کے کسی بھی دریا کے حسن سے کم نہ تھی۔ لیکن قدم قدم پر انسانوں اور جانوروں کی گندگی اور بدبو نے وہاں کھڑا رہنا دوبھر کر دیا تھا۔

اس وقت ان کا رخ دوسری طرف تھا۔ چناروں کے جھنڈ کے اختتام پر دریائے سوات بہہ رہا تھا اور اس پر لکڑی کے پرانے پل کے شہتیر ضرب کے نشان کی طرح ایک دوسرے کو کاٹ رہے تھے۔ چاندنی اور پانی سے اٹھنے والے بخارات کی دھند میں دریا پگھلی ہوئی چاندی معلوم ہو رہا تھا۔ اس پس منظر میں چڑچڑے پن اور خون کھولنے کی باتیں از خود دھواں بن کر اڑ گئیں۔ رفتہ رفتہ سب وقت کے اس سحر میں کھو گئے۔ اعجاز کو بہت پہلے کی یاد کی ہوئی ورڈز ورتھ کی ایک نظم یاد آئی اور اس نے بغیر کسی تمہید کے بلند آواز سے پڑھنی شروع کی:

Earth has not anything to show more fare
Dull would be of soul who could pass by
A sight so touching in its majesty
This city now doth, like a garment, wear,
The beauty of the morning, silent, bear,
Ship, towns, domes, theatres and temples lie
Ne'er saw I, never felt, a calm, so deep!
The River glideth at his own sweet will!
Dear God! the very houses reem asleep!
And all that mighty heart is lying still!

سب مسحور سے سنتے رہے۔ آخر میں زری نے کہا، ''صرف صبح اور رات کا فرق ہے۔ ورنہ یوں لگتا ہے جیسے ورڈز ورتھ نے یہ نظم اس منظر کو دیکھ کر کہی ہو اور تمھارے سنانے کے انداز نے تو ایک سماں باندھ دیا۔''

یکایک اعجاز کو محسوس ہوا جیسے وہ آسمان پر اونچا اڑتا چلا جا رہا ہو۔ جیسے اڑتے اڑتے وہ ستارہ بن جائے گا۔ پھر یکایک اس کا دل اتنا گداز ہو گیا کہ آنکھ میں آنسو آ گئے اور اسے لگا جیسے ابھی وہ زری کے قدموں میں ڈھیر ہو جائے گا۔ اس لمحے نرگس کی آواز نے یہ طلسم توڑ دیا۔

''اب واپس چلنا چاہیے، دیر ہو رہی ہے۔''

واپسی میں زری نے کہا،''اعجاز، تم نے ہمارے محکمے میں آ کر غلطی کی ہے، تمھیں تو چاہیے تھا کہ یونی ورسٹی میں انگریزی ادب پڑھاتے۔''

''ابھی دو چار دن ہوئے میں نے پنجاب یونی ورسٹی کا ایک اشتہار دیکھا ہے، اس کے لیے درخواست دے دوں؟'' اعجاز نے پوچھا۔

''واقعی اعجاز ضرور دے دو۔ اس موقعے کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ تمھارے لیے یہ جگہ بہتر رہے گی، اور تم نے ایک مرتبہ بتایا تھا کہ تمھاری امی کو کراچی کی آب و ہوا کی وجہ سے دمہ ہو گیا ہے تو انھیں لاہور کی آب و ہوا ضرور موافق آئے گی۔'' زری نے اس قدر سنجیدگی سے کہا کہ اعجاز نے سوچا کہ اب وہ درخواست دینے میں ایک دن کی بھی دیر نہیں کرے گا۔

ریسٹ ہاؤس کے نزدیک پہنچے تو سارے خیموں میں سناٹا تھا۔ چاندنی رات میں چنار کے پنج انگشتی پتوں کے سائے میں سوئے ہوئے سفید خیمے برف کے بنے ہوئے، اِگلو (Igloo) لگ رہے تھے۔

''اب سونا چاہیے، رات کا ایک بج رہا ہے۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔ ''تم سب نے وہ نظم ضرور سنی ہوگی۔''

Early to bed and early to rise

Makes the man healthy, wealthy.

''and dead'' زری نے جلدی سے کہا۔ سب ہنسنے لگے۔

''یہ کس کا اضافہ ہے؟'' نرگس نے پوچھا۔

''John Cheever کا۔ جہاں تک مجھے یاد ہے۔'' اعجاز نے کہا۔

''گڈ نائٹ۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

سب خاموشی سے اپنے اپنے کمروں کی طرف سونے چل دیے۔

شمس الرحمٰن کو اس رات ایبٹ آباد کا قبرستان بھی یوں ہی نظر آ رہا تھا جیسے وادی کے کٹورے میں ہتھیلیوں پر چراغ دھرے پریاں رقص کر رہی ہوں۔

رات کو بہت دیر تک شمس الرحمٰن ہوٹل کے باہر جنگلے کے پاس کھڑا رہا تھا۔ چاروں طرف پہاڑوں پر چراغاں سا ہو رہا تھا۔ رات منزلیں طے کرتی رہی۔ روشنیاں تیز تر ہوتی گئیں۔ لوگ محوِ خواب ہوتے گئے۔ سناٹے میں پہاڑ کی سڑکوں پر چلنے والی گاڑیوں کی گونج کانوں کو ناگوار گزرنے لگی۔ پھر وہ آواز بھی سو گئی۔ رات جاگتی رہی جیسے پہرہ دے رہی ہو۔ ستارے نیچے اتر آئے۔ دُبِّ اکبر عین ''اکبر منزل'' پر چمک رہا تھا۔ قبرستان میں سرو کے درخت سیاہ وردی پہنے سنتری کے مانند ایستادہ تھے۔ قبروں کے اوپر اور درختوں کی شاخوں پر لٹکتے ہوئے سرخ اور سبز کپڑے چراغوں کی روشنی میں یوں لگے جیسے عورتیں اپنے پیاروں کی قبروں پر سر جھکائے کھڑی ہوں۔ ایسے میں شمس الرحمٰن کو ایک نہایت عجیب اور بے ربط سا خیال آیا کہ اگر وہ یہاں، زری کے شہر ایبٹ آباد میں رہ پڑے تو اسی طرح کا وادی کے کٹورے میں بنا کوئی قبرستان اس کا خاندانی قبرستان بن جائے گا۔ اس کی آئندہ نسلوں کی لڑکیاں یوں ہی سر پر لال ہری اوڑھنیاں ڈال کر آیا کریں گی اور کہیں گی، ''ہمارے پُرکھے بہت دور دراز مقام سلہٹ سے آئے تھے۔ شاید ہماری پردادی، جو پری جیسی خوب صورت تھیں، انھیں مسحور کر کے یہاں لائی ہوں گی۔ یہ پریاں سدا سے آدم زادوں کو اپنے سحر میں گرفتار کر کے خوار کرتی ہیں۔ مگر یوں بھی تو ہو سکتا ہے کہ سلہٹ میں جلال بابا کے مزار پر جو ہر جمعرات کو ہزاروں دیے جلائے

جاتے ہیں اور وہاں کے قبرستانوں میں جو بچے اپنے پُرکھوں کی قبروں پر دیے جلاتے ہیں ان کی شہزادی ایسی پردادیوں کو یہاں کے دیوزادوں نے اپنے سحر میں گرفتار کیا ہوگا اور ان کے بچے آدم زاد کہلائے ہوں گے۔

اور کہیں ایسا تو نہیں ہوتا کہ یہ آدم زاد ہمیشہ پریوں کے دیس اور دیووں کی بستی کے درمیان بھٹکتے رہتے ہوں اور کہیں بھی انھیں کل نہ پڑتی ہو۔

شمس اندر آ کر بستر پر لیٹ گیا۔ سیلی چھت پر پانی نے نہ جانے کون کون سے ختم ہو جانے والے اور آئندہ وجود میں آنے والے ملکوں کے نقشے بنا رکھے تھے۔ غسل خانے میں ڈرم میں بھرنے والا پانی پلاسٹک کے تنگ پائپ میں پوری جگہ نہ پا کر غصے میں غرا رہا تھا۔ کمرے کی کھڑکی سے بھی نیچے وادی کا قبرستان نظر آ رہا تھا اور سر جھکائے کھڑی عورتوں کا ہیولا جوں کا توں قائم تھا۔ یہ رات شمس الرحمٰن کے لیے ان راتوں میں سے تھی جب نیند نہ آئے تب بھی گھبراہٹ نہیں ہوتی۔ کچھ کرنے کو نہ ہو تب بھی سونے کو جی نہیں چاہتا۔ جیسے آدمی اس رات کے سحر میں زندگی کے کوئی نئے معنی دریافت کرنا چاہتا ہو۔

کل دوپہر ہی کو تو شمس الرحمٰن، زری اور نرگس یہاں پہنچے تھے۔ اس سے پیشتر محکمہ سیاحت کے کتابچوں کی تیاری عموماً ایک آدمی کے سپرد کر دی جاتی تھی۔ کبھی وہ محکمے کا آدمی ہوتا تھا کبھی کوئی سینئر صحافی۔ اس کے بعد سال بہ سال پرانے کتابچوں میں تھوڑا سا ردوبدل کر کے اور نئی تصاویر ڈال کر نیا لٹریچر تیار کر لیا جاتا تھا۔ لیکن اس مرتبہ محکمے نے بڑے پیمانے پر از سرِ نو کتابچے تیار کروانے کا ارادہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ دیگر قابلِ دید جگہوں کے سروے اور ان جگہوں پر ریسٹ ہاؤس یا کرائے کے مہمان خانوں کی تعمیر کے سروے کا بھی ارادہ تھا۔ اس انقلابی اقدام کے لیے انقلابی کارروائی کی ضرورت تھی اور ایسے مہم جو لوگوں کی جو اس کام کو دلی ذوق و شوق سے انجام دیں، محض خانہ پوری نہ کریں۔

سوات کے علاقے اور ضلع ہزارہ کے لیے زری نے اپنی خدمات پیش کی تھیں کہ وہ یہاں کے چپے چپے سے واقف تھی۔ اس کو دیکھ کر نرگس نے فوٹو گرافی کے لیے اپنی خدمات نذر کی تھیں۔ نرگس بنیادی طور پر مصوری کے بنگالی اسکول سے تعلق رکھتی تھی مگر کچھ عرصے سے منھ کا مزہ بدلنے کے لیے فوٹو گرافی شروع کر رکھی تھی اور اس میں تمام کہنہ مشق حضرات کو پیچھے چھوڑ گئی تھی۔ اس سے پہلے کبھی لڑکیوں کو ایسے کاموں کے لیے نہیں بھیجا گیا تھا لیکن ان کو خصوصی اجازت مل گئی تھی اس لیے کہ زری نے ایبٹ آباد سے اپنے چچا کا اجازت نامہ حاصل کر لیا تھا۔ نرگس کا منگیتر نورالہدیٰ اسی محکمے میں کام کرتا تھا اور اسے نرگس کے جانے پر کوئی اعتراض نہ تھا خصوصی طور پر اس لیے کہ مردوں میں قرعہ فال

نور کے دوست شمس الرحمٰن کے نام نکلا تھا جو بے حد مرنجاں مرنج قسم کا مشرقی پاکستانی صحافی تھا۔ انگریزی بہت عمدہ لکھتا تھا۔ اردو اچھی جانتا تھا۔ اب تک لڑکیوں سے زیادہ تاریخ اور ادب کی کتابوں میں دل چسپی لیتا رہا تھا۔

یہ بھی طے ہو گیا تھا کہ نرگس زری کے ساتھ اس کے اپنے گھر یا رشتے داروں کے گھر قیام کرے گی اور شمس الرحمٰن ہوٹل میں ٹھہرے گا۔

ویگن، ایبٹ آباد کی آخری چڑھائی چڑھ کر بازار کے نکڑ پر رکی تھی۔ وہاں سے ''اکبر منزل'' تک کے لیے انھوں نے ایک پرانی مگر بڑی خوب صورت کار بطور ٹیکسی کرائے پر لے لی تھی۔ گاڑی خالص ہزارے کے بازار سے گزرتی ہوئی آئی تھی۔ کہیں بڑی سی کڑھائی میں چپلی کباب تلے جا رہے تھے۔ کہیں سرخ سرخ تندوری روٹیاں سلاخ کے ذریعے تندور سے نکال کر ٹاٹ پر رکھی جا رہی تھیں۔ یکایک کہیں سے سڑے ہوئے گوشت کا بھبکا آیا۔ نرگس نے فوراً کار کا شیشہ چڑھا لیا۔ جگہ جگہ کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پڑے تھے۔ شاید ان ہی میں کوئی مردہ جانور بھی پڑا تھا۔ شمس الرحمٰن نے ناک سکیڑی مگر زری نے کچھ محسوس نہ کیا کیوں کہ وہ اس وقت کے ایبٹ آباد میں نہیں کہیں ماضی کے ایبٹ آباد میں تھی۔ ''اکبر منزل'' کو دور سے دیکھتے ہی اس نے کہا، ''اوہ میرے خدا!'' اور کار کی کھڑکی پر رکھے ہوئے اپنے سفید بازو پر سنہری سر ٹکا لیا۔

یوں لگتا تھا جیسے گھر کی نحوست نے چند قدم آگے بڑھ کر زری کا استقبال کیا ہو۔ اس کا دمکتا ہوا رنگ زرد پڑ گیا تھا اور آنکھوں میں نمی تیر رہی تھی۔ جیسے ہی کار رکی، زری دروازہ کھول کر اتری، دوڑتی ہوئی پتھر کی سیڑھیاں چڑھتی چلی گئی۔ چند لمحوں بعد وہ اپنے باپ کی قبر سے لپٹی پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ شمس ٹیکسی ڈرائیور کے ساتھ مل کر اطمینان سے سامان اتارتا رہا۔ اس کے جانے کے بعد دونوں اوپر چڑھے۔ زینے کی نصف اونچائی تک پہنچے ہوئے چبوترے پر ایک دوسرے کے پہلو میں دو قبریں تھیں۔ اکبر خاں کی قبر کے سینے پر سنگ مرمر کا کھلا ہوا صحیفہ تھا۔ جس پر سنگِ موسیٰ سے قرآنی آیات کندہ تھیں۔ دوسری قبر کے کتبے پر درج تھا: گل جان، اہلیہ اکبر خان—سنہ ولادت—سنہ وفات۔

نرگس نے زرد آڑو کے سائے میں ماں باپ کی قبر پر بلکتی زری کو اپنے کیمرے میں محفوظ کر لیا کہ زری کو اپنے جذبات پر قابو رکھنے کا بڑا ارمان تھا۔

نرگس اور زری کا سامان ''اکبر منزل'' کی درمیانی منزل پر پہنچایا گیا جہاں موجودہ مکینوں کا قیام تھا۔ یہ زری کے دور کے رشتے کے پھوپھا اور پھوپھی تھے۔

شمس الرحمٰن کو بہت جلد اندازہ ہو گیا کہ ان مکینوں کو اس گھر سے محض اتنی دل چسپی ہے کہ اس کی

چھت فی الحال ان کے سر پر سایہ کیے ہوئے ہے، جس دن یہ چھت اس قابل نہ رہے گی وہ بے غم ہو کر یہ گھر چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ ممکن ہے وہ ایک خط اس مضمون کا لکھ دیں کہ عزیزی تمھاری کوٹھی کی حالت بہت خستہ ہوچکی ہے۔ جلد آ کر مرمت کراؤ ورنہ تمھارے باپ دادا کی اس نشانی کا نشان بھی مٹ جائے گا۔ شمس الرحمٰن کو یہ جاننے میں بھی دیر نہ لگی کہ مکینوں کی اپنی مالی حالت بھی تسلی بخش نہ تھی۔ فرنیچر قدیم اور خوب صورت تھا لیکن مسہریوں پر ایسے سستے پلنگ پوش پڑے ہوئے تھے جو مسہری کے گدے کا تن ڈھانکنے کو بھی کافی نہ تھے۔ باورچی خانے میں تیل کا ایک چھوٹا سا چولھا اور چند برتن تھے جیسے رہنے والے محض چند دن کے لیے آئے ہوں۔ غسل خانوں میں موسم کی مار کھائے ہوئے المونیم کے ساوار، جن کی چمک معدوم ہوچکی تھی، فرش پر صابن دانیوں کے ٹھیکرے تھے۔ ہر چیز سے متوسط درجے کی نچلی سطح پر پھسلتی ہوئی آمدنی کا اظہار ہو رہا تھا۔ ایسی غربت اور افلاس شمس الرحمٰن نے اپنے علاقے میں تو بہت دیکھا تھا مگر کراچی کے متوسط طبقے میں یہ صورتِ حال نہ تھی۔

ان کمروں میں اگر کوئی چیز اَن مل بے جوڑ تھی تو وہ زری کی فریم شدہ تصویریں تھیں۔ ایک فراک میں اپنے خوب صورت سفید کتے کے ساتھ، ایک گل جان کے ہاتھ کی پھول کاری کی قمیص میں، اور ایک ساری میں۔ تصویریں خوب صورت تھیں ہی لیکن ابھی تک تازہ اور شاداب بھی تھیں۔ مکان کی بوسیدگی اور فرسودگی کا ان پر کوئی اثر نہ تھا، جیسے کسی کھنڈر میں تازہ تازہ گلاب کے پھول کھلے ہوں۔

اندر کے زینے سے چڑھ کر یہ سب اوپر کی منزل پر پہنچے۔ یہاں سے دور دور تک پہاڑی سلسلے نظر آ رہے تھے۔ ''سر بن پہاڑ'' جس پر علامہ اقبال نے نظم ''سر بن کے سائے میں'' لکھی، زری نے اشارے سے بتایا۔ اس وقت بھی اس پر دھوپ اور سائے کی طلسمی کیفیت تھی۔

''وہ لوئر ملک پورہ ہے—— وہ کنج ہے—— پھگواڑی بانڈہ—— پھگواڑی مقامی زبان میں انجیر کو کہتے ہیں۔'' یکایک وہ اداس ہوگئی—— ''آدمی کو اس جگہ لوٹ کر آنا ہی نہیں چاہیے جہاں اس نے اپنا بچپن گزارا ہو، یادیں اس بری طرح یلغار کرتی ہیں۔ آؤ میں تمھیں اپنے والد کا کمرہ دکھاؤں جنھیں میں 'داجی' کہتی تھی۔'' اس نے زینے پر ایک قدم رکھا۔ یکایک اس کے منھ سے ایک چیخ نکلی۔

''یہ کیا ہوا؟ یہ چھت کب گری؟'' اس نے غصے سے پھوپھی کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ زرد ہوگیا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے اس نے داجی کو چھت کے نیچے دبے ہوئے دیکھا ہو—— پھوپھی معذرت آمیز لہجے میں بتانے لگیں کہ وہ اس کے بارے میں خط لکھنے ہی والی تھیں بلکہ کوشش یہ تھی کہ چھت کی مرمت ہی کروالی جائے۔ زری نے جیسے ان میں سے کوئی بات بھی نہ سنی ہو۔ بغیر کسی طرف دیکھے تیز ی سے زینہ اتر کر وہ اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ بند کرلیا۔

زری کی پھوپھی جی نرگس اور شمس الرحمٰن سے معذرت کرتی رہ گئیں۔ ''اس کی ساری چیزوں کی حفاظت ہی میرے لیے بڑا مسئلہ ہے۔ زری کے لیے اُس کی ماں نے بڑے چاؤ سے جہیز کے قیمتی جوڑے تیار کر کے رکھے ہیں خود اس کی ماں کے جوڑے ہیں۔ ایسی ایسی پھل کاریاں کہ بڑے سے بڑا کاری گر دیکھ کر رشک کرے۔ قیمتی سامان دوچھتی میں رکھوادیا ہے، باقی چیزوں سے نیچے کے کمرے بھرے پڑے ہیں۔ آؤ تمھیں دکھاؤں ــــ'' نرگس کے پیچھے پیچھے شمس الرحمٰن بھی سارا سامان دیکھتا پھرا۔ اسے واقعی افسوس ہوا۔ کیسا قیمتی سامان کس طرح برباد ہو رہا تھا۔

''اچھا ہوا یہ سامان زری نے نہیں دیکھا ورنہ اسے رنج ہوتا۔'' نرگس نے کہا۔

''مگر اس کے سوا چارہ کیا ہے، یہ بھی تو اسے سوچنا چاہیے۔ جب وہ یہاں نہیں رہتی اور کوئی ان کی مناسب دیکھ بھال کرنے والا نہیں تو ان کا رفتہ رفتہ ستیاناس ہو جانا بالکل قدرتی بات ہے، اس پر غم کیسا؟'' شمس الرحمٰن نے بنگلہ زبان میں کہا۔

''جن چیزوں سے آپ نے محبت کی ہو ان کو ملیامیٹ ہوتے دیکھ کر غم کرنا بھی بالکل قدرتی بات ہے۔'' نرگس نے بھی بنگلہ میں جواب دیا۔

''میں زری کو دیکھتی ہوں۔'' پھوپھی جی ہاتھ ملتی نیچے اتر گئیں۔ وہ پانچ فٹ کی پھرتیلی سی بڑی بی تھیں۔ ان کے ہاتھ پاؤں مُنّی بچّی جیسے تھے۔ مگر چہرے پر بڑی گہری جھریاں تھیں جیسے پہاڑی سلسلوں کے درمیان گہری کھائیاں۔ ان کی ہنسی میں لڑکپن کی شگفتگی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے انھوں نے بہت اچھے دنوں کے ساتھ بہت برے دن بھی دیکھے ہوں، اور دونوں کی چھاپ ان کی شخصیت پر موجود ہو۔

''زری ان بے چاری کے ساتھ زیادتی کر رہی ہے۔ اگر یہ بھی گھر چھوڑ کر چلی جائیں تو شاید اس میں چمگادڑیں آن بسیں۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''وہ بھی کیا کرے ــــ ایک گھر کو انسان نے بھرا پُرا دیکھا ہو، اس میں آرام اور آسائش پائی ہو۔ اس گھر سے اور اس میں رہنے والوں سے محبت کی ہو، پھر اسے اس حالت میں دیکھے تو اس کو صدمہ نہ ہو۔ شاید ہم نے یہاں ٹھہر کر غلطی کی ہے۔''

''میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ زری اتنی جذباتی ہو سکتی ہے۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

کئی دفعہ کہنے کے باوجود جب زری نے دروازہ نہیں کھولا تو مجبوراً شمس الرحمٰن اور نرگس، پھوپھی جی کے ساتھ چائے پینے لگے۔ ان کے شوہر اپنے کام سے نہیں لوٹے تھے۔ وہ چائے نہیں پیتے تھے۔ اس لیے چائے پر ان کا انتظار کرنا بے سود تھا۔ پھوپھی جی بے تکلفی سے باتیں کرتی رہیں ــــ ''اس خاندان کے لڑکے تو ایک عرصے سے پڑھ رہے ہیں۔ چند انگریزی اسکول کالجوں میں پڑھنے کے بعد

علی گڑھ چلے گئے تھے۔ جو علی گڑھ نہ جا سکے تھے وہ اسلامیہ کالج پشاور سے ڈگریاں لے کر غیر ممالک کی راہ لیتے تھے۔ یہ سب لڑکے اپنے صوبے کے بڑے بڑے عہدوں پر پہنچے تھے۔ انگریزوں کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تو بالکل انگریز لگتے تھے۔ ان میں سے کئی ایک نے ان ہی کی سی بود و باش اختیار کر لی تھی۔ ان کی طرح میز کرسیوں پر باوردی بیروں کی سروس میں کھاتے، شرابیں پیتے، پولو اور برج کھیلتے تھے۔ ان کی بیگمات سفید چادروں کو خدا حافظ کہہ کر لاہور، پشاور اور راول پنڈی جا کر خوب پر پُرزے نکال رہی تھیں۔ ان کی بچیاں انگریزی لباس پہنتیں، گھڑسواری کرتیں اور فرفر انگریزی بولتی تھیں۔

اس کی ابتدا یوں ہوئی کہ انگریز کمشنر اپنی بیٹی کو مری کے جیزس اینڈ میری اسکول بھیج رہے تھے۔ بیٹھے بٹھائے ہمارے پھوپھا سے جو اس زمانے میں ڈپٹی کمشنر تھے، بولے، ''ویل خان! تم بھی اپنی بیٹی کو میری لڑکی کے ساتھ مری بھیج دو۔ دونوں ساتھ آیا جایا کریں گی۔ لڑکیوں کو پڑھانا بھی بہت ضروری ہے۔' ان دنوں انگریز افسروں کی خواہش حکم کا درجہ رکھتی تھی۔ چناں چہ خان نے انگریز حاکم سے سوچنے کی مہلت مانگی اور پھر اپنے بھائی کے پاس بھاگے جو اس وقت فوج میں کرنل اور بعد میں جنرل بنے۔ ان کی خوشامد کی کہ تم بھی اپنی بیٹی کو مری جانے کی اجازت دے دو، ایک سے دو بہتر رہیں گی، ہمیں بھی تسلی رہے گی۔ بھائی تھے تو فوج میں کرنل مگر بیگم سے ڈرتے تھے کہنے لگے، بھابی سے پوچھ لو۔ بھاوج نے پہلا سوال خالص پشتو زبان میں یہ کیا کہ میری بچی کو جانگیہ تو نہیں پہننا پڑے گا۔ دیور لاجواب ہو گئے مگر اپنی بچی کو کمشنر کی بیٹی کے ساتھ بھیج دیا۔ پھر وہ لاہور گئی اور کنگ ایڈورڈ کالج سے ڈاکٹری پاس کر کے پشاور لیڈی ریڈنگ اسپتال میں کام کرنے لگی۔ پھر تو جیسے در ہی کھل گیا۔ ایک لڑکی انسپکٹریس آف اسکولز بنی جو انگریزی لباس میں گھوڑے پر بیٹھ کر دیہات کے اسکولوں میں جاتی تھی اور مقامی لوگ آج تک اسے انگریز ہی سمجھتے ہیں۔ زری کے باپ کو بھی اللہ بخشے تعلیم کا بے حد شوق تھا۔ یہی سودا بیٹی کے دل میں سما گیا اور اب تم دیکھ ہی رہے ہو کہ خود کراچی میں ملازمت کرتی ہے اور یہاں لاکھ کا گھر خاک ہو رہا ہے۔''

دروازے پر کھٹکا ہوا۔ پھوپھی جی دوپٹہ سنبھالتی ادھر لپکیں۔ شمس الرحمٰن کو لگا جیسے کوئی گھریلو چڑیا پھدک کر ادھر سے اُدھر چلی گئی ہو۔ دراز قد اور باوقار سے پھوپھا جی اندر داخل ہوئے۔ دروازہ کھلتے ہی زینے کی نصف اونچائی تک پہنچے ہوئے چبوترے پر دونوں قبریں نظر آئیں۔ پھوپھا جی نے دروازہ کھلا ہی چھوڑ دیا تھا۔ سڑک بہت نیچے تھی۔ آس پاس کوئی گھر نہیں تھا۔ شاید اس لیے مکینوں کو بار بار دروازہ بند کرنے کی عادت نہیں تھی۔ دروازے پر پشتو میں جلدی جلدی پھوپھی جی نے ان سب کا تعارف کروایا تھا۔

''زری کہاں ہے؟''سلام دعا کے بعد پھوپھا جی نے پوچھا۔

''اپنے کمرے میں ہے، ذرا بلایئے تو۔''

پھوپھا نے دروازہ کھٹکھٹایا اور اپنی زبان میں کچھ کہا۔ زری نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ انھیں سلام کیا۔ پھوپھا نے پیار کیا، گلے سے لگایا۔ خیریت پوچھی اور اپنے کمرے میں چلے گئے۔ زری تولیہ ہاتھ پر ڈال کر غسل خانے میں منہ ہاتھ دھونے چلی گئی۔ شکر ہے کہ زری نے اپنے اوپر قابو پالیا۔'' شمس الرحمٰن نے سوچا تھا۔ مگر رات کے کھانے پر وہ پھر بے قابو ہوگئی۔

''لو نرگس، یہ کوفتے تو لو۔'' اس نے ڈونگا اٹھا کر نرگس کی طرف بڑھایا ہی تھا کہ اس کا ہاتھ کانپا۔ ''کیا اس میز کی جگہ بدلی نہیں جاسکتی۔'' اس نے روکھے پن سے کہا۔

شمس الرحمٰن نے دیکھا، سامنے کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور زرد آلوچے کی شاخیں دونوں قبروں پر سوگواری سے جھکی ہوئی ہیں۔

''یہ جگہ باورچی خانے سے نزدیک تھی، اس لیے میز یہاں رکھوادی تھی کل جگہ بدل دیں گے پتر۔ تو اپنا جی خراب نہ کر، کھانا کھا۔'' پھوپھا جی نے پیار سے کہا۔

''آئی ایم سوری۔'' زری سر جھکا کر چھوٹے چھوٹے نوالے منہ میں ڈالنے لگی تھی۔

اور شمس الرحمٰن نے جیسے بے خیالی میں اٹھ کر دروازہ بند کر دیا تھا۔

ہوٹل کے اوپر جھکے ہوئے چیڑ کے درخت سے ایک خوب صورت پکا پھول کی طرح کا تکون پھل (cone) ٹوٹ کر ٹین کی چھت پر گرا، پھر تیزی سے لڑھکتا، ٹنن ٹنن کی آواز نکالتا گھاس میں آن کر چھپ رہا۔ کھٹ سے شمس الرحمٰن کے ذہن کی پٹری بدلی اور یادوں کی گاڑی نئی راہ پر چل نکلی۔ یہ یادیں کس طرح برسوں پرانی خوشبوؤں اور آوازوں کے ساتھ بندھی ہوتی ہیں۔

بَن اخروٹ کے لانبے سڈول سبز پتوں پر سے چھَن چھَن بارش کے قطرے بکھر رہے تھے۔ سوکھے chestnut ٹن کی آواز کے ساتھ ٹین کی چھت پر گرتے ہیں اور اس کی نالی نما گہرائی میں ٹھنن ٹھنن لڑھکتے دھپ سے کائی لگے گہرے پکّے نالے میں جا گرتے ہیں۔ Chestnut کے نام سے انگریزی ناولوں کی فضا ذہن میں ابھرتی ہے۔ جس دن اس کے ابا اسے مَری کے کونوینٹ اسکول میں داخل کروانے لائے تھے تو اس نے خود کو کسی انگریزی ناول کا ایک کردار ہی محسوس کیا تھا۔

اسکول کی گوتھک طرز کی عمارت کی گول مخروطی چھتوں کے نیچے اور چکنے گول میناروں کی اونچی اونچی کھڑکیوں کے پیچھے شیشے کی گرگابیوں والی سنڈریلا جیسی شہزادیوں کے بند ہونے کے امکانات نظر آتے تھے، سرنگوں کی طرح لمبے، چکنے اور ٹھنڈے کاریڈور میں سفید لبادے ہلاتی، تیز تیز چلتی سسٹرز لکڑی کے سفید دروازوں کے پیچھے پُراسرار طور پر غائب ہو جاتی تھیں۔ اونچے مینار کے گول گنبد نما کمرے سے پیانو کے ساتھ ڈھیر ساری عبادت گزار آوازیں آ رہی تھیں، جیسے کوئی مدھ بھری دوپہریا میں سبز گھاس پر سیب کے درخت کے نیچے لیٹا خواب دیکھ رہا ہو۔

وزیٹر روم کے بال جھڑے نستعلیق قالین، ریمبراں کی بھوری تصویروں کے نقوش، ٹھنڈے کمرے میں بڑے بڑے مردہ دل صوفوں اور پرانے بے داغ فرش پر سسٹرز اور مدر کے سفید بوٹوں کی ایک خاص ٹک ٹک نے بڑی پُراسراریت پھیلائی تھی۔ ان راہباؤں کے لباس اور چہروں کے نامانوس نقوش کچھ کم پُراسرار نہ تھے۔ رہی سہی کسر ڈومیسٹری میں پاس پاس بچھی ہوئی پلنگڑیوں، نیچی نیچی

الماریوں، گول دیواروں میں گول کھڑکیوں کے نصف سفید پردوں اور پکّے نالے میں گرتے شرشر پانی کی آواز نے پوری کردی تھی۔ جس میں درختوں کی سرسراہٹ بھی شامل ہوجاتی تھی۔ پتلی سڑک کے دوسری طرف کا پہاڑ ہر وقت سر پر سوار رہتا جس کی وجہ سے اس کمرے میں کبھی دھوپ نہ آتی اور کھڑکی کے باہر کی فضا سدا کائی جمی اور نم سی رہتی۔ گرگٹ بڑی اداؤں سے تاک جھانک کرتے۔ بَن اخروٹ کے درختوں پر چھن چھن بارش برستی اور سوکھے بن اخروٹ، ٹن سے ٹین کی چھت پر گرتے اور ٹھنن ٹھنن کرتے دھوپ سے کائی لگے پکے نالے میں جاگرتے۔ رات کو وہ یہ آوازیں سنتا اور ان آوازوں کی لہروں پر بہتا کبھی امی اور ابا کے ''گرین ویو'' کے لان میں اور کبھی شائستہ کے جیزس اینڈ میری کی اوپر والی سڑک کی چٹانوں پر جابیٹھتا— شائستہ بھی سنڈریلا کے قلعہ نما گول مینارے میں قید تھی اور اسی وقت باہر آتی تھی جب وہ امی اور ابا کے ساتھ اسے لینے جاتا تھا۔

لیکن بے نیند راتوں میں وہ چپ چاپ ان چٹانوں پر آن بیٹھتا۔ ان چٹانوں پر بَن اخروٹ، اور چیڑ کے درختوں کا سایہ ہوتا اور چٹان کے قدرتی پیالوں میں بارش کا پانی بھرا رہتا جیسے گرجا گھروں میں مقدس پانی کے کٹورے بھرے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی ان پیالوں میں جمی شفاف ریت کے اوپر ٹھہرے پانی میں مُنّی مُنّی مچھلیاں بھی تیر رہی ہوتیں اور اسے شاہ جلال سلہٹی کے مزار کی نگار رنگ مچھلیاں یاد آتیں جو تعداد میں بڑھتی جاتی تھیں کیوں کہ ان کو پکڑنے کی اجازت نہ تھی۔ شاہ جلال کے سلہٹ آنے کا واقعہ سن کر اس نے خود کو شیخ برہان الدین کے اس بچے کے ساتھ identify کرلیا تھا جس کے عقیقے پر گائے ذبح کرنے پر وہاں کے راجا نے اس بچے کو ذبح کروادیا تھا۔

خدا جانے اس کے دل میں یہ بات کیسے جاگزیں ہوگئی تھی کہ اس کے والدین اس کے عقیقے پر گائے ذبح کرواتے تو اسے بھی مار دیا جاتا۔ اس کے والد اسے سمجھایا کرتے تھے کہ اب حالات بدل چکے ہیں۔ اب پاکستان بن چکا ہے اور اس قسم کی کوئی پابندی نہیں ہے۔

وہ والد کے ساتھ چائے کے باغات میں گھوما کرتا تھا۔ کبھی کبھی اس کی امی بھی وہاں جاتی تھیں۔ وہ بڑی پڑھی لکھی اور طرح دار خاتون تھیں۔ ان کے انتقال کے وقت وہ بہت چھوٹا تھا مگر موت جیسے حادثے سے اس کم عمری میں دوچار ہونے کی وجہ سے وہ ماں کی موت کے منظر کو کبھی نہیں بھولا تھا۔ وہ مقامی اسکول میں پڑھتا رہا اور دادی کے زیرِ سایہ پرورش پاتا رہا۔ اس وقت اسے اردو برائے نام آتی تھی۔ پھر اس کے والد نے مقابلے کا امتحان پاس کرلیا تھا اور سرکاری ملازمت میں آگئے تھے۔ جب ان کا تبادلہ مغربی پاکستان کا ہوا تھا تو چند دن پہلے انھوں نے ایک خوب صورت عورت سے شادی کی تھی جو خود بھی ایک بڑے افسر کی بیوہ تھی اور اس کی ایک نہایت خوب صورت بیٹی

بھی تھی، اور آج تک اسے پتا نہ چلا تھا کہ اس کی خوب صورت لڑکی شائستہ سے اس کا کیا رشتہ تھا!

چٹان پر مچھلی کے کٹوروں کے پاس بیٹھے وہ چیڑ کے نوکیلے تنکے دانتوں میں دبائے باتیں کرتے رہتے۔ خدا جانے وہ کیا باتیں ہوتیں۔ ساتھ پکچر جانے کی یا نتھیا گلی، خیرہ گلی اور کوزہ گلی میں ساتھ ساتھ پھرنے کی۔ پھر وہ دونوں چٹان پر سے اتر کر اس میدان میں آجاتے جہاں اونچے اونچے ناگ پھنی کے درختوں میں سرخ اور نارنجی پھول لگے ہوتے، ایسے پھول جو سال دو سال میں ایک مرتبہ یا دس سال میں ایک مرتبہ کھلتے تھے۔

پھر وہ شائستہ کا ہاتھ تھام کر پھیلی پھیلی جال دار جھاڑیوں اور سرخ گول گول دانوں والے پودوں کو پھلانگتا پتلی سڑک پر لے آتا۔ گرگٹ منہ اٹھا کر جھانکتے اور پھر دبک جاتے۔ گلہریاں پھرتی سے درختوں پر چڑھ جاتیں۔ پھولے پھولے بالوں اور لانبی دُم والی گوہ لپاک جھپاک سڑک پار کر کے بلوں یا جھاڑیوں میں چھپ جاتی۔ پتلی سڑک سے وہ پنڈی پوائنٹ پہنچتے جہاں سایوں سے پُر ٹھنڈی میٹھی دوپہر ہر طرف پھیلی ہوتی۔ جہاں پھلوں کے درختوں پر بیٹھی موٹی لدھڑ مکھیاں اور ان کے سائے میں ہری گھاس پر کالی بھینسیں قنوطیوں کی طرح سستی سے اونگھتی رہتیں۔ بکریاں پہاڑ کی ڈھلوانوں پر اسٹرابیری کی جھاڑیوں پر منہ مارتیں اور نوعمر گوالے چیڑ کے سائے میں لانبے لانبے لیٹے پہاڑی گیت گاتے اور نزدیک کے شر شر بہنے والے جھرنے کی مسلسل آواز دوپہر کے سکوت کا حصہ بن جاتی جب تک کہ کسی پہاڑی کوے کی چیختی اناکرخت آواز میں ڈھل کر اس سکوت کو توڑ نہ دیتی۔

اسے مری کی یہ دوپہریں بے حد پسند تھیں جب کہ شائستہ کی امی (وہ انھیں خود بھی امی کہتا تھا مگر سوچتے وقت وہ ہمیشہ شائستہ کی امی ہوتی تھیں) کہا کرتی تھیں کہ مری میں دوپہر تو ہوتی ہی نہیں۔ ان کے نزدیک گرم دھوپ میں جلتی بھنتی گرم علاقوں کی دوپہر ہی دوپہر ہوتی ہے جس میں ہش ہش کر کے بچوں کو اندر لایا جاتا ہے اور دروازے بند کر کے زبردستی سلایا جاتا ہے۔ مری کی دوپہریں تو چپکے سے دھوپ چھاؤں کی پرچھائیوں کی طرح آتیں اور خاموشی سے سنہری شام میں بدل جاتیں۔

شام کو وہ شائستہ کو لے کر مال روڈ کی لائبریری میں چلا جاتا جہاں لکڑی کے پرانے چھجوں کے آگے افق تا افق پھیلے میدانوں کے آسمان سے کہیں زیادہ وسیع آسمان پر شفق کی سرخ اور سرمئی دھاریاں پھیلی ہوتیں اور پہاڑیوں پر بنے مسجد کے مینار سرِ شام نکل آنے والے تاروں کے جلو میں کھڑے، عید کارڈوں کی طرح خوب صورت لگتے۔

لائبریری میں لگی ہوئی دانش وروں کی تصویریں ماحول کو زیادہ باعلم اور گمبھیر بناتیں۔ یہاں سے کتابیں لے کر وہ شائستہ کے ساتھ لکڑی کا زینہ اترتا، مال روڈ کا ایک چکر لگا کر لوٹتا اور پھر وہ دونوں

شکستہ گرجا گھر کے عین سامنے چھتری کے نیچے بنچ پر بیٹھ جاتے جہاں چاروں طرف نارنجی للی اور قرمزی ڈیلیا کے پھول کھلے ہوتے۔ چلنے سے پیشتر وہ سڑک کے کنارے کی ریلنگ پکڑ کر نیچے جھانکتے جہاں سیمنٹ کی بل کھاتی پتلی پٹری پر لدو جانوروں کی طرح بھاری سامان اٹھائے قلی چڑھ رہے ہوتے۔ نیچے بسوں کے اڈے پر کوڑے اور گوبر سے بسی ہوئی ہوا اور مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے اکتا کر وہ آگے بڑھ جاتے۔ سی ایم ایچ کی پہاڑیوں اور درختوں سے ڈھکی چھپی عمارت کے گہرے سایوں میں چلتے جب وہ اسکول پہنچتے تو اسکول کے دفتر کو پتلے جنگلے کے ذریعے ملانے والے پل جیسے راستے پر ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے اور اسی وقت کوئی ساتھی لڑکا اسے جھنجھوڑ کر اٹھاتا کہ گھنٹی بجے دیر ہو چکی ہے، وہ ابھی سو رہا ہے۔ ابھی اسے نہ صرف تیار ہونا ہے، بلکہ اپنا بستر اور الماری بھی درست کرنی ہے۔ معائنے کے وقت اگر بستر میں ذرا سی سلوٹ یا الماری میں ذرا سی بے ترتیبی ہوئی تو اسے سزا ملے گی۔

تب آنکھیں ملتا وہ مشترکہ غسل خانوں کا رخ کرتا اور سوچتا کہ آخر راتوں کو وہ خواب میں مسلسل شائستہ کو کیوں دیکھتا ہے!

صبح چار بجے شمس الرحمٰن کی آنکھ کھلی۔ اس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ اس وقت کی خوب صورتی بیان سے باہر ہے۔ اس نے سوچا۔ پہاڑ ساکن، درخت چپ، چڑیا خاموش۔ صبح کا اجالا دبے پاؤں بتاشوں پر چلتا آ رہا تھا۔ پہاڑوں پر وہ رات کا چراغاں نہیں تھا۔ صرف دور دور اجلی سفید روشنیاں تھیں جو اندھیرے کے سحر کو بڑھا رہی تھیں۔ ابھی تک روشنیاں آنے والے اُجالے پر حاوی تھیں۔ فتح مند و کامران وہ کھل کھلا کر ہنس رہی تھیں۔ اس حقیقت سے بے خبر کہ ابھی دیکھتے دیکھتے اُجالا ان پر فتح پا لے گا اور وہ مرجھائی ہوئی کلیوں کی طرح بے رونق ہو جائیں گی اور تب انھیں بجھا دیا جائے گا۔ دوبارہ سونے کی خواہش نہیں تھی۔ ذرا دیر بعد وہ اٹھ کر تیار ہوگا اور ''اکبر منزل'' جا کر سب کے ساتھ ناشتا کرے گا۔ تب تک کے لیے اس نے اپنے ذہن میں اس خواب کو دُہرایا جس سے ابھی اس کی آنکھ کھلی تھی۔ وہ دریائے سُرما کے پاس کھڑا تھا۔ اس کے پُل میں ہمیشہ کی طرح ہزاروں کبوتر چھپے ہوئے تھے لیکن وہ پُل منگورہ کے نزدیک دریائے سوات پر بنے ہوئے لکڑی کے پُل سے مشابہ تھا، پرانے چرخے جیسا، جس پر یہاں سے وہاں تک ضرب (X) کے نشان ایک دوسرے کو کاٹتے چلے گئے تھے۔ وہ پُل کے پاس کھڑا اسبز ڈاب کے کٹے ہوئے مربع سے منھ لگا کر شیریں پانی پی رہا تھا کہ سامنے سے شائستہ آتی دکھائی دی۔ آج شائستہ کتنے دن بعد خواب میں نظر آئی ہے۔ اس نے خواب میں سوچا۔ اور پھر ایک دم حیران ہوا۔ شائستہ تو بہت مُنّی سی، سانولی اور بھولی سی تھی اسی لیے تو وہ اسے 'شاما' کہا کرتا تھا۔ یہ آج اتنی بڑی اور سنہری سی کیسے ہو گئی ہے جیسے سونے کی مورتی ہو۔ شمس الرحمٰن

نے اپنا ڈاب اس کی طرف بڑھایا مگر وہ پینے کی بجائے اس کے اندر جھانکنے لگی، جیسے کسی کنویں میں جھانک رہی ہو۔ اس کی ہنسی بھی مختلف تھی۔ تب اس نے کہا،''سب لوگ تمھیں شوشی کہتے ہیں مگر میں تمھیں شاما کہتا ہوں، تمھیں برا نہیں لگتا؟''

''نہیں، مجھے شاما نام اچھا لگتا ہے، لیکن میرا نام زری ہے۔''

تب شمس الرحمٰن نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا تھا اور اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔

اُس رات زری بھی تھکاوٹ کے باوجود نہ سو سکی تھی۔ یہ رات اس کے لیے کوئی نئے افق وا کرنے کے لیے تیار نہیں تھی۔ مگر پرانی یادوں میں چھپے ہوئے ہزاروں نکتے تھے جنھیں وہ موتیوں کی طرح رولتی رہی۔ پچھلے پہر اُٹھ کر تیسری منزل پر داجی کے کمرے کے آگے کھڑی ہوگئی دُبِ اکبر کے سائے میں اپنے طویل لبادے میں بال کھولے کھڑی، وہ ابھی ابھی آسمان سے اترنے والی پری لگ رہی تھی۔ سامنے ''یوسف منزل'' درختوں میں گھری کھڑی تھی۔ برآمدے کے باہر جلتی بتی پر پتنگے لوٹیں لگا رہے تھے۔ وہ شاید پانچ چھ سال کی رہی ہوگی جب زیب قادری ڈھیروں سامان کے ساتھ یہاں آن کر رہی تھیں اور وہ موقع ملتے ہی ان کے ہاں جا پہنچی تھی۔

گلگونہ، اس کی خادمہ پہلے ہی بتا چکی تھی کہ وہ نہایت خوف ناک اور آدم بیزار چیز ہیں۔ زری نزدیک بھی گئی تو اس کی خیر نہیں۔ لیکن وہ گلگونہ کو زیب قادری کی ملازمہ کے ساتھ محوِ گفتگو پا کر فوراً وہاں جا پہنچی تھی اور دروازے پر ہلکی سی دستک دی تھی۔ ''کون؟'' کے جواب میں وہ فوراً ''میں ہوں'' کہہ کر اندر داخل ہوگئی تھی۔

''لڑکی تم کون ہو؟'' بیگم زیب قادری نے چشمے کے اوپر سے گویا جھانک کر اسے دیکھا تھا۔ اس زمانے میں وہ نہایت قیمتی اور خوب صورت فراکیں پہنا کرتی تھی۔ سنہری بال پیشانی پر سے ہلالی شکل میں کٹے ہوئے تھے مگر کاندھوں پر دو لانبی سنہری چوٹیاں جھولتی رہتی تھیں۔ اس کی رنگت سنہری تھی (اس نے لوگوں کو کہتے سنا تھا) اور دانت خوب صورت۔ اس کو دیکھ کر زیب قادری مایوس تو بالکل

نہیں ہوئی تھیں بلکہ ان کی آنکھوں میں تجسس سا ابھرا تھا۔ زری کو دبلی پتلی زردسی وہ خاتون ذرا بھی ہیبت ناک نہیں لگی تھیں۔

''میں زری ہوں۔ میں نے سنا تھا کہ آپ کتابیں لکھتی ہیں، میں نے آج تک کسی کو کتابیں لکھتے نہیں دیکھا، ویسے میرے داجی اور چاچاجی کے پاس بہت کتابیں ہیں۔''

''پھر میں کیا کروں؟'' زیب قادری نے رُکھائی سے کہا تھا۔

''آپ لکھیے، میں آپ کو لکھتے ہوئے دیکھوں گی۔'' زری ان کے قریب پڑا ہوا چیتے کی کھال کا بڑا سا پرس کھسکا کر بیٹھنے لگی۔

''اوں ہوں— وہ اُدھر۔'' انھوں نے دور پڑے ہوئے دیوان کی طرف اشارہ کیا اور پھر لکھنے میں مصروف ہوگئیں۔ زری انھیں اور الماری میں رکھی ہوئی کتابوں کو دیکھتی رہی۔ کھڑکی کے باہر اسکول کے بچے نالے سے گزر کر اپنے گاؤں پھگواڑی بانڈے کی طرف جارہے تھے۔ دھوپ سامنے پہاڑ پر پھیلی ہوئی تھی۔ زیب قادری شاید زری کی موجودگی سے بے نیاز ہو چکی تھیں کہ یکایک وہ بول اٹھی۔

''اس میں کیا ہے آنٹی؟''

''کس میں کیا ہے؟'' انھوں نے چشمے کے اوپر سے اسے گھورا۔

''اس پرس میں— آپ اس پر اس طرح ہاتھ پھیر رہی ہیں جیسے اس میں بلی کا بچہ ہو۔''

اور قبل اس کے کہ بیگم زیب قادری کچھ کہیں، وہ پرس کو کھولنے لگی۔

''خبردار!'' زیب قادری نے پرس اٹھا کر گود میں رکھ لیا۔ پرس اٹھانے کے انداز سے زری نے اندازہ کیا کہ وہ خاصا بھاری ہے۔

''اب تم جاسکتی ہو۔'' بیگم قادری کے شاہانہ دبدبے سے زری کو یوں لگا جیسے ابھی وہ تالی بجادیں گی تو دو چار جلاد ہاتھ میں تلواریں لیے نکل پڑیں گے (داجی رات کو اسے الف لیلہ کی کہانیاں سنایا کرتے تھے)۔ اس تصور سے لذت لیتے ہوئے اس نے کہا، ''کل پھر آجاؤں۔''

''کیوں؟''

''میں آپ کو پوری کتاب لکھتے ہوئے دیکھوں گی، پھر داجی اور چاچاجی کو بتاؤں گی۔'' بیگم قادری نے چشمہ اتار دیا۔ ان کے چہرے سے بناوٹی خشونت دور ہوگئی۔ وہ ہنسیں تو چہرے پر معصومیت اور نرمی بکھر گئی۔

''تم میرے بارے میں کسی کو کچھ نہ بتانا، ہاں یہ بتاؤ تمھارا نام کیا ہے؟''

''زری خان!''

''اچھا ہے۔''

''چاچا جی نے رکھا ہے۔''

''تمھیں چاچا جی بہت پسند ہیں؟''

''بہت۔''

''ان کا نام کیا ہے — تمھارے چاچا جی کا؟''

''عُمر — عُمر خان۔''

''مجھے تو تم شکل سے کوچی لگتی ہو یعنی خانہ بدوش، اگر میں تمھیں کوچی کہوں؟''

''آپ کی مرضی — میں کل پھر آؤں گی۔ آنٹی! آپ کسی سے ملتی کیوں نہیں ہیں؟'' باہر نکلتے نکلتے اچانک وہ پوچھ بیٹھی۔

''ہر بات کی کوئی نہ کوئی وجہ ہوتی ہے کوچی، مگر ہر ایک کو بتانا ضروری نہیں ہوتا — اور تمھیں اتنے سوال کرنے کس نے سکھائے ہیں؟'' وہ ہنسیں تو زری کو اور بھی اچھی لگیں۔

''چاچا جی نے۔ وہ کہتے ہیں سوال کیا کرو، سوال کرنے سے انسان سیکھتا ہے۔''

''سوال کرنے سے انسان کچھ نہیں سیکھتا بے وقوف لڑکی۔'' نا معلوم وہ کیوں ایک دم بگڑ گئیں۔

''کیوں آنٹی؟'' اُس نے گردن اٹھا کر بے وقوفی سے پوچھا۔

''کل بتاؤں گی، اب تم جاؤ۔'' وہ پھر چشمہ ناک پر جمانے لگیں۔

''اچھا۔'' زری نے فرماں برداری سے کہا۔ زیب قادری کی ملازمہ اسے مالکن کے کمرے سے نکلتا دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔

''انھوں نے تمھیں کچھ نہیں کہا۔ میرا خیال تھا وہ تمھیں ڈانٹ کر بھگا دیں گی اور تم روتی ہوئی آؤ گی۔''

''واہ مجھے آج تک کسی نے نہیں ڈانٹا۔ پتا ہے انھوں نے مجھ سے کل بھی آنے کے لیے کہا ہے۔''

''سچ!''

راستے بھر زری، زیب قادری سے اپنے انٹرویو کی تفصیل خوش حال خاں کو سناتی آئی جو اتنی دیر اس رپورٹ کا منتظر اور مشتاق باہر بیٹھا رہا تھا۔

وہ دن اور آج کا دن، زری اور اس کے چاچا عمر، زیب قادری کے سحر میں یوں ڈوبے تھے کہ پھر نہ نکل سکے تھے۔ چاچا جی پر دنیا ہنستی رہی مگر انھوں نے کسی کی پروا نہ کی۔ شاید انھیں ہوش ہی نہ تھا۔ محبت کا جہاں تک تعلق ہے چاچا جی کتنے بدقسمت تھے۔ شاید اس ہی کی طرح! — اس کا اور چاچا

جی کا مقدر کا ستارہ ایک ہی تھا جبھی تو وہ اور چاچاجی سدا سے ایک دوسرے کی طرف کھنچتے تھے۔

اس دن سے زری اور زیب قادری کی باقاعدہ دوستی ہوگئی تھی۔ وہ کہیں بھی جاتیں زری کو ساتھ لے لیتیں۔ زری کے ساتھ گلگونہ بھی ضرور ہوتی۔ وہ اونچی چوٹیوں اور نیچی وادیوں، ادھ بنے مکانوں اور خرابوں کے چکر لگایا کرتیں تاکہ ان کے رومانی دہشت ناک افسانوں کو لوکیل (locale) میسّر آسکے۔ وہ مقامی لوگوں سے باتیں کرتی تھیں اور پرانے توہمات کے قصّے بڑے غور سے سنتی تھیں۔ ایک دن گلگونہ انھیں اپنے گھر بھی لے گئی تھی۔ گلگونہ کی ماں نے ان دونوں کی بڑی آؤ بھگت کی تھی۔ اس کے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات تھی کہ اس کی مالکہ کی بیٹی اور اتنی بڑی بیگم اس کی جھونپڑی میں آئی تھیں۔ گلگونہ کی ماں نحیف ونزار سی عورت تھی جو سارا دن جھاڑو سے چیڑ کے تنکے سمیٹتی اور سوکھے تکون (cone) جمع کرتی تھی۔ گھر کے پچھواڑے جمع شدہ ایندھن کی یہ ڈھیریاں برف کے بے داد دِنوں میں بڑی کام آتی تھیں۔ گلگونہ کی ماں اس بات سے بہت خوش تھی کہ زری کا سلوک گلگونہ سے بہت اچھا تھا۔ وہ اسے خدمت گار نہیں سہیلی سمجھتی تھی۔ گلگونہ کئی کئی دن گھر نہیں جاتی تھی تو اسے فکر نہیں ہوتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ ''اکبر منزل'' میں وہ بالکل محفوظ ہے۔

جب زری کا آنا جانا زیادہ ہوا تو زیب قادری اپنے چھوٹے موٹے کام بھی زری سے کروانے لگیں۔ زری جو اپنے گھر میں اپنے ہاتھ سے پانی بھی نہ پیتی تھی، دوڑ دوڑ کر زیب قادری کا کام کرتی۔ ان کے بڑے سے بکس میں سے (جو وہ ساتھ لے کر آئی تھیں اور کسی کو معلوم نہیں تھا کہ اس میں کیا کیا ہے) الائچیاں اور بادام پستے نکالنا اسے خاص طور پر پسند تھا۔ اس بکس میں بڑی میٹھی سی ٹھنڈک تھی، کسی پرانے مقبرے ایسی، یا کسی کنویں کے کنارے لگے بڑے سے درخت کی چھاؤں جیسی۔ اس کے علاوہ اس میں پرانے نئے کپڑوں، پھولوں اور عطریات کے بھبکے سے نکلتے تھے۔

''آنٹی! اس بکس میں اور کیا کیا ہے؟''

''بہت کچھ ہے، کسی دن تجھے دکھاؤں گی۔'' وہ سارے سوال کا جواب کسی آنے والے کل پر ٹالے جاتیں۔

''آنٹی! آپ کے بچے نہیں ہیں؟'' ایک دن زری پوچھ بیٹھی۔

''کون کہتا ہے؟''

''آپ اپنی دوست کے ہاں رہتی ہیں نا اس لیے میں نے سوچا......''

''کسی دوست کے ہاں ٹھہرنے کا مطلب یہ کیسے ہوا کہ اس کے بچے نہیں ہیں۔'' وہ سنجیدہ ہوگئیں۔ ''سنو، میرے دو بیٹے ہیں مگر ان میں سے کوئی بھی میرے پاس نہیں رہتا۔ اس لیے میں

سردیوں میں لاہور اور گرمیوں میں مری یا ایبٹ آباد کسی دوست یا جاننے والے کے ہاں رہتی ہوں جو مجھے دو کمرے مفت یا کرائے پر دے سکے۔ اپنا سامان ساتھ لے کر جاتی ہوں۔ اپنا کھانا الگ پکواتی ہوں آئی عقل شریف میں؟'' وہ ہنسیں۔

''کیوں؟'' حسبِ عادت زری نے جرح کی۔

''میری جان! یہ کیوں، کیا، تیرے کچھ کام نہ آئے گی۔ ادھر بیٹھ یہ کاغذ قلم لے اور مجھے یہ عبارت خوشخط لکھ کر دکھا۔''

''آنٹی ــــ مجھے اردو نہیں آتی اور میری ہینڈ رائیٹنگ بہت خراب ہے۔''

اسی لیے لکھوا رہی ہوں۔ تیری اردو اور تیری عاقبت دونوں سنوار دوں گی میں۔ لڑکیوں کے لیے بہت چوں چرا کرنا اچھا نہیں ہوتا، تجھے نہیں معلوم، اور شاید تیرے دا جی اور چاچا جی کو بھی نہیں معلوم۔ کسی دن ان کو میرے ہاں لے آنا۔''

زیب قادری نے تو یوں ہی کہہ دیا تھا لیکن ایک دن زری سچ مچ چاچا جی کو ان کے ہاں لے گئی۔

''یہ میرے چاچا ہیں۔'' اس نے بڑے فخر سے کہا۔ زیب قادری نے انھیں غور سے دیکھا۔ وہ بے داغ شلوار قمیص اور واسکٹ میں ملبوس متوسط قد کے عام سے مرد لگے۔ شاید کبھی خوب صورت رہے ہوں، انھوں نے سوچا۔

''بیٹھیے۔'' انھوں نے محض رسماً کہا۔ شاید وہ امید کر رہی تھیں کہ وہ معذرت کر کے چلے جائیں گے لیکن وہ بیٹھ گئے۔ اِدھر اُدھر دیکھا پھر بولے، ''یہ ساری کتابیں آپ نے لکھی ہیں؟''

''جی ہاں۔''

''آپ اپنی لکھی ہوئی کتابیں پڑھ بھی سکتی ہیں؟''

اب زیب قادری کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

''آپ کو آئے ہوئے ایک منٹ بھی نہیں ہوا اور آپ بے تکلفی پر اتر آئے ہیں۔'' وہ چیں بہ جبیں ہو کر بولیں۔ چاچا جی کھسیانے ہو گئے۔

''معاف کیجیے، گو میں خاص مشہور تعلیمی اداروں سے وابستہ رہا ہوں۔ لیکن اب بہت دنوں سے مہذب دنیا سے دور ہوں۔ ادب آداب بھولتا جا رہا ہوں۔''

''مجھے معلوم ہے، مشہور اداروں سے وابستہ لوگوں کو witty بننے کا بہت شوق ہوتا ہے بے رحمی اور سفاکی کی حد تک، لیکن میں آج کل باتوں کے موڈ میں نہیں ہوں۔''

''بات یہ ہے بیگم قادری، اگر ہم سفاک ہیں تو آپ بھی خاصی غیر مہمان نواز ہیں۔''

''جی ہاں، مہمان نوازی میں میری کوئی ایسی شہرت نہیں ہے، آپ زری کے چچا ہیں، اس لیے میں نے آپ کا لحاظ کیا ورنہ......''

''ورنہ تو آپ میرے پیچھے کتے چھڑوا دیتیں۔'' چاچا جی نے جلدی سے جملہ پورا کر دیا۔

زری جو یہ نوک جھوک بڑے مزے سے سن رہی تھی، آخری بات پر منھ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی۔

زیب قادری کو ناگوار گزرا۔ ''تم برآمدے میں بیٹھ کر کل کا کام ختم کرو۔'' انھوں نے ذرا سختی سے کہا۔

زری اپنا سامان لے کر برآمدے میں دیوان پر جا بیٹھی مگر اس کے کان وہیں لگے رہے۔

''کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ نے کیسے زحمت کی؟'' زیب قادری نے پوچھا۔

''سچ بتاؤں یا جھوٹ۔'' چاچا جی اب واقعی پرانی طالب علمانہ خباثت پر اتر آئے تھے۔

''سچ بتایئے۔''

''نہیں، پہلے جھوٹ سن لیجیے۔ وہ یہ ہے کہ میں نے آپ کی ساری کتابیں پڑھی ہیں۔ میں آپ کا بڑا مداح ہوں اور ایک مدت سے آپ سے ملنے کے لیے مرا جا رہا تھا۔''

زری اب اپنا کام چھوڑ کر دروازے کے پیچھے سے جھانکنے میں مصروف تھی۔

''اور سچ؟''

''سچ کڑوا ہوتا ہے، آپ برا مان جائیں گی۔''

''اب برا مانوں یا بھلا، جب اتنا کہا ہے تو وہ بھی کہہ دیجیے۔'' زیب قادری کے چہرے پر خفیف سی مسکراہٹ دیکھ کر زری کی جان میں جان آئی۔

''بات یہ ہے بیگم قادری کہ آپ کے بارے میں طرح طرح کی افواہیں پھیلی ہوئی ہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ ہندو مذہب کا مطالعہ کرنے کے لیے آپ ہندوستان کے جنگلوں میں پھرتی رہی ہیں۔ بدھ مذہب کے لیے سیلون گئی ہیں اور کسی پادری سے بائبل پڑھی ہے اور ان پگوڈوں اور مندروں کی خاک چھانتے چھانتے خوف ناک کہانیاں لکھنے لگی ہیں۔ اب جب سے زری نے یہاں آنا جانا شروع کیا ہے، زری کی ماں اور دادی کو خوف ہے کہ جانے آپ اسے کیا اُلٹی پٹی پڑھا دیں گی۔''

''دیکھیے، آپ کی بھتیجی میرے ہاں اپنی مرضی سے آتی ہے۔ وہ یہاں کیا کرتی ہے، یہ اُس کی خادمہ روز دیکھتی ہے اور آپ بھی دیکھ چکے ہیں۔''

''اوہو، آپ بہت جلد سنجیدہ ہو جاتی ہیں۔ وہ تو مذاق کی بات تھی۔ اصل بات تو یہ ہے کہ زری گھر میں کسی کی نہیں سنتی مگر آپ کا ہر لفظ، جیسے نعوذ باللہ اللہ کا فرمان ہو، میں یہ دیکھنے آیا تھا کہ آپ نے اس پر کیا جادو کیا ہے؟''

بیگم زیب قادری نے ان کی طرف شبہے سے دیکھا مگر اب ان کے چہرے پر شرارت نہیں، خلوص و معصومیت کے چشمے ابل رہے تھے۔

بیگم قادری نے گویا سفید جھنڈا لہرادیا۔ چشمہ اتار کر میز پر رکھا۔ کاپی میں قلم رکھ کر بند کیا۔ مسہری پر لگی ہوئی گھنٹی بجائی اور ملازم سے چائے لانے کو کہا۔ چائے کے دوران دونوں بڑے دوستانہ انداز میں باتیں کرتے رہے۔ اس کے بعد چاچا جی اٹھ کھڑے ہوئے۔ ''کسی نے کہا ہے کہ لذیذ کھانوں کی طرح اچھی باتوں کو بھی 'زیادتی' ہونے سے پہلے ختم کر دینا چاہیے۔ اب چلیں گے۔''

''پھر کبھی آیئے۔'' زیب قادری کے لہجے میں خلوص تھا ضرور۔

''نیکی اور پوچھ پوچھ۔''

چاچا جی زری کو ساتھ لے کر واپس چلے آئے۔ شام کو کچھ مہمان آگئے اور رات کو دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ جب چاچا جی نے جانے کا ارادہ ظاہر کیا تو دا جی نے کہا، ''لالہ! کبھی دو چار دن یہاں بھی رہ لیا کیجیے۔ یہ بھی آپ کا گھر ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم کہتے ہو تو نہیں جاتا۔'' چاچا جی نے ہتھیار ڈال دیے۔

دوسرے دن چاچا جی سہ پہر کے وقت انگور کی بیلوں کے نیچے ٹہل رہے تھے۔ جیسے ہی زری اور گلگونہ زیب قادری کے گھر جانے کے لیے سیڑھیوں سے نیچے اتریں۔ وہ گیٹ کھول کر یوں ان کے ساتھ ہو لیے جیسے یہ ان کا روز کا معمول ہو۔

اور اسی دن سے دا جی بے بے، اور بے بے کے دل میں کسی اَن جانے وسوسے نے سر اٹھایا۔ وہ چاچا جی کی حرکات و سکنات پر پندرہ سالہ لڑکی کی سی نگرانی رکھتیں۔ چاچا جی اب دوسرے تیسرے دن چکر لگاتے اور زری کے بغیر بھی ''یوسف منزل'' چلے جاتے۔ کبھی زری بے بے کو کہتے سنتی، ''دیکھا تم نے، لالہ کو یوسف منزل گئے کتنی دیر ہوگئی۔ ابھی تک نہیں لوٹے، آخر کیا کر رہے ہیں وہاں؟''

''اتنی دیر آدمی کیا کر سکتا ہے۔'' دا جی بات کو مذاق میں ٹالتے۔

''بے شرمی کی باتیں مت کرو۔'' بے بے چراغ پا ہو جاتیں۔ ''کیا کسی اکیلی غیر عورت کے پاس اس طرح جانا کوئی اچھی بات ہے، محلے والے دیکھیں گے تو کیا کہیں گے؟''

''پاگل ہوئی ہو، وہ کوئی بچہ ہیں۔ یوسف اور ان کی بیوی بھی وہاں ہوتے ہیں۔''

دا جی بے بے الگ خلجان میں مبتلا تھیں۔ تنہائی میں اس سے پوچھا کرتیں کہ چاچا جی اور زیب قادری کیا باتیں کرتے ہیں۔ کہیں سے کوئی مہمان آٹپکتا تو فوراً ملازم بھیج کر چاچا جی کو بلوالیا جاتا۔ طرح طرح کے حیلے بہانوں سے چاچا جی کو ان کے گھر واپس بھیجنے کی کوشش کی جاتی۔ ''تمھاری کوٹھی

سے آدمی آیا ہے، مالی کی بیوی نالے میں گر پڑی تھی، وہ اُسے لے کر اسپتال چلا گیا ہے، باغ کی رکھوالی کرنے والا کوئی نہیں ہے۔"

"کرم دین تو ہوگا۔"

"وہ کسی کام سے پنڈی گیا ہے۔"

چاچا جی مجبور ہو کر چلے جاتے لیکن دوسرے دن پھر لوٹ آتے۔ زری کو لگتا جیسے وہ رات کو سوتے نہ ہوں۔ ان کے گھر رہ جاتے تب بھی نچلی منزل میں کبھی انگوروں کے سائے میں اور کبھی جنگلے سے لگے "یوسف منزل" کی طرف دیکھتے رہتے۔ اور پھر زری نے محسوس کیا کہ چاچا جی جو ہمیشہ اپنی عمر سے کم نظر آتے تھے اور چاق چوبند رہتے تھے، بے حدست اور تھکے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ وہ چہل قدمی کا خوب صورت عصا سنبھالے "یوسف منزل" تک کا راستہ بہت آہستہ آہستہ طے کرتے۔

زری کو معلوم تھا زیب قادری بیمار ہیں۔ وہ شروع دن سے زری کو بہت دبلی پتلی اور کمزور لگی تھیں لیکن اب تو وہ ہر وقت لیٹی رہتی تھیں۔ اب وہ اسے باقاعدہ پڑھاتی بھی نہیں تھیں۔ زری اب بھی روز ان کے گھر جاتی تھی۔ کبھی کبھی وہ اسے ایسے قصے سناتی تھیں جو کہانیوں سے بھی زیادہ دل چسپ ہوتے تھے۔ ان کے بارے میں چند افواہیں صحیح بھی تھیں۔ انھوں نے سومناتھ کا مندر دیکھا تھا اور ہمالیہ کے نشیب میں بسے ہوئے ایک گاؤں 'کلو' کے میلے میں گئی تھیں جہاں انھوں نے سانڈ کی قربانی ہوتے دیکھی تھی۔ اس قسم کے مزے دار قصے زری بڑے شوق سے سنتی تھی لیکن بے بے کو شک تھا کہ اس عورت کے ہاتھ میں کالا علم ہے۔ جس کے زور سے اس نے لالہ جیسی بندھنی اور زری جیسی لاابالی ہستی کو اپنے قابو میں کرلیا ہے۔ دا جی بے بے بہو کی اس بات پر صاد کرتیں۔ "خدا خبر کہاں کہاں ماری پھرتی رہی ہے۔ کیا پتا کسی کافر سے کالا علم سیکھ لیا ہو۔"

مگر اب چاچا جی کا اُترا ہوا چہرہ اور سست قدم دیکھ کر کچھ کہنے کی ہمت نہ پڑتی۔ آخر دا جی کو بھی پتا چل گیا کہ ان دونوں عورتوں کا ڈر اتنا بے بنیاد نہ تھا۔ رفتہ رفتہ بات وہیں تک پہنچی تھی اور ایک دن جب مارے نقاہت کے سانس بیگم زیب قادری کے سینے میں نہ سما رہا تھا، دا جی خود انھیں اور چاچا جی کو اپنی کار میں کورٹ لے کر گئے تھے جہاں شادی کے کاغذات پر دونوں نے دستخط کیے تھے اور دو دن بعد زیب قادری چل بسی تھیں۔

کورٹ سے واپسی پر پہلی مرتبہ دا جی "یوسف منزل" آئے تھے۔ جہاں زیب قادری مٹی کے ڈھیر کی طرح بستر پر گر گئی تھیں۔ اتنی دور چلنے سے ہی وہ تھک کر چور ہو گئی تھیں۔ چاچا جی نے ان کا نرم ہاتھ تھپتھپاتے ہوئے کہا تھا، "زیب! ابھی تھکنے کا وقت نہیں آیا۔" اور وہ صرف مسکرا دی تھیں۔

زری داجی کے ساتھ ''اکبر منزل'' آ گئی تھی جہاں بے بے نے داجی کو آڑے ہاتھوں لیا تھا، ''ایسا ہی لالہ کو نکاح کا شوق تھا تو خوش حال کی ماں سے کر لیتے۔ بیوہ کو ٹھکانا مل جاتا، غریب بچے کو آسرا ہو جاتا۔''

''جب تم کوئی بات سمجھ نہیں سکتیں اور میں سمجھا نہیں سکتا تو کیا اس صورت میں خاموشی بہتر نہیں ہے۔'' داجی نے چڑ کر کہا تھا۔

''سمجھ میں آنے والی کوئی بات بھی ہو۔ میری کیا سارے زمانے کی سمجھ میں نہیں آ رہی۔ تم بتاؤ، کیا تم کسی نعش سے نکاح پڑھوا لیتے؟''

زری کو لگا جیسے داجی کے ذہن میں کوئی ہیولا جھانکا ہو۔ ایک سایہ ان کے چہرے پر سے گزرتا چلا گیا۔

''ہاں، اگر مجھے اس سے محبت ہوتی تو یقیناً پڑھوا لیتا۔'' کہتے ہوئے وہ تیزی سے باہر نکل گئے تھے۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ وقت آ گیا جب اُجالا ایک دم بڑھتا، پھیلتا اور چھاتا چلا جاتا ہے۔ پرندوں نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ انگور کی بیلوں، لیچی کے درختوں، سیبوں اور خوبانیوں کی شاخوں سے عجیب خوش الحان چہچہے سنائی دے رہے تھے۔ قدرت کا یہ آرکسٹرا بغیر کسی رسمی اعلان کے متواتر بج رہا تھا، کبھی ڈھیروں ساز ایک ساتھ سنائی دیتے، کبھی کچھ کم —— پھر رفتہ رفتہ ساز اور سُر کم ہونے لگے۔ کبھی تیز، کبھی مدھم، کسی سمفنی کی طرح۔ آخر میں چند چڑیاں دھیمے سروں میں الاپ کرنے لگیں جیسے صبح کے راگ بھیرویں کی مشق کر رہی ہوں۔

زری نے سڑک پر شمس الرحمٰن کو اس طرف آتے دیکھا۔ اس وقت پھوپھا جی کھٹ کھٹ کرتے پہاڑ سے تراشیدہ سیڑھیاں اترے۔ لوہے کا گیٹ کھول کر باہر آئے۔ شمس الرحمٰن نے سلام کیا۔

''ابھی تو سب سو رہے ہیں، میں روز صبح ٹہلنے جاتا ہوں۔ چلنا چاہو تو میرے ساتھ چلو۔'' انھوں نے کہا۔

''چلیے۔'' شمس الرحمٰن ان کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔

''پھوپھا جی اور شمس الرحمٰن میں قدرِ مشترک کیا ہے!'' زری نے سوچا۔ ان کے لیے زری اور نرگس کا ایک لڑکے کے ساتھ اتنی دور آنا تحیر خیز ضرور ہوگا۔ ایبٹ آباد میں سب ہی اسے جانتے ہیں۔ بہت جلد بات پھیلے گی اور چہ میگوئیاں ہوں گی۔ اس کی بلا سے —— وہ اب ان باتوں کی پروا نہیں کر سکتی۔

چاچا جی ان دنوں اپنی زمینوں کی دیکھ بھال کے لیے گاؤں گئے ہوئے تھے اور وہ ان سے ملنے کے لیے بے چین تھی۔

شمس الرحمٰن اور پھوپھا جی ڈھلان پر تیزی سے اترے۔ ایبٹ آباد زیرو میل کے نشان سے گزرتے، بلوچ میس کے سامنے سے گزر کر آگے بڑھتے چلے گئے۔ سبزہ بہت کچھ شمس الرحمٰن کے اپنے علاقے جیسا تھا مگر درختوں، پودوں اور بیلوں کی اقسام مختلف تھیں۔ قد آور چیڑ کے درختوں پر چڑھی ہوئی بیلیں چوٹی تک جا پہنچی تھیں۔ صنوبر کے درخت بانہیں پھیلائے کھڑے تھے اور چنار اپنے ہاتھوں کی پانچوں انگلیوں سے تالیاں بجا رہے تھے۔

''ایبٹ آباد اچھی جگہ ہے۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''ہاں، ہر لحاظ سے معتدل۔ یہاں سارے سال نہایت آرام سے رہا جا سکتا ہے۔ مگر نہ جانے کیوں، زری کو اپنا شہر پسند نہیں ہے۔'' پھوپھا جی نے دکھ سے کہا۔

''ہو سکتا ہے، وہ یہاں کی دکھ بھری یادوں سے بچنا چاہتی ہوں۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

وہ دونوں خاموشی سے چلتے رہے۔ صبح کا اُجالا سارے میں پھیل چکا تھا۔ اندھیرے سے آخری دم تک لڑنے والی بتیاں بجھائی جا چکی تھیں۔ پہاڑوں پر ہر طرف دو دو تین تین دروں والے نیلے، پیلے اور ہرے گھر نظر آنے لگے تھے۔ درختوں میں گھرے یہ معمولی سے مکان یوں تو برے نہیں لگتے۔ شمس الرحمٰن نے سوچا۔ اگر رات کی خوب صورتی سے اُن کا مقابلہ نہ کیا جائے۔ حُسن کے بھی مدارج ہوتے ہیں۔ برتر حُسن کے آگے کم تر حُسن ماند تو پڑتا ہی ہے لیکن بعض اوقات بھونڈا اور کریہہ نظر آنے لگتا ہے۔ ہر چیز کا اپنا المیہ ہے۔

"تم نے ابھی کہا تھا کہ زری یہاں کی دکھ بھری یادوں سے بچنا چاہتی ہے۔" دفعتاً پھوپھا جی بولے۔

"میرا اندازہ ہے۔"

"تم ٹھیک سمجھے۔ جب بھی وہ اس گھر میں ہوتی ہے ہر جگہ — جہاں وہ جاتی ہے، کھڑی ہوتی ہے، بیٹھتی ہے، سامنے اسے ماں باپ کی قبریں نظر آتی ہیں۔ اسے ضرور وہ زمانہ یاد آتا ہوگا جب وہ زندہ تھے۔ باپ نے اسے بے اندازہ پیار دیا تھا۔ وہ اس کی ہر جائز و ناجائز بات مانتے تھے اور ہم کہتے تھے، لالہ نے اسے بگاڑ دیا ہے۔ مگر اب اس پر ترس آتا ہے۔ تمھیں کیا معلوم کہ کتنے لوگوں نے اسے کیسے کیسے چاہا ہے۔ ہم سب کے لیے وہ اکبر خاں اور گل جان کی واحد نشانی رہ گئی ہے...... مگر" وہ سانس لینے کے لیے رکے اور جیسے ان کے سینے میں دبی ٹھنڈی آہ باہر آ گئی، "یوں لگتا ہے جیسے اسے اپنے چاہنے والوں کو تکلیف دے کر خوشی ہوتی ہے۔ ہم جب اس گھر کو دیکھتے ہیں جو کسی زمانے میں اپنے علاقے کا سب سے خوب صورت گھر تھا تو دل پر ایک مکا سا پڑتا ہے۔ یہاں کے انگور، خوبانی اور بادام روسا کو تحفے میں بھیجے جاتے تھے۔ راہ چلنے والے اس خوب صورت کوٹھی کو آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے تھے۔ اکبر منزل کا نام پڑھتے تھے اور اس کے گیراج کے نزدیک چھوٹے سے چبوترے پر دو گھڑی ستانے بیٹھ جاتے تھے تو لالہ اندر سے ان کے لیے چائے، شربت اور پھل بھجوایا کرتے تھے اور وہ اس مہمان نوازی پر حیران ہوتے تھے۔ زری کے والد کے پاس اس وقت کار تھی جب پورے شہر میں گنتی کی کاریں تھیں مگر اب سنا ہے کہ وہ رکشا ٹیکسی میں خاک پھانکتی دفتر جاتی ہے۔ اس نے سب کچھ تباہ کر دیا اور کوئی اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکا۔ اس نے سدا من مانی کی ہے اور ہمیشہ من مانی کرے گی۔ آؤ اب واپس چلیں۔" شمس الرحمٰن کو وہ بے حد اداس نظر آئے۔

گھر کی سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے پھوپھا جی گیٹ کے پاس چند منٹ ٹھہرے۔

"تم بیٹھک میں چل کر بیٹھو، میں زری کو بھیجتا ہوں۔" انھوں نے کہا۔

"جی بہتر۔"

"یہ کوٹھی کی حالت دیکھ رہے ہو؟" انھوں نے کہا۔

شمس الرحمٰن نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ کوٹھی کا رنگ و روغن اترے زمانہ ہو چکا تھا۔ بارش کی زیادتی نے دیواروں کو کائی زدہ کر رکھا تھا۔ دروازوں اور کھڑکیوں کی چمک ماند پڑ چکی تھی۔ آگے کو نکلے ہوئے جھروکے کی جالیاں ٹوٹی ہوئی تھیں۔ کوٹھی کی پیشانی پر لوحِ تقدیر کی طرح لکھا "اکبر منزل" رنگ اور چمک سے بے نیاز اب قریب قریب مٹ چکا تھا۔

"اگر آج لالہ کے کوئی بیٹا ہوتا تو اس گھر کی یہ حالت نہ ہوتی۔" انھوں نے یہ جملہ بڑی حسرت

سے ادا کیا اور سیڑھیاں چڑھ گئے۔

شمس الرحمٰن گیٹ کھول کر نچلی منزل کی بیٹھک کی طرف بڑھا۔ باغ اب صحن بن چکا تھا۔ البتہ انگور کی بیل موٹے موٹے رسّوں میں تبدیل ہو کر صحن کی چوڑائی پار کر کے گھر کے اوپر چڑھ گئی تھی۔ خوب صورت کٹاؤ دار پتوں کے درمیان سے سبز انگور کے چھوٹے بڑے بے شمار گچھے جھانک رہے تھے۔ رسّی جیسے لچک دار تنوں نے جنگلے کے نازک اور نفیس ستونوں کو اپنی آغوشِ محبت میں یوں جکڑ لیا تھا کہ وہ جگہ جگہ سے تڑخ کر رہ گئے تھے۔

بیٹھک کے آگے دُہرے گول ستونوں والا ایک برآمدہ تھا جس کے ستونوں پر چڑھی چنبیلی کی بیلیں کسی لڑکی کی لانبی چوٹی کی طرح آپس میں گندھی ہوئی تھیں۔ بیٹھک کی حالت باقی کمروں سے قدرے بہتر تھی۔ قالین، صوفہ سیٹ، دیوان، لیمپ اتنے بوسیدہ نہ تھے۔ دیواروں پر ناقابلِ بیان حد تک باریک اور نفیس پُھل کاریاں فریم میں جڑی ہوئی تھیں۔ آتش دان پر شاید زری کے والد اور والدہ کی تصویر تھی۔ دونوں غیر معمولی خوب صورتی اور وجاہت کا نمونہ تھے۔

شمس الرحمٰن نے بیٹھک میں سے مٹتے ہوئے نام ''اکبر منزل'' پر نظر ڈالی۔ کاش لالہ کے کوئی بیٹا ہوتا۔ پھوپھا جی کی بات اسے یاد آئی اور لمحے بھر میں اس پر انکشاف ہوا کہ لوگ بیٹوں کی تمنا کیوں کرتے ہیں۔

آج اس علاقے کی سب سے خوب صورت کوٹھی ایسی تھی جیسے عہدِ قدیم کی کوئی کارواں سرائے، خستہ و خراب — نیچے کے تین کمروں میں کاٹھ کباڑ بھرا ہوا تھا۔ کائی لگی چارپائیاں چارپائیوں کے اوپر چھت تک لگی تھیں۔ لکڑی کے بڑے بڑے بکس دوسرے بکسوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھے۔ ان بکسوں پر سوٹ کیس تھے، سوٹ کیسوں پر اٹیچی کیس تھے۔ لکھنے کی میزوں پر پرانے لیمپ، قلم دان اور گلدان رکھے تھے اور ان کی آدھی کھلی ہوئی درازیں مختلف چیزوں سے اٹی پڑی تھیں۔

چینی سلک کے کشنوں کے کپڑے گھس چکے تھے اور رنگ اڑ چکے تھے۔ راتوں کو ٹھہرنے والے مسافر انھیں اپنے سروں کے نیچے رکھتے تھے اور صبح یا دوسرے دن یا چار دن بعد وہ پھر وہیں آن پڑتے تھے۔ ڈھیروں بستر جو بکسوں سے نکلتے تھے، آنے والی مہمان لڑکیاں تہہ کر کے ہنڈولوں کی طرح رکھے ہوئے پلنگوں پر سجا دیتی تھیں کہ کون انھیں صندوقوں میں بھرتا پھرے۔ مُنّی سی پھوپھو جی میں نہ اتنی ہمت تھی نہ انھیں اتنی فرصت تھی کہ اپنی جگہ پر رکھ سکیں۔ جانے کل پھر کون مسافر کدھر سے آ نکلے۔ کوئی کینیڈا جانے کے لیے اپنے گاؤں سے چل کر دو دن یہاں آ ٹھہرا ہے۔ کوئی تربیلا ڈیم کے نئے منصوبے کو دیکھنے گیا تھا، واپسی میں یہاں قیام کر رہا ہے۔ کوئی آبائی گاؤں کا راہرو ہے، دم لے کر

آگے جائے گا۔ اپنے وکیل صاحب کی کوٹھی دیکھ کر چلا آیا ہے۔

''آپ کو اوپر بلایا ہے۔'' دروازے میں ایک اجنبی شخص کھڑا شمس الرحمٰن سے مخاطب تھا۔ اس کے خشخاشی بال کھڑے ہوئے تھے۔ کپڑوں پر چکنائی اور میل کے دھبے تھے اور چپلوں پر جیسے میلوں مسافت کی دھول جمی ہوئی تھی۔

شمس الرحمٰن اوپر آیا۔ اس نے دیکھا کہ کھانے کی میز کی جگہ تبدیل ہوگئی ہے۔ زری ہمیشہ کی طرح شوخ رنگ کی شلوار قمیص میں ملبوس تھی اور ایبٹ آباد کی اجلی فضا میں بڑی نکھری نکھری لگ رہی تھی۔ اسے دیکھتے ہی شمس الرحمٰن کو رات کا خواب یاد آیا اور اپنے خواب کی اس دورنگی پر وہ ایک بار پھر حیران ہوا۔

آج انھیں ''ٹھنڈیانی'' جانا تھا۔ شمس الرحمٰن نے ''اکبر منزل'' تک پہنچانے والے ڈرائیور کو ٹیکسی لانے کے لیے کہہ دیا تھا۔ زری اور نرگس ساتھ لے جانے کے لیے کھانا پکانے میں مصروف تھیں، جب انھیں پتا چلا کہ شمس الرحمٰن ہوٹل سے ناشتا کر کے نہیں آیا تو اسے انڈے، پراٹھے، دودھ اور چائے کا ناشتا دیا گیا جس کے دوران وہ اخبار پڑھتا رہا۔ اخبار کی خبریں بھی آج کل کے حالات کی طرح تضاد کا شکار تھیں۔ ایک طرف دورِ ایوبی کے سنہری کارناموں کا تذکرہ تھا، دوسری طرف اسمگلنگ کی روک تھام کے لیے زبردست اقدام کرنے کا ذکر تھا— اور چینی کی قلت پر کارٹون تھے۔

یکایک کان میں آنے والی غیر مانوس بلند آوازوں پر شمس الرحمٰن نے اخبار پر سے نظریں اٹھا کر دیکھا۔ جھروکے والے حصے میں دو مرد پرانی آرام کرسیوں پر بیٹھے بحث میں مصروف تھے۔ ان میں سے ایک وہی تھا جو اسے اوپر لے کر آیا تھا۔ وہ بے حد جوش و خروش سے بول رہا تھا۔ اس کے ظاہری حلیے پر بڑے بڑے الفاظ جو وہ پشتو لب و لہجے میں بول رہا تھا، اوپری اوپری لگ رہے تھے— ''اس دس سالہ جشن نے صدر ایوب کو جتنا نقصان پہنچایا ہے، اور کسی چیز نے نہیں پہنچایا۔ آپ اپنے گھر میں کوئی کام کریں تو اس کا ڈھنڈورا نہیں پیٹتے۔ دو سو روپے کی سفیدی کروا کے دو ہزار روپے جشن پر خرچ کرنا کہاں کی عقل مندی ہے؟ میں کہتا ہوں یہ چھچھورپن ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ جو کام بھی کیا گیا اس میں خلوص نہیں، دکھاوا تھا۔ اور اب پشاور میں صدر کی آمد پر جو انتظام ہو رہے ہیں۔ ہزار ہا محرابیں لگائی جارہی ہیں، بسیں اور گاڑیاں چلائی جارہی ہیں، ان سب کا ردِعمل ہوگا۔''

''ارے تو کیوں ہلکان ہوتا رہتا ہے ایسی باتوں پر، تجھے کیا، تو اپنا گھر بسا اور گھر میں بیٹھ۔'' پھوپھو جی نے کہا۔

''گھر بسانے کو بہت لوگ ہیں، ہم آزاد پرندوں کو آزاد ہی رہنے دو۔''

''تو آج کل کر کیا رہا ہے خوش حال خانا؟'' پھوپھا جی نے پوچھا۔

''بچے پڑھا رہا تھا، اب صرف تماشا دیکھ رہا ہوں۔'' خوش حال خان نے کہا۔ ''اخباروں میں تعلیمی ترقی کی شان میں قصیدے پڑھے جا رہے ہیں۔ پمفلٹ چھپ رہے ہیں اور ہمارے اسکول میں اتوار کی چھٹی کے بعد جب لڑکے آتے ہیں تو احاطے میں گندگی کے ڈھیر لگے ہوتے ہیں، بچے پہلے جھاڑو لے کر گندگی کو صاف کرتے ہیں، پھر اپنے گھر سے لائی ہوئی چٹائیوں یا بوریوں پر بیٹھتے ہیں۔ گرمی کے دنوں میں ہر بچہ اپنے پینے کا پانی گھی کے ٹین میں لے کر آتا ہے۔ پورے اسکول میں دو استاد ہیں جن میں سے ایک بے چارہ حکومت کے خلاف بکواس کرنے کے جرم میں فی الحال معطل کر دیا گیا ہے۔'' وہ کھسیانی ہنسی ہنسا۔

''تو کیوں اتنی بکواس کرتے ہو۔ حکومت کے خلاف بولتے رہنے سے تمھیں کیا ملتا ہے؟'' پھوپھا جی نے پوچھا۔

''سکون ملتا ہے، کچھ لوگ ہمیشہ مخالف کیمپ میں رہنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ اگر وہ آدمی ایک طرف اور ایک آدمی ایک طرف ہو تو یہ ہمیشہ تنہا آدمی کا ساتھ دیں گے۔''

''دیکھا، معلوم ہوتا ہے جیسے اس کا باپ بول رہا ہے۔ وہ بھی سدا حکومت کی مخالفت ہی کرتا رہا۔'' پھوپھا جی نے کہا۔

''یہ تو زبردستی کی مخالفت ہوئی۔'' اب وہ شخص بولا جو اب تک خاموش بیٹھا تھا۔

''جی نہیں۔ ہم اپنی آنکھیں کھلی رکھتے ہیں اور کان بھی۔'' خوش حال خاں جوش سے بولا۔

''دراصل تم لوگ کانا پھوسی کی تحریک کے اثر میں آ گئے ہو جو باقاعدہ چلائی جا رہی ہے۔ جس کا مقصد حکومت کو ہر قیمت پر غیر مقبول بنانا ہے۔'' دوسرے شخص نے کہا۔

''کانا پھوسی کی تحریک اس وقت چلتی ہے جب اخباروں میں سچی خبریں نہیں ملتیں اور لوگ ان پر اعتبار کرنا چھوڑ دیتے ہیں۔''

''کسی شخص کو نگاہوں سے گرانے کے لیے لطیفے مشہور کرنا، نظمیں لکھوانا اور غلط تصویریں چھاپنا کتنی گھٹیا بات ہے۔ اخبار میں سوئمنگ پول میں نہاتی لڑکیوں کی تصویر کے نیچے خود لکھا ہوا دیکھا۔ ''صدر پریڈ کا معائنہ کر رہے ہیں ـــ'' مسدس حالی کی طرز پر لکھا ہوا مسدس اکثر لوگ دہراتے پھر رہے ہیں:

کسی نے یہ سقراط سے جا کے پوچھا
ہے کس درجہ مہلک مرض 'بیڈیا' کا

یہ بیسک ڈیموکریسی کا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔''

''یہ طریقے زبان بندی کے خلاف مجبوراً اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ صحیح طریقے سے آپ کو ایک

لفظ کہنے کی اجازت نہیں ہوتی۔ کوئی ہے جو اس جشنِ دہ سالہ یا بنیادی جمہوریت کے خلاف کچھ کہہ سکے۔ یا اور جو اتنی دھاندلیاں ہو رہی ہیں۔''

''خدا کے لیے آہستہ بولو، آواز باہر جاتی ہے۔'' پھوپھو جی نے کہا۔

''ہاں، یہ کوئی موقع نہیں ہے سیاست پر بات کرنے کا۔'' پھوپھا جی بولے۔

''دیکھ لیا۔'' خوش حال نے طنز سے کہا، ''ٹھیک ہے اگر گھر کے اندر بات نہیں کر سکتے تو ہم باہر جا کر بات کریں گے۔ ٹولیوں میں بات کریں گے۔ اگر ملک کی ترقی اور خوش حالی کے جھوٹے جلوس نکلیں گے تو ہمارے مطالبوں کے سچے جلوس بھی نکلیں گے۔''

''تو تمھیں جیل مبارک۔'' خوش حال کے ساتھی نے کہا۔

''ہاں ہم جیل جائیں گے، ہم سولی پر چڑھ جائیں گے۔ تمھیں ٹوڈی نوکری مبارک۔''

''خوش حال خانا — خوش حال خانا — مہمان بیٹھے ہیں، ان کے سامنے تو اتنا جوش نہ دکھاؤ، پھوپھا جی نے کہا اور شمس الرحمٰن کا دونوں سے تعارف کروایا۔ ''یہ خوش حال خان ہے — خوش حال خان خٹک کی طرح باغی اور خودسر۔''

''خودسر نہیں، خوددار۔'' خوش حال نے تصحیح کی مگر پھوپھا جی سنی ان سنی کر کے تعارف کرواتے رہے۔ ''ایک اسکول میں پڑھاتا تھا مگر آج کل بے کار ہے۔'' اسکول ٹیچر سے زیادہ مزدور معلوم ہو رہا ہے۔ شمس الرحمٰن نے دل میں سوچا۔

''یہ افضل خان ہے، میرا رشتے کا بھائی ہے اور یہ شمس الرحمٰن ہیں۔ ٹورزم کے لیے کچھ کتابچے تیار کرنے کراچی سے آئے ہیں۔''

''آپ مشرقی پاکستان کے رہنے والے ہیں؟'' خوش حال خان نے بغیر کسی جھجک کے پوچھا۔

''جی ہاں۔''

''آپ اردو اچھی بول لیتے ہیں، پھر بھی لہجہ فوراً چغلی کھاتا ہے کہ انسان کہاں کا رہنے والا ہے۔ وہ خود کو چھپا نہیں سکتا۔'' خوش حال خان نے کہا۔

''چھپائے بھی کیوں۔'' شمس الرحمٰن نے برا مانا۔ ''ہر شخص کو اپنی جنم بھومی پر فخر ہوتا ہے۔''

''میرا مقصد آپ کو ناراض کرنا نہیں تھا۔'' خوش حال نے معذرت کی۔ ''مگر یہ بتایئے کہ فخر کرنے کا یہ مطلب تو نہیں ہے کہ انسان دوسروں سے نفرت کرے۔ آج تک جتنی جنگیں ہوئی ہیں، قوموں اور ملکوں کے درمیان ہی تو ہوئی ہیں۔ میرا تو خیال ہے کہ انسانوں کو قوموں اور ملکوں کے لحاظ سے تقسیم ہی نہیں کرنا چاہیے۔''

''آپ کے خیال میں ساری دنیا کو ایک ملک اور ایک قوم ہونا چاہیے۔'' شمس الرحمٰن نے کہا، ''کچھ لوگوں نے یوں بھی سوچا ہے مگر یہ بات ممکن نہیں ہے۔''

''میں سوچتا ہوں اگر انسان کو تقسیم کرنا ہے تو ان خصوصیات کی بنا پر کرنا چاہیے جو وہ اپنے اندر لے کر پیدا ہوتے ہیں اور بدل نہ سکتے ہوں، جیسے خون کا گروپ۔''

''اس طرح میرے خاندان کے زیادہ تر لوگ دوسرے گروہوں میں چلے جائیں گے جب خاندان سے ہی رشتہ نہ رہا تو اور کس سے رہا؟'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''خون — خون سے بڑا رشتہ تو کوئی نہیں ہوتا۔'' افضل خان کے لہجے میں خوش حال کی تضحیک صاف عیاں تھی۔

''جب تک انسان ذہنی طور پر بلند نہ ہو جائے، لڑائیاں ہوتی رہیں گی۔'' شمس الرحمٰن نے کہا، ''سرحدوں، قوموں اور مذہب کے نام پر نہ ہوں گی تو خون اور جین کے حساب سے ہوں گی۔ جس طرح بھی آپ انھیں تفریق کریں گے۔''

''یہ تفریق سراسر علمی ہونی چاہیے جس طرح مختلف درخت ہوتے ہیں تا کہ بالکل یک رنگی نہ ہو جائے۔'' خوش حال خان نے کہا۔

''اجی جناب آپ آئندہ کی بات کرتے ہیں۔'' زری آج پہلی دفعہ باورچی خانے سے ہاتھ صاف کرتی باہر آئی، ''حال کی تو خبر لیجیے۔ شمس سے پوچھیے کہ مشرقی پاکستان کے لوگ آپ سے کتنے بیزار ہیں اور آپ کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟''

شمس الرحمٰن تھوڑا سا کسمسایا پھر اس نے کہا، ''میں جھوٹ نہیں بولوں گا۔ گندگی پر پردہ ڈالنے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اصل میں ہماری زبان، ہمارے کلچر اور ہمارے رہن سہن کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی جاتی، بلکہ اس کا مذاق اُڑایا جاتا ہے۔ ہمارے ہاں بے حد سادگی ہے، دکھاوا بالکل نہیں ہے، اس کو جہالت اور لاعلمی سمجھا جاتا ہے حالاں کہ تعلیم ہمارے ہاں ہمیشہ سے زیادہ تھی اور زیادہ ہے۔ اب لوگ کہنے لگے ہیں کہ جس طرح ہندوستان نے پاکستان کو دل سے نہیں مانا ہے اسی طرح مغربی پاکستان نے مشرقی پاکستان کی اکثریت کو دل سے تسلیم نہیں کیا ہے ورنہ وہ بنگلہ کو اردو کے ساتھ قومی زبان بنانے میں اتنا نہ ہچکچاتے — اس کے علاوہ ہمارا اردو جاننا ضروری ہے لیکن میں نے کسی مغربی پاکستانی کو بنگلہ سیکھتے نہیں دیکھا۔ ان باتوں کو محسوس کیا جانے لگا ہے۔ دوسرے سارے صوبوں کے نام ہیں، مثلاً پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان، مگر ہمارے صوبے کا کوئی نام نہیں ہے۔ اگر ہم اسے کوئی نام دینا چاہیں تو اسے خطرے کی گھنٹی سمجھا جاتا ہے۔''

''آپ کے خیال میں بنگالی نیشنلزم کی تحریک اب واقعی خطرہ بن چکی ہے؟'' افضل خان نے پوچھا۔

''کچھ باتوں کا خیال نہ کیا گیا تو زور پکڑ سکتی ہے۔ میں یہاں رہتا ہوں، مجھے معلوم ہے کہ یہاں بھی بہت غربت ہے لیکن مشرقی پاکستان سے جب کسی تعلیمی دورے پر لڑکے آتے ہیں تو انھیں کراچی کے صاف ستھرے علاقے، وہاں کے کارخانے، اسلام آباد اور فیصل آباد وغیرہ دکھائے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تعلیمی دورے میں یہی دکھایا جانا چاہیے لیکن سماجی اور نفسیاتی ضرورت تھی کہ ان کو غربت زدہ علاقے بھی دکھائے جاتے۔ وہاں وہ یہی تاثر لے کر جاتے ہیں کہ مغربی پاکستان میں بے حد تعمیر و ترقی ہورہی ہے، لوگ ٹھاٹھ باٹھ سے رہتے ہیں جب کہ ہمارے ہاں لوگ روٹی کو ترستے ہیں۔''

''آپ ڈھاکا کی تعمیر کو اپنا حق اور اسلام آباد کی تعمیر کو اپنے اوپر زیادتی کیوں سمجھتے ہیں؟'' خوش حال خان نے پوچھا۔

''اسلام آباد کی تعمیر کو بہت لوگ غلط سمجھتے ہیں۔'' شمس الرحمٰن نے کہا، ''ان کا خیال ہے کہ یہ کروڑوں روپیا برباد کرنے کے برابر ہے۔ ابھی چند سال پہلے یہاں ادیبوں کا ایک وفد آیا تھا۔ ہم کچھ اخبار والے بھی موجود تھے۔ کوی جسیم الدین، جو پاکستان کے خیر خواہ بھی ہیں اور بڑے پیارے آدمی ہیں، مشرقی پاکستان سے آئے ہوئے تھے۔ وہ اپنے خاص انداز میں کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، بال بکھرائے بچوں کی طرح ہنستے باتیں کرتے چلے جارہے تھے۔ سامنے شہرزاد ہوٹل بن رہا تھا، ہر روز نئی کہانی کہنے والی شہرزاد کے نام پر — یکایک کوی جسیم الدین نے اسلام آباد کی مٹی اٹھائی، سونگھی اور کہا، 'اس میں سے پاٹ کی خوشبو آرہی ہے۔' پھر وہ ہنس پڑے جیسے مذاق کررہے ہوں۔ ممکن ہو وہ مذاق کررہے ہوں اور اپنے ساتھیوں کو بتانا چاہتے ہوں کہ مشرقی پاکستان میں سوچا جارہا ہے کہ اسلام آباد پٹ سن کے پیسے سے بن رہا ہے۔''

''سنا ہے ۱۹۶۵ء کی جنگ کے بعد مشرقی پاکستانیوں کو یہ احساس دلایا جارہا ہے کہ مغربی پاکستانیوں سے ان کی حفاظت نہیں ہوسکتی۔'' پھوپھا جی نے پوچھا۔

''یہ بات اتنی غلط بھی نہیں ہے۔ ۱۹۶۵ء میں ہندوستان کے ہوائی جہاز چٹاگانگ میں یہ اعلان کرکے جاتے تھے کہ اگر ہم چاہیں تو بم باری کرسکتے ہیں مگر تم بے فکر رہو، ہم تم پر حملہ نہیں کریں گے، اور سمندر کے ساحل پر بم پھینک جاتے تھے۔''

''جبھی ۱۹۶۵ء کی جنگ آپ لوگوں کا مسئلہ نہیں تھی۔'' خوش حال خان نے کہا۔ اس کے لہجے کی چبھن شمس الرحمٰن نے فوراً محسوس کی۔

''وہاں کے لوگ بھی یہی کہتے ہیں کہ ہمارے ہاں کے سیلاب اور سائیکلون آپ کا مسئلہ نہیں ہیں

بلکہ ان لوگوں کا مسئلہ بھی نہیں ہیں جو وہاں آ کر بس گئے ہیں۔ کیوں کہ ڈوبنے والے ساحلی علاقے اور دیہات ان کے دیہات نہیں ہیں۔'' شمس الرحمٰن نے جوابی حملہ کیا۔

''مجھے اس سے اختلاف ہے۔'' نرگس نے احتجاج کیا، ''ہم لوگ جو وہاں آ کر بسے ہیں وہاں کے سائیکلون اور طوفان یقیناً ہمارے مسئلے ہیں۔'' پھر اس نے شمس الرحمٰن سے بنگلہ زبان میں کچھ کہا۔

''آپ کو بنگلہ آتی ہے؟'' افضل خاں حیران ہوا۔

''جی ہاں، میں نے مشرقی پاکستان ہی میں آنکھ کھولی ہے۔ جب ہم ریل سے کلکتہ سے آ رہے تھے تو ہمارے والد بار بار کہہ رہے تھے، وہ دیکھو پاکستان کی سرحد، لیکن ہمیں دونوں طرف ایک سے کھیت نظر آ رہے تھے اور کوئی سرحد نظر نہیں آ رہی تھی۔ ہم بچوں نے تو بہت جلد بنگلہ سیکھ لی۔ اس کے بعد امی نے سیکھی اور والد جو مجسٹریٹ تھے اس معاملے میں سب سے پیچھے رہ گئے۔ بہت عرصے تک انھیں بنگلہ کا صرف ایک جملہ آتا تھا۔ 'تمی اے دوش کورے چھو؟' (کیا تم نے یہ جرم کیا ہے؟) اور مذاق میں اکثر ہم بچوں کے سینے پر انگلی رکھ کر یہ جملہ بولا کرتے تھے مگر اب تو وہ بھی خوب بنگلہ بولتے ہیں اور ٹیگور کے نہ جانے کتنے گیت انھیں یاد ہیں۔ ہاں ٹیگور — ہم پیار میں اسے رابی ٹھاکر کہتے ہیں۔ ہمارا بے حد عزیز شاعر ہے لیکن اسے ہندو کہہ کر نظر انداز کیا جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں نذرالاسلام کو اسلامی شاعر کہہ کر آگے بڑھایا جاتا ہے محض اس لیے کہ اس نے بنگلہ میں فارسی اور عربی الفاظ استعمال کیے ہیں ورنہ اس نے بہت جگہ مذہب کی مخالفت کی ہے۔''

''لوگ کہتے ہیں کہ ۱۹۴۷ء میں جب ہندوستان سے ہجرت کر کے لوگ آئے تو مشرقی پاکستان میں چادریں پھیلا کر چندہ اکٹھا کیا گیا لیکن جب لوگ اپنی محنت سے کمانے کھانے لگے، فیکٹریاں لگوالیں، گھر اور زمینیں خرید لیں تو مقامی لوگ جلنے لگے۔'' نرگس نے ہنس کر کہا۔

''نہیں، یہ سراسر بہتان ہے — جو لوگ وہاں آئے انھیں بھی تو چاہیے تھا کہ اس جگہ سے اور وہاں کے رہنے والوں سے پیار کرتے جنھوں نے انھیں ٹھکانا دیا تھا۔ وہ محض شاپنگ پیراڈائز اور پکنک اسپاٹ ہی تو نہیں تھی۔ وہاں بھی انسان بستے تھے، جن کی اپنی زبان تھی، کلچر تھا۔'' شمس الرحمٰن کا چہرہ مارے جوش کے سرخ ہو چلا تھا۔

''بھئی اب چلو نا، ٹیکسی کتنی دیر سے کھڑی ہے۔'' زری نے بحث ختم کرنا چاہی۔

''تم خوش حال خان کو ساتھ لے جایا کرو، یہ اس علاقے کے چپے چپے سے واقف ہے۔'' پھوپھا جی نے کہا۔

خوش حال خان نے زری کی طرف دیکھا۔ زری خاموش رہی۔

''میں تو فی الحال پشاور جا رہا ہوں، صدر کے جلسے کا تماشا دیکھنے۔ کسی کو کوئی چیز منگانا ہو تو بتا دو۔''

''اپنی جان سلامت لے کر آ جانا۔'' افضل خان نے چوٹ کی۔

''میری جان کی تم فکر نہ کرو افضل خانا — کچھ لوگ مٹی سے محبت کی بات کرتے ہیں اور کچھ لوگ اپنے مفاد کی۔ ہم ان لوگوں میں سے ہیں جو جان دینا بھی جانتے ہیں اور جان لینا بھی۔''

اس نے اپنے سینے پر ہاتھ مارا اور دھول بھرے پٹھانی چپل گھسیٹتا سیڑھیاں اتر گیا۔

''بے چارہ نا تردیم کا کیڑا۔'' افضل خان نے کہا۔

شمس الرحمٰن کو محسوس ہوا جیسے زری نے افضل خان کی طرف ناگواری سے دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔

''جھلا ہے۔'' پھوپھو جی کہہ رہی تھیں، ''اس کی ماں بے چاری بڑی پریشان رہتی ہے۔ رات رات بھر جاگتا ہے، کبھی موم بتی جلا کر اس کی طرف دیکھتا رہتا ہے۔ کبھی سانس روکنے کی مشق کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہمیں گن کر سانس دیے گئے ہیں، اگر سانس کم لیں تو عمر خود بخود بڑھ جائے گی۔ اس کی ماں بہت سمجھاتی ہے مگر یہ باز نہیں آتا۔''

''آؤ چلیں۔'' یکایک زری اس ساری بات سے بے حد اکتا گئی۔

یہ جگہ واقعی ''ٹھنڈیانی'' کہلانے کی مستحق تھی۔ تیز و تند موڑوں اور صنوبر کے سایوں سے گزرتے یہ آٹھ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچے تھے۔ اگر بادل ذرا دیر کو سورج کے سامنے پردہ تانتے تو ہاتھ پیر کی انگلیاں جمنی شروع ہو جاتیں۔ یہ علاقہ بذاتِ خود بہت خوب صورت تھا اور پھر یہاں سے مختلف وادیاں دور دور تک پھیلی اور برف پوش چوٹیاں نام بنام نظر آتی تھیں — نرگس نے اِدھر اُدھر گھومتے پھرتے عجیب و غریب نوکیلے پتھر زمین سے پھوٹتے ہوئے دیکھے جیسے کسی نے بہت سے سلسلہ ہائے کوہ کے ماڈل بنا کے رکھ دیے ہوں۔ ایسے ہی منے منے درخت تھے جن کی اٹھان اور بڑھن پورے درختوں جیسی تھی۔ اگر ان کی تصویریں لے کر انلارج کروالی جائیں تو نہایت خوب صورت دیو قامت درخت بن جائیں گے۔ جاپان کا قدیم Sae-Kei آرٹ یہاں قدرتی طور پر موجود ہے۔ نرگس بے حد پُرجوش تھی اور جلدی جلدی تصویریں لینے میں مصروف تھی۔

شمس الرحمٰن نزدیک کے پوسٹ آفس اور ٹیلی گراف آفس کی زیارت کو گیا تھا۔ تار گھر سے اس نے اپنے اخبار کے دفتر تار دیا تھا، ''اس تار کے پہنچنے کی تاریخ اور وقت نوٹ کرلیا جائے۔'' زری ایک پہاڑی پر کھڑی ہو کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ ایبٹ آباد، مانسہرہ اور کاکل کی وادیاں سبز لباس پہنے، بادلوں کی سفید باریک نقاب اوڑھے اپنی اپنی جگہ موجود تھیں۔ پھر زری نے میراں جانی اور ہستہ کی برف پوش پہاڑیوں کو ڈھونڈا۔ خنک ہوا اس کے سنہری بالوں سے کھیل رہی تھی۔ شمس الرحمٰن گنگناتا ہوا پگڈنڈی پر چڑھ رہا تھا:

''آکل بھنجے آکل گارے
ایتا نادر کھیلا
سکال بیلا آسر
زے بھائی
فقیر سانڈھے بیلا —— ایتا نادر کھیلا''

''یہ تم کیا گارہے ہو؟'' زری نے پوچھا۔

''یہ مرشدہ ہے زری بیگم۔ ہماری زندگی اور ہمارے مزاج کا ترجمان —— ہمارے ہاں تعمیر اور تباہی کا بڑا ساتھ ہے۔'' نرگس اسی وقت اپنا کیمرہ لٹکائے آئی۔

''نرگس! تم اس گانے کا ترجمہ زری کو سناؤ'' شمس الرحمٰن نے گیت دوبارہ گنگنایا۔

''ایک کنارہ پاٹتی ہے، ایک کنارہ گراتی ہے، یہ ندی کا کھیل ہے۔
جو صبح کو امیر ہے وہی (شخص) شام کو غریب ہے۔
یہ ندی کا کھیل ہے۔'' نرگس نے کہا۔

''ہمارا مزاج بھی بالکل ایسا ہی ہے۔ بہت جلد اِدھر سے اُدھر ہوجانے والا۔ ذرا سی دیر میں طوفان آتے ہیں، گھاٹ کے گھاٹ بہہ جاتے ہیں۔ سائیکلون آتے ہیں، گھروں کی چھتیں تک اڑ جاتی ہیں مگر جلد ہی سکون ہو جاتا ہے اور ہم سب کچھ بھول جاتے ہیں۔ ہمیں سمجھنے کے لیے ہمارے دریاؤں کے طور طریقوں کو اور موسم کے مزاج کو سمجھنا ضروری ہے، کیوں نرگس؟''

''یقیناً'' نرگس نے صاد کیا۔

''ایتا نادر کھیلا'' شمس الرحمٰن نے پھر مصرع اٹھایا۔

''جب میں مشرقی پاکستان جاؤں گی نا تو وہاں کی بہت سی پینٹنگز بناؤں گی۔ اپنے شو کے موقعے پر میں تمھیں بلاؤں گی۔ آؤ گی نا؟'' نرگس نے زری سے پوچھا۔

''میں —— آں —— ہاں —— کیوں نہیں'' زری خدا جانے کیا سوچ رہی تھی۔

''تم کبھی مشرقی پاکستان نہیں گئیں؟''

''نہیں''

''تمھیں ضرور جانا چاہیے، ایسی قدرتی خوب صورتی کہ کبھی دل ہی نہیں بھرتا۔ پانی کے ساتھ ہر چیز حرکت میں ناچتی، گاتی اور تھرکتی ہوئی'' نرگس نے کہا۔

''تمھیں معلوم ہے کہ وہاں لڑکیاں مچھلیاں پکڑتی ہیں، کھیت کاٹتی ہیں، پانی بھر کے لے جاتی

ہیں اور فصلوں کی کٹائی کے موقعے پر خوب ناچ گانا ہوتا ہے۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''یہ سب یہاں بھی ہوتا ہے۔ رزق میسّر آنا ہر جگہ آدم زاد کے لیے بڑی خوشی کی بات ہے۔'' زری نے کہا۔

دوپہر کے وقت سامنے کی پہاڑیوں پر دھوپ اس طرح پھیلی ہوئی تھی جیسے سورج نے ساری وادی کو اپنے سایۂ شفقت میں لے لیا ہو۔ تینوں نے ساتھ کھانا کھایا پھر شمس الرحمٰن اور زری اپنی اپنی رپورٹ تیار کرنے لگے۔ نرگس دوبارہ تصویریں کھینچنے چلی گئی۔

شمس الرحمٰن اپنا کام ختم کر کے آیا تو زری ایک ٹک سامنے ایک مڑے تڑے سے درخت کو دیکھ رہی تھی۔ اس درخت میں سیکڑوں چھوٹے بڑے گومڑے پڑے ہوئے تھے اور اس سے نکلتی ہر شاخ ٹیڑھی میڑھی تھی جیسے کسی اپاہج کے ہاتھ پاؤں۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' شمس الرحمٰن نے زری کو کھوئے کھوئے دیکھ کر پوچھا۔

''ابھی ابھی مجھے یوں محسوس ہوا جیسے اس وقت مجھے یہاں نہیں کہیں اور ہونا چاہیے تھا۔ اکثر ایسا محسوس ہوتا رہتا ہے مجھے — تمھیں نہیں ہوتا۔'' زری نے شمس الرحمٰن سے پوچھا۔

''نہیں، میں ہمیشہ وہیں ہوتا ہوں جہاں مجھے ہونا چاہیے اور اپنی مرضی سے ہوتا ہوں۔''

''میں بھی تو ہر کام اپنی مرضی سے کرتی ہوں۔''

''کچھ لوگ دوسروں کی مرضی سے کام کریں تب بھی اسے اپنی منشا سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگ اپنی مرضی سے کام کریں تب بھی خود کو مجبور سمجھتے ہیں۔''

''کیا جبر و قدر کا فلسفہ سمجھانے کے موڈ میں ہو؟''

''نہیں، بے چارے اعجاز کے بارے میں سوچ رہا ہوں جسے تم نے یہ کہہ کر کہ اس محکمے میں تم خود کو برباد کر رہے ہو، دور بھیج دیا۔ تم عورتیں واقعی کتنی خطرناک ہو کہ جب چاہتی ہو کسی کو گانے والے درخت یا بولنے والی چڑیا کی تلاش میں روانہ کر دیتی ہو اور جب وہ لوٹتا ہے تو دیکھتا ہے کہ......''

''دیکھو میں نے تو پورے خلوص سے رائے دی تھی۔'' زری نے شمس الرحمٰن کی بات کاٹی۔

''ضرور دی ہوگی مگر اس غریب نے تو عمل اسی لیے کیا کہ تمھاری خواہش تھی۔''

''وہ یونی ورسٹی میں زیادہ خوش رہے گا اور ساری عمر مجھے دعائیں دے گا۔'' زری نے کہا۔

''میں نے کہا نا کہ اپنے مستقبل کے خیال سے نہیں وہ محض اس لیے انٹرویو دینے گیا ہے کہ زری بیگم اس کے مستقبل میں دل چسپی لے رہی ہیں۔'' زری نے شمس الرحمٰن کی طرف دیکھا۔ کیا اس کے لہجے میں طنز ہے! — حسد ہے!! شمس الرحمٰن کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں ہمیشہ کی طرح شفاف تھیں۔

ایک بے نام سا حزن ان آنکھوں کو سدا پُرکشش بنائے رکھتا تھا۔ جس وقت اس کے خوب صورت سفید برابر برابر دانت مسکراہٹ میں کھلے ہوتے اس وقت بھی۔ اس کا رنگ قدرے سانولا تھا لیکن قد چھ فٹ کے قریب تھا۔ اس کی شخصیت میں سب سے زیادہ بنگالی چھاپ اس کی آنکھوں پر تھی۔ سیاہ خوب صورت پُرکشش آنکھیں۔ اس کی آنکھوں میں طنز اور حسد کی پرچھائیں نہ پا کر زری کو تھوڑی سی ناامیدی ہوئی۔

''یاد ہے منگورہ میں جب میں چنار کے سائے میں بورڈر پولیس کے سپاہیوں کے ساتھ خٹک ڈانس کر رہا تھا اور اعجاز وہاں ہم لوگوں سے ملنے آیا تھا۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''ہاں تو کیا ہوا تھا؟ مجھے یاد ہے بے حد پیارا موسم تھا اور حد سے زیادہ خوب صورت منظر۔''

تب تم سے باتیں کرتے ہوئے اعجاز کی آنکھوں میں وہ چیز — یا جذبہ میں نے تمھارے لیے دیکھ لیا تھا جسے دیکھ کر کوئی بھی پہچان سکتا ہے۔ میرا خیال تھا تم بھی پہچان گئی ہوگی۔''

''نہیں — میں نے شاید اس کی آنکھوں کی طرف دیکھا ہی نہیں تھا۔ اچھا تم بتاؤ، تم نے اپنی آنکھوں میں کسی کے لیے وہ جذبہ دیکھا ہے جسے تم پہچان لیتے ہو؟''

''مشکل سوال ہے۔'' شمس الرحمٰن یکایک سنجیدہ ہوگیا۔ ''انسان اپنی آنکھوں میں نہیں جھانک سکتا نا اسی لیے شاید وہ کبھی اس جذبے کو بھی سمجھ نہیں پاتا۔'' شمس الرحمٰن بیٹھے بیٹھے یکایک جیسے کہیں دور چلا گیا۔

''وہ کون تھی؟'' زری نے سنجیدگی سے پوچھا۔

''شاما — شاما کہا کرتا تھا میں اسے۔ بچپن میں۔ ایک کہانی پڑھی تھی جس میں بچے چڑیوں کے گھونسلے سے انڈے نکال کر دوبارہ رکھ دیتے ہیں۔ مگر چڑیاں ان انڈوں کو نہیں سیتی ہیں۔ اس کہانی میں لڑکی کا نام شیاما تھا۔ میں نے اسے شاما کہنا شروع کر دیا تھا۔ کیوں کہ وہ بڑی بھولی تھی۔ اسے کسی بات کی فکر تھی نہ تجسس تھا۔ نہ وہ کسی بات پر کڑھتی تھی، جب کہ میں بچپن میں بات بات پر کڑھتا رہتا تھا۔ ہاں تو ایک دن میں نے اس سے کہا، میں تمھارا نام نہیں لیتا، تمھیں شاما کہتا ہوں، تم اس پر بھی کچھ نہیں کہتیں۔''

''مجھے شاما نام اچھا لگتا ہے۔'' اس نے بھولپن سے کہا تھا۔

''تو یہ بچپن کی محبت ہے۔''

''ہاں۔''

''جس کے بارے میں یقین نہیں ہوتا کہ ہے یا نہیں ہے۔ یا تو بہت دن بعد اس کا یقین ہوتا ہے یا انسان ساری عمر سوچتا ہی رہ جاتا ہے کہ تھی یا نہیں تھی۔'' زری نے دھیرے دھیرے کہا۔

''تو تم بھی اس دور سے گزری ہو۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔ ''مجھے اس کا نام بتاؤ گی؟''

''کیا کرو گے پوچھ کر۔'' زری اب ایک پتھر پر بیٹھی اس کے درمیان اُگی گھاس اکھیڑ رہی تھی۔

''کہاں گیا وہ؟''

''معلوم نہیں۔''

''بے وفا تھا؟''

''ہاں شاید۔''

''بہت بے وقوف تھا۔۔ مگر وہ بے وفا بھی نہیں تھی، بس ہمیں کچھ پتا ہی نہ چلا......'' شمس الرحمٰن ٹھہر ٹھہر کر بول رہا تھا، ''کہ اس کا اور میرا کیا رشتہ ہے، کیا بندھن ہے؟''

نرگس ہاتھ ملتی آئی۔ اس کے ہونٹ نیلے پڑے ہوئے تھے۔

''خدا کے لیے اب چلو، میری تو قلفی جم گئی۔ دھوپ کے ڈھلتے ہی کس بلا کی ٹھٹھرن ہوگئی ہے۔''

جس وقت سرخ ٹیکسی سبز صنوبروں کے درمیان چکر لگاتی نیچے جارہی تھی یکایک بادل اس طرح چاروں طرف چھا گئے جیسے وہ بادلوں کے سمندر میں سے گزر رہے ہوں۔

''سنو'' زری کا موڈ خوش گوار ہو چکا تھا۔ ''اب جس چھکڑا سی کار میں ہم اس وقت جارہے ہیں نا اس کا خوب صورت ادھیڑ عورتوں کی طرح زبردست ماضی رہا ہوگا۔ یہ سرحد کے کسی خان کی ملکیت ہوگی اور اس پر بڑے زبردست حسد ہوئے ہوں گے۔''

''واقعی؟'' نرگس حیران ہوئی۔

''ہاں جناب ایک زمانہ تھا کہ یہاں کاریں بانسوں سے ناپ کر خریدی جاتی تھیں۔ یقین کرو، مذاق نہیں ہے۔ دوسرے کو نیچا دکھانے کا طریقہ یہ تھا کہ آپ کی کار اس سے چند انگل بڑی ہو۔'' زری ہنسی اور یکایک سنجیدہ ہوگئی۔

اسے ایک عجیب سا خیال آیا۔ ایک زمانے میں اس کے لیے بھی ٹوٹ کر پیغام آیا کرتے تھے۔ اس کے نام پر کالج اور یونی ورسٹی کے لڑکوں میں چاقو اور گولیاں چلتی تھیں۔ اس کی حیثیت اس سرخ خوب صورت کار ہی کی سی تو تھی جسے دوسروں کو جلانے کے لیے ہر شخص اپنے گیراج میں رکھنا چاہتا تھا۔ چاچا جی کی ایک کزن قدسیہ کی شادی ایک دقیانوسی امیر گھرانے میں محض اسی لیے ہوئی تھی کہ کسی نے اس کے ہونے والے شوہر سے کہہ دیا تھا کہ وہ لڑکی ناقابلِ حصول ہے۔

لیکن خوش حال خان ا۔۔ زری کو یاد آیا۔ وہ شاید میٹرک میں تھی جب خوش حال کی امی ایک دن چادر سنبھالتی داجی بے بے کے پاس آئی تھیں اور روتے ہوئے کہا تھا، ''میں جانتی ہوں میرا بیٹا زری

کے لائق نہیں ہے۔ اس کی جوتیوں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہے پر مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ زری کے پیچھے دیوانہ ہے۔ میں زری کا ہاتھ نہیں مانگ سکتی مگر اس سے کہو چاچی جی کہ کسی طرح وہ اس کا دل اپنی طرف سے پھیر دے، ورنہ میرا اکلوتا بیٹا خون تھوک تھوک کر مر جائے گا۔''

زری تیار ہو کر باہر نکلی تو بارش ہو رہی تھی۔ مگر یہ عجیب بارش تھی جو شملہ پہاڑی پر ہو رہی تھی، باقی پہاڑ خشک کھڑے تھے۔ سورج بادل کے ٹکڑوں کے درمیان سے جھانک رہا تھا، دھوپ پھیلی ہوئی تھی اور موٹی موٹی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ پہاڑ کی مخصوص بارش جو ہے بھی اور نہیں بھی — بچپن کی محبت کی طرح — سوندھی سوندھی خوشبو سارے میں پھیلنی شروع ہوئی مگر ابھی گھاس اور پودوں کی پیاس بجھی بھی نہ تھی کہ بوندوں نے اپنا آپ سمیٹ لیا، جیسے کوئی سمجھ دار بڑا آدمی اپنے یکا یک رونے پر شرمندہ ہو کر آنسو پی ڈالے۔ چڑیاں جو بارش کے دوران خوشی سے چہچہانے لگی تھیں، بہت دیر تک چہچہاتی رہیں۔

خوش حال خان کے گھر کی منڈیر پر بھی چند چڑیاں بیٹھی تھیں۔ زری کو محسوس ہوا جیسے ابھی کل کی بات ہو کہ وہ گلگونہ کے ساتھ یہاں آئی ہو۔ خوش حال خان کی امی اسے دیکھتے ہی کھل اٹھیں۔ ''بی بی گل!'' وہ ابھی تک اس کے بچپن کا نام لیتی تھیں حالاں کہ وہ زری نام پر اصرار کرتی تھی۔ ''بیٹی! تو ہی معلوم کر سکتی ہے کہ اسے کیا ہوا ہے — وہ تیرے ساتھ بچپن میں کھیلا ہے، تیرا بہت لحاظ کرتا ہے۔ جب سے پشاور سے لوٹا ہے کمرے میں بند ہے۔ نہ کھاتا ہے، نہ پیتا ہے، نہ ڈاکٹر کے پاس جانے کو تیار ہوتا ہے۔''

''اچھا ماسی، میں دیکھتی ہوں۔'' اس نے کہا اور خوش حال کی کوٹھری کی طرف بڑھی۔ دروازہ بند تھا مگر کنڈی نہیں تھی۔ زری اندر چلی گئی۔ خوش حال پرانی سی دری پر بچھے ہوئے کشمیری نمدے پر اوندھا پڑا تھا۔ نمدے کے کڑھے ہوئے شجرِ حیات پر اس کا سر تھا، ٹانگوں کے نیچے بھورا، بے بس سا میمنے کی شکل کا اونی شیر دبا ہوا تھا۔ روشنی سے بچنے کے لیے اس نے تکیہ اس طرح اوڑھ لیا تھا کہ نصف سر، گردن اور آنکھیں چھپی ہوئی تھیں۔

چاروں طرف مختلف تاریخوں کے اخبارات بکھرے ہوئے تھے۔ اندھیرے سے مانوس ہوتی آنکھوں سے زری نے یوں ہی چند خبروں پر نظر ڈالی۔ ۳۱ اکتوبر۔ صدر ایوب کل ریڈیو پاکستان سے قوم سے خطاب کریں گے۔ مغربی پاکستان کے وقت کے مطابق سوا سات بجے اور مشرقی پاکستان کے وقت کے مطابق سوا آٹھ بجے۔ فوراً بعد بنگلہ ترجمہ ہوگا (ماہانہ تقریر — زری کو یاد آیا)۔

اسی تاریخ کی دوسری خبر تھی، کل سے ملک بھر میں رائے دہندگان کا اندراج ہوگا۔ سب سے پہلے صدر ایوب کا نام ووٹروں کی فہرست میں درج ہوگا۔

۱۵ر نومبر — اخبار کی سرخی تھی — ''چینی کے کارخانوں پر پولیس اور فرنٹیئر کور کے جوانوں کا پہرہ لگا دیا گیا۔ محکمۂ خوراک کی اجازت کے بغیر چینی کا ایک دانہ بھی کارخانے کے باہر نہ جانے دیا جائے گا (گورنر موسیٰ)۔

اسی تاریخ کی دوسری خبر — دنیا کے سب سے بڑے مٹی بھرے ڈیم کی کھدائی کا افتتاح صدر ایوب کے ہاتھوں ہوا۔ چار ارب تیرہ کروڑ روپے کی لاگت سے اس ڈیم کی تعمیر شروع ہوئی۔

نوے سالہ بوڑھے کی نس بندی کر دی گئی — مختلف شہروں میں وکلا، طلبہ، سیاسی کارکنوں اور عوام کے احتجاجی جلوس۔

۷ر نومبر۔ شبِ برات کی تعطیل — گولی ماریے زیورات کو، صندوق میں سے بھرا ڈبا چینی کا لے گئے ظالم۔ (کارٹون)

''اچھا تو تمھیں یہ معلوم کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے کہ میرے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا ہے؟'' خوش حال نے تکیہ ہٹا کر کہا۔

''مگر تم ہی کو کیوں؟ وہ خود بھی تو پوچھ سکتی تھیں۔'' وہ نمدے پر شجرِ حیات اور شیر، دونوں سے ہٹ کر بیٹھ گیا۔

''پوچھا ہی ہوگا۔'' زری نے پھر مختصر سا جواب دیا۔ تب خوش حال کو یاد آیا کہ اس کی ماں تو جس وقت سے وہ واپس آیا ہے، سیکڑوں مرتبہ یوں چپ چاپ پڑے رہنے کی وجہ پوچھ چکی ہے اور اس نے ایک لفظ بھی نہیں بتایا ہے۔

''ہاں، انھوں نے پوچھا تھا مگر میں بتا نہیں سکا۔ وہ چند الفاظ میں بتانے کی بات بھی نہیں ہے اور اس ساری بات کو سمجھنا ان کے لیے بہت مشکل ہے۔''

''تو مجھے بتاؤ، شاید میں سمجھ سکوں۔'' زری نے کہا اور اس کے پاس نمدے پر بیٹھ گئی۔

''یہ ایک دن کا قصہ نہیں ہے۔ سارے اخبار پڑے ہیں۔ تم دیکھو، ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو جو تقریریں ہوتی ہیں، برداشت سے باہر ہوتی جا رہی ہیں۔ ساری گندم اور چینی اسمگل ہو رہی ہے۔ ڈکٹیٹر شپ قائم ہے اور طلبہ احتجاج کریں تو آرڈیننس پاس ہوتا ہے کہ ان کی ڈگریاں ضبط کر لی جائیں۔ وہ ڈگریاں جو انھوں نے سالوں کی محنت اور قابلیت سے حاصل کی ہیں، کسی بی ڈی سسٹم کے تحت نہیں لی ہیں۔ میں نے پشاور میں وہ جگمگاتی ٹرین بھی جا کر دیکھی تھی جس میں ملک کی جھوٹی ترقی کی بناوٹی نمائش ہو رہی تھی اور اب جگہ جگہ احتجاجوں پر فائرنگ کے بعد میں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اس جلسۂ عام میں اس شخص کو گولی مار دوں گا۔'' زری کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا سانس نیچے رہ گیا۔

''تو کیا وہ گولی تم نے چلائی تھی؟'' زری نے بے حد ہراساں ہو کر پوچھا۔

''سنتی جاؤ، میں گھر سے پستول لے کر گیا تھا۔ راستے بھر وہ گاڑیاں اور بسیں بھی دیکھتا گیا تھا جو مردان، نوشہرہ، تارو جبا، پیر پیائی اور پبی سے بھر بھر کر لوگوں کو پشاور پہنچا رہی تھیں۔ لوگ پشاور کی مفت سیر سے خوش تھے۔ بہت سے لوگوں کو نعرے لگانے کے پیسے بھی ملنے والے تھے۔ ایک دن کی چھٹی اور مفت کا میلہ۔ میں ان کو دیکھ کر سوچ رہا تھا کہ یہ لوگ جو کچھ وہاں دیکھیں گے وہ کوئی دوسرا ہی تماشا ہوگا۔ پشاور ایئر پورٹ سے جناح پارک تک سیکڑوں استقبالیہ محرابیں اور دروازے بنائے گئے تھے جن میں پھول پتوں کے علاوہ سیکڑوں ایرانی قالین اور اسمگل شدہ لیڈی ہملٹن کے تھان استعمال کیے گئے تھے۔ پارک کا کبابی دروازہ ہم عوام کے لیے تھا اور صدر کے لیے جی ٹی روڈ کا گیٹ مخصوص کر دیا گیا تھا۔'' وہ ذرا کی ذرا رکا۔

''اچھا پھر؟'' زری نے بے تابی سے پوچھا۔

''تمھیں یاد ہوگا جس دن میں جا رہا تھا افضل خان نے کہا تھا کہ پشاور سے اپنی جان سلامت لے کر آ جانا۔ اور میں نے کہا تھا، ہمیں جان دینا بھی آتا ہے اور لینا بھی۔ سچ پوچھو تو افضل خان کی اسی بات نے میرے اس خیال کو پکا کیا کہ اب جان لینے اور دینے کا وقت آ گیا ہے۔ میرا تو اس دنیا میں ماں کے سوا کوئی نہیں ہے اور ماں کو میں نے ویسے کون سی خوشی دی ہے۔ جب میں نہ ہوں گا تو لوگ اس کا زیادہ خیال کریں گے۔ ہاں، تو ایوب خان کے آنے پر کرائے کے لوگوں نے نعرے لگائے۔ میں نے دل میں سوچا کہ بس کرائے کی نعرہ بازی اب نہیں چلے گی۔ جیسے ہی وہ تقریر کرنے کھڑا ہوا میں نے پستول نکالنے کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالا تو میرے پاس کھڑے ہوئے ایک جوان لڑکے نے، جو نیلے رنگ کا سوٹ پہنے ہوئے تھا، گولی چلا دی۔ گولی ایوب خاں کے نہیں لگی۔ جلسے میں بھگدڑ مچ گئی۔ دو لاکھ آدمی اس طرح بھاگے جیسے باڑے میں گیدڑ کو دیکھ کر بھیڑ بکریاں بھاگتی ہیں۔ ایک بھاری بھرکم شخص نے، جو فوجی لگ رہا تھا، اس لڑکے کو پکڑ لیا۔ میں بھی بھیڑ کے ساتھ بھاگا اور بہت سے لوگوں کے ساتھ باہر نکل آیا۔ کئی لوگ گرے اور کچلے بھی گئے۔ سارا جلسہ درہم برہم ہو گیا۔ بعد میں سنا کہ منتظمین نے گیٹ بند کر دیا۔ لوگوں کو زبردستی روکا گیا اور ان کے سامنے تقریر بھی کی گئی۔ اخبار میں تم نے دیکھا ہوگا کہ صدر بالکل نہیں گھبرائے اور دو لاکھ کے مجمعے کے سامنے بڑے اطمینان سے تقریر کرتے رہے—— تو یہاں یہ ہوتا ہے۔'' خوش حال خان نے نمدے کے شیر پر سے اپنی جھکی ہوئی نظریں اٹھا کر زری کو دیکھا، خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور کہا، ''میں مارنے کے ارادے سے گیا تھا۔ سوچتا ہوں میں بھی اتنا ہی مجرم ہوں جتنا وہ لڑکا—— بے چارہ پولی ٹیکنیک کا

طالب علم ہے --- محمد ہاشم نام ہے اس کا۔ ماں باپ رو رہے ہیں کہ ان کا لڑکا بے گناہ ہے، سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ مجھے گولی چلانے کا الزام اپنے سر لے لینا چاہیے......''

''پاگل ہوئے ہو۔ جب تم نے گولی نہیں چلائی تو بلاوجہ --- اور وہ پستول کہاں ہے؟''

''پستول! --- واپسی میں جب مجھے خیال آیا اور میں نے جیب دیکھی تو پستول جیب میں نہیں تھی۔''

''تمھارے پاس کوئی پستول وستول سرے سے ہے ہی نہیں --- تم خواب دیکھ رہے ہو۔ خوش حال خان، دیکھو کسی سے کچھ نہ کہنا اور نہ کوئی ایسی ویسی حرکت کرنا۔''

''بھئی میرے پاس تھی، میں کہہ رہا ہوں نا --- یا تو وہ کہیں گر گئی یا ہو سکتا ہے کہ محمد ہاشم نے میری ہی جیب سے پستول نکالی ہو، وہ میرے بالکل نزدیک تھا۔''

''فضول باتیں مت کرو۔ تم ساری باتیں دل سے گھڑ رہے ہو۔ اخبار کی خبریں دیکھ کر تم نے یہ ساری کہانی بنالی ہے۔''

''کمال ہے تم ہی میرا یقین نہیں کرتیں تو اور کون کرے گا۔ میں بتا رہا ہوں کہ میں واقعی مارنے کے ارادے سے گیا تھا اور میرا نشانہ اس بے وقوف لڑکے کی طرح خطا بھی نہ ہوتا۔''

''اچھا اب تم خاموش رہو گے اور کسی سے اس بات کا ذکر نہیں کرو گے، اپنی امی سے بھی نہیں۔ میں تمھارے لیے کھانا لے کر آتی ہوں۔''

''میں کھانا نہیں کھاؤں گا۔ مجھے بھوک نہیں ہے۔'' خوش حال خان نے روٹھے لہجے میں کہا۔

''اچھا چائے پینا میرے ساتھ۔'' زری نے کہا۔

خوش حال خاموش رہا تو زری باہر آ گئی۔

''چائے کے ساتھ کچھ کھانے کو ہو تو دے دو چاچی۔''

''ہاں ہاں، ابھی لائی۔''

زری کے لیے ان کی آنکھوں میں احسان مندی اور محبت تھی اور شاید تھوڑا سا حسد بھی۔ جب انھوں نے زری کو بلا بھیجا تھا تو زری دل ہی دل میں ہنسی تھی۔ بڑی بی سمجھ رہی ہیں کہ خوش حال کے درد کا درماں اب بھی میرے پاس ہے۔ کیا انھیں معلوم نہیں کہ مرہم پرانا ہو جائے تو اس کی تاثیر ختم ہو جاتی ہے۔ جدید ترین دوائیں بھی تاریخ نکل جانے کے بعد بے کار ہو جاتی ہیں۔ مگر اب اسے اندازہ ہوا کہ خوش حال کی ماں کا خیال اتنا غلط بھی نہیں تھا۔ شاید پرانے مرہم میں ابھی کچھ اثر باقی تھا --- اور ماں اس بات سے واقف تھی کہ اس کے بیٹے میں جنونی محبت کرنے اور اندھا دھند نفرت کرنے کی بے پناہ صلاحیت ہے۔

زری چائے کی دو پیالیاں اور بسکٹ لے کر گئی تو وہ اسی طرح بیٹھا چاروں طرف بکھرے ہوئے اخباروں کو گھور رہا تھا۔ اپنے پرس میں سے اس نے نیند کی گولی نکالی، ''لو یہ کھالو — اور تھوڑی دیر سو جاؤ۔ تمھاری آنکھیں سرخ ہو رہی ہیں۔''

خوش حال نے گولی نگلی اور گھونٹ گھونٹ چائے پیتا رہا۔ زری چائے کی پیالیاں ٹرے میں رکھ کر واپس نکلی تو اس نے دیکھا کہ خوش حال پھر پہلے کی طرح اوندھا لیٹ گیا ہے۔ زری نے آہستہ سے باہر سے کنڈی لگا دی اور اس کی ماں سے کہا، ''جہاں تک ممکن ہو آپ خوش حال کو تنہا باہر نہ جانے دیں، میں کل پھر آؤں گی۔''

کئی سوال ان کے لبوں تک آئے مگر وہ خاموش رہیں۔ پھر بھی۔ انھوں نے سوچا۔ یہی کیا کم ہے کہ اس نے زری کے کہنے پر کچھ کھا پی لیا۔

زری دوسرے دن شام کو پھر خوش حال کی خیریت دریافت کرنے گئی۔ تائی نے بتایا کہ اب وہ پہلے سے بہت بہتر ہے۔ کل سہ پہر وہ بہت دیر تک سوتا رہا، اٹھا تو خود مانگ کر کھانا کھایا۔ صبح ناشتا بھی کیا اور دوپہر کا کھانا بھی کھایا ہے۔ زری نے کہا کہ آج وہ ان دونوں کو ساتھ لے کر اپنے خاندانی قبرستان اور گورا قبرستان جانا چاہتی ہے۔ خوش حال خان تھوڑی دیر سوچتا رہا۔ پھر بولا، ''میں تو تیار ہوں، بے بے سے پوچھ لو۔''

تائی جنت نے قبروں پر جلانے کے لیے اگربتیاں اور دِیوں میں ڈالنے کے لیے تیل اور ماچس کی ڈبیا ساتھ لی۔ پھول اس وقت موجود نہ تھے۔

روش سے مشابہ پتلی سیمنٹ کی سڑک، جس کے دونوں طرف کی گھاس اب زرد ہو چلی تھی۔ انھیں گورا قبرستان کے دروازے تک چھوڑ کے آگے بڑھ گئی۔ قبرستان کا چوبی دروازہ پرانا ہونے کے باوجود اتنا ہی مضبوط تھا۔ اس کو خوب صورت اور مضبوط تر کرنے کے لیے جو بڑے بڑے چوبی پھول پیتل کی موٹی کیلوں سے لگائے گئے تھے، اب تک جڑے ہوئے تھے۔ دروازے کے اوپر پتھر کی محراب اور چھت پر جنگلی گلاب کی بیلیں فراخ دلی سے چھائی ہوئی تھیں۔ سرمئی پتھر کی چہار دیواری آج بھی چاروں طرف سے سالم اور مضبوط ہے۔

قبرستان تختوں میں بٹا ہوا تھا۔ سب سے اوپری تختے پر قدیم چرچ اور پادری کے گھر کے آثار ہیں۔ اب صرف دو کمرے باقی تھے جس میں موجودہ چوکیدار مع بیوی بچوں، بکریوں اور ان کے بچوں کے رہتا تھا۔

تلاش کے بعد زری اور خوش حال نے دو پرانی قبریں ڈھونڈ نکالیں جن کو بچپن میں آ کر دیکھتے

تھے اور جن کی قدامت پر حیران ہوتے تھے۔ ان میں سے قدیم ترین ۱۸۵۳ء اور ۱۸۵۶ء کی تھیں۔ ان قبروں کے کتبے تو کائی سے پہلے بھی سیاہ پڑے ہوئے تھے مگر اب عبارت کے حروف تک جھڑ گئے تھے اور صاف پڑھے نہیں جاتے تھے۔ لیکن بعض پرانی قبریں اب بھی پتھر کی لاٹ کی طرح کھڑی ہوئی تھیں۔ انیسوی صدی کی ان قبروں کے سرخ اور سفید پتھر سیاہ پڑ چکے تھے۔ بعض قبروں کے چاروں طرف لوہے کے خوب صورت کٹہرے زنگیا گئے تھے مگر ان کی مضبوطی میں فرق نہیں آیا تھا۔

ان سب قبروں کے پاس سے نکلتی ہوئی زری سنگِ مرمر کی اس نازک اور خوب صورت قبر پر گئی جس پر سنگِ مرمر کا ایک معصوم فرشتہ آسمان کی طرف انگلی اٹھائے کھڑا تھا۔ نازک سی صلیب کا کتبہ تھا جس پر ایک نفیس گل دائرہ کندہ تھا۔ نام ایلزا ولسن۔ موت کی وجہ گھوڑے سے گرنا درج تھی۔ ''چاچا جی بچپن میں کئی مرتبہ مجھے اپنی منگیتر کی قبر پر لے کر آئے تھے۔'' زری نے بتایا، ''ان دنوں مشہور تھا کہ وہ ہر جمعرات کو یہاں چراغ روشن کرتے ہیں اور اکثر چاندنی راتوں میں یہاں پھرتے دیکھے گئے ہیں۔''

''سب افواہیں تھیں۔'' تائی نے کہا، ''یہ بھی سنا تھا کہ انھوں نے اس کے برابر میں اپنے لیے قبر کی جگہ رکھوالی ہے۔ پھر کچھ سال بعد انھوں نے اس عورت سے نکاح پڑھوالیا، کیا نام تھا اس کا؟''

''زیب قادری۔''

''ہاں زیب قادری ـــــ دیکھو مردوں کی باتیں ـــــ اور چند دن بعد وہ بھی مرگئی۔''

''ہاں وہ بھی مرگئیں اور ان کی خواہش کے مطابق چاچا جی نے ان کو اپنے باغ کے ایک کونے میں دفن کروایا۔''

چنار کے درخت کی آڑ سے کتے کا ایک سفید بچہ نکلا ـــــ دودھ کی طرح سفید ـــــ زری اس کو دیکھ کر ٹھنک گئی۔

''بالکل فلفل جیسا ہے، یاد ہے خوش حال؟''

''ہاں یاد ہے۔'' خوش حال نے دھیرے سے کہا، ''مجھے تو سب کچھ یاد ہے جس دن زیب قادری کا انتقال ہوا تم صبح صبح گھر سے غائب تھیں۔ اکبر چاچا بے حد پریشان تھے۔ وہ جنازے کے ساتھ بھی نہیں گئے تھے۔ سب کا خیال تھا کہ تم زیب قادری کی موت کی وجہ سے پریشان ہو کر کہیں چھپ گئی ہو۔ وہ ڈاکٹر یوسف کے گھر میں تمھیں تلاش کر رہے تھے۔ میں صبح سویرے فلفل کو دیکھنے گیا تو وہ گھر میں نہیں تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ تم اسے ڈھونڈنے نکل گئی ہو۔ میں نے اکبر چاچا کو بتایا۔ انھوں نے مجھے قبرستان کی طرف دیکھنے بھیجا اور خود ''اکبر منزل'' کی تیسری منزل پر چڑھ کر چاروں طرف دیکھنے لگے ـــــ میں نے قبرستانوں کی دیوار کے پاس فلفل کی نعش پڑی دیکھی۔ رات کو

کُھلا رہ گیا تھا اور طوفانی رات میں کوئی گیدڑ اسے مار کر ڈال گیا تھا۔ نزدیک ہی ایک جھاڑی کے پاس تم بے ہوش پڑی تھیں۔ میں نے بڑی مشکل سے تمھیں اٹھایا اور ایک ایک قدم اٹھاتا ہانپتا ہوا گھر کی طرف لے کر چلا۔ اکبر چاچا نے چھت پر سے مجھے دیکھ لیا۔ وہ بھاگتے ہوئے آئے اور تمھیں اپنی گود میں لے کر جلدی سے واپس چلے گئے۔ یہ سب مجھے کل کی طرح یاد ہے۔''

''ہاں، اس کے بعد زری کو کئی ہفتے بخار آیا تھا۔ ڈاکٹر کہتے تھے معیادی بخار ہے لیکن ہمارا خیال تھا اس کے دل پر دو صدمے پڑے ہیں۔ اپنی آنٹی قادری اور فلفل، دونوں سے اسے بڑی محبت تھی مگر ان کے مرنے کے بعد دونوں کا نام کبھی زبان پر نہ لاتی تھی بس اندر ہی اندر گھٹتی رہتی تھی۔ بخار اترا تو اس کی ساری چونچالی غائب ہوگئی تھی، رنگت زرد ہوگئی تھی، بال جھڑ گئے تھے، ذرا سا منھ نکل آیا تھا۔ ہر وقت اپنے کمرے میں بیڑی کھڑکی سے جھانکتی رہتی تھی یا کبھی ہولے ہولے زینہ اتر کر اپنے کتے کے خالی گھر کے آگے بیٹھ جاتی تھی۔ اس زمانے میں کئی دفعہ میں نے تجھے بھیجا تھا کہ جا کر زری کو کہانیاں پڑھ کر سنا۔'' تائی نے دھیرے دھیرے یہ سارا قصہ دہرایا۔

''ہاں، خوش حال مجھے کہانیاں سناتا تھا اور میرے ساتھ سانپ سیڑھی اور لوڈو کھیلتا تھا۔ جب میں ایسی چیزیں کھانے کی ضد کرتی تھی جو منع تھیں تو مجھے پیار اور طریقے سے سمجھایا کرتا تھا۔''

''اچھا تو یہ سب تمھیں بھی یاد ہے۔'' خوش حال دل ہی دل میں بڑا خوش ہوا۔ مگر بھلا اسے یہ کہاں پتا ہوگا کہ وہ خود بھی ایسی چیزیں کھانا چھوڑ دیتا تھا جو زری کو منع تھیں۔

''داجی نے اسی زمانے میں کسی انگریز سے ایک اچھی نسل کا کتا لیا تھا نا — میں تو صرف اس کے ساتھ کھیلتی تھی۔ اس کے کھانے اور نہلانے کا سارا انتظام تو خوش حال کے ذمے تھا۔''

''ہاں بٹی! اسے بھی ان کاموں سے خوشی ہوتی تھی مگر اس بے چارے کو کیا معلوم تھا کہ انھی کُتوں کم بختوں کی بدولت ایک دن تیرے باپ کی جان جائے گی۔'' تائی ایک دم خاموش ہوگئی تھیں مگر نکلے ہوئے تیر کی طرح جملہ اپنا کام کر گیا تھا۔ خوش حال خان نے ماں کو شکایت بھری نظروں سے دیکھا تھا۔

''تائی جی! آج تک میرے ساتھ یہی معاملہ ہے۔ جس چیز کو عزیز رکھی ہوں وہی مجھے دکھ پہنچاتی ہے — اور اب بھی یہ سوچ کر حیران ہوتی ہوں کہ جب داجی نے نوکروں کے ٹیکے لگوا دیے تو خود اپنے کیوں نہ لگوائے۔''

''ان کے ہاتھ پر ایک ہلکی سی خراش کتے کے ناخن سے آئی تھی۔ وہ یہی کہتے رہے کہ کتے کا دانت نہ لگے تو کچھ نہیں ہوتا۔ بعد میں ڈاکٹروں نے کہا کہ شاید اس زخم کے ذریعے پاگل کتے کا لعاب ان کے جسم میں چلا گیا تھا۔''

''میں جب ہاسٹل سے آئی ہوں تو وہ بالکل پُرسکون تھے۔ کتے کے کاٹے جانے کی کوئی علامت ان میں موجود نہ تھی۔ مجھ سے کہا گیا کہ رات زیادہ ہوگئی ہے، میں آرام کرکے صبح کو آجاؤں۔ صبح کو پہنچی تو وہ ختم ہو چکے تھے۔''

''اس لیے کہ انھیں زہر کا انجکشن لگوایا گیا تھا۔ میں نے اپنے کانوں سے رشتے داروں کو یہ باتیں کرتے سنا ہے کہ مرنے سے پہلے انھیں بڑی تکلیف ہوگی، ان کا جسم کانپے گا، جھٹکے لگیں گے، گلے میں درد ہوگا۔ پانی سے ڈریں گے اور منہ سے عجیب عجیب آوازیں نکالیں گے۔ سارے میں مشہور ہوگا کہ ان کے خاندان کے بزرگ پاگل ہوکر مرے ہیں۔ پاگل کتے کی موت—— میں نے تو تمھیں پہلے بھی کئی مرتبہ بتایا تھا۔''

''نہیں، یہ سب تیرا وہم ہے۔ ایسا ہوتا تو سب سے پہلے زری کی ماں کو شک ہوتا۔''

''انھیں کیسے ہوسکتا تھا، وہ تو اپنے بھائی کی عاشق تھیں۔ ایسی بات سننا بھی انھیں گوارا نہ تھا، اور پھر وہ میرا رشتہ بھی ان کے بیٹے سے طے کر چکی تھیں۔''

''اب جو کچھ بھی ہو۔ مرنے والے تو واپس نہیں آسکتے۔ خواہ مخواہ کی دشمنی مول لینے سے فائدہ —— میں تو اب بھی یہی کہتی ہوں کہ اپنے رشتے داروں سے صلح کرلے۔'' تائی نے کہا۔

''میں نے اسی وقت ماموں کے بیٹے سے شادی کرنے سے انکار کردیا تھا اور امی سے کہہ دیا تھا کہ ہرگز خاندان کے کسی لڑکے سے شادی نہیں کروں گی۔ میں نے دا جی کو اس لیے یہاں دفن کروایا تھا کہ شاید کبھی ثبوت مل سکے کہ ان کی موت طبعی نہیں تھی۔ لیکن ایک تنہا لڑکی کے لیے انصاف مانگنا بھی کتنا مشکل ہے۔''

''ارے، خوش حال کی بات پر نہ جا۔ خدا خبر انھوں نے کیا کہا اور اس نے کیا سنا۔ تجھے تو معلوم ہے یہ خوابوں کی دنیا میں رہتا ہے۔'' تائی نے کہا۔

''نہیں تائی جی! اس زمانے میں یہ بات میں نے دبی دبی زبان میں کئی لوگوں سے سنی تھی۔ اگر تحقیقات ہوجاتی تو بات کھل جاتی۔ لیکن سب سے پہلے بے بے ہی تیار نہیں ہوئیں۔ اس وقت سے اب تک میں بہت سے ڈاکٹروں سے بھی مل چکی ہوں۔''

''اب تو برسوں گزر گئے، تیری بے بے بھی نہ رہی، اب جانے دے۔ سب سے مل جل کر رہ۔ دیکھ رہی ہے تیری کوٹھی، تیری جائیداد اور سامان کا کیا حال ہو رہا ہے؟''

''ہونے دو۔ مجھے کیا قبر میں لے کر جانا ہے، لیکن جب تک دل صاف نہ ہوں میں کسی سے مل نہیں سکتی۔''

''کب تک پردیس میں ماری ماری پھرے گی؟''

''نصیب میں یہی سہی — ان بے چارے گورے فوجیوں کو بھی تو دیکھیے جو یہاں دفن ہیں۔ ان کی مائیں ان کے چہرے کیا، ان کی قبریں بھی نہ دیکھ سکی ہوں گی۔'' زری نے کہا۔

''یہی ہوتا ہے۔ کالونیاں بنانے کی قیمت تو دینا پڑتی ہے۔'' خوش حال نے کہا۔

''آؤ اب دوسرے قبرستان چلیں۔'' زری خوش حال کو جوش میں آتا دیکھ کر دوسری طرف مڑ گئی۔

جس وقت وہ دوسرے قبرستان سے فاتحہ پڑھ کر نکلے سورج ایبٹ آباد پر آخری نگاہ ڈال کر پہاڑ کے پیچھے غروب ہونے جا رہا تھا۔

مانسہرہ وادی بڑی، لیکن شہر چھوٹا ہے۔ اس چھوٹے سے شہر میں بھی ہر چیز موجود ہے۔ شمس الرحمٰن نے اپنی نوٹ بک میں لکھا۔ تازہ پھل، خشک میوے، سبزیاں، سلاد کے لیے نہایت تازہ کھیرے، گاجر، مولی اور چقندر وغیرہ۔ چپلی کباب، بڑی بڑی تازہ گرم روٹیاں۔ دہی بھی ہے لیکن سڑک کے کنارے کھلے برتنوں میں رکھا ہوا دہی کھانا خطرے سے خالی نہیں۔

مانسہرہ سے چند میل آگے جا کر سڑک دو حصوں میں تقسیم ہو جاتی ہے۔ ایک سڑک گلگت کی طرف نکل جاتی ہے اور دوسری کاغان کی طرف، ہم کاغان کی سمت جا رہے ہیں۔ گڑھی حبیب اللہ چند میل دور ہے۔ اس علاقے میں سیاحوں کے ٹھہرنے کے لیے کوئی جگہ بنائی جانی چاہیے۔ ہر منظر دامنِ دل کھینچ رہا ہے۔ سامنے دریائے کنہار بلندیوں سے اتر کر مظفر آباد کی طرف مڑ رہا ہے۔ اس کا چوڑا پاٹ خشک پہاڑوں کے سلسلوں میں گم ہو گیا ہے۔ دائیں طرف ڈوور (Dover) کی مشہور سفید پہاڑیوں جیسی پتھریلی سفید چٹانیں ہیں۔

شمس الرحمٰن نے اپنی نوٹ بک بند کی۔

''ہمیں دریائے کنہار کے کنارے ایک چھوٹا سا ریسٹ ہاؤس بنانے پر غور کرنا چاہیے۔ کیا خیال ہے، وہاں چلیں؟'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''بھائی ذرا ٹھہرو۔ میں ان سفید پہاڑیوں کے چند اسکیچ بنالوں پھر چلتے ہیں۔''

نرگس اپنا سامان لے کر دوسری طرف چلی گئی۔ زری اور شمس الرحمٰن وادی اور دور کے پہاڑی

سلسلوں کے سامنے سحر زدہ سے کھڑے تھے۔ ٹھنڈی ہوا میں زری کے سنہری بال اِدھر اُدھر اڑ رہے تھے۔ نزدیک کے درختوں پر چند سال پہلے لڑکے لڑکیوں نے اپنے نام کندہ کیے تھے، چھال کے وہ زخم آہستہ آہستہ بھر رہے تھے۔

"ایسے خوب صورت علاقے دیکھ کر مجھے اپنا دیس یاد آتا ہے۔ دیکھو زری تم بنگلہ سیکھ لو اور پھر وہاں کی سیر کرنے جاؤ۔" شمس الرحمٰن نے کہا۔

"میں سوچتی ہوں۔" زری نے کہا، "میں ایسی جگہ کیوں جاؤں جہاں کے لوگ مجھے پسند نہ کرتے ہوں۔"

"ارے! تمھیں کون پسند نہیں کرے گا۔ دیکھو ہر شخص کی ایک انفرادی شخصیت ہوتی ہے، دوسری سماجی حیثیت ہوتی ہے۔ انگریز لوگ ہندوستانیوں اور پاکستانیوں کو قوم کے لحاظ سے کیسی ہی نظر سے دیکھتے ہوں لیکن قابل اور اچھے لوگوں کی ہمیشہ قدر کرتے رہے۔ اگر تم خود کو برتر اور انھیں کم تر سمجھو گی تو ضرور مشکل ہوگی۔ اب جیسے اگر تم مجھے حقیر سمجھتیں تو کیا میں اس طرح اپنی باگ ڈور تمھارے ہاتھ میں دے دیتا۔"

زری نے چونک کر شمس الرحمٰن کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی مخصوص شگفتہ ہنسی ہنس دی۔ "تو گویا تم نے اپنی باگ ڈور میرے ہاتھ میں دے رکھی ہے۔"

"ہاں، کیوں کہ مجھے معلوم ہے کہ تم یہاں کی باسی ہو اور اس علاقے کے بارے میں ہم سے زیادہ جانتی ہو۔ یہ باہمی اعتماد کی بات ہوتی ہے بھئی۔"

"مگر جب دونوں طرف کے لوگ ایک دوسرے سے کھل کر بات نہیں کریں گے تو غلط فہمیاں کیسے دور ہوں گی؟"

"تم اور ہم بھی تو یہ کام کر سکتے ہیں۔ بات صرف یہ بتانے اور جاننے کی ہے کہ وہاں کے لوگ کم تر اور کم زور نہیں ہیں، صرف تھوڑے سے مختلف ہیں۔ اس لیے کہ وہاں کی آب و ہوا، رہن سہن الگ ہے۔ ایک زمانہ تھا، میں تمھیں بتاتا ہوں کہ بنگال کو نہایت خوف ناک اور خطرناک جگہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کی وجہ سے یہ بہت عرصے تک محفوظ بھی رہا۔ شمال میں پہاڑ اور جھرکنڈ کے جنگلات تھے، جنوب میں سمندر۔ عام طور پر یہ بات مشہور تھی کہ بارش کی زیادتی اور ندی نالوں کی بہتات سے آدھے سال غرقاب رہتا ہے اور سارا سال بیماریاں اور وبائیں پھیلتی رہتی ہیں۔ جب اکبرِ اعظم نے اسے فتح کیا تو اس نے اور جہانگیر نے یہاں رہنے والے افسروں کو جاگیریں دیں، وظیفے مقرر کیے، زیادہ تنخواہیں دیں۔ پھر جو لوگ یہاں رہ پڑے وہ یہاں کی قدرتی خوب صورتی، پھلوں پھولوں کی بہتات اور

دریاؤں سے مسحور ہوگئے۔ زرخیز زمین کی وجہ سے بہت کم محنت سے پیداوار افراط سے ہوتی تھی۔ یہاں رہنے سے وہ نفسیاتی خوف جو دوری سے پیدا ہوگیا تھا، ختم ہوگیا۔ لوگ اس آب و ہوا کے، بلکہ یہاں کے سیلاب، طوفانوں اور بیماریوں کے بھی اتنے عادی ہوگئے کہ وہ ان باتوں کو زبان پر بھی نہ لاتے تھے۔ ابوالفضل نے ''آئینِ اکبری'' میں لکھا کہ شہنشاہ اکبر کی فتح بنگالہ کے بعد سے اس علاقے کی آب و ہوا بہتر ہوگئی ہے۔ گویا مہابلی کے خوف سے بے چارے بنگال نے اپنے اطوار سنوار لیے۔'' شمس الرحمٰن ہنسا۔ ''کوئی بھی شخص ہو یا ملک، نزدیک سے دیکھے بغیر اس کی اصلیت کا پتا نہیں چلتا۔ دوسرا نکتہ یہ ہے کہ لین دین فطری ہونا چاہیے، اگر شعوری کوشش ہو تو پھر دینے کی ہونی چاہیے، لینے کی نہیں۔ دوستیاں اور محبتیں اس طرح بنتی ہیں، ورنہ کاروبار...... دوستیاں ایک دوسرے کو قریب کرتی ہیں اور کاروبار......''

''کاروبار دور کرتے ہیں اور اکثر سانجھے کی ہانڈی چوراہے میں پھوٹتی ہے—— میں سمجھ گئی۔''

زری نے جلدی سے کہا، ''اب اگر میں تم سے کہوں کہ تم یونی ورسٹی میں تاریخ پڑھایا کرو تو غلط نہ ہوگا۔''

''میں تمھارے چکر میں نہیں آؤں گا۔ میں سوچ رہا ہوں کہ اس کام کے لیے مشرقی پاکستان چلا جاؤں۔''

''تاریخ پڑھانے؟'' زری نے پوچھا۔

''جی نہیں، یہ سب پڑھانے جو تمھیں پڑھا رہا ہوں۔ دونوں صوبوں کو ایک دوسرے کے نزدیک آنا چاہیے۔ جب یہ باتیں میں تمھیں بتاتا ہوں تو تمھاری سمجھ میں آتی ہیں؟''

''ہاں، آتی ہیں۔''

''تو یہ بات یہاں کے لوگوں کو بھی اور وہاں کے لوگوں کو بھی سمجھانے کی ضرورت ہے۔''

''ایک دم سے تمھیں یہ خیال کیسے آ گیا؟''

''قومی یک جہتی کی کاؤنسل کی طرف سے مجھے ایک آفر آیا تھا۔ میں حکومت کی نوکری نہیں کرنا چاہتا تھا، مگر اب سوچتا ہوں کہ یہ کام بھی ضروری ہے۔''

''قومی یک جہتی کا۔''

''ہاں، سو رہی ہو—— کیسے اونگھ اونگھ کے سوال کر رہی ہو؟''

''نہیں سو تو نہیں رہی—— میں کچھ اور سوچ رہی تھی۔ ہاں یہ کام بھی ضروری ہے۔ آؤ چلیں، شام ہوگئی تو ایک دم اندھیرا چھا جائے گا۔''

''نرگس! جلدی اپنا سامان سمیٹو، ایک چکر دریا کا لگا کر آتے ہیں۔'' دوسری طرف جا کر

شمس الرحمٰن نے آواز دی۔

''واقعی اس گھر کی شان اور دبدبہ ہی کچھ اور ہے، یہی سر ایبٹ کا گھر ہو سکتا ہے۔'' نرگس نے کہا، ''ایبٹ آباد ان ہی حضرت نے بسایا تھا نا؟''

''ہاں۔'' شمس الرحمٰن نے کہا، ''آپ اس علاقے کی تھوڑی سی تاریخ جان لیں تو کوئی حرج نہیں ہے۔ تیمور نے یہاں قوم فارلغ کو بسایا تھا اور یہ سارا علاقہ ہزارہ فارلغ کے نام سے مشہور ہوا اس لیے کہ اس جگہ سے ایک ہزار سپاہیوں کا دستہ شاہی فوج کے لیے جاتا تھا۔ پہلے یہ علاقہ کشمیر میں شامل تھا مگر بعد میں یہ اس سے علاحدہ ہو گیا۔ دُرّانی حکومت کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر رنجیت سنگھ نے اسے اپنی حکومت میں شامل کر لیا۔ جب سکھ حکومت کمزور ہوئی اور ہزارہ میں بغاوت ہوئی تو گلاب سنگھ نے ہزارہ کو دوبارہ سکھوں کے حوالے کر کے جموں کے نزدیک کا علاقہ لے لیا۔ اس زمانے میں کپتان ایبٹ سکھ دربار کے حکم سے ضلع ہزارہ اور مہاراجا کے علاقے کی حد بندی کے لیے آیا۔ اس نے اہلِ ہزارہ کے دلوں کو جیت لیا اور اس کی حکمت عملی سے یہ علاقہ انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔ چناں چہ جیمس ایبٹ جو اب میجر بن چکا تھا، یہاں کا پہلا ڈپٹی کمشنر بنا اور گھوڑے پر بیٹھ کر طویل سروے کرنے کے بعد یہاں چھاؤنی بنائی، جس کا نام ایبٹ آباد رکھا گیا۔''

''جس وقت ایبٹ یہاں رہتا ہوگا تو اس گھر کی رونق قابلِ دید ہوگی۔'' زری نے کہا، ''خانساماں، بیرے اور اردلی گھومتے ہوں گے۔ اصطبل میں گھوڑے بندھے ہوں گے۔ باغ میں یہاں سے وہاں تک پھولوں کی کیاریوں میں خوب صورت پھول ہوں گے۔ صاف ستھری روشیں ہوں گی اور ٹینس کورٹ ہوں گے۔''

''گھر کی ہر چیز جھلمل جھلمل کرتی ہوگی۔'' نرگس نے کہا اور پھر دونوں نے مل کر اس گھر کو ماہرینِ آثارِ قدیمہ کی طرح 'ری کنسٹرکٹ' کرنا شروع کر دیا۔

''جناب یہ چوبی فرش یوں ننگے تو نہ ہوں گے۔ ان پر قیمتی قالین، شیر اور ہرن کی کھالیں ہوں گی۔ ان مضبوط زینوں پر سرخ بانات بچھی ہوگی۔ یہاں سکھوں کی پیش کردہ تلواریں اور کرپانیں لٹکی ہوں گی۔ یہاں کوٹ اور ہیٹ لٹکانے کا ریک ہوگا۔ دیواروں پر مارکوپولو بھیڑوں کے سر لگے ہوں گے۔ یہاں برآمدے میں جتنے آگے نکل آنے والی لمبی لمبی آرام کرسیاں پڑی ہوں گی۔ سیکڑوں کے حساب سے گملے رکھے ہوں گے جن میں سے پانی ٹپکتا ہوگا اور تپائی پر کافی رکھے میجر ایبٹ لندن آبزرور پڑھتے ہوئے اردلی کی مقامی گپ شپ پر سر ہلاتا جاتا ہوگا۔''

''اور یہاں کھانے کے کمرے میں بے حد چمکتی دمکتی لمبی سی میز ہوگی۔ اونچی پشت کی کرسیاں

ہوں گی۔ سائڈبورڈ پر چینی پینل میں لمبی دموں والے مور، اژدہے اور خوش وضع پھول ہوں گے۔ اس لمبے چوڑے ڈرائنگ روم میں وکٹورین مینٹل پیس کے عین اوپر ملکہ وکٹوریہ اور شہزادہ البرٹ کی نیشنل پورٹریٹ میوزیم والی تصویر کی نقل ہوگی اور سنہرے فریموں میں اولڈ ماسٹرز کے ری پرنٹ۔ بلجیم اور اٹلی کے جھاڑ فانوس اور بے حد بھاری سلور پیس۔''

''کرسمس کے دنوں میں یہاں رقص کی پارٹیاں بھی تو ہوتی ہوں گی۔ اندر لپکتے شعلوں اور رنگا رنگ شراب کی گرمی ہوگی اور باہر برف پڑی ہوگی۔''

''بھئی حکومت کے نشے کی گرمی کیا کم ہوگی۔'' شمس الرحمٰن نے پہلی مرتبہ لقمہ دیا تھا جسے دونوں نے نظر انداز کر دیا تھا۔ ''ہاں، باہر برف پڑی ہوگی۔ بادلوں میں ٹھٹھرا چاند گدڑی میں لپٹی کسی خوب صورت لڑکی کی طرح جھانکتا ہوگا۔ پردہ سَر کی کھڑکیوں سے مقامی لوگ چھپ چھپ کر ان پری چہرہ میموں اور ٹیل کوٹوں میں لمبے تڑنگے صاحب لوگوں کو رقص کرتے ہوئے دیکھتے ہوں گے۔''

''بس یا کچھ اور؟'' شمس الرحمٰن یکایک بیچ میں بول اٹھا تھا۔ ''اب میں نہایت افسوس کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ اس گھر میں ایبٹ کبھی نہیں رہا بلکہ وہ سرے سے ایبٹ آباد ہی نہیں رہا۔ وہ ہری پور میں ایک خیمے میں رہا کرتا تھا۔ البتہ شیرواں گاؤں میں چند دن ضرور رہا ہے۔''

''اونو!'' دونوں لڑکیوں نے گریہ کیا۔

اب وہ تینوں ایک بالکنی میں کھڑے تھے۔ اوپر کے ہر بیڈ روم کے سامنے ایک بالکنی تھی اور ہر جگہ سے ایک نیا منظر سامنے تھا۔ ایک جگہ سے پہاڑ اور دامن کے گاؤں دکھائی دیتے تھے۔ دوسری بالکنی سے سلیٹی چٹانیں اور پریڈ گراؤنڈ۔ تیسری بالکنی سے سرخ چھتوں والے بنگلے جہاں کسی زمانے میں انگریز اور اب مقامی فوجی افسران رہتے تھے۔ سالہا سال کی بارش، برف اور طوفان کے جھکڑوں نے ان تصویری کاٹج نما مکانوں کی حالت خستہ کر دی تھی۔

''لوگ ٹھیک کہتے ہیں کہ تاریخ بڑی ظالم ہوتی ہے اور تم تاریخ داں اس سے بھی ظالم۔'' نرگس ابھی تک افسردہ تھی۔ ''میں نے تو لکڑی کے اس مضبوط زینے پر سر ایبٹ کی انگلیوں کے نشانات بھی دیکھ لیے تھے۔''

''لوگ یہ بھی ٹھیک کہتے ہیں کہ عورتیں خصوصاً آرٹسٹ عورتیں بڑی جذباتی ہوتی ہیں۔ مگر تم غم نہ کرو۔''

''نرگس بیگم! ہوسکتا ہے تم ہی صحیح ہو — تاریخ بھی ہمیشہ سچی نہیں ہوتی۔''

نرگس نے اپنا سامان سنبھالا۔ دو پہاڑوں کے نشیب میں سورج غروب ہونے سے پہلے اپنی کرنیں سمیٹ رہا تھا۔ دریا سے پہلے ایک چوڑا سا نالہ پڑتا تھا جسے پھلانگنے کے لیے مقامی بچوں نے ایک چارپائی نالے میں ڈال رکھی تھی۔ ان سب نے ابھی اس چارپائی کے پل سے نالہ پار کیا اور دریائے کنہار کے کنارے جا پہنچے۔ دریا کی لہریں پرشور تھیں اور پتھروں پر قلابازیاں کھاتی نیچے آ رہی تھیں۔ ڈھول کی طرح گول جھاگ اڑاتی لہریں سبزے کے درمیان ہنستی کھلکھلاتی بے حد خوش کسی نامعلوم منزل کی طرف رواں تھیں۔ برف کی طرح ٹھنڈی اور بلور کی طرح شفاف۔ آسمان پر چاروں طرف سے بادل امڈ امڈ کر گھرے چلے آ رہے تھے۔ ہوا کی خنکی بازوؤں میں چٹکی لے رہی تھی۔

نرگس تصویریں لیتی رہی۔ شمس الرحمٰن نوٹ لیتا رہا۔ زری منظر سے لطف اندوز ہوتی رہی۔ ذرا دیر بعد شمس الرحمٰن ایک گیت گنگناتا زری کی طرف بڑھا۔

"امار آچھی پولا پان
غازی گنگا نگہبان
سارے گنگا دریا
پنج پیر بدر بدر

"مطلب سمجھیں؟"

"نہیں۔"

''نرگس تم سمجھاؤ۔''

''اس کا مطلب ہے۔'' نرگس نے کہا، ''ہم بچے ہیں، غازی اور گنگا نگہبان ہیں۔ ہمارے سروں پر دریائے گنگا کا اور پانچ پیروں کا سایہ ہے جن میں سے سب سے بڑے بدرالدین اولیا ہیں۔''

''وہی بات۔'' شمس الرحمٰن نے کہا، ''گنگا مائی — مقدس دیوی کا سایہ بھی ہے اور پانچ پیروں کا بھی، ایسا ہوتا ہے — خود بخود — اس میں کسی کی سازش نہیں ہے۔'' شمس الرحمٰن نے اصرار کیا۔

''اچھا اچھا۔'' زری نے گویا تسلی دی اور ایک طرف اشارہ کیا جہاں دو پہاڑوں کے نشیب میں سورج آخری ڈبکی لگانے کے لیے پر تول رہا تھا۔

بچے نالے پر سے اپنی چارپائی لے کر رخصت ہو چکے تھے۔ نالے کو پھلانگتے پھلانگتے بارش شروع ہو گئی۔ ان کی یہ کوشش کہ اندھیرا ہونے سے پہلے پُر پیچ علاقے سے نکل جائیں، پوری نہ ہوئی۔ بادل قدم قدم پر جیپ کے آگے سدِ راہ بن کر کھڑے ہو جاتے۔ بجلی کے لہریے ونڈ اسکرین پر روشنی ڈالتے جیسے کسی کی تلاش میں ہوں۔ چیڑ کے درختوں نے الگ محاصرہ کر رکھا تھا۔ یہ گمان ہو رہا تھا جیسے وہ تینوں کسی بھاری پُراسرار مہم کے لیے نکلے ہوں۔ جب پیچ دار راستہ ختم ہوا، اچانک بارش بھی رک گئی۔ شفق کی سرخی نے سارے آسمان کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ مانسہرہ کی پہلی وادی میں گاؤں کے گھروں میں روشنیاں جل اٹھی تھیں۔ آسمان کے مقابلے میں زمین کے ستارے کہیں زیادہ تھے۔ مانسہرہ کے ایک گھر کے آگے چار لڑکے قطار میں کھڑے سگریٹ پھونک رہے تھے۔ اندھیرے میں جلتے ہوئے چار سگرٹوں کے کونے بڑے پُراسرار سے لگے۔

زری کو خیال آیا کہ گھر پہنچتے پہنچتے بہت دیر ہو جائے گی۔ پھر اسے یاد آیا کہ آج چاچا جی واپس آ چکے ہوں گے۔ تب اس نے کہا، ''سنو، یوں کرتے ہیں کہ آج رات چاچا جی کے ہاں پناہ لیتے ہیں۔ ان کی کوٹھی راستے میں پڑے گی۔ چاچا جی ڈرائیور کو خط دے دیں گے کہ میں نے ان لوگوں کو روک لیا ہے، اس طرح ہم رات کو دیر سے پہنچنے کی خفت سے بچ جائیں گے۔''

''اور تمھارے چاچا جی کیا کہیں گے؟'' شمس الرحمٰن نے پوچھا۔

''چاچا جی کچھ نہیں کہیں گے۔ وہ جب کسی پر اعتماد کرتے ہیں تو کامل اور بھرپور۔ کسی حالت میں بھی ان کا اعتماد ڈھل مل نہیں ہوتا۔ یہ کتنی بڑی بات ہے۔''

''ہاں، یہ بہت بڑی بات ہے۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔ ''اور تم بھی ان پر اسی طرح اعتماد کرتی ہو؟''

''بالکل — اعتماد تو دونوں طرف سے ہوتا ہے۔ آج ہی ہم نے بھی تو اسی قسم کی کوئی بات کی تھی۔''

''ہاں، باہمی اعتماد بڑی چیز ہے۔'' شمس الرحمٰن نے دُہرایا۔

''نام ان کا عُمر ہے مگر ساری دنیا چاچا جی کہتی ہے۔ علی گڑھ اور لندن میں پڑھا۔ اپنے زمانے میں بڑے خوب صورت اور فیشن ایبل بھی تھے مگر اب گوشہ نشین ہو گئے ہیں۔ ان کی کوٹھی کے بڑے سے باغ میں سیب، آلو چے، آلو بخارا اور خوبانیوں کے بے شمار درخت ہیں۔ ہم بچپن میں لمبی چھٹیاں اور ہفتے وہیں گزارتے تھے۔ گھر کا کونا کونا پھلوں کی خوشبو سے مہکا کرتا تھا۔ باورچی خانے سے لے کر سونے کے کمروں تک کوئی جگہ نہ ہوتی تھی جہاں کسی نہ کسی چیز میں پھل نہ پڑے ہوں۔ لیکن ہم بچوں کو بھی گھر میں رکھا ہوا پھل کھانا حرام تھا۔ برف یا چشمے کے پانی میں ٹھنڈے کیے ہوئے پھل بھی نہیں کھاتے تھے۔ بس وہی گرما گرم پھل درخت سے توڑ کر کھاتے تھے جو مارے رس کے سوج رہے ہوتے تھے۔ اور یہ پھل ایک دوسرے کے دوپٹے سے صاف کر کے کھائے جاتے تھے۔''

یہ سب کہتے کہتے زری جیسے اس زمانے میں جا پہنچی (عدنان پاکستان ملٹری اکیڈیمی سے ہفتے کی شام سیدھا چاچا جی کے ہاں چلا آتا تھا)۔

''چاچا جی بتایا کرتے تھے کہ کاکول میں آج جو ملٹری اکیڈیمی ہے وہاں سب سے پہلے جنوبی افریقا کے بوائر، ہالینڈ کے باشندے قیدی بنا کر رکھے گئے تھے۔ انھوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ کی تھی۔ سر ونسٹن چرچل نے بھی اس اہم بوائر وار میں دادِ شجاعت دی تھی۔ اور جنوبی افریقا میں قید رہے تھے۔ بہرحال ان جنوبی افریقا سے آنے والے قیدیوں کے لیے یہ بیرکیں بنائی گئی تھیں۔ یہ قیدی عوام سے گھل مل گئے تھے۔ پتھروں کے بڑے عمدہ قلم دان اور دواتیں بناتے تھے اور بیچتے تھے۔ جب صلح ہو گئی اور یہ قیدی واپس چلے گئے تو ان بیرکوں میں ہندوستانی توپ کمپنیاں رکھی گئیں۔ پاکستان بننے پر پاکستان ملٹری اکیڈیمی بنا دی گئی۔ ان بیرکوں کے بارے میں شروع میں ایک عوامی گیت بھی مشہور ہوا تھا:

کاکولاں بنگلہ نیا پیا ــــــ چل دیکھن چلیے کیا جیہا

یعنی......''

''اب ترجمے کی تکلیف نہ کیجیے کہ ہم دونوں سمجھ گئے ہیں۔'' شمس الرحمٰن نے طنز سے کہا، ''ہاں آگے......''

''بس ہم لڑکے لڑکیاں کبھی بڑوں کے پاس جا بیٹھتے اور ماضی کی باتیں سنتے کبھی اپنی الگ محفلیں جماتے جن میں رات گئے تک باتیں، ہنسی مذاق، لطیفے اور قہقہے چلتے۔ صبح اٹھتے ہی پھر پھلوں کے درختوں پر دھاوا بول دیتے۔ پکے پکے آلو بخارے اور خوبانیاں توڑتے عدنان میرے دوپٹے کی طرف لپکتا، میں بھاگتی مگر وہ پکڑ لیتا ــــــ دوپٹے سے پھل صاف کرنے کے بعد آہستہ سے کہتا۔ تمھارے

دوپٹے سے صاف کرنے کے بعد پھل زیادہ مزے دار ہو جاتا ہے۔ میں احتجاج تو کرتی تھی مگر ایمان کی بات ہے کہ دل ایک اَن جانی میٹھی خوشی سے بھر جاتا تھا" کبھی کبھی ہم لڑکیاں چادر تان کر کھڑی ہو جاتیں۔ گھر کے لڑکے یا نوکر شاخیں ہلاتے۔ ڈھیروں پھل بلیئرڈ کی گیندوں کی طرح چادروں میں آ گرتے۔ اندر سے بڑی بوڑھیوں کی ڈانٹ کی آواز سنائی دیتی — صبح صبح پھل ہی کھائے جاؤ گے یا اندر آ کر ناشتا بھی کرو گے — اور پھر وہ اپنی سفید دھلی دھلائی چادروں پر پھلوں کے داغ دیکھ کر تاؤ میں آ جاتیں۔ ہم لڑکیاں خاموشی سے سر جھکا کر ان کی ڈانٹ پھٹکار سنتیں۔ خادمائیں پھلوں کے داغ دھو کر چادریں دھوپ میں گھاس پر پھیلا دیتیں اور ہم سب ناشتا کر کے پہاڑیاں ناپنے نکل جاتے۔"

زری خاموش ہو گئی۔ جیپ ڈھلوان سڑک پر اترتی چلی جا رہی تھی۔ اس کے ذہن کی سڑک پر یادوں کی گاڑی چلتی رہی۔ جب وہ سیب کے درخت کے سائے میں بیٹھ کر پڑھ رہی ہوتی تو عدنان دبے پاؤں وہاں آتا۔ شاخیں اس طرح جھکی ہوتیں کہ کوئی بچہ بھی بیٹھے بیٹھے سیب توڑ کر کھا سکتا تھا۔

عدنان اس کے پاس بیٹھ کر سرگوشی کرتا "چاچا جی سے کہو، گھر میں اتنے ملازم نہ رکھا کریں۔"

"کیوں؟" وہ بیوقوفی سے منھ پھاڑ دیتی۔

"تم کیا سمجھو گی۔" وہ چڑ کر کہتا۔ "تم کتاب پر سے نظر ہٹا کر دیکھو تو پتا چلے۔"

"لو دیکھ لیا۔" وہ چاروں طرف دیکھتی اور شاخ سے کوئی پکا ہوا سیب توڑ کر کھانا شروع کر دیتی۔

"کیا دیکھا! اب اگر تمھارے پاس بیٹھ کر باتیں کرنا چاہوں تو جناب وہ مالی صاحب کھڑے پانی دے رہے ہیں، اور وہ ان کی بیٹی گھاس پر گری ہوئی خوبانیاں چن رہی ہے۔ صاحب زادے ڈنڈا لیے کونے میں بھینس ہنکائے لیے چلے جا رہے ہیں۔ اور وہ مزدور کنواں صاف کرنے میں مصروف ہیں۔"

"سب اپنا اپنا کام کر رہے ہیں، تم اپنا کام کرو۔"

"مثلاً — کیا کروں؟"

"یہاں بیٹھ کر پڑھ لو۔"

"پڑھ لو! یہ خوب رہی۔ کیا میں یہاں پڑھنے آتا ہوں۔ وہاں پڑھا پڑھا کر بھُرکس نکال دیتے ہیں۔ یہاں میں آتا ہوں تم سے باتیں کرنے کے لیے۔"

"تو کرو...... ان لوگوں تک تو آواز نہیں جائے گی۔"

"آواز ہی کی کیا بات ہے — فرض کرو میں تمھارا ہاتھ پکڑنا چاہوں اور اتنا خوب صورت ہاتھ کس کا دل نہیں چاہتا پکڑنے کو۔"

''اوہو، ہزار دفعہ پکڑ کر اِدھر اُدھر اٹھاتے بٹھاتے ہو سب کے سامنے۔''

''وہ اور بات ہوتی ہے۔ فرض کرو میں اسے چومنا چاہوں اور اتنا خوب صورت ہاتھ — کس کا دل نہ چاہے گا چومنے کو۔''

عدنان کی ایسی باتوں پر وہ نہ چاہتے ہوئے بھی سرخ پڑ جاتی لیکن دوبارہ کتاب پر نظریں جما کر ظاہر کرتی جیسے وہ اس کی بات سن ہی نہیں رہی ہے۔ عدنان کنکھیوں سے دیکھتے ہوئے بولے جاتا، ''ایک تو پہاڑ پر ویسے ہی privacy نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ میلوں سے آپ لوگوں کو اور لوگ آپ کو دیکھ سکتے ہیں۔ گھر کا ہر کونا کہیں نہ کہیں سے نظر آتا ہے اور مزے کی بات یہ ہے کہ آپ کو پتا بھی نہیں کہ کہاں سے کیا نظر آتا ہے۔'' عدنان ظاہر کرتا کہ ملٹری اکیڈمی کا کول میں ہونے کے ناتے وہ بڑی بڑی باتیں کرنے کا اہل ہے۔

''ٹھیک ہے، پہاڑ پر رہنے والے سب شیشے کے گھروں میں رہتے ہیں۔ ان کو چاہیے کہ ایک دوسرے پر پتھر نہ پھینکیں۔'' زری کہتی۔

''دیکھا — زیادہ کتابیں پڑھنے سے آدمی کتابی باتیں کرنے لگتا ہے۔ چلو اٹھو، ہم پہاڑ پر چل کر دوسری طرف جا کر بیٹھیں گے۔''

''گلشن کو بلاؤ، چاچا جی کہتے ہیں تم سب ساتھ رہا کرو۔''

''ہاں، ایک تو یہ مصیبت ہے۔'' وہ کہتا اور جیسے بادلِ نخواستہ گلشن اور گلگونہ کو بلانے چلا جاتا۔

گھر کے عین نیچے پہاڑ تھا۔ جس پر چڑھنا ان کا روز کا معمول تھا۔ جب وہ کتاب لے کر چلتی تو گلشن اور عدنان اس پر ہنستے۔ زری نے کئی دفعہ محسوس کیا تھا کہ عدنان جو تنہائی میں ہمیشہ بے حد رومانوی ہو جاتا تھا، دوسروں کے سامنے اس کا مذاق اڑانے سے کبھی نہیں چوکتا تھا۔ اور گلشن جو بظاہر اسے خوش رکھنے کی کوشش کرتی تھی اندر ہی اندر اس سے جلتی تھی۔

(اس نے سنا تھا کہ بچپن میں زیب قادری کی موت کے دوسرے دن جب وہ بیمار پڑ گئی تھی اور صحت یاب ہونے کے بعد بے حد چڑ چڑی ہو گئی تھی، ان دنوں ساجد ماما اپنے بیوی بچوں کے ساتھ اسے دیکھنے آئے تھے۔ جاتے وقت بے بے نے بڑی لجاحت سے ان سے کہا تھا، ''لالہ! تم سے ایک بات کہوں، مانو گے؟''

''ہاں کیوں نہیں، سو دفعہ کہو، ماننے والی ہوئی تو ضرور مانوں گا۔''

''اگر نا کر دیا تو؟''

''مجھے معلوم ہے تم کوئی ایسی چیز نہیں مانگو گی جو میں نہ دے سکوں۔''

''ہاں تم دل ذرا بڑا کرلو تو دے بھی سکتے ہو اور میں یقین دلاتی ہوں کہ تم سے بڑھ کر اسے چاہوں گی، اس کی حفاظت کروں گی۔''

''پروہ ہے کیا؟''

''زری کو دیکھ رہے ہو، ابھی بیماری سے اٹھی ہے۔ ہر وقت چپ چاپ رہتی ہے۔ تم گلشن کو میرے پاس چھوڑ دو، زری کی ہم عمر ہے اس کا دل لگ جائے گا۔''

''میری طرف سے تو رکھے رکھو جب تک دل چاہے، میری بیٹی تمھاری بیٹی، ایک ہی بات ہے، پر اپنی بھابی سے پوچھ لو تو اچھا ہے۔''

بھاوج نے ہنس کر معنی خیز انداز میں کہا تھا ''اپنی بیٹی دوں گی تو بدلے میں تمھارے بیٹی لوں گی — تم اب لے لو، میں بڑی ہونے کے بعد لے جاؤں گی۔''

سب ہنس دیے تھے اور یوں گلشن زری کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ بظاہر گلشن اور زری میں کوئی فرق نہیں تھا۔ ایک سا کھاتی پہنتی تھیں، ایک ہی اسکول میں جاتی تھیں مگر بچوں میں جو چھٹی حس ہوتی ہے اس نے گلشن کو بتا دیا تھا کہ وہ زری کی مصاحبت کرتی ہے اور یہ کہ زری اگر اس سے خوش نہ ہو تو بہت ممکن ہے وہ یہاں نہ رہ سکے۔ گلشن یہاں رہنا چاہتی تھی اس لیے کہ باوجود زیادہ پیسا ہونے کے ان کا رہن سہن اتنا شاہانہ نہ تھا۔ گھر میں بہت سے بہن بھائی تھے اور بچوں کے جو چونچلے یہاں اٹھائے جاتے تھے، دیہات میں ان کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اس زمانے میں چاچا عمر خاں ان دونوں بچیوں کو دیکھ کر کہتے تھے کہ زری میں ذہانت مگر بھولپن ہے۔ گلشن میں ذہانت نہیں ایک خاص قسم کی زیرکی اور تیزی ہے جو ہمیشہ اس سے ایسے کام کرواتی ہے جو اس کے اپنے مفاد میں ہوں۔

''کتاب تو میں ضرور لوں گی، کہانی ایسے دل چسپ موڑ پر ہے کہ میں اسے چھوڑ نہیں سکتی۔'' زری کہتی۔

''تمھیں کیا معلوم — تمھارے آس پاس کتنی کہانیاں کون سے موڑوں پر ہیں۔'' عدنان گلشن کی طرف دیکھ کر مسکراتا۔ زری کچھ نہ سمجھتی۔ گلشن ہنس کر بات ٹال جاتی۔

لہر دار پگڈنڈی پر چلتے ہوئے وہ مزدوروں کو نئے تعمیر ہونے والے بنگلوں کے لیے نیچے سے پانی لے جاتا دیکھتے۔ ان کے کاندھوں پر رکھے ڈنڈے لٹکتے بڑے بڑے ٹینوں سے پانی چھلک کر ان کے کپڑوں اور ٹانگوں کو تر بہ تر کر دیتا۔ پنڈلی کی نسیں بوجھ سے ابھری ہوتیں اور پیروں کے تلوؤں سے سرخ مٹی مہندی کی طرح چمٹی ہوتی۔ زری کسی چیڑ کے سائے میں تنے سے کمر لگا کر کھڑی ہو جاتی۔

''پہاڑ پر کتنی محنت سے تو مکان بنتے ہیں اور پھر خالی پڑے رہتے ہیں۔'' وہ کہتی۔

''تمھیں تکلیف ہوتی ہے؟'' گلشن چھیڑتی۔

''ہاں ہوتی ہے۔'' زری پورے خلوص سے جواب دیتی۔

''انسان پیدا ہوتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ کیا یہ دکھ کی بات نہیں ہے؟'' گلشن ہنس کر کہتی۔

''ہاں یہ بھی دکھ کی بات ہے۔'' زری بدستور سنجیدہ رہتی۔

''آدمی کھانا کھاتا ہے اور تھوڑی دیر بعد پھر بھوکے کا بھوکا ــــ جیسے میں بے چارہ! کیا یہ غم کی بات نہیں ہے۔'' عدنان ہنسا۔ ''میرے خیال میں خالی پیٹ ہونے سے بڑا دکھ کوئی اور نہیں ہے ــــ کیوں زری؟''

''جی ہاں خالی پیٹ ہونے سے بڑا دکھ کوئی اور نہیں ہے، لیکن یہ لطیفہ نہیں ہے جس پر آپ دونوں ہنس رہے ہیں۔'' زری جوش میں آجاتی۔ ''کبھی خالی پیٹ رہے ہیں آپ لوگ؟ کبھی خالی پیٹ لوگوں کو دیکھا ہے؟'' ایسی ہی بات پر چڑ کر وہ ان کا ساتھ چھوڑ دیتی اور نالے کے ساتھ ساتھ اترتی نیچے چلی آتی۔ عدنان اور گلشن کی ہنسی کی آواز آتی رہتی۔ وہ سمجھتے تھے زری جان بوجھ کر چاچا جی کی نقل میں ایسے مسئلے اٹھاتی ہے اور ایسی باتیں دیکھتی ہے جو انھیں نظر بھی نہیں آتیں۔

گہرے نالے کے اندر سے جھانکتے سرسبز درخت زری کو بہت بھلے لگتے تھے۔ ہر سال بارش کا پانی اس نالے کو کچھ اور گہرا کر دیتا تھا۔ پرانے درخت کچھ اور بڑے ہو جاتے تھے۔ چند اور درخت پھوٹ آتے تھے۔ وہ اس بہتے پانی کے ساتھ چلتی زیب قادری کی قبر پر نکل آتی۔ اس کنج میں چنار، سرو اور شہتوت کے اتنے درخت تھے کہ باہر سے قبر نظر نہ آتی تھی۔ یہ باغ کا ایک دور دراز کونا تھا۔ قبر کے سرہانے بیدِ مجنوں کا لاغر درخت کھڑا تھا جس کی خوب صورت شاخیں ہوا سے قبر پر دھیرے دھیرے پھرتی تھیں جیسے سوکھے پتوں کو صاف کر رہی ہوں۔ پکے شہتوت قبر پر آہستہ سے یوں گرتے تھے جیسے اسے تھپک رہے ہوں۔ زری چپ چاپ اس کنج میں بیٹھی پڑھتی رہتی۔ یوں لگتا جیسے آنٹی قادری اپنے کمرے میں لکھنے میں مصروف ہوں اور وہ اپنا کام کر رہی ہو۔ چاچا جی کی ایک، کینوس کی پرانی کرسی سدا یہاں پڑی رہتی تھی۔ وہ شفیق گود کی طرح ہر آدمی کو جھولی میں بھر لیتی تھی۔ اس کرسی پر جھولتے ہوئے وہ گھنٹوں کتاب پڑھتی رہتی تھی۔

ان کتابوں کا چسکہ بھی تو اسے چاچا جی نے ہی لگایا تھا۔ بچپن میں اسے کہانیاں سناتے تھے اور کہانیوں کی کتابیں لا کر دیتے تھے۔ اس عمر میں اسے کورس کی کتابیں پڑھتے دیکھ کر کہتے تھے، ''دوسری کتابیں بھی پڑھا کر ــــ ایلس اِن ونڈر لینڈ اور سنڈ ریلا ــــ اور گلیورز ٹریول اور الف لیلہ وغیرہ۔''

''چاچا جی، یہ تو جادو واد و کی کتابیں ہیں، میں تو اب بڑی ہو گئی ہوں۔''

''انسان سب سے زیادہ بچہ اس وقت ہوتا ہے جب وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ بڑا ہو گیا ہے — اور یہ جادو کی بات کیا تو نے کی؟ تو مجھے یہ بتا کہ جادو کہاں نہیں ہے؟ کیا قدرت کا یہ سارا کارخانہ تجھے جادو نہیں لگتا۔ مجھے تو یہ سب کچھ طلسماتی لگتا ہے۔ آدمی ایک حقیر سا بیج ڈالتا ہے اور اس سے بڑا سا درخت بن جاتا ہے اور ایک درخت میں ایسے سیکڑوں ہزاروں پھل اور کروڑوں بیج پیدا ہو جاتے ہیں۔ کیا یہ جادو نہیں ہے؟ ان کہانیوں میں کیا ہوتا ہے۔ یہی نا کہ چھڑی سے چھوا تو آدمی تو تا بن گیا یا پھول شہزادی بن گیا یا آئینہ بولنے لگا۔ مگر یہ بتا کہ بچے کی پیدائش اس سے بڑا جادو نہیں ہے۔ دو آدمی ایک دوسرے سے ملتے ہیں۔ بعض دفعہ ایک دوسرے کو دیکھا تک نہیں ہوتا اور ایک ہنستا کھیلتا بچہ پیدا ہو جاتا ہے۔ شرما کیوں رہی ہے۔ اس میں شرم کی کیا بات ہے؟ انسانی بچہ بھی اسی طرح پیدا ہوتا ہے جیسے درخت، کیڑے مکوڑے، پرندے اور جانور پیدا ہوتے ہیں۔ مجھے تو یہ سب جادو لگتا ہے۔ آدمی غور کرے تو ساری ہی باتیں تعجب کی ہیں، نہ کرے تو کچھ بھی نہیں۔ آدمی بھی اس بلی کی طرح ہو سکتا ہے جو کھا پی کر سارا دن پڑی سوتی رہتی ہے۔ کبھی یہاں، کبھی وہاں۔''

چاچا جی کی باتیں ان دنوں مضحکہ خیز سی لگتی تھیں، ہنسی آتی تھی، اب محسوس ہوتا ہے کہ ان میں کتنی سچائی تھی۔ مگر وہ چاچا جی جو اتنے عقل مند اور بہادر لگتے تھے، جب عدنان کو گھوڑے پر آتا دیکھتے تو ان کا رنگ فق ہو جاتا۔

''عدنان پتر! گھوڑا نہ دوڑایا کر، خطرناک جانور ہے۔''

''گھوڑا اور خطرناک! ہا ہا ہا — '' عدنان ہنستا۔ ''چاچا جی گھوڑے سے زیادہ نیک اور شریف جانور تو کوئی ہے ہی نہیں البتہ سوار کو شیر ہونا چاہیے۔ سوار اناڑی ہو تو گھوڑا اپنے اوپر بیٹھنے نہیں دیتا، پھینک دیتا ہے۔''

''ہاں پھینک دیتا ہے جبھی تو کہہ رہا ہوں، نہ بیٹھا کر — کیا خبر کون گھوڑا کیسا ہے؟''

''نہیں چاچا جی — اپنے سوار کے نیچے ہر گھوڑا مسکین ہوتا ہے گدھے کی طرح۔ ہمارے استاد نے یہی بتایا ہے۔''

''نہیں بیٹا، تو نہیں جانتا۔ جا واپس چلا جا۔ کوئی اور شوق پیدا کر۔''

زری نے دیکھا تھا کہ جب بھی گھوڑوں کا ذکر آتا چاچا جی یوں ہی نئے لگام پڑے گھوڑے کی طرح بدکے رہتے۔ شاید اپنی منگیتر کے گھوڑے سے گر کر ہلاک ہونے کے بعد وہ تمام عمر گھڑ سواری کا خوف دل سے نہ نکال پائے۔

اور اس دن بھی عدنان گھوڑے پر سوار ہو کر ہی آیا تھا۔ وہ دن — جس کی تفصیلات زری کے ذہن میں گزرے ہوئے کل کی طرف صاف تھیں۔ سہ پہر کا وقت تھا۔ وہ سیمنٹ کے ایک بڑے سے گملے کی آڑ میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔ پہاڑ کی ہلکی دھوپ میں دو گلہریاں منڈیر پر بیٹھی سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ اس کا دل بلاوجہ بوجھل سا تھا اور کتاب میں نہیں لگ رہا تھا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا۔ سامنے کا چیڑ بھوسلا ہو رہا تھا، شاید اپنے تنکے جھاڑ رہا تھا۔ چنار کا بڑا سا درخت ہرے بھرے پتوں کے ساتھ طمانیت سے کھڑا تھا، جیسے بھرے پرے گھر کا صاحبِ خانہ، جیسے اس کے دا جی۔ ایک کوا بے نیازی سے پر مارتا گزرا۔ ایک بلبل وِیو سے اڑی اور سَرو کے سنورے ہوئے ستون میں چھپ گئی۔

یکایک اس کی نظر صدر دروازے کی طرف اٹھی۔ عدنان ایک لمبی چوڑی مشکی گھوڑی پر سوار چلا آ رہا تھا۔ گیٹ پر پہنچ کر وہ رکا، چاہتا تھا کہ کسی ملازم کو آواز دے۔ زری نے بھی چاروں طرف دیکھا کہ مالی یا چوکیدار دکھائی دے تو اسے اس طرف متوجہ کرے۔ آس پاس کوئی نظر نہ آیا اور اتنی ہی دیر میں کہ اس نے دوبارہ نظر اٹھائی تو دیکھا کہ چاچا جی گیٹ پر کھڑے ہیں۔ ان کی آنکھوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ اس نے زندگی میں کبھی چاچا جی کو اتنا غصے مین نہ دیکھا تھا۔ کسی خاموش ویسٹرن فلم کی طرح (اس تک باتوں کی آواز نہیں آ رہی تھی)۔ اس نے دیکھا کہ عدنان گھوڑے سے اترا، گھوڑے کی لگام صدر دروازے کے ستون کے ساتھ باندھی اور چاچا جی کے ساتھ اندر چلا گیا۔ ابھی وہ سوچ ہی رہی تھی کہ اندر جا کر صورتِ حال کا جائزہ لے کہ اس نے عدنان کو گھر سے باہر نکلتے دیکھا۔ اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ دائیں بائیں دیکھے بغیر وہ تیز تیز چلتا گیٹ تک آیا۔ گھوڑی کی لگام تھام کر اس پر بیٹھا اور ہوا ہو گیا۔

اس کے بعد زری نے عدنان کو ایبٹ آباد میں نہیں دیکھا۔ وہ حیران ہوتی رہی کہ اس روز چاچا جی کیا محض عدنان کے گھوڑے پر بیٹھ کر آنے سے اتنے خفا تھے۔ اور شاید یہ واحد واقعہ تھا جس کے بارے میں چاچا جی سے کچھ پوچھنے کی ہمت نہ ہوئی اور انھوں نے بھی بہت عرصے تک کچھ نہ بتایا۔ چند دن بعد سننے میں آیا کہ عدنان ملٹری اکیڈمی چھوڑ کر چلا گیا ہے۔ بعض لوگ کہتے تھے اس کی رپورٹیں اچھی نہ تھیں، اسے نکال دیا گیا ہے۔ زری سوچتی رہتی کہ اگر اسے جانا تھا تو وہ سب سے مل کر کیوں نہ گیا۔

اس کے بعد بہت عرصے تک، جب وہ گھوڑے پر یا ویسے ہی کسی ایسے لڑکے کو دیکھتی جس کا حلیہ عدنان جیسا ہوتا تو لگتا جیسے دل کی ایک دھڑکن تھوڑی، بہت تھوڑی دیر کو رکی ہو۔ زری دل کو سختی سے یاد دلاتی کہ عدنان نامی شخص کب اس کی زندگی میں داخل ہوا تھا کہ اس کے جانے کی یا دوبارہ ملنے یا نہ ملنے کی اہمیت ہو — دل اس بات پر صاد کر کے فرماں برداری سے اپنی پہلی رفتار سے چلنے لگتا۔

(منظر بدلتا ہے)

——پہلا سین——

(آسٹریا کے شہر سالز برگ میں مشہور قلعے کا منظر۔ قلعہ بہت بلندی پر واقع ہے۔ جہاں تک بجلی کی ٹرالی یا بہت سی بڑی بڑی آرام دہ سیڑھیاں چڑھ کر پہنچا جاتا ہے۔ اس بلندی پر قلعے کے اندر ایک میدان جس کے چاروں طرف مختلف کمرے ہیں، موجود ہے۔ دائیں طرف چیپل کی دیوار ہے۔ سامنے اُس آرٹسٹ لڑکی کے کمرے کا تھوڑا سا حصہ نظر آتا ہے جو یہاں رہتی ہے اور سریمک میں خوب صورت ٹائلز بناتی ہے۔ میدان کے عین درمیان پرانی وضع کا ایک کنواں ہے جس کی اونچی منڈیر، پانی نکالنے کی چرخی اور ٹین کی چھت کے پس منظر میں چند سیاح تصویریں کھنچوا رہے ہیں۔ کچھ قلعے کے سامنے کی دیوار کے پاس کھڑے ہیں جہاں سے سالز برگ کے دور دور تک پھیلے ہوئے گھاس کے نظر فریب میدان، دریا کے اوپر بنے ہوئے طرح طرح کے پُل اور مختلف عمارات نظر آتی ہیں جو زیادہ تر پرانی وضع کی ہیں۔ ایک چرچ کے گنبد، جیسے غباروں میں ہوا بھر کر مختلف شکلیں دے کر باندھ دیا گیا ہو۔ زری اسی جگہ کھڑی اس منظر کو دیکھ رہی ہے۔ ایک آواز سنائی دیتی ہے۔)

اجنبی آواز: ''ہیلو زری!''

زری: ''حیرت سے پلٹ کر دیکھتی ہے۔ چہرے کے تاثرات سے اندازہ ہوتا ہے کہ پہلی نظر میں وہ اجنبی شخص کو نہیں پہچانی پھر لمحے بھر میں پہچان لیتی ہے۔ محسوس ہوتا ہے جیسے اس شخص کی یہاں ملنے کی قطعی توقع نہ تھی اور اس شخص سے مل کر زری کو خوشی کم ہوئی ہے، حیرت زیادہ۔ اس کے بعد شاید رنج یا صدمہ یا شاک۔ شاید 'صدمہ' اس لفظ کو بیان نہ کر سکے کہ صدمے میں حیرت کا عنصر کم ہوتا ہے۔ بہر

حال زری صرف اس شخص کی طرف دیکھتی ہے اور کچھ نہیں کہتی۔)

اجنبی: ''میں عدنان ہوں۔ مجھے پتا چلا تھا کہ تم سالز برگ آئی ہوئی ہو۔ میں جرمنی سے صرف تم سے ملنے آیا ہوں — بالکل اتفاق سے مجھے معلوم ہوا۔''

زری: (خاموش رہتی ہے۔ اس نے اپنے شاک پر قابو نہیں پایا ہے۔)

اجنبی: (جواب عدنان بن چکا ہے) ''میں کئی دن سے تمھیں ڈھونڈ رہا تھا۔ بدقسمتی سے مجھے یہ پتا نہ چل سکا کہ تم کس سلسلے میں یہاں آئی ہو۔ اسی لیے تمھیں تلاش کرنے میں دقت ہوئی خدا کا شکر ہے کہ تم یہاں اتفاقاً مل گئیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ اگر طلب صادق ہو......''

زری: (بات کاٹ کر، اس ساری گفتگو کے سب سے بے ضرر حصے کو تھام کر) ''میں سیاحت کے سلسلے میں ہونے والا ایک کورس کر رہی ہوں۔''

عدنان: (انگریزی زبان میں)۔ ''گڈ! یہ تو خاصا طویل کورس ہوتا ہے تم سے ملاقاتیں رہیں گی۔''

زری: (شاک کے آثار دوبارہ چہرے پر نمودار ہوتے ہیں) ''کس سلسلے میں؟''

عدنان: (حیرت سے) ''سلسلہ — کیا ہم ایک دوسرے کو نہیں جانتے! ہم پرانے دوست نہیں ہیں؟''

زری: (برف جیسا ٹھنڈا لہجہ) ''نہیں، اب نہیں ہیں۔''

عدنان: (پُر جوش، جیسے چاہتا ہو کہ زری کو جھنجھوڑے لیکن کچھ سوچ کر باز رہتا ہے، اردو میں بولنا شروع کر دیتا ہے) ''خدا کا واسطہ — زری، کیا ہو گیا ہے تمھیں۔ بچپن کی ایک بھول — لغزش، جو کچھ بھی تم کہو۔''

زری: (جلدی سے) ''اس سلسلے میں اب کچھ مت کہو، بالکل نہیں۔''

عدنان: ''شکر اللہ تعالیٰ کا کہ تم اس بات کو بھول گئی ہو، یا بھولنے پر تیار ہو۔''

زری: ''یہ میں نے کب کہا۔ بعض باتیں نہ زبردستی بھلائی جا سکتی ہیں، نہ زبردستی یاد رکھی جا سکتی ہیں — اچھا خدا حافظ۔''

(ایک دم پلٹ کر کنویں کی سمت بڑھتی ہے۔ عدنان اس کے ساتھ چلتا ہے۔ اب وہ اردو بولتا ہے کہ دوسرے سیاح نہ سمجھ سکیں)

عدنان: ''آخر مجھے پتا تو چلے، تم لوگ، چاچا جی، آخر چاہتے کیا ہو؟ میرا سارا کیریئر تباہ ہو گیا۔ کیا ساری عمر میں جلاوطن رہوں گا، میرا بھائی، چاچا جی، کوئی مجھے معاف نہیں کرے گا؟''

زری: ''یہ اُن سے پوچھنے کی بات ہے۔''

عدنان: ''اور تم!— میں ہمیشہ تمھارے ساتھ زندگی گزارنا چاہتا تھا۔ کیا تم مجھ سے شادی نہیں کروگی؟ چاچا جی کی بھی تو یہی خواہش تھی۔''

زری: ''اگر تمھیں شادی کرنا ہے تو اس سے کرو۔ اب چاچا جی کی بھی یہی خواہش ہے۔''

عدنان: ''یہ نہیں ہوسکتا۔ بچپن کی ایک غلطی کا خمیازہ ساری عمر کی سزا تو نہیں ہوتی۔''

زری: ''ہو بھی سکتی ہے— یہ تو جرم پر منحصر ہے۔''

(تیزی سے چلتی ہوئی چیپل میں داخل ہوتی ہے جہاں سروس ہو رہی ہے۔ پیچھے کی بنچ پر ایک خاتون کے پاس سر جھکا کر بیٹھ جاتی ہے۔ پادری کی آواز سنائی دے رہی ہے۔)

پادری: ''کیا آپ لوگ خدا کے حضور جانے کے لیے تیار ہیں؟ اگر آپ ابھی مر جائیں تو آپ کا 'ابد' کہاں اور کیسے گزرے گا۔ جنت الفردوس میں یا جہنم زار میں— خداوند مسیح کے ساتھ یا شیطان مردود......''

(عدنان تھوڑی دیر دروازے میں کھڑا رہتا ہے پھر لوٹ جاتا ہے۔)

—دوسرا سین—

(موزارٹ کا گھر، جو اب اس کا میوزیم ہے۔ نچلی منزل کے کمرے میں اس کے لینڈ لارڈ کا فرنیچر اسی طرح موجود ہے۔ موزارٹ کا پیانو اور وائلن بھی۔ دیواروں پر اس کے مشہور اوپیرا کی تصویریں لگی ہوئی ہیں۔ دیواروں کے ساتھ چاروں طرف ان اوپیرا کے خوب صورت مناظر کے ماڈل بنے رکھے ہیں۔ زری ایک ایک ماڈل کو دیکھ کر حیران ہو رہی ہے۔ ان میں سمندر، سمندر کا کنارہ، اونچے اونچے شان دار محلات کے بیرونی اور اندرونی حصے تمام تر سجاوٹ کے ساتھ موجود ہیں۔ زری کو یاد آتا ہے کہ مشہور انگریزی فلم ''Sound of Music'' میں جو سالزبرگ میں فلمائی گئی تھی، نہ صرف مشہور قلعے کے مختلف حصے دکھائے گئے ہیں بلکہ یہ ماڈل بھی بطور سین استعمال کیے گئے ہیں۔ موزارٹ کی تصویر کے سامنے کھڑی ہو کر اسے غور سے دیکھ رہی ہے کہ کوئی شخص اس کے کندھے پر آہستہ سے ہاتھ رکھتا ہے۔ پلٹ کر دیکھتی ہے جیسے اسے معلوم ہے کہ وہ کون ہے اور اسے نظرانداز کرنے کے لیے تیار ہے)

عدنان: ''ہیلو''

زری: ''ہیلو'' (آگے بڑھ کر سیاحوں کے درمیان گم ہونے کی کوشش کرتی ہے)

عدنان: ''ایک منٹ۔ میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔''

زری: (وہیں کھڑے ہو کر) ''کہو۔''

عدنان: ''ذرا ایک طرف چل کر۔ کیا یہ بہتر نہیں رہے گا کہ ہم موزارٹ پلازا میں چل کر بیٹھیں تم نے موزارٹ کا مجسمہ دیکھا ہے جس کا کوٹ اور جوتے کائی سے سبز ہو رہے ہیں۔''

زری: ''فی الحال نہیں، ہم سیاحوں کی راہ میں حائل ہو رہے ہیں۔ اچھا اُدھر چلو اس کونے میں پیانو کے پاس۔''

(دونوں قدرے ایک طرف محراب کے نیچے رکھے ہوئے پیانو کے پاس جا کھڑے ہوتے ہیں)

عدنان: ''میں اتنی بہت سی باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔ آخر میرے پیچھے کیا ہوا؟ میری ہمت ہی نہیں ہوئی کسی کو لکھنے کی۔ خدا کی قسم زری، تمھیں نہیں معلوم میں کس کرب سے گزرا ہوں۔''

زری: (بے نیازی سے) ''کرب نہیں تجسس اور بس۔''

عدنان: ''بس نہیں، میں سب کچھ کرنے کو تیار ہوں مگر کوئی مجھے کچھ بتائے تو۔ تم لوگ تو بالکل بچے بن گئے ہو۔ ایسا ہو جاتا ہے۔ کوئی قیامت نہیں آ گئی۔ مجھے بتاؤ ایسی کیا بات ہے جو تم مجھ سے اتنی ناراض ہو۔ میں اپنی غلطی تسلیم کر رہا ہوں۔''

زری: ''جہاں تک میرا سوال ہے وہ باب بند ہو چکا ہے۔ ہلکا یا گہرا، جو زخم تھا وہ بھر گیا ہے۔ شکر خدا کا، ایک عمر میں زخم جلد بھر جاتے ہیں۔''

عدنان: ''پھر بھی تم مجھے قبول کرنے کو تیار نہیں ہو؟''

زری: ''اس لیے کہ اس زخم کے اندر میرے پچھلے احساسات بھی بند ہو گئے ہیں۔ میں وہ ساری چھوٹی چھوٹی باتیں، بچپن کی بے معنی باتیں سمجھ کر بھول چکی ہوں۔ ہاں اگر تم چاچا جی سے کچھ کہنا چاہو تو مجھے بتا دو یا خط لکھ کر دے دو۔ جب میں جاؤں گی تو خط ان کو دے دوں گی۔''

عدنان: ''مگر ان کی سوچ کا تو پتا چلے۔ وہ کیا چاہتے ہیں؟ میں انھیں نئے سال کی مبارک باد کے کارڈ بھیجتا رہا ہوں تاکہ انھیں میرا پتا معلوم رہے اور وہ چاہیں تو مجھ سے رابطہ قائم کر لیں۔ مگر نہ انھوں نے نہ احسن بھائی نے کبھی مجھے یاد کیا۔''

زری: ''میں احسن بھائی کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ البتہ چاچا جی بااصول آدمی ہیں۔ انھوں نے تمھارے سامنے ایک راہ رکھی تھی، تم نے اس پر چلنے سے انکار کر دیا۔ ہو سکتا ہے چند دن بعد یہ راہ بھی بند ہو جائے۔''

عدنان: ''اس کی شادی سے؟''

زری: ''ہاں۔''

عدنان: ''مگر تم مجھے کبھی قیامت تک معاف نہیں کرو گی، میں راندۂ درگاہ ہوں۔ میں دنیا بھر میں

سب سے زیادہ برا انسان ہوں۔ میں شیطان سے بھی گیا گزرا ہوں۔"

زری: "کیا میں نے یہ سب کہا؟"

عدنان: "اگر تم یہ سب کہہ دیتیں، ایک دفعہ اپنا غصہ اتار لیتیں تو شاید مجھے معاف کر سکتیں۔"

زری: "میں نے اپنا دل ٹٹول لیا ہے۔ بہت پرانی بات ہوگئی ہے بعض سوکھے درخت دوبارہ ہرے ہو جاتے ہیں لیکن سوکھے سڑے پھل دوبارہ تازہ نہیں ہو سکتے۔ زیادہ کچا پھل درخت سے توڑ لو تو وہ پکتا نہیں سڑ جاتا ہے۔"

عدنان: "یہ مکالمے! —— اردو فلم نہیں چل رہی زری۔ زندگی کو دیکھو یہ بڑی تلخ حقیقت ہے۔ تم مغرب کے لوگوں کو دیکھو، کیسی کیسی باتیں نظر انداز کر دیتے ہیں، بھول جاتے ہیں، معاف کر دیتے ہیں۔"

زری: "مگر کسی کی زبردستی سے تو نہیں۔ وہ ان کے کلچر کی کشادہ دلی ہے یا جو کچھ بھی ہے، ہم اپنے خون سے مجبور ہیں۔ احسن بھائی اور ثروت باجی پر میرا کوئی اختیار نہیں ہے، چاچا جی میری بات ضرور مان لیتے ہیں لیکن ہر بات نہیں۔ میں تمھارے لیے یہ کر سکتی ہوں (پرس کھول کر ایک کارڈ نکالتی ہے) قلعے میں جہاں ہم اس دن ملے تھے، ایک آرٹسٹ لڑکی رہتی ہے۔ وہ انگریزی اور فرانسیسی سیکھنا چاہتی ہے تاکہ سیاحوں سے بات چیت کر سکے۔ خوب صورت لڑکی ہے۔ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔ وہ بہت سی باتیں معاف کر سکتی ہے۔ تم ویک اینڈ پر آ کر اس کے ساتھ رہ سکتے ہو۔ وہ تمھارے شہر جا کر یقیناً خوش ہوگی۔ مل کر دیکھ لو، زبردستی نہیں ہے (کارڈ بڑھاتی ہے۔ عدنان ہاتھ آگے نہیں بڑھاتا۔ کارڈ زمین پر گر جاتا ہے) خدا حافظ۔" (اوپر کی منزل کے زینے کی طرف بڑھتی ہے۔ چند سیڑھیاں چڑھ کر اندھیرے زینے میں غائب ہونے سے پہلے لمحے بھر کو جھانک کر دیکھتی ہے۔ عدنان کچھ دیر خاموش کھڑا رہتا ہے پھر جھک کر کارڈ اٹھاتا ہے اور آہستہ آہستہ دروازے کی طرف بڑھ کر زری کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔)

ایبٹ آباد اب نزدیک آ چکا تھا۔ زری چاچا جی سے ملنے کی خوشی دل کے پور پور میں محسوس کر رہی تھی۔ ماضی کے سالز برگ اور عدنان سے فی الحال اس نے معذرت کر لی تھی۔ وہ خود کو کئی مرتبہ یقین دلا چکی تھی کہ اب ان یادوں کی اس کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ اگر بن بلائے مہمان کی طرح وہ پھر بھی آتی رہنا چاہیں تو وہ مجبور ہے۔ جیپ بادلوں کے نرغے سے نکلنے کے بعد خاصی تیز چلی تھی۔ اب وہ چاچا جی کی کوٹھی کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے۔ زری کو پچھلے برآمدے کی اور چاچا جی کے سونے کے کمرے کی روشنی صاف نظر آ رہی تھی۔

چاچاجی سامنے کے برآمدے میں بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔ مختلف شہروں میں وکلا، طلبہ، سیاسی کارکنوں اور عوام کے احتجاجی جلوس......

''ملک میں ہنگامی حالت جاری رکھنے کا کوئی جواز نہیں۔'' مغربی پاکستان ہائی کورٹ بار میں ایئر مارشل اصغر خاں کی تقریر۔

سیاسی راہ نماؤں کو رہا کرنے کا مطالبہ۔

راول پنڈی فائرنگ کے خلاف سوموار کو چوک فوارہ گجرات میں طالب علم مظاہرہ کر رہے ہیں۔
طالب علم لیڈروں کی پریس کانفرنس۔

انھوں نے جیپ کی آواز سنی۔ پہاڑیوں میں گونجتی ایک خاص گڑگڑاہٹ جیسے بادل گرج رہے ہوں۔ یہ آواز ان کے دروازے پر آ کر ختم ہوئی۔ پھر کچھ باتوں کی آواز آئی — چند سائے باغ میں نظر آئے۔ ذرا دیر بعد انھوں نے دیکھا، چوکیدار کے پیچھے دو عورتیں گرم کپڑوں میں ڈھکی چھپی اور ایک مرد ان کی طرف چلا آ رہا ہے۔ چاچاجی کینوس کی جھولتی کرسی سے اٹھے اور آگے بڑھ کر دیکھنے کی کوشش کی۔ اتنی دیر میں زری ہنستی ہوئی آ کر گلے لگ گئی۔ چاچاجی نے فرطِ انبساط سے ایک نعرہ لگایا۔ زری کی پیشانی اور بالوں کو چوما۔ پھر نرگس کے سر پر ہاتھ پھیر کر شمس الرحمٰن سے ہاتھ ملایا۔ اس دوران زری جلدی جلدی ان دونوں کا تعارف کرواتی رہی۔ اس کے بعد وہ دونوں کو اندر لے گئی۔ ان کو کمرے دکھائے۔ خانساماں کو کھانے کے بارے میں ہدایات دیں۔ چاچاجی سے پھوپھاجی کے نام

خط لکھوا کر ڈرائیور کو دیا، اور پھر واپس چاچا جی کے پاس آن بیٹھی۔ چاچا جی اب خاصے نحیف ونزار ہو چکے ہیں۔ زری نے دل میں سوچا۔

''زری پُتر، بہت دن انتظار کروایا تُو نے، کیسی ہے؟ —— خط بھی بہت کم لکھتی ہے تو۔''

''کیا کروں چاچا جی، فرصت نہیں ملتی —— مگر آپ یقین کریں کہ میں آپ کو بے حد یاد کرتی ہوں۔''

''ہاں مجھے یقین ہے، میں خود جو تجھے اتنا یاد کرتا ہوں۔ اچھا اب کچھ میٹھی میٹھی پرانی باتیں کر۔'' انھوں نے پیار سے اس کا ہاتھ تھپتھپایا۔

''چاچا جی! اتنی بہت سی باتیں، اتنی بہت سی یادیں۔ راستے بھر میں ان ہی یادوں میں گھری آئی ہوں۔'' زری نے کہا۔ چاند سیاہ بادلوں کے نرغے میں سے جھانکا۔ درخت ذرا دیر کو چاندنی میں نہائے۔ یکایک زری ہنسی اور کہا، ''چاچا جی! یاد ہے —— یاد ہے ایک دفعہ میں نے آپ سے کہا تھا کہ میں بڑی ہو کر بیرسٹر بنوں گی تو آپ نے کیا کہا تھا؟''

''نہیں، بالکل نہیں —— اس عمر میں کچھ یاد نہیں رہتا۔ کیا کہا تھا؟''

''آپ نے کہا تھا، بس تجھے جو پتہ نا تھا بن گئی، اب زیادہ کچھ نہ بن۔ حالاں کہ ان دنوں میں نے صرف میٹرک کا امتحان دیا تھا۔''

چاچا جی خوش ہو کر ہنسے جیسے ماضی کی باتوں نے انھیں بشاش کر دیا ہو۔ ''ہاں میں سمجھ گیا ہوں کہ تو کیا بننے والی ہے۔ جیسے ایک منی سی کلی ہوتی ہے، اس میں سو طرح کا حسن ہوتا ہے۔ رنگ خوشبو اور بناوٹ سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ کھل کر کیسا پھول بنے گی۔ اسی طرح بچیوں کی باتوں خوب صورتی اور ذہانت سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ بڑی ہو کر کیا نکلیں گی۔ میں نے ٹھیک کہا تھا۔'' چاچا جی بہت دیر تک ہنستے رہے۔

''اسی زمانے میں آپ نے ایک مرتبہ کہا تھا، تجھے دیکھ کر مجھے زیب قادری یاد آتی ہے۔ تو نے کچھ اس سے لیا ہے۔ تو میں نے جلدی سے کہا تھا، نہیں چاچا جی، میں نے ان سے کچھ نہیں لیا۔ ایک سوٹ کا کپڑا زبردستی مجھے دیا تھا بس۔''

''یہی تیری باتیں جو تھیں نا مجھے اس کی یاد دلاتی تھیں۔ بہت بھولی بھی، بہت تیز طرار بھی۔ کچھ عجب سی شخصیت تھی اس کی۔ تپ کر کندن ہوئی پھر بھی کچے سونے جیسی —— مگر ایسے لوگ خوار بہت ہوتے ہیں۔ زری بیٹا، تیری طرف سے بھی سدا میرے دل کو دھڑکا لگا رہا۔''

''کیوں چاچا جی! میں تو ٹھیک ٹھاک ہوں بالکل۔''

''تو ٹھیک ٹھاک نہیں ہے بیٹی۔ تیرے جیسے لوگ کہاں ٹھیک ٹھاک ہوتے ہیں جو ہر وقت

آسمان کی طرف دیکھتے رہتے ہیں۔ تو آسمان پر بے شک دیکھ مگر یہ بھی دیکھتی رہ کہ ہمارے پیروں سے زمین چمٹی ہوئی ہے۔ ہم پرندے نہیں، انسان ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ اوپر دیکھتے دیکھتے ٹھوکر کھائے اور کھڈے میں جا گرے۔"

"آپ ابھی تک ویسی ہی باتیں کرتے ہیں چاچاجی، میں اب بچہ تھوڑا ہوں۔"

"ہاں پھر بھی میری بات دھیان سے سن لیا کر۔ کبھی نہ کبھی تو ان باتوں کو سمجھے گی اور مجھے یاد کرے گی۔"

شمس الرحمٰن اور نرگس منہ ہاتھ دھو کر آئے تو زری نے انھیں برآمدے ہی میں بلا لیا۔ چاچاجی نے ہنستے ہوئے ان سے کہا، "زری کے بچپن میں جب میں اسے دیکھتا تھا تو اس کے باپ سے کہا کرتا تھا، اکبر خانا بچے تو سب ہی آزاد پیدا ہوتے ہیں لیکن کچھ بچے زیادہ آزاد ہوتے ہیں، جیسے یہ تیری زری ہے۔"

"دیکھو تم دونوں گھبرانا مت۔ ہمارے چاچاجی کو نئی نئی تھیوریاں بنانے اور حالات کو ان پر فٹ کرنے کا بڑا شوق ہے۔" زری نے چاچاجی سے چھیڑ خانی کی۔

"جھلّی، میری کوئی تھیوری غلط نکلی؟ آئے دن تصدیق ہوتی رہتی ہے لیکن تم لوگ میری قدر ہی نہیں کرتے — ہاں سناؤ پتر شمس الرحمٰن تمھارے والد کیا کرتے ہیں؟"

"میرے والد شروع میں سلہٹ میں ڈنکن برادرز کے چائے کے باغات میں ملازم تھے، پھر حکومت میں آ گئے تھے۔ مغربی پاکستان تبادلہ ہو گیا تھا۔ امی کے انتقال کے بعد انھوں نے دوسری شادی کر لی تھی۔ جب ابا کا انتقال ہو گیا تو میری سوتیلی ماں اپنے دونوں بچوں کو لے کر واپس چلی گئیں۔ اب بہت دنوں سے میرا ان سے برائے نام رابطہ ہے۔ ابا کے سامنے بھی ہم کبھی یہاں اور کبھی وہاں پھرتے رہتے تھے اور اب میرا ابھی کوئی ایک ٹھکانا نہیں ہے۔ مجھے یوں لگتا ہے جیسے ہم خانہ بدوشوں کی نسل سے ہوں اور ہماری قسمت میں بس اِدھر سے اُدھر پھرنا ہو۔"

"ہاں، مجھے یاد آیا۔" زری نے کہا، "آنٹی زیب شروع میں مجھے کوچی کہا کرتی تھیں۔"

"تو بھی تو کُوچی بن گئی — اپنا ڈیرہ اٹھائے کبھی کراچی، کبھی یہاں، کبھی وہاں۔"

"میں نے تمھیں آنٹی ایلزا کے بارے میں بتایا تھا نا، یہ آنٹی زیب جن کا ذکر میں کر رہی تھی یہ بھی چاچاجی کی محبوبہ تھیں — چاچاجی آپ نے کل کتنی محبتیں کیں؟"

نرگس نے زری کو گھور کر دیکھا تو اس نے کہا، "چاچاجی ایسی باتوں کا برا نہیں مانتے۔"

"تین۔" چاچاجی نے کہا، "کچھ لوگ محبت کے گورکن ہوتے ہیں۔ جن سے محبت کرتے ہیں، ان

کو دفناتے رہتے ہیں۔ مرزا غالب نے بھی کہا تھا کہ مغل بچے جس پر مرتے ہیں اس کو مار رکھتے ہیں۔ خدا نہ کرے زندگی میں کسی کو یہ کام ملے۔" چاچا جی نے سرد آہ بھری۔ "اچھا ایسا کرنا زری پتر، کھانے کے بعد سونے سے پہلے تھوڑی دیر کے لیے میرے کمرے میں آنا، تجھ سے کچھ باتیں کرنا ہیں۔"

ملازم نے کھانا رکھنے کا اعلان کیا۔

سب نے کھانا کھایا۔

شمس الرحمٰن اور نرگس تھکے ہوئے تھے، جلد سونے کے لیے چلے گئے۔ شمس الرحمٰن کے ذہن میں پچھلے چند دن کے واقعات البم میں لگی ہوئی تصویروں کی طرح صاف اور اپنی اپنی جگہ محفوظ تھے۔ چناں چہ وہ چاچا جی کے اپنے کھیتوں کی روئی سے بھرے ہوئے نرم لحاف میں دبک کر مزے سے سو گیا۔ نرگس تھکی ہوئی مگر اپنے کام سے مطمئن بہت جلد نیند کی وادی میں اتر گئی۔

ایک گلاس پانی کا، ایک گولی، پردے کھنچے ہوئے، بتی بند۔ لحہ بہ لحہ خوشامد، لجاجت، التجا — مگر وہاں ایک ''نہ'' اس سب کے جواب میں۔ یہ محبوبائیں نخرے کتنے کرتی ہیں — بدبختی سی بدبختی — ایک محبوبہ بھی ان کے حجرۂ وصال میں داخل نہ ہوئی۔ جس سے معاہدۂ ہم سری ہوا، وہ بھی نہ آئی۔ موت سے وصل نصیب ہوا۔ اور یہ نئی محبوبہ کتنے غمزوں سے آتی ہے اور کتنی جلد چلی جاتی ہے۔

وصل کی رات نہ جانے کیوں اصرار تھا ان کو جانے پر
وقت سے پہلے ڈوب گئے تاروں نے بڑی دانائی کی

مگر اب تارے یہ دانائی بھی نہیں دکھاتے، ہجر کی راتیں طویل ہوتی چلی جاتی ہیں۔ کبھی بھی انتظار اتنا تکلیف دہ اور تھکانے والا نہ تھا۔ مجبوراً روشنی کرتے ہیں۔ کتاب اٹھاتے ہیں کبھی فلسفے کی، کبھی شاعری کی اور کبھی ہلکے پھلکے مضامین کی۔ ذہن کے پچھلے گوشے میں انتظار گھات لگا کر بیٹھا رہتا ہے۔ اب آئی، اب آئی — ٹک ٹک ٹک ٹک — گھڑی اپنے سفر پر رواں ہے۔ ابھی بارش ہو رہی تھی، پھر اولے پڑے، چھن چھن چھن۔ اب وہ بھی بند ہو گئے۔ شاید چاند نکل آیا ہو۔ پردوں کے پیچھے بادلوں کے درمیان اپنی منزل کی طرف گامزن ہو — پندرھویں کا چاند۔ زیب کی موت کے بعد کی رات۔ اس سے چاند دکھانے کا وعدہ تھا۔ اب خود بھی نہیں دیکھتا۔ پردے کھنچے پڑے ہیں نئی محبوبہ کی خاطر — روشنی کی ہلکی سی کرن اس کی آنکھوں میں چبھتی ہے، بھاگ جاتی ہے۔ اس آخری عمر کی محبوبہ نے آنے اور نہ آنے کے بیچ کتنا تھکایا ہے، کتنا لاچار کیا ہے۔ وہ کون لوگ ہیں جو عشق کا روگ

نہیں پالتے۔ کیا وہ اس محبوبہ کے ناز نخروں سے خود کو بچا لیتے ہیں؟ شاید وہ اسے زبردستی رشتہ منا کحت میں لے آتے ہیں، پھر روشنی اور اندھیرے سے، اس کی مرضی اور نامرضی سے بے نیاز ہو جاتے ہیں۔ وہ لونڈی کی طرح رات بھر ان کے پیر دابتی ہے اور وہ مزے سے سناتے ہیں۔ مگر کیسے!— یہ تو بڑی ''ڈاڈھی'' محبوبہ ہے، بڑی ہی سنگ دل اور اچھال چھکّی۔ یہ کیسے قابو میں آتی ہے انھیں نہیں معلوم۔ انھیں تو بس اس کا انتظار، اس کی تمنا، اس کی آرزو ہی رہے گی۔ کبھی کتاب فلسفے کی، کبھی شاعری، کبھی ہلکے پھلکے مضامین، اور جب تھک کر چور ہو گئے— تاروں کا قافلہ چلنے کو ہوا تو بہت ہی ناپسندیدگی سے، کہ زبردستی انھیں کسی کے ساتھ بھی منظور نہ تھی، آخری حربہ، گولی— محبوبہ کو زبردستی گود میں لینے کی نامناسب کوشش، مگر مجبوری—

زری کی آمد نے جیسے یادوں کے بجھے چراغ پھر سے جلا دیے تھے۔ آج انھوں نے پاس رکھی کوئی کتاب نہ اٹھائی۔ الماری میں سے ٹٹول کر کہیں نیچے سے گرد آلود ڈائری نکالی۔ کئی سال پرانی۔ دیکھ بھال کر ایک خاص سنہ نکالا۔ یہ زیب قادری سے ان کی ملاقات کا سال تھا۔ دونوں کی زندگی کے بارہ ماسے کا یہ دسمبر نہیں تو اکتوبر نومبر ضرور تھا۔ زیب قادری سے پہلی ملاقات کے بعد انھوں نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا:

''وہ چیڑ کے اس خوب صورت تکون (cone) کی مانند ہے جو کھل کر سوکھ چکا ہے۔ مگر اس کی دل آویزی پہلے سے بڑھ گئی ہے۔ ہر پنکھڑی سخت ہے مگر لچک دار۔ اس کا سنہری رنگ ہزار پھولوں سے زیادہ نظر فریب ہے۔ وہ جنگل میں چیڑ کے درخت پر لگا ہو، گھاس پر پڑا ہو یا جاڑے کی چاندنی رات میں الاؤ میں جل رہا ہو۔ اس کے حسن اور حیثیت میں کوئی فرق نہیں آتا۔''

بیگم زیب قادری سے ان کی دوسری یا تیسری ملاقات تھی۔ زری کو کام دے کر وہ اطمینان سے آ کر بیٹھیں۔

''خیریت سے تو ہیں آپ؟'' انھوں نے پوچھا۔

آج ان کے ہاتھ میں پہلی مرتبہ قلم نہیں تھا۔ ان کے بال سنورے ہوئے تھے۔ وہ پہلی سے کچھ کم عمر دکھائی دے رہی تھیں۔

''میں تو خیریت سے ہی رہتا ہوں۔ برسوں سے کچھ نہیں ہوا۔ کبھی کبھی جی چاہتا ہے، بیمار ہی پڑ جاؤ، کوئی تو تبدیلی ہو۔''

''منفی ذہنیت ہے۔'' زیب قادری مسکرائی تھیں۔

''ہاں شاید— تنہائی کا ڈسا ہوا ہوں نا— نہ جانے کب سے تنہائی مجھے کھا رہی ہے۔ اور—

میں تنہائی کو۔'' لہجہ ان کا پھر بھی شگفتہ تھا۔

''کس کے جلد ختم ہونے کا امکان ہے؟'' زیب قادری ہنسیں۔

''کسی کا بھی نہیں۔ میں بھی ہٹا کٹا ہوں، وہ بھی ویسی ہی ہے۔'' (قہقہہ)

''مجھے تو تنہائی اچھی لگتی ہے، میں نے تو خود تنہائی کو پسند کیا ہے۔'' زیب قادری نے کہا۔

''پہلے میرا بھی یہی خیال تھا کہ ہر شخص کو اپنی مرضی کے مطابق زندگی بسر کرنے کا حق ہے مگر اب میرا خیال ہے کہ انسان کی جبلت میں، الگ الگ نہیں، مل کے رہنا ہے۔ اس کی زندگی کا مقصد اسی طرح پورا ہوتا ہے۔''

''کون سا مقصد آپ کی سمجھ میں آیا؟'' زیب قادری پھر مسکرائیں۔

''قدرت کی یہ ساری تگ و دو فی الحال بقا کی جدوجہد ہے۔ بقائے نسل ـــ کبھی یہ مور کو نچواتی ہے کہ مورنی بھاگی آئے، کبھی شہد کی ملکہ کو آسمان پر اڑواتی ہے۔ لڑکے لڑکیاں ایک دوسرے میں بے تحاشا کشش محسوس کرتے ہیں ـــ انجام شادی ـــ بچے ـــ خاندان، اور جب قدرت کا منشا پورا ہو جاتا ہے تو قدرت کے لیے ان کی حیثیت چھلکے یا پھوک سے زیادہ نہیں رہتی۔ والدین کا کام ہے بچوں کو ان کے پیروں پر کھڑا کر دینا تاکہ وہ آئندہ بقائے نسل کا انتظام سنبھالیں۔ بقائے نسل ہوگی تو تسخیرِ کائنات اور اپنے آپ کو اور خدا کو پہچاننے کے کام بھی چلتے رہیں گے۔''

''آپ کے خیال میں والدین بچوں کو محبت کی وجہ سے نہیں پالتے؟''

''قدرت یہی فریب دے کر تو پرورش کرواتی ہے۔ اور یہ لالچ کہ تم ان میں زندہ رہو گے۔ ان میں تمہارا جسم زندہ رہے گا، تمہارا خون دوڑے گا اور ان سے تمہارا نام چلے گا۔''

''بہت سے لوگوں کا نام ان کے بچوں کے بغیر بھی زندہ رہتا ہے۔'' زیب قادری نے کہا۔

''مگر اکثریت اپنے نام سے زندہ نہیں رہ سکتی زیب بیگم۔'' انھیں تھوڑی سی حیرت ہوئی کہ یہ نام کس سہولت سے ان کی زبان پر آ گیا تھا۔ ''جوانی میں لوگ پر پرزے نکالتے ہیں۔ اس فعال زمانے میں قدرت انھیں اس فریب میں مبتلا رکھتی ہے کہ تم بہت کچھ ہو، زمانے کی گاڑی تمہارے دَم سے چل رہی ہے مگر ادھیڑ عمر تک پہنچتے پہنچتے ان کی پرواز ختم ہو جاتی ہے۔ وہ پھر گھونسلے میں آن بیٹھتے ہیں اور اپنی ساری امیدیں بچوں سے وابستہ کر لیتے ہیں۔ میں تو جتنا چاروں طرف دیکھتا ہوں، اس بات کا یقین ہوتا جاتا ہے کہ یہ سب مایا جال ہے۔ قدرت نے اپنی بقا کے لیے ایک جال بچھایا ہے اور سب کتنی آسانی سے اس میں پھنستے چلے جاتے ہیں۔''

''مگر آپ تو قدرت کے جال میں نہیں پھنسے۔'' زیب قادری نے کہا۔

''ہاں ہم اس چکر سے نکلے تو مگر وہ جو کہتے ہیں :exceptions prove the rule— ہم جیسوں کو سب سے زیادہ اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہم قدرت کے کارخانے کا ایک قطعی بے کار پرزہ ہیں۔''

''پہلے تو آپ نے یہ راز پایا کہ قدرت نے سب کو اپنا آلۂ کار بنایا ہے، پھر آپ کو اس بات پر افسوس ہوا کہ آپ آلۂ کار کیوں نہ بنے۔'' زیب قادری ہنسیں۔

''ہاں اور کیا— جس وقت بچے ڈراما کرتے ہیں تو سب کو معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض کھیل اور تمثیل ہے مگر جس بچے کو ڈرامے میں حصہ نہیں ملتا وہ کتنا رنجیدہ ہوتا ہے۔''

''تو آپ کو منع کس نے کیا تھا ڈرامے میں پارٹ کرنے کو؟'' زیب قادری کو اس بحث میں خاصا لطف آ رہا تھا۔

''بس، محض بے وقوفی، بعض اوقات آدمی کو ضد ہو جاتی ہے کہ وہ کسی ایک آدمی کے ساتھ کام کرے گا، دوسرے کے ساتھ نہیں کرے گا، یہ تو بہت بعد میں پتا چلتا ہے کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ سب کا اپنا اپنا پارٹ ہے، ادا کرو اور جاؤ۔''

''تو اب آپ پچھتا رہے ہیں؟'' وہ مسکرائیں۔

''یہی سمجھ لیجیے۔ اب محسوس ہوتا ہے کہ نہ میں کسی کی زندگی کا سہارا ہوں، نہ کوئی میری زندگی کا سہارا ہے۔ بس خالی کوٹھی کا رکھوالا ہوں یا کھیتوں اور باغوں کا 'کاگ توا' جو بھری فصلوں میں چڑیوں اور کووں کو ڈراتا رہتا ہے۔ اس میں زندگی نہیں ہوتی محض خول ہوتا ہے۔''

''آپ کے کہنے کے مطابق تو قدرت اپنا کام نکالنے کے بعد سب کو خول ہی بنا دیتی ہے۔''

''ہاں، مگر ان سے مغز تو نکال لیتی ہے نا۔ ہم تو ان پھلوں میں سے ہیں جن کو پکنے سے پہلے کیڑا لگ جاتا ہے اس لیے کوئی توڑنا بھی ضروری نہیں سمجھتا۔ یوں ہی شاخ پر لٹکے لٹکے سوکھ جاتے ہیں۔''

ان کے لہجے کی افسردگی زیب قادری کے دل کو چھو گئی۔

''آپ کچھ لکھتے ہیں کیا؟'' انھوں نے پوچھا۔

''مثلاً کیا؟'' چاچا جی نے سوال کیا۔

''شعر و شاعری، افسانہ، ناول؟''

''یہ خیال کیوں آیا آپ کو؟'' چاچا جی نے پوچھا۔

''آپ باتیں اس طرح کی کرتے ہیں جیسے آپ بہت کچھ سوچتے رہنے کے عادی ہوں۔''

''اچھا، مگر آپ نے کبھی سوچا کہ یہ چیونٹیاں، یہ شہد کی مکھیاں، جو اتنی سمجھ دار اور ہوشیار ہوتی ہیں

کیوں شاعری نہیں کرتیں، کیوں ناول نہیں لکھتیں؟ اور یہ تتلیاں جو اتنی خوب صورتی سے اڑتی ہیں کیوں تصویریں نہیں بناتیں؟'' چاچاجی نے کہا۔

''کیا معلوم بناتی ہوں۔'' زیب قادری خوش دلی سے ہنسی تھیں۔ ''ہمیں کیا معلوم کہ ان کی شاعری، فلسفہ اور سائنس کیا ہے؟ ہم جن چیزوں کو جمادات اور نباتات کہتے ہیں، وہ خود کو کیا کہتی ہیں۔ اگر کوئی بہت بڑی مخلوق مثلاً دیو، ہم انسانوں پر تحقیق کرے تو خدا جانے ہمارے بارے میں کیا لکھے ــــ اور جن چیونٹیوں نے ہمارے مُردوں پر تحقیق کی ہوگی تو جانے کیا کیا مضحکہ خیز باتیں لکھی ہوں گی۔''

''ہاں واقعی بعض اوقات غور کرنے سے ساری زندگی کا تناظر بدل جاتا ہے۔'' چاچاجی نے کہا تھا اور دل میں سوچا تھا، ''کیا کسی شخص کے اچانک ملنے پر بھی زندگی کا تناظر بدل جاتا ہے۔''

زیب قادری سے اجازت لے کر چلتے ہوئے وہ سوچ رہے تھے۔ ساری عمر میں اس بات پر فخر کرتا رہا کہ میں نے ایلزا کی محبت کا بھرم رکھا اور راہِ وفا میں میرے قدم نہیں ڈگمگائے۔ لیکن آج یوں لگتا ہے جیسے وہ میری وفا نہیں تھی، محض اتنی سی بات تھی کہ کوئی ایسی ہستی ملی ہی نہیں جس کے ساتھ ڈرامے میں کام کرنے کو دل چاہے۔

اس رات انھیں بار بار قدسیہ یاد آئی۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے قدسیہ ہی زیب قادری کا بھیس بدل کر آئی ہو۔ کیا کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بظاہر جس شخص کو آدمی، بسر گیا ہو، اس کا لاشعور اسے کسی اور شخص میں پانے کی کوشش کرے۔

لڑکپن میں اکبر خان اکثر عمر خان کو قدسیہ کے نام سے چھیڑا کرتا تھا۔

''عمر خان لالہ! یار تم ہر وقت یہ اپنے پُرکھے قاسم خان کی داستان پڑھا کرتے ہو نا، اسی سے میں نے اندازہ لگایا ہے کہ خوب صورت لڑکیوں سے متاثر ہونا تمھارے خون میں شامل ہے۔ اس میں تمھارا کوئی قصور نہیں ہے۔''

''ہاں یار نظر تو ایسا ہی آتا ہے۔'' عمر خان کہتا۔

''تو تم قدسیہ کے معاملے میں سنجیدہ ہو؟'' اکبر خان پوچھتا۔

''ابھی کیا کہا جاسکتا ہے، ابھی تو وہ بچی ہے۔ اسکول میں پڑھتی ہے۔''

''تو تم کون سے بوڑھے ہو۔ جوانِ رعنا ہو قاسم خان کی طرح۔'' اکبر خان عمر میں عمر خان سے چھوٹا تھا۔ اسے لالہ کہتا تھا مگر دونوں میں مثالی دوستی تھی اور اکبر خان اکثر اس پر مذاق کا وار کرنے سے نہ چوکتا تھا۔

''تو پھر اپنی امی سے بات کرلو، دیر کس بات کی ہے۔'' اکبر خان کہتا۔

''پہلے ملک کی آزادی کا مسئلہ تو حل ہوجائے پھر اپنی گرفتاری کا سوچیں گے۔ یار کسی دن میاں دم کی اس پہاڑی پر میرے ساتھ چلو جہاں قاسم خان نے ڈیرے ڈالے تھے، وہاں تین صنوبر اب بھی سر جوڑے کھڑے ہیں اور چھوٹا سا قبرستان بھی ہے۔''

''ہاں چلو۔'' اکبر خان ہمیشہ عمر خان کے ساتھ جانے کو تیار رہتا۔

''میں نے بھی ان ساری داستانوں سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ سیر و سیاحت جو کبھی کبھی ہجرت سے جا ملتی ہے، ہمارے خمیر میں ہے۔ دوسروں کے مسالک کو سمجھنے کی کوشش بھی ہماری رگوں میں پرکھوں کی طرف سے آئی ہے۔ جب ہی تو کوئی کسی راہ پر چلتا ہے کوئی کسی راہ پر۔'' عمر خان کہتا، ''چاچا حیات کو دیکھو کہ دہرہ دون میں بیٹھے ہیں۔ بابا اور چاچا جی کے کچھ ناقابلِ فہم مسائل ہیں۔ بابا چاہتے ہیں کہ میں ان کی راہ پر چلوں، مگر یار ان کی بات میری سمجھ ہی میں نہیں آتی۔''

''تو تمھاری سوچ اپنے بابا سے اتنی مختلف کیسے ہوگئی؟''

''یہ الگ داستان ہے۔'' عمر خان خوش طبعی سے کہتا۔ ''یار میں سوچتا ہوں کہ ہماری زندگی میں بھی کبھی کوئی ایسی پر اسرار اور دل چسپ بات ہوگی جو ہماری نسلیں ذوق و شوق سے سننا چاہیں۔''

''عین ممکن ہے، تم مجھے اپنی داستانِ حیات سناؤ تو بتاؤں۔''

''اصل بات یہ ہے کہ بابا عبدالغفار خان کے چیلے ہیں۔ ان کی ہم دردیاں کانگریس کے ساتھ ہیں اور میں چاچا حیات سے متاثر ہوں۔ وہ خود علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرتے رہے اور مجھے بھی وہیں بھجوایا۔ اب بابا پریشان ہیں کہ بیٹا ہاتھ سے نکل رہا ہے اور چاچا کا مسلک اختیار کر رہا ہے۔''

''تو تمھارے بابا اور چاچا حیات میں سیاست کی وجہ سے نہیں بنتی؟'' اکبر خان نے پوچھا۔

''کئی باتیں ہیں۔ سب سے پہلی تو یہ کہ حیات چاچا نے ایک غیر خاندان یوپی کی لڑکی سے شادی کر لی اور فوج میں افسر ہونے کے بعد اپنے طور طریق بالکل بدل ڈالے۔ وہ دہرہ دون ملٹری اکیڈمی میں پڑھاتے ہیں۔ بیوی بے پردہ ہیں اور خاندانی رسم و رواج کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔ بیٹی انگریزی اسکول میں پڑھ رہی ہے۔ حیات چاچا اپنی بے پردہ بیوی کو لے کر گاؤں جانے سے گھبراتے ہیں۔ جس کی وجہ سے وہ سارے خاندان سے کٹ گئے ہیں۔ ان کو خاندان میں واپس ملانے کے لیے بابا نے بڑی اچھی چال چلی تھی کہ وہ چھوٹے بھائی مہر خان کی بیوہ سے نکاح پڑھوا لیں۔ مگر حیات چاچا نے بصد ادب بھابی سے شادی کرنے سے انکار کر دیا کہ فوج میں ابھی تک دو شادیوں کا کوئی تصور نہیں ہے۔ انگریز افسران کے کان میں بھنک پڑ گئی تو ان کی ترقی خطرے میں پڑ سکتی ہے۔ دوسرا اہم نکتہ یہ ہے کہ ہندوستان اس وقت ہندو مسلم کش مکش اور آزادی کے نازک دور سے گزر رہا ہے۔ اس وقت ایسی باتیں انھیں بے وقت کی راگنی معلوم ہوتی ہیں۔ اس جواب سے بابا کو بہت تکلیف ہوئی۔ ظاہر ہے کہ اب وہ نہیں چاہتے کہ جس شخص کو وہ ناپسند کریں یا جو ان کی حکم عدولی کی ہمت رکھتا ہو، خواہ ان کا سگا بھائی ہی کیوں نہ ہو، اس سے ان کا بیٹا تعلقات رکھے۔ انھیں یہ معلوم نہیں ہے کہ میں مسلم لیگ میں باقاعدہ کام کرتا ہوں۔ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان کے موقعے پر

جونیئر ورکر کی حیثیت سے لاہور گیا تھا اور واپسی میں علی گڑھ جانے کے بجائے دہرہ دون چلا گیا تھا۔ قدسیہ مجھے دیکھ کر پھولوں سے بھرے باغ سے گزرتی بھاگی ہوئی آئی تھی۔ اس کے ترشے ہوئے بال ہل رہے تھے اور گال سرخ ہو رہے تھے۔ بڑی خوب صورت فراک پہنے ہوئے تھی اور بالکل انگریز بچی لگ رہی تھی۔ اس کے سلام کے جواب میں، میں نے ہاتھ آگے بڑھا دیا تھا۔ اس نے شرماتے ہوئے ہاتھ ملایا تھا اور ہم دونوں نے پشتو ملی انگریزی میں بہت سی باتیں کی تھیں۔ اب بھی آتے جاتے میں دہرہ دون ضرور جاتا ہوں اور حیات چاچا سے مزے کی بحثیں رہتی ہیں۔ میں ان سے کہتا ہوں کہ آپ کے بڑوں نے بھی کیا جذباتی فیصلے کیے اور کتنا نقصان اٹھایا — اور کچھ نہیں تو پانچ سو علما نے لے کے ہجرت کا فتویٰ دے دیا اور لاکھوں مسلمان مُنھ اٹھا کر افغانستان چل دیے۔ افغانستان نے راستہ بند کر دیا تو واپس ہوئے۔ نہ جانے کتنے راہ میں کھیت رہے — اور خلافت کی مہم کے دوران وہ ہندو مسلم ہنی مون کا دور — مسلمان تلک لگائے رام لیلاؤں کا بندوبست کر رہے ہیں۔'' عمر خان نے قہقہہ لگایا۔ ''اب بھی ہنسی آتی ہے یار۔''

''ارے بھئی غضب، دلّی کی جامع مسجد سے شردھا نند کی تقریر کروادی گئی۔'' اکبر خان نے کہا۔

''بس گاندھی جی کو نبی ثابت کرنے میں ذرا سی کسر رہ گئی تھی ورنہ ان کے اقوال اور اعمال کی صداقت کی گواہیاں قرآنِ کریم میں تلاش کی جاتی تھیں۔''

''ہاں یہ سب میں انھیں یاد دلاتا تو وہ جواب دیتے کہ میاں جذباتی نہ ہوتے تو انگریز جیسی طاقت ور قوم سے کیسے بھڑتے۔ مسجد کان پور کا واقعہ، موپلا بغاوت تمھارے نزدیک یہ سب جذباتیت ہے! — اس جذباتیت کا فائدہ کیا ہوا، کبھی سوچا؟ — اس انگریز کے سامنے کہ سڑک پر لوگ راستہ چھوڑ کر کھڑے ہو جاتے تھے، سینہ سپر ہونے کی ہمتِ ہوئی۔ یہاں تک کہ انگریز جج عدالت میں آئیں تو علی برادران کھڑے تک نہ ہوں۔ ہمت کا دریا بھی قطرہ قطرہ ہی بنتا ہے۔ ۳۰ء، ۳۲ء سے جس شان سے ہندوستانی لیڈر انگریزوں کے ساتھ گول میز کانفرنسوں میں بیٹھ رہے ہیں، ان کی ابتدا کہاں سے ہوئی۔ بھئی بات یہ ہے کہ Nothing succeeds like success — جب جذباتیت کام آ جائے تو واہ واہ اور ناکام ہو جائے تو تنقید، ہمیشہ یہی ہوتا آیا ہے۔ دیکھا جائے تو حیات چاچا کی اس بات میں بھی سچائی ضرور ہے۔''

''ہاں، اچھا یہ بتاؤ اس دفعہ بھی تو تم دہرہ دون کا چکر لگاتے ہوئے آئے ہو۔ بنتِ عم سے ہاتھ ملایا؟'' اکبر خان نے شرارت سے پوچھا۔

''بالکل۔'' عمر خان نے خوش ہو کر کہا، ''ایمان کی بات یہ ہے کہ اس مرتبہ وہ مجھے کچھ زیادہ ہی

اچھی لگی ہے۔ اب بھی اس کی کوئی نہ کوئی ادا یاد آتی رہتی ہے۔ اس کی بولتی ہوئی آنکھیں، اس کے بال جھٹکنے کا انداز، اس کی شفاف ہنسی — اب تو وہ دہرہ دون کی صاف ستھری سڑکوں پر انگریز لڑکیوں کے ساتھ سائیکل چلاتی پھرتی ہیں۔''

''سوچ لو، تمھارے بابا اسے پسند کریں گے!'' اکبر خان نے کہا۔

اسی وقت ایک ملازم آیا۔ عمر خان کو اس کے بابا نے یاد کیا تھا۔

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا۔'' بابا نے تیسری مرتبہ حقے کی نَے منہ سے نکال کر بات شروع کی۔ عمر خان اپنے خیالات سے چونکا۔ تمہید طویل ہو جائے تو اس کے معنی ہیں کہ بات کہنے میں کوئی جذباتی رکاوٹ ضرور ہے۔ اس نے سوچا۔

''جی بابا جان!'' کہہ کر گویا عمر نے ان کی ہمت بندھائی اور موونڈھے پر پہلو بدل کر ہمہ تن گوش ہونے کی کوشش کی لیکن لحظہ بھر میں اس کے خیالات پھر بھٹک گئے۔ گول دریچے میں صلیب نما سلاخ پر بیٹھی چڑیاں کو دیکھ کر خیال آیا کہ یہ اٹھارھویں مرتبہ اس مخدوش جگہ گھونسلا بنائے گی جو گر جائے گا، اور پھر بنائے گی جو...... دریچے کے پار کھیت کاٹے جا چکے تھے۔ سوکھے ڈنٹھلوں کا ایک گٹھا سامنے بڑے درخت کے دوشاخے کے سنگم پر رکھا ہوا تھا۔ جہاں سے چڑیاں بقدرِ ہمت وضرورت تنکے نکال کر لا رہی تھیں۔ دریائے سندھ کا چوڑا پاٹ سامنے نظر آ رہا تھا مگر اُس کی صدا اُن کی گفتگو اور سکوت، ان کی زندگیوں کا ایسا حصہ بن چکی تھی کہ رات دن میں ایک آدھ بار ہی سنائی دیتی تھی۔

''بات بہت اہم ہے۔'' بابا نے کہنا شروع کیا، ''مگر جذباتی ہونے کی بالکل ضرورت نہیں۔''

عمر پھر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ موضوع ضرور اہم ہوگا ورنہ بابا اتنی طویل گفتگو کے عادی نہیں تھے۔

''میں کہہ رہا تھا کہ تمھارے مہر چاچا کے انتقال کو ایک سال ہونے کو آیا۔ اب ہمیں چاہیے اس کی بیوی بچوں کے بارے میں سنجیدگی سے سوچیں۔''

عمر خان نے فوراً سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا۔ سارے بہن بھائیوں میں سب سے زیادہ

دولت مہر چاچا کے پاس تھی کیوں کہ رحمت چاچی جہیز میں بہت زر اور زمین لائی تھیں۔ ان کے کھیت کھلیان تھے۔ شکر اور گڑ کے کھنڈسال تھے، حویلیاں تھیں۔ روپے پیسے کی تو کمی نہ تھی، البتہ بچوں کے بڑے ہونے تک ان چیزوں کے انتظام کی ذمہ داری تھی۔ بابا یقیناً یہ چاہتے ہوں گے کہ وہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر یہ ذمہ داری سنبھال لے۔ وہ دل ہی دل میں نہایت زوردار دلائل تیار کرنے لگا کہ بابا نے حقے کا ایک زوردار کش لے کر سلسلۂ کلام جوڑا۔

''تمھاری چاچی کی عمر زیادہ نہیں ہے۔ کسی مرد کے بغیر جائداد اور دو چھوٹے بچوں کو سنبھالنا آسان کام نہیں ہے، اس لیے میں چاہتا ہوں کہ.....'' وہ ذرا جھجکے، حقے کی طرف ہاتھ بڑھایا، پھر چھوڑ دیا۔ ''تم رحمت بی بی سے شادی کرلو۔''

دفعتاً دریائے سندھ کی لہروں کا شور ایک دھماکے سے عمر خان کے سر میں سما گیا۔ اس کے سر میں سائیں سائیں ہونے لگی۔ کیا اس نے صحیح سنا! بابا یہی کہہ رہے تھے۔ چاچی سے شادی!! بہت دور سے بابا کی آواز اب بھی آرہی تھی۔

''ہمارے ہاں ایسا ہوتا آیا ہے۔ ہم اپنے بھائیوں کی عزت کو رُلتے نہیں دیکھ سکتے۔ میں نے اس بات پر بہت غور کیا ہے۔ تم سے اس لیے کہا کہ وہ عمر میں زیادہ بڑی بھی نہیں ہے۔ خوب صورت ہے، خاندانی ہے۔ دو چار دن سوچ سمجھ لو۔ جلدی نہیں ہے۔ اب تم جاؤ۔ ہاں کسی سے اس بارے میں کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں ہے۔'' آخری جملہ کہتے کہتے ان کے لہجے میں سختی آگئی، جیسے وہ تنبیہہ کر رہے ہوں۔

اتنی دیر میں عمر سنبھل چکا تھا۔ لہروں کا شور تھم گیا تھا۔ ہوا کی سائیں سائیں رک گئی تھی۔ اس نے قدم دوبارہ زمین پر جماتے ہوئے بڑے وقار سے کہا، ''بابا جان! — ایسی بات تو میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ بہتر یہی ہے کہ آپ بھی بھول جائیں کہ یہ بات آپ نے مجھ سے کبھی کہی تھی۔ وہ آپ کی بھابی اور میری چچی ہیں۔ ان کی جائداد اور بچوں کی نگرانی ہم پر فرض ہے اور ہم یوں بھی کریں گے۔''

''تبھی میں کہتا تھا کہ جذباتی نہ ہونا۔ تبھی میں نے کہا تھا کہ مجھے فوری جواب نہیں چاہیے۔'' حقہ پرے سرکا کر وہ اٹھے اور ہاتھ پیچھے باندھ کر تیزی سے کمرے میں ٹہلنے لگے۔ ان کے چہرے پر ایک رنگ آرہا تھا ایک جارہا تھا۔ ''زمین سے اُگے نہیں برخوردار کہ باپ کو سبق پڑھانے لگے۔ تمھیں کیا معلوم کہ بھابی ایک غیر عورت ہوتی ہے اور بھائی کے مرنے کے بعد وہ بالکل ہی غیر ہوجاتی ہے۔ وہ سرِ بازار آپ کی عزت نیلام کرسکتی ہے۔ وہ کسی اور سے نکاح کر کے بھائی کے خون پسینے کی کمائی کسی اور کو دے سکتی ہے، بیوقوف۔'' غصے سے ان کے گھنے اَبرو تنے ہوئے تھے اور مونچھوں کے بال پھڑک

رہے تھے۔تو یہ زر اور زمین کی سیاست ہے۔عمر خان نے نہایت ٹھنڈے ذہن سے سوچا۔ بابا ابھی تک تلملا رہے تھے۔ ’’دو لفظ پڑھ کر تمھارے ہاں عزت کے معنی بدل جاتے ہیں۔ یہ علی گڑھ والے اللہ جانے کیا پڑھاتے ہیں کہ بھیجا اُلٹ کے کھوپڑی میں رکھ دیتے ہیں۔ چلو دفعان ہو یہاں سے۔‘‘

عمر خان کان دبا کر چپکے سے اٹھ آیا۔ ہر بات میں انگریزوں کو برا بھلا کہنا اس زمانے کی روایت بنتی جا رہی تھی۔لیکن بابا کو علی گڑھ کی تعلیم انگریزوں سے بھی زیادہ خطرناک نظر آتی تھی۔ غصّے میں بپھرے ہوئے بابا کے سامنے بولنا تیار فصل کو آگ دکھانے کے برابر تھا۔لمحوں میں برسوں کی محنت برباد ہو جاتی۔

جاتے جاتے عمر خان نے برآمدے میں خاموشی سے گڑیاں کھیلتی گل جان کو دیکھا۔ بابا کی پیش کش کتنی عجیب تھی!! بیٹھے بٹھائے وہ ساجد اور گل جان کا باپ بن جائے۔ وہ اسے لالہ کی بجائے بابا کہہ کر پکاریں۔شاید آنے والے دنوں میں وہ اپنی سوانح عمری میں کبھی یہ بات لکھ سکے گا اور آنے والی نسلیں یقیناً اسے حیرت اور دل چسپی سے پڑھیں گی۔

عمر خان نے گل جان کے گھنیرے سنہری بالوں کو پیار سے بے ترتیب کیا۔گل جان نے عمر کو عقیدت و محبت سے دیکھا اور مسکرا دی۔

زرداروں کا بے نواؤں پر ظلم، مختاروں کا مجبوروں پر جبر اگر ہمیشہ سے ہے تو سرکشی کا جذبہ بھی ازل سے موجود ہے۔ اگر یوں نہ ہوتا تو انسانی تاریخ یقیناً کچھ اور ہوتی۔ رحمت بی بی کو شاید اندازہ بھی نہیں تھا کہ ان کی سرکشی کا یہ انجام ہوگا۔ وہ ایک بڑے گھر کی بیٹی تھیں مگر اس زمانے میں جب لڑکی بیاہ کر کسی دوسرے علاقے میں چلی جاتی تھی تو گویا دوسرے ملک سدھار گئی۔ لڑکی والوں کا سمدھیانے میں آ کر ٹھہرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ پھر اندر باہر کی بے شمار ڈیوڑھیاں مردانے زنانے پہرے، سسرال کی لاج اور اپنی عزت، سیکڑوں غیر مرئی زنجیریں تھیں کہ عورتیں اپنے آپ کو ہر طرح محبوس پاتی تھیں۔ بیواؤں کی مجبوریاں سہاگنوں سے سوا تھیں اور اس زمانے میں سرکشی کا مطلب رسہ تڑا کر بھاگ جانا نہیں بلکہ قدیم غلاموں کی طرح سزائیں سہنا اور سہتے رہنا تھا۔ غلاموں کی طرح طوق ان کی گردن میں نہ تھا اور انھیں داغا نہ جاتا تھا لیکن ان سے مکمل فرماں برداری کی توقع کی جاتی تھی۔ ان کی حکومت کو تسلیم نہ کرنے والے باغی کو وہ ہر قسم کی سزا دینے کے مجاز تھے۔

ساجد اور گل جان ابھی بچے تھے۔ وہ زندگی کے ان جھمیلوں کو نہیں سمجھ سکتے تھے نہ ہی وہ اس راز کو سمجھ پائے کہ ان کے بابا کے انتقال کے بعد کیوں چند روز تک بڑے تایا، زمان خان نے ان سے اتنا لاڈ کیا۔ ان کا دل ہاتھوں میں رکھتے، بار بار بھاوج کے پاس آ کر انھیں تسلی دیتے، بچوں کے مستقبل کے لیے بڑے بڑے منصوبے بناتے۔ لیکن ان منصوبوں کو عملی شکل دینے سے بہت پہلے یکایک ان کا رویّہ بالکل بدل گیا۔ بھاوج سے بول چال بند ہوگئی اور بچوں سے اس قدر رُکھائی سے

پیش آنے لگے کہ وہ خود ہی ڈر کر پیچھے ہٹ گئے۔

اس کے بعد زرداد چاچا ان پر مہربان ہوئے۔ وقت بے وقت حویلی میں بھاوج کے حصے کی طرف آنکلتے۔ بچوں کے لیے چھوٹے موٹے تحائف لاتے اور انھیں کھیتوں کی اور دریا کی سیر کے لیے لے جاتے۔ ساجد اور گل جان محسوس کرتے کہ چاچا زرداد بھی ان کی امی سے کوئی ایسی بات کہتے ہیں جس سے ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو جاتا ہے اور وہ بہت دیر تک بڑبڑاتی رہتی ہیں۔

یہ دور بھی گزر گیا۔ چاچا زرداد کے چونچلے بھی ختم ہو گئے۔ پھر کسی نہ کسی بہانے رحمت بی بی کو حویلی کے ایک اور علاحدہ ڈھنڈار خستہ وخراب کونے میں پہنچا دیا گیا۔ ان کی فصلیں کبھی بارش، کبھی اولوں اور کبھی پالے سے ماری جاتیں۔ ان کے کھنڈ سال بند ہو گئے اور ان کی حویلیاں کھنڈ بننے لگیں۔ شکوے شکایت کا در تو پہلے ہی بند ہو چکا تھا، آہستہ آہستہ انصاف کا در بھی غار کی سِل کی طرح ان کے سینے پر سرکنے لگا۔ انھیں ناکافی اور بچی کھچی چیزیں کھانے کو ملتیں۔ گرمی کی جلتی دوپہروں میں جب دوسرے کمروں میں خدمت گار چھت سے لٹکے پنکھے کھینچ رہے ہوتے اور گھر کے کنووں میں برف ڈالی جاتی تو نوکروں کو حکم ہوتا کہ بچی کھچی ٹھلیوں صراحیوں اور آب خوروں کا پانی رحمت بی بی کی طرف بھیج دیا جائے۔ ان کے بستر اور لباس پرانے ہو گئے مگر نئے بننے کی نوبت نہ آئی کہ رحمت بی بی کسی کی خوشامد کو عار سمجھتی تھیں۔ موسمِ سرما کی یخ بستہ، طویل اور تاریک راتوں میں جب روئی ٹوٹے لحاف بچوں کو گرم نہ کر پاتے تو کبھی ایک بچے کو سینے سے لگا کر سوتیں کبھی دوسرے کو کہ اگر بیمار پڑ جاتے تو کوئی پرسانِ حال نہ ہوتا اور مر جاتے تو جھوٹی آہ وزاری کے بعد سب سکھ کا سانس لیتے کہ جائداد کے اصل وارث مر جائیں تو مسئلہ ہی کیا رہ جاتا ہے۔

عورتوں کو جب حال میں کچھ میسر نہیں ہوتا تو ان کے سارے خواب بچوں کے مستقبل کے گرد گھومتے ہیں۔ رحمت بی بی نے بھی ایسے سیکڑوں خوابوں کا تانا بانا بن رکھا تھا کہ ساجد جوان ہو کر پڑھ لکھ کر ضرور اس قابل ہو جائے گا کہ اپنا حق مانگ سکے۔ تب ان کے سارے دلدّر دور ہو جائیں گے۔ یہ خواب نہ جانے کس مسالے کے بنے ہوئے تھے جو سردی میں ان کے یخ بدن کو گرمی پہنچاتے تھے اور گرمی میں جلتے جسم اور پھنکتی روح پر ٹھنڈے پھائے بن جاتے تھے۔

قدرت کی یہ مہربانی کیا کم تھی کہ ان کا حق چھیننے والوں میں سے ہی ایک یعنی عمر خان ان کا طرف دار تھا۔ وہ ساجد سے پہلے بھی اکثر کہا کرتا تھا کہ وہ ذرا اور بڑا ہو جائے تو اسے تعلیم کے لیے اپنے ساتھ علی گڑھ لے جائے گا۔ حیات چاچا کی روایت کو وہ آگے بڑھانا چاہتا تھا۔ ایسے موقع پر گل جان ضرور پوچھتی، ''اور لالہ مجھے؟''

''تیرے لیے میں چاچا سے کہہ کر ایک انگریز گورنس رکھوا دوں گا، تو اس سے پڑھا کرنا۔''

گل جان اس بات سے بہت خوش ہوئی۔ بدقسمتی سے ساجد کے علی گڑھ جانے اور گل جان کے لیے گورنس آنے سے پہلے ہی ان کے بابا کا عدم سے بلاوا آ گیا۔ چند روز بعد عمر چھٹیاں گزار کر واپس علی گڑھ جانے لگا تو اس نے بابا سے کہا، ''میں ساجد کو اپنے ساتھ علی گڑھ لے جانا چاہتا ہوں۔ اگر آپ تھوڑا سا زیادہ خرچ بھیج دیں تو ہم دونوں کا گزارا ہو جائے گا۔ ساجد کے وہاں ہونے سے مجھے بڑا آرام رہے گا۔''

بابا جو کالج اور یونی ورسٹی کے ماحول سے ناآشنا تھے، مطمئن ہو گئے۔ وہ سمجھے کہ عمر اپنے ذاتی کاموں کے لیے ساجد کو ساتھ لے جانا چاہتا ہے۔ ساجد کی دوری رحمت بی بی کے لیے نہایت عمدہ سزا بھی ہو سکتی ہے۔ انھوں نے سوچا۔ اس وقت تک رحمت بی بی اپنے شوہر کے دونوں بھائیوں کو بطور امیدوار رد کر چکی تھیں اور عمر اور حیات چاچا ان سے شادی کرنے سے انکار کر چکے تھے۔

ساجد تو عمر خان کے ساتھ علی گڑھ چلا گیا لیکن گل جان کے لیے کوئی انگریز گورنس نہ آئی۔ وہ اپنے خاندان کی دوسری لڑکیوں کی طرح جاہل، تنگ دل اور بد دماغ اٹھ رہی تھی۔ البتہ اسے گاؤں کی ہنرمند لڑکیوں کی طرح تارکشی اور پھلکاریاں بنانا خوب آ گیا تھا۔ تائی اور چچی کوشش کرتی تھیں کہ کم از کم لڑکی کو اپنی مرضی کے تابع کر لیں۔ ماں کی طرف سے اس کا دل خراب کیا جاتا تھا کہ انھیں ہر قسم کی سہولت اور آسائش کی پیش کش کی جاتی ہے مگر وہ مارے اکڑ کے اپنے بچوں کو تکلیف میں رکھنے پر مصر ہیں۔ گل جان ان کی باتوں پر اعتبار کر کے ماں کی طرف سے کھنچی کھنچی رہتی تھی اور زیادہ وقت حویلی کے دوسرے حصوں میں گزارتی تھی۔

اگلے چند سال ملک کے لیے بھی اور عمر خان کے خاندان کے لیے بھی غیر متوقع واقعات سے پُر تھے۔ کانگریس، مسلم لیگ اور سکھوں نے جب ۳؍جون ۱۹۴۷ء کا منصوبہ قبول کر لیا تو آزادی اور تقسیم سے تعلق رکھنے والے ہر افسر کی میز پر گورنر جنرل ماؤنٹ بیٹن کے حکم سے ایک خصوصی کیلنڈر رکھ دیا گیا تھا جو یہ بتاتا تھا کہ ہندوستان کی آزادی اور پاکستان کے قیام میں اب کتنے دن باقی ہیں، جیسے اہم کاموں کے وقت الٹی گنتی گنی جاتی ہے۔ دس، نو، آٹھ سات.......روز ایک دن کم ہوتا جاتا تھا۔ کام کرنے والے افسران اور ان کا عملہ دن میں سیکڑوں مرتبہ اس کیلنڈر پر درج ہندسہ دیکھتے تھے۔ ہندوؤں کو محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ہندسہ آنکھیں جھپک رہا ہو اور گنگنا رہا ہو۔

سنو گجر کیا گائے......سمے گزرتا جائے......

اور مسلمانوں کو دور سے اونٹوں کی گھنٹیوں کی ٹنن ٹنن سنائی دیتی اور ان کے حدی خوانوں کی آواز:

تیز ترک گامزن منزل ما دُور نیست

اور کام کرنے والے اپنے کام کی رفتا تیز تر کر دیتے۔

آزادی کی منزل انگریز، ہندو اور مسلمان، سب کی توقع کے خلاف سامنے آ کھڑی ہوئی تھی۔ بہزاد کے مصرعے کے مصداق ''منزل کی طرف دو گام چلوں اور سامنے منزل آ جائے''— صرف سامنے نہیں آئی تھی بلکہ قدموں قدموں چل کر نزدیک تر آ گئی تھی۔

منزل کے نزدیک تر آنے میں یقیناً اس فضا کا ہاتھ تھا جو بقول لارڈ اسمے (ismay) بجلی سے بھری ہوئی تھی۔ کان کسی وقت بھی پھٹ سکتی تھی۔ یہ بات طے ہو چکی تھی کہ جون سے پہلے ہندوستان کو آزادی دے دی جائے گی لیکن یہ بات کسی کے خواب وخیال میں بھی نہیں تھی کہ یہ تاریخ ۱۵ر اگست ۱۹۴۷ء ہو جائے گی۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے تہیہ کر لیا تھا کہ وہ ہندوستانیوں کو آزادی دے کر ہی دم لے گا۔ اس نے کہا تھا کہ اگر مجھے لارڈ ویول کی جگہ جانا ہے تو میں یہ صرف اس صورت میں قبول کروں گا کہ میرا تقرر کسی صورت میں اس بات کا اظہار نہ کرے کہ میری شکل میں ''ڈریائیت'' کی میعاد بڑھائی جا رہی ہے۔ اس نے انگریزوں کے ملک چھوڑ دینے کی ایک تاریخ مقرر کرنے پر زبردست اصرار کیا تھا۔ اس کے لیے اس نے ڈھیروں خطوط وزیر اعظم ایٹلی کو لکھے تھے اور شاہِ وقت سے بھی جس سے اس کی رشتے داری تھی، بات چیت کی تھی۔

تاریخ کا تعین ہوا تو ردِعمل ہوا۔ اِدھر آزادی کی دیوی کے دیدار کی امید میں دل کی دھڑکنیں تیز تر ہو رہی تھیں اُدھر فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔

ہندوؤں کا خیال تھا کہ بنگال اور پنجاب کی تقسیم پر مسلمان آمادہ نہیں ہوں گے اور بالآخر پاکستان کا دعویٰ دھرا رہ جائے گا۔ مگر پنجاب کے مسلمان پنجاب کی تقسیم پر تیار ہو گئے۔ بنگال کی لجسلیٹو اسمبلی میں جب اکثریت نے یہ فیصلہ دے دیا کہ پورا بنگال پاکستان میں شامل ہوگا، تب آخر کار ہندو اکثریت نے مجبوراً تقسیم کے حق میں فیصلہ دے دیا۔ چناں چہ بنگال کی تقسیم ان ہندوؤں اور کانگریسیوں کے ہاتھ عمل میں آئی جن کے بزرگوں نے ۱۹۰۵ء میں تقسیمِ بنگال کے موقعے پر سخت ہنگامہ کیا تھا۔ یہاں تک کہ انگریزوں کو یہ تقسیم منسوخ کرنی پڑی تھی۔

شمالی مغربی سرحدی صوبے میں عوام کی اکثریت پاکستان کی طرف مائل ہوتی جا رہی تھی۔ اس سلسلے میں علی گڑھ اور دوسرے کالجوں کے لڑکوں نے جن میں عمر خان اور اکبر خان بھی شامل تھے، بہت کام کیا تھا۔ عوام علما کی بات بہت مانتے ہیں اس لیے پاکستان کے حق میں علما کے فتوے اور خود

علما کو لے کر گاؤں گاؤں پاکستان کا مطلب سمجھاتے پھرتے تھے۔ سرحد کے مسلمان یہ نکتہ پا گئے تھے کہ جب ان لوگوں نے انگریز کی غلامی پسند نہیں کی اور اس سے ہمیشہ لڑتے رہے تو آزادی ملنے کے بعد وہ ہندوؤں کی غلامی کیسے قبول کر سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں پشتو، انگریزی اور اردو میں چھپنے والے ہفتہ وار اور روزنامہ اخباروں نے بھی بہت کام کیا تھا۔ خیبر میل، الجمعیت، نوجوان افغان اور ہفتہ وار ''مظلوم دنیا'' سب نہایت پرجوش خبریں چھاپتے تھے۔ مضامین اور نظمیں لکھواتے تھے۔

''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ۔'' مسلم لیگ کے جلسوں کے بارے میں داستانی انداز میں خبریں شائع ہوتی تھیں۔ ''انسانی سروں کے بحرِ مواج میں پاکستانی پرچم کا فراٹے لینا اور مجاہدینِ اسلام کی زرق برق پوشاکوں کا چرخِ نیلی فام کو شرمندہ کرنا۔''

قائداعظم کے کہنے پر صوبہ سرحد میں جب سول نافرمانی کی تحریک شروع ہوئی تو ۲ر اپریل ۱۹۴۷ء کے الجمعیت نے لکھا: ''مسلمانانِ سرحد نے جیلوں کو بھر دیا۔ وزارتِ سرحد مسلمانوں کی بے مثال ایثار و قربانی سے بوکھلا گئی۔''

صوبے کی کانگریس وزارت تو اسی وقت بوکھلا گئی تھی جب پنڈت نہرو نے اکتوبر ۱۹۴۶ء میں وزیر اُمورِ خارجہ کی حیثیت سے شمال مغربی سرحدی صوبے کا دورہ کیا تھا اور ان کا استقبال اس صوبے میں بھی اور قبائلی علاقے میں بھی کالی جھنڈیوں سے کیا گیا تھا اور بعض جگہ کار پر پتھراؤ بھی ہوا تھا۔

جون میں صوبہ سرحد اور سلہٹ میں استصواب کا فیصلہ ہوا اور جولائی ۱۹۴۷ء میں کارروائی شروع ہوئی۔ بریگیڈیئر بوتھ کمشنر استصواب مقرر ہوئے۔ پچاس ہزار فوجی چالیس انگریز افسروں کی نگرانی میں اس کام پر مامور ہوئے۔ پولیس کی مدد کے لیے فوج آئی جس میں دہرہ دون سے حیات خان بھی آئے۔ ان کی آمد سے ذرا پہلے عمر علی گڑھ سے لوٹا تھا۔ وہ قدسیہ کو دیکھنے اور اس سے ملنے کو بے تاب تھا مگر ان دنوں وہ دہرہ دون میں نہیں تھی۔ اپنی امی کے ساتھ ان کے آبائی وطن گئی ہوئی تھی۔ عمر خان ساجد کے ساتھ پشاور آ گیا تھا اور رائے شماری میں رائے عامہ ہموار کر رہا تھا۔ میلے کا سا سماں تھا۔ میدانوں میں خیمے لگے ہوئے تھے جہاں بڑی عمر کے لوگ ڈھیلی ڈھالی شلوار قمیص اور سفید پگڑیوں میں، اور جوان جوق در جوق چلے آ رہے تھے۔ ۲۰ر مارچ، ۱۹۴۷ء کو پشاور میں پہلی مرتبہ عورتوں کا جلوس نکلا تھا اور اب مسلمان عورتیں بڑھ چڑھ کر استصواب میں حصہ لے رہی تھیں۔

صوبہ سرحد اور سلہٹ میں دونوں جگہ مسلم لیگ بھاری اکثریت سے جیت گئی۔ سلہٹ آسام کے بجائے پاکستان کا حصہ بننا قرار پایا۔ عمر خان کے ایک بنگالی دوست تاج الدین نے جو ''جونو'' کہلاتا تھا، اس ڈاک بنگلہ نما اسکول کی تصویر بھیجی تھی جہاں ریفرنڈم ہوا تھا۔ اس میں چھالیہ اور ناریل

کے درخت تھے اور بنگلہ زبان میں بینرز لگے ہوئے تھے۔ لوگ چھتریاں لیے قطار میں کھڑے تھے۔
جونو نے ''سلہٹ ہیرلڈ'' کا تراشا بھی بھیجا تھا جس میں استصواب کی تفصیل چھپی تھی۔ اس نے لکھا تھا، لوگ اس فتح پر بے انتہا خوش ہیں۔ بہت سے لوگوں نے جلال بابا کے مزار پر جا کر شکرانے کی نماز پڑھی ہے اور ان کے کبوتروں کو اور تالاب میں پلی ہوئی مچھلیوں کو پیٹ بھر کر کھانا کھلایا ہے۔

انقلاب اور آزادی کا تصور خون اور قربانیوں سے وابستہ ہے۔ ۱۹۴۶ء میں تقسیم کے نام پر فسادات ہوئے تھے۔ کلکتہ، بہار، نوا کھالی اور گڑھ مکتیسر میں دل بھر کے خون کی ہولی کھیلی گئی تھی۔ اب جوں جوں تقسیم کا دن نزدیک آ رہا تھا، دوبارہ خون کی ہولی کھیلنے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس کا علم سب کو تھا مگر سب دامن بچا رہے تھے۔ انگریز جو اس وقت تک امن و امان کے ذمہ دار تھے، اس نازک وقت میں اس پھڈے میں پاؤں اڑا کر آخری وقت میں لوگوں کو مارنے کی بدنامی مول نہ لینا چاہتے تھے۔ لیڈر حضرات خالی خولی بیانات دینے پر اکتفا کر رہے تھے۔ چناں چہ آزادی کی دیوی کا چہرہ دیکھنے سے پہلے ہی خون کی بھینٹ چڑھائی جانے لگی۔ بلوے، آبروریزی، آگ اور خون کے ساتھ دونوں طرف سے نقل مکانی کا عمل شروع ہوا۔

عمر خان اور اکبر خان نے کچھ عرصے کے لیے لاہور جا کر امدادی کیمپوں میں کام کیا اور ہجرت کرنے والوں کے المیوں سے روشناس ہوئے۔ ان کے گھروں پر پے در پے مسلح حملے ہوتے تھے۔ لوگ مارے جاتے تھے۔ املاک لوٹ لی جاتی تھیں، عورتیں اور لڑکیاں اغوا کر لی جاتی تھیں اور گھروں کو آگ لگا دی جاتی تھی۔ ایسی عورتیں بھی تھیں جو اپنے باپ، شوہروں یا بھائیوں کے ہاتھوں ماری گئیں یا گھر کے کنوؤں میں کود گئیں۔ دیہاتوں سے بیل گاڑیوں کے قافلے بوڑھوں، جوانوں، عورتوں اور بچوں کو لے کر سرحد پار کر رہے تھے۔ یہاں آنے والے قافلے بھی تھے۔ راہ میں ان پر حملے ہوتے تھے۔ لڑکیاں اغوا کر لی جاتی تھیں۔ سامان لوٹ لیا جاتا تھا۔ مرد مارے جاتے تھے اور بچا کھچا قافلہ آگے روانہ ہو جاتا تھا۔ ریل گاڑی کے ڈبوں میں جتنے لوگ اندر بیٹھے یا کھڑے ہوتے تھے، اتنے ہی چھتوں پر سوار ہوتے تھے۔ دونوں جگہ تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی تھی۔ رات کے اندھیرے میں نیند سے جھونک کھائے لوگ پھسل کر گر پڑتے تھے اور رشتے دار دریدہ دامنوں سے آنسوؤں خشک کر لیتے تھے کہ یہ موت بہر حال اپنے وطن میں تھی اور غیروں کی سرزمین پر برچھیوں اور بلموں کی موت سے بہتر تھی۔ فاقے اور بیماریوں سے مرنے والوں کی تعداد بھی کم نہ تھی۔ ہندوستان سے آنے والے سرحد پار کر کے اسٹیشنوں پر، کیمپوں میں یا جہاں ٹھکانا ملتا تھا، پڑ جاتے تھے۔ عجب افراتفری اور نفسا نفسی کا عالم تھا، کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔

تقسیم کے مسائل حل کرنے کے لیے جو کاؤنسل بنائی گئی تھی اس کو سب سے پہلے سرکاری ملازمین کا مسئلہ سلجھانا پڑا۔ سرکاری ملازموں کو کسی ایک حکومت میں ملازمت کرنے کا حقِ انتخاب دیا گیا۔ بڑی مشکل سے سردار پٹیل کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ ملازم چاہے تو مشروط فیصلہ کرسکتا ہے اور چھ ماہ میں اپنے آخری فیصلے کا اظہار کرسکتا ہے لیکن فسادات نے اس حق کو تقریباً ختم کردیا۔

عملے کی نقل و حرکت کی منصوبہ بندی اور انتظام کے لیے دہلی میں ایک دفترِ تبادلہ اور کراچی میں ایک دفترِ استقبالیہ بنا دیا گیا۔ دہلی سے تقریباً ۲۵ ہزار افراد اور ان کے ذاتی ساز و سامان کو سرکاری ریکارڈ کے ساتھ منتقل کیا جانا تھا۔ تبادلے کا کام یکم اگست کو شروع ہوا اور روزانہ ایک اسپیشل ٹرین روانہ کی جانے لگی۔ ان پر بھی حملے ہوتے رہے۔ ملکی اور غیر ملکی ہوائی جہاز چارٹر ہوئے، اور بہت سے لوگ ان کے ذریعے اس سرزمین میں پہنچے۔ پنجاب سے سکھوں اور ہندوؤں کے قافلے اسی طرح لٹ پٹ کر ہندوستان کی طرف رواں دواں تھے۔

۱۴ راگست کا جشنِ آزدی دیکھنے کے لیے عمر خان اور اکبر خان پشاور چلے آئے۔ آنے والوں کے مسائل بڑے اور گمبھیر تھے۔ ان کو بسانا دو چار دن کی بات نہیں تھی۔ نئے خون نے آزادی کے لیے جدوجہد کی تھی۔ وہ جشنِ آزدی میں شامل ہونا اور کسی بڑے کام کے بعد آرام کرنا اپنا حق سمجھتے تھے۔ پشاور میں تمام بڑے بڑے بازار سبز جھنڈیوں سے سجے ہوئے تھے۔ خصوصاً قصہ خوانی بازار، جہاں ۲۳ راپریل ۱۹۳۰ء کو انگریز سپاہیوں نے ٹینکوں سے ہجوم پر حملہ کیا تھا اور سیکڑوں نہتے لوگوں کو مارا تھا۔ دکانوں پر سبز جھنڈیاں پاکستان کے پھریرے اور برقی قمقمے لگے ہوئے تھے۔ جگہ جگہ مفت کھانا تقسیم ہو رہا تھا۔ سرکاری دفاتر پر قومی جھنڈے لہرائے گئے تھے۔ سرکاری عمارتوں پر چراغاں کیا گیا تھا۔ فوجی لاریاں پاکستان زندہ باد کے نعروں سے گونجتی اِدھر سے اُدھر پھر رہی تھیں۔ ریڈیو پشاور قومی نغمے بجا رہا تھا۔ صبح سحری کے وقت تک بازاروں میں اس قدر بھیڑ تھی کہ کھوے سے کھوا چھل رہا تھا۔ یہ ۲۷ ررمضان کی رات تھی۔

دوسرے دن دونوں اپنے گاؤں لوٹ آئے۔ یہاں آکر پتا چلا کہ حیات چاچا اپنے کنبے کے ساتھ خیریت سے پاکستان پہنچ گئے تھے۔ چند دن راول پنڈی رہنے کے بعد وہ رسال پور چلے گئے تھے۔ جہاں ان کی پوسٹنگ ہوگئی تھی۔ اس مرتبہ بھی حیات خان کے اپنے گاؤں نہ آنے کی بات کو سب نے بہت محسوس کیا تھا۔

مقامی لوگ جلد ہی بحالیِ مہاجرین کے پیچیدہ مسائل سے اکتا کر اپنے روز مرہ کے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ کراچی، لاہور، پشاور اور دیگر شہروں میں نئی مملکت کے بے شمار مسائل تھے۔ لاکھوں بے گھر، بے در لوگوں کا آنا اور ان کا بسایا جانا، گھروں کی کمی، ملازمتوں کی بے یقینی، مہاجر کیمپوں میں خوراک کی فراہمی۔ بارشوں اور بیماریوں نے ان مسائل کو اور الجھا دیا تھا۔ اغوا شدہ عورتوں کا نکالنا اور دوبارہ بسانا۔ انتظامیہ کے اپنے مسائل تھے، دفاتر اور ساز و سامان کی کمی۔ اسکولوں کی کمی۔ فوج کی منتقلی اور فوجی ساز و سامان کی فراہمی ــــ جمے جمائے کھاتے پیتے لوگ بے در ہوئے پڑے تھے اور ازسرِ نو پاؤں پر کھڑے ہونے کی تگ و دو کر رہے تھے۔ کچھ موقع پرست لوگ ان بے ٹھکانا حالات سے فائدہ اٹھا کر اپنے گھر بھرنے میں لگے ہوئے تھے۔ اس سارے ہیجان کا اثر دور دراز کے دیہاتوں تک بس اتنا ہی تھا جیسے کسی تیز بھنور کی شدت کنارے تک پہنچتے پہنچتے اپنا سارا کس بل کھو کر ننھی منی لہروں میں تبدیل ہو چکی ہو اور کنارے کی ریت کو اس پیار سے چھوئے جیسے عاشق اپنے محبوب کو چھوتا ہے۔

عمر خان اور اکبر خان گاؤں پہنچے تو انھوں نے دیکھا کہ ان کے علاقے میں جو چند ہندو اور سکھ گھرانے تھے، وہ جا چکے ہیں۔ البتہ ایک سکھ راج کا بیٹا دلدار سنگھ ابھی موجود تھا۔ اس بات نے خاصی سنسنی پھیلا رکھی تھی، کیوں کہ وہ یہاں رہ پڑنے کی کوئی خاص وجہ نہیں بتاتا تھا۔ کبھی کہتا تھا کہ وہ اپنا گھر فروخت کر کے جائے گا اور کبھی کہتا تھا کہ اس نے یہیں رہنے کا فیصلہ کیا ہے، آخر یہ اس کا وطن ہے۔

دوسری سنسنی خیز بات حاکم خان کی وطن میں آمد تھی۔ حاکم خان اور زمان کے والد رشتے کے

بھائی تھے۔ مدت ہوئی حاکم خان اپنے والد کے انتقال کے بعد زمینیں بیچ باچ بہت سا روپیا لے کر بمبئی چلے گئے تھے۔ گئے تھے کاروبار کے خیال سے لیکن بمبئی پہنچ کر یہ بات ذہن میں آئی کہ ملک و ملت کے مفاد میں ایک اردو اخبار نکالا جائے۔ تجربہ حاصل کرنے کے لیے کچھ دن ''خلافت'' اخبار میں کام کیا اور پھر اپنا ایک اخبار نکالا۔ اخبار نہ چل سکا اور سارا روپیا ڈوب گیا۔

اس کے بعد حاکم خان نے جہاں گردی اختیار کی۔ کلکتہ چلے گئے۔ بنگلہ سیکھی اور مولانا اکرم خان کے بنگالی اخبار ''آزاد'' میں کام کیا۔ مولانا اکرم خان آل انڈیا مسلم لیگ کنونشن میں لکھنؤ آئے تو ان کے ساتھ لکھنؤ چلے آئے اور راجا محمود آباد کے جاری کردہ اخبار ''ہمدم'' میں مولانا عبدالباری کے زیرِ نگرانی کام کرنے لگے۔ اردو شستہ لکھتے تھے۔ اب نہایت فصیح اردو شین قاف کی درستی کے ساتھ بولنے لگے۔ بعد ازاں لاہور چلے آئے اور مولانا غلام رسول مہر اور عبدالمجید سالک کے اخبار ''انقلاب'' سے وابستہ ہو گئے۔

۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال کے الٰہ آباد کے خطبے کی تائید کرنے والا کوئی اخبار تھا تو یہ ''انقلاب'' تھا۔ ۱۹۳۵ء کے بعد سے اس میں مستقل پاکستان پر مضامین شامل ہوتے تھے جن میں سے اکثر حاکم خان نے مختلف قلمی ناموں سے لکھے تھے۔ انگریزوں کی مخالفت میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہے تھے۔

جب کسی اخبار کی ملازمت سے دل اکتاتا تو کسی اسکول یا کالج میں پڑھانا شروع کر دیتے۔ جس زمانے میں بچوں کو انگریزی راج کی برکات رٹوائی جاتی تھیں، آپ انگریزی حکومت کی مکر وہات گنواتے۔ ابتدا میں جس طرح انگریزوں نے ہندوستان کو لوٹا اور اس کی صنعت پارچہ بافی کو نقصان پہنچایا وہ الگ۔ جنگ کے زمانے میں اس قدر سامان یہاں سے باہر بھیجا گیا کہ ہندوستان دانے دانے کو ترس گیا۔ کاغذی نوٹ چھاپ چھاپ کر افراطِ زر پھیلایا۔ یہاں تک کہ سارا ملک کنگال ہو گیا۔ بنگال کے قحط کا ذمہ دار بھی انگریز تھا۔ وغیرہ — نتیجہ ظاہر ہے شکایت ہوتی اور بہت جلد نکالے جاتے۔ پھر کسی اور جگہ قسمت آزمائی کرتے۔ اس جہاں گردی میں شادی کی نہ کچھ جمع جوڑا — پاکستان بنا تو جیسے گنگا نہائے۔ وطن کی محبت نے جوش مارا اور واپس چلے آئے۔ جس وقت گاؤں پہنچے تو تانگے سے ایک بڑا سا کرم خوردہ لکڑی کا بکس اتارا گیا جس میں اخباروں کے فائل اور کتابیں ہی کتابیں تھیں۔

اس عرصے میں والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ بہنیں بیاہ کر دور جا چکی تھیں۔ بھائی تلاشِ معاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ آپ نے اپنے گاؤں ''غازی'' کے پاس کی اپنی جھاڑ جھنکاڑ سے اٹی تھوڑی سی زمین صاف کی۔ وہیں کنوئیں کے پاس درختوں کے سائے میں ایک جھونپڑی بنائی اور کھیتی باڑی شروع کر دی۔ ایک بکری اور چند مرغیاں پال لیں۔ فارغ اوقات میں نئے یا پرانے اخبارات پڑھا

کرتے اور مضامین لکھا کرتے۔

گاؤں کا کوئی ہونہار بچہ پڑھنے آجاتا تو بڑے خوش ہو کر پڑھاتے۔ یوں تو ہر مضمون پڑھا سکتے تھے لیکن تاریخ ان کا محبوب مضمون تھا، بلکہ خود زندہ تاریخ تھے۔ جلیانوالہ باغ کا واقعہ تو شاید کانوں سنا ہو لیکن اور بہت سی کانفرنسوں اور واقعات کے چشم دید گواہ تھے۔ علامہ اقبال کو شاہی مسجد میں جنگِ بلقان پر نظم پڑھتے دیکھ اور سن چکے تھے۔ گاندھی، نہرو اور قائداعظم کو شملہ میں چہل قدمی کرتے کئی بار دیکھا تھا۔ اور اب ۱۴ اگست کے تاریخی دن کراچی جا پہنچے تھے۔ جہاں قائداعظم کو حلف اٹھاتے اور پھر کھلی کار میں لاکھوں کے مجمع کو ہاتھ ہلاتے دیکھ آئے تھے۔

عمر خان اور اکبر خاں بھی ان کے پاس جا کر بیٹھتے۔ ان کی کتابوں اور تجربات سے استفادہ کرتے۔ اکبر خان کے والد طاہر خان کو وہ پسند کرتے تھے لیکن عمر خان کے والد زمان خان سے ان کی پل بھر نہ بنتی تھی۔ خود زمان خان بھی ان کے علم اور تجربوں سے ذرا بھی مرعوب نہ تھے۔ بلکہ اکثر فارسی کا یہ سنا سنایا مصرع ''جہان گرد بسیار گوید دروغ'' دہرایا کرتے تھے ان کے نزدیک حاکم خان ایک کاہل اور نکھٹو رشتے دار تھے۔ تنگِ خاندان کہ کمیوں کی طرح رہتے تھے اور اپنی غربت سے نکلنے کے لیے ذرا بھی ہاتھ پاؤں نہیں مارتے تھے۔ زمان خان کی حویلی میں کوئی تقریب ہوتی تو حاکم خان سب سے آخر میں آتے اور سب سے پہلے اٹھ کر چلے جاتے۔ زمان خان جس طرح ان کا استقبال کرتے، اس میں کوئی نہ کوئی پہلو توہین کا ضرور نکلتا۔

''لو بھئی، اپنا حاکم خان آ گیا۔'' وہ لفظ حاکم پر زور دے کر کہتے، ''اب اس کا حکم چلے گا—'' ظاہر ہے کہ حاکم خان کا حکم تو اپنی بکری اور مرغیوں پر بھی نہیں چلتا تھا۔ بہت سے لوگ مسکراتے اور بعض چھپے کھلے بندوں ہنس دیتے۔ کبھی کبھار وہ حاکم خان کے بجائے افسر خان کہتے۔ کبھی کمانڈر اور کبھی جرنیل کہہ کر پکارتے۔ حاکم خان ہنس کر ٹال جاتے۔ خود ان کو بھی یہ نام پسند نہ تھا۔ لیکن اپنے نام پر کسی کا بس نہیں چلتا۔ یہ بھی ایک میراث ہے جو ایک نسل سے دوسری کو ملتی ہے۔ نام اچھا ہو تو خیر— برا ہو تو بزرگوں کے قرض یا ورثے میں ملی ہوئی بیماری کی طرح بھگتنا ہی پڑتا ہے۔

اِدھر حاکم خان کی رائے زمان خان کے بارے میں تھی کہ ان کے پُرکھوں کی کوئی بھی صفت ان کے ہاں راہ نہ پا سکی ہے، البتہ خامیاں جہاں کہیں بھی ہوں گی شجرے کے درخت کی شاخوں سے ہوتی ہوئی پکے پھل کے رس کی طرح ان میں سما گئی ہیں۔ ان میں نہ ترکوں کی سی ہمت اور شجاعت ہے اور نہ افغانی طنطنہ۔ لے دے کر ایک انا ہے جو بے ثمر دولت اور بے جا غصے کے بل پر پل رہی ہے۔ علم سے انھیں محبت نہ علم پروری اور علم نوازی کا دماغ۔ محبت، چاہت جو کچھ ہے، دولت سے ہے۔ زمین اس کا

وسیلہ اور عورت ان وسیلوں کا وسیلہ ہے۔ ان کی شادی مہر خان جیسے بڑے گھر میں نہ ہو سکی اس کا انھیں ہمیشہ قلق رہا اور رہے گا۔ اولادِ نرینہ عزیز ہے اور اس کے ناز اُٹھانے کو کسی حد تک تیار ہیں تو وہ بھی اس لیے کہ نام تو بیٹے ہی سے چلتا ہے۔ بیٹیوں سے تو اکثر دشمنوں اور 'تربوزوں' کے نام بھی چلتے ہیں۔

رفتہ رفتہ جیسا کہ عموماً زیادہ پڑھ لکھ جانے والے لیکن دنیا میں ناکام رہنے والوں کا طریقہ ہوتا ہے، حاکم خان نے دنیاداری سے کنارہ کشی اختیار کی۔ زمان خان کے بارے میں کچھ کہنا یا ان سے ملنا جلنا بھی ترک کر دیا۔ مسجد کے مولوی کی بیٹی محمدی بیگم سے جو تھوڑی بہت اردو فارسی پڑھی ہوئی تھی اور گھر میں بیٹھی بیٹھی بوڑھی ہو رہی تھی، نکاح پڑھوا لیا اور ہنسی خوشی رہنے لگے۔

ابھی چند ہی ماہ گزرے تھے کہ دلدار سنگھ اور اس کے پڑوسی کی بیٹی زلیخا کے بارے میں چہ میگوئیاں ہونے لگیں۔ اس سے پہلے کہ بات زیادہ بڑھے اور خون خرابہ ہو، حاکم خان درمیان میں پڑے۔ ان کے کہنے سے دلدار سنگھ مسلمان ہو گیا اور زلیخا سے نکاح پڑھوا لیا۔ یہ کام حاکم خان کے مولوی سسر نے انجام دیا، اور نکاح بھی انھوں نے پڑھایا۔ دلدار سنگھ کا اسلامی نام عبدالغنی رکھا گیا۔ اس موقعے پر اکبر خان کی والدہ (جنھیں وہ بے بے کہتا تھا) کا اصرار تھا کہ زلیخا کا نام بھی بدل دیا جائے کہ ایسے رومانوی نام خواہ مخواہ اسکینڈل پھیلانے کا سبب بنتے ہیں۔ چناں چہ زلیخا کا نام زینت بی بی رکھ دیا گیا۔ گو لوگ ایک مدت تک اسے زلیخا کے نام سے ہی یاد کرتے رہے، جو فی الحال ہم بھی کریں گے۔

دلدار سنگھ زلیخا کو بیاہ کر گھر لایا تو اسے پھولوں کی سیجوں پر رکھا۔ اس کے منھ سے نکلی بات دلدار سنگھ کے لیے حکم سے بھی بڑھ کر تھی۔ لڑکیاں اور عورتیں یوں دلدار سنگھ کو زلیخا کے ناز اٹھاتے دیکھتیں تو جلتیں۔ چناں چہ ایک طرح سے اس کا سوشل بائیکاٹ کر دیا گیا اور اسے ہرگز عبدالغنی نہ کہا گیا تاکہ یہ بات سامنے رہے کہ زلیخا نے ایک سکھ سے شادی کی ہے۔ وہ زلیخا کو لے کر حسن ابدال کے بابا قندھاری کے مزار پر گیا تو پورے گاؤں میں مشہور ہو گیا کہ دلدار سنگھ زلیخا کو پنجہ صاحب کی زیارت کے لیے لے کر گیا ہے۔

حاکم خان نے یہ دیکھ کر طاہر خان سے درخواست کی کہ وہ عبدالغنی کو ایبٹ آباد میں بننے والی اپنی کوٹھی پر رکھوا دیں کہ اسے اینٹیں بنانے سے لے کر مکان کی تعمیر تک کا کچھ تجربہ تھا۔ وہ عاشق مزاج ضرور تھا مگر محنتی اور ایمان دار تھا۔ چناں چہ طاہر خان نے اسے اپنی نئی تعمیر ہونے والی کوٹھی کی نگرانی کے لیے ایبٹ آباد بھجوا دیا۔ زلیخا اس بات پر بہت خوش ہوئی کہ ایبٹ آباد ایک پہاڑی مقام تھا۔ کل تک انگریزوں کی چھاؤنی تھی اور اس کی ساکھ چھوٹے موٹے دیہاتوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھی۔

ان دونوں کے ایبٹ آباد چلے جانے کے بعد گاؤں میں بے رونقی سی ہو گئی جیسے کسی میلے کے جانے کے بعد دھول سی اڑنے لگتی ہے۔

چیڑ کی پہاڑی پر شہزادہ بخارا کا خیمہ، زیرِ تعمیر اکبر منزل سے زیادہ دور نہ تھا۔ اس شہزادے کا چھوٹا سوتیلا بھائی عمر خان کا دوست تھا اور اسی کے ساتھ علی گڑھ میں پڑھتا تھا۔ وہاں وہ شہزادہ بخارا کہلاتا تھا۔ گھر سے سو روپیا جیب خرچ آتا تھا جو طالب علموں کے اس زمان میں آنے والے جیب خرچ میں سب سے زیادہ تھا۔ عمر کے گھر سے کچھ کم پیسے آتے تھے مگر وہ بھی شاہانہ ٹھاٹھ باٹھ سے رہتا تھا۔ شہزادہ بخارا اور عمر خان کی دوستی مکمل اور بھرپور تھی۔ چھٹیوں میں ساجد شہزادے کے ساتھ علی گڑھ سے آیا کرتا تھا۔ شہزادہ اسے آبائی گاؤں ''ٹوپی'' میں چھوڑ کر سری کوٹ کے بلند و بالا گاؤں کے چھوٹے راستے سے ایبٹ آباد پہنچ جاتا تھا اور یوں عمر خان کے لیے تنہا دہرہ دون جانا ممکن ہو جاتا تھا۔

یہ بات بھی ان کے درمیان طے تھی کہ جب ذرا بڑا ہو کر ساجد خان اپنے تایا خان زمان خان کے خلاف جائداد کا مقدمہ کھڑا کرے گا تو اس کی امداد اکبر خان کے والد طاہر خان اور شہزادہ بخارا کریں گے۔

عمر خان جب بھی ایبٹ آباد آتا، چھوٹے شہزادے کے ساتھ اس کے دق زدہ بھائی سے ملنے اس خیمے پر ضرور جاتا جو اس کا گھر بھی تھا اور اسپتال بھی۔ اس زمانے میں چیڑ کی ہوا، بے فکری اور اچھی غذا ہی دق کا علاج تھی۔ عمر خان اور اکبر خان کو شہزادے کا سارے تام جھام کے ساتھ لمبے چوڑے سائیں سائیں کرتے چیڑ کے درختوں کے سائے میں رہنا بڑا رومانوی سا نظر آتا تھا۔ وہ اس مہلک مرض کی چھوت سے بے نیاز شہزادے سے سقوطِ بخارا و سمرقند کی داستانیں سنا کرتے تھے۔ بے چارہ شہزادہ اس اکیلے کو رنگین بنانے کے لیے اپنی پھولی ہوئی سانسوں کے درمیان خون تھوکتا جاتا تھا۔

وسط ایشیا میں جدیدیت کی پہلی لہر تقریباً اسی زمانے میں محسوس کی گئی تھی جب روس میں زار کے خلاف ایک نئے انقلاب کی تیاری ہو رہی تھی۔ یہ جدیدیت شروع میں قانون، طرزِ تعلیم اور طرزِ معاشرت میں چند تبدیلیوں کا نام تھی۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ تحریک رُوس کے انقلاب کے زیرِ اثر آ گئی اور ۱۹۱۷ء میں رُوس کے انقلاب کے ساتھ اُس نے اور زور پکڑا۔ امیر عالم خان کی زارِ رُوس سے دوستی تھی۔ اُس کی ہم دردیاں بھی زار نکولس کے ساتھ تھیں مگر یہاں جو نوجوانانِ بخارا پارٹی وجود میں آئی وہ انقلاب رُوس کی طرف دار تھی۔ چناں چہ اس سلسلے میں امیر عالم خان کی نظریں برطانیہ کی طرف اُٹھیں۔ نومبر ۱۹۱۴ء میں انگریزوں کا ایک تجارتی وفد کرنل بیلی کی سربراہی میں (حسبِ عادت) کپاس کے سودے کے بہانے وسط ایشیا پہنچا تھا، اور وہاں سُرخ خطرے کی بُو سُونگھ چکا تھا۔ مگر افغان جنگوں کی وجہ سے انگریزوں کو اپنی ساری فوجیں ہندوستان کی سرحدوں پر منتقل کرنا پڑیں۔ اُدھر سُرخ فوجوں نے زار کے جنرل کو پسپا کر دیا، جس سے ماسکو اور ترکستان کا درمیانی راستہ کھل گیا۔

نظریات اور ضروریاتِ زندگی کی جنگ تبلیغ و اشاعت کے ذریعے پہلے سے جاری تھی اور پرانے نظریات بہت کچھ نئے نظریات کے آگے ہار مان چکے تھے۔ چناں چہ جب سُرخ فوجوں نے بخارا کی طرف بڑھنا شروع کیا تو ایک کے بعد دوسرا شہر اُن کے قبضے میں چلا گیا۔ اب صرف بخارا ہی تھا جہاں لڑائی ہو سکتی تھی۔ وہاں بھی تبلیغ و اشاعت جاری تھی۔ ترکستان کے غریب فاقہ کش بھوکوں مر رہے تھے۔ یہ لوگ اُن کی مدد کرتے تھے۔ بخارا کی انقلابی پارٹی اور رُوس کے حُریت نواز ایک ہو گئے تھے۔

ایسے میں امیرِ بخارا نے برطانوی سفیر سے درخواست کی کہ اس کا تیس کروڑ روپیا برطانیہ پہنچا دیا جائے مگر یہ ممکن نہ ہو سکا۔ آس پاس کے بہت سے شہروں پر انقلابیوں کا قبضہ ہو چکا تھا۔ بخارا کے گرد خندقیں کھودی جا چکی تھیں۔ ۳۰ راگست کو بخارا کا محاصرہ کیا گیا اور تین دن تک ایسی سخت جنگ ہوئی کہ باید و شاید۔ فصیل کے نزدیک ایک قبرستان تھا جو کبھی ایک فوج کے قبضے میں ہوتا کبھی دوسری کے۔ ایسا بھی ہوا کہ باغی قارقلی دروازہ کھول کر اندر داخل ہونے لگے لیکن ملا اور عوام اللہ اکبر کا نعرہ لگا کر توپوں کے دہانے میں گھس گئے اور انھیں اپنے زخمی اور نعشیں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ حملہ آور بار بار پسپا ہوئے مگر آخر کار دیوار میں شگاف پڑ گیا، اور گلیوں میں دست بدست لڑائی شروع ہوئی۔

اس دوران شاہی خاندان فرار ہو کر افغانستان پہنچ چکا تھا۔

۲۴ رمارچ ۱۹۲۱ء کو بخارا کی حکومت سوویت ری پبلک آف بخارا بن گئی۔ سقوطِ بخارا کے بعد بھی گوریلا لڑائیاں جاری رہیں لیکن اندرونی رقابتیں اور خلفشار چلتا رہا۔ انور پاشا اور ابراہیم بک متفق نہیں تھے۔ انور پاشا نے ابراہیم بک کو قید بھی رکھا۔ انور پاشا ایک خون ریز جنگ میں چل بسے تو قیادت پھر

ابراہیم بک نے سنبھالی۔ ادھر انگریزوں نے امیر بخارا کے سب سے بڑے بیٹے کو ہندوستان میں پناہ دے دی کہ کبھی بخارا روس سے واپس چھینا گیا تو تخت کے اصل وارث کو گدی پر بٹھا دیں گے۔

شہزادہ بخارا اور اُس کے نوکروں چاکروں کے لیے بھاری وظیفہ مقرر ہوا۔ دہلی کی گرمی نا قابلِ برداشت تھی اس لیے موسمِ گرما میں پورے لاؤلشکر سمیت پہاڑ پر بھیجنا پڑتا تھا۔ آخر میں طے ہوا کہ انھیں پہاڑ پر ہی بسا دیا جائے۔ چناں چہ انھیں ایبٹ آباد میں جگہ دے دی گئی۔ ملک پورہ اسی شہزادے کے نام پر بنا۔ نزدیک ہی اس نے ایک مسجد بنوائی جہاں نماز پڑھنے جاتا تھا۔ وہ شہزادے کی مسجد کہلاتی تھی۔ ہجرت کے اس سفر میں بیوی اور بیٹا بھی ساتھ تھے۔ واپسی کے خواب دیکھتے دیکھتے بیٹے کو دِق ہوگئی۔ شہزادہ عبدالمالک نے یہاں ایک اور شادی کر لی تھی۔ اس شادی سے جو بیٹا ہوا، وہ عمر خان کا دوست تھا۔

یہ عملی آدمی تھا۔ بخارا اور سمرقند اس کے خوابوں میں کبھی نہیں آئے۔ علی گڑھ میں پڑھتا اور شادی کے نام سے بیزار تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہ سب شان و شوکت باپ کے دم تک ہے۔ جو اپنی آبائی آن بان نباہنے کے لیے خوب خرچ کرتے تھے اور بے انتہا مقروض تھے۔

اُن ہی دنوں قائداعظم کے انتقال کی خبر جنگل کی آگ کی طرح نہیں، آہستہ آہستہ پھیلی تھی۔ خصوصاً دیہاتوں اور دُور دراز کے علاقوں میں۔ لوگ اس خبر پر یقین کرنا نہیں چاہتے تھے۔ جب یقین کرتے تھے تو ہراس پھیلتا تھا— اب کیا ہوگا؟ جیسے بہت بڑا غم تھا جس نے سارے سائبان کو تھام رکھا ہو نیچے آگرا ہو۔ عمرخان اور اکبرخان کے چہروں پر بھی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ آنسو پونچھتے دِل گرفتہ سے حاکم چاچا کے پاس پہنچے تو وہ سکڑے ہوئے اپنی چارپائی کی پائنتی پر بیٹھے تھے۔ جب وہ زیادہ دُکھی ہوتے تو اسی طرح اَدوائن پر بیٹھتے، جیسے یوں بیٹھنے سے انھیں سکون ملتا ہو۔

عمرخان اور اکبرخان کی ہمّت بندھانے کے بجائے وہ ان کے ساتھ روتے رہے۔ ''بدقسمت ہے وہ قوم جس کا لیڈر اسے بیچ منجدھار میں چھوڑ کر چلا جائے۔'' انھوں نے کہا۔ پھر وہ دِھیرے دِھیرے قائداعظم کی موت کی وجوہات کا تجزیہ کرتے رہے— ''اُن کو کینسر نے نہیں مارا تھا، نہ تپِ دق نے، نہ کام کی زیادتی نے— انھیں سیاست نے مارا تھا۔ وہ سیاست میں صدقی صدراست بازی اور اُصول پرستی کے قائل تھے۔ وہ چومکھی لڑائی کے لیے بھی تیار تھے مگر یہ نہیں جانتے تھے کہ سیاست میں کچھ داؤں بہت پیچیدہ اور انڈر ہینڈ بھی ہوتے ہیں۔ جب قائداعظم جیت گئے تو یہ داؤں استعمال کیے گئے— لوگ قیاس آرائیاں کر رہے ہیں کہ شاید انھیں آہستہ آہستہ زہر دیا جا رہا تھا۔ مگر یہی سیاسی اینچ پینچ اُن کے لیے زہر تھے۔ وہ ہر بات کے لیے ذہنی طور پر تیار تھے مگر شاید اس بات کے لیے تیار نہیں تھے کہ جب وہ اپنی خوابوں کی زمین پر پہنچیں گے تو وہاں کٹے پھٹے، ٹوٹے ہوئے جسم، لہر در لہر

اُن کے پیچھے آئیں گے۔ پاکستان کی سرحدیں کاٹ دی جائیں گی اور وہ اپنی مونوکل (monocle) لگی آنکھوں سے ان خون رِستی کٹی پھٹی لکیروں کو بھی دیکھیں گے۔ ان لکیروں کے ساتھ ریاستیں کٹ جائیں گی، صوبے کٹ جائیں گے — قائداعظم اصولی آدمی تھے۔ وہ سمجھتے تھے آدمی جب اُصول پر کوئی بات تسلیم کرلیتا ہے تو اُسے دل سے مان لیتا ہے۔ وہ نہیں جانتے تھے کچھ چیزیں ایسی بھی ہوتی ہیں جنھیں آدمی مجبوراً مان لے تو وہ اُس کی رگِ جاں میں خار کی طرح گڑ جاتی ہیں اور جنھیں نکالنے کے لیے آدمی کسی بھی حد تک جانے کو تیار ہوتا ہے۔

قدسیہ اپنے بنگلے کے لمبے برآمدے سے ہوتی باہر آئی اور لان میں کرسی پر نیم دراز ہوگئی۔ رسال پور میں نومبر کی خوش گوار ہوا اور ہلکی دُھوپ میں لیٹ کر پڑھتے رہنا قدسیہ کا محبوب مشغلہ تھا۔ کیاریوں میں پچھلے سال کے نرگس کے پودے دوبارہ پھوٹنے شروع ہوگئے تھے۔ برآمدے میں لکڑی کے ستونوں سے لپٹی بوگن وِلا، سانوری اور چنبیلی میں چھپی چڑیاں صبح کی نسبت خاموشی سے پُھدکتی پھر رہی تھیں۔ آسمان پر اُڑنے والے سُرخ رنگ کے منے ٹریننگ کے جہازوں میں سے کسی ایک کو اُترنے کی اجازت نہیں ملی تھی۔ وہ احتجاج کی ایک چیخ کے ساتھ دوبارہ بلند ہوا تو قدسیہ نے چونک کر اُوپر دیکھا تھا۔ ان جہازوں کو اُس کا بھائی عبید اور اس جیسی کچی عمروں کے کھڑے بالوں والے کیڈٹ اُڑا رہے تھے۔ یہی لڑکے شام کو لائبریری میں اُن سے بات کرنے کے بہانے بلا پوچھے اُسے قابلِ مطالعہ کتابوں کے نام بتاتے تھے اور میس کی تقریبات میں اُس کے اِردگرد پروانوں کی طرح مُنڈلاتے تھے۔ ان ہی دِنوں بابا نے اسے ایئرفورس کے میس میں جانے اور رقص سیکھنے کی اجازت بھی دے دی تھی جہاں شام کو کئی افسر اور بیگمات اسی غرض سے آتی تھیں۔ پاکستانی خواتین ان دِنوں انگریزی بولنے، برج کھیلنے، رقص کرنے اور انگریزی پکوان سیکھنے کی اَن تھک کوششیں کرتی نظر آتی تھیں۔ جو بیگمات اور افسران انگریزوں کے رنگ ڈھنگ اختیار کر لیتے تھے ان کو اپنے انگریز افسران کے ساتھ گھلنے ملنے میں آسانی ہوجاتی تھی۔ اُن کو بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اور وہ خود بھی اس بات پر فخر محسوس کرتے تھے۔ قدسیہ کے بابا اور امی تو دہرہ دون میں کب سے انگریزوں

کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے آ رہے تھے۔ اس لیے ان کو اس قسم کے تگ و دو کی حاجت نہیں تھی۔

عمر خان باغ کے پھاٹک میں آن کر کھڑا ہو گیا تھا، اور بہت دیر سے چپ چاپ قدسیہ کو دیکھ رہا تھا۔ اچانک قدسیہ کی نظر اُدھر گئی— پہلے کی طرح بھاگ کر اُس سے ملنے کے بجائے وہ خاموشی سے کرسی سے اُٹھ کھڑی ہوئی۔ عمر خاں نے بتایا کہ وہ سوات کی سیر سے لوٹ رہا تھا تو سوچا کہ راہ میں ان لوگوں سے ملتا جائے۔ قدسیہ نے بُردباری سے مناسب حد تک خوشی کا اظہار کیا اور اسے لیے اندر آئی جہاں اُس نے امی کو عمر خان کے آنے کی اِطلاع دی۔

دوپہر کا کھانا سب نے اکٹھا کھایا۔ چاچا حیات اور عبید سے کھانے کے بعد گپ رہی۔ شام کو عبید اور قدسیہ اُسے اپنی چھوٹی سی چھاؤنی دکھانے لے گئے۔ عمر خان کو پوری چھاؤنی ہرا ابھرا کمپنی باغ سا نظر آئی۔ سڑکوں پر بھی سبز تراشیدہ باڑ اور دو رویہ گلاب کھلے ہوئے تھے۔ 'نغظ' کے درخت نیلے آسمان کے پس منظر میں نشاۃِ ثانیہ کی پینٹنگز کے درختوں کی طرح سبزی اور سُرخی مائل کہیں پھلیے پھلیے، کہیں جُھکے جُھکے، کہیں گھنے تہ در تہ بادلوں کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ ان میں سے بعض بوڑھوں کی طرح خمیدہ کمر تھے اور بعض جوانوں کی طرح بلند و بالا اور تنومند۔

قدسیہ اور عبید نے عمر خان کو ایک عجوبہ دکھایا۔ ان درختوں کے گلابی نوک دار تنکوں سے منّے منّے گلابی موتی سے جھڑتے اور زندہ کیڑوں کی طرح اُچھلتے رہتے۔ یہاں تک کہ زمین میں باریک گڑھے پڑ جاتے۔

ایسے ہی خمیدہ کمر درختوں کے سائے میں قدسیہ کا کانوینٹ تھا۔ عمر نے محسوس کیا کہ وہ اپنی مدر سپیریر اور سسٹرز کی بڑی چہیتی ہے۔ حسین اور ذہین لڑکیاں شاید ان تائب عورتوں کو بھی اچھی لگتی ہیں۔ اس اسکول میں قدسیہ نہ صرف شکسپیئر پڑھ رہی تھی بلکہ شکسپیئر کے اسٹیج ڈراموں میں کام بھی کر رہی تھی۔ رومانوی عہد کے انگریزی شاعروں کی کئی نظمیں اسے ازبر تھیں۔ وہ نہایت شفاف برطانوی لہجے میں انگریزی بولتی تھی اور مہارت سے پیانو بجاتی تھی۔

آج شام مَیس میں ''گیسٹ نائٹ'' تھی جس میں کرنل حیات خان اپنی بیوی اور بچّی کے ساتھ عمر خان کو بھی لے جا رہے تھے۔ عام طور پر ان 'شبِ مہمانان' میں افسران کے بچّے مدعو نہیں ہوتے تھے، صِرف کرسمس اور خاص مواقع پر بُلائے جاتے تھے۔ اس مرتبہ خاص موقع یہ تھا کہ جو انگریز جنرل مہمانِ خصوصی تھے اُن کے اپنے بچّے انگلستان سے آئے ہوئے تھے اور آج میس میں مدعو تھے۔ عبید کی نائٹ فلائنگ تھی۔ وہ رات کی پرواز کی مشق کے لیے اپنا سبز فلائنگ سُوٹ پہن کر اور سب کو خدا حافظ کہہ کر جا چکا تھا۔ بیگم حیات نے اُسے اپنے پاس بلا کر اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے خاصی

زوردار آواز میں فی امان اللہ کہا تھا جیسے وہ کسی دُور دراز کے سفر پر جا رہا ہو۔

اس وقت وہ میس میں جانے کے لیے بالکل تیار تھیں۔ ہوا کی طرح باریک شیفون کی ساری ہوا کے جھونکوں سے ہل رہی تھی۔ بال جوڑے کی شکل میں سنورے ہوئے تھے اور گلے میں سچے موتیوں کا ہار تھا جو اُن کی سُبک گردن میں بہت سج رہا تھا۔ کرنل حیات ڈِنر جیکٹ پہنے جچے تُلے قدم رکھتے باہر آئے۔ تھوڑی دیر بیگم کے ساتھ کرسی پر بیٹھے۔ پھر دونوں ہاتھ میں ہاتھ دیے باغ کے ایک صدر دروازے سے دوسرے صدر دروازے تک ٹہلتے رہے۔ عمر خان تیار ہو کر نکلا تو لان پر پڑی ہوئی کرسیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ قدسیہ ابھی تیار نہیں ہوئی تھی۔

رات ابھی سے بھیگنی شروع ہو گئی تھی۔ احاطے کے کنارے پر لگے ہوئے یوکلپٹس کے درختوں کی لانبی لانبی ساری شاخیں اُوپر کی طرف سیدھی اُٹھتی چلی گئی تھیں اور ہوا سے یوں لہرا رہی تھیں جیسے وہ شاخ الگ سُر تال پر سب سے جُدا محوِ رقص ہو۔ اُن کے لمبے کاغذی پتے آپس میں ٹکرا کر ایک سَر سَراہٹ سی پیدا کر رہے تھے۔ بیٹھے بیٹھے عمر خان نے آسمان کی طرف دیکھا۔ نائٹ فلائنگ ابھی شروع نہیں ہوئی تھی۔ چیڑ میں لگے سبز رنگ کے بھاری ٹھوس تکون اندھیرے میں ایسے معلوم ہو رہے تھے جیسے لاہور کے لارنس گارڈن میں درختوں پر لٹکی ہوئی اُلٹی چمگادڑیں۔

چاند دھیرے دھیرے اُوپر آنا شروع ہوا۔ میس سے موسیقی کی آواز اُبھری۔ قدسیہ گھر کے برآمدے سے نکل کر لمبے لان سے گزرتی آئی جیسے چاند کی کرن سیاہ بادلوں میں لپٹی جھلمل جھلمل کر رہی ہو۔ ان دنوں لمبی لمبی قمیصوں کا نیا فیشن چلا تھا۔ قدسیہ کی سیاہ قمیص میں سنہری تار جھلملا رہے تھے۔ عمر کو اُس کا سراپا یوں لگ رہا تھا جیسے کسی خوب صورت تراشیدہ سرو میں ہزاروں جگنو چھپے جگمگ جگمگ کر رہے ہوں یا جیسے سیاہ مخمل کی ڈبیا میں کوئی ہیرا دمک رہا ہو۔

''آؤ چلیں۔'' کرنل حیات نے کہا۔

میس نزدیک ہی تھا۔ پریڈ گراؤنڈ کا تھوڑا سا حصّہ پار کر کے وہ فلیگ اسٹاف روڈ پر بنے ہوئے لمبے چوڑے میس میں داخل ہوئے۔ سامنے سرسبز لان میں صوفے اور کرسیاں رکھی ہوئی تھیں۔ سارا میس چھپی ہوئی روشنیوں سے رُومان خیز ہو رہا تھا۔ باڑھ کے نزدیک لگی ہوئی روشنیاں صرف کیاریوں کے ڈیلیا اور گلاب پر پڑ رہی تھیں۔ جیسے یورپ کی آرٹ گیلریوں میں خاص خاص تصویروں کی باریکیوں کو اُجاگر کرنے کے لیے ڈالی جاتی ہیں۔ چند مہمان آ گئے تھے۔ باقی دونوں صدر دروازوں سے برابر اندر آ رہے تھے۔ انگریز افسر، اُن کی بیگمات اور پاکستانی اسمارٹ خواتین و حضرات ٹولیوں میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ وہ خواتین جو روانی سے انگریزی نہیں بول سکتی تھیں اور ایسی تقریبوں کی

زیادہ عادی بھی نہیں ہوئی تھیں، آ آ کر صوفوں پر رنگ برنگے کُشنوں کی طرح سجتی جاتی تھیں۔

کرنل حیات کے ساتھ ایک نوجوان لڑکے اور لڑکی کو دیکھ کر فوراً اُن کا تعارف جنرل کے بچّوں سے کروایا گیا اور وہ جوانوں کی ایک الگ ٹولی میں جا کھڑے ہوئے۔

ذرا دیر بعد بینڈ نے رقص کی موسیقی شروع کی اور لان کے درمیان بنے ہوئے فلور پر رقص شروع ہو گیا۔ بیگم حیات سے چند سینئر افسروں نے رقص کی درخواست کی مگر انھوں نے طبیعت کی ناسازی کا عذر کر دیا۔ کرنل حیات سمجھ گئے کہ وہ عمر خان کی موجودگی میں رقص کرنا نہیں چاہتیں، ورنہ ان کے خلاف ایک اور بات سسرال والوں کو مل جائے گی۔

بیرے کشتیوں میں ناؤنوش کا سامان لیے پھر رہے تھے۔ بہت سے جوان افسروں نے بار کو گھیر رکھا تھا جس میں ایکٹرسوں کی نیم برہنہ تصاویر لگی ہوئی تھیں۔ جب دل بھر کے باتیں، پینا پلانا اور رقص ہو چکا تب کھانے کا اعلان ہوا۔ چاند اب تک سرو کے ایک لانبے درخت کی اوٹ سے رنگ و نور کی یہ محفل بڑی دل چسپی سے دیکھ رہا تھا۔

صنوبر کی لکڑی سے منڈھے کھانے کے کمرے میں یہاں سے وہاں تک لانبی لانبی میزیں تھیں جن پر قیمتی بھاری برتن اور میس کے نشان والی کٹلری جگمگا رہی تھی۔ کھانا بیٹھ کر بڑے تزک و احتشام اور میٹ اِن ڈِنر کے پورے اہتمام سے کھایا گیا، جس میں ایک گھنٹے سے زیادہ صرف ہوا۔ کھانے کے بعد لوگ پھر مختلف ٹولیوں میں بکھر گئے۔ کچھ باہر نکل گئے۔ چند سگرٹ پینے مختلف کمروں میں بیٹھ گئے۔ برج کی دُھتی دروازے بند کر کے کارڈ روم میں چھپ کر بیٹھ رہے۔ بینڈ پھر بجنا شروع ہوا۔

کرنل حیات سینئر افسروں کے ساتھ گرین رُوم میں بیٹھے تھے۔ جہاں سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ آہستہ آہستہ چند مرد اور خواتین باہر آئیں۔ اُن میں بیگم حیات بھی تھیں۔ عین سامنے سرو سے ہٹ کر چاند اب کانٹے کی تول بنا کھڑا تھا۔ ترازو کے دونوں پلڑے برابر تھے۔ آج اُس کی روشنی میں زردی نہیں سفیدی ہے۔ بیگم حیات نے سوچا— جیسے اس کی روشنی مستعار نہ ہو، اس کے اپنے اندر سے پھوٹ رہی ہو۔ چاند کا داغ تک لَو دے رہا ہے۔ وہ خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گئیں۔ آسمان پر جب کسی جہاز کی ہلکی سی آواز یا روشنیاں اُبھرتیں تو بیگم حیات کی نظریں ضرور اُدھر اُٹھ جاتیں اور انھیں خیال آتا شاید عبید اسی جہاز میں ہو۔

عمر خان لاؤنج میں چمڑے کے بے حد چوڑے صوفے پر بیٹھا تھا۔ پاس کی بھاری بھرکم چیسٹ پر انسائیکلوپیڈیا کی جلدیں اور چاندی کے اتنے بھاری منقّش پیں رکھے ہوئے تھے جو اُس نے ساری زندگی نہ دیکھے تھے۔ پاس ہی ہاتھی کے پاؤں سے بنا ہوا خط رکھنے کا ایک ڈبا دھرا تھا۔ دیوار پر خاصی

اونچائی پر، ۱۸۵۷ء کی یادگار لکھنؤ ریذیڈنسی کا پرچم فریم میں جڑا ہوا تھا اور اس کے نیچے کوئین میری کی ہندوستان کی آمد کے موقعے پر کھینچی گئی تصویر تھی، جس میں تاج کے علاوہ گلے میں موتیوں کا ہار بھی بہت نمایاں تھا۔ عمر خان نے قدسیہ سے دوسرے کمرے دیکھنے کی فرمائش کی۔ اس کے ساتھ ہی چند اور نوجوان جو پہلی دفعہ یہاں آئے تھے، اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہر کمرے کا نام کسی نہ کسی رنگ پر تھا اور اس کی سجاوٹ اسی رنگ کی مناسبت سے تھی۔ نیلے کمرے میں نیلے قالین اور پردوں کے ساتھ آتش دان کے آگے منگ عہد کا اسکرین اور دونوں طرف اسی عہد کے بڑے بڑے گلدان تھے۔

ایک کمرے میں دیواروں پر مارکوپولو بھیڑ کے بے شمار سر لگے ہوئے تھے جن کے نیچے ان کے شکار کرنے کی تاریخ درج تھی۔ ایک اور کمرے میں جارج پنجم کی تصویر جودھپوری برجس اور ٹوپی میں آتش دان کے اوپر لگی ہوئی تھی۔ منقش بھاری پایوں والی میزوں پر انگریزی ہفتہ وار اور ماہانہ رسالے سجے ہوئے تھے۔

باہر سے رقص کی دُھن کی آواز ہوا کے دوش پر سوار اندر آئی (عمر خان کو خیال آیا کہ اُسے رقص آتا تو وہ آج قدسیہ کے ساتھ ضرور پہل کرتا۔ قدسیہ نے اُسے بتایا تھا کہ وہ سیکھ رہی ہے لیکن ابھی تقریبوں میں رقص کرنے کی اجازت نہیں ملی ہے)۔ بہت سے نوجوانوں نے باہر جانے کے لیے پَر تولے۔ عمر خان نے کھڑکی میں جھانک کر دیکھا۔ صرف تین جوڑے ہلکی چاندنی میں رقص کر رہے تھے جیسے کنول کے پھول پانی پر ہوا سے دھیرے دھیرے ہل رہے ہوں۔ بیگم حیات صوفے پر بیٹھی آسمان کو تک رہی تھیں۔ وہ کسی گہری سوچ میں گم معلوم ہو رہی تھیں۔

ہوا میں خنکی بڑھ گئی تھی اس لیے بہت سی خواتین نے اندر بیٹھنے کو ترجیح دی تھی۔ مگر بیگم حیات کو باہر بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔ انھیں دہرہ دون یاد آ رہا تھا۔ کبھی مسوری، کبھی کوئی ایسی جگہ، جہاں وہ صرف سیر کے لیے گئی تھیں۔ یادیں بھولے بسرے خوابوں کی طرح لحہ بھر کو جھلک دِکھا کر غائب ہو جاتی تھیں۔ مَیس میں اندر کہیں ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اس آواز نے اُن کے دل کے تاروں میں لرزش سی پیدا کی۔ فون کی آواز کا تار اپنے پیارے لوگوں کی آوازوں سے بندھا ہوتا ہے۔ کہیں بھی کوئی گھنٹی بجے دل میں ارتعاش سا ہوتا ہے جیسے دوسرے سرے پر کوئی ہماری ہی آواز کا منتظر ہے۔

انھیں کئی سال پہلے کی ایک شام یاد آئی۔ عبید چھوٹا سا تھا اور وہ دونوں بچّوں کو چھوڑ کر اِنگلستان اور اسکاٹ لینڈ کی سیر کو نکلے تھے۔ اسکاٹ لینڈ کے ایک سرے پر اوبان کی بندرگاہ کے ہوٹل کے لاؤنج میں بیٹھے ہوئے وہ سمندر کو تک رہے تھے۔ شیشے کی کھڑکی میں سے سمندر تصویر کے سمندر کی طرح خاموش تھا۔ اس کے سینے پر چلتی ہوئی فیریاں اور ان کے ستونوں پر سرخ انگارہ سی بتی اور

دونوں وقت ملتے سمے کی بے نام اداسی میں بوجھل دل، جب سے وہ چلے تھے گھر سے بچّوں کی خیریت کی کوئی اطلاع نہیں ملی تھی۔ ایسے میں اس دُور دراز کے علاقے کی گھنٹی کی آواز بھی جیسے براہِ راست ان سے کچھ کہتی۔ جیسے آوازِ دوست جو عین منتظر لمحے میں سنائی دے۔ پھر کوئی آتا اور فون پر اجنبی زبان میں گفتگو کرنے لگتا اور لمحے کا سحر فون کی شناسا آواز سے گزرتا ہوا خاموش سمندر میں غرق ہو جاتا۔ یہ سب باتیں بعد میں انھوں نے کتنی ہی مرتبہ دُہرائی تھیں۔

''آؤ باہر چلیں۔'' عمر خان نے قدسیہ سے کہا اور لمحے بھر کو اس کا سفید بلّوری ہاتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ اتنا نرم تھا جیسے ہوا میں اُڑتا ہُوا کوئی رُوئی کا گالا۔ قدسیہ نے مزاحمت نہ کی۔ عمر خان نے چاہا کہ وہ اپنے دل کی باتیں قدسیہ سے کہہ دے مگر چاروں طرف لوگوں کا ہجوم دیکھ کر کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوئی۔ وہ زیادہ دیر تک اس کا ہاتھ بھی نہ تھام سکا۔ اس نے خود ہی جس طرح آہستہ سے ہاتھ پکڑا تھا، دھیرے سے چھوڑ دیا۔ دونوں باہر کی طرف چلے ہی تھے کہ اسی طرف سے ایک دل دوز چیخ کی آواز سُنائی دی۔ یکایک سنّاٹا چھا گیا۔ بینڈ بند ہوگیا۔ قدسیہ عمر خان کا ساتھ چھوڑ کر تیزی سے باہر نکل گئی۔ میس کی عمارت کے ہر دروازے سے لوگ باہر کی طرف جا رہے تھے۔ بیرے اپنی کشتیاں اُٹھائے لمحے بھر کو ڈسپلن بھول کر اُدھر لپکے۔

''کیا ہوا؟'' باہر نکلتے نکلتے قدسیہ نے کسی سے پوچھا۔

''فون پر کسی جہاز کے کریش ہونے کی خبر آئی ہے۔''

قدسیہ کے دل کو کسی نے دبا کر جیسے مسل دیا ہو۔ وہ لپک کر مجمع کو چیرتی ہوئی آگے بڑھتی گئی۔ اس کی امی صوفے پر بے ہوش پڑی تھیں۔ اُن کا رنگ سفید تھا جیسے بدن سے خون کا آخری قطرہ بھی نچوڑ لیا گیا ہو — ان کی باریک ساری خنک ہَوا میں ہولے ہولے ہل رہی تھی۔

''امی!'' قدسیہ نے گھاس پر بیٹھ کر اپنا سر صوفے پر ٹکا دیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

بہت جلد اس بات کی تصدیق ہوگئی کہ رات کی پرواز کے دوران عبید کا جہاز کریش ہوگیا تھا۔

علی الصبح پو پھٹ رہی تھی جس وقت عبید کا تابوت لیے گاڑی کرنل حیات کے بنگلے میں برآمدے کے آگے آ کر کھڑی ہوئی۔ فضا میں ہلکا ہلکا کہرہ تھا۔ ہر چیز اوس سے نم تھی، جیسے رات بھر بیگم حیات اور قدسیہ کے ساتھ مل کر روتی رہی ہو۔ برآمدے کے ستون پر چھائی ہوئی بوگن وِلا اور چنبیلی میں چھپی چڑیاں بھی بین کر رہی تھیں۔ کرنل حیات خشک آنکھوں کے ساتھ باہر آئے۔ بیگم حیات اور قدسیہ روتی ہوئی نکلیں اور عبید کو دیکھنے کی ضد کرنے لگیں۔ مگر وہ تابوت میں اس طرح بند تھا کہ جہاز کے جلے ہوئے ملبے کو اور اس کی جلی ہوئی ہڈیوں کو الگ نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دونوں کے بے حد اصرار کے باوجود انھیں تابوت کھول کر نہ دکھایا گیا اور اسے اسی طرح زمین کے نیچے اُتار دیا گیا۔

عمر خان کی حالت اُس سپاہی کی سی تھی جو جنگ فتح ہونے سے ذرا دیر پہلے بُری طرح زخمی ہو جائے۔ آج کا دن اُس نے قدسیہ سے اظہارِ عشق کے لیے اور چاچا حیات کو اپنی پسندیدگی کا اشارہ دینے کے لیے مخصوص کیا تھا۔ لیکن اب قدسیہ نے رو رو کر بُرا حال کر لیا تھا۔ چاچا حیات چاندی کے روپے پر بنی ہوئی مورت کی طرح چپ تھے اور چاچی اپنے ہوش و حواس کھو چکی تھیں۔ وہ کبھی انگریزی بولتی تھیں کبھی فرانسیسی۔ کرنل حیات حیران تھے کہ فرانسیسی زبان جو اُنھوں نے واجبی سی سیکھی تھی اور بے انتہا خواہش کے باوجود کبھی اس میں روانی سے گفتگو نہ کر سکی تھیں، اس وقت بے جھجک اور بے حد فراٹے سے بول رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے انھیں نیند کی بھاری خوراک دی تب بھی بہت دیر تک اس اجنبی زبان میں نہ جانے کیا کیا کہتی رہیں۔ آخر کار وہ تھوڑی دیر کو اُونگھ گئیں۔

عبید کی موت پر کرنل حیات کے سارے بہن بھائی پُرسے کے لیے آئے تھے اور چند دن رسال پور میں رہے تھے۔ ایسے افسردہ ماحول میں بھی جب گھر والوں کو اپنا ہوش نہیں تھا، انھیں نکتہ چینی کے لیے بہت سی باتیں مل گئی تھیں۔ عمر خان اپنے والدین کے قیام تک یہیں رہا۔ مگر اب ماحول یکسر بدل چکا تھا۔ وہ قدسیہ سے کچھ بھی نہ کہہ سکا سوائے اِلتجا بھری نگاہوں سے دیکھنے کے، جن کے معنی سمجھنا بھی کسی ذہین لڑکی کے لیے دشوار نہیں ہوتے۔

واپسی کے چند دن بعد جب اُس نے قدسیہ سے شادی کرنے کا خیال ظاہر کیا تو اُس کی ماں نے ایک ایسی بات کہی جس نے ایک دفعہ تو عمر خان کے ہوش اُڑا دیے۔

''آئندہ ایسی بات زبان پر نہ لانا۔'' انھوں نے سختی سے کہا، ''اب مجھے وہ بات کہنا ہی پڑے گی جو میں تجھے بتانا نہیں چاہتی تھی۔ تجھے کیا معلوم قدسیہ فسادات کے دوران تین دن سکھوں کے پاس رہی ہے۔''

''یہ کیسے ہوسکتا ہے امی، کسی نے آپ کو غلط اطلاع دی ہے۔'' عمر خان نے احتجاج کیا۔ ''وہ فوجی افسر کی بیٹی ہے۔''

''ایسی باتوں کی کوئی اطلاع نہیں دیتا۔ مگر یہ باتیں چھپتی نہیں ہیں۔ تجھے معلوم ہے کہ قدسیہ اور اُس کی ماں اُن دنوں دہرہ دون میں نہیں تھیں بلکہ قدسیہ کی ننھیال میں تھیں۔ وہاں فسادات کے دوران قافلے کی بسوں سے لڑکیوں کو نکال کر لے گئے تھے، اُن میں قدسیہ بھی تھی۔ وہ تو حیات خان اتفاق سے جلد وہاں پہنچ گیا تھا اور اُسے نکال لایا تھا۔''

اس خبر کو عمر خان نے افواہ سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ اس کے والد نے یہ دیکھ کر کہ وہ قدسیہ سے شادی کے خیال سے باز نہیں آرہا ہے، اُس کی دیرینہ خواہش کا احترام کرتے ہوئے اُسے انگلستان بھیج دیا۔ قدسیہ ابھی کم عمر تھی اور عمر خان کی واپسی تک اس مسئلے کو ملتوی کیا جاسکتا تھا۔ اُس کے سامنے تایازاد گل جان سے شادی کی تجویز بھی رکھی گئی تھی لیکن عمر خان نے انکار کر دیا تھا۔

عمر خان کے انگلستان جانے سے پہلے اکبر خان کے والد طاہر خان کی مدد سے، جو ایک مانے ہوئے وکیل تھے، ساجد کی طرف سے تایا زمان خان پر مقدمہ دائر کر دیا گیا تھا۔ اِس کام میں درپردہ عمر خان کا ہاتھ ہے، اِس کا علم کانوں کان کسی کو نہ تھا۔ بظاہر اکبر خان اور شہزادہ بخارا ساجد کی مدد کر رہے تھے۔ مقدمے کے طویل تھکا دینے والے دنوں میں رحمت بی بی، گل جان اور ساجد طرح طرح کے امتحانوں سے گزرے تھے۔ رحمت بی بی کا زیور بھی بکتا رہا، اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب جیٹھ کی حویلی اُن پر تنگ ہوئی اور انھیں طاہر خان کی حویلی کے چند کمروں میں اُٹھنا پڑا۔ یہی وہ وقت تھا جب

گل جان کی خوب صورتی کے سحر میں اکبر خان اسی طرح گرفتار ہوا جیسے عمر خان قدسیہ کی شخصیت کے جادو میں باندھا گیا تھا۔

جس دن عمر خان کو ماں کے خط سے قدسیہ کی شادی کی اِطلاع ملی اُسے شدید قسم کے دھچکے کا احساس ہوا جیسے اُس کے ساتھ دھوکا کیا گیا ہو اور اُس کی غیر موجودگی میں اُس کی بے حد عزیز متاع کسی اور کو سونپ دی گئی ہو۔ ماں نے بظاہر بڑے خلوص سے لکھا تھا کہ قدسیہ کا سسرال بڑا کھاتا پیتا عزت دار گھرانا ہے، وہ یقیناً راج کرے گی۔ اُس کا خاوند شہزور خان بڑا خوب صورت نوجوان ہے۔ مگر افسوس ہے کہ وہ ہم لوگوں سے بالکل کٹ گئی ہے۔ غلطی اس کے والدین کی ہے جنھوں نے بچی کو شروع ہی سے اپنے ددھیال سے مانوس نہیں کرایا۔ پھر بھی ہمارا ارادہ ہے کہ تہواروں اور شادی بیاہ کے موقعے پر کسی کو بھیج کر اُسے بلوالیا کریں گے۔ اُس بے چاری کا دُنیا میں ہے ہی کون۔

عمر خان سارا دِن ٹیمز کے ایمبا ک منٹ (Embankment) پر ٹہلتا رہا تھا۔ کبھی وہ وکٹوریہ گارڈن میں بجتے ہوئے بینڈ سے بے خبر کرسی پر بیٹھا سوچتا رہتا کہ اُسے انگلستان آنے سے پہلے اس بات کا فیصلہ کر کے آنا چاہیے تھا۔ کبھی سنگی شعلہ بار آتشیں مینار کے نزدیک سے گزرتے ہوئے خیال آتا، ایسا تو نہیں تھا کہ ماں کی کہی ہوئی آخری بات سن کر اُس کی محبت کی آگ ٹھنڈی پڑ گئی تھی۔ شاید عشق کی چنگاری ابھی شعلہ نہیں بنی تھی جو جسم و روح کی طہارت کے معنی بدل دیتی ہے۔ اگر ایسا تھا تو اب یہ احساسِ زیاں کیا تھا؟

وہ خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کرتا مگر بار بار اُس کا خیال قدسیہ کی طرف جاتا۔ صرف اسی کی خاطر تو وہ علی گڑھ سے چندوسی اور سہارن پور ہوتا ہوا دہرہ دُون جاتا تھا۔ قدسیہ کو دیکھتے ہی یوں محسوس ہوتا تھا جیسے دل کے دریچوں میں کوئی نیا دریچہ کھل گیا ہو جس میں سے معطر ہوائیں اور روشنی کا سیلاب اندر داخل ہو رہا ہو۔ واپسی پر کئی دن تک اس کا دل اس اَرفع تر جذبے سے بھرا رہتا تھا اور تنہائی میں اکثر وہ خیال ہی خیال میں اُس کی بازگشت سے خوش ہولیا کرتا تھا۔ قدسیہ کو اُس نے اِس حد تک اپنا جانا تھا کہ اُس کے لیے زیادہ تگ و دو کی ضرورت ہی نہ سمجھی تھی، اور اب اُسے اپنے اوپر بھی غصہ آ رہا تھا۔

چند روز نہ گزرے تھے کہ چاچا حیات کے انتقال کی خبر ملی۔ پھر رفتہ رفتہ قدسیہ اور چاچا حیات کے نام کے آگے ایک دُھندسی چھانے لگی جیسے عبید اور چاچی کے نام کے آگے ایک غیر مرئی سا جالا بن گیا۔

دہرہ دون! جہاں بے شمار اسکول، کالج اور اکیڈیمیاں قائم تھیں۔ جہاں خوش باش بچے یونی فارم پہنے گٹ پٹ انگریزی بولتے پھرتے تھے۔ جہاں پنجابی، پٹھان، گورکھے، سکھ اور انگریزوں کے ساتھ افغانستان کے شاہی خاندان کے پناہ گزیں سمرقند و بخارا سے بھاگ کر دوبارہ وہاں جانے کے

خواب دیکھا کرتے تھے۔ اب وہ دہرہ دون دونوں ملکوں کے خون سے بنی ہوئی ریڈکلف لائن کے پیچھے خوابوں کی دُھند میں چھپی ہوئی کوئی موہوم سی جگہ تھی جو اُس کے ذہن میں چار ناموں کے مٹنے کی وجہ سے معدوم ہوتی جارہی تھی، جیسے خوب صورت ترین خواب انسان کتنا بھی یاد رکھنا چاہے، آہستہ آہستہ ذہن سے محو ہو ہی جاتا ہے۔

یہی حال رسال پور کا تھا جہاں اُس نے آخری بار سیاہ کپڑوں میں ملبوس قدسیہ کو سیاہ شمع دان میں جلتی موم بتی کی طرح بھائی کے غم میں پگھلتے دیکھا تھا۔ اب وہ خوب صورت چھاؤنی اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ اس کے ذہن کے کسی دُور دراز گوشے میں سات پردوں کے پیچھے چھپ گئی تھی جہاں وہ اپنی مرضی سے جانا نہیں چاہتا تھا مگر بے خیالی میں کسی نہ کسی خیال کی ڈور تھامے جا نکلتا تھا۔ میس کی وہ بھیگی رات، جب اُس نے قدسیہ کا ہاتھ تھام کر اس سے پہلی بار دل کی بات کہنا چاہی تھی۔ سیاہ آسمان کے پس منظر میں وہ تر از و چاند۔ پھولوں پر پڑتی وہ مصنوعی روشنیاں —— فون کی وہ آواز —— اس کی چاچی کی وہ دل گداز چیخ اور قدسیہ کی وہ سراسیمگی، جیسے اُسے پہلے سے معلوم ہو کہ اس سارے المیے کا تعلق اُس کی اپنی ذات سے ہے۔

اور جب یہاں تک پہنچتا تو ذہن کے اس دریچے کو شعوری طور پر بند کر کے وہ تیزی سے باہر نکل آتا۔

عجیب بات ہے کہ عمر خان کی ایلزا ولسن سے پہلی ملاقات بھی چھاؤنی کے ایک میس ہی میں ہوئی۔ پہلے پہل ایلزا ولسن کو عمر خان نے بلوچ میس کے سب سے اوپری تختے پر کھڑے دُور سے دیکھا تھا۔ وہ لانبے چوبی برآمدے کے آخری سرے پر کھڑی تھی۔ ان کے درمیان ایک ہلالی سڑک اور بیس پچیس سیڑھیاں حائل تھیں۔ جون کی اُجلی دھوپ جو میدانوں کی نومبر دسمبر جیسی خوش گوار تھی، سارے میں پھیلی پڑی تھی۔ بڑے بڑے کانسی کے گملوں میں گلابی جیرنیم کے چمن زار کھلے ہوئے تھے اور سورج کی کرنوں میں چماچم کر رہے تھے۔ پتھر کے چبوتروں پر چڑھی توپوں پر سورج کی کرنیں اور چڑیاں اطمینان سے براجمان تھیں۔ برآمدے کی اونچی دیواروں پر سینگ دار مار کو پولو بھیڑوں کے سر اپنی شیشے کی آنکھوں سے عین سامنے دیکھ رہے تھے۔ ایسے میں دُور سے سیدھی کھڑی ایلزا، عمر خان کو اتنی بلند اور شان دار لگی تھی جیسے آزادی کا مجسمہ۔

عمارت کے عین درمیان کے چوڑے زینے پر چڑھتا، برآمدے کے جھجھماتے فرش پر ٹک ٹک کرتا، وہ بائیں کونے تک آیا تھا، اور چپکے سے ایک نگاہ گھڑی پر ڈالی تھی۔ بارہ بجنے میں ابھی ذرا دیر تھی۔

"گڈ مارننگ!" عمر خان نے کہا تھا۔ ایلزا نے خوش دِلی سے جواب دیا تھا۔ تب عمر خان نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کروایا تھا۔ ولایتی آداب کے برعکس اُس وقت عمر خان کو اپنا تعارف کروانا اس لیے آسان معلوم ہوا تھا کہ وہ ایلزا کے والدین کو بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ اُسے یہ بھی معلوم تھا کہ اُن کی بیٹی عنقریب آنے والی ہے۔ مگر یہ جان کر اُسے بڑی خوش گوار حیرت ہوئی کہ ایلزا ابھی اس

سے واقف تھی۔ غالبًا والدین نے ہی یہ غائبانہ تعارف کروایا تھا۔

کرنل ولسن کا بنگلہ ایبٹ آباد کا سب سے خوب صورت بنگلہ تھا۔ اُس کا چمن پھولوں سے اَٹا پڑا تھا۔ صدر دروازے پر سیب، خوبانیوں اور آلو بخارے سے لدے درخت جھکے ہوئے تھے۔ سلیٹی پتھروں کی چہار دیواری کے ایک کونے میں عین دیوار کی جگہ ایک خوب صورت بڑھتا ہوا چیڑ کا درخت لگا ہوا تھا جسے مالی کے کئی دفعہ کہنے کے باوجود مسز ولسن نے کاٹنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ دو منزلہ عمارت کے ہر کمرۂ خواب کے آگے بالکنی تھی، اور ہر بالکنی سے ایک مختلف منظر دکھائی دیتا تھا۔ اس لمبے چوڑے گھر میں اب تک فقط کرنل وِلسن اور مسز رہتے تھے۔ اب گرمیوں کی چھٹیوں میں اُن کا بیٹا جان اور بیٹی ایلزا آ گئی تھی۔ عمر خان اور ایلزا اندر جا کر چمڑے کے چوڑے صوفوں پر جا بیٹھے تھے اور پہلے ہی دن ڈھیروں باتیں کی تھیں۔ اس نے اپنے بھائی، جان کے بارے میں بتایا تھا کہ وہ بچپن میں والدین کے ساتھ ہندوستان کی مختلف چھاؤنیوں میں رہا تھا، اِس لیے اُسے اُردو آتی تھی اور چند سال پشاور میں رہنے کی وجہ سے پشتو بھی جانتا تھا۔ جب کہ وہ شروع سے اِنگلستان میں رہنے کی وجہ سے کسی بھی مقامی زبان سے واقف نہ تھی۔ جان اور ایلزا اپنے دوستوں کے ساتھ سیر وتفریح پر جانے کا ارادہ رکھتے تھے لیکن مشکل یہ تھی کہ جان کو تنہا مارے مارے پھرتے رہنے کا شوق تھا۔ بقول اس کے وہ مقامی لوگوں کو اسٹڈی کرنا چاہتا تھا، جس کے لیے اُن کے انداز میں اُن کے ساتھ گھل مل کے رہنا ضروری تھا۔ اپنے بارے میں ہنستے ہوئے اُس نے انکشاف کیا تھا کہ اُس کے بے تکلف دوست اُسے لِز کہتے تھے اور کچھ لوگ پیار یا حسد سے 'لِز ٹیلر' بھی کہتے تھے۔ عمر خان نے اُسے بتایا تھا کہ وہ واقعی اپنی ہم عصر اداکارہ کی طرح سرو قامت، طرح دار اور خوب صورت تھی۔

عمر خان نے اپنے بارے میں ایلزا کو بتایا کہ وہ اپنے والد کی اچانک موت پر قانون کی تعلیم نامکمل چھوڑ کر چلا آیا ہے۔ ہنستے ہوئے اُس نے کہا کہ اِنگلستان کے لارڈوں کے بچوں کی طرح اُس کا مقصد بھی ڈگری لینا نہیں بلکہ اچھے لوگوں میں کچھ اچھا وقت گزارنا تھا۔ اُس نے دریائے سندھ کے کنارے بسے اپنے خوب صورت گاؤں کو چھوڑ کر اس کوٹھی میں رہنا شروع کیا جو اُس کے باپ نے مسابقانہ ضد میں طاہر خان کی زمین سے چار گنا زمین لے کر مانسہرہ روڈ پر بنوائی تھی اور اُس میں اتنا شان دار پھلوں کا باغ لگوایا تھا جو ایبٹ آباد کی کسی اور کوٹھی کے ساتھ نہ تھا۔ عمر خان کو ویسے بھی قانون سے زیادہ پھولوں اور کتابوں سے دل چسپی تھی اس لیے اُس نے اس باغ کی دیکھ ریکھ کے بہانے یہاں رہنا شروع کر دیا تھا۔ اِنگلستان سے تازہ تازہ لوٹنے کی وجہ سے اُس کا اُٹھنا بیٹھنا انگریزوں کے ساتھ ہی تھا۔ اُن کے کلب جا کر برج، ٹینس اور بلیئرڈ کھیلتا، سوئمنگ کرتا۔ شام کو ٹینس کے بعد اکثر

وہ وِلسنز کے ساتھ اُن کے گھر جا کر چائے یا کافی پیتا اور گپ شپ کرتا تھا۔

ایلزا نے عمر خان کو گھڑسواری کی دعوت دی کہ اُسے گھڑسواری سے عشق تھا۔ عمر خان گھوڑوں سے گھبراتا تھا۔ بچپن میں ایک مرتبہ گھوڑے سے بُری طرح گرنے کے بعد اُس نے اُن کے نزدیک جانا چھوڑ دیا تھا۔ وہ گھڑسواری میں ایلزا کا ساتھ نہ دے سکتا تھا، مگر ٹینس اور برج میں شریک ہوسکتا تھا۔ ایلزا کا خیال تھا کہ جان سے بھی اُس کی یقیناً اچھی گھٹے گی۔

دُوسرے دن ایلزا ٹینس کورٹ میں عمر خان کا انتظار کرتی رہی مگر اُس دن وہ اپنی امّی اور بہنوں کو لے کر قدسیہ کے سسرال چلا گیا۔ جب سے وہ اِنگلستان سے لوٹا تھا اس بات پر ناراض تھا کہ آخر کیوں ان لوگوں نے قدسیہ سے ناتا توڑ لیا ہے۔ اُس بے چاری کا تو دُنیا میں کوئی بھی نہیں۔ پھر یہ ظلم کیوں کہ چچا تایا اور اُن کی اولادیں بھی اُس سے منہ موڑ لیں۔

قدسیہ کے گھر اس کی ماں اور بہنیں زنان خانے میں چلی گئی تھیں اور وہ خود بڑے خان اور شہزور خان کے ساتھ اس انتظار میں بیٹھا رہا کہ کب زنان خانے سے اُس کا بلاوا آتا ہے مگر یہ بلاوا نہیں آیا۔ اُس نے کھانا بھی مردانے میں کھایا۔ قہوہ بھی وہیں پیا، اور اس کے بعد اُس کی امّی نے گھر چلنے کا حکم صادر کر دیا۔

لوٹتے ہوئے اس کی امّی نے بتایا کہ قدسیہ بے حد تھکی تھکی اور بیزار سی لگ رہی تھی۔ اُنھوں نے یہ اشارہ دیا کہ شاید وہ اُمید سے تھی اور اسی لیے اُس کی یہ حالت تھی۔ اُس نے اُن میں کسی سے بھی کھل کر بات نہ کی تھی۔ اس کا موقع بھی نہیں تھا کیوں کہ اُس کی ساس اور نندوں نے مہمانوں کی خاطرداری کے بہانے اُسے ایک منٹ کے لیے بھی تنہا نہ چھوڑا تھا۔

چند روز بعد جب عمر خان، جان اور ایلزا کے ساتھ سیر پر نکلا تھا تو پھر قدسیہ کے گاؤں جا پہنچا تھا۔ اس مرتبہ اُس نے قدسیہ سے مل کر آنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ ان دو ملاقاتوں میں عمر خان نے اندازہ کیا تھا کہ قدسیہ کا شوہر ایک خوب رُو اور خودسر سا نوجوان ہے۔ شہزور خان بھی عمر کو بہت غور سے دیکھتا تھا۔ وہ آج بھی یہ نام بھولا نہیں تھا جو اس کی بیوقوف بیوی نے شادی کی رات نہ جانے کس حوالے سے لیا تھا۔ جب بھی عمر قدسیہ کے بارے میں کوئی بات کرتا، شہزور انجان سا بن کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگتا یا کوئی اور بات چھیڑ دیتا۔ آخر عمر نے منہ پھوڑ کر اپنی چچازاد بہن سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ شہزور خان نے جواب دیا کہ وہ ابھی زنان خانے میں پیغام بھجوائے دیتا ہے۔

ذرا دیر بعد وہ اُٹھ کر چلا گیا اور واپس آن کر بالکل عام لہجے میں عمر خان کو اطلاع دی کہ قدسیہ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے اور اس نے عمر خان سے ملنے سے معذوری ظاہر کی ہے۔

اس کے بعد سب کو پُرتکلف چائے پلائی گئی جس میں بھنی ہوئی ٹراؤٹ اور بٹیرے بھی تھے اور

رات کے کھانے کی دعوت بھی دی گئی لیکن عمر نے انکار کر دیا اور تینوں واپس چلے آئے۔ واپسی میں عمر خان بے حد خاموش اور ملول تھا۔ اُس نے اُن دونوں کو بتایا کہ قدسیہ بے حد حسین، ذہین اور حساس لڑکی تھی جو ہرگز اس اجڈ شوہر کے قابل نہ تھی۔ بدقسمت لڑکی جو وسائل رکھتے ہوئے بھی اپنے کسی شوق کی تکمیل نہ کر سکی۔ اس کو اعلیٰ تعلیم کے لیے باہر جانے کی تمنا تھی۔ اُسے ماہرانہ انداز میں پیانو بجانے کا شوق تھا۔ وہ دُنیا میں جانے کیا کیا کرنے کے خواب دیکھا کرتی تھی اور اب بے چاری اس نیم پختہ حویلی میں قید تھی جہاں اُسے اپنے عم زاد تک سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔

یہ سن کر جان نے لمحے بھر کو آنکھ بھر کے عمر خان کو دیکھا۔

''تمھارا خیال ہے کہ تمھاری کزن نے تم سے ملنے سے انکار نہیں کیا بلکہ اُس کے شوہر نے خود ہی اس کی طرف سے یہ پیغام بھجوا دیا۔'' جان نے پوچھا۔

''زیادہ امکان اسی بات کا ہے۔'' عمر خان نے دُکھ سے کہا۔

''اگر مجھے یہ معلوم ہوتا تو میں ضرور اُس سے مل کر آتی۔'' ایلزا نے کہا۔

''اس قبیلے کے مرد اس بات کو بھی پسند نہیں کرتے کہ آزاد اور بے باک عورتیں ان کے حرم کی خواتین سے ملیں۔ کیوں، میں صحیح کہہ رہا ہوں نا!'' جان نے کہا۔

عمر خان خاموشی سے برسات کے پانی سے کاٹی گئی ڈھلان پر اُترتا چلا گیا۔

''بے چاریاں۔'' ایلزا نے ہم دردی سے کہا، ''کیا تمھاری اس کزن سے دوستی تھی؟'' وہ بھاگتی ہوئی اس ڈھلان پر اُتری اور سیدھی دریا میں گرنے والی تھی کہ عمر خان نے اُسے تھام لیا۔

''ہم پھر یہاں آئیں گے، اچھی خوب صورت جگہ ہے۔'' جان نے چاروں طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں پھر کبھی یہاں نہیں آؤں گا۔'' عمر خان نے غصّے سے کہا، ''جب تک یہ بوڑھا کھوسٹ خان یا اُس کا اُجڈ بیٹا مجھے لینے میرے گھر نہیں آئے گا۔''

''غصّہ تھوک دو میرے دوست۔'' جان نے کہا، ''ان لوگوں کے ساتھ حکمتِ عملی سے چلنا پڑتا ہے۔ میں یہاں آؤں گا اور اس جگہ بیٹھ کر ٹراؤٹ مچھلیاں پکڑوں گا۔'' اُس نے گھاس کے درمیان کھلے چھوٹے چھوٹے پوست کے پھولوں سے بھری ایک جگہ کی طرف اشارہ کیا۔ ''اور خوب خاطریں کراؤں گا۔ ہوسکتا ہے مجھے تمھاری کزن سے ملنے کا موقع بھی مل جائے۔''

''ناممکن۔'' عمر خان نے کہا اور جلدی سے لکڑی کے جھولتے پل کی طرف بڑھا جس کے پار اُن کی جیپ کھڑی تھی۔

چند روز بعد عمر خان نے ایک مرتبہ پھر قدسیہ سے ملنے کی کوشش کی۔ اِس دفعہ براہِ راست اُس

کے گھر جانے کے بجائے وہ خود 'میاں دَم' میں اس جگہ ٹھہرا جہاں اُس کے پُرکھے قاسم خان نے ایک لڑکی پر دَم کر کے چشمے کے پانی کے چھینٹے دیے تھے۔ وہ چشمہ اب تک موجود تھا مگر سر جوڑے چنار کے درخت ناپید تھے۔ شاید اس جگہ وہ ریسٹ ہاؤس بن گیا ہو جہاں وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ اُس نے اپنے ایک ذمہ دار آدمی کے ذریعے گل صنوبر کو بلوایا تھا۔ سورج اپنا سونا بکھیر کر پہاڑوں کے پیچھے چھپ گیا تھا اور اُفق کی سرخی بھی سیاہی میں تبدیل ہو چلی تھی جب اندھیرے کی چادر اوڑھے ہانپتی کانپتی ہاتھ ملتی گل صنوبر آئی۔ عمر خان نے اُس سے کہا کہ وہ ہر قیمت پر ایک بار قدسیہ سے ملنا چاہتا ہے۔ خواہ وہ اُسے اپنے گھر بلوائے یا یہاں آن کر ملے۔ گل صنوبر نے کہا کہ وہ قدسیہ سے پوچھے بغیر کوئی وعدہ نہیں کر سکتی۔ وہ جا کر قدسیہ کو پیغام دے گی اور جو وہ کہے گی وہی کرے گی۔

دوسری رات جب سیاہ پہاڑیوں کے اُونچے نیچے راستے پر عمر خان قدسیہ کے آنے کا منتظر تھا، گلشن پھر تنہا ڈرتی سہمتی آئی۔ پشواز کی جیبیں ٹٹول کر اُس نے قدسیہ کے ہاتھ کا لکھا ہُوا خط عمر خان کو دیا اور تیز ہوا کے تھپیڑے کھاتی، بغیر ریسٹ ہاؤس تک آئے، بغیر چائے یا قہوہ پیے لوٹ گئی کہ یہی اُس کی مالکہ کا حکم تھا۔

اُس کے جانے کے بعد عمر خان تیز تیز چلتا اندر آیا اور لیمپ کی تھرتھراتی لَو میں قدسیہ کا خط پڑھا۔ وہ خط نہ تھا عجیب و غریب قسم کا زائچہ تھا۔ یا کسی آسمانی کتاب کا فرمان تھا یا کسی گم شدہ خزانے کا نقشہ تھا۔ عمر کانپ سا گیا۔ کاغذ پر دائرے سے بنے ہوئے تھے۔ ایک دائرے میں 'ق' کو پھول پتیوں کے ساتھ گھما پھرا کر لکھا گیا تھا۔ مگر اُس تک جانے کے سارے راستے مسدود تھے۔ ان بند راستوں پر کہیں سانپ لیٹے ہوئے، کہیں کنڈلی مارے بیٹھے تھے، کہیں باریک الفاظ میں کوئی مہمل سا جملہ تھا اور کہیں صرف 'موت' درج تھا۔ نیچے لکھا تھا — اب اس خزانے کی تلاش بند کر دینی چاہیے۔ نقشہ کسی صندوقچی میں بند کر کے دریا میں پھینک دینا چاہیے تاکہ آنے والی نسلوں کا کوئی نمائندہ اسے تلاش کر کے عجائب گھر کی زینت بنا سکے۔ کاغذ کے کونے میں گول دائروں کی شکل میں دستخط تھے جو عمر پہچان گیا۔ وہ قدسیہ کے ہی دستخط تھے۔ تحریر بھی اُسی کی تھی جو ذرا سی بگاڑ کر لکھی گئی تھی۔ دوسری طرف کونے میں درج تھا: ''مُردوں کو دفنا دینا کارِ ثواب ہے، انھیں ایذا دینے سے گناہ ہوتا ہے۔''

قدسیہ نے یہ معما کیوں لکھا تھا، عمر خان سوچتا رہا۔ کیا اس لیے کہ خط پکڑا جائے تو کوئی نہ جان سکے کہ کس نے لکھا ہے اور کس کے نام ہے — یا محض اس لیے کہ وہ اس سے ناراض تھی — یا وہ اپنا دماغی توازن کھو چکی تھی۔ گل صنوبر بھی تو کسی بات کا صحیح جواب نہیں دیتی تھی۔ وہ بتاتی تھی کہ قدسیہ بالکل خیریت سے ہے لیکن ٹھنڈی آہیں بھرتی تھی، اور اسے جانے کی اتنی جلدی رہتی تھی جیسے نظر نہ آنے والے خوف ناک دشمن اُس کی گھات میں ہوں۔ جاتے جاتے اُس نے صرف ایک بار پلٹ کر

دیکھا تھا اور کہا تھا، ''اب تم اُس سے ملنے کی کوشش نہ کرو، اسی میں اُس کی اور تمھاری بھلائی ہے۔'' وہ تیزی سے قدم بڑھاتی پہاڑی کی اوٹ میں غائب ہوگئی تھی، اور عمر خان اُسی رات واپس چلا آیا تھا۔

سوات سے واپسی کے تیسرے دن عمر نے ایلزا سے شادی کی درخواست کی۔ ایلزا کو اتنی جلدی اس بات کی توقع نہ تھی۔ اُس نے اپنے بھائی سے رائے لی۔ جان کا خیال تھا کہ اگر ایلزا بھی عمر سے محبت کرتی ہے تو یہ اُس کے لیے ہر طرح مناسب رشتہ ہے۔ عمر خان ایسا لڑکا ہے جس کے ساتھ کوئی بھی لڑکی ذرا سی سمجھ داری سے کام لے کر ہمیشہ خوش رہ سکتی ہے۔ ایلزا کے والدین اور عمر خان کی ماں بھی کچھ ردّ و قدح کے بعد بالآخر راضی ہوگئیں۔

عمر خان اور ایلزا کی منگنی جان کی فرمائش پر عمر کے خاندان کے روایتی انداز میں ہوئی۔ منگنی کا جوڑا، انگوٹھی اور مٹھائی لے کر خاندان کے بہت سے لوگ ٹوپی گاؤں سے ایبٹ آباد، ایلزا کے والدین کے بنگلے پر پہنچے۔ عورتوں میں خاندان اور برادری کی ایسی لڑکیاں تھیں جو اُن دنوں گاؤں چھوڑ کر مری اور لاہور کے اسکولوں اور کالجوں میں پڑھ رہی تھیں۔

یہ لڑکیاں ایلزا کے گھر پہنچ کر فوراً ''لِز'' کی بہنیں اور سہیلیاں بن گئیں۔ عمر سے گھی میں لتھڑا ہوا پیالہ اُٹھوایا گیا اور وہ تمام رسومات جو لڑکوں کے بیوی سے دبے رہنے کی کوشش میں کی جاتی ہیں۔ عمر کی رشتے دار لڑکیوں نے لِز کی بہنیں بن کر عمر خان سے پیسے اینٹھے، ڈھولک پر گیت گائے۔ ایلزا کے والدین اور اُن کے دوست احباب یہ سب رسمیں یوں دیکھتے رہے جیسے کوئی ناٹک دیکھ رہے ہوں۔ چائے پانی کی تواضع کے بعد یہ سلسلہ ختم ہوگیا اور سب اپنے اپنے گھر سدھارے۔

منگنی کے بعد بھی عمر خان پہلے کی طرح ایلزا کے گھر جاتا رہا۔ اب جب کہ عمر اور ایلزا ایک دوسرے کے منگیتر ہوگئے تھے، جان نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا اور تنہا ہی سیر سپاٹے کے لیے نکل جاتا تھا۔ جان سے ایلزا اور عمر، دونوں نے درخواست کی تھی کہ وہ اُن کی شادی تک پاکستان میں ٹھہرے، مگر جان نے وعدہ نہ کیا تھا۔

تایا زمان خان کے انتقال کے بعد ساجد نے اپنا مقدمہ واپس لے لیا تھا کیوں کہ تایا کے وارثوں کی باہمی رضامندی سے اُسے اپنی ساری جائداد واپس مل گئی تھی۔ اب وہ ٹھاٹھ سے اپنے آبائی گاؤں میں بس گیا تھا۔ لوگ پرانی کہانیوں کا آخری جملہ دُہرایا کرتے تھے، کہ خدا نے جیسے اُس کے دن پھیرے، سب کے پھیرے۔ قبل اس کے کہ کھوئی ہوئی جائداد کی بو پا کر گل جان کے لیے نوابوں اور جاگیرداروں کے رشتے آئیں، اکبر خان نے اس کا ہاتھ مانگ لیا۔ اکبر خان، جو عمر خان کا دوست اور ساجد کا محسن تھا۔ چناں چہ اکبر خان اور گل جان کی شادی عمر خان کی منگنی کے ساتھ ہی ہوئی۔

پندرہ سالہ حسین گل جان جب اپنا بھاری بھرکم آتشی گلابی اور سنہری لبادہ سنبھالے ''اکبر منزل'' پر اُتری تو نئے نویلے دولھا اکبر خان کو یہ سب بہت اچھا لگا۔ زندگی میں ایک بڑی خوش گوار تبدیلی کا احساس ہوا۔ الھڑ، شرمیلی، خوب صورت سی دُلہن، جو اس کی ڈھیری سی کتابوں کی طرح سونی صدا اُس کی ملکیت تھی۔۔۔ کتابیں جو اپنی خوب صورت جلدوں میں بندھی اپنی اپنی جگہ چپ چاپ رکھی رہتی تھیں۔ وہ جس وقت تک چاہتا انھیں پڑھتا، جب نہ چاہتا اُٹھا کر رکھ دیتا۔۔۔ گل جان کے ساتھ بھی اس کا کچھ ایسا ہی رویّہ تھا۔ یہ نہیں تھا کہ بیوی اُسے عزیز نہیں تھی یا وہ اسے کم تر سمجھتا تھا۔ کتابوں کی طرح وہ اُسے عزیز بھی تھی اور دل میں اُس کی بے حد قدر بھی تھی۔ لیکن کتابیں پڑھنے کے بعد اپنی جگہ سجی ہوئی اچھی لگتی تھیں اور بیوی گھر کے کام کاج کی نگرانی میں مشغول بھلی لگتی تھی۔

گل جان نے کچھ روز تو یہ خاموش اداکاری کی، پھر پر پرزے نکالنے شروع کیے۔ وہ سن و سال میں اکبر خان سے بہت چھوٹی تھی۔ عقل اور علم میں کم تر تھی مگر ڈنکے کی چوٹ پر کٹ حجتی کرتی اور لڑتی، جس طرح اس نے اپنی ددھیال کی عورتوں کو شوہروں سے لڑتے دیکھا تھا۔ پڑھے لکھے قابل ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنی نئی نویلی دُلہن کے ناز نخرے نہ اُٹھائے۔

جب ماں بننے کا وقت آیا تو دیہات کی کھاتی پیتی عورتوں کی طرح گل جان نے اور ہاتھ پاؤں پھیلائے۔ اکبر خان بیوی کا خیال تو رکھ سکتا تھا لیکن ضرورت سے زیادہ ناز برداری اس کے بس کی بات نہ تھی۔ ادھر گل جان یہ بات کسی طرح ماننے کو تیار نہ تھی کہ جو حادثہ اُس کے ساتھ پیش آ رہا ہے

وہ قطعی عام سی بات ہے، ہر عورت شادی کے دو ایک سال بعد اس دور سے گزرتی ہے۔

جب اکبر خان اور گل جان کے درمیان اس بات پر کوئی مناسب سمجھوتا نہ ہو سکا تو گل جان اپنی ماں سے ناز اُٹھوانے اور خدمت گاروں سے خدمت کروانے اپنے میکے چلی گئی۔ ان کے خاندان کا رواج بھی یہی تھا کہ پہلا بچہ میکے میں پیدا ہوتا تھا۔ ماں بچے کو دُودھ نہ پلاتی تھی۔ اس کام کے لیے دایہ رکھی جاتی تھی۔ اس طرح بچہ جب تک دودھ پیتا تھا، ننھیال ہی میں رہتا تھا۔

عمر خان نے گل جان کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ اس کے دوست کو چھوڑ کر نہ جائے۔ اس پر وہ اور بھی چڑ گئی۔ یہ بات کہ عمر نے ایک زمانے میں اس سے شادی سے انکار کر دیا تھا، شاید گل جان ابھی تک بھولی نہیں تھی۔ یوں اُس کو عمر خان سے کوئی جذباتی وابستگی نہیں تھی۔ وہ اسے بڑے بھائی کی طرح چاہتی تھی مگر کہیں کسی سطح پر اُس کے اندر کی جوان اور حسین لڑکی نے ہتک ضرور محسوس کی تھی جس کی وجہ سے وہ عمر سے کھنچی کھنچی رہنے لگی تھی اور چھوٹی بہن کی حد میں رہتے ہوئے اُسے جلی کٹی سنانے سے بھی نہیں چوکتی تھی۔

اکبر خان کی بچی اپنے ننھیال ہی میں پیدا ہوئی۔ اکبر خان کے ساتھ عمر خان بھی اُسے دیکھنے گیا۔ دریائے سندھ پر بنا ہوا عارضی کشتیوں کا پُل اپنی جگہ بدلتا رہتا تھا، اور اُس پر سے گزرتی ہوئی کوئی بھی سواری ایسا ارتعاش اور گھڑگھڑاہٹ پیدا کرتی تھی کہ ان میں بیٹھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا جیسے وہ بجلی بھرے بادلوں پر سوار ہوں۔ اُن کا گاؤں بھی کئی لحاظ سے منفرد تھا۔ پہاڑی علاقے کی ساری سنگلاخی یہاں موجود تھی۔ اُن کے اپنے مکان پہاڑیوں پر تھے۔ اُن کے گھروں کی پچھلی پہاڑیوں سے گندف کا قبائلی علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔ اس کے علاوہ میدانی علاقے کی ہمواری، وسعت اور ٹھہراؤ بھی تھا۔ اُفق پر دونوں طرف پہاڑ، درمیان میں دریائے سندھ کی پھیلی ہوئی قدیم وادی اور دریائے سندھ کا چوڑا پاٹ۔ دریا سے دُور دیہاتیوں کی نفسیات کچھ اور ہوتی ہے، دریا کے نزدیک گاؤں کی خصوصیات اور ہوتی ہے۔ دریائے سندھ جیسے دریا کے کنارے کے آباد گاؤں سال کے کسی مہینے میں بھی پانی سے محروم نہیں رہتے، پھر یہاں تو بارش بھی خوب ہوتی تھی۔ یہاں صوبہ سرحد اور پنجاب کی ساری فصلیں اُگائی جا سکتی تھیں۔ اس کے علاوہ یہ علاقہ تمباکو اور افیون کے لیے خاص طور پر مناسب تھا۔ یہ گاؤں صوبہ سرحد میں تھا لیکن پنجاب کی سرحد زیادہ دُور نہیں تھی۔ دوسری طرف چند ہی میل پر ضلع ہزارہ کا علاقہ شروع ہو جاتا تھا۔

عمر خان اور اکبر خان کے گھر پہاڑیوں پر تھے لیکن اُن کے کھیت میدانی علاقوں میں تھے۔ جہاں میلوں میل پوست کے رنگ برنگے نازک پھولوں پر نیچی اُڑان کرنے والی رنگین تتلیوں کا گمان گزرتا

تھا۔ کھیت کے کناروں پر ہوا سے جھومتے خوش باش اور باوقار سفیدے کے درختوں کی قطاریں تھیں۔ کہیں خوشی سے تالیاں بجاتے پاپلر کے درختوں کے جھنڈ تھے۔ میدانی علاقوں کی پتلی پتلی سڑکیں بڑی مسکینی سے نالوں کے نشیب میں اُتر جاتی تھیں اور پھر اُوپر چڑھ جاتی تھیں۔ پانی کم ہوتو گھوڑے تانگے سمیت گزر جاتے تھے، زیادہ ہوتو بعض اوقات بسیں بھی بہہ جاتی تھیں جن میں سے کچھ مسافر تیر کر نکل آتے تھے باقی برساتی نالوں میں لاپتا ہو جاتے تھے جن کی نعشیں چند روز بعد بیس بیس پچیس پچیس میل دُور سے ملتی تھیں۔

ٹوپی کا چھوٹا سا بازار بھی میدانی علاقے میں تھا۔ ٹوپی اور کوئٹہ کے درمیان میں پڑنے والا زبردست برساتی نالہ یہاں سے زیادہ دُور نہیں تھا۔ اس نالے میں سے بچپن میں یہ دونوں دوست سیکڑوں بار گزرے تھے۔ ٹوپی کے اس چھوٹے بازار کے حلوائی سے، جو اُن دونوں کو خوب جانتا تھا، عمر خان نے ایک بڑے سے ڈبے میں تازہ مٹھائی رکھوائی اور پھر دونوں ہنستے باتیں کرتے ساجد خان کے گھر پہنچے۔

عمر خان اور اکبر خان بچّی کو دیکھنے کے لیے بے تابی سے اُس پر جھکے۔ سنہری بالوں کا ڈھیر اُس کے چاند ایسے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھے۔ سنہری بالوں سے میل کھاتی اس کی پیدائشی ذہین آنکھیں کبھی بولتی ہوئی شاداب سی، کبھی حیرت زدہ اور چپ۔ عمر خان نے اسے دیکھتے ہی کہا، ''ارے سِدہ زر، سِدہ زرا!'' اور اس دن سے اس کا نام زری خان ہو گیا۔ گل جان بھی کچھ ایسی مسرور تھی کہ اُس نے عمر خان کے دیے ہوئے اس نام پر اعتراض نہ کیا۔

اکبر خان اپنی بیٹی کو دیکھ کر بے حد نہال ہُوا۔ بہت چاہا کہ اب اپنی بیوی اور بیٹی کو ایبٹ آباد لے جائے لیکن گاؤں کی ریت روایتیں اور راستے کی مشکلات حائل ہوئیں اور اسے خالی ہاتھ لوٹنا پڑا۔

جس دن زری پیدا ہوئی تھی عین اُسی دن حاکم خان کے گھر شادی کے کئی سال بعد بیٹا پیدا ہوا تھا۔ عمر خان اور اکبر خان اُسے بھی دیکھنے گئے۔ اپنے نام پر تو حاکم خان کا بس نہ تھا۔ لیکن بیٹے کا نام انھوں نے خوش حال خان رکھا تھا۔ خوش حال خان خٹک، حاکم خان کا ہیرو تھا۔ جیالا، باغی شاعر — اور سپاہی — صاحبِ سیف وقلم۔ اُن کی دلی تمنا تھی کہ خوش حال خان اپنے ہم نام بڑے شاعر کی طرح جری اور بے باک ہو۔

عمر خان کے والد زمان خان اب زندہ نہ تھے لیکن حاکم خان کو یقین تھا کہ اس نام پر ہنسنے کی جرأت وہ کبھی نہ کرتے۔

زری کی پیدائش کو دو ماہ بھی نہ ہوئے تھے کہ کسی نے آن کر ساجد خان کو اطلاع دی کہ اُس کا

بہنوئی اکبر خان اپنے نو مسلم ملازم عبدالغنی کی طرح دار اور خوب صورت بیوی زلیخا سے پیار کی پینگیں بڑھا رہا ہے۔ زلیخا کی وجہ سے عبدل نے بھی اکبر خان کو یوں مٹھی میں کرلیا ہے کہ وہ کوئی کام ان دونوں سے پوچھے بغیر نہیں کرتا۔ وہ اپنی جھونپڑی چھوڑ کر کوٹھی کے پچھلے حصّے میں اُٹھ آئے ہیں۔ گھر میں میز کرسیاں اور چینی کے برتن آگئے ہیں۔ دونوں میاں بیوی سارا دن لاٹ صاحبوں کی طرح گھر کے دوسرے ملازموں پر حکم چلاتے ہیں۔ اکبر خان کی بے بے بھی یہ سب دیکھ رہی ہیں اور انجان بنی ہوئی ہیں کہ اُس چلتر عورت نے بیماری میں ان کی خدمت کر کے اُن کو بھی اپنے قابو میں کرلیا ہے۔

یہ خبر رحمت بی بی اور گل جان پر بجلی بن کر گری۔ رحمت بی بی نے ادبدا کر بیٹی اور نواسی کے پیار پر بند باندھا۔ روتی پیٹتی بیٹی کا منھ چوم کر رُخصت کیا کہ قبل اِس کے کہ حالات زیادہ خراب ہوں، تو جا کر جیسے بھی بن پڑے خاوند کو قابو میں کر۔ کمک کے طور پر زری کو مع دایہ کے ساتھ کر دیا گیا کہ باپ کی بازیافت میں معاون ہو۔

اُس وقت اکبر خان، عمر کے ڈرائنگ رُوم میں بیٹھا ہوا تھا۔ کھڑکی میں سے نظر آنے والا منظر پینٹنگ کی طرح جیسے دیوار پر جڑا ہوا تھا۔ پہاڑی پر گوگاں کی پینٹنگ کے سے موٹے اور ٹیڑھے میڑھے سرسبز درخت نظر آرہے تھے جن کے تنوں پر کائی کی تہیں، تکونے پتوں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ چند درختوں کی جڑوں سے مٹی سرک گئی تھی۔ اُن کی اُلجھی ہوئی جڑیں جھانک رہی تھیں اور ایک جگہ ٹیلے کے نشیب میں خالی جگہ پر تکونی پتوں کی بیلیں زمین سے ٹیلے تک یوں چھائی ہوئی تھیں جیسے سجاوٹ کے لیے برابر برابر کاغذی جھنڈیاں لگائی جاتی ہیں۔ اس حُجلۂ عروسی میں ایک کالی چڑیا یوں سمٹی سکڑی بیٹھی تھی جیسے کوئی دُلہن بیٹھی ہو۔ اس تنہا چڑیا کو دیکھ کر یکایک اکبر خان نے کہا:

''لالہ یار — تمھیں نہیں معلوم میں آج کل کتنی تنہائی محسوس کر رہا ہوں۔ یہ عورتیں ہم مردوں کو چھوڑ کر کسی نہ کسی بہانے کہاں غائب ہو جاتی ہیں!''

''ان کی اپنی مجبوریاں بھی تو ہیں۔'' عمر خان نے کہا، ''آخر اپنے شوہر کو زری جیسی بچی کا تحفہ دینا بھی تو ہنسی کھیل نہیں ہے۔ تمھیں کیسا لگا اپنی بچی کو دیکھ کر۔''

''بہت اچھا لالہ! یقین ہی نہیں آتا کہ میری بچی ہے — میرا خون۔''

''ہر وقت ساتھ رہے گی تب یقین آجائے گا۔''

''نہ معلوم کب آئیں گے یہ لوگ — تم بھی اس طرف کم آتے ہو لالہ، اپنی فرنگن کے ساتھ گھڑ سواری میں مصروف رہتے ہو نا۔''

''ارے نہیں، تمھیں معلوم ہے میں گھوڑوں سے گھبراتا ہوں۔ وہ مجھے ماؤنٹ ڈیو تک لے جاتی ہے

اور گھوڑے گھوڑیوں کی قسمیں بتایا کرتی ہے، پر چار ہی ہے لیکن میں ابھی تک راہ پر نہیں آیا ہوں۔''

''آ جاؤ گے آہستہ آہستہ — تم نے اپنے پُرکھوں کی ڈائری میں سے ایک مرتبہ پڑھ کر سنایا تھا کہ خواہشیں انسان کے خون کے ساتھ نسلوں میں سفر کرتی ہیں تو کیا تمھارے کوئی گھڑسوار نگڑ دادا کسی فرنگن پر لٹو تھے جنھوں نے یہ شدید تمنا تمھیں عطا کی ہے یا تمھاری اپنی ہی خواہش ہے؟''

''خدا معلوم!'' عمر خان نے بے پایوں کی جھولتی ہوئی کرسی پر جھولتے ہوئے کہا، ''عین ممکن ہے کہ قاسم خان کی اولادوں میں سے کوئی کمپنی بہادر کی فوج میں صوبے دار یا رسالدار رہا ہو اور اپنے افسر کی میم کی زُلفِ گرہ گیر کا اسیر ہو اور ٹکٹکی کے خوف سے اپنے عشق کو سینے میں دبائے مر گیا ہو — بظاہر تو یہ سب اچانک ہی ہوا — آدمی خودکشی کرنا چاہے اور اپنا دریائے سندھ نزدیک ہو تو بے چارے بوڑھے راوی کی تلاش میں کیوں نکلا جائے۔''

عین اُس وقت بائیں طرف کی لانبی وینیشن کھڑکی سے کہ جس کی پینٹنگ زیادہ خوب صورت تھی، اوپر سے شرل شرل کرتے نالے اور درختوں سے ڈھانکی پگڈنڈیوں کو عبور کرتے عمر خان کے دو ملازم نیچے آئے اور اطلاع دی کہ گُل جان اور بی بی گُل ابھی ابھی گاؤں سے اچانک گھر پہنچی ہیں۔

اکبر خان اُڑتا ہوا گھر پہنچا تو اُس نے بیوی کے تیور بگڑے ہوئے دیکھے۔ اُسے رتی رتی بات کی خبر تھی کہ بیوی کی غیر موجودگی میں وہ اپنے نومسلم ملازم عبدالغنی کی بیوی زلیخا کے ساتھ کیا گلچھرے اُڑا رہا تھا۔ فوری جرح کے جواب میں اکبر خان نے صفائی پیش کی کہ بے بے بیمار تھیں اور وہ گھر کے کاموں کی نگرانی نہیں کر سکتا تھا، نہ مستقل طور پر نوکروں کی نوک جھوک سے نپٹ سکتا تھا۔ عبدل اور زلیخا میں یہ قابلیت دیکھ کر اُس نے باورچی خانے اور گھر کے دوسرے کاموں کو اُن کے سپرد کر دیا، اور نچنت ہو گیا۔ وہ گھر کے دُوسرے ملازموں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ کھانا بھی نہایت لذیذ مل رہا ہے اور بے بے کی نگہداشت بھی عمدہ طریقے سے ہو رہی ہے۔ اکبر خان نے بیوی کو مشورہ دیا کہ وہ غنی اور زلیخا پر اعتماد کر کے خود بھی بہت سے جھنجھٹوں سے آزاد رہ سکتی ہے۔ لیکن زلیخا کے خلاف بہت سے مشوروں سے لیس ہو کر آنے والی گُل جان اتنی آسانی سے ہار ماننے والی نہ تھی۔ اُس نے اس بات کو اپنی اَنا اور کچھ عرصہ گزر جانے کے بعد زندگی اور سوت کا مسئلہ بنا لیا۔

گھر میں ہر وقت دانتا کلکل رہنے لگی۔ اکبر خان کے لیے دل جمعی سے کوئی کام کرنا بھی دوبھر ہونے لگا تو رفعِ شر کے لیے اُس نے غنی اور زلیخا کو ملازمت سے الگ کرنے کا ارادہ کر لیا۔ اتفاق سے اسی دن ساجد دندناتا ہوا آ پہنچا (معلوم ہوتا تھا کہ اُس تک نہایت شر انگیز خبریں پہنچائی گئی ہیں۔ وہ جو اکبر خان سے چھوٹا تھا، اکبر خان اور عمر خان کا احسان مند تھا اور دونوں کی بہت عزت کرتا تھا)،

آتے ہی بھری بندوق کی طرح اکبرخان پر برس پڑا۔ ''تم میری بہن کو ایک کمینی عورت کی خاطر انگاروں پر لوٹا رہے ہو۔ تمھارے پاس اس کا کیا جواز ہے؟'' وہ دہاڑا۔

''میرے نزدیک کمینگی اِنسان کے اطوار میں ہوتی ہے۔ میں نے ان دونوں میں کوئی ایسی بات نہیں دیکھی۔ رہ گئی تمھاری بہن، تو وہ میری بیوی ہے۔ اس کو جھوٹی کہانیاں گڑھ کر سنائی جاتی رہی ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ وہ صورتِ حال کو اچھی طرح دیکھے اور شوہر پر اعتماد کرنا سیکھے۔''

''مین پوچھتا ہوں کہ دوکوڑی کے ملازم کی اوقات ہی کیا ہے، کیا اور نہیں مل سکتے۔ مجھ سے کہو تو میں ایک درجن آدمی اپنے گاؤں سے بھجوادوں۔''

عمرخان کو معلوم تھا کہ جب سے ساجد کا رشتہ پنجاب کے ایک بڑے زمیں دار گھرانے میں ہوا ہے اُس کی اکڑ میں کچھ اور اضافہ ہوگیا ہے۔

''شکریہ، مگر یہ دونوں ہمارے گھر کے کاموں کو سمجھتے ہیں اور اب میں انھیں نوکری سے الگ کرنا پہلے سے بھی زیادہ غیرضروری سمجھتا ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے تم بیوی اور اُس کے گھر والوں سے زیادہ اِن کمیوں کو اہمیت دیتے ہو، تمھیں اپنے سسرال والوں کی عزّت کا کوئی پاس نہیں ہے۔''

''اس بات کا سسرال والوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ میرا ذاتی معاملہ ہے اگر تم اس کا یہ مطلب لیتے ہو تو یہی سہی، مگر ایک بات طے ہے کہ جب تک تمھاری بہن یا تم اس بات پر مصر رہو گے میں انھیں نہیں نکالوں گا۔''

''میں جانتا ہوں، تمھارے دل میں چور ہے۔'' ساجد گرجا۔

''اگر میرے دل میں چور ہوتا تو میں بڑی آسانی سے انھیں کہیں اور ٹھکانا دے سکتا تھا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہوں؟'' اکبرخان نے یکایک ساجد کی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا۔ یہ بات اتنی ڈھکی چھپی نہیں تھی کہ ساجد نے ایک کمی عورت سے چھپ کر نکاح کیا تھا اور کسی دوسرے گاؤں میں ایک الگ گھر اُسے لے کر دیا تھا۔

''چوری اور سینہ زوری۔'' ساجد غصّے سے کانپ رہا تھا۔ ''تم مانے ہوئے وکیل سہی، مگر میں تمھیں بھی کورٹ میں کھنچوا سکتا ہوں۔''

''بہت شوق سے، اب تم سے وہیں ملاقات ہوگی۔'' اکبرخان نے کہا۔

بے بے ہانپتی کانپتی آئیں اور بیچ بچاؤ کرانا چاہا مگر اُن کی ایک نہ چلی۔ ساجد پیر پٹختا گیا اور جاتے جاتے اپنی بہن اور بھانجی کو بھی ساتھ لیتا گیا۔ مسئلہ اب میاں بیوی کا نہیں، ایک بڑے زمیں

دار کی عزت اور اس کے بہنوئی کی اَنا کا تھا۔

گرمی کا موسم گزرا۔ایبٹ آباد میں سردی نے اپنا ڈیرہ ڈالنا شروع کیا۔ چیڑ کے چہروں پر زردی چھانے لگی، چنار اپنی آگ میں خود ہی جل اُٹھے۔ دوسرے درختوں کے پتے زرد ہو ہو کر جھڑنے لگے۔ صندلیاں سلگنے لگیں۔ گھن گرج کے ساتھ بارش ہوتی، اولے پڑتے اور درجۂ حرارت کم ہوتا چلا جاتا۔ پہاڑ کا موسم سرما احساسِ تنہائی بڑھاتا ہے۔ جوں جوں درجۂ حرارت کم ہو رہا تھا۔اکبر خان کے احساسِ تنہائی اور بیوی بچی کی یاد میں اضافہ ہو رہا تھا۔لیکن بیوی کے آگے ہار اُس نے بھی نہ مانی تھی۔گل جان نے قسم کھا رکھی تھی کہ جب تک زلیخا وہاں موجود ہے وہ گھر کی دہلیز پار نہیں کرے گی۔

اکبر خان کی بے بے، داجی، عمر خان اور درمیان میں پڑنے والے لوگ بھی اب خاموش ہو گئے تھے کہ شاید وقت اور فاصلہ اس مسئلے کو حل کر سکے۔اب بھی اکبر خان کے گھر کی ایک ایک بات اتنا فاصلہ اور دریا عبور کر کے ساجد کے گاؤں تک پہنچتی تھی۔ اگر اسٹور میں سڑتا برسوں پرانا گراموفون غنی کو دے دیا جاتا تو گل جان کے کانوں تک خبر پہنچتی کہ اس کے شوہر نے جرمنی سے نیا ریکارڈ پلیئر منگوا کر زلیخا کو دے دیا ہے۔ اگر کوئی پرانی قمیص غنی کو مل جاتی تو افواہ پھیلتی کہ اکبر خان نے نئے کے نئے سوٹ زلیخا کے شوہر کو بخش دیے ہیں۔

زری بھی اپنی ماں کی طرح ایک بڑی سی حویلی میں پرورش پانے لگی۔ لیکن وہ یہاں خوش نہیں تھی۔اُس ننھی سی عمر میں بھی نہ جانے کیسے اُسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ حویلی اُس کی نہیں ہے۔اُس بڑی حویلی کی ہر چیز بڑی تھی۔شاید اسی لیے زری کو یہاں کی تنہائی بھی بڑی اور مہیب لگتی تھی اور اُسے اپنا ایبٹ آباد کا خوب صورت گھر اور داجی یاد آتے تھے۔عمر چاچا کا پھولوں پھلوں سے لدا حسین باغ یاد آتا تھا، گو وہ کسی سے کچھ کہہ نہیں سکتی تھی۔ابھی تو اُس نے بمشکل تین الفاظ مُنہ سے نکالنے شروع کیے تھے۔ بے بے، داجی اور چاچا۔عمر خان کو زری نے ماما کے بجائے چاچا کہنا شروع کر دیا تھا اور ساری عمر یہی کہتی رہی۔

اس حویلی میں کئی ایسے کمرے تھے جن میں دنوں کوئی نہ جاتا تھا۔زری کبھی کبھی وہاں جا کر چھپ جاتی۔رنگین سُتلی سے بنے ہوئے پلنگوں کی قوسِ قزح کے نیچے لیٹ کر جانے اُسے کیا سکون ملتا کہ جب اُس کی تلاش ہوتی تو وہ مہین ریت کی ہلکی سی تہہ پر اپنے سنہری بال بچھائے زمین پر سوئی ہوئی ملتی۔

کبھی کوئی خادمہ اُسے لے کر اُوپر چھت پر چلی جاتی تو وہ بے حد شوق سے دریا کو تکا کرتی اور سوچا کرتی کہ کبھی ان دریا پار کر کے آنے والوں میں اُس کے داجی بھی ہوں گے۔ مگر اُن دریا پار کرنے والوں میں اُس کے داجی نہیں تھے اور فراق کی گھڑیاں طویل تر ہوتی جا رہی تھیں۔

اکبرخان بھی زری کی یاد میں تڑپ تڑپ کر نشیب میں اُترتا، کبھی غازی گاؤں سے ہی لوٹ جاتا اور کبھی دریا پار کر کے دُوسری طرف بھی جاتا۔ ساجد کے ملازم فوراً اُس کی آمد کی اطلاع دے دیتے اور وہ زری کی ایک جھلک بھی نہ دیکھ پاتا۔ عمرخان نے گل جان اور ساجد کو سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی مگر انھوں نے یہ فرض کر لیا تھا کہ وہ بہن کے حق میں بولنے کے بجائے، جائز ناجائز، ہر طرح اپنے دوست کی طرف داری کرتا ہے۔

اکبرخان اُن دنوں بڑی سنجیدگی سے غنی اور زلیخا کے بارے میں سوچتا جو اُس کی خاطر اتنی بدنامی سہ رہے تھے اور بالکل انجان بنے ہوئے تھے۔ جن دنوں گل جان اور زری یہاں موجود تھیں، اکبر خان نے کئی مرتبہ دیکھا تھا کہ زلیخا چاؤ سے زری کی طرف ہاتھ بڑھاتی تو گل جان پھنکارتی، ''خبردار جو ان منحوس ہاتھوں سے میری پھول سی بچی کو چھوا۔'' زلیخا اپنے ہاتھ سمیٹ کر فوراً کسی دُوسرے کام میں لگ جاتی۔ اکبرخان دیکھتا کہ اب بھی وہ کسی شہید کی سی شان سے یہ سب سہہ رہی تھی۔ اُسے خوب معلوم تھا کہ اُس سے جلنے والے اُسے طرح طرح کے طعنے دیتے ہوں گے اور اُسے خوب جلی کٹی سناتے ہوں گے لیکن اُس نے کبھی کوئی بات کسی کے سامنے نہیں دُہرائی تھی۔ اگر زلیخا اکبرخان کے سامنے سُوں سُوں کر کے روتی تو شاید وہ اتنا متاثر نہ ہوتا لیکن اب اُس کی آنکھوں میں بے بسی کی آنچ دھیمے دھیمے اکبرخان کے دل میں چھپے سوکھے جھاڑ کو سلگانے لگی تھی۔

اس رات کڑاکے کی سردی تھی۔ سب گھر والے سونے کے لیے لیٹ چکے تھے۔ اکبرخان اپنے مطالعے کے چھوٹے سے کمرے میں بیٹھا کتاب پڑھنے اور سوچنے میں مصروف تھا۔ اِس کمرے میں ایک پلنگ بھی پڑا ہوا تھا اور جب سے گل جان اور زری گئی تھیں وہ اسی کمرے میں سویا کرتا تھا۔ آتش دان میں شعلوں کی آنچ مدھم پڑ چکی تھی اور کمرہ آہستہ آہستہ سرد ہونا شروع ہو گیا تھا کہ زلیخا کوئلے کی ٹوکری اٹھائے آخری کھیپ ڈالنے آئی۔ اُس کے سر پر اوڑھنی کا پلو تھا اور نظریں نیچی تھیں۔ اتنی شدید سردی کے باوجود اس کے بدن پر کوئی گرم کپڑا نہیں تھا۔ اُس نے اپنے گورے ہاتھوں سے کوئلے آتش دان میں ڈالے اور پاس پڑی ہوئی پنکھیا سے ہوا دی تو کوئلے چٹک کر چنگاریاں چھوڑنے لگے اور اکبرخان کو محسوس ہُوا جیسے اس کے دل میں دبی ہوئی چنگاری بھی ایکا ایکی سلگ اُٹھی ہے۔ اس عورت نے کتنے دُکھ جھیلے ہیں اور کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہیں لائی۔

''زلیخا! تم کتنی صابر عورت ہو، تم نے کبھی مجھ سے کسی بات کی شکایت نہیں کی۔'' اکبرخان نے کہا۔

زلیخا نے اپنی خوب صورت بھوری آنکھیں اٹھا کر اکبرخان کی طرف دیکھا اور کہا، ''مجھے آپ سے کوئی شکایت نہیں ہے صاحب جی، آپ بی بی کو بلا لیجیے، میں اب جانا چاہتی ہوں۔''

''کہاں؟''

''گاؤں — میری ماں بیمار ہے۔ غنی بھی وہیں گیا ہوا ہے۔''

''غنی! — وہ آج کل ساجد کے قبضے میں ہے۔ ساجد نے اس کو لالچ دیا ہے یا دھمکی دی ہے۔

آج ہی مجھے اُس کی طرف سے عدالتی سمن ملا ہے کہ میں نے اُس کی بیوی کو ورغلا کر اپنے پاس رکھ چھوڑا ہے۔'' زلیخا کی آنکھوں میں زخمی ہرنی کی سی وحشت اُبھری۔ اس کے کچھ کہنے سے پہلے اکبر خان نے اضافہ کیا، ''تمھارے شوہر نے میرے اوپر مقدمہ کر دیا ہے، اس لیے اب تم کہیں نہیں جا سکتی ہو۔''

''اب میں نہیں جا سکتی!'' زلیخا نے بے بسی سے پوچھا۔ ''غنی کے پاس بھی نہیں؟''

''غنی تو خود ساجد کے قابو میں ہے۔ تم گئیں تو وہ تمھیں کہیں چھپا دیں گے اور کہیں گے کہ میں نے تمھیں غائب کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے قتل کا مقدمہ بنا دیں، مقصد تو مجھے سبق سکھانا ہے۔''

''اب کیا ہوگا؟'' اکبر خان نے محسوس کیا کہ زلیخا دھیرے دھیرے کانپ رہی ہے۔

''اب تمھیں عدالت میں جا کر صحیح صحیح بات بتانی ہوگی۔''

''کیا میرا نام کچہری میں آئے گا؟'' زلیخا نے دہشت زدہ ہو کر پوچھا۔

''تمھارا بھی — اور میرا بھی۔'' اکبر خان نے سکون سے کہا۔

''آپ کا بھی!!'' وہ پھسر پھسر رونے لگی۔ ''اگر میں بی بی سے معافی مانگ لوں؟''

''کس بات کی معافی؟'' اکبر خان نے قدرے چڑ کر کہا۔

''کسی بھی بات کی، جس سے وہ ناراض ہے۔ میں اُن کے پاؤں چھو لوں گی — بس کچہری میں آپ کا اور میرا نام نہ آئے۔ وہ مجھے معاف کر دیں گی نا!''

''جب تک تم، میں یا وہ جیتے ہیں، یہ نہیں ہوگا۔ وہ لوگ خطائیں بخشنے والوں میں سے نہیں ہیں۔ اور یہ غنی کتنا بے وقوف نکلا۔ اگر وہ مجھ سے کہتا کہ میں زلیخا کو لے کر کہیں اور جانا چاہتا ہوں تو کیا میں اُسے روکتا — مگر وہ ان لوگوں کے کہنے میں آ گیا، جن کا مقصد پہلے کچھ بھی ہو، اب صرف مجھے ذلیل کرنا ہے۔''

''نہ جی، غنی ایسا نہیں ہے۔ ان لوگوں نے زبردستی کی ہوگی۔ وہ بھی میری وجہ سے کتنا خوار ہوا جی۔'' زندگی میں پہلی بار اکبر خان نے زلیخا کو روتے دیکھا۔ اکبر خان ایک ٹک اُسے روتا دیکھتا رہا۔ وہ کم گو دیہاتن تھی جو کچھ اُس کے دل میں تھا اُس سب کا اظہار اُس کے لیے ممکن نہ تھا مگر اُس وقت وہ کرچی کرچی ہو رہی تھی۔ خود کو کوس رہی تھی جس کے پیچھے ایک آدمی نے اپنا دین ایمان، ماں باپ، سب کچھ چھوڑ دیے تھے۔ اُسی کی وجہ سے اُس کے ہیرے ایسے مالک کو طرح طرح کے الزامات برداشت کرنے پڑ رہے تھے۔ لوگ یہ کیوں نہیں سمجھتے تھے کہ وہ ابھاگن، جس کے پیچھے ایک شخص پہلے ہی مٹ چکا ہو، کیسے کسی اور کا گھر اُجاڑ سکتی ہے۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ یہی بات تو لوگوں کے لیے اُس کی خباثت کا ثبوت تھی۔ جب وہ ایک مرد کو بہکا سکتی ہے تو یقیناً ہر مرد کے دین و ایمان اور وفاؤں

کا رُخ چٹکی میں اپنی طرف موڑ سکتی ہے۔

''بہرحال۔'' اکبرخان نے کہا، ''آج میں تم سے اس بات کی معافی مانگتا ہوں کہ میری وجہ سے تمھیں اتنی تکلیف ہوئی۔''

زلیخا کے چہرے پر یک لخت بہتر رنگوں کی چھوٹ سی پڑی۔

''یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں صاحب جی! میری وجہ سے آپ کا گھر اُجڑ رہا ہے، آپ بی بی گل کو دیکھنے کو ترستے ہیں۔ اس سے تو اچھا تھا کہ میں مرجاتی۔'' وہ پھر سسکیاں لینے لگی۔

یکایک اکبرخان، گل جان، بی بی گل اور غنی، سب کو بھول گیا۔ اُس کا جی چاہا وہ فوراً کورٹ میں جا کر اقبالِ جرم کرلے۔ ہاں یہ عورت اُس کے دکھ سکھ کی ساتھی تھی۔ وہ عورت جو ملازموں کی لگائی بجھائی میں آ کر میکے جا بیٹھی تھی اور بھائی کے بہکانے پر شوہر پر جھوٹا مقدمہ چلانے پر تیار ہوگئی تھی، اس کی کوئی نہیں تھی۔

''آج میں سوچتا ہوں زلیخا، کاش وہ بات سچ ہوتی جو دُنیا اتنے دنوں سے سوچ رہی ہے۔ کاش تمھارے دل میں واقعی میری جگہ ہوتی۔'' اکبرخان نے جھک کر زلیخا کا کالک بھرا ہاتھ پکڑلیا۔ کوئلوں کی سیاہی میں ان ہاتھوں کی سفیدی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ اُس کے ہاتھ گرم آگ تھے، شاید وہ ان ہاتھوں سے انگاروں کو چھیڑتی رہی تھی۔ اکبرخان نے اُس کے چہرے کی طرف دیکھا جو شعلوں کے قرب سے پہلے ہی سرخ انگارہ ہو رہا تھا۔ پہلے اس کے چہرے پر چنگاریاں سی اُڑیں پھر راکھ سی بکھری۔ اکبرخان سے ہاتھ چھڑا کر اپنے پیچھے دروازہ بند کرتی ہوئی وہ تیزی سے باہر نکل گئی۔ اکبرخان کی نظریں اُس کالے نشان پر جمی ہوئی تھیں جو زلیخا کے کوئلے کی سیاہی لگے انگوٹھے سے اَن جانے میں اُس کے ہاتھ پر منتقل ہوگیا تھا۔ مہرِ تصدیق کی طرح۔

وہ رات اکبرخان کے لیے بہت کٹھن تھی۔ دُھنکی رُوئی میں چھپے کانٹوں کی طرح زہریلے خیالات کی تیز نوکیں اُس کے ذہن میں چبھتی رہیں۔ دولت کی ایک روایت کہ ازدواج کی نازک ذاتی رنجشیں عزت وانا کا مسئلہ بن جاتی ہیں۔ ساجد کی احسان فراموشی، غنی اور زلیخا کا خاموش ایثار جو صرف اُس کی بات رکھنے کے لیے اتنے دن چپ چاپ سب کچھ سہتے رہے۔ عمرخان کے آبا کے روزنامچوں میں درج، دینے اور لینے والے ہاتھ کا فلسفہ — وہ عبدل اور زلیخا کا مالک تھا۔ انھیں تنخواہ دیتا تھا، مگر اصل دینے والے وہ دونوں تھے۔ وہ اس سے کہیں بلند تھے، دینے والے ہاتھ کی طرح جو لینے والے ہاتھ سے ہمیشہ بلند ہوتا ہے۔

صبح ہوئی تو بے بے نے اکبرخان کو اطلاع دی کہ زلیخا کہیں نہیں ہے۔ نہ اکبر منزل میں، نہ اپنے

گھر میں نہ اپنی پُرانی جھونپڑی میں۔ گھر اور جھونپڑی میں باہر سے قفل لگا ہوا تھا۔ اس یخ بستہ رات میں جب دانت سے دانت بج رہا تھا یا اس کہر آلود صبح میں، جب ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا، وہ منہ اندھیرے کہیں غائب ہوگئی تھی اس بادل کے ٹکڑے کی طرح جو آسمان پر کوئی نشان چھوڑے بغیر نامعلوم طور پر ہوا ہوجاتا ہے۔

اکبرخان ان ہی کپڑوں میں رات کی کسل مندی اُتارے بغیر عمرخان کے پاس جا پہنچا اور اسے رات کی ساری داستان سنائی۔ ''اب بتاؤ لالہ!'' اُس نے کہا، ''تم جو ازل سے عورتوں کے لیے دل میں گداز لیے پھرتے ہو اور ہمیشہ مردوں کے مظالم کی داستانیں سناتے ہو، تم نے کبھی اس کرب کا تصور کیا ہے جو بے وجہ میں نے اتنے دن سہا ہے۔ میں نے آج رات کی ساری بات تمھیں بتا دی ہے مع اس داغ کے جو اِس رات نے میرے ہاتھ پر ڈالا ہے مگر تم انصاف کرو، کیا اس کی ساری ذمہ داری مجھ ہی پر ہے؟''

''مجھے معلوم ہے کہ تم نے بیوی اور بچی کی جدائی کا صدمہ اُٹھایا ہے مگر تم زندہ ہو۔ مجھے معلوم ہے کہ کل کو تم اس بدنامی کے داغ سے بھی بری الذمہ ہو جاؤ گے۔ تمھارے بیوی بچے تمھارے ساتھ ہوں گے۔ اس سب کی زد بھی ایک عورت ہی پر پڑی ہے جو تمھاری انا کا جھنڈا اُٹھائے کسی یخ بستہ دریا میں کود گئی ہے یا جل مری ہے کیوں کہ وہ سَتی تھی (سَتی کے معنی ہیں وہ عورت جو پاک دامن ہو اور اپنے شوہر کی اَرتھی پر جل مرنے کو تیار ہو)۔ اس غریب کو تو اپنے شوہر کی چتا بھی نصیب نہ ہُوئی کہ وہ بھی اُسے دغا دے کر دشمن کے کیمپ میں چلا گیا۔''

عمرخان چپ ہوگیا۔ اکبرخان خاموشی سے باغ کے اُس حصے کو دیکھتا رہا جو کھڑکی میں پینٹنگ کی طرح جڑا تھا۔ صبح کے کُہر میں درخت اور بیلیں دُھندلائی ہوئی تھیں جیسے کسی نے تصویر پر مَلمَل کا پردہ ڈال دیا ہو۔

جنگ ختم ہو جائے اور لڑائی کا انجام محض جنگ بندی ہو تو فریقین دُنیا کو اپنی فتح کا یقین دلانے کے لیے دَب کر معاہدہ کرنے کو تیار نہیں ہوتے۔ اس کے علاوہ بہت عرصے تک فریقین کی فوجیں سرحدوں پر پڑاؤ ڈالے رکھتی ہیں۔ کاغذی معاہدوں سے بموں اور بندوقوں کے زخم نہیں بھرتے۔ یہ فوجیں ہر قسم کے جذباتی شرپسندوں (infiltrators) کو اندر جانے اور باہر نکلنے سے روکتی ہیں۔

اکبرخان اور گل جان کے درمیان وجہِ نزاع باقی نہ رہی تھی لیکن فوجیں ابھی بارکوں میں نہ گئی تھیں۔ صلح کی پہل کس طرف سے ہو، دب کر معاہدہ کون کرے۔ ساجد کا مان اور گل جان کا ٹھسا مانع تھا کہ وہ اکبرخان کے گھر جائیں۔ اکبرخان کا سادہ سا مطالبہ تھا کہ جو لے گیا ہے چھوڑ جائے یا گل

جان خود آجائے کہ اُس کا گھر ہے اور دروازے کھلے ہوئے ہیں۔

سردی آہستہ آہستہ رختِ سفر باندھ رہی تھی۔ عمر خان کے پھلوں کے درختوں پر پہلی مرتبہ اس بلا کا بلوسم (blossom) آیا تھا کہ سارا باغ سفید اور گلابی شگوفوں سے اَٹ گیا تھا۔ ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں کی پینٹنگز گویا موسم کے لحاظ سے تبدیل کی جاتی رہی ہوں، جیسے غیر ملکی کیلنڈر جن میں ہر ماہ کی تصویر موسم کی غماز ہوتی ہے۔ عمر اور ایلزا کی شادی اپریل میں ہونا قرار پائی تھی اور دونوں اکثر ان شگوفوں کے سائے میں بیٹھ کر اپنے مستقبل کے منصوبے بناتے تھے۔ ایلزا نے گھڑسواری کے شوق کو ازسرِنو مہمیز دینی شروع کر دی تھی۔

گھوڑے ابھی ابھی سیر سے لوٹے تھے۔ اُن کے بدن پسینے سے بھیگے ہوئے تھے۔ سائیس میلی دھوتی اور پھٹے ہوئے بنیان پہنے تولیوں سے اُن کا پسینہ خشک کر رہے تھے اور اس کام کی وجہ سے اُن کے اپنے بنیان پسینے سے بھیگے ہوئے تھے۔

''لو! ان بے چارے انسانوں کا پسینہ کون خشک کرے گا؟'' عمر خان نے شرارت سے ایلزا کو چھیڑا۔ ''جو تمھارے گھوڑوں کے ناز اُٹھانے میں خود پسینے پسینے ہو رہے ہیں۔''

''وہ جا کر نہا سکتے ہیں، انھیں منع کس نے کیا ہے۔'' ایلزا نے لاپروائی سے کہا۔

اسی وقت ایک گھوڑی دروازے کے درمیانی ڈنڈے کے نیچے سے سر نکال کر اور بدن کو جھونک دے کر باہر نکل گئی۔ ہیڈ سائیس بخار میں مبتلا ایک گھوڑی کو ٹیرامائی سن کھلانے میں مصروف تھا۔ ایلزا کو گھوڑی کی طرف بڑھتے دیکھ کر اُس نے کہا، ''مس، یہ کٹ کھنی گھوڑی ہے، اسے نہ پکڑنا۔ میں اس کے آگے جنگلہ رکھنا بھول گیا تھا۔ آپ رہنے دیں، میں کسی کو بلواتا ہوں اسے پکڑنے کے لیے۔''

ایلزا اَن سنی کر کے نپے تلے قدموں سے گھوڑی کی طرف بڑھتی رہی۔ ساتھ ہی اسے پچکارتی اور پیار کے ناموں سے پکارتی رہی۔ ''شی اِز اے ڈارلنگ، سویٹ لِٹل ڈیری ـــــ''

''سن رہی ہو، سائیس کیا کہہ رہا ہے؟'' عمر خان نے کہا۔

''شی اِز آل رائٹ، میں اُس پر سواری کر چکی ہوں۔'' ایلزا نے کہا۔ گھوڑی نے اپنی خوفناک بتیسی نکالی۔ عمر دو قدم پیچھے ہٹا لیکن ایلزا گھوڑی سے شفقت آمیز لہجے میں باتیں کرتی، ''میری پیاری ـــــ میری گڑیا'' کہتی آہستہ آہستہ اُس کے پاس پہنچ گئی اور دھیرے دھیرے اُس کی گردن تھپتھپانے لگی۔ یوں لگا جیسے ایلزا کا ہاتھ لگتے ہی گھوڑی کا غصہ کافور ہو گیا ہو۔

''اس پر زین کس دو، میں آج اس پر سواری کروں گی۔'' ایلزا نے کہا۔

''اس کا مزاج آج کل ٹھکانے نہیں ہے، مس صاحب!'' سائیس نے کہا۔

''شی اِز او کے۔'' ایلزا نے اسے دو ایک بار پیار سے تھپکی دی۔ سائیس نے اسے تیار کیا۔ وہ اطمینان سے کھڑی رہی۔

''آپ سے خوش ہے۔'' سائیس نے دانت نکال کر کہا۔

ایلزا گھوڑی پر سوار ہوئی اور ری ماؤنٹ ڈپو کے اندر میدان میں ایک چکر لگایا پھر عمر سے پکار کر کہا، ''آؤ تم بھی بیٹھو نا۔ سائیس سے کہو ایک سیدھا سا گھوڑا لے آئے۔ آج کہیں باہر چلیں گے۔''

''نہیں، پھر کبھی۔'' عمر خان نے کہا۔

''ارے تمھارے علاقے میں تو میں نے عورتیں تک گھوڑوں پر بیٹھی دیکھی ہیں۔'' اس نے کہا۔

''مگر میں نے مدت سے گھڑ سواری چھوڑ رکھی ہے۔'' عمر نے معذرت کی۔

''یہ تو کوئی بات نہیں ہوئی۔'' ایلزا نے کہا، ''چھوڑ رکھی ہے تو اب شروع کرو۔''

''پھر کبھی۔'' عمر خان نے کہا۔

''روز تم یہی کہتے ہو۔ آج اس کا فیصلہ ہوگا، یہ میرا حکم ہے۔'' ایلزا نے مذاق کے لہجے میں تحکم پیدا کیا۔ ''ابھی یا کبھی نہیں! — بولو کیا کہتے ہو۔''

''یقیناً ابھی اور اسی وقت — اور میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' عمر نے ہنستے ہوئے ہتھیار ڈال دیے۔

''لاؤ بھئی شیر علی، ہمارے لیے ایک گھوڑا نہایت عمدہ اور اصیل، جس پر بیٹھ کر آدمی فخر محسوس کرے۔''

سائیس گھوڑا لینے گیا۔ ایلزا میدان میں گھوڑی دوڑاتی رہی۔ عمر خان اصطبل اور اس کے مکینوں کو دلچسپی سے دیکھتا رہا۔ ایک بڑے سے میدان کے تین طرف کشادہ کوٹھریاں تھیں، دس بارہ فٹ لانبی اور اتنی ہی چوڑی۔ پہاڑ پر رہنے والے بہت کم غریب لوگوں کو اتنی کشادہ اور صاف ستھری کوٹھریاں میسر تھیں۔ پیچھے کی دیوار میں خاصی بلندی پر ایک بڑا روشن دان تھا۔ سامنے برآمدے میں ایک دروازہ کھلتا تھا۔ ہر دروازے میں دو لکڑیاں اس طرح لگی ہوئی تھیں کہ گھوڑے ان میں سے نکل نہ سکیں۔ اصطبل میں ایک طرف گھوڑے رکھے جاتے تھے دوسری طرف گھوڑیاں۔ درمیان میں ایک طرف دفتر کے چند کمرے تھے اور اس کے مقابل چارے کا گودام۔ ان گھوڑوں کا چارہ پنجاب کے ایک زرخیز علاقے میں باقاعدہ کاشت کیا جاتا تھا۔ شدید سردی کے موسم میں زیادہ تر گھوڑے بھی اسی علاقے میں بھیج دیے جاتے تھے اور گرمی میں واپس آ جاتے تھے۔

گھوڑے گھوڑیوں کے نام، اُن کی نسل اور عمر وغیرہ ان کے کمروں کے آگے ان کے نمبروں کے ساتھ درج تھے۔ یہی نمبر گرم لوہے سے اُن کے جسموں پر داغ دیے گئے تھے۔ عمر کو پہلے پہل گھوڑوں سے زیادہ ان کے ناموں نے متوجہ کیا۔ ''حجاز لو''، ''نسیم سحر''، ''مون ٹائڈ''، ''پری چہرہ''، ''جل پری''

اور ''خوب صورت طوفان'' وغیرہ۔ ''حجازلو'' نہایت نوعمر گھوڑی تھی لیکن اُس کا طویل قد وقامت دیکھ کر عمرخان تھرا اُٹھا تھا۔ اس کا چہرہ بھی ڈیڑھ فٹ سے کم لانبا نہ تھا۔ یہی حال دوسری گھوڑیوں کا تھا۔ ''پری چہرہ'' البتہ خوب صورت تھی۔ منہ تو اُس کا بھی لمبا تھا لیکن تھی خوش شکل، جسم سانچے میں ڈھلا ہوا، تنگ اور تیز۔ دُم کھڑی ہوئی۔ ''یہ تو خالص عرب گھوڑی کی پہچان ہے۔'' ایلزا نے اُسے بتایا تھا۔

ایلزا باری باری ہر گھوڑے کو تھپکتی تھی اور ''مائی ڈارلنگ'' وغیرہ کے القابات سے نوازتی تھی جس پر کبھی کبھی مذاق میں عمرخان احتجاج بھی کرتا تھا۔

''دیکھو یہ سارے گھوڑے گھوڑیاں کیسی التجا آمیز نظروں سے ہمیں دیکھ رہی ہیں اور کیسی بے چینی سے پیر پٹخ رہی ہیں۔ یہ آزادی مانگ رہی ہیں۔ ان کو کھول دینا چاہیے۔ بھلا ہمیں کیا حق ہے انھیں باندھ کر رکھنے کا۔'' عمرخان کہتا۔

''واہ، ان میں سے ایک ایک خزانہ ہے خزانہ۔'' ایلزا اِترا اٹھتی۔

''ہاں صاحب! ایک ایک گھوڑی ہزاروں روپے کی ہے۔'' سائیس بھی حقِ رفاقت نبھانا ضروری سمجھتا۔

''ارے اس بہار کو کیا ہوا؟'' چند دن پیشتر ایلزا بیمار گھوڑی کی طرف ایسی بے قراری سے لپکی تھی جیسی لوہا مقناطیس کی طرف۔ سائیس ایک کوٹھری کے باہر برقی پنکھا رکھنے میں مصروف تھا۔

''جی اسے تیز بخار ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا ہے اِس کے لیے پنکھا لگاؤ۔ بخار بڑھنا نہیں چاہیے۔''

''پوئرسول (poor soul)— پوئرڈارلنگ۔'' ایلزا نے بے اختیار اُس کے بھنتے ہوئے ماتھے پر بوسہ دیا تھا اور بہت دیر تک اُس کی گردن سہلاتی رہی تھی۔ گھوڑی اپنی سرخ احسان مند نگاہوں سے اُسے تاکتی رہی تھی۔

آج یہی گھوڑی اُس کے لیے لائی گئی تھی۔ عمر نے رکاب میں پاؤں ڈالا اور اطمینان سے سوار ہوگیا۔ اُس پر بیٹھتے ہی عمرخان کو محسوس ہوا جیسے وہ اتنے عرصے بعد بھی گھڑسواری کے سارے رموز سے واقف ہے۔ وہ خواہ مخواہ ہی اتنے دن گھبراتا رہا۔ اُس وقت وہ یوں سکون سے بیٹھا تھا جیسے اپنے مطالعے کے کمرے میں جھولتی کرسی پر بیٹھا ہو۔

ایلزا صدر دروازے کی طرف بڑھی۔ عمر بھی اُس کے پیچھے پیچھے چلا۔ ری ماؤنٹ ڈپو کے صدر دروازے سے بہار پر بیٹھ کر نکلتے ہوئے وہ واقعی دل ہی دل میں کچھ فخر سا محسوس کر رہا تھا۔ گھوڑوں کے سُموں کے نیچے سبز مخملیں فرش تھا، اور سامنے پہاڑی تھی جس پر سے بہتا نالہ آبشار کی شکل میں گرتا عمرخان کے گھر کی سرحد بناتا دُور وادی میں اُتر جاتا تھا۔ ایلزا اُس پہاڑی پر چڑھنے لگی۔ عمرخان نے

محسوس کیا کہ اس پہاڑی پر آمد و رفت نہ ہونے کی وجہ سے پگڈنڈیاں بہت پتلی ہیں اور اُن پر پڑے ہوئے چیڑ کے تنکوں کے ڈھیر خاصے پھسلواں ہیں۔

ایلزا اور عمر آگے پیچھے چلتے رہے۔ نسبتاً صاف سی ایک پگڈنڈی پر عمر خان نے اپنی گھوڑی کو ایڑ دی اور یکایک وہ اِس قدر تیز بھاگی جیسے اُس نے کوئی بھوت دیکھ لیا ہو۔ ایلزا کی گھوڑی کے پاس سے گزری تو وہ بھی بھڑک گئی۔ اپنے کان کھڑے کر کے اُس نے بھی بے تحاشا دوڑنا شروع کیا۔ عمر جھک کر گھوڑی کی پیٹھ سے لگ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ ایلزا اپنی گھوڑی کے ساتھ ساتھ عمر کی گھوڑی کو بھی سنبھالنے کی کوشش کرنے لگی۔ ایلزا کی چیخ پر عمر خان نے آنکھیں کھولیں۔ چند لوگوں نے مل کر دونوں گھوڑیوں کو قابو میں کیا اور تب عمر خان کو پتا چلا کہ ایلزا گھوڑی سے نالے میں گر گئی ہے۔ نالہ بظاہر آڑے ترچھے درختوں، جھاڑ جھنکار اور جال دار جھاڑیوں سے ڈھکا ہوا تھا مگر اندر ہی اندر پانی خاصی گہرائی تک زمین کو کاٹ چکا تھا، اور ہر سال کاٹتا چلا جاتا تھا۔ ایلزا ان جھاڑیوں سے گزرتی نالے میں گری تھی۔ جہاں بڑے بڑے پتھر پڑے ہوئے تھے اور اس کی رِیڑھ کی ہڈی ٹوٹ گئی تھی۔

ایلزا دو دن زِندہ رہی مگر زندگی سے اُس کا ناتا ایسا تھا جیسے کوئی ٹوٹی ہوئی شاخ چھال کے ایک تسمے سے درخت سے بندھی رہ گئی ہو۔ تیسرے دن اُس نے دم توڑ دیا۔

ایلزا کو مسیحی قبرستان میں، جسے عوام گورا قبرستان کہتے ہیں، دفن کر دیا گیا۔ اُس کی قبر سنگِ مرمر کی بنوائی گئی۔ جس پر نازک سا ایک کتبہ تھا۔ بل کھاتی سنگی بیل اور خوب صورت سا ایک فرشتہ جو اپنے خوب صورت مُنّے سے ہاتھ کی ایک سڈول انگلی اُٹھائے آسمان کی طرف اشارہ کر رہا تھا کتبے پر ایلزا کا سنِ پیدائش، جائے پیدائش، سنِ وفات اور موت کی وجہ بھی کندہ کی گئی تھی۔

عمر خان، گل جان کا تایا زاد بھائی بھی تھا اور اکبر خان کا دوست بھی۔ عمر خان کی منگیتر کے مرنے پر گل جان کو پُرسے کے لیے ضرور جانا چاہیے۔ رحمت بی بی اور ساجد نے سوچا۔ اصل وجہ یہ تھی کہ زلیخا اور غنی کے چلے جانے کے بعد ساجد نے مقدمہ واپس لے لیا تھا اور اکبر خان کی ضد دیکھ کر اب گل جان کو سسرال بھیجنے کے بہانے ڈھونڈے جا رہے تھے۔ کئی لوگوں کو درمیان میں ڈالا جا چکا تھا، جو بظاہر اپنی طرف سے اکبر خان کو نصیحت کرتے تھے کہ بات رفت گزشت ہوئی، جا کر بیوی کو گھر لاؤ۔ ننھی سی بچی تمھارے فراق میں تڑپ رہی ہے۔ کوئی جھوٹوں کہہ دیتا ہے کہ تمھارے دا جی آئے ہیں تو ادبدا کر بھاگتی ہے۔ مگر اکبر خان ٹالتا رہا۔ وہ ہی غمگین نہیں تھا، عمر خان بھی بے حد غم زدہ تھا اور چند دن اُس کے ساتھ رہ کر وہ عمر خان کا غم غلط کرنا چاہتا تھا۔

ایلزا کو دفن کرنے کے بعد عمر خان ایک مرتبہ بھی اپنے گھر سے باہر نہیں گیا تھا۔ اپنے باغ کے کونے میں لگے وہ ایک ایسے چنار کے سائے میں بیٹھا رہتا تھا۔ جس کے نیچے کئی کارواں پناہ لے سکتے تھے۔ اس چنار کے سبز، زرد اور شنگرفی پنج انگشتی پتوں کی خنک چھاؤں میں وہ سارا سارا دن بیٹھا پڑھتا یا سوچتا رہتا تھا۔ اکثر لباس بھی تبدیل نہ کرتا تھا، سونے کے لباس پر ڈریسنگ گاؤن پہنے سارا دن گزار دیتا تھا۔ پُرانا ملازم بشیر خان وہیں ناشتا لا دیتا۔ وہیں کتابیں اور لکھنے پڑھنے کا سامان پڑا رہتا۔ وہیں کھانا آ جاتا۔ کھانا کھا کر نیپکن سے ہاتھ منھ صاف کر کے وہیں چائے یا کافی پی کر آرام کرسی پر قیلولہ کر لیتا یا سگرٹ پیتے ہوئے پھر کچھ پڑھنے میں مصروف ہو جاتا۔ ملنے والوں میں بہت کم

لوگ تھے جو صبح کے اوقات میں آتے تھے، ہاں اکبر خان ہر وقت آ سکتا تھا اور اکثر کورٹ سے واپسی پر وہ سیدھا عمر خان کے پاس چلا آتا تھا۔

وہ موسم بہار کا نہایت شگفتہ اور خوب صورت دن تھا۔ نیلے آسمان پر بادلوں کے سفید ٹکڑے، دیواروں پر دونوں ہاتھوں سے بنائی جانے والی پرچھائیوں کی طرح چوپایوں اور پرندوں کی صورت قطار میں کھڑے تھے۔ سفید ہاتھی، بگلا، خرگوش اور برفانی بھالو۔ مگر جس وقت اکبر خان کوٹھی میں داخل ہوا، اُس نے دیکھا کہ عمر خان کی نظر نیلے آسمان اور ان بے داغ جانوروں پر نہیں ہے، نہ باغ کے اُن درختوں پر جو زرد خوبانیوں، سبز کچے سیبوں اور نیم پختہ آلو بخاروں سے اَٹے پڑے تھے۔ وہ اپنے سامنے پڑے ہوئے ایک پرچے کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ درختوں کی وجہ سے سبزے پر دُھوپ اور چھاؤں کا جو جال بچھا تھا اُسے پار کرتا اکبر خان نزدیک پہنچا اور اُس پرچے کو غور سے دیکھا۔ ستھری نسوانی تحریر میں انگریزی میں لکھے ہوئے جملے غالباً ایلزا کے ہیں۔ اکبر خان نے سوچا۔ عمر نے بغیر کوئی بات کیے وہ پُرزہ اُٹھا کر اکبر خان کے ہاتھ میں تھما دیا۔

میری طرف سے دو چار پھول اپنی محبوبہ اور منگیتر کی قبر پر چڑھا دینا۔ مجھے افسوس ہے کہ میں پھول تمھیں نہیں بھجوا سکتی۔ ہمارے ہاں آج کل پوست کے پھولوں کے سوا کوئی اور پھول نہیں ہے اور تم جانتے ہو کہ وہ کتنے کمزور ہوتے ہیں۔ کسی خوب صورت، جاں باز گھڑ سوار عورت کے لیے وہ موزوں نہیں ہیں، ہم جیسی عورتوں کے لیے مناسب ہیں۔ جن کے گھر اوّل دن سے اُن کے مقبرے ہوتے ہیں۔'' اس پرچے پر کوئی نام کوئی دستخط نہیں تھے — اکبر خان نے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو عمر خان نے کہا، ''یہ قدسیہ نے ڈاک سے بھیجا ہے۔ لز کے مرنے کی خبر اخبار میں چھپی تھی۔ اُس نے دیکھ لی ہوگی۔ میں سوچتا ہوں یہ دو جملوں کا خط بھی وہ کس طرح بھیج سکی ہوگی۔ تمھیں معلوم ہے وہ میری چچازاد بہن ہے لیکن اُس کا ظالم شوہر مجھے اُس سے ملنے نہیں دیتا۔''

''کیوں؟'' اکبر خان نے پوچھا۔

''سیدھی سی بات ہے۔'' عمر خان نے کہا، ''اُس کے نزدیک بیوی ذاتی جائداد ہوتی ہے۔ ملکیت کو اِس قسم کے کوئی حقوق حاصل نہیں ہوتے۔''

''تمھیں گھر کی کسی خاتون کو لے کر جانا چاہیے تھا۔'' اکبر خان نے کہا۔

''یہ بھی کر چکا ہوں۔ یہ سب ہو چکا ہے۔ ایک مرتبہ ایلزا کو ساتھ لے کر گیا تھا اور خاوند کی موجودگی میں ملنا چاہا تھا، صرف وہ خاندانی رشتہ جوڑنے کے لیے جو ہمارے اور اُس کے درمیان ٹوٹ گیا ہے۔''

''تو تم اُس سے ایک دفعہ بھی نہیں مل سکے؟'' اکبر خان نے پوچھا۔

''نہیں۔'' عمرخان نے کہا۔ ''میں سوچتا ہوں اکبر، ہماری عورتوں کے دُکھ کتنے بوجھل ہوتے ہیں۔ یہی اُٹھالیتی ہیں انھیں، ہم مردوں کے تو کلیجے پھٹ جائیں اور ہم مرد کتنے چھوٹے دل کے ہوتے ہیں، ہم میں مردانگی تو نام کو نہیں ہوتی اب اس شہزورخان کو دیکھو، اپنے آپ کو شہزادہ سیف الملوک سمجھتا ہے۔ قدسیہ سے محض اس لیے شادی کی کہ اُس کی خوب صورتی، اُس کی تعلیم اور اُس کے باپ کا عہدہ اُس کے لیے چیلنج بن گیا تھا۔ جب وہ بدنصیب لڑکی گھر میں گئی تو بیل کی جوڑی کے برابر ہوگئی۔ مجھے بعض اوقات خود سے نفرت ہونے لگتی ہے، مرد ہونے کے ناتے۔''

''یہ سب جاہل لوگوں کی باتیں ہیں۔'' اکبرخان نے کہا۔

''جاہل لوگوں کی باتیں نہیں ہیں۔'' عمرخان گرجا۔ ''شہزورخان بھی جاہل نہیں ہے، اور میں بھی ایسا جاہل اور بچہ نہیں تھا، جب میں نے ایلزا سے شادی کی درخواست کی تھی۔''

''تمھارا کیا ذکر ہے؟'' اکبرخان نے حیرت سے اُس کی طرف دیکھا۔ باغ میں دُور دُور بیٹھے، کام کرتے مالی بھی عمرخان کی اتنی اونچی آواز پر حیران ہوئے۔ عمرخان نے شرمندگی سے سر جھکالیا۔

''میرا نام بھی ہے اِس فہرست میں۔'' اُس نے دھیرے دھیرے کہا۔ ''میرا اعمال نامہ بھی سیاہ ہے۔ مجھے ایلزا سے شدید محبت اسی دن محسوس ہوئی تھی جس روز شہزورخان نے دریائے سوات کے کنارے میرے منھ پر جوتا مارا تھا اور مجھے قدسیہ سے ملنے سے منع کر دیا تھا۔ میں نے اُسے دکھانا چاہا کہ میں تیری بیوی سے زیادہ گوری چمڑی اور خالص برطانوی انگریزی بولنے والی لڑکی سے شادی کرسکتا ہوں۔ اور ایلزا کو دیکھو، میری وجہ سے اُس کی جان گئی۔ دو دن جان کنی کے عالم میں رہی لیکن مرتے مرتے بھی اُس نے میری اَنا کو جھنڈے پر چڑھائے رکھا۔ اُس کی آنکھوں میں یہ شکوہ نہ تھا کہ تم اناڑی وحشی، گھوڑے پر بیٹھنے کے نااہل میرے قابل نہ تھے۔ کیوں—'' وہ بے حد دُکھی ہوگیا۔ ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہا، ''دیکھو اکبر! گل جان تمھارے پاس آجائے تو اُس پر سختی نہ کرنا— اور اپنی بیٹی زربی کو خدا کے لیے اتنا مجبور نہ بنانا۔ اُسے خود کچھ بننے کا موقع دینا۔ اُسے اپنے لیے سوچنے اور فیصلہ کرنے کا حق دینا تاکہ وہ قدسیہ یا گل جان یا ایلزا نہ بنے۔''

اکبرخان نے محسوس کیا کہ عمر واقعی بہت غمگین ہے۔ ایلزا کے غم کے علاوہ اُسے کوئی ایسا دُکھ بھی کھا رہا ہے جسے کوئی نام نہیں دیا جاسکتا۔'' عمرخان صرف خالی خالی نظروں سے اُس کی طرف دیکھتا رہا۔

رحمت بی بی، ساجد اور گل جان عمرخان کو پُرسا دینے آئے تو بڑی سیاسی حکمتِ عملی سے اکبرخان کا آسامنا سامنا کروایا گیا۔ موقع لڑائی بھڑائی اور شکوے شکایات کا نہیں ہے۔ یہ ظاہر کرتے ہوئے رحمت بی بی اور ساجد اکبرخان سے یوں ملے جیسے درمیان میں کبھی کوئی خلیج حائل نہیں ہوئی تھی۔ شام کو سب

اکٹھے اکبر منزل پہنچے اور دُوسرے دن گل جان کو وہاں چھوڑ کر ماں اور بھائی اس طرح گاؤں سدھارے جیسے صرف اُن دونوں سے ملنے ہی آئے ہوں۔ لیکن زری ان لوگوں کے ساتھ نہیں آئی تھی۔

ایک دن جب زری چھت پر چڑھی نوجوان لڑکوں کو چمڑے کی مشکوں پر دریا پار کرتے دیکھ رہی تھی، اچانک کنارے پر کچھ زیادہ گہما گہمی نظر آئی۔ گھر کے کئی ملازم اس طرف بھاگتے دکھائی دیے۔ پھر حویلی میں ہلچل سی مچی۔ چند خادمائیں دھبڑ دھبڑ کرتی سیڑھیاں چڑھیں اور چلائیں، ”چلو بی بی گل! تمھارے داجی آئے ہیں۔“

اور اُس وقت زری جو سیکڑوں مرتبہ تصور میں داجی کو دریا پار کر کے آتا دیکھ کر خود کو بھاگتے، اُن سے لپٹا دیکھ چکی تھی، ایک دم پتھر بن گئی۔ ضرور یہ بھی خواب ہے۔ اُس کی آنکھ کھلے گی تو دیکھے گی کہ روز کی طرح وہ آج بھی اکیلی ہے۔

جب وہ نیچے نہ پہنچی تو اکبر خان اور عمر خان پاس پڑوس کے بچوں اور خاداؤں کے جلو میں زری کو لینے اُوپر چڑھے۔ زری اب چل بھی سکتی تھی اور بولتی بھی تھی۔ لیکن اُس نے نہ ایک قدم آگے بڑھایا نہ منھ سے ایک لفظ نکالا۔ وہ ایک ٹک اکبر خان کو دیکھتی رہی۔ اُن نظروں میں صرف حیرت تھی—— حیرت اور استعجاب، اور اس کے بعد بے پناہ شکایت۔ یہ نگاہیں اس بات کا ثبوت تھیں کہ وہ اکبر خان کو پہچان گئی تھی۔

اکبر خان نے بانہیں پھیلائیں تب بھی زری اپنی جگہ سے نہ ہلی اور جب اُنھوں نے اسے زبردستی گود میں لیا تو وہ یکایک سفید پڑ گئی اور اُس کی گردن ڈھلک گئی۔ بے ہوش زری کو کلیجے سے لگائے نیچے اُترتے ہوئے اکبر خان بے زبان آواز میں کہتا رہا، میری بیٹی، میری جان!—— اگر تو نہ ہوتی تو شاید آج میری زندگی کی داستان کچھ اور ہوتی۔ میں یہاں صرف تیری خاطر آیا ہوں اور اپنی بیوی سے دوبارہ تعلقات صرف اِس لیے قائم کیے ہیں کہ وہ تیری ماں ہے۔ مجھے پوری طرح یہ احساس ہو گیا ہے کہ ہم دونوں ساتھ تو شاید رہ سکیں مگر خوش کبھی نہ رہ سکیں گے۔

زری ہوش میں آئی تو بغیر کچھ کہے سنے دوبارہ داجی کے سینے سے لگ گئی اور دیر تک سسکیاں لیتی رہی۔ بہت سے لوگوں کے لیے یہ ردِعمل حیرت انگیز تھا۔ ان کا خیال تھا کہ زری اتنی کم عمر ہے اور اتنے کم دن باپ کے پاس رہی ہے کہ انھیں بالکل بھول چکی ہے۔ داجی سے یہ ملاپ زری زندگی بھر نہ بھولی۔ یہ بات اُس نے خود عمر خان کو کوئی مرتبہ بتائی تھی—— اور اب زری بھی زیب قادری کی شخصیت کے سحر کا شکار ہو گئی تھی۔ وہ بار بار اپنے دل کو ٹٹولتے رہے۔ نہیں، اب کوئی چیز ازسرِنو شروع کرنے کو جی نہیں چاہتا—— آدمی جب پوری طرح (disillusioned) ہو چکا ہو تو دوبارہ کیسے کسی

الوژن میں گرفتار ہوسکتا ہے۔ یہ تو بچپن کی باتیں تھیں کہ پرچھائیوں کو دیکھ کر گمان ہوتا تھا جیسے کوئی بیٹھا یا کھڑا ہے، دل دھڑکنے لگتا تھا۔ ہمت کرکے جا کر اُس چیز کو دیکھتے تھے تب دل ٹھہرتا تھا۔ جوانی میں یہ سائے پریاں بن کر رجھاتے تھے۔ جیسے باغ میں کوئی اپسرا سبز اوڑھنی اوڑھے کھڑی ہے۔ کبھی خوب رُو دریچے سے جھانک رہی ہے یا مخروطی اُنگلیاں دروازے پر دستک دے رہی ہیں۔ اب جب کہ یہ سارے تصورات ختم ہوچکے ہیں، نئے سرے سے خوابوں کی دُنیا بسانا بہت مشکل ہے۔

رات چاندنی تھی۔ اُس رات وہ لیٹنے سے پہلے بہت دیر تک ٹہلتے رہے تھے۔ آج پہلی بار اُن پر یہ انکشاف ہوا تھا کہ پہاڑوں پر چاندنی میدانوں اور ریگستانوں کی طرح ہر چیز پر چھاتی نہیں ہے بلکہ سائے اور روشنیوں کا یہ کھیل بڑا الجھا ہوا ہوتا تھا۔ خوشیوں، غموں، اُمیدوں اور مایوسیوں کے تانے بانے سے بُنی ہوئی زندگی کی مانند——انھوں نے ''یوسف منزل'' کی طرف دیکھا۔ زیب قادری کے کمرے میں ہلکی سی روشنی تھی۔ لیمپ کی روشنی میں وہ پڑھنے یا لکھنے میں مصروف تھیں۔ کوٹھی کے احاطے میں ایک بید مجنوں اس دیوداسی کی طرح کھڑا تھا جو ہاتھ میں تھال لیے دیوتا کی آرتی اتار رہی ہو۔ اس کی نیلی جھولتی شاخیں دیوداسی کے لمبے بالوں کی طرح زمین کو چھو رہی تھیں۔ ایک قدم آگے بڑھ کر وہ جنگلے کے پاس آ کھڑے ہوئے۔ انگور کی بیل نے جنگلے کے باریک ستونوں کو اُوپر سے نیچے تک یوں لپیٹ رکھا تھا جیسے مر کر ہی چھوڑے گی۔ محبت بھی بڑی ظالم ہوتی ہے۔ انھوں نے سوچا تھا، شکنجے میں کس لیتی ہے۔ پاپلر کے درختوں کے درمیان سے جھانکتی پہاڑ کی روشنیاں تاروں بھرے آسمان کی طرح لگ رہی تھیں۔ وہ کچھ سوچتے ہوئے بھی ڈر رہے تھے۔ جب آدمی لمبی مسافت طے کرلیتا ہے تو ایک ایسا وقت آتا ہے جب دو قدم چلنا بھی ناممکن ہوجاتا ہے۔ دل و دماغ کی ساری قوتیں اُس وقت بے کار ہوجاتی ہیں۔

مگر وہ اپنے ساتھ ایمان داری برتنے کے قائل تھے۔ انھوں نے اُس دن اپنی ڈائری میں لکھا تھا: اُس سے مل کر دو باتیں شدّت سے محسوس ہوئی ہیں۔ ایک بہت دن بعد سچ مچ بات کرنے کو جی چاہا ہے۔ دُوسرے اُس سے ملنے کے بعد تنہائی اتنی بُری نہیں لگتی۔

اُس دن زری میوہ نکال کر بڑے سلیقے سے سجا کر لائی تھی۔

''آنٹی! آج آپ دکھائیں گی اس بڑے بکس میں اور کیا کیا ہے؟''

''نہیں، پھر کبھی...'' زیب قادری نے کہا تھا اور اُٹھ کر پرانے ریکارڈ لگا دیے تھے۔ وہ دونوں خاموشی سے گانے سن رہے تھے۔ زری پاس بیٹھی میوہ ٹونگ رہی تھی۔ انھیں خیال آیا تھا موسیقی کی موہنی لہریں کھردرے الفاظ کو کیسا سڈول بنا دیتی ہے کہ اُن کی بدوضعی پر دھیان ہی نہیں جاتا۔ سہگل کسی کھوٹے سکے پر گیت گا دے تو ٹھن ٹھن بولتے چاندی کے روپے بلکہ اشرفیاں بھی اُس کے آگے ہیچ ہو جائیں۔

اچانک زیب قادری بولیں، ''عمر صاحب، آپ نے کبھی ایک بات پر غور کیا؟ مجھے اکثر خیال آتا ہے کہ جب ہم پہلی مرتبہ ملے تھے ہمارا رویّہ اتنا جارحانہ کیوں تھا۔ اب ایسا بھی نہیں ہے کہ ہم ایٹی کیٹ سے بالکل ناواقف ہوں۔''

''کہا جاتا ہے کہ حملے میں پہل کرنا بہترین دفاع ہے۔ میرا خیال ہے ہم بڑھ چڑھ کر کے اپنا بچاؤ کر رہے تھے۔''

''کس چیز سے بچاؤ؟'' زیب قادری حیران ہوئیں۔

''ہم دونوں اندر سے کسی دوست کے لیے تڑپ رہے تھے مگر ہماری اَنا یہ بات ماننے کے لیے تیار نہیں تھی اور ہم ایک دوسرے کو یہ بتا رہے تھے کہ ہم غرض مند نہیں ہیں۔ ہم کسی کی دوستی یا رفاقت کے بھوکے نہیں ہیں۔ ہماری زخمی انائیں ایک دُوسرے پر غرّا رہی تھیں کہ دوسرا ہمیں کمزور نہ سمجھ لے۔

آپ کو میری اس بات سے اختلاف کا پورا حق ہے۔‘‘

’’مجھے بحث کرنے کا شوق نہیں۔‘‘ زیب قادری نے مسکرا کر کہا تھا۔

’’بحث کرنے میں کیا بُرائی ہے؟ سقراط بحث کے ذریعے ہی لوگوں کو بہت کچھ سکھاتا تھا۔‘‘

’’سقراط جاہلوں اور تنگ دلوں کو صرف یہ سکھا پایا کہ سکھانے والوں کو، علم کی جستجو کرنے والوں اور سچ بولنے والوں کو زہر دے دینا چاہیے۔‘‘

’’یہ بھی تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔‘‘ وہ پہلا دن تھا جب زیب قادری کو انھوں نے ’’تم‘‘ کہا تھا اور آہستہ آہستہ نامعلوم طور پر زیب قادری بھی آپ سے تم پر آ گئی تھیں۔

ملازم نے آ کر اطلاع دی کہ اکبر منزل سے چاچا جی اور زری کا بُلاوا آیا ہے۔ وہ ’’یوسف منزل‘‘ سے نکلے تو یہ دیکھ کر بڑے حیران ہوئے کہ سورج ڈوبے دیر ہو چکی ہے۔

’’آج کتنی جلدی اندھیرا ہو گیا۔‘‘ انھوں نے زری سے کہا اور زری صرف مسکرا دی، جیسے وہ یہ بات خوب جانتی ہو کہ آج چاچا جی کو وقت گزرنے کا احساس کیوں نہ ہوا۔

دوسرے دن صبح ہی انھوں نے اکبر خان سے کہا تھا کہ وہ کورٹ جاتے ہوئے انھیں ساتھ لے کر گھر چھوڑتا جائے۔ زری اس وقت سو رہی تھی۔ گل جان اور اکبر خان کی امّی نے انھیں خوش خوش رخصت کیا تھا۔

یقیناً وہ کچھ کھوئے کھوئے سے تھے جیسے کوئی چیز بھول کر جا رہے ہوں اور انھیں یہ بھی یاد نہ ہو کہ وہ کیا چیز ہے اور کہاں رکھ کر بھول گئے ہیں۔

’’ایک بات کہوں لالہ! بے چاری گل جان بہت دنوں سے ڈر رہی تھی کہ آپ کہیں بیگم قادری کے پھندے میں نہ پھنس جائیں اور میں دُعا مانگ رہا تھا کہ کاش آپ پھنس جائیں۔‘‘ راہ میں اکبر خان نے کہا تھا۔

وہ صرف ہنس دیے تھے مگر شاید اس ہنسی میں خوش دلی نہیں، بے بسی سی تھی۔ گاڑی چلاتے ہوئے اکبر خان نے ان کے چہرے کے تاثرات تو نہ دیکھے مگر کچھ دیر انتظار کیا کہ وہ کچھ کہیں گے۔ بات کو بڑھانے کی تو انھیں عادت تھی مگر انھوں نے کچھ نہ کہا۔

’’مجھے صرف ایک بات بتائیے لالہ، کہیں آپ زیب قادری سے بچ کر تو نہیں بھاگ رہے؟‘‘ اکبر خان نے اُن کی طرف دیکھ کر براہِ راست سوال کیا تھا۔

’’معلوم نہیں۔‘‘ اُنھوں نے گول مول جواب دیا۔

’’نہیں، ایسا نہ کہیے لالہ، وہ بہت دُکھی عورت ہے۔ مجھے ڈاکٹر یوسف نے بتایا ہے کہ وہ بہت بیمار

ہے۔ چند دن کی رفاقت، دوستی، کچھ نہیں تو تھوڑا سا وقت دے سکیں تو اسے اس نعمت سے محروم نہ کیجیے۔"

اکبر خان نے گاڑی موڑ لی تھی اور انھیں واپس اپنے گھر لے آئے تھے۔

"میں نے لالہ سے کہہ دیا ہے کہ جب تک وہ اپنے گھر میں ٹیلی فون نہیں لگوائیں گے میں انھیں وہاں نہیں جانے دوں گا۔ حد ہے کنجوسی کی۔ اتنی آمدنی ہے، آخر وہ کس دن کام آئے گی۔" اکبر منزل پہنچ کر اکبر خان نے اعلان کر دیا تھا۔

گل جان نے شوہر کو غصے سے دیکھا تھا جیسے کہہ رہی ہو، اچھا تو اکبر خانا، تم بھی اس سازش میں شریک ہو۔ گل جان کی نظروں سے بچنے کے لیے چاچا جی کوٹھے پر چلے گئے تھے اور سربن پہاڑ پر پھیلی دھوپ کو دیکھ کر سوچتے رہے تھے۔ اکثر لوگ مرنے سے پہلے دُنیا سے دل بھر لینے کی بات کرتے ہیں۔ ٹھیک ہے دُنیا کی آسائشوں کو ترک کر دینا بھی ایک منزل ہے لیکن دل تو اصل میں اپنی ذات سے پھیرنا ہوتا ہے۔ میرے لیے دُنیا میں کیا ہے؟ میں خود — جس دن میں اپنے وجود کے نہ ہونے کی بات تسلیم کرلوں گا اُس دن مرنے کے لیے تیار رہوں گا اور میرے لیے یہی سب سے مشکل کام ہے۔ موت کا خوف ہی تو سب سے بڑا اژدھا ہے۔ اِنسان دُنیاوی خواہشات سے بلند ہوجائے اور موت کے خوف پر حاوی ہو جائے تو ایسی جنت میں پہنچ جائے گا۔ جیسی شکم مادر — کہ جس میں نہ کوئی خواہش تھی نہ خوف۔ لیکن موت کے خوف سے بلند ہونے سے پہلی زندگی پھر آپ کو اپنی طرف بلائے، ایک مرتبہ پھر بھیس بدل کر کسی کے رُوپ میں آئے اور آپ کو یقین دلائے کہ وہ یقیناً زندگی ہے، چھلاوا نہیں ہے تو انسان کیا کرے!!

رشی وشوامتر نے سالہا سال تاپ کیا تھا، لیکن ایک نرتکی مینکا کے فریب میں آ گئے تھے۔ وہ بے چارے کیا کرتے — زندگی کے سراب نہایت دل کش ہیں، جن میں ایک رفاقت کی چاندنی بھی ہے — تنہائی کی دُھوپ میں جھلسے ہوئے شخص کے لیے یہ ترغیب بہت بڑی ہے۔ آدمی واقعی کتنا کمزور ہے۔

زیب قادری نے چاچا جی کے اور زری کے ہزار منع کرنے کے باوجود بڑے بکس میں سے سفید چینی ریشم کا ایک سوٹ کا کپڑا زری کو نکلوا کر دیا تھا۔ گلگونہ اور زری وہ ٹکڑا لے کر چلی گئیں تو چاچا جی نے کہا، "تمھاری ایسی ہی حرکتوں کی وجہ سے تو تمھارے بارے میں طرح طرح کی کہانیاں مشہور ہوگئی ہیں۔"

"کوئی حرج نہیں ہے۔ جب انسان خود ہی کہانی بننے والا ہو تو ان باتوں کی کیا فکر کرتا پھرے۔"
زیب قادری نے کہا، "میں تمھیں یہ بتا دوں کہ مجھے ہمیشہ سے پہاڑ پر دفن ہونے کا بڑا ارمان تھا۔ اس

لیے کہ میں نے پہاڑ پر آج تک کوئی قبر ٹوٹی یا دھنسی ہوئی نہیں دیکھی۔ پہاڑی لوگ بہت خیال رکھتے ہیں قبروں کا، اور پھر ہر طرف گھاس، خودرو پھول، درختوں کا سایہ، چڑیاں اور ہنستے کھیلتے بچے۔ یہ لوگ کبھی تنہا نہیں رہتے۔''

''تم نے کوئی جگہ پسند کرلی ہے تو بتا دو، میں بھی اپنی ٹوپی یا رومال برابر میں رکھ دوں۔'' چاچا جی بولے۔

''کتنی جگہ ٹوپی یا رومال رکھ چکے ہو!'' زیب قادری ہنسیں۔ ''میں نے تو سنا ہے کہ تم نے لزی کے برابر میں اپنے لیے قبر کھدوا رکھی ہے۔''

''بالکل غلط—ہم جیسے لوگوں کے لیے جو کسی بات کی تردید یا تائید نہیں کرتے، ایسی ہی بے سر و پا داستانیں مشہور ہو جاتی ہیں۔''

''میں نے اپنے لیے کوئی خاص قبرستان پسند نہیں کیا ہے، مجھے حق ہی کیا ہے کسی کے قبرستان میں دفن ہونے کا۔ تم کہیں بھی کوئی اچھا سایہ دار کونا دیکھ کر دفن کروا دینا۔''

''پھر میں سفر کی تیاری کرنے چلوں؟ میں سوچتا ہوں ایک سے دو اچھے رہیں گے۔ تم نے دیکھا ہوگا، منزل ایک ہو، اچھے لوگوں کا ساتھ ہو رہا ہو تو انسان اپنے سفر کی تاریخ گھٹا بڑھا بھی دیتا ہے۔''

''تمھاری ایسی ہی باتوں پر وہ انگریز لڑکی تم پر عاشق ہو گئی ہوگی۔ مگر جب تم اس کے ساتھ ہی نہ گئے تو اب ٹھہرو، لوگوں کو تمھاری ضرورت ہے۔''

''کمال کرتی ہو، میری کیا ضرورت ہے۔ تمھارے تو اپنے بچے ہیں۔'' عمر خان بولے۔

''ہاں ہیں۔'' زیب قادری نے کہا، ''مگر وہ مجھ سے ہر لحاظ سے دُور ہیں اور میں چاہتی ہوں کہ وہ یہاں نہ آئیں۔''

''کیوں؟''

''یہ ایک طویل اور کرب ناک کہانی ہے، شاید میں کسی دن تمھیں سنا سکوں۔''

ڈاکٹر یوسف اُدھر سے گزرے تو لمحے بھر کو اُن کے پاس آئے۔

''ہمارے مہمان کو خوب کمپنی دے رہے ہیں، چاچا جی آپ۔''

''اور اس عمر میں انسان کسی کو کیا دے سکتا ہے، اپنی عمر بھی نہیں دے سکتا کہ وہ پہلے ہی تہِ جام پہنچ چکی ہے۔''

ڈاکٹر یوسف نے فرمائشی قہقہہ لگایا۔ ''آپ کی باتوں سے یقیناً ان کا دل بہلتا ہوگا۔''

وہ اُٹھ کر ڈاکٹر یوسف کے پاس گئے اور دھیرے سے کہا، ''میں تم سے تنہائی میں چند منٹ بات

کرنا چاہتا ہوں، اگر تمھیں فرصت ہو۔''

''ہاں ضرور۔ آیئے لان میں بیٹھتے ہیں۔''

وہ اور ڈاکٹر یوسف لان میں جا بیٹھے۔ ماحول پر بھرپور سکون طاری تھا۔ لانبے سبز درختوں سے ہلکی ہلکی بے آواز رُوئی اُڑتی ہوئی اُن کے سروں پر سے گزرتی آس پاس گر رہی تھی۔

''میں مسز قادری کی اصل کیفیت جاننا چاہتا ہوں۔'' انھوں نے کہا۔

ڈاکٹر یوسف نے چند لمحے توقف کیا۔ ''ان میں اب کچھ بھی نہیں رہا۔ وہ کسی دن، کسی بھی وقت ختم ہو سکتی ہیں۔''

''کیا ایسے وقت اُن کو اسپتال میں رکھنا زیادہ مناسب نہ تھا؟''

''جو سہولتیں وہاں ہوتیں، وہ سب انھیں یہاں میسر ہیں اور آ سکتی ہیں۔ اُن کی اپنی خواہش یہی ہے کہ انھیں اسپتال میں داخل نہ کروایا جائے اور نہ اُن کی زندگی کو مصنوعی طریقے سے بڑھایا جائے۔''

''کیا ان کی زندگی کی کوئی اُمید نہیں ہے؟''

''بظاہر تو نہیں۔ اس مرض میں یہی ہوتا ہے، آدمی چھلکا سا رہ جاتا ہے اور کسی وقت بھی ہَوا کے جھونکے کی طرح اُڑ جاتا ہے۔''

ڈاکٹر یوسف کے جانے کے بعد بھی وہ بہت دیر تک لان میں بیٹھے رہے۔ پھر دھیرے دھیرے قدم اٹھاتے گھر جانے کے بجائے قبرستان کی طرف چلے گئے۔ گاؤں کے بعد یہ ان کا خاندانی قبرستان تھا جو آہستہ آہستہ آباد ہوتا جا رہا تھا۔ زیب قادری ٹھیک کہہ رہی تھی۔ پہاڑ کے قبرستانوں میں اتنی وحشت نہیں ہوتی۔ پھر انھیں ایک عجیب سا خیال آیا۔ کیا خاندان والے زیب قادری کو اس قبرستان میں جگہ دے سکیں گے؟ بہت مشکل ہے۔ کیسی عجیب صورتِ حال ہے۔ ایک عورت اپنی ساری پونجی ایک غیر شخص کو تھما کر کہتی ہے، تم میرے بچوں کے امانت دار ہو، تم اُن کی آئندہ زندگی کے ذمہ دار ہو — اور وہ شخص جو اس عورت کو باقی زندگی دل میں دفن رکھنے کو تیار ہے، اُسے اپنے خاندانی قبرستان میں جگہ نہیں دلوا سکتا۔ زندگی واقعی مضحکہ خیز حد تک المیہ ہے!!

وہ اکبر منزل جانے کے لیے اُٹھے لیکن اُن کے قدم پھر یوسف منزل کی طرف بڑھ گئے۔ انھوں نے زیب قادری کے کان میں سرگوشی کی:

''زیب! — صرف ایک صورت میری سمجھ میں آتی ہے، وہ ہے ہماری شادی۔''

زیب قادری نے اُن کی طرف دیکھا، ''کیا تم اس بات کے لیے تیار ہو کہ میرے مرنے سے پہلے مجھ سے شادی کر لو۔ اگر ایسا ہے تو سمجھ لو میری طرف سے تم پر کوئی پابندی نہیں ہوگی، نہ میرے

بچّوں کا تمھاری جائداد پر کوئی حق ہوگا۔ صرف دُنیا کی نظروں میں تم اُن کے واحد جائز سرپرست بن جاؤ گے۔" وہ اُداسی سے مُسکرائیں۔ "جہاں اتنی کہانیاں مشہور ہیں ایک اور سہی۔"

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے، بلکہ میں بہت خوش ہوں گا۔ میرے گھر میں تمھاری بہت اچھی طرح دیکھ بھال ہوسکے گی اور تم ضرور اچھی ہو جاؤ گی۔ میرا ایمان ہے کہ آدمی قوتِ ارادی کے بل پر موت کو شکست دے سکتا ہے۔"

"دیکھو، ایک بات صاف کر دوں کہ میں یہاں سے کہیں جاؤں گی نہیں۔ ہمارے تمھارے رہنے کے انتظام میں بلکہ کسی انتظام میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ دو چار دن کے لیے اتنا بکھیڑا ـــــ اور تمھیں تو معلوم ہے کہ میں سنکی عورت ہوں۔ اگر مجھے اپنے بستر اور اپنی چیزوں کے بغیر زندگی اتنی دشوار نہ لگتی تو یہ سارا تام جھام لے کر کیوں پھرتی!"

"اچھا، میں ابھی جا کر اکبر خان سے بات کرتا ہوں۔"

وہ یوں اُڑتے ہوئے چلے تھے جیسے کوئی اٹھارہ سالہ لڑکا، دوست کو اپنی محبت کی کامیابی کی خبر سنانے جا رہا ہو۔

شام سے ہی بادل چھا رہے تھے۔ چوطرفہ بجلی چمک رہی تھی۔ رات ہوئی تو مشرق سے اور کالے کالے بادل اُٹھے۔ یکایک تیز آندھی چلی اور موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں۔ آندھی کا شور اور بجلی کی کڑک پہاڑوں میں گونج کر کئی گنا شدید ہوگئی تھی۔ سالم درخت اور درختوں کی شاخیں ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھیں۔ اُن کے وزن سے بجلی کے تار ٹوٹ رہے تھے۔ جگہ جگہ سے بجلی کے تاروں کے شارٹ ہونے کی آوازیں یوں آرہی تھیں جیسے توپیں داغی جارہی ہوں۔ سارے گھر میں ایک لالٹین ناکافی تھی۔ موم بتیاں ہوا کی زد میں کانپ رہی تھیں۔ کھڑکی سے باہر سارا شہر ایک گھنا بَن لگتا تھا جس میں بڑے بڑے درختوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ سارے شہر میں بجلی غائب ہوچکی تھی۔ بجلی کے تاروں سے جھڑتے شرارے فضا کو تاب ناک بنانے کے بجائے خوف ناک بنا رہے تھے۔

وہ برساتی پہنے، ٹارچ لیے باہر جانے کو تیار کھڑے تھے کہ انھوں نے گل جان کو کہتے سُنا، ''کوئی طوفان سا طوفان ہے، اگر سر پر کوئی درخت ہی گر پڑے تو۔''

''کچھ نہیں ہوتا خدا کی بندی، دو قدم پر گھر ہے۔'' اکبر خان کی آواز سنائی دی تھی۔

''اسی کو کہتے ہیں مت ماری جانا۔'' گل جان بے حد غصّے میں تھی۔

''اکبر خان دروازہ اندر سے بند کرلینا۔'' انھوں نے پکار کر کہا تھا۔

''آپ بےفکر رہیے لالہ، ہم بند کرلیں گے۔'' اکبر خان نے کہا تھا۔

اسی وقت بجلی زور سے چمکی اور بانات کی طرح اُن کے سامنے زینے پر بچھتی چلی گئی۔ اس کے

ساتھ کڑک کی آواز پر وہ اُترتے چلے گئے۔

ڈاکٹر یوسف اور اُس کی بیوی ڈاکٹر ثریّا، دونوں زیب قادری کے کمرے میں موجود تھے۔ یوسف ان کا ہاتھ پکڑ کر دُوسرے کمرے میں لے گیا اور کہا، ''آج کی رات بھاری ہے۔ کسی وقت بھی کچھ ہوسکتا ہے۔''

''کیا طبیعت بہت خراب ہے؟'' عمر خان نے پوچھا۔

''کبھی کبھی نبض بہت ہی سُست ہوجاتی ہے مگر ہم برابر دیکھ رہے ہیں اور دوا دے رہے ہیں۔ فیصلہ یہ ہوا ہے کہ میں، ثریّا اور آپ باری باری جاگیں گے۔ آپ اس دیوان پر لیٹ جایئے۔ پہلے میں جاگوں گا، پھر ثریّا۔ اگر رات خیریت سے گزر گئی تو پچھلے پہر ہم آپ کو اُن کی تیمارداری کے لیے جگادیں گے ورنہ——''

''ہاں ہاں ٹھیک ہے۔'' اُنھوں نے کسی قسم کا احتجاج نہ کیا۔ چادر اوڑھ کر چپ چاپ دیوان پر دراز ہوگئے۔ کمرے میں ایک لیمپ جل رہا تھا۔ جس کی لو نیچی تھی۔ یہ ناکافی روشنی کمرے کی دیواروں پر مختلف شکلوں کے سائے ڈال کر فضا کو باہر کی مہیب فضا سے ہم آہنگ کرنے کی کوشش کررہی تھی۔ بادلوں کی گرج پہاڑوں میں بم کے گولوں کی آواز بن کر گونج رہی تھی اور بجلی کی چمک سے جیسے بموں سے لگنے والی آگ کے شعلے بلند ہورہے ہوں۔ جب طوفان کا زور کم ہوا تب بھی چھت پر بوندوں کی جھنکار برقرار رہی جو رات بھر کبھی تیز اور کبھی مدھم ہوتی رہی۔ کبھی اُڑتے پتّوں کی سسکاریاں سنائی دیتیں۔ کبھی بند دروازوں اور آتش دانوں میں گزرتی ہوا کی نوحہ خوانیاں۔ ان سب صداؤں کی لہروں پر وہ کبھی غنودگی میں بہہ جاتے اور کبھی چونک کر جاگ جاتے۔ کمرے میں خاموشی پاکر، یوسف یا ثریا کو کرسی پر بیٹھا دیکھ کر وہ خدا کا شکر ادا کرتے اور یوں ظاہر کرتے جیسے سچ مچ سو رہے ہوں۔

جس وقت ڈاکٹر یوسف نے انھیں آواز دی، وہ پہلے سے جاگ رہے تھے۔ کسی چوکس سپاہی کی طرح فوراً اُٹھ کر بیٹھ گئے۔ زیب قادری کے پُرسکون چہرے کو دیکھا، پھر کھڑکی سے باہر دیکھنے لگے۔ آج چاند کی چودھویں تھی مگر بادلوں نے چاند کو تہ در تہ یوں چھپالیا تھا کہ کہیں سے چاندنی کی رمق بھی باہر نہ آسکے۔ ڈاکٹر یوسف انھیں ہدایت دے کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ وہ کرسی کھینچ کر زیب قادری کے پاس بیٹھ گئے۔ ذرا دیر بعد وہ دھیرے سے مسکرائیں اور بولیں، ''کیسا خوب صورت خواب تھا!— میں نے دیکھا کہ جیسے کوئی تقریب ہے، بہت سے مرد اور عورتیں لان میں ایک بڑے سے دائرے میں بیٹھے ہیں۔ یکایک بجلی چلی گئی۔ گھپ اندھیرا چھا گیا۔ ایسا اندھیرا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دیتا تھا۔ کچھ لوگ اُٹھ کر اِدھر اُدھر ٹہلنے لگے۔ اتنے میں کوئی آیا۔ میرے بہت نزدیک آکر

کان میں سَر گوشی کی، ''کیا یہ تم ہو؟'' وہ چہرہ اتنا قریب تھا کہ میرا دل کانپ سا گیا۔ مجھے یقین تھا کہ میری صورت اُسے نظر نہیں آ رہی۔ میں نے تو اُسے آواز سے پہچان لیا تھا مگر نہیں معلوم وہ یہ سوال کس سے کر رہا تھا، مجھے کون سمجھ رہا تھا۔ مجھے اس خیال میں رہنا بڑا اچھا لگا کہ شاید وہ مجھے ہی ڈھونڈ رہا ہے اور مجھے اُس وقت خود کو اندھیرے میں رکھنے میں بڑا مزہ آیا۔ جب میری آنکھ کھلی تو میرے دل میں میٹھا میٹھا درد تھا۔ اس خواب کے سوچتے رہنے میں بھی ایسا مزہ ہے جیسے یہ واقعہ سچ مچ پیش آیا ہو۔''

زیب قادری نے آنکھیں کھول کر دیکھا اور حیران ہو کر کہا، ''تم کب آئے؟''

''میں تو خاصی دیر سے بیٹھا ہوں۔''

''اچھا، مجھے پتا ہی نہیں چلا، میں ایک خواب دیکھ رہی تھی۔''

''ہاں تم نے مجھے سنایا ہے۔''

زیب قادری کی آنکھوں میں حیرت ابھری۔

''تمھیں! نہیں، یہ تو میں نے ابھی ابھی دیکھا ہے۔''

''جیسے کوئی تقریب ہے۔ بہت سے لوگ بیٹھے ہیں۔ یکا یک بجلی فیل ہو گئی—'' چاچا جی نے کہا۔

''ہیں!— کیا واقعی میں نے یہ خواب تمھیں سُنایا تھا؟'' وہ ابھی تک حیران تھیں۔

''ممکن ہے ہم تم یہ خواب ساتھ ساتھ دیکھ رہے ہوں۔''

''کیا پورا خواب سنایا تھا میں نے؟''

''سوائے اس کے کہ اندھیرے میں تم سے جھک کر یہ بات پوچھنے والا، میں تھا۔''

''اچھا— وہ جو کوئی بھی تھا مگر مجھے یہ پتا نہیں کہ وہ کس کو پوچھ رہا تھا۔''

''مجھے معلوم ہے اور تمھارے دل کو بھی معلوم ہے کہ وہ تم ہی کو پوچھ رہا تھا۔ میں تمھاری جگہ ہوتا تو کہتا— ہاں یہ میں ہوں۔''

''اگر آواز پہچاننے کے بعد وہ 'سوری' کہہ کر چلا جاتا تو کتنی سبکی ہوتی، کتنی تذلیل ہوتی۔ اب یہ سوچتے رہنے میں کتنا مزہ ہے کہ ہم نے اُس کا چہرہ دیکھ لیا مگر اپنا چہرہ نہ دکھایا۔ اُس کی آواز پہچان لی مگر اپنی آواز اُسے نہ سنائی تا کہ وہ شک میں رہے کہ شاید اُس کا محبوب ہی تھا یا شاید وہ نہ تھا۔''

''محبت کرو اور خود کو چھپاؤ— یہ بات میری سمجھ میں نہیں آتی۔'' عمر خان نے کہا۔

''کیا میں سوتے میں اور بھی باتیں کرتی رہی تھی؟'' زیب قادری نے پوچھا۔

''نہیں۔''

''صبح ہو گئی؟''

''ہاں، خدا کا شکر ہے۔'' اُنھوں نے ٹھنڈا سانس لیا تھا۔ شاید زیب قادری کو پتا نہ چلا کہ ایک ٹھنڈی سانس میں ہزار نہیں لاکھوں شکرانے تھے۔

''آج چاند کی چودھویں رات تھی، سو طوفان کی نذر ہو گئی۔ میں چاہتی تھی کہ آخری بار چاند کی چودھویں کا لطف اُٹھا لیتی۔''

''ہاں چودھویں کا چاند بڑا خوب صورت ہوتا ہے، لیکن کبھی تم نے منھ اندھیرے پندرھویں کا چاند دیکھا ہے؟ میں اُس کے حسن اور سحر کو بیان نہیں کرسکتا۔ ایک مرتبہ میں طلوعِ آفتاب کا منظر دیکھنے نکلا۔ سورج پہاڑوں کے پیچھے طلوع ہو رہا تھا لیکن ابھی سامنے نہیں آیا تھا۔ مغرب میں عین اُس مطلعے کے مقابل پورا چاند تھا۔ اس قدر چمک دار اور حسین کہ الفاظ اسے ادا نہیں کرسکتے۔ اُس میں چمک نہیں نور تھا۔ ٹھنڈک اور حُزن اور سکون اور خوب صورتی، لیکن یہ سارے الفاظ اُس کا نقشہ نہیں کھینچ سکتے نہ ہی رنگ — کیوں کہ وہ رنگ ابھی تک ملایا نہیں جاسکا جس میں بیک وقت یہ سب باتیں ہوں۔ میں اس ڈوبتے چاند کے سحر میں ایسا کھویا کہ پھر پلٹ کر سورج کو نہیں دیکھا۔ چاند چنار کے درخت سے آہستہ آہستہ نیچے اُترا اور پھر ایک چیڑ کے درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ جب تک میری نظروں کے سامنے رہا اُس کا چہرہ ماند نہیں پڑا تھا۔ اس میں ہزیمت نہیں آئی تھی اور اُس ڈوبتے چاند سے حسین تر منظر میں نے آج تک نہیں دیکھا۔''

''تم مجھے بے وقوف بنا رہے ہو، ڈوبتا چاند کبھی اتنا خوب صورت نہیں ہوسکتا۔''

''تم اپنی آنکھ سے دیکھ لینا۔ کل کے طوفان کے بعد آج رات مطلع ضرور صاف ہوگا۔''

''اچھا، تم کہتے ہو تو ضرور دیکھوں گی۔ ذرا مجھے تکیے سے ٹیک لگا کر بٹھا دو۔ دیکھو کیسی خوب صورت صبح ہے۔ وادی میں دُھند بھری ہوئی ہے۔ چڑیاں چہک رہی ہیں، مگر گرے ہوئے درخت اور ٹوٹی ہوئی شاخیں بتا رہی ہیں کہ رات زبردست طوفان آیا تھا۔''

''ہاں کل یوسف کے مالی نے جس لان کو اتنی محنت سے صاف کیا تھا، آج لگ رہا ہے کہ مہینوں سے اُس کی صفائی نہیں ہوئی۔''

''اچھا یہ بتاؤ کیا رات بھر تم یہیں رہے، میری طبیعت بہت خراب تھی؟''

''میں طوفان میں تمھارے نزدیک رہنا چاہتا تھا۔''

''خدا کا شکر ہے کہ یہ آخری طوفان تھا جو گزر گیا۔ بس اب کچھ نہیں ہے، تم جا کر آج دن بھر سوؤ۔ رات کو ہم جاگیں گے اور ڈوبتے چاند کا منظر دیکھ کر سوئیں گے۔''

''زیب! کیسی باتیں کرتی ہو تم! — لگتا ہے تم خود پندرہ سال کی ہو۔''

''کسی کے سامنے آدمی کو بڑا بننا اچھا لگتا ہے، کسی کے سامنے بچہ بننے کو جی چاہتا ہے— کبھی کبھی مجھے واقعی یوں لگتا ہے جیسے میں سچ مچ پندرہ سال کی ہوں۔'' وہ ہنسیں۔

''مگر کہانیاں تو تم خاصی خوف ناک لکھتی ہو۔''

''دوسروں کو دھوکا دینے کے لیے جس طرح بچے ماسک پہن کر بڑوں کو ڈراتے ہیں۔''

''اچھا، بہت باتیں کرلیں، اب تم آنکھیں بند کر کے آرام کرو یا سو جاؤ۔''

''پہلے تم یہاں سے جاؤ۔''

''میں اُس وقت جاؤں گا جب یوسف تمھیں ایک نظر دیکھ لے گا۔''

''ابھی بہت سویرا ہے، اُن میں سے کوئی اُٹھ کر نہیں آئے گا۔''

''تو میں یہاں بیٹھا ہوں۔''

''اچھا سنو عمر خان، ابھی تمھیں بہت کام کرنے ہیں۔ بہت دن زندہ رہنا ہے، اور میرے بچوں کو کسی قابل بنانا ہے۔''

''اور تم؟''

''میں!— اپنے کام تمھارے سپرد کر کے جا رہی ہوں، اور مجھے بہت اطمینان ہے۔''

''مگر کیوں زیب! ہم اور تم ایک طویل خوش گوار زندگی گزار سکتے ہیں ساتھ ساتھ۔ تم جانے کی بات کیوں کرتی ہو؟''

''شاید ہم جیسے لوگ ڈوبنے کے لیے، کشتی کی دید ہی کے منتظر ہوتے ہیں۔ یہ دیکھ کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ خود تو ڈوب رہے ہیں لیکن دوسرے مسافروں کو یقیناً بچا لیا جائے گا۔''

''اچھا، اب تم سو جاؤ، میں یہاں کھڑکی کے پاس بیٹھوں گا۔''

''نہیں، آج میں تمھیں اپنی کہانی سناؤں گی، یہاں کرسی پر آ کر بیٹھو۔''

''تم تھک جاؤ گی، میں اس وقت کوئی کہانی نہیں سنوں گا۔''

''نہ سنو— میں اپنے آپ ہی کو سناؤں گی۔ جب انسان اپنے اعمال کے سوا کچھ ساتھ نہیں لے جا سکتا تو وہ دُکھ بھری گھٹیا یادوں کی گٹھریوں کو یہاں کیوں نہ پھینک کر جائے۔''

''اچھا پھر کبھی۔''

زیب قادری نے آنکھیں بند کرلیں مگر آہستہ آہستہ بولتی رہیں۔ ''اتنا میں کہہ سکتی ہوں کہ میری داستان شادی جیسے مقدس رشتے کی سب سے الم ناک داستان ہے۔ میرا شوہر عجیب و غریب کومپلیکس کا شکار تھا کہ کوئی عورت اس سے محبت نہیں کر سکتی، یا کم از کم پہلی محبت نہیں کر سکتی۔ ہماری

رفاقت کی کہانی اتنی کڑوی ہے کہ اُسے سناتے ہوئے میری رگوں میں زہر سا پھیلنے لگتا ہے اور میں اس زہر کو کتنے دن، کتنے سال سینے سے لگائے جیتی رہی ہوں۔ اس داستان کی سب سے اَلم ناک کڑی یہ ہے کہ میری اس خاموشی، اس برداشت نے اس کے شک کو گہرا کر دیا۔ وہ میری خوشامد کرنے لگا کہ ایک دفعہ میں مان لوں کہ مجھے کسی اور سے محبت رہی ہے اور اس نے مجھے حاصل کیا ہے، تو مجھے ساری عمر کے لیے معاف کر دے گا — وہ مہینوں نہیں سالوں مجھے پریشان کرتا رہا اور اُس گناہ پر جو میں نے نہیں کیا تھا، فراخ دلی سے مجھے معاف کر دینے کی خوش خبری سناتا رہا۔

اندر ہی اندر جل کر میں اُس درخت کی طرح ہوگئی جس پر بجلی گر پڑی ہو۔ باہر سے جس کا تنا سلامت ہو لیکن اندر سے جل کر بالکل کھوکھلا ہو چکا ہو مگر اُسے اس بات کا اندازہ بھی نہ ہوا۔ اُسے اپنی ہی آگ نے اندھا کر رکھا تھا، وہ اور کیا دیکھتا۔ مہینوں برسوں بعد بھی اگر کبھی وہ مجھے خوش دیکھ لیتا یا کسی کے ساتھ ماضی کی باتیں کرتے ہوئے سن لیتا تو اُس کے دل کی آگ بھڑک اُٹھتی۔ وہ سوچتا۔ ہو نہ ہو، یہی شخص ہے جس کے ساتھ میرا کوئی نہ کوئی ناتا رہا ہے۔ اس کے بعد وہ مجھے جلانا، رُلانا اور افسردہ کرنا اپنا فرض جانتا۔ ایک وقت آیا جب میں اُس کے سامنے خوش ہونے اور جھوٹی ہنسی ہنسنے سے بھی ڈرنے لگی کیوں کہ مجھے مسرت کے ایک ایک لمحے کی قیمت چکانی پڑتی تھی۔ کبھی دوسروں کے سامنے اپنی توہین سے، کبھی جسمانی تکلیف سے اور کبھی ذہنی کرب سے۔ جسمانی چوٹ اگر دس دن بھی رہتی تو ذہنی کرب سے کم تکلیف دہ ہوتی، کیوں کہ وہ نظر آتی تھی۔ کبھی کبھی وہ خِفت محسوس کرتا تھا اور مداوا کرنے کی کوشش کرتا تھا۔

ہمارے دونوں بچے بڑے ہونے لگے۔ ہم ایک دُوسرے کے نزدیک آنے کے بجائے دُور ہوتے چلے گئے۔ کیوں کہ اس فاصلے کے بیچ بارودی سرنگیں تھیں، اُن کو پار کر کے قریب آنا میرے لیے ناممکن تھا۔ میں ہنس کر، رو کر، قسمیں کھا کر، حلف اُٹھا کر اُسے یقین دلا چکی تھی۔ وہ کچھ دن کے لیے خاموش ہو جاتا تھا اور پھر ایک دن اُس پر جیسے دورہ سا پڑتا تھا۔ آخر ایک دن میں نے اپنی بچپن کی ایک سہیلی کو رازدار بنایا۔ وہ غیر شادی شدہ اور ناتجربہ کار تھی۔ اُس نے مجھ سے کہا، "تمھیں تو کہانیاں کہنی آتی ہیں کوئی کہانی گھڑ کر سنا دو۔"

آخر ایک دن جب بات میری برداشت سے باہر ہونے لگی تو میں نے اُس جرم کا اقرار کر لیا جو میں نے نہیں کیا تھا۔ تشدد حد سے بڑھ جائے تو بے گناہ لوگ بھی جرم کا اقبال کر لیتے ہیں۔ مجھے ایک کہانی گھڑ کر سنانی پڑی اُس گناہ کی، جو کرنا تو ایک طرف میں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا، اس اُمید میں کہ اب ہمیشہ ہمیشہ کے لیے مجھے اس اذیت سے نجات مل جائے گی — اور اُس بھلے مانس نے جس

نے مجھے یقین دلایا تھا کہ اعترافِ جرم کے بعد میں اُس کی نظروں میں مریم کی طرح مقدس ہو جاؤں گی، معلوم ہے کیا کیا؟

اُس نے دُوسرے دن اپنی، میری اور بچّوں کی تصویریں اخبار میں چھپوا دیں اور اعلان کر دیا کہ میں اپنی بیوی اور بچّوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ رہا ہوں۔ آج سے یہ میری بیوی نہیں ہے اور بچے تو کبھی بھی میرے بچّے نہ تھے۔ اس کے بعد وہ خود خدا جانے کہاں روپوش ہو گیا۔

کوئی میرے اور بچّوں کے صدمے اور شرم کا اندازہ نہیں لگا سکتا۔ ہم کسی کو منھ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ میں نے انھیں کم عمری میں ہی دُور دراز کے ہاسٹل میں ڈال دیا۔ خود وطن کو خیر باد کہہ دیا اور بہت عرصے باہر رہی۔ اس کہانی کا خوش گوار پہلو صرف یہ ہے کہ میرے والدین، رشتے داروں اور دوستوں نے کبھی مجھ پر لمحے بھر کے لیے بھی شک نہیں کیا بلکہ یہی کہا کہ وہ شخص نارمل نہیں تھا۔ تمھیں بہت پہلے اُسے چھوڑ کر واپس گھر چلا آنا چاہیے تھا۔ حالاں کہ ابتدا میں یہی سبق دیا گیا تھا کہ اب یہ تمھارا شوہر، مجازی خدا اور اَن داتا ہے۔ جس طرح رکھے، رہو۔ خبردار ایک لفظ اُس کے خلاف منھ سے نہ نکالنا۔''

زیب قادری خاموش ہو گئیں۔ اُن کی آنکھوں سے آنسو نکل کر دائیں بائیں بہتے اُن کی گردن پر گر رہے تھے۔

''زیب! اگر تمھیں یہ داستان سنا کر تسکین ہوئی ہے تو میں خوش ہوں کہ یہ سب میں نے سنا۔'' اُنھوں نے رومال سے اُن کے آنسو خشک کرتے ہوئے کہا، ''اس وقت اگر تم میرا دل چیر کر دیکھو تو شاید اتنے ہی داغ ہوں گے جتنے تمھارے دل پر۔''

''اللہ کا احسان ہے کہ آخری وقت میں اُس نے ایک آدمی بھیج دیا جس کے سامنے میں بغیر شرمندہ ہوئے اپنے دل کے داغ کھول سکی۔ میں اپنے شوہر سے کہا کرتی تھی کہ تم نے مجھ پر الزام لگا کر کم از کم ایک محبت کرنے کا حق تو مجھے دے دیا ہے۔ اس پر وہ کہتا تھا، ایسی باتیں کر کے تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتیں۔ تم جیسی عورتیں جتنی چاہیں، محبتیں کر سکتی ہیں، اُن کو کسی حق یا اجازت کی ضرورت نہیں۔''

''اُس کی اپنی زندگی میں کوئی بھیانک حادثہ ہوا ہوگا — یا وہ تمھارے مقابلے میں شدید احساسِ کم تری کا شکار ہوگا۔ مجھے یقین ہے کہ اُس کی باقی زندگی کسی دماغی اسپتال میں گزری ہوگی۔''

''مجھے نہیں معلوم — مگر ایک بات اُس کی نیکی کی بتاؤں کہ یہ سب کرنے کے باوجود یا شاید اپنی زیادتی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے اُس نے مجھے اور بچّوں کو جائداد سے محروم نہیں کیا۔ اخبار کی خبر سے اُس نے کوئی قانونی فائدہ نہیں اُٹھایا۔ اُس کی موت کے بعد ساری جائداد مجھے مل گئی۔''

''اِس لیے کہ اخبار کی خبر سے اُس کا مقصد صرف تمھیں ذہنی صدمہ پہنچانا تھا، جو اُس نے پہنچا دیا۔''

''میں لکھنے پڑھنے کے بہانے ساری دُنیا میں ماری ماری پھرتی رہی تا کہ لوگ مجھے اور میری بپتا کو بھول جائیں۔ میرے خیر خواہ جو یہ ساری کہانی جانتے ہیں، کسی کو کچھ نہیں بتاتے۔ اکثر لوگ مجھے ایک پاگل امیر بیوہ سمجھتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے مجھ سے ہم دردی کے بہانے ازلی اور اَبدی پیمانِ وفا باندھنے کی کوشش بھی کی تھی لیکن میں نے اپنے اُوپر بقول تمھارے جانے کیسے کیسے خول چڑھا لیے کہ لوگ مجھ سے دُور ہی رہیں۔''

''اچھا اب ماضی کی ریل لپیٹو اور تھوڑی دیر سو جاؤ۔''

''جو تم کہو۔'' زیب قادری نے نقاہت سے آنکھیں موند لیں۔

عمر خان نے ہلکے سے زیب قادری کے گال پر اپنا ہاتھ رکھا۔ پھر آہستہ سے اُن کے رُوئی کے پھوئے ایسے ہاتھ کو اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا اور واپس اُسی جگہ رکھ دیا جہاں سے اُٹھایا تھا۔ جیسے کوئی بے حد بیش قیمت نازک سی چیز ہو جس کے ٹوٹ جانے کا خطرہ ہو۔ زیب قادری کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ انھوں نے کان لگا کر سنا۔ وہ آہستہ آہستہ گنگنا رہی تھیں — میں نے جب لکھنا سیکھا تھا — پہلے تیرا نام لکھا تھا۔

باہر چڑیاں چہچہا رہی تھیں، بے شمار چڑیاں — آرکسٹرا سا بج رہا تھا — باریک آوازیں، سیٹیاں، مرکیاں — الاپ — دھرپد — خیال کچھ گانے والیوں کے نام انھیں معلوم تھے جیسی بلبل ہزار داستان، مینا، شیاما، گل گچیاں اور کچھ کے نام انھیں معلوم نہیں تھے — پہاڑوں پر آم نہیں مگر انھیں لگا جیسے آج کی آوازوں میں کوئل کی کیوں؟ کیوں؟ کیوں؟ — کیوں ہوں؟ — کیوں ہوں بھی شامل ہو۔ جیسے اپنے ہونے کا جواز ڈھونڈ رہی ہو یا زری جیسی ہٹیلی لڑکی کی طرح سوال پر سوال کیے جاتی ہو اور کسی جواب سے مطمئن نہ ہوتی ہو۔

شاید آج کے آرکسٹرا میں اس کا ہونا بھی ضروری تھا۔ شاید وہ مہمان فن کار تھی جو صرف آج کے لیے باہر سے بلوائی گئی تھی یا محض اُن کے ذہن کی آواز تھی۔

زیب قادری کے ہونٹ آہستہ آہستہ ہلتے رہے۔ پھر اُن میں جنبش بند ہو گئی۔ لمحے بھر کو آنکھیں کھلیں پھر مند گئیں۔ چہرے پر سکون چھا گیا۔ عمر خان نے دوڑ کر ڈاکٹر یوسف کو اٹھایا۔ ڈاکٹر یوسف نے اُٹھ کر نبض دیکھی اور انکار میں سر ہلایا۔ عمر خان نے دیکھا زیب قادری کے چہرے پر وہی ملکوتی حسن تھا جو پندرھویں شب کے ڈوبتے چاند میں تھا۔

زری جب چاچا جی کے کمرے میں داخل ہوئی تو وہ سامنے لٹکے ہوئے اُس قالین کو تک رہے تھے جس پر سیاہ اُون سے بڑا سا ابوالہول بنا ہوا تھا۔ پس منظر میں اہرام، اُونٹ اور سوار تھے۔ ابوالہول کے مقابل اُونٹ اور سوار دونوں کی بلندی نہایت نا قابلِ التفات تھی جیسے دیو کے سامنے کوئی کیڑا — ابوالہول کی تاریخ کم لوگ جانتے ہیں مگر اس کی ہیبت سب کے دلوں میں ہے۔ یکایک چاچا جی کے کمرے میں اس قالین کی معنویت زری کی سمجھ میں آ گئی۔ عمر چاچا اپنے خاندان کے ریگستان میں اس ابوالہول کی مانند ہی تو تھے۔ سب اُن سے خوف زدہ رہتے تھے، صرف زری تھی جو اُن سے ذرا بھی نہیں ڈرتی تھی۔ اُسے خوب معلوم تھا کہ اس ابوالہول میں بھی دُوسرے مقبروں کی طرح منجمد تنہائی، پیار اور یادوں کے دفینے ہیں اور کچھ نہیں ہے۔

چاچا جی نے زری کو دیکھا اور پیار سے اپنے پاس بٹھا لیا۔

''کوئی ایک ماہ سے سوچ رہا تھا، تجھے خط لکھوں، یہاں بلواؤں یا خود کراچی جاؤں کہ تیرا یہاں آنے کا خط آ گیا۔''

''آپ اور کراچی! — سچ چاچا جی آپ آ جاتے تو مزہ ہی آ جاتا۔''

''بات سنان کے بارے میں ہے بیٹا۔'' چاچا جی کا لہجہ سوکھی لکڑی کی طرح خشک تھا۔

''سنان!'' زری کے دل میں ایک ٹھنڈی لہر دوڑتی چلی گئی۔ وہ بھی یکایک سنجیدہ ہو گئی۔

''جی چاچا جی۔'' اُس نے کہا۔

''وہ بہت بیمار ہے، ڈاکٹر کہتے ہیں اسے لاہور یا کراچی لے جائیں۔ یہاں اس کا علاج نہیں ہو سکتا۔ میں نے احسن کو خط لکھا تھا مگر اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔''

تھوڑی دیر خاموشی رہی۔ زری قالین کے ابوالہول کو تکتی رہی جیسے اس سے طاقت اور توانائی کی طالب ہو۔ چاچا جی سر جھکائے بیٹھے رہے جیسے اس سے آگے کہنے کو کچھ نہ ہو۔

''میں اُسے کراچی لے جاتی ہوں۔'' ایک دم زری نے نہایت عزم سے کہا۔

''تم!'' چاچا جی نے اُسے حیرت سے دیکھا۔ ''کیا کہو گی؟''

''یہی کہ میرا بیٹا ہے، میں نے اسے گود لے رکھا ہے۔''

''سوچ لو— تمھارے مستقبل کا سوال ہے۔ مجھے بھی دیکھ رہی ہو، یہ بوجھ کتنے دن اٹھا سکتا ہوں۔ سب سے بڑی بات تو یہ ہے کہ اس کا علاج یہاں ہو ہی نہیں سکتا۔ اسی لیے میں نے ہمت کر کے احسن کو خط لکھا تھا۔ ہو سکتا ہے اسے خط نہ ملا ہو۔''

''چاچا جی اتنے پریشان کبھی نظر نہ آئے تھے، جیسے ساری خطا ان ہی کی ہو۔ زری کو چاچا جی پر بے حد پیار آیا۔

''آپ میری فکر نہ کیجیے۔'' زری نے کہا، ''میرا مستقبل محفوظ ہے۔ جو لڑکیاں اپنے پیروں پر کھڑا ہونا جانتی ہیں ان کے مستقبل کو اتنا خطرہ نہیں ہوتا۔ شاید شیزی اور نیلی کو ہو۔''

''ہاں، بیٹی! مجھے معلوم ہے تو بہادر ہے۔ یہ بھی جانتا ہوں کہ یہ تیرے ساتھ سراسر زیادتی ہے لیکن کیا کروں— مجھے تیرے سوا کسی اور پر اعتبار بھی تو نہیں ہے۔''

''یہ اعتبار ہی تو مجھے اعتماد دیتا ہے چاچا جی— بزدل ہونا تو بہت آسان ہے اور لوگوں کی سمجھ میں بھی فوراً آ جاتا ہے۔ میری بات لوگوں کی سمجھ میں نہیں آئے گی لیکن ہمیں کیا پروا ہے۔ آپ یہ بتائیے وہ ہے کہاں؟ ہاسٹل میں یا اسپتال میں؟''

''اسپتال میں۔'' چاچا جی نے کہا، ''تم میری مجبوری سمجھ رہی ہو نا۔ میں نے اس کا ذمہ لیا تھا مگر اب بات میرے بس میں نہیں رہی۔ میں چاہتا تھا ایک مرتبہ احسن سے بات کر لیتا۔ شاید خط اُسے نہ ملا ہو، ہماری مُلک کی ڈاک کا انتظام— یا ممکن ہے ثروت کے ہاتھ لگ گیا ہو اور اس نے احسن کو نہ دکھایا ہو۔''

''اچھا یوں کیجیے، میرے محلے کا ایک لڑکا لاہور جانے والا ہے۔ میں آج ہی آپ کا خط اُسے سوات بھجوائے دیتی ہوں، وہ ہاتھ سے دے دے گا۔ بہت قابلِ اعتماد لڑکا ہے۔ اگر وہاں سے جواب نفی میں آئے تو آپ ذرا بھی نہ گھبرائیے گا۔ مانی جنت میرے پاس ہے، وہ اس کا خیال رکھے گی۔

آپ سمجھ لیجیے گا کہ جس کی امانت تھی اُسے لوٹا دی۔ امانتیں تو کبھی نہ کبھی لوٹائی ہی جاتی ہیں چاچا جی۔''

''تو کتنی باہمت ہے بیٹی! خدا جانے تجھے احساس بھی ہے کہ اس سے تیری زندگی میں کتنی مشکلات پیدا ہوں گی۔''

''بس چاچا جی! اب یہ موضوع ختم — بات طے ہو چکی۔ آپ سوئیے اور میں بھی جا کر سوتی ہوں۔ شب بخیر۔''

''زری نے چاچا جی کے ماتھے پر بوسہ دیا اور ابوالہول کے مجسّمے پر نگاہ ڈالتی ہوئی دروازہ بند کر کے باہر آ گئی۔

کسی اچانک اور فوری طور پر سمجھ میں نہ آنے والے شور سے نرگس کی آنکھ کھلی۔ گھبرا کر چاروں طرف دیکھا تو اندھیرا گھپ۔ آسمانی بجلی کی لہر روشن دان کے راستے اندر آئی۔ چاروں طرف یوں پھری جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہو اور اسی راہ سے لوٹ گئی۔ سڑک پر بجلی کے تاروں کے آپس میں ملنے اور جدا ہونے پر پٹاخے سے چھوٹ رہے تھے۔ اس آواز میں بادل کی کڑک مل کر دہشت ناک ہو گئی تھی۔ نرگس کانوں پر ہاتھ رکھ کر سہمی ہوئی بیٹھی رہی۔ پھر اس کی نگاہ زری پر پڑی جو مسہری کے تکیے سے ٹیک لگائے خاموش بیٹھی تھی۔

''زری! یہ سب کیا ہے؟ کیسی آوازیں آ رہی ہیں؟''

''کچھ نہیں، بارش اور بجلی، یہاں یوں ہی ہوا کرتا ہے — اور تم تو طوفانوں کے دیس کی رہنے والی ہو، سو جاؤ۔''

''نرگس اچھی بچّی کی طرح چپ چاپ دوبارہ لحاف میں دبک گئی اور اپنے کان خوب اچھی طرح لحاف میں چھپا لیے۔ زری پھر بھی جاگتی رہی۔ جس وقت وہ چاچا جی کے کمرے سے لوٹی ہے اُسے معلوم تھا کہ آج رات نیند مشکل سے آئے گی۔ بچپن میں بھی کبھی کبھی یوں ہی نیند اُڑ جاتی تھی۔ کمرے میں باہر کوئی چیز سنسناتی سنائی دیتی تھی جیسے کوئی دیو سانس لے رہا ہو۔ جھینگروں کی مانوس آوازیں رات کو عجیب عجیب صداؤں میں مل کر نیا رُوپ دھار لیتی تھیں۔ ہر لمحے خوف ہوتا تھا جیسے ابھی بند دروازہ پُراسرار طور پر کھلے گا اور کوئی سایہ اندر داخل ہوگا۔ آج یہ سب خوف نہیں تھے پھر بھی نیند بھاگے جا رہی تھی۔ زری کو اُس کے پیچھے دوڑنے کی بھی کوئی تمنا نہیں تھی۔ وہ بڑی طمانیت سے بیٹھی تھی۔ ذرا ذرا دیر بعد کھڑکی سے باہر جھانک کر دیکھ لیتی جہاں کوئی نہ کوئی جانا پہچانا منظر اُس کا منتظر ہوتا۔

آہستہ آہستہ بادلوں میں گھرا چاند اُوپر آ گیا۔ زمین پر چاندنی اور اندھیرے کی گوریلا جنگ جاری تھی۔ چاندنی درختوں کی آڑ لے کر چپکے چپکے نیچے اُتر رہی تھی۔ تاریکی غاروں میں اُس کی

تاک میں چھپی بیٹھی تھی۔

پھر چھم چھم بارش شروع ہوگئی۔ پتوں پر بوندوں کے گرنے کی مسلسل آواز کتنی جانی پہچانی تھی۔ کیسی مانوس خوشبوئیں اور آوازیں چاروں طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ اُس کے بچپن کی آوازیں۔ اب ساری گھاس بھیگ گئی ہوگی۔ چیڑ کے سنہری تنکے گیلے ہوکر ڈھلوانوں کو اور بھی پھسلواں کر دیں گے۔ سرخ چھتیں اور بھی سرخ ہو جائیں گی۔ بیدِ مجنوں کی لڑیوں سے پانی کی بوندیں موتیوں کی طرح ٹپکیں گی۔ بھیگی چڑیاں اپنی بوڑھی دادی اماؤں کی طرح پتوں میں چھپی صبح ہونے کا انتظار کر رہی ہوں گی۔

یکایک اولے پڑنے لگے۔ ٹین کی چھت پر باریک باریک اولوں کے گرنے کی آواز بچپن کی ایک اور صدا سے ملتی جلتی تھی جیسے کئی خادمائیں اناج کی ڈھیری کے سامنے پیر پسارے بیٹھی چھاج میں اناج پھٹک رہی ہوں۔ چھن — چھن — چھن۔

اور جب چھن چھن کی یہ آواز تھمی تو زری نے اپنی کشمیری شال اوڑھی اور برآمدے میں نکل آئی۔ صبح کی سپیدی نمودار ہونے لگی تھی۔ رات کی بارش سے ہر چیز تربتر تھی۔ بوندیں چھت میں جھالر کی طرح لگی ہوئی نالی میں گر رہی تھیں۔ یہ چاچا جی کا انتظام تھا کہ بارش کے پانی کی چھت پر گرنے والی ایک بوند بھی ضائع نہیں ہوتی تھی۔ ٹین کی قدرتی لہروں میں بہتا پانی اس نالی کے ذریعے پچھلے ٹینک میں جا کر جمع ہو جاتا اور حسبِ ضرورت کیاریوں میں دیا جاتا۔

زری نے دُکھ سے دیکھا کہ رات کے اولوں نے سیب اور خوبانیوں کے کچے جسموں کو داغ دار کر دیا تھا۔ چاچا جی کے کمرے سے روشنی آ رہی تھی۔ آہستہ سے اس نے چاچا جی کے کمرے میں جھانکا۔ وہ رات کے کپڑوں پر گاؤن پہنے لکھنے کی میز پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔

''چاچا جی، آپ جاگ رہے ہیں!'' زری نے پوچھا۔

''ہاں بیٹی، آ جا اندر۔'' اُنھوں نے کہا۔

''کیا لکھ رہے ہیں آپ؟''

''تجھے معلوم ہے مجھے ہمیشہ سے باغبانی کا شوق تھا۔ اب بوڑھا اور کمزور ہوگیا ہوں۔ پھل پھلواری کا کام زیادہ نہیں ہوتا اس لیے اب میں نے کاغذوں پر گلزار کھلانا شروع کر دیا۔''

''اچھا، شاعری کرنے لگے آپ؟'' زری بے حد خوش تھی۔

''نہیں، اِنسان کی داستان لکھ رہا ہوں — ساگا — تو بیٹھ جانا۔''

''ناول! — کب تک ختم ہو جائے گا'' زری اُن کے بستر پر ٹک گئی۔

''انسان کی داستان کبھی ختم نہیں ہوتی — بس میں لکھتا رہوں گا، لکھتا رہوں گا — اور ایک دن

مر جاؤں گا۔''

''کتاب اُدھوری چھوڑ کر؟'' زری نے کہا۔

''ارے تجھے کتاب کے ادھورے رہنے کا زیادہ افسوس ہے اپنے چاچا کی زندگی سے۔'' وہ ہنسے۔ ''نہیں، یہ کتاب اتنی ہی ادھوری اور اتنی ہی پوری ہوگی جتنی کسی بھی انسان کی زندگی — ہر انسان کی زندگی ادھوری بھی ہوتی ہے اور مکمل بھی۔''

''اس میں آپ کا فلسفۂ زندگی ہوگا نا'' زری نے پوچھا۔

''ہاں۔ میری سوچ اور زندگی کا سارا نچوڑ، تیری زندگی کا، اور سب کی زندگیوں کا۔ ابتدا سے زندگی کے ہر لمحے، ہر زاویے، ہر زمانے کی داستان۔''

''وہ تو کوئی عجیب و غریب چیز ہوگی۔'' زری نے کہا، ''کیا آپ تکنیک کا بھی کوئی نیا تجربہ کر رہے ہیں؟''

''ارے بھئی تکنیک وکنیک سب کہنے کی باتیں ہیں۔ زمان و مکان کی وحدت، گول اور چپٹے کردار، کہانی اور پلاٹ، یہ سب ہوں تب بھی بات نہیں بنتی اور یہ سب نہ ہوں تب بھی بات بن جاتی ہے۔ فن کی ساری خوبی بات بن جانے میں ہے، خواہ وہ موسیقی ہو، شاعری ہو یا ناول نگاری ہو۔''

''تو بات کیسے بنتی ہے یہی تو جاننے کی بات ہے؟'' زری نے پوچھا۔

''بات بنتی ہے جادو کی چٹکی سے۔'' چاچا جی نے کہا۔ ''اللہ میاں نے انسان کو بنایا۔ اس میں گوشت پوست، ہڈی، دل، دماغ، یہ وہ، بہت کچھ ڈالا — مگر وہ کیا چیز ہے جس سے وہ چلتا پھرتا ہے، کام کرتا ہے، وہ جادو کی چٹکی ہے۔ جب وہ نکل جاتی ہے تو آدمی مر جاتا ہے حالاں کہ دیکھنے میں ویسے کا ویسا ہے۔ سالم اور مکمل۔ ہر تخلیق اور فن کا یہی حال ہے۔ جو فن کار فن میں جادو کی چٹکی ڈال دیتا ہے وہ جی اُٹھتا ہے، اَمر ہو جاتا ہے۔ اللہ تیرا بھلا کرے، مائیکل اینجلو اور لیونارڈو ڈاونچی کے پاس یہ جادو کی چٹکی تھی، حافظ شیرازی اور امیر خسرو کے پاس تھی، میر اور غالب کے پاس تھی۔ ایلورا، اجنتا اور تاج محل کے معماروں کے پاس، اور کتنے ہی لوگوں کے پاس تھی۔ سب جانتے ہیں نام گنوانے سے کیا فائدہ۔ اس چٹکی کے دو ریزے بھی مل جائیں تو بات بن جائے۔''

''مگر یہ چٹکی آتی کہاں سے ہے؟'' زری نے پوچھا۔

''یہ مجھے نہیں معلوم۔ ہر ایک کا اپنا نسخہ ہوتا ہوگا، وہ کسی دوسرے کو کیوں بتائے گا۔ کیمیا کوئی کاری گری سے بناتا ہے، کسی کو پارس پتھر پڑا مل جاتا ہے۔ ہمیں کیا معلوم، کس نے کیسے بنایا۔ ہمیں تو صرف سونا نظر آتا ہے۔''

''چاچاجی، آپ اب تک ویسی ہی باتیں کرتے ہیں۔'' زری نے کہا۔

''ہاں تو اور کیا— اب تُو میرا ناول پڑھ کر دیکھنا اور بتانا کہ کچھ بات بنی یا نہیں۔''

''مجھے کیسے پتا چلے گا چاچاجی، میں کوئی نقاد ہوں۔''

''ارے جھلّی، کوئی بچہ بھی دیکھ کر بتا سکتا ہے کہ یہ آدمی زندہ ہے یا مردہ۔ ڈاکٹر تو پوسٹ مارٹم رپورٹ لکھنے کے لیے ہوتے ہیں— تُو تو شروع سے اچھی بھلی سیانی لڑکی ہے، تجھے ضرور پتا چل جائے گا۔''

''اچھا چاچاجی، میں ضرور دیکھوں گی کسی وقت۔ ابھی میں زیب آنٹی کی قبر پر جانا چاہتی ہوں۔''

''تو جا، یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے۔ وہ خود تیری راہ دیکھ رہی ہوگی۔ تجھ سے کتنی محبت تھی اُسے، شاید احسن اور عدنان سے بھی زیادہ۔''

''ہاں چاچاجی، جس دن ان کا انتقال ہوا ہے اُس رات بھی ایسا ہی طوفان آیا تھا نا؟''

''اس سے بھی زیادہ۔ اُس رات کئی درخت جڑ سے اُکھڑ گئے تھے، شاخیں ٹوٹ ٹوٹ کر بکھر گئی تھیں۔ قُل قُل کے گھر کا دروازہ بھی کھلا رہ گیا تھا، اور اکبر منزل کا بھی۔ قُل قُل کہیں باہر نکل گیا تھا، اور تو اُسے ڈھونڈنے چلی گئی تھی۔ اب کہیں دُور نہ جانا۔''

''نہیں چاچاجی، ابھی آتی ہوں اور آپ کو چائے بنا کر دیتی ہوں۔''

زری نے شال سر پہ اوڑھی۔ صبح کی تازہ ٹھنڈی اور نم ہوا میں سانس لیتی چلی تو یوں لگا جیسے گزرے وقت میں سفر کر رہی ہوں۔ وہی گھاس، وہی چھتنار چنار، سرو کے سائے، بید مجنوں اور پھل دار درخت، مگر زمانے کے قدم بہت دُور نکل گئے تھے۔ گزرے ہوئے وقت میں سفر کرنا ناممکن ہے۔

زری لوٹی تو نرگس اور شمس الرحمٰن اُٹھ چکے تھے اور چاچاجی اُن کے سامنے اپنی وہ تھیوریاں بیان کر رہے تھے جن کو وہ سیکڑوں مرتبہ سن چکی تھی۔ خانساماں چائے بنا کر لے آیا تھا اس لیے زری بھی وہیں بیٹھ گئی۔

''پتھریلی جگہ میں بیج آسانی سے نہیں اُگ سکتا اِس لیے اُن کو دُور دُور تک بکھیرنے کے لیے درخت ایک کام کرتا ہے— پہلے وہ بساط بھر اُونچا ہو جاتا ہے تاکہ بیج زیادہ دُور تک جا سکیں۔ یہ دیکھو'' چاچاجی نے چیڑ کے کھلے ہوئے خوشے سے ایک چلغوزے کی شکل کا بیج نکالا۔ ''اس بیج کی شکل کشتی سے کتنی ملتی ہے۔ بیج بھاری ہے اس لیے قدرت نے اس کے لیے ایک بادبان کا انتظام کیا ہے۔ اس جھلّی کی شکل بالکل بادبان جیسی ہے۔ اس کے ذریعے ہوا اُسے اڑا کر ایسی جگہ لے جاتی ہے جہاں اسے پنپنے کا موقع مل جاتا ہے۔ اب اس کو دیکھو، یہ رُوئی پروں سے بھی زیادہ ہلکی ہے۔ اپنے بیج میں

پھنسے ہوئے اس بیج کو اُڑا کر دُور دُور لے جائے گی، درخت کا یہی سندیسہ لے کر کہ جاؤ اپنی نسل بڑھاؤ آگے چلاؤ۔ زری کی امی اس رُوئی سے بہت تنگ آتی تھی کہ جوتوں کے ساتھ آ کر قالین پر چپک جاتی ہے۔ میں کہتا تھا، ہمشیرہ! قدرت اس کی ذمہ دار نہیں ـــ قدرت کا قالین تو زمین ہے اور زمین میں یہ قابلیت ہے کہ کوئی چیز اس پر باہر سے گر کر نہیں چپکتی، یا تو وہ چیزوں کو جذب کر لیتی ہے یا جھاڑ کر الگ کر دیتی ہے، میری ایسی باتوں سے وہ بہت چڑتی تھی۔"

"چاچا جی، آپ نے صبح ہی صبح اتنا لمبا درس دے ڈالا، یہ بے چارے کیسے ہضم کریں گے۔" زری نے کہا۔

"ہاں، آج کتنے دن ہو گئے تھے درس دیے ہوئے، میں یہ سنہری موقع کیسے جانے دیتا۔" چاچا جی نے کہا، "اور دیکھ تو آج جانے کی بات نہ کرنا۔ اب کے گئی تو مولا جانے کب آئے گی اور جب آئے گی تو خدا خبر میں یہاں ہوں گا یا کنج میں اُس 'مسافری' قبر کے پاس سوتا ملوں گا۔" چاچا جی کو سنجیدہ دیکھ کر زری نے چونچال بننے کی کوشش کی۔

"چاچا جی، یہ کیسی باتیں کر رہے ہیں آپ! پورے خاندان میں آپ اور میں دو ہی تو جوان تھے اور جوانوں پر ایسی باتیں نہیں سجتیں نا۔" زری نے چاچا جی کے گرم گاؤن کی جیبوں میں اپنے ہاتھ ڈال دیے۔

"ہاں، لوگ ہنستے تھے کہ چچا بھتیجی میں ایسی دوستی ہے جیسے ساتھ کے کھیلے ہوں۔ مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ بچپن میں بھی زری جس طرح میری بات سمجھتی تھی، کوئی اور نہیں سمجھتا تھا۔"

"چاچا جی، میں ایکٹنگ کرتی تھی، آپ کی بات تو میں اب بھی نہیں سمجھتی۔" زری نے قہقہہ لگایا۔ سب ہنسنے لگے۔

اب دُھوپ نکل رہی تھی۔ پاپلر کے پتے تالیاں بجا رہے تھے اور سنبل کے درختوں سے نرم روئی کی گولیاں اُڑ اُڑ کر لان میں گرنی شروع ہو گئی تھیں جیسے رات کے اولے ابھی تک گھاس میں پڑے ہوں۔ تینوں ناشتے کے لیے اندر چلے آئے۔

ناشتے کی میز پر شمس الرحمٰن نے اپنی ڈائری نکالی اور آج کے پروگرام سے زری اور نرگس کو مطلع کرنا چاہا۔

"میری خواہش تھی کہ تم دونوں بھی دو چار دن یہاں رہتے۔" چاچا جی نے کہا، "لیکن تم نہ چاہو تو میں مجبور نہیں کروں گا۔ البتہ زری کو میں ابھی نہیں جانے دوں گا۔"

"آج تو میں تم لوگوں کے ساتھ بالکل نہیں جا سکوں گی۔" زری نے چائے کی پیالی منہ سے

ہٹا کر مضبوط لہجے میں کہا، ''آج تو مجھے اپنے بیٹے کو دیکھنے جانا ہے۔'' اور پھر پیالی منھ سے لگالی۔

چاچاجی کا لاغر ہاتھ ذرا سا لرزہ پھر وہ سنبھل کر چمچے سے اپنا دُودھ دَلیا کھانے لگے۔ نرگس نے سنا مگر اُس کی سمجھ میں نہ آیا کہ ایسے موقعے پر اظہارِ حیرت کیا جائے، کچھ کہا جائے یا چپ رہا جائے۔ وہ اپنی پلیٹ میں دیکھ کر یوں توس اور انڈا کھاتی رہی جیسے اُس نے زری کی بات سنی ہی نہ ہو۔

شمس الرحمٰن نے البتہ اپنی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے زری کی طرف دیکھا۔ ایک بزرگ اپنے بیٹے کو دوستی کا مطلب سمجھانے کے لیے رات کے دو بجے اپنے ایک دوست کے پاس لے گئے تھے۔ دستک دی اور اپنا نام بتایا تو اُن کے دوست بالکل تیار اس طرح باہر نکلے کہ ایک ہاتھ میں اشرفیوں کا توڑا تھا اور دوسرے ہاتھ میں تلوار تھی۔ بولے، ''بے وقت کیسے تکلیف کی؟ روپے کی ضرورت ہے تو حاضر ہے اور دشمن سے لڑنا ہے تو میں مع تلوار حاضر ہوں۔'' شمس الرحمٰن کی نگاہوں میں زری نے اُس دوست کی سی ہم دردی، بھروسا اور تسلّی پائی۔ زری نے اپنی نظریں جھکا لیں لیکن شمس الرحمٰن کی نگاہیں اتنی ہی دیر میں بہت کچھ کہہ چکی تھیں۔

دوپہر کو زری نے چاچاجی سے کہا، ''چاچاجی، آپ گھبرایئے نہیں، اب میں تنہا نہیں۔ شمس الرحمٰن بھی میرے ساتھ ہوگا۔ مجھے خوشی ہے کہ اس نے سنان کی بات سننے کے بعد مجھ سے یہ درخواست کی ہے لیکن میں چاہتی ہوں کہ آپ میری زندگی کے بارے میں ایک ایک بات اسے بتا دیں۔ آج میں نے ان دونوں کو روک لیا ہے۔ آپ مجھے اپنا ناول دے دیجیے میں اُسے پڑھتی ہوں، اور آپ شمس الرحمٰن سے بات کر لیجیے۔ نرگس آپ کی کوٹھی کے اسکیچ بنانے میں مصروف ہے۔''

زری ناول کا مسودہ لے کر کوٹھی کے پچھواڑے چلی گئی۔ بچپن میں اکثر چمن اور عدنان کے ساتھ وہ یہاں بیڈمنٹن کھیلتی تھی۔ آج سالوں بعد وہ یہاں آئی تھی۔ اُسے محسوس ہوا کہ یہ علاقہ چڑیوں کی رہائش گاہ بن چکا ہے۔ اس کو دیکھتے ہی چھوٹی سبز پروں والی چڑیوں کے پرّے کے پُھر پُھر کرتے اُڑے۔ پھر گل گچیاں غل مچاتی (شاید ان کا نام ''غل غپاڑچیاں'' کی بگڑی ہوئی شکل ہو) احتجاج کرتیں اُن کے پیچھے لپکیں۔ لانبی دُم والی کالی چڑیاں قطار در قطار بجلی کے تار پر جا بیٹھیں۔ کووں نے صرف اونچی شاخوں پر بیٹھ کر احتجاج کرنا کافی سمجھا۔ زری شرمندہ سی ہو کر واپس چلی آئی۔ دُھوپ سے خالی سبزے اور چڑیوں سے پُر یہ جگہ ناول پڑھنے کے لیے کتنی موزوں تھی مگر وہ چڑیوں کی تنہائی اور خوشیوں میں مخل ہونا نہیں چاہتی تھی، اس لیے اپنا مسودہ لے کر چنار کے کنج کی طرف بڑھ گئی۔ آہستہ آہستہ چڑیاں اناروں کے جھنڈ اور دوسرے درختوں میں واپس چلی آئیں، اور پہلے کی طرح چہچہانے لگیں۔ دوپہر کے وقت اس بے فکری سے چڑیوں کا چہچہانا زری کو عجیب سا لگا۔ ان کی آواز میں ایک خاص قسم کی

آزادی اور بے خوفی ہے، جس سے ہمارے بڑے بڑے گاتک بھی محروم ہیں۔ زری نے سوچا۔

چاچا جی شمس الرحمٰن کو الیاسی مسجد دکھانے لے گئے تھے۔ مسجد کے اندر اُبل کر گرتے ہوئے بے حد ٹھنڈے پانی کے چشمے کے پاس بیٹھے ہوئے اور مسجد کے اُوپر سلیٹی پہاڑیوں پر ٹہلتے ہوئے چاچا جی نے زری کے والدین اور زری کی ساری داستان اُسے سنائی۔ آخر میں انھوں نے کہا، ''زری اب میری زندگی کی سب سے عزیز متاع ہے۔ میں تم سے یہی کہوں گا کہ اس کا دل دُکھا ہوا ہے۔ وہ بہت تنہا ہے، اُسے سکھ دینا۔''

''میں پوری کوشش کروں گا۔ رفاقت، سکھ اور دُکھ بانٹنے ہی کا نام ہے۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''ہاں، ایک بہت اہم بات سِنان کے سلسلے میں اور ہے۔ میں نے اور زری نے طے کیا ہے کہ احسن کو ایک دستی خط میں اُس کی بیماری کا سارا حال لکھ بھیجیں گے۔ اگر وہ اسے رکھنے اور علاج کروانے پر تیار ہوا تو سِنان کو لاہور بھیج دیں گے ورنہ—'' چاچا جی نے ذرا سا توقف کیا، ''زری اُس کو اپنے ساتھ کراچی لے جانا چاہتی ہے۔''

''زری اس سلسلے میں جو چاہیں کریں، میری طرف سے اُن پر کوئی پابندی نہیں ہے۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''بس اب مجھے اطمینان ہے۔ کسی کو سمجھ لینا بھی زندگی میں بہت بڑی بات ہے۔'' چاچا جی نے کہا، ''یاد رکھنا، میری دُعائیں ہمیشہ تمھارے ساتھ رہیں گی۔''

منگورہ سے اعجاز جتنا خوش لوٹا تھا، واپسی پر اُس نے ناصر خان کو اتنا ہی پریشان اور مضطرب پایا تھا۔

''کیا بات ہے، تمھارے والد تو خیریت سے ہیں؟''

''ہاں۔'' ناصر خان نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

''اور تمھاری امی؟''

اعجاز کے مُنھ سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ لگا جیسے اس نے ناصر خان کو گولی مار دی ہو۔ اس کا رنگ یکایک زرد ہوگیا۔ پھر اُس نے غصّے سے کہا، ''یاد ہے میں نے اک مرتبہ تم سے کہا تھا کہ میری امی کے بارے میں کبھی سوال نہ کرنا۔''

''اوہ سوری۔'' اعجاز نے کہا، ''میں بالکل بھول گیا تھا، مگر ناصر جب ہم صرف ایک دوسرے کو جانتے تھے، دوست نہیں تھے۔ اب کیا دوستی کا بھی یہی تقاضا ہے کہ تم مجھ سے یہ بات چھپاؤ۔ اگر وہ زندہ ہیں، اگر خدانخواستہ وہ زندہ نہیں ہیں — اگر ان کا تعلق کسی ایسے خاندان سے بھی ہے جس سے تمھیں اپنی ہتک —''

''چپ رہو — خدا کے لیے چپ رہو — ورنہ میں تمھارا گلا دبا دوں گا۔'' ناصر خان زور سے چیخا اور اعجاز کی طرف یوں لپکا جیسے سچ مچ اس کا گلا دبانا چاہتا ہو۔ پھر یکایک وہ ٹھٹکا، پلٹا اور اپنے پیچھے دروازہ بند کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ اُس نے دروازہ اس زور سے بند کیا تھا کہ سارا کمرہ جھنجھنا اُٹھا تھا۔ اعجاز کا دماغ بھی بھنا اُٹھا اور زندگی میں پہلی مرتبہ وہ باقاعدہ بُرا ماننے لگا۔ اس سے پہلے وہ ہمیشہ

ناصر خان آفریدی کی ہر بات مذاق میں ٹال جاتا تھا۔ وہ اکثر کہا کرتا تھا کہ ماہرینِ نسلیات کو اس بات پر ضرور ریسرچ کرنی چاہیے کہ آفریدی پٹھانوں میں اتنی بہت سی متضاد خصوصیات کیسے جمع ہوگئی ہیں۔ یہ بڑے زبردست دوست بھی ہیں، اور بے حد خطرناک دشمن بھی۔ بڑے جنگ جو ہیں مگر اندر سے بڑے نرم بھی ہیں۔ از حد خر دماغ ہیں اور نہایت منکسر المزاج بھی۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ان کا مزاج ان کے اپنے بس میں نہیں، بہت کچھ دوسروں کے ہاتھ میں ہے۔ انھیں ساز کی طرح ٹیون کرنا پڑتا ہے۔ اگر آپ نے انھیں صحیح ٹیون کر رکھا ہے تو ان سے زیادہ دوست، ندیم، شاہ خرچ، جان دینے والا پیارا آدمی کوئی نہیں، لیکن غلطی سے کوئی غلط سُر چھڑ گیا یعنی آپ نے اُن کی کسی دُکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تو ان سے زیادہ غصہ ور، بدمزاج، اکھڑ اور برخود غلط انسان بھی کوئی نہیں۔

اعجاز سمجھتا تھا کہ یا تو اُسے ناصر خان کو ٹیون کرنا آ گیا ہے یا اپنی بستی سے سال ہا سال دُور رہنے کی وجہ سے اس کی اپنی جبلّت کچھ بدل گئی ہے۔ بہر حال پچھلے چار سال میں وہ بہت اچھے دوست رہے تھے۔ اعجاز نے کئی مرتبہ محسوس کیا تھا کہ اُس کے دل میں کہیں بے حد حساس اور نازک تاروں کا جال بچھا ہے، جب بھی کسی بات سے اُن میں سے کسی تار میں ارتعاش پیدا ہو جاتا ہے تو وہ زخمی چیتے کی طرح مچلتا ہے۔ اپنی ساری بہادری، جنگ جوئی اور قوتِ برداشت کے باوجود اعجاز کے نزدیک وہ ایک نرم دل انسان تھا۔ اعجاز کو یہ بھی احساس تھا کہ مختلف قسم کے انسانوں میں رہتے ہوئے، انسانی تجربوں اور انسانی دُکھوں کا اثر لیتے ہوئے اور مختلف مکاتبِ فکر سے متاثر ہوتے ہوئے اُس کی فطرت کا تضاد کم ہونے کے بجائے کچھ اور بڑھ گیا ہے۔ شیر کو سدھا کر آپ مہذب بنا دیں، اُسے اہنسا کے فلسفے کا قائل کر دیں تو یہی ہوگا کہ وہ اپنی جبلّت اور علم کی چکّی کے پاٹوں کے بیچ پستا رہے گا اور اس کی شخصیت ریزہ ریزہ ہوتی رہے گی۔ اعجاز اُس کی شخصیت کی اس شکست و ریخت کا گواہ تھا لیکن اس کا اصل سبب اُسے بھی معلوم نہیں تھا۔

زندگی میں پہلی مرتبہ وہ ناصر خان کے گاؤں آیا تھا جو دریائے سوات کے کنارے آباد تھا۔ اُس کا گھر دریا کے عین اُوپر چٹان پر اس طرح بنا ہوا تھا کہ اُس کی شہ نشین ہوا میں معلّق نظر آتی تھی۔ زنان خانہ، مردان خانے سے دُور تھا جہاں اعجاز کا گزر نہیں تھا۔ ناصر خان کے والد، جو اچھی خاصی جائداد اور زمینوں کے مالک تھے، شہ نشین میں مشک جیسی گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے حُقّہ پیتے اور لوگوں سے مختلف مسائل پر بات چیت کرتے رہتے تھے۔ باپ بیٹے میں زیادہ ابلاغ نہیں تھا، کہیں مل جاتے تو ناصر کو ہدایت کرتے کہ مہمان کی خاطر داری میں کوئی کمی نہ ہو۔ اُسے پوری طرح سیر کروائی جائے اور مچھلی یا مرغابی، جس شکار کا شوق ہو، دل بھر کے کروایا جائے۔ چناں چہ ان دونوں نے خان کی

جیپ سے اور شیور لے سے، گھوڑوں اور کشتی سے، ہر طرح کی سیر کر ڈالی تھی۔ روز صبح گھوڑوں پر نکلتے تھے اور پہاڑیوں کے نشیب و فراز طے کرتے ہوئے سورج نکلنے کا لطف اٹھاتے تھے۔ اعجاز شروع میں گھوڑے پر بیٹھتے ہُوئے بِدکا تھا اور دل پر صبر کر کے بڑی ہمت باندھ کے بیٹھا تھا مگر جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا تھا کہ خطرے کی کوئی بات نہیں ہے۔ گھوڑے سدھے ہوئے تھے اور پگڈنڈیاں اُن کے سُموں کو لگی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ گھوڑے ایسے اطمینان اور دل جمعی سے قدم اُٹھاتے تھے کہ اعجاز کو اپنی پریشانی پر پشیمانی ہوتی تھی۔

انھی گھوڑوں پر بیٹھ کر ایک دن وہ زمُرد کی کان دیکھنے گئے تھے۔ مزدور تغاریوں میں سفید چکنے پتھر بھر کر لاتے تھے جن میں زُمردیں دھاریاں یا رگیں تھیں۔ یہ زمرد تھے۔ اُنھیں پتھروں سے زمرد الگ کرنے اور انھیں تولنے کے سارے مرحلے دکھائے گئے تھے۔ نکالے ہوئے زمرد کی چھوٹی بڑی خالص اور نخالص ڈلیاں انھوں نے دیکھی تھیں اور یہ کہانی بھی سنی تھی کہ یہاں کام کرنے والے ہر شخص کی جاتے ہوئے تلاشی لی جاتی ہے پھر بھی چوری ہوتی رہتی ہے۔ ایسے جواں مرد بھی موجود ہیں جو زمرد نگل لیتے ہیں اور بعد ازاں فضلے سے اُسے حاصل کر لیتے ہیں۔ اب اعجاز یہاں کی ہر عجیب و غریب بات پر یقین کرنے لگا تھا۔ شروع میں جب ناصر خان اس دیس کی لوک داستانوں، اوہام اور رسم و رواج کے بارے میں بتاتا تھا تو اعجاز کو یقین نہیں آتا تھا لیکن اب اُس نے ایک ایک لڑکی پر سات سات جن آتے اور جاتے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیے تھے۔

ان کہانیوں کی سچائیوں کے ساتھ یہاں کے آدمیوں کی نفسیات بھی کچھ کچھ اُس کی گرفت میں آرہی تھی۔ پہاڑوں کے ساتھ شب و روز واسطہ ہو تو انسان کی فطرت میں سختی کا ہونا لازمی ہے۔ جہاں کے دریا پُرشور ہوں اور پتھروں سے سر پٹک کر راستہ بناتے ہوں، جہاں برف و باراں کے شدید طوفان آتے ہوں، وہاں انسانی جذبات بھی تند و تیز ہی ہو سکتے ہیں۔ جہاں شہر کی آسائشیں دُور ہوں، جہاں فطرت ہی سب سے بڑی دوست اور فطرت ہی سب سے بڑی دشمن ہو وہاں دوستی اور دشمنی میں ناقابلِ فہم اُلجھنیں ہوں تو بات سمجھ میں آتی ہے۔

یہ سب باتیں آہستہ آہستہ اعجاز کی سمجھ میں آرہی تھیں مگر ایک بات اُس کی سمجھ میں نہیں آتی تھی کہ ناصر خان اچانک بیٹھے بیٹھے کھو کیوں جاتا ہے، ایسی گہری سوچ میں ڈوب جاتا ہے جیسے وہاں موجود ہی نہ ہو۔ کراچی میں اُس کا کھویا جانا سمجھ میں آتا تھا۔ گھر اور ماں باپ سے سیکڑوں میل دُور ظاہر ہے، اُسے گھر اور عزیز یاد آتے ہوں مگر اب جب کہ وہ اپنے گاؤں میں اپنے عزیزوں کے پاس تھا اور اس کا عزیز ترین دوست بھی ساتھ تھا، اُسے کیا پریشانی تھی۔ کوئی لڑکی کراچی میں اُس کی

دوست نہیں تھی۔ لڑکیوں سے وہ دُور بھاگتا تھا۔ اس معاملے میں وہ بالکل گاؤں والا تھا۔ لڑکیوں میں وہ دل چسپی لیتا تھا نہ کبھی شادی کے مسئلے پر سنجیدگی سے بات کرتا تھا۔ اب بھی وہ زنان خانے میں بہت کم جاتا تھا۔ ایک دن اعجاز نے اس کا سبب پوچھا تو کہنے لگا، ''یار، ہم لوگ ہر وقت 'زنان خانے' میں گھسا رہنا اچھا نہیں سمجھتے۔ ہمارے اپنے مردانے مشاغل ہوتے ہیں اور ہم گھر کی عورتوں سے بات بھی کیا کریں۔ آہستہ آہستہ ہمارے ان کے درمیان خلیج سی بن جاتی ہے، کوئی ایسا موضوع ہی نہیں ہوتا جس پر ہم بات کرسکیں سوائے اس کے کہ ہر روز اُن کی خیریت پوچھ لیا کریں۔''

ایسی ہی کسی بات پر ایک دن اعجاز نے کراچی میں اُس کی ماں کے بارے میں پوچھ لیا تھا اور وہ بپھر گیا تھا۔ اُس نے کہا تھا کہ آئندہ کبھی اُس کی امی کے بارے میں کچھ نہ پوچھے۔ اعجاز کو خوب معلوم تھا کہ ان جاگیرداروں کے ہاں اکثر نچلے طبقے کی عورتیں گھر میں ڈال لی جاتی ہیں۔ اُس نے سوچا تھا، اگر وہ کسی ایسی عورت کی اولاد ہے تو یہ کیا کم ہے کہ خان اسے اپنا بیٹا کہتا اور پاٹھ رانی کی اولاد کی طرح اس کے ناز اٹھاتا ہے اور اسے وہ تمام مراعات حاصل ہیں جو کسی بھی خاندانی ماں کے بیٹے کو حاصل ہوسکتی ہیں اور بھلا اُسے اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے کہ اس کی ماں کسی نواب کی لاڈلی بیٹی تھی یا کسی دودھ بلونے والی کی لڑکی تھی، اور اب تو اُسے یہ بھی معلوم ہوگیا تھا کہ اُس کی ماں زری کے خاندان سے تھی جو ظاہر ہے کہ کھاتا پیتا عزت دار خاندان تھا۔

لیکن آج بھی وہ اس بات پر اتنا ہی بھڑکا تھا، اور اعجاز نے سوچا تھا کہ اب اُسے یہاں سے چلا جانا چاہیے۔ اب وہ آؤٹ آف ٹیون ہوچکا ہے اور دونوں کے لیے بہتر ہے کہ وہ ایک دوسرے کی راہ نہ کاٹیں۔ اب ناصر خان آیا تو اعجاز سوٹ کیس میں اپنے کپڑے ڈھیر کر رہا تھا۔

''کیا کر رہے ہو؟'' اُس نے پوچھا۔

اعجاز نے جواب دینا مناسب نہ سمجھا۔ جو کچھ وہ کر رہا تھا، ظاہر ہے ناصر خان کو نظر آرہا تھا۔

''جارہے ہو تو جاؤ، مگر آئندہ کسی سے دوستی کا دعویٰ بھی نہ کرنا۔''

''گویا خطا میری ہے۔'' اعجاز اب خاموش نہ رہ سکا۔

''تم جنت اور دوزخ میں تو یقین رکھتے ہو؟'' ناصر خان نے پوچھا۔

''ہاں، کیوں؟''

''تمھارے ذہن میں جہنم کا جو بھی تصور ہے، فرض کرو تمھاری ماں کو جیتے جی اس میں ڈال دیا جائے اور ساری عمر اسی میں رکھا جائے تو تمھیں کیسا لگے گا؟''

اعجاز کانپ گیا۔ یہ ناصر خان کیا کہہ رہا ہے۔ اُس نے نگاہیں اُٹھا کر ناصر خان کی طرف دیکھا۔

وہ دروازے پر ہاتھ رکھے کھڑا تھا۔ اُس کا چہرہ بالکل سفید تھا۔ ہاتھ کی رگیں اُبھری ہوئی تھیں اور وہ آہستہ آہستہ کانپ رہا تھا۔ اعجاز نے آج سے پہلے کبھی اُسے اس حالت میں نہیں دیکھا تھا۔

''تمھیں معلوم ہے اعجاز، میری ماں اسی حویلی میں رہتی ہے اور میں اپنی یادداشت میں اُس سے نہیں ملا۔'' اُس کی آواز کی لرزش، اُس کے لہجے کا سوز، اُس کے چہرے کی دُکھن ایسی نہیں تھی جسے آدمی نظرانداز کر دے۔ اعجاز اُٹھ کر اس کی طرف بڑھا۔ اُس نے تسلی کے لیے ناصر خاں کے کندھے کی طرف ہاتھ بڑھایا ہی تھا کہ وہ اعجاز کے سینے سے سر لگا کر زار و قطار رونے لگا۔ اعجاز نے اُس سے کچھ نہ پوچھا۔ جب اُس کا دل ہلکا ہو گیا تو وہ آنسو پونچھتا ہوا خود ہی باہر چلا گیا۔ اعجاز نے کپڑے واپس الماری میں لٹکا دیے۔ اب جانے کا سوال ہی نہیں تھا۔ لیکن اعجاز نے دل میں اس ذکر کو نہ چھیڑنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ اب جب ناصر خان پر خاموشی کا دورہ پڑتا وہ اُسے اُس کے حال پر چھوڑ کر کتابوں سے دل بہلایا کرتا۔ دیوان خانے میں ایک الماری کتابوں سے بھری ہوئی تھی اور کتابیں ہمیشہ سے اعجاز کے حواسوں پر سوار رہی تھیں۔ بچپن سے کتابیں اُسے مسحور کرتی تھیں۔ رنگین الفاظ اس کے لیے ایسے طلسماتی محل تھے جن میں سیکڑوں پریاں، جن اور دیو چھپے بیٹھے تھے۔ کتابوں کی دُکانوں اور لائبریریوں کے سامنے سے گزرتے ہوئے اُس کے قدم ہمیشہ سست پڑ جاتے تھے۔ اس الماری کی کتابوں کو بھی وہ بڑے ذوق و شوق سے اُلٹتا پلٹتا اور کوئی نہ کوئی کتاب پڑھنے کے لیے نکال لیتا۔ زیادہ تر انگریزی کلاسیکی ناول اور انگریزی زبان کے شاعروں کے دیوان تھے۔ ہر کتاب پر بڑے خوب صورت نسوانی ہاتھ میں گول گول گھما کر لکھا گیا تھا: ''قدسیہ خانم''۔ کتابیں پُرانی تھیں۔ اُن کے اُوراق زرد پڑ رہے تھے۔ شاید ان کو کبھی ہوا بھی نہیں دی جاتی تھی، البتہ کبھی کے نیم کے پتے ان میں پڑے تھے جو سوکھ کر چُرمُر ہو گئے تھے اور کتابوں میں سے یوں رہ رہ کر جھڑتے رہتے تھے جیسے کسی برہن کی آنکھ سے آنسو گرتے ہیں۔

''یہ قدسیہ خانم کون ہیں جو انگریزی رومانوی شاعروں کی زبردست عاشق ہیں جب کہ تم کہتے ہو کہ تمھارے ہاں لڑکیوں کی تعلیم کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔'' ایک دن اعجاز نے پوچھ ہی لیا۔

''بھئی اس قسم کے حادثے ہمارے ننھیال میں ہوا کرتے تھے، اچھا چلو اب نکلو، یہاں تمھیں کتابیں پڑھنے کی اجازت نہیں ہے۔''

اعجاز کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ناصر خان کو ان کتابوں سے کچھ مخاصمت تھی یا حسد تھا کہ جب بھی وہ ان کو دیکھنے لگتا ناصر خان زبردستی اسے باہر لے جانے کی کوشش کرتا، خواہ اُسے جبراً اپنا موڈ ٹھیک کرنا پڑے۔

اور ایک دن جب اعجاز نے ایک نہایت بوسیدہ سی کتاب نکالی تو اُس میں سے ایک تصویر گر پڑی۔ تصویر بے حد حسین تھی۔ قدسیہ کا جو ہیولا اعجاز نے بنایا تھا اس سے بھی حسین۔ اعجاز نے جو قدسیہ کے خط سے مسحور ہو کر اکثر اُس کے بارے میں سوچا کرتا تھا، یہ فرض کر لیا کہ یہ تصویر قدسیہ خانم کی ہے۔ اس نے ناصر خاں کو یہ تصویر نہیں دکھائی اس لیے کہ اُس نے آج تک نہیں بتایا تھا کہ قدسیہ خانم آخر کون ہے۔ یہ خان لوگ عورتوں کے معاملے میں عجب طور سے حساس واقع ہوئے ہیں۔ اسے یقین تھا کہ اگر اُس نے یہ تصویر ناصر کو دکھائی تو وہ فوراً اندر لے جا کر اُسے محفوظ کر دے گا اور اُسے یہ بھی نہیں بتائے گا کہ تصویر کس کی ہے۔ وہ اتنی دل آویز تصویر تھی کہ اچھی پینٹنگ کی طرح اسے بار بار دیکھنے کو جی چاہتا تھا۔ اعجاز نے وہ تصویر اسی کتاب میں چھپا دی اور اس کتاب کو کونے میں رکھ دیا تاکہ جب چاہے آسانی سے نکال کر دیکھ سکے۔ اسے دیکھ کر اعجاز کو کیٹس کا مشہور مصرع A thing of beauty is a Joy for ever یاد آ جاتا تھا۔ اور جب بھی اسے دیکھتا تھا اسے زری کا خیال ضرور آتا تھا کہ اس تصویر میں بلاشبہ زری کی مشابہت تھی۔

اعجاز پہاڑی دریا کے فیروزی پانی میں مچھلی کی ڈور ڈالے بیٹھا تھا۔ دریا کا ٹھنڈا پانی گول گول شفاف پتھروں کے اُوپر سے بہہ رہا تھا۔ آسمان پر ہلکے ہلکے بادل تھے۔ خنک ہوا چل رہی تھی جس میں سبز لمبی گھاس گھوڑے کے ایال کی طرح اُلٹی ہوئی تھی۔ گہرے نارنجی، اودے اور سفید پوست کے پھول گھاس میں رنگین تتلیوں کی طرح لہرا رہے تھے۔

"تمھیں تو معلوم ہے کہ نہ میں مچھلی کے شکار کا شوقین ہوں، نہ اس کی الف بے سے واقف ہوں۔" اعجاز نے پاس بیٹھے ہوئے ناصر خان سے کہا، "مگر یار اتنا خوب صورت موسم ہو، ساتھ میں محبوبہ نہ سہی گہرا دوست ہی ہو تو آدمی بنسی پانی میں ڈالے بیٹھا بڑا رومانٹک نظر آتا ہے۔"

وہ دونوں ناصر خان کے گھر سے زیادہ دُور نہیں تھے مگر پہاڑی اور اس کے آگے نکلی ہوئی چٹان کی وجہ سے گھر سے اوجھل ضرور تھے۔ ان سے تھوڑے فاصلے پر چند عورتیں چادروں سے سر ڈھانپے دریا سے پانی بھرنے میں مصروف تھیں، اور ناصر خاں ٹکٹکی باندھے انھیں دیکھ رہا تھا مگر اس کی کھوئی کھوئی کیفیت سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ کوئی اور ہی منظر دیکھ رہا ہے۔ اُس نے اعجاز کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا تھا۔ شاید اس کا جملہ سنا بھی نہیں تھا۔

ناصر خان نے بے خیالی میں ایک پتھر اٹھا کر دریا میں پھینک دیا۔ ننھی ننھی لہریں دائرے بن کر پھیلتی چلی گئیں۔ یکایک اُسے خیال آیا کہ اعجاز پانی میں بنسی ڈالے بیٹھا ہے۔

"سوری۔" اُس نے کہا اور پھر خیالوں میں کھو گیا۔ کچھ دیر بعد اس نے ایکا ایکی بولنا شروع

کر دیا۔ ''میری بے چاری ماں اسی طرح چادر سے سر ڈھانک کر کبھی کبھی نوکرانیوں کے ساتھ چھپ کر باہر نکل آتی تھی اور دریا کے کنارے آن بیٹھتی تھی۔ اس نے کانوینٹ میں پڑھا تھا، اُس نے ورڈز ورتھ کی نظمیں پڑھی تھیں، اُسے فطرت سے بڑا لگاؤ تھا۔ وہ اپنی مدر سپیریر کی بہت چہیتی شاگرد تھی۔ خوب صورت، ذہین اور امیر لڑکیوں پر یہ راہبائیں بھی جان دیتی ہیں۔ جب سولہ سال کی عمر میں اس لڑکی کا رشتہ آیا تو انھوں نے اس کی شادی کی مخالفت کی تھی اور اس کے والد کو سمجھایا تھا کہ اتنی کم عمری میں شادی کر کے اس ذہین و فطین لڑکی کو تباہ نہ کریں مگر یہاں مسئلہ دوسرا تھا۔ یہ وقت کا مسئلہ نہیں، ان کی زندگی اور موت کا مسئلہ تھا۔ اس دن تم پوچھ رہے تھے نا کہ یہ قدسیہ خانم کون ہیں جو انگریزی رومانوی شاعری کی عاشق ہیں، تو قدسیہ خانم میری امّی کا نام ہے۔''

ناصر خاں کچھ دیر دَم لینے کو رُکا اور پھر بولا، ''ہوسکتا ہے وہ غیر مُلکی اسی جگہ بیٹھا مچھلیاں پکڑ رہا ہو، اور وہ بالکل اسی جگہ بیٹھی پانی بھر رہی ہوں اور ان میں میری ماں بھی پانی میں پاؤں ڈالے بیٹھی اپنے صاف شفاف ٹخنوں سے میل اتارنے کی ایکٹنگ کر رہی ہو۔ ماں نے اپنے اسکول کے کئی انگریزی ڈراموں میں کام کیا تھا اور انعام جیتا تھا۔''

دھیرے دھیرے ناصر خان نے وہ ساری داستان اعجاز کو سنا دی جو اُس نے اپنی ماں کی ڈائری میں پڑھی تھی۔ یہ ڈائری اسے کتابوں کی اُسی الماری سے ملی تھی جسے اعجاز ٹٹولتا رہتا تھا اور وہ آج بھی اُس کے پاس محفوظ تھی۔ اعجاز سنے بنا یہ ساری داستان سن رہا تھا، جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ وہ گرد و پیش سے بے نیاز ہو چکا تھا۔ اگر ناصر خان کی جگہ کوئی اور یہ قصہ سناتا تو شاید وہ یقین نہ کرتا۔ مگر اب جس طرح ناصر خان کو اپنی ماں کے ایک ایک لفظ پر اعتبار تھا، کسی نامعلوم منطق کی بنا پر اعجاز کو بھی ان کی سچائی کا یقین تھا۔

''پچیس سال، سُن رہے ہو، پچیس سال میری ماں اس جہنم میں رہی اور اب بھی رہ رہی ہے۔ میں نے آج تک انھیں نہیں دیکھا جب کہ اس وقت بھی وہ مجھ سے چند قدم کے فاصلے پر موجود ہیں۔ کہیں تم نے ایسا سنا ہے، دیکھا ہے، بتاؤ ـــ بتاؤ۔'' اس کے لہجے میں ہزاروں زنجیروں کی جھنجھناہٹ، جھلاہٹ اور لاکھوں آنسوؤں کی نمی تھی۔

قدسیہ کے لیے شہزور علی خان کا پیغام عین اس وقت آیا تھا جب ڈاکٹروں نے کرنل حیات کو بتایا تھا کہ اُن کے گردے خراب ہو چکے ہیں۔ وہ آپریشن کے لیے باہر جاسکیں تو عین مناسب ہے۔ کرنل حیات نے اس رشتے کے بارے میں بڑے بھائی زمان خان سے رائے لیتے ہوئے لکھا تھا کہ اگر عمر قدسیہ سے شادی کرنا چاہتا ہے تو اُن کی نظر میں اس سے بہتر رشتہ کوئی اور نہیں ہے۔"

زمان خان نے دل ہی دل میں فاتحانہ خوشی محسوس کرتے ہوئے جواباً لکھا تھا کہ عمر کا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ انگلستان گئے ہوئے نوجوان پر بھروسا کرنا ویسے بھی حماقت ہے۔ موجودہ حالات میں شہزور کا رشتہ قدسیہ کے لیے ہر طرح مناسب معلوم ہوتا ہے۔ کرنل حیات نے قدسیہ کے ہونے والے سسرال میں جاکر پوچھ گچھ کی تھی۔ لوگ دقیانوسی ضرور تھے مگر امارت اور شرافت تھی۔ رفتہ رفتہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ انھوں نے سوچا تھا، آہستہ آہستہ، سب ہی روشن خیال ہو رہے ہیں۔ کل تک ان کے والد اتنے پرانے خیالات کے تھے کہ عورت کا پلّو تک کسی غیر مرد کی نظر میں آنا گوارا نہیں کرتے تھے اور آج ان کی پوتی لڑکوں کے ساتھ فرفر انگریزی بولتی اور ٹینس کھیلتی تھی۔ قدسیہ کو سمجھاتے ہوئے اُنھوں نے کہا تھا، "ذرا ٹیکٹ (tact) سے کام لینا سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ It's only a matter of time."

تب قدسیہ نے بہت کوشش کی تھی کہ کسی طرح ایک بار فقط ایک بار عمر کو اطلاع دے سکے مگر یہ بھی ممکن نہ ہوا۔ عمر کا پتا اُس کے پاس نہیں تھا اور اُس کے گھر والوں کا رویہ دیکھتے ہوئے عمر خان کے گھر سے

پتا منگوانا آسان نہ تھا۔ کانوینٹ میں پڑھنے والی لڑکیاں، جن کو عام لوگ بے حد آزاد سمجھتے ہیں کتنی مجبور و بے بس ہیں کوئی نہیں جانتا، اُس نے دُکھ سے سوچا تھا۔

قدسیہ کو حیرت تھی کہ اس کے آزاد خیال باپ کے ذہن میں کیوں لڑکے اور لڑکی کی ذہنی ہم آہنگی کا سوال نہیں اُٹھا تھا۔ ان کے نزدیک سب سے اہم بات یہ تھی کہ رشتہ مالی طور پر برابر یا بڑے گھر کا ہو۔ نجانے کیسے اُن کو اس متھ (myth) پر یقین تھا کہ تعلیم یافتہ لڑکیاں جاہل لڑکوں کے ساتھ بخوبی گزارا کر لیتی ہیں اور یہاں تو شہزور علی خان خود بھی پڑھا لکھا تھا۔ قدسیہ آخر وقت تک حیص بیص میں رہی تھی۔ جس وقت نکاح کے لیے گواہ اُس کے پاس آئے ہیں اُس نے ہرگز ہاں نہیں کی تھی مگر اس کے زبان کھولنے سے پہلے اُس کا اقرار مردان خانے میں پہنچ چکا تھا اور اُس کے کمرے میں بیٹھی ہوئی عورتیں جن میں اُس کی ساری چچیاں شامل تھیں، اس خوشی کے موقعے پر اُس کی ماں کو یاد کر کے گلے مل کر رو رہی تھیں۔ قدسیہ حیران تھی کہ یہ سب کیا ڈراما ہے۔ اسے آخری آس تھی کہ شاید شہزور علی خان ہی اُس کی بات سمجھ سکے گا، لیکن وہ اُس کی بات تک سننے کا روادار نہ تھا۔ اب زندگی میں شادی کی پہلی پہلی رات اِس لیے تو نہیں آتی کہ انسان بیٹھ کر پہیلیاں بوجھے۔

قدسیہ کو اب دن میں کئی کئی بار اپنے قیدی ہونے کا احساس ہوتا تھا۔ یہ قید جسمانی بھی تھی اور ذہنی بھی۔ سارے فیصلے باہر ہوتے تھے اور اُسے صرف اطلاع دی جاتی تھی۔ ذہنی یکجائی کا کوئی سوال نہ تھا۔ اس کے شوہر کی سوچ بالکل جدا تھی۔ سیکڑوں مرتبہ وہ اس بات کا اظہار کر چکا تھا کہ وہ عورتوں کی آزادی اور آزاد خیالی کا سخت مخالف تھا اور اُسے صرف اس اُمید میں بیاہ کر لایا تھا کہ آہستہ آہستہ وہ راہِ راست پر آجائے گی۔

وہ جو پَر کھول کر اُڑنے کے خواب دیکھ رہی تھی، محسوس کر رہی تھی کہ زنجیر کا حلقہ اُس کے گرد تنگ اور تنگ ہوتا جا رہا ہے۔ وہ خوب صورتی جسے دیکھنے دُنیا دُور دُور سے آتی تھی، اُس کی آنکھوں کے لیے نہیں تھی۔ وہ پیسا جو اُمڈا پڑتا تھا اُس کے خرچ کرنے کے لیے نہیں تھا۔ اس نے باپ کے پاس جرمنی جانا چاہا جہاں وہ علاج کے لیے گئے ہوئے تھے تو انکار کر دیا گیا۔ اُس نے پشاور میں کوٹھی بنوا کر رہنے کا خیال ظاہر کیا تو وہ خاندانی بغاوت کے مترادف ٹھہرا۔ احساسِ تنہائی جو ابتدا میں ننھا سا کانٹا تھا، رفتہ رفتہ بھالا بنتا جا رہا تھا۔ تنگ آ کر اُس نے اپنے والد کو ایک طویل خط لکھا، جس کے جواب میں ایک تار آیا کہ دوسرے آپریشن کے دوران وہ چل بسے تھے اور یوں حلقۂ طوق اُس کی گردن میں یوں پھنس گیا کہ دائیں اور بائیں دیکھنا بھی دشوار ہو گیا۔

ایسے میں وہ نوکرانیوں کا بھیس بدل کر اُن کے ساتھ دریا کی سیر کو نکلا کرتی تھی اور جب وہ دریا

کے کنارے کپڑے دھوتی تھیں تو وہ دریا کے پانی میں پیر ڈالے اپنے حسنِ بلاخیز کا نظارہ کرتی تھی اور کڑھتی تھی کہ وہ ساری زندگی اس مٹی کے قلعے میں بند رہے گی اور کوئی ساتواں شہزادہ اُسے اس قید سے نکالنے نہ آئے گا۔

اور جب کبھی اس کا کہیں جانے کو جی چاہتا تو معلوم ہوتا کہ کاریں اور جیپیں بڑے یا چھوٹے خان کے کسی کام سے گئی ہیں یا اُن کے انگریز یا دیسی مہمانوں کے استعمال میں ہیں یا کسی خان دوست نے منگوا رکھی ہیں۔ البتہ چادر بندھی بجی سجائی بہلی حاضر ہے جس کے بیل نہایت پلے پلائے اور خوب صورت ہیں۔ اس چادر بندھی بیل گاڑی میں وہ کہاں جاتی۔ اُسے آس پاس کے صرف دو چار گھروں میں جانے کی اجازت تھی جہاں مالکنیں اُردو بولنا تک نہیں جانتی تھیں اور کالی یا سرخ چھینٹ کے ایسی کپڑے پہنتی تھیں کہ پہلی نظر میں نوکرانی اور مالکن کی پہچان بھی دشوار ہوتی تھی۔

اس صورتِ حال میں قدسیہ کے لیے یہ خصوصی رعایت چند روز تک باعثِ تسکین رہی کہ اسے اپنی پسند کے کپڑے پہننے کی اجازت تھی۔ اُس کے کمرے میں نئی وضع کی خوب صورت مسہری اور سنگار میز کے علاوہ کتابوں کی ایک الماری بھی تھی جہاں اُس نے اپنی کنوارپنے کی کتابیں، ڈکنس، ہارڈی، جین آسٹن اور برانٹی بہنوں کے ناول، شیکسپیئر، ملٹن براؤننگ اور رومانوی شعرا کی کتابیں سجا کر رکھ دی تھی۔ اُس نے دیکھا تھا کہ اُس کے سسرالی گھروں میں ایسے گھر بھی تھے جہاں زنان خانوں اور ڈھورڈنگروں کے باڑوں میں ذرا بھی فرق نہ تھا۔ ایک ہی آنگن میں گھل مل کر وہ بڑے چین کی زندگی گزارتی تھیں۔ مردوں سے زیادہ عورتوں کی رفاقتیں گھر کی گائے بکریوں اور مرغیوں کے ساتھ تھیں اور وہ ایک دوسرے کے دُکھ درد میں شریک تھیں۔

نسائی حرم کی یہ دونوں مخلوقات مالکوں کے رحم و کرم پر اُس وقت تک اُن کی توجہ اور آرام کی مستحق تھیں جب تک مالکوں کو اُن کی ضرورت تھی۔ اس کے بعد کوئی قصاب انھیں لے جائے یا دِق سِل میں خون تھوک کر پہاڑی قبرستان میں جا سوئیں، کسی کو پروا نہ تھی۔

قدسیہ دریا کے پانی میں پاؤں ڈالے اپنے شفاف ٹخنوں کا میل اتارنے کی اداکاری کر رہی تھی۔ خادمائیں باری باری گھڑے بھر کر پانی کے بنائے ہوئے گہرے راستے سے اوپر آ جا رہی تھیں۔ دو تین پتھروں پر بیٹھیں جھک کر دریا کے پانی میں کپڑے دھونے میں مصروف تھیں۔ یکایک قدسیہ نے دیکھا کہ ان سے کچھ فاصلے پر ایک سفید فام، بھوری داڑھی والا وجیہہ سا شخص دریا میں بنسی ڈالے بیٹھا ہے۔ سر پر دھوپ سے بچنے کے لیے چوڑی لگر کا ہیٹ ہے اور نزدیک ہی ایک مجلّد کاپی اور قلم پڑا ہوا ہے۔ قدسیہ نے اپنی خاص خادمہ سے پوچھا کہ یہ کون شخص ہے۔ اس نے بتایا کہ یہ خان کا مہمان ہے۔ شکار اور سیر کا شوقین ہے۔ کتابیں لکھتا اور تصویریں کھینچتا ہے اور ہر جگہ تنہا جانا پسند کرتا ہے۔ آج ہی کالام اور اوشو دیکھ کر لوٹا ہے۔ اسی وقت اُس غیر مُلکی کو نہ جانے کیا خیال آیا کہ اُس نے اپنی بنسی نکال کر گھاس پر رکھی اور اپنا بچھایا جھاڑتا ہوا اُن عورتوں کی طرف آیا۔ قدسیہ نے دیکھا کہ اُس کے پتلون کے پائنچے چڑھے ہوئے تھے۔ اُس کی پنڈلیاں سفیدے کے درخت کی طرح سڈول اور سپید تھیں جن پر مکّی کے بُھٹے ایسے سنہری بال تھے۔

ابھی وہ دُور ہی تھا کہ قدسیہ نے مُنھ پھیر لیا، اور نہایت تن دہی سے انجان بنی اپنے ٹخنے رگڑتی رہی۔ غیر مُلکی آن کر خادماؤں سے باتیں کرنے لگا۔ قدسیہ کو حیرت ہُوئی کہ وہ اُردو بھی بول سکتا تھا اور پشتو بھی۔ لڑکیاں اس سے ٹھٹھول کرنے لگیں۔ سب عورتیں ہی تو تھیں۔ کون چھوٹے یا بڑے خان سے کہنے جا رہا ہے کہ آج انھوں نے ایک غیر مردوے سے خوب باتیں کی ہیں۔ جلد ہی اُس کی توجہ

اس عورت کی طرف ہُوئی جو ماتھے تک چادر کھینچے بے نیازی سے منہ دوسری طرف کیے بیٹھی تھی۔ اب اتنی نظر انداز کیے جانے والی چیز بھی نہیں تھا وہ۔

گھاس پر اپنے بڑے بڑے سفید پاؤں احتیاط سے رکھتا وہ بالکل اُس کے نزدیک جا کر بیٹھ گیا اور بولا، ''السلام علیکم!''

''وعلیکم السلام!'' آہستہ سے قدسیہ نے کہا اور ہنسی دبانے کے بہانے چادر کا کونا منہ پر رکھ لیا۔

''وہ بس غور سے اُس کے چہرے کو دیکھتا ہی چلا گیا، اور پھر اُردو میں بولا، ''آپ بھی خان کے گھر میں رہتی ہیں؟''

''جی۔'' قدسیہ نے مختصراً کہا۔

''آپ کیا کرتی ہیں؟''

''میں بھی کام کرتی ہوں۔''

''مگر میں اتنی دیر سے دیکھ رہا ہوں کہ دوسری عورتیں پانی بھر کر لے جا رہی ہیں، کپڑے دھو رہی ہیں اور آپ خالی بیٹھی ہیں۔''

''میں!— میری آج چھٹی ہے۔'' قدسیہ نے گڑبڑا کر کہا۔

وہ ہنسا۔ ''میں نے تو سنا ہے کہ یہاں کے نوکروں نوکرانیوں کی کبھی چھٹی نہیں ہوتی۔ سال میں ایک دفعہ بھی نہیں'' — اور یکایک اس نے انگریزی میں کہا، ''اگر تم خان کی بیوی ہو اور یہاں سیر کرنے آئی ہو تو اس میں بھی کوئی حرج نہیں ہے۔ میں یہ بات خوب سمجھ سکتا ہوں۔ مردوں کی طرح عورتوں کو بھی باہر نکلنے کا حق ہونا چاہیے، کیوں نہ ہو۔''

اور تب یکایک قدسیہ بھول گئی کہ وہ کہاں ہے — دریا کا شفاف پانی اُس کے اپنے گھر کے سامنے کے دریا کا پانی ہے۔ گھاس پر اُڑنے والی تتلیاں وہی روزمرہ یہاں بیٹھنے والی تتلیاں ہیں اور پوست کے رنگ برنگے پھول بھی وہی ہیں جو روز ہی یہاں کی تازہ خنک ہوا میں لہلہایا کرتے ہیں۔ شاید لمحوں میں ورڈز ورتھ پڑھنے والی وہ لڑکی لیک ڈسٹرکٹ (Lake District) میں جا پہنچی۔ سبزہ ونڈر میئر یا گراس میئر کے کنارے پھیلا ہوا سبزہ بن گیا۔ پوست کے رنگ برنگے پھول ورڈز ورتھ کے ڈیفوڈلز میں تبدیل ہو گئے اور وہ نہایت رواں دواں انگریزی میں اس اجنبی سے باتیں کرنے لگی۔

''میں نے سنا ہے تم کہانیاں لکھتے ہو اور شکار کے شوقین ہو، تمھارا نام کیا ہے؟''

''ہیمنگوے۔'' اجنبی کے چہرے پر، ہونٹوں پر اور آنکھوں میں عجیب پُراسرار سا تبسم تھا۔

''کیا؟ اَرنسٹ ہیمنگوے — مشہور ناول نگار۔'' وہ ساری احتیاط بھول کر اپنی خوب صورت بڑی

بڑی حیران آنکھوں سے اُسے تکنے لگی۔

وہ مسکرایا۔ ''کیوں — کیا میں اُس جیسا نہیں لگتا؟''

قدسیہ نے غور سے اُس کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل اُسی جیسا تھا۔ چہرے کی وہی ساخت اور داڑھی کا انداز بھی۔ وہ پُر ہیجان لہجے میں بے تکان بولنے لگی۔

''مگر مجھے تو کسی نے نہیں بتایا کہ تم — اتنے مشہور لکھنے والے یہاں آئے ہوئے ہو۔ تمھارے آنے کی اطلاع تو اخبار اور ریڈیو میں بھی آنی چاہیے تھی۔''

''تو تم نے اخباروں میں نہیں پڑھی؟'' وہ بدستور مسکرا رہا تھا۔

قدسیہ شرمندہ ہوگئی۔ اُس نے گھاس کا تنکا توڑ کر مروڑتے ہوئے کہا، ''میں باقاعدہ اخبار نہیں پڑھتی۔ ہمارے زنان خانوں میں باقاعدگی سے اخبار آتے کہاں ہیں۔ تم بتانا کہ کس تاریخ کو خبر چھپی ہے۔ میں پرانا اخبار منگوا کر ضرور دیکھوں گی۔''

''بھئی میں چھپ کر یہاں آیا ہوں۔ میں نے کسی کو اطلاع تھوڑا ہی دی ہے۔ میں پبلسٹی کی خاطر تو یہاں نہیں آیا۔ میں تو سیر کرنے، شکار کھیلنے، تتلیاں اور کہانیاں جمع کرنے آیا ہوں — بتاؤ تم ان میں سے کیا دے سکتی ہو؟''

وہ حیران سی ہوگئی — کہیں یہ غیر ملکی اُس سے کوئی ایسی ویسی بات تو نہیں کہہ رہا۔ بے حد سنجیدگی سے اُس نے کہا، ''میں کسی کو کیا دے سکتی ہوں۔ میری حیثیت تو اس پرندے کی سی ہے جسے تم پنجرے میں ڈال کر اپنے گھر میں لٹکا لیتے ہو۔''

''کیا تو خوش نہیں ہو؟''

''اتنا ہی جتنا وہ پرندہ ہوتا ہے۔''

اُسی وقت ایک آبی پرندہ دریا پر سے فضا میں اُڑا۔ قدسیہ کی نظریں حسرت سے اُس کو دیکھنے لگیں۔ اجنبی کے چہرے سے یکایک مسکراہٹ غائب ہوگئی اور الم اس کی نظروں سے جھلکنے لگا، ''اوہ یہ تو بے حد افسوس ناک بات ہے۔'' اُس نے کہا۔

یکایک لڑکیوں میں ہلچل سی مچی۔ ایک لڑکی نے گھبرا کر کہا، ''خان۔''

غیر ملکی اُٹھا اور تیز تیز چلتا ہوا واپس جا کر اپنی بنسی سنبھال کر بیٹھ گیا۔ قدسیہ عورتوں کے جھرمٹ میں اُس پگڈنڈی سے جو پہاڑ کے درمیان تقریباً چھپی ہوئی تھی، جلدی جلدی اُوپر چڑھ گئی۔ شہزور اگر اُسے دیکھ بھی لیتا تو چادر لپیٹے کوئی اجنبی عورت سمجھ کر نظر انداز کر دیتا۔

''میں ہیمنگوے ہوں، بھولی چڑیا۔'' بھوری داڑھی والے نے گھاس پر خوشی سے پُھدکتی ایک چھوٹی

سی چڑیا کو مخاطب کیا، ''اور چند دن کے لیے ہیمنگوے بن جانے میں ایسا حرج بھی کیا ہے!'' وہ ہنسا۔
دوسری طرف سے آتا شہزور خان اُسے تنہائی میں ہنستے دیکھ کر حیران ہوا۔ کیا عجب جو یہ غیر ملکی پاگل ہو، اُس نے دل میں سوچا۔

اُس غیر ملکی کا اصل نام اَرنسٹ ہیمنگوے نہیں، جان وِلسن تھا۔

جان کوئی دو ہفتے شہزور کے ہاں مہمان رہا تھا اور جب جانے لگا تھا تو بڑے اور چھوٹے خان نے اُسے کئی تحفے بھی دیے تھے۔ اُس نے رات ہی کو اپنی کار ہر طرح درست کر کے رکھ لی تھی اور میزبانوں سے وعدہ لے لیا تھا کہ رات کو کسی وقت یا منھ اندھیرے جس وقت بھی وہ روانہ ہوگا، وہ اُسے رخصت کرنے کی زحمت نہیں کریں گے۔ رخصت ہونے کی تقریب سونے سے پہلے انجام پا گئی تھی، اور جان جا کر تنہا اپنے مہمان خانے میں لیٹ گیا تھا اور ابھی سورج نکلنے میں کئی گھنٹے باقی تھے جب وہ اپنے سفر پر روانہ ہو گیا تھا۔

دیکھنے میں جان کی کار فاختئی رنگ کی ایک بوسیدہ سی ڈبیا نما گاڑی تھی جس کا پچھلا ونڈ اسکرین عہدِ قدیم کے روشن دانوں سے مشابہ تھا۔ صرف دو دروازے تھے اور پیچھے اٹرم سٹرم کسی بے ترتیب گودام کی طرح بھرا ہوا تھا۔ لیکن اُس کار کا انجن نیا اور نہایت قابلِ اعتماد تھا اور جان اس قدر تیز رفتاری سے اُسے چلا رہا تھا جیسے کاروں کی کسی بین الاقوامی ریس میں حصہ لے رہا ہو۔ ہاں چند سال پہلے اُس نے کاروں کی ریس میں بھی حصہ لیا تھا۔ صبح جس وقت پو پھٹ رہی تھی، وہ طورخم سے پاکستان کی سرحد میں داخل ہوئے تھے اور جب درّۂ خیبر پار کر کے پشاور کے علاقے میں داخل ہوئے تھے تو چھاؤنی سے بہت سے انگریز مرد، عورتیں اور بچے اُن کے استقبال کو پہنچے ہوئے تھے۔ مقامی لوگ بھی دو رویہ کھڑے تھے جنھوں نے کاروں کو دیکھ کر تالیاں بجائی تھیں۔ پہاڑی علاقہ اُس کے اپنے ملک جیسا تھا۔ گو سبزہ کم تھا — لوگ بھی گورے چٹے اور تن درست تھے اور ہلکی ہلکی سردسی صبح ملک کی صبح کی طرح سہانی تھی۔ یہ ریس نہ اُس نے جیتی تھی نہ جیتنے کا شوق تھا بس ایک اڈونچر میں شامل ہونے کا شوق تھا اور جب دل بھر گیا تھا تو وہ ریس چھوڑ چھاڑ کشمیر جنت نظیر کی سیر کو نکل گیا تھا۔

اس مرتبہ وہ پاکستان کی سیر کے لیے نکلا تھا اور اپنی بہن کی شادی میں شرکت کرنے کا ارادہ تھا کہ ایک نئے اڈونچر میں پڑ گیا تھا اور اس وقت کار چلاتے ہوئے وہ اسی روانی میں اپنی زبان میں بول رہا تھا۔ ''واہ وا کیا خوب صورتی ہے جسے جدید زندگی نے ذرا بھی نہیں بگاڑا۔ مگر کچھ دن بعد یہ ٹورزم والے، یہ پیسے کے لوبھی اسے بھی ستیاناس کر دیں گے۔ جگہ جگہ ہوٹل بن جائیں گے، دکانیں بن جائیں گی۔ اتنے ٹورسٹ آئیں گے کہ سڑکوں پر چلنے کی جگہ نہ رہے گی اور ہر طرف سوائے ٹورسٹوں

کے کچھ بھی دیکھنے کو نہ ملے گا جیسا کہ انگلینڈ اور یورپ میں ہوتا ہے کہ ہر جگہ سیاح سر پر سوار رہتے ہیں۔ ہر عمارت، ہر عجائب گھر اور ہر پتھر کو دیکھنے کا ٹکٹ لگ جاتا ہے اور خدا کی قسم پیسے خرچ کرتے کرتے آدمی بولا اُٹھتا ہے اور یہاں ہر چیز مفت ہے۔ اتنے دن میں یہاں رہا— کیا کھانے کھائے— بالکل شاہی پکوان۔ روز تلے ہوئے تیتر، بھنے ہوئے بٹیر، دریا کی تازہ ٹراوٹ اور مسلّم دُنبے کہ دُوسری جگہ کھاتا تو کنگلا ہو جاتا اور پیسے دینے پر اصرار کیا تو خان نے ایک ڈانٹ پلائی کہ پیسے دینے تھے تو کسی ہوٹل میں ٹھہرے ہوتے۔ ہم زمیں دار ہیں۔ ہمارے ہاں جانے کتنے آدمیوں کا کھانا روز اسی طرح پکتا ہے۔ کیا مہمان نوازی ہے، کیا قدریں ہیں۔ ہم لوگ تو انھیں سمجھ ہی نہیں سکتے برتنا تو رہا ایک طرف مگر اس کے ساتھ ہی کیا دقیانوسیت ہے، کیا جبر ہے۔ انسان انسان کا غلام اور بیویاں غلاموں سے بدتر۔ ہمارے ہاں کی عورتیں اگر تین دن اس طرح رہ لیں تو یقیناً کپڑے پھاڑ کر گھر سے نکل جائیں، یا اپنے شوہروں کو قتل کر دیں۔ ہاں قتل کر دیں اور اغلب خیال ہے کہ سزا سے بھی بچ جائیں۔ جب وہ بتائیں کہ شوہر انھیں یوں قید کر کے رکھتے تھے کہ انھیں باہر نکلنے اور کھلی ہوا کھانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ اپنی مرضی سے کوئی کام نہیں کر سکتی تھیں سوائے نوکروں اور مویشیوں پر حکم چلانے کے۔ بھئی بات کیا ہے، میں اتنی دیر سے بولے چلا جا رہا ہوں اور کوئی ہنکارہ بھی نہیں بھر رہا— کیا سب سو رہے ہیں؟''

اُس نے ایک طرف درختوں کے جھنڈ کے پیچھے لے جا کر گاڑی کھڑی کی اور پیچھے مڑ کر دیکھا۔

''کُڈسی! سو رہی ہو؟''

''کُڈسی۔'' اپنے نام کا یہ حال سن کر یقیناً قدسیہ کسی اور وقت ہنستے ہنستے دُہری ہو جاتی مگر ایسے وقت دھیرے سے اُس نے صرف اتنا کہا۔ ''نہیں، رو رہی ہوں—''

''کیوں؟'' وہ حیران ہو کر بولا، ''آزادی کی اتنی شدید خواہاں ہو کر روتی ہو، کسی پرندے کو آزاد ہوتے وقت روتے دیکھا ہے؟''

وہ اور ہچکیاں لینے لگی۔

''دیکھو، میرے پاس اتنا وقت نہیں ہے کہ تمھارا منھ دُھلاؤں یا تمھیں پانی پلاؤں۔ ابھی ہمیں بہت دور جانا ہے۔ اور اگر تم اپنا فیصلہ بدلنا چاہتی ہو تو بتا دو۔ میں گاڑی لوٹا لیتا ہوں— مجھ پر جو کچھ گزرے گی سہہ لوں گا— بولو، گاڑی لوٹا لوں؟''

''نہیں— خدا کے لیے ایسی باتیں مت کرو۔ ہم لوٹے تو ہم دونوں کو مار دیا جائے گا۔''

''تو پھر تم بھی حوصلہ کرو کُڈسی ڈیئر— ہم دونوں کی زندگی خطرے میں ہے تو پھر مجھے اطمینان

سے گاڑی چلانے دو — تم اُٹھ کر تھرماس سے پانی پی لو اور ماضی کو بھول کر مستقبل کے بارے میں سوچو۔''

اور پھر گاڑی سفیدے کے درختوں کے درمیان تیزی سے دوڑنے لگی۔ اب جان نے باتیں کرنی بند کر دی تھیں اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ بھی کیا احمق ہے کہ اِدھر جان پر بنی ہے اور وہ اِدھر اُدھر کی ہانک رہا ہے جیسے وہ کسی لڑکی کو لے کر ڈیٹ پر نکلا ہو۔ کم بخت اس اڈونچر کی عادت نے پہلے بھی کئی جگہ خوار کیا ہے اور آج تو اُس نے غضب ہی کر ڈالا تھا کہ ایک الھڑ لڑکی کی خاطر جان اور عزت ہی خطرے میں ڈال دی تھی۔

اور اب قدسیہ سامان کے انبار میں چھپی پچھلی سیٹ پر لیٹے لیٹے سوچ رہی تھی کہ ذرا حواس ٹھکانے ہوں تو وہ ازسرِنو سوچنا شروع کرے کہ اُس نے کیا کیا ہے اور اب اُسے کیا کرنا ہے — مگر جیسے ہی وہ سوچنا شروع کرتی لگتا جیسے دماغ میں دُھواں سا بھرا ہوا ہے۔ آتی سردیوں میں ایک دُھند سی پہاڑوں پر چھا جاتی ہے اور پتا نہ چلتا کہ پیچھے کیا ہے۔ طرح طرح کے الوژن ہوتے رہتے ہیں۔ لگتا ہے جیسے یہ پہاڑ نہیں محض دُھند ہے، یا کالی کالی گھٹائیں ہیں یا شاید گھنے درختوں کے سلسلے ہیں۔ اسی طرح قدسیہ بار بار سوچ رہی تھی، کیا یہ سچ مچ آزادی ہے یا محض آزادی کا الوژن ہے۔ یہ یقین اُسے کب اور کیسے ہوگا! اور اب وہ کہاں جا رہی ہے؟

یہ سب اتنی جلدی ہوا تھا کہ اُسے سوچنے سمجھنے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ ایک شخص نے اُس کو قید میں دیکھ کر ترس کھایا تھا اور اُسے آزادی دلانے کا وعدہ کیا تھا۔ اُس کے پاس کیوں، کب اور کیسے کا وقت نہیں تھا۔ اُسے صرف ایک موقع دیا گیا تھا — ''ابھی'' یا ''کبھی نہیں'' — ''کبھی نہیں'' کے خوف سے اُس نے بغیر زیادہ سوچے ''ابھی'' کے خلا میں چھلانگ لگا دی تھی اور اُسے کچھ خبر نہیں تھی کہ جب اُس کے پیر زمین پر ٹکیں گے تو وہ زندہ ہوگی یا مر چکی ہوگی۔ یہی تو وہ سوچنا چاہتی تھی کہ اگر وہ زندہ رہی تو کس ڈھب سے، اور مرنے سے بچنے کی کیا صورت ہو سکتی ہے۔ یہ سب اُسے تنہا سوچنا تھا اس لیے کہ جو شخص اُسے لے جا رہا تھا وہ تو صرف پنجرے کا در کھولنے والا تھا۔ اُڑنا — کہاں تک اُڑنا، یہ اُس کے اپنے اختیار میں تھا۔

وہ خواب میں اکثر اُڑا بھی کرتی تھی اور جب وہ اپنے خواب شہزور کو سناتی تھی تو وہ ان پر ہنستا تھا۔ اُس کے نزدیک وہ ہوتے ہی اتنے بے سروپا تھے۔ کبھی وہ خواب میں قیدی پرندوں کو آزاد کیا کرتی تھی اور انھیں نیلے آسمان کی وسعتوں میں اُڑتا دیکھ کر خوش ہوتی تھی اور کبھی دیکھتی کہ ایک پہاڑی سلسلے کی چوٹی پر وہ اکیلی گھومتی پھر رہی ہے۔ کچھ اور لوگ وہاں موجود ہیں لیکن اُس کے ہمراہ

کوئی نہیں ہے۔ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ بہت دیر سے وہاں ہے اور اب اُسے گھر جانا ہے۔ راہ بھٹکنے یا بھولنے کا احساس نہیں تھا۔ لیکن کہیں پہنچنے کی اہمیت کا احساس ضرور تھا اور وہ کسی بھی سمت چلنے کی بجائے پہاڑ پر سے چھلانگ لگا دیتی تھی اور اسی وقت اُس کی آنکھ کھل جاتی تھی۔ آخر میں وہ کہاں گری، اسے کبھی پتا نہ چلا — اور جب کہ اُس نے سچ مچ چھلانگ لگا دی تھی، اب بھی وہ لاعلم تھی کہ اُس کا یہ قدم آزادی اور زندگی کی طرف تھا یا بدنامی اور موت کی طرف۔

''اُٹھو، کڈسی ڈیئر!'' قدسیہ چونکی تو کوئی شخص ہلکے ہلکے اُس کے گالوں پر طمانچے مار رہا تھا۔ اُسے یک لخت بڑا غصہ آیا۔ لمحے بھر کو اُسے کچھ احساس نہ تھا کہ وہ کہاں ہے اور یہ کون شخص ہے۔ مگر فوراً ہی خود آگہی کی لہر اس کے ذہن میں جاگی جب اُس شخص نے کہا، ''اُٹھو— سفر کے شروع ہی میں بے ہوش ہونا شروع کر دو گی تو آخر تک کیا ہوگا۔ سوچو کڈسی، تم نے اتنا بڑا قدم اُٹھایا ہے۔ اتنا بڑا خطرہ مول لیا ہے تو ہمت کرو، ورنہ ہم دونوں کے لیے خطرہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہم اس گاڑی میں سفر نہیں کر سکتے ہمیں اپنی کار بدلنی ہوگی اور تھوڑا بہت اپنا حلیہ بھی۔''

''ہم کہاں ہیں؟'' قدسیہ نے دھوئیں بھرے ذہن کے ساتھ پوچھا۔

''ہم رسال پور چھاؤنی میں ایک دوست کے گھر میں ہیں۔ میں یہاں اپنی گاڑی گیراج میں بند کر دوں گا اور ہم دوست کی گاڑی میں سفر کریں گے۔ میں اپنے کپڑے تبدیل کروں گا اور تمھیں بھی کوئی اور کپڑے تبدیل کرنے ہوں گے۔ کیا تم میرے دوست کی بیوی کے کپڑے پہننا پسند کرو گی؟'' جان اُس سے پوچھ رہا تھا۔

''مجھے کچھ معلوم نہیں، تم جو کہو گے کرلوں گی۔''

''گڈ گرل۔''

تو وہ رسال پور آ چکے تھے۔ امان درہ، مالاکنڈ، تخی کوٹ، مردان، سب کچھ گزر چکے ہیں۔ امان درہ ریسٹ ہاؤس جو قلعے کے اندر تھا آسمان سے باتیں کرتا تھا اور جہاں سے میلوں تک شاداب زمینیں،

نہریں، پہاڑوں کے سلسلے اور درختوں سے ڈھکی سڑک نظر آتی تھی۔ یہاں کے مختلف برآمدوں میں بیٹھ کر اُس نے بابا اور اُن کے دوستوں کے ساتھ شطرنج کھیلی تھی۔ طلوع وغروب کی پینٹنگز بنائی تھیں اور ایک رات ٹھیک بارہ بجے چودھویں کے چاند اور اس کی پھیلی ہوئی دودھیا چاندنی میں آس پاس کے لینڈ اسکیپ کو پینٹ کیا تھا۔

اور ایک رات جب وہ مالا کنڈ کے سنگی قلعے میں ٹھہرے ہوئے تھے تو بڑا زبردست زلزلہ آیا تھا۔ گھبرا کر وہ باہر نکلی تھی تو اُس نے دیکھا تھا کہ ہر طرف پہاڑ اور پتھر ہیں یا قلعے کی اُونچی دیواریں ہیں، اندھیرے میں پہاڑیاں نہایت دیوزاد اور ہیبت ناک نظر آتی تھیں اور وہ واپس آن کر چپکے سے اپنے بستر پر لیٹ گئی تھی۔ تب اُسے محسوس ہوا تھا کہ قلعے میں تھوڑی سی ہلچل ہے لیکن ذرا دیر بعد ہی سناٹا چھا گیا تھا کہ یہاں کے لوگ ایسے جھٹکوں کے عادی ہو چکے تھے۔

دوسرے دن جب وہ مالا کنڈ کی بل کھاتی سڑک پر اُترے رسال پور کی طرف بڑھ رہے تھے تو درگئی کی نہر کی طرف وادی میں انھوں نے آسمان پر اور زمین پر ایک قوسِ قزح دیکھی تھی۔ ذرا آگے بڑھے تو ایسی ہی دوسری قوسِ قزح آسمان اور زمین پر موجود تھی — قدسیہ کو یہ بات عجیب لگی تھی کہ زمین پر لیٹی قوس کے سارے رنگ بھی اتنے ہی واضح تھے جتنے آسمان کی قوس کے۔ اس نے گاڑی روکنے کی فرمائش کی تھی۔ بابا اور وہ بہت دیر تک یہ رنگین کمانیں دیکھ کر خوش ہوتے رہے تھے۔

تو اب وہ رسال پور میں تھی جہاں امی اور ابا کے ساتھ وہ کتنے ہی سال رہی تھی۔ جہاں اُس کی امی اور بھائی کی قبریں تھیں اور اس کی ماضی کی یادیں تھیں۔ اس کا جی چاہا یہاں کی سڑکوں پر پہلے کی طرح سائیکل دوڑاتی جائے اور اپنے بوڑھے مارکر سے ملے جسے اُمید تھی کہ ایک دن مس خان ٹینس میں بڑا نام پیدا کرے گی اور پھر جا کر اپنی مدر سپیریئر کو حیران کر دے۔ کار سے اُترتے اُترتے اُس نے ایک نظر دُور دُور ڈالی۔ وہی سو سوگز کے فاصلے پر بنگلے تھے۔ وہی اُن کی کٹی ہوئی باڑھیں، وہی سنسان سڑکیں۔ پہلے بھی یوں ہی لگا کرتا تھا جیسے یہ جادو کی زد میں آیا ہوا کوئی شہر ہو کہ جہاں ہر چیز موجود ہو، بس رہنے والے طلسماتی طور پر کہیں غائب ہو گئے ہوں۔ گاڑی سے اُتر کر لڑکھڑاتی ہوئی وہ اندر چلی گئی تھی۔

منہ ہاتھ دھو کر، کپڑے تبدیل کر کے جب وہ ناشتا کرنے بیٹھی تھی تو اُس نے دیکھا کہ جان بالکل نئی جون میں آ چکا ہے۔ اُس نے اپنی داڑھی مونڈ دی تھی۔ کپڑے تبدیل کر لیے تھے اور بہت حد تک نیا آدمی لگ رہا تھا۔ دوست کی گاڑی میں وہ دوبارہ روانہ ہوئے۔ جلد سے جلد وہ زیادہ سے زیادہ سفر طے کرنا چاہتے تھے۔ نارتھ روڈ، براڈوے روڈ، فلیگ اسٹاف روڈ اور پھر اسپتال روڈ

اسی طرح غط، شیشم اور ہار سنگھار کے درختوں سے ڈھکی کھڑی تھیں۔ پولوگراؤنڈ میں لمبی لمبی گھاس تھی۔ میس میں یوکلپٹس کے درخت ہوا سے ہولے ہولے ہل رہے تھے اور بڑے بڑے گلاب باڑھ کے درمیان سے تاک جھانک کر رہے تھے مگر اب یہاں پر اُس کے ماں باپ اور بھائی میں سے کوئی بھی تو نہیں تھا۔

اور اب وہاں کیا ہو رہا ہوگا؟ پہاڑوں سے گھرے اُس کے گاؤں میں روزمرّہ کے کام کب کے شروع ہو چکے ہوں گے۔ دُودھ دوہ کر آ گیا ہوگا اور بڑی بڑی ہانڈیوں میں چولھوں پر رکھ دیا گیا ہوگا۔ رات کا جمایا ہوا دہی بلویا جا رہا ہوگا۔ جھاڑو دی جا رہی ہوگی۔ ابھی کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ کل سے شہزور خان اپنے کسی دوست کے بلاوے پر کوہاٹ گیا ہوا تھا، اور وہ ہمیشہ سے دیر سے سو کر اُٹھنے کی عادی تھی۔ شہزور خان کا کوہاٹ جانا بھی تو ''ابھی یا کبھی نہیں'' کا ایک زبردست جزو تھا۔ اُس کے فیصلے میں ایک اور بہت اہم رُکن ــــ پھر کب ایسا موقع آئے گا کہ کوئی شخص خطرہ مول لے کر اُسے رہائی دلانے پر آمادہ ہوگا اور اس کا شوہر گھر پر نہیں ہوگا۔ آدمی سب کچھ خود ہی تو نہیں کرتا، حالات کا بھی تو دخل ہوتا ہے۔ اگر اس کی قید میں حالات کا کچھ دخل تھا تو اُس کی رہائی میں بھی اُن کا کچھ نہ کچھ ہاتھ ضرور تھا۔

اور اب رسال پور دُور رہ گیا تھا۔ مُنّی سی کار تیزی سے بھاگ رہی تھی۔ قدسیہ کو معلوم تھا کہ اٹک کے پل پر پوچھ گچھ ہوتی ہے۔ اُس کو ابھی سے خوف محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی پل دُور تھا مگر دریا کے پار اٹک کے قلعے کی عمارتیں نظر آ رہی تھیں۔ درختوں کے جھنڈ میں سے اترتی سفید سڑک، ایک مسجد، چند بیرکیں اور دریا کے کنارے گول مضبوط فصیل سے ملا ہوا اسلحہ خانہ جو گرمیوں میں اتنا ٹھنڈا رہتا تھا کہ اکثر انگریز افسران محض اس کا تماشا کرنے آتے تھے۔

اٹک کے پل پر جس وقت کار ٹھہری اور جان نے اپنا پاس دکھایا تو قدسیہ نے اپنا سانس روک لیا۔ شاید کسی طرح اُن کو اطلاع ہوگئی ہو اور ابھی اُسے پہچان لیا جائے۔ بظاہر وہ دریا میں پڑنے والے گرداب کا نظارہ کر رہی تھی مگر اُس کے اپنے دل و ذہن میں خیالات کے خوف ناک بھنور بن رہے تھے۔ جس وقت کار دوبارہ چلی تو اُس نے اطمینان کا سانس لیا۔ جان نے بے فکری سے کہا، ''شک ہونے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ انگریزی کپڑوں میں اسکارف باندھے، دُھوپ کا چشمہ لگائے میرے برابر بیٹھی تم بالکل انگریز ہی تو لگ رہی ہو ــــ اور تمھیں معلوم ہے کُدسی میری بہن لِز ایک پاکستانی سے شادی کر رہی ہے، وہ بھی ایبٹ آباد کا رہنے والا ہے عُمر ــــ عمر خان، شاید تم اُسے جانتی ہو، لندن سے بیرسٹری کر کے آیا ہے وہ۔''

''عمر خان!'' لمحے بھر کو قدسیہ کے دل کی دھڑکن تیز ہوئی اور پھر سُست ہوگئی۔ اچھا تو عمر خان لز سے شادی کر رہا ہے۔ ٹھیک ہے۔ وہ تو مُدّت ہوئی اُس سے مایوس ہوچکی۔ اب یہ بتانے سے کیا فائدہ کہ عمر خان اُس کا کزن ہے۔ قدسیہ جواباً خاموش رہی تھی، اور جان بولتا رہا تھا۔ ''دونوں کی منگنی ہوچکی ہے۔۔۔ میں آیا تو سیر کے لیے تھا مگر اُن کی شادی میں شرکت کرنے کا بھی ارادہ تھا لیکن اب تو لگتا ہے کہ اس اڈونچر کی وجہ سے شاید مجھے سیدھا انگلینڈ جانا پڑے۔'' قدسیہ حیران تھی کہ اُس نے یہ کس طرح سوچ لیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ انگلستان تک جائے گی۔

''کُڈسی ڈیئر، تمھیں وَرڈز ورتھ بہت پسند ہے نا۔ ارے جب تم لیک ڈسٹرکٹ دیکھو گی تو اَش اَش کر اُٹھو گی۔ ورڈز ورتھ کے ڈَو کاٹج (Dove Cottage) پر تو تم عاشق ہوجاؤ گی۔ دوپہر کو جب گھاس پر گزوں لمبے لمبے سائے پڑتے ہیں تو گھاس بے حد خوب صورت لگتی ہے۔ شام کو جھٹ پٹے میں جب جھیلوں کا پانی پُرسکون ہوتا ہے تو جی چاہتا ہے آدمی خود بھی دَم سادھ لے، اور رات کو جب گاؤں کی روشنیاں پانی میں پڑتی ہیں اور سناٹا ہوتا ہے تو وہاں سے ہلنے کو دل نہیں چاہتا۔۔۔ اور ہاں ابھی تو تم نے لندن کو صرف گالز وردی، ورجینیا وولف اور فارسٹر کے ناولوں میں پڑھا ہے جب تم خود وہاں پہنچو گی تو تمھیں بڑا عجیب لگے گا۔ میں بھی جب پہلے پہل لندن گیا ہوں تو ہر سنے ہوئے نام پر ذہن میں گھنٹی سی بجتی تھی اور کوئی کہتا تھا، ''اچھا تو یہ ماربل آرچ ہے، اچھا تو یہ ٹاور برج ہے، اچھا تو یہ یہ ہے۔۔۔'' اور ایسی باتیں کرتے ہوئے قدسیہ کو یوں لگا جیسے جان کوئی چھ فُٹا مرد نہیں بلکہ اس کے بچپن کا کوئی ساتھی بچہ ہے جو چھٹی میں لاہور دیکھ کر آیا ہے اور اُسے بادشاہی مسجد، شاہی قلعے اور شالامار دیکھنے کے قصے سنا رہا ہے۔

اور ابھی ذرا کی ذرا وہ اُونگھی تھی کہ پھر جان کی آواز کان میں آئی، ''کُڈسی! تم نے سرخ رنگ کی یہ عجیب وغریب پہاڑیاں دیکھیں۔ ذرا باہر جھانک کر تو دیکھو کیسی عجیب شکلیں ہیں ان کی اور کتنی دُور دُور تک چلی گئی ہیں۔'' سرخ رنگ کی پہاڑیوں کا ذکر سن کر ہی قدسیہ کا دِل ڈوبنے لگا۔۔۔ ہاں اُسے خوب معلوم تھا کہ گلابی اور سرخ رنگ کی ان پہاڑیوں میں اَن گنت سلوٹیں، کھائیاں اور نالے نالیاں تھیں اور یہ سب بے آب وگیاہ اور بنجر تھے۔ اور ان کے درمیان سے گزرنے والی ریلوے لائن پر بہت سی سرنگیں تھیں اور اسی سڑک پر ایک بے حد تیز موڑ کے بعد یکایک ایک ریلوے کراسنگ آتی ہے۔ ان سب جگہوں کی نسبت اس کے ذہن میں خون سے تھی۔ اس کی نظر میں یہ پہاڑیاں اس لیے سرخ تھیں کہ انھوں نے اُس کی ماں کا خون پیا تھا۔ نہیں، آج کے دن وہ ان خونی پہاڑیوں کو ہرگز نہیں دیکھے گی۔ اس نے بدستور آنکھیں بند رکھیں اور جان کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ موت ہر رنگ

میں بھیانک اور مہیب ہوتی ہے۔ موت کے بارے میں اُس نے اکثر سوچا تھا۔ اسی کی طرح کیا وہ لمحوں میں ختم نہیں ہو سکتی تھی۔ ذرا سی ہمت کی بات تھی۔ اس کے گھر کے سامنے کی چٹانیں دریا میں کودنے کے لیے نہایت مناسب اور آرام دہ رہتیں ــــ مگر جس طرح وہ قید سے سمجھوتا نہ کر سکی اسی طرح موت سے بھی سمجھوتا نہ کر سکی۔ فی الحال وہ مرنا نہیں چاہتی تھی اور موت سے بھاگ کر وہ زندگی سے اپنا خراج مانگ رہی تھی۔ اُس کے ہاتھ کیا آئے گا ــــ اللہ کے سوا یہ بات کون جان سکتا ہے!!

راول پنڈی ہمیشہ کی طرح کچھ پُرسکون، تھوڑا سا ہنگامہ پرور، کچھ خوب صورت، زیادہ بدصورت، کچھ نیا مگر زیادہ تر پرانا اپنی جگہ موجود تھا۔

یہاں بھی وہ کئی مرتبہ آئی تھی۔ مری جاتے ہوئے بابا اکثر یہاں ٹھہرا کرتے تھے۔ رات کو انگریزی پکچر دیکھتے، ٹھنڈی سڑک پر ٹہلتے اور صدر کی واحد بڑی دکان سے شاپنگ کرتے۔ لاہور اگر بتِ طناز تھا تو پنڈی گاؤں کی الھڑ مٹیار — مگر اب اس میں خاصی تبدیلی آ گئی تھی۔ کئی نئی دکانیں، نئی عمارتیں، نئے پٹرول پمپ بن گئے تھے۔ سڑکیں چوڑی ہو گئی تھیں۔ ہاں زندگی میں تبدیلیاں تو آتی ہی ہیں، شہروں میں بھی تبدیلیاں آتی ہیں۔ مگر اس کے سسر جیسے لوگ گاؤں میں کسی قسم کی تبدیلی پسند نہیں کرتے۔ آج بھی ان کے گاؤں میں کسی لڑکی کو اسکول کی ہوا نہیں لگی تھی۔ کوئی لڑکی صاف اُردو نہیں بول سکتی تھی اور کسی کو یہ حق نہیں تھا کہ اپنی شادی کے معاملے میں زبان کھولے۔ ابھی اس کی اپنی ملازمہ گل صنوبر کی شادی بڑے خان نے پچپن سالہ ایک شخص سے طے کر دی تھی۔ قدسیہ نے اُس کی مخالفت کی تھی تو نہ صرف بڑے خان کو بلکہ مغربی تعلیم حاصل کیے ہوئے شہزور خان کو بھی یہ بات بہت ناگوار گزری تھی۔ قدسیہ کے ساتھ رہ کر آزاد خیالی کے کچھ جراثیم گل صنوبر میں بھی سرایت کر گئے تھے کہ نکاح کے وقت اُس نے بھی ہاں کر کے نہیں دی تھی اور بعد میں اکثر اس کی ساتھنیں اُس کا مذاق اڑاتی تھیں کہ تیرا نکاح آدھا ہوا ہے۔ گل صنوبر بڑے دُکھ سے قدسیہ سے کہتی تھی، ”بی بی، یہاں تو یہی ہوتا ہے۔ ہر لڑکی کی شادی بڈھے سے ہوتی ہے اس لیے کہ بوڑھا ہی اِس قابل ہوتا ہے کہ لڑکی

کے ماں باپ کو پیسا دے سکے۔ جوان بے چارے پیسے کہاں جوڑ پاتے ہیں اور جب بڈھا مر جاتا ہے تو عورتیں جوان لڑکوں سے شادیاں کر لیتی ہیں مگر اب وہ خود بوڑھی ہو چکی ہوتی ہیں اِس لیے لڑکے انھیں چھوڑ کر کسی اور کے چکّر میں پڑ جاتے ہیں۔"

قدسیہ کے گھر سے نکلنے کی بات صرف گل صنوبر کو معلوم تھی۔ قدسیہ سوچ رہی تھی۔ خدا جانے ان کی غیر حاضری پر اُس پر کیسے کیسے ستم توڑے جا رہے ہوں گے۔ اُس کی پیٹھ داغی جا رہی ہوگی یا اُس کی زبان جلائی جا رہی ہوگی کہ کسی طرح تو وہ اس راز سے پردہ اُٹھائے کہ اس کی مالکن کب اور کس کے ساتھ بھاگی۔ کسی کے ساتھ بھاگنے کا تصور اس علاقے میں بالکل نیا نہیں تھا۔ گو بھاگنا جان جوکھم کا کام تھا تب بھی لڑکیاں کسی نہ کسی کے ساتھ بھاگ ہی جاتی تھیں۔ وہ بھی کسی کے ساتھ بھاگی تھی یہ اور بات ہے کہ اس میں اُس شخص غریب کا زیادہ ہاتھ نہیں تھا۔ دُنیا تو یہی سمجھے گی کہ اُس کے کسی پڑوسی زمیں دار کی ساتھ تعلقات رہے ہوں گے۔ اُس علاقے میں پڑوس بھی بہت دور دور تھے۔ خدا جانے اس سلسلے میں کس کس کے نام لیے جا رہے ہوں گے۔ جب کہ حقیقت یہ تھی کہ قدسیہ کی نظر میں پڑوس میں ایک شخص بھی تو ایسا نہیں تھا جس کے ساتھ وہ بھاگ سکے۔ ہوسکتا ہے اُس کا سسر — وہ گھاگ خان سمجھ گیا ہو کہ اُس کے غائب ہونے میں ضرور اُس غیر ملکی کا کوئی ہاتھ ہے جو ٹراؤٹ پکڑ کر بھوننے کے بہانے سارا سارا دن دریا کے کنارے بیٹھا مکھیاں مارتا رہتا تھا۔

اب تک یقیناً پولیس کو رپورٹ ہو چکی ہوگی۔ تمام اہم راستوں کی ناکہ بندی کر دی گئی ہوگی۔ اب اگر وہ پکڑے گئے تو کیا ہوگا؟— دیوار — اس کے آگے بس دیوار — آگے وہ کچھ سوچنا نہ چاہتی تھی کیوں کہ اُسے معلوم تھا کہ اس کے آگے موت ہے۔ خونی موت، یقینی موت! — مگر ابھی تو وہ زندہ ہے۔ وہ جیتے جی موت کے بارے میں نہیں سوچے گی۔ قدسیہ نے اپنا سر جھٹکا اور سامان کے انبار میں سے تھوڑا سا سر نکال کر باہر دیکھا۔ وہ گندم کے پودے جو سرحد کے علاقے میں بالشت بھر کے تھے، پنجاب کی گرمی میں دو فٹ اونچے ہو چکے تھے۔ ان کی سبز بالیں ہوا میں جھوم کر اپنے اوپر پڑتی دھوپ میں جیسے کھلی پڑ رہی تھیں۔ درختوں میں چھپے ہوئے رہٹ کی روں روں، اُن کے آگے کھڑے ہوئے مویشیوں کا گیان دھیان، مرغیوں اور بکری کے بچوں کا البیلاپن اور بوڑھوں کے حقوں کی گڑگڑاہٹ، سب فضا میں رچی بسی جیسے صدیوں کے سفر میں ایک اَن مٹ نقش کی طرح قائم و دائم تھی۔ ایسے میں اُن کی کار تیزی سے لڑھکتی ایک نامعلوم منزل کی طرف بڑھ رہی تھی۔ کیوں نہ کراچی میں وہ اپنے ماموں کے ہاں چلی جائے۔ قدسیہ نے سوچا۔ وہ شہر میں رہتے ہیں یقیناً آزاد خیال ہوں گے۔ شاید وہ اُس کے مسئلے کو سمجھ پائیں۔ چلتے ہوئے قدسیہ نے امی کے کاغذات میں سے

ڈھونڈ کر انور ماموں کا پتا ڈائری میں لکھ لیا تھا۔ وہ کبھی کراچی نہیں گئی تھی مگر اُسے یہ معلوم تھا کہ اُس کے ایک ماموں وہاں رہتے ہیں، جن کی امی سے خط وکتابت تھی۔ وہ اکثر انھیں کراچی آنے کی دعوت بھی دیتے تھے۔ اس سے زیادہ اُن کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی اور ان کی افتادِ طبع کے بارے میں تو بالکل کچھ بھی نہیں۔ خدا جانے اُن کا ردِعمل کیا ہو۔ ایک غیر ملکی کے ساتھ گھر سے بھاگنے کی خبر سن کر وہ کیا کریں!— خیر کراچی تو ابھی بہت دُور ہے، ابھی تو وہ لاہور بھی نہیں پہنچے تھے۔

لاہور!— جہاں وہ والدین کے ساتھ بہت بچپن میں دو ایک بار آئی تھی۔ لاہور کی ہر چیز اسے خواب کی طرح یاد تھی۔ ہر چیز خوب صورت تھی مگر دُھندلی۔ وقت اور فاصلے کا کوئی تصور نہ تھا۔ کون سی عمارت کہاں تھی، کس سمت میں تھی، اُسے کچھ یاد نہ تھا۔ البتہ مختلف جگہوں کے کچھ حصے اُس کے ذہن میں محفوظ رہ گئے تھے۔ ایک باغ تھا جہاں اونچے اونچے درختوں میں اُلٹی لٹکی چمگادڑیں چیں چیں کرتی اپنے پر پھڑ پھڑا رہی تھیں۔ شاید اسی باغ میں جب وہ شام کو گئے تھے تو اُس نے دیکھا تھا کہ گھاس میں سیکڑوں دیے سے جل رہے تھے۔ جیسے جادو کے زور سے وہ ہوا میں اُڑ جاتے اور پھر گھاس پر آ جاتے اور دوبارہ ہوا میں معلق ہو جاتے۔ بہت دیر بعد اسے اندازہ ہوا تھا کہ وہ دیے نہیں جگنو تھے۔ روشنی کے ساتھ ایک اور تاثر بھی وابستہ تھا۔ محل کا ایک کمرہ جس میں شیشے ہی شیشے جڑے ہوئے تھے۔ اُن کے ساتھ پھرنے والے گائڈ نے ایک مشعل جلا کر گھمائی تھی تو چکر پھیری کھاتی ہوئی مشعل کی روشنی میں آئینے کے یہ ٹکڑے ہزاروں لاکھوں تاروں کی طرح جھلملا اُٹھے تھے۔ اسی طرح اُس کے ذہن میں زیرِ زمین قلعے کی سُرنگوں کا وحشت ناک منظر تھا۔ جس کے اندھیرے میں بابا نے اپنا نیا رومال جلا دیا تھا محض اُس کو سرنگ کا تاثر بتانے کے لیے۔ اور ایک ہی جڑ سے پھوٹنے والے گلدستے کی طرح سجے ہوئے کھجور کے درخت بھی تھے۔ محرابوں اور طاقوں کی لمبی لمبی قطاریں بھی تھیں اور کس مپرسی کی حالت میں کبوتروں کی بیٹوں سے اَٹی ہوئی ایک قبر بھی تھی جس پر فارسی کا کوئی شعر لکھا ہوا تھا۔

بابا اور امی بن سنور کر اپنے دوستوں کے ساتھ ہاتھی دانت کی سی عمارت والے کلب میں چلے جاتے تھے اور وہ گھر کے بچوں اور نوکروں کے ساتھ گھر پر رہ جاتے تھے۔ شام کو آیا ان دونوں بہن بھائیوں کو سیر کو لے جاتی تھی اور وہ انگریز جوڑوں اور سائیکل پر سَر سَر پھرنے والے اُن کے بچوں کو تکا کرتے تھے۔ چھاؤنی میں صرف ایک بڑی سی دکان تھی جہاں سے وہ چاکلیٹ اور ٹافیاں خرید کر کھاتے تھے مگر یہ سارے مقام جو اس کے ماضی سے متعلق تھے، اب کیوں یاد آ رہے تھے! وہ مستقبل میں سفر کر رہی تھی یا ماضی میں؟ وہ تو آگے جانا چاہتی ہے۔ یہ ماضی اس کا دامن کیوں تھام رہا ہے!!

لاہور گزر گیا۔ منٹگمری پہنچنے سے پہلے سرسبز کھیتوں اور نہروں پر سے آتی ہوئی ہوا نے قدسیہ پر غنودگی طاری کر دی۔ جان نے لاہور کی ایک گلی سے گزرتے ہوئے کچھ کھانے کی چیزیں خریدی تھیں، جو ان دونوں نے کار ہی میں کھائی تھیں۔ جان کار چلاتے ہوئے منہ بھی چلا رہا تھا اور اسے بشاش رکھنے کی کوشش میں باتیں بھی کر رہا تھا۔ جب قدسیہ کی طرف سے ہوں ہاں بھی بند ہوئی تو وہ خاموش ہو کر پوری توجہ سے کار چلانے لگا۔

قدسیہ کی آنکھ کھلی تو ملتان کا علاقہ تھا۔ ریت کے ٹیلے سفید دھوپ میں جگمگ جگمگ کر رہے تھے۔ ریت میں ملے ہوئے ابرک کے ذرات جن کے بارے میں بچپن میں اُس نے سنا تھا کہ یہ قارون کے خزانے کی باقیات ہیں جو اونٹوں سمیت زمین میں دھنس گیا تھا۔ ریت کے ٹیلوں پر بنی ہوئی لہریں سمندر کی لہروں سے مشابہ تھیں اور اُن کی باریک ریت اُس وقت بھی ڈھیرے ڈھیرے ایک جگہ سے اُڑ کر دوسری جگہ گر رہی تھی، اتنی خاموشی اور آہستگی سے، جیسے آسمان سے شبنم گر رہی ہو۔ کھجوروں کے جھنڈ سر جوڑے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ نوکیلی خشک جھاڑیاں پانی کی آس میں آسمان کی طرف دیکھ رہی تھیں اور ببول کے درخت اپنی ملیالی شاخوں کے ہاتھ اُٹھائے دعائے استسقا میں مصروف تھے۔ آسمان شفاف، چمکیلا اور بے رحم حد تک گرم تھا۔

قدسیہ کے کانوں میں ہلکی ہلکی گھنٹیوں کی آواز آئی۔ اونٹوں کے قافلے — اُس کے ذہن نے کہا۔ ہر وہ آواز، جس کا تعلق ماضی سے ہو، دل میں ایسی ہی گھنٹیاں بجاتی ہے ٹن ٹن ٹناٹن۔ اس کے

بابا چند مہینے اس علاقے میں بھی رہے تھے۔ جب وہ ملتان کے بارے میں کچھ یاد کرتی تو شہر کی تنگ گلیاں، تاریک بازار، زرد اور سرخ آندھیاں، پُراسرار مزار اور گدڑیوں میں چھپے ہوئے فقیر یاد آتے۔ ان میں سب سے خوش گوار یاد ان گھنٹیوں کی تھی جو شام ڈھلے سے رات گئے تک کہیں بہت دُور سے شروع ہو کر بہت دیر تک آیا کرتی تھی اور جن کو سن کر ہمیشہ اسے اقبال کا ایک مصرع یاد آیا کرتا تھا جس کے معنی بھی اُس وقت اُسے پوری طرح نہ آتے تھے:

تیز ترک گامزن منزلِ ما دُور نیست

اُونٹوں پر قافلے آج بھی گزر رہے تھے۔ اونٹوں پر بندھی ہوئی اُلٹی چارپائیوں پر عورتیں اور بچے مزے سے ہلتے چلے جا رہے تھے۔ اس علاقے کے مردوں اور عورتوں کے تیکھے نقوش دُھوپ کی حدت سے سنولائے ہوئے تھے۔ شاید اسی دُھوپ کی شدت نے ببول کی چھال کو بھی سیاہ کر دیا تھا۔ ریت کے ٹیلوں میں صرف ببول کے درختوں کا چھدرا سایہ تھا جو ریت کی لہروں پر سیاہ دھبّوں کی شکل میں لیٹا ہوا تھا۔

یکایک قدسیہ کا جی چاہا، کار سے اُتر کر ان قافلے والوں کے ساتھ چارپائی پر جا بیٹھے اور کہے، میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی۔ مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ صرف آزادی اور گُم نامی — مگر یہ دو چیزیں بھی کتنی مشکل سے ملتی ہیں۔ ہر شخص دوسرے کو جاننا پہچاننا چاہتا ہے۔ یہ سب جو ایک دوسرے کو جانتے پہچانتے ہیں، کس مزے سے ساتھ ساتھ جا رہے ہیں۔ اگر میں اُن سے کہوں کہ میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گی تو ان میں ہلچل مچ جائے گی۔ یہ کون ہے! — ہمارے ساتھ کیوں جانا چاہتی ہے؟ مرد پکڑے جانے کے خوف سے لرزنے لگیں گے۔ عورتیں شک اور رقابت سے جل اُٹھیں گی۔ نہیں دُنیا میں مکمل گم نامی حاصل کرنا بھی شہرت حاصل کرنے سے کم مشکل نہیں ہے۔

شام ہوئی۔ اُفق پر سورج کا بڑا سا تھال نیچے سرکنا شروع ہوا اور دیکھتے دیکھتے غائب ہو گیا۔ آسمان پر گہری گل اناری، سرمئی اور سفید لکیریں سی پڑی رہ گئیں جو آہستہ آہستہ تاریکی میں مدغم ہونے لگیں۔ مگر وہ چلتے رہے۔ بڑھتی رات نے قدسیہ کے دل کی ہیبت بڑھا دی تھی۔ مگر اب اُس کے لیے کوئی اور راستہ نہ تھا۔ کبھی کبھی سامنے سے آتی ہوئی کسی گاڑی کی روشنی اس کی آنکھوں پر پڑتی اور پھر اندھیرا چھا جاتا۔ آدھی رات کا وقت ہو گا۔ جب قدسیہ نے محسوس کیا کہ کار سڑک چھوڑ کر کسی کچے راستے پر ہو لی ہے اور پھر ایک جگہ کھڑی ہو گئی ہے — پچھلی سیٹ پر لیٹے لیٹے ذرا سا سر اُٹھا کر اس نے دیکھا۔ شاید کوئی ریسٹ ہاؤس تھا۔ چاروں طرف اُونچے اُونچے درخت کھڑے تھے۔ عمارت کے پاس قدِ آدم باڑ تھی اور برآمدے میں زرد رنگ کی مردہ سی روشنی تھی۔

''تم چپ چاپ لیٹی رہنا، بولنا مت۔'' جان نے قدسیہ سے کہا۔ پھر اُتر کر چوکیدار کو بلایا۔ چوکیدار نے سامان نکالنے کی پیش کش کی تو جان نے اُردو میں کہا، ''نہیں سامان نکالنے کی ضرورت نہیں۔ صبح مجھے بہت جلدی جانا ہے۔ تم میرے لیے کھانے کا بندوبست کرو۔ اگر کچھ نہیں ہے تو کچھ انڈوں کا آملیٹ اور روٹی یا پراٹھے بنا دو جلدی — اور ایک کمرہ سونے کے لیے ٹھیک ٹھاک کر دو۔''

قدسیہ نے محسوس کیا کہ جان چوکیدار کو یہ تاثر دے رہا ہے جیسے وہ تنہا ہے۔ اُس نے دو آدمیوں کے کھانے کے لیے نہیں کہا تھا اور سونے کے لیے بھی ایک ہی کمرہ درست کروایا تھا۔ جب چوکیدار کمرے میں کھانا رکھ کر چلا گیا تو جان نے اُس سے کہا کہ اب وہ آرام کرے اور صبح کو برتن اُٹھالے۔ چوکیدار کے رخصت ہونے کے بعد وہ چپکے سے قدسیہ کو اندر لے گیا اور دروازہ بند کرنے سے پہلے اُس نے کہا، ''کڈی! میں ایک بات صاف کر دینا چاہتا ہوں۔ میں مرد ہوں اور سب مرد ایک سے ہوتے ہیں۔ کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا، جہاں تک اُن کی جبلت کا تعلق ہے۔ تمھیں یہ بھی معلوم ہے کہ ہم نے زبردستی ملکوں پر قبضے کیے ہیں۔ کالونیاں بنائی ہیں اور لوگوں کا استحصال کیا ہے مگر ہم عورت پر — اس کی مرضی کے بغیر قبضہ کرنا اپنی ہتک سمجھتے ہیں۔''

جان نے اندر سے ریسٹ ہاؤس کے سارے دروازے بند کر لیے تھے۔ ان دونوں نے مل کر خاموشی سے کھانا کھایا تھا اور تب جان نے کہا تھا، ''اب تم آرام سے سو جاؤ، دروازہ اندر سے بند کر لو۔ اِس ریسٹ ہاؤس میں اور بھی کئی کمرے ہیں، میں کہیں بھی پڑ رہوں گا۔ آج تو مجھے سولی پر بھی نیند آ جائے گی۔ کیوں کہ میں بے حد تھکا ہوا ہوں۔''

اور پھر وہ خدا جانے کون سے کمرے میں جا کر پڑ گیا۔ قدسیہ اندر سے دروازہ بند کر کے سونے کی کوشش میں پڑی جاگتی رہی۔ لیٹے لیٹے وہ تھک گئی — نیند کا دُور دُور پتا نہ تھا۔ اُس نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ چاندنی رات تھی اور چاروں طرف سناٹا۔ ایک پتا بھی نہیں ہل رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ ریسٹ ہاؤس آبادی سے بہت دُور بنا ہوا ہے۔ کہیں کوئی آواز نہ تھی سوائے دریا کے بہنے کی مسلسل آواز کے، جو خاموشی کا حصہ بن گئی تھی۔ دریا اُس کے غسل خانے سے چند قدم کے فاصلے پر تھا۔ دروازہ کھول کر پچھلی پگڈنڈی سے نیچے اُتر کر وہ دریا کے کنارے بیٹھ گئی۔ اُس وقت اُس کے دل کو کچھ ڈھارس سی تھی۔ جو کچھ ہوا، اچھا ہی ہوا۔ اتنے دن جس آزادی کے خواب دیکھے تھے، آخر کار اُسے مل گئی تھی۔ اب وہ اپنی زندگی کو نئے ڈھب پر چلائے گی۔ اُسی وقت آہٹ سنائی دی۔ ایک سایہ پگڈنڈی پر چلتا ہوا اُسی سمت آ رہا تھا۔ خوف سے اس کا لہو منجمد ہونے کو تھا کہ جانی پہچانی آواز آئی، ''کڈی — تم یہاں ہو۔ رات کو تمھارا باہر نکلنا ٹھیک نہیں۔''

''دل بہت گھبرا رہا تھا۔ پانچ منٹ کے لیے تازہ ہوا کھانے نکل آئی تھی۔''

جان آہستہ سے اس کے پاس آ کر بیٹھ گیا، اور بولا ''اب تھوڑی دیر میں ہمیں پھر روانہ ہونا ہے۔ کُڈسی کیسا لگ رہا ہے؟ جیسے ہم دو تنکے ہوں اور پانی کے دھارے پر بہتے چلے جا رہے ہوں۔ کبھی کبھی تو میں بہت تھرلڈ (thrilled) محسوس کرتا ہوں۔''

''کیا تمھیں ڈر نہیں لگ رہا؟'' قدسیہ نے پوچھا۔

''ڈر کے ساتھ ہی تو تھرل (thrill) محسوس ہوتا ہے۔ میں ہیمنگوے نہ سہی مگر یہ تو مانو گی کہ مصنف بھی ہوں، شکاری بھی اور ایڈونچرر بھی۔ تمھیں کیا محسوس ہو رہا ہے؟''

''میں گھر سے نکلی تھی تو لگا تھا جیسے دُھند میں کھڑی ہوں اور اب بھی دُھند ویسی کی ویسی ہے۔ آزادی کا احساس تو ہے مگر جب آئندہ کا سوچتی ہوں تو۔۔۔''

''سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایک دفعہ تم مضبوط ہو جاؤ پھر تم آزادی کے لیے لڑ سکتی ہو۔ یہ بیسویں صدی ہے۔ کوئی انسان کسی کو باندھ کر نہیں رکھ سکتا۔ وہاں تم اُن کے چنگل میں تھیں۔ اب تم صاف کہہ سکتی ہو کہ میں اس گھٹن میں نہیں رہ سکتی۔ آزادی، کھلا آسمان اور صاف ہوا پر سب کا حق ہے۔ تم اپنا حق مانگنا، قانون اور انصاف تمھارے ساتھ ہوگا۔'' وہ بولے جا رہا تھا اور قدسیہ سوچ رہی تھی، آزادی سی آزادی! رات کے وقت گھر سے سیکڑوں میل دُور ایک اجنبی کے ساتھ وہ دریا کے کنارے ریت پر بیٹھی ہے۔ یہ خواب ہے یا حقیقت۔ دریا ان سے بے نیاز اپنی دُھن میں مست بہتا چلا جا رہا تھا، جیسے اسے کہیں پہنچنے کی جلدی ہو۔

''کُڈسی ڈیئر تم گھبراؤ نہیں۔ کراچی پہنچ کر کچھ کریں گے۔''

''میں کچھ کرنا نہیں چاہتی۔۔۔ میں بس کھو جانا چاہتی ہوں۔'' قدسیہ نے دھیرے سے کہا۔

''کھو جانا چاہتی ہو!۔۔۔ کہاں؟''

''کراچی میں۔۔۔ کراچی تو بڑی جگہ ہے، وہاں بہت بھیڑ بھڑکا ہے۔ میں وہاں ایسے گم ہو جانا چاہتی ہوں کہ کسی کو پتا نہ چلے کہ میں کبھی تھی بھی۔۔۔ خود مجھے بھی نہیں۔''

''نہیں۔۔۔ یہ نہیں ہُوا کرتا جناب۔۔۔ میں تمھیں بتاؤں کہ آج کا انسان کھو نہیں سکتا۔ ایک زمانے میں ایسی باتیں میں نے بھی سوچی تھیں کہ آدمی بس ٹرین میں بیٹھے اور چھوٹے سے گم نام اسٹیشن پر اُتر کر کھو جائے۔ مگر میں نے دیکھا کہ آج کا آدمی نہ جرمنی کے کالے جنگلات میں کھو سکتا ہے نہ افریقا کے سبز جنگلات میں۔ ہر جگہ کا چپہ چپہ کسی نہ کسی کی ملکیت ہے۔ لوگ پوچھتے ہیں کہاں سے آ رہے ہو، کہاں جا رہے ہو؟ کسی ملک میں وہاں کی حکومت کی اجازت کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ وہ

زمانہ جب لوگ بن میں ایک کٹیا ڈال کر ہرن کا شکار کھیلتے تھے، اب صدیوں پیچھے رہ گیا ہے۔''

''جنگلوں میں نہیں، شہروں میں تو انسان کھو سکتا ہے۔''

''مشکل ہے۔ جہاں جاؤ گی لوگ سوچیں گے یہ اکیلی جوان، خوب صورت عورت کون ہے، کیا کرتی ہے، کہاں رہتی ہے؟ پڑوسی پوچھیں گے کہاں سے آئی ہو؟ کیا کرتی تھیں؟''

''میں عورتوں کے کسی ادارے میں پڑ رہوں گی۔ میں نے سنا ہے وہاں بے سہارا عورتوں کے لیے ایسے ادارے ہیں۔''

''پڑ تو سکتی ہو مگر کھو نہیں سکتیں، کنکر پتھر تو سڑک پر، نالی یا گھر میں پڑے رہ سکتے ہیں۔ مگر ہیرے کی چمک لوگوں کی نظروں سے کیسے چھپ سکتی ہے۔ تم ہی بتاؤ کیا میں مبالغہ کر رہا ہوں؟''

تب بات کی سچائی قدسیہ کے دل میں چبھ گئی۔ اگر وہ معمولی شکل و صورت کی ہوتی، ادھیڑ عمر ہوتی تو شاید کراچی شہر کی گلیوں میں خود کو کہیں چھپا لیتی مگر اب کہ وہ جوان، خوب صورت اور غیر ملکی کپڑوں میں ملبوس ہے، کسی بڑے ہوٹل میں تو شاید چھپ سکے، کراچی کی گلیوں میں نہیں چھپ سکتی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ چاندنی خاموش تھی۔ ذرا اسی روانی سے بہہ رہا تھا۔ دریا کے کنارے سرکنڈے ہوا سے نہیں، اپنے ہی بوجھ سے آہستہ آہستہ ہل رہے تھے۔ قدسیہ سر جھکائے ریت پر غیر شعوری طور پر انگلیاں پھیرتے ہوئے رو رہی تھی۔ جان نے اُسے روتے ہوئے دیکھا اور دُکھ سے کہا۔

''کڈسی، کیا میں تمھاری کوئی مدد نہیں کر سکتا؟ ــــ یقین کرو میرا دل تمھاری ہم دردی ــــ تمھاری دوستی سے بھرا ہوا ہے ــــ میں سوچتا ہوں کہ اگر میری بہن پاکستانی سے شادی کر سکتی ہے تو کیا میں نہیں کر سکتا ــــ کڈسی ڈیئر آئی لائک یو ــــ آئی ــــ''

قدسیہ نے کوئی جواب نہ دیا۔ جان بھی خاموش ہو گیا۔ دریا بہتا رہا۔ ہوا سسکتی رہی۔ چاندنی پھیلی رہی۔ یکایک آسمان پر ایک سیاہ بادل کے ٹکڑے نے چاند کو ڈھانپ لیا۔ اسی وقت کسی نے پیچھے سے یکایک قدسیہ کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ ہاتھ کی گرفت سخت تھی۔ وہ چونک کر پلٹی۔ تب کسی نے اس کے منھ پر سختی سے ہاتھ رکھا۔ اس کے اُوپر کوئی چیز پھینکی اور بورے کی طرح اُٹھا کر اسے کندھے پر ڈال لیا اور پھر اسے یاد نہیں کہ کیا ہوا۔

وہ اندھیرا جب اُس کے اُوپر کپڑا ڈال کر بورے کی طرح اُسے اُٹھایا گیا تھا، ہمیشہ کے لیے قدسیہ کا مقدر بن گیا۔ وہ چڑیا جو آسمانوں کی پرواز کو نکلی تھی، کھائی میں گری تڑپتی رہی۔ آسمانوں کی پرواز تو کیا ان کا تصور بھی اس کے لیے گناہ ٹھہرا۔ اس اندھیرے میں جہاں دن اور سال کی تمیز مٹ

گئی تھی۔ اس کے شوہر کی ایک آواز گونجی تھی، ''سچ سچ بتاؤ کیا اس نے تمھیں ہاتھ لگایا؟''

قدسیہ جو بس اپنے انجام کی منتظر تھی اور دبدھے میں رہنا نہیں چاہتی تھی، وہ جسے خود پر اتنا اعتماد تھا کہ یہ سوال ہی اس کے لیے بے معنی تھا، سوچنے لگی کہ اس سوال کا جواب کس انداز میں دے۔ یکایک اس کے ذہن میں جان کا ایک جملہ گونجا، ''مگر ہم لوگ عورت پر اُس کی مرضی کے بغیر قبضہ کرنا اپنی ہتک سمجھتے ہیں'' — اور اس نے بڑے اعتماد سے کہا، ''نہیں، وہ مرد جیسے بھی ہوں، عورت کو اُس کی مرضی کے بغیر ہاتھ لگانا بہت بُرا سمجھتے ہیں۔''

اور جیسے کسی نے خان کے طمانچہ جڑ دیا ہو۔ وہ اندھیری کوٹھری میں زخمی شیر ببر کی طرح تڑپا اور غرایا۔ ''اچھا تو یہ بات ہے۔ آج سے کسی عورت کی مرضی کے بغیر اسے ہاتھ لگانا مجھ پر بھی حرام ہے۔''

اس نے دھڑ سے دروازہ بند کیا اور باہر چلا گیا۔ قدسیہ آنے والی موت کا انتظار کرتی رہی۔ اب احتجاج کا کوئی فائدہ نہیں۔ چڑیا کے لیے اُڑنا، جہاں تک بھی اڑ سکے، اس کی فطرت ہے۔ مگر جب اسے پر قینچ کر دیا جائے تو کیا موت اس کے لیے بہتر نہیں ہے؟ اس کے لیے موت ہی تجویز کی گئی تھی مگر ساس نے یہ کہہ کر اس کے لیے موت کا دروازہ بھی بند کر دیا کہ ''سوچ لے، اس کے ساتھ ہی تو اپنے بچے کو بھی مار دے گا۔''

بیٹے کی پیدائش کے بعد قدسیہ ازسرِنو اپنی موت کا انتظار کرنے لگی، مگر اب — موت کی گھڑی ٹل چکی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسے معاف کر دیا گیا تھا۔ اس کے شوہر کی طرف سے اس کے لیے حبسِ دوام کی سزا منظور ہوئی تھی۔ سال پر سال گزرتے رہے۔ نہ کبھی اس کا شوہر اس کے پاس آیا نہ اس کے بیٹے کو نزدیک آنے کی اجازت دی گئی۔ کبھی کبھی وہ ان دونوں کو اوپر کی منزل سے مردان خانے کے سامنے یا دریا کے کنارے ٹہلتے دیکھ لیتی تھی۔

اُس کے کمرے سے سارا نیا فرنیچر نکال دیا گیا تھا، وہی پرانا سامان، جو اُس کی آمد سے پہلے تقریباً نصف صدی سے پڑا تھا، دوبارہ ڈال دیا گیا تھا، چوڑی سی مسہری، جس کے سرہانے درمیان میں بے آب آئینہ اور اطراف میں گلابی اور سبز پھول دار ٹائلیں لگی ہوئی تھیں۔ کڑھی ہوئی بدنما چادر اور قبر کی طرح کا سخت تکیہ۔ سرخ و سیاہ چھینٹ کی رضائی، جو اُن کے خاندان کی عورتیں ہمیشہ سے استعمال کرتی آئی تھیں۔

سب سے زیادہ رنج قدسیہ کو اُس وقت ہوا جب کتابوں کی الماری اٹھوا کر مہمان خانے میں ڈلوا دی گئی۔ صرف اس ایک چیز کے لیے اُس نے احتجاج کیا۔ مگر شنوائی نہ ہوئی۔ اب وہ قدسیہ خانم نہیں تھی نہ خان کی بیگم تھی۔ محض ایک دکھاوا تھی۔ سسرالی رشتہ دار اور جان پہچان والوں میں خان کی بیگم کی

حیثیت سے شادی غمی کے موقعوں پر شرکت کرتی تھی۔ گھر کے ملازموں اور جانوروں کی آقا تھی۔ اس کے دیے ہوئے وقت پر نوکر اُٹھ بیٹھتے تھے، اس کے حکم پر جا کر سو جاتے تھے۔ اس کی اجازت سے گھر کے چراغ جلتے اور گل ہوتے تھے۔ یعنی گھر میں صبح و شام ہوتے تھے۔ لیکن اُس کی اپنی زندگی میں صرف رات تھی—— طویل، تاریک اور ڈراؤنی رات، جس کا کوئی اَنت نہ تھا، کوئی صبح نہ تھی۔

قدسیہ چاہتی تو پچھلے پہر رات گئے اونچی چٹان سے دریا میں چھلانگ لگا کر اس شبِ دیجور کا خاتمہ کر سکتی تھی لیکن وہ تو یوں بھی ہر طرح مر چکی تھی اور مرنے کے بعد خودکشی کرنا اُسے بڑی بے معنی سی بات نظر آتی تھی۔

اعجاز کے لیکچرر شپ کے انٹرویو کے لیے جانے کا دن نزدیک آ رہا تھا اور ناصر خان کی خاموشی اور وحشت میں اضافہ ہو رہا تھا جیسے وہ کسی زبردست کش مکش میں مبتلا ہو۔ اعجاز اُس سے پوچھنا چاہتا تھا، اس سے کچھ کہنا چاہتا مگر یہ سوچ کر خاموش ہو جاتا تھا کہ جس مسئلے کا کوئی حل نہ ہو اُسے چھیڑنے سے کیا فائدہ ہے۔ اُس کے لاہور روانہ ہونے سے ایک دن پہلے زری کا خط لے کر خوش حال خان ایبٹ آباد سے اُس کے پاس پہنچا تھا۔ جس وقت اعجاز زری کا خط پڑھ رہا تھا اور احسن صاحب کے نام لاہور لے جانے والے خط کو سنبھال کر رکھ رہا تھا، ناصر خان خوش حال خان کو ساتھ لے کر پگڈنڈی سے اُتر کر نیچے دریا کے کنارے چلا گیا تھا اور دوپہر کے کھانے تک دونوں اُوپر نہ آئے تھے۔

شام کو جب خوش حال خان مہمان خانے کے کسی دوسرے کمرے میں آرام کر رہا تھا، اعجاز نے الماری میں رکھی ہوئی کتاب سے وہ تصویر نکالی اور ناصر خان کو دکھائی، ''ناصر! کیا یہ تمھاری امی کی تصویر ہے؟''

ناصر خان نے بے تاب ہو کر تصویر اعجاز کے ہاتھ سے چھین لی اور مبہوت بنا اُسے دیکھتا رہا۔

''تمھارے پاس کہاں سے آئی یہ تصویر؟'' اُس کے لہجے میں حیرت بھی تھی اور حسد بھی۔

''ایک کتاب میں سے نکلی ہے۔'' اعجاز نے سادگی سے کہا۔

''میں نے آج تک امی کی تصویر نہیں دیکھی مگر دل کہتا ہے کہ یہ اُن ہی کی ہے۔ اتنی خوب صورتی کہیں دیکھی ہے تم نے؟'' اس نے تصویر پر نظریں جمائے رکھیں۔

''ناصر! تم اپنی امی سے بہت ملتے ہو۔'' اعجاز نے آہستہ سے کہا۔

''میں! — ناممکن۔'' وہ کسی سوچ میں ڈوب گیا۔ پھر آہستہ آہستہ کہنے لگا، ''اتنے سالوں میں اُن کا کیا حال ہوا ہوگا؟ شاید وہ ہڈیوں کا ڈھانچا ہوگئی ہوں گی۔'' پھر اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے اور اُس نے رُندھی ہوئی بے بس آواز میں کہا، ''غیر ملکی، غیر شخص کتنا بڑا خطرہ مول لے کر میری ماں کی مدد کر رہا تھا — انھیں اس اندھے کنویں سے نکال رہا تھا اور میں ان کا بیٹا ہو کر انھیں اس جہنم سے نہ نکال سکا۔ یہ زہریلا ڈنک زندگی بھر میرے دل سے نہیں نکلے گا۔''

اعجاز نے تسلی کے لیے کچھ کہنا چاہا مگر الفاظ نے اُس کا ساتھ نہ دیا۔ ناصر خان نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا، ''اعجاز! میں نے ایک فیصلہ کیا ہے، بتاؤ کیا تم میرا ساتھ دو گے؟''

''ہاں کیوں نہیں۔ میں تمھارا دوست ہوں، تم مجھ پر بھروسا کر سکتے ہو۔'' اعجاز نے کہا۔

''سوچ لو۔ ہمارے ہاں دوستی اور دشمنی میں جان سے بھی ہاتھ دھونا پڑتا ہے۔ اِسی لیے تم سے کہنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ مگر یہ ہمت معلوم ہے مجھے کس نے دلائی؟'' ناصر خان نے کہا، ''خوش حال خان نے! میری امی کے میکے سے آنے والا یہ شخص نہایت نیک نفس انسان ہے۔''

''ناصر خان، تم کیا کر رہے ہو۔ اس معاملے میں انجان لوگوں کو شریک نہ کرو۔'' اعجاز نے تشویش سے کہا۔

''میں نے اسے کچھ نہیں بتایا، صرف اتنا کہ اس حویلی میں ایک عورت پچیس سال سے قید ہے۔''

''وہ اس عورت کو نکالنے کے لیے تیار ہوگیا، بلکہ اسے اپنے گھر میں پناہ دینے کو بھی آمادہ ہے۔ وہ کہتا ہے اُس کے گھر میں صرف وہ اور اُس کی ماں ہے اور ہفتوں کوئی اُن کے گھر میں نہیں آتا۔ اُس نے یہ بھی بتایا کہ زری کے ایک رشتے دار عمر چاچا ایبٹ آباد کے مضافات میں تنہا ایک بڑی سی کوٹھی میں رہتے ہیں۔ اس عورت کو وہاں بھی رکھا جا سکتا ہے۔ میرا خیال ہے اعجاز ہم اس شخص پر بھروسا کر سکتے ہیں۔ جب اسے معلوم ہوگا کہ وہ عورت اس کی بھی رشتے دار ہے تو وہ ہرگز ہمیں دھوکا نہیں دے گا۔''

''میں کچھ نہیں کہہ سکتا، مگر ایسے شخص کی مدد لینا، جس سے زندگی میں پہلی بار ملے ہو۔'' اعجاز نے کہنا شروع کیا۔ ناصر خان نے اُس کی بات کاٹ دی۔

''میں اس کام کے لیے دشمن کی مدد لینے کو بھی تیار ہوں، اور وہ تو امی کے رشتے دار ہیں اور اس کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ لوگ برے نہیں ہیں۔ بابا نے کسی ذاتی دشمنی کی وجہ سے اُن سے ملنا جلنا ترک کر رکھا ہے۔''

''ایک طرح سے تو ٹھیک ہے۔'' اعجاز نے کہا، ''اگر بابا کو پتا چل بھی گیا اور انھوں نے بہت

واویلا مچایا تو قانون کی نظر میں یہ کوئی جرم نہیں ہوگا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے رشتے داروں میں رہ رہی ہیں۔ لیکن اگر اُس نے پہلے ہی تمھارے ابا کو بتا دیا۔''

''میرے بابا سے نہ وہ کبھی پہلے ملا ہے نہ اب ملنے کا امکان ہے۔ وہ غریب لیکن روشن خیال انسان ہے۔ اُس کی ہم دردیاں غریبوں اور مظلوموں کے ساتھ ہیں۔''

''اچھا ــــ دیکھو، اگر تم اپنی امی کو کراچی لے جانا چاہو تو میرا گھر حاضر ہے۔'' اعجاز نے کہا۔

''اچھا چلو ــــ ابھی چلو۔'' وہ اعجاز کو گھسیٹتا ہوا زنان خانے کی طرف لے چلا۔ اب شام ہو چلی تھی۔ سرد علاقے کی سرمئی شام۔ خوش قسمتی سے اس وقت وہاں کوئی نہیں تھا۔ صدر دروازے کے باہر سبزی کی کیاریوں کے پاس بیٹھا چوکیدار حقہ بھرنے میں مصروف تھا۔ اُس کا منھ بھی دوسری طرف تھا۔ ناصرخان بلا روک ٹوک اندر چلا گیا اور پیچھے ڈرتا جھجکتا اعجاز بھی۔ صدر دروازے کے اندر گھستے ہی ایک اندھیری راہداری آئی۔ جس میں اناج کے بڑے بڑے قدِ آدم مٹکے رکھے ہوئے تھے۔ وہاں کھڑے ہو کر اُس نے آواز دی، ''گل صنوبرے!'' ایک ادھیڑ عمر کی عورت گھبرائی ہوئی باہر نکلی۔

''میں مدر سے ملنے آیا ہوں۔'' ناصرخان نے کہا۔ عورت گھبرائی ہوئی چوہیا کی طرح چاروں طرف دیکھنے لگی پھر گھبراہٹ میں ہاتھ ملنے لگی۔ ڈر کے مارے اعجاز کا بھی برا حال تھا۔ ناصرخان تو بیٹا تھا مگر اس کا کیا حشر ہونے والا تھا۔

''میں ان سے ملے بغیر نہیں جاؤں گا۔'' ناصرخان کے لہجے میں تیزی بھی تھی اور لوہے کی سی استقامت بھی۔

''تو آؤ۔'' عورت نے مری ہوئی آواز میں کہا اور جلدی سے انھیں ایک دیوار کی اوٹ سے اندر کی طرف لے کر چلی۔ وہ ایک اندھیرے کمرے میں پہنچے جہاں مزید ایک دھیما سا لیمپ روشن تھا۔ اعجاز کے ذہن میں وہ منظر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے نقش ہو گیا۔ ایک عورت منھ دوسری طرف کیے الماری میں سے کچھ نکال رہی تھی۔ قدموں کی چاپ پر اُس نے پلٹ کر دیکھا ــــ وہ قد آور تھی اور سنگِ مرمر کے کسی مجسمے کی طرح سیدھی اور سفید ــــ اس کے بالوں میں کہیں کہیں سفیدی تیر رہی تھی۔ وہ کھڑی ناصرخاں کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ پتھر کی ہو۔ صدیوں سے جب سے سنگ تراش نے اُسے تراشا ہو، یوں ہی کھڑی ہو۔

''امی!'' ناصرخان اُس کے قدموں میں جھکا۔

تب اُس نے بیٹے کو اُٹھا کر سینے سے لگا لیا۔ پھر اُس کی پیشانی چومی اور اسے پتھرائی ہوئی نظروں سے یوں دیکھنے لگی جیسے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ ہو۔ جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہی ہو یا جیسے

ناصرخان پانی کا بلبلہ ہو جو ابھی ٹوٹنے والا ہو۔ ان آنکھوں میں کیا کیا تھا، اعجاز کبھی زندگی بھر ان کا تجزیہ نہ کر پایا۔

''امی! میں تمھیں لینے آیا ہوں اور لے کر جاؤں گا۔ صبح پو پھٹنے سے پہلے ہم یہاں سے نکل جائیں گے۔ میں سارے انتظام کرلوں گا۔ تھوڑی دُور تک ہم گھوڑوں پر جائیں گے، اس طرح راستہ چھوٹا ہو جائے گا اور پھر کوئی ٹیکسی وغیرہ لے لیں گے۔ گھبرانا مت۔ تم میرے ساتھ جاسکتی ہو۔ میں تمھارا بیٹا ہوں۔ تمھیں میرے ساتھ جانے سے کوئی نہیں روک سکتا۔''

''زندگی میں پہلی مرتبہ ملے ہو تو اچھی اچھی باتیں کرو بیٹے۔ مجھے کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔۔۔ اور یہ؟'' ان کی نظریں اعجاز کی طرف اٹھیں۔

''یہ میرا دوست ہے۔ یہ ہمارے ساتھ جائے گا۔ اس پر تم اتنا ہی اعتماد کرسکتی ہو جتنا مجھ پر۔ اب بتاؤ اس سے اچھی بات اور کیا ہوسکتی ہے کہ میں تمھیں اس قید خانے سے نکالنے آیا ہوں، اور پھر تمھیں کبھی یہاں نہیں آنے دوں گا۔۔۔ کبھی نہیں!'' ناصرخان نے کہا۔

''میں اب کہیں نہیں جاؤں گی۔ میری زندگی تو جیسے کٹنی تھی، کٹ گئی۔ میں تمھیں مصیبت میں نہیں ڈالوں گی۔'' ان کے لہجے میں عزم تھا۔

''وہ میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔'' ناصرخان نے ترش لہجے میں کہا۔

''وہ تجھے جائداد سے عاق کرسکتے ہیں۔ وہ تجھے ساری جدی نعمتوں سے محروم کرسکتے ہیں اور چاہیں تو تیرا جینا بھی حرام کرسکتے ہیں۔''

''خیر۔۔۔ اب میں کچھ نہیں سنوں گا۔ کوئی بہانہ نہیں چلے گا۔'' ناصرخان نے کہا، ''یہ کیا ہے کہ تم اس غیر ملکی اجنبی کے ساتھ جاسکتی تھیں اور اپنے سگے بیٹے کے ساتھ جاتے ہوئے گھبرا رہی ہو۔''

اور تب وہ ہنستا اور روتا ہوا چہرہ ایک دم پتھر کا بن گیا۔ وہ ہاتھ جہاں تھے، وہیں رہ گئے۔ وہ پتلیاں جہاں تھیں وہیں گڑ گئیں۔ اسی طرح پتھر بنے بنے انھوں نے کہا، ''تجھ سے کیا کہا ہے ان لوگوں نے۔۔۔ انھوں نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ میں نے ساری زندگی کی قید صرف ایک شرط پر قبول کی تھی کہ میرے بیٹے کو میرے بارے میں کچھ نہیں بتائیں گے، زیادہ سے زیادہ یہی کہ وہ مر چکی ہے۔ مجھے بتا، انھوں نے تجھے کیا بتایا ہے اور کیسے بتایا ہے؟''

''انھوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ مگر مجھے پھر بھی معلوم ہے کہ تم پر کیا بیتی ہے۔ سب کچھ صحیح صحیح۔'' ناصرخان نے کہا، ''میں نے سب کچھ تمھاری اپنی تحریر میں تمھاری ڈائری میں پڑھا ہے۔''

''میری ڈائری تجھے کہاں ملی؟'' وہ حیران ہوئیں۔

''ایک دن میں تمھاری کتابیں ٹٹول رہا تھا تو ان کے درمیان رکھی ہوئی مل گئی تھی۔''

''کہاں ہے وہ؟''

''میرے پاس محفوظ ہے۔'' ناصر خان نے کہا۔

''اچھا! میں تو سمجھی تھی کہ جانے کب کی جل کر راکھ ہوچکی ہوگی۔ مجھے تو اب یاد بھی نہیں کہ میں نے اُس میں کیا کیا لکھا تھا۔ برسوں پرانی بات ہوگئی۔ ہاں اتنا ضرور یاد ہے کہ جو کچھ میں نے لکھا تھا، وہ حرف بحرف صحیح تھا۔''

''ہاں، مجھے اس بات کا یقین ہے۔''

''بس، مجھے خدا کے بعد تیرا ہی یقین چاہیے تھا بیٹے — مجھے اور کسی کی پروا نہیں ہے، کسی کی بھی نہیں۔''

''تو پھر تم تیار رہنا۔ پچھلی سڑک پر گھوڑے تیار ہوں گے۔ ہم پہاڑوں کے درمیان سے نکل جائیں گے۔ میں تمھیں لینے آؤں گا مگر تمھیں فوری چلنا ہوگا گھوڑے پر چل سکو گی نا!''

''ہاں، ہاں۔''

''تو بس طے ہے۔ رات کے پچھلے پہر — اور دیکھو تمھاری یہ تصویر بھی کتابوں سے ملی ہے۔ میں اسے اپنے پاس رکھ لوں؟''

''کیوں نہیں!''

''آؤ۔'' وہ اعجاز کا ہاتھ پکڑ کر اطمینان سے واپس نکل آیا۔ جاتے ہوئے قدموں میں تذبذب تھا۔ آتے ہوئے قدموں میں سکون و اطمینان تھا۔ گل صنوبر چوکیدار کو کسی کام میں لگا کر خود دروازے پر پہرہ دے رہی تھی۔

کمرے میں آ کر سر کے نیچے ہاتھ رکھ کر لیٹتے ہوئے ناصر خان نے کہا، ''مجھے محسوس ہو رہا ہے جیسے میں منوں مٹی کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اب کسی نے مجھے وہاں سے کھینچ نکالا ہے۔ اگر میری ماں نے مجھے کبھی دودھ پلایا ہے تو میں نے اس کا قرضہ چکا دیا ہے۔''

''ابھی کہاں!'' اعجاز نے کہا، ''ابھی تو اس راستے میں کئی سخت مقام آئیں گے۔''

''مجھے پروا نہیں ہے۔ اور سنو، میری امی اب تک کتنی پیاری ہیں۔ مجھے تو لگ رہا ہے جیسے وہ پہلے سے بھی زیادہ حسین ہوگئی ہیں۔ کتنی پُر وقار، کیسی مقدس اور کتنی عظیم! — ہم مرد لوگ کتنے ذلیل ہوتے ہیں۔ ہم کیسی پیاری، عزیز اور عظیم ہستیوں کو اپنی انا کے پیچھے فنا کر ڈالتے ہیں۔ ہم کتنے چھوٹے ہیں۔ ان بے بس مظلوم عورتوں کے مقابلے میں۔'' ناصر خاں کی آواز رُندھ گئی۔

''ہاں۔'' اور یکایک اعجاز کو اس غیر ملکی اجنبی کا خیال آیا۔ ''اس غیر ملکی کا کیا ہوا ہوگا ناصر؟''

''خدا ہی جانے۔ میں نے تو کبھی اپنے گھر میں اس کا ذکر نہیں سنا۔'' ناصر خان نے کہا۔

''ہوسکتا ہے تمھارے بابا نے اُسے مروا ڈالا ہو۔'' اعجاز نے کہا۔

''میرے خیال میں نہیں۔ کسی غیر ملکی کو مروا ڈالنا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ میرا خیال ہے وہ اپنے مُلک چلا گیا ہوگا۔''

''شاید اُس نے اس سارے واقعے کو اپنے الفاظ میں لکھا ہو۔'' اعجاز نے کہا۔

''ہاں شاید، اچھا تم اب سونے کی تیاری کرو۔'' ناصر خان بولا، ''میں صبح کے انتظامات کر کے آتا ہوں۔ تمھارا سامان تیار ہے؟''

''بالکل، ایک چھوٹا سا سوٹ کیس ہی تو ہے۔'' اعجاز نے کہا۔

''میرا خیال ہے کہ خوش حال خان سڑک سڑک جائے اور سیدو شریف میں ہمارا انتظار کرے۔ میں خوش حال خان کو ساری بات سمجھا دوں گا۔ وہاں سے میں اور امی خوش حال خان کے ساتھ مردان کے چھوٹے راستے سے ایبٹ آباد چلے جائیں گے۔ تم نوشہرہ چلے جانا اور وہاں سے لاہور۔

جس وقت ناصر خان لوٹا، اعجاز سو چکا تھا۔ کھٹکے سے ذرا سی آنکھ کھلی تو ناصر خان نے کہا، ''سب کچھ ٹھیک ہوگیا ہے۔ تم سو جاؤ میں تمھیں اٹھا لوں گا۔'' اعجاز پھر سو گیا۔

صبح اعجاز کی آنکھ کھلی تو وہ بستر پر نہیں تھا بلکہ ایک ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر دراز تھا۔ وہ وہاں کیسے پہنچا، اُسے کچھ یاد نہیں تھا۔ ٹیکسی چل رہی تھی۔ ڈرائیور کے برابر میں ایک اور آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ پہلے اعجاز سمجھا شاید وہ خوش حال خان ہے لیکن وہ خوش حال خان نہیں کوئی اور اجنبی شخص تھا۔ ذرا ہوش و حواس درست ہوئے تو اعجاز نے اپنے خوف کو چھپاتے ہوئے ڈپٹ کر کہا، ''یہ کیا چکر ہے۔ تم لوگ مجھے کہاں لیے جا رہے ہو؟''

ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے ہوئے شخص نے پیچھے دیکھا پھر ڈرائیور سے کچھ کہا۔ ڈرائیور نے سڑک کے ایک طرف گاڑی روک لی۔ ڈرائیور کے برابر بیٹھا ہوا شخص اتر کر اعجاز کے پاس آیا، ''یہ آپ کا بٹوہ ہے، اپنے پیسے دیکھ بھال لیجیے۔'' اس نے اعجاز کا بٹوہ اُس کی طرف بڑھایا۔ ''آپ کا سامان ٹیکسی میں موجود ہے، وہ بھی چیک کر لیجیے۔ بڑے خان نے کہا ہے کہ آپ جہاں تک چاہیں ٹیکسی لے جائیں۔ اس کے بعد ٹرین یا جہاز سے چلے جائیں لیکن دوبارہ کبھی یہاں آنے کی کوشش نہ کریں ورنہ آپ کی جان کو خطرہ ہے۔''

''اور ناصر خان؟'' اعجاز نے پوچھا۔

''اور مجھے کچھ معلوم نہیں ہے۔ مجھے یہی بتانے کا حکم تھا۔ بس میں یہیں سے واپس چلا جاؤں گا۔ خدا حافظ۔'' وہ چلا گیا اور ٹیکسی آگے بڑھ گئی۔

وہ اور ٹیکسی والا، دونوں بڑے خان کے گرگے تھے۔ اعجاز نے جتنے سوال پوچھے، ٹیکسی والے

نے کسی ایک کا جواب نہیں دیا۔صرف اُس نے اتنا پوچھا،''کہاں اتاروں آپ کو؟''

''جہاں دل چاہے اتار دو۔''اعجاز نے ناراضگی سے کہا۔

اس کے بعد ان دونوں کے درمیان کوئی بات نہ ہوئی۔ وہ اعجاز کو نوشہرہ کے بازار میں بس اسٹاپ پر اتار کر اور اس کا سوٹ کیس نیچے رکھ کر چپ چاپ واپس چلا گیا۔اعجاز نے چاروں طرف دیکھا۔اس کے لیے بالکل نئی جگہ تھی۔بس اسٹاپ پر چھوٹے چھوٹے بچے بیسیوں ہفت روزوں، فلمی رسالوں اور ڈائجسٹوں کا بار اُٹھائے بسوں اور کاروں کے پیچھے بھاگنے میں مصروف تھے۔''سرتاج'' ہوٹل میں بے حد پرانا ریڈیو کھرج میں بج رہا تھا۔غالباً وہ مدتوں سے سارے گلوکاروں کے گانے ایک ہی بے سری آواز میں سناتا تھا۔''گلستان'' پکچر ہاؤس میں فلم ''جاگدے رہنا'' چل رہی تھی اور پکچر ہاؤس کے سامنے فقیر لڑکے میلے کپڑوں سے کاروں کے شیشے مزید میلے کرنے میں مصروف تھے۔اتنے میں راول پنڈی کی آواز لگاتی ایک بس آ کر رُکی۔اعجاز نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور اُس میں سوار ہو گیا۔

ناصر خان اور اس کا گاؤں بہت پیچھے رہ گیا تھا۔اعجاز کو کل کی گزری ساری داستان یوں معلوم ہو رہی تھی جیسے اس نے کوئی خواب دیکھا ہو۔

زری کے کراچی روانہ ہونے سے ایک دن پہلے اکبر منزل سے ایک آدمی چاچا جی کو بلانے آیا۔ اب زری اور اس کے ساتھی چاچا جی کے ساتھ ہی رہ رہے تھے۔

چاچا جی واپس آئے تو یہ بُری خبر لائے کہ آج کے جلوس میں پولیس کے ساتھ جو جھڑپ ہوئی تھی اس میں خوش حال خان کے سر پر شدید چوٹ آئی ہے۔ ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن نے اپنے دو ارکان کی گرفتاری کے خلاف ہڑتال کی تھی۔ کوئی بھی وکیل عدالت میں پیش نہیں ہوا۔ پھر ۱۴۴ کی خلاف ورزی کرتے ہوئے جلوس نکالا تھا۔ جس میں اور بھی بہت سے لوگ شریک تھے اور خوش حال خان پیش پیش تھا۔ پولیس نے مظاہرین کے خلاف اشک آور گیس بھی استعمال کی اور لاٹھی چارج بھی کیا۔ کئی لوگ زخمی ہوئے جن میں خوش حال بھی شامل تھا۔ پولیس کی پوچھ گچھ سے بچنے کے لیے یہ بات چھپالی گئی ہے کہ وہ جلوس میں زخمی ہوا ہے اور گھر پر ہی اُس کا علاج ہو رہا ہے۔ چاچا جی نے اُس کی حالت دیکھی تو اسے فوری طور پر ملٹری اسپتال میں داخل کروا دیا جہاں اُن کے پرانے جاننے والے ڈاکٹر یوسف آج کل انچارج تھے۔ انھوں نے کہا کہ خاصا خون ضائع ہوگیا ہے لیکن تشویش کی کوئی بات نہیں ہے۔

کراچی روانگی سے ایک دن پہلے شام کو زری بھی خوش حال خان سے ملنے اور اسے خدا حافظ کہنے گئی۔ خوش حال خان کا چہرہ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ سر پر پٹی بندھی ہوئی تھی۔ نقاہت اُس کی آنکھوں سے ٹپک رہی تھی اور نیند کی دواؤں کی وجہ سے غنودگی بھی تھی۔ زری نے اُس کا ہاتھ ہم دردی سے دبایا اور خدا حافظ کہا۔ تب اُس کے ہونٹ ہلے مگر آواز نہ نکلی۔ غالباً اس نے بھی خدا حافظ ہی کہا ہوگا۔ زری کمرے سے باہر گئی، تب خوش حال خان کی ماں نے خوشحال کی آنکھوں کے کناروں میں

نمی محسوس کی۔ پھر اُس نے ایک ٹھنڈا سانس لے کر آنکھیں موند لیں۔

رات کو زری نے چاچا جی سے کہا، ''میں خوش حال خان کے سلسلے میں ایک بات آپ سے کہوں، آپ مانیں گے؟''

''میں نے اب تک تیری کوئی بات ٹالی ہے؟'' چاچا جی نے کہا۔

''میں چاہتی ہوں کہ آپ خوش حال خان کو اپنے ساتھ رکھ لیں تا کہ اُسے صحیح مشورہ دے سکیں۔ آپ کے اوپر ذمہ داریاں بھی بہت ہیں، کچھ اس پر ڈال دیجیے یہ اس کے لیے بہتر ہوگا کیوں کہ اب اس نے خیالی دُنیا میں رہنا شروع کر دیا ہے۔''

''وہ تو پہلے بھی رہتا تھا۔ تم ہی سے تو اُس نے کہا تھا کہ اکبر خان کو زہر دیا گیا ہے اور تم نے اس کی بات پر یقین بھی کر لیا تھا۔''

''ہاں چاچا جی، مگر اب تو وہ بہت آگے بڑھ گیا ہے۔ پشاور سے واپس آ کر کہنے لگا کہ میں صدر ایوب کو مارنے کے لیے گیا تھا اور میری ہی جیب سے پستول نکال کر اُس لڑکے نے صدر پر گولی چلائی تھی اور سوات سے آ کر اس نے ایک نئی سنسنی خیز کہانی سنائی تھی۔''

''اچھا! کیا؟''

''کہنے لگا کہ جہاں اعجاز ٹھہرا ہوا ہے، وہاں حویلی میں کوئی عورت پچیس ستائیس سال سے قید ہے۔ وہ اس عورت کو قید سے نکالنے کی مہم میں شریک ہو گیا تھا۔ کچھ لوگ گھوڑوں پر اسے نکال کر لاتے۔ پھر سیدو شریف میں اُس سے آن کر ملتے اور خوش حال اس عورت کو لا کر اپنے یا آپ کے گھر میں چھپا کر رکھتا مگر عین وقت پر کچھ گڑبڑ ہو گئی۔ سیدو شریف میں وہ انتظار کرتا رہا مگر جب وہ عورت اور اُس کو بچانے والے نہ پہنچے تو وہ تنگ آ کر واپس آ گیا۔''

''واقعی؟''

''جی ہاں۔ میں نے اسے سختی سے منع کر دیا ہے کہ یہ دونوں واقعات کسی کو نہ سنائے۔ خواہ مخواہ کسی مصیبت میں نہ گرفتار ہو جائے۔''

''جو خط وہ لے کر گیا تھا، وہ بھی پہنچایا یا نہیں؟''

''ہاں، وہ پہنچا دیا تھا۔'' زری نے کہا، ''اعجاز کے خط میں اس کی رسید بھی مل گئی۔''

''ٹھیک ہے۔ خوش حال کے سلسلے میں ضرور کچھ کروں گا۔ وہ ذہین ہے۔ کچھ نہ کچھ پڑھتا بھی رہتا ہے۔ وہ یقیناً میرے لیے اچھا ساتھی ثابت ہوگا، بقول تمہارے کوئی تو ہو جس کو میں نئی نئی تھیوریاں بنا کر سنا سکوں۔'' چاچا جی نے کہا۔

سوات کے پُرسکون اور پُرفضا ماحول سے نکل کر اعجاز لاہور پہنچا تو لاہور شہر تحریکِ جمہوریت کی شدت سے، پیپلز پارٹی، دیگر راہنماؤں اور طلبہ کی گرفتاریوں کی بہتات اور پولیس تشدد کے خلاف زبردست احتجاجی جلسوں اور جلوسوں سے لرز رہا تھا۔ مگر ابھی اعجاز کو اس ہیجان کا اندازہ نہ تھا۔ سوات کی ناکام مہم کے بعد ''قصرِ نیلم'' کا تجربہ بھی ایک داستانی رنگ لیے ہوئے تھا۔

اعجاز کے پاس زیادہ وقت نہیں تھا۔ اسٹیشن سے ٹیکسی لے کر وہ سیدھا ''قصرِ نیلم'' ہی چلا آیا تھا۔ ٹرین لاہور چھاؤنی کے اسٹیشن پر ذرا دیر کو رکی تھی اور وہ اپنا سوٹ کیس لے کر اتر گیا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ یہاں سے احسن صاحب کا گھر نسبتاً نزدیک ہوگا۔

''قصرِ نیلم'' پہنچ کر اعجاز کو اندازہ ہوا کہ وہ گھر واقعی کسی محل سے کم نہ تھا۔ گیٹ پر چوکیدار کی کرسی رکھی تھی مگر وہ غائب تھا۔ اعجاز جھجک کر اندر داخل ہوگیا۔ بائیں طرف گیراج میں دو جہازی کاریں کھڑی نظر آئیں۔ ان کو دیکھ کر اعجاز کے ہاتھ پاؤں پھولنے لگے۔

صدر دروازے سے گھر کے دروازے تک پہنچتے پہنچتے لانبے مخملیں چمن، جو سردی کے باوجود سرسبز تھے۔ شگفتہ پھول، بل کھاتی نہر، اس پر بنے محرابی پل اور سنگِ مرمر کے بڑے بڑے ٹیرس (terrace) سے اتنا مرعوب ہو چکا تھا کہ اسے اپنی شخصیت کچھ پچکتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اب اتنی دور آ کر لوٹ جانا بھی مناسب نہ تھا۔ آہستہ سے گھنٹی بجائی۔ ملازم لڑکا جیسے انتظار میں بیٹھا تھا، فوراً نکل پڑا۔

''صاحب ہیں؟'' ٹپٹا کر اعجاز نے پوچھا۔

''نہیں۔'' ملازم نے جواب دیا۔

''بیگم صاحبہ؟''

''وہ بھی نہیں ہیں۔''

''کوئی اور؟''

''صرف چھوٹی بی بی ہیں۔''

''ذرا ان کو بھیج دو۔''

''کیا کہوں اُن سے؟''

اب چھوٹی بی بی خدا جانے کتنی چھوٹی یا کتنی بڑی ہیں۔ اعجاز نے سوچا۔ بہرحال ایسے وقت پُراعتماد لہجے کی سخت ضرورت تھی۔

''کہنا اعجاز صاحب آئے ہیں اور زری بی بی کا خط لائے ہیں۔''

ملازم لڑکا اندر چلا گیا۔ اعجاز اپنی شخصیت کی لڑکھڑاتی دیواروں کو سنبھالا دینے کی کوشش میں مصروف رہا۔ آدھا دروازہ کھول کر ایک گول مٹول گوری سی لڑکی جھانکی۔

''آپ کہاں سے تشریف لائے ہیں؟'' وہ ضرور اپنی ماں کی طرح بولنے کی کوشش کر رہی تھی۔

''میں ایبٹ آباد سے آیا ہوں۔'' اعجاز نے کہنا شروع کیا، ''احسن صاحب کے نام ایک خط لایا ہوں، زری خان نے دیا ہے۔''

''زری خان نے پاپا کے نام خط دیا ہے آپ کو؟'' لڑکی کی آنکھیں دفعتاً مضحکہ خیز حد تک گول ہوگئیں۔ اُس کی آنکھوں میں پریشانی اور سوچ کی جو کیفیت تھی اُس نے اعجاز کو خلجان میں مبتلا کر دیا۔

''جی ہاں، زری خان ہی نے مجھے بھجوایا تھا۔ ممکن ہے خط کسی اور کا ہو۔'' اعجاز نے کہا۔

''کیا یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ خط چھوڑ جائیں اور تھوڑی دیر بعد آجائیں یا فون کرلیں۔'' لڑکی کچھ سوچ کر بولی۔

''ضرور ہوسکتا ہے۔ یہ لیجیے مگر خط ضرور دے دیجیے گا۔ کوئی اہم بات ہوگی جو مجھے دستی دیا گیا ہے۔ میں پھر حاضر ہوں گا۔ ہاں، اپنا فون نمبر مجھے لکھوا دیجیے۔''

لڑکی نے فون نمبر لکھوایا۔ اس دوران وہ خط پر لکھے ہوئے پتے کو غور سے دیکھتی رہی جیسے پتے کو دیکھ کر مضمون بھانپنے کی کوشش کر رہی ہو۔

''آپ شام کو آجائیں، پاپا اور ممی دونوں گھر پر ہوں گے۔'' لڑکی نے کہا۔

''بہت بہتر۔'' اعجاز نے چلتے چلتے لڑکی کو دیکھا جو اب لفافے کو غور سے دیکھ رہی تھی۔

ٹیکسی والے نے حسبِ عادت شور مچایا کہ ایک منٹ رُکنے کو کہا اور اتنی دیر لگا دی۔ اعجاز نے اس سے معافی مانگی، ہرجانہ دینے کا وعدہ کیا اور پھر کسی دوسرے درجے کے ہوٹل میں پہنچانے کی درخواست کی۔ میکلوڈ روڈ کے متوسط درجے کے ہوٹل میں پہنچ کر اعجاز نے اطمینان کا سانس لیا۔ یہ ہوٹل اعجاز کی شخصیت کو کچل رہا تھا نہ اعجاز اس ہوٹل کے وقار کو ٹھیس پہنچا رہا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اتنے ہی موزوں تھے جیسے کسی پیر کے لیے صحیح ناپ کا جوتا۔ ہوٹل لبِ سڑک واقع تھا۔ نہ باغ تھا نہ باغیچہ۔ نیچے چھوٹا سا صحن تھا جس میں سے دو اطراف میں نکلتی سیڑھیاں اوپر بالکنی میں پہنچا دیتی تھیں۔ یہاں سے مختلف کمروں میں جایا جاسکتا تھا۔ بالکنی میں چند گملے رکھے تھے۔ کمرہ صاف ستھرا تھا۔ غسل خانہ قدرے کم صاف تھا۔ کمرے کی کھڑکیاں ایک گلی میں کھلتی تھیں جس کا منظر بھی اعجاز کے لیے نامانوس نہیں تھا۔ گلیوں میں گزرتے ٹھیلے، شیشے کی گولیوں سے کھیلتے بچے، نالیوں میں پڑا کوڑا کرکٹ اور تیز تیز چلتے راہ گیر، سب نئی جگہ کے باوجود دیکھے بھالے سے لگتے تھے۔

اس وقت تک اعجاز کے ذہن میں دوبارہ ''قصرِ نیلم'' جانے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ یہی خیال تھا کہ کسی وقت ہوٹل کے دفتر میں جا کر تصدیق کرلے گا کہ خط احسن صاحب کے ہاتھ میں پہنچ گیا ہے، مگر کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ خالی ذہن شیطان کا کارخانہ ہوتا ہے۔ چناں چہ بجائے اس کے کہ وہ اپنے کل کے انٹرویو کے بارے میں سوچتا، اس کا ذہن سیدھا اس ہرے بھرے لان سے ہوتا ہوا ''قصرِ نیلم'' جا پہنچا اور سوچنا شروع کیا کہ زری کا نام سن کر اس لڑکی کی آنکھیں اس پُراسرار حد تک گول کیوں ہوگئی تھیں اور وہ اس بات پر اس قدر حیرت زدہ کیوں تھی کہ زری خان نے اس کے پاپا کے نام کوئی دستی خط بھیجا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے بعد اس نے تھوڑی دیر لیٹنا چاہا مگر خیالات پھر بھٹک کر ''قصرِ نیلم'' جا پہنچے۔ آرام اور یک سوئی دونوں غارت ہو چکے تھے۔ کہاں تو وہ اس گھر کی شکل بھی دوبارہ نہیں دیکھنا چاہتا تھا اور کہاں جانا اتنا ضروری ہوا کہ بار بار گھڑی دیکھنے لگا۔

ہوٹل سے نیچے اُترا تو ٹریفک نسبتاً کم تھی مگر اس نے دھیان نہیں دیا۔ ٹیکسی روکی تو ڈرائیور خاصی دیر تک متامّل رہا پھر کچھ سوچ کر بولا، ''اچھا بیٹھو، مگر آج جلوس نکل رہا ہے کہیں اس میں نہ پھنس جائیں۔''

وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ راہ میں طلبہ کا جلوس ملا۔ اطراف میں پولیس کی گاڑیاں کھڑی تھیں، جن میں پولیس والے ہاتھوں میں رائفلیں سنبھالے بیٹھے تھے۔ چند سپاہی درختوں کی آڑ میں کھڑے تھے۔ مظاہرین مسٹر بھٹو کو رہا کرو اور پولیس مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ پولیس ان کو منتشر کرنا چاہتی تھی۔ لڑکے اُن پر پتھراؤ کر رہے تھے۔ دفعتاً پولیس والوں کو جوش آیا اور انھوں نے لڑکوں پر لاٹھیاں برسانی شروع کر دیں۔ افراتفری مچ گئی۔ کئی لڑکے بھاگتے ہوئے اُن کی ٹیکسی کے پاس سے نکلے۔ وہ نام لے

لے کر بتا رہے تھے کہ فلاں فلاں زخمی ہو گئے ہیں۔ ٹیکسی والے نے جلدی سے ٹیکسی ایک گلی میں موڑ لی اور خدا جانے کہاں کہاں گھما کر اسے دوبارہ مال روڈ پر لایا اور ریلوے کا پل پار کر کے چھاؤنی کے علاقے میں داخل ہوا جہاں پولیس جگہ جگہ درختوں کی آڑ میں موجود تھی مگر شہر میں گہما گہمی کے کوئی آثار نہ تھے۔

''قصرِ نیلم'' بے حد پُرسکون تھا۔ اس وقت اعجاز اپنے بہترین سوٹ اور ٹائی میں تھا اور اس کے پاس کوئی سامان نہیں تھا۔ گھنٹی بجائی، ترنت نوکر برآمد ہوا اور اسے لے جا کر ڈرائنگ روم میں بٹھا دیا۔ یہ تو بعد میں اعجاز کو پتا چلا کہ وہ ڈرائنگ روم اصل ڈرائنگ روم نہیں تھا۔ اس گھر میں ٹرین کے کمپارٹمنٹ کی طرح کئی ڈرائنگ روم تھے جس میں مہمان حسبِ حیثیت بٹھائے جاتے تھے۔ جس کمرے میں اعجاز کو بٹھایا گیا اسے ڈیوڑھا یا زیادہ سے زیادہ سیکنڈ کلاس ڈرائنگ روم کہہ سکتے ہیں اور یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ کیوں کہ اعجاز نے اس وقت تک جتنی خود اعتمادی بہم پہنچائی تھی وہ صرف اسی کمرے کے لیے کافی تھی۔

ذرا دیر بعد ایک خاتون کہ جتنی گوری تھیں اتنی ہی موٹی تھیں، بغیر آستین کا بلاؤز پہنے اور قیمتی ساری بورے کی طرح لپیٹے اندر آئیں۔ اعجاز سوچنے لگا کہ ان کے مرحوم حسن کو موٹاپے نے کھالیا ہے یا میک اَپ نے۔ اس وقت بھی اُن کے چہرے پر پاؤڈر کی تہہ تھی اور لبوں پر گہرے نارنجی رنگ کی لپ اسٹک بھنویں پتلی پتلی، ڈوری ایسی تھیں اور بغیر آستین کا بلاؤز ان کے تھلتھلاتے بازوؤں کو نمایاں کرنے کے علاوہ ایک کام اور بھی کر رہا تھا، یہ اعلان کہ وہ فیشن ایبل ہیں اور آج کے دَور میں باوجود اپنے بھدے جسم کے، کسی سے پیچھے رہنے کو تیار نہیں ہیں۔ یہ سب اعجاز نے اس لیے غور سے دیکھا کہ زری نے انھیں اپنی کزن بتایا تھا لیکن ان میں اور زری میں کوئی مشابہت نہیں تھی۔ یہ بات اعجاز کے لیے خاصی اطمینان بخش تھی۔

''بیٹھو'' بیگم احسن نے کہا۔ اُن کی آواز اُن کے چہرے کی طرح کھردری اور بدن کی طرح بھدی تھی۔ ''تمھارا سفر تو اچھی طرح گزرا۔'' انھوں نے محض رسماً پوچھا۔ ان کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اُس کے سفر سے دراصل کوئی دلچسپی نہیں ہے۔

''جی ہاں۔'' اعجاز نے بھی رسمی سا جواب دیا۔

اس کے بعد بیگم احسن نے دروازے پر ایک نگاہ ڈالی۔

''تم زری کو کیسے جانتے ہو؟'' انھوں نے پوچھا۔

''میں اور زری ایک ہی محکمے میں کام کرتے ہیں۔ میں انٹرویو کے سلسلے میں یہاں آ رہا تھا—''

ابھی اعجاز کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ ایک دراز اور خوش پوشاک صاحب اندر آئے۔ اعجاز نے اُٹھ کر

ہاتھ ملایا اور اپنا نام بتایا۔ انھوں نے بھی ''احسن'' کہہ کر اپنا تعارف کرایا اور اعجاز کو بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''صبح سے اب تک کہاں رہے؟'' انھوں نے پوچھا۔

''ہوٹل ہی میں رہا، جہاں ٹھہرا ہوا ہوں۔'' اعجاز نے جواب دیا۔

''سنا ہے آج شہر میں بہت بڑا جلوس نکلا ہے اور لاٹھی چارج وغیرہ ہوا ہے۔'' احسن صاحب نے کہا۔

''جی ہاں۔ میں بھی اس میں پھنس گیا تھا۔ کچھ دیر بھی ہوگئی۔ ٹیکسی ڈرائیور خدا جانے کہاں کہاں سے نکال کر لایا۔ میں تو یہاں کے راستے بھی نہیں جانتا۔''

''اچھا۔'' احسن صاحب کچھ دیر سوچتے رہے، پھر بولے، ''آج کل شہر کی فضا اچھی نہیں ہے۔ آپ صرف دو دن کے لیے لاہور آئے ہیں تو ہمارے ہاں ٹھہر جایئے۔''

قبل اس کے کہ اعجاز کچھ کہے، انھوں نے ملازم لڑکے کو آواز دی۔ ''ڈرائیور سے کہو اعجاز صاحب کے ساتھ ہوٹل جائے اور ان کا سامان لے آئے۔''

اعجاز کی نظر بیگم احسن پر پڑی تو ان کا چہرہ بجھی ہوئی قندیل کی طرح بے رونق ہوگیا تھا۔ وہ واضح خفگی سے احسن صاحب کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ احسن صاحب اُن کو نظرانداز کرنے کے لیے ان کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہے تھے۔ زری کے ماضی کا ایک اَسرار — اعجاز کے دِل میں کسی نے کہا اور اُس نے یوں ظاہر کیا، گویا وہ احسن صاحب کے اصرار کے ہاتھوں مجبور ہوگیا ہے۔ احسن صاحب نے چلتے چلتے کہا، ''جلدی آ جایئے گا، آج کل حالات ٹھیک نہیں ہیں۔''

''بہتر ہے۔'' اعجاز نے کہا اور باہر نکل آیا۔ اسے یقین تھا کہ بہت دیر تک بیگم احسن اور احسن صاحب میں اس بات پر بحث ہوئی ہوگی کہ ایک نامحرم شخص کو، جو گھر میں کسی کا بھی دوست نہیں ہے، آخر مہمان بنا کر رکھنے کی کیا تک ہے۔

صبح اعجاز کی آنکھ کھلی تو اس کا دل چاہا کہ پکار کر پوچھے، ''میں کہاں ہوں؟'' نیم غنودگی کے عالم میں اس نے خود کو نیلے رنگ میں ڈوبا ہوا محسوس کیا۔ ہلکے نیلے رنگ کی دیواریں، نیلے رنگ کے پردے، اسی رنگ کے صوفے، باریک سفید لیس کے پردے کے پیچھے ڈریسنگ ٹیبل پر بھی نیلا رنگ غالب تھا۔ البتہ ٹیبل لیمپ کے سفید شیڈ، قالین پر سفید رنگ کا بڑے بڑے بالوں والا براق گول قالین نیلے رنگ میں پاکیزگی کی آمیزش کر رہا تھا۔ ''میں کہاں ہوں'' کہنے سے پیشتر ہی اسے یاد آ گیا کہ احسن صاحب کے ''قصرِ نیلم'' میں ہے، اور ابھی چند منٹ پہلے کسی نے دروازہ کھٹکھٹا کر چائے کا مژدہ سنایا تھا اور وہ نامعلوم شخص چائے تپائی پر رکھ کر چلا گیا تھا۔ اخروٹ کے منقش میز پر چاندی کے برتنوں میں چائے کا تصور اب پوری طرح جاگنے کے بعد اُسی بھلا نہ لگ رہا تھا کیوں کہ یہ چیزیں خواب کی حد تک تو ٹھیک تھیں مگر جیتی جاگتی زندگی میں اُس کی شخصیت کے ساتھ میل نہیں کھاتی تھیں۔

اُس نے چائے پیے بغیر اُٹھ کر دُہرے پردے سرکائے اور کھڑکی کے باہر نظر ڈالی۔ باغ پر ایک خوش گوار سناٹا طاری تھا۔ گلاب کے کٹورے شبنم کے قطروں سے بھرے ہوئے تھے۔ گلاب ہی کی شکل کے سبز کیکٹس کے پھول پورے پورے گملوں میں کھلے ہوئے تھے اور اوس سے لبالب تھے۔ بیلوں میں چھپی ہوئی چڑیوں کے چہچہے سنائی دے رہے تھے۔ کبھی کبھی کوے کی کائیں کائیں کی آواز آ جاتی تھی۔ مگر آدم زاد کوئی نہ تھا۔ آج انٹرویو کا دن ہے۔ ایک جملہ اعجاز کے تحت الشعور میں ہمہ وقت موجود تھا۔ وہ کپڑے لے کر غسل خانے میں چلا گیا۔ غسل خانے کی بے داغ سفیدی اور ٹب

دیکھ کر خیال آیا کہ آج شاہی انداز میں غسل کیا جائے۔ چناں چہ گرم اور ٹھنڈا پانی ٹب میں کھلا چھوڑ دیا۔ شیو سے فارغ ہو کر ٹب میں دیکھا تو وہی ہلکی فیروزی جھلک نظر آئی، جو دریائے سوات کے پانی میں نظر آتی تھی۔ دریائے سوات کی خنکی دل اور تلووں کو گدگداتی تھی مگر ٹب کی حرارت رات کی کسل مندی دھیرے دھیرے چوسنے لگی۔ اس نے بدن کو ڈھیلا چھوڑ دیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ وہ ساری رات جاگتا رہا تھا۔ کبھی منگورہ کی رات یاد آتی، کبھی ناصر خان اور قدسیہ خانم کا خیال آتا۔ نہ جانے ان کا کیا حشر ہوا۔ کبھی اپنی موجودہ کیفیت کو دیکھتا جو قصہ سوتے جاگتے کے ابوالحسن سے کسی طرح کم نہ تھی۔ علی الصبح تھوڑی دیر کو آنکھ لگی تھی کہ چائے لانے والے ملازم کی دستک نے اُٹھا دیا تھا۔

گرم پانی کے غسل نے رات کی تھکن اور کسل مندی بہت حد تک دُور کر دی۔ آئینے کے سامنے تیار ہو رہا تھا کہ ملازم نے دروازہ کھٹکھٹا کر پوچھا، ''آپ ناشتا کمرے میں کریں گے یا نیچے آ کر سب کے ساتھ کریں گے؟''

اعجاز نے آئینے پر نظر ڈالی۔ 'نیچے نیچے۔' آئینے والے نے کہا۔

حوصلہ رکھو یار، وہ مسکرایا۔ دیکھنے میں وہ اچھا خاصا پُر وقار اور خوش لباس لگ رہا تھا۔

''نیچے آ کر سب کے ساتھ کریں گے۔'' اعجاز نے بڑے اعتماد سے کہا۔

اس کمرے کا ایک بل کھاتا خوب صورت سا زینہ باہر سے ٹیرس پر آتا تھا اور دوسرا اندر سے بالکنی پر کُھلتا تھا۔ اندر والا دروازہ بند کر دیا جاتا تو یہ مہمان خانہ باقی گھر سے بالکل الگ ہو سکتا تھا مگر کسی وجہ سے اندر کا دروازہ بند نہیں کیا گیا تھا۔ ملازم اسی طرف سے اُسے لے کر نیچے اُتر گیا۔

ناشتے پر سب گھر والے موجود تھے۔ بیگم احسن نے اسے بڑے غور سے دیکھا۔ اعجاز کو محسوس ہوا جیسے آج ان کا موڈ قدرے بہتر ہے۔ چھوٹی لڑکی اسکول یونی فارم اور بالوں میں لگے ہوئے پنوں کی وجہ سے کل سے بھی کم عمر معلوم ہو رہی تھی۔ بڑی لڑکی جسے کل اعجاز نے ایک نظر دیکھا تھا، آج دُبلی پتلی نہیں بلکہ کمزور لاغر نظر آئی۔ اس کے چہرے کی زیتونی جھلک سنجیدگی سے مل کر افسردگی کی حدوں کو چھو رہی تھی۔ احسن صاحب نے اعجاز کو اپنے ساتھ کار میں یونی ورسٹی تک لے جانے کی پیش کش کی مگر اعجاز نے تنہا ٹیکسی میں جانے کو ترجیح دی۔

خاموشی طویل اور ناگوار ہونے لگی تو احسن صاحب نے کہا، ''بھئی نیلی ان سے کچھ باتیں کرو۔ تم تو بہت بولتی ہو۔'' پھر اعجاز سے انھوں نے اپنی دونوں بیٹیوں کا تعارف کرایا۔ ''میری بڑی بیٹی، اس کا نام شہزادی ہے۔ ہم اسے شیزی کہتے ہیں۔ یہ میڈیسن کر رہی ہے، ایف جے میں ہے، نیلی میٹرک میں ہے، نام نیلوفر ہے مگر نیلی کہلاتی ہے۔ ہاں بھئی مہمان سے کچھ بات تو کرو۔''

نیلی کچھ دیر سوچتی رہی پھر بڑی سنجیدگی سے اعجاز سے پوچھا، ''آپ کے کمرے میں سب چیزیں ہیں؟ آپ کو مزید کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے؟''

''جی نہیں، بلکہ میں ایسی چیزوں کی فہرست بنا سکتا ہوں جن کی فی الحال مجھے ضرورت نہیں ہے۔'' وہ ہنسا۔

''مثلاً؟'' نیلی نے کہا۔

''مثلاً ایئر کنڈیشنر۔'' نیلی کھل کر ہنسی، شیزی بھی مسکرا دی۔

اعجاز سب کو ناشتے کی میز پر چھوڑ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور اجازت چاہی۔

"Wish you best of luck". نیلی نے کہا۔ اُسے معلوم تھا کہ اعجاز اپنے اِنٹرویو کے لیے جا رہا ہے۔ اس کے بعد احسن صاحب نے یہی بات دُہرائی۔ اعجاز نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ بیگم احسن اور شیزی خاموشی سے چائے پیتی رہیں۔ اعجاز نے خدا حافظ کہا اور شاہراہ پر جا کر ٹیکسی پکڑ لی۔

عجب اتفاق تھا کہ جیسے ہی اعجاز انٹرویو کے کمرے میں داخل ہوا، سامنے ہی کراچی یونی ورسٹی کے ایک ایسے استاد بیٹھے تھے جن کی رائے اس کے بارے میں غیر معمولی اچھی تھی۔ ایم اے کرنے کے بعد چند ماہ اُس نے یونی ورسٹی میں پڑھایا تھا۔ اس بات نے اس کو انٹرویو میں پُراعتماد بنائے رکھا اور اس نے نہایت سکون سے جواب دیے۔ انٹرویو کے آخر میں جب اس سے کہا گیا کہ وہ لاہور میں اپنے قیام کی جگہ بتا دے تاکہ دو ایک دن میں اسے جواب بھیج دیا جائے تو اُس کی اُمید اور بڑھ گئی۔ اس انٹرویو میں زیادہ امیدوار نہیں تھے۔ اعجاز کو اندازہ ہو گیا کہ اس کا اصل مقابلہ صرف دو امیدواروں سے ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے استاد کی وجہ سے اسی کا پلڑا بھاری رہے لیکن اب مسئلہ یہ ہے کہ جب تک اِنٹرویو کا جواب آئے اسے لاہور میں رہنا ہوگا اور زیادہ دن احسن صاحب کے ہاں رہنا کسی طرح مناسب نہیں۔ بہتر یہی ہے کہ وہ کسی دوست کے اچانک مل جانے کی خوش خبری سنا کر فوراً ہوٹل اُٹھ آئے مگر اس سے پہلے زری کے بارے میں چند معلومات حاصل کرنا ضروری ہیں۔

واپس چلا تو آج پھر ایک جلوس سے مڈھ بھیڑ ہوئی جو ٹولنٹن مارکیٹ سے اسمبلی ہال کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہاں پہنچ کر تقریباً وہی واردات پیش آئی جو کل پیش آئی تھی۔ پولیس والوں نے جلوس کو اسمبلی ہال کی طرف جانے سے روکا۔ لڑکوں نے پتھراؤ کیا۔ پولیس نے آنسو گیس پھینکی، پھر لاٹھی چارج ہوا۔ فائر کی آواز سنائی دی اور مجمع تتر بتر ہو گیا۔ اعجاز فٹ پاتھ پر تیز تیز چلتا ہوا چڑیا گھر میں داخل ہو گیا۔ بہت دیر تک وہاں کے سبزہ زار میں گھومتا اور سوچتا رہا۔ حالات نہایت غیر یقینی ہیں۔ کسی وقت بھی یونی ورسٹی بند ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں وہ کیا کرے!

خاصی دیر بعد جب مجمع چھٹ گیا اور معطل ٹریفک دوبارہ بحال ہوگیا تب وہ باہر نکلا اور پیدل ہی چھاؤنی کی طرف چل پڑا۔ نہر کے پل کے پاس پہنچا تو ایک بس ملی۔ اُس میں بیٹھ کر وہ چھاؤنی کی طرف روانہ ہوا۔ لاہور اسے اچھا لگا تھا۔ کراچی کے مقابلے میں چھوٹا ضرور تھا، مگر پُر رونق اور پُر فضا ــــ اپنی الگ شخصیت کا مالک، جیسا کہ کسی اچھے شہر کو ہونا چاہیے۔ مال روڈ کسی پنجابی دوشیزہ کی طرح شگفتہ اور نکھری نکھری تھی، گو سردیوں کی آمد نے دو رویہ درخت کے پتوں کو زرد کرنا شروع کر دیا تھا۔

''قصرِ نیلم'' پہنچا تو بیس پچیس زنانہ آوازیں بیک وقت ہنسنے اور کچھ کہنے کی کوشش میں مصروف تھیں۔ مکھیوں کی جھنجھناہٹ سی، کچھ چیخیں، کچھ قہقہے ــــ کھانسی اور سگریٹ کے دھویں کے مرغولے ڈرائنگ روم سے بلند ہو رہے تھے۔ مجموعی تاثر ایسا تھا جیسے بہت سے ریڈیو بیک وقت مختلف اسٹیشنوں پر لگے ہوئے ہوں جن میں سے چند مقابلے میں ناکام رہ کر دھواں چھوڑنے لگے ہوں۔ پہلے تو اعجاز گھبرایا۔ پھر اسے خیال آیا۔ ہو نہ ہو، یہ بیگمات کی کافی پارٹی ہے۔ بیگمات کی کافی پارٹیوں کے بارے میں اُس نے صرف سنا تھا اس معاملے میں اس کا تجربہ صفر تھا۔ اسے معلوم ہوا کہ گھر کے باہر جو درجنوں نیلی پیلی گاڑیاں کھڑی تھیں اور جنھیں وہ کسی اور گھر کا دُم چھلاّ سمجھ رہا تھا، اسی محل کا شاخسانہ تھیں۔ اُسے حیرت تھی کہ یہ بیگمات باہر کی بارُود بھری سیاسی فضا سے ذرا بھی متاثر نہیں تھیں۔ وہ زیادہ تر چھاؤنی اور گل برگ کے علاقے سے آئی تھیں۔ چند ڈرائیور اطمینان سے کاروں میں پڑے سو رہے تھے، کچھ ٹولیوں میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔

اعجاز کے آنے کے ذرا دیر بعد اندر کے دروازے پر دستک ہوئی اور اس کے ''کم اِن'' کہنے پر نیلی اندر داخل ہوئی۔

''آپ کو نوکری مل گئی؟'' وہ مخملیں نیلے صوفے پر ٹِک گئی۔

''ابھی سے؟'' وہ ہنسا، ''ابھی تو صرف انٹرویو ہوا ہے۔''

''آپ کتنے دِن ہمارے ہاں رہیں گے؟'' وہ پھر بولی۔

''جتنے دن آپ رکھیں گی۔'' اعجاز نے کہا۔

وہ ہنس پڑی۔ ''گھر میں کوئی آجائے تو مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔ ہمارے گھر میں اتنے کم لوگ ہیں کہ مزہ نہیں آتا۔''

''کبھی زری خان بھی آتی ہیں آپ کے ہاں؟'' اعجاز نے موقع غنیمت جان کر پوچھا۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب ہاں میں ہوگا۔ تب بات آگے چلائے گا۔

''کبھی نہیں۔ ہم نے انھیں آج تک نہیں دیکھا'' نیلی نے کہا۔

''کیوں؟ وہ تو آپ کی امی کی کزن ہیں اور اکثر لاہور آتی رہتی ہیں۔'' اعجاز نے کہا۔

''معلوم نہیں۔ ممی کبھی اُن کی بات بھی نہیں کرتیں۔ پپا بھی نہیں کرتے۔ جس دن آپ ان کا خط لائے ہیں نا تو ممی کا موڈ بہت خراب تھا۔ رات کو وہ اور پپا بہت دیر تک جاگتے رہے۔ کبھی آہستہ آہستہ اور کبھی زور زور سے باتیں کرتے رہے۔ میں بھی رات کو دیر تک نہیں سوئی۔''

''اچھا تو صبح آپ نے ممی سے پوچھا نہیں کہ کیا بات تھی؟'' اعجاز نے کہا۔

''پوچھا تھا مگر انھوں نے کچھ بتایا نہیں بلکہ ڈانٹ دیا کہ ہر بات میں دخل مت دیا کرو۔''

''عجیب بات ہے۔'' اعجاز نے کہا۔ ''زری خان کا خط آئے تو ممی کا موڈ خراب ہو جاتا ہے لیکن جو آدمی خط لے کر آئے اسے مہمان بنا کر رکھ لیا جاتا ہے۔''

''جی—'' نیلی نے کہا۔

''یہ کیسے؟'' اعجاز نے پوچھا۔

''معلوم نہیں— ویسے میں آپ کو ایک بات بتاؤں؟'' نیلی اعجاز کی طرف جھکی۔

''ضرور بتایئے۔'' اعجاز ہمہ تن گوش ہو گیا۔

''میں زری خان سے کبھی ملی نہیں، مگر میں انھیں بہت پسند کرتی ہوں۔''

''اچھا!'' اعجاز مسکرایا۔ ''آپ ان سے ملی نہیں تو انھیں پسند کیسے کرنے لگیں؟''

''میں نے ان کی تصویریں دیکھی ہیں،'' نیلی نے کہا۔ ''مجھے وہ بہت اچھی لگتی ہیں۔ ممی کے پرانے البم ہیں نا، اُن میں ان کی بہت سی تصویریں ہیں، ممی انھیں چھپا کر رکھتی ہیں مگر میں کبھی کبھی نکال کر دیکھتی ہوں، آپ کو دکھاؤں؟''

اعجاز کے لیے یہ کتنی بڑی ترغیب تھی نیلی کو اندازہ نہ تھا۔

''اگر آپ کی ممی نے دیکھ لیا تو؟''

''ممی! وہ تو اس وقت مایوں کھیل رہی ہیں، ان کی پارٹی چل رہی ہے، اس سے اُٹھ کر کیسے آسکتی ہیں۔''

''اگر شہزادی بیگم نے دیکھ لیا تو؟'' اعجاز نے کہا۔

''شیزی!— وہ بھی اپنے کمرے میں پڑھ رہی ہیں— ہر وقت پڑھتی رہتی ہیں۔ میں تو بہت بور ہوتی ہوں۔ گھر میں کس سے بات کروں!''

''اگر انھوں نے ہمیں ممی کا البم دیکھتے پکڑ لیا تو؟'' اعجاز ابھی تک البم کے خیال میں کھویا ہوا تھا۔

''تو کچھ نہیں— ذرا سا ڈانٹ ڈپٹ کر چھوڑ دیں گی۔ ان میں یہ اچھی بات ہے کہ کسی کی

شکایت نہیں کرتیں۔"

"نیلی!" بالکنی سے شیزی کی آواز سنائی دی۔ "کیا تم اندر ہو؟"

"ہاں — آؤ نا، ایک منٹ کے لیے۔" نیلی نے کہا۔

شیزی دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ "نیلی! تم کیوں ہر ایک کا وقت برباد کرتی ہو۔ تمھیں اس طرح نہیں آنا چاہیے۔" شہزادی نے میٹھے لہجے میں تنبیہہ کی۔ تنہائی میں شاید وہ کہتی کہ غیر آدمیوں کے کمرے میں اس طرح گھس جانا نہایت نامناسب بات ہے۔ لیکن اعجاز کے سامنے وہ اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتی تھی۔ نیلی نے اس کی اس تنبیہہ کی ذرا بھی پروا نہ کی۔

"دیکھا آپ نے — نہ خود کسی سے بات کرتی ہیں نہ کرنے دیتی ہیں۔" نیلی نے شکایتاً کہا۔

اعجاز کھسیانی ہنسی ہنسا۔

"نیلی آپ سے کتنی چھوٹی ہیں؟" محض بات کرنے کے لیے اُس نے پوچھا۔

"پانچ سال۔" شیزی نے کہا، "لیکن اس میں بچپنا بہت ہے۔"

"یہ شیزی عمر میں مجھ سے اتنی بڑی نہیں ہیں جتنی بنتی ہیں۔" نیلی نے جواباً کہا۔

"اچھا اب چلو گی یا نہیں۔" شیزی بولی۔

"چلتی ہوں۔" نیلی نے کہا اور اسی طرح بیٹھی رہی۔

"میں آپ دونوں کے لیے تحفے لایا تھا چھوٹے موٹے — اگر آپ کہیے تو ابھی دے دوں۔"

"شام کو دے دیجیے گا، جب آپ نیچے آئیں۔" شیزی بڑی محتاط تھی۔

"واہ — ابھی کیوں نہیں۔" نیلی نے کہا۔

شیزی نے اُسے ذرا سا گھور کر دیکھا۔ "نیلی! — چلو پلیز۔" اس کا لہجہ سخت تھا۔

"اچھا ایک بات بتائیے، تحفے آپ لائے ہیں یا — زری خان نے بھیجے ہیں؟" نیلی نے پوچھا۔

"ڈونٹ بی سلی نیلی۔" شیزی نے اسے پھر ٹوکا۔ "کتنی مرتبہ کہا ہے کہ —" شیزی نے نیلی کا ہاتھ پکڑا اور اسے زبردستی اپنے ساتھ لے گئی۔ دروازے سے نکلتے نکلتے اُس نے اعجاز سے کہا۔ "نیلی اسی طرح ہر ایک کو پریشان کرتی ہے۔ آئی ہوپ یو ڈونٹ مائنڈ۔"

"ناٹ ایٹ آل۔" اعجاز نے کہا۔

دس منٹ بعد دروازے پر ہلکی سی دستک ہوئی۔ اعجاز نے اُٹھ کر دیکھا۔ نیلی ایک بڑا سا پرانا البم لیے کھڑی تھی۔ "آ جاؤں؟" اُس نے کہا۔

"اوہ!" اعجاز گھبرا گیا۔ "اس وقت آپ البم نہ لاتیں تو اچھا تھا۔"

''پھر کبھی ملنا مشکل تھا۔ ممی اپنے کپڑوں کی الماری میں پیچھے کی طرف چھپا کر رکھتی ہیں۔'' نیلی نے کہا۔

''وہ پارٹی میں مشغول ہیں اور شیزی پڑھتے پڑھتے سو گئی ہیں۔ میں دیکھ کر آئی ہوں۔''

''اچھا۔ آپ البم چھوڑ جائیے۔ دس منٹ بعد آ کر لے جائیے گا۔'' اعجاز نے کہا۔

''نہیں، میں آپ کو دکھاتی ہوں۔'' وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ منقش میز پر البم رکھ کر اس نے کھولا۔ ''دیکھیے۔'' جیسے کوئی بہت بڑی ٹرافی دکھانے والی ہو۔ یکایک اس کے چہرے پر وحشت سی دوڑ گئی۔ جلدی جلدی اس نے کئی ورق اُلٹے۔ ''شاید ممی کو پتا چل گیا ہے کہ میں یہ البم دیکھتی رہتی ہوں۔'' اس نے مایوسی سے کہا۔ ''انھوں نے تو ساری تصویریں نکال لی ہیں۔''

''نکال لیں!'' اعجاز نے حیرت سے کہا، ''ذرا دکھائیے۔'' وہ صوفے پر بیٹھ گیا۔ سیاہ البم میں جگہ جگہ سے تصویریں غائب تھیں۔ سفید روشنائی میں صفائی سے نیچے نام اور سن لکھے ہوئے تھے۔ وہ زیادہ تر گروپ فوٹو تھے اور نکالی گئی ہر تصویر کے نیچے لکھے ہوئے ناموں میں زری کا نام موجود تھا۔

''اچھا، اب آپ جلدی سے اس البم کو اس کی جگہ پر رکھ آئیے۔'' اعجاز کی مایوسی نیلی سے کم نہ تھی۔ ''میں چند ضروری خط لکھنا چاہتا ہوں۔''

''اگر میں انھیں خط لکھوں تو کیا آپ اپنے لفافے میں ڈال کر بھیج دیں گے؟''

''کن کو؟'' اعجاز نے پوچھا۔

''زری خان!'' وہ اپنی مخصوص معصومانہ ہنسی ہنس دی۔

''آپ انھیں زری آنٹی کیوں نہیں کہتیں؟'' اعجاز نے کہا۔

''ان سے کبھی ملی نہیں نا اس لیے۔ اور میں تو شیزی کو بھی شیزی ہی کہتی ہوں۔ ممی کہتی ہیں، بہن بھائیوں کو ایک دوسرے کا نام لینا چاہیے۔ آپا، باجی وغیرہ کہنا انھیں اچھا نہیں لگتا۔'' نیلی نے کہا۔

''آپ انھیں خط کیوں لکھنا چاہتی ہیں؟'' اعجاز نے پوچھا۔

''مجھے اچھی لگتی ہیں وہ۔'' نیلی بھولپن سے بولی، ''اور میں یہ بھی پوچھنا چاہتی ہوں کہ ممی ان سے کیوں ناراض ہیں؟''

''ہونہہ — اچھا، تو لکھ دیجیے۔ لیکن ذمہ داری آپ کی ہوگی۔ میری نہیں۔'' اعجاز نے کہا۔

''شیور۔'' وہ ہنسی۔ ''میں اپنی مرضی سے لکھ رہی ہوں۔ اچھا اب میں یہ البم لے جاتی ہوں۔''

وہ البم لے کر نکلی تو اعجاز نے اندر سے دروازہ بند کر لیا۔

بہت دن پیشتر کراچی میں امریکا سے ایک وفد سندھ کی سیر کو آیا تھا۔ زری اور اعجاز ان کے ساتھ گئے تھے۔ کراچی کی دھوپ میں رنگین سندھی ٹوپیاں اوڑھے، رنگین چشمے لگائے، پسینے اور یوڈی کلون سے نہائی یہ عورتیں چوکنڈی کی قبروں کے ڈیزائن اتارنے میں مصروف تھیں۔ مرد اس قبرستان کی تاریخِ پیدائش پر بحث کر رہے تھے۔ قبروں کے نمونے اور ان کی سمت اُن کے مسلمان ہونے کی دلیل ہیں۔ مگر کھدائی میں بعض قبروں سے دو مردے نکلے ہیں۔ یہ کیوں؟— اور پھر قبروں پر اتنی خوب صورت پچی کاری کرنے والوں کے گھر کہاں معدوم ہو گئے؟ انھوں نے اپنے گھروں کی تزئین کیوں نہ کی؟ اس قسم کے سوالوں کے دوران اعجاز نے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے زری کے ماضی کے بارے میں چند سوال چھیڑے تھے۔ زری نے اپنا مخصوص بشاش قہقہہ لگا کر کہا تھا، ''اعجاز، میں انسان ہوں، چوکنڈی کا قبرستان نہیں ہوں جو تم کھدائی کر کے نوادرات برآمد کرنا چاہتے ہو— یاد رکھو، نوادرات بڑا دردِ سر ہوتے ہیں۔ ساری عمر یہ تحقیق کرنا پڑتا ہے کہ یہ اصلی ہیں یا نقلی— کس دور کے ہیں، کس نے ان کو کن داموں کس کے ہاتھ بیچا تھا۔''

''تو تم اپنے دوستوں کے بارے میں کچھ جاننا نہیں چاہتیں؟'' اعجاز نے حیرت سے پوچھا۔

''کیا ضروری ہے کہ انسان اپنے دوستوں کے بارے میں یہ بات ضرور جانے کہ کتنے بھیانک قسم کے گناہ انھوں نے کیے ہیں۔'' وہ پھر ہنس دی تھی۔

''بھیانک قسم کے گناہ جاننے کے لیے ہی انسان کسی کے ماضی میں دلچسپی نہیں لیتا۔'' اعجاز

نے کہا تھا، ''بلکہ یہ جاننا ہی اس کی ذات میں دل چسپی لینے کا ایک پہلو ہے کہ اس کے والدین کہاں ہیں، وہ کہاں کہاں رہا ہے اور کیا کرتا رہا ہے؟''

''بہرحال، مجھے ان باتوں سے کوئی خاص دل چسپی نہیں ـــ میں تو جس کتاب کو جہاں سے کھول لیتی ہوں وہیں سے پڑھنا شروع کر دیتی ہوں۔''

''حالاں کہ ہر شخص کسی اچھی کتاب کو شروع سے آخر تک پڑھنا چاہتا ہے۔''

''مگر ـــ کسی شخص کی زندگی کی کتاب میں ہوتا ہی کیا ہے۔'' زری نے کہا تھا، ''چند تمنائیں، کچھ بے ضرر یا باضرر واقعات اور چند پچھتاوے ـــ تمھاری زندگی میں بھی یہی ہوگا۔ ممکن ہے پچھتاوے ابھی نہ ہوں تو پھر سہی ـــ آؤ چلیں، ہمیں اپنے مہمانوں کے ساتھ رہنا چاہیے۔''

اب خدا معلوم زری کی اپنی زندگی میں بے ضرر یا باضرر واقعات اور پچھتاووں کی تعداد کتنی تھی۔ اعجاز ایک نئی سوچ میں غرق ہو گیا تھا۔ زری اور قصرِ نیلم کے مکینوں کے رشتے کے بارے میں جتنا سوچتا تھا، اُلجھن بڑھتی تھی۔ زری دُور تھی۔ اس سے پوچھنا ممکن نہ تھا۔ خط میں اس کا کچھ لکھنا بھی قرینِ قیاس نہ تھا۔ کیوں کہ اسے بات ٹالنے کا عجیب و غریب ملکہ تھا۔ ایک مرتبہ ہمت کر کے اُس نے زری سے پوچھا تھا، ''تم نے اب تک شادی کیوں نہیں کی؟''

''تم نے کوہِ نور ہیرے کی تاریخ پڑھی ہے؟'' اُس نے جواب دیا تھا، ''کسی شاہِ برطانیہ نے اس تاج کو سر پر نہیں رکھا جس میں کوہِ نور جڑا ہوا ہے۔ کیوں کہ اس ہیرے کو منحوس سمجھا جاتا ہے۔ لیکن دُنیا کی کوئی سلطنت ایسی نہیں جو اسے اپنے خزانے میں نہ رکھنا چاہے۔''

اعجاز اپنے سوال اور اس جواب کا رشتہ ڈھونڈتا رہ گیا تھا ـــ کیا اس سلسلے میں وہ بیگم احسن سے بات کرے یا شیزی سے کچھ پوچھے!! ـــ مگر ابھی تک ان دونوں نے کبھی اس سے بے تکلفی سے بات تک نہ کی تھی۔ خاصی دِقت سے اعجاز نے زری کی طرف سے دھیان ہٹایا جو کسی ضدی بچّے کی طرح بار بار اُس کے خیال کا پلّو اپنی طرف کھینچ رہا تھا اور ناصر خان کو ایک مختصر سا خط لکھا تا کہ معلوم تو ہو کہ اُس پر کیا بیتی۔ اعجاز کا خیال تھا کہ قصرِ نیلم کے عارضی پتے سے ناصر خان کو خط لکھنا زیادہ محفوظ بھی تھا۔

شام کی چائے پر اعجاز نے ایک ایک پیکٹ شہزادی اور نیلی کو دیا۔ دونوں نے ''تھینکیو'' کہہ کر لے لیا۔ احسن صاحب نے تھوڑا سا احتجاج کیا لیکن بیگم احسن کچھ نہ بولیں۔ احسن صاحب نے تھوڑی دیر ملک کے غیر یقینی حالات پر بات چیت کی۔ ایسی صورتِ حال میں بزنس پر بہت بُرا اثر پڑتا ہے، وہ بتاتے رہے۔ اُٹھنے سے پہلے اعجاز نے یہ بات نکالی کہ اِنٹرویو کا جواب دو ایک دن میں ملنے کی امید ہے۔ احسن صاحب نے کہا کہ اس وقت اس کا کراچی جانا اور پھر آنا مناسب نہیں، بہتر ہے کہ

وہ لاہور ہی میں ٹھہر جائے۔ نیلی نے فوراً احسن صاحب کی بات پر صاد کیا، شیزی خاموش تھی۔ اس کے چہرے پر کوئی ایسا تاثر نہ تھا جس سے اس کی مخالفت کا یا موافقت کا اندازہ ہو۔ بیگم احسن کے چہرے پر ناگواری کے آثار تھے لیکن دوسروں کے سامنے شوہر کی مخالفت کرنا شاید ان کی عادت نہیں تھی یا ایٹی کیٹ کے خلاف سمجھتی تھیں۔ اعجاز نے فرضی دوست کے ملنے اور اُس کے گھر اُٹھ جانے کی داستان شروع ہی کی تھی کہ احسن صاحب نے فوراً کوئی دوسری بات شروع کر کے موضوع بدل دیا۔

اعجاز نیچے اترا تو اسے اندازہ ہوا کہ آج کا دن غیر معمولی خوب صورت دن ہے۔ سردیوں کی دھوپ سارے باغ پر پھیلی ہوئی تھی۔ دُہری پتیوں کے بڑے بڑے گلاب رنگ برنگے لبادے اوڑھے شاخوں کے کاندھوں پر حسین بوجھ کی طرح لدے ہوئے تھے۔ بیگم احسن آتے جاتے اپنے گلاب کے پھولوں کو بڑی چاہت سے دیکھتی تھیں اور آنے جانے والوں کو فخر سے دکھاتی تھیں۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ جو پھول مرجھاتا ہے اُن کے دل کو مسلتا ہے۔ اُن کا بس چلتا تو ہر پھول پر آبِ حیات چھڑک دیتیں کہ جو ایک دفعہ کھل جائے کبھی نہ مرجھائے۔

شیزی لان میں پڑی ہوئی کرسی پر ایک کتاب لیے تنہا بیٹھی تھی۔ اعجاز کو اندازہ ہو چلا تھا کہ شیزی کی طبیعت میں وہ بشاشت اور چونچالی نہیں ہے جو اس عمر کا خاصہ ہوتی ہے۔ والدین اپنے اپنے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ ان کے پاس یہ دیکھنے کا بھی وقت نہیں تھا کہ شیزی کتنی تنہا ہے۔ نیلی اس سے چھوٹی بھی تھی اور دونوں میں ذہنی قربت نہیں تھی۔ شاید کتابیں ہی شیزی کی بہترین ساتھی تھیں۔ لیکن اعجاز جانتا تھا کہ بعض اوقات کتابیں بھی اس خودغرض دوست کی طرح انسان کو بے حد تھکا دیتی ہیں جو اپنے ساتھی کے غم کو محسوس کرنے کے بجائے اپنی ہی کہے جاتا ہے۔ شاید ایسا ہی لمحہ تھا، کتاب شیزی کے ہاتھ میں ضرور تھی مگر وہ اسے پڑھ نہیں رہی تھی۔ اعجاز نے اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی۔ آج گیراج میں ایک بھی گاڑی نہیں تھی۔ لکڑی کے کٹاؤ دار محرابی پل کے نیچے منی سی نہر میں پتے اور بوگن ولا کی رنگین پنکھڑیاں خوب صورت بجروں کی طرح تیز رہی تھیں۔ بڑے بڑے درختوں میں

چھپی چڑیاں میٹھی میٹھی بولیاں بول رہی تھیں۔ موسمِ خزاں کی درختوں سے گرتی پتیاں تتلیاں معلوم ہو رہی تھیں۔ عام حالات میں اعجاز شیزی سے نظریں بچاتا یا تو قصرِ نیلم سے باہر چلا جاتا، ورنہ دوبارہ اپنے کمرے کا رُخ کرتا۔ لیکن آج اسے تنہا پا کر زری کے بارے میں مزید جاننے کی خواہش کو دبا نہ سکا۔

''کیا ہو رہا ہے؟'' نزدیک پہنچ کر اعجاز نے کہا۔

''کچھ نہیں۔'' شیزی نے سٹپٹا کر آنکھیں کھولیں۔ ''بیٹھے بیٹھے وہ اونگھ گئی تھی۔ اس کی آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں اور بالوں کی لٹیں بکھری ہوئی تھیں۔'' آج ہمارے کالج کی چھٹی جلد ہو گئی، ہنگامے کی وجہ سے۔''

''اور نیلی؟'' اعجاز نے پوچھا۔

''نیلی تو آج اسکول نہیں گئی۔'' شیزی نے جواب دیا۔ ''اپنی دوست نغمہ کے گھر گئی ہے۔ یہیں نزدیک ہی کہیں اس کا گھر ہے۔ واپسی پر ممی اُسے لیتی آئیں گی۔''

گویا وہ واقعی تنہا ہیں۔ اعجاز نے سوچا۔

''موسم اتنا خوب صورت ہے کہ اندر بیٹھے رہنے کو جی نہ چاہا۔'' اعجاز نے کہا، ''آپ کو بیٹھا دیکھ کر اِدھر آ گیا۔''

''بیٹھیے۔ میں دوسری کرسی منگوا لیتی ہوں۔'' شیزی اُٹھ کھڑی ہوئی۔

قبل اس کے کہ شیزی کسی کو آواز دے، اعجاز نے لپک کر برآمدے سے ہلکی سی گارڈن چیئر اٹھائی اور شیزی کے برابر بیٹھ گیا۔ شیزی اپنے ہاتھ کی کتاب کو بے دردی سے دبوچ رہی تھی۔

کیاریوں کے پھولوں پر تتلیاں اور بھونرے پھولوں کے مدھ اور سردی کی دُھوپ سے ست، کتنی ہی دیر ایک جگہ پڑے رہتے، اور اُڑتے تو یوں جیسے اُن کے پر بھاری پڑ گئے ہوں۔ اعجاز گفتگو کے آغاز کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہا تھا اور شیزی سامنے دیکھ رہی تھی۔ کتاب میں سے ڈاک کا ایک لفافہ نکل کر گھاس پر گرا۔ شیزی نے جلدی سے اُٹھا کر اسے دوبارہ کتاب میں رکھ لیا۔

''شیزی آپ سے ایک بات پوچھوں؟'' اعجاز نے کہا۔

شیزی کا رنگ لمحے بھر کر اُڑ گیا۔ اس نے حیرت بھری نگاہوں سے اعجاز کی طرف دیکھا۔ پھر سنبھل کر نظریں جھکائیں اور کہا، ''پوچھیے۔''

اعجاز کو اندازہ ہو چلا تھا کہ شیزی اپنے والدین سے زیادہ بے تکلف نہیں ہے۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ جو باتیں ان کے درمیان ہوں وہ احسن صاحب اور بیگم احسن تک نہ پہنچیں۔

''آپ زری خان کے بارے میں کیا جانتی ہیں؟'' اعجاز نے بالآخر کہہ ڈالا۔

شیزی نے دوبارہ چونک کر اعجاز کی طرف دیکھا۔ شاید اسے اس سوال کی توقع بالکل نہ تھی۔ اس کے چہرے پر دیر تک گومگو کے آثار رہے۔ ''مجھے صرف اتنا معلوم ہے۔'' ٹھہر ٹھہر کر اس نے کہا، ''بہت پہلے کبھی ہماری سب سے چھوٹی خالہ چمن زری خان کے ساتھ رہتی تھیں۔''

''اب وہ خالہ کہاں ہیں؟'' اعجاز نے پوچھا۔

''وہ تو بہت عرصے سے ملک کے باہر ہیں۔ خالو ماریشس میں بزنس کرتے ہیں۔''

''آپ نے کبھی زری کو دیکھا ہے؟'' اعجاز نے پوچھا۔

''شاید بچپن میں کبھی دیکھا ہو، مجھے یاد نہیں۔ وہ کراچی میں رہتی ہیں ہم لاہور میں۔''

''کبھی کسی موقعے پر ملاقات نہیں ہوئی؟''

''نہیں، میں نے سنا ہے کہ وہ اپنے رشتے داروں سے ملنا نہیں چاہتیں۔ اسی لیے وہ اپنے آبائی گاؤں بھی نہیں جاتیں۔'' شیزی نے کہا، ''مگر آپ یہ سب کیوں پوچھ رہے ہیں؟''

''یوں ہی ـــ کوئی دوست اُن سے شادی کرنا چاہتا ہے اور ان کے بارے میں جاننا چاہتا ہے۔'' اعجاز نے یہ بات اتنے متامّل انداز میں کہی کہ خود ہی پریشان ہوگیا۔ اس کے چہرے کی سرخی اُس کے دل کی غماز بن گئی اور جب یہ خیال آیا کہ شیزی بات پا گئی ہے تو وہ اور بھی شرمندہ ہوگیا۔ کچھ دیر دونوں نظریں جھکائے بیٹھے رہے۔ ڈرتے ڈرتے اعجاز نے شیزی کی طرف دیکھا۔ اس کے پُرسکون چہرے کو دیکھ کر حوصلہ ہوا۔

''آپ کچھ اور بتانا چاہیں گی؟'' اعجاز نے پوچھا۔

''نہیں ـــ اور مجھے کچھ معلوم نہیں۔'' شیزی نے کتاب کو کلیجے سے لگائے لگائے کہا۔

''اچھا، اب میں چلوں گا۔'' اعجاز اُٹھ کھڑا ہوا۔ شیزی بھی کھڑی ہوگئی۔

اُسی وقت صدر دروازہ کھلا اور ایک کار اندر داخل ہوئی۔ بیگم احسن نے اعجاز اور شیزی کو باتیں کرتے دیکھا۔ معاً انھیں احساس ہوا کہ شیزی اعجاز سے باتیں کرتے ہوئے مطمئن اور پُرسکون سی ہے۔ جب کہ تنہائی میں جواد کے ساتھ وہ ہمیشہ گھبرائی ہوئی اور حواس باختہ سی نظر آتی ہے۔

''آج شام تم کیا کر رہے ہو؟'' دوپہر کے کھانے پر احسن صاحب نے اعجاز سے پوچھا۔

''کوئی خاص کام نہیں۔ صرف ایک خط پوسٹ کرنے کا ارادہ ہے۔''

''خط تو کہیں بھی ڈالا جا سکتا ہے۔ آج تم میرے ساتھ گالف کلب چلو۔ مردوں کو باہر بھی نکلنا چاہیے۔'' یہ کہہ کر وہ خوش دلی سے ہنسے۔

''ضرور چلوں گا۔'' اعجاز فوراً تیار ہو گیا۔ اُسے اندازہ ہو رہا تھا کہ احسن صاحب کے کچھ کام کسی اور مصلحت کے تحت ہوتے ہیں جس کو وہ ہر ایک پر ظاہر نہیں کرتے۔

''شیزی بیٹا! کھانے کے بعد میرا گالف کِٹ صاف کروا کے گاڑی میں رکھوا دینا اور کرم داد سے کہنا میرے کھیل کے کپڑے اور جوتے وغیرہ دیکھ لے۔''

''جی پاپا۔'' شیزی نے فرماں برداری سے کہا۔

''اور تمھاری پڑھائی کیسی چل رہی ہے؟'' انھوں نے پوچھا۔

''جیسی سب کالجوں میں چل رہی ہے۔ آئے دن ہڑتالوں کی وجہ سے اسکول کالج بند ہو رہے ہیں۔ ہمارا کالج بھی بند ہو جاتا ہے۔'' ذرا دیر خاموش رہنے کے بعد ذرا سی ہچکچاہٹ سے اس نے کہا، ''پاپا! میں ذرا ڈیزی کے پاس جانا چاہتی تھی تھوڑی دیر کے لیے ——''

''ہاں ہاں، چلی جانا —— آج کل کیا کر رہی ہے وہ؟ کہاں رہتی ہے؟ اس کے والدین تو کراچی چلے گئے ہیں نا؟''

''جی پاپا— وہ وائی ڈبلیو سی اے میں رہتی ہے۔''

''کوئی ضرورت نہیں ہے اس کے پاس جانے کی، آج کل حالات اچھے نہیں، روز گولیاں چل رہی ہیں۔'' بیگم احسن نے کہا۔ ''جانے کتنے لوگ روز مر رہے ہیں۔''

''نہیں امی لوگ بڑھاتے ہیں، آپ اخبار تو پڑھتی ہیں۔'' شیزی نے کہا۔

''اخبار میں اصل خبریں نہیں ہوتیں۔'' بیگم احسن نے بھنویں چڑھا کر ناگواری سے اضافہ کیا، ''اور سن لو کہ مجھے تمھاری یہ دوست بالکل پسند نہیں ہے۔ تم میں اور اُس میں کیا بات کامن ہے، یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔''

''وہ میری بچپن کی دوست ہے ممی۔ آپ کو معلوم ہے کہ ہم کئی سال کلاس فیلوز رہی ہیں۔'' شیزی نے کہا۔

''وہ تمھارے اسکول میں اس لیے پڑھتی تھی کہ مسز ڈی سوزا تمھارے اسکول میں میوزک ٹیچر تھیں ورنہ اُن کی اتنی حیثیت تھی کہ—''

''ثروت! تم بہت status conscious ہوتی جا رہی ہو۔ ہے نا بچیو۔'' احسن صاحب ہنسے، گویا جملے کی سنجیدگی کو کم کر رہے ہوں۔

''بالکل— ممی ہمیشہ سے status conscious ہیں۔'' نیلی نے کہا اور پھر یکایک سرخ ہوگئی جیسے اُس نے کوئی بہت بڑی بات کہہ دی ہو۔

''اور تم بہت منھ پھٹ ہوتی جا رہی ہو۔'' بیگم احسن نے نیلی کی طرف دیکھ کر کہا اور فوراً اپنی صفائی پیش کی، ''آپ کو معلوم نہیں ہے ڈیزی بہت آزاد خیال ہوگئی ہے۔ کیا تھا اگر وہ اپنے ماں باپ کے ساتھ کراچی چلی جاتی، مگر اسے تو الگ رہنے کا شوق ہے۔''

''دیکھیے، آپ یہ بات بھول رہی ہیں کہ وہ عیسائی ہے۔ ان کا کلچر بہت سی ایسی باتوں کی اجازت دیتا ہے جو ہمارا کلچر نہیں دیتا۔ شیزی بیٹا! تم تیار ہو جاؤ ہم خود تمھیں تمھاری سہیلی کے پاس چھوڑ دیں گے اور واپسی میں لے لیں گے۔ بیگم اب تو خوش ہو!'' احسن صاحب نے بیگم احسن کی طرف دیکھا۔ وہ ذرا بھی خوش نہیں تھیں مگر انھوں نے خاموشی میں مصلحت جانی۔

شیزی نے ڈیزی کو فون کر دیا تھا۔ وہ وائی ڈبلیو سی اے کی عمارت کے پھاٹک پر اس کی منتظر تھی۔ آگے بڑھ کر کار تک آئی اور احسن صاحب کو انگریزی میں وِش کیا۔ احسن صاحب نے اس کی اور والدین کی خیریت پوچھی۔ پھر ڈیزی نے ایک نگاہ اعجاز پر ڈالی اور اعجاز نے فوراً محسوس کیا جیسے وہ بہت عرصے سے نظروں سے ترازو کا کام لے رہی ہو۔ ڈیزی عمر میں بھی شہزادی سے بڑی تھی اور یقیناً تجربے میں بھی۔

آج جو خط اعجاز نے زری کو لکھا تھا وہ اس خیال سے جیب میں رکھ لیا تھا کہ راستے میں لیٹر بکس میں ڈال دے گا۔ غالباً اس خط پر احسن صاحب کی نگاہ پڑ گئی یا یوں ہی شیزی کو اتارنے کے بعد انھوں نے اعجاز سے پوچھا، ''آپ اور زری ساتھ کام کرتے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' اعجاز نے کہا۔

ذرا دیر خاموشی رہی، اس کے بعد اعجاز نے کہا، ''زری نے میرے ہاتھ جو خط بھیجا تھا، وہ بہت ضروری معلوم ہوتا تھا کیوں کہ وہ ایک آدمی ایبٹ آباد سے سوات لے کر آیا تھا۔ آپ نے اس کا جواب دے دیا۔''

احسن صاحب کے چہرے سے محسوس ہوا جیسے انھیں اعجاز کی یہ کرید اچھی نہ لگی ہو۔ لیکن فوراً ہی انھیں خیال آیا کہ معاملہ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے کا ہے۔ ابھی وہ خود زری کے بارے میں کئی باتیں کریدنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ انھوں نے فوراً عام سے لہجے میں کہا، ''ہاں، وہ زری کا نہیں، اصل میں اُن کے چچا عمر کا خط تھا۔ کوئی کاروباری معاملہ تھا۔ زری کس سلسلے میں ایبٹ آباد گئی ہوئی تھی؟''

''اپنے محکمے کے کام کے سلسلے میں۔'' اعجاز نے کہا۔

''اچھا، کراچی میں وہ کس کے ساتھ رہتی ہے؟'' احسن صاحب نے پوچھا۔

''تنہا، شاید ایک بوڑھی سی ملازمہ ہے، آپ کبھی ان کے گھر نہیں گئے؟'' اعجاز نے بھولپن سے پوچھا۔

''نہیں، کبھی اتفاق نہیں ہوا۔'' احسن صاحب نے کہا، ''آپ مجھے اُس کا پتا دے دیجیے گا، شاید کبھی ضرورت پڑ جائے۔''

''ابھی لکھ لیجیے۔'' اعجاز نے کہا۔

''ہاں ابھی لکھے لیتا ہوں، ڈائری میرے پاس ہے۔'' انھوں نے ایک منی سی ڈائری نکالی۔ اعجاز پتا بتاتا رہا، وہ لکھتے رہے۔ پتا لکھ کر انھوں نے ڈائری جیب میں رکھ لی۔ اعجاز نے نوٹ کیا کہ احسن صاحب نے اوپر زری کا نام نہیں لکھا۔

کلب کی سفید عمارت سامنے سے رومن طرز کی تھی۔ وہی شان دار اونچے، گول چکنے ستون۔ عمارت پیچھے کی طرف سے باریک جالیوں اور پیلے پن کی وجہ سے ہاتھی دانت کی بنی ہوئی لگتی تھی، اور یہ بات بھی اس کی شان اور دبدبے میں اضافے کا باعث تھی۔ سامنے پُرفضا اور خوش نما چمن زار تھا جو جا کر لارنس باغ سے مل جاتا تھا۔ اندر کمروں کی چھتیں اونچی تھیں۔ ہال کی چھت پر رنگین پھول دار حاشیہ بنا ہوا تھا۔ حکومت اور فوج کے بڑے بڑے افسر پینے پلانے اور باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ چند غیر ملکی خواتین اور بچے گالف کا سامان سنبھالے گرین کی طرف جا رہے تھے۔

''تم میرے ساتھ چلو گے یا تھوڑی دیر بیٹھو گے؟'' احسن صاحب نے پوچھا۔

اعجاز نے ساتھ چلنے کو ترجیح دی۔ احسن صاحب بہت دن بعد کھیلنے کے لیے آئے تھے اس لیے انھوں نے تنہا پریکٹس کرنے کو ترجیح دی۔ پہلے 'ٹی' سے انھوں نے گیند پھینکی، اور اس کے پیچھے چلے۔ اعجاز اور کیڈی سامان کا تھیلا سنبھالے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ چوتھے یا پانچویں ہول (hole) کے بعد ان کے ہاتھ میں جھٹکا آ گیا اور وہ اعجاز کو لے کر واپس چلے آئے۔ ''پریکٹس نہیں رہی۔'' انھوں نے کہا، ''وقت نہیں ملتا۔ بزنس میں آدمی کو کسی کام کے لیے وقت نہیں ملتا۔ اب چند دن کی فرصت ملی تھی، جی چاہا گالف کھیل لیا جائے لیکن انسان جس چیز سے غفلت برتتے وہ وقت پڑنے پر بدلہ لے لیتی ہے۔'' وہ اپنی ایک کلائی دوسرے ہاتھ سے پکڑے ہوئے تھے۔ کلب پہنچ کر انھوں نے آواز لگائی۔ ''فضل دین! ذرا ایک پٹی بھجوا دو ہاتھ پر باندھنے کے لیے۔''

تھوڑی دیر بعد ایک بیرا بڑے مؤدّب انداز میں جھک کر احسن صاحب کی کلائی پر پٹی باندھنے لگا۔ اعجاز کے انکار کے باوجود انھوں نے کافی کا آرڈر دیا اور اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔

''تمھارے خیال میں زری کیسی لڑکی ہے؟'' ذرا دیر بعد اچانک انھوں نے پوچھا۔

''میں تو یہ بات آپ سے پوچھنے والا تھا۔'' اعجاز نے کہا۔

''اوہ۔'' وہ ہنسے۔ ''میں اسے نہیں جانتا، بالکل نہیں جانتا۔ اتفاق ہے کہ فیملی کے ساتھ کبھی کراچی جانا نہیں ہوا۔ میں کبھی ملک سے باہر جاتا ہوں تو ایک آدھ دن کے لیے کراچی کے کسی ہوٹل میں ٹھہر جاتا ہوں۔ ثروت کے دوسرے رشتے داروں سے بھی میری زیادہ ملاقات نہیں۔ بزنس مین کے پاس اتنا وقت کہاں کہ دیہاتوں اور گاؤں کا چکّر لگاتا پھرے۔ بچیاں کبھی کبھار چلی جاتی ہیں۔''

اعجاز نے محسوس کیا کہ وہ اس سے باتیں کر رہے ہیں مگر ان کا ذہن کہیں اور ہے۔ صنعت کاروں کا ذہن یا تو بزنس میں ہوتا ہے یا تجوریوں میں، اعجاز نے سوچا۔ ان کے شوق بھی بس دکھاوے کے ہوتے ہیں۔ محبت ہو یا کھیل، وہ والہانہ شیفتگی کہاں جو سچّی طلب والوں کا حصّہ ہوتی ہے۔ کتابوں سے دل لگایا تو انھیں کے ہو رہے۔ کھیلے تو کھُل کھیلے۔ محبت کی تو اس میں ڈوب رہے۔ یہ لوگ تو ساری عمر بحرِ مردار کے پانی پر تیرتے رہتے ہیں کہ ڈوبنا چاہیں بھی تو ڈوب نہیں سکتے۔

ڈیزی شہزادی کو لے کر اپنے کمرے میں آئی۔ ''شیزی! واٹز دا پروبلم؟ تم فون پر بہت پریشان معلوم ہو رہی تھیں۔''

''ہاں ایسی ہی بات ہے۔'' شیزی نے کہا، ''آج پرویز کا خط ملا ہے۔ وہ بہت جلد آ رہا ہے۔ اتفاق سے وہ خط میرے ہی ہاتھ لگا ہے اور میں نے اب تک کسی کو نہیں دکھایا۔''

''پرویز تمھارا منگیتر؟''

''بدقسمتی سے میرا شوہر ہے۔'' شیزی کی آواز میں لرزش تھی۔

''اوہ سوری، میں ہمیشہ بھول جاتی ہوں کہ تمھاری میرج ہو چکی ہے۔''

''میرج نہیں نکاح۔'' شیزی نے تصحیح کی۔

''ہاں نکاح — پر، واٹز دا پروبلم۔''

''پروبلم یہ ہے۔ دیکھو غور سے سننا اور فار گاڈز سیک میرا مذاق نہ اڑانا۔ تم دُنیا میں واحد شخص ہو جس کو میں یہ بات بتا سکتی ہوں۔''

''تو بولو — بتاؤ۔'' ڈیزی نے کہا۔

شیزی نے انگریزی میں بات شروع کی تا کہ ڈیزی پوری طرح سمجھ سکے۔ ویسے بھی بات نازک تھی۔ اس کا خیال تھا، غیر زبان میں ادا کرنا نسبتاً آسان ہوگا، ''تم ممی کو جانتی ہو۔ پہلے تو جواد اور اُس کے گھر والوں سے بے حد مسحور ہوئیں اور اس وقت جب مجھے کسی بات کا ہوش نہیں تھا، اٹھا کر میرا

نکاح کر دیا۔ شروع میں تو میں بھی خوش تھی کہ کھاتے پیتے اسمارٹ لوگ ہیں۔ کیپٹن جواد بڑا ہینڈسم ہے، وغیرہ۔ لیکن اب آہستہ آہستہ اُس کے بارے میں میرے خیالات بدل رہے ہیں۔ اب وہ آتا ہے تو ممی اس بات پر فخر کرتی ہیں کہ وہ دوسری تنگ نظر عورتوں کی طرح نہیں ہیں، وہ نکاح کے بعد اپنی بیٹی کو اُس کے دُولھا کے ساتھ باہر بھیجنے میں کوئی برائی نہیں سمجھتیں۔ اس کے ساتھ وہ نیلی کو میرے ہمراہ بھیجتی ہیں اور سمجھتی ہیں کہ انھوں نے مجھے ہر طرح محفوظ کر دیا ہے مگر ایسا نہیں ہوتا۔''

''پھر کیا ہوتا ہے؟'' ڈیزی ہنسی، پھر یکایک سنجیدہ ہوگئی۔

''پہلی مرتبہ کیا ہوا تھا، میں تمھیں بتاتی ہوں۔ ہم تینوں ساتھ پکچر دیکھنے گئے۔ نیلی نے اپنی دوست نغمہ کو ساتھ لینے پر اصرار کیا۔ چناں چہ اسے بھی ساتھ لے لیا گیا۔ ہم چاروں ایک مزاحیہ انگریزی فلم دیکھنے گئے جو بحیرۂ روم کے ساحلوں اور ہوٹلوں میں فلمائی گئی تھی۔ تم نے بھی شاید ایسی فلمیں دیکھی ہوں گی۔ وہ فرانسیسی کارٹون ہیرو کہ جب ہیروئن کا بوسہ لیتا ہے تو دونوں کے بدن سے پھلجھڑیاں سی چھوٹنے کی آواز آتی ہے۔ بے حد نیلا آسمان اور بے حد فیروزی سوئمنگ پول اور اس میں تیرتی لڑکیاں — میرے خیال میں ایسی فلمیں ہرگز اس قابل نہیں کہ کوئی نکاحی جوڑا انھیں ساتھ دیکھے، چہ جائے کہ چھوٹی بہن اور اس کی دوست کے ساتھ۔ مجھے بے حد کوفت ہو رہی تھی۔ مجھے دائیں بائیں دیکھتا پا کر جواد صاحب نے فرمایا، ''تمھیں فلم پسند نہیں آ رہی تو آؤ باہر کا ایک چکر لگا کر آتے ہیں۔'' میں نے موقع غنیمت جانا۔ فوراً اُٹھ کھڑی ہوئی۔ مگر جناب نیلی اور نغمہ اس چکرم کی بے وقوفیاں دیکھ کر ہنسنے میں مصروف تھیں اور ہرگز اس فلم سے دست بردار ہونے کو تیار نہیں تھیں۔ فلم کلب میں ہو رہی تھی اس لیے خطرے کی کوئی بات نہ تھی۔ جواد نے کہا، چلو ہم چائے پی کر آتے ہیں۔ چائے پینے کے بعد اُسے وہ تحفہ یاد آ گیا جو اس نے میرے لیے خریدا تھا اور اس کے کمرے پر پڑا ہوا تھا۔ میں ہچکچائی تو اُس نے کہا، ''ڈرتی کیوں ہو، ہم سند یافتہ میاں بیوی ہیں، مذہب، قانون، ہر ایک رُو سے۔'' میں نے نیلی اور نغمہ کے تنہا ہونے کی دُہائی دی تو اس نے کہا، ''ابھی پکچر ختم ہونے میں بہت دیر ہے۔'' اور کار اپنے کمرے کی طرف موڑ لی۔

مَیس میں اُس کا کمرہ ایک طرف کونے میں تھا۔ صاف ستھری روشیں، گملوں میں سفید، اُودے گُلِ داؤدی کھلے ہوئے تھے۔ دُور سرسبز ٹینس لان میں چند افسر ٹینس کھیل رہے تھے۔ ہم لیموں کی کلیوں کی کھٹی میٹھی خوشبو سونگھتے باڑ کے نزدیک سے اندر داخل ہوگئے۔ کمرے میں پہنچ کر ایک خوب صورت سا ڈبا میرے ہاتھ میں تھمانے کے بعد — اب میں کیا کہوں — بس یوں سمجھو کہ وہ خود اُس پکچر کا ہیرو بن گیا۔ جب میں نے مدافعت کی کوشش کی تو وہ بے حد جذباتی اور روٹھا ہوگیا اور اس کے بعد یوں لگتا

تھا جیسے اس پر جنون طاری ہو۔ ایک شدید غصّے کی کیفیت، جس کو وہ دبا رہا تھا۔ اُس کے انداز میں ابھی یا کبھی نہیں (now or never) کی طرف جو اشارہ تھا اس نے میرے دل کو بے حد مجروح کیا۔ محبت اور انا کے اس ٹکراؤ میں، میں 'کبھی نہیں' کے لیے بھی تیار تھی مگر یکایک مجھے خیال آیا کہ شاید یہ میرا پاگل پن ہوگا۔ 'کبھی نہیں' کا خیال مجھے طلاق اور ممی کی بے انتہا بوکھلاہٹ تک لے گیا۔ مجھے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سمندر کے درمیان کسی خطرناک چٹان پر کھڑی ہوں۔ محبت، مذہب، اخلاق، انا اور شرم و حیا کی لہریں بار بار اس سے ٹکرا رہی ہیں۔ مجھے پتا بھی نہ چلا اور پانی سر سے اونچا ہوگیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں نے گناہ کیا ہے۔ اور تمھیں بتاؤں کہ سب سے زیادہ دُکھ دینے والا احساس کیا تھا؟ یہ خیال کہ اب آئندہ کے لیے احتجاج کے سارے دروازے بھی بند ہوگئے ہیں۔''

ثیزی خاموش ہوگئی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اتنی دیر میں تھک کر چور ہوگئی ہو۔ اس کی رنگت زرد تھی اور سفید ہونٹ کپکپا رہے تھے۔ ڈیزی کچھ دیر خاموشی سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔ پھر بولی، ''تو پھر کیا ہوا ثیزی! وہ کہتا تو ٹھیک ہے نا کہ تم ہر لحاظ سے میاں بیوی ہو تو پھر سیکس کو ٹیبو (taboo) کیوں بناتی ہو؟''

''میں تمھیں بتا رہی ہوں نا کہ احساسِ گناہ میرا پیچھا نہیں چھوڑتا۔'' ثیزی نے روہانی آواز میں کہا۔

''وہ احساسِ گناہ نہیں، تمھارا احساسِ شکست ہے۔'' ڈیزی نے کہا، ''تم نے اس بات کو اپنی انا کا مسئلہ بنالیا ہے۔''

''اُس کے اصرار پر میری کیا حالت ہوتی ہے، Oh Daisy, I feel so humiliated.''

''کیا وہ میری اتنی سی بات نہیں مان سکتا تھا!'' ثیزی ہاتھوں میں منہ چھپا کر رو رہی تھی۔

''میری جان! اس میں ذلت کی کوئی بات نہیں۔'' ڈیزی نے کہا، ''شکر کرو کہ تم اُس سے اور وہ تم سے محبت کرتا ہے، ورنہ یہاں ایسے شادی شدہ جوڑے عام ہیں جن کا رشتہ ساری عمر طوائف اور تماش بین کا رشتہ رہتا ہے۔ یقین کرو، ایسی بیویاں بھی ہیں جن کے شوہر اُن کے علم میں، بلکہ ان کے سامنے دوسری عورتوں کے پاس جاتے ہیں اور وہ یہ کرب برداشت کرتی ہیں، یہ بے عزتی سہتی ہیں۔ میری نصیحت ہے کہ بہادر بنو۔ تم اُس کی بیوی ہو، محبت کرنے دو اور محبت کرو۔۔۔ سوچو، محبت میں humiliation کا کیا سوال ہے؟''

''مگر میرے لیے یہ بہت مشکل ہے ڈیزی! اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تمھارے پاس نہ آتی۔''

''یوں ہے تو پھر ایک ہی صورت ہے کہ تم تنہائی میں بالکل نہ ملو۔'' ڈیزی نے کہا۔

''مگر مجھے ممی مجبور کرتی ہیں اُس کے ساتھ جانے کے لیے۔ کہتی ہیں، بے چارہ اتنی دُور پشاور سے آتا ہے، اس کے ساتھ پکچر دیکھ آؤ گی یا گھوم پھر آؤ گی تو تمھارا کیا بگڑ جائے گا۔ لوگ باتیں

بناتے ہیں تو بنائیں، ہم اُن کی طرح دقیانوسی نہیں ہیں۔''

''کیا وہ اِس مسئلے کی پیچیدگی کو نہیں سمجھتیں یا وہ بھی چاہتی ہیں کہ تم ۔۔۔''

''نہیں، وہ واقعی نہیں سمجھتیں ورنہ نیلی کو ساتھ بھیجنے پر اصرار نہ کرتیں۔ نیلی بے حد منھ پھٹ ہے لیکن وہ اس لیے خاموش ہے کہ وہ اپنی دوست کو ممی سے چھپا کر ساتھ لے جاتی ہے اور سمجھتی ہے کہ اصل میں یہ اس کا راز ہے۔ بے چاری نیلی۔''

''اوہ مائی گاڈ!'' ڈیزی نے آسمان کی طرف دیکھا۔ ''خدا جانے یہ مائیں ہاتھی دانت کے کون سے میناروں میں رہتی ہیں۔''

''وہ پھر آ رہا ہے۔ بتاؤ میں کیا کروں؟'' شیزی نے کہا۔

''تم ممی کو صاف بتا دو۔ نو پرابلم۔''

''میرے لیے یہ بھی بہت مشکل ہے ڈیزی۔'' شیزی رونکھی ہوگئی۔ ''ممی سے میری اتنی بے تکلفی نہیں ہے۔''

''پھر اس کا ایک ہی حل ہے۔ میں بہت جلد کراچی جا رہی ہوں، تم میرے ساتھ چلی چلو۔''

''یہ بھی ناممکن ہے۔'' شیزی نے کہا، ''کراچی میں کوئی ایسا عزیز نہیں جس کے پاس میں جا سکوں۔''

''میں جو تمھاری دوست ہوں، کیا تم میرے ساتھ نہیں ٹھہر سکتیں؟'' ڈیزی نے کہا، ''دیکھو، کوئی بات ناممکن نہیں ہوتی۔ اس کے لیے آنٹی کو تیار کرنا پڑے گا اور میرا خیال ہے کہ وہ مان جائیں گی۔ پہلی نظر میں جو بات ناممکن لگتی ہے وہ آہستہ آہستہ ممکن ہو جاتی ہے۔ میں دو ایک دن میں تمھارے گھر آؤں گی اور تمھارے پپا اور ممی سے بات کروں گی۔''

''کیا تم انھیں ساری بات بتا دو گی؟'' شیزی نے دہل کر پوچھا۔

''ارے نہیں، لیکن ضرورت پڑنے پر بتایا بھی جا سکتا ہے یہ تو وہ بھی جان لیں گی کہ تمھاری صورت پر جو بارہ بج رہے ہیں، آب و ہوا کی تبدیلی اس کے لیے ضروری ہے۔''

''کاش! ممی اجازت دے دیں۔'' شیزی نے کہا۔

''دے دیں گی بھئی، آج کل اسکول کالج بھی روز روز بند ہو رہے ہیں۔ پھر تم تنہا تھوڑی جاؤ گی۔'' ڈیزی نے کہا، ''میں جو تمھارے ساتھ ہوں۔ تمھارے کھونے کا تو کوئی اندیشہ نہیں البتہ تمھیں ذرا جم کر لڑنا ہوگا۔''

''یہی تو میرے لیے مشکل ہوگا۔'' شیزی نے کہا۔

''کسی سے تو لڑو۔ میاں سے نہیں لڑسکتیں تو ماں باپ ہی سے اکڑ جاؤ ورنہ زمانے سے کیسے لڑو گی۔ اچھا یہ بتاؤ تمھارے پپا کی کار میں کون لڑکا بیٹھا ہوتا؟'' ڈیزی نے پوچھا۔

''ایک مہمان ہے، کراچی سے آیا ہے۔'' شیزی نے جواب دیا۔

''کوئی مدد کرسکتا ہے؟'' ڈیزی نے آنکھ مار کر پوچھا، ''قدیم سورماؤں کے کوئی آثار ہیں؟''

''نہیں بھئی، بالکل سیدھا ہے بے چارہ۔'' شیزی نے کہا، ''میری خالہ پر عاشق ہے۔''

''اوہ، تب تو بالکل ہی پھسپھسا مال ہے۔'' وہ خوش دلی سے ہنسی۔

''دیکھو تم ممی کے سامنے اس قسم کی باتیں نہ کرنا ورنہ ـــ'' شیزی نے کہا۔

''ظاہر ہے۔ میں کیا اُلو ہوں۔'' ڈیزی نے کہا، ''میں ان سب کی نفسیات کو سمجھتی ہوں۔''

ہاسٹل کے چوکیدار نے اطلاع دی کہ احسن صاحب کی کار آئی ہے۔ دونوں باہر آئیں۔

''ڈیزی! تم جلد آ کر ممی سے بات کرنا۔'' شیزی نے سرگوشی کی۔

''بہت جلد۔ مجھے بھی سفر میں ایک ساتھی کی تلاش ہے۔ بہت بور سفر گزرتا ہے۔ تم ذہنی طور پر تیار رہنا۔'' ڈیزی نے کہا۔ ''اور مضبوط بھی۔''

''ایک بات میری سمجھ میں آئی ہے۔'' شیزی نے کہا، ''تم کراچی جانے سے ایک دن پہلے آ کر پاپا سے بات کرنا اس طرح کہ ممی کو زیادہ سوچنے کا موقع ہی نہ ملے۔ پاپا راضی ہو گئے تو سمجھو بیڑا پار ہے۔''

''اوکے۔'' ڈیزی نے کہا۔

''خدا حافظ۔''

''بائی۔''

برسوں سے شیزی نے ٹرین سے کوئی لمبا سفر نہیں کیا تھا۔ زندگی میں دو چار مرتبہ لاہور سے راول پنڈی تک ایئر کنڈیشنڈ کمپارٹمنٹ یا ریل کار میں آ گئی تھی۔ اُسے عوامی ریل گاڑیوں میں سفر کرنے کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ اس کے والدین جب اس کے کراچی جانے پر تیار ہو گئے تو انھوں نے اُسے ہوائی جہاز سے جانے کی رائے دی۔ لیکن ڈیزی کی برتھ ''عوامی'' ریل گاڑی میں بک تھی اور شیزی، ڈیزی کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہتی تھی۔ ڈیزی نے بڑے اطمینان سے کہہ دیا تھا کہ شیزی کو برتھ نہ ملی تو وہ باری باری لیٹ بیٹھ کر گزارہ کرلیں گی۔ چوبیس گھنٹے کی ہی تو بات ہے۔

احسن صاحب کا ڈرائیور ان دونوں کو لاہور سٹی اسٹیشن تک چھوڑنے گیا تھا۔ ڈیزی نے اُسے پلیٹ فارم تک آنے کی اجازت بھی نہیں دی۔ قلی سے سامان اُٹھوا کر وہ دونوں اندر آ گئیں۔ ڈیزی نے کنڈکٹر گارڈ کی مدد سے اپنا کمپارٹمنٹ تلاش کیا اور شیزی کو ساتھ لے کر اس میں آ بیٹھی۔ ٹرین پشاور سے آئی تھی۔ پلیٹ فارم پر ایک جم غفیر پھولوں کے ہار لیے کسی وزیر صاحب کے استقبال کو کھڑا تھا۔ اُن کے خوب صورت، آرام دہ ڈبے کو باقی گاڑی سے جدا کرنے میں گاڑی آدھ گھنٹا لیٹ ہوگئی۔

شیزی کو یقین نہیں آرہا تھا کہ وہ کراچی جانے کے لیے ٹرین میں سوار ہو چکی ہے۔ یہ کارنامہ ڈیزی نے انجام دیا تھا۔ اُس نے احسن صاحب کو قائل کرنے کی کوشش کی۔ انھوں نے شیزی سے پوچھا کیا وہ واقعی کراچی جانا چاہتی ہے، اور اُس کی ہاں نے ہی بہت حد تک کام بنا دیا۔ وجہ یہ تھی کہ بہت دنوں سے شیزی کا صبر اور اُس کی چپ ان کے دل میں گھاؤ ڈال رہی تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ شیزی عام بیٹیوں کی

طرح ان سے کچھ طلب کرے، ضد کرے، کچھ منوائے۔ بیگم احسن نے بہت اعتراض کیے۔ پہلے تو انھوں نے اس سارے معاملے کو مذاق سمجھا، پھر ناممکن قرار دے دیا۔ اس کے بعد کراچی شہر کی شان میں ناگفتہ بہ کلمات کہے۔ ''کراچی میں رکھا کیا ہے، خاک اُڑ رہی ہے۔ وہاں کی آب و ہوا سے کراچی کے رہنے والے بیزار رہتے ہیں۔'' وغیرہ — اس سے کام نہ بنا تو ملک کے اَبتر حالات کی دہائی دی۔ آخر میں انھوں نے کہا کہ احسن صاحب اس بات کی کبھی اجازت نہیں دیں گے۔ انھیں معلوم نہیں تھا کہ وہ پہلے ہی قول ہار چکے ہیں، بلکہ بیگم کو خاموش کرنے کے لیے بھی ان کے ترکش میں کچھ تیر موجود ہیں۔

''تم نے اپنی ضد سے اس پر خوشیوں کے دروازے تو بند کر دیے، اب زندگی تو حرام نہ کرو۔ وہ جانا چاہتی ہے تو اسے خوشی سے جانے دو، وہ اتنی سمجھ دار ہے کہ میں تم سے زیادہ اس پر بھروسا کرتا ہوں۔'' اس آخری بات پر بیگم احسن خاصی جھلائی تھیں۔ انھوں نے منھ پھلا لیا تھا۔ دو تین دن ان سے خفا بھی رہیں مگر شیزی کو اجازت مل گئی تھی۔

شیزی اور ڈیزی سیکنڈ کلاس کمپارٹمنٹ میں تھیں۔ ساری ٹرین ڈبوں کے درمیان لگی ہوئی برساتیوں (vestibules) کے ذریعے ایک تھی۔ اور اس راہ سے آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ مسافر، قلی، گارڈ، ٹکٹ چیکر، ٹھنڈی بوتلیں، گرم چائے بیچنے والے، گنڈے گولے اور اُبلے ہوئے انڈے بیچنے والے، لنگڑے لولے اور اندھے فقیر بغیر کسی رکاوٹ کے آ جا رہے تھے۔ کمپارٹمنٹ کا دروازہ ان کی نقل و حرکت کی وجہ سے برابر جھول رہا تھا۔ اُس کو لمحہ بھر کے لیے بھی ساکت ہونے کی مہلت نہیں ملی تھی۔ شیزی نے تھوڑی دیر تو یہ منظر حیرت اور دل چسپی سے دیکھا لیکن ذرا دیر میں مسلسل شور و شر سے اُسے زبردست کوفت ہونے لگی۔ کٹے ہوئے بازوؤں والے فقیروں کو اتنے قریب محسوس کرنا، بچوں کا انھیں مستقبل گھورنا اور ماؤں سے طرح طرح کے تکلیف دہ سوال کرنا شیزی کو بہت پریشان کن لگا۔

ابھی ٹرین چلنی شروع نہ ہوئی کہ بچوں کی بے جا فرمائشوں پر دھمکیاں اور مار پیٹ شروع ہو گئی جس کا منطقی نتیجہ بچوں کا رونا تھا۔ اس پر مستزاد گرم چائے اور انڈے بیچنے والوں کی حلق سے نکالی جانے والی مخصوص آوازیں، جو شیزی کے کانوں میں بُری طرح چبھ رہی تھیں اور وہ دل ہی دل میں یہ سوچ کر کانپ رہی تھی کہ یہی صورتِ حال رہی تو چوبیس گھنٹے کیسے گزریں گے۔ ڈیزی کو پُرسکون دیکھ کر وہ بھی مطمئن دکھائی دینے کی کوشش کر رہی تھی۔

خدا خدا کر کے گاڑی چلی اور پانچ منٹ کے اندر اندر یہ راز کھل گیا کہ ٹرین میں نہ پانی کا انتظام ہے نہ روشنی کا۔ اس طویل سفر میں مسافر خواتین ڈھیر سے بچوں کے ساتھ پانی اور بجلی کے بغیر کیسے گزارہ کریں گی۔ شیزی یہ سوچ کر ہیبت زدہ تھی۔ ذرا دیر بعد انکشاف ہوا کہ یہ عورتیں ریل گاڑیوں

میں پانی کی غیر موجودگی کی عادی ہیں۔ اس لیے تھلیوں، بدھنوں، پلاسٹک کے لوٹوں اور جگ وغیرہ میں پانی لے کر چلی تھیں۔ یہ سب برتن گاڑی کی چھکا چھک کی تال پر رقص کرتے ہوئے حال میں آ چکے تھے۔ چند برتنوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو ہو کر چھلکنے لگا تھا۔ کوئی یک لخت ہی اوندھ گیا تھا۔ پوٹلیاں اور گٹھریاں تر ہو رہی تھیں۔ چپل تیر رہے تھے۔ پانی کے قطعے گول سے لاتبے، پھر نوک دار ہوتے ہوئے ایک دوسرے سے مل کر تالاب، جھیلیں، آبنائے اور خاکنائے بنا رہے تھے۔ پانی کی چند لکیریں دیر تک ایک جگہ ٹھہری رہتیں پھر چند انچ آگے بڑھ جاتیں، جیسے رقص کرنے والا طائفہ ٹھہر ٹھہر کر چل رہا ہو۔ فرش پر پھینکے جانے والے ٹافی کے کاغذ، پھلوں کے چھلکے اور گنڈیری کے پھوک کہیں پانی کی راہ روکنے اور کہیں بدلنے میں معاون تھے۔

بچے اندھیرے اور سردی سے نالاں اور مائیں بچوں کی پریشانی سے ہلکان ہو رہی تھیں۔ ذرا دُور جا کر گاڑی جنگل میں ٹھہر گئی۔ ریلوے کے کارکن ہاتھ میں اندھی لالٹین لیے تحقیق و تفتیش میں مصروف ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ کسی نے ان ہی کے ڈبے سے زنجیر کھینچی ہے۔ بار بار وہ عورتوں سے سوالات کرتے کہ زنجیر کس نے کھینچی ہے اور انھیں ہر بار جواب ملتا کہ یہاں سے کسی نے نہیں کھینچی۔ آخر خدا خدا کر کے یہاں سے ٹرین کھسکی۔ شیزی کو ممی کی بات یاد آئی کہ ملک کے حالات اچھے نہیں ہیں۔ باقی عورتیں اطمینان سے بیٹھی تھیں لیکن وہ دل ہی دل میں سہمی جا رہی تھی کہ خدا جانے کیا ہونے والا ہے۔

ٹرین تو چل دی لیکن روشنی کا مسئلہ حل نہ ہوا۔ کئی چھوٹے اسٹیشن آئے اور گئے۔ ریلوے کا عملہ جو لاہور میں جھنڈیاں اور بغل میں کاپیاں دبائے بار بار کمپارٹمنٹ کے درمیان سے گزر رہا تھا، اب غائب ہو چکا تھا۔ شیزی کو ڈیزی نے اُوپر کی برتھ پر لیٹ جانے کو کہا تھا اور وہ لیٹ بھی گئی تھی مگر اس کے لیے اس ہنگامے میں پل بھر سونا بھی مشکل تھا۔ دونوں اپنے ساتھ کتابیں اور رسالے لے کر چلی تھیں مگر تاریکی نے مطالعہ بھی ناممکن بنا دیا تھا۔ شیزی برتھ پر لیٹی نیچے کا تماشا دیکھنے میں مصروف تھی۔ ڈیزی کمبل ٹانگوں پر ڈالے کھڑکی کے باہر بھاگتے سائے دیکھ رہی تھی۔

کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے بعد کمپارٹمنٹ کے چار قمقموں میں سے دو میں روشنی کے آثار ہویدا ہوئے۔ مگر وہ محض آثار تھے۔ روشنی موم بتی کی روشنی کے دسویں حصے کے برابر بھی نہ تھی۔ بس جیسی کسی بیٹری ختم ہوتی ہوئی ٹارچ کی سرخ روشنی، جو تاریکی کا پردہ تو چاک نہیں کر سکتی، ہاں کوئی اس روشن نقطے پر نظریں گاڑے رکھے تو نفسیاتی تشفی کا باعث ہو سکتی ہے۔

یہ زنانہ ڈبا تھا اور تاریکی میں مردوں کی بلا روک ٹوک آمد و رفت سے بہت سی عورتیں خائف تھیں۔ ٹرینوں میں آئے دن ڈاکے پڑا کرتے تھے۔ مزید یہ کہ ایک اسٹیشن پر پانچ چھ مسٹنڈے مرد

مستقل طور پر غسل خانے کے آگے کھڑے ہو گئے۔ کسی اور کی تو ہمت نہ ہوئی، ڈیزی نے جا کر باز پرس کی تو انھوں نے کہا کہ پوری ٹرین میں کہیں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہے اس لیے مجبور ہو کر یہاں کھڑے ہو گئے ہیں۔ جیسے ہی کہیں اور جگہ ملی، وہ یہاں سے چلے جائیں گے۔ مگر وہ ساری رات وہیں کھڑے رہے۔ اُن کی وجہ سے ساری رات کوئی عورت غسل خانے کے نزدیک بھی نہ پھٹکی۔ بچوں کو وہ اپنے پیروں کی کھڈیوں پر عین مسافر عورتوں کی ناک کے نیچے فراغت کراتی رہیں۔

جس وقت شیزی، ڈیزی کے حق میں برتھ سے دست بردار ہو کر نیچے اُتری تو ڈبے کی حالت ناگفتہ بہ ہو چکی تھی۔ فرش پر بہنے والے پانی میں مختلف رنگ کے پیشابوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ ٹین اور المونیم کے ناشتا دان اوندھے پڑے تھے۔ گٹھریاں لڑھکتی پھر رہی تھیں۔ کوئی عورت اسی فرش پر چادر ڈال کر نیچے دراز تھی۔ دائیں بائیں بچے پڑے ہوئے تھے۔ سیٹوں پر عجیب عجیب زاویوں سے عورتیں اور بچے سو رہے تھے۔ کسی کا پیر کسی کے سر پر تھا اور کسی کا سر کسی کے پیروں میں۔

اب شیزی کمبل اوڑھے، ٹھنڈی ہوا کے جھونکوں سے اُلجھتی، گاڑی کے دوڑتے سایوں کو دیکھ رہی تھی، اور سوچ رہی تھی اگر اس ٹرین سے آنے والے وزیر صاحب اپنے شان دار مخصوص کمپارٹمنٹ کی جگہ کسی عام ڈبے میں بیٹھ جاتے تو اُن کی معلومات میں یقیناً اضافہ ہوتا کہ عوام کس طرح سفر کرتے ہیں۔ ٹرین میں پانی اور بجلی نہ ہونے کے کیا معنی ہوتے ہیں اور اس سے کتنی تکلیف ہوتی ہے۔ کاش کوئی ایسی صورت ہو کہ قوم کے وہ سارے لیڈران، جو قوم کو پھسلانے میں مصروف رہتے ہیں، کبھی اس کی مشکلات بھی جاننے کی کوشش کریں۔ پھر فوراً ہی وہ یہ سوچ کر شرمندہ ہو گئی کہ اگر وہ ڈیزی کے ساتھ سفر نہ کرتی تو خود اسے زندگی بھر اِس صورتِ حال کا اندازہ نہ ہوتا۔

خدا خدا کر کے اُجالا ہوا مگر ڈبے کی حالت کسی طور بہتر نہ ہوئی۔ ریگستانی علاقے سے ریت اُڑ اُڑ کر بلا تکلف کھڑکیوں سے اندر داخل ہوتی رہی کھڑکیاں بند نہ کی جا سکتی تھیں کیوں کہ بہت سی عورتیں اور بچے روشنی نہ ہونے کی وجہ سے اِس کی اجازت نہیں دے رہے تھے، ویسے بھی اتنی ڈھیری مسافر عورتوں اور بچوں کے لیے تازہ ہوا کی سخت ضرورت تھی۔ ایسے بچے جو خود غسل خانے جانے کے قابل تھے، رات بھر یہی مشغلہ اختیار کیے رہے تھے، اور اب غسل خانے باہر تک اُبل رہے تھے۔

ایسے میں ناشتے دان اور پوٹلیاں کھل رہی تھیں جن میں سے مڑے ہوئے پراٹھے، قیمہ، مکئی کی روٹیاں اور سرسوں کا ساگ نکل رہا تھا۔ آتے جاتے بیروں سے ٹھنڈے پانی کا مطالبہ ہو رہا تھا۔ جنھیں وہ اس طرح نظر انداز کر رہے تھے جیسے حکومت مخالف پارٹی کے مطالبات نظر انداز کرتی ہے۔ چار چار، چھ چھ ٹرے ایک دوسرے پر دھرے بیرے پھرتی سے اِدھر سے اُدھر جا رہے تھے۔ جو

مسافر اُن سے ناشتا یا کھانا نہ لے اس کو پانی دینا اُن کی ذمہ داری نہ تھی۔

شیزی کے منع کرنے کے باوجود ڈیزی نے ناشتے کی دو ٹرے لے لیں، سارے بچے اس قدر ندیدے پن سے ان کے ناشتے کو دیکھ رہے تھے کہ دونوں کے حلق میں نوالہ پھنسنے لگا۔ شیزی بالکل کچھ نہ کھا سکی۔ اُس نے صرف ایک پیالی چائے پی۔ ڈیزی نے تھوڑا سا ناشتا کیا اور باقی ساری چیزیں بچوں میں بانٹ دیں۔ دوپہر کے کھانے کا بھی یہی حشر ہوا۔ بیروں کا لایا ہوا پانی اور شیزی کے تھرماس کا پانی عورتیں بلا اجازت خود پی گئیں یا اپنے بچوں کو پلا دیا۔ صبح ہوتے ہی ڈبے میں پھر آمدورفت شروع ہوگئی۔ ہر گھنٹے دو گھنٹے بعد ٹرین رُک جاتی اور ہر مرتبہ تحقیق کرنے والے ان ہی کے ڈبے میں آ کر پوچھتے کہ زنجیر کس نے کھینچی ہے۔ ملک کے حالات کے پیشِ نظر نگاہیں کسی تخریب کار کی تلاش میں تھیں۔ آخر کار ڈیزی نے دو تخریب کار ڈھونڈ لیے۔ وہ کسی اور کمپارٹمنٹ میں بیٹھے ہوئے چند لڑکے تھے جو آتے جاتے محض شرارتاً دروازے میں لگی ہوئی زنجیر کے تاروں کا ڈبا گھما جاتے تھے جس سے بریک لگ جاتا تھا اور ٹرین کھڑی ہو جاتی تھی۔ ان لڑکوں کو ڈانٹ کر بھگا دینے کے بعد ذرا سا سکون ہوا۔ ان کے لیے یہ تفریح تھی۔ انھیں یہ اندازہ نہیں تھا کہ ان کی وجہ سے یہ طویل سفر، طویل تر ہوا جا رہا تھا۔ اب تک گاڑی کئی گھنٹے لیٹ ہو چکی تھی۔

دیہاتی مسافر عورتیں ہر دس پندرہ منٹ بعد ڈیزی اور شیزی کو بیروں سے سیٹ کے نیچے سے ٹہو کے دیتیں اور وقت پوچھتیں۔ دونوں جان سے بیزار ہو گئی تھیں۔ ان کا جی چاہ رہا تھا کہ کلائی سے گھڑیاں اتار کر ان عورتوں کو دے دیں۔

آخر کراچی کے مضافات شروع ہوئے۔ عورتوں نے اپنا سامان سمیٹنا شروع کیا۔ سگھڑ ماؤں نے سیٹ پر بیٹھے بیٹھے لوٹوں کے بچے کھچے پانی میں ہاتھ ڈال کر بچوں کے منہ چپڑے، وہیں اُن کے کپڑے تبدیل کیے۔ تیل لگا کر کنگھی کی۔ یہاں تک کہ جھٹکا کھاتی ٹرین میں آنکھوں میں سرمہ بھی لگا یا۔ پھر اسی طرح خود منھ دھویا۔ کنگھی چوٹی کی اور بن ٹھن کر بیٹھ گئیں۔ ڈیزی نے بھی سیٹ پر بیٹھے بیٹھے پرس میں سے آئینہ کنگھا نکال کر بال درست کیے۔ لپ اسٹک لگائی، فراک کو جھاڑا، کمر کی بیلٹ کو ازسرِ نو کسا۔ موزے اُوپر کھینچے۔ جوتوں پر رُومال پھیرا۔ اب وہ کراچی اسٹیشن پر اُترنے کے لیے بالکل تیار تھی۔

شیزی حیران تھی کہ ڈیزی اتنے خوف ناک تجربے کے بعد کس طرح اتنی نارمل اور چاق چوبند ہے۔ وہ خود تو تھکن، ذہنی کوفت اور بھوک پیاس سے نڈھال ہو چکی تھی۔ اُسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ جہنم کا کوئی تختہ دیکھ کر مہینوں بعد لوٹی ہے۔ اگر عوام ایسی زندگیاں گزار رہے ہیں تو وہ ہر قسم کا احتجاج کرنے میں یقیناً حق بجانب ہیں۔ اُس نے دل میں فیصلہ کیا۔

شیزی نے سر اُٹھا کر کراچی اسٹیشن کی عمارت کو دیکھا۔ پرانی زرد سی عمارت پر تین پنکھڑیوں کا پھول کھلا ہوا تھا۔ اسٹیشن کی چھت کے دونوں طرف ٹین کی ڈھلواں چھتیں تھیں۔ چھتوں کے اخیر میں لوہے کا جنگلہ اور سنگین نما ستون تھے۔ عمارت کے آگے کاریں تھیں۔ جن میں لینے آنے والے رشتے داروں کے ساتھ تیزی سے مسافر گھروں کو روانہ ہو رہے تھے۔ اسٹیشن کے ایک طرف ٹیکسیاں اور اس کے بعد قطار در قطار وکٹوریا کھڑی تھیں۔ شیزی نے اس سے پہلے یہ سواری کبھی نہیں دیکھی تھی۔ ایک دوسرے کے مقابل بیٹھنے والی سیٹوں، کوچوان کی اونچی سیٹ اور ایک طرف لگی ہوئی لمبی سی لہراتی رنگین چابک کو شیزی نے بڑی دل چسپی سے دیکھا۔ گھوڑے کے ساز اور برنجی چوکور لالٹینوں نے وکٹوریا کی شان اور بڑھا دی تھی۔ وکٹوریا کی کالی چھت بڑے خوب صورت انداز میں تہہ کی ہوئی پیچھے پڑی تھی۔ لاہور کے تانگوں کے مقابلے میں یہ یقیناً شاہانہ سواری تھی۔

ڈیزی ٹیکسی کی طرف لپکی۔ شیزی کو یہ بات بڑی عجیب لگی کہ ڈیزی کے گھر سے کوئی بھی اسے لینے نہیں آیا۔ ڈیزی نے اطمینان سے کہا، ''اس کی ضرورت کیا ہے۔ ہمارے گھر میں کار اور ڈرائیور تو ہے نہیں۔ ہم لوگ اتنا جذباتی ہونا افورڈ نہیں کر سکتے کہ ٹیکسیوں میں ایک دوسرے کو لینے جائیں، اور اتنا ٹائم کس کے پاس ہے بابا۔''

ایک طرف چند فوجی سپاہی اپنی گاڑی کے انتظار میں کھڑے بار بار ٹوپیاں درست کر رہے تھے۔ نزدیک کی زیرِ تعمیر مسجد سے بار بار ایک اعلان نشر ہو رہا تھا، ''میرے بھائیو اور دستو! یہ غریب

نواز مسجد زیرِ تعمیر ہے۔ اس کی تعمیر میں حصّہ لے کر ثوابِ دارین حاصل کریں۔'' بولنے والے کی مسلسل یکساں آواز اب جھینگر کی صدا کی طرح بے اثر ہو کر رہ گئی تھی۔

ڈیزی ٹیکسی میں بیٹھ کر اس جگہ آئی جہاں شیزی کھڑی تھی۔ دونوں کا سامان رکھا گیا اور ٹیکسی روانہ ہوئی۔ دونوں طرف بنگلے نما گھروں کے احاطوں میں اور سڑک پر ناریل اور پام کے خوب صورت درخت نظر آئے۔ ٹرام پٹری بھی شیزی کے لیے بالکل نئی چیز تھی۔ ٹیکسی زرد پتھر کی ٹھوس پرانی عمارتوں کے پاس سے گزرتی سڑکیں پار کرتی گلیوں میں آئی۔ زرد عمارت میں ایک گورنمنٹ اسکول نظر آیا جس کی کھڑکیوں کے صد فی صد شیشے شہید ہو چکے تھے۔ پھر ایک ریت بھرے میدان سے گزر کر ٹیکسی ایک نہایت معمولی سی رنگ اُترے مکان کے آگے کھڑی ہو گئی۔

''ڈیزی آ گئی، ڈیزی آ گئی۔'' انگریزی اور اُردو کی ملی جلی آوازوں نے ان کا خیر مقدم کیا۔ شیزی نے ٹیکسی کا کرایہ ادا کیا جس پر ڈیزی نے کوئی اعتراض نہ کیا۔ ذرا دیر میں ڈیزی کے پپا اور مما نے باہر نکل کر ڈیزی کو پیار کیا اور شیزی کو اچنبھے سے دیکھتے ہوئے بادلِ نخواستہ اس سے ہاتھ ملایا۔

''مما! شیزی کچھ دن ہمارے ساتھ رہے گی، اس کا خرچ میں برداشت کروں گی۔'' شیزی کو ڈیزی کا آخری جملہ بہت بے موقع لگا۔ لیکن ڈیزی ہمیشہ سے اپنی بے باک گفتگو کے لیے مشہور تھی۔

ڈیزی کے چھوٹے بہن بھائی شیزی کا خوب صورت دمکتا ہُوا سُوٹ کیس اُٹھانے کے لیے تھوڑی دیر جھگڑے پھر دونوں کا سامان لے کر اندر بھاگ گئے۔

''شیزی میرے ساتھ میرے کمرے میں رہے گی۔'' ڈیزی نے اعلان کیا۔ مما کے چہرے پر بشاشت کے کوئی آثار ہویدا نہ ہوئے۔

''اوکے، اوکے۔'' انھوں نے قدرے تیزی اور تلخی سے کہا اور پتلی کانپتی ٹانگوں کے ساتھ سیڑھیاں چڑھنے لگیں۔

ڈیزی چند منٹ کے لیے شیزی کو ڈرائنگ روم میں لے گئی۔ کمرہ اس قدر مختصر سا تھا کہ شیزی کو حیرت ہوئی کہ ڈرائنگ روم ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ 'قصرِ نیلم' کے اسٹور رُوم یقیناً اس کمرے سے بڑے تھے۔ اس مُنّے سے ڈرائنگ رُوم میں پرانی وضع کا ایک چھوٹا سا صوفہ سیٹ تھا جس کا کپڑا گھس چکا تھا۔ میز پر ڈیزی کے پپا اور مما کی شادی کی تصویر تھی۔ پپا کا نیا سوٹ اچھا سلا ہوا تھا اور مما سفید شادی کے لباس میں نازک ہاتھوں میں پھولوں کا گلدستہ تھامے تر و تازہ سی کھڑی تھیں۔ ان دونوں کو دیکھنے کے بعد شیزی کو یوں محسوس ہوا جیسے یہ اُن کے پچھلے جنم کی تصویر ہو۔

دوسری تصویر میں جوان چہرے، بھورے لانبے گیسو اور بڑی بڑی ذہین آنکھوں والے یسوع

مسیح بیلیں چڑھے ایک پرانے مگر خوب صورت مکان کے چبوترے پر کھڑے تھے۔ ایک آدمی کے بازوؤں پر ایک بیمار لاغر بچہ بے حال لیٹا ہوا تھا۔ مسیح اُس بچے کو اپنے پرسکون چہرے اور ہم درد آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ آسمان بے حد نیلا تھا۔ کراچی کے آسمان سے بالکل مختلف۔ مسیح کا سفید بے داغ لبادہ اور اس پر اوڑھی ہوئی سرخ چادر اس ڈرائنگ روم کے حزن کو تھوڑا سا کم کر رہی تھی۔

ڈیزی تھوڑی دیر کو اسے تنہا چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ اب آئی تو اسے اپنے کمرے میں لے کر چلی۔ راہ میں ایک اور کمرہ پڑا جس کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ یوں ہی شیزی کی نگاہ اُٹھ گئی۔ کمرے میں کوئی سو رہا تھا مگر دو مختلف بازو چادر سے جھانک رہے تھے۔ ایک بالوں سے بھرا ہوا تنومند، دوسرا چکنا، سانولا، نازک اور سڈول۔ شیزی اس مسئلے پر غور ہی کر رہی تھی کہ ڈیزی نے کہا، ''یہ میرے بھائی کا کمرہ ہے۔ کبھی کبھی اس کی منگیتر بھی اس کے ساتھ آن کر رہتی ہے۔''

''ایک ہی کمرے میں؟'' شیزی نے حیران ہو کر پوچھا۔

''ظاہر ہے کہ وہ اس کے ساتھ رہنے آتی ہے، ہمارے ساتھ تو نہیں۔ میرا بھائی کچھ کرتا دھرتا نہیں ہے۔ یوں ہی عارضی کام کرتا رہتا ہے۔ الگ گھر وہ لے نہیں سکتا، اس گھر میں اتنے کمرے نہیں ہیں۔ اب تو بے چاری کے بچہ ہونے والا ہے۔ پور تھنگ۔ مما نے بہت شور مچایا ہے کہ اب تمھیں شادی کرنا پڑے گی اور تمھیں پتا ہے کہ ان کی شادی چرچ میں نہیں ہوسکتی، باہر ہوگی۔ مما اور ڈورتھی، دونوں کو اس بات کا بڑا غم ہے۔ ڈورتھی بے چاری کو تو شرم آئے گی نا کہ اتنا بڑا سا پیٹ لے کر شادی کی قسمیں کھائے گی۔ لیکن بھائی کہتا ہے کہ اس سے کیا فرق پڑتا ہے — ہاؤ سلّی، ازنٹ اِٹ۔''

''تمھارے خیال میں ہر مسئلہ سلّی (silly) ہوتا ہے۔'' شیزی چڑ گئی۔ ''اتنی بڑی بات کو تم اہمیت نہیں دیتی ہو۔''

''بڑی بات کیا ہے، سیدھا سا اقتصادی معاملہ ہے۔ اگر پیٹر (Peter) کے پاس پیسے ہوتے تو وہ شادی کر لیتا اور الگ گھر لے کے رہتا۔ مگر بے چارے کے پاس گھر نہیں، نہ اتنا پیسا ہے کہ ہوٹلوں میں اِدھر اُدھر رہیں۔ چناں چہ وہ اپنے ماں باپ اور ہم سب کی نالج میں یہاں آ کے رہتی تھی۔ معاملہ سیریس ہوگیا تو بہت لوگوں نے ابورشن کی رائے دی مگر پیٹر اور ڈورتھی، دونوں راضی نہ ہوئے۔ حالاں کہ ایسے علاقوں میں، جہاں ہم رہتے ہیں، ایسے معاملات چلتے رہتے ہیں۔ مسلمان گھرانوں میں بھی اور عیسائی گھرانوں میں بھی، صرف نقطۂ نظر کا فرق ہے۔''

''ہوگا۔'' شیزی کپڑے لے کر غسل خانے میں نہانے کے لیے چلی گئی۔

نہانے کی ترکیب اُس کی سمجھ میں نہ آئی۔ نہ باتھ ٹب تھا نہ شاور۔ کپڑے لٹکانے کے لیے صرف

ایک کھونٹی تھی۔ اُس پر تولیہ ڈالتی تو وہ بار بار گر جاتی۔ دروازہ اندر سے پوری طرح بند نہ ہوتا تھا اور ہر لحظہ خطرہ تھا کہ ہوا سے چوپٹ کھل جائے گا۔ شیزی نے کمر بند سے اُسے باندھا۔ اس کے باوجود اس قدر عجلت اور پریشانی میں نہائی جیسے گاڑی نکلی جا رہی ہو۔

کھانے کی میز پر ڈیزی کے مما، پپا، پیٹر، ڈورتھی اور چھوٹے بہن بھائی موجود تھے۔ ڈورتھی بڑا سا پیٹ لیے میز کی چوڑائی میں اپنے منگیتر کے برابر میں تقریباً اُسی کی کرسی پر بیٹھی تھی۔ کھانا کھاتے ہوئے کانٹے چھریوں کی طرح دونوں کے ہاتھ پیر آپس میں اُلجھے جا رہے تھے۔ کھانا شیزی کے گھر سے بالکل مختلف تھا۔ مارے تھکن اور پریشانی کے اس سے کچھ بھی نہ کھایا گیا۔ کھانے کے دوران ڈیزی کے والدین نے صرف اُس کے والدین کی خیریت پوچھی اور اُس سے کوئی بات نہ کی۔ چھوٹے بہن بھائی اُردو ملی انگریزی میں کچر پچر کرتے رہے۔

رات کو سونے کے لیے لیٹی تو شیزی کو یہ بات بڑی غنیمت لگی کہ اس کے پلنگ کی چادر اور تکیہ کا غلاف ابھی بدلا گیا تھا۔

''جواد کی کوئی تصویر ساتھ لائی ہو؟'' ڈیزی نے لیٹے لیٹے پوچھا۔

''نہیں تو — کیوں؟'' شیزی حیران ہوئی۔

''راستے میں یا یہاں پہنچنے کے بعد وہ تمھیں یاد آیا؟'' ڈیزی کا دوسرا سوال تھا۔

''نہیں تو۔'' شیزی نے سچائی سے کہا۔

ڈیزی نے کچھ دیر سوچا۔ پھر کسی پہنچے ہوئے گرو کی طرح کہا، ''میرا خیال ہے، تمھیں جواد سے محبت نہیں ہے۔ بہتر یہی ہے کہ تم اس سے شادی سے انکار کر دو۔''

''مگر ہماری شادی ہو چکی ہے۔'' شیزی نے کہا۔

''ارے ہاں —'' اس نے کروٹ لی — ''لو، یہ تو میں بھول ہی جاتی ہوں۔ کتنی عجیب صورتِ حال ہے کہ تم شادی کے بعد اس سے بچ کر بھاگ رہی ہو۔ بہر حال میری پُرخلوص رائے یہ ہے کہ اس کے گھر جانے سے پہلے تمھیں اس مسئلے پر اچھی طرح غور کرنا چاہیے۔''

''کس مسئلے پر؟'' شیزی نے چڑ کر کہا۔

''یہی کہ تم اس سے واقعی محبت کرتی ہو یا نہیں، اگر تمھارا جواب نفی میں ہے تو تمھیں اس کے ساتھ جانے کے بجائے طلاق لے لینی چاہیے۔''

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو ڈیزی، اور مجھے سونے دو۔'' شیزی نے جھنجھلا کر کہا۔

ڈیزی کے سونے کے بعد بھی شیزی جاگتی رہی۔ باہر چاروں طرف اتنا شور تھا کہ اس کے سونے

کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کتے بھونکے چلے جا رہے تھے۔ کہیں کوئی شراب کے نشے میں بک رہا تھا۔ کسی گھر سے موسیقی، اور ڈھما ڈھم کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں۔ محلے کے مسلمان گھرانوں کے ایک طرف لگے شامیانوں سے تالیوں کے ساتھ قوالی کی تانیں بلند ہو رہی تھیں۔ نزدیک ہی کسی گھر میں مردانہ اور زنانہ گالی گلوچ کا میچ ہو رہا تھا۔ اس کے کئی راؤنڈ ہو چکے تھے مگر میچ ختم ہونے کا کوئی امکان نظر نہ آتا تھا۔ غالباً اس لیے کہ اس میں نہ ناظرین تھے نہ ریفری۔

''کیا میرا ڈیزی کے ساتھ یوں چلے آنا واقعی مناسب تھا؟'' شیزی سوچ رہی تھی۔ ''شاید ممی کا اندازہ اس معاملے میں زیادہ غلط نہیں تھا کہ میں ڈیزی کے گھر میں نہیں رہ سکوں گی۔ پھر اسے ڈیزی کی بات یاد آئی کہ گھر جانے سے پہلے تمھیں اس مسئلے پر اچھی طرح غور کر لینا چاہیے کہ تم واقعی اس سے محبت کرتی ہو یا نہیں؟''

''پاگل لڑکی! جیسے ہمارے ہاں روز جو سیکڑوں شادیاں ہوتی ہیں، وہ سب محبت ہی کی شادیاں تو ہوتی ہیں۔ ہاں یہ اس کی ناپسند کی شادی نہیں تھی۔ بات ہی کچھ ایسی تھی۔ پہلی مرتبہ پرویز کے گھر والے جب ان کے گھر آئے تھے تو وہ سب کتنے مسحور ہوئے تھے۔ چار عدد جوان، خوب صورت اور اسمارٹ لڑکیاں۔ الگ الگ ان میں سے کوئی بھی خوب صورت نہ تھی لیکن ان کا مجموعی تاثر بلا کا سحر خیز تھا۔ اُن کی امی بھی اُن کی بڑی بہن سی لگتی تھیں جو شیزی پر سب سے زیادہ فریفتہ ہو رہی تھیں۔ انھوں نے اس بات کو راز نہیں رکھا تھا کہ کھاتے پیتے گھرانے کا ہینڈسم فوجی افسر بیٹا کسی کام سے شیزی کے کالج میں گیا تھا اور شیزی پر مر مٹا تھا۔ وہ اُس کی بھیجی ہوئی آئی تھیں اور 'نہ' سُننے کی اُن میں سے کسی کی عادت نہیں تھی۔ بظاہر نہایت مناسب رشتہ تھا۔ شیزی کم عمر اور ناسمجھ تھی لیکن ممی اس بات سے بے حد خوش تھیں کہ ساری سہیلیوں میں ان کی ناک اونچی ہو جائے گی کہ شیزی کو کتنی جلدی کیسا اچھا رشتہ مل گیا تھا۔ ڈر یہ تھا کہ انھوں نے انکار کیا یا ٹال مٹول کی اور ادھر ان کی چالاک سہیلیوں میں سے کوئی اس انمول پنچھی کو پھانس لے گی۔ شیزی اُن کی اس منطق سے تو مرعوب نہ ہوئی، البتہ غیر جانب دار رہی۔ رشتہ اور لڑکا اچھا ہے تو یہی سہی۔ اگر پاپا اور ممی کو پسند ہے تو اسے بھی ناپسند نہیں۔ لڑکا دیکھنے میں تو اپنی تمام بہنوں سے نکلتا ہوا تھا اور ممی نے یہ بات انھیں بتا دی تھی کہ ابھی انھیں شادی کی جلدی نہیں ہے۔

''میں بھی پہلے کم از کم دو لڑکیوں کی شادی کروں گی تب جواد کا بیاہ کروں گی۔ ایک کی تو منگنی ہو چکی ہے، دوسری کی بات چل رہی ہے۔''

جواب ہاں میں مل گیا تو انھوں نے منگنی کے بجائے نکاح پر زور دیا۔ پہلے تو شیزی اور پاپا بالکل تیار نہ تھے لیکن ممی نے بالآخر انھیں قائل کر ہی لیا۔ ''جب شریف لوگوں کی زبان ایک ہوتی ہے تو کیا

منگنی اور کیا نکاح — فرض کرو دو تین سال منگنی رکھ کر وہی زبان سے پھر جائیں تو بدنامی لڑکی کی۔''
وہی سارے فضول دلائل جو ایسے موقعوں پر دیے جاتے ہیں۔ اور اس نے بھی ہتھیار ڈال دیے۔ پتا نہیں کیوں اُس زمانے میں اسے محسوس ہوتا تھا جیسے یہ اُس کا مسئلہ ہی نہیں ہے، کسی اور کی بات ہے۔ یوں ہوا تو کیا، ؤوں ہوا تو کیا!

''ٹن۔'' باہر میدان میں کھلنے والی کھڑکی کی سلاخ پر ٹن سے ایک پتھر آن کر لگا۔ شیزی ڈر کر کانپنے لگی۔ اُس نے ڈیزی کو آواز دی۔ ڈیزی نے نیند سے بوجھل آواز میں ماجرا پوچھا اور طمانیت سے کہا، ''تم اطمینان سے سوتی رہو، کوئی سؤر کا بچہ شراب میں دھت کنکر پھینک رہا ہوگا۔ اسے معلوم ہے کہ اس گھر میں کئی لڑکیاں رہتی ہیں۔''

شیزی پھر لیٹ گئی لیکن اسے کسی کل چین نہیں پڑ رہا تھا۔ جیسے کوئی اُس کے اندر باہر چٹکیاں لے رہا ہو۔ کچھ دیر بعد اُس نے اُٹھ کر بتی روشن کی۔ اُس کا بستر میدانِ کارزار بنا ہوا تھا۔ چند مچھر خون میں تر بہ تر کچلے پڑے تھے۔ کچھ کھٹمل افراتفری میں دائیں بائیں بھاگ رہے تھے۔ چند پورے بستر کی لمبائی طے کر کے پسپا ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔ شیزی سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ یا اللہ ان حالات میں نیند کیسے آئے گی؟ عوامی ریل کے ڈبے کے بعد یہ دوسری رات تھی کہ اس نے پلک تک نہیں جھپکی تھی۔

ڈیزی اپنی سفید سلپ میں مزے سے سو رہی تھی۔ اُس کا سانولا بدن تنگ مختصر سی شمیز میں کمبل میں اِدھر اُدھر جھانک رہا تھا۔

''تو یہ بھی زندگی کا ایک رُخ ہے۔'' شیزی نے سوچا۔

واقعی یہ رُخ ابھی تک اُس سے پوشیدہ تھا۔

آج کا دن بے حد بے درد، غیر حساس اور خود غرض سا دن تھا۔ صبح سے ایسے خشک ہوا چل رہی تھی کہ ہونٹ اور گال پھٹے جا رہے تھے۔ پھولوں کی پتیاں ہوا سے بے محابا اڑتی پھر رہی تھیں، جیسے کوئی سہارا ڈھونڈ رہی ہوں۔

لاہور کے آسمان پر چیلیں روز سے زیادہ تھیں اور معمول سے نیچے اڑ رہی تھیں جیسے کسی شکار کی تلاش میں زینہ بہ زینہ نیچے اترتی چلی آئی ہوں۔ سیاسی فضا کی طرح موسمی فضا میں بھی عجیب کشیدگی سی تھی جیسے کسی کو کسی پر اعتبار نہ رہا ہو۔

آج پھر ہڑتال۔ اسکول کالج بند تھے۔ راستے سنسان تھے۔ اِکا دُکا گاڑیاں اور ٹیکسیاں چل رہی تھیں۔ اسکول کالج کے طلبہ ان کو بھی روکنے کی کوشش کر رہے تھے۔ کھلی ہوئی دکانوں پر پتھراؤ کیا جا رہا تھا کہ دکان دار دکانیں بند رکھیں۔

اعجاز ایک طویل چکر کاٹ کر 'قصرِ نیلم' لوٹا تو گھر کا لان، جو ہمیشہ مسحور کرتا تھا، بیگانہ سا لگا۔ نہ درختوں اور کنجوں میں پہلا سا سحر تھا نہ فیروزی نہر میں۔ فضا میں مٹی کی بو بسی ہوئی تھی اور مطلع گرد آلود تھا۔ نہر کے پانی پر بوگن ولا کی ڈھیروں پتیاں ٹھس سی پڑی تھیں اور گلاب کے کٹوروں پر بھنبھناتے بھونرے کہیں اُڑ گئے تھے۔ اعجاز اپنے کمرے میں جا کر بستر میں گھس گیا۔ گھر میں کوئی فرد نظر نہیں آ رہا تھا۔ شیزی کے کراچی جانے کے بعد سے نیلی بھی نظر نہیں آئی تھی۔ ناصر خان نے اُس کے خط کا جواب نہیں دیا تھا۔ امی کا کوئی خط نہیں آیا تھا۔ زری تک تو خط ابھی پہنچا بھی نہیں ہوگا لیکن وہ جواب کا

بے چینی سے منتظر تھا۔ وہ اب سنجیدگی سے کراچی واپس جانے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ یونی ورسٹی کا خط وہاں بھی آ سکتا ہے۔ وہیں فیصلہ کرلیا جائے گا، پھر بھی وہ ٹھہرا ہوا تھا۔ شاید آج فیصلہ ہوجائے۔ اس صورت میں وہ لاہور میں کوئی گھر دیکھ لے گا تاکہ جب وہ سامان لے کر آئے تو دِقت نہ ہو۔ ایسی ہی باتیں سوچتا وہ سو گیا۔ آنکھ کھلی تو شام کے سائے لمبے ہوگئے تھے۔ فضا میں اب تک بوجھل خاموشی تھی۔ آج شام کی چائے کے لیے بھی کسی نے اُسے نہیں جگایا تھا۔

نیچے اُترا تو اُس نے گھر کے نوکروں کو صدر دروازے کے پاس پریشان سا کھڑے دیکھا۔ پوچھنے پر معلوم ہوا کہ نیلی بہت دیر سے غائب ہے اور گھر میں کسی سے کچھ کہہ کر نہیں گئی ہے۔ بیگم احسن کار اور ڈرائیور لے کر اُسے گھر گھر تلاش کر رہی تھیں۔ احسن صاحب نیلی کی سہیلیوں کے گھروں پر فون کر رہے تھے اور ہر جگہ سے نفی میں جواب مل رہا تھا۔

یکایک اعجاز کو نیلی کی دوست نغمہ کا خیال آیا۔ کل ہی تو اُس نے اعجاز کو اپنے اس راز میں شریک کیا تھا۔ اس نے بتایا تھا کہ وہ کینٹ اسٹیشن کے پیچھے بنی ہوئی کوٹھیوں میں سے ایک کے سرونٹ کوارٹر میں رہتی ہے۔ ایک موہوم امید کے سہارے اعجاز اس طرف چل کھڑا ہوا۔ سڑک کے کنارے لگے شیشم کے درختوں کی پتیاں جھڑ رہی تھیں۔ سینٹ جان پارک کے علاقے میں سوکھے پتوں کے ڈھیر لگے تھے۔ کسی کسی بنچ پر کوئی مسافر دراز تھا یا کوٹھیوں کے ملازم بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ وہ یوں ہی کوٹھیوں کے آگے کی پتلی سڑکوں پر چکر لگا رہا تھا کہ ایک بڑی سی پرانی کوٹھی کے باہر لوگوں کا ہجوم دیکھا۔ اس ہجوم میں چند طالب علم ہاتھ اٹھا اٹھا کر زور زور سے بول رہے تھے۔ محتاط لوگ چند لمحے کھڑے ہوکر ماجرا پوچھتے اور آگے بڑھ جاتے۔

''یہاں اتنے لوگ کیوں جمع ہیں؟'' اعجاز نے ایک شخص سے پوچھا۔

''اِس کوٹھی کی آیا کا لڑکا آج، شہر کے جلوس میں شامل تھا۔ اس کے گولی لگی ہے۔ یہ نہیں معلوم کہ وہ زندہ ہے یا مرگیا ہے۔ زندہ ہے تو کس اسپتال میں ہے، مرگیا ہے تو اُس کی نعش کہاں ہے۔ پولیس والے کسی قسم کا جواب دینے کو تیار نہیں۔ غریب طالب علموں کی اتنی پہنچ نہیں — اور ایک غریب آیا کا لڑکا — اُس کو کون پوچھتا ہے — اس کے ساتھی لڑکے شور مچا رہے ہیں کہ جیل یا اسپتال میں، جہاں کہیں ہے، ہمیں اُس کا پتا بتایا جائے اور مرگیا ہے تو اس کی لاش دی جائے — مگر —''

بات اُدھوری چھوڑ کر وہ شخص بھی ایک طرف کو چل دیا۔

کوٹھی کے مالک اس ہنگامے سے گھبرا کر باہر نکل آئے تھے اور لڑکوں کو بہلا پھسلا کر واپس بھیجنے کی کوشش کر رہے تھے۔ طلبہ سارا غم و غصہ ان پر نکال رہے تھے۔ اب انھیں بھی طیش آ چلا تھا اور وہ

بھی تشدد پر آمادہ تھے۔ ان سب کو بحث و تمحیص میں چھوڑ کر اعجاز نہایت خاموشی سے کوٹھی کے اندر داخل ہوگیا۔ رَوش گھومتی ہوئی پچھلے حصے کی طرف جا رہی تھی جہاں سے باتوں کی آواز آرہی تھی۔ اعجاز اس پر چلتا ہوا شاگرد پیشے کی طرف چلا گیا۔ وہاں کچے صحن میں ایک کونے میں ایک افسردہ آنکھوں والی گائے اپنے چونچال سے بچے کے ساتھ کھڑی تھی۔ کوارٹروں کے آگے برآمدے میں بان کی کھرّی چارپائی پر چار پانچ عورتیں غمگین سی بیٹھی تھیں۔ اُن میں سے ایک عورت، جس کے چہرے پر خون کی رمق بھی نہیں تھی، بے بسی سے اپنی ہتھیلیاں رگڑ رہی تھی اور یکساں آواز میں بین کر رہی تھی۔ ہاتھوں کو مسلسل رگڑنے کا یہ عمل اعجاز کو مضحکہ خیز سا لگ رہا تھا۔ اس چارپائی کے پیچھے عورتوں کی آڑ میں نیلی اپنی دوست نغمہ کے ساتھ چپ چاپ کھڑی تھی۔ دونوں کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں اور وہ ہاتھ ملتی عورت کی طرف ہم دردی سے دیکھ رہی تھیں۔

اعجاز کی ہمت نہ ہوئی کہ اس کرب ناک فضا میں نیلی کو آواز دے۔ ذرا دیر بعد نیلی نے خود ہی اعجاز کو دیکھا۔ شاید وہ اُس کی طرف بڑھتی کہ عین اُسی وقت کوٹھی کے مالک کے ساتھ بیگم احسن احاطے میں داخل ہوئیں۔ نیلی کو دیکھتے ہی پہلی نظر اطمینان کی تھی لیکن فوراً ہی یہ نظر قہر میں بدل گئی۔ نیلی کا ہاتھ پکڑ کر تقریباً گھسیٹتی ہوئی وہ اسے اپنے ساتھ لے کر چلی گئیں۔

''یہ کون تھی؟'' ایک عورت نے دوسری سے پوچھا۔

''نغمہ کی سہیلی جو کھڑی تھی، اُس کی ماں تھی، دیکھا تھا کیسے غصے میں تھی—!''

''اپنی بیٹی کا ہاتھ پکڑ کر لے گئی اور جس کے بچے کو گولی لگی، اُس کی بات بھی نہ پوچھی۔''

''یہ بڑے لوگ ہیں نا—'' اس کے آگے اعجاز نے نہ سنا۔ وہ سر جھکائے کوٹھی کی روش کو پار کر کے جس طرح آیا تھا اسی طرح چپ چاپ لوٹ گیا۔

گھر پہنچا تو معلوم ہوا کہ بیگم احسن نے نیلی کو ایک بیڈ روم میں مقفل کر دیا ہے اور خود اپنا کمرہ بھی بند کر لیا ہے۔ وہ کسی سے بات کرنے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہیں۔ احسن صاحب بھی نیلی کی سفارش کرنے میں ناکام ہو جانے کے بعد غم غلط کرنے کلب جا چکے ہیں۔

اعجاز بہت دیر تک اس خیال سے لاؤنج میں بیٹھا رہا کہ بیگم احسن کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے اور وہ باہر نکلیں تو ان سے بات کرے یا احسن صاحب آجائیں تو اُن سے مل کر نیلی کی خطا معاف کرانے کی کوشش کرے۔ احسن صاحب آئے، بیگم احسن کے کمرے میں گئے اور واپس آن کر کہا، ''بھئی وہ بے انتہا غصے میں ہیں اور ہرگز کسی کی بات سننے کو تیار نہیں ہیں۔ انھوں نے کھانا کھانے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ میرے خیال میں آج کی رات نیلی کو بند ہی رہنا پڑے گا اور شاید یہ اُس کے لیے اچھا ہو۔''

اعجاز خاموش کھڑا رہا، تو انھوں نے کہا، ''تم کھانا کھالو، میں ایک دوست کے ساتھ کھا آیا ہوں۔''

اعجاز مایوس ہو کر چلا آیا۔ اُس نے بھی رات کو کھانا نہیں کھایا۔ اچھی خاصی سرد رات تھی اور حالات خراب ہونے کی وجہ سے پولیس کے شبہے میں گرفتار کرنے یا پوچھ گچھ کرنے کا بھی اندیشہ تھا پھر بھی وہ گرم کپڑوں میں دُگلا بنا رات گئے تک چھاؤنی کی سڑکوں پر مارا مارا پھرتا رہا، کڑھتا رہا اور سگرٹ پھونکتا رہا۔ خزاں کے درخت پتے جھاڑ کر ننگ فنگ کھڑے فضا کی افسردگی میں اضافہ کر رہے تھے۔ اُن کی پتلی شاخیں فقیروں کی طرح آسمان کی طرف انگلیاں اُٹھائے شاید ''اللہ ہی دے گا'' کا ورد کر رہی تھیں۔ جوں جوں رات بھیگ رہی تھی خنکی بڑھ رہی تھی۔ چاند معصوم و مغموم سا چہرہ بنائے درختوں کے درمیان سے جھانکتا کہ بادل لپک کر اسے پھر قید کر لیتے۔ وہ کمرے کی طرف قدم بڑھاتا تو نیلی کا معصوم چہرہ اور بھولی آنکھیں جیسے شکایت کرتیں — بس اتنی ہی دوستی تھی۔ کئی مرتبہ اس کا جی چاہا وہ نیچے سے نیلی کو پکارے اور اُس کی خیریت پوچھ کر کمرے میں جائے، مگر یہ ممکن نہ تھا۔ وہ اس وقت نیلی کے لیے کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ آخر اپنی ساری قوت مجتمع کر کے وہ لوٹا اور باہر کے زینے سے اپنے کمرے میں چڑھ گیا، مگر رات بھر وہ سو نہ سکا۔

صبح احسن صاحب نے اعجاز کو اعتماد میں لے کر بتایا کہ رات میں ایک دفعہ وہ بیگم سے چھپا کر کنجی نکال کر لے گئے تھے اور نیلی سے مل آئے تھے۔ وہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی رو رہی تھی۔ احسن صاحب نے اُسے بستر پر لٹانے کی کوشش کی تو اس نے اُن کے سینے پر سر رکھ کر سسکتے ہوئے کہا، ''پاپا، کیا میں بہت بری ہوں؟ کیا میں نے بہت برا کام کیا ہے؟ — نغمہ میری دوست ہے، اُس کے بھائی کو گولی لگی تو کیا مجھے اُس کے گھر نہیں جانا چاہیے تھا؟''

احسن صاحب نے اُسے تسلی دی کہ وہ بری نہیں ہے نہ اُس نے بُرا کام کیا ہے۔ غریبوں سے ہمدردی کرنا اور آڑے وقت میں ان کے کام آنا تو اچھی بات ہے۔ اس کی ممی کو تو صرف اس بات کا غصہ ہے کہ ان سے بات چھپائی کیوں گئی؟ جب غصہ اُتر جائے گا تو وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گے۔ اس بات سے نیلی کو اطمینان ہوا اور وہ بستر پر آنکھیں بند کر کے لیٹ گئی۔ صبح پھر وہ بیگم کے اُٹھنے سے پہلے نیلی کے کمرے میں گئے۔ وہ آرام سے سو رہی تھی۔ احسن صاحب اُس کے سرھانے کہانیوں کی چند کتابیں اور اُس کے پسندیدہ چاکلیٹ رکھ آئے۔ بیگم احسن نے نوکر کے ہاتھ نیلی کو ناشتا بھجوا دیا لیکن خود اُس کے کمرے میں نہیں گئیں نہ احسن صاحب کو جانے کی اجازت ملی۔ اب اعجاز نے چند منٹ کے لیے نیلی کے پاس جانے کی اجازت چاہی تو انھوں نے سختی سے انکار کر دیا، ''جب دو تین دن تک گھر کا کوئی فرد اُس سے بات نہیں کرے گا تو اُس کے مزاج ٹھکانے آجائیں گے۔ وہ بے حد

ضدی اور خود سر ہوتی چلی جا رہی ہے۔'' اُنھوں نے کہا۔

اعجاز کو اس بات سے تھوڑی سی خوشی ضرور ہوئی کہ انھوں نے اُس کا شمار گھر والوں میں کیا تھا مگر نیلی سے نہ مل سکنے کا اُسے واقعی رنج تھا۔ وہ تھوڑی دیر اُن کے پاس بیٹھ کر اُٹھ آیا۔ ملک کے حالات عجب رُخ اختیار کر رہے تھے۔ ہر شہر میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کی جا رہی تھی مگر لوگوں نے اسے نظر انداز کرنا اپنا شعار بنا لیا تھا۔ ایک جگہ جلوس نکلتا، اُس پر آنسو گیس پھینکی جاتی اور فائرنگ ہوتی تو دوسرے دن کئی شہروں میں اُس فائرنگ کے خلاف مظاہرے ہوتے۔ جلوس نکلتے، ہجوم بے قابو ہو جاتا تو فائرنگ ہوتی اور پھر کئی اور جگہ مظاہرے ہوتے۔ مظاہرے پورے ملک میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتے جا رہے تھے۔ اب شہیدوں کے خاندانوں کو خوں بہا دینے کے مطالبات شروع ہو گئے تھے۔ سیاسی لیڈروں کو رہا کرنے اور جمہوریت بحال کرنے کے مطالبات تو شروع سے چل ہی رہے تھے۔

شام کو اعجاز کسی کام سے سینٹرل پوسٹ آفس کی طرف جانے لگا تو راستے میں ایک بھاری جلوس نظر آیا۔ اس میں مزدوروں کسانوں سمیت عوام کے تمام طبقات شامل تھے۔ یہ مشترکہ جلوس دو بجے چوک رنگ محل سے چلا تھا۔ لوگ اس میں مختلف قسم کے بینرز اٹھائے ہوئے تھے۔ سیاسی راہنماؤں کو رہا کرو، امریکی سرمایہ ضبط کرو، امریکی فلمیں بند کرو، مہنگائی ختم کرو، بے روزگاری ختم کرو، پاک چین دوستی زندہ باد، کسان مزدور اتحاد زندہ باد، افسرِ شاہی مردہ باد، پولیس تشدد مردہ باد، حق ہڑتال بحال کرو، طلبہ کو آزاد کرو، شہید طالب علموں کی لاشیں واپس دو۔ شہیدوں کے خاندانوں کو خوں بہا دو۔ لوگوں نے درجنوں کی تعداد میں لیڈروں کی تصویریں بھی اُٹھا رکھی تھیں۔ زخمی اور شہید ہونے والے طلبہ کی مائیں اور بہنیں جلوس میں سب سے آگے تھیں۔ اعجاز نے دیکھا اور اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا۔ آگے کی دوسری یا تیسری صف میں نغمہ ایک جھنڈا اٹھائے جا رہی تھی اور اُس کے برابر میں نیلی اس کے کندھے سے کندھا ملائے ساتھ چل رہی تھی۔ یہ کیسے ممکن ہے؟ کیا بیگم احسن نے نیلی کو جلوس میں جانے کی اجازت دے دی ہے؟ یہ ممکن نہیں ہے— تو کیا نیلی گھر سے بھاگ کر آئی ہے؟ اتنی سیدھی سادی بھنورے میں پلی ہوئی لڑکی کی یہ ہمت! شاید یہ اس وقت کی فضا میں بسے ہوئے ولولے کا اثر تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے تک جلوسوں میں ڈنڈے اور گولیاں کھا رہے تھے، پولیس پر پتھراؤ کر رہے تھے، زخمی ہو کر اسپتالوں میں جا رہے تھے، ٹرک میں بھر کر شہر سے میلوں دُور چھوڑے جا رہے تھے اور پیدل واپس آ رہے تھے۔ ان میں ایک عجیب جنوں خیز اُمنگ پیدا ہو گئی تھی، جیسے وہ چند مہینوں میں کئی برس بڑے ہو گئے ہوں۔ زیادہ سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ خشت باری اور نعرہ بازی میں اضافہ ہو گیا تھا۔ کچھ طلبہ دکانوں میں گھس گئے تھے اور پولیس والے وہاں پہنچ کر لاٹھی برسا رہے تھے۔

پھر جلوس کو آگے بڑھنے سے منع کر دیا گیا۔ جلوس پھر بھی بڑھتا رہا۔ پولیس نے آنسو گیس پھینکنی شروع کی۔ لڑکوں نے چاہا کہ لڑکیوں کے آگے بند باندھ لیں تو ان پر لاٹھیاں برسنے لگیں اور پھر گولی چلنے کی آواز آئی۔ گیس کے دھوئیں میں جلتی آنکھوں کے ساتھ اعجاز مجمعے میں گھسا، اور نیلی کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ کر اسے کھینچتا ہوا کنارے پر لایا۔ اعجاز پھر بھی نہیں ٹھہرا۔ فٹ پاتھ پر بھاگتے لوگوں کے درمیان سے نکال کر وہ اسے ایک گلی میں لے آیا اور پھر ایک دکان کی سیڑھیوں پر ستون کے پیچھے کھڑے ہو کر اُس نے بڑے سنجیدہ اور گمبھیر لہجے میں، جیسے وہ ہر طرح اس بات کا مجاز و مختار ہو، اُس سے پوچھا، ''نیلی تم اس جلوس میں کیسے شامل ہوئیں؟'' وہ سیدھا اُس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

نیلی اُس وقت بے حد روہانسی ہو رہی تھی۔ اپنی بے بسی پر رنج و افسوس، اعجاز پر غصہ، اور آنسو گیس کی جلن نے مل کر اس کے چہرے اور آنکھوں کو خونِ کبوتر کر دیا تھا۔

''آپ نے مجھے کیوں نکالا؟'' نیلی نے تقریباً روتے ہوئے کہا۔

''یہ میں تمھیں بعد میں بتاؤں گا۔'' اعجاز نے اپنا رومال لبِ سڑک لگے ہوئے نلکے سے تر کر کے نیلی کو دیا۔ ''اس سے اپنی آنکھیں اور چہرہ صاف کرو اور میرے ساتھ چلو۔''

دوبارہ نیلی کا ہاتھ پکڑ کر بھیڑ بھاڑ میں سے تقریباً گھسیٹتا ہوا وہ فٹ پاتھ پر آیا اور تیزی سے چھاؤنی کی طرف بڑھنے لگا۔ گولیوں کی آواز اب بھی سنائی دے رہی تھی مگر اب وہ خاصے فاصلے پر تھے۔ جلوس میں بھگدڑ مچ گئی تھی۔ لوگ بغیر سوچے سمجھے منہ اُٹھائے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔

اعجاز نیلی کو ساتھ لے کر چلتا رہا۔ دونوں راستے میں کچھ نہ بولے۔ اعجاز نے اب بھی نیلی کا ہاتھ پکڑ رکھا تھا۔ جب اعجاز کو یقین ہو گیا کہ اب وہ محفوظ ہیں اور نیلی تھک کر ہانپنے لگی ہے تب وہ اُسے لے کر ایک پلیا پر بیٹھ گیا۔

''اب بتاؤ تم باہر کیسے نکلیں؟'' اعجاز کے لہجے میں جو زور تھا اُس کی وجہ سے نیلی کی ہمت نہ پڑی کہ وہ اعجاز کے اس اِستحقاق کو چیلنج کرے۔ روتی آواز میں جیسے وہ اپنے پاپا یا بڑے بھائی کو جواب دیتی، اُس نے کہا، ''کل نغمہ کے گھر میں بات ہو رہی تھی کہ آج جو جلوس نکلے گا، اس میں اُس کے سارے گھر والے شریک ہوں گے اور میں نے نغمہ سے وعدہ کیا تھا کہ میں بھی اُس کے ساتھ ضرور جاؤں گی۔''

''میں پوچھ رہا ہوں تم اس بند کمرے سے باہر کیسے نکلیں؟'' اعجاز نے جھک کر اُس کا چہرہ دیکھا۔

نیلی پھر پھسر رونے لگی۔ اعجاز نے دیکھا کہ وہ سر سے پیر تک کانپ رہی ہے۔ شاید پہلی مرتبہ اسے اپنے جُرم کی سنگینی کا احساس ہوا تھا۔ اپنے ساتھیوں کو نزدیک نہ پا کر وہ مستعار ہمت و حوصلہ ہوا ہو چکا تھا۔ اعجاز نے اسے اپنے نزدیک کر لیا اور ہمت بندھانے کے انداز میں کہا، ''اب رو و نہیں،

مجھے ساری بات سچ سچ بتاؤ تا کہ میں سوچ سکوں کہ اب کیا کرنا ہے؟''

نیلی کچھ دیر روتی رہی۔ پھر اس نے آہستہ آہستہ خود پر قابو پالیا اور رُک رُک کر کہنے لگی، ''آپ کو معلوم ہے نا، انکل جمشید کے گھر کے درخت کی شاخیں ہمارے گھر کی بالکنی تک آتی ہیں۔ میں اس درخت کی ایک شاخ سے ان کے باغ میں کود گئی اور چپکے سے ان کے گیٹ سے نکل کر نغمہ کے گھر چلی گئی۔ کسی کو شبہ بھی نہیں ہوا، اس لیے کہ میں ویسے بھی ان کے گھر جاتی رہتی ہوں۔ نغمہ کے سارے بہن بھائی، یہاں تک کہ اس کی امی بھی آج کے جلوس میں شامل تھیں۔''

''مگر تمھارے گھر سے تو اس جلوس میں کوئی شریک نہیں تھا۔'' اعجاز نے کہا، ''تم نے یہ نہیں سوچا کہ تمھاری ممی اور پاپا کو پتا چلے گا تو وہ کیا کہیں گے۔''

''میں نے کمرے میں پرچا لکھ کر رکھ دیا تھا کہ اس جلوس میں میرا جانا بہت ضروری ہے۔'' نیلی نے کہا۔

''اور اس کا انجام کیا ہوگا، یہ بھی تم نے سوچا؟'' اعجاز نے تلخی سے کہا۔

''نہیں۔ شاید ممی مجھے ایک مہینے تک اُسی کمرے میں بند رکھیں گی۔''

''اس سے کڑی سزا بھی مل سکتی ہے آپ کو، اور آپ کو میرے ساتھ پا کر میری پوزیشن بھی بہت خراب ہو سکتی ہے۔ یہ بھی سوچا آپ نے؟'' اعجاز نے جان بوجھ کر اپنا لہجہ تلخ اور طنز آمیز رکھا۔ ''آپ کی ممی اور پاپا یہ سوچ سکتے ہیں کہ میں نے آپ کو کمرے سے نکالا اور جلوس میں لے گیا۔''

''میں اُن کو ساری بات بتا دوں گی۔'' نیلی نے کہا۔ اعجاز نے دیکھا کہ اب پھر وہ اس پتے کی طرح کانپ رہی تھی جو تیز ہوا کی زد میں ہو۔ اعجاز جانتا تھا کہ بچپن میں کبھی کبھار ایسے مواقع آتے ہیں جب آدمی بغیر سوچے سمجھے کوئی کام کر گزرتا ہے اور بعد میں اُس کی سنگینی کا احساس گھیر لیتا ہے۔

''اچھا اب ڈرو مت۔'' اعجاز یکایک نرم پڑ گیا۔ ''تھوڑی سی اور ہمت کرو۔ میں تمھیں لے جا کر پڑوس میں انکل جمشید کے گھر چھوڑ دوں گا۔ تم اسی طرح اندر جانا جیسے اپنے گھر سے آئی ہو۔ میں جا کر تمھارے پاپا کو اطلاع کر دوں گا، وہ جا کر تمھیں لے آئیں گے۔ اس کے بعد جو کچھ بیتے گی اس کے لیے تم بھی تیار رہنا اور میں بھی تیار رہوں گا۔''

وہ دونوں چلتے رہے۔ سڑک پر بہت کم آمد و رفت تھی۔ اعجاز نے کئی کاروں سے لفٹ مانگی لیکن کسی نے دھیان نہیں دیا۔ آخر ایک کار رُکی۔ اعجاز نے کچھ سوچ کر قصرِ نیلم کے پڑوس کا پتا ڈرائیور کو بتایا۔

نیلی کے پڑوس کے مکان میں چلے جانے کے بعد وہ 'قصرِ نیلم' میں داخل ہوا۔ ایک ملازم نے بتایا کہ احسن صاحب گھر پر نہیں ہیں اور نیلی بی بی ابھی تک اسی کمرے میں بند ہیں ـــ بیگم احسن پچھلے

لاؤنج میں جو دھوپ کمرے، کا کام دیتا تھا، بیٹھی کوئی خط پڑھ رہی تھیں۔ اعجاز نے سوچا تھا کہ وہ بیگم احسن کو ساری بات نہایت مختصر الفاظ میں اور ہلکے پھلکے انداز میں بتا کر نیلی کی جاں بخشی کی کوشش کرے گا، مگر یہ جان کر کہ یہاں کسی کو نیلی کی غیر موجودگی کا علم نہیں ہوا ہے، اس نے اپنا خیال بدل دیا۔ اُس نے سوچا کہ بیگم احسن سے کنجی لینے کے بعد وہ کسی طرح نیلی کو دوبارہ کمرے میں داخل کر سکے تو اس سے بہتر بات اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ احسن صاحب ہوتے تو بات بن جاتی، اب ممکن ہے کسی ملازم کو رازدار بنانا پڑے۔

''آنٹی! کیا آپ پانچ منٹ کے لیے نیلی کے کمرے کی چابی دے سکتی ہیں؟'' اُس نے نہایت عاجزی سے کہا۔

''کیوں؟'' اپنی پتلی تیکھی بھنویں اٹھا کر اعجاز کو انھوں نے حیرت سے دیکھا جیسے اُس کی جرأت پر متعجب ہوں۔

''میں نیلی سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ انھیں سمجھانا چاہتا ہوں۔'' اعجاز نے کہا، ''وہ میری بات ضرور مان لیں گی۔''

بیگم احسن ابھی تک اُسے تذبذب سے دیکھ رہی تھیں گویا پوچھ رہی ہوں، یہ دعویٰ کس برتے پر کر رہے ہو تم! اعجاز نے اپنی بات پر کسی پشیمانی یا جھجک کا اظہار نہیں کیا۔ اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے بیگم احسن پر شدید غصّے کا جو دورہ پڑا تھا وہ گزر چکا ہے۔ شاید وہ خود اس بات کی منتظر ہیں کہ نیلی کے سلسلے میں ان کی تھوڑی سی خوشامد کی جائے۔ وہ تھوڑی دیر سوچتی رہیں پھر اپنے پاس پڑے ہوئے ایک پرس میں سے کمرے کی چابی نکالی۔

''چلو'' وہ بولیں۔

اعجاز کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ اُس کو نیلی کے ساتھ اپنی جان بھی خطرے میں نظر آنے لگی۔ اب کیا ہوگا؟ وہ کیا کہے گا؟ کیا وہ انجان بنا رہے؟ نیلی کو کمرے میں نہ پا کر بیگم احسن کی جو حالت ہوگی، اُس کے بعد کیا وہ انجان بنا رہ سکے گا؟

بیگم احسن نے قفل میں کنجی گھمائی اور اعجاز سے دروازہ کھولنے کو کہا۔ وہ جان بوجھ کر پیچھے رہ گئیں ــــ اعجاز نے جوں ہی دروازہ کھولا، نیلی نے بستر سے گردن اُٹھا کر اُس کی طرف دیکھا۔ یقیناً وہ پچھلی طرف کے اسی درخت کے راستے سے اوپر چڑھ کر پھر بستر پر دراز ہوگئی تھی۔ اعجاز کو اپنی عزت کے تحفظ کے احساس کے ساتھ نیلی بیک نظر بڑی شریر، بڑی معصوم اور بے حد پیاری لگی۔

اعجاز کرسی کھینچ کر نیلی کے پاس بیٹھ گیا۔ ''جناب! آپ مجھ سے وعدہ کیجیے کہ آئندہ کسی جلسے

جلوس میں شرکت نہیں کریں گی۔" نیلی نے گھبرا کر اعجاز کی طرف دیکھا کیوں کہ دروازے میں کھڑی بیگم احسن کی جھلک اُس نے دیکھ لی تھی۔ اعجاز کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ اُس نے مزید کہا، "اور آئندہ کسی دوست کے گھر ممی کو بغیر بتائے نہیں جائیں گی۔"

"وعدہ۔" نیلی نے خوشی سے ہنستے ہوئے کہا۔

اعجاز نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

"پکا وعدہ!" نیلی نے آہستہ سے اعجاز کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا۔ "پکّا۔" پھر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ بیگم احسن دروازے میں کھڑی یہ سب دیکھ رہی تھیں۔ اعجاز اور نیلی کے چہروں پر دو سچے دوستوں کی رفاقت کی چمک دیکھ کر ان کے دل کو عجیب سی محرومی کا احساس ہوا۔ بھلا نیلی اور جواد میں ایسی دوستی کیوں نہ ہو سکتی تھی!

"آنٹی! نیلی نے پکا وعدہ کرلیا ہے کہ اب وہ کبھی ایسی غیر ذمہ دارانہ حرکت نہیں کریں گی۔" اعجاز نے خوش ہو کر بیگم احسن کو بتایا۔ بیگم احسن کے ہاتھ میں اب تک وہ خط تھا جو وہ یہاں آنے سے پہلے پڑھ رہی تھیں۔

"تمھاری خالہ نے لکھا ہے کہ ممکن ہے اب ہم مشرقی پاکستان ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیں۔ تم سب لوگ جتنی جلد ہو سکے کچھ دن کے لیے یہاں آ جاؤ۔ لڑکیوں کو مشرقی پاکستان دیکھنے کا شوق بھی ہوگا، اور یہ جگہ ہے بھی دیکھنے کے قابل۔"

"ممی پھر چلیے نا۔ دیکھیے آج کل تو اسکول کالج بھی بند ہیں۔" نیلی اب پھر قصرِ نیلم کی چھوٹی لڑکی بن چکی تھی۔

"ہنگامے تو وہاں بھی ہو رہے ہیں۔" اعجاز نے کہا۔

"مگر دُنیا کے سارے کام تو چل ہی رہے ہیں۔ اسی زمانے میں ہمارے میاں صاحب نے بیٹی کو کراچی بھیج دیا۔"

"اور جواد بھائی بھی تو وہاں جا رہے ہیں ممی۔" نیلی نے کہا۔

"جواد بھائی؟" اعجاز نے کہا، "اچھا! مجھے کیپٹن جواد سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ آپ نے بتایا تھا کہ وہ لاہور آنے والے ہیں مگر وہ آئے نہیں۔"

"ہاں، اُس نے اپنا ارادہ بدل دیا ہے۔ اوّل تو فون کرنے سے پہلے جو خط اُس نے اپنے آنے کے بارے میں لکھا تھا وہ نہیں ملا۔ پھر شیزی کراچی چلی گئی۔ اب پتا چلا کہ اس کی پوسٹنگ مشرقی پاکستان کی ہوگئی ہے، اس کی تیاری میں لگ گیا ہے۔ کہہ رہا تھا وہاں جانے سے پہلے ملنے آؤں گا۔"

''تو ہم بھی اُن کے ساتھ چلیں گے۔'' نیلی نے بشاشت سے کہا۔

''واہ ہمارا اُس کا کیا ساتھ۔ وہ اپنی فوجی یونٹ کے ساتھ جائے گا۔''

''مشرقی پاکستان جانے کی خوشی میں نیلی کی سزا معاف، کیوں آنٹی؟'' اعجاز نے کہا۔ بیگم احسن نے مسکرا کر نیلی کی طرف دیکھا۔ نیلی نے آگے بڑھ کر ماں کے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور ان کی گردن پر پیار کر لیا۔

صبح شیزی بستر سے اُٹھی تو آنکھوں میں کھٹک اور جوڑ جوڑ میں درد تھا۔ انگڑائی لیتی وہ سلاخیں لگی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ چند عورتیں ملگجی فراکیں اور سلیپر پہنے، بال بکھرائے گھروں کے سامنے کھڑی سبزی کے ٹھیلے والے کا انتظار کر رہی تھیں جو ٹاٹ کے پردوں کے پیچھے سے سبزی لیتی عورتوں کو بھگتاتا آ رہا تھا۔ یہ عورتیں دل و جان سے باتیں کرتے کرتے یکایک سبزی والے کو اُس کی سست روی پر نہایت فحش انگریزی اور اُردو گالیوں سے نوازتیں اور پھر گفتگو کا سرا جوڑ دیتیں۔ شیزی کو یہ منظر کسی مزاحیہ پاکستانی پکچر کی طرح مضحکہ خیز لگ رہا تھا۔ بچے بغیر ہاتھ منہ دھوئے اپنی زنگ آلود پہیہ جام سائیکلوں پر ریس کرنے میں مصروف تھے۔ ایک سوکھے چمڑے ایسی جلد والے مریل بڑے میاں سر پہ ہیٹ اوڑھے، ہاتھ میں ڈبل روٹی سنبھالے گلی میں چلے آ رہے تھے۔ شیزی کو نہ جانے کب کا سنا ہوا ایک لفظ یاد آیا — پلپلی صاحب — اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ لیکن وہ لمحے بھر بعد ہی غائب ہو گئی کہ مٹی اڑاتی ایک کوڑا گاڑی سامنے میدان سے گزری۔ شیزی کو ریت اپنے دانتوں تلے کر کر کرتی اور آنکھوں میں کھٹکتی محسوس ہوئی۔ وہ کھڑکی سے پیچھے ہٹ گئی۔ غریبوں سے ہم دردی کرنا اور بات ہے اور ان کے ساتھ رہنا الگ مسئلہ ہے۔ شیزی نے سنجیدگی سے سوچا۔

شام کو وہ ڈیزی اور اُس کی ایک دوست کے دوستوں کی کھیپ کے ساتھ ایک نہایت برائے بالغان قسم کی فلم دیکھنے گئی۔ جمہوریت بحال کرنے کے حق میں ایک جلوس وہاں سے گزرا اور پکچر ہاؤس پر پٹرول چھڑک کر آگ لگاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے شعلے بلند ہوئے۔ ''آگ آگ''

کے شور میں فلم دیکھنے والے نکل کر بھاگے۔ شیزی حد سے زیادہ ہراساں تھی مگر ڈیزی نے اس کا ہاتھ تھاما۔ پل بھر میں لائن میں بیٹھے ہوئے سارے دوست باہر نکل آئے۔ سب نے اپنی کاریں اور موٹر سائیکلیں سنبھالیں۔ بغیر سواری کے دوست ان کی کاروں یا موٹر سائیکلوں کے پیچھے بیٹھ گئے۔ شیزی کو بھی کسی کار میں ٹھونس دیا گیا اور سب کے سب شہر کے ہنگاموں سے دُور سمندر کے کنارے جا پہنچے۔ وہاں چیونگم چباتے ہوئے نہایت آزادی سے ہر قسم کی باتیں ہوتی رہیں۔ ڈی ایچ لارنس اور نوبوکو (Nobokov) کی کتابوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کنواری بالیوں کے کان ذرا بھی سرخ نہ ہوئے۔ ڈیزی اور اس کی دوستوں کے ہجوم میں ہر مذہب و ملت اور ہر طبقے سے تعلق رکھنے والے لوگ تھے۔ ان میں کنواری لڑکیاں بھی تھیں اور ایسی لڑکیاں بھی جو تین شوہروں سے طلاق لینے کے بعد اب نئے منگیتر کے ساتھ دیکھی جاتی تھیں۔ آدھی رات تک پانی کے چھپاکے، پھر ساحلِ سمندر پر کار کے کیسٹ پر بجتی ناچتی تھرکتی موسیقی پر رقص ہوتا رہا۔ منہ اندھیرے، رات کا نشہ ٹوٹ رہا تھا کہ سب لوگ دوبارہ کاروں میں بھر کر اور موٹر سائیکلوں پر لد کر واپس ہوئے۔ رات کے مشعل بردار جلوس کے جلائے ہوئے پکچر ہاؤس، پٹرول پمپ، شکستہ اسکوٹروں اور گاڑیوں کے سلگتے یا بجھے ہوئے ملبے کو دیکھتے ہوئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے۔

گھر پہنچ کر سونے کے لیے لیٹتے وقت ڈیزی نے شیزی سے کہا، ''سنو، کراچی کے اس کراوڈ (crowd) میں سے کسی کو پسند کرلو۔ سب ہم جیسے کھال میں مست لوگ نہیں ہے بابا! بڑے بڑے انڈسٹریلسٹ اور زمیں داروں کے بیٹے بھی ہیں۔ کوئی نہ کوئی پھنس جائے گا۔ ہم جیسی لڑکیوں کے ساتھ تو یہ صرف گھومتے ہیں، پر شادیاں پردے کی بوبو یا خاندان کی لڑکیوں سے کرتے ہیں۔ تم جیسی سیدھی سادی، خوب صورت اور امیر لڑکیاں تو بڑی 'ووگ' میں ہیں آج کل۔''

شیزی نے پلٹ کر غصے سے ڈیزی کو دیکھا تو ہنستے ہوئے کہا، ''اوکے — اٹز نن آف مائی بزنس، گڈ نائٹ۔'' (It's None of my Business, Good Night.)

اور چادر منہ پر کھینچ کر ذرا سی دیر میں خراٹے لینے لگی۔ اُس وقت صبح کے نو بجے تھے اور شیزی کے لیے اُس وقت سو جانا ناممکن تھا۔

زری بچپن سے اپنے گاؤں کی حویلی اور پھر ایبٹ آباد کے جے جمائے گھر میں رہی تھی اس لیے غیر شعوری طور پر ایسے گھر اُسے اپنی طرف کھینچتے تھے جن میں پرانے تنومند، داڑھیاں بڑھائے ٹیڑھے میڑھے درخت ہوں۔ دیواروں پر چھائی بیلیں چھت سے باتیں کر رہی ہوں۔ اِس کے برعکس کراچی میں یا تو اپارٹمنٹ تھے یا ایسے نئے گھر جہاں سبزۂ نو دمیدہ بھی نہیں تھا۔ ان گھروں میں زری کو یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنی جڑ سے کٹ گئی ہو۔ نئے مکانوں کی رُکھائی اور خشک بے نیازی جیسے کوئی بھربھری ریت پر جی رہا ہو۔

زری نے ایسے تمام مکانوں سے منہ موڑا اور زرد رنگ کی ایک دقیانوسی، سنگی، اونچی چھتوں والی پیاری سی عمارت میں اُٹھ آئی۔ جس کے آدھے حصے میں ایک آرٹ اکیڈیمی قائم تھی۔ اس مکان میں بہت سے ایسے خالی کمرے تھے جہاں زری کبھی نہیں جاتی تھی۔ مگر ان کی موجودگی اسے بڑی غنیمت لگتی تھی جیسے اس کے بچپن کی کسی حِس کو تسکین دے رہے ہوں۔ لکڑی کا چمک دار زینہ، شطرنجی ٹائلیں جو ہر نظر میں ایک نیا نمونہ بن کر آنکھوں کے سامنے ناچتی تھیں۔ کمروں کے آگے برآمدے، بالکنیاں، محرابیں اور محراب نما کھڑکیاں جن پر بڑ کی گولر بھری شاخیں جھکی رہتیں۔ اونچے درختوں سے ٹپ ٹپ لال لال پھول ٹپکا کرتے اور کھڑکھڑ کرتے سوکھے بن بادام کے پتے گرتے۔ ان درختوں کے سبز پتوں کے ساتھ پھوٹتی سُرخ کونپلوں پر ایسے پرندوں کا گمان ہوتا جو شاخ کی پھننگوں پر ابھی ابھی آن کر بیٹھے ہوں، یا اُڑنے کے لیے پر تول رہے ہوں۔ گرمیوں کی دوپہروں میں ان درختوں

میں ہوا سنسان اور ان میں چھپے ہوئی فاختاؤں کی کوکو اور کوئل کی کوہو احساسِ تنہائی نہ ہونے دیتی۔

زری کہا کرتی تھی کہ پرانے درخت، خوب صورت پھول اور میٹھی آواز والے پرند، ان مزاج شناس نوکروں کی طرح ہوتے ہیں جو آپ کی تمام ضرورتیں پوری کرتے رہنے کے باوجود کبھی آپ کے کسی کام میں مخل یا موڈ میں حائل نہیں ہوتے۔ ورنہ اچھی سے اچھی موسیقی بعض اوقات بے وقت کی راگنی بن جاتی ہے۔ ایسے پرانے گھروں میں رات کی ساری آوازیں آپ کے تحت الشعور کا حصہ بن جاتی ہیں۔ جھینگروں، چھپکلیوں، اُڑتے پتوں، کبھی کبھی بلاوجہ سنسنانے والی اور کبھی یکایک دم سادھ لینے والی ہوا کی صدائیں۔ ابھی رات کا اندھیرا چھٹتا نہیں کہ نئی میٹھی آوازیں آمدِ صبح کا پیغام دیتی ہیں۔ چڑیاں بے تحاشا چہچہانے لگتی ہیں۔ مینا کی سریلی آواز بلبل کی میٹھی آواز سے الگ سنائی دیتی ہے اور آدمی آنکھ کھلنے کے بعد ہشاش بشاش اُٹھتا ہے جب کہ نئے مکانوں میں الارم کی آواز روز کے دردِ سر کا پیغام بن کر آتی ہے۔

زری کے گھر میں ایک پرانا خانساماں اور گلگونہ کی ماں جنت بی بی بہ حیثیت ہاؤس کیپر تھیں۔ زری کے گھر سے جناح اسپتال زیادہ دور نہ تھا۔ جہاں سنان کو داخل کر دیا گیا تھا۔ کمرے زیادہ صاف ستھرے نہ تھے لیکن ڈاکٹر قابل تھے۔ گھر اور دفتر سے نزدیک ہونے کی وجہ سے زری کو دیکھنے جانے میں آسانی تھی۔ شروع میں تو زری چھٹی لے کر سنان کے ساتھ رہی تھی مگر بعد میں سنان نے اتنی بہادری دکھائی تھی کہ خود ہی کہہ دیتا تھا کہ وہ تنہا اسپتال میں رہ سکتا ہے۔

زری ابھی دفتر سے لوٹی تھی۔ کھانا کھا کر ذرا دیر باہر دُھوپ میں بیٹھی تھی کہ جنت بی بی نے آج کی ڈاک لا کر دی۔ گھر کی ڈاک وہ اکثر یہیں بیٹھ کر دیکھتی تھی۔ چند دن ہوئے یہیں بیٹھے بیٹھے اس نے اعجاز کا خط کھولا تھا جس میں سے نیلی کا خط اس کی گود میں گر پڑا تھا۔ دونوں کے خط پڑھ کر وہ بہت دیر تک مسکراتی رہی تھی۔ دونوں ہی ایسے بچے تھے جو اپنے بڑوں سے خواہ مخواہ کی اُمیدیں وابستہ کر لیتے ہیں۔ کسی بڑے نے کسی موڈ میں کہہ دیا کہ ہم تمھیں ایک اچھی سی چیز دیں گے۔ اب وہ بھول چکا ہے لیکن بچہ ہے کہ ہر پل ہر گھڑی یہ امید لگائے ہے کہ وہ بڑا اُسے کوئی نادرِ روزگار تحفہ دے گا—— اور تصور ہی تصور میں وہ چیز بڑھتی جاتی ہے—— نادر اور نایاب ہوتی جاتی ہے۔

زری یہی سوچ رہی تھی اور اب تک اعجاز یا نیلی کو خط نہیں لکھ پائی تھی۔ سنان کی بیماری کی وجہ سے اسے فرصت بھی بہت کم ملتی تھی۔ آج کے خطوں میں ایک خط چاچا جی کا تھا۔ سب سے پہلے اُس نے یہی خط کھولا۔ پہلا جملہ پڑھ کر اس کے دل کو دھکا سا لگا۔

''خوشحال خان اب اِس دُنیا میں نہیں ہے۔'' چاچا جی نے لکھا تھا: ہمارے خاندان کے کئی لوگ

حکومت میں اعلیٰ عہدوں پر مامور ہیں۔ وہ چاہتے تھے خوش حال خان کی ماں کی بہتری اسی میں ہے کہ جلسے جلوس کے سلسلے میں اس کا نام نہ آئے۔ ویسے بھی وہ سنکی اور جھلا مشہور تھا۔ اس کی ناک سے پہلے بھی خون جاتا تھا۔ اس لیے اس کی موت کو طبعی بنانے میں زیادہ دِقت نہیں ہوئی۔ اسے اکبر منزل کے نیچے خاندانی قبرستان میں دفن کر دیا گیا ہے۔ اس کی ماں کی رو رو کر بُری حالت ہے لیکن وہ بھی اپنے شوہر اور بیٹے کی طرح بے حد خود دار عورت ہے۔ وہ ہرگز کسی کی مدد لینے کو یا اپنا گھر چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہے۔ میں نے سوچا ہے کہ گاؤں میں ان کی جو تھوڑی بہت زمین ہے اس کی دیکھ بھال اپنے ذمے لے لوں تا کہ اُس سے خاطر خواہ آمدنی ہو اور غریب بیوہ کا گزارا ہو سکے۔ اس سلسلے میں اگر میں پہلے دل چسپی لیتا تو بہتر ہوتا۔ لیکن بہت سی باتوں کا خیال اس وقت آتا ہے جب وقت گزر جاتا ہے۔

مرنے کے بعد خوش حال خان کی جیب سے جو بٹوہ نکلا اس میں بمشکل چند روپے تھے۔ اخبار کے دو ایک تراشے اور ایک دُھندلی سی تصویر، جس کے پیچھے پنسل سے خوش حال، فلفل اور زری لکھا ہوا ہے۔ یقین جانو مجھے اس کی موت کا بے حد غم ہے، اور ایک عجیب طرح کا احساسِ جرم ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ تمھیں بھی اُس کی موت کا صدمہ ہوگا، مگر کیا کیا جائے۔ ہمارا قومی المیہ ہے کہ خوش حال خان جیسے غیور، صاف گو اور بلند کردار لوگ زندگی میں کچھ نہیں کر پاتے بلکہ نکھٹو، جھلّے اور پاگل کہلاتے ہیں۔ ہماری قوم ایسے لوگوں سے کام لینا نہیں جانتی۔ وہ بے مصرف زندگی گزار کر گم نام موت مرجاتے ہیں، اور جھوٹے، دغاباز، دوغلے اور کمینے لوگوں کی چھوٹی چھوٹی مصلحتیں ایسے لوگوں کی موت سے بھی ان کی زندگیوں کی طرح فائدہ نہیں اُٹھاتیں۔

اعجاز کو تقرری کا خط مل گیا۔ اس کو ایک مہینے کے عرصے میں اپنے کام پر حاضر ہونا تھا۔ محکمے کی طرف سے اُس کی چھٹی باقی تھی، لیکن احسن صاحب کے گھر وہ غیر معین عرصہ کے لیے نہیں رہ سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کراچی سے اپنا سامان لانے سے پہلے کسی گھر کا انتظام کر لے۔ یہ مسئلہ بھی بیگم احسن کی مدد سے حل ہوا۔ ان کے بہت پرانے جاننے والوں میں کوئی صاحب اپنے گھر کا نصف حصہ کرائے پر دینا چاہتے تھے اور کسی شریف کرایہ دار کی تلاش میں تھے۔ اعجاز نے آخری جواب کے لیے ان سے بھی چند دن کی مہلت مانگی اور کراچی جانے سے پہلے ایک بار پھر خود کو زری کے بارے میں بات کرنے پر مجبور پایا۔ اس مرتبہ اس کی مخاطب بیگم احسن تھیں۔ جب سے شیزی کراچی گئی تھی اور نیلی نے ان کی نافرمانی میں سزا بھگتی تھی، وہ اعجاز پر کچھ زیادہ مہربان ہو گئی تھیں۔ مگر اعجاز اب بھی محتاط تھا۔ اسے معلوم تھا کہ قصرِ نیلم جیسے گھرانے میں اُس جیسے شریف لڑکے کا کام یہی ہوتا ہے کہ گھر کے ضروری بل کسی وجہ سے رہ گئے ہوں تو انھیں ادا کر دے، پارٹیوں میں نشست کا انتظام اور مہمانوں کی دیکھ بھال کرے، صاحبِ خانہ بہت مصروف ہوں تو ہنگامی دور میں ایک مرد کا گھر میں ہونا بہتر ہوتا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ یہاں سے اس وقت تک ٹلنے کا نام نہ لے جب تک گھر والے خود منھ پھوڑ کر نہ کہیں۔ آخر شام کو ایک دن جب احسن صاحب اور نیلی دونوں گھر پر نہیں تھے، اعجاز نے ہمت کی۔

''میرا اندازہ ہے کہ آپ زری کے ذکر پر خوش نہیں ہوتیں، پھر بھی میں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ وہ کس قسم کی لڑکی ہے اور اُس کا ماضی کیا ہے؟''

بیگم احسن کچھ دیر یوں سُن بیٹھی رہیں جیسے انھوں نے اعجاز کا سوال سنا ہی نہ ہو۔ اعجاز کو یقین ہوگیا کہ وہ بات ٹالنے کے لیے سُنی اَن سُنی کر گئی ہیں لیکن اچانک اُنھوں نے بولنا شروع کر دیا،

''زری وہ بدنصیب لڑکی ہے جس کے قریب رہنے والے کسی شخص کو میں نے خوش نہیں دیکھا۔ میں اتنی وہمی نہیں ہوں لیکن بعض لوگوں کی نحوست پر میرا یقین پکّا ہے، ان میں سے ایک زری ہے۔''

''اچھا!'' اعجاز ہنس دیا۔ دفعتاً یوں محسوس ہوا جیسے اس کی ہنسی بیگم احسن کے لیے چیلنج بن گئی ہو۔

''زری میرے نزدیک وہ چھلاوہ پائی ہے جو بھیس بدل کر لوگوں کے سامنے آتی ہے اور جب وہ اس کے سحر میں گرفتار ہوجاتے ہیں تو انھیں مار ڈالتی ہے۔'' انھوں نے بڑے جوش سے کہا۔

''کیا وہ سچ مچ اتنی خوف ناک ہے۔'' اعجاز نے کہا، ''مجھے تو اس میں ایسی کوئی بات نظر نہیں آئی۔''

''تمھیں کیسے نظر آئے گی؟'' انھوں نے طنز سے کہا، ''تم تو خود اُس کے سحر میں گرفتار معلوم ہوتے ہو۔''

یکایک اعجاز شرم سے سرخ ہوگیا۔ اُس کے کان جل اُٹھے اور اُس نے نگاہیں جھکا لیں۔

''زری جب تک اپنے والد کے گھر رہی وہ کبھی خوش نہ رہے۔ والدہ کے ساتھ رہی تو انھوں نے سوائے تکلیفوں کے کچھ نہ دیکھا۔ اپنی زندگی اس نے الگ برباد کی۔ آج بھی سنتے ہیں کہ اس کی شخصیت لوگوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے مگر اُس کی قربت کسی کو راس آئی ہے نہ راس آئے گی۔ زری کیا ہے زہریلی گیس ہے کہ نزدیک رہنے والا کچھ دیر اَن جانے میں اس گیس میں سانس لیتا رہتا ہے اور پھر مر جاتا ہے۔ بس اس سے زیادہ نہ میں بتا سکتی ہوں نہ بتانا چاہتی ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ جلدی سے اُٹھ کر چلی گئیں مبادا اعجاز کوئی اور سوال کر ڈالے۔

تین دن اور تین راتوں کی جگار کے بعد جب شیزی کی آنکھوں کے آگے تارے ناچنے لگے اور آنکھوں کے نیچے سیاہ حلقے پڑ گئے تب اُس نے سنجیدگی سے سوچنا شروع کیا کہ اب کیا کیا جائے؟ اتنی جلد لاہور لوٹ جانا تو لڑے بغیر ہتھیار ڈال دینے کے برابر تھا۔ اس کے علاوہ ان دنوں جواد کا وہاں ہونا یقینی تھا۔ یکا یک اسے خیال آیا کہ کسی ایسے رشتے دار کا پتا لگایا جائے جہاں وہ چند دن رہ سکے۔ کراچی میں دُور و نزدیک کا کوئی رشتے دار یا پاپا ممی کا کوئی نہ کوئی دوست ضرور ہوگا۔ ممی کو اوّل تو فون کرنا دشوار تھا، دوسرے سو فی صد اس بات کا امکان تھا کہ وہ فوری واپسی کا مطالبہ کریں۔ آخر اسے زری کا خیال آیا۔ شاید وہ کسی ایسے رشتے دار کی نشان دہی کر سکیں، جہاں وہ چند دن رہ سکے۔ کوشش کر لینے میں کیا حرج ہے۔ زری کا محکمہ معلوم تھا اِس لیے فون نمبر معلوم کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ ایک پبلک ٹیلی فون سے شیزی نے زری کو اطلاع دی کہ وہ اُس کے دفتر ملنے آ رہی ہے، اور ڈیزی کو ساتھ لے کر ٹیکسی میں میٹروپول ہوٹل پہنچی۔

دوسری منزل کے لمبے کوری ڈور میں یہاں سے وہاں تک دفتروں کی تختیاں لگی ہوئی تھیں اور سخت کاروباری ماحول تھا۔ زری کے دفتر پہنچ کر شیزی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ اندر سے ایک زنانہ آواز آئی، ''کم اِن''۔ دونوں اندر داخل ہوئیں۔ زری نے انھیں بیٹھنے کا اشارہ کیا اور مطبوعات کے سلسلے میں فون پر کسی کو ہدایات دیتی رہی۔ معاً شیزی کے دل میں خیال آیا کہ اُس نے یہاں آ کر غلطی کی ہے۔ آخر اسے یہ امید کیوں تھی کہ وہ خاتون جن سے ان کے گھر کا کوئی فرد کبھی نہیں ملتا، اُس کی مدد کریں گی۔ ابھی فون رکھتے ہی وہ یقیناً کاروباری انداز میں پوچھیں گی، ''جی میں آپ کے لیے کیا کر سکتی ہوں؟'' ڈیزی کے سامنے

کتنی ہتک ہوگی۔ مگر اب کیا ہوسکتا تھا۔ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ فون ختم کر کے جیسے ہی زری ان کی طرف متوجہ ہوئی، شیزی مارے گھبراہٹ کے ایک دم سرخ پڑ گئی۔ زری نے باری باری دونوں کی طرف دیکھا۔

''تو آپ شہزادی ہیں؟'' اُس نے کہا، ''ارے آپ اتنا بلش (blush) کیوں کر رہی ہیں، ادھر آیئے — آن کر مجھ سے گلے ملیے۔''

زری خود کرسی سے اُٹھ کر اُس کی طرف بڑھی۔ شیزی بھی کھڑی ہوئی۔ زری نے اسے گلے سے لگا کر گال کو ہونٹ سے مَس کیا۔ اس کے بعد ڈیزی سے ہاتھ ملایا۔ زری کے لہجے میں جو بے تکلفانہ ادا تھی وہ شیزی اور ڈیزی دونوں کو اچھی لگی۔

''یہ میری دوست ڈیزی ہیں۔'' شیزی نے تعارف کرایا۔

''آپ کا نام بڑا خوب صورت ہے۔'' زری نے مسکرا کر کہا، ''ڈیزی پھول بھی تو بڑا پیارا ہوتا ہے، نازک سا۔ آپ کبھی انگلینڈ گئی ہیں؟''

''اوہ نو — خواب میں بھی کبھی نہیں۔'' ڈیزی نے اپنی ازلی صاف گوئی سے کام لیا۔

''انگلینڈ میں ہر جگہ، میدانوں میں، سڑک کے کنارے گھاس میں ڈھیروں ڈھیر ڈیزی کے پھول کھڑے جھومتے رہتے ہیں۔ بڑے پیارے لگتے ہیں۔ ہاں شیزی، کہاں ہے تمھارا سامان؟''

''میں تو کئی دن سے آئی ہوئی ہوں، ڈیزی کے گھر ٹھہری ہوں۔'' شیزی نے کہا۔

''اچھا۔'' زری نے اطمینان سے کہا۔

پھر گھنٹی بجائی، کچھ چیزیں دراز میں ڈالیں، دراز بند کی اور اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''لنچ کا وقت ایک بجے ہوتا ہے، ابھی چند منٹ باقی ہیں مگر نیور مائنڈ، آیئے چلیں۔'' اسی وقت چپڑاسی آیا۔ زری نے اُس سے کہا، ''جمعہ بی بی کو بتا دینا، میں مہمانوں کے ساتھ گئی ہوں، اب لنچ کے بعد ہی آؤں گی۔''

شیزی اور ڈیزی حیران تھیں کہ وہ کہاں لے جائی جا رہی ہیں۔ آخر انھوں نے دل ہی دل میں طے کیا کہ زری انھیں لنچ کے لیے کسی ہوٹل میں لے جانا چاہتی ہے۔ زری لاہور کے موسم کے بارے میں سوالات کر رہی تھی اور کراچی کے نرم گرم موسم سے اُس کا موازنہ کر رہی تھی۔ طویل کاری ڈور کو پار کر کے وہ لفٹ سے نیچے اتریں۔ ہوٹل کے باہر منی سی ایک فیئٹ کھڑی تھی، زری نے شیزی سے پیچھے بیٹھنے کو کہا۔ ڈیزی کو ڈرائیور کے برابر کی سیٹ پر بٹھایا اور خود گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا، ''ہاں تو ڈیزی، کہاں ہے آپ کا گھر؟''

''کیا آپ میرے گھر چل رہی ہیں؟'' ڈیزی نے حیران ہو کر پوچھا۔

''اور کیا — ابھی میں نے بتایا تھا کہ لنچ کا وقت ہو گیا ہے۔ اب کہیں تو چلیں گے نا۔''

''اوہ، اچھا۔'' ڈیزی نے اپنے حواس بجا کیے۔ ''طارق روڈ سے پہلے شاہراہِ قائدین پر بائیں

طرف مُڑ یئے گا-- ماڈل اسکول کے نزدیک__''

''اچھا بس میں سمجھ گئی۔'' زری نے درمیان ہی میں ٹوک دیا۔''ہاں شیزی! اور کیا شوق ہیں تمھارے، گاتی ہو؟''

''جی نہیں۔'' شیزی نے جواب دیا۔

''ناچتی ہو؟'' زری کے لہجے میں مسکراہٹ تھی۔

''نہیں۔'' شیزی ہنس پڑی۔

''شکر ہے، تم ہنستی تو ہو۔'' زری نے کہا۔

''دائیں طرف۔'' ڈیزی نے راہ بتائی، ''اگلی گلی سے بائیں لیجیے۔''

دو چار گلیوں میں دائیں بائیں گھومنے کے بعد کار ایک گلی میں جا ٹھہری۔ بچوں کی ایک ٹیم کرکٹ کھیلنے میں مصروف تھی۔ انھوں نے ذرا کی ذرا کھیل روک کر کار کو نکلنے دیا، اور اجنبی لڑکیوں کو دلچسپی سے دیکھا، پھر اپنے کھیل میں مصروف ہو گئے۔ چند کرسچن لڑکیاں ایک گھر کے آگے کھڑی اپنی مخصوص انگریزی میں روانی سے باتیں کیے جا رہی تھیں۔ چند چھوٹے لڑکوں نے ایک کتے کی دُم میں بڑا سا ٹین باندھ دیا تھا۔ وہ گھبرا کر بے تحاشا دوڑ رہا تھا اور بچے اُس کے پیچھے تالیاں پیٹتے اور شور مچاتے بھاگ رہے تھے۔

''یہ ہے ہمارا گھر۔'' ڈیزی نے پوری کوشش کی کہ اس کے لہجے میں کسی قسم کا اظہارِ ندامت نہ ہو۔

ڈیزی آگے، اس کے پیچھے زری اور آخر میں شیزی اندر داخل ہوئی۔

''مما۔'' ڈیزی نے چہرہ اُوپر کر کے آواز دی۔ اُوپر سے مما کا مُرجھایا سانولا چہرہ جھانکا۔ زری کو دیکھ کر اُن پر 'یک نہ شُد دو شُد' کی سی کیفیت طاری ہوئی۔ پھر وہ دھیرے دھیرے نیچے اُترنے لگیں۔ زری نے دیکھا، نیچی سی بدرنگ فراک میں سے ان کی ٹانگیں کونج کی ٹانگوں کی طرح دُبلی اور سیاہ دکھائی دے رہی تھیں۔ وہ گلابی رنگ کا ایسا سوئیٹر پہنے ہوئے تھیں جس کا رنگ اترے بھی کئی سردیاں گزر چکی تھیں۔

''مما! یہ شیزی کی آنٹ (aunt) ہیں۔'' ڈیزی نے کہا۔

''ہاؤ آر یو؟'' دونوں عورتوں نے ہاتھ ملایا۔ ''آیئے بیٹھیے۔'' انھوں نے تکلفاً کہا۔

ڈیزی سوچ رہی تھی کہ اب کس طرح مما سے لنچ کا ذکر چھیڑے۔

''سوری، ہمارے پاس بیٹھنے کا وقت نہیں ہے۔'' زری نے کہا، ''ابھی آفس سے اُٹھ کر آ رہی ہوں۔'' پھر اُس نے شیزی کی طرف دیکھا اور کہا، ''شیزی اپنا سامان گاڑی میں رکھوایئے، ابھی ہمیں لنچ بھی لینا ہے۔ بقول کسے__''

شیزی نے چونک کر ڈیزی کی طرف دیکھا۔

"یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔" ڈیزی نے احتجاج کیا، "شیزی تو میرے ساتھ رہنے آئی ہے۔"

"آپ کے گھر تو رہ لیں، اب خالہ کا بھی کوئی حق ہے۔" زری نے ڈیزی کی ممانی کی طرف دیکھا۔ "آپ ہی انصاف کیجیے۔"

"ہاں، انصاف کی بات تو یہی ہے۔" مما نے خوش ہو کر اُردو میں کہا۔

"اور آج کل میرے ہاں شیزی کی سخت ضرورت ہے۔" زری نے کہا۔ شیزی حیران تھی کہ زری کو اس کی ایسی کیا ضرورت پڑ گئی ہے۔ ڈیزی نے شیزی کو اپنے کمرے کی طرف آنے کا اشارہ کیا۔

"تم کیا چاہتی ہو؟" ڈیزی نے پوچھا۔

"میں ان کے ساتھ تو جانا نہیں چاہتی تھی۔ اصل میں ……" وہ کچھ کہتے ہوئے ہچکچا رہی تھی۔ زری کو اُس طرف آتے دیکھ کر وہ ایک دم خاموش ہوگئی۔

"اچھا، تو بھئی یہ تمھارا کمرہ تھا اور یہ تمھارا سوٹ کیس ……" سامنے کمرے میں شیزی کا سوٹ کیس زری فوراً پہچان گئی۔ "میں تمھیں تو اٹھا نہیں سکتی البتہ تمھارا سوٹ کیس اٹھا لیتی ہوں۔"

جیسے ہی اُس نے سوٹ کیس کو ہاتھ لگایا، ڈیزی کی مما نے ایک بچے کو اشارہ کیا جس نے سوٹ کیس اٹھایا اور جھٹ پٹ زینہ اُتر گیا۔ زری نے شیزی کا ہاتھ پکڑا اور اُسے لے کر نیچے کی طرف چلی۔ کار میں بیٹھنے سے پہلے ڈیزی شیزی کی کھڑکی کی طرف گئی۔

"تمھیں کسی دن کوئی شخص غیر علاقے میں لے جائے گا اور تم کچھ نہ کر سکو گی۔" اس نے شیزی کے کان میں سرگوشی کی۔

"میں بہت جلد واپس آ جاؤں گی۔" شیزی نے خلوص سے کہا۔ کیوں کہ اسے معلوم تھا کہ اس کے زری کے گھر جانے کی خبر اس کی ممی کے لیے بے حد پریشان کن ہوگی۔

"یہ تمھارے بس کی بات نہیں، البتہ یہ بتا دو کہ تم سے contact کیسے ہوگا؟" ڈیزی نے کہا۔

شیزی کے کہنے پر زری نے اپنا فون نمبر اور گھر کا پتا ڈیزی کو بتایا۔

"تم ضرور کسی دن میرے ہاں آؤ۔" زری نے کہا۔ "میرے گھر کے آدھے حصے میں ایک آرٹ اکیڈمی کھلی ہوئی ہے۔ اس وقت وہاں ایک شو کی زبردست تیاریاں ہو رہی ہیں، تم جیسی لڑکیوں کی وہاں بہت ضرورت ہے۔"

"مجھے شو میں کام کی ضرورت نہیں، ایک عدد نوکری درکار ہے۔ شاید اب میں لاہور نہ جاؤں۔ اگر آپ کے آفس میں کوئی جگہ ہو تو خیال رکھیں۔"

"شیور (sure)۔" زری نے کہا اور گاڑی کا رُخ اپنے گھر کی طرف موڑ لیا۔

زری، شیزی کو لے کر گھر آئی۔ جنت بی بی نے سادہ سا کھانا چن دیا۔ کھانے کے بعد زری نے شیزی کو ایک کمرہ دکھایا۔ ایک پلنگ پر صاف ستھرا بستر بچھا ہوا تھا۔ ڈریسنگ ٹیبل تھی۔ لکھنے پڑھنے کی ایک میز اور کرسی۔ کمرے کا فرنیچر پرانی وضع کا مگر قیمتی تھا۔

''یہ تمھارا کمرہ ہے۔'' زری نے کہا، ''میرے ہاں مہمانوں کی آمدورفت صفر ہے، اس لیے نوکروں کو مہمان داری کا تجربہ نہیں ہے۔ اس کا علاج یہی ہے کہ جس چیز کی ضرورت ہو مانگ لینا۔ تکلف کرو گی تو تکلیف میں رہو گی۔''

''جی اچھا۔'' شیزی نے فرماں برداری سے کہا۔

''آؤ تمھیں کلچرل گروپ سے ملوا دوں۔'' زری اسے گھر کے دوسرے حصے میں لے گئی جہاں ایک پارٹی کے چند لوگ نذر الاسلام کا ایک گانا اور اس کا ترجمہ ایک ہی دھن میں گانے کی مشق کر رہے تھے۔ اندر کمرے سے گھنگھروؤں کی چھنا چھن اور تک دھنا دھن اور تھا تھا تھا کی آوازیں آ رہی تھیں۔

برآمدے میں ایک بنگالی مرد چند آرٹسٹوں کو ڈرامے کی ہدایات دے رہا تھا۔ ڈراما غالباً مغربی اور مشرقی پاکستان کی یک جہتی کے لیے لکھا گیا تھا۔

''ہائے۔'' زری کو دیکھ کر وہ پکارا۔

زری، شیزی کو لے کر اس کے پاس گئی۔ ''نورا یہ میری بھانجی ہے شیزی۔ کچھ دن ہمارے پاس رہے گی۔ تمھارا کام یہ ہے کہ تم اسے بور نہ ہونے دو۔''

''بور ہونے کا کیا شوال ہے۔'' نور نے خالص بنگالی لہجے میں کہا،''میں آج ہی انھیں اپنے ڈرامے میں کاسٹ کر لیتا ہوں۔ یہ تو ہیروئن بھی بن سکتی ہیں۔''

''جی نہیں، میں نے کبھی کسی ڈرامے میں کام نہیں کیا۔'' شیزی ہکلائی۔

''ہر شخص کی زندگی میں کوئی نہ کوئی پہلا دن تو ہوتا ہے۔'' زری نے کہا۔''اچھا ایکٹنگ نہ سہی، میوزک کلاس جوائن کر لو، پینٹنگ شروع کر دو، کس وقت آتے ہیں اپنے کبیر صاحب؟''

''بس آتے ہی ہوں گے۔'' نور نے جواب دیا۔

''میں پینٹنگ کی کوشش کروں گی، میں نے بچپن میں تھوڑی سی کی بھی ہے۔'' شیزی نے کہا۔

''چلو، تم نے کسی چیز کا شوق تو ظاہر کیا۔ لو بھئی میں چلی۔ خدا حافظ — خدا حافظ نور۔''

شیزی بیٹھی ڈرامے کی ریہرسل سے دل بہلاتی رہی۔ نور کی بنگالی لہجے میں اردو اسے اچھی لگ رہی تھی۔ ڈرامے کے پرجوش مکالمے اُسے مضحکہ خیز لگ رہے تھے۔ بہر صورت ڈیزی کے گھر کی بے رنگی اور اکتاہٹ کے بعد شیزی کو یہ ہنگامہ اچھا لگا۔ اسی گھر کے ایک گیراج میں ایک آدمی پینٹنگ کا سامان اور تیار کینوس فروخت کر رہا تھا۔ شیزی ایک کینوس اور سامان خرید لائی اور باقی کلاس کے ساتھ مل کر ایک اسٹل لائف پینٹ کرنے میں مصروف ہو گئی۔

جب سب لڑکے لڑکیاں چلی گئیں تب شیزی نے بھی اپنا برُش تارپین کے تیل میں دھویا۔ ذرا دیر میں زری ایک اور لڑکی کے ساتھ داخل ہوئی اور شیزی سے اُس کا تعارف کرایا۔

''نرگس بہت اچھی آرٹسٹ اور اِن نور میاں کی منگیتر۔''

''جو بات پہلے بتانی چاہیے تھی وہ بعد میں بتائی ہے۔'' نور نے ہنس کر کہا۔

''اچھا زیادہ اتراؤ مت۔ بولو چائے پیو گے؟'' زری نے پوچھا۔

''جرور۔ آج تو تھک کے — وہ ہو گیا — کیا بولتے ہو تُم لوگ۔''

''چُور۔'' نرگس نے کہا۔

''خدارا اپنی اُردو درست کرو نور۔'' زری نے تنبیہ کی۔

''پہلے تم اپنی بنگلہ ٹھیک کرو۔'' نور نے پٹ سے جواب دیا۔

''بنگلہ سیکھوں گی تو درست کروں گی۔'' زری نے کہا۔

''نرگس بتا رہی تھی کہ شمس تمھیں بنگلہ پڑھا رہا ہے۔'' نور نے کہا۔

''ہاں، کوشش تو کر رہا ہے غریب۔''

''وہ بے چارہ کیا پڑھائے گا۔ وہ تم لوگ میں رہ کر خود بنگلہ بھول چکا ہے۔''

''نہیں، ایسی بات بھی نہیں ہے۔ البتہ اُردو اچھی بول لیتا ہے اِس لیے تم اس سے جلتے ہو۔''

''جلنے کا مطلب ہے jealous، ہے نا!''

''ہاں۔'' زری نے کہا۔

''تم اسے اتنا لفٹ دے رہی ہو جلنے کا تو بات ہی ہے۔'' نور نے نرگس کی طرف دیکھ کر آنکھ ماری اور ہنسنے لگا۔

''اچھا یہ غنڈہ گردی—'' زری نے ہنس کر کہا۔

''ویسٹ میں اسے compliment بولتے ہیں۔'' نور نے کہا۔

''ویسٹ پاکستان میں اسے غنڈہ گردی کہتے ہیں اور پوربو پاکستان میں کیا کہتے ہیں؟'' زری نے پوچھا۔

''فلرٹ کرنا۔ نرگس نے مجھے اپنا دوستوں کے ساتھ تھوڑا تھوڑا فلرٹ کرنے کا اجاجت دے دیا ہے۔''

''غلط، بالکل غلط۔ ہرگز نہیں۔'' نرگس نے انگلی نچا کر احتجاج کیا۔

''اچھا میں چل کر چائے بنواتی ہوں، تم دونوں دومنٹ میں پہنچو۔ آؤ شیزی چلیں۔''

زری شیزی کو لے کر اپنے حصے میں آئی۔ تھوڑی دیر میں نور اور نرگس بھی آ گئے۔ ابھی وہ چائے پی رہے تھے کہ شمس الرحمٰن آ گیا۔

''شمس الرحمٰن— اخبار میں سینئر رپورٹر ہیں۔'' زری نے شیزی سے اس کا تعارف کروایا۔

اس کو دیکھتے ہی جنت بی بی بنگلہ کی کتاب اور کاپی اُٹھا لائی۔

''پہلے گرما گرم چائے پلواؤ اور کچھ کھانے کے لیے دو۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''دیکھتی ہوں، اگر تمھاری قسمت کا کچھ ہوا تو نکل آئے گا۔'' زری نے کہا۔

''ہماری قسمت میں تو بہت کچھ ہے اگر مل جائے۔'' شمس الرحمٰن نے زری کو دیکھتے ہوئے زیرِ لب کہا۔

''جو جس کی قسمت میں ہوتا ہے، وہی ملتا ہے۔''

''تمھارے دل سے کچھ نکلے بھی۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''اوہو، بڑی بامحاورہ اُردو بول رہے ہو۔'' زری بولی۔

''دیکھ لو، ایک تم ہو کہ روز بنگلہ پڑھنے سے جی چراتی ہو۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''میں جان نہیں چراتی مگر روز کچھ نہ کچھ ہو جاتا ہے۔ بنّان کے پاس اسپتال جانا ہوتا ہے۔ آج

شیزی آئی ہوئی ہے، وہ دیکھے گی کہ یہاں کوئی پوچھ نہیں تو بھاگ نکلے گی۔''

''ارے نہیں۔'' شمس الرحمن نے چائے پیتے ہوئے بے تکلفی سے ٹانگیں پھیلائیں۔ ''تمھارے شکنجے میں آ کر کون بھاگ سکتا ہے۔'' وہ ہنسا۔

نور اور نرگس نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھا۔ نور نے بنگلہ میں کچھ کہا۔ شمس الرحمن اور نرگس دونوں ہنسنے لگے۔

''کیا کہا؟'' زری نے پوچھا۔

''دیکھو جری، کوئی بھی جُبان سیکھنا ہو تو بس بولنا شروع کر دو۔ یہ پنسل کاپی لے کر گھس گھس کرنے سے کچھ نہیں ہوگا۔'' نور نے کہا۔ ''تم ہمارے ساتھ بنگلہ میں بات کرو۔ دیکھو دنوں میں تمھیں بنگلہ سکھا دیں گے۔ یہ شمشو تو فراڈ کر رہا ہے۔''

''اچھا تو طے ہوا کہ میں آج سے تم لوگوں کے ساتھ بنگلہ میں بات کروں گی۔'' زری نے کہا۔

''خبردار جو کوئی میری زبان پر ہنسا۔ البتہ جب تک شیزی ساتھ ہے بات اُردو میں ہوگی۔''

''بس اب پڑھائی کا ڈھونگ ختم۔ چلو کہیں چل کر کھانا کھاتے ہیں۔'' نور نے کہا۔

''نہیں، یہ ڈھونگ نہیں ہے۔ زری کو بنگلہ پڑھنا اور لکھنا بھی آنا چاہیے۔'' شمس الرحمن سنجیدہ ہو گیا۔

''اچھا کل سہی — آج پڑھائی بالکل نہیں ہو سکتی۔'' نرگس نے کہا۔

''چلو، واپسی میں مجھے اسپتال میں اتار دینا۔'' زری نے کہا۔ ''آؤ اٹھو، چلو شیزی۔''

وہ سب اُٹھ کر شمس الرحمن کی کار میں بیٹھ کر چل دیے۔ راستے بھر شیزی سوچتی رہی کہ اب اس صورتِ حال کی اطلاع ممی کو کیسے دی جائے۔ وہ کس طرح باور کریں گی کہ اس ساری کارروائی میں اس کی مرضی کا ذرا بھی دخل نہیں۔ واقعی ڈیزی ٹھیک کہہ رہی تھی کہ اگر کوئی مجھے اٹھا کر قبائلی علاقے میں لے جائے گا تو میں بلا چون و چرا چلی جاؤں گی۔ کیا میں ہمیشہ اپنی مرضی کے خلاف چلائی جاتی رہی ہوں گی۔ کیا میری کوئی وِل (will) نہیں ہوگی۔ ایک زری ہیں کہ دوسروں کے دل کی بات بغیر بتائے جان لیتی ہیں اور اپنی ہر بات اتنی آسانی سے منوا لیتی ہیں۔ شمس الرحمن شاید ٹھیک کہہ رہا ہے کہ تمھارے شکنجے سے کون نکل سکتا ہے۔ اس کی نظریں بتا رہی ہیں کہ وہ اس شکنجے میں اپنی مرضی سے گرفتار ہو چکا ہے اور ایک اور شخص بھی ہے جو سیکڑوں میل دُور بیٹھا ان کی مرضی کا پابند ہے اور یہ فیصلہ نہیں کر سکتا کہ لاہور میں رہے یا کراچی چلا جائے۔ اس عورت میں کچھ تو ایسا سحر ہے جس کی وجہ سے ممی اس سے خوف کھاتی ہیں۔ کل تک مجھے اپنی بے بسی اور مجبوری بالکل قدرتی لگ رہی تھی، آج کتنی غیر فطری لگ رہی ہے۔ نہیں، کوئی شخص اتنا مجبور نہیں ہے۔ کیا امّی سے یہ کہنا اچھا لگے گا کہ زری آنٹی

زبردستی مجھے اپنے گھر لے آئی ہیں۔ کیا میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ میں خود ان کے گھر آ گئی ہوں۔ وہ میری خالہ ہیں اور ان کے گھر رہنے میں کیا برائی ہو سکتی ہے۔

یہ سوچنے کے بعد بھی اس کی ہمت نہ ہوئی کہ یہ سب فون پر ممی کو بتائے۔ اس نے خاموش رہنے میں مصلحت جانی۔ ڈیزی کے گھر سے ایک خط بھیج چکی تھی۔ اس کا جواب آنے تک ممکن ہے وہ کسی اور رشتے دار کے گھر جا سکے یا واپس ڈیزی کے گھر پہنچ جائے۔ خط میں وہ صورتِ حال کو بنا سنوار کر لکھ سکے گی۔ فون پر فوری جوابات دینے پڑتے ہیں۔ خطوط میں تھوڑی سی مصلحت آمیزی کی جا سکتی ہے۔

اس دن وہ سب کے ساتھ چل چل کر خوب تھکی۔ نئی جگہ ہونے کے باوجود خوب گہری نیند سوئی۔

ایئرپورٹ سے گھر جانے کے بجائے اعجاز سیدھا زری کے مکان پر پہنچا۔ زری کی خاموش طینت ملازمہ نے کہا، ''بی بی گل اسپتال میں ہیں۔''

''اسپتال میں — کون سے اسپتال میں، خیریت تو ہے؟''

''ہاں وہ ٹھیک ہیں۔ جناح اسپتال کے پرائیویٹ وارڈ میں، کمرہ نمبر —'' کم گو عورت نے اطمینان سے کہا۔ مگر اعجاز کو یقین ہوگیا کہ زری بہت بیمار ہوگی۔ خدا جانے وہ کب سے بیمار ہے۔ تبھی تو اس کے خطوں کا جواب نہیں دیا۔ اپنا سوٹ کیس جنت بی بی کے حوالے کر کے وہ اسی ٹیکسی میں اسپتال چلا گیا۔

اسپتال کے کمرے پر دستک دیتے ہوئے اعجاز کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اس کا جی بھرا آرہا تھا۔ تصور میں وہ زری کو کمزور و لاغر بستر پر پڑا دیکھ رہا تھا۔ سنہری بال اس کے زرد بیمار چہرے کا ہالہ کیے ہوئے تھے۔ تصور ہی میں اس نے زری کے کان سے اپنا منھ لگا کر سرگوشی کی۔

''زری میں آ گیا ہوں۔ اب تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔''

دروازے پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی، ''کم اِن۔'' یہ زری کی آواز تھی۔ اعجاز نے دروازہ کھولا۔ زری سامنے کھڑی تھی۔ کالی شلوار، زرد رنگ کا سندھی انداز کا کڑھا ہوا کرتا۔ وہ بیمار نہیں تھی۔ بیمار کوئی اور تھا جو بستر پر لیٹا ہوا تھا۔ اعجاز نے اس کی طرف دیکھا۔ وہ نو دس سال کا بچہ تھا۔ گورا رنگ، موٹی موٹی آنکھیں جو بخار کی تپش سے جل رہی تھیں۔ سرخ ترشے ہوئے ہونٹ، جن پر پپڑیاں سی جمی ہوئی تھیں۔ اعجاز نے حیران سوالیہ نظروں سے زری کی طرف دیکھا۔

''میرا بیٹا سنان، بہت بیمار ہے اعجاز۔'' زری نے کہا، ''اسی لیے میں تمھارے خط کا جواب نہیں دے سکی۔''

اعجاز نے زری کو یوں دیکھا جیسے اسے اپنے کانوں پر اعتبار نہ ہو۔ یہ زری نے کیا کہا!— اور اس انداز میں جیسے وہ روز اس سے اپنے بیٹے کی بات کرتی ہو۔ اب بھی یوں لگ رہا تھا جیسے اُسے ذرا بھی اندازہ نہ ہو کہ اس ایک جملے سے اعجاز کے دل اور ذہن پر کیا گزر گئی۔

''سو جاؤ بیٹے، آنکھیں بند کر لو۔'' اس نے بچے کی آنکھوں پر ہاتھ رکھا۔ بچے نے آنکھیں موند لیں۔

''بیٹھو اعجاز، خیریت سے تو ہو؟'' زری نے کہا۔ مگر وہ کھڑا رہا اور خاموشی سے سنان کے چہرے کو تکتا رہا۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اُس نے اس بچے کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہے۔

زری اس سے لاہور کی باتیں کرتی رہی۔ ملازمت مل جانے پر خوشی کا اظہار کیا مگر اعجاز نے سوائے ہوں ہاں کے کچھ نہ کہا۔ اتنے میں نرس آ گئی۔ زری اُٹھ کر اس کی مدد کرنے لگی۔ جس وقت سنان کے خون چڑھایا جانے لگا اس نے نہایت کرب سے کہا، ''نہیں امی پلیز— مجھے بہت تکلیف ہوتی ہے۔''

زری اسے بہلاتی پھسلاتی رہی۔ تھک ہار کر وہ خاموش ہو گیا۔ زری کرسی کھینچ کر اس کے پاس بیٹھ گئی اور ایک ٹک اسے دیکھتی رہی۔ زری کا چہرہ زرد تھا اور آنکھوں میں کرب کی پرچھائیاں تھیں۔ اعجاز کو یوں لگا جیسے جو خون سنان کے جسم میں جا رہا ہے قطرہ قطرہ زری کے جسم سے نکل رہا ہے۔ پھول جیسے بچوں کا ناقابلِ علاج مرض میں مبتلا ہو کر کشاں کشاں موت کی طرف جانا— کیا اس سے زیادہ کرب انگیز منظر کوئی اور ہو سکتا ہے۔

جب ڈاکٹر سنان کو دیکھ کر باہر نکلا تو اعجاز بھی اُس کے ساتھ ہو لیا۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ بچے کو خون کا کینسر ہے۔ اس کا خون بار بار بدلا جا رہا ہے۔ مگر زندگی کی کوئی اُمید نہیں ہے۔''

اعجاز واپس کمرے میں جانے کے بجائے اِدھر اُدھر پھرتا رہا۔ ہر طرف مریض تھے۔ کسی کی رنگت ہلدی کی طرح زرد تھی۔ کسی کے پاؤں پر پلاسٹر چڑھا ہوا تھا۔ کوئی کراہ رہا تھا۔ ہر طرف دکھ اور پریشانیاں تھیں۔ زری کے گھر سے یہاں تک وہ سوچتا آیا تھا کہ وہ زری کو یوں تسلی دے گا، یہ کہے گا، مگر اب وہ زری سے کچھ نہ کہہ سکا تھا۔ وہ زری سے کیا کہے— ''صبر کرو—'' مگر صبر تو اس کے چہرے پر لکھا تھا۔

اعجاز دوبارہ کمرے میں گیا تو سنان سو چکا تھا اور زری ٹکٹکی باندھے اب بھی اسے دیکھ رہی تھی۔ اعجاز نے سن رکھا تھا کہ ایسے مریضوں کے اپنے خون کا آخری قطرہ بھی جسم سے نکل جاتا ہے تو وہ اس چراغ کی طرح گُل ہو جاتے ہیں جس کا تیل ختم ہو گیا ہو— سنان بھی بہت جلد اسی طرح ختم ہو جائے

گا۔۔۔ زری کا بچہ!۔۔۔ اسے یوں نہ مرنا چاہیے تھا۔ اعجاز کا دل دھیرے دھیرے پگھلنے لگا۔ اس نے زری کے ہاتھ کو تھپتھپایا اور اُٹھ کھڑا ہوا۔ دروازے پر، جب وہ رخصت ہونے لگا تو بالکل غیر شعوری طور پر اس کے منھ سے نکلا۔

''سنان کے والد کو اس کی بیماری کی اطلاع ہے؟'' اور جب یہ جملہ اس کے منھ سے نکل گیا تو اس نے اپنے چہرے پر اپنے دلی جذبات نہ آنے دینے کی بے سُود سی کوشش کی۔

''تمھیں یہ خیال کیسے ہوا کہ سنان کا کوئی باپ بھی ہے۔'' زری نے کہا۔ اعجاز چور سا ہو گیا جیسے اسے یہ معلوم نہ ہو کہ دُنیا میں آنے والے ہر بچّے کا کوئی باپ ہوتا ہے۔ وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔ اسے کچھ خبر نہ تھی کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ گیٹ پر اس نے شمس الرحمٰن کو اندر جاتے دیکھا مگر وہ انجان سا بنا نکلا چلا گیا۔ اس کے اندر ایک کڑوا دُھواں بھرا ہوا تھا جو اس کا دم گھونٹے دے رہا تھا۔ تو زری کا ماضی اس کے لیے بند کوٹھری ہے، جیسے ساتواں در۔۔۔ جب تک وہ اسے نہیں کھولے گا اُس میں جھانکنے کے لیے تڑپتا رہے گا اور جب کھول لیا تو خدا جانے کون آسیب اور بلائیں اس میں سے نکل کر اس کی گردن پر چڑھ بیٹھیں گی اور خون پینا شروع کر دیں گی۔ اس دن محبت اسے نہایت اذیت ناک چیز نظر آئی۔ شاید وہ محبت نہیں کوئی اور نہایت تکلیف دہ جذبہ تھا، نفرت سے بھی گہرا اور شدید۔

جس وقت اعجاز چونکا وہ اسپتال اور زری کے گھر سے بہت دُور نکل چکا تھا۔ زری کے گھر سے سوٹ کیس لینے کے بجائے وہ اسی طرح اپنے گھر چلا گیا۔

دو دن تک اعجاز اپنے کمرے سے باہر نہ نکلا۔ اس کی امی اور چھوٹے بہن بھائی پریشان تھے۔ وہ بے سروسامانی کے عالم میں دل گرفتہ سا لاہور سے آیا تھا۔ اس کے ہاتھ میں صرف ایک بریف کیس تھا۔ ہوسکتا ہے وہ اس لیے سامان نہ لایا ہو کہ اسے واپس جانا تھا اور اس کے کپڑے وغیرہ یہاں موجود تھے۔ مگر پریشانی کی بات یہ تھی کہ وہ آتے ہی اپنے کمرے میں بند ہوگیا تھا۔ پوچھنے پر اس نے صرف یہ بتایا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے مگر بظاہر اسے کوئی بیماری نہیں تھی۔ بخار تک نہیں تھا جو بہت سی بیماریوں کی علامت ہوتا ہے۔ امی دل ہی دل میں اُس کی خاموشی کی توجیہات کرتی رہیں۔ شاید کراچی چھوڑنے کا غم ہو، دوستوں اور عزیزوں سے دُور نہ رہنا چاہتا ہو، مگر وہ تو کہتا ہے نئی ملازمت سے خوش ہے۔ خود ہی جانا چاہتا ہے، کسی اور نے تو زبردستی نہیں کی تو آخر پریشانی کیا ہے۔

تیسرے دن اعجاز ایکا ایکی اٹھا، تیار ہوا اور جناح اسپتال پہنچا۔ وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ سنان کسی پرائیویٹ کلینک میں منتقل ہوگیا ہے۔ کچھ معلومات اسپتال کے دفتر سے حاصل ہوئیں کچھ پڑوس کے کمروں اور نرسوں سے۔ آخر اس جدید طرز کے مہنگے کلینک پہنچا جہاں سنان کو لے جایا گیا تھا۔ باہر ہی سے اس کے مہنگے ہونے کا اندازہ ہوا۔ کراچی کی سال کے ابتدائی مہینوں کی بہاریں طرح طرح کے پھول کھلے ہوئے تھے۔ عمارت شان دار تھی۔ شفاف برآمدوں میں سدا بہار گملے رکھے تھے۔ استقبالیہ میں یہاں سے وہاں تک ٹیلی فون تھے، جن کے پاس حسین لڑکیاں بیٹھی ہوئی فون کرنے والوں کے سوالات کے جوابات دے رہی تھیں اور آنے والوں کی رہبری کر رہی تھیں۔ اعجاز نے

کمرے کا نمبر معلوم کیا۔ وہاں پہنچ کر دھات کی چھوٹی سی تختی پر لکھا ہوا خوب صورت نمبر دیکھ ہی رہا تھا کہ دروازہ کھلا اور ایک نرس باہر نکلی۔ اعجاز نے زری کی جھلک دیکھ لی اور اندر چلا گیا۔ اعجاز کو دیکھتے ہی سنان کے سرہانے بیٹھی سفید چادر میں لپٹی کوئی عورت غسل خانے کے سامنے رکھے ہوئے اسکرین کے پیچھے جا کر چھپ گئی۔ اعجاز نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ اس نے ایک نظر میں دیکھا کہ کمرہ بڑا ہے۔ اس کے دو حصے ہیں جن میں ایک میں قالین پر صوفے پڑے ہوئے ہیں اور کونے میں میز پر ایک چھوٹا سا ٹیلی وژن بھی رکھا ہوا ہے۔ یہیں صوفے پر کوئی اور شخص بیٹھا ہوا تھا۔ جس کی پیٹھ دروازے کی طرف تھی۔ دوسرے حصے میں مریض کا پلنگ تھا۔ اس کے پاس ایک کرسی تھی۔ پلنگ کا زاویہ ایسا تھا کہ مریض چاہے تو لیٹے لیٹے دوسرے حصے میں رکھا ہوا ٹیلی وژن دیکھ سکتا تھا۔

ایک نظر ان سب چیزوں پر ڈالنے کے بعد اعجاز نے زری کی طرف دیکھا جو اسے دیکھ چکی تھی۔ زری نے کچھ پریشان سا ہو کر اس شخص کی طرف دیکھا جو صوفے پر بیٹھا تھا۔ اعجاز کا پہلا خیال شمس الرحمٰن کی طرف گیا۔ تو وہ صبح ہی صبح یہاں موجود ہے۔ اعجاز نے سوچا۔ اس وقت اعجاز کی موجودگی کا احساس اس شخص کو بھی ہوا۔ قدموں کی چاپ پر یا زری کی نگاہوں میں کچھ محسوس کر کے اس نے پلٹ کر دیکھا۔ اعجاز یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ احسن صاحب تھے۔

''آؤ آؤ'' انھوں نے گھبراہٹ میں کھڑے ہوتے ہوئے کہا۔

تینوں اپنی اپنی جگہ چور تھے۔ جیسے کسی غلط جگہ پکڑے گئے ہوں۔ سب سے پہلے اعجاز سنبھلا۔ اس نے سوچا کہ اس پر سنان کی عیادت کے لیے آنے پر کوئی اخلاقی پابندی نہیں ہوسکتی تو پھر وہ ہراساں کیوں ہو۔ اس وقت اس کے ذہن کی جو کیفیت تھی اس میں بے حد مضبوط ہو جانا یا لمحے بھر میں بالکل ٹوٹ جانا، دونوں باتیں ممکن تھیں۔

''میں سنان کو دیکھنے آیا تھا'' اس نے مضبوط لہجے میں جم کر کہا۔

''میں بھی —'' احسن صاحب نے جیسے صفائی پیش کی۔

''کیسی طبیعت ہے اب؟'' اس نے ہوا میں منھ کر کے پوچھا۔ اس کی مخاطب نہ زری تھی نہ احسن صاحب۔ یکایک سنان کی ناک پر لگے ہوئے آکسیجن کے تھیلے کو دیکھ کر وہ دم بخود رہ گیا۔ کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ جیسے سب ہی جانتے ہوں کہ یہ سوال پوچھنا کتنا بے معنی ہے۔

سنان کسمسایا اور اس نے آنکھیں کھول دیں۔ لمحے بھر میں جیسے دماغ کا کوئی بجھا ہوا بلب روشن ہو گیا۔ اعجاز کو یاد آیا کہ اس نے اس بچے کو کہاں دیکھا تھا۔ اسے یقین ہو گیا کہ اس نے اس بچے کو کہیں نہیں دیکھا تھا بلکہ اس بچے میں ایک ایسے شخص کی بے حد مشابہت ہے جسے وہ جانتا ہے اور اس وقت بھی

وہ یہاں موجود ہے۔ وہی آنکھیں، وہی ہونٹ، چہرے کی وہی ساخت، بالوں کا وہی رنگ۔ دونوں کے ترشے ہوئے سرخ لبوں پر پپڑیاں جمی ہوئی تھیں۔ دونوں کی آنکھوں میں حیرانی اور وحشت تھی۔

اور تب احسن صاحب کی یہاں موجودگی اعجاز کی سمجھ میں آ گئی، اور یہ بات بھی کہ ایکا ایکی سنان کو اس مہنگے کلینک میں کیوں منتقل کر دیا گیا — اور یہ بھی کہ زری اعجاز کو دیکھ کر کیوں جھجکی تھی۔ کیوں اس کی نظریں احسن صاحب کی طرف اٹھ گئی تھیں اور یہ بھی کہ 'قصرِ نیلم' میں کیوں زری کا نام لینا ممنوع تھا۔ لیکن نہیں اب بھی بہت سے سوال تھے — کب اور کیسے؟ یہ ازلی سوال جو وہ کسی سے نہ پوچھ سکتا تھا، اور جو برابر اس کے ذہن پر ہتھوڑے برسا رہے تھے۔

ہم تینوں کا اس وقت ایک کمرے میں رہنا ناممکن ہے۔ اعجاز کو خیال آیا۔ زری تو رہے گی — اور احسن صاحب بھی — اس کے آگے وہ نہ سوچ سکا۔ اور ''اچھا میں چلتا ہوں'' کہہ کر جلدی سے باہر نکل گیا۔

زری اس کے ساتھ باہر نکل اور صدر دروازے تک آئی۔

''میں تو سمجھا تھا سنان کا باپ مر چکا ہے۔'' اعجاز نے رخصت ہوتے وقت تلخی سے کہا۔

''ہاں — اور دیکھو، بعض اوقات مرے ہوئے باپ بھی کتنے کام آتے ہیں۔ جس بچے کو جیتے جی کوئی پوچھنے والا نہ تھا اس کے لیے اس بات کا کتنا انتظام ہے کہ وہ لگژری (luxury) میں مرے۔'' زری کا لہجہ بھی کم تلخ نہ تھا۔

''تو تمہیں اس کی پیش کش قبول نہ کرنی چاہیے تھی۔'' اعجاز نے کہا۔

''بعض اوقات آدمی مجبور ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی سوچا، کیا حرج ہے اگر بچہ آرام دہ بستر پر، صاف ستھرے ماحول اور پھولوں سے سجے ہوئے کمرے میں ٹی وی دیکھتا ہوا خوش خوش ختم ہو جائے۔'' زری نے اپنی آنکھوں میں آئے ہوئے آنسو پینے کی کوشش کی۔

''خدا حافظ۔'' اعجاز نے زری کی طرف بغیر دیکھے کہا۔

''لاہور جاؤ تو یہ نہ بتانا کہ احسن بھائی یہاں تھے۔'' زری نے کہا۔

''احسن بھائی!'' اعجاز کے دل اور ذہن نے اس شدت سے بغاوت کی کہ خود کو قابو میں رکھنا مشکل ہو گیا۔ وہ دروازے میں داخل ہونے والے ایک شخص سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔ تو زری اسے کلینک کے صدر دروازے تک چھوڑنے اور خدا حافظ کہنے نہیں صرف یہ جملہ کہنے آئی تھی۔

وہ تیز تیز قدم بڑھاتا نکلا چلا گیا۔ زری چند لمحے دروازے میں کھڑی رہی کہ شاید وہ پلٹ کر دیکھے۔ مگر اعجاز نے پلٹ کر نہ دیکھا جیسے پلٹ کر دیکھتے ہی وہ پتھر کا بن جائے گا یا شاید وہ پتھر کا بن چکا تھا۔ اس کا ذہن پتھر کی طرح بوجھل تھا۔ اس کے دل میں ایسا وزن محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ آہستہ آہستہ پتھر میں

تبدیل ہو رہا ہو۔ اسی پتھر ذہن کے ساتھ اس نے اسی وقت لاہور واپس جانے کا فیصلہ کیا اور ذہن کے گوشے میں زندہ رہ گئے کسی خلیے نے اسے یاد دلایا کہ اس کا سوٹ کیس ابھی تک زری کے گھر پڑا ہوا ہے۔

زری کے گھر سوٹ کیس لینے گیا تو اس نے برآمدے میں بیٹھی ہوئی شیزی کی جھلک دیکھی۔ اعجاز کو خیال آیا کہ یقیناً وہ اپنے ہوش و حواس میں نہیں ہے۔ یہ بلاشبہ اس کا فریبِ نظر ہے کہ زری کے گھر میں اسے شیزی دکھائی دی۔ اس نے یہ بھی سوچا کہ اسے اس بات کی تحقیق کرنی چاہیے کہ وہ شیزی ہے یا نہیں۔ اس سے کم از کم اسے اپنی ذہنی حالت کا اندازہ ہو جائے گا۔ وہ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا شیزی کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اعجاز کا زری کے ہاں آنا ان ہونی بات تو نہ تھی مگر وہ اس وقت اعجاز کو وہاں دیکھنے کے لیے بالکل تیار نہ تھی۔ نہ اسے یہ بات معلوم تھی کہ دو دن پہلے وہ یہاں اپنا سوٹ کیس ڈال کر گیا ہے۔

'آپ؟' بے اختیار شیزی کے منہ سے نکلا۔

''اور اسی انداز میں اگر آپ سے پوچھا جائے کہ 'آپ؟' اعجاز کے لہجے کی تلخی اور اس کے چہرے کی بے انتہا سنجیدگی سے شیزی گھبرا گئی۔ اعجاز نے کبھی اس سے اس طرح بات نہ کی تھی۔ تو کیا وہ ممی کے کیمپ میں ہے۔ اس نے دل میں سوچا۔

''بیٹھیے۔ زری آنٹی شاید ابھی آتی ہوں۔'' شیزی نے کہا۔

''جی نہیں، مجھے جلدی ہے۔ بڑی بی میری چیز لے کر آتی ہوں گی۔'' اعجاز نے کھڑے کھڑے کہا۔ وہ بالکل غیر فطری انداز میں شیزی کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ جیسے وہ شیزی کو نہیں، کسی بہت ہی غیر معمولی ہستی کو دیکھ رہا ہو جس کو وہ زندگی بھر یہاں دیکھنے کی توقع نہ کر سکتا تھا۔

جنت بی بی نے اعجاز کا سوٹ کیس لا کر اس کے ہاتھ میں دیا اور لوٹ گئی۔ اعجاز چند لمحے پھر بھی وہاں کھڑا رہا۔ شیزی کچھ دیر تک تذبذب میں رہی۔ آخر ہمت کر کے اس نے کہا، ''اعجاز صاحب، آپ ممی کو یہ نہ بتائیے گا کہ آپ نے مجھے زری آنٹی کے ہاں دیکھا ہے، انھیں رنج ہوگا۔ میں خود ہی انھیں ساری بات لکھوں گی۔''

''اچھا!'' اعجاز کا لہجہ اب بھی بدلا ہوا تھا۔ ''کیا یہ بھی نہ بتاؤں کہ احسن صاحب بھی زری کے ساتھ اس کلینک میں موجود ہیں جہاں زری کا بیمار بیٹا داخل ہے اور انھوں نے مجھے خود بتایا ہے کہ وہ سنان کو دیکھنے آئے ہیں۔''

''پاپا!'' شیزی کی آنکھیں حیرت سے کھل گئیں۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ پاپا کراچی آئے ہوئے ہیں۔''

''اور انھیں کب معلوم ہے کہ آپ اس وقت ڈیزی کے گھر نہیں زری کے ہاں ہیں۔'' اعجاز نے کہا۔

''اعجاز صاحب! آپ انھیں کچھ نہ بتایئے گا پلیز۔'' شیزی نے دردمندانہ اپیل کی۔

اعجاز نے ایک بار پھر اس کو بے یقینی سے دیکھا۔ سوٹ کیس کو اپنے ہاتھ میں تولا، اور ''خدا حافظ'' کہہ کر تیزی سے احاطے کے دروازے سے باہر نکل گیا۔

شیزی سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔ اعجاز نے ابھی کیا کہا تھا ـــ زری کا بچہ! تو کیا وہ لڑکا جو بیمار ہے، زری کا بیٹا ہے مگر جنت بی بی نے تو کہا تھا کہ اس کا کوئی رشتے دار ہے۔ جنت بی بی تو آج صبح سے ہی گھبرائی ہوئی پھر رہی تھی۔ وہ ویسے بھی بہت کم بولتی تھی مگر آج تو اس کے ہر سوال کے جواب میں گونگی بن گئی تھی۔ اس کا وہ سکون جو مُردنی کی حدوں کو چھوتا تھا، آج اضطراب میں بدلا ہوا تھا۔ چیزیں بار بار اس کے ہاتھ سے گر رہی تھیں۔ آنکھیں خلا میں جیسے کچھ ڈھونڈ رہی تھیں۔ نظریں کسی سے کچھ مانگ رہی تھیں، مگر کس سے؟ اس بات کا تعین کرنا شیزی کے بس میں نہیں تھا۔ آج کا دن بہت ہی عجیب اور غیر معمولی دن ہے، شیزی صرف یہ سمجھ سکی۔

سوچتے سوچتے اسے خیال آیا کہ اس کے پاپا یہاں موجود ہیں تو اسے ان کے ساتھ واپس لاہور چلا جانا چاہیے۔ مگر انھوں نے تو اس سے کوئی رابطہ قائم نہیں کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ کسی کو یہ بتانا نہیں چاہتے کہ وہ کراچی آئے ہوئے ہیں اور شاید وہ ممی کو یہ نہیں بتا سکتے کہ وہ زری آنٹی کے بیٹے کی عیادت کرنا چاہتے ہیں۔ اور زری آنٹی کا بیٹا کہاں سے آ گیا جب کہ کبھی اس نے ان کی شادی کی خبر نہیں سُنی۔ خدا جانے کیا گورکھ دھندا ہے! ایک مرتبہ تو اس کا جی چاہا کہ وہ اسی وقت کلینک جائے اور دیکھے کہ پاپا اس کا سامنا کس انداز میں کرتے ہیں۔ مگر اس کی ہمت نہ ہوئی اور وہ نڈھال سی کرسی پر پڑی رہی۔ کیا اعجاز ممی کو یہ بات بتا دے گا کہ وہ زری کے یہاں تھی؟ کیا وہ ممی سے یہ بات نہیں چھپا سکے گا کہ اس نے پاپا کو زری کے ساتھ دیکھا ہے؟ اُس نے اِس قسم کا کوئی وعدہ نہ کیا تھا۔ اس کے چہرے پر دھواں سا اُڑ رہا تھا۔ شاید اس کے دل میں رشک وحسد کی چنگاریاں چیخ رہی تھیں۔ شیزی کا دل ڈوب سا رہا تھا۔ اعجاز کو اس حال میں دیکھ کر اسے کیوں اتنا رنج ہو رہا تھا، وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی۔ کیا وہ لاہور جا کر ممی کے سامنے اس کی پول کھول دے گا؟ اس نے اضطرار میں کرسی پر پہلو بدلا۔ اسے زری ت یاد آئی۔ آج ہی انھوں نے کسی بات پر کہا تھا، ''دیکھو شیزی، جھوٹ وہ شخص بولتا ہے جو ڈرتا ہے۔ آپ سے، دنیا۔ یا کسی اور شخص سے ـــ جو اس خوف سے بلند ہو گا وہ جھوٹ کیوں بولے گا، مجھے بتاؤ۔''

تو زری خود کو اس خوف سے بلند سمجھتی ہیں۔ وہ ضرور آج ان سے ساری بات بنے گی، ہر قیمت پر ـــ اس نے دل ہی دل میں فیصلہ کیا۔

شام کو کلینک سے فون آیا کہ سنان کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔ زری دوپہر کو کلینک سے واپس آئی تھی۔ وہ بہت تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ شیزی کا دل چاہ رہا تھا اس سے بہت سی باتیں پوچھے، مگر وہ کھانا کھائے بغیر ہی اپنے کمرے میں چلی گئی تھی اور اب تک وہیں تھی۔ جنت بی بی زری کے آنے پر کلینک چلی گئی تھی۔ اس وقت گھر میں صرف زری اور شیزی تھیں اور یہ فون زری کے بجائے شیزی ہی نے سنا تھا۔ شیزی نے زری کے کمرے میں جا کر اسے پیغام سنایا۔ اس کی نگاہیں زری کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں۔ خبر سنتے ہی زری کا چہرہ زرد ہو گیا اور وہ فوراً کلینک جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ ڈرتے ڈرتے شیزی نے ساتھ چلنے کو کہا۔ زری نے کوئی اعتراض نہ کیا۔

جس وقت وہ سنان کے کمرے میں پہنچیں، ڈاکٹر کمرے میں موجود تھا۔ جنت بی بی ایک کونے میں مصلے پر بیٹھی اپنا سفید دوپٹہ ہاتھوں پر پھیلائے دُعا مانگنے میں مصروف تھی۔ اس کا سفید نچڑا ہوا چہرہ آنسوؤں سے تر تھا۔ ایک اور اجنبی عورت سنان کے سرھانے بیٹھی زار وقطار رو رہی تھی۔ زری نے پہنچتے ہی بچے کا ہاتھ تھاما اور ٹکٹکی باندھ کر اسے دیکھنے لگی۔ آنسو آہستہ آہستہ اس کے سنہری گالوں پر بہتے رہے۔

شیزی نے دیکھا کہ اس کے پاپا بھی کمرے میں موجود ہیں۔ وہ دبے پاؤں ان کے پاس گئی اور ان کا ہاتھ پکڑ کر کھڑی ہو گئی۔ دونوں خاموشی سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے ایک معصوم رُوح کو اس دُنیا سے رخصت ہوتے دیکھتے رہے۔ زری اس بچے کا ہاتھ اخیر دم تک تھامے رہی۔ جس وقت اس نے اپنی آخری دھندلائی ہوئی نگاہ سے دیکھا، زری نے جھک کر اس کی پیشانی چوم لی۔ اس

نے آخری سانس لیا۔۔۔ زری نے اپنے ہاتھوں سے اس کی لانبی پلکوں والے پپوٹے آنکھوں پر گرا دیے۔ پٹی پکڑے اجنبی عورت نے پچھاڑ کھائی۔ ڈاکٹر کے اشارے پر دو نرسیں اسے سنبھال کر باہر لے گئیں۔ جنت بی بی اسی طرح دوپٹہ پھیلائے دعا میں مصروف رہی۔ سنان کے مرجانے کے بعد وہ اس کی زندگی کے لیے دست بدعا تھی۔ شیزی کو یوں لگا جیسے کوئی پھول خاموشی سے شاخ سے ٹوٹ کر زمین پر بکھر گیا ہو۔ اس نے اپنا چہرہ اُٹھا کر پاپا کی طرف دیکھا۔ وہ بالکل ساکت تھے۔ شیزی نے اپنا سر اُن کے کاندھے سے لگا دیا۔ انھوں نے ہلکے سے اُس کا سر تھپکا اور اسے لے کر کمرے سے باہر آ گئے۔

سنان کو دفنانے تک آپس میں کوئی سوال جواب نہ ہوئے۔ بعد میں ایک خاموش کونے میں جہاں سوکھے پتوں کا ایک ڈھیر پڑا تھا، احسن صاحب نے سر جھکائے معذرت آمیز لہجے میں کہا، ''شیزی! ہم والدین بچوں کو جھوٹ بولنے سے منع کرتے ہیں مگر خود جھوٹ بولتے ہیں، اور باتیں بچوں سے چھپاتے ہیں۔ یہ ہماری کمزوری اور مجبوری ہے۔ میں نے تمھاری ممی کو نہیں بتایا ہے کہ میں کراچی آیا ہوا ہوں۔ اس کی وجہ میں بہت عرصہ پہلے تمھیں بتانا چاہتا تھا مگر تمھاری ممی راضی نہ ہوئیں۔ آج جب کہ سنان مر چکا ہے میں چاہوں گا کہ زری تمھیں یہ ساری بات بتا دیں۔ تم آج کل زری کے ساتھ رہ رہی ہو نا۔ زری نے مجھے بتایا تھا۔''

''جی پاپا۔'' شیزی نے شرمسار ہو کر سر جھکا لیا۔

''اس میں کوئی حرج نہیں ہے بیٹی۔۔۔ صرف تمھاری ممی بعض باتیں سمجھنا نہیں چاہتیں جس کی وجہ سے مشکلات پیدا ہو رہی ہیں۔ میرا خیال ہے تمھیں ساری بات معلوم ہونی چاہیے اور یہ بات بتانے کے لیے زری ہی سب سے زیادہ موزوں ہیں۔''

شیزی کچھ کہنا چاہتی تھی مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کہے۔

''میں زری کو خدا حافظ کہہ کر آتا ہوں، اس سے یہ بھی کہہ دوں گا کہ وہ ایک دن میں جب بھی وہ مناسب سمجھے تمھیں ساری بات بتا دے۔''

''احسن صاحب گھر کے اندر گئے، ذرا دیر بعد وہ اور زری ساتھ ساتھ باہر نکلے۔

''خدا حافظ بیٹے!'' شیزی کے پاس آ کر انھوں نے کہا۔

''خدا حافظ پاپا!'' شیزی کھڑی رہی۔ زری احسن صاحب کو گیٹ تک چھوڑنے گئی۔ اس وقت تک جنازے میں شریک ہونے والے اکثر لوگ جا چکے تھے۔ صرف نرگس، نور اور شمس الرحمٰن ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے۔ سنان اس گھر میں کبھی نہیں آیا تھا۔ صرف اس کا جنازہ یہاں سے اُٹھا تھا مگر گھر میں عجیب خوف ناک سناٹا تھا۔ شیزی دبے پاؤں چلتی اندر آئی اور خاموشی سے اپنے کمرے کی طرف

بڑھ گئی۔ وہ اتنی آہستگی سے چل رہی تھی جیسے ذرا سی آواز سے گھر کی بیش قیمت خاموشی چیخ جائے گی۔

کوئی ایک گھنٹے بعد شیزی باہر نکلی تو ڈرائنگ روم سے باتوں کی آواز آ رہی تھی۔ سنان کے سوگ میں کئی گھنٹے خاموش رہنے کے بعد اب زری اور شمس الرحمٰن باتوں میں مصروف تھے۔ شیزی وہاں پہنچی تو اس نے شمس الرحمٰن کو کہتے سنا، ''انسان خدا تک کیسے پہنچا، بتاؤ؟''

''پیغمبروں نے اس کی ذات کی گواہی دی۔'' زری نے کہا۔

''ٹھیک ہے، پیغمبروں نے خدا کی ذات کی گواہی دی لیکن ہر انسان کے اپنے اندر بھی تو شدید خواہش ہے کہ وہ نہ سہی کوئی تو ہو جو Absolute ہو، Relative نہ ہو۔۔۔ دُنیا کی ہر قدر، ہر رشتہ اضافی ہے۔ کوئی قدر، کوئی رشتہ، کوئی ہستی تو مطلق ہو۔ زمان و مکان سے آزاد ہو۔ اگر ایسی ہستی نہیں ہے تو ہونی چاہیے۔ انسان کی نفسیاتی ضرورت بھی یہی کہتی ہے، روحانی ضرورت بھی یہی کہتی ہے۔ سماجی مجبوریاں بھی یہی کہتی ہیں۔ اس کی جبلّی اور ذہنی حدود بھی یہی کہتی ہیں کہ کوئی ہو جس پر آدمی انحصار کر سکے، کوئی ہو جو انتہائی لاچاری میں دُعا سنے اور قبول کرے۔ کوئی ہو جس کو تقدیر بنانے والا کہہ سکیں۔ انسان مجبورِ محض ہو تو کسی مختارِ کل کے مقابلے میں ہو، جس نے ساری کائنات پیدا کی ہو۔ جو محرکِ اوّل ہو، جس کو بقا ہو، جو ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے، جو اٹل ہو، بے عیب ہو، بیک وقت ہر جگہ موجود ہو اور سب کچھ جانتا، دیکھتا اور سنتا ہو۔ یعنی وہ سب کچھ ہو جو انسان نہیں ہے نہ ہو سکتا ہے۔'' شمس الرحمٰن روانی سے انگریزی میں بول رہا تھا۔

شیزی دروازے میں ٹھٹکی کھڑی تھی۔ جب شمس الرحمٰن کی بات ختم ہوئی تو وہ اندر داخل ہوئی۔ یکایک خاموشی چھا گئی۔ جیسے ہوا چلتے چلتے اچانک تھم جائے۔

سنان کا سوئم گزر گیا تب ایک رات زری سفید گاؤن پہنے، سنہری بال بکھرائے اس کے کمرے میں داخل ہوئی اور اس کے پلنگ کے پاس کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ کچھ دیر دونوں خاموش رہیں پھر شیزی نے ہمت کر کے کہا، ''اب تو مجھے پاپا نے اجازت دے دی ہے کہ آپ سے سارا قصہ سن لوں۔ خدا کے لیے مجھے بتائیے کہ یہ سب کیا گورکھ دھندا ہے، میں بہت اُلجھ رہی ہوں۔''

''دیکھو شیزی!'' زری نے دھیرج سے کہا، ''ان میں سے کوئی بھی راز میرا راز نہیں ہے، نہ تمھارے والدین کا ہے۔ اگر میں تمھاری ممی کی جگہ ہوتی تو اب تک تمھیں سب کچھ بتا چکی ہوتی۔ اس عمر کے بچوں سے ایسی باتیں چھپانے سے فائدہ کم اور نقصان زیادہ ہوتا ہے۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ میرے دل میں طرح طرح کے وہم آ رہے ہیں۔ ان کے ہوتے ہوئے میں کبھی صاف دل سے ممی اور پاپا کا سامنا نہ کرسکوں گی۔'' شیزی نے کہا۔

''تم نے اس اجنبی عورت کو تو دیکھا تھا جو سنان کے سرھانے بیٹھی رو رہی تھی۔'' زری نے کہا، ''یہ سنان کی ماں ہے، لیکن چند گنتی کے لوگوں کے سوا یہ بات کوئی نہیں جانتا۔ اس کا نام گلگونہ ہے اور یہ جنت بی بی کی بیٹی ہے۔''

شیزی نے حیرت سے زری کی طرف دیکھا مگر منھ سے کچھ نہ کہا۔

''یہ بہت پرانی بات ہے۔'' زری نے کہنا شروع کیا، ''شاید یہ بات بھی تم لوگوں سے چھپائی گئی ہے کہ تمھاری دادی ایک نہایت اور یجنل قسم کی خاتون تھیں۔ وہ کہانی کار بھی تھیں۔ تمھارے دادا نے

کسی وجہ سے انھیں چھوڑ دیا تھا یا وہ خود الگ ہوگئی تھیں۔ ان کے مرنے کے بعد اور اپنے مرنے سے دو دن پہلے انھوں نے چاچا عمر سے شادی کر لی تھی۔ جس کا واحد مقصد اپنے بیٹوں کو تحفظ دینا تھا۔ بڑے بیٹے احسن یعنی تمھارے والد اس وقت جرمنی میں زیرِ تعلیم تھے۔ دوسرے بیٹے یعنی تمھارے چاچا عدنان نسبتاً چھوٹے تھے۔ جس وقت تمھاری دادی یعنی آنٹی زیب قادری کا انتقال ہوا، یہ دونوں ملک سے باہر تھے۔ پھر احسن بھائی تو جرمنی میں ہی تعلیم حاصل کرتے رہے لیکن عدنان کو چاچا جی نے بلوا لیا، اور اپنے زیرِ سایہ ملٹری اکیڈمی کاکول میں داخلہ دلوا دیا۔ چاچا جی اس کا بہت خیال رکھتے تھے اور واقعی اپنے بیٹے کی طرح چاہتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ٹریننگ ختم کر کے افسر بن جائے تو میرے ساتھ اس کی شادی کر دیں کہ اتفاق سے میں بھی چاچا جی کی بڑی چہیتی اور لاڈلی تھی۔

عدنان یہی ظاہر کرتا رہا کہ وہ مجھ میں دلچسپی لے رہا ہے، لیکن اس عرصے میں وہ ہم تین لڑکیوں کو بے وقوف بناتا رہا۔ ایک میں، دوسری تمھاری خالہ چمن، جو میری کزن تھیں اور تیسری ہماری خدمت گار گلگونہ۔ ہم دو لڑکیوں کے ساتھ اس کا رومان زبانی تھا لیکن گلگونہ کے ساتھ عملی —— نتیجہ ظاہر ہے۔

جب یہ حقیقت کھلی کہ گلگونہ اُمید سے ہے تو چاچا جی بڑے ناراض ہوئے۔ اس عرصے میں احسن بھائی کی شادی ثروت باجی سے ہو چکی تھی۔ چاچا جی نے سارا قصہ احسن بھائی کو لکھا اور عدنان کو گلگونہ سے شادی کرنے پر مجبور کرنے لگے مگر وہ نہ مانا اور یہاں سے دوبارہ جرمنی بھاگ گیا۔ چاچا جی نے گلگونہ کے سلسلے میں احسن بھائی اور باجی ثروت کی مدد چاہی تو انھوں نے کانوں پر ہاتھ رکھا، کہ انھیں عدنان کی ناجائز اولاد سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ آخر چاچا جی نے ایک بڑی عمر کی عورت کے ساتھ گلگونہ کو مانسہرہ بھجوا دیا تاکہ وہ اس کی دیکھ بھال کرتی رہے۔ وہ خود بھی وہاں آتے جاتے رہتے تھے۔ کبھی کبھی مجھے بھی اپنے ساتھ لے جاتے تھے تاکہ گلگونہ کو تسلی رہے۔ وہ کہنے کو میری خدمت گار تھی مگر دراصل میری سہیلی تھی۔

گلگونہ کے بیٹا ہوا جس کا نام چاچا جی نے سنان رکھا اور ایک کھلائی رکھ کر جیسے تیسے اسے پالا۔ احسن بھائی اور ثروت باجی نے چاچا جی سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ وہ چاہتے تھے کہ چاچا جی عدنان کے بیٹے سے کوئی علاقہ نہ رکھیں۔ شاید عدنان کے ملک سے چلے جانے کے بعد وہ زیب آنٹی کی اور چاچا جی کی ساری جائداد ملنے کے خواب دیکھ رہے ہوں —— میں کچھ نہیں کہہ سکتی مگر چاچا جی اسے مسئلے پر کسی سے بات کرنے کو تیار نہ تھے۔

اب رہی یہ بات کہ تمھاری ممی میری شکل کیوں دیکھنا نہیں چاہتیں؟ تو سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے جو باتیں تم لوگوں سے چھپائی ہیں، مجھ سے یا چاچا جی سے ملنے کے بعد وہ راز نہیں رہ سکتی تھیں۔ گو جہاں تک تمھارے کنبے کا تعلق ہے، کوئی بات بھی اتنی بھیانک نہیں ہے کہ بچوں کے

سامنے اسے ہوا بنایا جائے۔ یہ بات چھپانے سے عدنان کی جگہ احسن بھائی کے ملوث ہونے کا شبہ ہوتا ہے، جو اعجاز کو ہوا اور جس کی تردید میں نے نہیں کی کیوں کہ اس سلسلے میں کسی بھی شک وشبے کی تردید یا تائید میں نہیں کرتی۔ ایک وقت ایسا بھی آیا تھا جب یہ بات پھیلائی گئی تھی کہ بچہ گلگونہ کا نہیں، زری کا ہے۔ گلگونہ کو صرف استعمال کیا گیا ہے۔ ایسی افواہوں کی تردید کرنے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا، کیوں کہ جو جانتے ہیں وہ جانتے ہیں اور جو نہیں جانتے ان کو یقین دلانا بے کار ہوتا ہے۔ چناں چہ میں خاموش رہی۔ یہ ایک نازک مسئلہ تھا۔ گلگونہ کی شادی ہوچکی تھی۔ جنت بی بی ہرگز اس بات پر آمادہ نہ ہوتی تھی کہ کسی کو اصل بات کا علم ہو۔ اس لیے ہم اس معاملے کو ہوا دینے کی بجائے دبا دینے کے قائل تھے۔ ہوسکتا ہے کچھ لوگوں کا مجرم ضمیر بھی ہم سے ملنے سے روکتا ہو۔ دیکھو بُرا نہ ماننا — اب سننے بیٹھی ہو تو بہتر ہے کہ سب کچھ سُن لو۔ ایک بات یہ بھی ہے کہ احسن بھائی کو شروع سے اپنے بھتیجے سے ہمدردی تھی۔ مگر اس معاملے میں ثروت باجی کے سامنے ان کی دال کبھی نہ گلی۔ احسن بھائی میرا احسان مانتے ہیں کہ میں نے اپنی بدنامی کے خیال کو نظرانداز کر کے ہمیشہ سنان کی مدد کی۔ تمھاری ممی کو یہ بات بے حد ناگوار ہوئی ہے مگر مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ میں نے جو کچھ کیا، چاچاجی اور آنٹی قادری کے خیال سے کیا۔ تمھیں اندازہ نہیں کہ مجھے آنٹی سے کتنی محبت تھی اور چاچاجی سے کتنی محبت ہے۔ نیلی اور تم مجھے اس لیے عزیز ہو کہ تم ان دونوں کی پوتیاں ہو، تم دونوں میں زیب آنٹی کی — میں انھیں زیب آنٹی ہی کہتی تھی، بہت مشابہت ہے۔''

ثیزی یہ سب اس طرح سن رہی تھی جیسے ٹرانس (trance) میں ہو۔ وہ زری کی گفتگو کے دوران نہ بولی، نہ ہلی جلی۔ زری نے بات ختم کر کے اس کی طرف دیکھا۔ پھر اپنی مخصوص شگفتہ ہنسی طاری کی اور کہا، ''ہاں ایک بات اور — میں کبھی کبھی چھیڑ خانی کے طور پر اپنے جاننے والوں کو لاہور جاتے وقت احسن بھائی کا پتا دے دیتی ہوں اور ان سے احسن بھائی کا مہمان بننے پر اصرار کرتی ہوں، صرف اس لیے کہ مجھے معلوم ہے اس معاملے میں ثروت باجی احسن بھائی سے نہیں جیت سکتیں۔ یہ ہماری خاندانی روایت بھی ہے اور خاندانی کمزوری بھی۔ وہ اس لیے بھی خاموش ہوجاتی ہیں کہ بچپن میں یہ سب بہنیں کئی کئی ماہ آن کر ہمارے ہاں مہمان رہتی تھیں اور ان کی بہن، تمھاری چمن خالہ، جن کا ذکر میں نے عدنان کے سلسلے میں کیا تھا، کئی سال میری ساتھی اور دوست کی حیثیت سے ہمارے گھر رہی تھیں۔ اسے تم میری خباثت کہہ لو یا شرارت۔ اچھا اب تم سوؤ... میں چلی۔''

''زری آنٹی! میں ممی کو فون کرنا چاہتی ہوں۔ صرف یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں آپ کے گھر ہوں اور خیریت سے ہوں۔''

''ہاں ہاں تو کرو۔ کیا اس میں میری اجازت کی ضرورت ہے۔'' زری نے اپنا سفید گاؤن ٹخنوں سے ذرا اُونچا کیا اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

گو رات خاصی جا چکی تھی لیکن شیزی نے اسی وقت اُٹھ کر لاہور فون کیا اور ممی کو کم از کم الفاظ میں زری کے گھر آنے کی وجہ سمجھانے کی کوشش کی، مگر وہ کچھ بھی نہ سمجھیں۔ شیزی کو احساس ہوا کہ انھیں اس بات سے اس کے اندازے سے زیادہ صدمہ ہوا ہے۔ ان کا مطالبہ تھا کہ وہ صبح سویرے ہی ڈیڈی کے گھر واپس جائے اور پھر جلد از جلد لاہور پہنچنے کی کوشش کرے، جواد اس کا انتظار کر رہا ہے۔ اس کی ممی نے یہ بھی بتایا کہ اس کے پاپا کسی ضروری کام سے ملتان گئے ہوئے ہیں۔

''بے چاری ممی!'' اسے اپنی ماں پر واقعی ترس آیا۔ انسانی رشتے اتنے پیچیدہ ہو سکتے ہیں، یہ تو اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔

دوسرے دن ایک اور اچنبھا شیزی کا منتظر تھا۔ یہ جواد تھا جو اس کی ممی کا فوری بلاوا اور ہوائی ٹکٹ لے کر کراچی زری کے گھر پہنچ چکا تھا۔ آج بلکہ تھوڑی دیر بعد ہی انھیں لاہور کے لیے روانہ ہونا تھا۔ شیزی کو خود تعجب ہوا کہ وہ جواد کو دیکھ کر اتنا نہ گھبرائی جتنا کہ عام حالات میں گھبراتی۔ شاید یہ اتنے دن زری آنٹی کے گھر رہنے کا اثر ہے، اس نے سوچا۔ ان کا وجود ہی انسان کو خود اعتمادی سکھاتا ہے۔ زری نے بیگم احسن کی اس قدر عجلت کی وجہ سمجھ لی تھی لیکن ان جان بن کر بڑی خندہ پیشانی سے اس نے جواد سے کہا، ''عموماً مہمان کا آنا اپنی مرضی سے اور جانا میزبان کی رضا سے ہوتا ہے لیکن یہاں شیزی کا آنا میری مرضی سے اور جانا تمھارے 'حکم' سے ہو رہا ہے۔'' 'حکم' کا لفظ اس نے جان بوجھ کر استعمال کیا تاکہ وہ اس پر احتجاج کرے، لیکن جواد مسکراتا رہا جیسے وہ اس لفظ سے خوش ہوا ہو۔ ''تم آج نہ جاتیں تو ایک خبر سنتیں، مگر خیر—'' زری نے شیزی سے کہا، ''وہ تمھیں لاہور میں بھی مل جائے گی۔'' زری نے شیزی کو گرمجوشی سے گلے لگایا اور دروازے تک چھوڑنے آئی۔

ٹیکسی میں شیزی نے ممی، پاپا اور نیلی کی خیریت دریافت کی اور یہ معلوم کرنے کی کوشش کی کہ اعجاز نے کراچی سے جا کر کیا کہا۔

''کیا اعجاز صاحب لاہور پہنچ گئے؟'' اُس نے پوچھا۔

''پروفیسر اعجاز!— تمھاری ممی نے یہی کہہ کر مجھ سے تعارف کروایا تھا۔ ان حضرت کا۔'' جواد ہنسا۔ ''حالاں کہ وہ بے چارہ محض جونیئر لیکچرر ہے۔''

''اچھا— پھر؟'' شیزی نے بات آگے بڑھائی۔

''پھر کیا!'' میں نے ان کو غور سے دیکھا اور کہا، ''آپ پروفیسر تو کسی طرف سے نظر نہیں آتے۔ اس پر انھوں نے فرمایا کہ میں ابھی جونیئر لیکچرر ہوں اور یہ کام بھی مستقبل قریب میں شروع کرنے والا ہوں۔ ممکن ہے پروفیسری تک پہنچتے پہنچتے وہی صورت ہوجائے جو آپ کے ذہن میں ہے۔ پھر انھوں نے وہ مصرع پڑھا— کیا گزرے ہے قطرے پہ گہر ہونے تک وغیرہ وغیرہ۔ میں نے کہا کہ آپ کے شعر پڑھنے کے انداز میں ابھی سے پروفیسری کی جھلک ہے، تب نیلی نے انکشاف کیا کہ انگریزی کے لیکچرر ہیں اور بہت اچھی انگریزی پڑھاتے ہیں۔ وہ ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ رہی تھی کہ اس نے ان سے انگریزی نظمیں پڑھی تھیں۔'' جواد اپنے لہجے کے طنز کے ساتھ کہتا رہا، ''اور جو بات میری سمجھ میں نہیں آئی وہ یہ ہے کہ ایک بالکل غیر، اَن جانے معمولی سے لڑکے کو تمھارے گھر میں اتنی لفٹ کیسے مل رہی ہے۔''

''اچھا، یہ بتاؤ تم اس دفعہ لاہور میں ٹھہرے کہاں ہو؟'' شیزی نے فوراً بات بدل دی۔

''میں جناب اس مرتبہ تمھارے گھر میں ٹھہرا ہوں۔ تمھارے نہ ہونے سے یہ فائدہ ہوا کہ اس خاکسار کو 'قصرِ نیلم' کے مہمان خانے میں ٹھہرایا گیا۔'' جواد نے کہا۔

''اور اعجاز؟'' شیزی کے منھ سے نکلا۔

''مجھے کیا معلوم کہ وہ کون سے بھٹ میں رہتے ہیں۔'' اعجاز اپنے مذاق سے خود ہی محظوظ ہوا۔ ''میرا خیال ہے کہ تمھارے گھر سے ان کا گھر زیادہ دُور نہیں ہے۔''

جل ککڑا— شیزی نے دل میں سوچا۔ اسی وقت شیزی نے دیکھا کہ ٹیکسی اسٹار گیٹ سے سیدھی ایئرپورٹ پر جانے کی بجائے۔ ہوٹل مڈوے ہاؤس کی طرف مڑ رہی ہے۔

''یہ کیا؟''

''ابھی مجھے اپنا سامان لینا ہے۔'' جواد نے کہا، ''یہاں رکھوا دیا تھا۔''

''آج ہی آئے ہو، ابھی واپس جانا ہے۔ اتنا کیا سامان ہوگا۔'' شیزی حیران ہوئی۔

''ابھی لیے لیتے ہیں، وقت ہے ابھی۔'' جواد نے اطمینان سے کہا۔

''وقت ہے تو ذرا ڈیزی کے گھر چلیں، میں نے اس کے لیے ایک تحفہ خریدا تھا۔'' شیزی نے کہا۔

''جی نہیں، اتنا وقت نہیں ہے۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آپ کو میرے سوا ہر ایک سے ملنے کا ارمان ہے۔''

شیزی خاموش ہوگئی۔ ٹیکسی ہوٹل مڈوے کے کشادہ گیٹ سے گزر کر فواروں کے پاس ایک طرف رُک گئی۔ جواد نے ایک بیرے کو اشارہ کر کے بلایا۔ ''میرا کمرہ جانتے ہو ٹھیک سوا کتالیس، وہاں پہنچا دو۔''

''ارے اتنی سی دیر کے لیے ریسپشن پر رکھوا دو نا، اور اپنا سامان منگوا لو۔'' شیزی نے کہا۔
جواد نے اسے نظر بھر کر دیکھا لیکن شیزی نے نگاہیں چرالیں۔
''کمرے میں چل کر کافی منگواتے ہیں۔'' جواد نے کہا۔
''ڈائننگ روم میں پییں گے۔ میں جا کر آرڈر دیتی ہوں، تم وہیں آجانا۔'' شیزی آگے بڑھ گئی۔
''تم ابھی تک اتنی ہی ضدّی ہو۔'' جواد نے جھنجھلا کر کہا۔
''کچھ زیادہ۔'' شیزی نے اطمینان سے کہا اور بائیں ہاتھ کو چلی۔ پینٹری کے آگے نرسری تھی جہاں غیر ملکی بچے کھیل رہے تھے۔ آگے دو دُکانیں تھیں جہاں پاکستانی مصنوعات سجی ہوئی تھیں۔ اس نے ایک گزرتے ہوئے بیرے سے ڈائننگ ہال کا راستہ پوچھا۔ بیرے نے بتایا کہ وہ استقبالیہ سے آگے اُوپر کی منزل میں ہے۔ شیزی دوبارہ استقبالیہ کے سامنے سے گزری تو جواد وہاں نہیں تھا۔ وہ ایسی جگہ رہنا چاہتی تھی جہاں چند لوگ موجود ہوں مگر ڈائننگ ہال میں جانا نہیں چاہتی تھی۔ ہوسکتا ہے وہاں پہنچ کر جواد پھر کمرے میں چلنے پر اصرار کرے۔ چوڑی بل کھاتی سیڑھیوں کے برابر میں سوئمنگ پول لکھا دیکھ کر وہ اُس طرف مڑ گئی۔ پتلے چھت والے کوریڈور سے گزر کر وہ ایک چاروں طرف سے بند جگہ پہنچی جہاں پہلے لان تھا اور اس کے آگے سوئمنگ پول۔ لان میں آرام کرسیوں پر کئی غیر ملکی جوڑے دھوپ میں دراز تھے۔ گہرے فیروزی رنگ کے دو پارچے میں ملبوس بھاری بھرکم ایک عورت نے پاس لیٹی عورت سے کچھ کہا۔ نیوی بلو تیراکی کے لباس میں ملبوس ایک دُبلی پتلی لڑکی نے آنکھیں کھول کر اور سر اُٹھا کر شیزی کی طرف دیکھا۔ پاس لیٹے مردوں نے بھی اسی طرح دیکھا۔ ان کی نگاہوں میں کچھ ناگواری سی تھی جیسے انھیں یقین ہو کہ وہ صرف ان کا تماشا دیکھنے آئی ہے، جیسے ہوٹل کے بیرے اور باورچی بہانے بہانے سے چکّر لگاتے رہتے ہیں۔ ان کی نظروں میں شک دیکھ کر وہ خفیف سی ہو کر واپس ہوئی اور ڈائننگ ہال کی سیڑھیاں چڑھ گئی۔ سامنے لاؤنج میں بہت سے لوگ صوفوں پر بیٹھے اونچی کھڑکیوں سے باہر پھولوں کا نظارہ کر رہے تھے۔ کچھ اوپر ڈائننگ ہال میں کھانے پینے میں مصروف تھے۔ جواد ابھی تک نہ پہنچا تھا۔ اسے کچھ خیال آیا، وہ دوبارہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آئی اور کاؤنٹر پر آج کی لاہور فلائٹ کے بارے میں پوچھا۔ معلوم ہوا کہ صبح کی پرواز تو کب کی جا چکی ہے۔ اب شام کو ایک فلائٹ ہے۔ شیزی نے پی آئی اے کے دفتر فون کیا تو معلوم ہوا کہ شام ہی کے جہاز میں ان دونوں کی بکنگ ہے۔ شیزی نے فوراً اپنے سوٹ کیس کا مطالبہ کیا۔ استقبالیہ کے کاؤنٹر پر کوئی سوٹ کیس نہیں تھا۔ سامان جواد اپنے ساتھ کمرے میں لے گیا تھا۔
شیزی کا دل چاہا ہوٹل والوں سے سختی سے سوٹ کیس طلب کرے۔ خوب ہنگامہ مچائے۔ اس کا

موڈ دیکھ کر وہ یقیناً سوٹ کیس منگوا دیں گے۔ لیکن ایسی کوئی بات زبان سے نکالنا خواہ مخواہ کے اسکنڈل کو جنم دینا تھا۔ اس نے اپنا پرس ٹٹولا۔ ڈائری کا پرچہ پھاڑ کر اس پر جلدی جلدی گھسیٹا۔ ''جواد! میں تمھارے ساتھ نہیں جا رہی ہوں۔ میرا سوٹ کیس یہیں چھوڑتے جانا، اس ہدایت کے ساتھ کہ جب میں مانگنے آؤں تو مجھے دے دیا جائے، شکریہ۔''

خط کاؤنٹر پر دینے کے بعد شیزی تقریباً بھاگتی ہوئی باہر کی طرف لپکی۔ وہ تیزی سے گملوں اور پودوں کی آڑ میں ہوتی ہوئی باہر نکلی اور صدر دروازے سے ذرا ہٹ کر کھڑی ہوگئی۔ ایئرپورٹ کی خاص سڑک پر ٹیکسی ملنا مشکل نہ تھا، فوراً ہی ٹیکسی مل گئی۔ شیزی نے ایئرپورٹ جا کر دوسرے دن کا ایئر ٹکٹ خریدا اور ڈیزی کے گھر کے لیے روانہ ہوگئی۔ آج ٹیکسی میں تنہا سفر کرنے اور ڈیزی کا گھر ملنے نہ ملنے کی اسے کوئی پریشانی نہ تھی۔

سڑک کے متوازی ریل کی پٹری پر ایک مسافر گاڑی دوڑی جا رہی تھی۔ کبھی ٹیکسی آگے نکل جاتی کبھی ریل گاڑی۔ شیزی کو یوں لگا جیسے اسی طرح وہ اپنی تقدیر کے ساتھ ساتھ بھاگ رہی ہے۔ خدا ہی جانے وہ دونوں کب تک متوازی بھاگتے رہیں گے۔ وہ تقدیر سے بچھڑ جائے گی، یا کسی ریلوے کراسنگ پر دونوں آپس میں ٹکرا کر پاش پاش ہو جائیں گے۔

ڈیزی کے گھر پہنچتے ہی اس نے کہا، ''ڈیزی! میں ایک بدمعاش کے چنگل سے نکل کر آ رہی ہوں، دیکھ ہاتھ کتنے ٹھنڈے ہو رہے ہیں۔'' شیزی نے ڈیزی کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیا۔

''کون تھا وہ بدمعاش؟'' ڈیزی نے فکرمند ہو کر پوچھا۔

''جواد۔''

''بائی گاڈ!— قسم سے بتاؤ۔'' ڈیزی قہقہہ لگا کر ہنس پڑی۔

''سچ کہہ رہی ہوں، وہ میرے پیچھے یہاں تک آ پہنچا ہے۔ شکر ہے کہ اُسے تمھارے گھر کا پتا معلوم نہیں ہے ورنہ وہ یہاں بھی پہنچ جاتا۔'' شیزی نے کہا۔

''مگر یہاں اس کی دال نہیں گلتی۔ دیکھا نہیں تم نے اس گلی کے بچے کتوں تک کی دم میں ٹین باندھ کر چھوڑ دیتے ہیں۔ یہاں کسی کی زبردستی نہیں چلتی، ہاں اپنی مرضی سے جو جس کا جی چاہے کرے، مگر ہوا کیا، پوری بات تو بتاؤ۔''

شیزی نے اسے پوری بات بتائی اور وہ ایک دم تیغ پا ہوگئی۔

''محبت ہو یا سیکس، ہر چیز کے کچھ آداب ہوتے ہیں۔ کچھ رکھ رکھاؤ ہوتا ہے۔'' حسب عادت وہ تیز اور رواں انگریزی میں بات کر رہی تھی۔ ہمارے ہاں کے مردوں کو کچھ — ہی میں مزا آتا ہے۔''

''بھئی چپ رہو، کیسے الفاظ تم استعمال کرتی ہو، کوئی سن لے گا۔'' شیزی بوکھلائی۔

''میں تو صرف لفظ استعمال کررہی ہوں اور وہ تمھیں باقاعدہ استعمال کررہا ہے۔ غنڈہ کہیں کا۔ تم ابھی تک اتنی ہی ڈرپوک ہو، میرا خیال تھا تم کچھ سُدھر گئی ہوگی۔''

''بھاگ تو آئی ہوں اور کیا کرتی!'' شیزی نے کہا۔

''اچھا آؤ۔۔۔ اندر چل کر بیٹھو۔'' ڈیزی بولی، ''اپنے کمرے میں چل کر اطمینان سے بیٹھیں۔''

کمرے میں پہنچ کر ڈیزی نے کہا، ''تم جواد کے ساتھ لاہور نہیں پہنچو گی تو تمھاری ممی کی حالت خراب ہوگی۔''

''آج ہی میں کہیں نہ کہیں سے ممی کو فون کرکے بتادوں گی کہ میں جواد کے ساتھ نہیں آرہی بلکہ کل پہنچوں گی۔ اگر وہ ذرا سا بھی غور کریں گی تو کچھ نہ کچھ سمجھ جائیں گی۔''

''اور جواد وہاں جاکر کیا کہے گا؟'' ڈیزی نے کہا۔

''میری بلا سے جو چاہے کہے۔ اب مجھے اس کی پروا نہیں ہے۔'' شیزی نے کہا۔

''گڈ۔ تم میں واقعی فرق آگیا ہے۔ یہ بات واقعی سوچنے کی ہے کہ جو شخص عورت کی، خود اپنی بیوی کی عزت نہ کرسکے، اس کے ساتھ مستقل دھوکا کرتا رہے، کیا تم اس کے ساتھ رہ سکو گی۔ ابھی تم برابر اس سے چھپتی پھر رہی ہو۔''

''ہاں یہ بات سنجیدگی سے سوچنے کی ہے۔ مجھے زری آنٹی سے رائے لینی چاہیے تھی مگر میں ان کے گھر اس لیے نہیں گئی کہ وہ کہیں دوبارہ وہاں نہ پہنچ جائے۔''

''زری آنٹی سے نہیں، اپنے دل سے رائے لو، اپنے دماغ سے مشورہ کرو، فیصلہ کرو اور اس پر ڈٹ جاؤ۔'' ڈیزی نے کہا۔

''میں سوچتی ہوں جب تک بات ٹل سکتی ہے ٹالے رکھوں۔ دیکھنا یہی ہے کہ جواد وہاں جاکر کیا کہتا ہے۔''

''دیکھ لو۔ یہ نہ ہو کہ پانی سر سے گزر جائے۔ اور ہاں سنو کہ پرسوں اتوار کو میری بے چاری بھاوج کی بھی شادی ہورہی ہے۔''

''کس سے؟'' شیزی نے بے خیالی میں پوچھا۔

''بے وقوف، میرے بھائی سے اور کس سے، مگر تم تو کل جارہی ہو، اس میں شریک نہ ہوسکو گی، ویسے بھی ہم ہمارے شرم کے باہر کے کسی آدمی کو شریک نہیں کررہے۔'' وہ طنز سے ہنسی مگر شیزی نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنے ہی خیالوں میں گم تھی۔

چاچا جی! بسنان بے چارہ ختم ہو گیا۔ دفنا دیا گیا، ہماری زندگیوں سے ہمیشہ کے لیے معدوم ہو گیا۔ مجھے آپ سے ہم دردی ہے، آپ کے لیے وہ زیب آنٹی کی نشانی، ان کی نسل کا نمائندہ تھا۔ مگر اب کیا کیا جائے۔ ہر شخص کی زندگی اور موت، کیوں؟ کیوں؟ — اور کیوں؟ — جیسے سوالات چھوڑ جاتی ہے جن کا ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ہے۔ خوش حال خان کی موت بھی تو ہمارے لیے بہت سے سوالات چھوڑ گئی ہے۔

چاچا جی! زندگی کا منظر میری نظر میں کچھ یوں بنتا ہے جیسے ریگستان کی ریت میں ہم لوگ سونے کے ذرات نکالنے پر مامور ہوں۔ یہ ذرے کس لیے ریت میں ملائے گئے ہیں، ملانے والا کیا چاہتا ہے، کتنے دن میں یہ سارے ذرات نکالے جاسکیں گے، اس کے بارے میں سب لاعلم ہیں۔ مگر تلاش جاری ہے۔ ریت لا انتہا ہے، دھوپ میں جل اُٹھتی ہے، چاندنی میں ٹھنڈی پڑ جاتی ہے (مگر تلاش جاری ہے)۔ کچھ لوگ اس تلاش میں نفع دیکھ رہے ہیں اور آئندہ نسلوں کے لیے اس خزانے کو جمع کر رہے ہیں۔ کچھ اس تلاش کو محض تلاش کی خاطر جاری رکھے ہوئے ہیں اور چند اس کی نئی نئی تاویلیں کرنے میں مصروف ہیں مگر تلاش جاری ہے۔ ریت میں سے سونے کے ذرات — ابھی اتنی صدیوں میں تو مٹھی بھر بھی نہیں نکلے — کیسے نکلیں گے! کب تک نکالے جائیں گے! کچھ پتا نہیں۔ محض تلاش ہمارا کام ہے، جیسے آثارِ قدیمہ کے روز کے روز پیسے پانے والے مزدور، جنھیں کچھ معلوم نہیں ہوتا کہ وہ کیا کھوج رہے ہیں اور کیوں کھوج رہے ہیں!

آپ کی زری

اُس دن اعجاز کو دو خط ملے تھے۔ ایک زری کا، دوسرا ناصر خان کا۔ ناصر کا خط اس کے خط کے جواب میں ''قصرِ نیلم'' سے پتا تبدیل ہو کر آیا تھا۔ اعجاز کا دل کہتا رہا، پہلے زری کا خط کھولو لیکن کسی بھولے بچے کی طرح اعجاز نے کہا نہ مان کر پہلے ناصر خان کا خط کھولا — اُس نے لکھا تھا:

ڈیئر اعجاز — سلامت رہو۔

تم نے ٹھیک لکھا تھا اس واقعے کے بعد، دوسرے دن سے یہ ساری داستان یوں معلوم ہوتی تھی جیسے کوئی خواب دیکھا ہو۔ تمھارے خط کا جواب بھی اسی لیے نہ دے سکا کہ میں خود ایسی ذہنی کیفیت میں تھا جس میں سب کچھ خواب لگ رہا تھا۔ مجھے تو یہ شک ہو چلا تھا کہ میں کراچی میں تمھارے ساتھ رہا بھی تھا۔ کبھی یہ شبہ ہوتا تھا کہ کراچی کوئی جگہ ہے بھی — کسی دوسری دنیا، کسی اور جنم کے کسی مقام کا نام تو نہیں ہے۔ اعجاز نامی میرا کوئی دوست تھا بھی یا نہیں۔ کیا میں نے اپنی امی کو واقعی اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا!!!

جو کچھ بیتی وہ تمھیں زبانی سنانا چاہتا ہوں، چناں چہ تمھارے پاس پہنچ رہا ہوں۔ ابھی صرف یہ بتاؤں گا کہ میں فوج کی میڈیکل کور سے وابستہ ہو رہا ہوں۔ چند ماہ کی ٹریننگ کے بعد براہِ راست کپتان بنا دیا جاؤں گا۔ ٹریننگ پر جانے سے پہلے تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ تم ۸ر تاریخ کے خیبر میل پر مجھے لینے پہنچو۔

تمھارا ناصر

اب اعجاز نے زری کا خط کھولا۔ چھوٹا سا خط اور زری کی ایک تصویر نیلی کے لیے تھی۔ اعجاز کو اس نے لکھا تھا:

ڈیئر اعجاز!

نور اور نرگس کے ساتھ ہی، اگلے اتوار کو میری اور شمس الرحمٰن کی شادی ہے۔ ہم دونوں کی دلی تمنا ہے کہ تم اس میں شریک ہو کر ہماری خوشیوں میں اضافہ کرو۔

تم اس خبر پر حیران ہو گے، مگر دیکھو پریشان نہ ہونا۔ میں یہ ذمہ داری خود قبول کر رہی ہوں، اور سارے نتیجے بھگتنے کو تیار ہوں۔ جب آدمی کسی کام کی ذمہ داری ہر اچھائی اور بُرائی، کامیابی اور ناکامی کے پورے احساس کے ساتھ قبول کرتا ہے تو اس کی زندگی میں پچھتاوے کم آتے ہیں۔ جب لڑائی کا ذکر بہت سننے میں آتا ہے تو سپاہی کے لیے جنگ کا انتظار، جینے اور مرنے کا سسپنس بہت جان لیوا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح ہم دونوں کا ساتھ بہت جان لیوا ہوتا جا رہا تھا۔ ہم نے سوچا ایک مرتبہ سر پر

کفن باندھ کر کود پڑیں، پھر دیکھا جائے گا— یا تو آگ گلزار بن جائے گی ورنہ جلنا تو ہے ہی۔ آخر ملک کی یک جہتی کے دعوے دار ہیں۔ سب سے کہتے ہیں، دونوں صوبوں میں زیادہ سے زیادہ شادیاں ہونی چاہییں۔ لوگ کہتے ہیں کر کے دکھاؤ۔ ہم نے کہا یہ بھی دکھا دیں گے۔ فیض کے اشعار یاد ہیں:

شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے؟
دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے؟
پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

بات طویل ہو گئی۔ کہنا یہ تھا کہ تم آن کر مل جاؤ۔ شادی میں شریک ہو جاؤ۔

یہ التفاتِ دلِ دوستاں رہے نہ رہے

اور شاید ہم بھی جلد ہی مشرقی پاکستان چلے جائیں۔

تمھاری زری

اعجاز سن سا رہ گیا۔ تو وہ سب سے چھوٹا شہزادہ نہیں تھا جو داستانوں میں سرخ رُو و بامراد ہوتا ہے۔ وہ ان بدنصیب لوگوں میں سے تھا جن کی تقدیر میں محض تلاش، ناکامی اور پتھر کا بن جانا ہوتا ہے۔ کیا زری کو واقعی یہ احساس نہیں تھا کہ وہ اس کی ذات سے کیا کیا اُمیدیں لگائے ہے یا اس عجیب بے رحم لڑکی کے نزدیک دل دُکھانے سے ایک مرتبہ ہی کسی کا دل توڑ دینا زیادہ بہتر ہے۔ اسے بیگم احسن کی بات یاد آئی۔

نہیں، اگر وہ اس کی محبت کا روزِ نجات نہیں منا سکتا تو اُس کی جدائی کا سوگ بھی نہیں منائے گا۔ زری کبھی بھی اس کی نہ تھی، نہ وہ اس کا ہو سکتا تھا— اور یہ کتنا غنیمت تھا کہ ناصر آج ہی آ رہا ہے۔ اس کا باوفا دوست۔ وہ زری کی شادی تک یہیں رہے گا اور وہ اسے سارے لاہور کی سیر کرائے گا۔ وہ خوب گھومیں پھریں گے۔ اگر بیگم احسن تیار ہو گئیں تو ان کو اور شیزی اور نیلی کو بھی ساتھ لے جائیں گے۔ ہاں، اب تو شیزی بھی آنے والی ہے۔ بیگم احسن نے ایسی کوئی بات کہی تو تھی۔ اعجاز نے فوراً اپنے ملازم کو آواز دی۔ اس کو کھانے کے بارے میں ہدایات دیں اور یوں ناصر کے استقبال کی تیاریوں میں جٹ گیا جیسے اس کا بے تکلف دوست نہیں، کوئی بہت بڑی اور اہم شخصیت اس کے گھر مہمان آ رہی ہو۔

ناصر کی گاڑی تھوڑی سی لیٹ تھی۔ اسٹیشن سے گھر تک اِدھر اُدھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اپنے گھر پہنچ کر اعجاز اسے اپنے کمرے میں لے گیا۔ ''دیکھو، یہ ہمارا اور تمھارا کمرہ ہے۔ دو بیڈ ہیں، درمیان میں بیڈ سائڈ ٹیبل اور لیمپ۔ اس میز پر یہ پھول میں نے خود تمھارے اعزاز میں لگائے ہیں۔ ملازم

سے میں نے کہہ دیا ہے کہ پہلے چائے دے اور پھر کھانا۔ آؤ ہم وہاں بیٹھتے ہیں۔" ایک محرابی دیوار کے دوسری طرف پھول دار دری پر دو کرسیاں اور کتابوں کی ایک شیلف رکھی تھی۔ سامنے ایک دروازہ چھوٹے سے چمن زار میں کھل رہا تھا جو بڑے لان کے درمیان باڑھ لگا کر الگ کر دیا گیا تھا۔ "اصل میں یہ ایک ریٹائرڈ افسر کا گھر ہے۔ میاں بیوی ہیں، بچہ کوئی نہیں ہے۔ اس لیے انھوں نے یہ حصہ کرائے پر اٹھا دیا ہے۔ اچھا اب مجھے یہ بتاؤ کہ اس رات تمھارے گھر میں تم پر کیا بیتی کہ اب مجھ میں مزید تابِ انتظار نہیں ہے۔"

"لمبی کہانی ہے۔ تم کھانے کے بعد تک انتظار نہیں کر سکتے۔ مجھے تھکن بھی نہیں اُتارنے دو گے؟"

"جس ڈبے میں بیٹھ کر تم آئے ہو اس میں تھکن نہیں ہوتی، نہ تمھارے اُوپر تھکن کے آثار ہیں البتہ میں مارے تجسس کے مرا جا رہا ہوں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں جان سے گزر جاؤں تو اور بات ہے۔"

"اچھا تو سنو۔ اُس رات جب میں نے امی سے کہا کہ آپ کو ہمارے ساتھ اس گھر سے ہمیشہ کے لیے جانا ہوگا، تو امی نے ایک خطرناک فیصلہ کیا۔ انھوں نے سوچا کہ وہ میرے ساتھ چلی گئیں تو میری زندگی عذاب بن جائے گی، میرا باپ مجھے جائداد سے عاق کر دے گا اور خدا جانے کیا ستم ڈھائے۔ مجھ سے انکار کرنا بھی اُن کے بس میں نہیں تھا۔ انھوں نے میرے نام ایک پرچا لکھ کر گل صنوبر کو دیا، جس میں لکھا تھا: "بس تمھاری دید کے ایک لمحے کے لیے موت کو ٹالے ہوئے تھی، یہ لمحہ میری زندگی امر کر گیا۔ اب میرے جینے سے حاصل بھی کیا ہے۔ سمجھ لینا کہ تمھاری ماں کو مرے ہوئے تیس سال گزر گئے۔ خدا حافظ۔"

اس کے بعد وہ دریا میں چھلانگ لگانے نکلیں۔ دریا کے اُوپر نکلی ہوئی چٹان پر انھیں پکڑ لیا گیا۔ وہ اس بات سے قطعی ناواقف تھیں کہ ستائیس سال سے دن رات ان پر پہرہ تھا۔ اس رات مدتوں بعد پہلی بار ان کا اپنے شوہر سے آمنا سامنا ہوا۔ چاندنی رات تھی۔ نیچے دریا چاندی کی طرح چمک رہا تھا۔ سفید چٹانیں، سنگِ مرمر کی بنچیں — تم نے تو وہ جگہ دیکھی ہے، ذرا اس کا تصور کرو — پُروقار اور خوب صورت امی، سب کچھ خواب سا لگ رہا تھا — سال ہا سال بعد ایک شوہر نے اس بیوی کو، جو کم عمری میں چنبیلی کے پھول کی طرح رہی ہوگی، سنگِ مرمر کے مجسمے کے رُوپ میں دیکھا۔ میں نے یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ وہ بے خوف سیدھی کھڑی تھیں۔ شوہر کا دل شاید موم ہوا۔ وہ بڑے اعتماد اور وقار سے اس کی طرف بڑھا اور بولا، "بس قدسیہ، اتنی سزا کافی ہے۔ آج میں نے تجھے معاف کیا — تو بھی مجھے معاف کر دے۔"

"امی کچھ دیر خاموش رہیں۔ پھر انھوں نے بابا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا، "خان! تم

بھی مجھے معاف کر دینا، میں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ اُس غیر ملکی نے مجھے ہاتھ لگایا تھا مگر میری مرضی کے بغیر نہیں۔''

اور پھر وہ نپے تُلے قدم رکھتی زنان خانے میں غائب ہو گئیں۔ انھیں نہیں معلوم کہ ان کے یہ مکالمے کسی اور نے بھی سنے ہیں، خود اُن کے بیٹے نے — مگر مجھے یقین ہے کہ انھوں نے بابا سے جو کچھ کہا ہے، وہ غلط ہے۔ انتقام لینے کے بہت سے طریقے ہوتے ہیں۔ جس ناکردہ گناہ کی سزا انھوں نے اتنے سال بھگتی، آخر انھوں نے فیصلہ کیا کہ اس بات کا اقرار ہی اس شخص کی انا کو توڑ سکتا ہے۔ وہی ہوا۔ میرا باپ، خان، ان کا شوہر بار بار اُن سے ملنا چاہتا تھا۔ ان سے کہلوانا چاہتا تھا کہ کسی طرح وہ ایک مرتبہ کہہ دیں کہ جو بات انھوں نے اس رات کہی تھی وہ جھوٹ ہے مگر انھوں نے اپنے شوہر کی شکل دیکھنے کی قسم کھالی تھی۔ وہ اب بھی زندہ ہیں اعجاز، مگر انھوں نے کھانا پینا تقریباً چھوڑ رکھا ہے۔ سوکھ کر کانٹا ہو رہی ہیں — سفید پتھر کا وہ مجسمہ اب موم کی گڑیا ہو کر رہ گیا ہے۔ اب انھوں نے گھر کی ظاہرا مالکن بنے رہنے سے بھی انکار کر دیا ہے۔ اب نہ وہ نوکروں کو حکم دیتی ہیں نہ ان کے حکم سے گھر کے چراغ جلتے اور بجھتے ہیں۔ وہ مجھ سے بھی کوئی بات نہیں کرتیں۔ مجھ سے اب ان دونوں کی یہ حالت نہیں دیکھی جاتی۔ میں نے فوج کی میڈیکل کور میں داخلہ لے لیا ہے۔ چھ مہینے بعد کمیشن مل جائے گا۔ ڈائریکٹ کپتان بن جاؤں گا اور جہاں کہیں پوسٹنگ ہوگی، چلا جاؤں گا۔ ایک مرتبہ بابا سے اجازت لے کر امی کو ساتھ لے جانے کی کوشش کروں گا۔ اُمید ہے کہ بابا مان جائیں گے۔ شاید امی بھی راضی ہو جائیں۔''

یہ کہہ کر ناصر خاموش ہو گیا۔ باغ میں ایک چڑیا مسلسل بول رہی تھی، اس کی آواز سناٹے کو گہرا کر رہی تھی۔ اعجاز کا دل پہلے ہی غمگین اور بوجھل تھا۔ اب اسے افسوس ہو رہا تھا کہ اُس نے کیوں آتے ہی ناصر سے اس اذیت ناک داستان سنانے کو کہا، ''آؤ ناصر چلیں، ذرا باہر کا ایک چکر لگا کر آتے ہیں۔'' اعجاز نے کہا، ''مجھے افسوس ہے، مجھے ابھی یہ ذکر نہیں چھیڑنا چاہیے تھا۔''

''ٹھیک ہے یار، ایسی باتیں کہہ دینے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ لاؤ جلدی سے چائے بناؤ۔''

جہاز عمارت سے اتنا نزدیک تھا کہ مسافر پیدل ہی ٹرمینل کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شیزی اُتری، نیلے رنگ کے شلوار سوٹ میں اوپر چھوٹا سا سفید براق کوٹ پہنے وہ بڑی شفاف اور دُھلی دُھلائی سی لگ رہی تھی جیسے بارش کے بعد نیلے آسمان پر کوئی لقۂ ابر۔ کندھے پر پرس ڈالے وہ اطمینان سے آہستہ آہستہ ان کی طرف بڑھ رہی تھی۔ شیزی نے ایک نگاہ استقبال کرنے والوں کی طرف ڈالی۔ نیلی نے خوش ہو کر زور زور سے ہاتھ ہلایا۔ شیزی بھی مسکرائی اور جواباً ہاتھ ہلایا۔ ناصر، اعجاز کی طرف جھکا ''پرانی کتابوں میں سے امی کی جو تصویر تمھیں ملی تھی کیا یہ لڑکی اس تصویر سے ملتی ہے؟'' اس نے پوچھا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' اعجاز نے کہا، ''اس وقت جب وہ تصویر ملی تھی تو مجھے اس میں کسی اور کی مشابہت نظر آئی تھی۔''

''زری کی؟'' اعجاز نے سرگوشی میں پوچھا۔

''ہاں ــــ مگر ہو سکتا ہے کہ دونوں کی مشابہت ہو، خاندان تو ایک ہی ہے۔''

شیزی عمارت کے اندر غائب ہو گئی تو وہ تینوں باہر آ کر اس کا انتظار کرنے لگے۔ ذرا دیر بعد وہ ٹرالی میں اپنا سوٹ کیس رکھے باہر نکلی۔ نیلی جا کر اس سے لپٹ گئی۔ دونوں نے محبت سے ایک دوسرے کے گال پر ہلکا سا بوسہ دیا۔ شیزی نے نگاہیں اُٹھا کر دیکھا کہ کون کون آیا ہے۔ اعجاز کو دیکھ کر اس کی آنکھوں میں پہچان کی چمک آئی۔ دونوں نے بیک وقت سلام کیا۔ اعجاز نے ناصر خان کا تعارف کروایا۔

''یہ میرا دوست ہے ناصر، ڈاکٹر ہے اور فوج میں جانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ شیزی بھی میڈیکل کالج میں پڑھ رہی ہیں، ظاہر ہے کہ ڈاکٹر بننے کا ارادہ رکھتی ہیں۔''

اسی وقت آگے بڑھ کر ڈرائیور نے شیزی کو سلام کیا اور سوٹ کیس اُٹھا کر کار میں رکھنے چلا گیا۔

''ممی اور پاپا کیسے ہیں، آئے نہیں۔'' شیزی نے پوچھا۔

''ممی ٹھیک ہیں، پاپا تو یہاں نہیں ہیں۔ کل ملتان سے ان کا فون آیا تھا۔ وہ اب ٹرین سے چلیں گے اور فیصل آباد ہوتے ہوئے آئیں گے۔ ممی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے وہ ایئر پورٹ نہیں آئیں۔''

''اوہ!'' شیزی کو کچھ یاد آیا، اچھا تو واقعی پاپا کو ملتان جانا تھا اس لیے کچھ اطمینان ہوا کہ ملتان کی بات سراسر غلط نہیں تھی۔

''لوگ کہتے ہیں کہ کراچی کی آب و ہوا اچھی نہیں ہے لیکن آپ کی صحت پر تو اچھا اثر پڑا ہے۔'' اعجاز نے شیزی سے کہا۔ وہ سب آہستہ آہستہ کار کی طرف بڑھ رہے تھے۔

''جی ہاں، زری آنٹی کے ساتھ رہنا مجھے راس آیا ہے۔''

دم بھر کو یوں لگا جیسے شیزی نے پتھر کھینچ کر اعجاز کے عین سینے پر مارا ہو۔ پھر وہ سنبھل گیا (وہ اس نام کا اتنا اثر نہیں لے گا — وہ زری کے ذکر سے ہرگز نہیں بچے گا)۔

''آپ زری کی شادی میں شریک ہوئے بغیر آگئیں!'' اعجاز نے اپنی لرزتی ہوئی آواز پر قابو پانے کی کوشش کی۔

''زری آنٹی کی شادی! کب؟ کس سے؟'' شیزی سخت متعجب تھی۔

''شمس الرحمٰن سے، اگلے اتوار کو، تعجب ہے کہ انھوں نے آپ سے ذکر نہیں کیا۔''

''اوہو، انھوں نے کہا تو تھا کہ تم یہاں رہتیں تو ایک اہم خبر سنتیں، خیر وہاں بھی تمھیں مل جائے گی۔ وہ یقیناً یہی خبر ہوگی۔ مگر آپ کو کیسے پتا چلا؟''

لمحہ بھر اعجاز نے توقف کیا جیسے سانس درست کر رہا ہو۔ ''مجھے ان کا دعوت نامہ ملا ہے۔ نرگس اور نور نے بھی بلایا ہے۔ آپ ان سے ملی ہوں گی۔ دونوں کی شادی ایک ہی دن ہو رہی ہے۔''

''ان کی شادی کے بارے میں مجھے معلوم ہے اور یہ بھی کہ شادی کے بعد وہ دونوں مشرقی پاکستان چلے جائیں گے۔''

شیزی اور نیلی کار میں پچھلی سیٹ پر بیٹھیں۔ ناصر اور اعجاز آگے ڈرائیور کے برابر میں بیٹھ گئے۔

اعجاز نے کہا، ''ناصر! تم اور شیزی ایک ہی پیشے سے متعلق ہو۔ تم نے اب تک شاپ ٹاک (shop talk) شروع نہیں کی۔''

''سوچ تو رہا تھا کہ ان کی پڑھائی کے بارے میں پوچھوں، مگر آج کل تو پڑھائی سے زیادہ مظاہروں کا زور ہے۔ ان کا ایف جے کالج بھی آگے آگے ہے۔ گنگا رام ہسپتال سے بھی جلوس نکلتے ہیں جن پر راستے میں طالبات گل پاشی کرتی ہیں۔''

''جی نہیں۔'' شیزی نے احتجاج کیا، ''راستے میں جن جگہوں سے جلوس گزرتے ہیں، وہاں کے لوگ گل پاشی کرتے ہیں۔ میرے کراچی جانے سے پہلے ایک جلوس 'میو ہسپتال' سے شروع ہوا تھا۔ اس میں سر گنگا رام اور ایف جے کالج بھی شریک تھا۔ وہ چیئرنگ کراس سے ہوتا ہوا مسجد شہدا سے دو حصوں میں بٹ گیا تھا۔ میو ہسپتال والے واپس چلے گئے اور ایف جے کالج والیاں اپنے کالج آ گئی تھیں۔ اس جلوس پر لوگوں نے پھولوں کی پنکھڑیاں پھینکی تھیں۔''

''آپ اس جلوس میں شریک تھیں؟'' ناصر خان نے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' شیزی نے جواب دیا۔

''آپ کو جمہوریت سے دل چسپی نہیں ہے؟'' ناصر خان نے گویا اُسے چھیڑا۔

جمہوریت سے دل چسپی ہونا اور بات ہے اور عملی سیاست میں حصہ لینا اور بات ہے۔''

شیزی نے کہا۔

''آپ دونوں کبھی سوات گئی ہیں؟'' ناصر خان نے پوچھا۔

''کئی مرتبہ۔'' نیلی نے جواب دیا۔

''کون سے موسم میں؟''

''گرمیوں میں۔''

''کبھی وہاں آ کر خزاں کی بہار دیکھیے۔''

''خزاں کی بہار؟'' نیلی ہنسی۔

''ہاں، یہی تو میں آپ کو بتا رہا ہوں۔ بہار سے زیادہ خوب صورت خزاں ہوتی ہے۔ درختوں کے پتے جو سبز، زرد، نارنجی، گلابی اور سرخ ہو جاتے ہیں۔ پھلوں کے باغوں میں میلوں تک یہ رنگ اتنے خوب صورت لگتے ہیں کہ حد نہیں۔''

''اچھا، اب کے خزاں میں جائیں گے۔'' شیزی نے کہا۔

'قصرِ نیلم' دور سے چمک رہا تھا۔ اس میں بھی سفید اور نیلے رنگ کی آمیزش تھی۔ دیواریں سفید تھیں اور چھجے اور کارنس نیلے تھے۔ اس وقت دھوپ میں چمکتا ہوا وہ چاندی میں جڑا ہوا نیلم لگ رہا تھا۔ شاید نیلا رنگ ان سب کا پسندیدہ رنگ ہے۔ ناصر خان نے سوچا۔ نیلی اس وقت سفید کپڑوں پر

نیلا کوٹ پہنے ہوئے تھی۔

ناصر خان اور اعجاز شیزی اور نیلی کو چھوڑ کر جانے لگے تو بیگم احسن نے ان دونوں کو کھانے پر روک لیا۔ کھانے کے بعد جانے کے لیے نکلے تو بیگم احسن نے انھیں اصرار کر کے ڈرائیور کے ساتھ کار میں بھجوایا۔ کار سے اُتر کر برآمدے میں قدم رکھتے ہی ناصر نے ایک ٹھنڈی آہ بھری۔

''کیا ہوا یار، خیریت تو ہے؟'' اعجاز نے پوچھا۔

''یار میں نے کہیں پڑھا تھا، یونانی اسطور ہے یا کیا کہ اللہ میاں نے ساری رُوحیں توام پیدا کیں اور پھر ان کو الگ کر کے دُنیا میں پھینک دیا تا کہ وہ ایک دوسرے کو تلاش کرتی رہیں۔ آج اس لڑکی شیزی کو دیکھ کر مجھے برسوں کی پڑھی ہوئی یہ بات یاد آئی۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ لڑکی میری روح کا توام حصہ ہے۔ میں نے اسے پہچان لیا ہے اور آج مجھے اس بات کا یقین ہو گیا ہے کہ ایسا ضرور ہوتا ہے۔''

اعجاز سناٹے میں آ گیا۔ اس شخص نے تو زندگی میں کسی لڑکی کی طرف سنجیدگی سے دیکھا تک نہیں تھا۔ کیا اسے پتا ہے کہ شیزی کا نکاح ہو چکا ہے۔ ابھی کیا جلدی ہے۔ ابھی بہت وقت پڑا ہے۔ یقیناً وہ مذاق کر رہا ہوگا، اتنا سنجیدہ بھی نہیں ہو سکتا۔ یہ بے چارہ پیارا شخص، جس کی ناکامیاں اس کی پیدائش سے پہلے سے شروع ہو گئی تھی، اس کو دیکھ کر کتنی ڈھارس بندھتی ہے۔ وہ جو مجموعۂ اضداد ہے۔ ایک کھاتے پیتے زمیں دار باپ کا بیٹا، اپنی ریاست سے روٹھ کر بھاگ آیا ہے اور اس کے ایک کمرے کے مکان میں بے حد خوش اور مطمئن ہے۔ جن کے ہاں پشتوں سے کوئی ڈاکٹر نہیں تھا، یہ شخص ڈاکٹر بن گیا، اور اب فوج میں کمیشن لینے کا ارادہ کر رہا ہے۔

''میری سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تم فوج میں کیوں جا رہے ہو؟'' اعجاز نے اتنے دنوں میں کوئی پانچویں مرتبہ یہ بات کہی تھی۔

''آخر تمھیں کیا اعتراض ہے؟'' ناصر خان سنجیدہ ہو گیا۔

''بھئی میں آج تک تمھیں ایک سوچنے والا حساس انسان سمجھتا تھا، تمھیں جنگ سے کیا دل چسپی ہے؟''

''میں نے کب کہا کہ مجھے جنگوں سے دلچسپی ہے۔'' ناصر خان نے کہا، ''اور سوچنے کا حق کیا صرف ان تھالی کے بینگنوں کو ہے جو سیاست دان کہلاتے ہیں اور اِدھر اُدھر لڑھکتے رہتے ہیں یا ان دانشوروں کو جو دوسروں کے خیالات کی جگالی کرتے رہتے ہیں۔''

''میرا مطلب یہ تھا کہ ڈاکٹری کے پیشے اور فوج کا تعلق؟'' اعجاز بولا۔

''ارے بھئی ڈاکٹری کا پیشہ سب سے زیادہ لڑائی ہی میں تو کام آتا ہے۔'' ناصر خان نے کہا،

''جہاں بیٹے کے معصوم نوجوانوں کو مارا اور زخمی کیا جاتا ہے۔ ایسے سپاہیوں کو جن میں سے اکثر بے چاروں کو یہ بھی معلوم نہیں ہوتا کہ یہ لڑائی کیوں ہو رہی ہے۔ بس انھیں جنگ پر جانے کا حکم ملتا ہے اور وہ حکم کے بندے چلے جاتے ہیں۔ اکثر جنگوں میں کسی کو کچھ بھی حاصل نہیں ہوتا۔ نہ کسی کو فتح ہوتی ہے نہ شکست۔ دونوں طرف ہزاروں زخمی اور قیدی ہوتے ہیں۔ جن کو مصنوعی اعضا اور تمغے دے دیے جاتے ہیں۔ نعشوں کو ایک ہی بڑی سی قبر میں دفن کر دیا جاتا ہے۔ دونوں ملک کچھ دن اپنی جنگی برتری کا پروپیگنڈہ کرتے رہتے ہیں لیکن بہت جلد ان کا پول کھل جاتا ہے۔''

''اسی لیے تو میں نے کہا تھا کہ جب تمھیں جنگ پر یقین نہیں ہے تو فوج میں کیوں جاتے ہو؟'' اعجاز نے کہا۔

''جنگ پر ایمان اور یقین تو کوئی صحیح الدماغ آدمی نہیں رکھ سکتا۔ جنگ کسی عقیدے کا نام نہیں کہ اس پر ایمان نہ رکھنے والا کافر ہو لیکن فی الحال جنگیں اتنی اٹل معلوم ہوتی ہیں جتنی موت۔''

ناصر خان نے کچھ دیر توقف کیا اور کہا، ''یار میں سوچتا ہوں، کبھی تو — اب سے ہزاروں سال بعد ہی، ایسا وقت آئے گا جب جنگ اسی طرح مٹ جائے گی جس طرح آدم خوری اور غلامی ختم ہو گئی۔''

''شاید۔'' اعجاز نے تذبذب سے کہا۔

''لوگ کہتے ہیں لڑائیاں ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔ جب آدم خوری اور غلامی عام ہو گی تب بھی ہمیشہ یہی کہا جاتا ہو گا کہ یہ ہمیشہ سے ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔'' ناصر خان نے کہا۔

''ہاں یار، بات تو تم ٹھیک کہتے ہو مگر یہ مستقبل بہت دور معلوم ہوتا ہے، فی الحال تو ہر ملک تیاریوں میں مصروف نظر آتا ہے۔ ہر جگہ امن کے نام پر جنگ ہو رہی ہے۔''

''جب تک جنگیں ہو رہی ہیں ڈاکٹروں کا ان میں جانا جہاد ہے، اور گھر سے زیادہ سے زیادہ دور رہنے کے لیے بھی کسی معقول بہانے کی ضرورت تھی۔'' ناصر خان نے کہا۔

''تو یوں کہو۔ بڑے بڑے نعروں کے پیچھے اکثر چھوٹے چھوٹے ذاتی مقصد ہوتے ہیں۔'' اعجاز بولا۔ ''لو چائے پیو۔''

شیزی کو نیلی سے بہت سی باتیں پتا چلیں۔ اسے اندازہ ہوا کہ وہی نہیں، ان چند دنوں میں نیلی بھی ذہنی طور پر بڑی ہوگئی ہے۔ اس نے نغمہ کے بھائی کے زخمی ہونے اور جلوس میں جانے کی داستان سنائی۔ پھر اس نے بتایا کہ ممی کو اتفاق سے جواد کا وہ خط مل گیا تھا جس میں اس نے اپنے لاہور آنے کی اطلاع دی تھی اور انھیں یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ شیزی جان بوجھ کر ان دنوں کراچی گئی ہے۔ اس کے علاوہ نیلی کو یہ بھی معلوم تھا کہ جواد خاص طور پر شیزی کو لینے کراچی گیا تھا مگر واپسی پر ان سے بغیر ملے پشاور چلا گیا تھا اور فون پر صرف اتنا بتایا تھا کہ کسی وجہ سے شیزی اس کے ساتھ نہیں آسکی ہے۔

شیزی کئی دن تک متوقع رہی کہ اس کے پاپا اور ممی اُس سے تفصیلی بات کریں گے لیکن کسی نے کوئی بات نہ کی۔ اس سے پہلے اکثر اُس کی ممی اسے کریدا کرتی تھیں اور وہ ہمیشہ ایک ہی جواب دیتی تھی، ''ممی! جو بات ختم ہوچکی اسے پھر سے شروع کرنے کا کیا فائدہ ہے؟ اب وہ ممی کو بتانا چاہتی تھی کہ جو بات ختم ہوچکی تھی وہ ابھی ختم نہیں ہوئی ہے ــــ اور وہ اسے واقعی ختم کرنا چاہتی ہے مگر اس کا طریقہ نہیں جانتی۔ بجلی کے پنکھے کا پلگ نکال دیا جائے تو پنکھا خود بخود رُک جاتا ہے۔ اپنے خیال میں وہ جواد کے ساتھ اپنے تعلقات کا پلگ نکال چکی تھی مگر پنکھا رُک جائے گا، اس کا اسے یقین نہیں تھا۔

وہ چاہتی تھی کہ ممی یا پاپا اس سلسلے میں اس سے بات کریں تاکہ وہ اپنا خیال ان پر ظاہر کرسکے مگر ان دونوں میں سے کسی نے اس سے بات نہ کی۔ شاید انھیں معاملے کی سنگینی کا احساس تھا اور جب تک وہ حتمی طور پر کچھ فیصلہ کرنے کے قابل نہ ہوں، بات کرتے ہوئے ڈرتے تھے۔

اخباروں کی شہ سرخیاں اب بھی ملک بھر میں ہنگاموں کا اعلان کر رہی تھیں اور ملک کا ایک دور اپنے منطقی انجام کی طرف بڑھ رہا تھا۔

آئندہ کسی پاکستانی کے خلاف ڈیفنس رولز کے تحت کارروائی نہیں کی جائے گی۔

صدر عنقریب ہنگامی حالات ختم کرنے کا اعلان کردیں گے۔

لاہور کالج کی طالبات نے پابندی کے باوجود جلوس نکالا۔

ڈھاکا یونی ورسٹی کیمپس کے باہر پولیس تشدد کے خلاف طلبہ کا احتجاجی جلسہ۔ جلسے کے بعد جلوس نکالا جائے گا۔

شاہراہِ قائداعظم پر سارا دن طلبہ کے جلوس گزرتے رہے۔ طالب علموں نے ٹریفک کنٹرول کیا۔ لاہور کے مختلف کالجوں کی طالبات کا احتجاجی جلوس۔

پولیس آئندہ تعلیمی اداروں میں داخل نہیں ہوگی۔ وزیرِ داخلہ کی طرف سے یقین دہانی۔

لاہور میں مزدوروں، ڈاکٹروں، انجینئروں، اساتذہ، طلبہ اور خواتین کے احتجاجی جلوس۔ عدالتی کام معطل رہا۔

جلال پور جٹاں ۔۔۔ صدر کے نام یادداشت۔

اسکول اور کالج تا حکمِ ثانی بند رہیں گے۔

اگرتلہ سازش کیس کے ایک ملزم سارجنٹ ظہور الحق کی ڈھاکا چھاؤنی میں ہلاکت۔ مشرقی پاکستان میں غم و غصہ کا طوفان۔

قانون قطعی طور پر غیر موثر ہو چکا تھا۔ ہر محکمہ، ہر جماعت، ہر طبقہ کوئی نہ کوئی فریاد لیے جلسہ کرنے اور جلوس نکالنے میں مصروف تھا۔ مشرقی پاکستان میں فقیروں تک کا جلوس نکالا جن کے مطالبات خاصے مضحکہ خیز تھے۔ جگہ جگہ شامیانے لگے ہوئے تھے اور مختلف لوگ مختلف مطالبوں میں بھوک ہڑتال کیے پڑے تھے۔ صحافی دھڑا دھڑ بیان اور تصویریں لے رہے تھے۔ بھوک ہڑتالی ہار پھول پہنے فرش پر دراز تھے۔ ہر طبقے کے لوگ جا کر ان کی خیر و عافیت دریافت کر رہے تھے تاکہ کل ان میں سے کوئی اقتدار میں آجائے تو یاد رکھے کہ کس نے فاقہ مستی میں اس کا ساتھ دیا تھا اور جب اخباروں میں ہڑتالیوں کی خیریت دریافت کرنے والوں کے نام آئیں تو اُن کا نامِ نامی بھی آجائے تاکہ سند رہے اور بوقتِ ضرورت کام آئے۔

۱۹ر مارچ تک یہ سلسلہ چلتا رہا۔ پھر حکومت کے اندر چند لوگ حرکت میں آئے۔ کمانڈر ان چیف جنرل یحییٰ خاں نے مشرقی پاکستان سے جنرل مظفر الدین کو راول پنڈی بلوایا۔ نہایت خفیہ فوجی

کانفرنس ہوئی اور طے ہوا کہ ۲۵ رمارچ کے دن مارشل لا لگا دیا جائے۔ ۲۲ رمارچ شہ سرخی: میرا اوّلین کام آزادانہ اور منصفانہ انتخاب کرانا ہے — نئے گورنر مسٹر یوسف ہارون کا بیان۔

۲۳ رمارچ — عوام اپنے ملک کو بچائیں اور نظریۂ پاکستان کی حفاظت کریں۔ فیلڈ مارشل صدر ایوب خان کا بیان — اسی دن مشرقی پاکستان کے نئے گورنر نور الہدیٰ نے اپنے عہدے کا حلف اٹھایا۔ عوام کو دکھانے کے لیے یہ ڈراما کھیلا گیا تھا۔ اصل ڈراما کچھ اور ہی تھا۔

اصل ڈراما یہ تھا کہ ۲۴ رمارچ ۱۹۶۹ء کو ایوانِ صدر میں جنرل یحییٰ خاں، میجر جنرل راؤ فرمان علی، الطاف گوہر اور فدا حسین فیلڈ مارشل ایوب خاں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایوب خاں بہت پریشان تھے۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد وہ لب کشا ہوئے، ''میں سمجھتا ہوں کہ اب ملک میں دوبارہ مارشل لا لگائے بغیر چارہ نہیں۔ یہ مارشل لا فوری اور سخت ہونا چاہیے۔ They should know that we mean it. جنرل یحییٰ خاں نے معنی خیز نگاہوں سے راؤ فرمان علی کی طرف دیکھا۔ لفظ 'We' محلِ نظر تھا — بڑے میاں اب تک اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ مارشل لا ان کے حکم سے لگایا جائے گا۔

''ہمیں تفصیلات طے کر لینی چاہییں۔'' فیلڈ مارشل ایوب خاں دوبارہ گویا ہوئے۔

''سر!'' یحییٰ خان کھرج میں اپنی زوردار آواز کے ساتھ بولے، ''اب یہ مارشل لا فوج لگائے گی۔''

فیلڈ مارشل ایوب خاں نے چونک کر جنرل یحییٰ خاں کی طرف دیکھا۔ وہ سامنے دیکھ رہے تھے مگر ان کے بیٹھنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔ ایک تاریک سایہ سا ایوب خاں کے سرخ و سپید چہرے پر چھاتا چلا گیا جیسے کوئی لہر بڑھتی چلی آ رہی ہو۔ وہ چند ثانیوں تک بالکل خاموش رہے۔ شاید جذبات پر قابو پانے کی کوشش کر رہے تھے یا بولنے کے لیے الفاظ ڈھونڈ رہے تھے۔ آخر انھوں نے آواز کو نارمل بنانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا:

''آپ کی بات سمجھ گیا۔ میں مستعفی ہونے کو تیار ہوں۔''

لکھی ہوئی تقریر ان کے آگے بڑھا دی گئی۔ انھوں نے اس پر ایک نظر ڈالی، ''ٹھیک ہے، میں یہ تقریر ریکارڈ کرا دوں گا۔'' فیلڈ مارشل ایوب خاں نے کہا۔

یہ تقریر ریکارڈ کروا کے ایک جنرل نے بہ نفسِ نفیس دوسرے جنرل کے ہاتھ میں دی تاکہ وہ کراچی لے جائیں جہاں سے اُسے نشر ہونا تھا۔ کراچی میں یہ امانت تیسرے جنرل کے ہاتھ میں پہنچی جنھوں نے اسے اپنی نگرانی میں نشر کروایا۔ جنرل یحییٰ خاں کی تقریر بھی ریکارڈ ہو چکی تھی۔

۲۵ رمارچ کو عوام کا غیر قانونی میلہ زور شور سے جاری تھا۔ لوگ ہار پھول پہنے شامیانے تلے بھوک ہڑتال کیے بیٹھے تھے۔ بڑے بڑے لیڈران، یونی ورسٹی کے اساتذہ، شہر کے خواص اور دانشور

حضرات خیر و عافیت پوچھنے آ رہے تھے۔ صحافی بیان پر بیان اور تصویروں پر تصویریں لے رہے تھے۔

ایسے میں جنرل یحییٰ خاں کی تقریر ٹی وی اور ریڈیو پر نشر ہوئی کہ فوری طور پر مارشل لا لگا دیا گیا ہے۔ جلسے جلوس پر پابندی عائد کر دی گئی ہے، پورے ملک میں سیکشن نمبر ۱۴۴ نافذ کر دیا گیا ہے۔ یہ سنتے ہی ہڑتالیوں نے ہار پھول ریت پر پھینکے، جوتے پہنے اور بھاگے ۔۔۔ پانی سے روزہ بھی نہ کھولا۔ حال احوال پوچھنے آنے والے آدھے راستے سے لوٹ گئے۔ صحافیوں نے اپنی ڈائریاں اور کیمرے بند کر لیے۔ شامیانے والوں نے اس پھرتی سے شامیانے اور دریاں سمیٹیں کہ چند منٹ میں جہاں میلے کا سماں تھا، وہاں دھول اُڑنے لگی اور چاروں طرف سناٹا گونجنے لگا۔

پیش منظر

۷/دسمبر ۱۹۷۰ء— جگہ جگہ خیمے لگے ہوئے تھے۔ کنویسنگ ہو رہی تھی۔ پاکستان کی زندگی میں پہلی مرتبہ الیکشن ہو رہے تھے۔ اس قوم کے بہت سے نوجوانوں نے صرف الیکشن کا نام سنا تھا الیکشن ہوتے نہ دیکھے تھے۔ بچے اپنی زندگی میں پہلی مرتبہ یہ ''میلہ'' دیکھ رہے تھے اور سوچ رہے تھے، کاش ہم بھی ووٹ دے سکتے۔ ووٹنگ بوتھ پر لمبی لمبی قطاریں تھیں۔ ووٹ دینا ہر شخص کا بنیادی حق بھی ہے، اس کا انسانی اور سماجی فرض بھی۔ ایسی باتیں سننے میں آ رہی تھیں۔ فرض اگر پکنک تہوار اور میلے کے ساتھ منسلک ہو جائے تو اور کیا چاہیے۔ عورتیں جو گھر کی چہار دیواری میں پڑے پڑے تھک گئی تھیں، کراچی کی سردی کی خوش گوار دھوپ میں کھڑی بے حد خوش تھیں۔ بوڑھی عورتیں جن کی کمریں جھکی ہوئی تھیں اور آنکھوں سے پوری طرح نظر نہ آتا تھا، ہمت سے لمبی قطاروں میں لگی ہوئی تھیں۔ بہت سے لوگ کھانے پینے کا سامان ساتھ لائے تھے۔ سارا دن بے حد چہل پہل رہی تھی اور شام کو ٹی وی بیشتر گھروں میں دل چسپی کا مرکز تھا جہاں سے رات بھر الیکشن کے نتائج بتائے جانے والے تھے۔

شمالی علاقوں میں جہاں سردی کا زور تھا، کمروں میں صندلیاں، انگیٹھیاں اور ہیٹرز رکھ لیے گئے تھے۔ چائے اور کافی کے دور چل رہے تھے اور الیکشن کے نتائج کے دوران دوسرے پروگرام بھی بڑی دل چسپی سے دیکھے جا رہے تھے۔ صبح ہوتے ہوتے مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی اور مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کی جیت یقینی ہو چلی تھی۔

ابتدائی جوش و خروش میں بہت سے لوگوں کو اس بات کا اندازہ نہ ہوا کہ ایک صوبے میں بھاری

اکثریت سے جیتنا اور دوسرے صوبے میں اس پارٹی کا وجود نہ ہونے کے برابر ہونا کتنے گمبھیر نتائج پیدا کرسکتا ہے، لیکن آہستہ آہستہ اس وقت خیز صورتِ حال کا اندازہ ہوا، اور مارچ ۱۹۷۱ء میں مشرقی پاکستان ایک پُرآشوب دور سے گزرا جس کے بعد حکومت نے اعلان کیا کہ آہستہ آہستہ حالات نارمل ہوگئے ہیں۔ بھارت میں پناہ لینے والے لوٹ رہے ہیں۔ اسکول، کالج، دفاتر، بینک اور فیکٹریاں، سب حسبِ دستورِ سابق کام کر رہے ہیں۔ غرض کہ فوج کے دستور کے مطابق:

''سب ٹھیک ہے جوان؟''

''سب ٹھیک ہے سَر!''

نومبر ۱۹۶۸ء سے دسمبر ۱۹۷۱ء تک دریائے سندھ، بوڑھی گنگا، راوی اور دریائے ٹیمز میں بہت پانی گزر چکا ہے۔ بہت سے لوگ ادھر سے اُدھر ہو چکے ہیں۔ بہت سے لوگ جو وقتی طور پر مغربی پاکستان یا غیر ممالک میں گئے تھے، وہیں رہ پڑے ہیں۔ نور اور نرگس انگلستان سے ابھی تک نہیں لوٹے ہیں۔ نرگس کے والد ثناء اللہ صاحب کی نعش چٹا گانگ میں کالوگھاٹ پر پڑی رہی تھی۔ نرگس کا بھائی جمال دیناج پور میں دفن کر دیا گیا تھا۔ باقی گھر والے سب کچھ چھوڑ کر مغربی پاکستان آ گئے تھے۔ کراچی میں بیگم مرزا اور بیگم ثنا اللہ کی ملاقات ہوئی تو دونوں اپنے بھرے پُرے گھروں کی ایک ایک چیز کو یاد کر کے دکھی ہوتیں۔ بیگم ثنا اللہ اپنے شوہر اور جوان بیٹے کو یاد کر کے روتی ہیں تو بیگم مرزا اپنے بیٹے الیاس اور بیٹی بینو کو یاد کر کے روتی ہیں۔ ہر چند کہ بینو زندہ اور خوش ہے مگر انھیں اس بات کا یقین نہیں ہے — یقین ہی تو ہر چیز سے اُٹھ گیا ہے۔

نرگس کی چھوٹی بہنیں جو بنگلہ زبان میں اُردو سے کہیں زیادہ رواں ہیں، اب بھی بے خیالی میں کبھی کبھی بنگلہ بولنا شروع کر دیتی ہیں۔ کہیں مل جائیں تو بنگلہ کتابیں ضرور پڑھتی ہیں۔ حال ہی میں انھوں نے کوی جسیم الدین کی نکشی کانتھار ماٹھ (زرکار لحاف) دوبارہ ختم کی ہے۔ جس میں دو گاؤں کے درمیان ایک تالاب ہے۔ ایک بانسری کے سُر دوسرے گاؤں تک پہنچتے ہیں۔ ایک گاؤں سے بھٹیالی کا سُر بلند ہوتا ہے تو دوسرے گاؤں کی ناریاں اپنی اپنی کٹیا کے دروازے سے لگ کر چپ چاپ سنتی رہتی ہیں۔ نرگس کی بہنیں اب بھی ان جانے میں جیبو نندو داس کا لکھا ہوا گیت گنگنانے لگتی ہیں۔ ”میں نے بنگال کا چہرہ دیکھا ہے اس لیے میں دُنیا کے رُوپ کی تلاش میں کہیں نہیں جاتا۔“ اور

پھر چاروں طرف دیکھ کر یکایک خاموش ہو جاتی ہیں۔

انھیں معلوم ہے کہ مشرقی پاکستان میں اب بھی فضا سازگار نہیں ہے۔ مکتی باہنی کی کارروائیاں زوروں پر ہیں۔ بھارت دنیا بھر کی ہم دردیاں حاصل کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہا ہے۔ مہاجرین کی آمد کو بڑھا چڑھا کر پیش کر رہا ہے۔ سرحدوں پر برابر جھڑپیں ہو رہی ہیں۔ ۱۰ر جون ۱۹۷۱ء کو انٹر کانٹی نینٹل پر تین دستی بم پھینکے گئے۔ روز کہیں نہ کہیں سے بم پھٹنے کی اطلاع آتی ہے۔ ڈھاکا سے ایک خط آیا ہے جس میں ۱۴ر اگست کے ریڈیو مشاعرے کا تفصیلی حال ہے۔ خط کا نام پتا پھاڑ لیا گیا ہے اور وہ خط ایک خاص حلقے میں گھوم رہا ہے۔ یہ ڈھاکا کی اصل کیفیت کا غماز ہے۔ ۱۴ر اگست کے ریڈیو مشاعرے میں مغربی پاکستان سے بھی شعرا بلائے گئے تھے۔ جنرل نیازی اس مشاعرے میں مہمانِ خصوصی تھے، شاید دُنیا کو یہ بتانے کے لیے کہ سیاسی اور کلچرل سطح پر مشرقی پاکستان نارمل ہے۔

ہر جگہ فوج کا عمل دخل ہے۔ شہریوں پر پابندی ہے، رات کو بغیر پاس کے کوئی باہر نہیں نکل سکتا۔ ہمیں ۱۴ر اگست کے مشاعرے کا دعوت نامہ ملا۔ جنرل نیازی صدارت کے لیے آ رہے تھے۔ چند قدم کے بعد ہی پاس پوچھا گیا۔ دعوت نامہ دکھایا مگر اجازت نہ ملی۔ گھر لوٹے اور پاس لیا۔ قدم قدم پر پاس اور دعوت نامہ دکھاتے ریڈیو اسٹیشن کے نزدیک پہنچے تو وہاں فوج یوں کھڑی تھی جیسے سلامی دینے آئی ہو۔ ہر طرف سپاہی کھڑے تھے اور ہر کار کو شبہے سے دیکھ رہے تھے۔ وہاں پاس دکھایا، آگے بڑھے، کار کی تلاشی ہوئی۔ کار رکھ لی گئی۔ اب پیدل چلے، دورویہ فوجی سپاہی کندھے سے کندھا ملائے کھڑے تھے۔ عمارت کے دروازے پر پاس دکھایا تو جامہ تلاشی ہوئی اور اندر جانے کی اجازت مل گئی۔ یہاں دونوں طرف کمانڈوز کھڑے تھے۔ چھ فٹ سے اونچے، کاندھے سے کاندھا اور سنگینوں سے سنگینیں ملائے، اپنی سرخ سرخ آنکھوں سے آنے والوں کو گھور رہے تھے۔ یوں محسوس ہوا جیسے مشاعرے میں نہیں، جیل خانے میں جا رہے ہوں۔

اسٹوڈیو میں، جہاں سے مشاعرہ نشر ہو رہا تھا، کمانڈوز کی ایک اور نسل ایستادہ تھی۔ اس وقت تک زیادہ تر نشستیں خالی تھیں اور بہت سی آخر تک خالی ہی رہیں۔ شاعر بے چارے بھی اسی طرح سنگینوں کے سائے میں جامہ تلاشی دیتے آئے اور ڈائس پر بیٹھ گئے۔ انھیں بھی مہمانِ خصوصی کی آمد سے بہت پہلے بٹھا دیا گیا۔ مہمانِ خصوصی آئے تو دو سپاہی آگے اور دو پیچھے سنگینوں کا سایہ کیے ساتھ تھے۔

بارے مشاعرہ شروع ہوا۔ گھر پر کہہ کر آئے تھے کہ داد میں ہماری آواز ضرور پہچانی جائے گی مگر ایسے ماحول میں کس کم بخت کی آواز نکلتی — نہ داد نہ فریاد — کسی نے چوں نہ کی — شاعر بھی منہ ہی

منھ میں کچھ بُد بُداتے رہے۔ مشاعرے کے آخر میں مہمانِ خصوصی نے بھی چند اشعار سنائے۔ ان کے رخصت ہونے کے بعد کمرے کا دروازہ بند کر دیا گیا اور اس وقت کھولا گیا جب وہ چند میل دُور نکل گئے۔ پھر اسی طرح سنگینوں کے نیچے سے گزرتے باہر آئے۔ کارلی اور گھر روانہ ہوئے۔ آدھی رات کا وقت، دُور دُور سناٹا۔ راہ میں فوجی کار روک کر پوچھتے تھے، ''کدھر سے آرہے ہو؟'' کہتے، ''مشاعرے سے'' تو شک کی شکن گہری ہو جاتی۔ دعوت نامہ دکھاتے تو اسے آنکھوں کے سامنے کر کے سوچ میں پڑ جاتے کہ جانے کیا سازشی چیز ہم نے انھیں دھوکا دینے کے لیے ایجاد کی ہے۔ آخر دبنگ ہو کر کہنا پڑا کہ بھئی ایسی جگہ مدعو تھے جہاں تمھارے جنرل نیازی بھی موجود تھے، کوئی مذاق نہیں ہے۔ تب جا کر خلاصی ہوئی۔ اِکٹھے باتیں کرتے گھر آئے۔ گھر والوں نے کہا، ''تمھاری داد کی آواز تو آئی نہیں ویسے آن داہول مشاعرہ کامیاب تھا۔''

نیلی کالج میں پڑھ رہی ہے۔ اب ہر بات پر اس کی آنکھیں حیرت سے گول نہیں ہوتیں۔ وہ بہت سی باتیں سمجھنے لگی ہے۔ زری کی شادی کے بعد اُس نے بہت عرصے تک اعجاز کو دکھی دیکھا تھا، اور سچے دوست کی طرح بغیر زری کا نام لیے اُس کی دل جوئی کی تھی۔ وہ یہ جانتی ہے کہ ناصر خان اور شیزی ایک دوسرے کو بے انتہا پسند کرنے کے باوجود کیوں ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے بھی گریز کرتے ہیں۔ کیپٹن جواد کا کٹ آؤٹ (cut out) کسی ٹھوس جسم کی طرح اسے بھی ان دونوں کے درمیان نظر آتا ہے۔ کسی قید خانے کے مضبوط دروازے کی طرح ٹھوس اور اٹل۔ والد کے انتقال کے بعد ناصر نے فوج میں جانے کا خیال چھوڑ دیا تھا اور واپس اپنے گاؤں چلا گیا تھا، جہاں وہ اپنے گھر میں پریکٹس کرتا ہے۔ گاؤں والوں سے فیس تو کیا لیتا اکثر دوائیں بھی مفت دیتا ہے، اور اکثر اعجاز کے پاس لاہور آیا کرتا ہے۔

نیلی نے مشرقی پاکستان سے واپس آنے کے بعد بھی سیاست میں حصہ لیا تھا۔ یعنی ۱۹۷۰ء کے الیکشن میں پیپلز پارٹی کے لیے نغمہ کے بہن بھائیوں کے ساتھ مل کر کام کیا تھا جس کی بیگم احسن نے اجازت دے دی تھی۔ اگلے سال مئی ۱۹۷۱ء میں عین اپنی سالگرہ کے دن اسے الیاس کا بھیجا ہوا کارڈ ملا تھا جس پر اس کے خون کے چھینٹے تھے۔ ان نشانوں کی وجہ سے وہ ساری عمر سالگرہ کے دن کارڈ بھیجنے کے وعدے سے ایک ہی کارڈ بھیج کر سرخ رُو ہو گیا تھا۔ نیلی کو معلوم تھا کہ مشرقی پاکستان کے حالات نارمل نہیں ہیں۔ ۲۰ راگست ۱۹۷۱ء کو کراچی کی مسرور بیس (Base) سے بیس سالہ راشد منہاس کے ٹریننگ کے جہاز میں اس کا بنگالی انسٹرکٹر زبردستی بیٹھ گیا تھا اور جہاز کو بھارت کی سمت لے جا رہا تھا کہ راشد منہاس نے وہ جہاز گرا دیا تھا اور اس طرح دونوں ختم ہو گئے تھے۔ اس کے بعد

بنگالی ایئر فورس کے عملے کو گراؤنڈ کر دیا گیا تھا۔ راشد منہاس کو ملک کا سب سے بڑا اعزاز نشانِ حیدر دیا گیا تھا اور مطیع الرحمٰن اپنی حکومت کی نظر میں جرأت کے تمغے کا حق دار ٹھہرا تھا۔

۲۹ ستمبر کو پاکستان نے اقوامِ متحدہ سے اپیل کی تھی کہ جو لوگ خود کو بنگلہ دیشی کہتے ہیں انھیں پاکستان کا غدار تسلیم کیا جائے، مثلاً ایم آر صدیقی، جس کے خلاف مشرقی پاکستان میں مقدمات چل رہے ہیں۔ اس نے چٹاگانگ میں قتل گاہیں قائم کیں۔ صدیقی اس بات کا ذمہ دار ہے کہ Hypodermie Syringes کے ذریعے قیدیوں کے جسموں سے خون نکال کر بنگلہ دیش کے نام پر بلڈ بینک میں جمع کیا گیا وغیرہ — نومبر میں سرحدی جھڑپوں میں تیزی آئی۔ بھارت نے مکتی باہنی کے ساتھ مل کر مشرقی پاکستان کی سرحد کے اندر کئی حصوں پر قبضہ کر لیا تاکہ یہیں سے آگے بڑھ سکے اور شروع دسمبر میں بالآخر جنگ کا دیو مغربی اور مشرقی پاکستان میں دھم سے آ کودا۔

"یاد ہے۔" مینا نے پوچھا، "مارچ میں بارود کی بوشہر کی طرف سے آ رہی تھی مگر آج آسمان کی طرف سے آ رہی ہے۔"

"ہاں۔" ہریل نے آسمان کی طرف منھ اُٹھا کر کہا، "آثار تو اچھے نہیں ہیں، مگر اب کیا کیا جا سکتا ہے!"

۲/ اور ۳/ دسمبر کی درمیانی شب رات کے دو بجے بموں کی دھادھم سے لوگ چونک کر اُٹھے۔ بھارتی حملے کا خطرہ تو سر پر منڈلا رہا تھا۔ مزید تصدیق بی بی سی سے ہو گئی، جس نے چند منٹ کے اندر اندر بھارت اور پاکستان کے درمیان جنگ چھڑ جانے کا اعلان کر دیا۔

جن لوگوں نے جنگ نہ دیکھی ہو، ان کے نزدیک جنگ کوئی بہت ہی خواب ناک سی چیز ہوتی ہے، نُوری قسم کی، دُور سے چمکتی، صبح کے تارے جیسی۔ عزم و قربانی اور آزادی وغیرہ کے الفاظ ایک خوف ناک حقیقت کو خوب صورت دھند میں چھپا دیتے ہیں۔ نوجوانوں کے لیے خصوصاً جنگ میں لڑنے والے سپاہیوں اور جوان افسروں کے لیے جنگ و جدل کے قتل و خون کو ایک قسم کا رومان بنا دیا جاتا ہے جس کے نام ہی سے خون میں ابال آتا ہے۔ فوج میں ان لڑکوں کو بھرتی کیا جاتا ہے جن کی اٹھتی جوانیاں کچھ کر دکھانے کی آرزو میں کھولا رہی ہوتی ہیں۔ جن کے ہاتھ پاؤں کسی سے ہاتھا پائی کرنے کو ہمہ وقت آمادہ رہتے ہیں۔ ایسے میں ان کے سامنے ایک دشمن پیش کیا جاتا ہے، کوئی اَن جانی، قابلِ نفرت مخلوق، جسے مارنا اور تباہ کرنا ان کی زندگی کا مقصد ہے۔ چناں چہ اس 'دشمن' سے جسے کبھی وہ انسانی شکل و صورت میں اپنے خیالوں میں بھی نہیں دیکھتے، لڑنے جاتے ہوئے وہ خوشی سے

ناچتے ہیں، قہقہے لگاتے ہیں کیوں کہ جنگ ان کے لیے کسی محبوب کی طرح دل آویز بنا دی گئی ہے۔

میجر تجمل اور ساتھیوں نے جب بھرپور جنگ کی یہ خبر اگلے مورچوں میں بیٹھے بیٹھے سنی تو اُن پر اس قسم کی کوئی سنسنی طاری نہ ہوئی کہ وہ وصلِ محبوب سے قریب تر ہیں، اس لیے کہ وہ نومبر ہی میں جنگ سے گزر چکے تھے۔ جنگ اُن کے لیے ملک کے دفاع کا بے حد اہم کام تھا۔ جان سے عزیز تر سہی مگر اس میں کوئی رومان نہ تھا— پوری حقیقت تھی۔ گرمیوں کی دھوپ کی طرح روشن، صاف اور تکلیف دہ۔ انھیں معلوم تھا کہ لڑائی میں انسان خواب نہیں دیکھتا، وہ جاگتا ہے اور حال میں زندہ رہتا ہے، لمحے لمحے کے حال میں، گھنٹوں اور دنوں کے حال میں نہیں۔ ابھی برسٹ پھٹا، چار آدمی گرے، دو زخمی ہوئے دو اللہ کو پیارے ہوئے۔ ان میں سے ایک آپ بھی ہو سکتے تھے۔ آپ کا ذہن بڑے سکون سے ہر چیز قبول کر رہا ہے۔ اس کو اتنا کہنے کی فرصت نہیں کہ ''ایسا تو ہوتا ہے۔'' اسے یہ دیکھنا ہے کہ اگلا قدم کیا ہے۔ آیا زخمی اٹھا لیے گئے، پیچھے پہنچا دیے گئے۔ اگر حملہ شدید ہے تو شاید یہ سوچنے کی بھی فرصت نہ ہو، جو گزر رہا ہے وہ گزر رہا ہے۔ آپ اس کے بارے میں سوچنے کے اہل نہیں ہیں۔ آپ کا ذہن اور باتوں میں لگا ہوا ہے۔ دشمن کے ہوائی جہازوں کی آواز آ رہی ہے۔ ہمارا توپ خانہ کیا کر رہا ہے؟ اب کس کی طرف سے فائر ہو رہا ہے اور ہمیں کیا کرنا ہے— مجھے کیا کرنا ہے؟

نومبر کا وہ دن میجر تجمل کو خوب یاد تھا جس دن جنگ کی خوش خبری پہلے پہل سنی تھی۔ کالی گنج میں دوپہر کے کھانے کے بعد وہ چند ساتھی افسروں کے ساتھ تاش کھیل رہا تھا۔ کرنل مشرف ایک طرف بیٹھے چائے کی دوسری پیالی پی رہے تھے۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، رات کو بخار ہو گیا تھا۔ ڈیوٹی افسر نے بتایا کہ ڈویژنل ہیڈ کوارٹر سے فون آیا ہے۔ کرنل مشرف خود اُٹھ کر گئے اور واپس آ کر بتایا کہ رات کو غریب پور کی طرف کوچ کرنا ہے اور جو علاقہ دشمن نے ہڑپ کر لیا ہے، اس سے واپس لینا ہے۔

میجر تجمل کے جسم میں سنسنی سی دوڑی— جنگ کا رومان— وصلِ محبوب— ''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے سر! اگر مناسب سمجھیں تو مجھے موقع دیں۔''

''ہاں ضرور کیوں نہیں، تم فورس کمانڈر بن کر جاؤ گے۔'' کرنل مشرف نے کہا، ''رات کو نو بجے روانگی ہے۔ دو کمپنیاں جائیں گی۔ دلدار اور جواد تم اپنی کمپنیاں تیار کر لو۔''

''اوکے سر!'' دلدار اور جواد نے تاش میز پر چھوڑی اور اپنی کمپنیوں کو تیار کرانے کے لیے چلے گئے۔ سپاہیوں نے افسرانِ زیریں کی نگرانی میں اپنی اپنی تیاریاں شروع کر دیں۔ جھولا چترہ دُرست کیا جانے لگا۔ پانی کی بوتلیں بھری گئیں۔ خشک راشن اور مرہم پٹی کا سامان رکھا گیا۔ جب تیاری مکمل ہو گئی تو معائنہ ہوا۔ پہلے پلاٹون کی سطح پر، پھر کمپنی کے درجے پر— معائنے کے بعد تمام کام روز

مرّہ کے مطابق انجام پانے لگے تاکہ سپاہی غیر ضروری سوچ بچار کا شکار نہ ہونے پائیں۔ جنگ کا سحر ان کے ذہنوں میں برقرار رہے۔ روز کے مطابق شام کے کھیل انجام پائے۔ روز کی طرح رات کا کھانا ہوا۔ رات کے نو بجے فال اِن (fall in) ہونے کا حکم ہوا۔

رخصت کے وقت کرنل مشرف نے چھوٹی سی تقریر کی۔ جوانوں کا حوصلہ بڑھایا، انھیں افسروں کا حکم ماننے کی تلقین کی اور ان پر اپنے بھرپور اعتماد کا اظہار کیا۔ آخر میں میجر تجمّل کو بتایا گیا کہ حملے کے احکام انھیں بریگیڈ کمانڈر خود دیں گے۔

ریرا اسمبلی تک جوان ٹرک میں آئے جہاں رات بھر کا ٹھکانا ڈھونڈا۔۔۔ درختوں اور جھاڑیوں سے رات کو طرح طرح کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ان کی آمد سے پرندے اپنے گھونسلوں میں بے چین ہو گئے تھے۔ تالاب کے کنارے تاڑ، چھالیا اور ناریل کے درخت زیادہ تھے۔ ان سے ذرا ہٹ کر جہاں نباتات ذرا کم تھی، تھوڑے تھوڑے فاصلے پر پلاٹونوں نے قیام کا ڈول ڈالا۔ سب کے ہیور سیک پیٹھ پر، ٹوپیاں سروں پر اور بندوقیں ہاتھوں میں تھیں۔ کسی نے درخت سے پیٹھ لگالی۔ کوئی گھاس پر نیم دراز ہوا۔۔۔ کسی نے لوٹ لگانے کی ہمت کی۔ کوئی جاگا، کوئی سویا، کسی نے کہانی کہی، کسی نے سُنی۔ کوئی ماضی کے خیالوں میں کھویا رہا۔

کیپٹن جواد نے اپنی جیب سے بٹوہ نکالا۔ ہلکی غیر محسوس روشنی میں کوئی چیز دیکھنے کی کوشش کی۔ پھر واپس بٹوے میں رکھ کر بٹوہ جیب میں رکھ لیا۔

''کس کی تصویر ہے؟'' کیپٹن ضیا نے ہنس کر پوچھا۔

''بیوی کی اور محبوبہ کی۔'' کیپٹن جواد نے ٹھنڈا سانس بھرا۔

''ایک ہیں یا دو؟'' کیپٹن ضیا نے مذاق کیا۔

''تصویر ایک ہے، لڑکیاں دو ہیں۔'' کیپٹن جواد نے کہا۔

''بڑے خوش قسمت ہو کہ دونوں ایک تصویر میں ہیں، ورنہ بڑی مشکل ہوتی۔'' کیپٹن ضیا ہنس پڑا۔

وہ اسے مذاق سمجھ رہا تھا لیکن کیپٹن جواد کے لیے وہ دقیق لمحہ آچکا تھا جب جی چاہتا ہے کہ انسان اپنا راز کسی نہ کسی کو بتا دے۔ شاید غیر معمولی حالات کا بھی اس میں ہاتھ تھا۔

اس اندھیری طویل سوتی جاگتی رات میں جب سورج واقعی کروڑوں میل دُور لگ رہا تھا۔ کیپٹن جواد نے کیپٹن ضیا کو اپنی داستان سنائی تھی۔ وہ چار بہنوں کا چھوٹا اور لاڈلا بھائی تھا۔ اس کے والد اچھے خاصے کھاتے پیتے خاندان سے تھے اس لیے اس کے والدین اور بہنوں نے بچپن سے اس کے بڑے ناز نخرے اٹھائے تھے۔ فوج میں وہ اپنی مرضی سے آیا تھا اور شیزی سے اس کا نکاح بھی اس کی

مرضی سے ہوا تھا۔ مگر یکایک اُس کے والد کا انتقال ہوجانے اور بڑی بہن کی منگنی کے ٹوٹ جانے پر حالات بدل گئے۔ ماں کا کہنا تھا کہ کم از کم دو بہنوں کی شادی کے بعد وہ شیزی کی رخصتی کرائیں گی۔ والد کی وفات کے بعد ایک سال تک کسی کی شادی ممکن نہ تھی۔ شیزی نے میڈیسن میں داخلہ لے لیا، اور وہ وقتاً فوقتاً لاہور جا کر شیزی سے حقِ زوج مانگتا رہا جس پر ان کی اَن بن ہوگئی۔ یہاں تک کہ اب بہت دنوں سے اُنھوں نے ایک دوسرے کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ اس کا خیال تھا کہ شیزی کے والدین کی طرف سے طلاق کا مطالبہ آئے گا۔ وہ ذہنی طور پر اس کے لیے تیار تھا مگر اس محاذ پر مکمل خاموشی رہی، سوائے اس کے کہ شیزی کی امی کبھی کبھار فون کر کے پوچھتیں کہ وہ لاہور کیوں نہیں آتا، اور وہ کوئی نہ کوئی بہانہ کر دیتا۔

ڈھاکا آ کر وہ شیزی کی کزن بینا مرزا کے تیرِ نظر کا گھائل ہوگیا۔ وہ ہر لحاظ سے شیزی سے مختلف تھی۔ اس میں بے انتہا جنسی کشش تھی لیکن وہ بھی اس سے سیدھے منھ بات نہ کرتی تھی۔ رفتہ رفتہ نفرت اور محبت کی کشمکش کا ایک عجیب رشتہ اس کے ساتھ قائم ہوا جس میں جواد نے اس کی انا کو توڑنے کے لیے زبردستی اس کی محبت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ فوری اور جنونی جذبہ نہیں تھا بلکہ یہ جذبہ ایک عرصے سے اس کے اندر کہیں پرورش پا رہا تھا۔ نتیجتاً اسے بینو کے ساتھ دوسروں کے سامنے بھی شرمندہ ہونا پڑا۔ جس میں کیپٹن خالد بھی شامل تھا جو شمس الرحمٰن کے ساتھ اس گھر میں آیا تھا۔ کیپٹن خالد اس واقعے کی رپورٹ جواد کی یونٹ میں کرنا چاہتا تھا مگر سب کی صلاح کے بعد اسے منع کر دیا گیا تھا اور دو چار دن کے اندر بینو کی شادی ہوگئی تھی۔ پھر وہ بینو سے کبھی نہیں ملا تھا۔ اُس کی جیب میں ایک تصویر تھی جس میں شیزی اور بینو دونوں موجود تھیں۔ بہت دفعہ ہمت کی کہ اس تصویر کو پھاڑ کر پھینک دے لیکن نہ جانے کیوں وہ یہ بھی نہیں کر پاتا تھا۔

رات کے ایک بجے کا وقت تھا جب درختوں کے درمیان سے ایک جیپ کی بتیاں دکھائی دیں۔ یہ بریگیڈ کمانڈر کی جیپ تھی جو بہ نفسِ نفیس آپریشن آرڈر دینے آئے تھے۔ صبح چھ بجے حملہ کرنا تھا۔ اطلاع کے مطابق دشمن کی صرف ایک کمپنی اور چھ سات ٹینک تھے۔ دو کمپنیوں اور ٹینک کے ایک اسکواڈرن کے ساتھ انھیں شکست دے دینا مشکل نہ تھا۔

صبح نہایت حسین تھی۔ جس وقت اندھیرا اور اُجالا ایک دوسرے کو الوداعی بوسہ دے رہے تھے، درختوں میں بے شمار چڑیاں چہچہا رہی تھیں۔ تالاب میں مینڈکوں کا شور دوبارہ جاگ گیا تھا۔ سپاہیوں نے جلدی جلدی تیاری کر کے فارمنگ اَپ پوزیشن تک پہنچنے پر کمر کس لی تھی۔ سنگل فائل میں چلتے ہوئے سپاہی اور کنارے کنارے چلتے ہوئے ٹینک —— ٹینک پر جمے ہوئے گھاس کے تودوں اور چھل

جالیوں میں اٹکی ہوئی شاخوں کی وجہ سے وہ چلتے پھرتے درخت اور ٹیلے دکھائی دے رہے تھے۔ ٹینک پرانے تھے، زنجیروں پر چلتے ہوئے ان کی جھنکار ایسی تھی جیسے ان میں بہت سے ٹین بندھے ہوئے ہوں۔ پرانا ماڈل ہونے کی وجہ سے ان کے قوتِ بصری بھی مشکوک تھی، اور اسکواڈرن کمانڈر نے صاف کہہ دیا تھا کہ وہ ساڑھے چھ بجے سے پہلے حملے کے لیے تیار نہیں ہے۔

کچھ دیر بعد انھیں جھنڈا لیے گائڈ ملا۔ جس نے کیپٹن دلدار کی کمپنی کو دائیں جانب اور کیپٹن ضیا کی کمپنی کو بائیں جانب بھیج دیا۔ کچھ دور جانے کے بعد دو اور گائڈ ملے جنھوں نے آگے بڑھنے کا اشارہ دیا۔ آگے پہنچ کر وہ اسٹارٹ لائن میں پھیل گئے۔ اب دونوں کمپنیوں کا ایک مستطیل بن گیا تھا۔ اسٹارٹ لائن پر پلاٹون کمانڈر اپنے پلاٹونوں کے ساتھ تھے۔ ذرا پیچھے کمپنی کمانڈر اور مستطیل کے درمیان میں فورس کمانڈر میجر تجمل، بیٹری کمانڈر اور اپنے عملے کے دیگر لوگوں کے ساتھ تھا۔

ساڑھے چھ بجے حملہ ان کی طرف سے شروع ہوا تھا۔ فوراً ہی بھارتی علاقے سے توپ خانے کی بوچھاڑ اور مشین گن کا فائر ہونے لگا۔ ان کی توپیں بھی مار کر رہی تھیں۔ اس گولہ باری کی پناہ میں درختوں کی آڑ لے کر یہ آگے بڑھتے رہے۔ دشمن غریب پور سے پیچھے ہٹ گیا تھا۔ اسی وقت میجر تجمل نے دُوربین سے دیکھا کہ ایک منڈیر سی ہے جس پر بے شمار فوجی کالی پٹیاں پہنے بیٹھے ہیں۔ پہلی نظر میں وہ انھیں اپنی فرنٹیئر کور کے سپاہی لگے لیکن غور کرنے پر پتا چلا کہ وہ آسام رائفلز کے سپاہی ہیں۔ بریگیڈ ہیڈکوارٹر کو صورتِ حال بتائی تو انھوں نے جواب دیا، آگے بڑھتے چلے جاؤ جہاں تک بڑھ سکتے ہو۔

حکم کے مطابق وہ درختوں کی آڑ لے کر آگے بڑھنے لگے۔ ابھی اگلا دستہ بمشکل دو تین سو گز گیا ہوگا کہ سامنے سے جیسے جہنم کے دروازے کھل گئے۔ توپ کے گولوں نے ساری جگہ کو دھواں دار کر دیا۔ دائیں بائیں تڑتڑ آدمی گر رہے تھے۔ جو بھی آگے بڑھتا قضا کا شکار ہو کر نیچے گرتا دکھائی دیتا۔ میجر تجمل نے اپنے اردلی حضرت گل کو گرتے دیکھا۔ اس کے پیٹ میں گولے کا کافی بڑا ٹکڑا لگا تھا۔ میجر تجمل خود اس کے پاس گیا۔ اس کی نکلی ہوئی انتڑیوں کو اندر کر کے جھولے سے فیلڈ پٹی نکال کر اس کے زخم کو باندھا۔ حضرت گل مایوس مگر احسان بھری نظروں سے اپنے صاحب کی طرف دیکھتا رہا۔ شدتِ درد سے وہ بول نہیں سکتا تھا مگر اس کی نگاہوں میں تشکّر کے ساتھ التجا تھی۔ میجر تجمل نے اسے دلاسا دیا اور یقین دلایا کہ جب وہ اس علاقے سے نکلیں گے تو اسے ضرور پیچھے اسپتال تک پہنچائیں گے۔ اتنی دیر میں ایک ڈاکٹر بھی پہنچ گیا تھا۔ جس نے اسے مارفیا کا انجکشن دیا اور اسے اٹھا کر پیچھے مورچے میں پہنچا دیا گیا۔ اس پر نیم بے ہوشی کی کیفیت طاری تھی اور کمبل میں لپٹا چپ چاپ پڑا تھا۔

جب آگ اور دھوئیں کا زور کچھ کم ہوا اور شورِ محشر تھما تو زخمیوں اور مرنے والوں کی گنتی کی گئی۔

بیس سپاہی شہید ہوئے تھے۔ کیپٹن ضیا شدید زخمی تھا۔ زخمی زیادہ تھے اور اسٹریچر اٹھانے والے کم۔ میجر تجمل نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ درخت کی لکڑیوں اور رائفلوں سے اسٹریچر تیار کریں اور زخمیوں کو پیچھے لے جائیں۔ اس دوران میں دو بیل گاڑیاں نظر آئیں۔ کچھ نعشوں اور زخمیوں کو ان پر ڈال کر پیچھے بھیجا گیا۔

ہر پانچ دس منٹ کے بعد کوئی نہ کوئی حضرت گل کو جا کر دیکھ لیتا تھا۔ سارے احکامات سے فارغ ہو کر میجر تجمل حضرت گل کو دیکھنے آیا۔ پہلی نظر میں لگا کہ وہ گہری نیند سو رہا ہے۔ میجر تجمل نے نزدیک جا کر دیکھا، اُس کی آنکھیں بے نور ہو چکی تھیں۔ نبض پر ہاتھ رکھا، وہ ساکت تھی۔ تجمل نے اس کا چہرہ کمبل سے ڈھانپ دیا۔ اپنے شہر کوہاٹ سے ہزاروں میل دُور آج اس خدمت گزار حضرت گل کا چراغِ زندگی گل ہو چکا تھا۔ میجر تجمل کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ حضرت گل مر چکا ہے۔ اس کا دل چاہا کہ وہ اسے آواز دے کر دیکھے، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ سر کہہ کر سیلوٹ کرتا ہوا کھڑا نہ ہو جائے۔ میجر تجمل کی آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا۔ اس نے تو حضرت گل سے وعدہ کیا تھا کہ جب بھی وہ پیچھے جائے گا اسے اپنے ساتھ لے جائے گا۔

لیکن ان کو یہیں dig in ہونے کا حکم ملا۔ مورچے کھودے جانے لگے، اور اگلے حکم تک ڈیرے ڈال دینے کی تیاریاں ہونے لگیں۔ ان کے چھ ٹینک تباہ ہو چکے تھے۔ چار ٹینک دشمن اپنے علاقے میں لے گیا تھا۔ زخمیوں اور نعشوں کو لے جانے والے آدمی نئے اسلحہ و بارود اور تازہ کھانے کے ساتھ واپس چلے آئے تھے۔

تجمل نے چند سپاہیوں کو حکم دیا کہ حضرت گل کے مورچے کا راستہ پتھر اور مٹی سے بند کر دیا جائے۔ وہ اپنی ساری وفاداریوں، محبتوں اور عزم و استقلال کے ساتھ اس مورچے میں دفن ہو گیا۔ یہی مورچہ اس شہید کی قبر تھی۔

میجر تجمل کیپٹن ضیا کو اپنے تازہ بنے ہوئے بنکر میں لے آیا تھا۔ اس کے بدن پر کئی جگہ زخم تھے۔ وہ بنکر میں پڑا کراہ رہا تھا اور مستقل بولے جا رہا تھا۔ میجر تجمل کو معلوم تھا، باریسال میں ایک مرتبہ اس نے سیلاب میں گھرے ہوئے لوگوں کو بچایا تھا، اور پتلون کے اوپر سے جونکیں اس کی ٹانگوں پر چمٹ گئی تھیں۔ جس وقت پتلون اتاری تھی تو کھال بھی اس کے ساتھ اُتر گئی تھی۔ آج وہ اپنے زخموں کو ان جونکوں کے زخم سمجھ رہا تھا اور بار بار یہی تذکرہ کر رہا تھا۔

"کبھی سنا کرتے تھے سر، کہ جونکیں خون چوس لیتی ہیں، آج اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ ویسے سر مقامی لوگ بھی تو ہمیں جونکیں ہی کہتے ہیں، یعنی ہم ان کے خون پر پل رہے ہیں۔"

"اس کے ذہن پر اثر ہو گیا ہے سر، بہک رہا ہے۔" ڈاکٹر کیپٹن آزاد نے کہا۔

''میں جانتا ہوں۔'' میجر تجمل نے کہا۔ ''ذہین ہے، سوچتا ہے۔ شاعر مزاج اور حساس بھی ہے۔''

صوبے دار میجر نے باہر سے آن کر سلیوٹ کیا۔

''سر، درختوں میں ایک بوڑھا زخمی پڑا ہے۔ اسے اُٹھا لاؤں؟''

''کون ہے وہ؟''

''پتا نہیں سر، شکل سے بنگالی لگتا ہے۔''

''وہ مر چکا ہے۔ میں اُسے دیکھ چکا ہوں۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''نہیں سر، وہ مرا نہیں ہے، سانس باقی ہے۔'' صوبے دار میجر نے کہا۔

''اچھا یہاں لے آؤ۔'' میجر تجمل نے کہا۔

دو آدمی ایک بوڑھے کو لیے ہوئے آئے۔ وہ چار خانے کی رنگ اُتری چادر اور میلا سا سفید بنیان پہنے ہوئے تھا۔ سینے پر ایک کاپی دھری تھی۔ میجر تجمل نے وہ کاپی اٹھا لی۔

''واقعی سر، زندہ ہے۔'' ڈاکٹر حیران ہو رہا تھا۔ ''میں نے اسے اچھی طرح دیکھا تھا سر، یہ بالکل مر چکا تھا۔''

''موت کی تعریف کیا ہے؟'' کیپٹن جواد نے غصے میں ڈاکٹر کو چیلنج کیا۔

''موت کی تعریف! — موت کی تعریف یہ ہے کہ جس کے بعد انسان زندہ نہ ہو سکے۔'' ڈاکٹر نے بوڑھے پر جھکتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔

''ہاہا — '' کیپٹن ضیا کی آواز ان حالات میں بڑی پُراسرار بلکہ خوف ناک لگی۔

''زندہ وہ ہے جو مرا نہ ہو اور مرا ہوا وہ ہے جو زندہ نہ ہو سکے — ہاہا — ''

''ارے بھائی میرے، خدا کے لیے اس کو ایک مارفیا کا انجیکشن اور دے دو ڈاکٹر۔'' کیپٹن جواد اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

''یہ بوڑھا تو خلیل جبران معلوم ہوتا ہے۔ اس کی کاپی میں اُردو میں بڑی خوب صورت اور اندوہ ناک نظمیں لکھی ہوئی ہیں۔ کٹی انگلیوں کا نوحہ — بریدہ سروں کا ماتم۔''

''سر! یہ کاپی مجھے دے دیجیے، میرے پاس کچھ چھوڑ ہے، کھانا آنے تک وہ ہی کھاتے ہیں۔''

''نہیں نہیں، یہ تو بہت کام کی چیز ہے۔ حیرت ہے کہ کوئی بنگالی ایسی خوب صورت اُردو لکھے۔''

''سر! ایک بنگالی نے مجھ سے کہا تھا۔'' کیپٹن ضیا نے پھر بولنا شروع کر دیا، ''ہم تو اُردو کو قرآن کا رسم الخط سمجھتے تھے اور تمھاری زبان کو 'نبی کی بھاشا' کہتے تھے۔ اُردو میں لکھا ہوا ایک جملہ مل جاتا تھا تو اسے سر آنکھوں سے لگا کر اونچی جگہ رکھ دیتے تھے مگر اب — ''

''ضیا! میرا خیال ہے تم تھوڑی دیر کے لیے آنکھیں بند کر کے سونے کی کوشش کرو۔'' میجر تجمل نے کہا، ''بس سر۔'' کیپٹن ضیا نے فوراً آنکھیں موند لیں۔

میجر تجمل نے ڈاکٹر کو اشارہ کیا۔ اس نے اپنی سرنج ٹٹولی۔

میجر تجمل خون میں بھرے اوراق الٹتا پلٹتا رہا۔ بہت سی سطریں نہ پڑھی گئیں۔ ایک جگہ لکھا تھا: میں نے دُنیا میں انسانیت کا حسین ترین رُوپ محبت کی شکل میں دیکھا تھا اور آج مکروہ ترین روپ نفرت کی شکل میں دیکھ رہا ہوں۔ بھولی بھالی سکون آور موت بھی دیکھی تھی اور درندہ صفت عفریت جیسی موت بھی دیکھی۔ ایسی معصوم بچیوں کی موت جن کے کپڑے پہلے ان کی عصمتوں کے خون سے داغ دار ہوئے۔ ان بچوں کی موت جن کی چیخیں اس بات کی گواہ تھیں کہ ان کی ماؤں کی وہ چھاتیاں کاٹی گئیں جن میں دودھ اترتا تھا۔ یہ جو سیکڑوں، ہونہار صحت مند بچے موت کے گھاٹ اتارے گئے یہ کس گناہ کی پاداش میں؟ سارا صفحہ سوالیہ نشانوں سے بھرا ہوا تھا جن کے درمیان خون کے چھینٹے تھے۔ میجر تجمل بہت دیر تک ان سوالیہ نشانوں کو دیکھتا رہا، یہاں تک کہ وہ خون کے ان قطروں جیسے لگنے لگے جو تمام کاغذ پر سیکڑوں ہزاروں مُہروں کی طرح جمے ہوئے تھے یا جیسے ہزاروں لاکھوں ماتھے کی بندیاں—

''سو گیا— بالآخر—'' کیپٹن جواد نے ضیا کی طرف دیکھ کر ٹھنڈا سانس بھرا۔

''ہم افسروں پر بڑی بھاری ذمہ داری ہے، بہت بھاری ذمہ داری۔'' میجر تجمل نے کہا، ''تم نے وہ پُل دیکھے ہوں گے جن پر لکھا ہوتا ہے کہ یہ بیس ہزار ٹن بوجھ سہار سکتے ہیں لیکن ان پر سے اتنا وزن کبھی نہیں گزرتا۔ ہم وہی پل ہیں اور آج کل ہم پر سے وہ زیادہ سے زیادہ بوجھ گزارا جا رہا ہے جو ہم جھیل سکتے ہیں۔ یاد رکھو یہ بڑی آزمائش کا وقت ہے، اس میں ثابت قدم رہنا ہی تو اصل بات ہے۔''

بوڑھے کو اور ضیا کو ایک علاحدہ بنکر میں لے گئے تھے۔ آہستہ آہستہ باقی افسر بھی اپنے اپنے بنکروں میں چلے گئے تھے۔ چھالیا اور ناریل کے پتے چھائے یہ پختہ بنکر سپاہیوں نے بڑی محنت سے بنائے تھے۔ ان سب کے جانے کے بعد میجر تجمل نے سوچا تھا، کیپٹن ضیا کا ذہن اس بوجھ تلے جواب دے گیا ہے— جواد چڑچڑا اور غصیلا ہو رہا ہے۔ ڈاکٹر دواؤں اور گولیوں کا سہارا لے رہا ہے۔ اس نے ایسے کتنے ہی زخمی دیکھے ہوں گے جو کریٹ میں پڑی ٹوٹی رِستی بوتلوں کی طرح کسی خالی گھر یا ریسٹ ہاؤس میں پڑے تھے کہ کوئی خالی گاڑی ملے گی تو انھیں فیلڈ اسپتال پہنچایا جائے گا۔ ایسے گھروں میں خون چوکھٹ پر اس کا انتظار کرتا اور کتنے ہی زخمی کسی ڈاکٹر کی آمد کے انتظار میں ختم ہو چکے ہوتے۔

میجر تجمل کے مزاج کا توازن اور شدید احساسِ ذمہ داری اسے بچا لے گیا تھا۔ آج دسمبر میں بھرپور لڑائی چھڑ جانے کے بعد بھی وہ ذہنی طور پر اتنا ہی چاق چوبند تھا۔ کیپٹن جواد اب تک اس کے ساتھ تھا۔ بوڑھا جس نے اپنا نام مولانا بتایا تھا، ٹھیک ہو کر ڈھاکا جا چکا تھا۔ کیپٹن ضیا بھی آرام کرنے کے لیے کچھ دنوں کے لیے ڈھاکا بھیج دیا گیا تھا مگر اب وہ واپس آ چکا تھا۔ حضرت گل کی قبر پر وہ اب بھی روز فاتحہ پڑھا کرتا تھا۔

میجر تجمل نے گھڑی دیکھی، صبح کے چار بجے تھے، دسمبر کی ۶ر تاریخ تھی۔ آج رات یا صبح حملہ متوقع تھا۔ ان کے سامنے ڈیڑھ سو مربع کلومیٹر کا علاقہ آج بھی بھارت کے قبضے میں تھا۔ اس نے بارہا ان کے فوجی حصار کو توڑ کر آگے بڑھنے کی کوشش کی تھی مگر ناکام رہا تھا۔ لیکن آج اس کے ارادے خطرناک تھے۔ رات سے وہ حملے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ پیدل فوج بے اندازہ تھی۔ ٹینکوں کی نقل و حرکت کی آواز سے اندازہ ہوتا تھا کہ ٹینکوں کی ایک رجمنٹ کے ساتھ حملے کی تیاری ہے۔ میجر تجمل کے سی او کرنل مشرف آ چکے تھے اور اپنے افسروں اور سپاہیوں کے ساتھ چوکس بیٹھے تھے۔ عین چار بجے گولہ باری شروع ہوئی۔ گولہ باری اس قدر شدید تھی کہ موروچوں سے باہر نکلنا ممکن نہ تھا۔

صبح کی پہلی روشنی کے ساتھ چھ بجے پہلا حملہ ہوا جسے پسپا کر دیا گیا۔ دس بجے تک پے بہ پے حملے ہوئے اور ہر بار انھیں پسپائی کا سامنا ہوا۔ دس بجے کے قریب کرنل مشرف کے پاس دائیں فارورڈ کمپنی کے کیپٹن جواد کا فون آیا کہ سامنے سے تیزی کے ساتھ دشمن کے ٹینک آ رہے ہیں اور وہ کسی صورت انھیں روک نہیں سکیں گے۔ کرنل مشرف نے حکم دیا کہ مورچے خالی نہیں کیے جا سکتے، انھیں بہرحال وہاں بیٹھ کر مقابلہ کرنا ہے اور خدا کی طرف سے کسی بہتری کی اُمید لگائے رکھنا ہے۔

میجر تجمل نے اپنی نظروں کے سامنے ٹینک دائیں طرف سے گزرتے، جیسور کی طرف جاتے دیکھے اور یقین ہو گیا کہ پوری پلٹن کیپٹن جواد سمیت زندہ دفن ہو گئی ہے۔ کیپٹن ضیا بار بار اپنی آنکھیں ملتا۔۔۔ اسے محسوس ہوتا جیسے وہ اب بھی کیپٹن جواد کو خندق میں نشست کے انداز میں رائفل سنبھالے بیٹھا دیکھ رہا ہے۔ ایک گھٹنا ٹھوڑی سے ذرا نزدیک ہے، دوسرا ذرا دُور۔۔۔ وہ سامنے شست باندھے ہے اور اسی طرح بیٹھے بیٹھے اس پر چھت چھا دی گئی ہے۔ اس کا سانس بند ہو گیا پھر بھی وہ اسی پوزیشن میں بیٹھا ہوا ہے۔ جنگ کی پوزیشن میں۔۔۔ اپنے دشمنوں کو مارنے کی پوزیشن میں۔۔۔ اور دشمن انھیں مارے بغیر صرف خندق میں بند کرتا ہوا گزر گیا ہے، جس طرح حضرت گل کو اس کی خندق میں بند کر دیا گیا تھا۔ کیپٹن ضیا کا ذہن بد کے ہوئے گھوڑے کی طرح بے قابو جولانیاں بھر رہا ہے۔ وہ اسے روک نہیں سکتا۔ وہ اپنے دوست کو کندھا نہ دے سکا، اور اس پر مٹی نہ ڈال سکا تو کیا ہوا۔۔۔ سپاہی کے

لیے یہی موت اچھی ہے کہ وردی میں اپنی رائفل کے ساتھ مرے۔ اس کے کندھوں کے نشان، اس کا ہیلمٹ، اس کی پیٹی، ہیورسیک اور چھاگل سب اس کے ساتھ ہو۔ اس کی بیوی اور محبوبہ کی تصویریں بھی عزت کے ساتھ دفن ہو جائیں اور کسی کو کچھ پتا نہ چلے۔

دشمن نے دائیں طرف سے گزر کر پیچھے کی طرف سے جا کر انھیں گھیر لیا۔ سامنے سے اب بھی گولیاں برس رہی تھیں اور بچے کھچے لوگ اس کا جواب دے رہے تھے۔ ساڑھے تین بجے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کو اطلاع دی گئی کہ حملہ اس قدر شدید ہے کہ اسے روکنا بس میں نہیں۔ دشمن پیچھے بھی موجود ہے۔ وہاں سے پسپائی کا حکم ملا۔

فون کے ذریعے آگے کی کمپنیوں کو بتا دیا گیا کہ جب بھی کوڈ ورڈ ملے فوراً جھیل کی طرف پہنچنے کی کوشش کریں۔ سامنے، پیچھے اور دائیں طرف دشمن تھا، صرف بائیں طرف پسپائی ممکن تھی جدھر بہت بڑی جھیل تھی اور اندازہ تھا کہ سینے تک تو پانی ضرور ہوگا۔ ممکن ہے کسی جگہ زیادہ بھی ہو۔

گولیوں کی بوچھاڑ سانس نہیں لینے دیتی تھی۔ سپاہی برابر زخمی ہو رہے تھے۔ جن کو پیچھے بھجوانے کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ زخمیوں کی چیخ پکار، ہائے، واویلا، کوئی پانی کے لیے پکار رہا تھا۔ ان کی آوازیں توپوں کی گھن گرج اور مشین گنوں کی سنسناتی ہوئی صداؤں میں گم ہو کر رہ جاتی تھیں۔ کبھی مورچوں میں بیٹھے جوانوں کے نعرۂ تکبیر اور اللہ اکبر کی آوازیں گونجتی تھیں۔ کبھی کوئی سہما ہوا جانور دبکا ہوا نظر آجاتا تھا۔ پرندوں نے آج صبح سے اپنی زبان نہیں کھولی تھی، وہ سہمے ہوئے یا تو درختوں میں بیٹھے تھے یا منہ اندھیرے کسی محفوظ جگہ پرواز کر گئے تھے۔

دائرہ زیادہ تنگ ہونے لگا تو پسپائی کا کوڈ ورڈ دے دیا گیا۔ پچاس گز کے قریب ایسا علاقہ تھا جس میں سے گزر کر جھیل تک پہنچا جا سکتا تھا اور اس پر مشین گن کا فائر ہو رہا تھا۔ کمپنی کمانڈروں نے آواز کی سمت سے اندازہ لگا لیا تھا کہ کھلے ہوئے علاقے میں فائرنگ ہو رہی ہے لیکن وہاں سے گزرے بغیر چارہ نہ تھا۔ آخر بھاگ بھاگ کر درختوں کی آڑ لیتے ہوئے جھیل کی طرف جانے لگے۔ آہستہ آہستہ سب پہنچ گئے۔ باورچی، مشعلچی اور جمعدار وغیرہ بھی ان میں شامل تھے۔ سب سے آخر میں ہیڈ کوارٹر پہنچا۔

زنجیر کا دائرہ مکمل ہونے سے ذرا دیر پہلے کیپٹن ضیا اپنی جیپ کی قیادت میں ٹرک میں زخمیوں اور رہی سہی گاڑیوں کو لے کر نکلا۔ کسی کو معلوم نہیں تھا کہ ان سب کا کیا حشر ہوگا۔ عین ممکن تھا کہ وہ درمیان میں پس کر رہ جائے مگر گاڑیوں کی آواز سے اندازہ ہوا کہ وہ آہستہ آہستہ دشمن کی زد سے باہر ہو گئیں۔

جھیل کے کنارے آدھ گھنٹا انتظار کرنا تھا کہ جس کو آنا ہے وہ آ لے تو چلیں۔ روزِ محشر کی طرح

یہاں حساب کتاب بھی کرنا تھا کہ کون مرا اور کون جیا۔ اس وقت سب خاموش تھے۔ اپنے اپنے خیالات اور احساسات کے شکار۔ مورچے میں لڑتے ہوئے نہ مرے تھے تو کم از کم اب خیریت سے جیسور پہنچ جائیں، جہاں ان کا بریگیڈ ہیڈکوارٹر تھا۔ اب سب سے زیادہ خطرہ جنگی قیدی ہونے کا تھا اور اس کے لیے وہ کسی طرح تیار نہ تھے۔ جنگی قیدی بننا بذاتِ خود نہایت ہتک اور بے عزتی کی بات تھی، اور ایک مرتبہ دشمن کے وائرلیس پیغام کو سنتے ہوئے انھوں نے ایک بڑے جنرل کا پیغام سنا تھا: ''دیکھو، جنگی قیدی بالکل نہیں ہوں گے—'' اور اس سے انھوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا تھا کہ جو بھی دشمن کے ہتھے چڑھے گا اسے کُتّے کی موت مرنا ہوگا۔

ان خیالات کے ساتھ وہ جھیل میں اُترے۔ کنارے پر پانی قدرے کم تھا مگر آہستہ آہستہ زیادہ ہوتا گیا، ایک وقت آیا کہ پانی پستہ قد سپاہیوں اور افسروں کے سروں سے اونچا ہونے لگا۔ ایسے افسروں اور سپاہیوں کی تعداد زیادہ نہیں تھی۔ انھیں قد آور سپاہیوں نے بغلوں سے پکڑ کر ان کا سر پانی سے اونچا کیا اور سو دو سو گز لے جا کر جہاں پیر زمین سے دوبارہ لگے، چھوڑ دیا۔

جھیل میں جل کھمبی کی بیلوں نے جال بُن رکھے تھے۔ مچھلیوں کو زیادہ دُور نہ جانے دینے کے لیے جگہ جگہ لکڑیاں کھڑی تھیں جن کے آس پاس چھوٹے چھوٹے بھنور بن رہے تھے۔ کناروں پر بانس کے پودے اور گھنی جھاڑیاں تھیں۔ مارے تھکن کے سپاہیوں کے حواس جواب دے رہے تھے۔ اپنا بوجھ ہلکا کرنے کے لیے کسی نے ہتھیار پھینکے اور کسی نے ہیورسیک کا بوجھ اتار دیا کہ اب زندگی کا بوجھ لے کر چلنا بھی دوبھر ہوا جا رہا تھا۔ کسی کو یہ معلوم نہیں تھا کہ دسمبر کی اس رات میں جھیل کا پانی ٹھنڈا تھا یا گرم۔ کسی کو وقت کا احساس نہیں رہا تھا۔ بس اتنا معلوم تھا کہ رات آہستہ آہستہ گہری ہوتی جا رہی ہے۔ میجر تجمل اپنے ساتھیوں کو حوصلہ دینے کی کوشش کر رہا تھا، باقی سب خاموش تھے۔ دو تین میل لمبی چوڑی یہ جھیل ڈیڑھ گھنٹے میں عبور کی۔ خشکی میں چلنا شروع کیا تو گیلے کپڑوں اور انتہائی تھکن کے باعث چند قدم کے بعد ہی سب کو سخت سردی لگنے لگی۔ سردی کے اثر کو کم کرنے کے لیے تیز تیز چلنا شروع کیا— کپڑے تھوڑی دیر میں سوکھ گئے مگر سب کے بدن اکڑ کر رہ گئے۔

رات کے ڈیڑھ بجے جیسور پہنچے تو بریگیڈ ہیڈکوارٹر خالی تھا اور چوک پر یہ آرڈر لیے لوگ موجود تھے کہ پسپائی کھلنا کی طرف ہوگی۔ معلوم ہوا کہ بریگیڈ ہیڈکوارٹر سہ پہر کو ہی افراتفری میں خالی کر دیا گیا تھا۔ پانچ چھ کمروں کے ذاتی مکان میں بنایا ہوا یہ بریگیڈ ہیڈکوارٹر نہایت عجلت میں چھوڑا گیا تھا۔ آدھا کھانا کھایا ہوا پڑا تھا۔ ایش ٹرے میں ادھ جلے سگریٹ، کاغذات، نقشے اور فائلیں تک موجود تھیں۔ کرنل مشرف نے ان چیزوں کو جلانے کا حکم دیا۔ ادھ جلے بارود کے ڈھیروں میں ان

فائلوں اور نقشوں کو پھینک کر وہ سب کھلنا کی جانب بڑھے۔ ان کا خیال تھا کہ جیسور اس قدر جلدی میں خالی کیا گیا تھا تو ضرور کوئی نہ کوئی سبب ہوگا۔ شاید دشمن یہاں پہنچا ہی چاہتا ہوگا۔

صبح چھ بجے تک یہ سپاہی اسی طرح چلتے رہے جیسے کل کے پرزوں میں چابی دے کر چھوڑ دیا ہو۔ وہاں کسی اور یونٹ کے لوگ موجود تھے جو اپنے سپاہیوں کو 'کور' (cover) دینے کے لیے وہاں آئے تھے۔ ان کی پناہ میں ان سپاہیوں کو بھی آرام کرنے کا موقع ملا اور جس کو جہاں جگہ ملی، ڈھیر ہوگیا۔ ان کی تھکن، ان کی شدید بے بسی چہروں پر لفظ لفظ رقم تھی۔ میجر تجمل نے جنگ کی بہت سی فلمیں دیکھی تھیں۔ ان میں فوجوں کی پسپائی کے مناظر بھی دیکھے تھے۔ تھکے ہوئے بے جان سپاہی، چہروں پر گرد اور پسینے کی تہیں، بھاری جوتوں پر کیچڑ کا لیپ اور بکھرے ہوئے بال — لیکن ان سب سپاہیوں اور آج اس کے ساتھ آنے والے سپاہیوں میں اصل اور نقل کا فرق تھا — ان کی آنکھیں جو کہانی کہہ رہی تھیں، وہ بڑے سے بڑا ایکٹر سو مرتبہ مر کر زندہ ہونے کے بعد نہیں دکھا سکتا تھا۔

اس جنگ کے جو مناظر انھوں نے دیکھے تھے وہ کسی کے سامنے بیان کرنے کے قابل بھی نہیں تھے۔ انھوں نے اپنے سپاہیوں کو پھٹے پرانے جوتے پھینک کر مردہ دشمنوں کے پیروں سے موزے اور جوتے اتار کر پہنتے دیکھا تھا۔ اُن کو عین جنگ میں ایسے کھوکھلے بے روح قہقہے لگاتے سنا تھا جیسے ہوا کھنڈروں میں بے اثر ہوکر ٹوٹے دروں سے گزرنے کی کوشش میں چیخ رہی ہو۔

کمانڈنگ آفیسر جیپ میں بیٹھ کر آگے چلے گئے تھے۔ کھلنا چالیس میل دُور تھا مگر آہستہ آہستہ ان لوگوں نے پھر چلنا شروع کر دیا تھا، شاید دشمن تعاقب میں چلا آ رہا ہو۔ سرسوں کے تیار کھیت یوں معلوم ہوتے تھے جیسے ہر طرف سبز قالین بچھے ہوں جن پر پیلے پھولوں کے نقش و نگار بنے ہوں مگر افسوس یہ قالین ان کے لیے نہیں تھے۔ جب دشمن کے ہوائی جہاز بمباری کرتے تو یہ سڑک کے کنارے نالیوں میں یا کھیتوں میں پناہ لیتے اور ان کے جانے کے بعد پھر آگے بڑھتے۔ پونے گیارہ بجے گاڑیاں انھیں لینے آئیں جن میں سوار ہوکر یہ کھلنا پہنچے۔

Killed in action کی خبر بریگیڈ ہیڈکوارٹر، ڈویژنل ہیڈکوارٹر اور جنرل ہیڈکوارٹر تک کوئی نئی بات نہ تھی۔ روز ایسے سیکڑوں نام انھیں ملتے تھے۔ جنرل ہیڈکوارٹر کے پرسنل ڈائریکٹریٹ سے کتنے ہی ایسے رجسٹرڈ خط روز روانہ کیے جاتے تھے۔ ان کے لیے محض ایک خبر تھی، چھوٹی سی خبر۔

مگر جب یہ رجسٹرڈ خط کیپٹن جواد کی والدہ نے کھولا اور پڑھا تو اُن کے لیے یہ خبر نہیں تھی ایک بہت بڑا سانحہ تھا، ایک المیہ تھا جس نے اس گھر کی بنیادیں ہلادیں۔ اکلوتا، لاڈلا، من مانی کرنے والا ان سب کا پیارا دیارِ غیر میں اپنی جان کھو چکا تھا اور یہ سب اس کی آخری دید سے بھی محروم رہ گئے تھے۔

سب اس کنبے پر ترس کھا رہے تھے، خصوصاً اس کی جوان جہان خوب صورت بیوہ پر جس کو سسرال میں قدم رکھنا بھی نصیب نہیں ہوا تھا۔

سابق میجر ظاہر کو کلکتہ کے آرمی ہیڈکوارٹر سے بلاوا آیا تھا۔ وہ پس و پیش کر رہا تھا۔ قادر نے اسے یہ کہہ کر قائل کرلیا کہ ایسے حالات میں جب مکتی باہنی اور بھارتی فوج مل کر پاکستانی فوج کو شکست دینے والے ہیں، کسی بھی ایسے کام میں پس و پیش نہیں کرنا چاہیے جو دیش کے لیے ہو، خواہ وہ بھارتی فوج کے ماتحت لڑنا ہی کیوں نہ ہو۔

آرمی ہیڈکوارٹر جہاں سے بنگلہ دیش کے سارے آپریشن ہو رہے تھے، فورٹ ولیم قلعہ میں بنایا گیا تھا۔ عجب اتفاق ہے، ظاہر نے سوچا کہ اسی قلعے کے اندر فورٹ ولیم کالج سے اُردو نثر کی ابتدا ہوئی تھی۔

ظاہر کو جس کام کے لیے بلایا گیا تھا وہ یہ تھا کہ تنگیل کے علاقے میں پیراٹروپر

(paratrooper) اتارنے تھے۔ اوّل تو ظاہر کو اس کا تجربہ تھا دوسرے وہ تنگیل میں ہونے کی وجہ سے وہاں کے چپّے چپّے سے واقف تھا اور پاکستانی فوج کے ٹھکانوں کا بھی اسے خوب اندازہ تھا۔ یہ کام ظاہر کی طبیعت کے عین مطابق تھا۔ اس لیے اس نے فوراً ہامی بھرلی۔ چھاتا بردار فوج کو ۱۱ر دسمبر کو اترنا تھا۔ ابھی کئی دن باقی تھے اس لیے اس نے فیصلہ کیا کہ جو کانوائے (convoy) جیسور جارہا ہے، اس کے ساتھ جیسور کی سیر کرآئے۔ کلکتہ کے فورٹ ولیم میں ۶ر دسمبر کی جیسور کی فتح کے بہت چرچے تھے۔ ۸ر دسمبر کو غیر ملکی صحافی، ٹیلی وژن کا عملہ اور مجیب نگر کی حکومت کے صدر اور وزیراعظم وہاں جارہے تھے۔ اس کانوائے کے ساتھ ظاہر کے جاننے والوں میں میلوحق اور شمس الرحمٰن بھی تھے۔ میلو کا مقصد باریسال جاکر اپنی پھوپھی سے ملنا تھا۔ شمس الرحمٰن صحافی کی حیثیت سے آیا تھا۔ ظاہر، اکرام الحق کے ساتھ کئی مرتبہ اس سے مل چکا تھا۔ اس وقت وہ سب گرینڈ ہوٹل کلکتہ کے سامنے چلنے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ شمس الرحمٰن کچھ تذبذب میں تھا کہ وہ جو یک جہتی کا مقصد لے کر مشرقی پاکستان آیا تھا، آج بھارتی فوج اور غیر ملکی نامہ نگاروں کے ساتھ مکتی باہنی کی رہنمائی میں سفر کررہا تھا۔

''بھائی، حالات مشین کی کل نہیں ہوتے کہ چلا دی تو چل پڑے اور روک دی تو رُک گئے۔ یہ تو جب ایک دفعہ کوئی رُخ اختیار کرلیتے ہیں تو ہمارا ان پر بس نہیں رہتا۔ میں تو پاکستانی فوج سے بھاگ کر یہاں آیا ہوں مگر میرے ضمیر میں کوئی خلش نہیں ہے بلکہ میں فخر کرتا ہوں۔'' ظاہر نے کہا۔

غیر ملکی نامہ نگار ایڈورڈ اسے سمجھا رہا تھا، ''شادی فرد سے ہوتی ہے نظریے سے نہیں ہوتی۔ میرے ایک ساتھی کی بیوی فلپینو ہے، دوسرے کی جاپانی ہے۔ پاکستان کے جی او سی ایسٹرن کمانڈر اپنے ساتھ جس رپورٹر کو ہیلی کاپٹر میں بٹھا کر لے گئے تھے اور جس کا بہت چرچا ہوا تھا، وہ امریکن ہے اور اس کا شوہر فرانسیسی۔''

''سوال یہ ہے کہ تم امریکن ہوکر کسی روسی سے شادی کرلوگے؟'' شمس الرحمٰن نے پوچھا۔

''عین ممکن ہے۔'' امریکن نے ہنس کر بات ٹال دی۔

''بات یہ ہے کہ شادی نہ محض جسمانی ہوتی ہے نہ محض نظریاتی۔ یہ دونوں کے درمیان ایک غیر محسوس سنگم ہوتا ہے۔'' ظاہر نے کہا، ''اگر تمھارے نظریے بدل گئے تو یہ کوئی غیر فطری بات نہیں ہے۔ ہم سب آہستہ آہستہ اس طرف آتے ہیں۔ تم بتاؤ ایڈورڈ تمھارا کیا خیال ہے؟''

''ہاں — میں بھی رفتہ رفتہ اس بات کا قائل ہوا کہ اب بنگلہ دیش بن ہی جانا چاہیے۔ میرا خیال ہے بھارت نے عالمی رائے کو اپنی طرف کرنے کا کام بڑے سلیقے سے کیا۔ بھارت میں جمہوری حکومت ہے اس نے بھی بہت مدد کی۔ لوگ پوچھتے ہیں مارشل لا میں کیا خرابی ہے؟ انھیں معلوم نہیں

کہ مارشل لا میں کسی کو پتا نہیں چلتا کہ کہاں کیا ہو رہا ہے، کون کر رہا ہے۔ غلطیوں کا ذمہ دار کون ہے؟ آج پاکستانی فوج ہر جگہ ٹکڑیوں میں لڑ رہی ہے۔ عام آدمیوں کو قطعی نہیں معلوم کہ کیا ہو رہا ہے؟ مغربی پاکستان میں ہر شخص سمجھ رہا ہے کہ وہ ہر جگہ جنگ جیت رہے ہیں۔

صبح چھ بجے یہ کانوائے روانہ ہوا۔ آگے سیکورٹی کی گاڑی، بنگلہ دیش کے صدر کے پیچھے نذر الاسلام اور وزیراعظم تاج الدینؔ کی گاڑی۔ اس کے بعد کئی جیپیں اور مائیکروبس، جن میں غیر ملکی صحافی کیمروں کے ساتھ سوار تھے۔ سڑک کے دونوں طرف شرنارتھیوں کے خیمے تھے جن میں سے بچوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ دسمبر کے کہرے میں یہ کانوائے آہستہ آہستہ چلتا رہا۔ میلو، ظاہر اور شمس الرحمٰن اکٹھے بیٹھے تھے اور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔

''جس طرح ایسٹرن کمانڈ کے ہیڈکوارٹر کے نقشے پر روز نشانات لگائے جاتے ہوں گے اسی طرح ہیڈکوارٹر میں بھی روز کے روز نقشوں پر نشانات لگائے جاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ہمیں سوفی صد سچی خبریں نہ ملتی ہوں پھر بھی قادر کی 'انٹیلی جنس' سروس خاصی تیز ہے۔'' ظاہر نے کہا، ''پاکستانی فوج ہر سیکٹر میں مستقل پیچھے ہٹ رہی ہے۔ ناٹور سیکٹر میں کری گرام اور لال منیر ہاٹ کی چوکیاں چھوڑیں۔ اسپیشل ٹرین چلا کر رنگ پور پہنچ گئے، ٹھاکر گاؤں سے منڈل پارہ ڈولر سے دیناج پور۔ برہمن بڑیا سیکٹر میں اکھوڑ کے جنوب میں گنگا ساگر، ملک باری لاناسر کی چوکیاں چھوڑیں۔ برہمن بڑیا سے بھیرب بازار بھاگے۔ مکتی باہنی کے خوف سے بھیرب بازار کا پکا پُل توڑا۔ میمن سنگھ کے علاقے میں کمال پور، نقشی، بیرو باری کی چوکیاں خالی کر کے میمن سنگھ چلے گئے۔ بخشی گنج سے بٹالین ہیڈکوارٹر شیر پور پہنچا ہے۔ ہمارے علاقے میں تو پاکستانی فوج اس طرح بھاگی بھاگی پھر رہی ہے کہ بے چاروں کو کہیں جائے پناہ نہیں۔ ہم تو جگہیں بدلتے رہتے ہیں مگر وہ مارے ہیبت کے مادھو پور کے جنگل کے نزدیک سے نہیں گزرے۔ سلہٹ میں بھی ان پر بُری گزری۔ بٹالین ہیڈکوارٹر کہاں اور کمپنیاں کہاں، کسی کو کسی کا پتا نہیں۔ اِدھر سے اُدھر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ بظاہر سب کی کوشش یہی ہے کہ کسی طرح ڈھاکا پہنچ جائیں مگر ہم لوگوں کی پوری کوشش یہی ہے کہ وہ کسی طرح ڈھاکا نہ پہنچنے پائیں۔ پورے صوبے میں جہاں بھی وہ ٹھہر گئے ہیں یہ ان کا کمال نہیں ہے بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ وہ وہیں رہیں۔ ان کی راہ روکنے اور انھیں مصروف رکھنے کے لیے ہر جگہ تھوڑی سی فوج، بورڈر فورس اور مکتی باہنی کے لوگ ہیں جو انھیں آگے پیچھے دوڑاتے رہتے ہیں۔''

''ہم اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں۔ ہم میں ان سے کہیں زیادہ جذبہ ہے۔ ان کے پاس کوئی 'کاز' نہیں ہے۔'' میلو نے کہا۔

''بلکہ میں تو کہوں گا کہ ان کو خود اپنے 'کاز' پر یقین نہیں ہے۔ آہستہ آہستہ وہ بھی قائل ہو گئے ہیں کہ ہم ٹھیک کر رہے ہیں۔ ان کے ایمان میں کمی آ گئی ہے۔ ایمان میں کمی آ جائے تو آدمی لڑ نہیں سکتا'' ظاہر نے کہا۔ ''وہ صرف مدافعتی جنگ لڑ سکتا ہے اور ایک دفعہ پسپائی شروع ہو جائے تو آدمی آخری دیوار پر چلا جاتا ہے۔''

بھارت اور پاکستان کی سرحد پر پہنچے تو آگے ایک مائن سویپر (Mine Sweeper) چلنے لگا۔ راستے میں جو گاؤں آ رہے تھے، ان کے مکان، دکانیں سب خالی تھیں۔ سڑکیں سنسان تھیں البتہ کہیں کہیں نعشیں پڑی نظر آتی تھیں۔ جیسور کے نزدیک لوگ ٹرکوں، موٹر سائیکلوں اور گاڑیوں پر سوار جے بنگلہ کے نعرے لگا رہے تھے۔

پاکستانی فوج کا بریگیڈ ہیڈکوارٹر خالی پڑا تھا۔ گولہ بارود کے ذخائر، نقشہ جات اور فائلیں اب تک سلگ رہی تھیں۔

بھارت کی مدراسی رجمنٹ نے جیسور پر قبضہ کیا تھا۔ آگے جا کر کھلنا کے مضافات میں پاکستانی فوج سے پھر لڑائی ہوئی تھی۔ میجر تجمل اور ساتھیوں نے آٹھ سے گیارہ تاریخ تک وہاں مورچہ بندی کی تھی اور ۱۱ دسمبر کو پھر ایک بار بھارتی فوج کے ایک حصے کو ایک جگہ روکے رکھنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ باقی فوج ڈھاکا کی طرف روانہ ہو گئی تھی۔ دریائے میگھنا کے پل کے دو span ٹوٹے ہوئے تھے۔ سیکڑوں گاؤں والے کشتیاں اور بجرے لے کر آ پہنچے تھے۔ سپاہیوں اور ہلکے ہتھیاروں کو دریا کے پار اتار دیا تھا اور ٹینکوں کو کشتیوں کے ذریعے کھینچ کر اور پیچھے سے دھکا دے کر پار کروا دیا تھا۔ جب بھی کوئی دریا آتا تھا، بھارتی انجینئر کور کے جوان منٹوں میں اس پر بیل پل یا پون ٹون برج بنا دیتے تھے اور اس کے کناروں پر سڑک تعمیر کر دیتے تھے، اس لیے کہ سارا کھیل وقت کا تھا۔ اِس سے پہلے کہ پاکستان کی مدد کے لیے کوئی آئے یا اقوامِ متحدہ میں جنگ بندی کا فیصلہ ہو، ڈھاکا پہنچ کر ہتھیار ڈلوا دینا مقصود تھا۔ بھارت کو معلوم تھا کہ ڈھاکا کے دفاع کے لیے پاکستانی فوج نہیں ہے اور چاروں طرف سے وہاں پہنچنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارنے والے جگہ جگہ بھٹک رہے ہیں۔ میمن سنگھ اور آشوگنج سے بڑھنے والے پاکستانی بریگیڈ کو ڈھاکا پہنچنے سے روک دیا گیا تو بس کام بن گیا۔

بارسوفیٹ کی بلندی سے بارہ ناٹ فی گھنٹا چلنے والی ہوا میں پیراشوٹ سے اُترتے ہوئے ظاہر کی پٹل سے کہی گئی بات یاد آ گئی کہ وہ جس گھر میں ہوگی وہ پیراشوٹ سے سیدھا وہاں اُترے گا۔ فضا میں لٹکے لٹکے وہ مسکرایا اور اپنے چاروں طرف دیکھا۔ فضائے بسیط میں اُوپر نیچے ساری جگہ چھتریاں چھائی ہوئی تھیں۔ تیز ہوا کی وجہ سے یہ یقیناً زیادہ جگہ لیں گی۔ ظاہر نے سوچا۔ مقامی لوگ چارخانے کی لنگیاں اور بنیان پہنے انھیں پُرشوق نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ چھاتا بردار درختوں اور گھر کی چھتوں پر اُترتے تو یہ لوگ فوراً انھیں کندھوں پر بٹھا کر اتار لیتے۔ پوکھروں اور جھیلوں میں چھلانگیں لگا کر وہ ہتھیار نکال لاتے جو اوپر سے گرائے گئے تھے۔ ظاہر بھی ایک تالاب میں اُترا اور پانی جھٹکتا باہر نکلا۔ بنگالیوں نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا اور اپنے گھر لے جا کر کھانا کھلانے کی پیش کش کی۔ جب ظاہر نے انکار کیا تو سارے چھاتا برداروں کے لیے دال بھات پک کر وہیں پہنچ گیا۔ اس وقت تک اندھیرا ہو چکا تھا۔ مقامی لوگوں کی رہنمائی میں وہ سب اکٹھے ہوئے۔ ان کی گنتی ہوئی، حاضری لی گئی اور ان کے کام انھیں بتائے گئے۔

ان کا ایک کام پُل اور فیری اسٹیشن پر قبضہ کرنا تھا۔ دوسرا کام تنگیل پر قبضہ کرنا اور تیسرا کام قادر باہنی سے مل کر جمال پور سے آنے والی انڈین بریگیڈ کے ساتھ ڈھاکا کی طرف پیش قدمی تھی۔

پاکستانی فوج کے بریگیڈیئر قادر اور ان کے اسٹاف آفیسر نے تنگیل کے سرکٹ ہاؤس میں کھڑے ہوئے شمال اور جنوب میں اُترتی ہوئی چھاتا بردار فوج دیکھی۔ میجر سرور نے اطلاع دی کہ

مقامی لوگوں کا خیال ہے کہ یہ چینی سپاہی ہیں۔ پاکستانی افسر تو اس خبر پر یقین نہ کر سکے لیکن اس افواہ کو مقامی لوگوں نے خاصی ہوا دی تاکہ پاکستانی سپاہی، جو دوست ملکوں اور غیبی امداد کی آس لگائے ہوئے ہیں، اس پر یقین کرلیں اور اطمینان سے بیٹھے رہیں۔ ۱۰ر دسمبر سے ۱۳ر دسمبر تک چین اور امریکا کی مدد کی آس کا ایک ایسا وقت ضرور آیا تھا جب پاکستان کا عام شہری اور سپاہی ہی نہیں، دانش ور، سیاست دان، فوجی افسر، یہاں تک کہ ایسٹرن کمانڈ کے کمانڈر جنرل نیازی بھی اس خوش فہمی میں مبتلا رکھے گئے تھے کہ دوستوں کی مدد اب آئی کہ آئی۔

۹ر دسمبر تک ایسٹرن کمانڈ نے جی ایچ کیو کو دھوکے میں رکھا تھا اور دشمنوں کے دانت کھٹے کرنے کی داستانیں پہنچائی تھیں۔ ۷ر دسمبر کو گورنر مالک نے صدرِ پاکستان کو صحیح صورتِ حال سے آگاہ کیا مگر انھوں نے پروا نہ کی۔ ۹ر دسمبر کو جب جنرل نیازی نے آنسوؤں سے رونے دھونے کے بعد تشویش بھرا سگنل بھیجا تو جی ایچ کیو نے موقع محل دیکھ کر مناسب کام کرنے کی ذمہ داری گورنر مالک کو سونپ دی۔

میجر جنرل راؤ فرمان علی نے اقوامِ متحدہ سے درخواست کی کہ وہ پاکستانی فوجیوں کو نکالنے کا انتظام کرے اور منتخب شدہ ممبران کو حکومت بنانے کی دعوت دے دے لیکن مغربی پاکستان سے اعلان کر دیا گیا کہ اس قسم کی کوئی سرکاری اپیل نہیں کی گئی ہے۔

اب جی ایچ کیو کی باری تھی کہ ایسٹرن کمانڈ کو دھوکے میں رکھے۔ مزید وقت حاصل کرنے کے لیے ان سے کہا گیا کہ شمال سے زرد دوست مدد کے لیے پہنچ رہے ہیں اور سفید دوستوں کا بحری بیڑا بحرِ ہند سے خلیج بنگال کی طرف بڑھ رہا ہے۔ وقت اس لیے حاصل کیا جارہا تھا کہ شاید پاکستان کا نمائندہ اقوامِ متحدہ کی اسمبلی میں جنگ بندی کا فیصلہ کروانے میں کامیاب ہو جائے لیکن مغربی پاکستانی اس خوش فہمی میں تھے کہ مشرقی پاکستان چند دن جنگ جھیل گیا تو پاکستانی فوجیں کشمیر فتح کرلیں گی۔

ڈھاکا میں تین طرف سے بھارتی فوجیں تیزی سے بڑھ رہی تھیں، وہاں باقاعدہ پاکستانی فوج کے صرف ڈیڑھ ہزار افراد تھے، جن کو یہ بتانا کہ لینن گراڈ کا محاصرہ نوے دن رہا تھا، بے سود تھا۔

نواب پور میں اکرام الحق کی نانی اپنے کمرے میں بیٹھی تسبیح پڑھ رہی تھیں۔ ان کی بوڑھی کمزور ملازمہ منوتی جو آج کل اُن کے پاس آئی ہوئی تھی، تخت سے ٹیک لگائے زمین پر بیٹھی تھی۔

دادا کی لائبریری میں کھڑی بلقیس، جیتو اور بیٹو پریشان ہو رہی تھیں کہ اب اتنی ڈھیر ساری اُردو کتابوں کا کیا ہوگا؟

''یہ کتابیں ہمیں betray کریں گی۔'' بیٹو نے ہولی کراس (Holy Cross) کالج میں شاید یہ لفظ نیا نیا سیکھا تھا۔ نانی کا جی چاہا ایک تھپڑ جا کر بیٹو کے لگائیں— ''betray کی بچی، بڑی انگریزی داں بن رہی ہے، کیا میری اُردو کی کتابیں غدار ہیں؟ میر جعفر کی ساتھی ہیں یا یہودی ہیں؟'' مارے غصے کے اُن کا ذہن اُلجھ کر رہ گیا۔

''دادی جان سے کتنی مرتبہ کہا تھا کہ ہم تو انھیں پڑھ نہیں سکتے۔ ایشیاٹک سوسائٹی لائبریری کو دے دیں۔'' بلقیس بولی، ''مگر انھیں دُنیا میں کوئی چیز پیاری ہے تو یہ اُردو فارسی کی کتابیں اور رسالے ہیں۔''

''اب تو جان پر بن گئی ہے۔ اب یا تو گھر جلے گا یا کتابیں جلیں گی۔'' نیتو بولی۔

نانی جان اندر سے کھول گئیں، ٹھیک ہے اگر کتابیں جلانی ہی پڑیں تو— مگر اتنی بے حسی کیوں!— جلانے کو آدمی گھاس پھونس بھی جلاتا ہے اور اپنے عزیز کی ارتھی بھی جلاتا ہے مگر احساس بھی کوئی چیز ہے، اس آج کل کی نسل کو ہوا کیا ہے۔

''دیکھو میں پھر کہتی ہوں کہ ان کتابوں کو نیچے تہہ خانے میں ڈال دو یا گاؤں بھجوا دو، آخر وہاں

بھی تو اتنی کتابیں ہیں۔'' نانی نے ایک بار اور کتابوں کی جاں بخشی کی کوشش کی۔

''گاؤں بھیجنا ناممکن ہے اس زمانے میں اور تہہ خانے میں ڈالنا بہت بڑی رِسک ہے، سوچ لیجیے۔'' بلقیس بولی۔

''اچھا تو جلا دو سب کو ایک ہی دفعہ — پاپا کاٹو۔'' نانی سر تھام کر تخت پر ٹِک گئیں۔

پوتیوں نے ذرا بھی نہ سمجھا کہ غصّے سے کہہ رہی ہے۔ بیشو جھٹ سے ماچس کی ڈبیا اٹھا لائی۔ باقی دونوں شیلف سے کتابیں اُٹھا اُٹھا کر زمین پر رکھنے لگیں۔ بیشو کے انداز میں وہ تیزی اور لپک تھی جیسے کسی جلسے کا افتتاحی ٹیپ کاٹ رہی ہو یا بین الاقوامی عورتوں کے جلسے میں پہلی شمع روشن کر رہی ہو۔

نانی نے ہاتھوں سے سر اٹھایا تو ان کے سامنے اپنے بابا جان کی سوانح کو آگ لگائی جا چکی تھی۔ کم بخت کو سب سے پہلے اپنے پردادا کی سوانح ہی ملی جلانے کو — ان کا ذہن کھولنے لگا۔ پھر انھیں یاد آیا کہ بیشو تو اُردو سے قطعی ناواقف ہے، اس بے چاری کو کیا معلوم کہ یہ کون سی کتاب ہے۔ وہ بے تحاشا جھپٹیں اور جلتے اوراق سمیت کتاب کو اٹھا کر اس کے پہلے ورق چاٹتے شعلوں کو اپنے ہاتھوں سے بجھانے لگیں۔ ان کی انگلیوں کے پورے جل گئے — بلا سے — دل کیا کم جلا ہوا ہے — انھوں نے اپنے پلّو کا گولا بنایا اور جھلستے صفحے اس سے بجھانے لگیں۔

''یہ میرے بابا کی سوانح ہے۔'' انھوں نے کہا، ''اسے میں اپنے ٹرنک میں کپڑوں کے نیچے رکھ لوں گی اور کسی نے پوچھا تو کہہ دوں گی کہ یہ میری کتاب ہے، اس کا ان لڑکیوں سے کوئی تعلق نہیں ہے، نہ ہی میرا اور ان کا کوئی رشتہ ہے — مجھے پکڑ کر لے جاؤ اور سولی چڑھا دو۔''

''اوہ سوری، سو سوری — دادی پلیز۔'' بیشو نے اُٹھ کر نانی کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

''ماں! مجھے کیا پتا تھا کہ یہ دادا کی بایوگرافی ہے۔ ٹھہرو، میں برنول لاتی ہوں۔'' وہ نانی کی انگلیوں کی مرہم پٹی کرنے لگی۔ بلقیس اور جیتو تن دہی سے کتابیں چھانٹتی رہیں۔ ''تہذیبِ نسواں'' اور ''عصمت'' کے فائل۔ مصورِ غم راشد الخیری کی کتابیں، ''صبحِ زندگی''، ''شامِ زندگی''، ''آمنہ کا لعل'' — ہیں یہ کیا! — وہ دوبارہ لپکیں — وہ اپنے بابا کی سوانح بچالیں گی تو کیا ''آمنہ کا لعل'' — ان کے منھ میں خاک — ایسی کتابیں راکھ ہونے سے پہلے وہ اپنی خاک ہوا میں اُڑا دیں گی۔

''یہ کتاب — یہاں لا کر رکھو۔'' انھوں نے تحکمانہ کہا۔ جیتو نے جسے اُردو آتی تھی، کتاب کا نام دیکھ کر کتاب لا کر ان کے پاس رکھ دی۔

''اور یہ کامریڈ کے پرچے؟'' اب وہ سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔

''جلا دو انھیں بھی — ان سے affiliation کا اندازہ تو ہوگا۔''

''ارے بے وقوفو!'' نانی کا جی چاہا بیٹو کے لمبے بال کھسوٹ کر ایک جھانپڑ لگائیں، ''جاہلو! اُس زمانے میں سارے بنگال کی affiliation ان ہی کے ساتھ تھی۔'' آج کی نسل اپنے پرکھوں کی تاریخ سے ڈر رہی تھی۔ جس نسل نے انھیں اس قابل بنایا کہ وہ آزاد فضا میں سانس لے سکیں اور آج آزادی کا مطالبہ کر سکیں۔ جل جانے دو سب کو — یہ نسل ہے ہی اس قابل کہ اس کو ورثے میں کچھ نہ ملے۔ غصے سے کھولتی وہ بیٹو سے اپنا ہاتھ چھڑا کر دونوں کتابیں سینے سے لگائے باہر چلی گئیں۔

لائبریری کے ایک کونے میں اُردو کی کتابیں لاتعلقی سے سُلگتی اور جلتی رہیں۔ لڑکیوں کا دھیان صرف اس بات میں تھا کہ وہ جلد سے جلد جل جائیں تاکہ ان کی راکھ کو آسانی سے کیاریوں میں دبایا جا سکے۔

اس دن نانی نے کھانا نہ کھایا، ''میری طبیعت بوجھل ہے، ناشتا سینے پر دھرا ہوا ہے۔'' انھوں نے کہا۔ مگر سارا دن وہ غم جو اُن کے سینے پر دھرا تھا، اور بھوک ان کے معدے کو کھرچتی رہی۔ اتنے دن کے خطرے اور کھنچاؤ نے قویٰ میں بے حسی سی پیدا کر دی تھی۔ چاہیے تو یہ تھا کہ کتابوں کا غم دریاؤں میں ملنے والے ایک دھارے کی طرح الگ سے پتا ہی نہ چلتا، مگر ابھی چند غم ایسے تھے جن کا بوجھ آج بھی ناقابلِ برداشت معلوم ہوتا تھا۔

''مصباح الحق کے گھر فون کر دو، اکرام سے کہو اگر آ سکتا ہے تو مجھے آ کر لے جائے، میرا دل گھبرا رہا ہے۔'' نانی نے کہا، ''تم پوتیوں سے تو وہ غیر لڑکی بینو مجھ سے زیادہ محبت کرتی ہے۔''

لڑکیاں سمجھ گئیں کہ وہ ان سے بے حد ناراض ہیں۔

''میں بھی تو یہی جاننا چاہتا ہوں کہ مطلق سچائی بھی کوئی چیز ہے یا نہیں؟'' چاچا جی زری سے باتیں کر رہے تھے۔ ''اگر ہے تو اب تک انسان کو ملی کیوں نہیں — یا مل چکی ہے اور انسان کو اس کی ملکیت کا احساس نہیں ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ آسمانی کتابوں میں یا انسانی ذہنوں میں یا سائنس اور علوم وفنون میں یہ سارے جوابات موجود ہیں۔ بس اُنھیں کھوجنے کی ضرورت ہے۔ ہر ٹکڑے کو اپنی جگہ لگا دینے کی ضرورت ہے جو ابھی تک کوئی کر نہیں پایا ہے — اس طرح کر نہیں پایا ہے کہ سب اسے مان لیں۔ کچھ لوگ مان لیتے ہیں کچھ منکر ہو جاتے ہیں۔ کیا کوئی ایسا وقت آئے گا جب سب مان لیں گے، جس طرح سورج نکلتا ہے تو سب مان لیتے ہیں — ظاہر ہے میری زندگی میں تو یہ جوابات نہیں ملیں گے۔ میں بھی اور لوگوں کی طرح یہ سوالات آئندہ نسلوں کو دے جاؤں گا، جس طرح ہم اپنا گھر بار اور اپنی بیماریاں اپنے وارثوں کو دے جاتے ہیں۔'' لکھتے لکھتے چاچا جی نے قلم روک کر کہا۔

''کس طرح چاچا جی؟'' زری نے پوچھا۔

''اپنے ناول کے ذریعے۔'' چاچا جی نے چشمے کے اُوپر سے زری کو دیکھا۔

''چاچا جی جس دور سے ہم گزر رہے ہیں کیا اس میں یہ ادب ودب بکواس نہیں لگتا جیسے زندگی سے بہت دُور کی فضول باتیں ہوں۔'' زری اکتاہٹ سے چچینڈے چھیلتی رہی۔

''ہاں کبھی کبھی کھانا اور پانی بھی یوں ہی لگنے لگتا ہے جیسے بالکل بے کار اور فضول چیز ہو — آدمی بھی بے کار لگتے ہیں، آپس کے رشتے بھی مجہول ہو جاتے ہیں مگر دراصل ایسا نہیں ہوتا تو پھر

ادب کیسے فضول ہو جائے گا؟'' انھوں نے قلم ہاتھ سے رکھ دیا۔

''اچھے آدمی وہ ہوتے ہیں نا جو مہربان ہوتے ہیں، دوسروں کے دُکھ درد کو سمجھ لیتے ہیں۔ اچھا ادب بھی وہی ہوتا ہے جو تسلی سے ان سب سوالوں کے جواب دیتا ہے جو ہمارے دل میں ہوتے ہیں۔ ہماری سنتا ہے اور بغیر ہمیں شرمندہ کیے ہماری کوتاہیوں کا، راستہ بھولنے اور بھٹکنے کا پتا دیتا ہے۔ اس میں کہیں چوکھٹ پر چراغ دھرے ہوتے ہیں، کہیں جگنو چمک رہے ہوتے ہیں، کہیں چاند کی شیتل چاندنی ہوتی ہے۔ جس کو جس چیز کی ضرورت ہوتی ہے اس طرف چلا جاتا ہے۔ کبھی ہمیں سورج چاہیے کبھی چوکھٹ کے دیوٹ۔ مہربان خیرات کرنے والا آدمی اچھا ہوتا ہے جو ہمیں سمجھ لے، جو دل سے ہمارا دوست ہو، اور اس سے بھی بہتر آدمی وہ ہوتا ہے جو ہماری آتما کو جان لے، جو ہم سے زیادہ ہمیں سمجھ لے۔ ہمارے بغیر پوچھے ہمیں راستہ دکھائے اور ہماری راہ کے کانٹے ہٹاتا جائے۔ ہے یا نہیں—— میرے خیال میں تو اچھے اور بُرے ادب کا فرق یہی ہے—— بُرا ادب نادان دوست کی طرح ہے جو ہمارا وقت خراب کر کے چلتا بنتا ہے اور بعد میں ہم پچھتاتے ہیں کہ ناحق کام کے وقت ان کی باتیں سنیں۔''

''چاچا جی آپ نے قبل از تاریخ سے اپنا ناول شروع کیا ہے تو یہ کہاں ختم ہوگا اور کب تک؟'' زری نے دوسرا وار کیا۔

''ارے پگلی، میں نے تجھے بتایا تھا نا کہ میں اسے ختم کروں گا ہی نہیں، زندگی بھر لکھتا رہوں گا—— پھر میری زندگی کے ساتھ زندگی تھوڑا ہی ختم ہو جائے گی جو میں اسے ختم کروں۔ میں اس میں سوال اٹھاتا رہوں گا۔ کچھ سوال ایسے ہیں جو لڑکپن سے میرے ذہن میں گڑے ہوئے ہیں، جیسے پکّی زمین میں پیروں کے نشان—— عورت کی عصمت کا تصور—— امن اور جنگ کا تصور اور حق و باطل کا تصور—— ہوسکتا ہے ان باتوں سے میرے ناول میں جھٹکے لگیں، مگر زندگی میں تو جھٹکے لگتے ہیں—— زندگی میں جو کچھ ہوتا ہے، آرٹ میں بھی وہ سب ہوسکتا ہے۔''

''چاچا جی! شمس آپ کو کسی اور گھر میں بھیجنے کی بات کر رہے ہیں۔ مجھے ڈر لگے گا، وہ خود بھی زیادہ تر باہر رہتے ہیں۔'' زری نے موضوع بدل دیا۔

''میں اس سے بات کروں گا کہ ایسی حالت میں میرا زری کے پاس رہنا اچھا ہے، اگر اس کے بعد وہ ضد کرے گا تو مجھے جانا پڑے گا، اسے پریشانی میں ڈالنا بھی مناسب نہیں، ایسے معاملات آپس میں اعتماد سے ہی طے ہوسکتے ہیں۔''

''مجھے آپ کی طرف سے بھی فکر رہے گی، آپ بند ہو کر بیٹھیں گے نہیں۔ کسی نہ کسی طرح باہر

نکل جائیں گے۔''

''نہیں، تیرے ساتھ وعدہ کرتا ہوں جو شمس الرحمٰن کہے گا وہی کروں گا۔ بس تیری خیریت کی اطلاع مجھے ملتی رہے۔''

''مولانا بھی تو اتنے مہینوں سے نہیں لوٹے نہ جانے کہاں رہ گئے۔'' زری نے کہا۔

''ہاں وہ ہوتے تو بڑا اطمینان ہوتا، کاش وہی آ جاتے۔'' چاچا جی نے کہا۔

زری اسپتال سے لوٹی تو سارے راستے سوچتی آئی کہ اس کے بچے کو پیدائش کے لیے ایسے پُرآشوب دن کیوں ملے! ڈاکٹر نے کہا تھا نو مہینے پورے ہو چکے ہیں، اب کسی بھی دن بچے کی پیدائش ہوسکتی ہے۔ گھر میں داخل ہوئی تو سامنے ہی دیوار پر فریم میں ایک نئی تصویر لگی نظر آئی۔ یہ تصویر کسی ایسے شخص کی تھی جسے اس نے آج تک نہیں دیکھا تھا۔ جہاں تک اُسے یاد پڑتا تھا وہ کوئی تاریخی شخصیت بھی نہیں تھی۔ وہ کسی جوان آدمی کی تصویر تھی جس کے بال اور داڑھی بے تحاشا بڑھی ہوئی تھی، آنکھوں پر سیاہ چشمہ اور گلے میں مفلر تھا، جیسے کوئی مفرور مجرم اپنا اصل حلیہ چھپانے کی کوشش کر رہا ہو۔

''یہ کون ہے؟'' زری نے شمس الرحمٰن سے پوچھا۔

''ارے یہ رونجھو ہے، میرا بھائی۔''

''یہ تصویر کہاں سے آئی؟'' زری نے ایک بار پھر غور سے تصویر کو دیکھا۔

''اس نے مجھے بھجوائی ہے۔''

''اس کا مطلب ہے وہ کہیں نہ کہیں تم سے ملتا ضرور ہے۔''

''نہیں، وہ عرصے سے یہاں نہیں ہے۔'' شمس الرحمٰن نے لاپروائی سے کہا اور اخبار اٹھالیا۔

''وہ تم سے ملنے نہیں آیا مگر اپنی تصویر بھجوائی، یہ بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔''

''کیوں؟ — یہ کوئی ایسی ناممکن بات نہیں ہے۔''

''شمس! تم اب بہت مختصر بات کرنے لگے ہو، اور چبا چبا کر بھی —'' شمس الرحمٰن اخبار سے نظریں ہٹا کر چپ چاپ اسے دیکھتا رہا۔

زری نے سارے کمرے پر نظر ڈالی۔

''تم نے قائداعظم کی تصویر اتار دی ہے؟'' اُس نے کہا۔

''ہاں۔'' شمس الرحمٰن نے مختصر سا جواب دیا۔

''کیوں؟'' زری اس کے پاس آ کھڑی ہوئی۔

''اگر میں کہوں کہ میں نے نیا فریم بنوانے کے لیے دے دی ہے۔'' شمس الرحمٰن نے اُس کی طرف دیکھا۔

''تو میں یقین نہیں کروں گی کیوں کہ آج کل وہ دن نہیں ہیں جب قائدِاعظم کی تصویر فریم کروانے کے لیے دی جائیں۔''

''تمھیں معلوم ہے تو پوچھتی کیوں ہو؟'' شمس الرحمٰن کا لہجہ تیکھا تھا۔

''میں سمجھ گئی، وہ تمھارا بھائی نہیں ہے — وہ اسمِ اعظم ہے — کوئی نہ کوئی باہنی ہے جو تمھاری حفاظت کی ضامن ہے۔''

''میری نہیں، تمھاری — اگر تم سننا ہی چاہتی ہو تو سن لو۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''تو کیا اب مکتی باہنی کے شیر اور چیتے میری حفاظت کے ضامن ہوں گے؟'' زری بے حد غصّے میں تھی۔

''بگڑنے کی ضرورت نہیں، ٹھنڈے دل سے سوچو۔'' شمس الرحمٰن کے لہجے کی خشکی زری نے اپنے دل میں اترتی محسوس کی۔

''تو تم اب اس خوں خوار شخص کی تصویر پر پھولوں کا ہار ڈالو گے؟'' زری رونکھی ہوگئی۔

''ہمیں زندہ رہنا ہے زری اور مصلحت سے کام لینا ہے، جذباتی ہونے سے کام نہیں چلے گا — تمھیں بھی یہ بات فخر سے کہنی ہوگی کہ یہ شخص تمھارے شوہر کا بھائی ہے۔''

''کیوں؟''

''اس لیے کہ تمھیں نہیں معلوم باہر کیا ہو رہا ہے۔''

''نہیں۔ کیا پاکستان کی مدد کے لیے کوئی نہیں آ رہا؟ بتاؤ پلیز، کیا سچ ہے کیا جھوٹ ہے؟''

''میں تمھیں بتا سکتا ہوں اگر تم میں سچ سننے کی ہمت ہو۔''

''بتاؤ۔''

''سچ یہ ہے کہ تم اور تم جیسے ہزاروں لوگ دھوکے میں ہیں۔ یہ بالکل صحیح ہے کہ پاکستانی فوج جنگ ہار رہی ہے۔ ان کے لیے ایک ایک پل بھاری ہے۔ تنگیل میں بھارتی فوج اُتر چکی ہے۔ چاروں طرف سے بھارت کی فوج اور مکتی باہنی ڈھاکا کی طرف بڑھ رہی ہے۔ جنرل مانک شا کا پیغام بھی نشر ہو رہا ہے کہ پاکستانی فوج جہاں کہیں بھی ہے، نزدیک ترین بھارتی فوج کے کمانڈروں کے آگے ہتھیار ڈال دے۔ ان کی حفاظت کی ضمانت لی جاتی ہے اور ان سے جنیوا کنونشن کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔ تمھیں معلوم ہے کہ اس پیغام کے بعد سے پاکستانی فوج جگہ جگہ ہتھیار ڈال رہی ہے۔''

''اوہ نو۔'' زری نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر چیخ دبانے کی کوشش کی۔ پھر کچھ دیر وہ اسے ٹکٹکی باندھے دیکھتی رہی جیسے کہہ رہی ہو، یہ سب تم اتنے سکون سے کیسے کہہ اور سُن رہے ہو— بالآخر وہ سارے دعوے غلط نکلے— تم بھی بدل گئے شمس— پھر اس نے اپنا چہرہ دوسری طرف کرلیا۔ شمس الرحمٰن کو پتا نہیں چلا کہ وہ خاموش بیٹھی ہے یا رو رہی ہے۔ یہ تمھاری نظریاتی شادی کا انجام ہے!— جیسے شمس الرحمٰن کے اندر کسی نے تمسخر سے کہا۔ شمس الرحمٰن کے اندر زری کے لیے بے انتہا ہمدردی کا جذبہ جاگا۔ وہ اس کے بچّے کی ماں بننے والی تھی۔ اس سے اُٹھنا بیٹھنا مشکل ہو رہا تھا۔ ایسی حالت میں اس نے کتنا بڑا صدمہ پہنچایا تھا اُسے۔ بالآخر وہ آگے بڑھا۔

''تم کیوں پریشان ہوتی ہو جان— جو قسمت میں ہے وہ تو ہو کر رہے گا— مگر ہم تم ایک تھے، ایک ہی رہیں گے۔'' وہ زری کی طرف جھکا۔

زری نے اپنے چہرے سے ہاتھ اُٹھائے۔

''شمس خود کو مزید دھوکا نہ دو۔ اب تم بھی disillusioned ہو چکے ہو اور میں بھی۔''

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے، ہمیں آخر تک بہتری کی اُمید رکھنی چاہیے۔ یہ تو بتاؤ ڈاکٹر نے کیا کہا ہے؟''

''اس نے کہا ہے، کسی بھی دن، کسی بھی وقت—'' زری نے جواب دیا۔

''اچھا، میں نے اکرام اور بینو سے بات کرلی ہے، بینو تمھارے ساتھ اسپتال جائے گی۔ اس کی وجہ سے تمھیں اطمینان رہے گا۔''

''تم کہیں جا رہے ہو؟'' شمس الرحمٰن کو دروازے کی طرف بڑھتے دیکھ کر زری نے کہا۔

''ہاں۔''

''کہاں؟''

شمس الرحمٰن کچھ دیر خاموش رہا۔

''واپس آن کر بتاؤں گا۔ تم اتنی دیر چاچا جی سے گپ شپ کرو۔'' کہتا ہوا وہ تیزی سے باہر نکل گیا۔

شمس الرحمٰن کے جانے کے بعد زری پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ وہ بہت دیر تک روتی رہی۔

چاچا جی آئے اور اُس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر خاموش بیٹھ گئے۔

جب اس کا دل ہلکا ہوا تو وہ بچپن کی ضدی زری بن چکی تھی۔

''مجھے بتایئے، نا چاچا جی یہ سب کیا ہو رہا ہے؟ کون سچ بول رہا ہے کون جھوٹ بول رہا ہے؟''

وہ جھلا رہی تھی۔ ''اخباروں کی خبریں کچھ اور کہہ رہی ہیں، یہاں کے لوگ کچھ اور کہہ رہے ہیں۔''

''حالات اچھے نہیں ہیں بیٹی ـــــ آس ٹوٹ رہی ہے۔''

''مگر یہ سب ہوا کیسے؟'' زری نے اصرار کیا، ''ہمیں تو بتایا گیا تھا کہ ہمیشہ حق کی فتح ہوتی ہے، باطل کو شکست ہوتی ہے، تو کیا وہ حق پر تھے؟ ہمیشہ کہا جاتا تھا کہ شیر کی ایک دن کی زندگی لومڑی کے سو دنوں سے بہتر ہوتی ہے تو پھر آپ کے شیروں نے لومڑی بننا کیسے گوارا کیا؟ یہ سب کیا ہے؟ کون ہم سے جھوٹ بول رہا تھا اور کیوں؟''

''ان سوالوں کے جواب وقت دے گا بیٹی، ابھی تو ہم بالکل اندھیرے میں ہیں۔ ہمیں بالکل معلوم نہیں ہمارے چاروں طرف کیا ہو رہا ہے۔ کون کتنا سچ بول رہا ہے اور کتنا جھوٹ؟ میں بھی بہت سے سوالوں کے جواب کھوج رہا ہوں۔''

''آپ جب ان سوالوں کے جواب پالیں گے تب بھی کسی کو نہیں بتائیں گے کیوں کہ ہمارے ہاں خاموش رہنے کی ایک نئی ریت شروع ہوگئی ہے۔ جو نہیں جانتا وہ اس لیے چپ رہتا ہے کہ لوگ سمجھیں وہ جانتا ہے، اور جو جانتا ہے وہ اس لیے چپ رہتا ہے کہ لوگ دھوکے میں رہیں کہ اسے کچھ خبر نہیں ہے ـــــ جو نہیں جانتے وہ اپنی جہالت کا بھرم رکھنا چاہتے ہیں، جو جانتے ہیں وہ کسی کا غضب مول لینے کی ہمت نہیں رکھتے۔ اس لیے کہ وہ یہ بھی جانتے ہیں کہ ان کی بات سے کون کون ناراض ہوسکتا ہے۔ یہ بے حسی بڑھتی جارہی ہے، روگ ہوگئی ہے چاچا جی، اور بہت جلد ہمیں پوری طرح ختم کردے گی جیسے دیمک جب کسی چیز کو چاٹتی ہے تو اُس وقت پتا چلتا ہے جب وہ چیز ناکارہ ہو چکتی ہے۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

چاچا جی خاموش رہے۔ وہ جو مطلق سچائی کی کھوج میں تھے، کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ اتنے دن سے چاروں طرف جو کچھ ہو رہا تھا، وہ بھی دیکھ رہے تھے۔ پاکستانی فوج حق کے لیے جہاد کر رہی تھی۔ بھارتی علما کوثر و تسنیم سے دھلی ہوئی زبان میں ریڈیو پر تقریریں کر رہے تھے، ''یہ جہاد نہیں ہے۔ بنگلہ دیش کے مسلمان آزادی چاہتے ہیں اور یہ آزادی ان کا حق ہے۔''

رات کا وقت تھا۔ شمس الرحمٰن پڑوس میں کسی کے گھر گیا تھا۔ زری گھر میں اکیلی تھی۔ دروازے کی گھنٹی بجی۔ زری نے دروازے پر جا کر اندر سے پوچھا، ''کون ہے؟''

''میں ہوں معراج — ابوظفر معراج۔''

ترنت دروازہ کھلا اور زری نے اُس شخص کا، جسے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، اپنائیت سے ہاتھ تھام لیا۔ ''آپ!'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ خدا کا شکر ہے اُس نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ ''آپ خیریت سے ہیں؟''

معراج کو حیرت ہوئی۔ وہ سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ زری جو اُس کی یا شائستہ کی کچھ بھی نہ تھی، اُسے دیکھ کر اتنی خوش ہو گی۔

''آیئے — اندر آ جایئے — میں شمس کو فون کرتی ہوں۔ برابر ہی میں ہیں، ابھی آ جائیں گے۔''

اُس کی آواز میں اتنی ملائمت اور مسرت تھی جیسے وہ معراج کے قدموں میں بھر بھر مٹھیاں پھول نچھاور کرنا چاہتی ہو — جیسے وہ اُس کی آمد کے لیے ایک ایک گھڑی، ایک ایک پل گنتی رہی ہو۔

ٹیلی فون مصروف تھا۔

''آپ بیٹھیے، میں خود بلا کر لاتی ہوں۔'' وہ اپنا موٹاپا ہلاتی باہر چلی گئی۔

شمس الرحمٰن آ کر معراج سے گلے ملا۔ وہ دونوں بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ معراج بھارت میں کہاں رہا تھا اور کیا کیا کرتا رہا تھا، اس کی داستان سناتا رہا۔ اُسے معلوم تھا کہ اب حالات

بدل رہے ہیں اور وہ ڈھاکا آنے والے چند غیر ملکی رپورٹروں کے ساتھ چلا آیا تھا۔

''ابھی سلہٹ جانا ٹھیک نہیں ہے۔ چند دن اور انتظار کرنا ہوگا، ویسے شوشی اور بچّی کی خیریت کی اطلاع مجھے مل گئی ہے۔ وہ اپنے دادا کے پاس ہیں۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''اچھا، ہمارا بیٹا تاری ابھی تک خالہ ہی کے ساتھ ہے۔ وہ لوگ بھی خیریت سے ہیں۔''

زری کھانا پکانے چلی گئی تو معراج نے شمس الرحمٰن سے پوچھا، ''سنا ہے یہاں مکتی جودھا کے لوگوں کو پکڑوانے کے بڑے بڑے انعام مقرر ہوئے ہیں۔''

''ہاں ہوئے تھے، شروع دسمبر کے اخباروں میں خبریں آئی تھیں، اعلان چھپے تھے۔ ڈپٹی انسپکٹر جنرل اور انسپکٹر جنرل انٹیلی جنس کے لیے اور مکتی باہنی کے لیڈروں کے لیے، اور گولہ بارود کے ذخائر کے لیے۔''

''اسی طرح کے نام وہاں بھی چھاپے جا رہے ہیں، تمھارا نام بھی چھپ جاتا اگر میلو اور رونجھو نہ ہوتے۔'' معراج نے کہا۔

''میرا!— کیوں؟'' شمس الرحمٰن نے تعجب سے پوچھا۔

''تمھارا فوجیوں کے ساتھ رابطہ تھا نا۔'' معراج نے کہا۔

''تمھاری ہی خاطر گیا تھا بھائی، اس کے بعد میرا ان سے کوئی رابطہ نہیں رہا۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''اسی بات کو صاف کرنے کے لیے میلو نے تمھیں جیسور بلوایا ہے کہ لوگوں کے دلوں سے شبہ نکل جائے۔''

''اچھا یہ بتاؤ کہ امریکا اور چین نے پاکستان کی مدد کیوں نہ کی؟ یہاں ہر حلقے میں اس بات پر تعجب ہے۔ بھارت میں لوگ اس بارے میں کیا کہتے ہیں؟'' شمس الرحمٰن نے پوچھا۔

''وہاں کے لوگوں کو اندازہ تھا کہ امریکا اور چین صرف زبانی ہم دردی کر رہے ہیں۔ اس دفعہ چین کا لہجہ ۱۹۶۲ء اور ۱۹۶۵ء سے بالکل مختلف تھا۔ بھٹو کے چین جانے پر مشترکہ اعلانیہ تک شائع نہ ہوا۔ سب کو معلوم ہے کہ چین بین الاقوامی حیثیت سے دنیا کے سامنے آ رہا ہے۔ وہ اقوامِ متحدہ میں آنے کی بات سوچ رہا ہے۔ اُدھر روس کے ساتھ دریائے یوسوری کے سرحدی علاقے میں اس کا جھگڑا چل رہا ہے جس کی وجہ سے اس کی بہت سی فوج پھنسی ہوئی ہے۔ اب وہ کسی ملک کے ساتھ لڑائی مول لینا نہیں چاہتا— نہ دسمبر کے مہینے میں وہ پہاڑی علاقوں میں اتنی دُور اپنی فوج لڑنے بھیج سکتا ہے۔ چین نے یا امریکا نے کبھی پاکستان کے ساتھ اس قسم کا کوئی معاہدہ کیا ہی نہیں۔ یہ تو ان کی اپنی خوش فہمیاں ہیں یا عوام کو دھوکا دینے کی کوشش ہے کہ دوست ملک لڑنے کے لیے آ رہے ہیں۔ امریکا ویت نام کی وجہ سے عوام کی ناراضگی جھیل چکا ہے، وہاں کے عوام بنگلہ دیش کی آزادی کے حامی

ہو چکے ہیں۔ مخالف پارٹی بنگلہ دیش کی حامی ہے۔ صدر نکسن اور کسنجر پر ویسے ہی تنقید ہوتی رہتی ہے۔ امریکا آج کل چین کے ساتھ دوستی کے مسئلے میں اُلجھا ہوا ہے اور پاکستان سے صرف زبانی ہم دردی جتا رہا ہے۔''

''اور یہ ساتواں بحری بیڑہ؟'' شمس الرحمٰن نے پوچھا۔

''امریکا کا بحری بیڑہ اُس کے اپنے لوگوں کو نکالنے آ رہا ہے جس پر اتنی ہلچل مچی ہوئی ہے۔ پاکستانیوں کو چاہیے تھا کہ جس طرح اگست میں بھارت نے رُوس سے معاہدہ کیا یہ بھی امریکا سے ازسرِنو کوئی معاہدہ کرتے۔ رُوس کے ڈر سے چین بھی سہم گیا ہے اور امریکا اس لڑائی کو نیوکلر جنگ تو بنانا نہیں چاہتا۔ وہ کیوں پھٹے میں ٹانگ اڑائے؟ اس نے یحییٰ خان کو بیچ میں ڈال کر چین سے دوستی کی، یحییٰ خان اتنی اہمیت پا کر خوش ہو گئے۔ رُوس ناراض ہوا، اُن کی بلا سے — مشرقی پاکستان جائے یا رہے۔ امریکا کو بھی مشرقی پاکستان سے دل چسپی نہیں ہے، اس کا یہ احسان کم ہے کہ مغربی پاکستان سلامت ہے۔''

''یہ بتاؤ، وہاں بیٹھی بنگلہ دیشی حکومت کو یہاں کی مشکلات کا اندازہ ہے؟''

''کیوں نہیں ہے، چار ملین پناہ گزیں وہیں تو پڑے ہوئے ہیں۔ اُن کو بسانا ہے۔ باہینیوں میں آپس میں جو جھگڑے ہیں، وہ بھی کسی سے چھپے ہوئے نہیں ہیں۔ حکومت کا تجربہ کسی کو نہیں ہے، یہ بھی سب کو معلوم ہے تبھی تو وہ بھی آنے سے کترا رہے ہیں، ورنہ جس طرح میں آیا وہ بھی آ سکتے تھے۔ فصلوں کا جو نقصان ہوا ہے اس سے قحط کا سامنا ہے۔ یہ بھی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے۔ ریلوے، پُل اور سڑکوں کا جو عالم ہے وہ فوج اور مکتی باہنی، دونوں کا کارنامہ ہے، مگر سب سے بڑی بات تو وہ دعوے پورے کرنے کی ہے جو عوام سے کر رکھے ہیں۔ تمھیں معلوم ہے 'عوامی لیگ' کی خاص قیادت شیخ مجیب الرحمٰن اور شیخ مونی کو لوگ بورژوائی ڈیموکریسی لانے والے لوگ کہتے تھے۔ اس میں جو انتہا پسند عناصر شامل ہوئے اور شیخ مجیب الرحمٰن کو ان کا کہنا ماننا پڑا، ان کا کہنا تھا کہ سوشلزم اس غریب ملک کا حل ہے اور اس کے لیے ضروری ہے کہ سیاسی علاحدگی اور سوشل انقلاب ساتھ ساتھ ہو۔ ۱۹۷۰ء میں انھوں نے سائنٹیفک سوشلسٹ انقلاب کی قرارداد پاس کی تھی اور وہ اب تک اسی پر اڑے ہوئے ہیں۔ مکتی باہنی میں ایسے عناصر ہیں جو بھارت کے خلاف ہیں۔ اب ان سب میں آپس میں فیصلہ کیسے ہوگا۔ ہمارے بنگو بندھو شیخ صاحب تو پاکستان میں بیٹھے ہوئے ہیں اور کون ہے جس کی بات سارے لوگ مانیں؟''

''دیکھا جائے گا۔ ابھی آزاد بنگلہ دیش تو بننے دو بھائی۔'' شمس الرحمٰن نے کہا، ''مگر ان سب باتوں کا ذکر زری کے سامنے نہ کرنا۔''

معراج نے کہا، ''اس وقت بھی میرے کانوں میں شریمتی اندرا گاندھی کی آواز گونج رہی ہے۔

انھوں نے کس اعتماد سے کہا تھا، ''میں یقین دلاتی ہوں کہ بروقت فیصلے کیے جائیں گے۔ ہمارے نزدیک بروقت فیصلوں کی بڑی اہمیت ہے، بعد از وقت کیے گئے فیصلوں کا کوئی فائدہ نہیں۔''

''ہاں واقعی، بروقت فیصلوں کی بڑی اہمیت ہے۔'' شمس الرحمٰن نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

شمس الرحمٰن رات کو دو بجے کے بعد سویا تھا، اور ایک گھنٹے بعد گھبرا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ ایک عجیب سی آواز اس کے کانوں میں گونجی تھی جیسے کسی نے کہا ہو، چیتا تیری آ جھے'' (چتا تیار ہے)۔

وہ ہڑبڑا کر اُٹھا اور اپنے چاروں طرف دیکھا۔ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے اس کے بدن میں آگ لگی ہوئی ہو۔

''کیا ہوا؟'' زری گھبرا گئی۔

''کچھ نہیں۔ میں تھوڑی دیر کو باہر جاتا ہوں، گرمی سے طبیعت گھبرا رہی ہے۔'' وہ بنیان اور چادر میں باہر نکل گیا تھا۔

گرمی! دسمبر کے مہینے میں—زری جلدی سے پیٹی کوٹ میں ساڑھی کھونس کھانس باہر بھاگی تھی۔ شمس الرحمٰن پچھلے لان میں ٹوٹے درخت پر بیٹھا تھا۔ پچھلے کال بوٹی ساکھ کے طوفان میں یہ درخت گر پڑا تھا۔ چند جڑیں اب بھی زمین کے اندر رہ گئی تھیں۔ اس درخت کو نہ مردہ کہہ سکتے تھے نہ زندہ۔ زری نے جا کر شمس الرحمٰن کے ماتھے پر ہاتھ رکھا۔ اس کا خیال صحیح تھا، وہ بخار میں بھن رہا تھا۔

''خدا کے لیے اندر چلو۔ تمھیں نمونیہ ہو جائے گا۔'' زری نے التجا کی مگر وہ اسی طرح بیٹھا رہا، جیسے اُس کی بات سمجھ نہ پا رہا ہو۔ کئی دفعہ کہنے کے بعد بھی جب وہ نہ ہلا تو زری بے بس سی اُس کے پاس بیٹھ گئی۔

اندر فون کی گھنٹی مسلسل بج رہی تھی۔ جب گھر کا کوئی شخص فون کے پاس نظر نہ آیا تو مجبوراً معراج اُٹھا اور اس نے ریسیور کان سے لگایا۔

''شمس بھائی کہاں ہیں؟ میں رونجھو بول رہا ہوں، ایک بُری خبر ہے۔ آپ کون بول رہے ہیں؟'' رونجھو کی آواز جیسے کہیں پاتال سے آ رہی تھی۔

''کیا ہوا؟—میں معراج بول رہا ہوں۔''

''کون؟ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ کیا شمس بھائی گھر پر ہیں، انھیں بلا دیجیے، نہیں ٹھہریے—آپ جو کوئی بھی ہیں انھیں ذرا آہستہ آہستہ بتا دیجیے کہ شائستہ آپا—جی ہاں ہماری بہن۔ شائستہ آپا جل گئیں۔ بہت بُری طرح۔ خبر نہیں سنی اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔ میں بھی اسی باشا میں تھا، رات ہی کو آیا تھا، ہو سکتا ہے کسی نے دیکھ لیا ہو۔ پٹرول چھڑک کر آگ لگا دی۔ افراتفری میں ہم باہر نکلے۔

بچی بھی بھاگ آئی، ہم نے بہت کوشش کی مگر شائستہ آپا جلد نہ نکل سکیں۔ وہ الگ چھوٹے کمرے میں تھیں۔ کہہ رہا ہوں نا اپنی سی کوشش کی۔ آگ کے شعلے آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ آس پاس کے آم کے درخت، ناریل سب جھلس گئے۔" رونجھو بولے چلا جا رہا تھا۔

"آپ؟ آپ — معراج بھائی ہیں۔ اوہ! — بہت افسوس ہے کہ میں نے آپ کو یہ خبر سنائی۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ آپ وہاں آئے ہوئے ہیں، ریئلی سوری۔ مگر معراج بھائی، آپ کا آنا بے حد ضروری ہے۔ دادا اور بچی اُن کی دیکھ بھال نہیں کر سکتے۔ اگر آپ نہیں آئے تو وہ مر جائیں گی۔ ٹھیک ہے۔ بس وہیں آم کے سائے میں ان کی قبر بنا دیں گے، معراج بھائی۔ آم انھیں بہت پسند ہیں۔ بچی میرے پاس ہے، آپ کی امانت ہے۔ آپ کے پاس پہنچا دوں گا۔ بس اب لڑائی آخری سانس لے رہی ہے۔ یہی سب سے نازک وقت ہے، دُعا کیجیے اور آنے کی کوشش کیجیے۔ خدا حافظ۔"

زری، شمس الرحمٰن کو سہارے سے اندر لائی تو اس نے معراج کو فون کے پاس سر پکڑے بیٹھے دیکھا۔ چاروں طرف بلیک آؤٹ تھا۔ کمرے سے آنے والی ہلکی سی روشنی میں معراج اسے ایک ہیولا سا لگا۔ دیوار پر اس کا سایہ اس سے بہت بڑا، کسی دیو کی طرح بالکل اسی انداز میں بیٹھا تھا۔

"ان کو بہت تیز بخار ہے اور سردی میں باہر چلے گئے۔" کہتی ہوئی زری، شمس الرحمٰن کو کمرے میں لے گئی۔ معراج نے کوئی جواب نہ دیا۔ زری شمس الرحمٰن کے دوست ڈاکٹر کو فون کرنے آئی، تب معراج وہاں نہیں تھا۔ کرفیو میں کہاں جائیں گے، اس نے سوچا، یوں ہی بے چین ہوں گے۔ کب سے بیوی بچوں سے الگ پریشان پھر رہے ہیں۔ آج کل راتوں کو جاگنا، بے چینی میں ٹہلنا اور اندر باہر گھومنا، کوئی بھی بات ایسی نہیں، جس پر آدمی حیران ہو۔

ڈاکٹر آ نہیں سکتا تھا۔ زری گھر میں رکھی ہوئی دواؤں کے نام بتاتی رہی، ڈاکٹر نے ان ہی میں سے دوائیں تجویز کر دیں۔

"کوئی بات نہیں ہے بھابی، ٹھیک ہو جائیں گے۔ آج کل کے حالات لوگوں کے ذہنوں پر عجیب طرح اثر ڈال رہے ہیں۔ میں نے کچھ لوگوں کی شخصیت کو بالکل بدلتے دیکھا ہے۔ بس اب کشتی کنارے پر لگنے والی ہے، دُعا کیجیے۔"

شٹ اپ! زری کا دل چاہا، کہے مگر وہ فون رکھ کر چپ چاپ چلی آئی۔

شمس الرحمٰن اپنے ہم نام شاعر شمس الرحمٰن کی ایک نظم گنگنا رہا تھا:

ذات کے غم آگیں سنگیت پر جگنو
اپنے پاؤں میں روشنی کے چھوٹے گھنگھرو پہنے ناچ رہے ہیں

اور اس سنسار میں، میں تنہا چل رہا ہوں۔
جاڑے کی سرد راتوں میں تھوڑی دیر کے لیے یوں ہی میری آنکھ لگ جاتی ہے
دروازے کی کنڈی کھلی رہتی ہے
بہت ممکن ہے مجھے شیر کسی دن اپنی درندگی کا شکار بنالیں
بہت ممکن ہے ایک دن میری سر ذلاش شہر کے کسی گندے نالے میں تیرتی نظر آئے
یوں تو میرے دروازے کی اوٹ میں کتنے نامعلوم بھوت چھپے ہوئے زبانیں چاٹ رہے ہیں

دوا پی کر منہ ہی منہ میں گنگناتا شمس الرحمٰن غنودگی میں چلا گیا۔ زری نے اسے نہیں بتایا کہ معراج گولے اور گولیاں برستی اس رات میں باہر چلا گیا اور ابھی تک نہیں لوٹا ہے — اور یہ کہ وہ تخلیق کے درد میں مبتلا ہو چکی ہے۔

چاچا جی ایک گھر کی اوپری منزل میں قید تھے۔ وہ صرف بند تھے لیکن ان کو 'قید' کہنے پر اصرار تھا۔ باہر سے تالا لگا ہوا تھا۔ رات گئے سورج ان کے لیے کھانا لے کر آتا تھا۔ دال بھات، بھجیا یا مچھلی کا سالن کھلانے کے بعد چپکے سے اندھیرے میں غائب ہو جاتا تھا۔ دن کو وہ گھر میں پڑی ہوئی بنگلہ کی کوئی کتاب یا کبھی کبھار سورج کے لائے ہوئے اخبار پڑھ لیتے تھے۔ رات کو روشنی نہ ہونے کی وجہ سے پڑے سوچتے رہتے تھے۔ ان کی کھڑکی سے ذرا فاصلے پر زینے کی چھت کے نیچے اسٹول پر ایک پٹھان چوکیدار بیٹھا نظر آیا کرتا تھا۔ غالباً وہ بھی ان کی طرح چھپا ہوا تھا۔ معلوم نہیں کون اسے کھانا پانی دیتا تھا۔ آج وہ نظر نہیں آیا تھا اور چاچا جی سوچ رہے تھے کہ شاید اسے کوئی بہتر ٹھکانا مل گیا ہے یا اُسے مکتی باہنی کا کوئی شخص پکڑ کر لے گیا ہے یا تنہائی اور بھوک سے تنگ آ کر ہر چہ بادا باد کہہ کر وہ خود ہی نکل کھڑا ہوا ہے۔ ان کا جی چاہا وہ بھی اس پٹھان کی طرح ہر چہ بادا باد کہہ کر نکل کھڑے ہوں مگر انھیں زری سے کیے گئے وعدے کا خیال آ گیا۔ وہ ویسے ہی بہت ہراساں ہے اسے اور پریشان کرنا کسی طرح مناسب نہیں ہے۔

آج دوپہر کو بے موسمی بارش ہوئی تھی۔ درختوں کے عکس گیلی سڑک پر منعکس ہو رہے تھے، ٹیڑھے میڑھے، شاخ در شاخ۔ یوکلپٹس کے درختوں کے عکس روتے دیو جیسے لگ رہے تھے۔ کھمبوں کے عکس بھی صاف نظر آ رہے تھے۔ سڑک دُھل کر صاف اور سیاہ ہو گئی تھی۔

"کمرے کے دروازے پر مخصوص کھٹ کھٹ ہوئی۔ سورج ابھی کھانے کے برتن لے کر گیا تھا۔

اب کون آسکتا ہے! کہیں فرشتۂ اجل نے تو سورج کی دستک نہیں سن لی ہے اور اب اسی انداز میں دستک دے کر اُن کی روح قبض کرنے آیا ہے۔ چاچا جی نے جھانک کر دیکھا، باہر ایک نہیں دو سائے تھے۔ دوبارہ دستک ہوئی تو چاچا جی نے سوچا، محلّے والے چوکنے ہو جائیں گے۔

''کون؟'' انھوں نے دروازے کی جھری سے منھ لگا کر آہستہ سے پوچھا۔

''میں ہوں سورج، مولانا آئے ہیں۔''

چاچا جی نے فی الفور دروازہ کھول دیا۔ مولانا اندر آئے اور سورج سے کہا، ''تم جاؤ، میں تھوڑی دیر ٹھہروں گا۔''

''میں تالا لگا جاتا ہوں۔ آپ گلی کے دروازے سے نکل جایئے گا اور چاچا جی سے کہیے گا کہ دروازہ اندر سے بند کرلیں۔''

''ٹھیک ہے۔'' انھوں نے کہا۔

چاچا جی نے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کیا۔

''مولانا آپ کی طرف سے بڑی تشویش تھی۔ کہاں رہے اتنے دن؟'' انھوں نے کہا۔

''مارا مارا پھرتا رہا— بہت کچھ دیکھا'' وہ تخت پر ٹِک گئے۔ ''بھائی عمر! قتلِ عام دیکھا، قتلِ خواص دیکھا۔ الفاظ کے ایٹم پھیل کر پھٹتے دیکھے اور اُن کی لائی ہوئی تباہی دیکھی— شاید کسی نے کہا تھا کہ ہم یہاں کی نسل بدل دیں گے۔ ان الفاظ کی کاٹ زہر کے خنجر سے تیز تھی جس کے بدلے میں لوگوں نے اپنے ذہنوں کو زہر میں بجھا لیا۔ میں نے نعشیں اس طرح ایک دوسرے پر چجی ہوئی رکھی دیکھیں جیسے حلوائی تھال میں مٹھائی سجا کر رکھتے ہیں— میں نے کتوں اور گدھوں کو ابکائیاں لیتے دیکھا— میں نے—''

''مولانا! آپ کو معلوم ہی ہے کہ پرانے زمانوں میں بادشاہ اپنے قلعوں کی بنیادوں میں غلاموں کا خون ڈلوایا کرتے تھے، اچھا یہ بتایئے۔'' چاچا جی نے کہا، ''کچھ اچھے لوگوں سے بھی ملے آپ؟ کچھ اچھے لوگوں کو بھی دیکھا؟''

''ہاں، یہ سورج— یہ سورج میاں جو اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر روز آپ کے پاس آتا ہے— ایسے سیکڑوں لوگ ہیں جنھوں نے اپنے دوستوں کو چھپا رکھا ہے۔ ایک میجر تجمل، جس سے میری دوستی ہوگئی تھی، وہ مجھے اپنا بزرگ سمجھتا تھا اور بہت عزت سے پیش آتا تھا۔ میری اس سے ایسی ہی باتیں ہوتی تھیں جیسے آپ سے۔ میں اس سے مذاق کرلیا کرتا تھا۔ ایک دن کہنے لگا، مولانا وردی کے ساتھ ہیومر (humour) نہیں چلتا۔ میں نے کہا، داڑھی کے ساتھ چل سکتا ہے تو وردی

کے ساتھ کیوں نہیں چلے گا۔ حسِ مزاح دُکھوں کو برداشت کرنے کی قوت دیتی ہے۔ میاں فوجی بھی تو انسان ہوتا ہے۔''

''فوج کس حال میں ہے مولانا؟'' چاچاجی نے پوچھا، ''پاکستانی فوج۔''

''بُرے حال میں ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ ان حالات میں کوئی بھی فوج ہوتی تو اس کا یہی حال ہوتا۔ آٹھ ماہ سے ایک فوج اپنے ہی لوگوں سے لڑ رہی ہے۔ پہلے کچھ لوگ ان کے مددگار تھے جنھیں یہ رضا کار کہتے تھے، اب زیادہ تر بنگالی رضا کار دوسری طرف چلے گئے ہیں۔ مقامی لوگ تن، من، دھن سے بھارتی فوج اور مکتی باہنی کی مدد کر رہے ہیں۔ ہر جگہ پاکستانی فوج ٹکڑوں میں بٹی ہوئی ہے اور گھری ہوئی ہے۔ اب دونوں فوجوں کا نصب العین جلد سے جلد ڈھاکا پہنچنا ہے جس میں پاکستانی فوج کامیاب ہوتی نظر نہیں آتی۔''

''اس کا مطلب ہے پاکستانی فوج ہتھیار ڈال دے گی۔'' چاچاجی نے سہم کر پوچھا۔

''جنگ بندی ہو جائے تو بہتر ہے ورنہ دوسری صورت ہتھیار ڈالنا ہی ہے۔ عمر بھائی! ایک زمانے میں یہاں مناظرے ہوا کرتے تھے۔ بڑے بڑے بزرگ، جوگیوں اور پنڈتوں سے مناظرے کیا کرتے تھے اور جب پنڈت مناظروں میں ہار جایا کرتے تھے تو گاؤں کے گاؤں مسلمان ہو جاتے تھے۔ میں سمجھتا ہوں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان کے پنڈت آپس میں مناظرہ کر لیتے، بنگلہ دیش بن جاتا مگر اتنی جانیں تو ضائع نہ ہوتیں۔''

''آپ ٹھیک کہتے ہیں مولانا، سیاسی تصفیہ ہو جاتا تو فوج کی تذلیل نہ ہوتی۔ اتنے بے گناہ، بہاری اور بنگالی کے نام پر نہ مارے جاتے۔'' چاچاجی نے کہا۔

''آپ کو معلوم ہے عمر بھائی، دونوں طرف سے ایسے لوگ مجھے ملے جو میرے سامنے اعتراف کرتے تھے کہ ہم نے بے گناہ لوگوں کو مارا یا مروایا ہے اور ہمیں ضمیر کی خلش پریشان کر رہی ہے۔''

''مولانا! کیا میں غلط کہتا ہوں کہ کائنات کروڑوں سال پرانی سہی مگر انسان ابھی بچپن کے دور میں ہے۔ اسے اپنے برے بھلے کی تمیز نہیں، خود محافظت کی جبلت بچالے تو بچالے ورنہ اس میں اتنی تمیز نہیں کہ خود کو آگ، پانی سے بچا سکے۔ مہلک ہتھیاروں سے اور ایٹم بموں سے یہ کھلونوں کی طرح کھیلتا ہے اور پھر روتا ہے۔ اقبال نے کہا ہے نا:

یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید
کہ آ رہی ہے دما دم صدائے کن فیکوں

چاچاجی بستر پر دراز ہو گئے۔

''ہم تو کہتے ہیں کہ یہ کائنات کچھ نہیں ہے محض 'اُس' کے خیال کا پَرتو ہے۔'' مولانا نے کہا، ''سب کچھ 'اُس' کے ذہن میں ہو رہا ہے۔ کسی چیز کا کوئی خارجی وجود ہی نہیں ہے—— یہ سب کچھ صرف اس کے علم میں ہے، کائنات کا ہر رُوپ۔''

''ہاں مولانا، آپ دین دار تو یہ سوچ کر خود کو تسلی دے لیتے ہیں۔ صدف کا کیڑا ریت کے مسلسل کچوکوں سے تحفظ کی خاطر لعاب کی دیوار کھڑی کر لیتا ہے۔ ریت کا ذرّہ اس کیمیاوی عمل سے خول بن جاتا ہے۔ لیکن ہر کیڑے کو یہ نعمت میسر نہیں کہ وہ ریت کے ذرّے کو موتی میں تبدیل کر لے۔ ہم گناہ گار کیا کریں جن کو یہ دُنیا حقیقت نظر آتی ہے—— بڑی تلخ حقیقت! ایک زمانے میں، میں نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا: زندگی ایک گلِ دائرہ ہے—— گلِ دائرہ wreath جو قبروں پر چڑھایا جاتا ہے۔ یہ زندگی اور موت کے تسلسل کا سمبل ہے۔ زندگی خوب صورت سہی مگر اس میں کانٹے بھی چھپے ہوئے ہیں اور اس کا انجام موت کے سوا کچھ نہیں۔ لیکن اب میں سمجھتا ہوں کہ زندگی زنجیر کا دائرہ ہے جس کی آخری کڑیاں بھی آپس میں جوڑ دی گئی ہیں۔ زنجیر کے اس دائرے میں زندگی اور موت، جبر اور قدر کے مسئلے بھی سمٹ آتے ہیں۔ ہے نا مولانا——''

''کچھ نہیں کہہ سکتے عمر بھائی، یہ بھی اس کا احسان ہے کہ اُس نے ہم سے بہت کچھ چھپا رکھا ہے۔ ایک وقت ان دنوں میں ایسا بھی آیا جب میں نے مستقبل کی باتیں اس طرح ہوتے دیکھیں جیسے میری نظروں کے سامنے ہو رہی ہوں، بہت کڑا وقت تھا وہ—— شکر ہے کہ گزر گیا۔''

''اچھا! کیا دیکھا آپ نے مولانا؟'' چاچا جی نے بے صبری سے پوچھا۔

''مت پوچھیے، کیا فائدہ۔'' مولانا نے دُکھ سے کہا۔ ان کا چہرہ فرطِ جذبات سے چولھے پر تپے ہوئے توے کی طرح جل اُٹھا تھا۔ ''میں نے سرنگ کھودتے ہوئے سپاہی دیکھے—— بھاگنے کی کوشش میں انھیں گولیاں کھاتے دیکھا—— کتوں کو اُن کی ٹانگوں کو بھنبھوڑتے دیکھا۔ مت پوچھیے، یہ سب جاننے میں کوئی راحت نہیں ہے بھائی—— بہت پریشان کن چیز ہے، کسی کے گلے میں پھانسی کا پھندا ہے یہ۔ یہ جس کے اشارے پر سب کچھ ہو رہا ہے، یہ بھی کتنے دن کا ہے۔ میں نے اُس کا خون خود اس کے گھر کی سات سیڑھیوں پر پڑے دیکھا۔ بہت خوف ناک ہے یہ سب کچھ۔ اب چلوں گا بھائی۔'' انھوں نے دروازہ کھولا۔ مجذوبوں کی طرح بڑبڑاتے، چھوٹے چھوٹے قدم رکھتے اُترے اور گلی کی طرف کا دروازہ کھول کر اندھیرے میں چپ چاپ غائب ہو گئے۔ پھر انھوں نے مڑ کر نہ دیکھا۔

چاچا جی کو اپنے تایا حاکم خاں کی بہت پرانی ایک بات یاد آئی کہ مستقبل پر پردہ ہی پڑا رہے تو اچھا ہے۔ زندگی نے زری سے معرکہ آرائی کی شاید قسم کھا رکھی تھی۔ عین لڑائی کے دنوں میں جب تخلیق کا

درد اُٹھا تو اُسے یوں محسوس ہوتا تھا جیسے جسم کی نسوں کے ساتھ دماغ کی رگیں بھی کھنچ رہی ہوں۔ جیسے وہ درد کی کسی ایسی باؤلی میں اُترتی جا رہی ہو جس کی تھاہ نہ ہو۔ لیبر روم میں درد کی لہروں کے ساتھ ہوائی حملے کے سائرن کی لہریں بھی اُبھر اور ڈوب رہی تھیں۔ جسم کے ساتھ دماغ میں بھی ہزاروں مروڑے پڑ رہے تھے۔ بچّے کی پیدائش کے ساتھ لگا تھا جیسے جان بھی اس کے جسم سے نکل گئی ہو۔ بیٹے کی پیدائش کی اطلاع دے کر ایک نرس بچے کو لے کر چلی گئی تھی، ایک نظر بھی اُسے نہ دکھایا تھا۔ وارڈ کے کمرے میں آنے کے بعد بھی ہر وقت دھما دھم بموں کے دھماکے سنائی دیتے تھے اور دل و جان پر گھونسے برستے تھے۔ آیاؤں اور نرسوں کی نگاہیں کہتی تھیں، یہ سب تمھارا کیا دھرا ہے۔ یہ اندھیرے میں ڈوبے اسپتال اور عمارتیں، آگ کے شعلوں میں دہکتا آسمان اور اسٹریچر پر پل پل آتے ہوئے زخمی — ان ساری آفتوں میں وہ مظلوم کی نہیں ظالم کی حیثیت سے شریک تھی۔

وہ لمحے لمحے شمس الرحمٰن کا انتظار کرتی رہی اور جب وہ آیا تو آنکھیں موند کر یوں پڑ گئی جیسے سو رہی ہو۔ شمس الرحمٰن اسے سوتا سمجھ کر کھڑکی میں جا کھڑا ہوا تو اُس کا دل دُکھ سے بھرنے لگا۔ شادی کے پہلے پہلے دنوں کی طرح وہ اسے گود میں بھر کر پیار کیوں نہیں کرتا، وہ اب کیوں نہیں کہتا، نفرت اور جنگ کے بادلوں میں بھی ہمارے پیار کا سورج چمکتا رہے گا۔ یہ شمس الرحمٰن، یہ سور یہ دیوتا صرف تمھارا ہے۔ شمس الرحمٰن کھڑکی سے اکتا کر واپس کرسی پر آن بیٹھا اور پل پل گھڑی دیکھتا رہا۔ جب زری نے آنکھ کھولی تو وہیں بیٹھے بیٹھے پوچھا، ''کیسی طبیعت ہے؟''

''ٹھیک ہے — بچّے کو دیکھا؟''

''ہاں۔''

''مجھے کیوں نہیں دکھاتے؟''

''کمزور ہے۔ انکیوبیٹر (incubator) میں رکھا ہے۔ چند دن میں ٹھیک ہو جائے گا تو لائیں گے۔''

''بہت چھوٹا ہے؟'' زری نے پوچھا۔

''ہاں، وزن کم ہے۔''

''دیکھنے میں کیسا ہے؟''

''بالکل تمھاری طرح۔'' پھر وہ نظریں چُرا کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ زری کا جی چاہا شمس الرحمٰن کو جھنجھوڑے اور پوچھے، اپنے بچّے کی باتیں اس طرح چبا چبا کر کیوں کرتے ہو، جیسے وہ تمھاری ناجائز اولاد ہو — لیکن وہ خاموش رہی۔ اس نے سوچا، چیخنے چلانے سے محبتوں کے اُڑ جانے والے پرند لوٹ تھوڑا ہی آتے ہیں۔ اندر ہی اندر وہ سسکتی رہی لیکن باہر سے مضبوط رہی، کبھی ہتھیار نہیں ڈالے تو

اب کیسے ڈال دے۔

اب اتنی ہمت اور طاقت بھی تو نہیں تھی کہ لڑ بھڑ کر اپنے دل صاف کرلیں۔ کسی نتیجے پر پہنچ جائیں۔ آخر وہ کس بات کی منتظر تھی — یوں لگتا تھا جیسے وہ کسی گہرے کنویں میں بیٹھی کسی معجزے کی منتظر ہو اور اسے یہ بھی معلوم ہو کہ یہ معجزہ کبھی نہیں ہوگا۔

شمس الرحمٰن آہستہ آہستہ خالی تھرماس، خالی پلیٹیں اور چمچے اُٹھاتا رہا۔ زری کو معلوم تھا کہ کرفیو کے درمیانی اوقات میں وہ بھاگم بھاگ آتا ہے۔ اس کا بھی کیا قصور تھا! چلنے سے پہلے اس نے اس کے گورے ہاتھ پر اپنی سانولی انگلی رکھی پھر آہستہ سے اس کا ہاتھ دبایا اور خدا حافظ کہہ کر کمرے سے باہر چلا گیا۔

۱۴ر دسمبر ۱۹۷۱ء کے دن گورنمنٹ ہاؤس میں شیشے کے کیس میں تیرتی مچھلیوں کو باہر کی کچھ خبر نہ تھی۔ ایک سنہری مچھلی نے منّی سی کالی شارک سے کہا، ''تو نے کبھی سمندر دیکھا ہے؟''

''نہیں، میں تو یہیں پیدا ہوئی تھی۔ تم نے دیکھا ہے؟''

''ہاں، کبھی بچپن میں دیکھا تھا — اتنا بڑا، اتنا بڑا کہ تم اس مستطیل پانی میں پیدا ہونے والی اس کا اندازہ بھی نہیں کر سکتیں؟''

''کیا ہم کبھی دوبارہ سمندر میں جائیں گے، کیا میں بھی سمندر دیکھ سکوں گی؟'' منّی سی شارک نے پوچھا۔

''اُمید پر دُنیا قائم ہے۔'' سنہری مچھلی نے کہا۔

''تمھیں کب توڑا گیا تھا؟'' نیلے چینی کے خوب صورت گلدان میں لگے ہوئے پھول نے اپنی پڑوسن کلی سے پوچھا۔

''آج ہی — اور تمھیں؟''

''مجھے بھی۔ کیبنٹ میٹنگ کی سجاوٹ کے لیے، میں نے باغ کی کچھ بہار تو دیکھ لی، افسوس کہ تو نے کچھ بھی نہ دیکھا۔''

''میں نے آنکھ کھولی ہی تھی، مجھے ایک خوش گوار سی ہوا اور لطیف سی خنکی کا احساس ہوا تھا کہ مالی نے مجھے شاخ سے جدا کر لیا۔ کیا ہم کبھی دوبارہ باغ میں نہ جا سکیں گے؟'' کلی نے پوچھا۔

''دوبارہ؟'' پھول افسردگی سے ہنسا۔ عین اسی وقت دھماکا ہوا۔ گورنمنٹ ہاؤس کے بائیں حصے پر بھارتی فضائیہ نے بمباری کی تھی۔ گورنر اپنے وزرا اور سیکریٹریوں کے ساتھ باہر خندقوں کی طرف لپکے۔ چھت کا ملبہ شیشے کے کیس پر گرا۔ مچھلی گھر کا شیشہ چھناکے سے ٹوٹا۔ مچھلیاں، پھول اور کلیاں اس ملبے پر گریں۔ گورنر کا سیکریٹری دھول اور دھوئیں میں اٹا کھانستا ہوا گورنر کو ڈھونڈتا پھر رہا تھا۔ اس کا پاؤں خاموش پڑی کلی اور تڑپتی سنہری مچھلی پر پڑا، لمحے بھر میں دونوں روندے گئے۔ باقی مچھلیاں اور ننھی سی کالی شارک پہلے ہی ٹھنڈی ہو چکی تھیں۔ سب لوگوں کو باہر کی طرف جاتے دیکھ کر سیکریٹری بھی گورنر کے بنکر کی طرف بڑھا۔ ایک بار اور ہوائی حملہ ہوا۔ اب ساری عمارت میز پر دھرے ہوئے کسی عمارت کے ماڈل کی طرح خالی اور سنسان تھی۔ صرف اندر کسی کمرے میں ٹیلی فون کی گھنٹی کسی دُکھی دل کی پکار کی طرح مسلسل چیخ رہی تھی۔

''اپنی فیملی کو آج انٹر کانٹی نینٹل بھیج دُوں یا کل؟'' گورنر نے اقوامِ متحدہ کے نمائندے جان کیلی (John Kelly) سے پوچھا۔ سن ڈے آبزرور، لندن کا نمائندہ گیون ینگ (Gavin Young) جھک کر غور سے ان کی باتیں سننے لگا۔

''ابھی، اسی وقت۔'' عین اسی وقت ایک اور حملہ ہوا۔ جان کیلی کی آواز شور میں دب کر رہ گئی۔ گورنر ہاؤس سے مٹی کا ایک اور ریلا اُٹھا۔

گورنر نے اپنے بریف کیس سے ایک کاغذ نکالا۔ اسی بریف کیس پر کاغذ رکھ کر یحییٰ خان کے نام اپنا اور اپنی کیبنٹ کا استعفیٰ لکھا اور مسٹر کیلی کے حوالے کیا۔

پھر بغیر کچھ کہے سنے گورنر نے اپنے جوتے موزے اتارے، برابر کے غسل خانے میں جا کر وضو کیا، سر پر رومال باندھا اور بنکر کے ایک کونے میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگے۔ گیون ینگ نے بنکر کے دروازے سے باہر جھانکا۔ تیسرے ہوائی حملے سے گرا عمارت کا ملبہ آہستہ آہستہ زمین پر اپنی جگہ بنا رہا تھا۔ کئی درخت گر گئے تھے۔ خندقیں آدمیوں سے لبالب بھری ہوئی تھیں۔ خندقوں میں جگہ نہ پا کر کچھ لوگ درختوں اور کاروں کے نیچے چھپے ہوئے تھے۔ دو حملوں کے دوران کچھ لوگ ہمت کر کے خندقوں سے نکلتے اور انٹر کانٹی نینٹل کا رُخ کرتے جو غیر جانب دار علاقہ تھا۔ درختوں اور کاروں کے نیچے چھپے ہوئے لوگ ان کا ساتھ دیتے یا ان خندقوں میں ان کی خالی جگہ پُر کر دیتے —— یہ جگہ کتنی پُرسکون اور باوقار ہوا کرتی تھی، اُس نے سوچا۔

شام تک جب ہوائی حملے بند ہو گئے اور بظاہر سکون ہو گیا تو وہ سب جو گورنر ہاؤس کے قیمتی قالینوں پر دھری اونچی کرسیوں پر بیٹھ کر قوم کی قسمتوں کے فیصلے کرتے تھے، لٹے ہوئے قافلے کی مانند

ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل پہنچے، افسردہ، نڈھال اور مایوس سر جھکائے، سست قدم، نیند میں چلنے والوں کی طرح اندر داخل ہو رہے تھے۔ کیمرے ہمیشہ کی طرح ان کی تصویریں کھینچ رہے تھے۔ ان میں اتنا بَل نہ تھا کہ ان کیمروں سے بچ کر نکل سکیں ورنہ ایسے وقت جب ان کے چہرے دھول اور کالک سے اَٹے ہوئے تھے، بکھرے بال مٹی سے بھرے ہوئے تھے، آنکھوں میں زندگی سے ندامت اور موت کی دہشت تھی۔۔۔۔ تصویر اُتروانا ان کے لیے سب سے بڑی اذیت تھی۔

بینو اسپتال پہنچی تو نرس نے کہا، ''اپنے مریض کو سمجھائیے۔ اس نے دروازہ اندر سے بند کرلیا ہے، یہاں کسی کو دروازہ بند کرنے کی اجازت نہیں ہوتی۔''

''بات کیا ہے؟'' بینو نے پوچھا۔

''بے بی مر گیا ہے۔'' نرس نے جواب دیا۔

''کیسے؟'' بینو حیران ہوئی۔

''بلیو بے بی تھا — آپ نے نہیں دیکھا تھا۔ پیدا ہوا تھا جب سے کبھی کبھی نیلا ہو جاتا تھا۔''

بینو نے کئی مرتبہ دروازہ کھٹکھٹایا۔ بہت منت سماجت کی تب زری نے دروازہ کھولا۔ بینو جا کر زری سے لپٹ گئی۔

''انھوں نے میرے بچے کو مار دیا ہے۔ انھوں نے جان بوجھ کر میرے بچے کو مارا ہے۔'' بینو نے غور سے زری کے چہرے کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھ میں آنسو نہیں تھے مگر معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت دیر تک روتی رہی ہے۔ اُس وقت اُس پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔

''نہیں زری آپا، وہ بلیو بے بی تھا۔ نرس نے مجھے بتایا ہے۔ شاید شمس بھائی کو یہ بات معلوم ہو۔''

''وہ بلیو بے بی نہیں ہو سکتا۔ یہ سب ان کی بہانے بازیاں ہیں۔''

''آپ خود کو سنبھالیے، میں دو منٹ میں ڈاکٹر سے مل کر آتی ہوں۔'' بینو نے کہا۔

''نہیں، تم نہ جاؤ بینو۔ یہ کسی کو نہیں چھوڑیں گے۔ نہ تمھیں، نہ مجھے۔''

''ذرا آہستہ بولیے۔ یہاں کسی کو نہیں معلوم کہ میں کون ہوں۔'' بینو نے کہا۔

''مگر کب تک چھپاؤ گی، جیسے ہی انھیں پتا چلے گا یہ تمھیں مار دیں گے جیسے میرے بچے کو مار دیا۔'' زری ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

''خدا کے لیے ہوش میں آیئے زری آپا، ایسی باتیں شمس بھائی کے سامنے نہ کیجیے گا۔ آج کل سب بے حد پریشان ہیں، کوئی بھی بُرا مان سکتا ہے۔'' بینو نے کہا۔

''نہیں، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ سب بہت اطمینان سے مار رہے ہیں۔ تم ذرا اسپتال میں چل پھر کر دیکھو کہ اس دُنیا میں کیا کیا ہوتا ہے۔ سارے لیبر روم بھرے پڑے ہیں، برآمدوں میں اسکرین لگا کر پیاری پیاری لڑکیوں کو ڈال رکھا ہے جو اپنے خوب صورت پیارے پیارے بچوں کے مرنے کی دُعائیں مانگ رہی ہیں اس لیے کہ انھیں نہیں معلوم کہ وہ کس کم بخت کی اولاد ہیں۔ یہ ان سور ماؤں کے کارناموں کا نتیجہ ہیں جو یہاں کی نسلیں بدلنے آئے تھے اور ان سور ماؤں کی جو دیش کی آزادی کے لیے اُٹھے تھے اور اپنی ہی ماں بہنوں کو خوار کیا تھا۔ اب یہ دونوں سورما اپنا ملک ایک تیسرے ملک کے حوالے کر دیں گے۔'' بینو یکایک زری کے گلے میں بانہیں ڈال کر رونے لگی۔

''ایسا کیوں ہوتا ہے زری آپا، جب بھی کوئی انقلاب آتا ہے تو عورت کو کس بات کی سزا ملتی ہے، عورت کیوں رُلتی ہے؟''

''اس لیے کہ اسے مارنا سکھایا نہیں گیا—— اسے صرف پٹنا، رُلنا اور مٹی میں ملنا ہی سکھایا گیا ہے۔ میں کہتی ہوں کہ آج اگر ساری دُنیا کی عورتیں یہ فیصلہ کرلیں کہ وہ کوئی بچہ پیدا نہیں کریں گی جب تک ساری دُنیا میں امن نہ ہو جائے، جب تک سارے تباہ کن ہتھیار ختم نہ کر دیے جائیں تو کیا مردوں کے دماغ ٹھکانے نہ آ جائیں لیکن عورتوں کو اتنی عقل کون دے، وہ اپنی طاقت سے واقف کیسے ہوں؟''

''اچھا زری آپا، میں ابھی ایک منٹ میں آئی۔'' بینو کو یاد آیا کہ وقت کم ہے اور کام بہت۔ ''اگر ڈاکٹر اجازت دے دے تو آپ میرے ساتھ چلیے، وہاں آپ کی بہتر دیکھ بھال ہو سکے گی مگر ایک بات یاد رکھیے گا، میری سسرال میں ہر نسل کا ایک الگ نظریہ ہے۔ ساس اور سسر مسلم لیگی اور پکے پاکستانی ہیں لیکن میری نند اور دیور جوان لوگ ہیں اور ان کے خیالات آپ جانتی ہیں۔''

''میں تمھارے ساتھ نہیں جاؤں گی۔'' زری نے سختی سے کہا۔

بینو نے تھوڑی دیر کے لیے اُسے تنہا چھوڑنا مناسب سمجھا۔ وہ ڈاکٹر کے کمرے میں گئی۔ ڈاکٹر راؤنڈ پر تھی۔ ایمرجنسی میں مریضوں کی بھیڑ تھی۔ اسٹریچر پر زخمی چلے آ رہے تھے۔ لوگ کرفیو سے پہلے واپس جانا چاہتے تھے۔ ہر طرف شور وغوغا اور افراتفری کا عالم تھا۔ شمس بھائی اب تک نہیں آئے۔ بینو

کے دل میں شک کا کانٹا کھٹکا۔نہیں، یہ نہیں ہوسکتا۔ وہ خود سے اُلجھتی کمروں اور برآمدوں کا چکر کاٹتی رہی۔ واقعی سب سے زیادہ ستم عورت پر ہی ٹوٹتے ہیں۔ ہر نیا ملک عورت کی ناموس کی قیمت پر بنتا ہے، اور ناموس کے یہ دشمن کیا قسم کھا کر کہہ سکتے ہیں کہ ان کے آباؤ اجداد کا ایک قطرۂ خون بھی مقتول میں شامل نہیں۔

بینو دوبارہ ڈاکٹر کے کمرے میں آئی تو وہ راؤنڈ سے واپس آ چکی تھی مگر زری کو ابھی گھر بھیجنے کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہ ذہنی طور پر صحت مند نہیں تھی، بے حد جذباتی اور حساس ہو رہی تھی۔ اسے نیند کی دوا دی گئی تھی۔ سونا اور آرام کرنا ہی اُس کے حق میں بہتر تھا۔ بینو ڈاکٹر کو یقین دلاتی رہی کہ اُس کے گھر میں زری کو یہاں سے زیادہ آرام مل سکتا ہے اور ذہنی آسودگی بھی۔ ڈاکٹر نے چڑ کر کہا کہ اس وقت کسی کو اسپتال سے جانے کی اجازت نہیں دی جاسکتی، صبح کو بڑی ڈاکٹر مریضہ کی حالت دیکھ کر اجازت دے سکتی ہے۔

مایوس ہو کر بینو لوٹی تو زری کمرے میں نہیں تھی۔ البتہ غسل خانے سے پانی گرنے کی آواز آ رہی تھی۔ کیا یہ بہتر نہ ہو کہ آج رات وہ خود زری کے ساتھ اسپتال میں رہ جائے۔ بینو نے سوچا۔ کیا گھر پر فون کر لے۔ خاصی دیر ادھیڑ بن کرنے کے بعد اُسے یاد آیا کہ زری ابھی تک غسل خانے سے نہیں نکلی تھی اور پانی گرنے کی آواز ایک سار آ رہی تھی۔ بینو نے غسل خانے کا دروازہ کھولا، زری اندر نہیں تھی، نہ اس کا صابن اور ٹوتھ پیسٹ تھا۔ جلدی سے الماری کھول کر دیکھی تو وہ بھی خالی تھی۔ بینو نے نرس کو اطلاع دی۔ سارے اسپتال میں بھگدڑ مچ گئی، کونا کونا دیکھا گیا، چاروں طرف لوگوں کو دوڑایا گیا مگر زری کا کہیں پتا نہ تھا۔ بینو نے شمس الرحمٰن کو فون کیا تو وہاں سے بھی کسی نے نہیں اُٹھایا۔

جس ٹیکسی میں وہ آئی تھی اور اس سے انتظار کرنے کو کہا تھا، وہ بھی غائب تھی۔ دروازے پر چند ٹھیلے والے اپنے ٹھیلوں پر درختوں کی ٹہنیاں سجائے پھل اور کھانے پینے کی چیزیں بیچنے میں مصروف تھے۔ ایک رکشا کسی مریض کو لے کر آئی۔ مریض کے اُترتے ہی بینو اس میں بیٹھ گئی تاکہ گھر روانہ ہو اور اکرام کی مدد سے زری کو تلاش کرے۔

عبدل ٹیکسی ڈرائیور نے سڑک کے کنارے فٹ پاتھ پر ایک عورت کو سفید ساری سے سر ڈھانپے کھڑے دیکھا۔ وہ اپنی ٹیکسی بڑھا کر نزدیک لے گیا۔ ابھی ابھی وہ ایک غیر ملکی نامہ نگار کو انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل چھوڑ کر آ رہا تھا۔

"تمی بانگالی نا کی؟" عبدل نے پوچھا۔

''ہیں، اُمی بانگالی۔'' عورت کا لہجہ بنگالی نہ تھا اور ساری کے پلّو سے اَدھ چھپا چہرہ دُھلے لٹھے کی طرح سفید تھا۔

''آپنار باڑی کوتھائے؟''

''سلہٹ۔'' جواب ملا۔

''ہم آپ کو جانتا ہے۔'' ٹیکسی والے نے آگے جھک کر آہستہ سے کہا۔

''مجھے!'' زری حیران ہوئی۔ اُس نے سر کا پلّو کچھ اور آگے کھینچ لیا۔

''یاد ہے مئی میں الیاس مرجا کو گولی لگی تھی تو ہم اپنی رِکسا میں اسے گھر لے گیا تھا۔ آپ نے ہم کو پیشا دینے کی بہت کوشش کی تھی مگر ہم نے نہیں لیا تھا۔ ہم میت کے ساتھ قبرستان بھی گیا تھا۔''

''بنگلہ میں بات کرو، خدا کے لیے بنگلہ میں بات کرو۔'' زری نے آہستہ سے کہا۔

''میں خود بہاری ہوں۔'' عبدل نے رواں بنگلہ میں کہا، ''مگر خود کو بنگالی بتاتا ہوں۔ اُس زمانے میں سائیکل رکشا چلاتا تھا۔ جاتے جاتے ایک صاحب اپنی کار سستی دے گیا۔ میں نے اُس کے لیے کچھ پیسے دے دلا کر ہوائی جہاز کے دو ٹکٹ کا بندوبست کیا اور بس۔ اُس کی کار میں نے ٹیکسی بنالی۔ آپ جہاں جانا چاہیں، بتادیں، میں چھوڑ دُوں گا، لیکن آج کل باہر نکلنا خطرناک ہے۔''

زری جلدی سے اس کی ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ اسے قطعی اندازہ نہ ہوا کہ وہ بہاری ہے یا بنگالی۔ دونوں زبانوں میں اس کا لہجہ بتارہا تھا کہ وہ یہیں پیدا ہوا، اور یہیں پلا بڑھا تھا۔

''اپنی جابن کوتھائے؟'' عبدل نے ٹیکسی اسٹارٹ کی۔

''میرا کوئی گھر نہیں ہے۔'' زری کی اس بات پر عبدل نے چونک کر اُس کی طرف دیکھا۔ ''ہاں یہی سمجھ لو کہ اب میرا کوئی گھر نہیں ہے، تمھارے گھر میں عورتیں تو ہوں گی؟''

''بہت ہیں۔'' عبدل نے کہا۔

''تو مجھے اپنے گھر لے چلو۔'' زری نے کہا۔ عبدل نے حیران ہو کر زری کو دیکھا۔

''اوہ ماں! آپ کو نہیں معلوم ہم میر پور کے لوگ تو خود مصیبت میں ہیں۔ بارہ نمبر، گیارہ نمبر، چھ نمبر، سب پر بڑی آفت ہے۔ کرفیو لگا ہوتا ہے تب بھی نہیں چھوڑتے۔ ہمارا بس چلتا ہے تو ہم بھی نہیں چھوڑتے۔ پوری پوری بسیں لے جا کر جلا کر پھینک دیں ہیں ہم نے۔ میں تو ٹیکسی بونو گرام میں ایک جگہ کھڑی کرتا ہوں۔ ایک غیر ملکی نامہ نگار مسٹر ڈیوڈ نے مجھے مستقل لگالیا ہے۔ بس اسی کو لے کر اِدھر اُدھر جاتا ہوں۔ وہ بھی بڑا جیالا ہے، جگہ جگہ پھرتا رہتا ہے۔ مجھے بڑا ڈر لگتا ہے مگر وہ پیسے خوب دیتا ہے۔''

''اچھا پھر تم ہی بتاؤ میں کہاں جاؤں۔ جہاں میں رہتی تھی وہاں اب میرا ٹھکانا نہیں ہے۔'' زری نے کہا۔

''میں سمجھتا ہوں، سگوں نے آنکھیں بدل لی ہیں۔ آپ یوں کریں کہ ہوٹل اِنٹر کانٹی نینٹل چلی جائیں۔ ابھی ہماری ٹیکسی کے آگے ریڈ کراس کی گاڑیوں میں گورنر صاحب اور سارے وزیر ہوٹل میں گئے ہیں۔ ڈیوڈ صاحب نے مجھے بتایا تھا۔''

''میرے پاس زیادہ پیسے نہیں ہیں، میں وہاں نہیں رہ سکتی۔'' زری نے کہا۔

''آپ کو وہاں پناہ مل جائے گی، وہاں بہت سے پچھمی پاکستانی ہیں ریڈ کراس کی پناہ میں۔ آج کل پیسوں کی ضرورت نہیں ہے۔'' عبدل نے کہا اور ٹیکسی کا رُخ ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل کی طرف کر لیا۔

''ہو سکتا ہے مجھے پناہ نہ ملے'' زری کے لہجے میں شک تھا۔

''آپ جایئے تو سہی۔ میں باہر کھڑا رہوں گا، آپ سیدھی ڈیوڈ صاحب کے پاس چلی جائیں اور میرا نام لے دیں، کہیں عبدل نے بھیجا ہے۔'' عبدل نے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

زری اپنے حواسوں میں ہوتی تو اس بات پر چھنکار دار قہقہہ لگاتی مگر اب وہ خاموش رہی۔

''یہ دُنیا بڑے آدمیوں کی ہے بی بی۔'' عبدل بولتا رہا۔ ''آپ بھی کسی بڑے آدمی کی بیوی لگتی ہیں، آپ بھی وہاں جا سکتی ہیں۔ آپ نے تو دیکھا ہوگا، بڑے بڑے بزنس مین پہلے ہی نکل گئے، بڑے بڑے لوگ ہوائی جہازوں میں بیٹھ کر چلے گئے۔ مصیبت تو ہم غریبوں کی ہے۔ آرمی ایکشن سے پہلے ہم مرے۔ کالی وردیوں والے آئے تو ہماری لڑکیوں کو پکڑ کر لے گئے۔ مکتی باہنی والے آئے تو ہماری لڑکیوں کو لے گئے۔ بنگالیوں کے بھی کھاتے پیتے خاندان امریکا، انگلستان بھاگ گئے۔ یہ مڈل کلاس یا دیہات کے رہنے والے اسکول کالجوں کے لڑکے ہیں جو مکتی باہنی میں لڑ رہے ہیں۔ ویسے آپ نے ریڈیو سُنا، ہندوستانی جنرل نے کہا ہے کہ کل صبح نو بجے تک ہتھیار ڈال دو۔ مگر فکر کی کوئی بات نہیں ہے، ہم ایسی آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالیں گے، ڈھاکا کی ایک ایک گلی میں لڑائی ہوگی۔''

وہ اُس وقت شاہ باغ ایونیو سے گزر رہے تھے — کیا یہاں بھی لڑائی ہوگی، زری نے سوچا۔ ڈھاکا کی کئی گلیاں اور سڑکیں اُس کے ذہن کے پردے پر اُبھریں ہرا بھرا جھومتا مسکراتا ڈھاکا، جو اب مسلسل ہوائی حملوں کی زد میں تھا۔

''ہوٹل آ گیا'' عبدل نے کہا۔

زری نے پیسے دینے کے لیے پرس کھولا تو عبدل بولا ''سو برابر ہے جو آپ سے کچھ لوں۔''

زری نے اُس کا شکریہ بھی ادا نہ کیا۔ صرف اُس کی طرف احسان مندی سے دیکھا اور اپنا چھوٹا

سا سوٹ کیس گھسیٹتی اندر چلی آئی۔

مستعفی گورنر، وزیر اور سیکریٹری میلے کچیلے کپڑوں اور بکھرے بالوں کے ساتھ فارم بھر رہے تھے۔ شاید اسے بھی ان کا ساتھی سمجھ کر فارم دے دیا گیا۔ ایک سیکریٹری جس کو مین میخ نکالنے کی عادت تھی، بڑے غور سے فارم پڑھ رہا تھا۔

''سر نیوٹرل زون میں تو وہی لوگ رہ سکتے ہیں جن کا فریقین میں سے کسی کے ساتھ کوئی واسطہ نہ ہو۔'' اُس نے کہا۔

''ہم استعفیٰ دے چکے ہیں اور ریڈ کراس کی پناہ میں یہاں آئے ہیں۔'' گورنر نے آہستہ سے کہا۔

''تو کیا ہم لکھیں کہ ہم بے زمین ہیں، ہمارا کوئی وطن نہیں ہے اور اس علاقے سے ہمارا کوئی تعلق نہیں ہے۔'' زری کی آواز سناٹے میں پھٹے بانس کی طرح گونجی۔ کئی لوگوں نے اپنے اپنے فارم سے نظر اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور پھر فارموں پر جھک گئے۔

''خاتون آپ کو جان عزیز ہے کہ نہیں!؟'' ایک وزیر نے خوں خوار نظروں سے اس پاگل عورت کو دیکھا جو فارم بھرنے کے بجائے پھٹی پھٹی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔

گورنر کی آسٹریلین بیوی اور بیٹی کاؤنٹر سے کمرے کی چابی لے کر تھکے تھکے قدموں سے لفٹ کی طرف جا رہی تھیں۔

سب ابھی تک فارموں پر جھکے ہوئے تھے جیسے وہ اعمال نامے ہوں جو بائیں ہاتھ میں تھمائے گئے ہوں۔

''ابھی یہاں ایک خاتون فارم بھر رہی تھیں؟'' جان کیلی نے جیسے اپنے آپ سے پوچھا۔

''ہاں، بھر تو رہی تھیں۔'' کسی نے کہا۔

''کہاں گئیں؟''

''معلوم نہیں۔ ایک فارم تو یہاں پڑا ہے۔'' جان کیلی نے فارم اٹھا کر دیکھا۔ اس پر انگریزی میں بڑا بڑا لکھا تھا: ''پاکستان زندہ باد''۔۔۔ اور نیچے دستخط تھے جو پڑھے نہیں جا رہے تھے۔

جان کیلی تیزی سے صدر دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ ایک ٹیکسی میں بیٹھ رہی تھی کہ جان نے اُسے جا پکڑا۔ وہ ہٹ دھرمی سے جانے پر مصر تھی اور وہ اسے بچوں کی طرح بہلا پھسلا رہا تھا کہ وہ اس کے ہوٹل میں ٹھہرنے پر اصرار نہیں کرے گا، وہ تھوڑی دیر اس سے بات تو کر لے اور پھر وہ اسے استقبالیہ کے ایک صوفے پر بٹھا کر شفقت بھری آنکھوں اور نرم آواز کے ساتھ بہت دیر تک سمجھاتا رہا کہ حالات جو ہوتے ہیں بعض اوقات سائیکلون کی طرح ہوتے ہیں کہ نہ اس کو روکا جا سکتا ہے نہ اس

کا رُخ بدلا جاسکتا ہے۔ پھر اُس نے کہا، ''تم فارم نہیں بھرنا چاہتیں تو نہ بھرو۔ تم میری ذاتی مہمان ہو، اس پر تو تمھیں کوئی اعتراض نہیں۔'' وہ زمی سے مسکرایا، ''کوئی تم سے کچھ نہیں پوچھے گا، میں بھی کچھ نہیں پوچھوں گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ہر شخص کی کوئی نہ کوئی دردناک داستان ہے — مگر ایک بات ضرور پوچھوں گا، تم مجھے بیمار لگ رہی ہو۔ مجھے بتاؤ کیا تم بیمار ہو؟''

زری نے اثبات میں گردن ہلا دی۔

''میں تمھیں کمرہ دلوائے دیتا ہوں، بس تم آرام کرو۔ نیچے آنے کی ضرورت نہیں، تمھارا کھانا کمرے میں پہنچ جائے گا۔'' یہ کہہ کر وہ کاؤنٹر پر گیا۔ رجسٹر میں اندراج کروایا، ایک چابی لی اور پورٹر سے کہا، ''لیڈی کا سوٹ کیس لے جاؤ اور ان کو کمرے تک پہنچا کر آؤ۔''

شام کو وہ ایک ڈاکٹر لے کر زری کے کمرے میں آیا۔ ڈاکٹر نے زری کی کیس ہسٹری سنی اور اسے مکمل آرام کا مشورہ دیا۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد بھی وہ تھوڑی دیر زری کے پاس بیٹھا رہا۔ زری نے اس سے صحیح صورتِ حال جاننے کی فرمائش کی۔

''جنرل نیازی نے امریکن سفارت خانے کے ذریعے ہتھیار ڈالنے کی پیش کش کی ہے مگر اس میں یہ شرط ہے کہ اسے جنگ بندی کہا جائے گا۔ جنرل مانک شا تک بھی یہ خبر پہنچ گئی ہے۔ انھوں نے کہا ہے کہ جنگ بندی کا کوئی سوال نہیں ہے۔'' اس نے کہا۔ ذرا توقف کے بعد وہ بولا، ''اب کل کیا صورتِ حال ہوتی ہے اُس کا پتا کل چلے گا۔ تم زیادہ سوچنا مت اور خوب آرام کرنا۔ ہاں اگر دل چاہے تو چند جملوں میں اپنی بات کچھ بتا دو۔''

''چند جملوں میں یہ ساری باتیں کہاں بتائی جاسکتی ہیں۔'' زری نے کہا۔ ''واقعات کا ایک ریلا سا آتا ہے اور زبان پر آ کر رُک جاتا ہے۔ یادوں کی آندھیاں سی چلتی ہیں، ذہن میں بگولے ناچتے ہیں اور سب کچھ گڈمڈ ہو جاتا ہے۔ اگر آپ سمجھ رہے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے، میں اُسے بڑے سکون سے دیکھ رہی ہوں، تو یہ غلط ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے اسے میں اس طرح دیکھ رہی ہوں جیسے کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔''

''اچھا اچھا، تم لیٹ جاؤ۔ شب بخیر۔'' وہ اپنے پیچھے دروازہ بند کرتا ہوا باہر نکل گیا۔

زری ساری رات اور سارا دن نہ جاگی نہ سوئی، نہ ہوش میں رہی نہ بے ہوش۔ جب آنکھ کھلتی تو آنکھیں بند کر لینے اور سو جانے کی بے پناہ خواہش اسے پھر بے خودی کی لہروں میں ڈبو دیتی۔ کبھی کبھی یوں محسوس ہوتا جیسے اس کے ذہن میں اچھوتے اور نادر خیالات آ رہے ہیں۔ جب ذرا ہوش آتا تو وہ خیالات اس کے ذہن سے دُور ہو چکے ہوتے اور وہ انھیں دوبارہ ذہن میں لانے کی کوشش بھی نہیں کرتی۔ وہ جاننا بھی نہیں چاہتی تھی کہ وہ کیا تھے۔ وہ اپنے بارے میں بھی کچھ سوچنا نہیں چاہتی تھی، وہ کسی چیز کے بارے میں سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ گہری، میٹھی، بے خود نیند سونا چاہتی تھی، اس میں ڈوب جانا چاہتی تھی۔ نیند اسے خود آغوش میں بھینچے لے رہی تھی لیکن ہوائی حملوں کے دھماکے ان کے وصل میں خلل ڈال رہے تھے۔

ان دھماکوں سے جاگتی تو کبھی کبھی یہ جاننے کی کوشش ضرور کرتی کہ وہ کہاں ہے۔ اسے اندازہ ہوتا کہ ہوٹل کا صاف ستھرا نفیس کمرہ ہے مگر اندھیرا — شاید آج کل دن نہیں ہوتا، رات ہی رہتی ہے۔ کسی وقت دو مہربان چہرے آتے، جان اور ڈاکٹر۔ ڈاکٹر کی دواؤں اور انجکشنوں سے زری کو کوئی فائدہ محسوس نہیں ہو رہا تھا سوائے اس کے کہ نیند گہری اور گہری ہو جاتی تھی۔ شاید ڈاکٹر یہی چاہتا تھا۔

ایک مرتبہ ایسے ہی کسی وقفے میں زری کے کان میں جان کی آواز آئی جو ڈاکٹر سے کہہ رہا تھا:

''جنرل مانک شا نے آخری الٹی میٹم دے دیا ہے۔ آج شام پانچ بجے سے صبح نو بجے تک ہتھیار ڈالنے کی مہلت ہے۔ اس دوران فضائی حملہ بھی بند رہے گا۔ اس کے بعد وہ تمام فوجی اڈے

تباہ کر دینے کی دھمکی دے رہا ہے۔"

زری کو یقین نہیں تھا کہ یہ بات اس کے کانوں نے سنی ہے یا یہ بھی ان ہی خوابوں کا حصہ ہے جو وہ جاگتے سوتے دیکھ رہی ہے۔ اس کا ذہن کنوئیں میں پڑے ہوئے ڈولوں کی طرح ذرا دیر کو اوپر آ کر پھر تہہ میں ڈوب چکا تھا۔

اس اندھیرے میں، جو اندر باہر پھیلا ہوا تھا، اس کا ذہن چند لمحے کو روشن ہوا اور پھر بھوک کی چمک نے اس کے معدے کو کھرچا۔ ٹٹول کر اس نے بیڈ سائڈ ٹیبل پر رکھی ہوئی موم بتی جلائی اور اُٹھ کر ریفریجریٹر کا معائنہ کیا۔ اس میں دودھ، پانی اور تھوڑے سے پھل موجود تھے۔ زری نے پھل کھائے، دُودھ پیا اور اپنے آپ سے کہا، "میں بیمار نہیں ہوں، مجھے طاقت کی ضرورت ہے، جسمانی بھی اور ذہنی بھی۔"

اپنی طاقت کو آزمانے کے لیے وہ اٹھی اور کھڑکی تک گئی۔ اس کی توانائی بہت حد تک بحال ہو گئی تھی۔ کھڑکی کا پردہ اُٹھا کر باہر دیکھا۔ بے حد تاریکی تھی۔ یقیناً آدھی رات گزر چکی تھی۔ اس تاریکی میں یکایک ایک چکا چوند سی ہوئی اور اس نے دیکھا کہ ریس کورس کے چاروں طرف شفاف روشنیوں کی پھلجھڑیاں دائرہ سا بنا رہی ہیں۔ کناروں پر لگے ہوئے درخت اس روشنی میں ایک ملکوتی خوب صورتی سے دمکتے اور پھر بجھ جاتے۔

اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ موم بتی بجھا کر وہ دوبارہ اندھیرے میں اُتر گئی۔

فون کسی مریض کی لمبی کراہ کی طرح بجے جا رہا تھا۔ شمس الرحمٰن کے کان شاید اُسے سن رہے ہوں لیکن دماغ بالکل سن تھا۔ زری اسپتال جانے سے پہلے اپنے خطوط اور دیگر کاغذات پھاڑ کر ٹوکری میں ڈال گئی تھی۔ وہ ٹوکری اب اوندھی پڑی تھی اور پھٹے ہوئے کاغذات سارے گھر میں اُڑتے پھر رہے تھے۔ بگلے اور کنول کی نظم کے چھوٹے بڑے ٹکڑے جو شمس نے زری کو اُردو میں ترجمہ کرنے کے لیے دی تھی، اس کے اور چاچا جی کے خطوط، اور زری کے اپنے مضامین، جن میں یک جہتی کا لفظ بار بار آیا تھا۔ شمس الرحمٰن کو محسوس ہو رہا تھا جیسے کاغذ کے یہ پرزے اُس کے ذہن میں اٹا اٹ بھر گئے ہیں۔ ان پرزوں سے گزرتی فون کی آواز کو بہت دیر میں اُس نے سنا۔ سست قدموں سے، جیسے کوئی سوتا ہوا چلتا ہے، جا کر اس نے ٹیلی فون اُٹھایا۔ اُس وقت اس کے ذہن نے بجلی کے کرنٹ کی طرح جھٹکا مار کر کہا، زری!——

مگر وہ زری نہیں تھی۔ اب تک جتنے بھی فون آئے تھے ان میں کوئی بھی زری کا نہیں تھا۔ اس وقت بھی رونجھو بول رہا تھا۔ اس کا لہجہ خوشی سے کنول کے پھول کی طرح کھلا ہوا تھا، "جے بنگلہ —— بھائی سنا تم نے۔ آج شام ریس کورس میدان میں ہتھیار ڈالے جائیں گے، ضرور آنا۔" وہ چاہتا تھا

آواز کے ناتے ہی بھائی کے گلے لگ جائے۔ دونوں اتنے قہقہے لگائیں کہ آسمان سر پر اُٹھالیں۔ لیکن ایسے وقت میں اس نے شمس الرحمٰن کی بجھی ہوئی آواز سنی۔ ''رونجھو! میرا بیٹا مرگیا ہے ــــ اور زری چلی گئی ہے۔''

''کہاں گئی؟'' رونجھو نے پوچھا۔

''معلوم نہیں۔ وہ اسپتال میں نہیں ہے، نہ گھر آئی ہے، ہیوپٹل کسی کو معلوم نہیں کہ وہ کہاں ہے۔''

باہر سے جے بنگلہ کے نعروں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ہوائی فائروں کی صدائیں آ رہی تھیں۔ رونجھو کے سینے میں خوشی کے بلبلے سے اُٹھ رہے تھے۔ گیس بھرے غبارے زمین کی طرف نہیں جاتے، اُوپر ہی اُوپر اُٹھتے ہیں۔ لوگ تو اس کی طرف آ رہے تھے اسے سینے سے لگانے کے لیے، اسے کندھوں پر بٹھانے کے لیے۔ اُس کا جی چاہا، فون پر چلّا کر کہے، خس کم جہاں پاک۔ چلی گئی تو اچھا ہوا۔ مگر اُس کے بھائی کے لہجے میں دُکھ تھا۔ بنگلہ دیش بن گیا تھا، اور اُس کے بھائی کا لہجہ بجھی ہوئی شمع کی طرح سیاہ پوش تھا۔ کیا کوئی خبر بنگلہ دیش بن جانے کی خبر سے بڑی ہو سکتی ہے؟ اس سے زیادہ خوش آئند ہو سکتی ہے!

ڈیم اِٹ (damn it) اس نے کہنا چاہا مگر پھر رُک گیا۔

''میں پھر زری کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''بھائی ٹھہرو، تم گھر پر رہو۔ میں اپنے آدمیوں سے معلوم کرواتا ہوں۔ وہ بہت جلد پتا چلالیں گے۔ انھیں سب معلوم ہے کہ کون کہاں ہے۔''

''دیکھو، اگر زری کو کچھ ہوگیا تو ــــ''

''اس کو کچھ نہیں ہوگا۔ سب کو معلوم ہے وہ میری بھابی ہے۔''

رونجھو کے لہجے میں جو فخر تھا، شمس الرحمٰن نے اس کی کاٹ دل کے اندر کہیں محسوس کی۔ اُس کے بھائی کو اپنے خالص بنگالی ہونے پر بڑا ناز تھا۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ وہ ترک زادہ ہے۔ اُس کا لانبا قد، کتنی ہی نسلوں بعد تپ کر پوری طرح نہ سنولا سکنے والی رنگت اس کی گواہ تھی۔ ان دنوں آنکھوں، بالوں، جسم کی رنگت اور انسانی اعضا کی گواہیاں تسلیم کی جا رہی تھیں۔ ان کی گواہیاں تو قیامت کے دن بھی مانی جائیں گی۔

''بھائی! وہ اپنی مرضی سے کہیں گئی ہوگی، کوئی اُسے لے نہیں گیا ہوگا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔'' رونجھو کہہ رہا تھا۔

''کیا نہیں ہو سکتا، کیا نہیں ہو رہا!؟ کیسی باتیں کر رہے ہو تم۔ فائرنگ کی آوازیں نہیں سن رہے۔'' شمس الرحمٰن بے حد ناراض تھا، ''بنگلہ دیش تو بن گیا ــــ اب یہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں،

کیوں آ رہی ہیں؟''

دھیرج! بھائی دھیرج۔ شادھینتا میں تو یہ سب ہوتا ہے۔ تھوڑی دیر میں تمھیں فون کروں گا، تم گھر پر ہی رہنا۔''

فون بند ہوگیا۔ شمس الرحمٰن نے ریسیور رکھ دیا اور چاروں طرف دیکھا۔ نعروں کی آواز سے فضا گونج رہی تھی۔ کھڑکی میں کھڑا ہو کر وہ باہر دیکھنے لگا۔ ہجوم نعرے لگاتا، شور مچاتا بھاگا جارہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے لڑکوں کے ہاتھوں میں رائفلیں اور بندوقیں تھیں۔ ایسے ہاتھوں میں جنھوں نے کبھی ایئرگن بھی نہیں اُٹھائی تھی۔ بہت سے ہوائی فائر کر کے خوش ہو رہے تھے۔ دیوانے، رقصاں ـــ یہ رقص جذب و مستی کا نہیں تھا مگر وہ اپنے ہوش میں بھی نہیں تھے۔ کیا آج کنول بگلوں کے شکار پر نکلے ہیں!

خیشگی ضلع مردان، صوبہ سرحد کی جھیل کنول کے پتوں اور پھولوں سے پٹی پڑی تھی۔ اتنے بڑے پتے اور پھول شمس الرحمٰن نے زندگی میں کبھی نہ دیکھے تھے۔ اس کے نزدیک ہی کسی زمانے میں پشکلاوتی تھا۔ ''کنول کا شہر'' ـــ جو چھٹی صدی قبلِ مسیح میں گندھارا کا نہایت خوش حال دارالحکومت تھا۔ جب ۳۲۶ ق م کے ایک سہانے اپریل کے دن سکندرِ اعظم یہاں وارد ہوا تھا تو اس شہر کو مضبوط فصیلوں سے بند پایا تھا۔ تیس دن کی لگاتار کوششوں کے بعد سکندر کے جنرل اس کنول کے شہر کو فتح کر پائے تھے۔ یہ نوٹس شمس الرحمٰن نے جھیل کی کشتی میں بیٹھ کر لکھے تھے۔ زری نے کنول کا ایک بڑا سا پتا دھوپ سے بچنے کے لیے چھتری کی طرح سر پر چھالیا تھا۔ کنول کے پتے سے شفاف پارے کی طرح تھرتھراتی بوندیں زری کے کپڑوں پر گری تھیں مگر اسے پتا بھی نہ چلا تھا۔ آبی پرندے آسمان پر اُڑتے ہوئے آتے تھے، جھیل پر جھکتے تھے اور پر مارتے ہوئے دوبارہ اُڑ جاتے تھے۔ نرگس نے زری کی تصویر کھینچی تھی۔ وہ فلم ''شکنتلا'' کی نقل میں کنول کے پتے پر ڈنٹھل سے کسی فرضی عاشق کے نام خط لکھ کر فلم کا وہی پرانا گیت گا رہی تھی۔ وہ دن تھا جب زری کی محبت کا کنول اُس کے دل کے تالاب میں پہلے پہل کھلا تھا۔

اس جھیل کے بعد وہ شہباز گڑھی میں دشتِ سُدلا دیکھنے گئے تھے جہاں مہاتما بدھ نے آخری سے پیشتر کا جنم شہزادہ وسوانتر کی شکل میں لیا تھا اور سخاوت و خیرات کی انتہائی صورت لوگوں کے سامنے پیش کی تھی۔ اُس کے اپنے لوگوں نے اُسے ملک بدر کر دیا تھا۔ اس نے اپنے بیوی بچوں تک کو خیرات کر دیا تھا۔ گیان حاصل کرنے کی یہ آخری تپسیا تھی، اس لیے بیوی بچے سب کچھ اسے واپس مل گیا تھا۔ اس وقت شمس الرحمٰن کو کیا خبر تھی کہ ایک ایسا دشتِ بلا اُس کی زندگی میں بھی آئے گا جہاں وہ

اپنے بیوی بچے سے ہاتھ دھوئے گا۔ لوگ اسے ساعتِ عید قرباں سمجھ کر اس سے جشنِ مسرت میں شریک ہونے کا مطالبہ کریں گے۔ چوں کہ وہ کوئی پیغمبر یا بدھ کا اوتار نہیں ہے اس لیے اس کی زندگی میں کوئی معجزہ نہ ہوگا کہ وہ اپنی بیوی یا بچے کو دوبارہ حاصل کر سکے۔

ابھی رات ہی کو تو وہ نذرالاسلام کی نظم ''سرخاب'' کا آخری بند گنگنا رہا تھا:

اس درد کے گہرے تاریک ساحل پر فرقت زدہ سرخاب
ڈھونڈتا رہتا ہے اپنی رفیقۂ حیات کو
جو طلوعِ آفتاب کے ساتھ نکلتی ہوئی سحر کے
ملاپ کے سنگم پر اسے بآوازِ بلند پکارتی ہے

وہ اس نظم کو سرخاب کے لیے مشہور اس واقعے کی رعایت سے گنگناتا تھا کہ سرخاب کے نر اور مادہ دن بھر ساتھ رہتے ہیں اور رات آنے پر علاحدہ ہوجاتے ہیں اور پھر مادہ طلوعِ آفتاب کے وقت اپنے نر کو پکارتی ہے۔ وہ بھی زری کی آواز سننے کے لیے ہمہ تن گوش تھا مگر اس کی آواز کہیں سے بھی سنائی نہیں دے رہی تھی۔ اس کی رفیقۂ حیات شاید اس کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئی تھی۔ کیا اس میں اس کا کوئی دوش تھا؟

اس صبح اس کا ذہن پوری طرح صاف تھا۔ اتنی دیر کی گہری نیند اور آرام نے اسے بہت تقویت پہنچائی تھی۔ صبح ہوائی حملے کا ایک سائرن بجا تھا اور اب ٹیلی فون بج رہا تھا۔ فون پر کوئی نہایت صاف انگریزی میں اسے چنبیلی روم میں آنے کی دعوت دے رہا تھا۔ پاکستانی فوج ہتھیار ڈالنے پر راضی ہوگئی ہے۔ اس سلسلے میں یہاں قیام کرنے والوں کو کچھ ضروری ہدایات دینی ہیں۔

to hell with you —— زری نے کہنا چاہا، مگر اُسے معلوم تھا کہ بلانے والے شخص پر غصہ اتارنا بدتمیزی کے سوا کچھ اور نہ ہوگا۔ زری نے رُک رُک کر کہا، ''ڈاکٹر نے مجھے آرام کرنے کی ہدایت کی ہے۔ ضروری ہدایات فون پر ہی بتا دیں تو کرم ہوگا۔''

فون کرنے والے نے کہا، ''ریڈکراس کے دفتر سے فارم لے کر آپ لوگ اپنے گھر والوں کو خیریت بھیج سکیں گے (کون گھر والے —— چاچاجی اس وقت خدا جانے کہاں ہوں گے، خدا کرے وہ اسی گھر میں خیریت سے ہوں)۔ یہ ہوٹل بدستور غیر جانب دار علاقہ رہے گا مگر یہاں کسی کو سیاسی پناہ نہیں ملے گی، جلد یا بدیر ہر ایک کو یہاں سے جانا ہوگا۔ بھارتی حکومت کی قید میں یا بنگلہ دیش حکومت کی تحویل میں (اس کا مطلب ہے ابھی صرف بے عزتی ہوئی ہے، بے غیرتی کی موت باقی ہے)۔

اب اس ہوٹل پر بھی حملہ ہوسکتا ہے اس لیے آپ کسی صورت میں ہوٹل سے باہر نہ نکلیں (تو یہ ہوٹل اب جائے اماں بھی نہیں ہے)۔

جنیبلی روم کا ڈراما ختم ہوا اور سب اپنے اپنے کمروں کو لوٹ گئے تو زری نیچے اُتر کر جان کیلی کے پاس گئی— ''اگر تم یہاں پناہ لینے والوں کو بچا نہیں سکتے اور کسی نہ کسی کی قید میں دینے پر مجبور ہو تو کم از کم میں یہاں نہیں رہوں گی۔ جب تک ممکن ہوگا میں خود کو گرفتار ہونے سے بچاؤں گی۔''

''میں تو تم کو یہی رائے دوں گا کہ یہیں رہو۔ یہ سب تمھارے ہی ساتھی ہیں۔ کیمپ میں تم نہیں رہ سکو گی اور باہر بہت خطرہ ہے۔ میں تمھیں ایک بات بتاتا ہوں۔ ہندوستانی فوجیوں کو تم سے کوئی ذاتی پرخاش نہیں ہے۔ انھیں اپنی حکومت کی طرف سے حکم ہے کہ کسی مقامی یا غیر مقامی کو خواہ مخواہ ہراساں نہ کریں۔ لیکن مقامی لوگ اور مکتی باہنی باہر کے لوگوں کے خون کے پیاسے ہیں۔ مختلف باہنیوں کے اختلافات چل رہے ہیں اس لیے باہر رہنا خطرناک ہوسکتا ہے، بہت خطرناک۔''

''مسٹر کیلی! یا تو آپ مجھے براہِ راست نکالنے کا وعدہ کیجیے، ورنہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیجیے۔''

''میری مشکل کو سمجھنے کی کوشش کرو میری بچی— میں تمھیں براہِ راست کیسے نکال سکتا ہوں، کسی کو بھی کیسے نکال سکتا ہوں!''

''تو ایسے بے بس لوگوں سے مدد کی کیا توقع ہوسکتی ہے، بہرصورت آپ کا شکریہ۔''

''پیاری بچی! تم اب بھی کمزور ہو، میں تم سے درخواست کرتا ہوں کہ اپنے کمرے میں جا کر آرام کرو اور ذہن پر زیادہ بوجھ نہ ڈالو۔ میں بہت مصروف ہوں ورنہ ضرور تمھاری مدد کرتا۔ ہتھیار ڈالنے کا مسودہ شاید اسی ہوٹل میں تیار ہو۔ میں چاہتا ہوں وہاں موجود رہوں تاکہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔''

''اچھا میں جاتی ہوں۔'' زری نے کہا۔

''گڈ گرل!'' جان کیلی خفت بھری شفقت سے مسکرایا اور زری کے جانے کے بعد اپنے ساتھی سے کہا، ''جنرل اروڑہ کا چیف آف اسٹاف میجر جنرل جیکب ہتھیار ڈالنے کے کاغذات لے کر آیا ہے۔ ہمیں اس کو اور اپنے مسودے کو ملا کر دیکھنا ہے۔''

''ہتھیار ڈلوانے کے لیے کون آ رہا ہے؟'' ساتھی نے پوچھا۔

''ابھی تک جنرل اروڑہ، ایئر مارشل دیوان اور وائس ایڈمرل کرشنن کی اطلاع ہے۔''

اوپر آ کر زری نے کاندھے پر لٹکائے جانے والے تھیلے میں اپنے چند کپڑے اور ضروری چیزیں ڈالیں۔ سوٹ کیس میں رکھے بچے کے کپڑوں پر اُس نے ایک سفید دوپٹہ اس طرح پھیلایا جیسے کفن ڈال رہی ہو۔ سوٹ کیس کو ایک طرف سرکا کے ہر طرح کے خیالات کو جھٹکتے ہوئے وہ ایک بار پھر

کھڑکی میں آ کھڑی ہوئی۔

ریڈیو اسٹیشن ڈھاکا کی عمارت کے سامنے ہجوم کھڑا ''جے بنگلہ'' کے نعرے لگا رہا تھا۔ یہاں سے وہ صوبائی یک جہتی اور مشترکہ کلچر کی باتیں کیا کرتی تھی۔ چند لمحے پیشتر اس عمارت سے پاکستان کا جھنڈا اتارا جا چکا تھا۔ ایک شخص نے اس جھنڈے کو لیر لیر کر کے اس کی دھجیوں کو چٹکی سے پکڑ کر اس طرح آگ لگائی جیسے شعبدے باز اپنے رومالوں کو جلا کر ہوا میں اڑا دیتے ہیں۔ اس جھنڈے کو بھی ہوا میں اڑا دیا گیا۔ زری کے دیکھتے دیکھتے اس جھنڈے کی جگہ بنگلہ دیش کا پرچم لگا دیا گیا۔ زری نے بستر پر گر کر تکیے میں منہ چھپا لیا اور زور زور سے رونے لگی۔ یہ خواب نہیں تھا — یہ سب خواب نہیں تھا۔ وہ کہتی رہی۔

کیا باہر نکلنے کی کوئی صورت ہے؟ زری نے دوبارہ کھڑکی میں سے جھانکا تو ہجوم ان کے ہوٹل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ بعض کے ہاتھوں میں فہرستیں تھیں — وہی اعمال نامے جو بائیں ہاتھ میں تھمائے جائیں گے۔ گورنر، کابینہ، سیکریٹری، اعلیٰ افسران، صنعت کار، ان سب کا یوم الحساب آ پہنچا ہے۔ ہوٹل کا منیجر اور جان کیلی دونوں مکتی جودھا کے لیڈروں سے باتیں کر رہے تھے۔ پھر تیز تیز چلتے وہ اندر آئے، جہاں جہاں ممکن تھا، فون کیا۔ ذرا دیر بعد جیپ دوڑاتا ایک منکر نکیر آیا، اس کے کہنے سُننے سے ہجوم لوٹ گیا۔ اُس نے کیا کہا تھا؟ اُس نے انھیں تسلی دی تھی کہ وہ خود ان سب سے حساب لے گا، کوئی بچ کر نہیں جائے گا۔

ہجوم نعرے لگاتا، ہوائی فائر کرتا ایک اور بستی کی طرف چلا گیا جس کا حساب یقیناً وہ لے سکتا تھا۔ وہاں گورنر، اُس کی کابینہ اور اعلیٰ عہدے داران نہیں تھے، ان کی طرح کے عام لوگ تھے — چلے چلو — اُن لوگوں سے حساب لیا جائے گا — تڑ — تڑ، تڑاتڑ — ذرا دُور ایک درخت کے نیچے ایک ٹیکسی ننھے منے کیڑے کی طرح کھڑی تھی۔

کیا ان سب لوگوں کو ہپنوٹائز (hypnotize) کر دیا گیا ہے؟ وہ لوگ جو ایک وقت سیدھی سادی زندگی گزارتے ہیں، دوسرے وقت کیسے اپنے ساتھیوں اور پڑوسیوں کو مار سکتے ہیں، ان کی لڑکیوں کو ریپ کر سکتے ہیں، اپنے شوہروں اور بیویوں کو جن کے ساتھ بستر کے حصے دار تھے، تہ تیغ ہوتا دیکھ سکتے ہیں؟ یقیناً ان کے ذہن دھو دیے گئے ہیں۔ فون کی گھنٹی بجی۔ زری نے ریسیور اٹھایا۔ استقبالیہ سے کسی نے کہا، ''آپ کے کوئی رشتے دار لاؤنج میں آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔''

چاچا جی! زری کے دل نے کہا۔ کتنا دل چاہ رہا تھا ان کے سینے پر سر رکھ کر رونے کو۔ وہ تھیلا کندھے پر لٹکا کر نیچے بھاگی۔

لاؤنج میں جو شخص اس کا انتظار کر رہا تھا اسے پہچاننے میں تھوڑی سی دیر لگی۔ بے حد تنگ، رنگ اُتری پتلون اور پھول دار بش شرٹ پہنے، ناریل کے تیل سے چپڑے بال جمائے وہ عبدل تھا۔

گیارہ نمبر میر پور میں عبدل کے مکان میں زری کا داخل ہونا وہاں کے باسیوں کے لیے ایک عجوبے سے کم نہ تھا۔ میر پور کے چھوٹے چھوٹے دو کمروں کے مکانوں کے سامنے بانس کی پھچیوں کے جنگلے تھے اور ایک ایک گھر میں دس دس بارہ بارہ آدمی تھے۔ آس پاس کے گھروں کی تمام خلقت زری کو دیکھنے کے لیے ٹوٹی پڑ رہی تھی۔ عبدل نے جلدی سے ماں کو الگ لے جا کر ساری داستان سنائی تھی اور ٹیکسی لے کر واپس چلا گیا تھا۔ زری نے اندر داخل ہو کر دیکھا تھا کہ دھڑ دھڑاتی آگ پر ایک خالی دیگچی پڑی جل رہی تھی اور پرات میں آٹے پر مکھیاں بھنک رہی تھیں کیوں کہ ہانڈی چڑھانے والی اور آٹا گوندھنے والی لڑکیاں اُس کو دیکھنے کے شوق میں دروازے پر لٹکی ہوئی تھیں۔

برآمدے میں سیاہ ریشم کا ڈھیر پڑا تھا جہاں چند منٹ پہلے چند لڑکے بیٹھے بالوں میں ڈالنے والی چوٹیاں بنانے میں مصروف تھے، اس وقت وہ بھی اسے دیکھنے کے لیے کام چھوڑ چکے تھے۔ عبدل کی ماں نے بڑی مشکل سے ڈانٹ ڈپٹ کر سب کو بھگایا اور زری کو لے کر ایک کمرے میں آ گئی۔ وہاں پڑی واحد چارپائی پر کچیا داڑھی میں کوئی مدقوق بڑے میاں پڑے بخار میں بھن رہے تھے۔ وہ دونوں سیتل پاٹی پر بیٹھ گئیں۔ عبدل کی ماں کا لہجہ خالص بہاری تھا۔ اپنے خاص جھٹکے دار انداز میں اس نے بڑی پوتی کو آواز دی، ''نسی ما — اپنے دادا کو دودھ دے بٹیا۔'' اور پھر زری سے مخاطب ہوئیں، ''یہ بنگالی لوگ ہم سے جلتے کاہے؟ ہم لوگ پیٹ سے بھوکے رہتے پر کپڑے اچھے پہنتے۔ یہ لوگ سمجھتے ہمارے پاس بہت پیسا ہے۔ ہم گوش کا شوربا بنا کے دس جنے کھاتے۔ اے دو جنے ہوتے تو پانچ روپے کی ماچھی چٹ کر جاتے۔''

''اچھا۔'' زری نے صرف اتنا کہا۔

اکا دکا فائرنگ کی آواز آ رہی تھی۔ گھر کے آنگن سے سا اور گاؤں کے جھنڈوں کے نمایاں تاڑ کے درخت دکھائی دے رہے تھے۔ دوپہر کو زری کے لیے چچینڈے کی بھجیا، لمبے ہرے لیموں اور کھیرے کی کٹی ہوئی چٹنی اور ڈھکے ہوئے گلاس میں بکری کا دودھ آیا۔ زری نے بہت چاہا کہ سب کے ساتھ کھانا کھائے، مگر اسے الگ کھانا دیا گیا۔ زری کو احساس تھا کہ اتنے دن کے لگاتار کرفیو میں ان گھر والوں کو کھانے کے سامان کی قلت رہتی ہوگی۔ سہ پہر کو تین بجے میر پور روڈ پر بھاری ٹرکوں کی آواز سنائی دی اور پھر بچے بھاگتے ہوئے اندر آئے، ''شادھین ہوگیا۔ شادھین ہوگیا۔''

"چپ رہو کم بختو، کیوں بدشگونی کرتے ہو؟" بخار میں پھنکتے بڑے میاں نے کہا۔

واقعی ان لوگوں کو اب تک پاکستانی فوج کے ہتھیار ڈالنے کے بارے میں کچھ معلوم نہیں۔ زری حیران تھی۔

"دادا! ہندوستانی فوجیوں کے ٹرک ڈھاکا جا رہے ہیں۔ سب کہہ رہے ہیں کہ —"

"ہنک نہ خبردار، بکنے دو انھیں۔ تم سب اندر آ کر بیٹھو۔" بڑے میاں نے ڈانٹ بتائی۔ سب بچے سہم کر برآمدے میں جا بیٹھے۔

شام کو چھ نمبر میرپور پر حملہ ہوا۔ اللہ اکبر اور جے بنگلہ کے نعروں سے فضا گونجتی رہی۔ رات تک پریشان کن خبریں آتی رہیں۔ سب دروازے بند کیے قلعہ بند بیٹھے دعائیں پڑھتے رہے۔ مرد اور لڑکے رائفلیں سنبھالے لڑنے کے لیے تیار تھے مگر عبدل غائب تھا۔ رات گئے جب گولیوں اور چیخ پکار کا شور تھما تو عبدل چوروں کی طرح گھر میں داخل ہوا۔ اس کا رنگ سفید پڑا ہوا تھا۔ عبدل کی منگیتر ساجدہ چھ نمبر میں رہتی تھی۔ وہ اس کے گھر سے آ رہا تھا۔ ساجدہ کے والد اور والدہ شہید ہو چکے تھے۔ وہ لوگ ان کی لاشیں بھی اٹھا کر لے گئے تھے۔ اس کا ایک بنگالی دوست جو ساور گاؤں میں رہتا تھا، عین حملے کے دوران کسی نہ کسی طرح اُس کی منگیتر کو نکال کر لے گیا تھا اور وہ اس کے گھر میں تھی۔

کھانا کھائے بغیر وہ بہت دیر تک چپ چاپ پڑا رہا۔ بہن بھائی کرید کرید کر اُس سے ہتھیار ڈالنے کی بات پوچھتے رہے۔ آخر اس نے قبول کر لیا کہ ریس کورس میدان کے حاضرین کی پچھلی صفوں سے بھی ذرا پیچھے وہ کھڑا یہ سارا منظر دیکھ رہا تھا۔ چار بج کر اکتیس منٹ پر جنرل نیازی نے کاغذوں پر دستخط کیے اور اپنی پستول نکال کر جنرل اروڑہ کے حوالے کی۔ جب وہ جانے لگے تو ہجوم میں سے کسی نے ان پر جوتا پھینکا۔ جنرل اروڑہ کو لوگوں نے کندھوں پر بٹھا لیا اور اسی طرح ریس کورس میدان سے باہر تک لائے۔ جنرل ناگرہ نے جو تنگیل سے بھارتی فوج کے ساتھ آئے تھے، اپنی جیپ پر کھڑے ہو کر "جے بنگلہ" کے نعرے لگائے۔ بنگالی عوام نے دڑھیل سکھوں کے گلوں میں ہار ڈالے، ان کو گلے لگایا۔ گورکھے سپاہیوں کی ٹوپیاں اور ان کی رائفلوں کی نالیاں پھولوں سے گلدانوں کی طرح سجی ہوئی تھیں۔ وہ جہاں جہاں سے گزرے، گیندے کے پھولوں کی سنہری پتیاں ان پر نچھاور کی گئیں — کہتے کہتے عبدل کی آواز بھرا گئی۔ لڑکیاں گھٹنوں پر ٹھوڑیاں رکھے بیٹھی تھیں اور آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ چھوٹے بچے ٹکر ٹکر ان سب کو دیکھ رہے تھے۔

آٹھ بجے پاکستان کی خبریں سننے سارے گھر والے اکٹھے ہوئے۔ خبروں کے بعد سب کے چہرے سوالیہ نشان بنے ہوئے تھے۔

"اِس میں تو ہتھیار ڈالنے کا ذکر نہیں۔ کیا تم نے خود دیکھا ہے؟" ہر ایک کی نظر کہہ رہی تھی۔ ہر زبان کہنا چاہتی تھی، عبدل جھوٹ بول رہا ہے، کاش عبدل جھوٹ بول رہا ہو۔

"ہنھ — کہتے ہیں ہم آخری آدمی تک لڑیں گے، ڈھاکا میں تو کسی فوجی نے ایک گولی تک نہیں چلائی۔ ارے وہ کیا لڑیں گے — لڑیں گے ہم میرپور والے۔" عبدل نے کہا۔

"کیا شہر میں بھی جھگڑا ہو رہا ہے؟" ماں نے پوچھا۔

"ہاں، نواب گنج، دھان منڈی، نیا پلٹن، ٹی اینڈ ٹی کالونی، محمد پور اور کئی جگہ حملہ ہوا۔ چھوٹے چھوٹے بنگالی لڑکے، جن کو کل تک گھر سے باہر جانے کو نہیں ملتا تھا، آج بہاری گھروں میں جا کر رائفلیں دکھا کر روپیا پیسا لوٹ رہے تھے، کاروں کی چابیاں لاتے اور ایک ایک کار میں دس دس بھر کر جے بنگلہ کے نعرے لگاتے اور کہتے، "ہم مکتی باہنی کا سولہواں ڈویژن ہیں۔ یعنی ہم سولہ تاریخ کو مکتی باہنی بنے ہیں۔"

رات کو لڑکوں اور مردوں میں دیر تک مسکوٹ ہوتی رہی اور وہ عورتوں کو ہدایات دے کر باہر چلے گئے۔ زری کے پوچھنے پر عبدل کی بہن نے بتایا کہ اس کا ایک بھائی بجلی کا کام کرتا ہے۔ اس نے یہ ہدایات دی ہیں کہ اگر رات کو حملہ ہو اور سارے مرد ہلاک ہو جائیں تو وہ سڑک سے بجلی لانے والا آنگن سے لٹکتا تار کاٹ کر ہاتھ میں پکڑ لے اور باقی ساری عورتیں ایک دوسرے کو پکڑ لیں تاکہ بجلی کے جھٹکے سے ہلاک ہو جائیں۔

ہوا میں دسمبر کی ہلکی سی خنکی تھی۔ گھر میں اوڑھے جانے والے کپڑے پرانے اور ناکافی تھے۔ رات کو لالٹین دروازے کے پیچھے لَو نیچے کر کے رکھ دی گئی۔ رات بھر دادا کھانستے رہے، کوئی نہ کوئی بچہ روتا رہا۔ کوئی نہ کوئی اُٹھ کر غسل خانے تک جاتا رہا۔ رات بھر گولیوں کی اِکا دُکا آواز کہیں دُور سے آتی رہی اور گھر کی ساری عورتیں جاگتی اور دُعائیں پڑھتی رہیں۔

رات خیریت سے گزری۔ صبح مرد اور لڑکے گھر لوٹے۔ عبدل کی بہن نے رازداری سے بتایا کہ عبدل اپنی منگیتر کی خیریت معلوم کرنے ساور گاؤں جا رہا ہے۔ زری نے عبدل کو بلا کر کہا کہ اسے اندازہ نہیں تھا کہ میرپور میں رہنا اتنا خطرناک ہے۔ اب وہ محمد پور کے ریلیف کیمپ میں جانا چاہتی ہے تاکہ وہاں کے بیماروں اور زخمیوں کی دیکھ بھال کر سکے۔ عبدل نے کہا کہ محمد پور بھی محفوظ علاقہ نہیں ہے لیکن زری کے اصرار پر وہ کسی نہ کسی طرح اسے وہاں تک چھوڑ آنے پر راضی ہو گیا۔

زری نے وہی سفید ساری باندھی، ماتھے پر بندیا لگائی اور سر کو خوب اچھی طرح ڈھانک کر، کہ چہرے کا زیادہ سے زیادہ حصہ چھپ جائے، ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ عبدل پہلے اُسے حضرت شاہ علی بغدادی

کے مزار پر لے گیا۔ زری کا ساور جانا مناسب نہیں تھا۔ عبدل نے کہا کہ جب تک وہ لوٹ کر نہ آئے زری اندر مزار کے پاس جا کر خاموشی سے قرآن شریف پڑھتی رہے۔ اس سے کوئی باز پرس نہ کرے گا۔ زری کے لیے کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ یہ لمحہ انتہائی خطرناک بھی ہوسکتا تھا۔ احاطے میں درخت کے نیچے موٹے مسٹنڈے کالے فقیر سرخ تہمد باندھے بافراغت پڑے تھے۔ دو عورتیں جن کے گہرے سیاہ بال جٹا دھاری فقیروں کی مانند تھے، سرخ مختصر سی ساریوں میں لپٹی زمین پر بیٹھی تھیں۔ یہ سب جاسوس بھی ہوسکتے ہیں۔ زری نے سوچا اور سر پر پلّو کھینچتی چپ چاپ مزار کے ایک طرف اس طرح بیٹھ گئی کہ دروازے کی طرف سے آنے والا اس کے چہرے کا کم سے کم حصہ دیکھ سکے۔ وہ چپ چاپ سیپارہ پڑھنے میں مصروف رہی۔

عبدل واپس آیا تو کچھ دیر بنگلہ میں ان فقیروں سے باتیں کرتا رہا۔ زری سہمی بیٹھی رہی، پھر اُس نے کہا کہ ساجدہ خیریت سے ہے لیکن راستے میں اینٹوں کے بھٹے کے پاس اُس نے بے شمار لاشیں دیکھی ہیں جن پر مکھیاں بھنبھنا رہی ہیں۔ میرپور کی طرف ٹرک آتے بھی اس نے دیکھے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ مکتی باہنی ہی کے ہوں۔ وہ چاہتا ہے کہ زری کو محمد پور پہنچا کر جلد واپس آجائے۔

راستے سنسان تھے۔ ٹرک میں بیٹھے لوگ نعرے لگاتے گزر رہے تھے۔ جیپوں میں مسلّح جوانوں کو دیکھتے ہی موت سر پر منڈلاتی نظر آتی۔ اِکا دُکا کار یا رکشا گزرتی دکھائی دیتی تھی۔ زری دبکی بیٹھی راہ کی منزلیں گن رہی تھی۔ پلابی، گیارہ نمبر، دس نمبر، گول چکر، دو نمبر، ایک نمبر — بنگلہ کالج، پائیک پاڑا، تنکیل، سب سنسان تھے۔ پُل کے نزدیک بانس کی جھونپڑیاں خالی پڑی تھیں۔

کلیان پور کی عمارتوں میں بھی زندگی کے آثار نہیں تھے۔ بائیں طرف کھیت، کھجور اور سپاری کے درخت اور میلوں پھیلی بیلیں بھی ہمیشہ کی طرح ساکت تھیں۔ کیا انھیں معلوم تھا کہ وہ اب پاکستان میں نہیں، بنگلہ دیش میں ہیں؟ زری نے سوچا۔ ایوب ایونیو کی طرف سے گولیوں کی آواز آرہی تھی۔

''سوچ لیجیے، انٹر کانٹی نینٹل لے چلوں۔ وہ سب سے زیادہ محفوظ ہے۔''

''نہیں، عبدل ہمت کر کے مجھے کیمپ کے دفتر ہی میں چھوڑ دو۔'' زری نے کہا۔

بڑی سڑک کو چھوڑ کر، اندر گلیوں میں چکر دے کر عبدل نے زری کو کیمپ کے دفتر میں چھوڑا اور فوراً واپس چلا گیا۔

آج تیسرا دن تھا کہ مصباح الحق صاحب اوپر سے نیچے نہیں اُترے تھے۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ اکرام الحق ۱۸ر دسمبر کا اخبار لے کر ان کی طبیعت پوچھنے گیا تھا۔ مصباح الحق صاحب اخبار دیکھتے رہے۔ انھوں نے اکرام سے کوئی بات نہ کی۔ ۳۱ر دسمبر کے بعد یہ پہلا اخبار شائع ہوا تھا۔ سرخ رنگ کی غیر معمولی بڑی سرخی تھی ''بنگلہ دیش وجود میں آ گیا ہے۔'' اخبار کے نام کے بارے میں اعلان تھا کہ اس علاقے کی سیاست میں انقلاب آفریں تبدیلی کے بعد اس اخبار کا نام ''دی آبزرور'' ہوگا۔ شیخ مجیب الرحمٰن کی ۷ر مارچ کی پوری تقریر درج تھی — بنگلہ دیش بتیار کیندو سے تاج الدین کی تقریر کا ذکر تھا۔ جس میں انھوں نے قتل و غارت کی مذمت کی تھی اور لوگوں سے ہاتھ روکنے کی درخواست اور خون دینے کی اپیل تھی — تصویروں میں مکتی فوج کے جیلوں سے رہا کروائے ہوئے قیدی تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کے بیٹے شیخ کمال کی تصویر تھی جو ستِ کھیرا میں لڑتا رہا تھا، اور شمس الاسلام کی تصویر ہیلی کوپٹر کے ساتھ تھی۔

مصباح الحق صاحب کو اخبار میں اس درجہ منہمک دیکھ کر اکرام واپس نیچے چلا آیا۔ جب بہت دیر تک اخبار کے صفحے اُلٹنے کی آواز بھی نہ آئی تو بیگم حق نے تشویش سے اپنے شوہر کی طرف دیکھا — اخبار کی سرخی — بنگلہ دیش کا وجود — ان کے سامنے تھی اور ان کی آنکھیں پتھرا چکی تھیں۔ ابھی تین دن پہلے اس اخبار کا نام ''پاکستان آبزرور'' تھا۔

بیگم روتی پیٹتی نیچے اتریں۔ وہ جانتی تھیں، ان کے شوہر یہ صدمہ برداشت نہ کر سکیں گے۔ گھر میں جو کچھ ہو رہا تھا، بہت کچھ ان سے چھپایا جا رہا تھا۔ وہ اسے جوانوں کی ایک شورش سمجھتے تھے جس پر جلد یا بدیر قابو پا لیا جائے گا۔ ریڈیو پاکستان کے علاوہ کوئی اور ریڈیو سننے پر وہ ہرگز آمادہ نہ تھے۔

میلوحق کہا کرتا تھا، ہماری نسل ایک الگ مکتبۂ خیال کی نمائندہ ہے۔ دادا جان اسلامزم کے قائل ہیں۔ ابا کے لیے مسلم لیگ دُنیا میں پہلی اور آخری پارٹی ہے۔ بھائی اکرام، شیخ مجیب الرحمٰن کی بین بین پارٹی والے شیخ مونی کے ساتھی ہیں اور ہم عوامی لیگ کے انتہا پسندوں میں سے ہیں۔ ہم نے ۱۹۷۰ء میں ایک ریزرویشن میں سائنٹی فک سوشلسٹ انقلاب لانے کا عہد کیا تھا، اور آہستہ آہستہ شیخ مجیب پر پوری طرح اثر جما لیا تھا۔ اب بھی ہم شیخ مجیب کی میانہ روی والوں کی ہرگز نہیں چلنے دیں گے۔ بنگلہ دیش بنا تو اس کا نام سیکولر سوشلسٹ اسٹیٹ آف بنگلہ دیش ہوگا، اور اس کی حکومت سوشلسٹ انقلاب لانے کی ذمہ دار ہوگی ورنہ ہم اس کا تختہ الٹ دیں گے۔

آج صبح چار بجے اپنے گھر سے نکلتے ہوئے شمس الرحمٰن کو ایبٹ آباد کی صبح یاد آئی ـــــ یہی وقت تھا، موسمِ گرما کی صبح میں یہاں کی دسمبر جیسی خنکی تھی۔ پہاڑ ساکن، درخت چپ، چڑیاں خاموش، سناٹا۔ صبح کا اُجالا جیسے دبے قدموں بتاشوں پر چلتا آ رہا ہو۔ دُور دُور تیز روشنیاں جگمگ کرتی، اندھیرے کے سحر کو بڑھاتی، اُجالے پر حاوی، فتح مند، کامران اور ہنستی ہوئی۔ اس حقیقت سے بے خبر کہ ابھی صبح کا اجالا ان پر فتح پالے گا اور وہ مرجھائی ہوئی کلیوں کی طرح بے رونق ہو جائیں گی۔ نرم رو خنک ہوا اس دن دل کو گدگدا رہی تھی، اور آج زخمِ دل کو چھوتی ہوئی گزر رہی تھی۔ اس ہوا کے لمس سے اُس روز پتے سرسرا رہے تھے مگر آج کراہ رہے تھے۔

تھوڑی دیر پہلے رونجھو نے اُسے فون کیا تھا۔ ''باوثوق ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ زری ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل میں ہے۔ تم فوراً وہاں چلے جاؤ، شاید آج کسی وقت وہ لوگ ہوٹل چھوڑ دیں گے۔ صرف اتنا کہنا کہ بیوی کی تلاش میں جا رہا ہوں اور کچھ نہ کہنا۔ ہاں سنو، مصباح الحق صاحب بے چارے پر دل کا دورہ پڑا اور ختم ہو گئے۔ اسی لیے اکرام اور بینو تمھیں فون نہ کر سکے۔''

''اوہو کب؟ مجھے پہلے کیوں نہ بتایا، میں جاتا۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''ایسے حالات میں کون کسی کو کیا بتائے بھائی؟'' رونجھو کے لہجے کی کھنک ماند پڑ چکی تھی۔

''ہاں یاد آیا۔ ہمارے علاقے میں راتوں کو کیا ہوتا رہا ہے۔ بہت سے پروفیسر اور لیکچرار اور ـــــ'' شمس الرحمٰن نے کہنا شروع کیا۔

''چپ رہو بھائی! اس بارے میں بھاپ بھی منہ سے نہ نکالنا۔ چپ رہنے میں بہتری ہے۔ اور دیکھو، مل جائے تو اُسے کچھ دن کے لیے اکرام کے گھر میں رکھنا یا کہیں اور، میرا مطلب سمجھ رہے ہونا۔''

''اب یہ مار کاٹ بند ہونی چاہیے رونجھو، ہمیں جو چاہیے تھا مل گیا ہے۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''ابھی کہاں بھائی، چلتی مشین اتنی آسانی سی نہیں رُکتی۔ دس لاکھ ہتھیار اس وقت لوگوں کے پاس ہیں۔ اب ان میں وہ لوگ بھی شامل ہو گئے ہیں جو کل تک نیوٹرل تھے۔ مشین رُکتے رُکتے ہی رُکے گی۔ Let's hope for the best.——— جے بنگلہ ———''

شمس الرحمٰن بھاگم بھاگ ہوٹل پہنچا۔ ہوٹل کے چاروں طرف ٹینک کھڑے تھے۔ باہر بورڈ پر بڑا بڑا 'نیوٹرل زون' اور نیچے 'انٹرنیشنل ریڈ کراس جنیوا' درج تھا۔ بھارتی فوجیوں کو جنھیں دو دن پہلے اس ہوٹل کی حفاظت پر مامور کیا گیا تھا، شمس الرحمٰن نے اپنے جواب سے مطمئن کیا اور ہوٹل کے اندر داخل ہوا۔ بہت سے ٹرک قطار میں کھڑے تھے، فہرستوں سے نام پکارے جا رہے تھے اور لوگ سامان اٹھائے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ شمس الرحمٰن نے جلدی جلدی ایک نگاہ مسافروں پر ڈالی، پھر فہرست پڑھنے کی کوشش کی؛ آخر میں کسی کی رائے سے وہ ریڈ کراس کے دفتر کی طرف بڑھا۔ راہ میں جان کیلی نے روک کر اس سے مدّعا پوچھا۔

''میں اپنی بیوی کو تلاش کر رہا ہوں۔ زری شمس الرحمٰن۔''

''زاری، یس یس آئی نو ہر۔'' جان کیلی نے جھک کر شمس الرحمٰن کا چہرہ دیکھا۔ ''زاری دو دن یہاں رہی اور تیسرے دن اپنے کسی رشتے دار کے ساتھ چلی گئی۔'' اس نے شفقت سے شمس الرحمٰن کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

''رشتے دار؟ چاچا جی! مگر وہ تو ابھی تک اسی گھر میں بند ہیں۔ کون ہو سکتا ہے! اکرام الحق، رونجھو، میلو، خالد، ہاں کیپٹن خالد ـــ'' وہ باری باری ذہن میں آنے والے نام لیتا رہا۔

''نہیں اس کا نام تھا، مجھے ایک سیکنڈ سوچنے دو، عبدل ـــ ہاں عبدل، وہ دیکھنے میں مزدور طبقے کا بنگالی نظر آتا تھا، کسی طرح زاری کا رشتے دار نہیں لگتا تھا مگر وہ ضد کر کے اُس کے ساتھ چلی گئی۔'' جان کیلی نے کہا، ''اگر تم کچھ دن پہلے ـــ''

زمین ایک بار پھر شمس کے قدموں سے نکل گئی۔ وہ اپنی مرضی سے گئی ہوگی۔ کوئی اسے لے جا نہیں سکتا۔ رونجھو نے کہا تھا۔ مگر وہ کس کے ساتھ کہاں چلی گئی۔ وہ کسی ایسے شخص کے ساتھ گئی ہے جسے میں نہ جانتا ہوں تاکہ اس تک نہ پہنچ سکوں۔ ان کی رفاقت کے دوران یہ حادثہ کب پیش آیا کہ زری کو ایک غیر شخص پر مجھ سے زیادہ بھروسا ہو گیا۔ شاید زری کو یقین ہو گیا ہے کہ اس کے بچے کو جان

بوجھ کر مارا گیا ہے اور اُس کے مارے جانے میں میری رضا کا دخل ہے۔

اکرام کے پاس جانا چاہیے شاید اُسے معلوم ہو کہ عبدل کون ہے۔ مگر اتنے سویرے وہاں جانا مناسب نہیں تھا۔ چاچا جی کے پاس جانا چاہیے۔ مولانا بھی چاچا جی کی حفاظت اور سہولت کے خیال سے ان کے ساتھ رہنے لگے تھے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ مولانا کسی عبدل کو ساتھ لے کر آئے ہوں اور زری کو چاچا جی کے پاس لے گئے ہوں۔

اولڈ سیکریٹریٹ روڈ پر لگے ہوئے گلدان کی طرح سجے ہوئے درخت، جڑ کے بعد ایک تومند سا تنا، قدِ آدم پہنچنے کے بعد بیک وقت کئی تنے ایک ساتھ پھوٹ کر سیدھے اوپر کی طرف جاتے ہوئے، بنگال کی خاص نسوانی ادا سے لچکتے اور لہراتے ہوئے ــــ نسلیں اسی طرح ایک تنے سے پھوٹتی ہیں اور آزادی سے بڑھتی جاتی ہیں۔ چاچا جی نے ایک مرتبہ ان ہی درختوں کو دیکھ کر کہا تھا۔ ہر درخت کے جھومنے کا انداز جدا ہوتا ہے۔ یوکلپٹس کی ہر ٹہنی الگ لچکتی، بل کھاتی اور لہراتی ہے جیسے بہت سی لڑکیاں الگ الگ بھاؤ بتا ن مل کر ناچ رہی ہوں۔ ناریل کے بڑے بڑے تام جھام پتے، چھت میں لگے ہوئے کپڑوں کے پرانے پنکھوں کی طرح ہلتے ہیں۔ تاڑ کے درختوں کے گول پتے مورچھل کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ کیلے کے پتے ہوا سے لڑتے ہوئے اور گلِ مہر کی شاخیں ہوا کی موجوں پر تیرتی ہوئی لگتی ہیں۔ چاچا جی نے کہا تھا۔

کیا آج وہ چاچا جی کو بتائے کہ وہ کسی ترک زادے کی نسل سے ہے، اور یہ تماشا دیکھے کہ وہ اُٹھ کر اسے فلموں کے سین کی طرح گلے لگائیں اور پکاریں، تو ہمارا خون ہے بیٹے! یہ میلوڈراما زندگی کے اس المیے میں جو اس وقت جاری ہے، یونانی کورس کی طرح سکون آور ہوگا یا مضحکہ خیز۔ کم از کم چاچا جی کو اس ڈرامے کی قطعی کوئی ضرورت محسوس نہ ہوگی، اس لیے کہ اب سے بہت پہلے زمین اور پودوں سے اُلجھتے ہوئے وہ اس نتیجے پر پہنچ چکے ہیں کہ ایک بیج سے نسلیں پھوٹتی اور بڑھتی رہتی ہیں۔ انسان ایک دوسرے کے آبا و اجداد بھی ہیں اور وارث بھی۔ یہ بھی کتنی اچھی بات ہے کہ درختوں کی نسلیں کبھی خون، رنگ، او زبان کی آویزش پر آپس میں نہیں اُلجھتیں اور ایک دوسرے کے خون کی پیاسی نہیں ہوتیں۔ شمس نے سوچا ــ یا ہوتی ہیں؟ ــــ سندربن میں بڑے درخت چھوٹے درختوں کو پنپنے نہیں دیتے، خود دھوپ اور بارش کو لپک لینے کی کوشش میں اُونچے اور اُونچے ہوتے چلے جاتے ہیں۔ اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں دوسرے کو فنا کر دینے کی جبلت ــــ شاید وہ بھی چاچا جی ہوتا جا رہا ہے ــــ ایک سوچ سے دوسری سوچ اُبھرتی ہے۔

"چاچا جی، آپ کیا سوچتے رہتے ہیں؟" ایک دن اُس نے پوچھا تھا۔

''سوچ سوچ کر تھک گیا ہوں، اب تو عقل کام نہیں کرتی۔'' چاچا جی نے کہا تھا۔

''تو آپ کیوں اتنا سوچتے ہیں؟''

''بس خود ہی خیال آتے رہتے ہیں، شیطان کا کارخانہ ہے اور کیا۔ سوچتا ہوں انسان ہر وقت عجائبات کی کھوج میں رہتا ہے مگر اس نے اپنے ذہن کے عجوبے کو نہیں ٹٹولا۔ دُنیا کے سات عجائبات اس کے شوق کو بڑھاتے ہیں۔ سات آسمانوں اور سات سمندروں کی کھوج میں پڑا رہتا ہے لیکن اپنے ذہن کے سات تختوں کی سیر نہیں کرتا۔ وہ کمپیوٹر بنا رہا ہے جو انسانی ذہن کی جگہ لے لے لیکن انسانی ذہن کس طرح کام کرتا ہے، یہ اسے معلوم نہیں۔ یہ راز کمپیوٹر اسے نہیں بتا سکتا، کیوں کہ کمپیوٹر تو وہی باتیں بتا سکتا ہے جو انسان نے اسے بتائی ہیں۔''

چاچا جی ٹھیک کہتے ہیں، انسان اپنے بارے میں، اپنے خیالات اور رجحانات کے بارے میں کتنا کم جانتا ہے۔ زری نہیں جانتی کہ وہ کیا چاہتی ہے اور کیوں مجھ سے دور بھاگ رہی ہے۔ میں نہیں جانتا کہ میں کیوں اُسے تلاش کرنے پر مجبور ہوں۔ وہ میری سرخاب ہے۔ مجھے اُسے ڈھونڈنا ہے چاہے طلوعِ صبح کے وقت وہ مجھے پکارے یا نہ پکارے۔

شمس الرحمٰن نے گھنٹی بجائی۔ بظاہر مولانا اس گھر میں تنہا رہتے تھے۔ شمس الرحمٰن یا سورج ان کے لیے کھانے پینے کا سامان لے آتا تھا۔ وہ خود کھانا پکاتے تھے۔

سب سے اُوپر کی منزل پر ایک اسٹور میں الماریوں اور ٹرنک کے پیچھے ایک محفوظ جگہ بنا دی گئی تھی کہ اگر حملہ آور تلاشی لینے پر تُل ہی جائیں تو چاچا جی کو وہاں چھپا دیا جائے۔

مولانا نے جھری میں سے جھانک کر دروازہ کھولا۔

''زری یہاں ہے؟'' دروازہ کھلتے ہی شمس الرحمٰن نے بے صبری سے پوچھا۔

''زری! ــــ وہ تو اسپتال میں ہے نا۔'' مولانا نے کہا۔

''نہیں، وہ کئی دن ہوئے وہاں سے نکل گئی ہے۔ انٹر کانٹی نینٹل میں پتا چلا ہے کہ وہ کسی عبدل نامی شخص کے ساتھ گئی ہے جو خود کو اُس کا رشتے دار بتاتا ہے۔ آپ کسی عبدل کو جانتے ہیں؟''

مولانا نے کچھ دیر سوچا اور کہا، ''سرِ دست تو نہیں۔ اندر آؤ، دماغ پر زور ڈالتے ہیں ــــ اور دیکھو عمر بھائی کو یہ بات نہ بتانا، انھیں بہت صدمہ ہوگا۔ وہ دو ایک دن میں کہیں نہ کہیں مل جائے گی۔''

''کہاں ملے گی مولانا؟'' شمس نے دُکھ سے کہا، ''پہلے ہی گلشن، موتی جھیل، دھان منڈی، گرین روڈ، شگن بگیچہ، اصفہانی کالونی اور شہر کے علاقے میں نواب پور، اسلام پور، ارمنی ٹولہ، ابونگرام، سب ہی جگہ جہاں جہاں جاننے والے ہیں، ڈھونڈا تھا، کیا معلوم تھا کہ وہ انٹر کانٹی نینٹل چلی

جائے گی۔ اب وہ وہاں سے گئی ہے تو چھاؤنی میں بھی نہیں ہوسکتی۔''

''اپنے بھائی سے پوچھو۔'' مولانا نے کہا۔

''رونجھو اور قادر کے کیمپ کے لوگ تو پہلے ہی اسے تلاش کر رہے ہیں۔''

''اندر آؤ، سوچتے ہیں۔'' مولانا نے کہا۔

چاچا جی نے سب سے پہلے زری اور اس کے بیٹے کے بارے میں پوچھا۔

''دونوں ٹھیک ہیں۔ یہ میں آپ کے لیے کچھ انڈے اور سبزی لایا تھا۔'' کہتا ہوا شمس الرحمٰن باورچی خانے میں چلا گیا۔ واپس آیا تو چاچا جی بات کا سرا وہیں سے جوڑنے کی کوشش کر رہے تھے جہاں سے اس کی آمد پر ٹوٹا تھا۔ شمس الرحمٰن کو گفتگو میں شریک کرنے کے لیے انھوں نے کہا، ''ہم مشرقی پاکستان کے المیے کی بات کر رہے تھے۔ کوئی حادثے میں مر جائے تو اس کا پوسٹ مارٹم ہوتا ہے کہ کہیں زہر تو نہیں دیا گیا، قتل کی سازش تو نہیں تھی، لیکن اس المیے کی اصل وجہ پتا نہیں چلے گی، پوسٹ مارٹم کی رپورٹیں بھی چھپائی جائیں گی۔''

''ہر قتل کے لیے پوسٹ مارٹم رپورٹ کی ضرورت نہیں ہوتی بھائی عمر، سیدھے سادے صاف قتل بھی ہوتے ہیں، قتلِ عمد۔ آلۂ قتل بھی سامنے اور وجہِ قتل بھی صاف — زیادہ تر قتل حرص ہی کی وجہ سے ہوتے ہیں۔ حرص اور حسد مل کر انسان کو اندھا کر دیتے ہیں، آدمی کچھ سوچنے سمجھنے کے قابل نہیں رہتا۔''

''آپ تو ہر بات اخلاقیات اور روحانیت کی طرف لے جاتے ہیں۔'' چاچا جی نے کہا، ''اگر ایک ہی لفظ استعمال کرنا ہے تو میرے نزدیک اس کا نام ہے ڈکٹیٹر شپ یا لا جمہوریت اور بس۔ لا جمہوریت میں اوپر بیٹھے ہوئے لوگ رازداری کے نام پر اپنی کم علمی، بے عملی اور بداعمالیوں کو چھپاتے ہیں اور انارکی پھیلاتے ہیں۔ کسی کو کسی بات کی خبر نہیں ہوتی، کوئی کسی کے آگے جواب دہ نہیں ہوتا۔ کیا خیال ہے میاں؟'' چاچا جی نے شمس الرحمٰن سے پوچھا۔

''وجہ جو کچھ بھی ہو مگر میں اتنا جانتا ہوں —'' شمس الرحمٰن کچھ دیر ٹھہرا پھر اس نے ہمت کر کے کہہ ڈالا ''یہ بازو تو دسمبر سے پہلے ہی علاحدہ ہو چکا تھا۔ اس کے لیے سیدھا سادا سرجری کا عمل ہونا چاہیے تھا کہ نہ زخم لگتا، نہ خون بہتا۔ جب اسے تلوار کی ضرب سے الگ کیا گیا تو چوٹ بھی آئی اور تکلیف بھی ہوئی۔''

''یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟'' چاچا جی نے حیران ہو کر پوچھا، ''تمھارا خیال ہے، بازو پہلے ہی الگ ہو چکا تھا؟''

''ہاں میں نے کہا نا دسمبر سے پہلے فوجی کارروائی کے بعد جس طرح ہر جگہ عدم تعاون شروع ہوا،

اس سے آپ کو اندازہ نہیں ہوا کہ اب ایک پاکستان رہنا مشکل ہے۔ وقت کا معاملہ ضرور تھا، ممکن ہے بھارت درمیان میں نہ آتا تو کئی سال لگ جاتے۔ میں یہ بات زری کو سمجھانا چاہتا تھا مگر وہ اسے سمجھنے کے لیے تیار نہیں تھی، کوئی بھی نہیں تھا۔''

مولانا اور چاچا جی سوچ میں پڑ گئے۔ خاصی دیر خاموشی رہی۔ اس کے بعد چاچا جی نے کہا، ''میں نے اپنے اناج اور پھل وغیرہ تقسیم کرنے کا ایک نظام رائج کیا ہے۔ جو بانٹے وہ اپنا حصہ سب سے آخر میں لے۔ یا یوں سمجھیے کہ ایک شخص بانٹے اور دوسرا چناؤ کرے۔ اس صورت میں بانٹنے والا جتنے انصاف سے ڈھیریاں لگائے گا اتنا ہی اس کا اپنا فائدہ ہے۔ دوسری صورت میں سب بڑی بڑی ڈھیریاں لے لیں گے اور آخر میں سب سے چھوٹی ڈھیری اس کے لیے رہ جائے گی۔ ایسا ہی کوئی اصول سیاست میں اور ہر طرح کے قانون ساز اداروں میں ہونا چاہیے۔ یہ نہیں کہ خود ہی ڈھیریاں بنائیں اور سب سے بڑا ڈھیر خود اٹھالیا۔''

''انسان میں خوفِ خدا ہو تو یہ کام وہ کبھی نہیں کرے گا، خواہ اناج کی ڈھیری ہو یا اقتدار کی۔'' مولانا نے کہا۔

''کوئی نہ کوئی ایسی صورت ہو کہ وہ کر ہی نہ سکے۔'' چاچا جی نے کہا۔

''آپ ٹھیک کہتے ہیں چاچا جی، اچھا اب میں چلوں گا، مجھے ذرا جلدی ہے۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''عمر بھائی! میں بھی ذرا دیر کو شمس کے ساتھ جاتا ہوں۔ دوپہر تک لوٹ آؤں گا۔'' مولانا بولے۔

گھر کے باہر قفل لگا کر نکلے تو مولانا نے کہا، ''شمس! مجھے ابھی یاد آیا کہ جگن ناتھ سا ہا روڈ پر ایک صدیقی فیملی رہتی ہے۔ بینو کے والد مرزا صاحب کا ان سے اچھا میل ملاپ تھا۔ ان کے ایک بیٹے کا نام عبدل ہے۔ ممکن ہے وہ زری کو اپنے گھر لے گیا ہو۔''

''جگن ناتھ سا ہا روڈ — قلعے کے عین بازو میں — وہ جگہ تو خود زیادہ محفوظ نہیں ہے۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''اس گھر میں پچاسوں لوگ رہتے ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد صدیقی صاحب اس گھر میں آئے تھے۔ اس وقت بھی وہ کئی بہن بھائی تھے اور اب کئی بھائیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں اور سب مع بچوں کے اسی گھر میں رہتے ہیں۔ میں اکثر اس گھر میں جاتا رہا ہوں۔ چار منزلہ اس گھر میں تل دھرنے کو جگہ نہیں ہے۔ ہر کمرے میں آٹھ دس بچوں کا کنبہ رہتا ہے۔ تین تین چار چار نوکر نوکرانیاں ہیں۔ اتنے بھرے پرے گھر میں باہر کی ایک عورت کا پتا بھی نہیں چل سکتا۔ اگر زری کسی طرح وہاں پہنچ گئی ہے تو یقیناً وہیں ہوگی۔ رہن سہن پرانا ہے، مگر کھاتے پیتے اور مہمان نواز لوگ ہیں۔ چلو، وہیں چلتے ہیں۔''

لال باغ فورٹ کے جنوبی دروازے کے نزدیک جگن ناتھ ساہا روڈ پر 'صدیقی ہاؤس' پہنچے تو عجب افراتفری کا عالم تھا۔ ایک ٹرک کھڑا ہوا تھا اور خواتین جلدی جلدی اس میں بیٹھ رہی تھیں۔ سارا خاندان مولانا کو جانتا تھا مگر اس وقت سب نگاہیں چُرا رہے تھے۔ خاندان کے بزرگ اُن کے پاس آئے اور بتایا کہ زری اُن کے ہاں نہیں ہے اور ان تین چار دنوں میں ہر رات ان کے گھر پر حملہ کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ پڑوسیوں نے سمجھا بجھا کر حملہ آوروں کو بھگا دیا لیکن اب پڑوسیوں نے خود ہی مشورہ دیا ہے کہ وہ لوگ کہیں اور چلے جائیں۔ ان کی ایک بنگالن بہو نے ان کو نکالنے کا بندوبست کیا ہے۔ وہ عورتوں کے زیورات اپنی پنڈلیوں پر باندھ کر لے جا رہی ہے۔ راستے میں جگہ جگہ انھیں روکا جاتا ہے اور باز پرس ہوتی ہے۔ وہ مکتی باہنی کے لوگوں کے نام لیتی ہے اور کہتی ہے کہ میں بنگالی بہاری کچھ نہیں جانتی، یہ میری سسرال والے ہیں اور میرے جیتے جی ان کو کوئی ٹیڑھی نظر سے نہیں دیکھ سکتا۔

دس سے پندرہ بیس سال کی کئی لڑکیاں گھبرائی ہوئی باہر نکلیں۔ ان کے چہرے خوف سے زرد پڑے ہوئے تھے اور آنکھوں میں دہشت تھی۔ انھیں جلدی جلدی ٹرک میں بٹھایا گیا۔ چند عورتیں چادر میں لپٹی نکلیں۔ دو تین لڑکے رائفل لے کر ٹرک میں چڑھے، سب سے آخر میں وہ دُبلی پتلی بنگالن نکلی۔ شمس الرحمٰن کے نزدیک سے گزری تو اس نے غور سے دیکھا۔

''پاول؟'' بے اختیار اُس کے منہ سے نکلا۔

لڑکی نے چونک کر دیکھا۔ پہلی نظر میں نظر انداز کرنے کی کوشش کی پھر کچھ سوچ کر قریب آئی۔

''کیسے ہیں شمس بھائی آپ؟ — سب لوگ کیسے ہیں؟''

''کیا پوچھتی ہو؟ ساری بُری خبریں ہیں۔ مصباح الحق صاحب کا تین دن ہوئے، ہارٹ فیل ہو گیا۔''

''ہائے ماں۔'' پاول نے اپنی چھاتی پر ہاتھ دھرا اور بھائی کے غم میں دھیرے دھیرے رونے لگی۔

''میلو ابھی تک نہیں لوٹا۔ سنا ہے انڈر گراؤنڈ ہو گیا ہے، راج شاہی چلا گیا ہے۔ تمھارا خاوند ملا؟''

''ہاں، یہ ہیں نا''۔ اس نے ایک طرف کھڑے ہوئے ایک شخص کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ سارے ان ہی کے خاندان کے لوگ ہیں۔ ہم ان کو مختلف جگہوں پر ٹھہرا رہے ہیں، کچھ کو فارم گیٹ پر، کچھ شاہ جہاں پور اور کچھ موتی جھیل۔''

''تم بڑی باہمت ہو بیٹی، خدا تمھیں جزائے خیر دے۔'' مولانا نے کہا۔

''اپنے گھر بھی جاؤ۔ بھابی کو تسلی دو۔ پُتل تمھیں بہت یاد کرتی ہے۔'' شمس الرحمٰن نے کہا۔

''اچھا جاؤں گی تو — '' اس نے کہا، ''خدا حافظ۔''

ٹرک میں بیٹھے لوگ بے چین ہو رہے تھے۔ بھاری قدموں سے چلتی جیسے کوئی رقاص بھارت ناٹیم کے ابتدائی قدم اٹھا رہا ہو، وہ عورتوں کے ساتھ ٹرک میں بیٹھ گئی۔

''زری تو یہاں نہیں ہے لیکن ہمارا فرض ہے کہ ہم ان کے ساتھ جائیں اور انھیں منزلِ مقصود پر چھوڑ آئیں۔ تنہا بچی کیسے مقابلہ کرے گی۔'' مولانا نے کہا۔ شمس الرحمٰن نے باقی ماندہ لوگوں کو اپنی گاڑی میں بٹھایا اور ٹرک کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

مارچ میں محمد پور کیمپ ایک اسکول میں قائم ہوا تھا۔ وہ بعد میں اسی محلے میں بانس کی جھگیوں میں منتقل کر دیا گیا تھا۔ یہ کیمپ بے ترتیب سے ایک دائرے میں بانس اور چٹائیوں سے بنے چھوٹے چھوٹے کمروں پر مشتمل تھا۔ ضرورت کے لحاظ سے ان کو اور بھی چھوٹے چھوٹے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یہاں تک کہ وہ ناقابلِ تقسیم ہو گئے تھے۔ کھڑکیاں نہ ہونے کی وجہ سے ان میں ہوا کا گزر نہیں تھا۔ جھونپڑیوں کی چٹائی کی دیواریں اور سہارے بارش کی زیادتی کی وجہ سے سیاہ پڑ چکے تھے۔ ان ہی میں سے ایک کمرے میں آگ جلتی تھی اور روٹیاں پکتی تھیں۔ ان جھگیوں سے جو نالیاں نکلتی تھیں وہ ہر جھگی کے سامنے سے گزرتی پورے احاطے کا چکر کاٹتی تھیں۔ ان میں میلا پانی اور غلاظت ہر وقت بھری رہتی تھی۔ جگہ جگہ گول گڑھے گندگی سے ابلتے تھے۔ دو جھگیوں کی درمیانی پتلی گلی میں رنگین ساریوں میں ملبوس عورتیں ایک دوسری کو کھالہ (خالہ) کہہ کر پکارتیں، برتن مانجھتی جاتی تھیں اور پاکستان جانے کی باتیں کرتی رہتی تھیں۔ کمروں کے اندر کہیں کہیں کوئی چارپائی نظر آتی تھی جہاں کوئی مدقوق بوڑھا پڑا کھانستا رہتا تھا۔ مختلف صوبوں سے کتنے ہی تپِ دق کے مریض ان کیمپوں میں آئے تھے جنھوں نے چپ چاپ اپنا مرض کیمپ میں رہنے والے دوسرے لوگوں میں تقسیم کر دیا تھا۔

غذا کی کمی کے سبب بچے سوکھے کی بیماری میں مبتلا ہو گئے تھے۔ بڑی بڑی بھوکی آنکھیں، زرد رنگ، پھولے پیٹ، سوکھے جھولتے ہاتھ پاؤں لیے یہ بچے ان گلیوں میں لڑھکتے پھرتے تھے۔ پیٹ میں کیڑے عام تھے اور دستوں کی بیماری سے کوئی گھر خالی نہ تھا۔

زری محمد پور کے کیمپ کے لوگوں کی مدد کرتی تھی اور اسپتال کے ایک کمرے میں رہتی تھی۔ کیمپ کے اور باہر کے لوگ اسے زرینہ آپا کہتے تھے۔ اس نے اپنا یہی نام بتایا تھا۔ پہلے پہل کیمپ کے مکینوں نے اسے شبہے کی نظر سے دیکھا تھا۔ ضرور کوئی غیر ملکی نامہ نگار خاتون سفید ساری پہن کر اخبار کے لیے مواد جمع کرنے اور تماشا دیکھنے تشریف لائی ہیں۔ لیکن رفتہ رفتہ وہ اس سے مانوس ہو گئے۔ وہ جو کوئی بھی تھی، دکھیا تھی۔ دکھ نہیں بتاتی تھی مگر تکلیفوں کی اپنی زبان ہوتی ہے۔ وہ انسان کی چال ڈھال میں، انداز و ادا میں ظاہر ہو جاتے ہیں۔ اب کیمپ اور اسپتال میں پڑے مریض بغیر پوچھے بھی اپنی داستانیں اسے سناتے تھے۔

وہ سنتہار سے بچ کر آیا تھا۔ کالج میں پڑھنے والا ایک ذہین لڑکا۔ اسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ جہنّم سے نکل کر آیا ہے۔ ذہن میں ہر وقت الاؤ سا بھڑکتا ہے۔ جس میں انسانی ہڈیاں چٹخنے اور گوشت جلنے کی بو آتی ہے اور پھر جیسے چھن سے کوئی کباب کی سلاخیں پانی میں ڈال دیتا ہے۔ بھاگتے میں اس نے درختوں سے الٹی لٹکی لاشیں دیکھی تھیں جن کا گوشت نوچا جا چکا تھا اور اس کے ساتھ خنجروں سے لکھے گئے نعرے بھی مٹ گئے تھے۔ وہ ندی نالے اور تالاب جو برسات میں پانی سے ایک ہو جاتے تھے، اب خون سے ایک ہو گئے تھے۔ پینے کے لیے اوک میں پانی بھرتا تو اس کا رنگ گلابی ہوتا۔ پیاس سے بے تاب ہو کر پی لیتا تو اُبکائیاں آنے لگتیں۔ ان دنوں کتے، بلیاں اور گدھ تک اُبکائیاں لے رہے تھے۔ سرکنڈوں میں لاشے سڑ رہے تھے۔ سارس اور بگلے مچھلیاں پکڑنے اترتے تو چونچ میں انسانی انگلیاں پھنس جاتیں۔ چلتے ہوئے ٹھوکر لگتی، دیکھتا تو انسانی کھوپڑی۔ سچ جانیے کہ کوے، گدھ، چونٹیاں اور گرد و غبار مہربان لگتے تھے جو انسانوں کے ہاتھوں بے حرمت ہونے والوں کے آخری داغ مٹا کر انھیں معدوم کر رہے تھے۔

اسی اسپتال میں ایک آٹھ نو سال کی لڑکی تھی جو ہمیشہ چپ چاپ رہتی تھی۔ ایک دن زری نے اس سے پوچھا، ''تمھارا نام کیا ہے؟''

''صدّیقہ۔'' لڑکی نے جواب دیا۔

''تم اکیلی ہو؟''

''جی۔'' لڑکی نے کہا۔ کچھ دیر خاموش رہی، پھر بولی، ''میرے سارے گھر والوں کو انکل نے مار دیا ہے۔''

''انکل — کون انکل؟'' زری نے پوچھا۔

''وہ ہمارے گھر کے پاس رہتے تھے نا، ہم انھیں انکل کہتے تھے۔'' لڑکی نے بتایا، ''وہ ابو کے

دوست تھے۔ ایک دن صبح کو آئے۔ کہنے لگے، بھابی چائے تو پلواؤ۔ میز پر چائے بنی رکھی تھی۔ انھوں نے چائے پی، اتنی دیر میں کئی اور لوگ اندر آ گئے جنھیں ہم نہیں جانتے تھے۔

'اب تم سب لوگ لائن میں لگ جاؤ' انکل نے کہا۔

'اتنا خوف ناک مذاق نہ کرو یار' ابو نے کہا۔ تب انکل نے بندوق کے آگے لگی ہوئی چھری ابو کے سینے میں چبھوئی۔

'خبردار جو مجھے یار کہا۔ سب ایک طرف کھڑے ہو جاؤ' وہ زور سے چیخے۔ ابو اور ہم سب ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ کچھ آدمی ہماری امی اور بہنوں کو لے کر چلے گئے۔ ابو اور بھائیوں کو ٹھائیں ٹھائیں مار دیا۔ میں رونے اور چلانے لگی تو انکل مجھے دوسرے کمرے میں لے گئے۔ مجھے چپ کرانے لگے۔ ٹافی دینے لگے، پھر کہنے لگے، یہ کپڑے تمھارے اچھے نہیں ہیں، میں تمھیں اچھے کپڑے بنوا دوں گا۔'' وہ خاموش ہو گئی۔ اندھیرے میں کچھ دیر زری نے اس کے دوبارہ بولنے کا انتظار کیا۔ وقفہ طویل ہو گیا تو زری نے کہا، ''اچھا پھر کیا ہوا؟''

''پھر۔ مجھے پتا نہیں۔ میں نے تو آنکھیں بند کر لی تھیں۔'' لڑکی نے کہا اور کروٹ بدل لی۔

زری نے منھ پر ہاتھ رکھ لیا اور دیر تک سسکتی رہی۔

''آپ سے کوئی ملنے آیا ہے۔'' دروازہ کھٹکھٹا کر کیمپ کے وارڈن نے اطلاع دی۔

''اس وقت کون ہے؟ تم نے نام نہیں پوچھا؟'' زری نے کہا۔

''اس نے بتایا نہیں، کہتا ہے میں ان کا رشتے دار ہوں۔''

''شاید عبدل ہو۔ نہ جانے اس وقت کیوں آیا ہے؟'' زری نے سوچا۔

چپل پہن کر ساری ٹھیک کرتی وہ باہر نکلی۔ کیمپ کے دروازے کے باہر کوئی شخص کھڑا تھا۔ سڑک کے لیمپ کی روشنی کیلوں کے جھنڈ سے گزر کر اس تک آ رہی تھی مگر زری کو یاد نہیں پڑتا تھا کہ اس نے اس شخص کو دیکھا ہے۔

''میں رونجھو ہوں۔'' اس نے انگریزی میں کہا۔

زری کا ذہن کوندے کی طرح لپک کر ڈرائنگ روم میں لگی ہوئی تصویر تک پہنچا۔ مگر اس شخص کے منھ پر داڑھی نہیں تھی نہ سر کے بال بڑھے ہوئے تھے۔

''ہر جگہ آپ کو تلاش کیا جا رہا ہے۔'' اس نے کہا، ''مجھے پتا چلا کہ اس حلیے کی ایک خاتون اس کیمپ میں دیکھی گئی ہیں۔ میں نے شمس بھائی سے کہا......'' وہ الفاظ تول تول کر بولنے لگا، ''چلیے کیمپ میں چل کر دیکھ لیتے ہیں۔ انھوں نے کہا، پہلے تم مل آؤ۔''

''مجھے کیوں تلاش کیا جا رہا ہے؟'' زری نے پوچھا۔

''آپ کی حفاظت کے خیال سے اور کیوں؟'' رونجھو نے کہا۔

زری کا دل بجھ گیا۔ کم بخت نے بلاوجہ ہی دھڑکنا شروع کر دیا تھا۔

''میں کیمپ میں بالکل محفوظ ہوں۔ اور کوئی بات؟'' اس نے رُکھائی سے کہا۔

''بات یہ ہے کہ کیمپ میں رہنے والوں اور قید ہو جانے والوں کا مستقبل غیر یقینی ہے۔ کچھ نہیں معلوم کہ وہ کب تک پاکستان پہنچیں گے۔ آپ چاہیں تو ہم آپ کو جلد پاکستان بھجوا سکتے ہیں۔'' رونجھو نے کہا۔

زری نے کچھ دیر سوچا۔ ''کن شرائط پر؟'' اس نے پوچھا۔

''کوئی شرط نہیں ہے۔ ایک آدمی ساتھ جائے گا۔ آپ ہر جگہ محفوظ رہیں گی۔ ہمیں معلوم ہے کہ آپ کمزور ہیں۔ ایک بہت خوب صورت جگہ آپ کے آرام کے لیے محفوظ کرا دی گئی ہے۔ آپ جب تک چاہیں وہاں رہیں۔ اس کے بعد کھٹمنڈو میں پاکستان کے سفارت خانے کے ذریعے آپ لندن اپنی دوست نرگس کے پاس یا پھر پاکستان جا سکیں گی۔''

''میرے پاس پیسا نہیں ہے۔'' زری نے کہا۔

''اس کا انتظام ہو جائے گا۔ صرف یہ کیجیے گا کہ یہاں بینک میں جو پیسہ آپ کے نام ہے، اس کا اتھارٹی لیٹر یہاں کے کسی آدمی کے نام لکھ دیجیے گا۔'' زری کو یکایک بے حد سردی محسوس ہوئی۔ اس نے ساری اچھی طرح اپنے چاروں طرف لپیٹی۔

''کیا یہ شمس کا پیغام ہے؟'' زری نے اپنا لہجہ مضبوط رکھا۔

''یہی سمجھ لیجیے۔'' رونجھو جھک کر جوتے میں لگی ہوئی کیچڑ صاف کرنے لگا۔

''اگر میں یہ نہ کروں۔'' زری نے پوچھا۔ رونجھو سیدھا کھڑا ہو گیا جیسے اب دو بدو بات کرنے کا وقت آ پہنچا ہو۔

''سوچ لیجیے۔ آپ کا روپیا یوں بھی حکومت ضبط کر لے گی۔ آپ اسے حفاظت اور آرام سے پہنچانے کا معاوضہ سمجھ لیجیے یا وہ آخری نیکی جو آپ اپنے شوہر کے لیے کر سکتی ہیں۔'' زری کو خاموش پا کر رونجھو نیم تاریکی میں اس کے چہرے کے تاثرات پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ پھر ایک ایک لفظ تولتے ہوئے بولا ''کیا آپ شمس بھائی سے ملنا چاہیں گی؟ ان سے رائے لینا پسند کریں گی؟''

''نہیں اس کی ضرورت نہیں۔'' زری نے کہا۔ رونجھو کی مسکراہٹ اور بھرپور اطمینان کا ایک سانس، اندھیرے میں زری نہ دیکھ سکی۔ ''تم یہاں کیسے آئے، تمھیں اس علاقے میں ڈر نہیں لگا؟'' زری کے لہجے میں طنز بھی تھا۔

''میں خاصے انتظام سے آیا ہوں، ویسے بھی مجھے کوئی نہیں جانتا۔ میں پسِ پردہ کام کرنے والوں میں سے ہوں۔ اچھا تھارٹی لیٹر کل لکھ کر تیار رکھیے، اور جو خطوط لوگوں کے نام آپ دینا چاہیں۔''

''میں کب جاسکوں گی اور جو شخص میرے ساتھ جائے گا میں اس پر کیسے بھروسا کرسکتی ہوں؟'' زری نے پوچھا۔

''کل رات، آپ اسی وقت تیار رہیے گا۔ جو آدمی آپ کے ساتھ جائے گا اس کا کام ہی یہی ہے۔ اس کو اس کام کا بھاری معاوضہ ملے گا۔ وہ یقیناً ہمارا قابلِ اعتماد آدمی ہوگا۔''

''کیا میری پسند کا کوئی آدمی میرے ساتھ نہیں جاسکتا؟'' زری نے سوال کیا۔

''مثلاً کون؟''

''سورج، اکرام الحق کا ملازم جو چاچاجی کو کھانا پہنچاتا تھا یا عبدل، ایک ٹیکسی ڈرائیور جو ہوٹل انٹر کانٹی نینٹل سے مجھے یہاں لایا تھا۔''

''کیا وہ بنگالی ہے؟'' رونجھو نے پوچھا۔ زری نے لمحے بھر سوچا۔

''ہاں، اور اب بھی انٹر کانٹی نینٹل ضرور جاتا ہوگا۔ وہاں کے اخباری رپورٹر اسے جانتے ہیں۔''

''اکرام کو بتائے بغیر اس کے ملازم کو اس کام کے لیے نہیں لیا جاسکتا اور اکرام کو بتانے سے مشکلات پیدا ہوسکتی ہیں۔ عبدل کو کل تلاش کرنے کی کوشش کروں گا، اگر وہ مل گیا تو اسے ساتھ بھیجا جاسکتا ہے۔''

''کیا میرے چاچاجی میرے ساتھ جاسکتے ہیں؟'' زری نے پوچھا۔

''مجھے افسوس ہے، آپ کے چاچاجی خود کو بھارتی فوج کے حوالے کرچکے ہیں بلکہ ان کے قیدی بن کر بھارت جاچکے ہیں۔''

زری لڑکھڑائی، اس نے کیمپ کی دیواروں کو تھاما۔

''وہ خیریت سے ہیں، آپ کو یقین ہے؟'' اس کی آواز حلق میں گھٹ کر نکلی۔

''ہاں ہاں، وہ آپ کے اور شمس بھائی کے نام پیغام چھوڑ گئے ہیں کہ میں روز اپنے کمرے سے بھارتی فوجی ٹرک گزرتے دیکھتا ہوں اور میں نے خود کو ان کے حوالے کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے۔ کیوں کہ مجھے جلد یا بدیر بہرحال اپنے وطن جانا ہے۔''

''انھوں نے میرے نام پیغام چھوڑا ہے اس کا مطلب ہے کہ انھیں یہ معلوم نہیں تھا کہ میں لاپتا ہوں۔''

''میرا خیال ہے انھیں یہ بات بتائی نہیں گئی تھی۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوا۔'' زری نے کہا۔

''آپ کو یقین ہے کہ آپ آخری بار شمس بھائی سے ملنا نہیں چاہتیں؟'' رونجھو نے دوبارہ پوچھا۔

''اگر میں اس شخص سے ملنے کو بے قرار ہوتی تو دور کیوں بھاگتی، چھپتی کیوں پھرتی؟ جب وہ مجھ سے ملنے کو بے تاب نہیں تو میں کیوں ہوں؟''

''یو آر رائٹ۔(you are right)'' رونجھو نے کہا، ''اچھا آپا، کل تک کے لیے خدا حافظ۔''

رونجھو زیرِ لب مسکراتا، تیز تیز چلتا دروازے کی طرف بڑھا۔ رونجھو نے زری کی مدد کر کے اپنے بھائی کو اس کی زد سے ہمیشہ کے لیے بچا لیا تھا۔ احسانوں میں بعض اوقات بڑی مصلحتیں چھپی ہوتی ہیں۔

رونجھو کے جانے کے بعد زری دوبارہ اپنے کمرے میں آئی اور سوچتی رہی۔ خدا جانے اب کون سے امتحان اس کے منتظر ہیں۔ کیا ان لوگوں پر بھروسا کیا جا سکتا ہے؟ صدیقہ پھٹی ہوئی چادر میں لپٹی سو رہی تھی۔ سوکھے چہرے پر بے پناہ کرب آ گیں آنکھیں، جن کی طرف دیکھا نہ جاتا تھا، بند تھیں۔ اب یہ لڑکی کس رشتے پر اعتبار کرے گی؟ اور وہ خود کس پر یقین کرے؟

ہوا کے تیز جھونکے کے ساتھ چند اوراق اڑتے پھر رہے تھے۔ زری نے انھیں پکڑ کر لیمپ کی روشنی میں پڑھنے کی کوشش کی۔

''ایک غدر کالوں کا، ایک ہنگامہ گوروں کا، ایک فتنہ انہدامِ مکانات کا، ایک آفت وبا کی، ایک مصیبت کال کی، اب یہ برسات جمیعِ حالات کی جامع ہے۔ لال کنویں کے محلے میں خاک اڑتی ہے، آدمی کا نام نہیں، ایک اچھے گاؤں کی آبادی تھی، وہاں کے رہنے والے اگر گولی سے بچے ہوں گے تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہاں ہیں؟''

خطوطِ غالب کے یہ لخت لخت پرزے سمیٹ کر زری پڑھتی رہی۔ ۱۸۵۷ء اور ۱۹۷۳ء کے ان حالات میں اتنا فرق بھی تو نہ تھا۔

پانچ سو لشکر کا حملہ پے بہ پے اس شہر پر ہوا۔ پہلا باغیوں کا لشکر، اس میں اہلِ شہر کا اعتبار لٹا، دوسرا لشکر خاکیوں کا اس میں جان و مال و ناموس و مکان و مکین و آسمان و زمین و آثارِ ہستی سراسر مٹ گئے۔ تیسرا لشکر کال کا، اس میں ہزار ہا آدمی بھوکے مرے، چوتھا لشکر ہیضہ کا، اس میں بہت سے پیٹ بھرے مرے، پانچواں لشکر تپ کا، اس میں تاب و طاقت نہ پائی۔ اب تک اس شہر سے کوچ نہیں کیا۔

جاگیردار، پنشن دار، دولت مند، اہلِ حرفہ کوئی بھی نہیں ہے۔ مفصّل لکھتے ہوئے ڈرتا ہوں......

سوائے اناج اور اُپلوں کے کوئی چیز ایسی نہیں جس پر محصول نہ لگا ہو۔

پوچھو کہ غم کیا ہے، غمِ مرگ، غمِ فراق، غمِ عزت۔

زری نے کاغذ قلم اٹھایا اور غالب کے اسی جملے سے لکھنا شروع کیا۔

پوچھو کہ غم کیا ہے...... بینو! اخبار پڑھتی ہوں تو لگتا ہے کسی اور دنیا کی بات ہے، کوئی اور زبان ہے جو میری سمجھ میں نہیں آ رہی۔ اتوار کو گالف کورس میں پاکستانی فوجیوں سے باقاعدہ ہتھیار رکھوا لیے گئے......شہیدوں کی یادگار تعمیر کی جائے گی۔

لوگوں کا مطالبہ ہے کہ پاکستان کے حامیوں پر مقدمے چلائے جائیں جس طرح عالمی جنگ میں نازیوں پر چلائے گئے تھے۔ ۱۰ جنوری کو شیخ مجیب الرحمٰن بنگو بندھو ڈھاکا پہنچے اور سیدھے ریس کورس گئے۔ بنگلہ دیش مسکراتا ہے، اخباروں میں سرخیاں چھپیں۔ ''آج ہم غازیوں کو سلام کرتے ہیں اور شہیدوں کو سلام کرتے ہیں۔'' شیخ نے کہا۔ کون غازی! کون شہید؟ — بینو پیاری، تم نے جس بات کو پہلے دن سے قبول کر لیا تھا، میں اب تک اسے قبول نہ کر سکی۔ اس صورت میں بتاؤ میرے پاس یہاں رہ پڑنے کا کیا جواز ہے؟ نفرتوں کے ساتھ جینا میں نے ابھی سیکھا نہیں ہے۔ شمس اب ان حقیقتوں کا پرستار ہے، سو ہمارے راستے جدا ہوئے — میں نے ہمیشہ کے لیے ان لوگوں سے ناتا توڑ لیا ہے جن کے ساتھ رہ نہ سکوں۔ سو وہی کر رہی ہوں۔ خدا کرے تم سب خوش رہو — اکرام کو سلام کہنا۔

سورج ڈوب رہا تھا جب تجمل اس اجڑے گرجا گھر میں پہنچا۔ جس وقت اس نے ہتھیار نہ ڈالنے کا فیصلہ کیا تھا، شاید اس کے ذہن کے کسی گوشے میں اس چرچ کا خیال ہو جہاں پاول کو پناہ ملی تھی، مگر اب وہ چرچ اس سے بہت دور تھا۔ ابھی تو وہ کھلنا کے مضافات میں تھا۔ ۱۰ر دسمبر کو انھوں نے بھارتی فوج کا مقابلہ کیا تھا۔ ۱۶ر دسمبر کو جب اوپر سے ہتھیار ڈال دینے کے احکامات ملے تھے تب بھی وہ بہت دیر تک لڑتے رہے تھے۔ یہاں تک کہ انھیں بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے ڈانٹ بھی پڑی تھی، اور جس وقت سفید جھنڈا ہلاتے بھارتی فوجی دور سے دکھائی دیے تھے اور اس طرف سے بھی رائفلوں پر سفید قمیصیں چڑھا کر ہلائی جا رہی تھیں، وہ موقع پا کر وہاں سے کھسک گیا تھا۔ اتنا سب کچھ دیکھنے کے بعد بھی انسانوں پر اس کا اعتماد متزلزل نہیں ہوا تھا۔ ممکن ہے کہیں پناہ مل جائے۔ اگر موت قسمت میں ہے تو یہی سہی۔ اس کا رُخ باریسال ہی کی طرف تھا۔ یہ علاقہ بہت کچھ اس کا دیکھا ہوا تھا مگر اس سے پہلے یہ اجاڑ گرجا گھر اس نے نہیں دیکھا تھا۔ اس گرجا گھر کی شام رات میں داخل ہو چکی تھی۔ دروازوں کا روغن اترے زمانے بیت گئے تھے۔ دروازے کے پٹوں میں بارش کے اترتے پانیوں نے نالیوں کی طرح گہری ریخیں بنا دی تھیں۔ صدر دروازے پر پیتل کی چمکتی کیلیں اور نیم دائرے میں پنکھڑیاں اب لوہے کی طرح سیاہ ہو چکی تھیں۔ تجمل گرجا گھر کے چاروں طرف گھوما، بظاہر سارے دروازے اندر سے بند تھے، باہر کسی دروازے میں قفل نہ تھا جب کہ اندر کسی ذی روح کے ہونے کے کوئی آثار نہ تھے۔ آخر تجمل نے ایک دروازہ کھولنے کا فیصلہ کر لیا۔

پوری طرح چوکس ہوکر اس نے ایک دروازے کو زور سے دھکا دیا تو چوکھٹ بھی تھوڑی سی اپنی جگہ سے کھسک گئی۔ زنگ آلود کنڈی کسی پردہ نشین کی طرح جھری میں سے جھانکی۔ ریوالور کو تان کر بائیں ہاتھ سے موٹی زنجیر کو اٹھا کر جھٹکا دیا تو لمبی بھاری زنگ آلود زنجیر سے جھنکار ایک آہ کی طرح ابھری اور وہ دروازے کے پہلو سے لگ کر چپ ہوگئی۔ تجمل نے اندر داخل ہوکر وہیں کھڑے کھڑے جائزہ لیا۔ اندرونی حالت کسی طرح بیرونی حالت سے بہتر نہ تھی، لیکن یہ اندازہ ضرور ہوتا تھا کہ اپنے دورِ عروج میں اس کا شمار مایۂ ناز گرجا گھروں میں ہوگا۔ وہ خاصا بڑا تھا۔ نصف کمرے تک بھری بنچیں تھیں جن کے بھورے گدے اب سیاہ ہو چکے تھے۔ زمین پر کبوتروں کی بیٹوں کے سفید اور سرمئی چھلے دائرہ در دائرہ پڑے تھے۔ میزوں پر کئی مہینوں کی ریت تھی جسے وقت بغیر چھیڑے سوتا چھوڑ کر آگے بڑھ گیا تھا۔ فرش کسی نعش کی طرح ٹھنڈا اور بے جان تھا۔ کھڑکیوں کے رنگین ٹوٹے شیشوں سے سورج کی آخری کرنیں داخل ہوکر اب رخصت ہوا چاہتی تھیں۔ ان سے فائدہ اٹھا کر تجمل نے ایک بار اور چاروں طرف دیکھا۔ کھڑکیوں میں چڑیوں کے گھونسلے تھے۔ دیواروں کے طاقچوں میں مریم کی مورتی کی جگہ خالی تھی۔ ابنِ مریم کا دھڑ گرد کی پوشاک پہنے موجود تھا مگر اس کا سر غائب تھا۔ گلدانوں اور شمع دانوں کی جگہیں خالی تھیں۔ بجلی کے سوئچ بورڈ کی تلاش کی تو دیکھا کہ پرانے بوسیدہ تار جگہ جگہ سے لٹکے ہوئے ہیں — اسے حضرت گل کی نکلی ہوئی انتڑیاں یاد آئیں۔

بظاہر کوئی ذی روح اندر نہ تھا مگر کوئی تو ہوگا جس نے سارے دروازے اندر سے بند کر رکھے تھے۔ اس پناہ گزین کی تلاش میں ریوالور تانے تجمل نے آہستہ آہستہ آگے بڑھنا شروع کیا۔ پلپٹ (pulpit) کے نزدیک سے گزر کر وہ پچھلے کمرے میں داخل ہوا۔ یہ بھی خالی تھا۔ کسی زمانے کے چند مذہبی کتابچے پڑے تھے جن پر ریت کی تہیں جمی ہوئی تھیں۔

اب روشنی کی آخری رمق بھی دم توڑ چکی تھی۔ تجمل نے ہورسیک سے ٹارچ نکال کر جلائی اور اس کی مدد سے ایزل سے گزرتا ہوا چرچ کے آخری حصے میں پہنچا تو فرش پر جوتوں کے نشان نظر آئے۔ یہ نشان پیچھے پڑی ہوئی ایک لمبی میز تک گئے تھے۔ میز پر روشنی ڈالی تو سفید چادر میں لپٹا کوئی لیٹا ہوا تھا۔ اوہ، تو یہ صاحب غالباً اس چرچ کے رکھوالے ہیں جو یہاں اطمینان سے سو رہے ہیں۔ کیا انھوں نے اس کو دیکھا نہیں ہے۔ اس کے قدموں کی چاپ نہیں سنی ہے یا اس سے ڈر کر ہی یہاں چھپ گئے ہیں؟ تجمل نے جھٹکے سے چادر اس شخص کے منھ سے کھینچ کر ٹارچ کی روشنی اس پر ڈالی اور حیرت زدہ رہ گیا — وہ چہرہ یا وہ سر کسی زندہ یا مردہ آدمی کا نہیں تھا بلکہ اس مجسمے کا تھا جو طاق میں دھرا تھا۔ تو پھر یہ جسم کس کا تھا؟ میجر تجمل نے چادر ذرا سی اور ہٹائی تو وہاں ایک دھڑ موجود تھا جس کا سر کٹا ہوا تھا۔

ٹارچ کی روشنی میں یہ منظر سلویڈور ڈالی (Salvidor Dali) کی کسی سرریلسٹ پینٹنگ کی طرح بھیانک تھا۔ حلق بریدہ کسی ایسے شخص کی تصویر جو اپنا دھڑ دیکھ کر خود ہی قہقہہ لگا رہا ہو۔ تجمل افسردہ اور حیران کھڑا تھا۔ اس نے لانبی زلفوں، بڑی بڑی آنکھوں والا سنجیدہ چہرہ غور سے دیکھا۔ یہ پیغمبر یسوع مسیح — مسیحا، مردوں کے جسم میں روح پھونکنے والا — اس کے ساتھ اتنا خوفناک مذاق کس نے کیا تھا!!

اب تجمل کو یقین ہوگیا کہ چرچ میں کوئی زندہ شخص نہیں ہے۔ یہ مذاق کرنے والے باہر سے کنڈی اٹکا کر جا چکے تھے۔ اندر سے دروازہ بند کر کے وہ رات تجمل نے اس اجاڑ گرجا گھر میں گزاری۔ ہیورسیک میں رکھا خشک راشن کھایا۔ چھاگل میں سے پانی پیا اور ساری رات چپ چاپ سفر کرتے چاند کی ہمرہی میں گزار دی — صبح روشنی ہونے سے پہلے اس نے اپنی وردی پادری کے کمرے میں اتار کر نعش سے اتارا ہوا بنیان اور اس کی اوڑھی ہوئی چادر باندھ لی اور باہر نکل آیا۔

احاطے میں کھڑے ہار سنگھار کی کلیوں کے کچے ریشم کے کویوں جیسے زرد ہار اس پرانے مگر مضبوط چرچ کی آرتی اتار رہے تھے۔ اس وقت تجمل کی نظر صدر دروازے پر پڑی۔ باریسال کے گرجا گھر کی طرح یہاں بھی ایک پوسٹر لگا ہوا تھا، جس کے کاغذ کی سپیدی زردی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ ایک جھٹکے سے اس نے وہ زرد پتلا کاغذ اتارا اور اس پر ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ رومن اردو میں لکھے ہوئے الفاظ ٹارچ کے دائروں کی روشنی میں ابھرے:

میں نے خداوند کا حکم پایا جب اس نے کہا کہ تو اپنے لیے بیوی نہ کر، اور نہ اس جگہ تیرے بیٹے اور بیٹیاں ہوں، کیوں کہ خداوند ان بیٹوں اور بیٹیوں کی بابت جو یہاں پیدا ہوتے ہیں اور ان باپوں کی بابت جو اس ملک میں پیدا ہوتے ہیں، یوں فرماتا ہے، وہ دردناک موت مریں گے۔ ان پر کوئی ماتم نہ کرے گا۔ وہ دفن نہ کیے جائیں گے۔ وہ سطحِ زمین پر کھاد کی مانند ہوں گے۔ وہ تلوار اور کال سے ہلاک ہوں گے۔ ان کی لاشیں ہوا کے پرندوں اور زمین کے درندوں کی خوراک ہوں گی۔

شمس الرحمن اپنے سونے کے کمرے میں بیڈ لیمپ جلائے اخبار پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اخبار جو کبھی ''پاکستان آبزرور'' تھا، ۱۸ ردسمبر ۱۹۷۱ء کو ''دی آبزرور'' تھا اور ۲۳ ردسمبر سے آج تک ''بنگلہ دیش آبزرور'' تھا۔ اس کے برابر کی مسہری پر زری آج بھی نہیں تھی مگر اس کی تمام چیزیں جوں کی توں موجود تھیں۔ مسہری کے نزدیک تپائی پر اس کا قلم اور چند ہیرپن۔ سنگھار میز پر اس کا بالوں کا برش اور سنگھار کی چیزیں، بک شیلف میں اس کی کتابیں اور سجاوٹ کا سامان، دیناج پور کے مہاراجا کی ہاتھی

دانت کی کرسی کا ریپلیکا (replica) جس کے ہتھے پر دو شیر بنے ہوئے تھے اور گدی کمخواب کی تھی۔ ہاتھی دانت کی سیتل پاٹی کا چھوٹا سا ٹکڑا جس پر مٹی کی پلیٹ میں مٹی کے بنے ہوئے کم رنگا، تال، گاب اور ڈالم تھے۔ الماری میں نفاست سے لٹکی ہوئی ساریاں، نچلی دراز میں اس کے جوتے، اس کے پرس، چوڑیاں، خوشبوئیں۔ ہر رات وہ غسل خانے سے شب خوابی کا لباس پہنے نکلتی تو خوشبو کی ایک مخصوص مہک کمرے میں پھیل جاتی۔ آج کتنی راتوں سے وہ اس خوشبو سے محروم تھا۔ وہ پہلے کی طرح اب پھر تنہا رہ گیا تھا۔ شوشی نے خط میں لکھا تھا، تم نے جو احسان میرے ساتھ کیا ہے، اس کا بدلہ کبھی نہیں اتار سکوں گی لیکن میری تم سے ایک درخواست ہے کہ مجھ سے ملنے نہ آنا۔ میں تمھیں اپنا جھلسا ہوا چہرہ دکھانا نہیں چاہتی۔ تمھارے ذہن میں میری جو تصویر موجود ہے، وہی رہے تو بہتر ہے۔ ان عورتوں کے نزدیک چہروں کی بہت اہمیت ہے! اس کا دل جو داغ داغ ہے—— وہ کیا شوشی سے کم بد نصیب ہے—— اس کا دل کیا، سارا دیس ہی داغ داغ تھا۔ سڑکیں اور پل ٹوٹے ہوئے، دکانیں جلی ہوئیں، فیکٹریاں ڈھیر، فصلیں تباہ، مشینیں، سونا چاندی، پٹ سن اور اناج، سب اسمگل ہوکر بھارت جارہا تھا۔ اپنی جوٹ کی فیکٹریاں بند پڑی تھیں۔ بھارت میں ہر کارخانہ تین شفٹ کرتا تھا اور نئے کارخانے لگائے جارہے تھے۔ بھارت سے نئے نوٹ چھپ کر آتے تھے۔ پیداوار کم اور نوٹ زیادہ، قیمتیں آسمان سے باتیں کررہی تھیں۔ قحط منھ پھاڑے سامنے کھڑا تھا۔ آج رونجھو سے اسی بات پر اس کا جھگڑا ہوا تھا۔

رونجھو نے مہینوں بعد آج شکل دکھائی تھی اور اس بات کا اقرار بھی کرلیا تھا کہ زری کو بنگلہ دیش سے نکلوانے کا سارا انتظام اس نے کیا تھا مگر اس کا اصرار تھا کہ اس میں صرف نیک نیتی کا دخل تھا۔ اس وقت زری اور شمس الرحمٰن دونوں کی جان خطرے میں تھی۔ وہ یک جہتی کے لیے کام کرتے تھے۔ ان پر پاکستان کی حمایت کا اور فوجیوں سے تعلقات کا الزام تھا۔ بنگلہ دیش بننے کے بعد ان کے دوست عوامی لیگ کے وفاداروں میں سے نہیں ہیں۔ اکرام الحق نے حکومت کا ایک عہدہ یہ کہہ کر ٹھکرا دیا تھا کہ وہ اپنا کاروبار سنبھال رہا ہے۔ میلو جیتو تنتر ک دل میں شامل ہوچکا ہے اور رُکھی باہنی سے لڑ رہا ہے۔ چل اور ظاہر بھی اسی گروپ میں ہیں۔ مینو کی پھوپھی پاول کے خلاف الزام تھا کہ اس نے دسمبر ۱۹۷۱ء میں سیکڑوں بہاریوں کو پیسے اور زیورات سمیت بھارت کے راستے بھگایا ہے اور پھر خود بھی چلی گئی ہے۔ سو میں نے برا تو نہیں کیا۔ زری کے جانے کے بعد تم نے گوشہ نشینی اختیار کرلی۔ یہ اچھا کیا، ورنہ باہر کے حالات ناگفتہ بہ ہیں۔

"تم کیا سمجھتے ہو کہ مجھے باہر کے حالات کا علم نہیں ہے۔ مجھے معلوم نہیں ہے کہ عوامی لیگی حکومت

کی سرپرستی میں رکھی باہنی کیا کر رہی ہے! یہ اسمگلنگ اور بلیک مارکیٹنگ کو ختم کرنے کے لیے بنائی گئی تھی مگر اس نے صرف سیاسی دشمنوں کو ختم کیا۔ گاؤں دیہاتوں کا محاصرہ، لوٹ مار، قتل و غارت اور عورتوں کی ناموس تک بات پہنچتی رہی اور کسی کا محاسبہ نہیں ہوا۔ بیس مہینوں کے بعد ان کے لیے قانون بنایا گیا تو ماضی کے گھناؤنے کاموں کو یہ کہہ کر قبول کر لیا گیا کہ نیک نیتی سے کیے گئے تھے (نیک نیتی سے رونجھو نے زری کو ہمیشہ کے لیے اس کی زندگی سے خارج کر دیا تھا)۔ تیس ہزار جوان انھوں نے مارے کیوں کہ اپوزیشن پارٹیوں میں تھے۔ تم نے بنگلہ دیش کو کس حال پر پہنچایا ہے۔ کیا یہی تمھارا شنار بنگلہ دیش ہے۔ ننگا، بھوکا، جہاں کسی کی نوکری، کسی کی عزت اور کسی کی جان محفوظ نہیں؟ بولو، جو کل تک تمھاری سیاسی کشتیوں کے ناخدا تھے، ان کو آج اپنے دیش کے 'میر جعفر' کہتے ہو۔''

''آہستہ بولو بھائی، میں مانتا ہوں یہ سب ہوا اور ہو رہا ہے مگر انقلاب میں یوں ہی ہوتا ہے — فرانس کے اور روس کے انقلاب میں بھی یہی ہوا تھا۔''

''بس یہی کہہ کر خود کو فریب دیتے رہو۔'' شمس الرحمٰن گرجا۔ ''یاد رکھو، جو کچھ تم نے کیا ہے میں اس کے لیے تمھیں کبھی معاف نہیں کروں گا۔''

''میں نے صرف آپ کی جان بچانے کا قصور کیا ہے۔ آپ کے خلاف الزام ہے کہ آپ دوسرے ممالک کے ذریعے آج بھی پاکستان سے رابطہ رکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

''تمھیں کیسے معلوم؟''

''معلوم کرنے کے طریقے ہوتے ہیں۔ آپ نے مختلف ذرائع سے وہاں خط بھیجنے کی کوشش نہیں کی؟'' رونجھو نے کہا۔

''میں نے اپنی بیوی سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، پاکستانی حکومت سے ساز باز نہیں کی ہے۔'' شمس الرحمٰن دہاڑا۔

''اس کا مطلب ہے وہ خط پکڑے گئے ہیں اور زری تک نہیں پہنچے۔''

''ظاہر ہے۔'' رونجھو نے اطمینان سے کہا۔

''یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟'' شمس الرحمٰن للکارا۔

''مجھے نہیں معلوم۔'' رونجھو بے تعلق تھا۔

''تمھیں معلوم ہونا چاہیے رونجھو کہ انسانی برداشت کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔ وہی شخص جس کے ایک اشارے پر لوگ جان دینے کو تیار تھے، اب کس تیزی سے نامقبول ہو رہا ہے۔''

''یہ اس کے خلاف سازش ہے، وہ بے چارہ کیا کرے۔ مشکلات بڑی اور زیادہ ہیں اور اس

کے بس سے باہر ہیں۔''

''ہر معاملے میں اپنے لوگوں کو بچانا — جن باتوں کے لیے مغربی پاکستانیوں کو معاف نہیں کیا گیا، تم سمجھتے ہو تم لوگوں سے جواب طلبی نہیں ہوگی۔''

''میں چلتا ہوں، میں تو صرف تمھاری امانت دینے آ گیا تھا جو بہت دنوں سے میرے پاس پڑی تھی۔'' رونجھو نے ایک لفافہ شمس الرحمٰن کی طرف بڑھایا۔ ''یاد رکھو، میں نے تمھاری جان بچائی ہے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ اس کے لیے میری جواب طلبی ہوگی۔ خدا حافظ۔'' دھڑ سے دروازہ مارتا ہوا وہ کمرے سے باہر چلا گیا۔

شمس الرحمٰن نے کئی مرتبہ کاغذ کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ نہ کہیں نام تھا نہ پتا تھا، نہ تاریخ تھی۔ یہ عجب دستاویز تھی جو زری کی طرف سے اسے موصول ہوئی تھی۔ لفافے پر زری کے ہاتھ کا پتا لکھا ہوا تھا۔ لفافہ کھولنے سے پہلے اس نے ایک بار اپنے کمرے پر نگاہ ڈالی تھی۔ یہ اس کا کمرہ تھا یا جادو گھر (عجائب گھر) تھا۔ جہاں آثارِ قدیمہ رکھے ہوئے تھے۔ ان میں ایک لفافے کا اضافہ ہونے والا تھا۔ انسان معدوم ہو جاتے ہیں اور ان کی چیزیں رہ جاتی ہیں، تحریریں رہ جاتی ہیں۔

زری نے اسے غلط سمجھا تھا۔ وہ اوروں کی طرح ہوتا تو آج اتنا اکیلا نہ ہوتا، اتنا تنہا! — روزِ ازل کی طرح، شامِ ابد کی طرح اور شاید لوحِ تقدیر کی طرح۔

شمس الرحمٰن نے اس تحریر کو دوبارہ پڑھا جو نہ کوئی خط تھا، نہ پیغام تھا بلکہ شاید دنیا کی تمام عورتوں کی طرف سے دنیا کے تمام مردوں کے نام ایک سوال نامہ تھا۔

''تم مرد لوگ عورت سے آخر کیا چاہتے ہو؟ کبھی اسے پانی کی مانند دیکھنا چاہتے ہو کہ جس برتن میں ڈالو اسی کی شکل اختیار کر لے۔ کبھی چاہتے ہو وہ فولاد بن جائے کہ کسی کے آگے خم نہ ہو مگر جب تم چاہو، پانی میں نمک کی طرح گھل جائے۔ جب تم چاہو تو ایسی خوب صورت دکھائی دے کہ آنکھیں خیرہ ہو جائیں۔ جب تمھاری خواہش ہو تو ایسی سخت جان ہو جائے کہ ہر ظلم برداشت کرے۔ جب تمھاری مرضی ہو تو ریشم کی طرح نرم ہو کہ ایک مٹھی میں دبالی جائے۔ ہر وقت تمھاری ہم نوائی کرے۔ حکم کی غلام بنی رہے۔ جب تم چولے کی طرح اپنا نظریہ بدل لو تو وہ بدل جائے۔ تمھاری رضا پر زندہ رہے اور تمھارے اشارے پر مر جائے۔

سوچو! اتنا تو خدا بھی بندے سے مطالبہ نہیں کرتا۔ وہ جب تک چاہتا ہے زندہ رکھتا ہے اور جب چاہتا ہے موت کی نیند سلا دیتا ہے مگر یہ نہیں کہتا کہ اٹھ، اور سمندر میں جا کر ڈوب مر کہ اپنی آئی سے مرنا تو آسان ہے مگر کسی کے حکم پر جان سے گزرنا بہت مشکل ہے۔

زری شمس الرحمٰن کے سلہٹ میں رہ کر آئی تھی۔ سفید ساری میں بندیا لگائے وہ بانس کے گھروں کے آگے کھڑی اڑیسہ سے آئی ہوئی تیسری نسل کو چائے کی پتیاں توڑ کر پیچھے بندھی ٹوکریوں میں ڈالتا دیکھتی رہتی۔ سر پر بندھی ہوئی اوڑھنیاں پیچھے کی طرف اور ہاتھ مشین کی طرح تیزی سے چلتے ہوئے۔ سرکٹ ہاؤس کے سامنے دریائے سُرما کو بہتا دیکھتی۔ یہ طوفانی دریا جو برسات میں طوفان اور تباہی لاتا ہے، جس کے لیے کسی شاعر نے لکھا تھا: دیکھو آج پھر وہ دیوانی وحشت زدہ ہے۔ اس کے بالوں کی راکھ سے اٹی ہوئی جٹاؤں نے آسمان کو چھپالیا ہے۔ اپنے گندے ہاتھوں سے ہر چیز کو چھو رہی ہے۔ اس کے جنوں کی زد سے کوئی بھی بچا ہوا نہیں ہے۔

اور پھر زری آسام اسٹیٹ کے خوب صورت چٹائیوں سے بنے ہوئے گھر میں چند دن گزار کر آئی تھی۔ یہ گھر بانسوں پر کھڑا تھا۔ گھر کے آگے بانس کی جالی دار بالکنی تھی جس پر کپڑے سوکھ رہے تھے۔ نیچے زمین پر جانور چارہ کھا رہے تھے۔ پیٹ پھولے ٹرکی (turkey) اور کوڑے میں منھ مارتی مرغیاں۔ یہاں کے سردار کی واحد ٹرانسپورٹ بڑا سا کالے رنگ کا ہاتھی درختوں کے درمیان پگڈنڈی پر پنکھے کی طرح کان ہلاتا ٹھمک ٹھمک چلتا تھا۔ زری جب تک یہاں رہی، ان کی طرح زمین پر سوتی اور ان کا کھانا کھاتی رہی۔ ان کے ساتھ لکڑی کی گھریلو مشین پر روئی سے بنولے الگ کرتی رہی لیکن ان کا لباس پہننا اس کے بس میں نہیں تھا۔ ان عورتوں کے سینے اور کمر پر ایک کپڑا لپٹا ہوتا تھا۔ پیچھے کی طرف اس کپڑے میں اتنی گنجائش بھی ہوتی تھی کہ بچے اطمینان سے بیٹھے رہیں۔ سر پر ایک پٹی لپٹی ہوتی تھی اور بس — مشرقی پاکستان مرحوم میں، باوجود اس کے ساری اور تہمد پہننے کا رواج تھا، ساڑھے سات گز کپڑا سالانہ فی کس خرچ ہوتا تھا۔ زری کو یاد آیا۔ بیٹھے بیٹھے اسے کیا کچھ یاد آیا کرتا تھا -- تب باتیں بھلانے کے لیے وہ چاچا جی کے ناول کے چند ابواب پڑھا کرتی تھی جو وہ اپنے ساتھ اسپتال لے گئی تھی۔ کبھی کبھی وہ بھارتی ایجنٹ جیوتی پرشاد اور عبدل سے باتیں کیا کرتی تھی۔ جیوتی پرشاد نے اسے بتایا تھا کہ مارچ ۱۹۷۱ء میں سکھاری پٹی پر فوجی حملے کے بعد سونے کی لوٹ مچی تھی۔ بعد میں لوٹنے والوں نے یہ سونا پچیس تیس روپے تولہ کے حساب گھروں میں لے جا کر بیچ دیا تھا۔ اُن دنوں بھاگتے ہوئے، عورتوں کے ہاتھوں سے گٹھریاں گر گر گئی تھیں اور انھیں پتا تک نہ چلا تھا۔ کبھی کبھی ان پوٹلیوں میں نوزائیدہ بچے بھی ہوتے تھے جنھیں وہ دوسری پوٹلیوں کے ساتھ ہاتھوں میں سنبھال کر بھاگتی تھیں۔ ہزاروں کہانیاں تھیں، ہر طبقے ہر محلے کی ایک الگ داستان تھی۔ عبدل میر پور کے حالات سناتا تھا۔ جنوری میں بہت سی بہاری آبادیوں نے بنگلہ دیش سے وفاداری کا اعلان کر دیا تھا مگر میر پور ان میں شامل نہیں تھا۔ چنان چہ ان پر بار بار حملہ ہوتا تھا۔ اسلحہ کی تلاشیوں کے

بہانے گھر سے نکال دیا جاتا تھا اور گھر لوٹ لیے جاتے تھے۔ جو لوگ دوبارہ گھروں میں جانے کی ہمت نہیں کرتے تھے وہ کیمپوں کا رخ کرتے تھے۔ بقرعید کے دوسرے دن منظم حملہ ہوا تھا۔ چھ نمبر محاذ تھا— ایک نمبر کے بہت لوگ مارے گئے۔ دس گیارہ اور بارہ نمبر سب سے زیادہ لڑے۔

شیخ مجیب الرحمٰن کے پاس سب اپنی اپنی شکایتیں لے کر پہنچتے ہیں۔ لیکن وہ بھی بے بس ہیں۔ وہ سب کو خوش اور مطمئن کرنا چاہتے ہیں مگر ان کی کوئی سنتا نہیں ہے۔ انھوں نے اعلان کیا کہ سب لوگ اپنے ہتھیار جمع کرادیں مگر سوائے چند بے کار اور بوسیدہ ہتھیاروں کے ہتھیار جمع نہ ہوئے۔ دس لاکھ ہتھیار اب بھی لوگوں کے ہاتھوں میں ہیں۔ عوامی لیگ دو حصوں میں بٹ چکی ہے۔ شیخ مونی، عبد الرزاق اور طفیل احمد شیخ مجیب الرحمٰن کے ساتھ ہیں مگر جنگ کی اگلی صفوں میں لڑنے والے سراج العالم، ابو طاہر، ٹیپو بسواس، متین، وحید الرحمٰن اور سراج سگدر پہلے دن سے اس حکومت سے ناخوش ہیں۔ یہ لوگ ان بسوں اور ٹرکوں پر شب خون مارتے ہیں جو سامان لے کر بھارت کی طرف جاتے ہیں۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ ہم جب تک ایک ایک بہاری کو ختم نہیں کردیں گے، ہتھیار نہیں رکھیں گے۔ سنا ہے شیخ نے پولیس کے حکام سے کہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ بہاریوں کو جیل میں رکھا جائے تاکہ ان کی جانیں محفوظ رہیں۔ سینٹرل جیل میں تین ہزار کی جگہ تیرہ ہزار آدمی پیٹھ سے پیٹھ لگائے بیٹھے ہیں، کھانے کو نہیں ہے مگر ہاں جانیں محفوظ ہیں، کب تک محفوظ رہیں گی، یہ معلوم نہیں۔

زری اور عبدل کو نیپال کی سرحد تک پہنچا کر بھارتی ایجنٹ واپس چلا گیا تھا۔ زری اب سطحِ سمندر سے ڈھائی ہزار فٹ بلند پوکھر کی خوب صورت وادی میں اس شہزادی کی مانند تھی جسے کسی دیو نے پہاڑوں کے درمیان قید کردیا ہو۔ شام کو وہ لانبی سبز جھیل کی طرف منھ کر کے بیٹھ جاتی۔ سامنے پہاڑوں پر گھنے جنگلوں کی تاریکی مہیب اور ہولناک ہوتی۔ اندھیرے میں جھیل کا پانی سانپ کی کینچلی کی طرح سیاہ ہوجاتا۔ رات کو گیدڑوں اور کتوں کے بھونکنے کی آواز آتی۔ پھر چاند پہاڑیوں کے پیچھے سے طلوع ہوتا اور ہر چیز نور میں نہا جاتی۔ صبح اناپورن کی برف سے ڈھکی چوٹی پر سورج طلوع ہوتا تو لگتا جیسے برف میں آگ لگی ہوئی ہو۔ زری حیران تھی کہ اس کے وطن کے جیسا گاؤں دنیا کے پردے پر دوسرا بھی موجود تھا، جہاں بیک وقت برفیلی چوٹیاں اور سپاٹ میدان پائے جاتے تھے اور ایسی ہی ملی جلی آب و ہوا تھی۔ آٹھ ہزار فٹ بلند برفیلے پہاڑوں کے سلسلے۔ پھر درختوں سے سرتا سر ڈھکی پہاڑیاں، ان کے سائے میں بے انت سبز جھیل، جس کی کوکھ سے ایک دریا گہری گھاٹیوں سے گزرتا چلا جاتا تھا۔ پہاڑیوں پر اوپر نیچے کچے مکان اور پھونس کے چھپر، میدانوں میں بانس، کیلے اور نارنگیوں کے جھنڈوں میں چھپے ہوئے سرخ اینٹوں کے دومنزلہ مکانات تھے۔ سبز رنگ پوکھروں

کے کنارے سیاہ اور چتکبری گائیں اور بھینسیں فراغت سے جگالی کرتیں۔ گھروں کے آگے کھلی جگہوں پر لڑکیاں اور عورتیں بانس کی ٹوکریاں بنتیں، مرد اینٹیں یا مٹی کے برتن دھوپ میں رکھتے اور لڑکے بالے کھٹا کھٹ کپڑے بنتے رہتے۔

اکثر زری کو محسوس ہوتا جیسے بانس کے جھنڈ سے نکل کر آنے والا کوئی مرد یا لبوترے چٹائی کے ٹوکرے میں جھانکنے والی کوئی عورت ابھی سر اٹھا کر اسے بی بی گل کہہ کر پکارے گی۔

چاچا جی کی، میری اور اس شخص کی تقدیر میں زندگی کے تسلسل میں بہنا نہیں تھا۔ وہ پتھر بننا تھا جو کچھ دور دریا کے ساتھ بہہ کر کنارے پر آن پڑتے ہیں۔ زری قبرستان میں خوش حالی خان کی قبر کے سرہانے بہت دیر سے کھڑی تھی۔ لمبے سرو کے درخت اتنے برسوں میں کچھ اور دراز قامت ہو گئے تھے۔ رات بارش ہوئی تھی۔ بزرگوں کی قبروں پر بندھے ہوئے تازہ سرخ اور سبز کپڑوں کے رنگ ڈھل، سوکھ کر نکھر آئے تھے۔ ان قبروں سے کبھی شمس الرحمٰن نے وعدہ کیا تھا:

I shall love you and cherish you till death do us part.

آج وہ ان مقابر سے استقامت مانگنے آئی تھی۔ جرأت اور حوصلہ ایک بند لفافے کے خلاف۔ یہ لفافہ اسے آج ہی ملا تھا۔ جس پر ایسے ٹکٹ تھے جو اس نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ یہ خط کسی اور کرے سے آیا ہوا بھی ہو سکتا تھا۔ زری میں اس لفافے کو کھولنے کی ہمت تھی نہ اسے بند کا بند پھاڑ کر پھینک دینے کی جرأت تھی۔ وہ ہر وقت، ہر لحظہ اس کے دل و ذہن پر طاری تھا۔ ایک ہلکا سا لفافہ، مگر بڑے سے بڑے بوجھ سے بھاری۔

۱۹۷۴ء کی ایک خوش گوار دوپہر، ۱۹۷۱ء کی جدائی کے بعد یہ شمس الرحمٰن کی پہلی تحریر تھی جو اس تک پہنچی تھی۔ اس خط میں امکانات کی ایک دنیا تھی۔ ایسے موقعے پر کیا کچھ لکھا جا سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے اس نے لکھا ہو — میں تمھارا منتظر ہوں، آ جاؤ۔

شاید اس نے لکھا ہو — میں تمھارے پاس پہنچ رہا ہوں۔

ممکن ہے اس نے لکھا ہو — اس رات کے بعد سے راج میاں (ابوظفر معراج الدین) کا کچھ پتا نہیں چلا۔ اس کے اور بچوں کی خاطر میں نے شوشی سے شادی کر لی ہے، مگر اس بات سے میری تمھاری دوستی میں کوئی فرق نہیں آئے گا۔ ''دوستی'' لفظ کو لوگ کس کس طرح استعمال کرتے ہیں۔

اسے خط کھول لینا چاہیے، وہ فیصلہ کرتی۔ جب کھولنے کے لیے ہاتھ بڑھاتی تو اس کے اندر سے آواز آتی۔ ''نہیں ابھی نہیں پلیز — ابھی میں کچھ باتوں کے لیے تیار نہیں ہوں۔''

تم تو بہت نڈر تھیں۔ بڑے بڑے فیصلے خود کیے اور کبھی نہیں پچھتائیں۔

ہاں بڑے بڑے نڈر اور دلیر بھی کسی نہ کسی مقام پر کمزور اور بزدل ہو جاتے ہیں۔

''وہ کھڑی ہیں زری آنٹی۔'' دور سے شیزی نے سب سے پہلے زری کو دیکھا۔ اعجاز اور نیلی ذرا پیچھے تھے۔ اعجاز نے نیلی کی کمر میں ہاتھ ڈال رکھا تھا اور وہ سنبھل سنبھل کر پگڈنڈی پر قدم رکھ رہی تھی۔ شیزی اور ناصر دونوں ڈاکٹر تھے۔ ان کے ساتھ ہونے سے اعجاز اور نیلی کو بڑی تقویت تھی۔ ناصر کو آج زری کے پاس آنے میں کوئی تکلف نہ تھا۔ وہ شیزی کا ہاتھ تھامے زری کی طرف بڑھا۔ زری نے ہمیشہ کی طرح شیزی کو گلے لگا کر پیار کیا۔ اتنی دیر میں نیلی پہنچی تو زری نے اس کے بڑھتے ہوئے پیٹ کو پیار سے دیکھا اور کہا:

''مائی فیورٹ نیس (my favorite niece) اور اسے بڑے لاڈ سے گلے لگایا۔ اعجاز زری کو اور زری کے اس پیار کو ملے جلے جذبات کے ساتھ دیکھتا رہا۔ لمحے بھر کو جیسے اس کا دل کسی نے مٹھی میں دبایا اور چھوڑ دیا۔

''ارے تم لوگ کہاں سے آ ٹپکے؟ — کب آئے، کہاں ٹھہرے ہو، چاچا جی کے پاس؟''

''جی ہاں۔'' ناصر نے کہا۔

''مگر آج رات تم سب میرے مہمان ہو گے۔ مکان دیکھنے میں جیسا بھی ہے، تمھیں یہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ میرے جہیز کے بے شمار پلش کے لحاف ہیں جنھیں اب استعمال ہو جانا چاہیے۔ میرے پاس بڑا اچھا خانساماں ہے، ٹھہرو گے نا!''

''ہاں ہاں، کیوں نہیں زری آنٹی!'' نیلی نے کہا اور شیزی نے سوچا، جواب دینے کی ضرورت ہی نہیں، جب زری آنٹی نے کہہ دیا تو بات طے ہو گئی۔ مگر اسی وقت ناصر نے کہا، ''ایک شرط پر، آپ کو ہمارے ساتھ میرے گاؤں چلنا ہو گا امی سے ملنے کے لیے۔''

''مجھے منظور ہے۔'' زری نے کہا۔ ''تم لوگوں کو دیکھ کر کتنی خوشی ہو رہی ہے بتا نہیں سکتی۔ آج چاچا جی کی بات میری سمجھ میں آ رہی ہے۔ وہ کہتے تھے نا، زندگی دریا کی طرح رواں دواں ہے۔ نسلیں آتی رہیں گی، نسلیں جاتی رہیں گی، ایک نسل دوسری نسل کو اتنا کچھ دیتی ہے جس کا اندازہ بھی نہیں ہو سکتا۔ اصل وراثت تو وہی ہوتی ہے جو جینز (Jenes) سے منتقل ہوتی ہے، جس سے انسان کی زندگی، اس کی تقدیر بنتی ہے۔ یہ جائیدادیں، زمینیں تو فروعی چیزیں ہیں۔'' زری پتھریلی جگہ پر ان سب سے نسبتاً اونچی جگہ ایستادہ تھی اور وہ سب اس کے سامنے کھڑے تھے۔ نیلی کو دفعتاً خیال آیا کہ بنزارتھ میں جھاڑیوں اور درختوں کے نزدیک لمبے لبادوں میں چھپے سینٹ خطبے دیتے ہوں گے

تو کچھ ایسا ہی منظر ہوتا ہوگا۔

''آؤ چلیں۔'' زری نے کہا۔

زینے کے نصف حصے پر زرد آلو بخاروں کی جھکی ہوئی شاخوں کے سائے میں بنی ہوئی زری کے والدین کی قبروں پر فاتحہ پڑھ کر سب لوگ اکبر منزل کے اندر آئے۔ زیادہ تر کمرے بند تھے۔ زری سب کو اپنی خواب گاہ میں لے کر آئی۔ سب سے پہلے اس نے بند لفافہ بہت سی کتابوں کے نیچے چھپا دیا۔ کمرہ سلیقے اور نفاست سے سجا ہوا تھا۔ ماں کی بنائی ہوئی پھلکاریاں، جو پہلے ڈرائنگ روم میں تھیں ،اب اسی کمرے میں لگی ہوئی تھیں۔ داجی کی بے بے کی اور زری کی تصویریں بھی یہیں تھیں۔ ان خواتین کی تصویروں میں ناصر خان کو اپنی ماں کی جھلک نظر آتی تھی اور شیزی اور نیلی کو اپنی، جیسے وہ آئینہ دیکھ رہی ہوں۔ اعجاز گم سُم سا تھا۔ وہ اس سے پہلے کبھی زری کے گھر نہیں آیا تھا۔ زری کے گھر کی اس حالتِ زار کو دیکھ کر اسے افسوس ہوا تھا۔

رات کو نیلی نے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا اور اعجاز کو آواز دی، ''اجی، کتنا خوب صورت منظر ہے۔ میرا جی چاہتا ہے چھت پر جا کر دیکھوں۔''

نیلی کا ہاتھ تھام کر اعجاز آہستہ آہستہ اسے چھت پر لایا۔ دُبِّ اکبر عین اکبر منزل کے اوپر چمک رہا تھا۔ علامہ اقبال کی نظم کا سربن پہاڑ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ وہ ابھی تک چاند کی روشنی کی زد میں نہ آیا تھا۔ اس پر کھڑے چیڑ کے گھنے درخت اس وقت ایک سیاہ سایہ بن گئے تھے۔ قبرستان میں سرو کے درخت آج بھی سنتری کی طرح ایستادہ تھے اور درختوں پر لٹکے سرخ اور سبز پارچے چراغوں کی روشنی میں یوں لگ رہے تھے جیسے عورتیں اپنے پیاروں کی قبروں پر سر جھکائے کھڑی ہوں۔ چاند کی روشنی دوسری طرف سے آ رہی تھی۔ پہاڑ پر چاندنی زندگی کی طرح آنکھ مچولی کھیلتی نظر آتی ہے۔۔۔ اعجاز نے سوچا۔ زری کے کمرے کی بتی ابھی تک روشن تھی۔۔۔!

ناصر نے امی کی ناراضگی کے خیال کے باوجود ایک ڈراما کھیلا تھا۔ ان سب کو یہاں آئے تیسرا دن تھا کہ اس نے آن کر کہا، ''امی — چٹان کے نیچے دریا کے کنارے ایک اجنبی بیٹھا ہے، وہ آپ کو پوچھ رہا ہے۔''

''مجھے! — کیوں؟''

''معلوم نہیں۔ شاید وہ آپ کو جانتا ہو۔''

''کون ہے؟ مجھے کس طرح جانتا ہے، تم نے پوچھا تو ہوتا۔'' قدسیہ واقعی گھبرا گئی تھی۔

''مجھے پوچھنا اچھا نہیں لگا، آدمی شریف معلوم ہوتا ہے، آپ اس سے مل لیجیے، حرج ہی کیا ہے۔''

''واہ، خواہ مخواہ — خدا معلوم کون ہے؟''

''کوئی اللہ کا بندہ ہی ہوگا، آپ اس سے ملاقات کر لیجیے، میں اوپر سے دیکھتا رہوں گا، کوئی خطرہ ہوا تو یہیں سے چھلانگ لگا دوں گا۔''

''ارے بے حیا۔'' قدسیہ نے خالص مقامی دیہاتی انداز میں کہا، ''مجھے کیا خطرہ ہو سکتا ہے، میں تو تیرے خیال سے کہہ رہی تھی۔''

''امی، میں نے آپ سے کتنی مرتبہ کہا ہے کہ اب آپ میرا اور دنیا کا خیال دل سے نکال دیجیے اور جو آپ کے دل میں آئے، کیجیے۔ جہاں دل چاہے جائیے کوئی آپ کو کچھ نہیں کہہ سکتا، میں اس کا ذمہ لیتا ہوں، جائیے جا کر اس شخص سے بات کر لیجیے۔''

سر پر دوپٹہ تو پہلے سے تھا، قدسیہ نے سفید ریشمی چادر دوپٹے کے گرد لپیٹی اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں اترنے لگی۔ جس جگہ پہلے ڈھلوان راستہ تھا، وہاں ناصر نے سیڑھیاں بنوادی تھیں۔ دریا کا پانی بڑھتا تو نیچے کی چند سیڑھیاں پانی میں ڈوب جاتیں۔ مستقل پانی کی زد میں رہنے کی وجہ سے وہ اکثر شکستہ رہتی تھیں۔ قدسیہ دھیرے دھیرے قدم رکھتی سیڑھیاں اترتی رہی۔ اجنبی کا چہرہ دریا کی طرف تھا۔ کون ہوسکتا ہے — کوئی پرانا ملازم — مرحوم شوہر کا دوست، رشتے دار، ہاری!

آخری چند سیڑھیوں تک پہنچی تو قدموں کی چاپ پر اس شخص نے مڑ کر دیکھا اور دیکھتا رہا۔ قدسیہ نے جلدی جلدی ذہن کو ٹٹولا — نہیں، وہ تو اس شخص سے کبھی نہیں ملی۔

''السلام علیکم! میرا نام عمر ہے — عمر خان۔''

''اوہ!'' قدسیہ کو محسوس ہوا جیسے سیڑھیاں اس کے پاؤں تلے دریا کی نرم زمین میں دھنستی جارہی ہوں۔ وہ وہیں بیٹھ گئی۔ عمر خان آہستہ آہستہ چلتا ہوا آیا اور اس کی سیڑھی کے نزدیک کھڑا ہوگیا۔ اس نے قدسیہ کو بولنے کی زحمت نہ دی، خود ہی بولتا رہا۔ کس طرح اور کب کب اس نے قدسیہ سے ملنے کی کوشش کی تھی۔ اس نے ایلزا سے اپنی منگنی اور زیب قادری سے شادی کی داستان بھی سنا دی، ایسی بے تکلفی سے جیسے قدسیہ اور وہ روز ملتے ہوں۔ اپنی داستان کے دوران کسی وقت وہ قدم بڑھا کر قدسیہ سے ایک سیڑھی نیچے بیٹھ چکا تھا۔ لہریں پانی میں نکلی ہوئی چٹانوں کے گرد حصار ڈال رہی تھیں۔ اور وہ اداس سیاہ پوش چٹانیں چپ تھیں، وہ لہروں کے حصار میں نہیں زمین میں اپنے دھنسے ہوئے وجود میں قید تھیں۔

''اب تم بتاؤ، تم اتنے طویل عرصے تک قیدِ تنہائی کیسے برداشت کرتی رہیں؟''

''میں دن بھر یادوں کے موتی چن کر ڈھیریاں لگاتی تھی اور رات کو بیٹھ کر انھیں لڑی میں پروتی تھی۔''

''کیسے؟''

''سسٹر پیٹریشا نے جو ہمیں انگریزی پڑھاتی تھیں، لکھنے کی مشق کے لیے ہمیں روز ڈائری لکھنے کی عادت ڈلوائی تھی، بس میں یہی ڈائری لکھا کرتی تھی، مجھے ایسا لگتا تھا جیسے میں وہ زندگی دوبارہ بسر کررہی ہوں۔''

''مثلاً کون سی باتیں؟''

''اپنے بچپن کی چھوٹی چھوٹی باتیں، کس طرح سردیوں میں ہمارے لان کی گھاس کی ایک ایک پتی جل جاتی تھی اور بہار آتے ہی سرسبز ہوجاتی تھی۔ لان کے بیچوں بیچ نرگس کے پھول ایک دائرے میں لگے ہوتے تھے۔ ہر سال موسم ختم ہوتے ہی مالی ان کے سبز پیاز ایسے ڈنٹھل لپیٹ کر باندھ دیتا

تھا، وہ مرجھا کر ختم ہو جاتے تھے۔ اگلے موسم میں سارے پودے پھر پھوٹ آتے تھے اور وہ دائرہ دوبارہ بن جاتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے سفید پھول اپنی پیلی آنکھوں سے جھک جھک کر ایک دوسرے کو دیکھ رہے ہوں۔''

''واہ! — پھولوں کا ایک قدرتی گل دائرہ! — اور کچھ —''

''بس ایسی ہی چھوٹی چھوٹی ہزاروں باتیں — سردیوں میں لان پر چھایا ہوا کہرہ، جو برآمدے تک چلا آتا تھا اور چند قدموں کے بعد کچھ نظر نہ آتا تھا۔ صبح گھاس پر پڑی ہوئی شبنم، روشوں پر پڑے ہوئے گول گول پتھر — تم یقین نہیں کرو گے، آج بھی یوں لگتا ہے جیسے میں ابھی جھک کر ان پتھروں کو چھو سکتی ہوں۔ املتاس کے انگور جیسے وہ خوشے توڑ سکتی ہوں جو زمین تک پہنچتے تھے۔ ہر سال ایئر فورس کی پاسنگ آؤٹ پریڈ کے موقعے پر ہم صبح صبح تیار ہو کر جاتے تھے۔ سارا رسال یور رنگ برنگے کپڑے پہنے امڈ آتا تھا۔ پریڈ کرنے والے کیڈٹوں کی قطاروں کے پیچھے ہوائی جہاز کھڑے ہوتے تھے۔ صبح کی خوش گوار ٹھنڈی ہوا ہمارے چہروں پر لگتی تھی۔ سارے چہرے خوب صورت، مطمئن اور کھلے ہوئے لگتے تھے۔ پریڈ کے آخر میں ہوائی جہاز دندناتے ہوئے سلامی دینے آتے تھے۔ دو ایک جہاز جنھیں ایئر فورس کے کمانڈر ان چیف اور بڑے سنیئر افسران چلاتے تھے، ہوائی کرتب بھی دکھاتے تھے۔ ساری خلقت آسمان کی طرف تکتی ہوئی عجیب سی لگتی تھی۔ اس کے بعد میس میں چائے ہوتی تھی، کیڈٹ اپنے والدین کے پاس آتے تھے اور بہانے بہانے سے ہم لڑکیوں سے باتیں کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ بس ایسی ہی بے کار باتیں اور کیا!''

''مجھے تو تمھاری باتوں میں اس وقت بھی بہت مزہ آ رہا ہے، اچھا اور کچھ؟''

''ہزاروں لاکھوں باتیں ہیں، روز مرہ اپنے ذہن کو کریدنا اور کچھ نہ کچھ لکھنا، پرندوں کے بارے میں، تتلیوں کے بارے میں، اپنے گھر میں پلے ہوئے کتے اور بلیوں کے بارے میں۔ میری زندگی میں آنے والا کوئی کردار ایسا نہیں جس کا ذکر اس ڈائری میں نہ ہو۔''

''قدسیہ سنو'' انھوں نے قدرے جھک کر کہا — ''ہم ایک دوسرے کی زندگی کے حصے دار تو نہ بن سکے لیکن کیا ایک دوسرے کی تحریر شیئر (share) نہیں کر سکتے؟ میں ایک ناول لکھ رہا ہوں جو ایسے ہی ہزاروں چھوٹے بڑے واقعات سے عبارت ہے۔ میرا خیال ہے تمھاری ڈائری اور میرا ناول مل کر ایک بہترین ساگا بن سکے گا۔ تم میرا ناول پڑھنا، میں نے قید میں انسانی فطرت کے عجیب پہلو دیکھے ہیں، بلکہ ان جانوروں کی زندگی کا بھی مطالعہ کیا ہے جو ہمارے کیمپ میں آئے تھے۔ میں تمھاری ڈائری پڑھوں گا اگر تم اجازت دو گی۔''

''ہاں، اس میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جو تم نہ پڑھ سکو۔ ہماری ہسٹری کی سسٹر ہمیں تاریخی مقامات دکھانے لے گئی تھیں۔ مانسہرہ، ٹیکسلا، تخت بھائی، پشکلاوتی، ان کھنڈرات اور وہاں سے نکلنے والے نوادرات کی تفصیل بھی میں نے لکھی ہے اور وہی پرانی گھر کی باتیں۔ دو بجے پپا آتے تھے اور کھانے کے بعد سو جاتے تھے۔ بھائی اکثر کسی نہ کسی کھیل کی پریکٹس کے لیے چلا جاتا تھا۔ میں برآمدے میں ایزل رکھ کر پینٹنگ کرتی تھی۔ اس وقت باغ کا منظر بڑا خوب صورت ہوتا تھا۔ گلہریاں ایک دوسرے کے پیچھے بھاگتی اور درخت پر چڑھتی تھیں۔ تتلیاں اونچے پھول بھرے ہولی ہاک، گلفرینا اور للی پر منڈلاتی تھیں اور ہنی سکل (Honey Sucklf) پودوں پر ٹیڑھی بیٹھی ڈولتی رہتی تھیں۔ اس وقت سناٹے میں اسکواش کھیلنے والوں کی دیوار پر گیند مارنے کی اور ٹینس کورٹ میں پریکٹس کے لیے بنی ہوئی دیوار پر پڑنے والی گیند کی آواز گونجتی تھی جو آج بھی میرے کانوں کو اسی طرح سنائی دیتی ہے۔ نوشہرہ جانے والے کشتی کے پُل پر بچھی ہوئی پیلی اور کناروں سے سڑی ہوئی گھاس، اس پر گزرنے والی گاڑیوں سے پیدا ہونے والی مخصوص آواز--- میں نے کہا نا، میں ہر چیز کو ذہن میں دُہراتی تھی اور لکھتی تھی۔ یوں سمجھو کہ میں ایک جنم میں دو مرتبہ بچی بنی۔ تمھیں عجب لگ رہا ہوگا، میں کتنی زیادہ باتیں کر رہی ہوں۔ مگر سوچو میں کتنے سال سے تنہا ہوں۔ کوئی باتیں کرنے والا نہیں ہے، لگتا تھا میں بولنا بھول چکی ہوں۔''

''میں چاہتا ہوں کہ تم ابھی اور باتیں کرو، تکلیف دہ باتیں نہیں، اسی طرح ہلکی پھلکی۔ کسی دن ہم تکلیف دہ باتیں بھی کریں گے۔'' وہ کھڑا ہو گیا اور دریا کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے پلٹ کر گھر کی طرف دیکھا۔ ''سب کچھ وہی ہے۔ جب میں آیا کرتا تھا یہی منظر ہوتا تھا، یہی دریا، یہی چٹان، وہی مچان۔''

''ہاں تو سنو، جس زمانے میں پینٹنگ کرتی تھی نا اسی دور میں، میں نے پاپ آرٹ (Pop Art) کا ایک نمونہ بنایا تھا۔ کینوس پر رنگوں کے ساتھ بہت سی یادگار چیزیں لگا دی تھیں۔ پپا کے کوٹ کے بٹن، ممی کے بندے، اپنی قمیص کا ٹکڑا جو میں اس رات پارٹی میں پہنے ہوئے تھی جس رات عبید کے جہاز کے کریش ہونے کی خبر آئی تھی۔''

''ٹھہرو، تمھاری وہ قمیص تو مجھے بھی یاد ہے۔ سیاہ رنگ کی قمیص جس میں سنہری تار جھلملا رہے تھے۔''

''تعجب ہے، قمیص پہننے والی کو بھول گئے، قمیص تمھیں یاد رہی۔''

''میں نے کہا تھا نا کہ کسی دن ہم تکلیف دہ باتیں بھی کریں گے--- تم نے یہ شعر سنا ہے:

تمام عمر ترا انتظار ہم نے کیا
اس انتظار میں کس کس سے پیار ہم نے کیا

میری زندگی اس شعر کی تفسیر ہے۔ میں صفائی پیش نہیں کر رہا، صرف یہ بتا رہا ہوں کہ ایسا ہوتا ہے اور میرے ساتھ ہوا ہے۔''

''تو تم نے بہت سے عشق کیے؟''

''ہاں۔''

''کتنے کامیاب ہوئے؟''

''کوئی بھی نہیں مگر میں نے عشق نہیں کیے صرف محبتیں کیں۔ شاید وہ عشق کی سرحدوں کو چھو گئی ہوں۔''

''تو تم عشق کسے کہتے ہو؟''

''عشق ایک گھاٹے کا سودا ہے۔ آدمی کتنا ہی دانا بینا ہو، کتنا ہی نفع کی بات سوچنے والا ہو، عشق ہو جائے تو ہر قسم کے سود و زیاں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ عشق میں محبوب کے حسن و جمال، سن و سال کا بیچ بھی نہیں ہوتا۔ جب تمھاری شادی کی خبر ملی تو میں سارا سارا دن یہ شعر پڑھتا رہتا تھا:

عشق نے پکڑا نہ تھا غالب ابھی وحشت کا رنگ

جس کو غالب عشق کہتا ہے میں اسے محبت کہتا ہوں۔ جسے غالب وحشت کہتا ہے میں اسے عشق کا نام دیتا ہوں۔''

''اچھا اب میں چلوں، بہت دیر ہوگئی۔ ناصر نے مجھے بتایا نہیں تھا کہ دریا پر کون شخص میرا انتظار کر رہا ہے۔'' قدسیہ نے کہا۔

''ہاں، اس نے مجھ سے کہا تھا کہ وہ تمھیں بتائے گا نہیں۔ زندگی میں ایسے استعجاب اچھے لگتے ہیں نا —— تم چلو، میں بھی ابھی آتا ہوں۔''

قدسیہ کے جانے کے بعد وہ کھڑے دریا کو دیکھتے رہے اور سوچتے رہے، محبت بھی وقت اور زمانے کی طرح ہے، لافانی اور اٹل، مگر کسی کے ہاتھ نہ آنے والی کوئی چیز، وہ کسی کی ملکیت نہیں ہے، زندگی اور وقت کی طرح ہر ایک کی ہے اور کسی کی بھی نہیں ہے۔

چاچا جی دریا پر اپنی کزن سے محو گفتگو تھے۔ ان کے ساتھ جو غیر ملکی لڑکی آئی تھی، وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھی اپنا تعارف کروا رہی تھی۔ اب اس گھر میں مردانہ ڈرائنگ روم الگ نہ تھا۔

''میرا نام ریناتے ہے، میں جرمنی سے پاکستان آئی ہوں، یہ ملک میرے شوہر کا وطن ہے مگر بد قسمتی سے وہ نہیں آسکے ہیں۔''

''آپ کے شوہر کا نام؟'' ناصر خان نے پوچھا۔

''عدنان خان'' ریناتے نے صحیح تلفظ کے ساتھ جواب دیا۔ زری کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس علاقے میں ایسے ہی غیر محسوس زلزلے کے جھٹکے آیا کرتے تھے۔ لیکن اس کے سوا یہ جھٹکا کسی نے بھی محسوس نہ کیا تھا۔ وہ سنبھل کر بیٹھ گئی۔

''میرے شوہر پاکستان پر اتنے فدا نہیں ہیں جتنی میں ہوں۔'' وہ خوش ہو کر ہنسی۔ ''انھوں نے کبھی مجھ سے اردو سیکھنے کے لیے نہیں کہا لیکن میں نے خود سیکھی۔ اب میں جا کر اسے بتاؤں گی کہ ماں کی طرف سے جائیداد میں جو کوٹھی اسے ملی ہے وہ کتنی خوب صورت ہے اور اس کے ساتھ کتنا بڑا باغ ہے...... سچ مچ جنت ہے جنت ——!''

اچھا، مانسہرہ روڈ کی وہ کوٹھی چاچاجی نے عدنان کے نام کر دی، حیرت! —— جس کا نام سننا گوارا نہ تھا، اتنی بڑی جائیداد اسے بخش دی۔ لیکن ریناتے کہہ رہی تھی اس کی ماں کی جائیداد ...... اس کا مطلب ہے ان دو دنوں میں جب زیب آنٹی زندہ تھیں، چاچاجی نے یہ کوٹھی اور باغ ان کے نام منتقل کر دیا تھا۔ یہ چاچاجی کے پرکھوں کا تحفہ آئندہ زیب قادری کی آئندہ نسلوں کے نام تھا، ایک حقیر سا خارجی تحفہ کیوں کہ وہ اپنی ذات کا کوئی حصہ انھیں نہ دے سکے۔

''آپ کو پاکستان اچھا لگا؟'' نیلی نے انگریزی میں پوچھا کیوں کہ وہ انگریزی بولنے کی عادی تھی۔

''ہاں، مجھے پاکستان اچھا لگا۔ پاکستان کے لوگ بھی اچھے ہیں مگر......'' اس نے انگریزی میں جواب دیا۔ تو اب عدنان نے تمھیں انگریزی سکھا دی ہے۔ زری نے سوچا۔

''مگر کیا؟''

''مگر سسٹم میں کہیں کوئی خرابی ہے، یہاں کام نہیں ہوتے۔ بہت گڑبڑ، بہت خوشامد، بہت اِدھر اُدھر پھرنا پڑتا ہے، آدمی گھبرا جاتا ہے۔''

''اور جہاں ہر کام ہو جاتا ہے؟'' زری نے پوچھا۔

''وہاں آدمی اکتا جاتا ہے۔'' ریناتے نے زور سے قہقہہ لگایا۔

''سو آدمی کے لیے گھبرا جانا یا اُکتا جانا مقدر ہے۔ جب تم جرمنی سے اُکتا جاؤ گی تو تم یا تمھاری آئندہ نسلیں پاکستان آ جائیں گی یا کسی اور ملک چلی جائیں گی۔'' زری نے سوچا۔

''آپ کی طبیعت ٹھیک ہے زری آنٹی، آپ بالکل زرد ہو رہی ہیں۔'' نیلی نے کہا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں۔'' زری نے سنبھلنے کی کوشش کی۔

''زری! اوہ—— ٹھہرو، یہ نام سنا ہوا لگتا ہے۔'' ریناتے نے کہا، ''بہت سال ہوئے سالزبرگ میں مجھے ایک لڑکی ملی تھی۔ بہت خوب صورت لڑکی تھی وہ، یہیں کہیں شمال کی رہنے والی۔ اس نے ہی

مجھے عدنان سے ملوایا تھا۔ بعد میں ایک مرتبہ عدنان نے مجھے بتایا تھا کہ وہ اس لڑکی سے محبت کرتا تھا مگر اس نے عدنان کو قبول نہیں کیا۔ بدقسمت لڑکی ــــ عدنان اچھا آدمی ہے، ذرا لاابالی سا ہے، مگر ہر شخص میں کوئی نہ کوئی عیب ہوتا ہے ــــ ہے نا۔''

''نہیں زری آنٹی کی طبیعت زیادہ خراب ہے۔ انھیں لے جا کر لٹا دو پلیز شیزی اور گرم دودھ میں اوولٹین ڈال کر دے دو۔'' نیلی نے کہا۔

''ہاں بالکل زرد ہو رہی ہے بے چاری بیمار عورت۔'' ریناتے نے زری کا نازک کمزور ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر دبایا۔

شیزی زری کو سہارا دے کر سونے کے کمرے میں لے گئی۔

''کیا حال ہی میں ان کو کوئی صدمہ پہنچا ہے؟'' ریناتے نے پوچھا۔

''نہیں۔'' ناصر خان نے بڑے یقین سے کہا، ''اس بے چاری لڑکی کی ساری زندگی ہی صدموں سے عبارت ہے ــــ میں نے اس کو شگفتہ گلاب کی طرح دیکھا تھا، اب یہ وڈ روز (wood rose) ہو کر رہ گئی ہے۔

''وڈ روز بھی تو اپنی جگہ بہت خوب صورت ہوتا ہے ــــ ہے نا۔'' ریناتے نے کہا۔

کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ چاچا جی اور قدسیہ ڈرائنگ روم کے دروازے میں کھڑے تھے۔ شیزی اور نیلی نے انھیں حیرت سے دیکھا۔ چاچا جی نے تو کہا تھا، اس گھر کے دروازے مدت ہوئی، ان پر بند ہو چکے ہیں۔

نرگس اور نور نے لندن سے شمس الرحمٰن کو لکھا تھا ــــ بنگلہ دیش کے حالات غیر یقینی ہیں، ہم نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا ہے۔ نور الزماں جو بگلا اور کنول جیسی نظم لکھ کر راتوں رات اُس بنگلہ دیش کا ہیرو بن گیا تھا جو ابھی وجود میں نہیں آیا تھا، اب حقیقی بنگلہ دیش میں آتے ہوئے گھبرا رہا تھا۔ جبھی تو قرآن مجید میں شاعروں کی مذمت کی گئی ہے کہ یہ کہتے کچھ ہیں اور کرتے کچھ ہیں۔ مولانا نے کہا تھا۔

باہر کے ملکوں میں بنگلہ دیش کے بارے میں جو خبریں پہنچتی تھیں، وہ تشویش ناک تھیں۔ خوراک کی کمی، سیلاب اور قحط نے شونار بنگلا کو زین العابدین کی پینٹنگز کا سا بھوکا اور کنگال بنگال بنا دیا تھا۔ ۱۹۶۸ء سے لے کر ۱۹۷۳ء تک آفاتِ سماوی کا ٹھکانا نہ تھا، خانہ جنگی اور جنگ کے اثرات الگ تھے۔ ۱۹۷۳ء کے سیلاب کے بعد حالات اور ابتر ہوئے۔ لوگ کیلے کے درخت کا گودا، بھوسی، چاول کی پیچ اور پتے کھا رہے تھے۔ لوگوں کا خیال تھا کہ قحط کو دور کرنے کے لیے حکومت کچھ نہیں کر رہی

ہے۔ وہ اسمگلنگ، وباؤں اور قحط کی طرف سے غافل اپنے لوگوں کو تھپکی دینے اور ان کے ہاتھ مضبوط کرنے میں مصروف ہے۔ پیش رو حکمرانوں کی طرح وہ ملک کی ہر مصیبت کو ''سازش'' قرار دے دیتی ہے۔ مولانا بھاشانی نے ان شربوہارا لوگوں کی حمایت میں بھوک ہڑتال بھی کی جن کی بے جان سوکھی ہڈیاں لب سڑک جگہ جگہ پڑی نظر آتی تھیں، جن کو رام داؤ اور بندوقیں نہیں، بھوک مار رہی تھی۔ مگر کوئی فائدہ ہوا! شاید نور اور نرگس نے ٹھیک ہی فیصلہ کیا ہو۔ شمس الرحمٰن نے سوچا۔ ہر شخص اپنے بچوں کی بہتری سوچتا ہے۔ نور اور نرگس نے اپنے دو بچوں کی تصویریں بھیجی تھیں۔ موٹے موٹے سوئیٹروں میں دُ گلے بنے وہ برف میں کھیل رہے تھے۔ کبھی نہ کبھی یہ بچّے یا ان بچوں کے بچے بنگلہ دیش ضرور آئیں گے۔ شمس الرحمٰن نے اس تصویر کو دیکھ کر سوچا تھا اور یوں تو ممکن ہے کہ بینو اور اکرام الحق کا بیٹا کراچی اور پاول اور یوسف کی اولاد سلہٹ آن کر بس جائے۔ لیکن ابھی نہیں، ابھی تو لوگ اس ملک سے باہر جانے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے ہیں۔

کتنی عجیب بات ہے کہ جس گھر کو اتنے چاؤ سے بنایا تھا، لوگ اب اس سے دور رہنا چاہتے ہیں۔

سہروردی اڈان کے نزدیک رمنا گرین کے ایک درخت پر بیٹھے ہوئے ہریل نے کہا، ''مینا رات کا کوئی راگ سناؤ۔ ایمن، درباری، جے جے ونتی۔''

''ہریل! آج میرا جی نہیں چاہتا گانے کو، طبیعت پریشان سی ہے۔'' مینا نے کہا۔

مینا چپ تھی۔ شاید سو رہی تھی۔ ہریل ابھی تک جاگ رہا تھا۔ ان چار سالوں میں آزادی کے بعد بنگلہ دیش میں بہت کچھ ہوا ہے۔ شہید مینار تو آزادی کے ایک سال کے اندر ہی بن گیا تھا جس پر ٹیگور کی نظم درج ہے — راہِ پیش قدمی میں کسی کی آواز سنائی دے رہی ہے — اپنی جان وقف کر دینے والوں کے لیے کوئی ڈر، کوئی خوف نہیں ہے۔ مگر آج بھی ہر طرف خوف و ہراس پھیلا ہوا تھا۔ بنگلہ دیش میں چین و سکون نایاب تھا۔ کل ۱۴/اگست تھی — پاکستان کا یوم آزادی۔ آج ۱۵/ اگست ہے بھارت کا یومِ آزدی — بنگلہ دیش کا یوم آزادی گزر چکا تھا یا آنے والا تھا۔

مینا نے کہا تھا، اس کی طبیعت پریشان سی ہے۔ طبیعت تو ہریل کی بھی بے چین تھی۔ عجیب قسم کی بے کلی تھی۔ ذرا دیر بعد ہریل نے مینا کو آواز دی۔

''مینا مینا، دیکھو بارود کی بو آرہی ہے، بتاؤ تو کس طرف سے؟''

مینا نے آنکھ کھولی۔ آسمان کی طرف دیکھا۔ ''دھان منڈی کی طرف سے۔'' اس نے کہا۔

''آؤ چل کر دیکھیں۔'' ہریل نے کہا۔

وہ دونوں اُڑے۔ روڈ نمبر ۳۲ پر شیخ مجیب الرحمٰن کا مکان دھواں دھار ہو رہا تھا۔ یہ بنگو بندھو جو

۱۰ر جنوری ۱۹۷۲ء کو پاکستان سے بنگو پتا بن کر لوٹے تھے، ۱۵/۱۵ اگست ۱۹۷۵ء کی اس رات اپنی خواب گاہ کے آگے زینے پر لہولہان پڑے تھے۔ سات سیڑھیوں پر ان کا خون پڑا ہوا تھا۔ لینڈنگ کے پیچھے کی دیوار پر گولیوں کے نشانات تھے۔

شیخ کمال آفس کے کمرے کے سامنے شطرنجی والے برآمدے میں پڑا سسک رہا تھا۔ اس کی کھلی آنکھیں گویا کہہ رہی تھیں —— ہم سب شطرنج کے مہرے ہیں اور ہماری قسمت میں بہرحال پٹنا اور بساط پر سے ہٹا دیے جانا ہے —— اس کی بیوی، جس کے ہاتھوں سے شادی کی مہندی ابھی جدا نہ ہوئی تھی، اس کا بھائی اور نو بیاہتا دلھن اور چھوٹا بھائی، سب مہرے پٹ چکے تھے۔ شیخ مجیب الرحمٰن کا بھانجا شیخ مونی بھی بساط پر سے ہٹایا جا چکا تھا۔ ان سب کا ملازم چھوکرا ابوالقاسم ہاتھوں میں منہ چھپائے رو رہا تھا۔ آسمان سے شبنم آم کے درختوں پر، گل چاندنی کے پیڑوں پر اور احاطے کی دیوار کے پاس لگے بنگلہ دیش کے جھنڈے پر گر رہی تھی۔

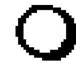
مینا پلاش کے درخت پر آنکھیں موندے پروں میں اپنا منہ چھپائے بیٹھی تھی۔ اس وقت وہ سنہری آواز والی چڑیا نہیں، پروں کا ایک ڈھیر معلوم ہو رہی تھی۔ دل ہی دل میں تشفی حاصل کرنے کے لیے وہ دہرا رہی تھی:

پیش قدمی کرنے والوں کے لیے کوئی خوف نہیں، کوئی خوف نہیں!

یہ خواب سارے

پہلی اشاعت: مئی ۱۹۹۱ء

فہرست



غبارِ خاطر کے باب سارے

ثمن، ڈیو اور بصیرہ اکٹھے امریکا کے لیے روانہ ہوئے۔ ساتھ چلنے کی وجہ تھی دوسرا تھ۔ ثمن اور بصیرہ نے اس سے پہلے ملک سے باہر سفر نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں دل سے ساتھ رہنا چاہتی تھیں، لیکن بظاہر یہ انتظام ضمیر صاحب کی مرضی سے ہوا تھا۔ ڈیو پر اُن کے جہاز سے جانے کی کوئی پابندی نہیں تھی، نہ اسے بہت زور شور سے مدعو کیا گیا تھا، لیکن اس نے خود یہ پیش کش کی۔ وہ ثمن کے ساتھ رہنا چاہتا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اس کی ہمراہی ان دو لڑکیوں کے لیے کتنے اطمینان کا باعث ہو گی جو بظاہر بہادر بننے کی کوشش میں مصروف اندر سے کانپ رہی ہیں۔ ہر سفر میں، ہر کام میں پہلی مرتبہ ایک خوف سا ہوتا ہے، نامعلوم کا خوف، نہ جاننے کا ڈر جو کہیں جا کر عملی مشکلات میں مبتلا ہونے یا پہلے پہل جھجنے کے وسوسوں سے الگ ہوتا ہے۔

اُسے یوں بھی امریکا جانا تھا، لیکن اتنے دن وہ ٹالتا رہا۔ چند دن اِدھر یا اُدھر ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، وہ دل کو سمجھاتا۔ شاید ان جانے میں وہ اس خبر سے کچھ دن اور بچنا چاہتا ہو جو مما اس کے لیے سنبھالے بیٹھی تھیں۔ یہ ازل سے اس کی عادت تھی۔ امتحان کی پوری تیاری کے بعد سوچنا.....اگر اس مرتبہ امتحان نہ دے تو کیسا رہے؟ ملازمتوں کی درخواستیں بھیجتا۔ بڑے جتن سے، ریزیومے (resume) بناتا۔ بعض اوقات دوسرے شہروں میں انٹرویو کے لیے بلایا جاتا تو اس کے لیے چھٹی لیتا اور پھر ٹال جاتا۔ چھوڑو کون جائے، پھر سہی۔

وہ خود حیران تھا۔ وہ حقیقت کی تلاش میں تھا۔ کیا ایسا ہوتا ہے کہ حقیقت کھوجنے والے بعض

اوقات اس کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں رکھتے!

رات کے ٹھیک بارہ بجے رائل ڈچ ایئر لائنز کا جہاز کراچی سے امریکا کے لیے روانہ ہوا۔ مگر اس کا پہلا پڑاؤ مسقط تھا جہاں سے اس کو سامان اُٹھانا تھا۔ وہاں سے ایمسٹرڈیم اور پھر شکاگو۔ جہاز میں داخل ہونے کے بعد ثمن اور ڈیو کو پتا چلا کہ بصیرہ کا ٹکٹ فرسٹ کلاس کا تھا۔ وہ فرسٹ کلاس میں چلی گئی جہاں مسافروں کی تعداد کم تھی، خدمت گاروں کی تعداد زیادہ اور آرام و آسائش بیش بیش، سیٹیں چوڑی تھیں۔ جہاز کی دیوار کے برابر ایک ریک تھا جس کے اُوپر میگزین اور فالتو کپڑے اُتار کر رکھے جاسکتے تھے۔ ریک کو کھولو تو خالی جگہیں تھیں جہاں بیگ اور پرس وغیرہ رکھنے کی گنجائش تھی۔ یہ سب کچھ ثمن نے بعد میں اُس حصّے میں جاکر دیکھا۔ شروع میں وہ کھڑکی کے برابر سیٹ پر بیٹھی، ڈیو برابر میں اور تیسری سیٹ پر بارہ سالہ ایک لڑکا جو بخار میں بھن رہا تھا۔ اس کا باپ اُس کے ہمراہ تھا جو آئل کے دوسری طرف بیٹھا تھا۔ وہ ایمسٹرڈم کی ہوائی کمپنی میں ملازم تھا اور مفت سفر کرنے کا مجاز تھا۔ پاکستان سے انجینئرنگ کرنے ایمسٹرڈیم گیا تھا، وہ نہ کرسکا۔ ایک ڈچ لڑکی سے شادی کرکے وہیں رہ پڑا۔ بچہ اُردو یا پنجابی نہیں بول سکتا تھا۔ زندگی میں پہلی مرتبہ دادی سے ملنے پنجاب کے چک میں گیا تھا اور وہاں سے پیچش اور بخار لے کر لوٹا تھا۔ لاغر و بیمار بچہ گردن ڈالے نڈھال پڑا تھا۔ بچے کے باپ نے یہ ساری داستان ڈیو کو اپنی ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں سنائی۔ ڈیو بھی اُس سے انگریزی میں بات کرتا رہا۔

ثمن کھڑکی سے باہر دیکھتی رہی۔ عیدِ میلاد کی رات تھی۔ کراچی شہر کی عمارتوں، دفتروں اور سڑکوں پر جو بے شمار رنگین قمقمے لگے ہوئے تھے، فضا سے ان کی بہار کچھ اور ہی تھی، جیسے چھوٹے چھوٹے رنگین نگینے کسی نے کوہ و صحرا، جنگل و بیابان میں بڑی مہارت سے سجائے ہوں۔ آخری روشنی تک ثمن نے کراچی کو دیکھا۔ اپنی امی کی آنسو بھری آنکھیں اور سر پر رکھتے ہوئے اُن کا کانپتا ہاتھ بار بار اُس کے ذہن پر اُبھرتا۔ وہ اسے چھوڑنے ایئر پورٹ تک نہیں آئی تھیں، کون رات کو انھیں واپس لے کر جاتا۔ ثمن نے اپنے گھر کی چوکھٹ پر ہی انھیں خدا حافظ کہا تھا۔ جب اندھیرا مکمل اور گہرا ہوا، صرف جہاز کے پر پہ چمکنے والی سبز روشنی رہ گئی تو ثمن نے کھڑکی کا سفید پلاسٹک کا پردہ کھینچ کر اپنی یادوں کو شعوری طور پر خود سے الگ کردیا اور جہاز کے اندر ہونے والی سرگرمیوں پر دھیان دیا۔

تین ایئر ہوسٹسیں، ایک سے ایک سرو قامت، نیلے رنگ کے لباس میں ملبوس پھرتی سے اِدھر اُدھر پھر رہی تھیں۔ زیادہ دیر نہیں گزری تھی کہ اُن میں سے ایک جو باقی دونوں سے زیادہ خوب صورت تھی اور کانوں میں سفید رنگ کے ٹاپس بھی پہنے ہوئے تھی، ان کے پاس آئی اور ڈچ لہجے کی انگریزی میں سب سے باری باری پوچھا، ''آپ کچھ کھانا پسند کریں گے؟''

سمن نے منع کر دیا۔ ڈیو نے ہاں کہا۔ بچے نے انکار میں گردن ہلا کر دوبارہ آنکھیں موند لیں۔ بچے کے باپ نے ڈچ زبان میں کچھ کہا۔ ایئر ہوسٹس کے جانے کے بعد اُس نے ڈیو سے کہا، ''کچھ کھاتے ہی اسے اُلٹی آئے گی یا غسل خانے جانے کی ضرورت ہوگی اس لیے اس کا بھوکا رہنا ہی بہتر ہے۔ بچے نے دو دن سے، جب سے وہ اپنے گاؤں سے چلے تھے، کچھ نہیں کھایا تھا۔ بچے کی ہمدردی میں باپ نے بھی کچھ نہیں لیا۔

ڈیو کی ٹرے میں دو سینڈوچ، سلاد، ایک میٹھا، انناس کا رس اور چائے تھی۔ ڈیو کے اصرار پر چائے سمن نے پی اور پھر ہوائی کمپنی کی چار خانے دار چادر اوڑھ کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔ ابھی آنکھ لگی بھی نہ تھی کہ مسقط آ گیا۔ جہاز دھڑ دھڑا کر زمین سے لگا تو سمن نے پردہ اُٹھایا۔ مسقط ایئر پورٹ سجاوٹ میں کراچی سے بھی بازی لے گیا تھا۔ ڈیو نے سمن کی طرف جھک کر کھڑکی سے باہر جھانکا۔ سمن سانس روک کر کھڑکی کی طرف جھک گئی۔

''مسقط ایئر پورٹ کیوں اتنا سجا ہوا ہے، یہاں کی تو ایک ایک عمارت بقعۂ نور بنی ہوئی ہے۔'' ڈیو نے کہا۔

''عیدِ میلاد.....'' سمن نے کہا۔

''اچھا ہاں.....پیغمبر کی ولادت کا دن.....ٹھیک۔'' ایک مرتبہ پھر اس نے کھڑکی سے جھانکنے کی کوشش کی۔ احاطے کے جنگلوں تک رنگین لہریں پڑی ہوئی ہیں۔ عمارتوں کے اندر سے پھوٹتی نیلی روشنی بہت اچھی لگ رہی ہے۔''

''جگہ بدل لو، اگر اچھی طرح دیکھنا چاہتے ہو تو''.....سمن نے کہا۔

''نہیں..... یہاں سے بھی دکھائی دے رہا ہے۔'' اُس نے کہا۔

سمن کچھ نہ بولی۔ جہاز کے اُڑتے ہی اُس نے پردہ کھینچ دیا، حالاں کہ اس کا جی چاہ رہا تھا کہ حدِ نگاہ تک آسمان سے روشنیاں دیکھے مگر وہ نہیں چاہتی تھی کہ ڈیو باہر کی روشنیاں دیکھتے وقت اس پر چھا جائے۔

جہاز میں فلم دکھانے کی تیاریاں ہو رہی تھیں۔ سمن نے ہیڈ فون نہیں لگایا۔

''مووی نہیں دیکھو گی؟'' ڈیو نے کہا۔

''نہیں، تم دیکھو۔'' سمن نے کہا۔

''تم کیا کرو گی؟''

''میں سوؤں گی۔''

''ارے بھئی سونے کے لیے ساری عمر پڑی ہے۔ رات یوں بھی بہت لمبی ہوگی۔ کچھ اپنی کہو، کچھ

ہماری سنو۔'' ڈیو نے جہاز کی گرم چوخانے دار چادر گود میں جماتے ہوئے کہا۔

''میرے پاس اِس وقت کہنے کو کچھ نہیں، تمھاری سن لوں گی۔'' سمن نے کہا۔ ''لیکن داستان سنتے سنتے سو جاؤں تو؟''

''تو باقی پھر.....'' ڈیو نے کہا۔

''اچھا سناؤ۔'' سمن کرسی سے سر ٹکا کر ہمہ تن گوش ہوگئی۔

ڈیو نے اپنی سیٹ پیچھے کر کے سمن کے برابر کی، تکیہ سر کے نیچے جمایا پھر سمن کی طرف منہ کر کے اتنی ہلکی آواز میں کہ صرف سمن سن سکے، اپنی آپ بیتی سنانے لگا۔ سمن درمیان میں بالکل نہیں بولی۔ جب تک ڈیو کے کراچی پہنچنے اور سمن سے پہلی ملاقات کی نوبت آئے سمن کی آنکھیں بے حد بوجھل ہوچکی تھیں۔ ڈیو کے دیکھتے دیکھتے وہ غافل ہوچکی تھی۔ اس کی گہری سیاہ پلکوں کے پٹ اس کی گہری سیاہ آنکھوں پر پڑے تھے۔ ڈیو کو اپنی زندگی کی سیکڑوں راتیں ایک ساتھ یاد آنے لگیں۔ گہری گھٹاؤں سے گھری کالی گھپاؤں جیسی رات، کالی مخملیں دبیز رات، بجلی کے کوندوں سے لو دیتی، بادلوں کی گڑگڑاہٹوں سے اُدھڑی بے نیند کی رات، علی الصبح اُٹھ کر کہیں جانے کی تیاری میں گزری بے کل رات، کسی سے مل کر واپس آنے پر بیٹھے بیٹھے درد کی رات، جگنو چمکنے، چاند کے اُجلنے کی رات اور یہ آدھی جاگتی، آدھی سوتی، بولتی ہوئی مگر خاموش جہاز کی رات.....

انسان کا ذہن بھی جہاز کے پینل کی طرح ہے، اُس نے سوچا۔ ہزاروں کل پُرزے، روشنیاں، لٹو، کھٹکے اور کیا کیا کچھ..... اُڑنے سے پیش تر بہت سی چیزوں کو مناسب جگہ لانا ہوتا ہے۔ اُترنے سے پہلے کچھ اور انتظامات کرنے ہوتے ہیں۔ اُس نے بھی فی الحال مستقبل کی سوچ کا بٹن بند کر رکھا ہے۔ وہ حال کے لمحے میں جی رہا ہے۔ اسے پوری طرح محسوس کرنا چاہتا ہے۔ اگر وہ جہاز سے باہر اس طرح دیکھے جیسے کوئی ایسا آدمی یا بچہ دیکھے جس نے اس سے پہلے وہاں کی کوئی چیز نہ دیکھی ہو، اُوپر سے نیچے زمین کو دیکھ کر وہ کسی چیز کو پہچان نہ سکے، کسی چیز کو کسی چیز سے تشبیہہ نہ دے سکے۔ یہ سوچ کر جہاز کی کھڑکی کا پٹ اُوپر ہٹایا تو اسے حیرت ہوئی۔ ایک نظر کے بدلنے سے زمین، آسمان، فاصلے، سمتیں، چاند، سمندر، روشنیاں کچھ کی کچھ ہوگئی تھیں۔ پھر یوں محسوس ہوا جیسے وہ سچ مچ زمین کی کسی چیز سے متعلق نہیں ہے۔ وہ وقت سے بھی ماورا ہے۔ اس کا تعلق پھیلی ہوئی کائنات اور بے انت زمانے سے ہے۔ کائنات کا ایک حصّہ بن جانے کے بعد وہ خود کچھ بھی نہ تھا۔ اس کے آس پاس بیٹھے ہوئے لوگ، اس کی اپنی خواہشات، اس کا علم، اس کی لاعلمیاں سب یکساں تھیں۔ مووی دیکھتے لوگ، اخبار پڑھتے، اونگھتے لوگ، بچوں کے آرام کے لیے بے کل مائیں سب کتنے عجیب لگ رہے تھے۔ کل پرزے یا چیونٹیاں یا کچھ بھی نہیں، بالکل غیر

اہم..... ہیں بھی یا نہیں ہیں۔ وہ خود بھی کہیں نہیں تھا یا شاید اپنی سوچ میں تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔

جب ابدیت دُھند میں کھوئی کسی ایسی وادی کی طرح ہوگی جس کا کوئی انت نہ ہو یا طویل چادر کی مانند پھیلی ہوگی جس کا کوئی سرا نہ ہو۔

اس ابدیت کی چادر میں کوہِ ایورسٹ بس اِک ذرا سی سلوٹ۔

اہرامِ مصر منا سا ایک دھبا۔

وقت اس وادی میں اُڑتا چھوٹا سا جگنو۔

زمانہ اُفق تا اُفق پھیلی، دُھندلی بے پہچان سی لکیر.....

شہرت چادر کے انتھک طول میں کہیں کوئی چھوٹا سا اُبھار۔

عبادتیں اور ریاضتیں اتنی بڑی چادر کے تانے بانے میں ہلکے رنگوں کی طرح گم۔ تمام کرے، کائنات، کاسموس، ابد کی وادی میں اُگی بے نام جھاڑیاں۔

ابتدا اور انتہا اس دُھند میں پر مارتے کہیں کو جاتے پُراسرار سے پرندے۔

اور جب ابدیت کی اس خاموش چادر پر پھیلی چاند کی روشنی بھی نہ رہے گی، نہ ستاروں کی جوت، نہ سورج کی کرنوں کے جال تب..... تب کیا فرق پڑے گا کہ کوئی شیکسپیئر ہو یا چڑیا یا تتلی یا مچھلی یا جال، یا لُغت کا ایک لفظ فنا..... محض فنا۔

یا وہ بھی نہ ہو،

کچھ بھی نہ ہو......

یکایک دھائیں دھائیں..... کسی نے کانوں پر زور سے دستک دی۔ کان جو سن ہو گئے تھے، جاگ گئے۔ آوازیں لوٹ آئیں، آنکھوں کے پردے سرک گئے اور ہر چیز وہی ہوگئی فیض کی زبان میں کہ جو تھی۔ اُس نے دیکھا کہ سمن برابر کی سیٹ پر غافل سو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر ڈیو کو رحم آیا۔ ننھی سی یہ لڑکی کس برتے پر دنیا سے نمٹنے اتنی دُور تنہا جا رہی ہے۔ ڈیو نے اسے بتانے کی کوشش کی تھی کہ وہ جس ملک میں جا رہی ہے، اُسے جائے اماں نہ سمجھے..... وہاں قتل بھی ہوتے ہیں، جنسی آزادی بے راہ روی تک ہے مگر جنسی دباؤ اور تشدد بھی ہے۔ دنیا بھر کے جرائم بھی ہیں۔

''اب جو کچھ بھی ہو......'' اُس نے کہا تھا، ''مجھے بچوں کی طرح خود ہی سیکھنے دو۔''

بچے خود سے سیکھنے میں کتنی مرتبہ آگ سے جلتے، گرتے پڑتے ہیں مگر وہ بھی ٹھیک کہتی ہے۔ دنیا میں یوں ہی ہوتا ہے۔ انسان دوسروں کے بتانے سے سب کچھ سیکھ جاتا تو ہر نسل سیکھی سکھائی ہوتی۔ کسی کی جان جوکھوں میں نہ ہوتی مگر ہوتا یوں ہے کہ اپنے تجربے، اپنے دُکھ، اپنی مشکلات، اپنی جنت، اپنی دوزخ سب

کی الگ ہے۔ مور کی طرح جنگل میں تنہا ناچتے رہنا اور اپنی دوزخ میں تنہا جلنا سب کا مقدر ہے۔

''سوئٹ ڈریمز!'' ڈیو نے سوتی ہوئی سمن سے کہا۔ اپنی طویل ٹانگیں پھیلانے کی کوشش کی اور آنکھیں موند لیں۔

علی الصبح سمن کی آنکھ کھلی تو پہلا احساس یہ ہوا کہ اس کا سر ڈھلکا ہوا ڈیو کے بازو پر ہے۔ جلد سے سیدھی ہو بیٹھی اور ڈیو کو غور سے دیکھا۔ وہ سو رہا تھا۔ جہاز میں اندھیرا تھا۔ سمن نے کھڑکی کا پٹ کھول کر دیکھا تو بادلوں نے چھوٹا نقشہ دکھایا جیسے پچیس تیس فٹ نیچے اُتھلا سا پانی ہو جس کے چاروں طرف جھاڑیاں اور کچھ دُور ایک بے شکل سا گڑھا ہو۔ جہاز کے سفر میں بھی زندگی کی طرح خاصی چھل بازیاں ہیں۔ سمن نے سوچا۔ پلٹ کر پھر اُس نے ڈیو کی طرف دیکھا۔ وہ واقعی سو رہا ہے؟ کہیں بن تو نہیں رہا؟ نہیں، وہ واقعی سو رہا تھا۔ عجیب بات تھی کہ جاگتے میں وہ ہمیشہ ہشاش بشاش نظر آتا تھا لیکن سوتے میں اس کے چہرے پر کسی نامعلوم کرب کی نشانیاں تھیں۔

سمن احتیاط سے اُٹھی اور نہایت محتاط ہو کر دونوں سوتے مسافروں سے بچ کر نکلتی آئل میں آئی۔ ڈیو نے ذرا سی حرکت کی شاید نکلتے ہوئے اس کی ٹانگ ڈیو کی ٹانگ سے ٹکرا گئی تھی مگر وہ اُٹھا نہیں۔ سمن غسل خانے میں چلی گئی۔

واپس آئی تو جہاز کی روشنیاں جل چکی تھیں۔ ناشتے کی چہل پہل شروع ہو چکی تھی اور غسل خانوں کے آگے لمبی لمبی قطاریں لگنی شروع ہو گئی تھیں۔ ڈیو اُٹھ کر بیمار بچے کی خیریت پوچھ رہا تھا۔ اس کے بال بکھرے ہوئے تھے اور آنکھوں میں سُرخ ڈورے تھے۔

''تم تو خوب سوئیں۔'' سمن کو دیکھ کر ڈیو نے کہا، ''میری بکواس بھی تم نہیں سنی۔''

''باتیں تو وہی تھیں جو تم مجھے پہلے سنا چکے تھے، اس دفعہ رقت زیادہ تھی۔'' سمن نے ہنس کر کہا۔

''تبھی تمھیں نیند آ گئی۔''

''میں پریشان ہوں تو مجھے نیند زیادہ آتی ہے۔''

''اچھا ہوا تم نے بتا دیا، میں یاد رکھوں گا۔'' ڈیو نے کہا۔

''اب جا کر منہ ہاتھ دھوؤ، ناشتا آنا شروع ہو گیا ہے۔ کوئی صورت ہے بصیرہ کی خیر خبر لینے کی؟'' سمن نے پوچھا۔

''کسی ایئر ہوسٹس سے پوچھو شاید اجازت مل جائے۔'' ڈیو نے اپنے تھیلے میں سے ٹوتھ برش نکالا اور بچے کے پاس سے نکلتا غسل خانے کی طرف چلا۔ ''ویسے بصیرہ کو یہاں آنے میں زیادہ آسانی ہوگی۔'' پاس سے گزرتے ہوئے اُس نے کہا۔

ثمن ایئر ہوسٹس سے پوچھ کر فرسٹ کلاس میں گئی جو چند سیڑھیاں چڑھنے کے بعد الگ ایک نسبتاً چھوٹا کمرہ تھا۔ مسافروں کے لباس اور سج دھج ان کی امارت کی چغلی کھا رہی تھی۔ مسافر نسبتاً کم تھے اور بصیرہ تین خالی نشستوں پر چادر لپیٹے آرام سے سو رہی تھی۔ چاروں طرف ایک نگاہ ڈال کر ثمن اُلٹے قدموں لوٹ آئی۔

ایمسٹرڈیم ایئر پورٹ پر جہاز وہاں کے وقت کے مطابق ٹھیک چھ بجے اُترا۔ ثمن نے غور سے دیکھا کہ کس طرح جہاز سبک خرامی کرتا عمارت کے باہر لٹکتی سونڈوں میں سی ایک کے دہانے پر فٹ ہو گیا۔ اس سرنگ نما راستے سے گزرتے وہ عمارت میں آئے۔ بصیرہ جس کی نیند بھر چکی تھی، بڑی ہشاش بشاش نظر آ رہی تھی۔ اپنے تھیلے اُٹھائے، خود کار پٹریوں پر کھڑے کھڑے چلتے وہ طویل راہداریاں طے کر کے ٹرانزٹ میں آئے۔ رواں زینے، چلتی فٹ پاتھ کی طرح رواں راستے بصیرہ اور ثمن کے لیے نئے تھے۔ ڈیوان پر ہزاروں مرتبہ گزر چکا تھا۔ وہ ایمسٹرڈیم کے ایئر ٹرمینل میں کئی مرتبہ ٹھہر چکا تھا۔ اس کے لیے یہ کوئی عجوبہ نہ تھا لیکن ثمن اور بصیرہ کے لیے واقعی عجوبہ تھا۔ اتنا بڑا، کئی منزلیں۔ بیٹھنے کے لیے بے شمار صوفے۔ کونے بچالوں میں پڑے صوفوں پر لوگ بے خبر سو رہے تھے۔ ہر جگہ گہما گہمی تھی مگر بھیڑ بھاڑ نہ تھی۔ بصیرہ فرسٹ کلاس کا ویٹنگ رُوم تلاش کر رہی تھی جو اُوپری منزل پر تھا۔ ڈیو اور ثمن اس کے ساتھ آئے۔ ایک جگہ بڑے خوب صورت انداز میں لکھا تھا۔ وین گاف رُوم۔ وہ سمجھے شاید وین گاف کی پینٹنگز کا کوئی نمائشی کمرہ ہے۔ پوچھنے پر پتا چلا کہ فرسٹ کلاس کے مسافروں کا مسافر خانہ ہے۔

''تم یہاں کے شاپنگ سینٹر کی سیر نہیں کرو گی؟'' ڈیو نے بصیرہ سے پوچھا۔

''تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد۔'' بصیرہ نے کہا۔

ڈیو اور ثمن پھر نچلی منزل پر آ گئے۔

''بصیرہ کو دیکھو، اس نے رسماً بھی تو ہمارے ساتھ رہنے پر اصرار نہیں کیا۔'' ثمن نے کہا۔

''وہ ہمیں زیادہ سے زیادہ ساتھ رہنے کا موقع دینا چاہتی ہے۔'' ڈیو نے کہا۔

''جی نہیں۔'' ثمن نے بگڑ کر کہا، ''میں اسے خوب جانتی ہوں، بگڑی امیر زادی ہے وہ۔ آرام کا کوئی موقع چھوڑ نہیں سکتی، اسی لیے تو دوست ہوتے ہوئے بھی میں ہمیشہ اس سے دوری محسوس کرتی ہوں۔''

ثمن نے طویل شیشوں کے پار دیکھا۔ باہر حدِ نظر تک سبزہ تھا مگر یہاں کی مشہور نہروں اور پون چکیوں کے کوئی آثار نہ تھے۔

''ایمسٹرڈیم کی سیر کو چلتی ہو؟ کئی گھنٹے ہیں ہمارے پاس۔'' ڈیو نے کہا۔

ویزا کہاں ہے؟'' ثمن نے کہا۔

''ویزا لے لیتے ہیں یہیں سے ایک دن کا''۔ ڈیو نے کہا۔

''نہیں، ہم نے یہی طے کیا تھا کہ ایئرپورٹ سے باہر نہیں جائیں گے، دیر ہو گئی تو مصیبت میں پڑ جائیں گے۔''

''کیوں ہو جائے گی دیر.... ڈیم اسکوائر کا چکر لگائیں۔ چھوٹی سی بوٹ رائڈ۔''

''نا بابا..... پھر کبھی سہی۔ تمھارا تو دیکھا ہوا ہے؟'' سمن نے پوچھا۔

''نہ صرف دیکھا ہے بلکہ نہر میں کشتی کے گھر میں رہنے کا بھی سوچا ہے۔'' ڈیو کونے میں دھرے بادامی رنگ کے ایک صوفے میں دھنس گیا۔ اپنا بیگ دونوں ٹانگوں کے بیچ پھنسا لیا۔ سمن نزدیک کھڑی رہی۔

''کتنے ہرجائی ہو، ہر جگہ رہ پڑنے کا سوچتے ہو۔'' سمن نے مذاقاً کہا۔

''میں کیا کروں، منظر اتنا اچھا لگا۔ نہروں میں پڑے کشتی کے گھر ہلکے ہلکے ہلتے ہوئے جھولے کی طرح۔ بیڈروم کی کھڑکیوں میں جھالر دار پردے اور پھولوں کے گل دان، ڈیک پر بچوں کی بائیسکل..... سچ مچ کتنا مزہ آئے ایسے گھر میں آدمی رہے۔ مُنّی سی سیاہ آنکھوں والی کوئی لڑکی جس کی ہنسی بڑی جان لیوا ہو، بالوں میں ٹیولپ لگائے ہاتھ پکڑ کر آپ کو خشکی سے اس گھر کے جزیرے میں اُتارا کرے۔''

''سنو، یہ رومانی ناولوں جیسے تمھارے خواب تم پر بالکل جچتے نہیں ڈیو صاحب!''

''تمھارے خواب تم پر جچتے ہیں یا نہیں کبھی سناؤ تو پتا چلے۔'' ڈیو نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''میں خواب واب نہیں دیکھتی۔ بس سوچتی رہتی ہوں کاش یہ کر لیتی، وہ کر لیتی۔ کسی طرح امی کو اپنے پاس رکھ سکتی.....''

''کوئی مشکل بات نہیں تھی مگر تمھیں آسانیوں کو مشکل بنانے کا ہنر آتا ہے۔'' ڈیو نے چوٹ کی۔

''یہ ہنر تو تمھیں بھی آتا ہے..... ورنہ اچھے خاصے چین سے اپنے گھر میں رہتے۔'' سمن نے جوابی حملہ کیا۔

''اور نام نہاد بڑے بھائی کی جوتیاں کھاتے۔'' ڈیو نے بات کاٹی۔

''تم ماں باپ سے کہہ کر اپنا بزنس الگ بھی کر سکتے ہو، اگر وہ تمھیں اتنا ہی چاہتے ہیں تو مان جائیں گے۔''

''بزنس اور چاہت دو الگ چیزیں ہیں۔ لکھنے کو تو مما نے لکھ دیا کہ پپا پوری ایک شاخ کا انتخاب مجھے سونپنا چاہتے ہیں لیکن وہاں جا کر معلوم ہوگا کہ معاملہ کیا ہے۔ پپا نے بزنس خود شروع کی تھی، وہ چاہتے ہیں ان کے بچے بھی شروع سے آخر تک ہر کام کی نوعیت جانیں۔ ہو سکتا ہے پہلے پہل وہ مجھے اُس شاخ کا جینٹر بنا دیں۔''

''وہ کیا ہوتا ہے؟'' ثمن، ڈیو کے پاس صوفے پر بیٹھ گئی۔

''جمعدار۔ کام کے بعد روزمرہ کی صفائی کرنے والا۔''

''خیر اب اتنا بھی نہیں۔'' ثمن نے کہنا شروع کیا۔

''تم نہیں جانتیں، خیر چھوڑو۔ آؤ شاپنگ سینٹر کا ایک چکر تو لگائیں۔ یہ تھیلے لاکر میں ڈالے دیتے ہیں۔''

سامنے ہی بینک کا کاؤنٹر تھا۔ وہاں سے ڈیو نے ڈالر کے گلڈر بنوائے۔ نزدیک ہی لاکر تھے۔ ان میں اپنے بیگ رکھے اور شاپنگ سینٹر کی سیر کو نکلے۔ ثمن کو اس بازار کی رونق بہت بھائی۔ دُکانوں سے ہی اندازہ ہوجاتا تھا کہ یہ ایمسٹرڈیم کا بازار ہے۔ دکانیں ہیروں سی جگر جگر کررہی تھیں۔ ہیروں کی چھوٹی بڑی گھڑیوں میں دنیا کا ہر وقت بجا تھا۔ شوکیس میں بلور کی چڑیوں کے آگے ہیروں کے دانے پڑے تھے۔ اس کے بعد پھولوں کا نمبر تھا۔ ایسے خوب صورت شبنم پڑے اور تازہ کہ ثمن نے کبھی باغوں میں بھی نہیں دیکھے تھے۔ گلاب اور ٹیولپ کے ان گنت رنگ جن کے بڑے بڑے گل دستے پھول اور کلیوں کی شکل میں جدا جدا رکھے تھے۔ دوسرے اقسام کے پھول اور بیجوں کے پیکٹوں سے دکانیں بھری ہوئی تھیں۔ ان کے علاوہ مہنگے سوئٹر، کوٹ، مفلر، ٹائیاں اور اسکارف، جوتے اور پرس۔ ہالینڈ کے مشہور ڈیلف برتن اور اسی کے کھلونے، پون چکیاں اور جوتے۔ اصلی گڑیاں اور چاکلیٹ کی بنی ہوئی گڑیاں۔ چکنے کاغذوں میں الگ الگ لپٹے ہوئے پھل اور ہر قسم کے جانور کا انتڑیوں میں ٹھنسا قیمہ۔

''دیکھ رہی ہو؟'' ڈیو نے کہا۔ ادھیڑ عمر کے مرد اور ان سے بھی زیادہ عمر کی عورتیں دھڑا دھڑ ہیرے کی انگوٹھیاں خرید رہی ہیں۔ کوئی ان سے کہے کہ تمھاری انگلیاں کب کی ٹیڑھی میڑھی ہوچکیں، جھریاں پڑی انگلیوں میں یہ انگوٹھیاں سجنے سے رہیں۔''

''تو تمھیں کیا؟ اُن کے پاس پیسہ ہے خرید رہی ہیں۔'' ثمن نے کہا۔

''یہی تو دکھ ہے کہ جن انگلیوں میں ہیرے کی انگوٹھیاں ہونی چاہییں، مثلاً.....'' اُس نے جھک کر ثمن کا ہاتھ تھاما، ''ان سڈول انگلیوں میں۔ اگر تم راضی ہو تو میں اسی وقت ایک ہیرے کی انگوٹھی خرید کر لاسکتا ہوں اور ہم یہیں سے فون پر اپنی منگنی کی خبر پاکستان اور امریکا بھیج سکتے ہیں۔''

''پاگل پنے کی باتیں مت کرو۔'' ثمن نے آہستہ سے اپنا ہاتھ ڈیو کے ہاتھ سے چھڑا لیا۔

''آؤ دیکھیں بصیرہ کیا کررہی ہے، شاید وہ ہمیں ڈھونڈتی پھر رہی ہو۔''

''ابھی تو تم اس کی آرام طلبی سے جل رہی تھیں، اب اس کے پاس جانے کو تیار ہو۔'' ڈیو نے کہا۔

''بہت آرام کرلیا اُس نے۔ ہوسکتا ہے وہ ہمیں ڈھونڈنے نکلی ہو اور ہم نہ ملے ہوں۔'' ثمن نے کہا۔

جوں ہی انھوں نے زینے پر قدم رکھا بصیرہ نیچے اُترتی نظر آئی۔ بصیرہ کے ساتھ ایک مرتبہ اور دکانوں کا چکر لگانے کے بعد وہ کیفے ٹیریا چلے گئے۔ ٹرانزٹ میں ہونے کی وجہ سے انھیں کھانے کے کوپن مل گئے تھے۔

شکاگو کے جہاز میں جانے سے پہلے لابی میں آئے تو دنیا کے ہر ملک کے لوگ نظر آئے۔ پاکستانی خواتین اپنے لباس اور مرد شکلوں سے پہچانے جاتے تھے۔ افریقا کے مرد اور خواتین دونوں اپنے لباس میں تھے۔

''یوں لگتا ہے کہ دنیا کے ہر ملک کے لوگوں کی الگ الگ قطار بنائی جائے تو سب سے بڑی قطار پاکستانیوں کی ہوگی۔'' سمن نے کہا۔

''اپنے ملک سے سب سے زیادہ بیزار بھی تو وہی ہیں۔'' بصیرہ نے کہا۔

''ایک یہ ہیں......'' سمن نے ڈیو کی طرف اشارہ کیا۔ ''دنیا ان کے ملک کی طرف بھاگ رہی ہے اور خود یہ ساری دنیا میں مارے مارے پھرتے ہیں۔''

''ایسا بھی ہوتا ہے۔'' ڈیو نے مختصراً کہا۔

''ان کو دیکھو۔'' بصیرہ نے ایک افریقی خاتون کی طرف دیکھا، ''کالی بھجنگ، ناک نقشہ بے انتہا بھونڈا۔ سر پر یہ بڑا سا پگڑ اور کس ٹھسّے سے بیٹھی ہیں جیسے ملکۂ حُسن ہوں۔''

''ہوسکتا ہے کہ اپنے ملک کے معیار سے یہ ملکۂ حُسن ہوں۔'' سمن نے کہا۔

''توبہ کرو۔'' بصیرہ نے کہا۔ ''یہ کسی بھی معیار سے ملکۂ حُسن نہیں ہوسکتیں۔''

''ہوسکتی ہیں۔'' ڈیو نے بڑے یقین سے کہا۔ ''مثلاً اب وہ مجھے ذرا بھی بدشکل نہیں لگ رہی بلکہ ایک طرح سے....'' ڈیو مناسب الفاظ ڈھونڈ رہا تھا۔

''خوب صورت، پری کی طرح۔'' سمن نے لقمہ دیا۔

''نہیں خیر..... مگر پُرکشش تو یقیناً۔'' ڈیو نے کہا۔

''خدا تم پر رحم کرے۔'' بصیرہ ہنسی۔

''یہ جو ٹرالیوں میں پورے پورے کنبے بیٹھے جارہے ہیں یہ زیادہ تر عرب ہیں، تم نے غور کیا؟'' سمن نے موضوع بدل دیا۔

''ظاہر ہے انھیں کے پاس اتنا پیسا ہے کہ سامان خود گھسیٹنے کے بجائے ٹرالیوں میں پھریں۔'' بصیرہ نے کہا۔

''اور تم نے دیکھا کہ ساری ٹرالیوں کی ڈرائیور عورتیں ہیں؟'' ڈیو نے کہا۔

''ہاں واقعی، یہ تو میں نے دیکھا ہی نہیں تھا۔'' سمن نے کہا۔

''آپ زیادہ متعجب نہ ہوں۔ امریکا میں اسکول اور پبلک بسیں عموماً عورتیں چلاتی ہیں۔'' ڈیو نے کہا۔

''اور مرد کیا کرتے ہیں؟'' سمن نے پوچھا۔

''مرد!.......مرد زیادہ تر بھاری کام کرتے ہیں فیکٹریوں میں اور ٹرک وغیرہ چلاتے ہیں یا ملک چلاتے ہیں۔''

''اوفوہ.....آ گئی نا اکڑ۔ ہر مرد عورت کے مقابلے میں خود کو برتر بنانا چاہتا ہے چاہے وہ ڈیو میاں ہی کیوں نہ ہوں جو عورتوں کے حقوق کے لیے ان کے ساتھ جلوسوں میں جاتے ہوں۔'' سمن نے کہا۔

''بھئی.......میں نے تو سیدھی سی ایک بات کہی، تمھارے اپنے احساسِ کمتری نے اُسے کچھ اور معنی دے دیے۔''

''اچھا اب سیدھے سیدھے اپنے گیٹ نمبر کا رُخ کرو ایسا نہ ہو کہ جہاز نکل جائے۔'' بصیرہ نے تنبیہا کہا۔

ڈیو نے گھڑی دیکھی اور تینوں تیزی سے اپنے گیٹ کی طرف بڑھے۔ اس جہاز میں بھی بصیرہ اوپر فرسٹ کلاس میں چلی گئی۔ ڈیو اور سمن کی نشستیں پاس پاس تھیں۔ تیسری سیٹ خالی تھی۔ چلتے ہی مشروب ملا۔ پھر دوپہر کا کھانا۔

''جہاز میں کھانے پینے پر کس قدر زور ہوتا ہے۔'' سمن نے کہا۔

''ایک تو مسافروں کا وقت کٹ جاتا ہے، دوسرے دنیا جہان کے مسافر ایک سے دوسرے جہاز میں آتے جاتے رہتے ہیں، کسی بے چارے کے لیے صبح کا ناشتا ہوتا ہے، کسی کے لیے رات کا کھانا۔ اب ہم اس وقت دوسری مرتبہ لنچ کھائیں گے۔''

''مجھے تو بالکل بھوک نہیں ہے۔'' سمن نے کہا۔

''جہاز میں کھانا شغل کے طور پر ہوتا ہے۔'' ڈیو نے کہا، ''جتنا جی چاہے جو جی چاہے کھاؤ، نہ کھاؤ تو ہوٹلوں کی طرح پچھتاوا نہیں ہوتا۔''

سمن کے کھانے پر ''مسلم فوڈ'' کا لیبل چسپاں تھا۔ یہ انتظام ضمیر صاحب نے بصیرہ اور سمن کے لیے کروایا تھا۔ ڈیو، سمن کو ایلومنیم کے ڈبے میں لپٹا کھانا کھولتے دیکھتا رہا۔ ڈبا بے حد گرم تھا، مشکل سے کھلا۔ اندر موٹے چاول، ہلدی سے زرد مرغی، زیرہ ملے بسکٹ، رول اور رائتہ تھا۔ سمن نے صرف رول اور رائتہ کھایا۔

ڈیو دل وجان سے اپنا کھانا کھاتا رہا۔ آس پاس کے سارے مسافر اپنی ٹرے خالی کرنے پر تلے ہوئے

تھے۔ خدا معلوم سب کے سب بھوکے ہیں یا وقت کاٹنے کے لیے دل لگا کر کھا رہے ہیں۔ ثمن نے سوچا۔

ابھی تک ثمن کی گھڑی میں پاکستان کا وقت تھا۔ جب اس پر نظر پڑتی، خیال آتا امی کیا کر رہی ہوں گی۔ زندگی میں پہلی مرتبہ وہ بالکل تنہا تھیں۔ ہر مرتبہ ثمن کے دل میں تیر سا گڑتا۔ اس عمر میں انھیں تنہا چھوڑنا کیا اس کے لیے مناسب تھا؟ احساسِ جرم سے وہ اندر ہی اندر سکڑ سی جاتی۔

''ڈیو! کیا وقت ہے؟'' اس نے ڈیو کی گھڑی کا وقت جاننا چاہا۔

''کہاں کا وقت؟'' ڈیو نے پھلوں کے قتلے کھاتے ہوئے پوچھا، ''فضا میں کوئی وقت نہیں ہوتا۔ ایمسٹرڈیم کا وقت کچھ اور ہے، پاکستان کا کچھ اور، امریکا کا بالکل الگ۔ بحرِ منجمد شمالی کے جس حصے سے ہم گزر رہے ہیں وہاں کے برفیلے ریچھوں کے پاس شاید کوئی وقت ہو۔''

''تمھاری گھڑی میں کہاں کا وقت ہے ابن الوقت؟'' ثمن نے قدرے بگڑ کر پوچھا۔

''پاکستان میں پاکستان کا تھا، ایمسٹرڈیم میں ہالینڈ کا تھا۔ جہاز چلتے ہی میں نے امریکا کا وقت کر لیا تھا۔''

''تب تو میں نے ابن الوقت ٹھیک کہا نا۔ اچھا امریکا کا وقت بتاؤ۔'' ثمن نے کہا۔ ''اب تو وہی ہمارا وقت، وہی ہمارا نصیب ہے، خدا جانے کب تک کے لیے۔''

''افوہ، کس قدر رقت تم نے طاری کر رکھی ہے۔'' ڈیو ہنسا۔ ''سنو، گھڑی کو صرف ایک گھنٹے پیچھے کر لو۔ امریکا کا دن ہوگا تو پاکستان کی اگلی رات۔''

''کتنی عجیب بات ہے۔'' ثمن نے کہا، ''میں اس وقت حال میں ہوں اور امی مستقبل میں۔ اگر میں اس وقت انھیں فون کروں تو وہ جمعہ میں ہوں گی اور میں جمعرات میں۔''

''ہاں، ان کے لیے وہ حال میں ہوں گی اور تم ماضی میں۔'' ڈیو نے کھانا ختم کر کے کافی کی پیالی اُٹھالی۔

''مجھے پہلے بھی ایک مرتبہ ایسا تجربہ ہوا۔'' ثمن نے کہا، ''میں سوال جواب کے ایک پروگرام کے لیے ٹی وی اسٹیشن گئی۔ یہ پروگرام اس وقت ریکارڈ ہو رہا تھا اور بعد میں دکھایا جانے والا تھا۔ اس میں مجھے ایک انعام ملا۔ انعام کا ڈبا لیتے وقت اور گھر آتے میں سارے راستے میں سوچتی رہی کہ اس میں کیا ہے۔ گھر میں آ کر کھولا تو اس میں ایک ہیئر ڈرائر اور شلوار قمیص کے سوٹ کا کپڑا تھا۔ میں نے وہ سوٹ سی لیا۔ جس دن یہ پروگرام ٹی وی پر دکھایا گیا میں اتفاق سے وہی سوٹ پہنے بیٹھی تھی۔ خود کو وہ ڈبا لیتے ہوئے دیکھ کر مجھ پر ایک عجیب سی کیفیت گزری جو میں کبھی نہیں بھولوں گی...... اس یک وقت میں ماضی اور مستقبل میں موجود تھی۔ ڈبا ہاتھ میں لیے میں سوچ رہی تھی کہ اس میں کیا ہے اور

اسکرین کے سامنے میں اسی کپڑے کا سوٹ پہنے بیٹھی تھی جو ڈبے میں بند تھا اور جس کی موجودگی کا بھی مجھے علم نہ تھا۔'' ثمن جوش سے بولتی رہی، ''اس سے پہلے بھی یہ باتیں سنتی تھی مگر سمجھ میں نہیں آتی تھی۔ بعض اوقات بات سمجھ میں دیر سے آتی ہے، ہے نا؟''

''ہاں.....اور کبھی کبھی وقت گزر جانے کے بعد۔'' ڈیو نے کافی کی چسکی لی اور ثمن کو نظر بھر کے دیکھا۔

''کیا معنی؟''

''معنی یہ کہ سوچ لو، ایسا نہ ہو کہ میری بات تمھاری سمجھ میں اتنی دیر سے آئے کہ میں ماضی میں رہ جاؤں اور تم مستقبل میں چلی جاؤ۔''

''جانے کیا بک رہے ہو؟ میرا دماغ کام نہیں کر رہا۔ جسم کے ساتھ ذہن بھی بے حد تھکا ہوا ہے۔ لگتا ہے سیکڑوں سال سے جہاز میں سفر کر رہی ہوں، نیند کے مارے الگ برا حال ہے۔''

''خیر، تھکے ہوئی تو سبھی ہیں مگر میری بات ٹالنے کے لیے تمھیں بہانہ مل گیا ہے۔'' ڈیو نے کہا۔

''میں ذرا ٹانگیں سیدھی کر کے آتی ہوں۔'' ڈیو کی لمبی ٹانگیں پھلانگ کر وہ آنل میں چلتی غائب ہو گئی۔

لنچ کے برتن اُٹھاتے ہی فلم دکھانے کے لیے کھڑکیوں کے پردے کھینچ دیے گئے مگر یوں لگا جیسے لمبے سفر پر آنے والوں کو سونے کا بہانہ دیا گیا ہو۔ اندھیرے میں سب آڑے ترچھے پڑے سوتے رہے۔ ثمن اور ڈیو کے حصے میں ڈیڑھ سیٹ آئی اس لیے وہ نسبتاً آرام سے رہے۔ فلم دیکھنے والوں میں وہ چند لوگ تھے جو ایمسٹرڈیم سے تازہ دم سوار ہوئے تھے۔

شکاگو آنے سے پہلے لوگ منھ ہاتھ دھو تیار ہو بیٹھے۔ شکاگو کے اوہیر ایئرپورٹ پر اسرار صاحب کی جائیداد کا انتظام سنبھالنے والے امریکن میاں بیوی بصیرہ کو لینے آئے تھے۔ لانکولا اسپتال، جہاں بصیرہ کے دل کا آپریشن ہونا تھا، ان کے اوک پارک کے مکان سے زیادہ دور نہیں تھا۔ بصیرہ کا قیام اسی مکان کے اُوپری حصے میں ہوگا۔ انھوں نے بتایا۔ ادھیڑ عمر کے میاں بیوی شکل وصورت سے ہی منتظم نظر آ رہے تھے۔ بصیرہ نے ان سے اپنا فون نمبر لے کر ثمن اور ڈیو کو دیا۔ ثمن کے پاس ابھی کوئی فون نمبر نہیں تھا۔ اس نے یونی ورسٹی آف الی نوائے، اربانا میں اپنے ٹھکانے پہنچ کر اس کو فون کرنے کا وعدہ کیا۔ محض احتیاطاً بصیرہ نے ڈیو سے اس کا نمبر لیا۔

بصیرہ کے رخصت ہونے کے بعد ڈیو اور ثمن مسافروں کے ہجوم سے گزرتے اربانا جانے والے جہاز کے حصے میں آئے۔ اربانا لے جانے والا منا سا جہاز بے دست و پا باہر کھڑا نظر آیا۔ ابھی جہاز میں سوار ہونے کا اعلان نہیں ہوا تھا۔ گنتی کے مسافر انتظار یہ میں کرسیوں پر اپنا چھوٹا موٹا سامان لیے بیٹھے تھے۔

''اب بھی کہو تو میں تمھیں تمھاری یونی ورسٹی تک چھوڑ آؤں۔'' ڈیو نے ایک مرتبہ پھر پیش کش کی۔

''نہیں۔ مجھے اپنا کام خود کرنے دو پلیز۔'' سمن نے لجاجت سے کہا، ''اب تک تم نے میری جتنی مدد کی ہے اس کے لیے میں دل سے شکر گزار ہوں۔''

''اچھا، واقعی!'' ڈیو، سمن کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اس کی طرف جھکا۔ سمن بیدِ مجنوں کی شاخ کی طرح کانپی لرزی اور پھر مضبوط ہوگئی۔

''سوچ رہی ہوں۔'' اُس نے کہا۔ ڈیو نے کچھ دیر انتظار کیا، مگر سمن نے بات آگے نہ چلائی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟'' ڈیو نے پوچھا۔

''ہم کچھ دن نہ ملنے کا تجربہ کر کے دیکھیں۔'' سمن نے آہستہ سے ڈیو کا ہاتھ اپنے کندھے سے ہٹایا۔

''کیوں؟'' ڈیو حیران ہوا۔

''آزمائش کے لیے کہ ہماری........'' قبل اس کے کہ ڈیو کچھ کہے، اس نے جلدی سے کہا، ''ہماری دوستی کتنی مضبوط ہے۔''

''بیگم صاحبہ! جب آدمی اپنی اپنی مشکلات اور مصیبتوں میں گرفتار ہو تو ملنے کا سوچنا اور مل سکنا ہی دوستی کا امتحان ہے نہ کہ علاحدگی...... علاحدگی تو اسی دن ہوگئی تھی جب تم نے اپنی امی کو میرا رشتہ قبول نہ کرنے کی ہدایت کردی تھی۔''

''کیا بکواس کر رہے ہو؟'' سمن چڑ کر بولی۔ وہ جلدی سے کرسی پر بیٹھ گئی۔ کھڑے ہوئے تو واقعی وہ اس پر چھائے چلا جاتا ہے۔

''غلط کہہ رہا ہوں؟'' وہ برابر کی کرسی پر جم گیا۔ ''مجھے تو معلوم ہے وہ مجھے دل سے پسند کرتی ہیں۔ امریکا آنے سے پہلے تمھاری شادی ہو جاتی تو وہ بہت خوش ہوتیں۔ مزے سے یہاں آ کر تمھارے ساتھ رہتیں۔''

''وہ خوش نہیں ہوتیں۔'' سمن نے اصرار سے کہا۔ ''تم اُنھیں نہیں جانتے، ساری زندگی تو میں اُن کے ساتھ رہی ہوں۔ ساری عمر انھیں میری وجہ سے طعنے سننے پڑے ہیں۔ آخر میں ہار کر انھوں نے کہہ دیا کہ تمھارا جی چاہے سو کرو، مگر مجھے معلوم ہے کہ دنیا کے یہ طعنے کہ ان کی بیٹی نے ایک امریکن سے شادی کر لی، ان کی جان لے لیں گے۔''

''یہ تو ہوئی ان کی بات، اب اپنی بات بتاؤ۔'' ڈیو نے کہا۔

''اپنی بات کیا؟'' سمن نے معصومیت سے پوچھا۔

''اچھا، اب بات اُڑانے لگیں۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرو۔'' ڈیو نے کہا۔

''آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہوں۔ سچی بات سنو گے؟'' ثمن نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''ہاں'' ڈیو نے کہا۔

''یقین کرو...... میں بے انتہا بے یقینی کی کیفیت میں ہوں، اسی لیے تو چاہتی ہوں کہ ہم کچھ دن بالکل نہ ملیں۔''

''اچھا، ایک وعدہ کرو کہ جب تم بے یقینی کی کیفیت سے نکل کر یقین تک پہنچو گی تو پھر خود کو دھوکا نہیں دو گی۔ جس دن تمھیں میری اور اپنی محبت کا یقین ہو جائے اُس دن ضرور مجھے بتا دو گی چاہے میں جہاں ہوں...... وعدہ!'' اس نے اپنا لمبا چوڑا ہاتھ آگے بڑھایا۔

''اس شرط پر کہ ہم کم از کم چھ مہینے تک بالکل نہیں ملیں گے۔'' ثمن نے کہا۔

''فون تو کر سکتا ہوں۔'' ڈیو نے پوچھا۔

''شاید......'' ثمن نے بے یقینی سے کہا۔

''دیکھو، اگر اربانا پہنچ کر تم نے مجھے فون نہ کیا تو میں سیدھا وہاں آن پہنچوں گا، کسی نہ کسی طرح تمھیں ڈھونڈ لوں گا اور سارے معاہدے ختم ہو جائیں گے۔''

''اچھا میں وہاں پہنچ کر جیتے ہی تمھیں فون کروں گی۔''

جہاز میں سوار ہونے کا اعلان ہو چکا تھا۔ مسافر اپنے تھیلے اُٹھا کر چلنا شروع ہو گئے تھے۔

''اچھا خدا حافظ۔'' ثمن نے اپنا ممولا سا ہاتھ آگے بڑھایا۔

''میں بھی دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم کتنے دن خود کو دھوکا دے سکتی ہو۔'' ڈیو نے ہاتھی کے پیر جیسے ہاتھ میں دھیرے سے اس کا ہاتھ دبایا اور چھوڑا تو ثمن لمحے بھر میں جہاز کی راہ داری میں غائب ہو گئی۔

عورتوں کی کانفرنس اور زنا بالجبر کے آرٹ کے نمونوں نے اسے چت کیا یا شاید ذہنی طور پر وہ پہلے ہی اس بیماری کے لیے تیار تھی۔ اُس دن ثمن تھک ہار کر بستر پر پڑی تو پھر اُٹھ نہ سکی۔ تھکن نے اُسے گرایا تھا مگر ذہنی تنہائی اور کانفرنس کے مالیخولیا نے ایسی پٹخنی دی کہ بخار اس پر چڑھ بیٹھا۔

ہاسٹل ڈارم کے چھوٹے سے کمرے کے صوفہ بیڈ پر پڑے ہوئے اسے خیال آیا کہ لاکھوں طلبہ کے اس یونی ورسٹی ٹاؤن میں ایک بھی تو ایسا نہیں جس کو یہ فکر ہو کہ وہ زندہ ہے یا مر گئی، بھوکی ہے یا کچھ کھایا پیا ہے۔ ہٹی کٹی ہے یا پلنگ سے لگ گئی ہے۔ کوئی ایک شخص یا شخصیت جس کو اپنی بپتا سنا سکے یا جس سے مدد کی درخواست کر سکے۔

پی ایچ ڈی سے پہلے کورس ورک کرنے کے لیے اس نے گرمی کی چھٹیوں میں کورس لے لیے تھے۔ ہفتے میں بیس گھنٹے، اسسٹنٹ شپ کا کام الگ تھا۔ اس سے اکتا کر اپنے خیال میں ایک ذرا تفریح کی خاطر اس نے سوچا کہ نیشنل ویمن اسٹڈی پروگرام کے تحت ہونے والی کانفرنس میں شرکت کی جائے۔ ایشین اسٹڈیز میں پولیٹیکل سائنس کے پروفیسر نے جو کئی سال اسلام آباد میں رہ کر آئے تھے، اس کانفرنس کے بارے میں اسے بتایا تھا۔ ان کی بیوی اس کانفرنس میں مڈل ایسٹ کے بارے میں پیپر پڑھ رہی تھیں۔ بے حد مشکل نام والی بھارتی لیکچرر بھی اس کانفرنس میں حصہ لے رہی تھیں۔

رجسٹریشن کے لیے فلوریڈا ہال پہنچی تو وہاں بے حد گہما گہمی تھی۔ گرمی کی چھٹیوں میں لڑکیوں کے کمرے زیادہ تر خالی تھے اس لیے مختلف ملکوں اور شہروں سے آئی جانے والی خواتین وہاں ٹھہرائی جا رہی تھیں۔ یہ خواتین سامان ڈھو ڈھو کر کمروں میں لے جا رہی تھیں۔ کچھ پست ہو ہو کر سامان کے ڈھیر کے نزدیک زمین پر پڑی تھیں۔ ایک قطار اپنے کمروں کی چابیاں اور دیگر معلومات حاصل کرنے کاؤنٹر کے سامنے کھڑی تھی۔ جو یہ کام کر چکی تھیں وہ سامان لے کر اوپر جا رہی تھیں۔ کچھ فراغت سے کھڑی باتیں کر رہی تھیں۔ ایک بڑے سے بل بورڈ پر مختلف پیغامات درج تھے۔ کانفرنس کے بلّے لگائے منتظمین عورتیں ہر جگہ مستعد تھیں۔

معلوم ہوا رجسٹریشن کی جگہ سامنے کی عمارت میں ہے۔ سڑک پار کر کے وہاں گئی۔ رجسٹریشن کے لیے خواتین لمبی لمبی قطاروں میں کھڑی تھیں۔ مختلف میزوں پر بیٹھی رضا کار خواتین ہر طرح کے مسئلے حل کرنے میں مصروف تھیں۔ رجسٹریشن صرف ایک دن کی کروائی کیوں کہ نہ اس کے پاس اتنا وقت تھا نہ مال کہ پوری کانفرنس میں حصہ لیتی۔ یہاں نہ صرف رجسٹریشن، بلکہ کھانے پینے اور بس کے ٹکٹ تک کے پیسے دینے پڑ رہے تھے۔ جب کہ اپنے ملک کی کانفرنسیں مفت بلاوے سے ہوتی تھیں۔

دوسرے دن بہت سویرے اُٹھ کر پیدل ہی چل دی۔ مکینوں کی تو خبر نہیں لیکن مکان ضرور سوئے سوئے لگ رہے تھے۔ درخت بھی جیسے غنودگی میں تھے مگر چلبلی چڑیاں چوکس اور چہچہاتی ملیں۔ فلوریڈا ہال میں پہلے دن کی گہما گہمی کے مقابلے میں سناٹا تھا۔ کمرے میں درمیانی میزوں پر خواتین کے بارے میں بے شمار کتابیں، کتابچے اور رسالے رکھے تھے۔ کانفرنس کے لوگو بنی ٹی شرٹیں بکاؤ تھیں۔ دیوار سے لگی کرسیوں اور صوفوں پر چند خواتین کانفرنس کے پروگراموں کی ضخیم کتاب پر نشانات لگا رہی تھیں۔ وہ بھی بڑی عمر کی ایک خاتون کے پاس ٹک گئی اور اپنی کتاب پر نشان لگانے لگی۔ سارے پروگراموں میں کسی کا بھی حصہ لینا ناممکن تھا۔ عورتیں اپنی مرضی کی تاریخ، کلچر، تفرقوں کی وجوہ، حال اور مستقبل کے امکانات کھوج رہی تھیں۔ اولڈ ویمنز لیگ سے لے کر نوعمر لڑکیوں کی مشکلات تک سیکڑوں موضوعات تھے۔ جنوبی

ایشیا، مشرقِ وسطیٰ اور افریقا کی عورتوں کے بارے میں لیکچر جدا تھے۔ آرٹ کی نمائشیں، موسیقی کی نشستیں، فلمیں، ڈرامے الگ۔ اپاہج عورتوں کے گروپ کے لیے بھی بہت کچھ تھا۔ ہم جنسیت کے بارے میں پہلے پہل کب سنا تھا، سمن کو یاد نہ تھا۔ مگر یہاں کھلم کھلا اس پر باتیں ہو رہی تھیں۔ وڈیو ٹیپ بھی دکھائے جانے والے تھے۔ اس سیشن میں جا کر دیکھے، سمن نے سوچا مگر ہمت نہ ہوئی...... کسی نے دیکھ لیا تو!...... یہ کسی کون تھا؟ کوئی یہاں اسے اتنی اچھی طرح نہ جانتا تھا، نہ اس کے بارے میں فکرمند تھا پھر اسے کس کا ڈر تھا؟ خدا جانے کس کا؟ اپنے کلچر سے آدمی کن بندھنوں میں بندھا ہوتا ہے کون جانے!

''عورتوں کے بارے میں مطالعہ اور سوشل تبدیلیاں۔'' سمن نے ایک جگہ نشان لگایا۔ بین الاقوامی تحریکوں پر سے گزر کر انگریزی خواتین ناول نگاروں کے ناول۔ دلچسپی سے اس نے پڑھا۔ رچرڈسن کی ''پامیلا'' سے پہلے جسے انگریزی کا پہلا ناول مانا جاتا ہے، خواتین سو ناول لکھ چکی تھیں جنھیں نظرانداز کیا گیا۔ یورپین ادب اور کلچر کو پھلانگ کر وہ مشرقِ وسطیٰ میں خواتین کے موضوع تک پہنچی اور وہاں نشان لگایا۔

پاس بیٹھی عمر رسیدہ خاتون اُٹھیں تو وہ بھی اُٹھ کھڑی ہوئی اور ''ہائے'' کہہ کر ساتھ ساتھ ہو لی۔ وہ بے تکلفی سے باتیں کرنے لگیں تو اس نے سوچا، دنیا اسے کتنا ہی آزاد خیال سمجھے مگر اسے خوب معلوم ہے کہ وہ ہمیشہ تحفظ کی تلاش میں رہتی ہے۔ اپنے خاندان میں وہ کئی باتوں میں خاتونِ اوّل سہی مگر دوسرے ملکوں کی لڑکیوں اور عورتوں سے مقابلہ کرتی تو لگتا کہ اس کی ساری عمر یوں گزری ہے جیسے دو ہاتھوں کے بیچ دیا جل رہا ہو۔

وہ پیدل یہاں تک آئی تھی اور بس کا ٹکٹ لینا چاہتی تھی۔ اس کی ساتھی خاتون جو جم شوز پہن کر آئی تھیں، پیدل چلنا چاہتی تھیں۔ ان کے ساتھ کو اس نے بس کے آرام پر ترجیح دی اور باتیں کرتی پیدل چلتی رہی۔ وہ خاتون اوکلوہاما سے آئی تھیں اور نوبوکو کی کتاب ADA پر تحقیق کر رہی تھیں۔ آگے پیچھے چھوٹے موٹے گروہوں میں یا تنہا خواتین قانون، طب، تعلیم اور تجارت کے مختلف ڈیپارٹمنٹ میں ہونے والی نشستوں کی طرف جا رہی تھیں۔

اس کی پہلی نشست لا کالج کے کمرہ نمبر ڈی میں تھی۔ یا تو ''خواتین کی بدلتی تاریخ اور اس کے شعور'' کا موضوع اہم تھا یا یہ وجہ تھی کہ منتظم خواتین میں سے دو بڑی اہم ہستیاں یہاں موجود تھیں۔ سمن نے سامعین میں ایک کمسن عرب لڑکی کو حجاب میں ملبوس دیکھا جو بچہ گاڑی میں ایک چھوٹے سے بچے کو لیے بیٹھی تھی۔ اس کے سامنے میز پر کانفرنس کی فائل کے برابر میں بچے کے دودھ اور جوس سے بھری دو بوتلیں دھری تھیں۔ وہ لڑکی بذاتِ خود عورتوں کی بدلتی تاریخ اور اس کے شعور کی بے مثل مثال تھی لیکن کسی نے اس کی طرف دھیان نہ دیا۔ لیکچر دینے والی بے حد باتونی اور چلبلی خاتون وکٹورین

عورتوں کا مذاق اُڑاتی رہیں جو ناقابلِ یقین حد تک باعصمت، بے جنس اور بے دست و پا تھیں، جو کسی بات کو رد کرنا جانتی ہی نہیں تھیں۔ مردوں کا یہ عالم تھا کہ ہنری جیمس صاحب نے پانچ جلدوں کی اپنی سوانح میں کوئی پرائیویٹ بات نہ لکھی۔ دوبارہ دیکھنے کے بعد صرف ایک باب کا اضافہ کیا۔ وکٹورین عورتوں کی ہم جنسی کے رجحانات پر بحث کرتے ہوئے انھوں نے ایل نوروز ویلٹ اور ورجینیا وولف کو لپیٹا اور ان کی تحریریں اور خطوط ثبوت میں پیش کیے۔ خاتمہ یہ تھا کہ آج کی عورت اپنے بدن سے شرمسار نہیں ہے۔ وہ اس پر اپنا حق چاہتی ہے۔ اس کی چھاتیاں اس کے بچوں کی ملکیت نہیں ہیں۔ اس کی کوکھ اس کی اپنی ہے اس لیے اسے بچہ پیدا کرنے یا گرانے کا حق ہے اور جنس میں صاف گوئی اور ایمان داری فرسودہ روایات سے زیادہ اہم ہے۔

دوسری نشست کے سامعین میں زیادہ تر عرب اور ایرانی خواتین و حضرات تھے۔ خواتین حجاب میں تھیں یا لمبے سائے اور طویل موزے پہنے ہوئی تھیں۔ ایک ایرانی خاتون نے موجودہ ایران کی تبدیلیوں کے بارے میں مضمون پڑھا جس نے سامعین کو خاصا پژمردہ کیا۔ ''چادر اوڑھو یا کوڑے کھاؤ'' خواتین کے لیے اعلانِ عام۔ بے حجاب نظر آنے والیوں کو پچھتر (۷۵) کوڑے تک لگائے جاسکتے ہیں۔ بیگار کیمپوں میں لے جاکر بے گار بھی کروائی جائے گی۔ مرگ بر بے حجاب کے نعرے عام ہیں اور متعہ اور صیغہ بھی۔ چند گھنٹوں سے لے کر ننانوے سال تک کے نکاح جو غریب عورتیں مالی بدحالی سے مجبور ہو کر کرتی ہیں۔ کم عمر لڑکیوں کے نکاح کرنے کی وجہ سے بچوں کی تعداد بڑھ رہی ہے وغیرہ...... عورتیں نوکری چھوڑ دیں تو شوہروں کی تنخواہ میں اضافہ کردیا جائے گا۔ ایک امریکن خاتون نے عرب خواتین میں ختنے کی رسم کے بارے میں مضمون پڑھا جس نے سارے ہال میں سناٹا دوڑا دیا۔ خواتین سے لیے ہوئے انٹرویوز سے اقتباسات دہشت ناک تھے۔ کم عمر لڑکیوں کی ختنہ کے علاوہ نکاحی مردوں کا دوسروں کے سامنے اپنی نوعمر بیویوں سے زبردستیوں کا ذکر سن کر جیسے سمن کے سر میں سارا خون جم کر رہ گیا۔

یہاں سے آرٹ گیلری گئی تو ڈھاٹے باندھے خوف ناک چہرے، سُرخ خونی آنکھیں، وحشت انگیز شکلیں، خون آشام چاقو، چھریاں، دہشت زدہ معصوم لڑکیوں کے چہرے دیکھے۔ زنا بالجبر کے آرٹ کے نمونوں میں بیچ بیچ کے ایک کیک میں خنجر دھنسا ہوا تھا۔ نیچے درج تھا A piece of cake..... اسے اپنے ملک کی معصوم لڑکیاں یاد آئیں۔ دشمنی میں ایک گاؤں کے لوگ دوسرے گاؤں پر حملہ کرتے تھے اور کھلے بندوں عورتوں کے ساتھ زیادتی کرتے تھے۔

ساتھی خاتون رات کو تھیٹر میں ڈراما دیکھنا چاہتی تھیں لیکن سمن معذرت کرکے اپنے کمرے میں چلی آئی۔ آخری لیکچر اور آرٹ کے بھیانک نمونوں نے اسے تھکا دیا تھا جیسے وہ ہزاروں میل چلی ہو۔ وہ اپنے

بستر پر بے دم سی پڑ گئی۔ عورتوں کی بے بسی اور اپنی تنہائی پر کڑھتی اور روتی رہی۔ یہاں تک کہ بخار نے آ گھیرا۔ صوفہ نما بیڈ میں ذرا سی درمیانی جگہ کے بعد دیوار میں بڑی سی میز نصب تھی جس پر ٹیلی فون رکھا تھا۔ چاہتی تو استقبالیہ میں فون کر دیتی۔ ڈیوٹی کلرک اسے ڈاکٹر کے پاس لے جانے کا انتظام کر دیتی۔ گول گھومنے والی کرسی کے پاس اسٹوو پر کیتلی میں چائے کا پانی موجود تھا۔ بغیر زیادہ ہلے جلے چائے بنا کر دراز سے اسپرین نکال کر کھا سکتی تھی مگر خود رحمی نے رونے کا راستہ سجھا دیا تھا۔ پہلے ہلکے ہلکے روئی اور پھر پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیا۔ برابر برابر کمرے تھے، آمنے سامنے بھی کمرے تھے۔ دو کمروں کے بیچ ایک غسل خانہ تھا، شاید کوئی تو سنے گا، کوئی تو آئے گا، مگر کوئی نہ آیا۔ سب اپنے اپنے کاموں، اپنے اپنے عذابوں میں مبتلا تھے۔ روتے روتے سوچتی رہی کہ گھر میں امی اس کی سسکی بھی سن لیتیں تو اُن کی جان نکل جاتی۔ بیماری میں وہ کسی پاجی بچے کی طرح ضدی بن جاتی۔ اس کے بستر کے سرہانے کی میز پر مختلف قسم کے سوپ، جوس، ہارلکس اور اوولٹین دودھ کی پیالیوں اور گلاسوں کے ڈھیر پڑے رہتے جن کو وہ منہ لگا لگا کر چھوڑتی جاتی اور یہاں کوئی حلق میں پانی ٹپکانے والا بھی نہیں تھا۔

اچانک فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ بصیرہ کا فون تھا۔

''کیا کر رہی ہو؟''

''کچھ نہیں۔'' ثمن نے کہا۔

''تمھاری آواز بھاری ہے، رو رہی ہو کیا؟'' بصیرہ نے مذاقاً کہا۔

''ہاں۔'' ثمن بولی۔

''کیا ہوا؟''

''سخت بخار ہے، کوئی پوچھنے والا نہیں۔'' ثمن نے کہا۔

''پوچھنے والوں کو دور رکھتی ہو اور پھر روتی ہو، تم بھی خوب ہو۔'' بصیرہ نے کہا

''ہاں، اسی لیے تو آج امی بہت یاد آ رہی تھیں۔ تم نے کیسے فون کیا؟''

''میں نے اپنے ڈاکٹر سے کہا کہ مرنے سے پہلے نیاگرا فال دیکھنا چاہتی ہوں۔ بڈھا بولا، تم میرے ہاتھ سے تو مرو گی نہیں، مگر چاہتی ہو تو جاؤ پہلے فال دیکھ آؤ، بڑا پیارا بڈھا ہے قسم سے۔''

''کب جا رہی ہو؟''

''کل، تم بھی چلو۔'' بصیرہ اس کی بیماری کے بارے میں بھول چکی تھی۔ اُسے تو بالکل پروا نہیں، سوچ کر ثمن کے دل کو دھکا سا لگا۔

''کیسے جا سکتی ہوں، بتایا تو بخار ہے۔ ویسے تو سمر کورس کے ختم ہونے کے بعد دو ہفتے کی

چھٹیاں تھیں۔'' سمن نے اور بے بسی طاری کی۔

''بھئی کچھ کرو۔'' بصیرہ بولی۔

''کیا کروں؟'' سمن نے برا مانا۔

''بخار کو اُتارو۔'' بصیرہ نے کہا، ''بہت ضروری ہے۔''

''بھوت اور بخار میرے بس میں نہیں ہیں، تم اُتار سکو تو اُتار دو۔'' سمن نے چڑ کر کہا۔

''اچھا ایسا کرو، تم بعد میں آ جانا۔ میں ہوائی جہاز سے جا رہی ہوں۔ ہوٹل میں کمرہ بک کروالیا ہے، تم اس کا فون نمبر لکھ لو۔''

''مگر......'' سمن نے کہنا شروع کیا۔

''تم لکھو تو۔'' بصیرہ نے کہا۔

سمن نے نمبر لکھا۔

''میں اکیلی کسی طرح نہیں آ سکتی۔'' اس نے کہا، ''میرے پاس کار ہے نہ ہوائی جہاز کا کرایہ۔''

سمن بخار میں ویسے ہی بھُن رہی تھی۔ اس کا جی چاہ رہا تھا، اپنی ان رانی دوست کو جلی کٹی سنائے جس کے لیے ہر بات بے حد سادہ اور آسان ہوتی ہے۔

''ارے وہ تمھارا امریکن عاشق کہاں ہے؟ اسے پکڑو!''

''فضول باتیں مت کرو۔'' سمن نے بھنا کر کہا۔

''اچھا، مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا، تم آرام کرو۔'' بصیرہ نے کہا۔

''تم کیا کرو گی؟'' بات سمن کے منھ میں تھی کہ بصیرہ نے فون بند کر دیا۔

سمن نے پھر رونا شروع کر دیا۔ روتے ہوئے خود اسے اپنے رونے پر غصہ آ رہا تھا۔ اسے کیا ہوتا جا رہا ہے؟

وہ تو سمجھ رہی تھی، اب بڑی مضبوط ہو گئی ہے مگر لگتا ہے کہ اس کی شخصیت اتنی ہی بودی ہے جتنی پہلے تھی۔ ٹھیک کہتے ہیں لوگ، عمارت کی بنیاد ناقص رہ جائے تو عمارت کو کمزور ہی کہا جائے گا۔ جگہ جگہ سجاوٹی ستون بنانے سے اس کی کمزوری چھپ تو سکتی ہے مگر دور نہیں ہو سکتی۔ ایسی عمارتیں طوفان تو کیا مہاوٹیں بھی نہیں سہہ سکتیں۔

سوچتے سوچتے ذرا سی آنکھ لگی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

''کون؟'' سمن نے حیران ہو کر پوچھا۔

''پدما!'' ایک لڑکی کی میٹھی سی آواز آئی۔ یہ آواز اور یہ نام اُس نے پہلے کبھی نہیں سنا تھا۔

ہانپتی کانپتی اُٹھی، دروازہ کھولا۔ ایک لمبی سی ہندوستانی لڑکی سیاہ سیدھے پجامے اور فراک نما قمیص میں کھڑی تھی۔

''میرا نام پدما ہے، مائیکی میرا منگیتر بھی آیا ہے۔ اصل میں مائیکی کو ڈیو نے فون کیا کہ تم بیمار ہو، جا کر تمھیں دیکھیں۔ مائیکی کو بلا لوں؟''

''ضرور'' مجبوراً سمن کو کہنا پڑا۔ یہ ضرور بصیرہ کی کارستانی ہے۔ اُس نے سوچا۔ اس کو ہر ایک کے معاملے میں دخل دینے کا شوق ہے۔ ابھی جو اس لیے تڑپ رہی تھی کہ کوئی پوچھنے والا نہیں اب پدما اور مائیکی کے آنے پر پریشان تھی۔ بھلا اس چوہیا کے بل میں اس حلیے میں ان لوگوں سے پہلی مرتبہ ملنے کی تک ہے۔

مائیکی اندر آیا اور دروازے میں کھڑے کھڑے ہاتھ بڑھا کر سمن سے مصافحہ کیا۔ پھر ایک جھرجھری لی۔ ''اوہو، بہت تیز بخار ہے واقعی۔'' مائیکی نے کہا۔

''آنکھیں کتنی سرخ ہو رہی ہیں۔'' پدما نے فکرمندی سے کہا، ''ہم تمھیں ڈاکٹر کے پاس لے جانے آئے ہیں۔''

اب سمن نے آنا کانی شروع کی مگر دونوں نے ایک نہ سنی۔

''مائیکی! تم نیچے بیٹھو، میں دو منٹ میں انھیں تیار کروا کے لاتی ہوں۔'' پدما نے کہا۔

مائیکی کے جانے کے بعد پدما نے سمن کے اشارے پر سرہانے لگی الماری سے لٹکے ہوئے کپڑے اسے تھمائے۔

تیار کروا کے ایلی ویٹر سے اسے نیچے لائی۔ ہال میں مختلف صوفوں پر کہیں پڑا کوئی سو رہا تھا، کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔ چند لڑکے لڑکیاں ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ وہیں مائیکی بیٹھا تھا۔ انھیں دیکھ کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ پدما نے اس کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال دیا۔ تینوں نیچے سڑک تک آئے۔ سمن گاڑی میں پیچھے بیٹھ گئی۔ پدما اور مائیکی آگے بیٹھے۔ گاڑی چلانے سے پہلے مائیکی نے پدما کو پیار کیا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ سمن کو لگا جیسے اُسے دوبارہ سردی لگ کر بخار چڑھنے والا ہو۔

''پہلے کبھی یونی ورسٹی کلینک جانا ہوا؟'' پدما نے پلٹ کر پوچھا۔

''نہیں۔'' سمن نے جواب دیا۔

''وہاں دوا ہر مرض کے لیے ایک ہی ملتی ہے۔'' پدما نے ہنس کر کہا، ''کیوں مائیکی ٹھیک ہے نا۔''

''ہاں، مگر اس سے فائدہ ہو جاتا ہے۔'' مائیکی نے کہا۔ ''یہ بڑی عجیب بات ہے۔''

دوا لے کر لوٹے تو وہ اس کے منع کرنے کے باوجود اس کے کمرے میں ٹھنس کر بیٹھ گئے۔ پدما نے

اسے دوا پلائی اور پھر مائیکی کی انگلیوں میں انگلیاں پھنسا کر اسے یوں تھام کر بیٹھ گئی جیسے وہ کہیں بھاگا جا رہا ہو۔ جیسے ہی اس کی انگلیوں کی گرفت نرم ہوئی مائیکی نے اس کے سانولے ہاتھ کی پشت پر ہلکا سا بوسہ دیا۔ باتیں کرتے کرتے پدما دھیرے سے مسکرائی اور باتیں کرتی رہی۔

''سنو، ہمارے اپارٹمنٹ کے پاس ایک لڑکی رہتی ہے۔ وہ کسی ساتھی لڑکی کی تلاش میں ہے۔ تم اگلے سمسٹر وہاں اُٹھ آؤ، چھوڑو اس قبر کو۔ ہم بھی یہاں ایک ایک سمسٹر بھگت چکے ہیں..... ہے نا!''

پدما مائیکی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکرائی۔ مائیکی بھی مسکرایا۔

''ڈیو کو فون کر کے بتانا ہوگا کہ ہم نے اپنی ڈیوٹی دے دی ہے۔'' مائیکل نے کہا۔ ''تمھارے لیے کیا کہوں؟'' اس نے سمن سے پوچھا۔

''میرا شکریہ کہہ دینا اور یہ کہ میں ٹھیک ہو جاؤں گی۔ معمولی بخار ہے، کوئی خاص بات نہیں۔'' سمن نے کہا۔

''مگر ڈیو تو بہت پریشان تھا۔ اس کی آواز میں جو concern تھا نا اس سے میں سمجھ گیا کہ کوئی بات ہے اور یہ بھی کہ تم..... شاید ہماری والی پہلی اسٹیج سے گزر رہے ہو۔ دُور رہ کر بھولنے کی کوشش، ٹھیک ہے نا!''

سمن کا گلابی پڑتا رنگ دیکھ کر پدما نے مائیکی کی خبر لی۔

''پہلی ہی ملاقات میں تمھیں ایسی باتیں نہیں کرنی چاہییں۔'' پدما نے اسے انگریزی میں ڈانٹا، پھر سمن سے ہندی میں کہا، ''مجھ سے بھی کوئی اس طرح بولتا تو مجھے بہت کھراب لگتا۔''

''اچھا چلو، انھیں آرام کرنے دو۔'' مائیکی نے کہا۔

''ہم پھر آئیں گے۔'' پدما اُٹھ کھڑی ہوئی۔ سمن نے نوٹ کیا، پدما اور مائیکی کا قد ایک تھا۔ لڑکی ہونے کے ناتے وہ مائیکی سے لمبی لگتی تھی۔ نہ جانے اس میں ایسی کیا بات تھی کہ سمن کو بہت عرصے پہلے کی پڑھی راجندر سنگھ بیدی کی کہانی ''لمبی لڑکی'' یاد آئی۔ لڑکی کو اس کی نانی ہمیشہ جھکانے کی کوشش کرتی ہے تا کہ شادی کے لیے دیکھنے والوں کو وہ زیادہ لمبی نظر نہ آئے۔ کئی سال شوہر کے ساتھ رہ کر بھی جب وہ واپس آتی ہے تو نانی وہی حرکت کرتی ہے، اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے جھکانے کی کوشش......

ہم لوگ جن باتوں کو اہمیت دیتی ہیں کیا وہ واقعی اہم ہیں۔ قد کی اہمیت ہے، گورے رنگ کی اہمیت ہے، مذہب، کلچر، ہم صوبہ، ہم زبان، ہم وطن ہونے کی؟ یا محبت؟ بخار زدہ ذہن نے ایک بار پھر پسپا کر دیا اور وہ آنکھیں موند کر بے سدھ سی پڑ گئی۔

صبح سو کر اُٹھی تو بخار کم تھا مگر ناشتے کے لیے نیچے جانے کی ہمت نہ ہوئی۔ چھوٹا سا اسٹوو زمین

پر رکھا تھا۔ کیتلی میں پانی بھر کر اس پر رکھ دیا۔ چائے کے ساتھ دو چار بسکٹ کھا کر دوا پی لی جائے، اس نے سوچا۔ کمرے کی واحد کھڑکی سے باہر دیکھا۔ رائٹ اسٹریٹ کی پچھلی گلی ہمیشہ کی سنسان تھی۔ سڑکوں کے کنارے پر کھڑے درخت ہرے بھرے تازہ پتوں سے اٹے کھڑے تھے۔ اُن کے سائے میں پلنے والی گھاس اکھڑی اکھڑی سی تھی۔ لال نیلی دھاری والی ایک ڈاک گاڑی نظر آئی۔ دوسری گاڑیوں کے برعکس ان گاڑیوں کی ڈرائیونگ سیٹ دائیں طرف اس لیے ہوتی ہے کہ وہ دائیں طرف گھروں کے آگے لگے ڈاک کے ڈبوں میں باآسانی ڈاک ڈالتے چلے جائیں۔ شاید امی کا خط آیا ہو۔ اس نے دل میں سوچا۔ پھر اسے اپنے شہر کا میلوں پیدل چل کر آنے والا ہانپتا کانپتا ڈاکیا یاد آیا جس سے ممن کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی شکایت رہی۔ امی نے عید، بقر عید پر عیدی بھی ہمیشہ کلیجہ نوچنے کے بعد ہی دی۔ حالاں کہ وہ بے چارہ کتنی محبت سے خط ہاتھ میں دیا کرتا تھا جب کہ یہاں کی گاڑی والیاں عمارتوں کی دیوار میں لگے ٹین کے ڈبوں کے ٹھنڈے بے جان خانوں میں ساری ڈاک ٹھونس جاتی تھیں۔ جب کھول کر نکالو تو بے شمار فضول ڈاک کے بیچ اپنے پیاروں کے خطوط کھو سے جاتے تھے۔

چائے کا پانی ابل گیا تھا۔ چائے بنانے اُٹھی تو لڑکھڑائی۔ امی ایسے میں بھلا اسے اُٹھنے دیتیں۔ بمشکل چائے پینے بیٹھی تو اپنی اور ماں کی تنہائی کے احساس سے پھر آنکھیں بھر آئیں۔ وہ ماں کو جدائی کا صدمہ سہنے کے لیے چھوڑ کر یہاں کیوں آئی؟ امان کے نام سے بچنے کے لیے یا اس لیے کہ عورتوں کے گرد گھٹن کا حصار تنگ ہوتا جا رہا تھا..... یہ تو پہلے بھی تھا کہ اگر آپ عورت ہیں تو کوئی بھی مرد آپ کی بے عزتی کر سکتا ہے، بدتمیزی سے بول سکتا ہے۔ چھپے ہوئے، گلے ہوئے ٹماٹر ٹھیلے والے کو چپ چاپ تھیلے میں ڈالتے دیکھتی جائیے۔ سیکڑوں مکھیوں سے اٹا، چھیچھڑوں سے بھرا گوشت چپ چاپ لے جائیے ورنہ قصائی اپنی تیز چھری جیسی زبان سے لمحے بھر میں آپ کی زخمی انا کی بوٹیاں بنا کر سب کے سامنے ڈھیر کر دے گا..... مگر اب کچھ دنوں سے جو دیواریں اُٹھائی جا رہی تھیں وہ غیر مرئی ہوتے ہوئے بھی بہت ٹھوس تھیں۔ ان غیر مرئی ٹھوس دیواروں کو قبول نہ کرنے والیوں کے ساتھ اور زیادتیاں بھی کی جا سکتی تھیں۔ ان کی عزت اور زندگی بھی خطرے میں ہو سکتی تھی۔ کیا واقعی؟...... یا محض یہ بات تھی کہ وہ اسکول کی معمولی نوکری نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اسے آگے بڑھنے کا شوق تھا۔ وہ ننانوے کے پھیر میں پڑ گئی تھی!

بونے بابا اسے بچپن کی کہانیاں بھی سنایا کرتا تھا، کہانیاں نہیں آپ بیتیاں۔ بونا بابا کو شاید لکھنا نہیں آتا تھا مگر کہانیاں کہنے کا ہنر آتا تھا۔ وہ ہندوستان میں پٹیالہ ریاست کے کسی ایسے قصبے میں رہا تھا جہاں بہت سی تاریخی جنگیں لڑی گئی تھیں۔ شہیدوں کے پنجوں کے خون بھرے نشانات ابھی تک مزاروں میں موجود تھے۔ سر کٹے شہید چلتی گاڑیوں میں چڑھ اور اُتر جاتے تھے۔ اندھے گہرے کنویں

ابھی تک نعشوں کے نمک سے کھاری تھے اور انگریزوں کے ادھ جلے ٹینک کھیتوں کے کنارے گڑے ہوئے تھے۔ اسی قصبے کے پاس ویرانے میں کہیں ایک سیاہ فام پہاڑ تھا جس کے کوئلے جیسے کالے مگر سخت پتھر کے بیچ سونے کے ذرّے جڑے ہوئے تھے۔ سونے کی کان کے بیچوں بیچ ہرے پانی کی ایک تہ سی جمی ہوئی تھی۔ کئی مرتبہ حکومت نے اور مختلف ٹھیکے داروں نے اس سنگِ خارا سے سونا جدا کرنے کی کوشش کی تھی مگر سونا نکالنے کا خرچ ہمیشہ سونے کی مقدار اور اس کی قیمت سے زیادہ ہوتا تھا۔ چناں چہ سونا نکالنے والے جلد ہی دل چھوڑ جاتے تھے۔ بونے بابا چھوٹے تھے۔ انھیں یہ بات پتا نہ تھی۔ صرف اتنا معلوم تھا کہ یہ سونا کھرا ہے۔ چناں چہ سونا پانے اور امیر بننے کے شوق میں انھوں نے بہت سے کالے پتھر لا کر گھر میں چھپا دیے تھے۔ گرمیوں کی بھلستی دوپہروں میں جب ان کی امی سو جاتی تھیں تو وہ کالے پتھر کڑچھے میں ڈال کر اُپلے کی آگ پر رکھ دیتے۔ آنچ کو تیز تر کرنے کے لیے سوکھی گھاس، خشک شاخیں اور بے کار کاغذ جلاتے مگر وہ پتھر ذرا ٹس سے مس نہ ہوتا۔ ایک مرتبہ غصے میں پتھر کو ہاتھ سے نکال کر پھینکا تو اُن کا ہاتھ جل گیا۔ سونے کے یہ نہ نکلنے والے ڈلے اب تک بونے بابا کے دل کے نہاں خانے میں گڑے ہوئے تھے۔ شاید وہ بھی بونے بابا تھی جو ٹھنڈے کڑچھے میں پتھر پگھلانے کی کوشش میں مصروف تھی۔

''ٹھک ٹھک......ٹھک......''

''کون؟''

''پدما۔''

''اوہ.....'' سمن نے دوڑ کر دروازہ کھولا۔ پدما اور مائیکی اس کے لیے گرما گرم ناشتہ لیے کھڑے تھے۔

''یہیں کھاؤ گی یا نیچے؟''

''یہیں۔'' سمن نے کہا۔

پدما سمن کے پاس صوفہ نما بیڈ پر بیٹھ گئی۔ مائیکی میز کے سامنے رکھی واحد کرسی پر ٹک گیا۔ سمن ناشتا کرنے لگی۔ پدما اسے بے تکلفی سے بتاتی رہی کہ مائیکی سے اس کی دوستی کس طرح ہوئی۔ چار پانچ لڑکے لڑکیوں کا گروپ تھا جو ہر وقت ساتھ رہتا تھا۔ اس گروپ کی ایک لڑکی سے پدما کی دوستی ہوئی اور وہ بھی اسی گروپ میں شامل ہوگئی۔ پدما سے پہلے اس کی دوست شانتی کو اندازہ ہوا کہ مائیکی اس میں دلچسپی لے رہا ہے۔ شانتی نے ایک مرتبہ شرطیہ کہا کہ مائیکی پدما سے پیار کرنے لگا ہے۔ یہ کہہ کر پدما نے پیار سے مائیکی کی طرف دیکھا۔ مائیکی پیار بھری مسکراہٹ مسکرا دیا۔ پدما امریکا میں بالکل خوش نہیں تھی اور واپسی کے لیے پر تول رہی تھی۔ اس نے شانتی کی اس بات کو

اہمیت نہیں دی اور آخر کار ہندوستان واپس جانے کا فیصلہ کرلیا۔ یہ خبر سن کر مائیکی گھبرایا ہوا آیا اور پروپوز کیا۔ پدما نے کہا، وہ دو الگ دنیاؤں کے رہنے والے ہیں۔ وہ ہمیشہ کے لیے اپنے ملک جا رہی ہے۔ شاید وہ ایک دوسرے کو کبھی دیکھیں گے بھی نہیں۔ مائیکی اُداس ہوگیا مگر پدما نے اپنا دل مضبوط رکھا۔ اندر اندر سے وہ بھی دُکھی تھی۔

عجیب بات ہے کہ مائیکی کو چھوڑ کر چلے جانے میں اسے تکلیف نہیں ہوئی لیکن گھر پہنچتے ہی اس کی یاد ستانے لگی۔ اس کی ایک ایک بات یاد آتی۔ پدما پھر مائیکی کی آنکھوں میں جھانکی، مائیکی پھر پیار سے مسکرایا۔ مائیکی کی دُکھی آنکھیں، اس کا سُوکھا مکھ پدما کو یاد آتا اور یہ بات کہ اب وہ کبھی اسے نہ دیکھے گی، اس سے نہ ملے گی۔ تب اسے لگتا کہ جیسے اُس نے اپنی بہت قیمتی من چاہی چیز کھو دی ہو۔ کسی بات میں دل نہ لگتا۔ اس کی ماں بار بار پوچھتیں۔ ''کیا بات ہے پدما! تم کھش نہیں ہو؟''

پدما کہتی، ''ماں میں کھش ہوں۔'' پر ماں تو ماں ہی ہوتی ہے۔ اسے پتا چل گیا کہ کوئی بات ضرور ہے۔ اُس نے ایک دن بڑے پیار سے کسم دے کر پوچھا۔ پدما نے ساری بات سچ سچ بتا دی۔ پتا ہے ماں نے کیا کہا، ماں بولی، ''تم واپس چلی جاؤ پدما۔ اُس لڑکے سے ابھی کچھ مت بولو۔ اس کو دیکھو، پرکھو، یہاں اس کے بنا رہنے کا تجربہ تو کرلیا نا۔ اب اُس کے پاس رہ کر دیکھو۔ سوچو، سمجھو۔ سوچ کے دل اور دماگ سے جو فیصلہ کرو گی وہ مجھے اور تمھارے پتا جی کو منجور ہوگا۔ ہم اس میں کھش ہوں گے، وشواس رکھو...... تم بچی نہیں ہو، ہم نے تمھیں بہت اچھی ایجوکیشن دی ہے۔ تمھیں باہر جانے کا چانس ملا ہے، ہر طرح سوچنے سمجھنے کی آجادی ہے تو کیسے ہوسکتا ہے کہ تمھیں ٹھیک آدمی کی جانچ نہ ہو۔ آدمی ٹھیک ہونا چاہیے، بھلے کہیں کا ہو۔'' ماں کی یہ بات گرہ میں باندھ کر پدما واپس آگئی۔ اس نے ظاہر کیا کہ وہ پڑھائی ختم کرنے آگئی ہے۔ مائیکی کو دیکھتی رہی، پرکھتی رہی۔ جب وشواس ہوگیا کہ وہ بھلا آدمی ہے، سیریس ہے جیسے کہ اس کی مما نے کہا، ٹھیک ہے تب اس نے ہاں کرلی اور دونوں نے منگنی کا اعلان کردیا۔

''منگنی پر یہ چھلا مائیکی نے مجھے دیا۔'' پدما نے اپنی انگلی میں پڑا چھلا فخر سے دکھایا۔

''شادی کب ہو رہی ہے؟'' سمن نے پوچھا۔

''میں تو کہتا ہوں کر ڈالو مگر یہ راضی نہیں ہوتی۔'' مائیکی نے پدما کی طرف دیکھا۔

''بھئی، ابھی پڑھائی کے بیچ شادی کیسے کرسکتے ہیں؟'' پدما نے کہا، ''اتنے کام کرنے ہوتے ہیں شادی میں، ذرا فرصت ہوگی تو اطمینان سے بیٹھ کر ہر چیز کی فہرست بنائیں گے۔ تم بھی مدد کرو گی نا؟''

''ضرور'' سمن نے کہا۔ ناشتے کے برتن سمیٹ رہی تھی کہ پدما نے اس کے ہاتھ سے لے لیے۔

''لاؤ، مجھے دو میں دھو کر رکھ دیتی ہوں۔''

"نہیں نہیں.....رکھ دو ایسے ہی، میں دھولوں گی۔ یہاں برتن دھونے کا کوئی انتظام نہیں، غسل خانے میں دھونے ہوں گے۔" سمن نے کہا۔

غسل خانہ اندر سے بند تھا۔ دوسرے کمرے کی لڑکی گئی ہوئی تھی۔

"اچھا پھر ہم چلتے ہیں۔" برتن میز پر رکھ کر وہ کھڑی ہوگئی۔ مائیکی بھی اُٹھ کھڑا ہوا۔

"ڈیو سے بات ہوئی تھی؟" ڈرتے ڈرتے سمن نے پوچھا۔

"نہیں۔ اُس نے فون کیا تھا مگر ہم لوگ ملے نہیں۔ آج میں خود فون کروں گا۔" مائیکی نے کہا۔

"بائی بائی۔" پدما اور مائیکی نے کہا اور دروازہ بند کرتے ہوئے چلے گئے۔

ذرا دیر بعد پدما نے پھر دروازے پر دستک دی۔

"دیکھو، تم اب سارا دن آرام کرنا۔ تمھارا کھانا نیچے ریفریجریٹر میں ہوگا۔ جب دل چاہے مائیکرو ویو میں گرم کر کے کھالینا، بلاوجہ تھکنے کی ضرورت نہیں۔ او کے۔"

"تھینک یو۔" سمن نے کہا۔

"یو بیٹ....." پدما امریکن انداز سے کہتی بھاگ گئی۔ چند سیڑھیاں نیچے زینے پر مائیکی اس کا منتظر تھا۔

سہ پہر تین بجے تک سمن پڑی سوتی رہی۔ آنکھ کھلی تو یکایک محسوس ہوا کہ اس کی طبیعت بہتر ہے۔ بخار بھی نہیں تھا۔ گلے میں درد بھی نہیں تھا۔ دوا اور نیند دونوں شاید اسے راس آ گئی تھیں یا پدما اور مائیکی کی تیمارداری۔ کوئی پوچھنے والا تو تھا، ڈیو کے حوالے سے ہی سہی۔ وہ پدما اور مائیکی کے بارے میں سوچتی رہی۔ چند ماہ میں کسی ملک کی سائیکی کے بارے میں کیا کہا جاسکتا ہے؟ یہاں جو نئی نسل پروان چڑھ رہی تھی اس کے بارے میں بھی اور ملک کے عام حالات کی بابت بھی وہ سخت اُلجھن میں تھی۔ وہ جو سمجھتی آئی تھی کہ امریکا میں مذہب وزہب کا کوئی ذکر نہیں ہے، دیکھتی تھی کہ ہر سڑک کے ہر کنارے پر ایک مختلف چرچ موجود تھا۔ شادی دوبارہ "اِن تھنگ" ہوگئی تھی۔ بڑی زوروں کی چھ چھ دن چلنے والی شادیاں ہو رہی تھیں۔ اپنی ایک ساتھی لڑکی کی شادی میں اس نے شرکت کی تھی۔ لڑکی کا تعلق اُس چینی نسل سے تھا جو دو نسلوں سے یہاں آباد تھی۔ لڑکا جو اس کے ساتھ پڑھتا تھا یہودی تھا۔ شادی میں عبرانی زبان کی آیتیں اور چینی روایتیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ پانچ سو آدمی اس میں شریک تھے۔ طرح طرح کی بولیاں بولی جارہی تھیں اور اسی دن بس میں اسے پندرہ سالہ ایک لڑکی ملی تھی جو دو بچوں کو ساتھ لیے جارہی تھی۔ ایک گاڑی میں لیٹا ہوا تھا، دوسرا اس کے کندھے پر لٹکے ہوئے تھیلے نما پٹی کے ذریعے اس کی چھاتی سے چمٹا ہوا تھا۔ ایک اس کا اپنا بچہ

تھا، دوسرے کی وہ بے بی سٹنگ کرتی تھی۔ اس وقت دونوں کو اسپتال لے کر جا رہی تھی۔ وہ اپنے سترہ اٹھارہ سالہ بوائے فرینڈ کے ساتھ رہتی تھی۔ وہ کہیں کام کرتا تھا۔ فارغ اوقات میں اس کے ساتھ کھانا پکواتا اور بچوں کی دیکھ ریکھ میں مدد کرتا تھا۔ وہ لڑکی خود کو خوش قسمت سمجھتی تھی کہ اس کا بوائے فرینڈ اس کے ساتھ رہتا تھا ورنہ زیادہ تر لڑکے ماں بننے والی لڑکیوں کو چھوڑ کر بھاگ جاتے تھے۔

نیچے جا کر کھانے کے ساتھ وہ آج کی ڈاک لائی۔ امی کا خط نہیں تھا مگر ڈیو کا تھا۔

سنو میری سپرنووا!

زندگی کی ابتدا اور ارتقا کا ستاروں کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ زمین پر موجود بعض ایٹم بتاتے ہیں کہ نظامِ شمسی بننے سے کچھ پہلے ایک سپرنووا دھماکا ہوا...... تارے جو عظیم کاسموسی دھماکوں کے ساتھ ٹوٹتے رہتے ہیں سپرنووا کہلاتے ہیں۔ اس دھماکے کے زنجیری دھماکوں سے نظامِ شمسی وجود میں آیا اور سورج کی پیدائش کے بعد اس کی حراری قوتوں سے وہ مرکب آرگینک مولی کیول (organic molicule) بنے جن سے زندگی کی ابتدا ہوئی۔ چناں چہ زمین کا ارتقا لاکھوں نوری سال دُور ستاروں کی موت کا مرہونِ منت ہے۔

میں ان دنوں بے حد تھکن محسوس کر رہا ہوں۔ قدم اُٹھانا دوبھر ہے۔ لگتا ہے جیسے کسی نے زمین کی کشش کو بہت بڑھا دیا ہے۔ شاید ہر انسان کے اپنے اندر کے جذباتی مدّو جزر اس کے لیے زمین کی کشش کو کم یا زیادہ کر دیتے ہوں جبھی تو کچھ لوگ ہوا میں اڑتے ہوئے لگتے ہیں اور کچھ زمین میں پیر دھنساتے چلتے ہیں۔ سوچا، ہوسکتا ہے دور بیٹھے تم کسی لیور سے زمین کی کشش کی قوت بڑھا رہی ہوں why not?..... لاکھوں نوری سال دور سپرنووائی دھماکے انسانی ارتقا پر اثر ڈال سکتے ہیں تو تم سے مجھ تک آنے والی ذہنی یا جذباتی رویں اثر کیوں نہیں ڈال سکتیں؟ ثبوت موجود ہے کہ تم بیمار ہو....... اب میری ذہنی صحت کے بارے میں تمھارا شک یقین میں بدل رہا ہے نا؟

میرے دل کے ستارے کہتے ہیں، بہت جلد کچھ ہونے والا ہے۔ ہوشیار رہنا۔

تمھارا ڈیو..........

بیماری نے ثمن کے دماغ کو سن کر رکھا تھا۔ نیند کی دوائیں اُسے مزید سلا رہی تھیں۔ اس لیے ڈیو کا خط اسے گورکھ دھندا سا لگا۔ پھر کبھی فرصت میں اسے دوبارہ پڑھے گی۔

خط ایک طرف ڈال کر وہ اُٹھی، چائے بنائی، دوا کھا کر دوبارہ لیٹ گئی اور ایسی غافل سوئی کہ دوسرے دن صبح کی خبر لائی۔

ٹیلی فون کی تیز آواز سے آنکھ کھلی تو لمحہ بھر ثمن کو خبر نہ ہوئی کہ وہ کہاں ہے اور کیا ہو رہا ہے۔

حواس بجا ہوئے تو اس نے بند آنکھوں سے فون کا ریسور اُٹھا کر نیند سے بھاری آواز میں ہیلو کہا۔
''آپ کے مہمان آئے ہیں۔'' ریسپشن سے کسی نے کہا۔
سمن نے آنکھیں کھول کر کھڑکی پر نظر ڈالی۔ پردے کے پیچھے صبح کا اُجالا کہیں دور سے جھانک رہا تھا۔ ''مہمان! اتنے سویرے؟ سمن کے منھ سے بے اختیار نکلا۔
''خود بات کرلیں۔'' دوسری طرف سے جواب ملا۔
درمیانی ایک لمحے میں بھی سمن کا سویا ذہن سوچتا رہا، کون ہو سکتا ہے؟ دھیان مائیکی اور پدما کی طرف گیا مگر دل نہ مانا۔ شاید کوئی بری خبر؟۔ دل پتے کی طرح کانپا۔
یکایک دوسری طرف سے ایک نہایت مانوس مگر غیر متوقع آواز سنائی دی۔ خوشی سے کھنکتی، صبح کی ہوا سے تازہ دم، ''سوری سمن! تمھیں اتنے سویرے اُٹھا دیا۔''
''ڈیو...... تم؟ واقعی تم، یہاں!......'' سمن کے لہجے کے بے ساختہ پن میں جو خوشی تھی وہ چھپا نہ سکی۔ پھر یکایک وہ سنبھل گئی، ''خیریت!...... تم یہاں کیسے؟''
''اب بُلاؤ گی بھی یا سارے سوال جواب فون پر ہی کروں گی؟'' ڈیو بیزار ہوا۔
''ہاں...... وہ......'' سمن نے کمرے میں چاروں طرف نگاہ ڈالی۔ بستر بے بنا تھا، چائے کی پیالی زمین پر، دوائیں میز پر پھیلی ہوئی تھیں۔ وہ خود رات کے لباس میں تھی۔ بال بکھرے، منھ بیماری سے بے مزہ۔
''تم وہیں ریسپشن یا ہال میں کہیں بیٹھ جاؤ اچھی سی جگہ دیکھ کر، میں ابھی نیچے آتی ہوں۔ دیکھو نا، میں تیار نہیں ہوں......''
''what the hell......'' ڈیو کی ناراض آواز سنائی دی مگر سمن نے فون رکھ کے فوراً نیچے جانے کی تیاری شروع کردی۔
اتنے سویرے ہال کے مختلف حصّوں میں جہاں دن بھر رونق رہتی تھی بالکل سناٹا تھا۔ ایک صوفے پر اندھے ٹی وی کے سامنے ڈیو بیٹھا تھا، خاموش اور بگڑا بگڑا۔
''ہائے سمن..... ہائے ڈیو'' تقریباً دونوں نے ساتھ کہا۔
ڈیو اُٹھ کھڑا ہوا۔ آگے بڑھا۔ پھر ٹھہر گیا کیوں کہ سمن ہال کے شروع ہی میں ٹھٹک گئی تھی۔
''تم نے مجھے نیچے بٹھا دیا، اپنے کمرے تک بھی نہیں آنے دیا۔ اس کا کیا مطلب ہے؟'' ڈیو نے شکوہ کیا۔
''مطلب وطلب کچھ نہیں ہے۔'' سمن نے ڈپلومیسی اختیار کی۔ ''اتنا چھوٹا کمرہ ہے، بالکل چوہیا

کا بل۔'' وہ آہستہ آہستہ آگے بڑھی۔'' میں خود وہاں سے نکلنا چاہتی تھی۔ یہاں کھلی جگہ میں اتنا اچھا لگ رہا ہے۔''

''خیر، تم واقعی بیمار لگ رہی ہو اس لیے کچھ نہیں کہتا۔ مگر میں خوب جانتا ہوں کہ نہ تمھیں اپنے آپ پر اعتماد ہے نہ کسی اور پر۔ یاد رکھو، اس سے کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔''

''پھر تمھاری فضول باتیں شروع ہو گئیں۔'' سمن نے چھوٹی بچی کی طرح منھ اُٹھا کر اُسے دیکھا، ''میں کب تم سے ڈری؟.....اچھا بتاؤ کیسے آئے؟''

اسے اس طرح اپنی طرف دیکھتے دیکھ کر ڈیو کا دل چاہا اسے گود میں بھر لے۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا سمن ایک قدم پیچھے ہٹی۔

''تمھیں لینے آیا ہوں بھئی۔ بصیرہ نے تمھیں نہیں بتایا؟'' ڈیو نے کہا۔

''نہیں تو......'' سمن نے کہا، ''بھئی میں زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکتی۔'' وہ صوفے پر بیٹھ گئی۔ ''اب بتاؤ کیا قصہ ہے؟''

''عجب خبطی خاتون ہے تمھاری دوست۔ مجھ سے کہا کہ سمن کو لے کر نیاگرا پہنچو تو میں سمجھا کہ تم سے یقینی بات ہوگئی ہوگی۔ صبح سویرے چونکانے کا خیال البتہ میرا تھا۔'' ڈیو بولا۔

''بات تو اُس نے کی تھی۔'' سمن نے کہا، ''مگر میں نے کہا کہ میں بیمار ہوں میرے پاس کار ہے نہ ہوائی جہاز کا کرایہ، بس بات ختم۔''

''اُس نے تمھاری دوا دارو کا انتظام کر دیا، سفر کا بندوبست بھی کر دیا۔ مجھ سے کہا۔ وہ تنہائی کی وجہ سے بیمار پڑی ہے۔ نیاگرا فال میں سب جمع ہوں گے، بڑا مزہ آئے گا۔ تم اپنے دوست مائیکی اور اس کی منگیتر کو بھی لیتے آنا۔ میں نے سوچا، سارا معاملہ تم سے طے ہو چکا، مجھے صرف تمھیں جا کر لینا ہے۔''

''بس یہی بات تو مجھے بصیرہ کی ناپسند ہے، خود ہی دوسروں کی طرف سے اُلٹے سیدھے پروگرام بناتی رہتی ہے۔'' سمن بگڑی، ''حالاں کہ میں نے اُسے بتا بھی دیا تھا کہ ابھی کچھ عرصے میرا اور ڈیو کا آپس میں ملنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔''

''شاید اسی لیے بے چاری نے پروگرام بنایا ہو۔'' ڈیو بولا، ''اُسے ہمارے یا تمھارے اُوپر رحم آ گیا ہو، آخر سب تمھاری طرح پتھر دل تو نہیں ہوتے۔ وہ تو بے چاری ویسے ہی دل کی مریضہ ہے۔''

''بچوں کی سی باتیں مت کرو ڈیو۔'' سمن نے تختی پکڑی۔

''بچوں کی سی باتیں تم کر رہی ہوں۔ اتنا وقت گنوا رہی ہو۔ ابھی شکاگو سے کینیڈا کا ویزا بھی لینا ہے۔''

''میں بیمار ہوں۔'' سمن نے کہا۔

''نہیں تم ٹھیک ہو۔ بس اب پروگرام بن چکا ہے۔ دل چاہے تو کار میں پیچھے لیٹ کر سوتی چلی جانا، میں تم سے ایک بات بھی نہیں کروں گا، اگر میری طرف سے کچھ ڈر ہے۔''

''خیر........اب اتنا بھی تم سے نہیں ڈرتی جتنا تم سمجھ رہے ہو۔'' سمن نے برا مانا۔ ''اچھا چلو، خود چل کر دیکھ لو میرا کمرہ ہے یا کبوتر کا ڈربا ہے۔''

دونوں اُوپر آئے۔ ڈیو کے وجود سے واقعی سارا کمرہ بھر گیا۔ سمن نے جلدی سے بستر کو صوفے میں بدلا۔ ڈیو نے مدد کی۔ پھر سمن نے اپنا تکیہ اور چادر اُٹھائی اور انھیں گود میں رکھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ دونوں کے پیروں میں انچوں کا فاصلہ تھا۔

''میرا دل چاہ رہا ہے بصیرہ سے فون کر کے پوچھوں کہ وہ کون ہوتی ہے میرے معاملات میں دخل دینے والی۔'' سمن نے کرسی پیچھے کر کے میز کو دھکیلا حالاں کہ میز عمارت کے ساتھ جڑی ہوئی تھی۔

''ارے بھئی کسی کو تو دخل دینے دو۔'' ڈیو پست قد صوفے کی وجہ سے سمن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کر سکتا تھا۔ ''سنو، اپنی امی کو تم دخل نہیں دینے دیتیں، مجھے تم دخل نہیں دینے دیتیں، اپنی دوستوں کو بھی نہیں بولنے دیتیں۔ آخر کب تک من مانی کرتی رہو گی؟''

''اور تم من مانی نہیں کرتے ہو۔'' سمن چڑ گئی۔ ''تم نے آج تک کسی کی بات سنی؟ مجھے تم نے یہ تک نہیں بتایا کہ پاکستان سے جو بھاگے آئے تھے کہ تمھاری مما کوئی بڑا انکشاف کرنے والی ہیں تو کیا معلوم ہوا؟''

''رابطہ نہ رکھنے کی پابندی لگاتی ہو، پھر کہتی ہو تم نے یہ نہیں بتایا، وہ نہیں بتایا۔'' ڈیو نے جوابی وار کیا۔ ''ایسی پابندی لگانے سے پہلے اپنے دل سے پوچھ لیتیں تو یہ مشکل نہ ہوتی۔'' ڈیو نے اُس کی آنکھوں میں جھانکا۔

''بڑے آئے دل والے۔'' سمن نظریں چرا گئی۔

''بس اب سب باتیں راستے میں ہوں گی، فوراً چلنے کی تیاری کرو۔ پدما اور مائیکی انتظار کر رہے ہوں گے۔'' ڈیو نے کہا۔ ''بصیرہ سے خود وہاں جا کر پوچھ لینا جو کچھ پوچھنا ہے۔''

''اچھا تم نیچے جا کر بیٹھو، میں تیاری کر لوں۔'' سمن نے کہا۔

''ارے تو میں کیا تمھیں کھا رہا ہوں؟'' ڈیو نے کہا۔

''دیکھ نہیں رہے ہو، تل بھر تو جگہ نہیں ہے۔ ابھی الماری کھولوں گی تو ساری چیزیں سر پر آن پڑیں گی۔''

''تو کون سی لمبی چوڑی تیاری کرنی ہے۔ تھیلے میں دو جوڑے کپڑے ڈالو اور چلو۔''

''دو جوڑے کپڑے رکھنے کے لیے بھی تھوڑی سی جگہ چاہیے۔ الماری تو کھولنا پڑے گی۔ پلیز، تم نیچے جا کر بیٹھو، ٹی وی دیکھو، میں ابھی آتی ہوں دو منٹ میں۔'' سمن نے کہا، ''تم یہاں ہو گے تو مجھ سے کوئی کام نہیں ہوگا۔''

''میں ٹی وی دیکھنے نہیں آیا۔'' ڈیو بولا، ''اور دیکھو، مجھے معلوم ہے کہ تم سے کام کیوں نہیں ہوگا۔''

''کیا معلوم ہے تمھیں؟'' سمن نے للکارا۔

''یہی کہ تم کام کرو گی میں تمھاری طرف دیکھتا رہوں گا۔ مارے ڈر کے تمھارے ہاتھ سے چیزیں گرتی رہیں گی اور تم کانپتی رہو گی اور ہانپتی رہو گی۔''

''اس میں ڈر کی کوئی بات نہیں ہے۔'' سمن بولی، ''بس مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں اپنا کاٹھ کباڑ نکالوں تو کوئی مجھے تاکتا رہے۔''

''میں کہتا ہوں تم بیٹھی رہو۔ مجھے بتا دو، میں تمھارا سارا سامان دو منٹ میں رکھے دیتا ہوں۔''

''جی نہیں، آپ کو نیچے جانا ہوگا۔'' سمن بضد رہی۔

''تم بھی عجیب چیز ہو، تمھاری کوئی بات میرے پلّے نہیں پڑتی۔'' ڈیو نے آنکھوں کے ڈھیلے گھمائے۔

''بالکل یہی میرے ساتھ ہے۔'' سمن نے کہا، ''اور ہاں میں نے ناشتا بھی نہیں کیا ہے ابھی۔''

''تم تیار تو ہو، راستے میں ناشتا کرلیں گے۔ دیکھو دو منٹ سے زیادہ نہ لگانا۔'' ڈیو اُٹھ کھڑا ہوا۔

''او کے، پانچ منٹ۔'' سمن نے کہا۔

ڈیو کے جانے کے بعد سمن نے جلدی جلدی سفری بیگ میں اپنے کپڑے، ٹوائلٹ کا سامان اور کیمرہ رکھا۔ پرس لیا اور نیچے آ گئی۔

''مجھے چکر آ رہے ہیں مارے کمزوری کے۔'' سمن نے کہا۔

''فکر مت کرو۔ بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی، نیاگرا فال کے درشن کرو گی تو۔'' ڈیو نے کہا۔ ''تمھارے لیے تو صرف کمزوری کے چکر ہیں، ہمارے لیے تو ہزاروں چکر ہیں۔''

''مثلاً؟'' سمن نے پوچھا۔

''ایک تو تم نے ہی گھن چکر بنا رکھا ہے۔'' ڈیو نے کہا، ''باقی باتیں بعد میں، اب چلو۔''

دونوں ساتھ ساتھ باہر آئے۔ ڈیو کی نئی کار نیچے کھڑی تھی۔

''کب خریدی؟'' سمن نے پوچھا۔

''میں نے کہاں خریدی، مما نے دلوائی۔بیٹھو۔''

سمن، ڈیو کے برابر میں بیٹھ گئی۔ڈیو نے گاڑی چلائی۔کریزٹ آرٹ سینٹر کے پاس ایک گلی میں مڑ کر چھوٹے سے کار پارک میں گاڑی کھڑی کی۔

''پدما کا گھر ہے یا مائیکی کا؟'' سمن نے پوچھا۔

''چل کر دیکھتے ہیں۔'' ڈیو نے کہا۔

دونوں سیڑھیاں اُوپر چڑھے۔ڈیو نے ایک دروازے پر دستک دی۔مائیکی نے دروازہ کھولا۔

''آؤ، آؤ۔میں ناشتا کر رہا ہوں۔'' اُس نے اعلان کیا۔

بیٹھنے کا کمرہ بڑا تھا جس میں ایک بڑا صوفہ سیٹ اور چند کرسیاں تھیں۔ایک ٹی وی اور کافی ٹیبل کے علاوہ دو ایک چھوٹی میزیں بھی تھیں۔

''باورچی خانے میں چلے آؤ۔'' مائیکی چھوٹے سے باورچی خانے میں میز پر جا کر ڈٹ گیا۔

سمن اور ڈیو بھی کھانے کی کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''سمن نے ابھی ناشتا نہیں کیا ہے۔'' ڈیو نے اعلان کیا، ''اور ہم سے تو کوئی پوچھ ہی نہیں رہا ہے کہ کب چلے اور کب پہنچے۔''

''پدما!'' مائیکی نے پکار کر کہا، ''ڈیو اور سمن آ گئے ہیں۔''

''اچھا۔'' گیلے بالوں کو جھٹکتی پدما بیڈ روم سے نکلی۔ڈیو کی بات اس نے سن لی تھی۔''مائیکی تم نے ان دونوں سے ناشتے کے لیے پوچھا بھی نہیں۔'' گھر والیوں کی طرح پدما نے مائیکی کو ڈانٹا۔

مائیکی نے کندھے اُچکا دیے۔

''تم دونوں یہیں ہمارے ساتھ ناشتا کرو۔میں ناشتا بناتی ہوں''۔پدما نے کہا۔سمن اس کی مدد کو اُٹھی تو اس نے کہا، ''نہیں نہیں، تم بیٹھنے کے کمرے میں جا کر آرام سے بیٹھو، ابھی بیماری سے اُٹھی ہو۔تم بھی اپنا ناشتا لے کر وہیں جاؤ مائیکی۔ڈیو میری مدد کرے گا۔''

''جو حکم۔'' مائیکی نے اپنا ناشتا اُٹھایا اور کافی ٹیبل گھسیٹ کر اس پر رکھ کر ناشتا کرنے لگا۔سمن پاس کے دوسرے صوفے پر بیٹھ گئی۔ڈیو نے توس ٹوسٹر میں ڈالے۔

''سمن راستے میں مجھ سے پوچھ رہی تھی کہ ہم پدما کے گھر جا رہے ہیں یا مائیکی کے۔'' ڈیو نے کہا اور سمن کی طرف دیکھ کر شرارت سے مسکرایا۔

پدما اور مائیکی ہنس پڑے۔سمن سرخ ہو گئی۔پھر اسے خود پر غصہ آیا۔بن بیاہے ساتھ رہنے والے تو شرما نہیں رہے پھر میں کیوں شرماؤں۔اُس نے چاہا وہ کچھ کہے۔مگر کوئی ڈھنگ کی بات

بروقت نہ سوجھی اور وہ چپ رہی۔

''ہم دونوں نے منگنی کے کچھ دن بعد ساتھ رہنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔'' مائیکی نے کافی کا گھونٹ بھر کے بڑی سنجیدگی سے کہا۔

''ہاں......'' پدما کیتلی میں چائے ڈالتے ہوئے انگریزی میں بولی، ''اس بات پر میرے کچھ ہم وطن مجھ سے بہت ناراض ہیں مگر میری جوتی کی نوک سے.... میرے اور مائیکی کے خیال میں ساتھ رہنے کا فیصلہ ایک کمٹ منٹ ہے، شادی سے پہلے کریں یا شادی کے وقت، اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔''

تمھارے والدین کو معلوم ہے کہ تم ساتھ رہتے ہو؟ سمن کا جی چاہا پوچھے مگر یہ سوچ کر کہ ابھی اس کی ان سے اتنی بے تکلفی نہیں ہے کہ اس قسم کے ذاتی سوال پوچھ سکے، خاموش رہی۔

پدما اور مائیکی کا سامان تیار تھا۔ ناشتا کرتے ہی انھوں نے اپنے اپنے تھیلے اُٹھائے اور نیچے آ گئے۔ ڈیو نے اپنی کار سے امریکا کی ریاستوں کے نقشے نکالے اور مائیکی سے راستے کے بارے میں گفتگو کی۔ مائیکی نے اپنی کار میں رکھے نقشے پر نشانات لگائے۔ پھر مائیکی کی کار میں پدما اور ڈیو کی کار میں سمن بیٹھی اور دونوں کاریں شکاگو کے لیے روانہ ہوئیں۔

مکیں تو مکیں اتنے سویرے مکان بھی سوئے ہوئے لگتے تھے۔ درخت تک غنودگی میں تھے البتہ چلبلی چڑیاں ہر طرح چوکس چہچہائے جا رہی تھیں۔ دور کے کھیتوں میں دھند کا سرمئی غبار تھا جو اُفق تک پھیلا ہوا تھا۔ ان کے درمیان کھیتوں میں بنے مکانات اور درخت پنسل سے بنائے گئے اسکیچ سے لگ رہے تھے۔

''لکھوکھا سال پہلے بڑا سا کوئی برفانی تودہ اس علاقے کو روندتا ہوا، پہاڑ، پہاڑیاں زمین کے برابر کرتا سیکڑوں سال میں آہستہ آہستہ جیسی اس کی عادت ہے آخر گزر گیا۔ یہاں کی زمین کو نہ صرف ہموار کر گیا بلکہ زمانے بھر کی دھاتیں جو پہاڑوں کے اندر اور زمین کے اوپر تھیں، زمین کے اندر اُتارتا یعنی اپنی زیادتی کا کفارہ ادا کرتا چلا گیا۔ سو آج تک میلوں میل تک یہ زمین ہتھیلی کی طرح سپاٹ مگر کسی نوخیز مشرقی عورت کی طرح زرخیز ہے۔'' ڈیو نے کہا، ''سن رہی ہو سمن، یہاں کوئی مصنوعی ذریعۂ آبپاشی نہیں مگر ہر سال دو فصلیں بڑی آن بان سے لہلہاتی ہیں۔''

''مگر بارشوں کی کیسی ریل پیل ہے جو باجے گاجے کے ساتھ آتی ہیں۔'' سمن نے کہا۔

''باجے گاجے؟'' ڈیو حیران ہوا۔

''میرا مطلب ہے گرج چمک کے طوفان۔ روز ٹی وی پر طوفان کا نشان سولی کی طرح لٹکا ہوتا ہے۔'' سمن نے منھ بسورا۔

''ارے تمھاری سوچ تو روز بروز منفی ہوتی جا رہی ہے۔ تمھیں کیا ہوگیا ہے؟'' ڈیو نے کہا۔

''مجھے کیا معلوم تھا کہ یہاں روز طوفان آتے ہیں، جس دن ٹورنیڈو کی وارننگ کا جھومرٹی وی پر لٹکا ہوتا ہے جان نکل جاتی ہے۔''

''بہت عزیز ہے اپنی جان! اور بھی تو لاکھوں لوگ رہتے ہیں۔'' ڈیو نے کہا۔

''ہاں کوئی بھی تو نہیں ڈرتا..... لوگ پروا بھی نہیں کرتے، اسی طرح بے فکری سے باہر پھرتے رہتے ہیں۔ پہلے دن جب ٹورنیڈو کی وارننگ میں کھڑکی سے باہر میں نے درخت کو دیکھا تو یوں لگا جیسے اس پر جن آگیا ہو۔ اتنا ڈر لگا مجھے، لیکن ڈارم میں لوگ اس طرح آجا رہے تھے جیسے کچھ ہو ہی نہ رہا ہو۔''

''عادی ہو گئے ہیں، تم بھی عادی ہو جاؤ گی۔'' ڈیو بولا۔ ''یہ اتنی ہری بھری زمین، یہ کھڑی فصلیں یوں ہی تو نہیں بن جاتیں۔''

''اچھا اب اپنی تاریخ سناؤ، کیا کہا تمھاری مما نے؟'' سمن نے پوچھا۔

''میرا خط ملا تھا؟'' جواب میں ڈیو نے پوچھا۔

''ہاں ملا۔ بخار اور زکام نے ذہن بالکل ناکارہ کر رکھا تھا۔ تمھارے خط کا ایک لفظ بھی پلے نہیں پڑا۔'' سمن نے کہا، ''کہنا کیا چاہتے تھے تم؟''

''بعض دفعہ زیادہ پڑھنے سے انسان کند ذہن ہو جاتا ہے۔ تم بے کار میں پی ایچ ڈی کرنے کے چکر میں ہو۔ میں نے ایک جگہ پڑھا تھا کہ بعض پی ایچ ڈی ڈاکٹر بے چاروں کو ان کی ذہانت سے کہیں زیادہ پڑھا دیا جاتا ہے۔'' ڈیو نے کہا۔

''تم پھر ذاتی حملہ کر رہے ہو۔'' سمن نے جوابی وار کیا، ''خیر اتنا تمھارے خط سے اندازہ ہو گیا تھا کہ تمھارے اُلجھے ہوئے ذہن کی کوئی کہانی ہے۔''

''ذہن کی کہانی نہیں بھئی، کائناتی حقیقت۔ سائنس داں کہتے ہیں کہ دو متوازی تاریخیں بھی موجود ہو سکتی ہیں۔ اگر ہم ماضی کے ایک واقعے کو بدل دیں تو پوری تاریخ بدل جائے گی۔ اس طرح دو مستقبل بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ میرا خیال ہے یعنی ایک میں ہم نیاگرا فال دیکھیں گے اور ہو سکتا ہے دوسرے میں کائنات کے گرد چکر لگا رہے ہوں۔ اگر ماضی میں سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہو کہ روشنی کی رفتار سے کچھ ہی کم رفتار سے چلنے والی گاڑیاں بن گئی ہوں......''

''میں نے بتایا نا کہ میرا دماغ بالکل بند ہے۔ تم کیوں اس سے سر پھوڑ رہے ہو۔'' سمن نے کہا۔

''بھئی دیکھو نا ایسی سائنس جس میں اتنا تخیل ہو کہ فکشن مات ہو جائے مزے دار چیز ہے یا نہیں۔ اگر ابھی ہم دونوں فضا میں سفر کر رہے ہوں تو ہم برنارڈ ستارے تک جو پتا نہیں کتنے ہزار نوری سال دور ہے صرف آٹھ سال میں پہنچ جائیں گے اور.....''

''فضول باتیں چھوڑو، یہ بتاؤ کہ تمھاری مما نے اتنی دور سے بُلا کر تمھیں کیا بتایا؟''

''ماضی کی ایک نئی تاریخ.....'' ڈیو نے اس کی طرف دیکھا۔

''کیا مطلب؟'' سمن نے پوچھا۔

''مطلب یہ کہ انھوں نے میرے ماضی کے بارے میں پہلے کچھ اور بات بتائی تھی جو میں تمھیں بتا چکا ہوں۔ اب کے وہ مجھے ایک بڑے بینک میں لے گئیں۔ سیاہ ٹائیلوں کی سیڑھیاں اُتر کر ہم ایک زمین دوز کمرے میں گئے جہاں بہت بڑے بڑے لاکر رکھے تھے۔ ایک لاکر کھول کر انھوں نے سیپ جڑے ایک بکس سے کچھ کاغذات نکالے۔ چھوٹے سے کمرے میں ایک میز کرسی پڑی ہوئی تھی، انھوں نے اُس کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہاں جا کر کاغذات کو اچھی طرح دیکھ لو۔''

''کیا میں انھیں گھر نہیں لے جا سکتا، ان کی کاپی نہیں بنوا سکتا؟'' میں نے پوچھا۔

''میرا خیال ہے یہ مناسب نہیں ہے۔'' مما رسانت سے بولیں۔ وہ ہمیشہ ایسے ہی بولتی ہیں۔ میں نے کسی کو گھر میں نہیں بتایا کہ تمھیں اپنے اصل والدین کا سراغ لگانے پر اتنا اصرار ہے۔ تمھارے والد یا بہن کو معلوم ہوگا تو انھیں بہت تکلیف ہوگی۔''

''وہیں بیٹھے بیٹھے کاغذ پر میں نے کچھ تفصیلات نقل کیں۔ مما نے کاغذات کا پلندہ واپس لا کر وہیں رکھ دیا اور مصنوعی روشنیوں کے سائے میں اس زمین دوز کمرے میں ایک اور کہانی سنائی۔ لاکر کی محافظ خاتون نے دو مرتبہ جھانک کر دیکھا مگر مما نظر انداز کر گئیں۔''

''اصل کہانی اتنی دردناک اور افسوس ناک تھی۔'' انھوں نے کہا، ''کہ تمھیں تکلیف سے بچانے کے لیے میں نے تمھیں پاکستان والا قصہ سنا دیا تھا جو بالکل سچ تھا، سوائے اس بات کے کہ وہ بچہ تم نہیں تھے۔ خیر، اصل بات یہ ہے کہ جس وقت ہم نے تمھیں گود لیا تمھاری ماں تمھیں پال رہی تھیں اور تمھارے نانا جو کہیں اور رہتے تھے اس کام میں ان کی مدد کر رہے تھے۔ تمھارے والد کا انتقال ہو چکا تھا۔ ان کے خاندان کے ساتھ تمھاری ماں کا کوئی رابطہ نہیں تھا۔ پھر کار کے ایک حادثے میں تمھاری امی کا انتقال ہو گیا۔ جس دن تمھاری امی اسپتال میں آخری سانس لے رہی تھیں تم ہمارے ہاں تھے۔ تمھارے نانا اور تمھاری سوتیلی نانی اسپتال کے چکر لگا رہی تھیں۔ جب تمھاری ماں مر گئیں تو سوتیلی نانی نے کہا کہ میں چند دن تو اس بچے کو رکھ سکتی ہوں مگر ہمیشہ کے لیے نہیں کیوں کہ میرا اس سے براہِ راست کوئی رشتہ بھی نہیں ہے نہ ہماری ایسی عمر ہے کہ ننھے سے بچے کی دیکھ بھال کر سکیں اور نہ ہم مالی طور پر خوش حال ہیں۔ جیسا کہ میں نے پہلے بھی تمھیں بتایا تھا کہ مجھے پہلے ہی دن تم پر بے انتہا پیار آیا تھا۔ جتنے دن تم ہمارے ہاں رہے بالکل پریشان نہیں کیا۔ پپا

تم پر عاشق ہو گئے۔ میگی تمھاری گرویدہ تھی۔ پیٹر بھی ہر وقت تمھارے ساتھ کھیلتا تھا۔ آخر خاصے سوچ بچار کے بعد ہم نے تمھیں گود لے لیا۔''

''مما کی بات ختم ہوئی تو ہم سیاہ ٹائلیں چڑھ کر اُوپر آئے۔ کہانی کا سحر کم ہونا شروع ہوا۔ بینک سے باہر نکلے تو اثر کچھ اور کم ہوا۔ میرا دل گواہی نہیں دے رہا تھا کہ مما کی بات سچ ہے۔ گھر پہنچتے پہنچتے یقین سے گماں تک پہنچا۔ اُدھر پیٹر جیسے میرے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اسے نہ جانے کیسے ہر بات کی خبر ہو جاتی ہے۔ اس کی فطرت ہی ایسی ہے کہ ہر بات کا کھوج رکھتا ہے۔ چناں چہ اس نے پول کھول دیا کہ مما نے میرے پیچھے کچھ کاغذات میرے گود لیے جانے کے بارے میں تیار کرائے ہیں۔ اس بات کو اس سے بطورِ خاص خفیہ رکھا گیا تھا مگر اسے معلوم ہو ہی گیا کیوں کہ اس کے اپنے لوگ بھی ہیں جو ہر بات کی خبر رکھتے ہیں۔ بہر حال جو تحقیق میں نے بعد میں کی اس سے معلوم ہوا کہ واقعہ یہ بھی سچا تھا۔ اخبار کی رپورٹ موجود تھی۔ حادثے کی تصویریں تھیں، پولیس کی رپورٹ بھی تھی مگر جس بات کا یقین نہیں تھا وہ یہی تھی کہ آیا وہ بچہ جسے سوتیلی نانی نے رکھنے سے انکار کر دیا تھا، میں ہی تھا۔ اب نانا اور نانی بھی مر چکے ہیں۔ نانی کی بیٹی کے پاس چند تصویریں پرانی موجود ہیں مگر وہ کہتی ہیں کہ ان کے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو میری تشفی کر سکے۔ اگر گود لیے جانے کے کاغذات موجود ہیں تو ان کے ہوتے ہوئے مجھے کسی اور ثبوت کی کیا ضرورت ہے؟ سو بات جہاں سے چلی تھی وہیں ہے۔ ماضی کی اس تاریخ کی اُلجھن یہ ہے کہ میں پاکستانی ہوں یا امریکن ہوں؟''

''کیا تمھیں اس بات سے کوئی فرق پڑے گا؟'' سمن نے پوچھا۔

ڈیو سوچ میں پڑ گیا۔

''بظاہر تو نہیں۔ تمھاری حد تک تو بالکل نہیں، مگر بعض صورتوں میں، مثلاً کلچرل کیا کہتے ہیں......''

''برداشت......'' سمن نے لقمہ دیا۔

''برداشت تو مجھ میں بہت ہے۔ میرا مطلب ہے.....'' ڈیو سوچ کر بولا، ''identity''

سمن نے کہا، ''پہچان یا شناخت!''

''ہاں شناخت کے لیے تو ہے۔ اُردو شاعری جو میری جڑ ہو سکتی تھی اب میرے لیے درخت کی ایک شاخ رہ جائے گی۔ تم سمجھ تو سکتی ہو نا یہ بات!''

''اور کتنے پاکستانیوں کے لیے اُردو شاعری ان کی شناخت ہے آج کل؟'' سمن نے کہا، ''لوگ اُردو نہ جاننے پر فخر کرتے ہیں۔ رہی جڑ کی بات تو خدا ہی جانتا ہے کہ کس کی جڑ کہاں ہے؟ آخر میں شاید سارے درختوں کی جڑیں کسی ایک بڑے سے درخت میں جا کر مل جاتی ہوں گی۔ اب زمین کے اندر کی

جڑوں میں رہو یا برگد کے درخت کے اوپر سے لٹکنے والی داڑھی سے لٹکے رہو۔ وہ بھی کبھی نہ کبھی دوبارہ جا کر زمین میں گڑ ہی جائیں گی۔ تم نے برگد کا درخت اور اس کی شاخوں سے لٹکتی جڑوں کو دیکھا ہے نا؟''

''ہاں۔'' ڈیو خوش ہو کر بولا، ''کبھی کبھی تم اپنے جیسی خوب صورت بات کہہ دیتی ہو اور میں حیران ہو جاتا ہوں کہ اتنی چھوٹی سی لڑکی اور اتنی بڑی بات۔''

''دیکھو، میرے قد کی بات مت کیا کرو، مجھے اس کا بہت کمپلیکس ہے۔'' ثمن نے سچائی سے کہا۔

ڈیو نے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے ڈلے روح کی سچائی سے چمک رہے تھے۔

''ثمن! تمھارا قد، رنگ روپ کوئی میری آنکھوں سے دیکھے تو پتا چلے۔ خود تم میری آنکھوں میں دیکھو تو حیران رہ جاؤ۔ خیر، میرے ساتھ رہو گی تو تمھارا یہ کمپلیکس دور ہو جائے گا۔''

''تمھارے جیسے پہاڑ آدمی کے سامنے تو یہ اور بڑھ جاتا ہے۔'' ثمن نے کہا۔

''اگر میں پہاڑ ہوں تو تم سورج ہو۔ سورج ہمیشہ اونچا ہوتا ہے چاہے زمین سے نکلتا نظر آئے۔''

''ارے ہاں، میں نے ابھی پیچھے دیکھا، سورج خاصا اونچا ہو گیا ہے اور بادلوں میں سے اس کی کرنیں بالکل آبشار کی طرح نیچے گر رہی ہیں کسی بہت چوڑے آبشار کی طرح۔ کیا نیاگرا بھی اتنا ہی چوڑا ہے؟''

''مجھے دکھائی نہیں دے رہا مگر میرا خیال ہے اس سے بھی زیادہ۔'' ڈیو بولا۔

''بہت خوب صورت ہے؟'' ثمن نے پوچھا۔

''بہت۔'' ڈیو نے کہا، ''بڑی چیزوں میں نیاگرا فال اور تاج محل اور چھوٹی چیزوں میں......''

''چھوٹی چیزوں میں کیا؟''

''تم!''

''پھر فضول باتیں۔''

''ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ اچھا یہ بتاؤ ابھی کیا تصور ہے تمھارا نیاگرا فال کے بارے میں؟'' ڈیو نے پوچھا۔

''تصویریں تو بہت دیکھی ہیں مگر کوئی واضح تصور اب بھی نہیں ہے۔ ٹھہرو......'' ثمن نے آنکھیں بند کر کے سوچا، ''ایک پہاڑ کے اُوپر سے آبشار نیچے گر رہا ہے اور دریا میں پانی جا رہا ہے۔ دور ایک پل نظر آ رہا ہے۔ کشتی جا رہی ہے......نہیں تصویروں کی طرح چھوٹے چھوٹے حصے ذہن میں آتے ہیں، پورا ایک منظر نہیں بنتا، دیکھنے کے بعد ہی بنے گا۔'' ثمن نے ہار مان لی۔

''یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ کسی چیز کو پہلے پہل دیکھنے کی حیرت اور مسرت کی اپنی ایک جگہ ہوتی

ہے۔ بعد میں وہ بہتر ہو سکتی ہے مگر وہ نہیں ہو سکتی جو پہلی بار تھی۔'' ڈیو نے کہا، ''نیاگرا فال کو پہلی مرتبہ دیکھا تھا تو میری آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔''

''واقعی؟'' ثمن حیران ہوئی۔

''ہاں.....اور تمھیں دیکھ کر بھی۔'' ڈیو نے کہا۔

''اُس دن اسرار صاحب کے گھر سب ہی رو رہے تھے۔'' ثمن نے کہا۔

''مگر میں تو تم سے اسکول میں ملا تھا پہلے دن، یاد ہے؟''

''ہاں یاد ہے۔ اُس دن بھی تم مجھے دیوزاد لگے تھے اور اب بھی ویسے ہی لگتے ہو۔ پہلے دن اور بعد کے دنوں میں کوئی فرق نہیں پڑا۔''

تم مجھے ننّھی سی پری لگی تھیں اور اب بھی لگتی ہو۔'' ڈیو بولا، ''مگر زندگی میں پہلے پہل جیتے جی ایک زندہ پری کو دیکھنا بڑا تجربہ ہے۔''

''کاش ایسا ہی ہوتا۔'' ثمن نے ٹھنڈا سانس لیا۔

''تمھیں کچھ ہو رہا ہے۔'' ڈیو نے دوبارہ اس کی طرف غور سے دیکھا۔ خالی سڑک پر چند ثانیے نگاہ دوسری طرف کی جا سکتی تھی، ''تم آگے جانے کے بجائے پیچھے جا رہی ہو۔''

''میں تھک گئی ہوں۔'' ثمن نے کہا۔

''یوں کرو تم آنکھیں بند کر کے تھوڑی دیر سو جاؤ۔'' ڈیو نے کہا، ''میں ریڈیو بند کر کے غزل کا ٹیپ لگا دیتا ہوں۔''

ثمن نے آنکھیں موند لیں۔ ڈیو نے دلی دھنی کا ٹیپ لگا دیا۔

کیا مجھ عشق نے ظالم کو آب آہستہ آہستہ
کہ آتش، گل کو کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ

چند ثانیے بعد ثمن نے چپکے سے آنکھیں کھول کر ڈیو کو دیکھا۔ وہ زیرِ لب غزل کے الفاظ دُہرا رہا تھا اور اس کے چہرے پر ایسا کرب تھا جیسے وہ کسی بھی لمحے رونے والا ہو۔

''ایک بات کہوں؟'' گانے کے دوران ہی ڈیو نے کہا۔

''ہوں......کہو۔'' ثمن بولی۔

''تم نے میرا کراچی والا اسی ویو اپارٹمنٹ دیکھا تھا نا؟''

''ہاں دیکھا تھا۔''

''مجھے ایک منظر بہت یاد آتا ہے۔'' ڈیو نے خوابیدہ لہجے میں کہا، ''سردیوں میں جب مچھیرے

اپنی کشتیاں سمندر پر پھیلا دیتے تھے اور جال ڈال کر سو جاتے تھے تو میری بالکنی سے رات کو یوں دکھائی دیتا تھا جیسے سمندر میں دور اور نزدیک پہاڑیاں اُبھر آئی ہوں اور پہاڑیوں کے گھروں میں دیے جل رہے ہوں۔ آگے پیچھے کشتیوں اور ان کی لالٹینوں کا یہ طلسم اتنا خوب صورت لگتا تھا کہ میں گھنٹوں اُسے دیکھتا رہتا تھا۔ کبھی کبھی راتوں کو بلاوجہ جاگنا یوں لگتا ہے جیسے انسان جاگ کر، یہ خوب صورت لمحے سمیٹ کر اپنی عمر بڑھا رہا ہو یا وہ قدرت کی نعمتوں کا تھوڑا سا خراج ادا کر رہا ہوں۔ یہ منظر مجھے اب بھی یاد آتا ہے۔ سب سے عجیب بات جو ہے وہ یہ ہے کہ تصور میں اس چھوٹی سی بالکنی میں تم بھی میرے ساتھ کھڑی ہوتی ہو جو اصل زندگی میں کبھی نہیں ہوا۔''

''میں اصل زندگی میں تمھارے ساتھ تمھاری بالکنی میں کھڑی ہوئی ہوں۔'' سمن نے کہا، ''یاد ہے جس دن ہم جلوس میں شریک ہوئے تھے واپسی میں تھوڑی دیر کو تمھارے گھر بھی گئے تھے۔ پھر راستے میں تم نے اپنی کہانی شروع کی تھی اور جب تم مجھے لے کر گھر پہنچے تھے تو سلیم کی گاڑی ہمارے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔''

''ہاں، اُس دن میں سوچ کر گیا تھا کہ تمھاری امی کو بھی اپنے بارے میں سب کچھ صاف صاف بتادوں گا اور بڑے روایتی انداز میں تمھارا ہاتھ اُن سے مانگوں گا۔ اس وقت مجھے معلوم نہیں تھا کہ میں خود کو بے وقوف بنا رہا تھا۔ وہ باتیں جو میری ذات کے بارے میں مجھے اور دوسروں کو بتائی گئی تھیں سب جھوٹ تھیں...... سب جھوٹ ہیں۔ اب پتا چلا کہ میں جو حق بات کہنے میں بڑا فخر کرتا تھا، میں خود دنیا کا سب سے بڑا جھوٹ ہوں۔''

سمن کو وہ دن یاد آیا۔ دور سے سمندر ریتلا بے ضرر سا لگ رہا تھا۔ سمندر کے کنارے پتھروں کے بند اور منڈیر پر سیر کرنے والے برابر برابر بیٹھے تھے۔ چند لوگ سمندر میں پانی کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے۔ ان کے نزدیک سے لمبی ٹانگوں والی چڑیاں پھدکتی ہوئی جا رہی تھیں۔ گیلی زمین میں ان کی ٹانگوں کے سیکڑوں عکس لمبے تنکوں کی طرح گڑے تھے۔ پھر سرِ شام اونچی عمارتوں کے درمیان طباق سا چاند اُبھرا۔ ڈیو بڑا بے چین اور بے آرام سا تھا۔ وہ بار بار اس سے چلنے کو کہتی اور وہ 'اچھا' کہہ کر پھر ٹھہرا رہتا۔ بڑھتے اندھیرے میں دور اُفق پر سمندر میں کھڑے جہازوں کی روشنیاں اُجلنی شروع ہوئیں۔ اندھیرا ذرا سا اور گہرا ہوا تو چنے فروخت کرنے والوں کے کاندھے پر ترازو کی طرح جھولتے پلڑوں میں چنوں کے نیچے مٹنے سے الاؤ کی لہریں ہوا میں جھولتی عجیب سی لگیں۔ نارنجی شعلے سانپ کے پھن کی طرح بل کھاتے تاریکی کو کاٹتے جاتے تھے۔ ''دیکھو تو کتنا اندھیرا ہو گیا۔'' گھبرا کر اس نے کہا اور دروازہ کھول کر زینے سے نیچے اُترنے لگی۔ تب ڈیو سوتے میں چلنے والے شخص کی

طرح آہستہ آہستہ نیچے اُترا اور دونوں کار میں بیٹھ کر سمن کے گھر پہنچے۔

بصیرہ نے اوپر دیکھا۔ سر پر آبزرویشن ٹاور کی کرین جیسی عمارت بھاری چیزیں تولنے والے اسکیل کی طرح ادھ بیچ میں لٹکی نظر آتی تھی۔ وہ اس وقت بہت نیچے دریائے نیاگرا کے کنارے، میڈ آف دی مسٹ، نامی کشتی کے انتظار میں کھڑی تھی جو انھیں آبشار کے نیچے تک لے جانے والی تھی۔ اوپر ٹیرس سے رنگ برنگی جیکٹوں میں ملبوس اس وقت کے ساتھی یوں دکھائی دیے تھے جیسے دریا کی چٹانوں کے بیچ لال، نیلے، ہرے، پیلے پھول گھومتے پھر رہے ہوں۔ ایلی ویٹر کے اُڑن کھٹولے سے اُترتے چڑھتے لوگ دکھائی نہ دیتے تھے، اس لیے بصیرہ کو یوں لگا تھا جیسے یہ مخلوق آسمان سے سیدھی اس گہرائی میں اُتری ہے اور دنیا تک پہنچنے کی راہ کھوج رہی ہے۔ ایک طرف دریا ہے اور دوسری طرف پہاڑ کی سیدھی دیوار۔ اب وہ بھی اسی آسمانی مخلوق میں آ ملی تھی۔ دوسروں کی نظروں میں وہ یوں بھی کسی اور ہی دنیا کی مخلوق تھی۔ اس کی زندگی اس کی ہم عمر لڑکیوں کی نگاہوں میں بڑی ولولہ انگیز تھی۔ وہ اس کے لباس، گھر کی آرائش، اس کی کاروں کو حیرت اور حسرت سے دیکھتی تھیں جب کہ اسے محسوس ہوتا تھا کہ اُس کے دل و دماغ کے زیادہ تر خانوں میں تنہائی کی دُھند کے سوا کچھ نہیں اور بس یہی دُھند اس کی ملکیت ہے۔ ایک دُھند دوسری دُھند میں مل کر کثیف ہی ہوسکتی ہے۔ چناں چہ کیلی فورنیا کی دُھند ہو یا نیاگرافال کے بھاری قطروں کی دُھند، وہ ہر جگہ تنہا تھی۔

اس کی دوستوں خصوصاً ناز کو یقین تھا کہ وہ کسی بھلے آدمی سے شادی کرلے تو وہ بھلا شخص اور اس کے بچے اس خلا کو پُر کردیں گے۔ ناز اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہی تھی مگر بصیرہ کو گمان تھا کہ وہ بھلا آدمی اتنا سیدھا تھا کہ شاید پیدا ہونا ہی بھول گیا تھا ورنہ کہیں تو ملتا۔ اس شریف آدمی سے پہلے ملک الموت سے مُڈبھیڑ ہوئی۔ اس سے بچنے کے لیے امریکا تک آئی۔ اب نیاگرافال دیکھ کے رین بو پل پار کر کے کینیڈا ناز کے پاس جانے کا ارادہ تھا۔ موت نے اگر درمیان ہی میں دبوچ لیا تو دودھیا آبشاروں سے اُڑتی پھوار اور دُھند کے بیچ چپ چاپ چلا جانا شاید آسان ہو۔ فی الحال ڈاکٹر 'ایم' کے پنجے سے تو وہ نکل آئی تھی۔

'نیاگرافال دیکھ آؤ، آپریشن بعد میں ہوجائے گا، نو پرابلم۔'' اس کے ٹیسٹ کے کاغذات دیکھ کر ڈاکٹر نے کہا تھا۔

سمن کو ساتھ چلنے کے لیے فون کیا تو وہ بیمار پڑی تھی۔ طے ہوا کہ بصیرہ چلی جائے، ہوسکا تو سمن بعد میں آجائے گی۔ ناز کے شوہر اشرف صاحب اسے لینے آنے والے تھے لیکن شام کو جب وہ اپنے

ہوٹل سے گرتے آبشار کو دیکھ رہی تھی، ناز کا فون آیا کہ اشرف صاحب کو اچانک کام پڑ گیا ہے اس لیے ان کے چھوٹے بھائی سلیم اسے لینے آئیں گے۔ کمرے کا نمبر انھیں بتا دیا جائے گا۔ امید ہے وہ ہوٹل ہی میں سلیم کا انتظار کرے گی۔

صبح اُٹھ کر تیار ہونے کے بعد کچھ دیر تو بصیرہ نے انتظار کیا اس کے بعد اس نے سوچا، ناز صاحبہ اپنے چہیتے دیور کو میرے سر منڈھنے کی نہایت بھدی اور ناکام کوشش فرما رہی ہیں۔ انتظار کرتی ہے میری جوتی۔ وہ تو اتنے عرصے سے یہاں ہیں، آبشار ان کے دیکھے ہوئے ہوں گے، میں جاتی ہوں سیر کو۔ ایسا ہی ہے تو وہ ہوٹل میں بیٹھ کر انتظار کی گھڑیاں گنیں۔ اُس نے ایک بار پھر اُوپر دیکھا۔ سلیم سے اس کی باقاعدہ ملاقات کبھی نہیں ہوئی تھی۔ شاید سلیم نے بصیرہ کو دیکھا بھی نہیں تھا، دیکھا بھی ہو تو اتنی بلندی سے کسی کو پہچان لینا ناممکن تھا۔ اُوپر ٹیرس پر چند لوگ کھڑے تھے، ہوسکتا ہے اس میں میاں سلیم بھی ہوں۔ سلیم کے ساتھ اس آنکھ مچولی میں اب اسے مزہ آ رہا تھا۔ دیکھیں وہ حضرت اب کیا کرتے ہیں۔

میڈ آف دی مسٹ پہلے سفر سے لوٹ چکی تھی۔ گھٹنوں گھٹنوں پانی سے تر، سر اور پیر جھٹکتے مسافر اُترے۔ نئے مسافروں نے برساتیاں پہن کر ہڈ اوڑھ لیے۔ سب کے حلیے یکساں ہوئے تو صورتیں بھی ایک سی ہوگئیں۔ بصیرہ خوش ہوئی کہ کسی ایک مسافر کو تاڑنا بہت مشکل ہوگا۔ اس وقت وہ کشتی میں بھری ہوئی نیل کی بوریوں میں سے ایک بوری تھی۔

بے خوف و خطر وہ ڈیک پر بالکل سامنے جا کھڑی ہوئی۔ امریکن آبشار کی پھوار نے ان پر قطروں کے ایسے پھول برسائے کہ سب کو اپنا چہرہ دوسری طرف کرنا پڑا۔ اس پھوار کے بعد لوگ مسلسل قہقہے لگاتے اور خوش ہوتے رہے۔ انگریزی اور فرانسیسی میں ہونے والی کمنٹری پر کسی نے دھیان نہ دیا۔ امریکن آبشار کے عین دہانے پر بڑا سا ایک خشک پیڑ اٹکا پڑا تھا۔ کسی بھی لمحے آبشار کے ساتھ نیچے گر سکتا ہے۔ بصیرہ نے سوچا..... تیزی سے اُترتا آئے۔ کشتی سے ٹکرائے، کشتی اُلٹے اور یوں قضا سے مچیٹا ہو۔ نزدیک کھڑی ایک عورت نے اسے بتایا کہ آٹھ سال سے یہ درخت یوں ہی آبشار کے کنارے پر ٹکا ہوا ہے۔

'دلہن کی نقاب' کے آگے لکڑی کے تنگ زینوں پر زرد برساتیوں میں اُوپر چڑھتے اُترتے لوگ بھی کسی اور دنیا کی مخلوق لگ رہے تھے۔ عین اُس وقت جب وہ ان پیلی قباؤں والے یا جوجوں ماجوجوں کو دیکھنے میں محو تھی، کسی نے اس کی برساتی کا دامن کھینچا۔

سلیم! پہلا خیال اسے آیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ چھوٹی سی برساتی اور نیلی ٹوپی میں چشمہ لگائے ایک مضحکہ خیز سا لڑکا اس کا نام جاننا چاہتا تھا۔ وہ بمشکل سات آٹھ سال کا ہوگا۔

''تم میرا نام کیوں پوچھ رہے ہو؟'' بصیرہ نے جھک کر اس سے پوچھا۔

بچہ شرما گیا۔

''کوئی شخص اسے اچھا لگے تو اس کا نام پوچھتا ہے۔'' ماں نے جلدی سے ڈپلومیسی سے کہا، ''میرا نام کرس ہے۔ تم تنہا ہو؟''

''ہاں، ایک طرح سے۔'' بصیرہ نے کہا۔

''ہم اس کے بعد ہیلی کاپٹر سے سیر کریں گے۔ ہماری کار پارکنگ 'ون' میں ہے۔ تمھاری کار کہاں ہے؟''

''میں کار میں نہیں آئی۔'' بصیرہ نے کہا، ''میں ویوموبل سے گوٹ لینڈ جاؤں گی۔ مجھے 'آندھیوں کے غار' دیکھنے کا شوق ہے۔''

''ہیلی کاپٹر کی سیر کے بعد ہم بھی کیو آف داونڈز میں جائیں گے۔ چاہو تو ہم تمھیں وہاں اُتار دیں۔'' کرس نے کہا، ''ہوسکتا ہے ویوموبل میں تمھیں زیادہ مزہ آئے۔ بیٹے کی طرف دیکھ کر پھر اس نے کہا، ''یہ مائیک ہے اور یہ فِل میرا شوہر۔'' فِل اور بصیرہ نے سلام کے طور پر گردن ہلائی۔ تب تک بصیرہ سوچ چکی تھی کہ وہ تنہا ہی جائے گی۔ اسے ہمیشہ سے سہارے ڈھونڈنے کی عادت تھی۔ زندگی میں یوں بھی کوئی کام اس نے خود نہ کیا تھا۔ بچپن سے آیائیں اور دایاں مقرر تھیں۔ ایک مرتبہ اسکول میں اس بات پر اس کی ہنسی اُڑی تھی کہ وہ کاغذ نہیں کاٹ سکتی تھی۔ زمان نے ایک بار اس سے کہا تھا، ''تمھارا کام کر کے مجھے ہمیشہ خوشی ہوتی ہے مگر وہ کام جو میں اپنی مرضی اور چاہت سے کروں۔ جب تم 'حکم' دیتی ہو تو مجھے بالکل خوشی نہیں ہوتی مگر اتنی مجال کہاں کہ تمھاری بات ٹال سکوں۔'' وہ حیران ہوئی تھی کہ زمان نے یوں بھی سوچا تھا۔

چھوٹے چھوٹے کاموں کے لیے فوری طور پر کسی سے مدد مانگنا اس کے لیے بالکل قدرتی سی بات تھی۔ اس کے ذہن میں یہ بات کبھی نہ آئی کہ کچھ لوگوں کے لیے یہ کام زحمت بھی بن سکتے ہیں۔ زمان کے جانے کے بعد وہ بہت دن تک اس کے الفاظ کا تجزیہ کرتی رہی۔ شاید وہ ٹھیک کہتا تھا۔ اس میں اس کے ابا کا بھی قصور تھا جو ہر آئے گئے کو بتاتے تھے کہ بن ماں کی بچی کا دل ہاتھوں میں رکھنا ضروری ہے خصوصاً جب کہ وہ دل کی مریضہ ہے۔ ملازموں کی بھرمار اور لوگوں سے ہمدردی وصول کرتے کرتے ان جانے میں وہ یہ سمجھنے لگی تھی کہ ہر ایک کی توجہ حاصل کرتے رہنا اور ہر ایک سے کام کرواتے رہنا بھی اس کا حق ہے۔ اس کے والد اپنے کاموں میں اور بچی کو خوش رکھنے کی کوشش میں اتنے مصروف تھے کہ انھوں نے محسوس بھی نہ کیا کہ بچی کے حقوق پھیلتے اور دوسروں کے سکڑتے جا رہے ہیں۔ فطرتاً وہ نیک تھی لیکن اس کے لیے لینا فطری اور دینا غیر فطری سا ہوتا جا رہا تھا۔ سب سے پہلے اس بات

کا احساس زمان نے دلایا تھا۔ وہ شعوری طور پر اس کمزوری سے چھٹکارا پانے میں مصروف تھی۔ امریکا آنے سے پہلے اس نے اپنے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ وہ کسی کا سہارا نہیں ڈھونڈے گی اور اپنے فیصلے خود کرے گی۔ اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا اپنے خیال میں یہ اس کا پہلا قدم تھا۔

''ہاں، تم نے ٹھیک کہا، ویو موبل میں مجھے زیادہ مزہ آئے گا۔'' بصیرہ نے کہا۔

''بائی بائی۔'' کنارے پر لگتے ہی کرن، فل اور مائیک نے کہا اور تیز تیز قدم اُٹھاتے ایلی ویٹر کی طرف چلے گئے۔ بصیرہ اپنی برساتی لوٹا کر سوغاتوں کی دکان میں آ گئی۔ وہاں اس نے ٹھٹک کر دیکھا۔ سلیم تو نہیں؟ یوں ہر ملک اور قوم کے لوگ خاصی تعداد میں تھے۔ کسی طرف سے ہسپانوی بولنے کی آواز آ رہی تھی، کہیں فرانسیسی بولی جا رہی تھی۔ چینی، جاپانی، کورین اور ویت نامی سب امریکن لباسوں میں تھے مگر ان کے چہرے چغلی کھا رہے تھے۔ ہندوستانی، پاکستانی ساریاں، شلواریں اور شالیں سب نظر آئیں مگر کوئی ایسا تنہا شخص دکھائی نہ دیا جو کسی کو تلاش کر رہا ہو۔ لکڑی پر بنے ہوئے آبشار، اس کے بارے میں کتابیں اور قیمتی دھات کے ہار بُندے خرید کر وہ اطمینان سے باہر نکلی۔ ایلی ویٹر سے اوپر چڑھی اور پٹری پر چلتی موبل ویو سے نظارہ کرتی گوٹ لینڈ تک آئی۔ نیاگرا فال تو بچپن کا خواب تھا مگر مارلن منرو کی پرانی فلم ''نیاگرا فال'' کی نئی کاپی دو مرتبہ دیکھنے کے بعد سے بصیرہ کو زرد برساتی پہن کر چوبی زینوں پر چڑھنے کا بے انتہا شوق ہو گیا تھا۔

گوٹ لینڈ کے ہیلی پیڈ پر اُترنے کے بعد اس نے دل سے رائے لی تو اس نے ہیلی کاپٹر میں بیٹھنے کی رائے نہ دی۔ اپنی بیماری کا بہانہ بنایا مگر ملک الموت کے خوف کا سایہ جو ساتھ ساتھ چل رہا تھا، اس سے بھی وہ غافل نہ تھی۔ دل کی بات مان کر وہ دریائے نیاگرا کے چوڑے پاٹ کے کنارے پتھروں پر جا بیٹھی۔ پتھروں کے بیچ نارنجی، زرد اور اودے خوب صورت خود رو پھول سر اُٹھائے جھانک رہے تھے۔ اس تک پہنچ کر دریا کی روانی میں یکایک ہلکی طغیانی آ جاتی تھی کیوں کہ سطح آب کے نیچے چٹانیں چھپی ہوئی تھیں۔ بصیرہ کو لگا جیسے بہتی لہروں کے نیچے مگر مچھ گھات میں بیٹھے ہوں۔ اس کے والد کو اور خود اسے اپنے سارے رشتے دار پانی میں پوشیدہ مگر مچھ ہی تو نظر آتے تھے۔ رشتے داروں کے خیال اور والد کی یاد نے چٹکی لی تو سارا منظر بدل گیا...... نیلا آسمان، دریا پر جھلملاتی سورج کی کرنیں، بیدِ مجنوں کی پانی میں ڈوبی شاخیں نوحہ خواں ہوئیں تو وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ویو موبل میں دوبارہ سوار ہو کر وہ آندھیوں کے غار تک آئی۔ ٹکٹ لے کر اندر عمارت میں گئی۔ سیر سے واپس آنے والے زرد بھیگی برساتیاں اُتار اُتار کر ڈال رہے تھے جنھیں چند لڑکے لڑکیاں ہینگر میں ڈال کر لٹکاتے جاتے تھے۔ ہلدی رنگ برساتی اور کپڑے کے تکونے سموسے ایسے جوتے پہن کر، جو خشک کرنے والی

مشین میں سے نکلنے کی وجہ سے گرما گرم بھی تھے۔ کہنے کو یہ جوتے مختلف ناپ کے حساب سے جدا جدا خانوں میں رکھے تھے مگر بعض مضحکہ خیز حد تک بڑے تھے۔ کچھ کے منہ کھلے ہوئے تھے۔ یہ جوتے پہن کر ہر شخص ہنس رہا تھا۔ وہ بھی ہنسی جیسے کوئی اس کے تلوے میں گدگدی کر رہا ہو۔

لمبی قطار میں برساتی اور ہڈ پہنے ایک بار پھر سب ایک سے تھے۔ صرف لمبی چھوٹی برساتیاں آہستہ آہستہ کھسکتی دکھائی دیتی تھیں۔ ہیلی کاپٹر سے اُتر کر وہ نشیب میں گئے۔ پھر ایک سرنگ نما دہانے سے پہاڑ پر بنی پگڈنڈی پر سے گزرتے چوبی زینے تک پہنچے۔ اس زینے کے آس پاس کی ساری چٹانیں آبشار کی مستقل پھوار سے پھپھوندیا گئی تھیں۔ زینے پر ہاتھ رکھا تو کائی کی لجلجاہٹ سے پھریری آ گئی۔ بصیرہ نے ٹھٹک کر ایک بار چوبی زینے پر نظر ڈالی۔ 'دلہن کی نقاب' کا پانی اندھا دھند گر رہا تھا۔ چوبی زینے پر بکھری زرد برساتیاں جیسے آبشار کی دیواروں سے کیڑے نکل کر رینگ رہے ہوں یا خود رو سانپ کی چھتریاں پھوٹ پڑی ہوں۔

بصیرہ جوں جوں آگے بڑھتی رہی پھوار کی تیزی اور بوچھاڑ بھی بڑھتی چلی گئی۔ 'طوفانی عرشے' تک پہنچتے پہنچتے یہ پھوار تیز بارش بن چکی تھی۔ اس ڈیک پر کھڑا ہر شخص پانی سے بھیگتا ہنس رہا تھا، خوش ہو رہا تھا۔ دریا میں دور سے گزرتی میڈ آف دی مسٹ کو ہاتھ ہلا رہا تھا۔ بچے خوشی سے چیخ رہے تھے۔ اس گرتے پانی میں بھی کچھ لوگ تصویریں لینے میں مصروف تھے۔ بصیرہ نے منہ اُٹھا کر 'دلہن کی نقاب' کو دیکھا۔ پانی کا ایک چھینٹا منہ پر پڑا۔ وہ زور سے ہنسی۔ اسے لگا جیسے اس کے ساتھ کوئی اور بھی ہنسا۔ یکایک لگا جیسے کسی نے تر بتر ہاتھ اس کے گیلے ہاتھ میں دیا ہو۔ اُس نے پلٹ کر دیکھا۔ عرشہ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ ماتھے تک آئے ہڈ اور اُوپر سے برستے پانی میں سب کے چہرے یکساں طور پر مضحکہ خیز تھے۔ اس کا ہاتھ کسی کے ہاتھ سے مس ضرور ہوا تھا۔ یخ، لجلجا، کائی زدہ سا ہاتھ۔ سلیم یا ملک الموت یا یوں ہی اتفاقاً کسی کا ہاتھ چھو گیا ہو۔ طوفانی عرشہ چھوڑ کر وہ پھر اس چوبی زینے پر ہولی جس پر ایک وقت میں ایک آدمی ہی چل سکتا تھا۔ کوئی بھی اس کے پیچھے نہ آیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتی رہی۔ کچھ دیر بعد رہبر کے اشارے پر باقی لوگوں نے بھی زینے پر چلنا شروع کیا اور سب آگے پیچھے چلتے قطار میں کھڑے ہوئے اور دوبارہ ایلی ویٹر سے واپس آ گئے۔

بصیرہ نے بھی باقی سیاحوں کی طرح اپنی گیلی برساتی اُتار کر کاؤنٹر پر کھڑی عورت کو دی۔ تکونا جوتا اُتار کر ٹین میں پھینکا اور اپنے جوتوں کا تھیلا واپس لے کر انھیں پہننے بنچ پر بیٹھی تب ایک شخص اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

''میرا نام سلیم ہے۔ آپ کا بصیرہ.....؟'' لہجے میں کچھ یقین تھا کچھ گمان۔

اپنے ملک میں مردوں سے ہاتھ ملانے کی کوئی روایت نہیں تھی تب بھی اس نے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ سلیم کا ہاتھ لجلجا اور کائی زدہ نہیں تھا۔ کم از کم اس وقت وہ خشک اور کرارا تھا۔

''آپ کو کیسے پتا چلا کہ میں بصیرہ ہوں؟'' بصیرہ نے اپنا جوتا پاؤں میں ڈالتے ہوئے پوچھا۔

''اس بات کو جانے دیجیے۔'' سلیم نے کہا، ''ناز بھابی نے کہا تھا بے چاری میری سہیلی اکیلی ہے اسے سیرا کرا دینا۔ یہاں صبح سے آپ کے ساتھ گھوم رہے ہیں، احساس بھی نہیں ہوا کہ آپ کو کسی ساتھی کی ضرورت ہے۔''

''یہ تو میرے سوال کا جواب نہیں۔'' بصیرہ نے کہا۔

''بھئی کچھ انداز سے اندازہ کیا کہ آپ ہی بصیرہ ہو سکتی ہیں اور بھابی نے ایک تصویر ساتھ کر دی تھی۔ صبح سے اس سے صورت ملا ملا کر دیکھ رہا ہوں مگر رنگ برنگے ہڈوں میں کیا پتا چلتا ہے۔ اب آپ نے برساتی اُتاری تو مجھے کچھ شبہ سا ہوا۔ تصویر بھی جانے کب کی پرانی ہے۔'' سلیم نے جیکٹ کی جیب سے ایک تصویر نکال کر دکھائی۔ بصیرہ بے اختیار ہنس پڑی۔ تصویر نہ صرف پرانی تھی بلکہ تنگ جیب اور آبشار کے پانی کی مار سہہ سہہ کر اس کا حلیہ بگڑا ہوا تھا۔

''اس تصویر سے تو بڑے بڑے سراغ رساں بھی نہیں پہچان سکتے تھے۔'' سلیم نے کہا، ''بس میں نے تو ہوا میں ایک تیر پھینکا، آپ جواب نہ دیتیں تو کسی اور کو پکڑتا۔ شاید اس سانولی سلونی کو۔'' اُس نے ٹھوڑی سے ہلکا سا اشارہ کیا۔ ایک بے حد پرکشش سانولی لڑکی لمبی سی چوٹی کے ساتھ کھڑی تھی مگر جلد ہی اس کے آس پاس جمگھٹا لگ گیا۔ اس کے جیسے چند اور سانولے سلونے بہن بھائیوں کا، وہ تنہا نہیں تھی۔

''کوئی بھی لڑکی جو بصیرہ ہونے کی ہامی بھر لیتی آپ اُسے ناز کے پاس لے جا کر کھڑا کر دیتے؟'' بصیرہ نے ہنس کر پوچھا۔

''اور کیا کرتا۔'' سلیم نے بے بسی سے ہاتھ پھیلائے۔ ''یہی علاج تھا اس حماقت کا۔'' سچ پوچھیے تو مجھے اب بھی یقین نہیں ہے کہ آپ بصیرہ ہیں۔ کیا آپ اپنے والد کا نام بتائیں گی؟''

والد کے نام پر بصیرہ یکا یک افسردہ ہو گئی۔

''جانے دیجیے۔'' سلیم نے جلدی سے کہا، ''اب آپ جانے اور بھابی، میں تو بس آپ کو ان تک پہنچا دوں گا۔''

''ابھی تو مجھے کینیڈا کی طرف سے نیاگرا فالز کو اچھی طرح دیکھنا ہے'' بصیرہ نے کہا۔

''جی ہاں! یہ حکم بھی مجھے ملا ہے کہ اچھی طرح سیر کرا کے لاؤں۔ لوگ اپنے کام دوسروں پر ڈالنے میں کتنے ہوشیار ہو گئے ہیں۔'' سلیم نے تصویر کو اُلٹا پلٹا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کو دوبارہ

جیب میں ٹھونسے یا بصیرہ کو دے دے۔ بصیرہ نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے تصویر بصیرہ کو دے دی۔

''ہاں، ناز کیسی ہے؟ اور مُنّی بچی، کتنے دن کی ہوگئی، نام کیا ہے؟'' بصیرہ نے ایک سانس میں پوچھا۔

''بھابی اچھی ہیں، بچی ٹھیک ہے۔ آج بمشکل چھ دن کی ہوئی ہے۔ نام فی الحال مائرہ ہے، اور کچھ؟'' سلیم نے کہا۔

''اور بھائی اشرف؟ سنا ہے انھیں اچانک کوئی کام آن پڑا ورنہ وہ مجھے لینے آنے والے تھے۔'' بصیرہ نے کہا۔

''سنا تو میں نے بھی یہی ہے۔ اب کہاں چلنے کا ارادہ ہے؟'' سلیم نے پوچھا۔

''ہارس شو کے امریکن کنارے پر۔'' بصیرہ نے کہا، ''کل کینیڈا کی طرف جانے کا ارادہ ہے۔''

''بہت بہتر۔'' سلیم نے ہتھیار ڈالنے کے انداز میں کہا۔

شکاگو سے کینیڈا کا ویزا لے کر چلے تو پدما نے کہا، ''بات سنو، مائیکی کو ڈیو کے ساتھ بیٹھنا چاہیے اور سمن کو میرے ساتھ۔ اس لیے کہ اب میرے اور مائیکی کے پاس بات کرنے کے سارے ٹاپک ختم ہو چکے ہیں۔''

''ابھی سے!'' سمن نے ہنس کر کہا۔

''مجھے کس بات کی سزا مل رہی ہے؟'' ڈیو نے کہا، ''میرے پاس تو سمن سے بات کرنے کے بہت موضوع ہیں۔''

''مائیکی سے دوستی کی، آخر تم دونوں دوست ہو اور اتنے دن بعد ملے ہو۔'' پدما نے کہا۔

''ٹھیک ہے، ایک شرط پر۔'' ڈیو نے شہادت کی انگلی اُٹھائی، ''تم سارے راستے سمن کو اچھی اچھی نصیحتیں کرتی جاؤ گی۔ سمجھ رہی ہو نا میری بات۔'' اس نے پدما کو آنکھ ماری۔ ''اور اگلی مرتبہ جب کہیں رکیں گے تو دوبارہ مسافروں کا تبادلہ ہوگا۔''

''چلو خیر، تھوڑی دیر اچھی گپ رہے گی۔'' مائیکی مان گیا۔

پدما گاڑی چلاتے ہوئے بولتی رہی۔

''گھبرانا مت، میں تمھیں نصیحت وصیحت کچھ نہیں کروں گی۔ یہ ہر ایک کا اپنا معاملہ ہے، مگر میں ایک بات کہوں گی تم بتانا کہ ٹھیک ہے یا غلط۔ اپنے دیش میں میرے جیسی لڑکیوں کی گنتی کالے کلوٹوں میں ہوتی ہے۔ سارے لوگ کیسے بھی ہوں سفید رنگ پر مرتے ہیں۔ کیا کوئی ایسا لڑکا جو مائیکی جیسا ہو اپنے دیش میں مجھ سے شادی کرے گا؟ تم بولو......'' پدما نے لمحہ بھر کے لیے اس کی طرف دیکھ کر

کہا، ''یہ لوگ ہمیں کھوب صورت کہتے ہیں۔ ہماری چھپی ٹانگوں کی ایک جھلک دیکھ پائیں تو مانو پری کو دیکھ لیا۔ ہمارے ملک کا اتنا ہینڈسم لڑکا، اتنا پڑھا لکھا اور امیر ہماری طرف نجر اُٹھا کر دیکھے گا؟''

''نہیں۔'' سمن نے کہا، ''پاکستان میں بھی بیس تیس یا بیالیس جتنے بھی اب بڑے گھرانے ہوں گے، اُن کی آس لگائے گا غریب۔''

''میں سوچتی ہوں سمن! ہوسکتا ہے دل میں کہیں ماتا جی بھی کھش ہوں گی کہ اُن کی کالی کلوٹی بیٹی کو بڑا ہینڈسم، سندر، پڑھا لکھا لڑکا مل گیا۔''

''ریلی؟'' سمن کے لہجے میں شک تھا۔

''میں نے کہا۔ ہوسکتا ہے۔'' پدما بولی، ''نہیں؟ ماتا جی کو اچھے سے پتا ہے کہ انھیں مائیکی جیسا داماد ملنے سے رہا۔''

''ہوسکتا ہے۔'' سمن نے زیرِ لب انجانے میں کہا۔

''سامنے کی بات تو یہی ہے کہ مائیکی نے مجھے اور میں نے مائیکی کو پسند کرلیا، مگر کچھ اندر کی باتیں بھی ہوتی ہیں نا۔ مائیکی کے ساتھ بھی وہی ہوں گی۔'' پدما نے کہا، ''جیسے وہ ساری جندگی کا نبھاؤ ڈھونڈ رہا ہو یا کچھ اور..... پتنی جو اسے پتی دیو سمجھے۔''

''یہ بات بھی ٹھیک ہے۔'' سمن نے کہا، ''اب میں عورتوں کی آزادی کا جتنا بھی پرچار کروں مگر عملی زندگی میں مجھ سے زیادہ کوئی اپاہج لڑکی نہیں ہوگی۔ کسی کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتی، کوئی فیصلہ کر نہیں سکتی۔ رونا میرے لیے ایسی ہی تفریح ہے، جیسا یہاں کی لڑکیوں کے لیے رات کا رقص۔ تم ٹھیک کہتی ہو، آدمی اندر سے کچھ اور ہوتا ہے اور باہر سے کچھ اور......''

''تو ایسی لڑکیاں لڑکوں کی ایگو کے لیے کتنا بڑا بُوسٹ ہیں سوچو۔'' پدما نے کہا۔ ''یہاں کی لڑکیوں سے بالکل الگ۔''

''تو تم اب شادی کب کر رہی ہو؟'' سمن نے کہا پھر وہ گھبرا گئی، ''میں نے کوئی غلط بات تو نہیں پوچھ لی؟''

''نہیں، نہیں۔'' پدما نے ہنس کر کہا، ''سب ہی پوچھتے رہتے ہیں۔ لوگوں کے لیے بڑا مجا (مزا) ہے اس بات میں۔ ہماری بھی تو نہ جانے کتنی شادیاں ہوں گی، ایک مندر میں، ایک چرچ میں اور ایک کورٹ میں مگر اصل شادی تو ہماری سچ بات یہ ہے کہ ہو ہی چکی۔'' پدما اب بے حد سنجیدہ لگ رہی تھی۔ ''جب یہ کِصہ چل رہا تھا تو میں نے اپنی ایک بڑی عمر کی دوست سے رائے لی۔ اس نے پتا ہے کیا کہا..... بولی، شادی کھشبو کی طرح ہے، کبھی کھود کو آتی ہے، کبھی دوسروں کو آتی ہے، کبھی ہر

ایک کو آتی ہے اور کبھی کسی کو بھی نہیں آتی..... مگر خوشبو جب تک ہے تو ہے۔ ختم ہوگئی تو ختم ہوگئی۔ خوشبو میں بولو کیا گانٹھ باندھ سکتا ہے آدمی..... کیا اُسے اُڑنے سے روک سکتا ہے؟ اُن کے کہنے سے میں نے سوچا، جو دن ہم ساتھ اچھی طرح گزار سکتے ہیں اسے فرسٹریشن میں گزارنے کا کیا فائدہ! کیا خبر خوشبو کتنے دن کی ہے؟ جب تک ہے، محسوس ہوتی ہے لگا لو اور دل خوش کرلو۔ گھونٹ گھونٹ کر رکھنے سے رہ بھی سکتی ہے، مر بھی سکتی ہے..... ہے نا؟''

''مثالوں سے کچھ نہیں ہوتا پدما!'' سمن نے کہا، ''بات سمجھ میں آنے کی ہے، تمھاری سمجھ میں آ گئی، میری سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کی بھی تو بہت سی وجہیں ہوسکتی ہیں۔ انسان کی اپنی شخصیت، سوچ، کلچر اور کچھ چھپی ہوئی باتیں جیسے کہ تم نے کہا۔ تم، لوگوں کے کہنے سننے کی پرواہ سے آگے نکل گئیں، میں نہیں نکل سکی۔ ہوسکتا ہے تمھارے unconscious کا ردِعمل ہو۔ اسے پہلے سے معلوم ہو کہ تمھاری امی کہیں گی آدمی ٹھیک ہونا چاہیے۔ بھلے کہیں کا ہو........''

''یہ بات تمھاری سمجھ میں نہیں آتی؟'' پدما نے پوچھا۔

''بھئی بات تو سونے کی طرح کھری لگتی ہے مگر سوال وہی ہے کہ ہم کون سے سنار ہیں جو کسوٹی پر رکھیں اور پرکھ لیں کہ یہ آدمی سولہ آنے یا اب سو پیسے کھرا ہے۔ پیسوں کے نام سے تو آدمی کی قیمت ویسے ہی گری ہوئی لگتی ہے۔'' سمن بے ساختہ ہنسی۔

''ہاں کچھ لگتی تو ہے۔'' پدما بھی مسکرائی۔

گاڑی نئی اسٹیٹ میں داخل ہو چکی تھی۔ درختوں پر سبزہ اُنڈا ہوا تھا۔ سڑک کے کنارے گھاس میں زرد، گلابی اور کاسنی پھول کھلے ہوئے تھے۔ ایک اسٹیٹ پارک کے نشان پر پدما نے exit لیا۔ ڈیو نے بھی اپنی گاڑی موڑ لی۔

''دس منٹ کا وقفہ۔'' پدما نے اعلان کیا، ''میں تو کوک پینے جا رہی ہوں۔''

''میں بھی۔'' مائیکی بولا۔

''اس طرح رکتے ہوئے گئے تو پہنچ چکے۔'' ڈیو نے کہا، ''جلدی کرنا۔''

''ابھی آئے۔'' پدما نے کہا۔

لان پر بڑے بڑے درختوں سے روئی اڑتی پھر رہی تھی۔ چڑیاں، چڑ چڑ پس منظر میں کہیں بولے جا رہی تھیں۔ پھر یکایک دل کو چھونے والی ہو ہو کی صدا سنائی دی۔ فاختہ! سمن نے دل میں سوچا۔ خوش گوار ہوا لباس سے گزر کر بدن کو اور دن سے گزر کر مشامِ جاں کو طراوٹ بخش رہی تھی۔

''سارا سال ایسی ہی ہوا چلے دن رات تو کتنا مزہ ہو۔'' سمن نے کہا۔

''شاید آدمی اس سے بھی اُکتا جائے۔'' ڈیو نے کہا، ''سن رہی ہو فاختہ کی آواز، اسے اس ہوا میں کچھ مزا نہیں آ رہا... کیسی رو رہی ہے بے چاری۔''

''واقعی، یہ افسردہ ہوک اس موسم میں ذرا بھی اچھی نہیں لگ رہی۔'' سمن بنچ پر بیٹھ گئی۔

''بے چاری کا دل بہت ہی جلا ہوا ہے، میری طرح۔'' ڈیو نے ایک درخت سے ٹیک لگالی۔

''تمھاری طرح!'' سمن ہنسی۔

''اور کیا... اتنا تھوڑا سا وقت ہمارے پاس ہے اور تم دوسری گاڑی میں جا کر بیٹھ گئیں۔'' ڈیو بسورا۔

''پدما نے کہا تھا، میں تو نہیں۔'' سمن نے صفائی پیش کرنے کی کوشش کی۔

''تم پر پدما کی ہر بات ماننا فرض نہیں ہے۔'' ڈیو بگڑا۔

''واقعی!'' سمن مسکرائی، ''اور ان نصیحتوں کے بارے میں کیا خیال ہے جو وہ راستے بھر کرتی آئی۔''

''کچھ اثر ہوا تم پر؟'' ڈیو نے اشتیاق سے پوچھا۔

''بے...... حد۔'' سمن نے مذاقاً کہا۔

''دیکھو یہ گلہری کیسے تمھارے سامنے کھڑی ایک ٹک تمھیں دیکھ رہی ہے۔'' ڈیو نے کہا۔ ''جیسے کچھ کہنا چاہتی ہو۔''

''شاید اختلاف کا حق مانگ رہی ہے۔'' سمن نے کہا۔

پاس سے ایک موٹر سائیکل شور مچاتی گزری۔

''وہاٹ؟'' ڈیو نے پوچھا۔

''نیور مائنڈ۔'' سمن نے کہا۔

''چلو۔ آؤ سمن.....'' پدما اشارے کر رہی تھی۔

''اب تم تھوڑی دیر پیچھے لیٹ جاؤ۔'' پدما سمن کو سمجھا رہی تھی، ''کشن پڑا ہوگا اس کا تکیہ بنا لو۔''

سمن، ڈیو سے نظریں بچا کر چپکے سے پدما کی گاڑی میں پیچھے سرک گئی۔ وہاں سے دزدیدہ نگاہ ڈیو پر ڈالی۔ ڈیو کا چہرا اُترا ہوا تھا۔ شاید فاختہ کی سی ہُوک اس کے دل سے نکل رہی تھی۔ سمن کا دل یکایک بے حد بوجھل ہوگیا۔ کشن کا تکیہ بنا کر وہ سچ مچ لیٹ گئی۔

کار چلی تو سمن کو محسوس ہوا جیسے کار سیدھی آگے بڑھنے کے بجائے چکر کھا رہی ہو۔ بڑے سے دائرے میں گھوم رہی ہو، گھومے جا رہی ہو۔ جی چاہا اُٹھ جائے۔ اُٹھ کر دیکھے آخر وہ کہاں جا رہی ہے۔ مگر وہ پڑی رہی اور پھر سو گئی۔ اُس نے ایک عجیب و غریب خواب دیکھا۔ اس نے دیکھا کہ وہ خود بصیرہ کی ہاتھی ایسی چوڑی مسہری کے پائنتی پر سکڑی ہوئی پڑی ہے، جیسے کوئی بے آسرا بچی کھلے آسمان کے

نیچے گرتی اوس میں فٹ پاتھ پر پڑی ہو۔ اس کے بال بکھرے ہوئے ہیں اور اس کے چہرے پر جا بجا آنسوؤں سے پھیلے کاجل کے نشان ہیں۔ اتنے میں بصیرہ نے کمرے میں آن کر بجلی کا بٹن دبایا اور اسے دیکھ کر خوف اور حیرت سے پوچھا، ''سمن! تم یہاں کیا کر رہی ہو؟ وہ کہاں ہے، تمھارا دولھا؟''

تب خواب میں ہی سمن کو یاد آیا کہ اس کی شادی ہو چکی ہے۔ اُس نے اپنی طرف دیکھا تو وہ عروسی لباس پہنے ہوئے تھی، مگر وہ اب بھی رو رہی تھی۔

''کیا ہوا؟..... ہوا کیا؟'' بصیرہ گھبرا کر پوچھ رہی تھی۔ اُس کی پریشانی بتا رہی تھی جیسے اسے شک ہو کہ شوہر نے سمن کو جان سے مارنے کی کوشش کی ہے جیسے اس کا جسم خونم خون ہو۔

''تمھارا میاں کہاں ہے؟ وہ کیا کر رہا ہے؟'' بصیرہ نے اصرار سے پوچھا۔

''سو رہا ہے شاید۔'' سمن نے روتے روتے ہچکی لی۔

''تو تم کیوں رو رہی ہو؟ اُس نے کچھ کہا؟'' بصیرہ بے حد فکر مند تھی۔

''ہاں۔'' سمن نے سسکی لی۔

بصیرہ کے چہرے پر گہری فکر کی لکیریں ابھریں۔ ''وہی قصہ؟''

''کون سا قصہ؟'' سمن حیران ہوئی۔

''وہی ازلی سوال، شادی سے پہلے کسی کے ساتھ معاشقہ! کسی کے ساتھ سوئیں۔؟ بہلا پھسلا کر پوچھنا اور پھر.....''

''نہیں، نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ وہ اماں والی بات تو میں نے خود اسے بتائی اور کہا، اب مجھے اپنا بدن سمندر کی ریت کی طرح لگتا ہے۔ سمندر کی ریت جس پر کیڑے مکوڑے چلتے ہیں، مری مچھلیاں اور سمندری گھاس پھوس پڑی رہتی ہے۔ چھوٹے بچے اور کتے موتتے رہتے ہیں۔ میں تمھارے لائق نہیں ہوں۔''

''پھر اس نے کیا کہا؟'' بصیرہ نے پوچھا۔

''اس کا منھ غصے سے سرخ ہو گیا۔'' سمن نے کہا۔ بولا، ''میں نے تم سے محبت کی ہے سمن، تمھارا بدن میرے لیے پاکیزہ اور مقدس ہے، اگر وہ تمھارے لیے سمندر کی ریت ہے تو میں خود کو رینگنے والا کیڑا یا مری مچھلی نہیں سمجھتا۔ جب تک تمھارا بدن خود تمھارے لیے مقدس نہیں ہوتا۔ جب تک تم خود کو میرے قابل نہیں سمجھتیں اس وقت تک کے لیے گڈ نائٹ۔'' اور وہ کروٹ بدل کر سو گیا۔

سمن نے زور کی سسکی لی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ وہ پدما کی کار کی پچھلی سیٹ پر سکڑی ہوئی پڑی تھی۔

''کیا ہوا سمن؟'' پدما نے پیچھے منھ کر کے زور سے پوچھا۔

''ٹھیک ہوں، بالکل۔''

''مجھے لگا جیسے تم رو رہی ہو۔ کیا کوئی برا سپنا دیکھا؟'' پدما نے پوچھا۔

''ہاں۔'' سمن نے مختصراً کہا۔

''گاڑی روکوں؟.... ڈیو کی کار میں جاؤ گی؟''

''ارے واہ کیوں؟'' سمن ہنس پڑی۔

''ایسے ہی، میں نے سوچا شاید.....'' پدما بڑبڑائی۔

''نہیں چلی چلو..... راہ کھوٹی کرنے سے کیا فائدہ؟ ہر پڑاؤ میں آدھا گھنٹا ضائع ہو جاتا ہے۔'' سمن نے کہا۔

''ہاں یہ تو ہے۔'' پدما گاڑی چلاتی رہی۔ ''ڈیو کی گاڑی ہمارے بالکل پیچھے ہے۔'' اُس نے کہا۔

سمن نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ اپنے خواب کے بارے میں سوچتی رہی۔ خواب میں اس کی شادی کس سے ہوئی تھی؟ وہ کون تھا جس نے اس سے یہ بات کہی تھی؟ کم از کم اسے معلوم تو ہو۔ یہ تو بڑی ناانصافی کی بات ہے کہ اسے یہ تک معلوم نہیں کہ یہ بات کہنے والا کون تھا؟

سورج کا تھال سرخ ہو کر درختوں کے جھنڈ میں چھپ جانے کے لیے نیچے اُترتا چلا گیا۔ سورج کے ڈوب جانے کے بعد بھی جھٹپٹے کا سماں تھا۔ گرمیوں کی راتیں بہت دیر تک روشن رہتی ہیں۔ نیم تاریکی میں گھاس میں جگنو چمکتے دکھائی دے رہے تھے۔ چمکتے، بجھتے اور پھر ہوا میں شعلے سے بن کر غائب ہو جاتے۔ سمن یہ منظر دلچسپی سے دیکھتی جا رہی تھی۔ اسے پتا بھی نہ چلا کہ کب گاڑیوں نے اپنی گزرگاہ بدلی۔ کار رکی تو وہ چونکی۔ سامنے ایک ہوٹل تھا جس کا نام ''جانبازوں کی سرائے'' تھا۔ لکڑی کی سیاہ بیرکیں جن پر کھوپڑیاں اور ڈراؤنے چہرے تھے۔ نیچی چھتیں اور دروازوں پر سیاہ کراس بنے ہوئے۔ یہ جگہ دیکھ کر ہی سمن کا دل بیٹھنے لگا۔

''بھئی گاڑی چلا چلا کر تھک گئے۔'' ڈیو کہہ رہا تھا، ''رات کو یہاں ٹھہر جاتے ہیں۔ صبح سویرے نیاگرا چلیں گے، یہاں سے بہت نزدیک ہے۔''

''واہ، اب ذرا سی دور رہ گیا تو یہاں ٹھہرنے کا فائدہ! رات ہی کو تو سین دیکھنے کا ہوتا ہے۔'' پدما نے کہا۔ پدما اور مائیکی اپنی گاڑی سے لگے کھڑے تھے اور ان کے ہاتھ ایک دوسرے میں الجھے ہوئے تھے۔ سمن کو اور بھی اُلجھن ہوئی۔

''مگر رات کو نیاگرا میں ٹھہرنے کی جگہ نہیں ملے گی، تب کیا کریں گے؟'' مائیکی نے جھک کر پدما کے بالوں کو چوما۔

''ایک صورت اور بھی ہے۔'' ڈیو بولا، ''یہاں بکنگ کرا لیتے ہیں، پھر آبشار کی سیر کر کے

واپس آ کر یہاں سو جائیں گے۔ جانبازوں کی سرائے میں۔ ہم کیا جانبازوں سے کم ہیں؟''

''مجھے تو بحری لٹیروں کی سرائے لگ رہی ہے۔'' سمن نے کہا، ''اس خوف ناک سرائے کو چھوڑو۔ مجھے یقین ہے کہ بصیرہ نے ہمارے ٹھہرنے کا انتظام کر رکھا ہوگا۔''

''جمہور کی رائے..... ووٹنگ!'' ڈیو پکارا۔ ''جو خواتین و حضرات یہاں رات گزارنے کے حق میں ہیں ہاتھ اُٹھائیں۔'' اس نے اپنا ہاتھ بلند کیا۔

مائیکی نے ہاتھ ہلایا ہی تھا کہ پدمانے اُسے پکڑ لیا۔ ڈیو نے بے بسی سے دیکھا۔ اس کا واحد اُٹھا ہوا ہاتھ نیچے گر گیا۔

''چلو بھئی سیدھے نیاگرا چلتے ہیں۔ ڈیو نے ہار مان لی، ''قسمت بالکل ساتھ نہیں دے رہی۔ کسی کو اس بات کا خیال نہیں کہ یہ غریب شخص کب سے اسٹیرنگ کے پیچھے ہے۔''

بفلو شہر سے گزرے، نیاگرا زیادہ دور نہیں تھا۔ بصیرہ کے ہوٹل پہنچے تو بصیرہ کے بجائے اس کا لکھا ہوا رقعہ اُن کا منتظر تھا۔ کینیڈا کی طرف دوسرے نیاگرا شہر میں اس کے ہوٹل کا نام اور پتا، امریکا کے نیاگرا میں اپنے اس ہوٹل میں اس نے ڈیو اور مائیکی کے لیے بکنگ کرا دی تھی۔ ان دونوں کمروں کے پیشگی پیسے وہ دے چکی تھی۔ دوسرے دن انھیں کینیڈا کے نیاگرا میں اُس سے ملاقات کرنی تھی۔

عین جس وقت ہیلی کاپٹر نیاگرا آبشار کے اُوپر سے گزرا اور نیچے دریا میں ایک فیری پانی کے ہلال میں داخل ہوئی ڈیو نے نظر اُٹھا کر سمن کو دیکھا جو کتابچہ کھولے پڑھ رہی تھی۔ نیاگرا فالز دس ہزار سے تیس ہزار سال تک پرانے ہیں۔ ابھی صرف بارہ ہزار سال پہلے تک یہ سات میل پیچھے.......

''ارے یہ کتابی معلومات چھوڑو، نیچے دیکھو، نیچے۔'' ڈیو نے سمن سے کتابچہ چھین لیا۔

سمن نے کھڑکی سے ناک چپکالی۔ ڈیو نے باہر دیکھا جہاں ایک بار منظر پھر بدل چکا تھا۔

''اب پتا چلا کہ ہیلی کاپٹر سے لی گئی آبشار کی تصویریں کتنا دھوکا دیتی ہیں۔'' سمن نے کہا۔ ''اتنے اونچے آبشار ذرا ذرا سے cascades دکھائی دیتے ہیں۔''

''اور کیا، جتنی دور سے تصویر لی جاتی ہے آبشار کی اونچائی اتنی ہی کم ہو جاتی ہے۔ جھیلوں کو دیکھو لبالب بھرے پیالے لگ رہے ہیں۔ رین بو پل تاروں کا ایک رباب ہے۔'' ڈیو نے کہا۔

''اور وہ دیکھو، دومنزلہ بسیں درختوں کے بیچ یوں لگ رہی ہیں جیسے گھاس میں سرخ بیر بہوٹیاں۔''

''ہاں، سمن میں اکیلے میں تم سے ایک بات کہنا چاہتا تھا۔ لگتا ہے تنہائی مشکل سے ملے گی، اب کہہ دوں؟''

''کہو۔'' سمن نے پرس کو گود میں دبوچ کر ہمت باندھی۔

''اکڑو گی تو نہیں؟'' بات شروع کرنے سے پہلے ڈیو نے تمہید باندھی۔

''اکڑنے کی بات ہوگی تو ضرور اکڑوں گی۔'' سمن ہنس پڑی۔

''خواہ مخواہ..... رہنے دو پھر، میں تمھاری امی کو خط میں لکھ دوں گا۔'' ڈیو پھر باہر دیکھنے لگا۔

''اچھا!'' سمن بولی، ''ایسی کیا بات ہے جو مجھ سے نہیں ہوسکتی امی سے ہوسکتی ہے؟''

''ایسی تو خیر بہت سی باتیں ہیں مگر یہ بات خاص طور پر ایسی ہے جس سے تمھارا کوئی تعلق ہی نہیں۔ مجھے تم سے کہنا ہی نہیں چاہیے تھا۔'' ڈیو بولا۔

''جب میرا کوئی تعلق نہیں تو میں اکڑوں گی کیوں جناب؟'' سمن نے جرح کی۔

''کیوں کہ اکڑنا، اِترانا اور دوسروں کو عذاب میں رکھنا کچھ لوگوں کی عادت ہوتی ہے۔''

''اور کوئی برائی رہ گئی ہو تو وہ بھی کہہ ڈالو۔'' سمن نے برا مانا۔ پھر وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگی۔ ہیلی کاپٹر دھیرے دھیرے نیچے اُتر رہا تھا اور تصویریں بڑی ہوتی جا رہی تھیں۔

''سوچ کر بتاؤں گا۔'' ڈیو نے ہنس کر کہا۔

''اچھا، اب وہ بات بھی بتا دو جس کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' سمن نے دوبارہ کریدا۔

''مجھے معلوم تھا تم نہیں رہ سکو گی مگر اب تو تمھاری امی ہی تمھیں بتائیں گی۔'' ڈیو اکڑا۔

''پلیز...... بتا دو'' سمن نے خوشامد کی۔

''ایک شرط پر بتاؤں گا۔'' ڈیو بولا، ''کہ تم کوئی بیان بازی نہیں کرو گی، نہ مخالفت میں نہ موافقت میں۔''

''اگر میرا واقعی کوئی تعلق نہ ہوا تو.....'' سمن نے مشروط صلح کی۔

''تعلق تو دور کا بھی نہیں ہے۔'' ڈیو نے کہا، ''تم نکال لو تو اور بات ہے۔''

ہیلی کاپٹر نے زمین کو چھوا۔ پنکھے بند ہوئے۔ ڈیو اور سمن اُترے، پھر مائیکی اور پدما اس کی طرف بڑھے۔ اُن کے ہیلی کاپٹر میں اُڑ جانے کے بعد وہ دونوں پانی میں گرتی بیدِ مجنوں کی شاخوں کے سائے میں جا بیٹھے۔ صاف اور روشن دن۔ ہلکورے لیتا پانی اور ہوا سے ہلکی ہلکی جھولتی بیدِ مجنوں کی لڑیوں جیسی شاخیں۔ سمن نے ایک گہری سانس لی اور سوچا۔ شادی کی بات تو نہ ہوگی، مگر ڈیو کا اعتبار ہی کیا۔ وہ کہہ دے گا کہ تمھاری شادی کا تم سے کیا تعلق، تمھارے ہاں تو یہ مسئلہ ہی تمھارے بڑوں کا ہوتا ہے۔ بات ٹل ہی جائے تو اچھا۔ اور جب اس نے سوچا کہ بات ٹل گئی ہے تو ڈیو نے یکایک بولنا شروع کر دیا۔

''تمھیں معلوم ہے میں نے کراچی میں سی ویو والا گھر خرید لیا تھا؟''

''نہیں، میرا خیال تھا تم کرائے پر رہ رہے ہو۔'' سمن نے کہا۔

''ہاں شروع میں، لیکن جب مجھے پتا چلا کہ مالک مکان گھر بیچنا چاہتا ہے اور اس کی قیمت معلوم ہوئی تو میں نے سوچا کہ ساحلِ سمندر پر اتنا سستا مکان تو دنیا بھر میں کہیں نہیں ملے گا۔ میری رال ٹپک پڑی۔ ارے بھئی ڈالر میں تنخواہ مل رہی تھی اس سے پہلے کچھ ین بھی کما رکھے تھے، چناں چہ وہ گھر خرید لیا۔ کچھ سامان بھی لے کر ڈالا۔ اب وہاں چوکی دار رکھا ہے۔ نہ رکھو تو کہتے ہیں لوگ آ کر قبضہ جما لیتے ہیں۔ چوکی دار رکھو تو ہر مہینے پیسے دو۔ یہ بھی سنا ہے کہ چوکیدار دیکھتے ہیں کہ مالک ہزاروں میل دور ہے تو اپنی طرف سے کرائے پر چڑھا کر کرایہ وصول کر کے کھا جاتے ہیں۔ مطلب یہ کہ بڑی دردِ سری ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر تمھاری امی کسی طرح وہاں چلی جائیں تو......''

''نہیں، دیکھو نا......'' سمن نے کہنا شروع کیا، ''تمھیں معلوم ہے وہ تقریباً بیس سال سے ایک ہی گھر میں ہیں۔ اب کہاں سارا سامان......''

''بس......بس......'' ڈیو نے بڑا سا ہاتھ اُٹھا کر اُسے دم لینے کا مشورہ دیا۔ ''نو کمنٹ، تمھارا وعدہ تھا۔ فیصلہ اپنی امی پر چھوڑ دو۔ میری جگہ زیادہ محفوظ ہے۔ اُن کے علاقے میں آئے دن کرفیو لگا رہتا ہے۔ رہا سامان ڈھونے کا مسئلہ تو وہ میں کسی کے ذریعے کروا دوں گا۔ انھیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔''

''اگر وہ راضی ہوگئیں تو تمھیں اُن سے کرایہ لینا ہوگا۔'' سمن نے زور دے کر کہا۔

''ہاں......مگر معاہدہ میرے اور ان کے درمیان ہوگا۔ آپ درمیان سے نکل چکی ہیں۔'' ڈیو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

سمن چپ چاپ بہنے والے سفید پانی پر سورج کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک جھلمل کرتے عکس کو دیکھتی رہی اور دل ہی دل میں سوچتی رہی، اگر امی ڈیو کے گھر میں چلی جائیں تو اچھا ہی ہے۔ علاقہ زیادہ خوب صورت ہے۔ صبح سے شام تک رونق رہتی ہے۔ اُوپر سے سمندر ہی کو تکتے رہو تو جی نہیں گھبراتا۔ بہت دنوں کے سوکھے کے بعد جب بارش ہوتی ہے تو لوگ چیونٹیوں کی طرح ساحل پر جمع ہو جاتے ہیں۔ کاروں پر کاریں آتی ہیں۔ بچے اور لڑکے نہاتے اور تیرتے ہیں۔ عورتیں شلوار کے پائنچے اُٹھائے پانی میں کنارے کنارے چلتی رہتی ہیں۔ پتھروں کی دیوار پر قطار سے لوگ بیٹھے بھنے چنے اور مونگ پھلیاں کھاتے رہتے ہیں۔ پس منظر میں ریت میں اٹکا جہاز اسٹیج کے پردے کی سیٹنگ کا کام دیتا ہے۔ اس کے مقابل میں کچھ فاصلے پر کھڑا بارج تیز لہروں کے ساتھ اپنی سمت بدلتا رہتا ہے۔ شام کو اُفق پر جہازوں کی روشنیاں کیسی خوب صورتی سے جھلملاتی ہیں۔ بوڑھے، جوان، بچے سب ٹہلنے نکل جاتے ہیں۔ امریکا سے جاگنگ کا شوق بھی وہاں پہنچ گیا ہے۔ فربہ عورتیں اور لڑکیاں سفید پی ٹی شوز پہنے تیز تیز قدم اُٹھاتی چلتی ہیں۔ فیڈرل بی ایریا سے تو قطعی مختلف ماحول

ہے۔ امی کا دل یقیناً لگا رہے گا۔ ہوسکتا ہے نئی دوستیاں راس آئیں۔ وہاں کے رہنے والے بھی نسبتاً آزاد خیال ہوں گے۔ اس آخری خیال پر وہ آپ ہی آپ مسکرائی۔

''تم انھیں خط میں کچھ نہیں لکھو گی۔'' ڈیو نے کہا۔ ''وعدہ!''

''وعدہ!'' سمن نے کہا۔

''یوں نہیں، ہاتھ ملاؤ۔'' ڈیو نے کہا۔

اس طرف آتے ہوئے مائیکی اور پدما نے ڈیو کے دیوزاد ہاتھ میں سمن کے ننھے سے ہاتھ کو چھپا دیکھا تو خوشی سے مسکرائے۔

چاند کی چودھویں تاریخ تھی مگر بادلوں نے چاند کو کسی خسیس کی طرح چھپا رکھا تھا۔ کینڈین نیاگرا گاؤں کے وکٹوریہ پارک میں لگے پرانی وضع کے کھمبوں اور ریستوراں کی دھیمی دھیمی روشنی ہر طرف پھیلی ہوئی تھی۔ سبز چوڑے پتے اور سرخ ٹیولپ نیم تاریکی میں بھی اپنی بہار دکھا رہے تھے۔ ساڑھے سات بجے آبشار پر رنگین روشنیاں پھینکی جانے لگیں۔ سیاح جنگلے کی طرف لپکے۔ بصیرہ اور سلیم بھی اس طرف بڑھے۔ کیمروں کی روشنیاں آسمانی بجلی کی طرح لپک رہی تھیں۔ آبشار پر پھینکی جانے والی سرخ روشنی جھاگ بھرے پانی میں مل کر گلابی ہوگئی تھی۔ لوگ اور قریب جا کر جنگلے اور پتھر کے ستونوں پر جھک کر دھائیں گرتے آبشار کو دیکھتے رہے۔ اس جگہ سے امریکن آبشار کے دونوں حصے صاف سامنے پھیلے ہوئے نظر آتے تھے۔ اس سحر میں گرفتار لوگ گھنٹوں سے کھڑے تھے۔ کچھ ذرا پیچھے ہٹ کر بینچوں پر جا بیٹھتے تھے یا کچھ کھا پی آتے تھے مگر جنگلہ لحہ بھر بھی خالی نہ رہتا تھا اور لوگ ان کی جگہ لے لیتے تھے۔ جب وہ ہٹتے تھے تو جانے والے لوٹ آتے تھے۔ خوش گوار موسم اور طلسماتی فضا نے جیسے سیاحوں کو جکڑ رکھا تھا۔ یکایک نیلی روشنی نے پس منظر کے اندھیرے کو بڑھا دیا۔ لڑکے لڑکیوں کا ایک گروہ ایک طرف سے آیا۔ ایک لڑکے نے گٹار بجانا شروع کیا۔ ساتھی تھرکنے لگے۔ حلقہ بڑا ہونے لگا۔ کچھ اور لوگ بھی جھومنے اور تھرکنے لگے، کچھ گانے لگے، کچھ تالیاں بجانے لگے۔ یہ گاتا، ناچتا، تھرکتا حلقہ، ڈھیلے چھوڑے ہاتھ، نصف دائرے میں چکر لگاتے پاؤں۔ جسم موسیقی کی لے پر خود بخود جھونک کھا رہے تھے۔ نیم مدہوشی کا عالم تھا۔ یہ گانے والے شاید ہمیشہ تو یہاں نہیں ہوتے۔ کبھی اس نے ان کے بارے میں سنا نہیں۔ شاید آج صرف ان کی خاطر رنگ بدلا۔ سبز روشنی دودھیا پانی کو صرف انگوری کر سکی، جیسے انگوری مشروب بھر بھر انڈیلا جا رہا ہو۔ پھر رنگ بدلا۔ سفید روشنی، سفید موتی سے گرتے پانیوں میں کیسی ریشمی سفیدی تھی۔ بصیرہ کو کچھ یاد آیا۔ ایک بار جیسے موت کے فرشتے

کے پر پھر اس کے ذہن کو چھوتے ہوئے گزرے۔ خیال کی رو کو دوسری طرف موڑنے کے لیے وہ سلیم سے مخاطب ہوئی، ''آپ میڈ آف دی مسٹ کے ٹرپ پر ہماری کشتی میں تھے نا؟''

''جی ہاں۔''

''اور آپ نے ہی اُس بچے سے میرا نام پوچھنے کو کہا تھا؟''

''ویسے بھی مجھے یقین تھا کہ آپ بصیرہ ہیں مگر آپ اتنی خوش تھیں.... بچوں کی طرح چیخیں مار رہی تھیں۔''

''خیر، چیخیں تو نہیں مار رہی تھی۔'' بصیرہ نے برا مان کر کہا، ''البتہ بچوں کی طرح خوش تھی، یہ آپ کہہ سکتے ہیں۔''

''جو بھی ہو۔'' سلیم نے کہا، ''میں نے بہرحال اُس وقت آپ کی خوشی میں مخل ہونا مناسب نہیں سمجھا، کیوں کہ جو نقشہ بھابی نے کھینچا تھا وہ اس خوش باش لڑکی سے ذرا مختلف تھا۔''

''اچھا!'' بصیرہ نے تعجب سے کہا۔ ''گویا ناز نے فرمایا تھا کہ نہایت نک چڑھی سی کوئی لڑکی کہیں دکھائی دے تو اُسے پکڑ لاؤ۔''

''خیر یہ تو نہیں مگر اسی قسم کی کوئی بات......'' سلیم ہنسا۔

''اچھا یہی سہی۔'' بصیرہ نے کہا ''مجھے اس سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا، میں سمن تو ہوں نہیں۔''

''سمن!'' سلیم نے بصیرہ کی طرف دیکھا ''آپ سمن نہیں ہیں؟ سمن کا یہاں کیا ذکر ہے؟''

''ہاں سمن......وہ ڈیو سے شادی......''

''ڈیو سے شادی!......'' اُف کتنا شور ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ سلیم نے سوچا، بصیرہ کیا کہہ رہی ہے؟

بصیرہ انتظار کرتی رہی کہ سلیم کچھ کہے۔ پلٹ کر دوبارہ اس کی طرف دیکھے، مگر وہ کچھ نہ بولا۔ یہاں تک کہ بصیرہ نے کہا، ''آپ تھک گئے ہوں تو چلیں؟''

''میں تو نہیں تھکا......آپ تھک گئی ہوں تو چلیں۔'' سلیم نے کہا۔

''ابھی زیادہ رات تو نہیں ہوئی۔ میں تھوڑی دیر بنچ پر بیٹھنا چاہتی ہوں۔'' سلیم کا انتظار کیے بغیر وہ پیچھے رکھی ہوئی بنچوں کی طرف بڑھی۔ 'دلہن کی نقاب' پر ملنے والی سانولی سلونی لڑکی اپنے ساتھی لڑکے کے ہاتھ میں ہاتھ دیے گزری۔ میکسیکی گھرانے کے آٹھ دس افراد بے تحاشہ باتیں کرتے اس کے سامنے آ گئے۔ اُن کے نرغے سے نکلی تو ایک بچی نے چھوٹے بھائی کی بچہ گاڑی چلاتے ہوئے اس کے پیر پر پیر رکھ دیا۔ بصیرہ نے درد سے سسکی لی۔ بچی کو خبر تک نہ ہوئی۔ سب اپنے اپنے خیالوں

میں مگن پھر رہے تھے۔ ایک بنچ پر تھوڑی سی جگہ خالی تھی، بصیرہ وہیں ٹک گئی۔ ٹورنٹو سے آئی امرتسر کی دو بوڑھیاں پنجابی زبان میں ہندوستان کی سکھ سیاست اور حکومت کی زیادتیوں پر نہایت بھولپن سے گفتگو کر رہی تھیں۔ اُن کے سفید شیفون کے دوپٹوں پر پڑی باریک سفید فردیاں اور بھک سفید بال اِدھر اُدھر سے پڑتی روشنی میں چمک چمک اُٹھتے تھے۔ گانے والوں کا ٹولا غائب ہو چکا تھا۔

بصیرہ کو سخت تھکان محسوس ہو رہی تھی۔ اس نے تھوڑی دیر کو آنکھیں موند لیں اور سر بنچ سے ٹکا دیا۔

''ارے تم یہاں سونے آئی ہو بے وقوف!'' پٹ سے بصیرہ نے آنکھیں کھولیں تو ثمن سامنے کھڑی تھی۔ اس کے ساتھ ڈیو بھی تھا۔ پدما اور مائیکی ذرا فاصلے پر کھڑے تھے۔ ثمن نے سب کا تعارف کروایا۔

''اے بی ہمیں بلا کر کہاں چھپتی پھر رہی ہو'' ثمن نے کہا، ''ہم کب سے اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارتے پھر رہے ہیں۔''

''بھئی تھک گئی تھی بہت پھر بھی یہاں سے ہلنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ تم سامنے کا منظر تو دیکھو'' بصیرہ نے کہا۔

''ارے یہاں سے خاک دیکھیں، جنگلے کے پاس سے دیکھیں گے۔'' ثمن نے کہا۔

وہ سب جنگلے کی طرف بڑھے۔ بصیرہ دھیرے دھیرے اُس رخ بڑھتی رہی جہاں سلیم کھڑا تھا۔

''تم اکیلی ہو ابھی تک؟'' ثمن نے بصیرہ سے پوچھا، ''نازیا اشرف بھائی لینے نہیں آئے۔''

''ابھی پتا چلا جاتا ہے کہ کون لینے آیا ہے۔'' بصیرہ نے گول مول جواب دیا۔

جنگلے کے نزدیک پہنچ کر بصیرہ نے آواز دی۔ ''سلیم!''

سلیم پلٹا۔ ثمن اور سلیم نے بیک وقت ایک دوسرے کو دیکھا۔ دونوں ٹھٹکے۔ پھر سلیم نے ڈیو کو دیکھا جو گانے والوں کے اس گروپ کو دیکھ رہا تھا جو گھومتے گھامتے پھر اسی طرف نکل آئے تھے۔ وہ عین ان کے سامنے جنگلے کے نزدیک کھڑے ہو کر گانے لگے۔ گٹار بجانے والا دل و جان سے گٹار بجانے اور گانے میں مصروف تھا۔

تم میرے سامنے آنسوؤں سے لبریز آنکھیں لیے کھڑی ہو
تم سوچ رہی ہو میں تمھیں برا بھلا کہوں گا
کوئی ایسی بات جس سے تمھیں تکلیف ہو
پھر تم مجھے نہیں جانتیں
میں اور تمھیں تکلیف دوں
میں تو اس زمین کو بوسہ دیتا ہوں جس پر تم چلی ہوں

آبشار پر پڑنے والی اودی روشنی میں فضا بے حد پُراسرار ہوگئی تھی۔ سلیم سمن کی طرف بڑھا۔

''مبارک ہو شادی۔'' سلیم نے کہا۔

''کیسی شادی؟'' سمن نے منھ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھا۔

''تمھاری اور ڈیو کی۔'' سلیم نے کہا۔

''ہوش میں تو ہیں آپ؟...... کس نے کہا آپ سے؟'' سمن کے تیور بگڑے۔

''بصیرہ نے ابھی ابھی ......'' گانے والوں کے شور میں اپنی آواز کو بلند رکھنے کی کوشش کرتے ہوئے سلیم نے بے چینی سے پوچھا، ''کیا اُس نے غلط کہا؟''

سمن نے اُسے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ تیزی سے بصیرہ کی طرف بڑھی۔ اُس کا بازو تھام کر وہ اسے جنگلے کے اور نزدیک لے گئی، ''تم نے سلیم سے کہا کہ میری اور ڈیو کی شادی ہوگئی ہے؟''

گٹار بجاتا شخص اچانک اُچک کر جنگلے کے ستون پر چڑھ گیا تھا۔ بصیرہ اسے حیرت سے دیکھ رہی تھی۔ وہ کیا کرنا چاہتا تھا؟...... سمن کی چبھتی ہوئی آواز دور کہیں سے آ رہی تھی۔ اس کے دل میں کہیں شدید درد کی لہر جاگی۔

''جواب دو......''

یہ اس قدر شور میں کون اس سے جرح کر رہا تھا؟ ملک الموت! سوال و جواب، منکر نکیر؟

''جواب دو نا؟''

''نہیں، نہیں۔ میں نے تو......'' بصیرہ نے کہنا شروع کیا۔

یکایک جنگلے پر چڑھے شخص نے کسی پرند کی طرح بازو ہوا میں بلند کیے اور گٹار سمیت آبشار کی گود میں چھلانگ لگا دی۔ بصیرہ نے چیخ ماری...... تالیاں بجاتے ہاتھ رک گئے۔ ہا ہو کرتے لوگوں کے منھ سے عجیب سی چیخیں نکلیں۔ بھیڑ میں ہلچل سی مچی۔ ایک ریلا سا جنگلے کی طرف لپکا۔ کیا ہوا؟ کیا ہوا؟ کا شور مچا۔ سمن نے بصیرہ کی طرف دیکھا۔ اس کے چہرے سے شدید تکلیف کے آثار ظاہر تھے اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

سمن نے اس کا ہاتھ تھاما۔ اسے پیچھے بنچ تک لے جانے کے لیے لیکن وہ بے ہوش ہو چکی تھی۔

اسی افراتفری میں انھوں نے زاؤں زاؤں کرتی آنے والی ایمبولینس کی آواز سنی۔ وہ ایمبولینس جو آبشار میں کود پڑنے والے شخص کے لیے آئی تھی بصیرہ کو لے کر تیزی سے اسپتال کی طرف بڑھی۔ ایمبولینس بھی چھوٹا موٹا اسپتال ہی تھا۔ اس میں موجود عملے کو اندازہ تھا کہ لڑکی پر دل کا دورہ پڑا ہے۔ ان کی ایمبولینس میں ایسی چیزیں موجود تھیں جن سے وہ اسپتال پہنچنے تک مریض کو سنبھال سکتے تھے۔

عذاب سارے

کبھی ناول کا بیج ذہن میں بویا گیا تھا۔ پودا پھوٹا تھا۔ شاخیں نکلی تھیں۔ کونپلیں پھوٹنی شروع ہوئیں تو میں نے نوٹس لینے شروع کیے۔ بچپن سے عادت تھی، مُنّے مُنّے الفاظ میں نہایت تیزی سے لکھتی تھی۔ یہ خیال نہ تھا کہ ایک وقت آئے گا جب اپنی آنکھیں ساتھ نہ دیں گی اور اپنی ہی تحریر پڑھنا دوبھر ہوگی۔ آنکھوں میں سلاخیں سی گڑیں گی، سر میں دھماکے ہوں گے اور کام پھر کبھی ''اچھے وقت'' کے لیے اُٹھا دیا جائے گا۔ میں نے ناول کے چند باب ہی صاف کیے تھے کہ آنکھوں میں یہ تکلیف شروع ہوگئی اور کام ٹلنے لگا۔

وہ ''اچھا وقت'' دور سے دور تر ہوتا جارہا تھا۔ آہستہ آہستہ ذہن میں اُگے ہوئے پودے کی شاخیں مرجھانے لگی تھیں۔ کہانی پر گرفت کمزور ہونے لگی تھی۔ کردار کتابچوں میں بند نوحہ کناں تھے۔ میں خوف زدہ کہ شاید ہمیشہ کے لیے وہیں دفن ہوجائیں گے اور بے موت مارے جائیں گے۔

یہ صورتِ حال میرے لیے پریشان کن اور تشویش ناک تھی۔ میں اپنے پچھلے ناولوں کے کرداروں کو یاد کرتی تھی۔ وہ کیسے مہمانوں کی صورت میرے پاس رہتے تھے۔ ان سے میری خوب دوستی ہوجاتی تھی۔ وہ مجھے جانتے پہچانتے تھے، میں انھیں جانتی پہچانتی تھی۔ ہم میں مباحثے ہوتے تھے۔ میں انھیں اختلاف کا حق دیتی تھی اور آخر میں ہم کسی نہ کسی ایسے نتیجے پر پہنچ جاتے تھے جو دونوں کے لیے قابلِ قبول ہوتا تھا........ لیکن اس دفعہ دھیرے دھیرے ان کی صورتیں بھی میرے ذہن میں دھندلی ہوتی جارہی تھیں۔ یہی وجہ تھی کہ کبھی کبھی شدید مایوسی میرے دل کو مسلتی تھی اور میں بے اختیار

پکار اُٹھتی تھی، یا اللہ وہ دن کب آئے گا جب میں اس قابل ہوں گی کہ اپنے ان کرداروں کو مہمانوں کی طرح اپنے ہاں رکھ سکوں۔ ان سے میری ایسی ہی دوستی ہو جیسے پچھلے کرداروں سے تھی۔ میں ان کی خاطریں کروں، وہ مجھ پر اعتماد کریں۔ مجھے اعتماد میں لے کر اپنے سارے بھید کھول دیں اور جب وہ رخصت ہوں تو مجھے اطمینان ہو کہ میں نے اپنا فرض بخوبی ادا کیا کہ اب یہ میرے دوست اپنے اپنے ٹھکانوں پر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پہنچ جائیں گے۔ ان کو ہنسی خوشی رخصت کرنے کا عالم اور اس کے بعد تنہائی کا احساس اور زندگی میں ایک خلا، بذاتِ خود ایک دلچسپ تجربہ ہوتا تھا جس میں سے دوبارہ گزرنے کا امکان کم سے کم تر ہوتا جا رہا تھا۔ شدید مایوسی نے بڑھ کر دل کے درد کی صورت اختیار کر لی تھی اور کبھی کبھی مجھے بے اختیار رونا آ جاتا تھا۔

ہمیشہ جب چھٹیاں گزارنے کسی نئی جگہ جاتی تھی تو اپنے ناول کے نوٹس ضرور ساتھ لے جاتی تھی۔ خوب صورت علاقے اور فرصت ان دوستوں کو قریب تر لے آتے تھے، لیکن اس دفعہ جب سردیوں کی چھٹیاں میں نے نیاگرا فالز میں گزارنے کا فیصلہ کیا تو اپنے بکھرے ہوئے کاغذات کا پلندہ ساتھ نہ لائی کیوں کہ ان کو ساتھ لانا ایسا ہی ہوتا جیسے کوئی اندھا اپنا پرانا چشمہ اس لیے ساتھ لے کر پھرتا رہے کہ شاید وہ پھر کبھی اس سے دیکھنے کے قابل ہو جائے گا۔ میں نے گھر پر بھی ایک طرح سے ان کو اپنی نظروں سے دور کر رکھا تھا۔ ان کو ساتھ لانے کا مطلب ہوتا کہ میں احساسِ محرومی کی پوٹ ساتھ باندھ لائی ہوں۔ خواہ مخواہ میری تفریح بھی تباہ ہوتی۔

نیویارک اسٹیٹ کے نشیب و فراز دور دور تک میری نظروں کی زد میں تھے۔ پہاڑوں کے سلسلے جیسے پتھروں کی دیوار، میدانوں کے اونچے نیچے تختے، گھاٹیاں اور نالے جو برف سے جمے ہوئے تھے۔ دریا جو برف کی منجمد لہراتی لکیر بن گئے تھے۔ کھیتوں میں برف ملی مٹی۔ جب بھی اس کو دیکھتی، محسوس ہوتا جیسے کھیتوں میں برف بوئی گئی ہے۔ گھاٹیوں میں بے برگ درختوں کی پتلی شاخوں کے جال اور گچھے آپس میں مل کر ایک عجیب گلابی اور اُودی دھند سی پیدا کر رہے تھے۔ چھوٹے چھوٹے شہروں میں ہر چوراہا، ہر دکان اور ہر گھر کرسمس کی سجاوٹ سے جگمگا رہا تھا۔ چرچ اپنی سجاوٹ میں یکتا تھے۔

راستے بھر برف ملی، مگر پڑی نہیں۔ ایسی خوب صورت اور روشن رات تھی کہ باید و شاید۔ تارے کم تھے مگر یوں جگمگا رہے تھے کہ جی چاہتا تھا ہاتھ بڑھا کر اس نیلے طباق پوش سے دو ایک موتی اکھیڑ لیے جائیں۔ اس نیلے اُفق پر جہاز اُڑتے تارے بنے، جولانیاں بھرتے پھر رہے تھے۔ باہر درجۂ حرارت منفی ہو، حدِ نظر تک برف پڑی ہو، گرم بند کار سے آپ باہر کے مناظر دیکھتے جا رہے ہوں تو کتنی طمانیت کا احساس ہوتا ہے۔ ان حسین علاقوں سے گزرتے ہوئے اچانک وہ دوست یاد آئے

جن سے وابستہ ہر چیز میں گھر چھوڑ آئی تھی۔ اپنے خیال میں اُن کے خیال بھی۔

اچانک مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میرے وہ دوست میرے ساتھ سفر کر رہے ہوں اور اپنی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہے ہوں۔ ان کے ساتھ نے تنہائی کے احساس کو کم کر کے ماحول کو حسین تر کر دیا، مگر ان میں سے کسی نے مجھ سے بات نہیں کی۔ ان کی موجودگی کا احساس غیر مرئی سا تھا۔

نیاگرا گاؤں پہنچ کر سامان موٹل میں ڈال کر میں نیاگرا آبشار کے درشن کو نکل گئی۔ دور سے روشنیوں کے چکر، جلتے بجھتے قمقمے، روشنیوں کے مینار اور درختوں پر روشنیوں کے ہار نظر آ رہے تھے۔ میں کرین نما آبزرویشن ٹاور سے آبشار دیکھنا چاہتی تھی۔ کار سے اُتری تو برف کی کٹیلی ہوا نے اپنے خنجر سے وار کیا۔ دوسرے سیاح بھی ہوا کی زد سے بچنے کی کوشش میں دہرے ہوئے تیز تیز چلتے واپس آتے دکھائی دیے۔ اس تیز ہوا میں چند منٹ سے زیادہ ٹھہرنا ناممکن تھا۔ آنے والے ایک آدھ منٹ پلیٹ فارم سے باہر دیکھتے اور واپس لوٹ جاتے۔ میں نے وہاں کھڑے ہو کر دور سے پھینکی جانے والی نیلی روشنی میں آبشار کو دیکھا۔ وہ کرشن کی مورتی کی طرح سانولا لگا۔ میرا جی نہ چاہا کہ وہاں سے جاؤں اس لیے میں عمارت کی آڑ میں ایک بنچ پر بیٹھ گئی۔ وہاں سے آبشار کو اور اس پر پڑنے والی سرخ، سبز اور اُودی روشنیوں کو دیکھتی رہی۔ پھر ہمت کر کے اُٹھی اور پلیٹ فارم کا ایک اور چکر لگایا۔ سارا پلیٹ فارم پگھلتی برف اور آتے جاتے قدموں کی مٹی سے کیچڑ سا ہو رہا تھا۔ برفیلی ہوا طمانچے سنبھالے تیار کھڑی تھی۔ پہلے میں دھنک پل کی طرف گئی جہاں سے کاریں کینیڈا کی سرحد میں داخل ہو رہی تھیں۔ نیچے دریائے نیاگرا کا پانی سیاہی میں مدغم ہو چکا تھا۔ گھوم کر پھر آبشار کی طرف آئی۔ اب اس پر سبز روشنی ڈالی جا رہی تھی اور اس کا رنگ ہلکا انگوری تھا۔ انگور کا عرق باریک لہریوں اور اونچی دیوار اور باریک پھوار کی صورت گر رہا تھا۔ میں تنہا وہاں کھڑی اندھیرے میں دھائیں دھائیں گرتے اس معجزے کو دیکھتی رہی۔ میرا جی چاہا کاش میرے ناول کا کوئی کردار اس وقت میرے ساتھ ہوتا۔ یکا یک اپنے ذہن میں کسی کی موجودگی کا بڑا واضح احساس ہوا۔ میں ذرا سا ٹھٹکی تو اُس نے کہا۔

''آپ مجھے نہیں پہچانیں؟ میں ڈیو ہوں۔''

''ڈیو........'' ذہن نے چھن بھر سوچا اور پھر میں نے مسرت لمحے بھرے لہجے میں پوچھا؟

''کیا تم سچ مچ ڈیو ہو؟''

''جی ہاں......آپ نے بہت عرصے سے حال احوال نہیں پوچھا تو خیال آیا کہ میں ہی چلا چلوں۔''

''میں تو آج ہی تمھیں یاد کر رہی تھی مگر اس مایوسی کے ساتھ کہ اب میں تمھیں کبھی اپنے دوسرے

کرداروں سے نہیں ملوا سکوں گی۔ کبھی تم سب مل کر میری کتاب کا تانا بانا نہ بن سکو گے۔''

''ایسی مایوسی کی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' ڈیو نے خوش دلی سے کہا، ''اگر آپ اپنے لکھے ہوئے مٹتے الفاظ نہیں پڑھ سکتیں تو ہم سب آپ کی مدد کر سکتے ہیں۔ ہم خود اپنی کہانی آپ کو سنا سکتے ہیں۔ آخر آپ نے ہمیں ایک سوچنے والا ذہن دیا ہے۔ عاقل و بالغ بنایا ہے۔'' وہ خوش دلی سے ہنسا۔

ہوا کی کٹیلی زد میں اب لمحہ بھر کھڑا رہنا بھی دوبھر تھا۔ میں تیزی سے چلتی دوبارہ ستون کی آڑ میں بنچ پر بیٹھ گئی۔ ڈیو میرے ساتھ آیا۔ اپنے دستانوں میں چھپے ہاتھوں کو مزید گرم کرنے کے لیے میں نے کوٹ کی جیبوں میں ڈال لیا۔

''میں سمن کو بھی یاد کر رہی تھی۔'' میں نے کہا، ''اپنے ناول کا آغاز میں نے اُسی کی کہانی سے کیا تھا۔''

''ارے چھوڑیے۔ آپ کہانی کا آغاز مجھ سے کیجیے، میری داستان اس سے زیادہ دلچسپ ہے۔''

''واقعی.....!'' مجھے اس کا انداز اچھا لگا۔ آبزرویشن ٹاور کی نیم تاریکی میں بھی وہ قطعی امریکن نظر آ رہا تھا کیوں کہ اس کا وجود میری باطنی آنکھ دیکھ رہی تھی۔

''دیکھیے نا، مجھے یقین ہے کہ میرا باپ پاکستانی تھا۔ میں اپنے باپ کی تلاش میں پاکستان گیا تھا اور وہاں مجھے بڑے عجیب و غریب لوگوں سے واسطہ پڑا اور کئی نئی باتیں معلوم ہوئیں۔''

''اچھا! اب چلتے ہیں تم راستے میں مجھے اپنی کہانی سنانا۔'' میں نے کہا۔

کار میں بیٹھ کر میں نے اپنی موٹل کی راہ پکڑی۔ ڈیو نے اپنی داستان شروع کی۔ وہ سناتا جاتا تو مجھے یاد آتا جاتا کہ ہاں اس کی کہانی کا آغاز یوں ہی ہوا تھا۔

میں شیخوپورہ میں پیدا ہوا تھا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ چار سال کی عمر سے پہلے میں نے مما کی جان کھانا شروع کر دی تھی کہ وہ مجھے اسکول میں داخل کر دیں۔ ڈیڈ انجینئر تھے۔ وہ اپنے کام پر چلے جاتے تھے۔ مما ڈاکٹر تھیں۔ انھوں نے شیخوپورہ میں اپنی کلینک کھول رکھی تھی۔ رہتے ہم لاہور میں تھے۔ ڈیڈ اور مما کے جانے کے بعد سارا دن میں نوکروں کے ساتھ رہ رہ کر تنگ آ گیا تھا۔ مما مجھے انگریزی اور امریکن اسکولوں میں لے کر گئیں مگر انھوں نے کم عمر کہہ کر مجھے داخل کرنے سے انکار کر دیا۔ تب مما نے میری ضد سے مجبور ہو کر مجھے شیخوپورہ کے ایک پرائمری اسکول میں داخل کر دیا۔ ان کا خیال تھا کہ اس طرح میں ان کے قریب رہوں گا، ڈرائیور کے ذریعے وہ ایک طرح سے مجھ پر نظر رکھ سکیں گی۔ جس قسم کا وہ اسکول تھا، مما کا خیال تھا کہ چند دن میں ہی میرا نشہ ہرن ہو جائے گا اور میں اس کو خیرباد کہہ دوں گا مگر ایسا نہیں ہوا۔ گاؤں کا اسکول جہاں بچے کچی زمین پر بوریاں بچھا

کر بیٹھتے تھے اور اسکول کے آگے لگے ہینڈ پمپ کے نیچے بیٹھ کر گھٹنوں تختیاں دھوتے اور ملتانی مٹی ملتے تھے اور خط لگے قلموں سے پکی سیاہی سے اُردو الفاظ لکھتے تھے، مجھے بہت پُراسرار سا لگتا تھا۔ چکوں کے بچوں کے ساتھ بیٹھ کر پڑھنا اور کھیلنا، اُن کے ساتھ اُردو اور پنجابی بولنا اپنے گھر میں سارا دن مکھیاں مارنے سے کہیں بہتر تھا۔

اس مقامی اسکول کے کھیل میں گُلی ڈنڈا اور مضامین میں اُردو سب سے پہلے سیکھی۔ بہت کم عمری سے میں نے اُردو کی کہانیاں پڑھنی شروع کردی تھیں۔ اسکول کے بعد ڈرائیور کار لے کر مجھے لینے آتا اور کار میں بیٹھتے ہی دنیا بدل جاتی۔ میں چک کے اسکول کے طالب علم سے ایک بڑے انجینئر امریکن باپ کا بیٹا اور امریکن ڈاکٹرنی کا بیٹا بن جاتا۔ گھر جاتے ہی دھول بھرے جوتے سارا دن گھر میں کام کرنے والے جمعدار کے حوالے کردیے جاتے۔ نہا کر کپڑے تبدیل کرتا تو اسکول کے کپڑے کوارٹر میں رہنے والے دھوبی کے پاس فوری طور پر بھیج دیے جاتے جہاں سے دوسرے دن وہ پھر کلف لگے، استری سے اکڑے، ہینگر میں لٹک کر آجاتے۔ ڈیڈ اور مما کے ساتھ میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھانے کے بعد میں نزدیک کے کلب چلا جاتا جہاں انگریز یا انگریز نما پاکستانی یا اپنے جیسے امریکن لڑکوں کے ساتھ سوئمنگ کرتا۔ شام کو ایک ٹیوٹر پڑھانے آتے جن سے میں اُردو کی کہانیوں کی کتابیں لانے کی فرمائشیں کرتا اور اُن کے جانے کے بعد پچھلے باغ میں سفید فوارے کے پیچھے بیٹھ کر پڑھا کرتا۔ شہد کی مکھیوں سے بھرے درختوں کے سائے میں خوشبوؤں، تتلیوں اور جھاگ بھرے گرتے فوارے کے بیچ میں بیٹھ کر طلسماتی کہانیاں پڑھتا اور رات کو ایسے طلسماتی خواب دیکھتا جن کے آگے ساری داستانیں گرد ہو جاتیں۔

''تمھاری ایک بڑی بہن اور بھائی بھی تو تھے۔'' میں نے ڈیو کو یاد دلایا۔

''میں نے سن رکھا تھا کہ میری پیدائش سے پہلے وہ کئی کئی ماہ کے لیے آن کر مما اور ڈیڈ کے پاس رہتے تھے مگر میرے ہوش سنبھالنے کے بعد سے میں نے انھیں نہیں دیکھا تھا۔ وہ دونوں امریکا میں پڑھ رہے تھے۔ تہواروں کے موقعے پر وہ اپنی تصویریں کارڈوں کے ساتھ بھیجا کرتے تھے۔ مما دونوں کو طویل خط لکھا کرتی تھیں اور کارڈوں کے نیچے میں ٹیڑھے میڑھے حروف میں اپنے دستخط کر کے ان کو بھیجا کرتا تھا۔

مما کو میرے معاملات میں ہمیشہ دلچسپی رہی مگر ڈیڈ کو میرے بارے میں شاید اتنا ہی معلوم ہ جتنا کسی پڑوسی بچے کے بارے میں۔ یہ بات آج بھی اتنی ہی صحیح ہے جتنی اس وقت تھی جب میں انھیں ہی اپنا سگا باپ سمجھتا تھا۔ کبھی بھی کوئی پوچھ لیتا کہ میں کون سے اسکول یا کون سی کلاس میں پڑھتا ہوں

تو وہ بغلیں جھانکنے لگتے۔ مجھے تو اُن کا اور مما کا رشتہ بھی ڈاکٹر اور مریض کی طرح غیر جذباتی سا لگتا تھا۔ یہ اور بات کہ وہ ڈیئر اور ڈارلنگ کے بغیر لقمہ نہ توڑتے تھے۔ ان کے ہاں شکووں کا، شکوک و شبہات کا، رشک و حسد کا، محبتوں میں فراق و وصال کے تند و تیز جذبات کا، دل ٹوٹنے اور جڑنے کا کوئی دخل نہیں تھا۔ ایک مرنجاں مرنج شریف النفس دریا تھا جو اپنے کناروں کے اندر رساں رساں بہتا رہتا تھا۔ نہ کبھی خشک ہوتا تھا نہ اس میں طغیانی آتی تھی۔ اس دریا کے دو کناروں پر دو شہر آباد تھے جن کے درمیان بنے پل سے آمد و رفت جاری تھی۔ ایک شہر کا نام انجینئر ولیم اور دوسرے کا نام ڈاکٹر ایلس تھا۔

ہاں تو مما کی امید کے برعکس میں اس اسکول میں پڑھتا رہا۔ وہاں میرے ساتھ خصوصی سلوک ہوتا تھا اس لیے دوسرے بچوں کے ننگے بدنوں پر نیم کی ننگی قمچیاں پڑتے دیکھنا بھی مزے دار لگتا تھا۔ مار کھاتے ہوئے ان کا تلملانا اور ہائے ماٹ صاحب مر گیا، کہہ کہہ کر اپنے پیانہ پڑے سرخ ہاتھوں کو دونوں ٹانگوں کے درمیان چھپانا، فارغ اوقات میں درختوں پر غلام لکڑی اور زمین پر کلی کلی کانٹا کھیلنا مجھے آج تک یاد ہے۔

ایک دن اسکول سے واپس کلینک گیا تو مما فوری طور پر جانے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ انھوں نے ڈرائیور سے کہا کہ مجھے کار میں کہیں سیر کرالائے۔ ڈرائیور مجھے ہرن مینار لے گیا اور اس نے مجھے بتایا کہ شہزادہ سلیم نے یہ مینار اپنے چہیتے ہرن کی یادگار کے طور پر بنوایا تھا۔ ہرن مینار کے اندر کی پکی تپلی سیڑھیوں پر گھومتا ہوا چڑھ رہا تھا تو یکایک محسوس ہوا جیسے میں پہلے بھی کبھی یہاں آیا ہوں۔ اُوپر پہنچ کر مٹیالی دیواروں کے درمیان بے پٹ کی کھڑکیوں سے باہر جھانک کر دیکھا چوکور تالاب کے بیچوں بیچ ایک عمارت تھی جس میں چوطرف ایک راستہ جا رہا تھا۔ خالص مغلیہ توازن کی اس مثال کو دیکھتے ہوئے پھر یوں لگا جیسے یہ عمارت ذہنی یا جسمانی طور پر میری کھنگالی ہوئی ہے حالاں کہ مجھے خوب معلوم تھا کہ میں اس سے پہلے کبھی یہاں نہیں آیا۔ کچی مٹی کی دیوار ہزاروں ناموں سے کھدی پڑی تھی۔ زمین پر پڑی ہوئی ایک کیل اُٹھا کر میں نے اپنا نام ڈیو کھودا پھر ڈیڈ کا نام کھودتے ہوئے جو میرے نام کا حصّہ تھا جانے کیوں میرا جی اُچاٹ ہو گیا۔ میں نے کیل زمین پر پھینکی اور دھیرے دھیرے نیم تاریک پتلا زینہ اُترنے لگا۔ اس وقت بے اختیار جی چاہا کہ تالاب کے بیچ بنی اس عمارت میں جاؤں اور اس کا نقشہ اپنے ذہن میں بنے اس دُھندلے نقش سے آزماؤں جو آہستہ آہستہ صاف ہو رہا تھا۔ مغلیہ عمارت کے صدر دروازے سے گزر کر ہم تالاب کے درمیان بنے پکے راستے پر آگے بڑھتے گئے۔ عمارت کے اندر پہنچ کر آزمائش کے لیے میں نے ڈرائیور سے پوچھا۔

''ہم اس عمارت میں نیچے بھی تو جا سکتے ہیں نا، پانی کے قریب تک؟''

''ہاں چلو، یہ سیڑھیاں وہیں جارہی ہیں۔'' ڈرائیور نے کہا۔ اس سے پہلے گھومتی سیڑھیاں اُتر کر میں نیم تاریک محرابوں تلے جا کھڑا ہوا۔ تالاب کا سیاہی مائل پانی میرے قدموں میں تھا۔ وہ سیلی سیلی عجیب سی بو تھی جو مانوس سی لگی۔

ڈرائیور بتا رہا تھا کہ مغل بیگمات اپنی باندیوں کے ساتھ اس پردے کی جگہ پر آ کر غسل کرتی تھیں۔ شاید وہ جتانا چاہتا تھا کہ وہ امریکن عورتوں کی طرح بے حیا نہیں تھیں جو برائے نام جانگیے پہن کر مردوں کے ساتھ غسل آبی اور آفتابی کرتی ہیں۔ میں اس وقت یہ سوچ رہا تھا کہ میں اس جگہ یا اس سے ملتی جلتی جگہ کب گیا ہوں؟ ایسا ہی تالاب چوطرفہ راستہ، درمیان میں عمارت، عمارت کے نیچے سیڑھیاں، تاریک محرابیں، سیاہی مائل پانی اور سیلی سیلی عجیب سی بو۔ کبوتروں کی غٹرغوں کی طرح مبہم اور اُداس اور اس کے ساتھ ذہن میں ایک الجھن، جیسے کسی عزیز ہستی کو نہ پہچان سکنے کی تلاطم اور بے قراری۔ لاہور کے سورج کی تراڑی وہاں نہیں تھی، نیلے آسمان پر سفید ابر پاروں کی سی خنکی تھی پھر بھی دل کو کچوکتی ایک نامعلوم چبھن لیے واپس اُوپر آیا۔

مما کو سارا قصہ سنایا تو خیال تھا کہ وہ میرے بچپنے پر ہنسیں گی اور ڈیڈ کو اور اپنی دوستوں کو میری قوتِ متخیلہ کا یہ کمال ہنس کر سنائیں گی مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ ان کے سفید ماتھے پر دونوں آنکھوں کے درمیان سوچ کی لکیریں اُبھریں۔ ایک دو تین...... یہ لکیریں اُن کی سوچ کی شدت کے لحاظ سے پڑتی تھیں۔ اُس دن وہ یقیناً تین لکیریں تھیں۔

مجھے فکر ہوئی کہ مما مجھے آئندہ اس خوب صورت جگہ جانے سے نہ روک دیں مگر ایسا نہیں ہوا۔ مما کو جب بھی کام ہوتا اور ڈرائیور کے ساتھ مجھے ہوا خوری کو بھیجتیں میں اُسے ہرن مینار چلنے کو کہتا۔ مینار سے تین طرف پھیلے سبزہ زار، کھیت، چرتی گائیں اور ایک طرف تالاب کے بیچ بنی سرخ عمارت مجھے بے حد اچھی لگتی تھی اور میرا دل بے اختیار ان کی طرف کھنچتا تھا۔ ابھی بمشکل اُردو پڑھنی شروع کی تھی مگر مینار کی دیوار پر گودے گئے ان ٹیڑھے بانکے زنانہ اور مردانہ ناموں کو پڑھنا میرا محبوب مشغلہ تھا۔ عجیب بات ہے، اتنا عرصہ ہوگیا اب بھی جب میں اس بات کو بیان کر رہا ہوں تو میرے دل میں وہ کیفیات پیدا ہو رہی ہیں جو اُس وقت ہوتی تھیں گو ان پر ایک دُھندسی چھائی ہوئی ہے۔ وہ نمی، پانی پر سے آتی ہوا اور محرابوں کے تلے تاریکی جس صورت میں مجھے یاد آتی ہے ایسی دنیا کی کوئی عمارت یاد نہیں آئی جب کہ میں دنیا کے بہت سے مشہور ملک اور مقامات دیکھ چکا ہوں۔

موٹل کی پارکنگ میں گاڑی کھڑی کر کے اپنا باقی سامان اُتارا۔ تالا کھول کر اپنے کمرے میں آئی۔ اس دوران ڈیو بغیر کچھ کہے سنے غائب ہوگیا تھا۔ اتفاق سے اس موٹل کے ساتھ چھوٹا سا ایک

ریسٹوراں تھا۔ میں نے وہاں جا کر کھانا کھایا۔ شب خوابی کا لباس پہننے کے بعد میں نے باہر دیکھا اور سوچا کہ کاش ڈیو پھر آ جائے۔

رات کے نو بجے تھے۔ گرمیوں میں اس وقت جھٹپٹے کا وقت ہوتا تھا اور ہری ہری گھاس میں جگنو جگمگاتے پھرتے تھے، اس وقت آدھی رات کا سا سماں تھا۔ چاند کی تیسری یا چوتھی تاریخ ہوگی مگر برف چاندی کی طرح چمک رہی تھی۔ سڑک کی شفتالو رنگ روشنیاں، آس پاس کی عمارتوں کی سفید روشنیاں اور موٹل میں پونم کے چاند جیسے گول گلوب کی سفید روشنیاں سب اپنی اپنی جگہ آسمان سے گرنے والے روشنیوں کے آبشار میں بہت خوب صورت لگ رہی تھیں۔ برف بھری راتوں میں روشنیوں کا یہ غبار کہکشاؤں سے اُترنے والے مسلسل کاروانوں کا سا سلسلہ لگتا تھا۔ ہر جگہ روشنیوں کا پڑاؤ جیسے پریوں کی برات اُتری ہو اور پریاں سفید لباس پہنے ہلکے ہلکے رقص کر رہی ہوں۔ چاند کی سیڑھیوں سے چھما چھم اُترتی پریاں کچھ لوگوں کو ضرور نظر آتی ہوں گی۔ ہم تو ہیں پردیس میں، دیس میں نکلا ہوگا چاند......
کیسٹ پلیئر پر عابدہ پروین نے سراپا۔ یہ بات کتنی غلط کتنی صحیح تھی۔ چاند تو ہر جگہ وہی ہوتا ہے مگر دیس کا چاند کتنا یاد آتا ہے۔ اپنا جانا پہچانا چاند! پردیس کا چاند اجنبی سا لگتا ہے، ناآشنا، بے گانہ......
مگر یہ تو ہم جیسوں کا چاند ہے، تخیل پرستوں کا ورنہ حقیقت پسندوں کا چاند تو کچھ اور ہی ہے۔ ریت اور پتھروں اور غاروں سے بھرا چاند۔ وہ کہتے ہیں انسانی زندگی کائنات کے اربوں کھربوں کہکشاؤں، سورجوں، چاندوں، ستاروں اور سیاروں میں ایک حقیر کیڑے کی سی ہے۔ ہم کہتے ہیں اس کی اپنی زندگی میں تخیل کی اربوں کھربوں کہکشائیں، سورج، چاند تارے اور سیارے بھی تو ہیں۔ ان سب کی کھوج کے لیے بھی تو یہ زندگی بہت ننھی سی ہے اور جب آپ تسخیر کائنات کے لیے نکلتے ہیں اور فضا میں بہت اونچی اُڑانیں بھرنے لگتے ہیں تو آپ کی حقیقت پسندی تخیل پرستی بن جاتی ہے۔ کتنے نظام شمسی ہیں؟ کون سیارہ کس کے گرد گھومتا ہے اور کیوں؟ ہزاروں لاکھوں میل دور کسی اور سیارے کے مدار کی لرزش کتنی دور کے کسی اور سیارے کی چال کو بدل دیتی ہے۔ کسی سیارے کے آسمان پر ایک، کسی کے آسمان پر کئی کئی سورج اور کئی کئی چاند چمکتے ہیں۔ کہیں کوئی سیارہ فنا ہو چکا مگر اس کا شفق رنگ داغ اب تک باقی ہے۔ کسی آسمان پر سورجوں کی زنجیر روشنیوں کی کڑیوں کی شکل میں چمک رہی ہے۔ کہیں نیلے سورج کی آغوش میں سرخ گیند ماں کی گود میں بچے کی طرح بیٹھی ہے۔ پیچ دار چٹان کے بیچ کھلی کھڑکی سے ایک بیضوی چمک دار سیارہ تیزی سے گھومتا دکھائی دے رہا ہے۔

ہم تو ہیں پردیس میں، دیس میں نکلا ہوگا چاند

ہاں جس طرح میں یہاں تنہا تھی، مسلسل تنہائی کا ایک لامتناہی احساس جس کو یہ گانا اور بڑھا رہا

تھا۔ کبھی کبھی ماحول ان گانوں میں زیادہ معنویت ڈال دیتا ہے۔ ایورس ڈیل کے نیشنل پارک میں اقبال کی نظم اور ملکہ پکھراج کی آواز مجھ کو تو ڈراتی ہے اس دشت کی پہنائی۔ تو شاخ سے کیوں پھوٹا، میں شاخ سے کیوں ٹوٹا، ایک جذبۂ پیدائی، ایک جذبۂ یکتائی زیادہ بامعنی بن جاتی ہے۔ سموکی ماؤنٹین میں اس غزل میں، مٹ گئیں آہیں فقط دل میں دھواں سا رہ گیا، جان پڑ جاتی ہے اور چاندنی رات میں انشا جی کی غزل، کل چودھویں کی رات تھی پروائی ہوا کی طرح زخموں میں ٹیس اُٹھانے لگتی ہے۔

یکا یک برف پڑنی شروع ہوگئی۔ چاند برف کی دُھند میں چھپ گیا۔ سفید پنکھڑیوں کی طرح چپ چاپ برسنے والی یہ برف بڑی سرد دل اور کٹھور ہوتی ہے۔ اس کی اور میری نفرت ملی محبت کی سی وقت پسند دوستی ہے۔ وہ مجھے پسند بھی ہے اور اس سے وابستہ ٹھنڈ سخت ناگوار بھی ہے۔ برف کہیں رُکی ہوئی تھی، کہیں بکھری ہوئی تھی اور کہیں جمی ہوئی تھی۔ اس کے بھی ہزاروں رنگ ہیں۔ اس کے ساتھ ٹھنڈ وابستہ نہ ہوتی تو ہر رنگ خوب صورت ہوتا مگر ہر پھول کے ساتھ کانٹا اور ہر برف کے ساتھ سردی وابستہ ہے۔ کیا کیا جائے۔ زمین پر بہشت کہیں نہیں ہے۔

''زمین پر بہشت کہیں نہیں ہے۔ بہت خوب، کس نے کہا ہے؟''

''میں نے..... اچھا ہوا تم آ گئے، میں تمھیں یاد ہی کر رہی تھی۔''

''مجھے معلوم ہے۔ آپ سوچ رہی تھیں کہ اتنی جلدی آپ سو نہیں سکتیں اور ایسے موسم میں باہر جا نہیں سکتیں۔ اگر ڈیو کی بک بک سن لی جائے تو کیا حرج ہے۔ اشارہ ملتے ہی میں آ موجود ہوا۔''

''دوستوں کا یہ فائدہ ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''آپ اکیلے میں اپنے ہی مقولے دُہرا رہی تھیں؟'' ڈیو شرارت سے ہنسا۔

''ہاں...... آج ہل چلی ہوئی ایک زمین میں برف پڑی دیکھی تو یوں لگا جیسے کھیت میں کسی نے برف بوئی ہو۔ سوچا اس کا بھی کوئی محاورہ ہونا چاہیے۔ جو لوگ برف بوئیں گے وہ کیا کاٹیں گے؟''

''جو برف بوئیں گے وہ پانی کاٹیں گے۔'' ڈیو نے فی البدیہہ کہا۔ ''ظاہر بات ہے، مطلب یہ کہ جو کچھ نہیں بوئیں گے وہ کچھ نہیں کاٹیں گے۔'' وہ مسکرایا۔

''محاورہ برا نہیں۔'' میں نے کہا، ''اب آئے ہو تو تسلی سے بیٹھو اور اپنی داستان شروع کرو۔''

''تو سنیے..... مگر تسلی سے بیٹھو تو آپ یوں کہہ رہی ہیں جیسے میں جسمانی طور پر آپ کے سامنے موجود ہوں۔''

''علامتی طور پر بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی جم کر رہو جیسے آگ لینے نہیں آئے۔''

''جب تک آپ چاہتی ہیں تب تک ہی رہ سکتے ہیں، آپ کا دھیان دوسری طرف گیا، اس کے

معنی محفل برخاست۔''

''اچھا!......تم مجھے بتاؤ، میرے ماحول کا تمھیں کتنا علم ہے؟''

''جتنا آپ بتائیں۔''

''یعنی تمھیں یہ معلوم نہیں کہ میں کہاں ہوں اور میرے آس پاس کیا ہو رہا ہے؟''

''کیسے معلوم ہو سکتا ہے جب تک آپ بتائیں نہیں۔ آپ کے ذہن سے باہر ہمارا وجود کہاں ہے؟''

''عجیب سی بات ہے، مجھے تو تم سب بالکل جیتے جاگتے لگتے ہو، گویا میں تمھیں ہنستا بولتا، چلتا پھرتا دیکھ سکتی ہوں۔''

''خالق اور مخلوق میں یہی فرق ہوتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' میں نے کریدا۔

''خالق اپنی مخلوق کو دیکھ سن سکتا ہے۔ اس کے دلوں کا حال جانتا ہے، اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کو اس سے زیادہ سمجھتا ہے لیکن مخلوق خالق کے بارے میں اتنا ہی جان سکتی ہے جتنا وہ چاہے۔'' ڈیو نے کہا۔

''اپنے لیے مجھے خالق کا لفظ مناسب نہیں لگتا۔ خالق سانس لیتے لوگ بناتا ہے، ہم محض تصویریں بناتے ہیں۔ تم میرے کردار ہو، مخلوق نہیں۔''

''میں تو خود کو تصویر نہیں سمجھتا، بہرحال حقیقت اپنی جگہ ہے کہ آپ ہمیں آزاد یا خود مختار سمجھیں، ہمیں معلوم ہے کہ آپ ہماری قسمت بدلنے پر قادر ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ آپ نہ بدلیں۔''

''بات یہ ہے کہ ناول کی ایک شکل ہے اور ہر شخص کی موجودگی کی کوئی نہ کوئی وجہ ہے۔ ہر شخص کے کردار کی کچھ بنیادی خصوصیات ہیں۔ ان کو ناول کی شکل اور وضع کے اندر رہ کر اپنے کردار کی بنیادی خصوصیات کے مطابق ہی کرنا ہے جو کچھ کرنا ہے۔ ہمیں کرداروں سے ہمدردی اور محبت تو ہے مگر ہمارا تعلق ان سے اسی طرح رہے گا جیسے وہ ہیں، ان کو بدلنے کی ضرورت ہی کیا ہے!'' میں نے کہا۔

''اچھا، بات کچھ کچھ میری سمجھ میں آ رہی ہے۔'' ڈیو کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

''تم اپنا قصہ سنانے والے تھے نا؟'' میں نے یاد دلایا۔

''کوئی حرج تو نہیں، اگر بچپن کی باتیں مختصر کر دوں؟''

''کر دو۔'' میں نے کہا۔

''بہت بچپن میں مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی کہ میں مما اور ڈیڈ کا سگا بیٹا نہیں ہوں۔ جب ہم

پاکستان سے واپس امریکا گئے وہاں ڈیڈ نے انجینئرنگ کی اپنی فرم کھولی جو خوب چل نکلی۔ مما نے اپنی پسند کا بڑا سا گھر لیا اور ہم خاصے ٹھاٹھ باٹھ سے رہنے لگے۔ تب مختلف لوگوں سے سن کر اور پیٹر کا رویہ دیکھ کر یہ بات ذہن نشین ہونے لگی کہ پیٹر اور میگی کی طرح میں ڈیڈ اور مما کا سگا بیٹا نہیں بلکہ لے پالک ہوں۔ شروع میں پیٹر صرف مجھے تنگ کرتا تھا، آہستہ آہستہ اُس نے جتانا شروع کیا کہ یہ میرا گھر نہیں ہے، اس گھر کی چیزیں میری نہیں ہیں، مما میری ماں نہیں ہیں اور وہ خود میرا بھائی نہیں ہے۔ اکثر وہ کہتا، ''ماں سے پوچھو وہ تمھیں کہاں سے اُٹھا لائی ہیں اور وہیں دفعان ہو جاؤ۔'' آہستہ آہستہ یہ بات میرے دل میں بیٹھنے لگی کہ میں اس گھر کا حصہ نہیں ہوں اور رفتہ رفتہ میں اس گھر میں اجنبی بننے لگا۔ ڈیڈ اور مما، پیٹر، میگی اور مجھ میں کوئی فرق نہیں سمجھتے تھے۔ میگی عمر میں مجھ سے پندرہ سولہ سال بڑی تھی اور بہت محبت آمیز سلوک کرتی تھی مگر پیٹر نے ہر نعمت میں زہر گھول دیا۔ آخر میں نے بہانے بہانے سے مما سے اپنے اصل والدین کا پتا پوچھنا شروع کیا۔ مما ہمیشہ یہ کہہ کر ٹال دیتیں کہ انھیں میرے سگے والدین کے بارے میں معلومات نہیں ہیں اور میں اس فکر میں خود کو نہ گھلاؤں کیوں کہ وہ سب مجھے بے حد چاہتے ہیں اور بالکل سگا بیٹا سمجھتے ہیں۔ یہ بات صحیح تھی۔ میں ان کا دل نہیں دُکھانا چاہتا تھا اس لیے پیٹر کے طعنے تشنے برداشت کرتا رہتا تھا۔ کبھی برداشت سے باہر ہو جاتی تو مما سے اس کی شکایت کر دیتا جس پر اسے خوب ڈانٹ پڑتی مگر نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ مجھے اور بھی زیادہ ستانے کی کوشش کرتا۔

ہاں ایک بات تو میں نے آپ کو بتائی ہی نہیں کہ جب سے مجھے معلوم ہوا تھا کہ مما میری مما نہیں ہیں، میں خواب میں اپنی ماں کو دیکھا کرتا تھا۔ وہ مما سے بالکل مختلف ہوتی تھیں۔ کوئی بات بھی مما جیسی نہیں تھی۔ مما کو نوجوانی کے عالم میں کبھی نہیں دیکھا مگر میری ماں بہت کم عمر سی، چھوٹی سی، معصوم سی، نرم نرم، گندھے ہوئے میدے ایسی گرم اور ملائم تھیں۔ وہ معصوم، کمسن ماں مجھے من مانی کرنے دیتی تھیں اور اُن کے سامنے میں جی بھر کے شرارتیں کرتا اور ہنستا تھا۔ اُن کے چہرے پر ہمیشہ ایک خوف سا رہتا تھا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ مجھ سے بھی ڈرتی ہوں۔ محبت اور ڈر کے ایسے ملے جلے جذبات میں نے مما کے چہرے پر کبھی نہیں دیکھے تھے۔ چار سال کی عمر سے مجھے اُردو کی کہانیاں اور داستانیں پڑھنے کا جو چسکا لگ گیا تھا وہ اب تک باقی تھا، شاید اسی وجہ سے مجھے عجیب طلسماتی خواب دکھائی دیتے تھے۔ ایسی جگہیں جو میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھی تھیں۔ میں سوچا کرتا تھا مما سیدھا سپاٹ بھٹے کا پودا ہیں جس کا پھل خوب صورتی سے زیادہ افادیت رکھتا ہے۔ خواب میں دکھائی دینے والی ماں گل بکاؤلی کا پھول ہے جس میں پراسرار قوتیں ہوتی ہیں جو ہر ایک کو نہیں ملتا۔ جان جوکھوں کے بعد مل جائے تو اندھی آنکھوں میں روشنی آجاتی ہے۔

ایک خلش سی میرے دل کو لگی رہتی تھی۔ گھر میں سب کچھ تھا۔ کئی گاڑیاں تھیں۔ ہمارا اپنا ایک یاٹ تھا مگر میں دوستوں کو اپنے گھر لانے سے کتراتا تھا کیوں کہ پیٹر کسی نہ کسی طرح ان پر یہ انکشاف کرنا ضروری سمجھتا تھا کہ میں اس گھر کا لے پالک ہوں۔ اس کو ایک عجیب شوق تھا۔ وہ لکڑی کے تختوں پر رنگ و روغن سے بڑی محنت کے ساتھ لکھتا تھا: ''یہ شارعِ عام نہیں ہے، مداخلت کرنے والے کو کڑی سزا ملے گی یا اُسے گولی سے اُڑا دیا جائے گا یا اس پر کتے چھوڑ دیے جائیں گے۔'' یہ لکھتے وقت یا لگاتے وقت وہ مجھے بار بار دکھاتا تھا اور مجھے ایسی نظروں سے دیکھتا تھا جیسے جتانا چاہتا ہو کہ تم بھی ایک طرح سے اس گھر میں بلا اجازت داخل ہونے والوں میں سے ہو اور تمھارے ساتھ یہی سلوک ہونا چاہیے۔ ان تختوں کو وہ گھر کے باغ اور احاطے کی مختلف حدوں میں گاڑ دیتا تھا۔

پیٹر، ڈیڈ کی کمپنی میں کچھ کام کرتا تھا مگر میرا خیال ہے کہ برائے نام۔ اس کو نئی نئی کاروں کا شوق تھا۔ آئے دن کاریں بدلتا تھا لیکن جس دن مما نے مجھے میری پسند کی ایک نئی سائیکل خرید کر دی اس کے آگ لگ گئی۔ اس نے جھگڑا شروع کیا۔ میں نے دُوبدو جواب دیا۔ میگی نے میری طرف داری کی جس پر پیٹر نے میگی کے ایک طمانچہ جڑ دیا۔ گھر بھر میں کھلبلی سی مچ گئی۔ مما نے پیٹر کو خوب ڈانٹا مگر وہ ڈھیٹ بنا رہا کہ وہ ایک غیر لڑکے کی خاطر کسی گھر کے فرد کو اپنی بے عزتی کرنے کی اجازت نہیں دے گا۔ میگی کا داخلہ ہاورڈ میں ہوگیا تھا۔ وہ وقت سے پہلے ہی اپنا سامان اُٹھا کر وہاں کے لیے روانہ ہوگئی۔ اُس دن میرے دل میں زبردست احساسِ جرم نے سر اُٹھایا۔ میری وجہ سے گھر میں رنجشیں پیدا ہو رہی تھیں، گھر کے افراد بکھر رہے تھے، مجھے چاہیے کہ اپنے والدین کا پتا چلاؤں اور بقول پیٹر کے یہاں سے دفعان ہو جاؤں۔ میں نے مما سے بات کی تو انھوں نے مجھے گلے سے لگا لیا اور کہا کہ پیٹر کی بدمزاجی کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس کی فطرت ہی اس قسم کی ہے۔ میں نہیں ہوں گا تب بھی گھر کے افراد سے اسی طرح لڑتا رہے گا۔ اُس رات دس سال کی عمر میں اپنی پہلی کہانی میں نے لکھی جس میں ایک شہزادے کو ایک دیو یا قلعے میں بند کر دیتا ہے اور ایک بہادر شہزادی مردانہ لباس میں آن کر اسے بچاتی ہے۔

یہ سلسلہ چلتا رہا۔ جس دن پیٹر مجھے زیادہ پریشان کرتا اس دن دل کی بھڑاس نکالنے کو میں ایک کہانی لکھتا جس میں ہیرو میں ہوتا اور ظالم دیو درندہ پیٹر ہوتا۔

میں نے بیس سال کی عمر میں ایک ناول لکھنا شروع کیا۔ مما نے دن رات مجھے لکھتے دیکھا تو پوچھا کہ میں کیا کر رہا ہوں؟

''میں ناول لکھ رہا ہوں مما!'' میں نے خوش ہو کر بتایا، ''یہ ایک پندرہ سولہ سال کی لڑکی کی کہانی

ہے۔ اس عمر میں اس کے ایک بچہ پیدا ہوتا ہے۔ ماں مر جاتی ہے اور بچہ اکیلا رہ جاتا ہے۔''

یہ کہانی سن کر مما کا رنگ فق ہوگیا۔ میں نے دیکھا کہ اُن کے ہاتھ آہستہ آہستہ کانپ رہے تھے۔ انھوں نے میز سے خوشبو میں بسا ایک ٹشو پیپر لیا اور اس سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے میری طرف غور سے دیکھا۔

''یہاں آؤ...... مجھے تم سے کوئی بات کرنی ہے۔'' وہ آگے چلیں میں پیچھے پیچھے۔ اس سال گرمیوں میں ہم نے باغ میں بیٹھنے کا ایک کمرہ بنایا تھا جو سارے گھر سے ملا ہوا بھی تھا اور الگ بھی۔ وہاں پہنچ کر مما ایک آرام دہ کرسی پر بیٹھ گئیں اور مجھے نزدیک کی ایک رنگ دار کینوس کی کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔

''دیکھو، مجھے ٹھیک ٹھیک بتاؤ، کیا تمھارے ڈیڈ نے تمھیں کچھ بتایا ہے؟''

''کس بارے میں؟'' میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

''کس بارے میں..... مما نے دہرایا۔ ''تمھارے بچپن کے بارے میں، جب ہم پاکستان میں رہتے تھے، اس کے یا کسی لڑکی کے بارے میں......'' وہ کہتے کہتے رُک گئیں اور ٹکٹکی لگا کر میری طرف دیکھنے لگیں۔

میں گھبرا گیا۔

''نہیں، انھوں نے مجھے کچھ نہیں بتایا، خدا کی قسم مما...... انھوں نے مجھے کسی لڑکی کے بارے میں نہیں بتایا۔''

انھوں نے ایک ٹھنڈا سانس لیا اور سر کرسی کے پچھائے سے ٹکا دیا۔ وہ بہت دیر تک خاموش آنکھیں مونڈے لیٹی رہیں۔ میں نے ان کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیا تو وہ بہت ٹھنڈا تھا۔

''مما! کیا بات ہے، آپ پریشان ہیں؟ آپ اتنی ٹھنڈی کیوں ہو رہی ہیں؟''

''یہ بہت ٹھنڈا کمرہ ہے۔ جالیوں سے باہر کی ہوا اندر آتی ہے۔'' انھوں نے کہا۔ اب وہ سنبھل چکی تھیں۔ ''تم ابھی ناول لکھنے کے لیے بہت چھوٹے ہو۔ اپنی تعلیم کی طرف زیادہ توجہ دو۔'' وہ دوبارہ ڈاکٹر ایلس بن چکی تھیں۔

''مگر لکھتے رہنے میں حرج کیا ہے؟'' میں نے اصرار کیا، ''ہوسکتا ہے میں ابھی اسے ختم نہ کروں مگر ابھی تک جو کچھ میں نے محسوس کیا ہے وہ تو لکھ سکتا ہوں۔''

''مثلاً.... کیا محسوس کیا ہے تم نے اب تک؟'' مما نے پوچھا۔

''بہت کچھ، محبتیں، نفرتیں اور خوف۔ مما!'' یکا یک میں جوش میں آ کر بولنے لگا، ''کبھی کبھی دن میں یا رات میں اچانک مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی بہت اچھی بات، بہت ہی اچھی بات مجھے

معلوم ہوتے ہوتے رہ گئی ہو۔ جیسے جیسے اندھیرے میں اتنی دیر کو بجلی جلے اور بجھ جائے کہ آدمی سوچتا ہی رہ جائے، کیا اُجالا ہوا تھا؟ ہوا تھا تو کیسا تھا؟ کیا تھا؟ کون سی چیز نظر آئی ہوگی؟ مگر کچھ پتا نہ چلے۔ بس وہ خوب صورت بات ہوتے ہوتے رہ جاتی ہے۔ کبھی یوں محسوس ہوتا ہے جیسے بادلوں بھرے دن میں لمحے بھر کو سورج نکل کر دوبارہ بادلوں میں چھپ جائے۔ جیسے دھنک دکھائی دے اور دوبارہ دیکھو تو لگے کہ نظر کا دھوکا تھا مگر دل کہے کہ نہیں دھوکا نہیں تھا، وہ سچ مچ تھی۔ ایسی ہی کوئی بات۔ میں پوری طرح بیان نہیں کر سکتا مگر کوشش کروں گا کہ لکھ سکوں۔''

''میرا اب بھی یہی خیال ہے کہ تم اس کام کے لیے ابھی بہت چھوٹے ہو۔'' انھوں نے کہا، پھر وہ اُٹھیں اور کچھ سوچتے ہوئے ہال سے گزر کر گھر کے اندر چلی گئیں۔

میں وہیں بیٹھا رہا۔ جالی لگی دیواروں سے چڑیوں کے بولنے کی آوازیں، گیلی گھاس اور چیڑ کے درختوں کی ملی جلی خوشبو اندر آ رہی تھی۔ میرے سامنے کی شاخ پر ایک نارنجی کارڈینل سر پر تاج سجائے بڑی رعونت سے بیٹھا تھا۔ گھاس پر تین چار چڑیاں کھسر پھسر کر رہی تھیں جیسے تاجِ شاہی کے خلاف سازش میں شریک ہوں۔

تقریباً پندرہ منٹ بعد مما پھر آئیں، میرے برابر بیٹھ گئیں۔ کرسی پر رکھے ہوئے میرے ہاتھ پر شفقت سے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ اب وہ ہاتھ سرد نہیں تھا بلکہ اپنے ٹھنڈے ہاتھ پر مجھے وہ گنگنا سا لگا۔

''ڈیوڈ ڈیئر!'' انھوں نے کہنا شروع کیا، ''میں نے عہد کیا تھا کہ یہ بات تمھیں کبھی نہیں بتاؤں گی لیکن تمھاری باتوں سے بار بار اندازہ ہوتا ہے کہ قدرت چاہتی ہے کہ تمھیں یہ بات معلوم ہو تو سنو میں تمھیں سب کچھ بتائے دیتی ہوں مگر یاد رکھنا میں صرف وہی بتا سکتی ہوں جو مجھے معلوم ہے اور بہت سی باتیں مجھے بھی معلوم نہیں ہیں۔''

ان کے انکشاف پر میں جل کر بیٹھ گیا مگر بولا کچھ نہیں کہ کہیں میرے لہجے یا آواز کی تھرتھراہٹ سے مما میرے دل کی حالت جان جائیں۔ مما بہت آہستہ آہستہ اپنے الفاظ تول تول کر بولنے کی عادی ہیں۔ بات جتنی سنجیدہ ہو وہ اتنی ہی پرسکون اور اطمینان سے بات کرتی ہیں اور الفاظ کا ناپ تول بھی بڑھتا جاتا ہے۔ وہ اس طرح بیٹھی تھیں کہ میں تو ان کے سامنے تھا ہی گھر کے دروازے اور باغ پر بھی ان کی نگاہ تھی۔ گمبھیر آواز میں ٹھہر ٹھہر کر انھوں نے بات شروع کی۔

یہ پاکستان کے شہر شیخوپورہ کا قصہ ہے...... تمھاری پیدائش سے چار پانچ ماہ پہلے کی بات ہے۔ ایک دن شام کو جب میں اپنا سامان سمیٹ کر کلینک سے باہر نکلی تو نرس میرے پیچھے دوڑتی ہوئی آئی۔ اُس نے بتایا کہ ابھی ابھی ایک لڑکی کلینک میں لائی گئی ہے، اس کی عمر پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہیں

ہے۔ وہ بے انتہا سہمی ہوئی ہے۔ معلوم ہوتا ہے اس نے بچہ گرانے کے لیے کوئی اُلٹی سیدھی چیز کھالی ہے مگر وہ کسی بات کا ٹھیک سے جواب نہیں دیتی۔ اس کی اُردو بھی واجبی سی ہے۔ وہ بلتستانی یا پشتو یا کوئی اور زبان بولتی ہے۔ میں اُلٹے پاؤں پھری۔ واقعی اس لڑکی کے بچے کے ضائع ہونے کا امکان تھا اور وہ مارے ڈر کے زرد پڑی ہوئی تھی۔ اس کے کچے گورے چہرے پر جسمانی تکلیف کے ساتھ ذہنی انتشار کے آثار تھے۔ میں نے اس کا اعتماد حاصل کرنے کے لیے اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو میں اسے تسلی دی اور چند بے ضرر سے سوال کیے۔ اس کے کم سن چہرے پر خوف اور پریشانی کے سائے ویسے ہی رہے۔ لمحے بھر کو چاروں طرف دیکھ کر اس نے مایوسی سے سر جھکا لیا۔

''وہ کہاں ہے؟'' اُس نے آہستہ سے کہا۔

''کون؟'' میں نے پوچھا۔

''شاہ نواز۔'' اُس نے کہا۔

''وہ جو تمھیں لے کر آیا تھا اسے ہم نے گھر بھیج دیا ہے۔ یہاں اس کے ٹھہرنے کی کوئی جگہ نہیں ہے اور وہ ٹھہر کر کرتا بھی کیا۔ صبح آ جائے گا۔'' نرس نے نرمی سے کہا۔ لڑکی نے بے یقینی سے اس کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہوں میں ہزاروں سوال تھے مگر اس نے کچھ نہ پوچھا۔

مارفیا کے انجکشن، دواؤں اور اس کا بستر اونچا کر دینے سے امید بندھی کہ شاید بچہ رہ جائے۔ میں نے نرس کو ہدایات دیں۔ بطورِ خاص منع کیا کہ اس سے کوئی ایسے سوال نہ کرے جس سے وہ پریشان ہو کیوں کہ وہ پہلے ہی بہت فکرمند لگتی تھی۔ اس کے بعد گھر کے لیے روانہ ہوگئی۔ میں نے نرس کو بتا دیا تھا کہ رات میں اس کی طبیعت زیادہ خراب ہو تو مجھے فوراً ٹیلی فون پر اطلاع دے مگر رات کو فون نہیں آیا اور دوسرے دن جب میں کلینک پہنچی تو لڑکی کی طبیعت بہت بہتر تھی۔ قصہ مختصر زینت چند دن میرے کلینک میں رہی۔ اس کا شوہر پھر نہ آیا۔ میں نے اپنے اثر کو کام میں لا کر شہر میں ایک جگہ اس کے رہنے کا انتظام کر دیا۔ بدقسمتی سے بچے کی پیدائش میں بے چاری لڑکی مر گئی تو میں نے اسے خود پالنے کا فیصلہ کر لیا کیوں کہ وہ بچہ بے انتہا پیارا تھا اور میں ہی نہیں تمھارے ڈیڈ بھی پہلی ہی نظر میں اس پر عاشق ہو گئے تھے۔ مما نے نہایت پیار سے میرا ہاتھ دبایا اور مسکرائیں۔ جب وہ محبت سے مسکراتیں تو ان کی آنکھوں کے پاس باریک جھریاں اُبھر آتیں اور ان کی آنکھوں میں موتی سے ٹوٹتے۔ شاید وہ منتظر تھیں کہ میں مما کہہ کر اُن کے گلے سے لگ جاؤں گا لیکن میرے دل میں سیکڑوں سوال سر اُٹھا رہے تھے۔

''آپ نے اس سے کبھی نہیں پوچھا کہ میرا باپ کیا کرتا تھا اور وہ ماں کو ایسی حالت میں تنہا

چھوڑ کر کیوں غائب ہوگیا؟'' میں نے پوچھا

''بیٹے! کم ترقی یافتہ ملکوں کی اپنی مشکلات ہوتی ہیں، تم یہاں بیٹھے ان کو نہیں سمجھ سکتے۔ لڑکی کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ دیہاتی لوگ تھے۔ اس کے شوہر کی پہلے دو بیویاں اور کئی بچے تھے۔ وہ لگ کر کام کرنے کا عادی نہیں تھا۔ کام کی تلاش میں وہ لاہور آیا تھا مگر اسے کام نہیں ملا۔ بیوی کو محفوظ سمجھ کر شاید وہ ملازمت کی تلاش میں کہیں اور نکل گیا۔ بچے کی پیدائش کے بعد وہ ایک مرتبہ کلینک میں آیا۔ جب اسے پتا چلا کہ زینت مرگئی ہے تو اس نے کہا کہ وہ اتنے چھوٹے بچے کو نہیں پال سکتا اور خوشی سے اسے دینے کو تیار ہے، چناں چہ ہم نے تمھیں گود لے لیا۔''

''مجھے یقین نہیں آتا کہ کوئی اپنے بچے کو بلا کسی وجہ کے اس طرح ہمیشہ کے لیے دے سکتا ہے۔'' میں نے دکھ سے کہا۔

''ارے میاں، کس چکر میں پڑے ہو'' مما بگڑ کر بولیں، ''تمھارے اپنے ترقی یافتہ ملک میں کتنے بچے ہیں جو اپنے بدنی ماں باپ کے پاس پلتے ہیں؟ کسی کی سگی ماں نہیں ہوتی، کسی کا سگا باپ، کسی کا کوئی بھی سگا نہیں ہوتا۔ تمھیں یقین نہ آئے تو اور بات ہے۔ اب تو یہاں دو ماؤں اور دو باپوں اور ان کی فیملی کا چکر چل نکلا ہے۔ میں ایسی دو عورتوں کو جانتی ہوں جن میں سے ایک اس لڑکے کی ماں ہے مگر وہ دوسری کو بھی ماں ہی کہتا ہے۔ کوئی پوچھے کہ یہ کہاں سے آیا ہے تو ماں بڑے اطمینان سے کہتی ہے کہ ایک دوست نے تحفتاً دیا ہے۔ اس لڑکے کا سگا باپ کہتا ہے کہ میں اس کا بدنی باپ ہوں لیکن اور کسی معاملے میں اس کا باپ نہیں ہوں، چناں چہ بڑے ہوکر کبھی اس نے پوچھا تو میں ساری صورتِ حال اسے سمجھا دوں گا۔ ان کا خیال ہے کہ جب تک یہ بچے بڑے ہوں گے ایسے مصنوعی طور پر پیدا شدہ بچوں کی تعداد اتنی زیادہ ہوجائے گی کہ کوئی عجوبہ نہ رہے گا۔ بچے اس بات کو محسوس بھی نہ کریں گے۔''

''ہوسکتا ہے۔'' میں نے اپنے اندر بڑھتے ہوئے غصّے کو دبا کر کہا، ''لیکن میں آج سے بیس سال پہلے پیدا ہوا تھا اور بقول آپ کے میرا ڈی۔ این۔ اے بلو پرنٹ (d.n.a blue print) پاکستانی ہے تو میں وہ بات کیسے برداشت کرسکتا ہوں جو میرے پرکھوں نے نہیں سنی اور آنے والی کئی نسلیں بھی کسی طرح نہیں سمجھ سکیں گی۔'' میں یونی ورسٹی میں پولیٹیکل سائنس پڑھ رہا تھا لیکن جینیٹک انجینئرنگ کی نئی سائنس میں خاصی دلچسپی لیتا تھا۔ میری بات سے یکایک مما کا رنگ زرد ہوگیا۔ شاید ان کو ایسے جواب کی امید نہ تھی۔ کچھ دیر وہ بالکل سیدھی اور خاموش بیٹھی رہیں۔ جب ان کو غصّہ آتا یا وہ کسی ذہنی کش مکش میں ہوتیں تو یوں ہی بیٹھ جاتیں۔ ذرا دیر بعد وہ کرسی سے اُٹھ

بیٹھیں۔

"بہر حال،" انھوں نے کہا۔ "جو کچھ مجھے معلوم تھا تمھیں بتا دیا۔ اب آگے اپنی جان کو نہ گھلانا۔ یقین کرو ہم تمھیں اپنے سگوں سے زیادہ چاہتے ہیں اور ہمیشہ چاہیں گے۔ تمھارے ڈیڈ اور میرے وصیت نامے میں تمھارا اتنا ہی حصہ ہے جتنا پیٹر اور میگی کا۔" طویل القامت، پروقار نپے تلے قدم اُٹھاتیں وہ میرے پاس آئیں، پیار سے میرا سر تھپتھپایا۔ آہستہ سے میرے ماتھے پر بوسہ دیا اور بے آواز قدموں سے واپس گھر کے اندر جانے کے لیے بڑھیں۔

"مما!" میں نے اُن کا ہاتھ تھام لیا۔ "لاہور شہر میں میری ماں غریب عورتوں کے ادارے میں رہی تھیں؟"

مما نے لوٹ کر مجھے دیکھا۔ ان کی سمجھ میں نہیں آیا کہ میں یہ سوال کیوں کر رہا ہوں۔

"نہیں...... گورنمنٹ اسکول کے ایک اُستاد صوفی رحمت اللہ تھے، اُن کی بیوی شاید زینت کی دوست تھی۔ وہ وہاں رہی مگر خرچ میں نے برداشت کیا کیوں کہ صوفی صاحب کے بھی پہلی بیوی سے کئی بچے تھے۔ یہ ان کی دوسری بیوی تھیں۔"

"آپ نے مجھے وہیں کے کسی خاندان کو کیوں نہیں دے دیا؟" میں نے پوچھا۔

"وہاں بے سہارا بچوں کو گود لینے کا اتنا رواج نہیں ہے اور جب خدا نے ہمیں اتنا دیا تھا کہ ہم تمھیں آسانی سے رکھ سکتے تھے تو کیوں نہ رکھتے۔ پیدائش کے بعد تم سب سے پہلے میرے ہاتھوں میں آئے۔ اسی لمحے میں نے تمھیں اپنا سمجھا۔ اس وقت مجھے کیا معلوم تھا کہ تم بڑے ہو کر مجھ سے ایسے سوال کرو گے۔" مما کے چہرے پر سچ مچ کا دُکھ تھا۔ میں شرمسار ہو گیا۔

"آئی ایم سوری۔" میں نے کہا۔

مما مسکرائیں۔ میں نے جس ہاتھ سے ان کا ہاتھ تھام رکھا تھا، اس کے پچھلے حصے پر پیار کیا اور محبت سے میری طرف دیکھتی اندر چلی گئیں۔ میں سیدھا اپنے کمرے میں گیا، اپنی ڈائری میں جو میں مقفل رکھتا تھا، گورنمنٹ ہائی اسکول اور صوفی رحمت اللہ کے نام بڑی حفاظت سے سنبھال سنبھال کر لکھے۔ ایک دوسرے صفحے پر شاہ نواز اور زینت نام بھی، حالاں کہ یہ دو نام میرے دل پر نقش ہو چکے تھے اور ان کو بھول جانے کا کوئی سوال نہ تھا۔ ڈائری کو دوبارہ مقفل کرنے کے بعد میں نے اپنی پرانی اُردو کی کتابیں نکالیں بہت دیر تک ان کو پڑھتا اور ان پر پیار سے ہاتھ پھیرتا رہا۔ اس دن اُردو زبان سے بالکل مادری زبان کی سی محبت محسوس ہوئی۔ جہاں کہیں سے اُردو کی کتاب ملتی منگوا لیتا۔ ایشین لائبریری جا کر اُردو رسالے اور اخبار پڑھتا اور وہاں سے اُردو کی کتابیں لے کر آتا۔ خاصا وقفہ ہو گیا

تھا لیکن آہستہ آہستہ میری اُردو کی قابلیت بڑھنے لگی۔ یونی ورسٹی میں غیر ملکی زبان لینے کا وقت آیا تو میں نے اُردو زبان لے لی اور جنوبی ایشیا میرا محبوب ترین مضمون بن گیا۔ مما سے پھر میں نے کسی قسم کے سوال جواب نہ کیے۔

یونی ورسٹی کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد جب میں نے کم تنخواہ اور زیادہ دردِ سر والی تیسری دنیا کی ملازمت کا انتخاب کیا تو میرے کئی دوستوں نے مجھے بڑا احمق سمجھا۔ مما نے اسے بچپنا جانا، بالکل ویسی ہی، وقت سے پہلے اسکول جانے کی ہٹ۔ انھوں نے زیادہ مخالفت نہیں کی اور اجازت دے دی۔ مما کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی کہ میں پاکستان جا کر اپنی جڑوں کو کھوجوں گا۔''

صبح کو جب میری آنکھ کھلی تو چند لمحے تک ڈیو کی کہانی مجھے بالکل یاد نہ آئی۔ پھر آہستہ آہستہ حافظے کی ڈور پکڑ کر چلی تو آخری جملہ جو یاد آیا وہ یہی تھا، مما کے فرشتوں کو بھی خبر نہیں تھی...... شاید اسی وقت مجھے نیند آ گئی تھی اور ڈیو مجھے سوتا دیکھ کر رفو چکر ہو گیا تھا۔

دوسرے دن تیار ہو کر گوٹ آئی لینڈ کی سیر کو نکلی۔ برف کے میدان اور دریائے نیاگرا کا چوڑا پاٹ ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ دریا میں ہلکی ہلکی لہریں اُٹھ رہی تھیں۔ مشرق میں پورا سورج نکل آیا تھا اور دریا میں اس کا عکس ایک چوڑی سفید پٹی کا پل بنا رہا تھا۔ عین وہی موسم تھا جو میں نے چاہا تھا۔ کبھی کبھی خواہشیں خوب پوری ہوتی ہیں، میں نے سوچا..... میں نے چاہا تھا کہ جب میں سردیوں میں نیاگرا کی سیر کو نکلوں تو وہاں برف پڑی ہو مگر میرے پہنچنے کے دن برف باری نہ ہو، بارش نہ ہو اور سخت برفیلی ہوا نہ ہو...... چناں چہ ایسا ہی تھا۔ گوٹ لینڈ میں ہیلی پیڈ بند تھا۔ سفید برف کے میدانوں میں نیم سوختہ درخت یا سرو کے سرسبز درخت ایستادہ تھے۔ کھانے کی میزیں، گرمیوں کی پکنک کی گھما گھمی سے دور برف سے اٹی پڑی تھیں۔ بگلے دریا پر نیچی اُڑانے کر رہے تھے۔ گفٹ شاپ کے پارکنگ لاٹ میں کار کھڑی کر کے میں نیاگرا کے امریکن آبشار کی طرف بڑھی۔

آدم نہ آدم زاد!...... چڑیاں بھی نہیں تھیں مگر چاروں طرف سے تڑ تڑ کی آوازیں کانوں میں آ رہی تھیں۔ سر اُٹھا کر کئی بار اُوپر دیکھا۔ کبھی چونک کر دائیں بائیں نگاہ کی۔ یکا یک برف کا ایک لمبا سا بازو میرے قدموں میں تڑ سے گرا۔ رات کو آبشار کی پھوار درختوں کے تنوں اور شاخوں پر برف بن کر جم گئی تھی۔ اس وقت وہ ٹوٹ ٹوٹ کر گر رہی تھی۔ یہ انجانی آوازیں برف کے چٹخنے اور ٹوٹ کر زمین پر گرنے کی تھیں۔ ایک بورڈ اس خطرے سے آگاہ کرتا دکھائی دیا۔ سخت برف سے سرِ عزیز کو خطرہ تو یقیناً تھا لیکن خطرے کو نظر انداز کر کے میں نے دو آبشاروں کی درمیانی یخ بستہ جگہ پر جانے کا فیصلہ کیا۔ برف کی پگڈنڈی پر سنبھلتے ہوئے نیچے اُتر رہی تھی تو محسوس ہوا جیسے اور بھی کوئی ہمراہ ہے۔

''میں سمن ہوں۔'' میٹھی باریک سی ایک آواز آئی۔ پانچ فٹ ایک انچ کی میری دبلی پتلی ہیروئن میرے ذہن سے لچکتی ہوئی نکلی۔ اس کی بھوری آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔

''میں نے بھی آپ کی مدد کا فیصلہ کرلیا ہے۔'' سمن نے بڑی ذمہ داری سے مجھے مطلع کیا۔

''بہت خوب!'' میں نے خوش ہو کر کہا، ''آؤ پھر دو آبشاروں کے درمیان اس برف بھرے پیالے میں جا بیٹھتے ہیں، وہاں کوئی مخل نہیں ہوگا۔''

برف کے گول گول تار زمین سے نکل کر دوبارہ زمین میں پیوست ہو رہے تھے۔ موسمِ گرما میں یہ سرسبز جھاڑیاں رہی ہوں گی۔

''اپنی کہانی کہاں سے شروع کرنا چاہتی ہو؟'' میں نے سمن سے پوچھا۔

''اپنی زندگی کے ایک نہایت برے دن سے جب بہت سے حادثے ایک ساتھ ہوئے۔'' اس نے خندہ جبینی سے کہا۔ اس کے لہجے میں وہ تلخی نہیں تھی جس کی مجھے توقع تھی۔

نیچے پہنچ کر پتھروں پر سے برف جھاڑتے ہوئے میں نے سامنے دیکھا۔ کینیڈا کا اپنی نعل نما آبشار ہمیشہ کی طرح دھائیں دھائیں گر رہا تھا۔ جھاگ کی پھواریں ہوا میں اُڑ رہی تھیں۔ سیاہ پتھروں پر برف کی قلمیں ہاتھی کی سونڈیں بن کر لٹک رہی تھیں۔

''ہاں اب سناؤ۔'' میں نے پتھر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''میں ایم اے انگریزی ادب کا امتحان دے چکی تھی۔ یونی ورسٹی میں مختلف موضوعات پر انگریزی میں کیسٹ بھرے جا رہے تھے۔ ان کے لیے میرا انتخاب ہوا تھا اور میں اب بھی یونی ورسٹی جاتی تھی۔ میں بے دلی سے یونی ورسٹی کے ریمپ پر چڑھ رہی تھی جب سلیم تیز تیز قدم اُٹھاتا میرے برابر پہنچا۔ میں نے اسے نظر انداز کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ اُن دنوں میں سے ایک دن تھا جو بلا وجہ آدمی کو مالیخولیا میں مبتلا کرتے ہیں۔ سارا آسمان بھوسلا ہو رہا تھا اور ہوا تیز...... ہر جگہ دھول اُڑ رہی تھی۔ تیز ہوا نیچے میدان میں بکھرے کاغذوں اور پتوں کو ریمپ کے آس پاس کونوں میں دھکیل دیتی اور دوسرے جھونکے میں خود ہی پھر سارے میں بکھیر دیتی۔

''سمن کہاں جا رہی ہو؟'' سلیم نے پوچھا۔

میں بغیر رُکے، بغیر جواب دیے چلتی رہی۔

''سمن! مجھے تم سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں، کہاں بیٹھنا چاہو گی؟'' سلیم کے لہجے میں جواب کے لیے اصرار تھا۔

''ریڈنگ روم میں۔'' میں نے جان بوجھ کر ایسی جگہ کا نام لیا جہاں بہت سے لوگ ہوں۔

''نہیں...... کہیں اور......'' اُس نے ذرا لجاجت سے کہا۔

میں بغیر جواب دیے آگے بڑھتی رہی، لائبریری میں آ کر ریڈنگ روم میں جانے کے بجائے زینہ چڑھنے لگی۔ وہ بھی ساتھ لگا رہا۔ دوسری منزل کی بالکنی کی منڈیر سے لگ کر کھڑے ہونے کے بعد میں نے کہا، ''بات مختصر ہو تو اچھا ہے، مجھے پوائنٹ پکڑنا ہے۔''

یونی ورسٹی روڈ کے پاس آسمان پر ریت کے بادل چھائے ہوئے تھے۔ شاید وہاں سے ریت بھر کر لے جانے والے چھکڑوں سے مٹی اُڑ رہی تھی۔ نیچے ببول کے سایوں میں گاڑیاں بے ترتیبی سے کھڑی تھیں۔

''کیا وہ مسجد نئی بنی ہے؟'' سلیم نے سامنے کی مسجد کے لانبے پتلے مینار کی طرف اشارہ کیا۔ تب ہی مجھے شبہ ہوا کہ کوئی بات ایسی ہے جو فوری طور پر حضرت کے منھ پر نہیں آ رہی ہے۔ میں بھی بے زاری سے سامنے دیکھتی رہی۔ دفتر کی عمارت کے پاس چند لڑکے لڑکیاں باتوں میں مصروف تھے۔ ایک لڑکا اور ایک لڑکی ان سے ہٹ کر دیوار سے لگے بیٹھے تھے۔

''مجھے یونی ورسٹی کا یہ سماں اچھا لگتا ہے۔'' سلیم نے کہا۔ ''پورے پاکستان میں یہی ایک جگہ ہے جہاں لڑکے بے جھجک لڑکیوں سے بات کر سکتے ہیں۔''

''واقعی۔'' میں نے طنز سے کہا، ''ہوٹلوں اور ساحلِ سمندر کے بارے میں کیا خیال ہے؟''

طنز کو سمجھ تو گیا ہوگا، مگر کچھ سوچ کر پی گیا۔ میں نے کلائی کی گھڑی پر نظر ڈالی، یونی ورسٹی کا چکر کاٹ کر بسیں لائبریری کے پیچھے بس اسٹاپ کی طرف جا رہی تھیں۔ مجھے اندازہ تھا کہ اب تک وہاں طلبا اور طالبات کا ہجوم لگ چکا ہوگا۔

''آپ مجھ سے کچھ کہنا چاہتے تھے؟'' بالآخر میں نے سلیم کو یاد دلایا۔

''ہاں...... وہ..... امان شادی کر رہا ہے۔'' اس کی جھجک کے باوجود یہ جملہ پتھر کی طرح میرے سر پر اچانک آن کر گرا۔ میری نگاہیں بے اختیار اس کی طرف اُٹھیں اور دل ہی دل میں خدا کا شکر ادا کیا کہ وہ میری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ اس کی نظریں اب بھی سامنے مسجد کے مینار یا آس پاس اُڑتی ہوئی چیلوں پر جمی ہوئی تھیں۔ ''مجھے افسوس ہے۔'' آخر میں اس نے اضافہ کیا۔ میں تب تک خود پر قابو پا چکی تھی۔

''افسوس کس بات کا؟'' میں نے کہا، ''یہ جملہ میرے لیے ایسا ہی ہے جیسے آپ کہیں آج دھول اُڑ رہی ہے۔'' دل میں خوش تھی کہ اس نے میری طرف نگاہ نہیں کی ورنہ وہ ضرور بھانپ لیتا کہ دھول میرے چہرے پر بھی اُڑ رہی تھی۔ سلیم نے اپنے بازو منڈیر پر رکھ دیے اور نیچے دیکھتا رہا۔

''دھول اور دھویں سے دم بھی تو گھٹتا ہے۔'' ذرا دیر بعد وہ بولا، ''تمھارے لیے یہ خبر ایسی تو نہیں؟''

''ہوسکتا ہے، ہو..... مگر اس سے زیادہ اہم بھی نہیں۔ اب میں چلوں گی، میری بس کا وقت نکلا جا رہا ہے۔''

''تو تم یہ نہیں پوچھو گی کہ وہ کس سے شادی کر رہا ہے۔؟'' سلیم نے کہا۔ میں جل ہی تو گئی۔

''پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔'' میں نے کہا، ''میں ایسے لڑکوں کو خوب جانتی ہوں جو طرح طرح کی لڑکیوں سے دل بہلاوے کے لیے دوستی کرتے ہیں اور بعد میں اپنی عمر سے دس پندرہ سال کم عمر کسی گوری چِٹی لڑکی سے ماں بہنوں کی آڑ لے کر شادی کرتے ہیں۔ وہ بھی کسی ایسی ہی لڑکی سے شادی کر رہا ہوگا جس کے کان میں کبھی میری بھنک پڑی اور اُس نے میرے بارے میں پوچھ لیا تو اس کے گال پر طمانچہ مار کر کہے گا، شٹ اپ۔''

اب سلیم نے میری طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں ہمدردی کی ملائمت تھی۔ ''امان کی حرکتوں نے تمھیں سارے لڑکوں کی طرف سے بدگمان کر دیا ہے۔'' اس نے نرمی سے کہا۔

''جی ہاں......'' میں نے ڈھٹائی اختیار کی۔ ''اور اس سے فرق بھی کیا پڑتا ہے؟''

''شاید تم ٹھیک کہتی ہو۔'' وہ افسردگی سے بولا۔

میں عمارت کا زینہ اُترنے لگی۔ وہ بھی ساتھ ہولیا۔ ریمپ پر ساتھ ساتھ چلتے ہوئے اس نے کہا، ''جی تو نہیں چاہتا کہنے کو..... مگر میں جو بات کہنے آیا تھا وہ کچھ اور تھی۔''

''فرمائیے......'' میں نے کہا، ''جس بات کو کہنے اتنی بطورِ خاص آئے ہیں اُسے بھی کہہ ہی ڈالیے۔''

''اصل میں امان نے مجھے مجبور کیا...... پھر بھی میں نہ آتا.....'' وہ رُک رُک کر بول رہا تھا۔ ''معلوم نہیں کیوں میں چاہ رہا تھا کہ تمھیں یہ خبر کسی اور طرح نہ ملے، مثلاً اس کے شادی کے کارڈ سے۔ تم نہایت قریبی عزیز ہو، شادی کا کارڈ تو جائے گا ہی اور شاید تم اور تمھاری امی شرکت بھی کریں۔''

''سلیم صاحب! یہ ہماری پرابلم ہے۔ آپ جس مقصد سے آئے ہیں وہ بیان کیجیے۔'' میں نے قدرے ترشی سے کہا۔

''امان چاہتا تھا کہ شادی میں یا بعد میں کوئی ایسی بات نہ ہو.....'' وہ پھر خاموش ہوگیا۔

''کیسی بات؟'' میں نے تجاہل سے کام لیا۔

''جس سے بدمزگی ہو بھئی.....'' آخر وہ کھلا، ''مگر تم سے مل کر مجھے اندازہ ہوا کہ تمھاری طرف سے کوئی ایسی بات نہیں ہوسکتی۔''

''بہت کچھ ہوسکتا ہے سلیم صاحب!'' میں طنز سے نہ چوکی۔ مجھے اس شخص پر بے حد غصہ آ رہا تھا

جو اپنے دوست کا یہ مجہول پیغام لے کر میرے پاس آیا تھا۔ ''آپ نے وہ فلمیں نہیں دیکھیں جس میں لڑکیاں عین شادی کے دن زہر کھا لیتی ہیں یا گوٹے لچکے کے کپڑے پہن کر، سر پر جھومر لگا کر عشقیہ گانے گاتی ہیں۔''

سلیم کھسیانی ہنسی ہنسا۔ اس کے چہرے پر بے بسی اور بے چارگی کا پسینہ دیکھ کر مجھے رحم آ گیا۔ میں نے اس سے کہا، ''سنیے...... امان کی زندگی کا دوغلا پن اور دُہری شخصیت اس کی زندگی میں زہر گھولنے کو کافی ہے مگر آپ اس سے یہ ضرور کہہ دیجیے کہ میں اس کے کسی حکم کی پابند نہیں ہوں۔ میں چاہتی ہوں کہ وہ ساری عمر اس بات سے ڈرتا رہے۔ یہ میری مرضی ہے کہ میں کسی سے کچھ کہوں یا نہ کہوں۔ اگر نہیں کہوں گی تو صرف اس لیے کہ امان اور اس سے متعلق سارے لوگوں کو میں نے اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا ہے۔''

''اس میں تم مجھے بھی شامل کر رہی ہو؟'' سلیم نے پوچھا۔

''یقیناً!'' میں نے کہا۔

''تمھیں نہیں معلوم میں نے کتنی مرتبہ امان کو سمجھایا تھا۔ کئی مرتبہ جی چاہا تھا تم سے کہوں، تم بہت بھولی ہو، امان اس کا فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ وہ تمھارا کزن یا منگیتر یا جو کوئی بھی ہے تمھاری زندگی تباہ کر دے گا، مگر تم سے کہنے کی ہمت نہیں پڑی۔ ڈرتا تھا کہیں تم ہی مجھے نہ ڈانٹ دو۔''

''جی نہیں......'' میں نے رکھائی سے کہا، ''آپ امان کے دوست تھے۔ یہ دوستی کے خلاف تھا کہ آپ مجھ سے کہیں کہ میرے دوست کی طرف سے ہوشیار رہنا۔''

''تم اب بہت سمجھ دار ہو گئی ہو۔'' سلیم نے ہتھیار ڈالنے کے انداز میں کہا۔

''دھکے کھا کر لوگ سنبھل جاتے ہیں۔'' میں نے اپنی طرف سے آخری کلمہ کہہ کر بات ختم کر دی۔

''میرا خیال ہے تم ضرورت سے زیادہ سمجھ دار ہو گئی ہو۔'' سلیم نے کہا۔ میں اس بات کا مطلب نہیں سمجھی مگر پوچھا بھی نہیں۔ ہم ایک ساتھ ریمپ سے نیچے اُترے۔

''چلو تمھیں نیپا چورنگی تک چھوڑ دوں۔'' سلیم نے کہا۔

میں نے گھڑی دیکھی۔ یونی ورسٹی کی بسوں کا وقت گزر چکا تھا۔ عام بس نہ جانے کتنی دیر میں آئے۔ نیپا چورنگی منھ پر ہی تھی۔ وہاں تک کار میں چلے جانے میں ایسا کوئی حرج نہ تھا۔ ریمپ سے چند قدم کے فاصلے پر ریت میں ببول کے نیچے اس کی نیوی بلو کار کھڑی تھی۔ چھت پر ببول کے زرد پھول اور سبز باریک پتیاں بکھری پڑی تھیں۔ میں گاڑی میں اس کے برابر کی سیٹ پر بیٹھ گئی۔

''ناز بھابی سے ملنے آؤ گی؟'' گاڑی چلاتے ہوئے اُس نے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' میں نے صفائی سے انکار کر دیا۔

''کیوں نہیں؟'' سلیم نے پوچھا۔

''ناز میری دوست ہے جو بالکل اتفاق سے آپ کی بھابی بن گئی ہے۔ میں صرف دوست کی حیثیت سے اس سے ملنا چاہتی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''یہ مجھے بھی معلوم ہے کہ اُس کے شوہر کے بھائیوں سے تمھارا کوئی رشتہ نہیں..... وہ ہمارے گھر ٹھہری ہوئی تھیں اس لیے میں نے پوچھا۔''

''ناز سے فون پر بات ہوگئی تھی۔ ہم بصیرہ کے ہاں اکٹھے ہوں گے یا وہ میرے ہاں آئے گی۔ اچھا ایک بات تو بتایئے۔'' مجھے ایک بات یاد آئی جو سلیم کے سوال سے ذہن میں ابھری تھی۔

''پوچھو۔'' سلیم نے گاڑی چلاتے ہوئے میری طرف دیکھا۔

''ناز اور اشرف بھائی کی شادی امریکا میں ہوئی۔ نہ آپ نے شرکت کی نہ میں نے پھر آپ کو کیسے پتا چلا کہ ناز میری دوست ہے؟''

''اس کا جواب یہ ہے کہ اشرف بھائی اور ناز بھابی نے شادی کے بعد ہم سب کو خطوط لکھے۔ اشرف بھائی نے مجھے اپنی شادی کی تھوڑی سی روداد لکھی جو واقعہ کم اور افسانہ زیادہ لگتا ہے۔''

''اچھا!'' بے ساختہ میرے منھ سے نکلا۔

''تمھیں معلوم نہیں؟''

''نہیں.......فون پر یا خطوں میں اس نے کوئی ایسی بات نہیں بتائی۔ شادی کے بعد سے اس سے ملاقات ہوئی نہیں۔''

''تم چاہو تو اشرف بھائی کا خط میرے نام پڑھ سکتی ہو۔ ناز بھابی تمھاری دوست ہیں انھیں اعتراض تو نہیں ہونا چاہیے۔'' سلیم جان بوجھ کر بات دوسری طرف لے جا رہا تھا۔ میں نے باہر دیکھا تو نیپا چورنگی کب کی گزر چکی تھی۔

''آپ مجھے حسن اسکوائر پر اُتار دیں۔'' میں نے کہا۔ ''اور جو سوال پوچھا تھا اس کا مختصر جواب......''

''اچھا ہاں..... مختصر جواب یہ ہے کہ ناز بھابی نے مجھے جو خط لکھا اس میں کراچی کی دو سہیلیوں کو فوری طور پر اپنی شادی کی اطلاع دینے کا حکم دیا۔ اس میں دو نام اور فون نمبر تھے۔ میں نے بصیرہ انصاری کو فون کر دیا۔ ان سے بات کر کے اس بات کی تصدیق بھی ہوگئی کہ دوسرا نام تمھارا ہی ہے مگر میں نے تمھیں فون نہیں کیا بلکہ بصیرہ سے کہہ دیا کہ تمھیں اطلاع کر دیں۔ اس وقت مجھے تم سے بات کرنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اب تو تمھیں یقین آ گیا ہوگا کہ آج میں امان کے مجبور کرنے پر آیا ہوں۔''

''آپ یہ نام بار بار نہ لیں تو بڑی عنایت ہو۔'' میں نے قدرے بگڑ کر کہا۔

''اوہ...... معاف کرنا۔ مجھے بڑی خفت سی محسوس ہو رہی ہے کہ میں تم سے ایسی بات کہنے یونی ورسٹی آیا۔ اسی لیے بار بار صفائی پیش کر رہا ہوں۔''

''اب تو جو ہونا تھا ہو چکا...... آپ کسی کے کہنے سے آئے یا اپنی مرضی سے مگر تھی فضول سی بات۔'' میں نے کہا۔ ''آپ یہ تو مانیں گے؟''

''معلوم نہیں......'' سلیم نے کہا۔ ''امان کے اصرار پر بات معقول ہی لگ رہی تھی لیکن تمھارے کہنے پر اب نامعقول لگ رہی ہے۔'' وہ کھسیانی سی ہنسی ہنسا۔ ''شاید میں اس لیے راضی ہو گیا ہوں کہ تمھارے سامنے اپنی پوزیشن صاف کر سکوں۔''

''اس کی بھی ضرورت نہیں تھی کیوں کہ اس ساری کہانی میں آپ کا ذکر کہیں نہیں آتا۔ آپ نے محض اپنا وقت ضائع کیا اور میرا موڈ خراب کیا۔'' میں آج سچ بولنے پر اُدھار کھائے بیٹھی تھی۔

''مگر تم تو کہہ رہی تھیں کہ تمھیں اس خبر سے کوئی فرق نہیں پڑا۔'' سلیم نے کہا۔

''میں نے غلط کہا تھا......'' میں نے جل کر کہا، ''اب تو آپ خوش ہیں، آپ یہی کہلوانا چاہتے تھے نا...... سنیے، ہماری ایک دور کی عزیزہ تھیں۔ میں نے انھیں اپنے بچپن میں دیکھا تھا۔ سنا تھا کہ ان پر کسی 'بد' چیز کا سایہ ہے۔ وہ بدروح انھیں صاف ستھرا رہنے سے باز رکھتی تھی۔ جب وہ نہانے کے لیے غسل خانے جاتی تھیں تو وہ نادیدہ ہستی انھیں کونے میں دھکیل کر اتنا جھنجھوڑتی تھی کہ وہ روتی پیٹتی بغیر نہائے غسل خانے سے نکل آتی تھیں۔ یہ تماشا میں نے بچپن میں دیکھا تھا، اب آپ کے دوست کا نام میرے لیے ایسی ہی بدروح بن گیا ہے جو مجھے اس طرح جھنجھوڑتا ہے کہ میرا جوڑ جوڑ ہل جاتا ہے اور اس کا اثر کئی گھنٹے رہتا ہے۔ میں آپ کو یہ بات بتانا نہیں چاہتی تھی لیکن مجبور ہو کر بتا دی۔ آپ چاہیں تو اپنے دوست کو بھی بتا دیں۔''

''سمن! مجھے غلط مت سمجھو۔ امان میرا دوست ہے، وہ اچھا دوست ہے۔ کڑے وقتوں میں وہ میرے کام آیا ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ میں اس کی ہر بات پر صاد کرتا ہوں۔''

''اس کا ثبوت تو موجود ہے۔ آپ اس کے کہنے سے میرے پاس آئے۔'' میں نے کہا۔

سلیم کے سانولے چہرے پر سرخی کی ایک لہر دوڑی۔ ''بس اب اور شرمندہ نہ کرو۔ آئی ایم رئیلی سوری۔''

گاڑی میرے گھر کے آگے کھڑی ہوئی تو میں چونکی۔ سلیم بالکل خاموش تھا۔

''ارے، آپ کو تو میرے گھر کا راستہ معلوم ہے۔'' میں نے صلح کرنے کی کوشش کی۔ آج

میں نے واقعی اس کے ساتھ دل بھر کر زیادتی کی تھی۔ بعض اوقات آدمی ایک کے کیے کا بدلہ دوسرے سے لیتا ہے۔

''ہاں معلوم ہے۔'' سلیم نے افسردگی سے کہا، ''قبل از تاریخ سے۔''

''کیا مطلب؟''

''جس تاریخ سے تم نے کچھ لوگوں کو اپنی زندگی سے ہمیشہ کے لیے خارج کیا، اس تاریخ سے پہلے سے میں اس گھر کو جانتا ہوں۔''

''گھر تک پہنچانے کا شکریہ۔'' میں نے کہا۔

وہ مجھے ایسی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا گویا ابھی اور کچھ کہنا چاہتا ہے۔ شاید وہ اس بات کا منتظر تھا کہ میں اس سے گھر میں آنے کو کہوں گی مگر میں نے رسماً بھی نہ کہا۔ مجھے وہ دن یاد آئے جب امان مجھے چھوڑنے آتا تھا۔ ہمارے گھر کے سامنے گل مہر کے گچھے اسی طرح ہوا سے ہلا کرتے تھے۔ جب وہ جاتا تھا تو پھولوں کی نارنجی پنکھڑیاں اور چھوٹی چھوٹی گہری سبز پتیاں اس کی کار کی چھت پر گل بوٹے بنا رہی ہوتیں۔ گل مہر سے ایک نارنجی پھول ٹپ سے سلیم کی کار کی چھت پر گرا۔

''خدا حافظ!'' میں نے گھر کی طرف قدم بڑھایا۔ کمرے کے اندر کھڑکی سے دیکھا تب بھی وہ کار کھڑی تھی۔ تقریباً پانچ منٹ تک سلیم یوں ہی اسٹیئرنگ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا۔ اس کے بعد کار چلی اور آہستہ آہستہ رینگتی ہوئی گلی کے موڑ پر غائب ہوگئی۔ سمن چپ ہوگئی۔

ذرا دیر خاموشی رہی۔ ''آپ نے مجھے جیسا چاہا تھا ویسی ہی ہوں یا مختلف؟'' سمن نے اچانک پوچھا۔ اس نے اپنی ذہین آنکھوں سے میرے چہرے پر ٹکٹکی باندھی اور جواب میرے چہرے پر پڑھ لیا۔ ''مختلف نا!'' اس نے اصرار کیا۔ ''شاید کچھ زیادہ منہ پھٹ، بقول امی اکل کھری...... اکل کھرا جگ سے برا۔ امی کہا کرتی ہیں۔'' اس کا جی جلا ہوا تھا۔

''بنانے والا بناتے وقت جو لچک رکھتا ہے نا اس سے ہر مخلوق فائدہ اٹھاتی ہے۔'' میں نے خندہ پیشانی سے کہا۔ ''تم استثنا نہیں ہو۔''

''اس کا مطلب ہے، معاملہ ٹھیک ٹھاک ہے، آپ مایوس نہیں ہیں۔''

''قطعی نہیں۔ تم سے اس طرح کی قربت ہو تو مایوسی کیسی۔ اختلافِ رائے کا فیصلہ تو ہوسکتا ہے۔''

''آپ کانپ کیوں رہی ہیں...... آنکھوں سے پانی بہہ رہا ہے'' سمن نے تشویش سے کہا۔

''مجھے سخت سردی محسوس ہورہی ہے۔ لگ رہا ہے اس یخ دان میں سردائی جارہی ہوں۔''

''تو پہلے کیوں نہ بتایا آپ نے؟'' اس نے تشویش سے کہا۔

''میں تمھاری بات ختم ہونے کی منتظر تھی اور منظر کی خوب صورتی بھی راہ روک رہی تھی۔ نیاگرا دریا کے اندر یہ برف کے درخت اور جھاڑیاں گویا پانی کے اندر برف کے جزیرے اور یہ ان کی عجیب وغریب ٹیڑھی میڑھی بل کھاتی بانہیں۔ جانے کو دل تو نہیں چاہتا مگر اب ٹھنڈ ناقابلِ برداشت لگ رہی ہے۔ اندر جا کر کافی پینے کا ارادہ ہے۔''

''اچھا جایئے، پھر ملیں گے، خدا حافظ!''

''سمن، ابھی سے نہ جاؤ'' میں نے اس کی خوشامد کی۔ ''اب آئی ہو تو اور تھوڑی دیر ساتھ دو۔ تنہائی کی سیر میں اب تمھارا ہی سہارا ہے۔ سنا نہیں، اکیلی تو لکڑی بھی نہیں جلتی۔''

''ہماری امی اس طرح کی باتیں بہت کرتی ہیں۔'' وہ ہنسی۔ ''اچھا چلیے، آپ کے پاس کتنا وقت ہے؟'' وہ بولی۔

''میرے پاس تو وقت ہی وقت ہے...... اور اس سے اچھا مصروف بھی وقت کا اور کوئی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''مگر میں ساری داستان ایک بیٹھک میں تھوڑا ہی سنا سکتی ہوں۔''

''کم از کم اس ایک برے دن کی کہانی تو ختم کرو۔'' میں نے کہا۔ گردن کے گرد مفلر لپیٹتی اپنی ٹھٹھرتی ٹانگوں سے میں اُٹھ کھڑی ہوئی۔

''جی اچھا!'' وہ گویا راضی ہوگئی۔

چاروں طرف نگاہیں ڈالتی میں خراماں خراماں واپس ہوئی۔ برف چکنی تھی۔ سنبھل سنبھل کر قدم اُٹھاتی، ایک نگاہ گرتے آبشار پر اور برفیلے منظر پر ڈالتی، پھر آگے بڑھتی۔ شکر ہے کہ ہوا تیز نہیں تھی ورنہ اتنی دیر باہر ٹھہرنا ناممکن ہو جاتا۔ عمارت کے اندر سوغات کی دکان کے برابر میں ریستوراں تھا۔ چائے پینے کو جی چاہ رہا تھا مگر امریکا کی چائے نے بڑا مایوس کیا تھا۔ ۱۷۷۳ء میں انگلستان سے آئی چائے کو غرقِ آب کرنے کے بعد سے امریکنوں نے کبھی چائے کو منہ نہ لگایا تھا۔ کافی اُن کا پسندیدہ مشروب تھی جو ہر جگہ تیار ملتی تھی۔ چائے کے نام پر گرم پانی کا ایک گلاس اور چائے کی پڑیا الگ سے ملتی تھی۔ چائے میں چینی ٹھنڈا دودھ ڈالتے، ہلاتے گھولتے وہ نیم گرم شربت بن کر رہ جاتی تھی۔ ایسی چائے پر میں اب کافی کو ترجیح دیتی تھی۔ کافی کا گلاس بنا کر میں نے کونے کی جگہ تلاش کی۔ بہت سے لوگ ریستوراں میں بیٹھے کھا پی رہے تھے۔ لمحے بھر کو لگا جیسے سمن میرا ساتھ چھوڑ گئی ہو، مگر جب کرسی پر بیٹھ کر کافی کی پہلی چسکی لی تو وہ پھر آ موجود ہوئی۔

''خدا کا شکر ہے تم دوبارہ آ گئیں۔'' میں نے کہا۔

''میں نے آپ سے وعدہ تو کیا تھا کہ اُس برے دن کی کہانی سناؤں گی۔''

''ہاں سناؤ۔'' میں نے کہا۔

''روز بس میں دھکے کھاتی گھر آتی تھی، اُس دن کار سے آئی۔ مگر دیر سے بھی پہنچی اور تھکن بھی زیادہ ہوئی۔ سر الگ سے درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ امی نے دیکھا تو پریشان ہو گئیں۔''

''خیریت! تمھاری طبیعت تو ٹھیک ہے، بہت تھکی ہوئی لگ رہی ہو۔'' انھوں نے پوچھا۔

''سر میں سخت درد ہے۔'' میں نے ہاتھ سے سر دبایا۔

''بھوک سے ہو گا، کھانا کھالو۔'' امی نے غور سے میرے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا، ''ڈھنگ سے ناشتا بھی تو نہیں کرتی ہو۔''

''نہیں امی! کھانے کو جی نہیں چاہ رہا۔ چائے کے ساتھ سر کے درد کی گولیاں کھا کر لیٹوں گی۔'' میں نے کہا۔

غسل خانے سے ہاتھ منھ دھو کر نکلی تو امی پلیٹ میں چند بسکٹ، پیالی میں چائے اور سر کے درد کی گولیاں لے آئی تھیں۔ میں چائے پیتی رہی، وہ چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ مجھے محسوس ہوا جیسے وہ کچھ کہنا چاہتی ہوں لیکن انھوں نے کچھ نہ کہا۔ بسکٹ کھانے اور چائے پینے کے بعد جب انھوں نے مجھے چادر تان کر لیٹتے دیکھا تو مجبور ہو گئیں۔

''ثمن! ایک بری خبر ہے۔'' انھوں نے کہا۔

''مجھے معلوم ہے۔'' میں نے کہا۔

''اچھا!......'' امی حیران ہو گئیں، ''تمھیں کیسے معلوم؟''

''ایک مہربان یونی ورسٹی میں مجھے یہ خبر دینے آئے تھے۔'' میں نے کہا۔

''اوہ......اچھا۔'' امی ٹھٹکیں۔ تپائی پر سے چائے کے برتن اُٹھانے لگیں۔

''امی! میں اُٹھوں گی تو برتن اُٹھا کر رکھ دوں گی، ذرا دیر لیٹوں تو شاید سر کا درد ٹھیک ہو جائے۔''

''ہاں، کچھ دیر آرام کرلو، مگر میت عصر کی نماز کے ساتھ اُٹھائی جائے گی۔'' امی نے کہا۔

''میت!......کس کی میت؟'' لیٹتے لیٹتے میں اُٹھ کر بیٹھ گئی۔

''تم تو کہہ رہی تھیں کہ تمھیں معلوم ہے۔'' حیرت سے انھوں نے میری طرف دیکھا۔

''نہیں، یہ بات مجھے نہیں معلوم.....آپ کس کی بات کر رہی ہیں؟'' میں نے پریشان ہو کر پوچھا۔

''تمھاری دوست بصیرہ کے والد کا اچانک دل کے دورے سے انتقال ہو گیا۔ ناز کا فون آیا

تھا۔ وہ بصیرہ کے پاس جارہی تھی اور چاہتی تھی کہ تم بھی جلد سے جلد پہنچو۔'' امی نے کہا۔

''اوہ...... بے چاری بصیرہ۔'' بے اختیار میرے منھ سے نکلا۔ آج سچے دل سے یہ بات میری زبان سے نکلی تھی، یوں چھیڑنے کے لیے ہم نے اس کا نام ہی بے چاری غریب امیر زادی رکھ دیا تھا۔ پیسہ تو اس کے پاس بہت تھا مگر نہ بہن بھائی تھے نہ ماں۔ ایک باپ تھے وہ بھی اچانک چل بسے۔ کیا حال ہوگا بے چاری کا۔ میں سر کا درد بھول کر اُس کے پاس جانے کی تیاری کرنے لگی۔

''میں بھی چلوں گی۔'' امی نے مجھے تیار ہوتے دیکھ کر کہا۔

''امی، آپ جا کر کیا کریں گی۔'' میں نے کہا، ''آپ کو تکلیف ہوگی۔ میں شاید رات کو وہیں رہ جاؤں۔''

''میں سمجھتی ہوں کہ مجھے جانا چاہیے۔'' امی نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ''کل کو میں مر جاؤں تو کیا نازکی امی تیرے پاس پُرسے کو نہ آئیں گی؟''

''جیسی آپ کی مرضی۔'' میں لاجواب ہوگئی۔

''وہ بری خبر کیا تھی جس کے لیے تم کہہ رہی تھیں کہ تمھیں معلوم ہے؟'' امی نے پوچھا۔

''جانے دیجیے امی، بعد میں بتاؤں گی۔ اگر آپ چلنا چاہتی ہیں تو تیار ہوجایئے اور بشیر کو ٹیکسی کے لیے بھیج دیجیے۔''

''ذرا دیر آرام کرلیتیں، کہہ رہی تھیں سر میں سخت درد ہے۔'' امی نے کہا۔

''وہ تو ہے مگر مجبوری ہے۔ ٹیکسی بھی تو آسانی سے نہیں ملتی، نہ جانے کتنی دیر میں ملے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں، میں بشیر کو بھیجے دیتی ہوں۔'' امی باہر چلی گئیں۔

میں تیار ہوتے ہوئے بصیرہ کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس کی اور میری زندگی میں کچھ یکسانیت تھی۔ وہ امیر زادی تھی مگر سگے بہن بھائیوں سے میری طرح محروم تھی۔ میرے والد کا انتقال ہو چکا تھا اُس کی والدہ کا۔ ایک وقت آتا ہے جب لڑکی ماں کے ساتھ زیادہ قربت محسوس کرتی ہے۔ امی اور میرے درمیان وہ قربت شروع میں نہ تھی۔ مشرقی حیا کی وہ روایتی بے جا چادر ہمارے درمیان رہی جس نے مجھے بہت نقصان پہنچایا مگر اب ہم آہستہ آہستہ ایک دوسرے کے نزدیک آتی جارہی تھیں۔ اس کے برخلاف بصیرہ روز بروز اپنے باپ سے دور ہوتی جارہی تھی۔ وہ زیادہ سے زیادہ نناوے کے پھیر میں رہنے لگے تھے۔ انھیں یہ وہم تھا کہ ان کے عزیز صرف دولت کی خاطر ان سے ملنا چاہتے ہیں۔ بصیرہ کو بھی وہ ہر وقت خبردار کرتے رہتے تھے جس کی وجہ سے وہ عزیزوں کو شک سے

دیکھتی تھی۔ ناز اور میرے سوا کبھی کسی کی اس سے دوستی نہ ہوئی۔

اس کے علاوہ اس کے دل میں پیدائشی سوراخ تھا۔ ڈاکٹروں نے اسرار صاحب سے کہا تھا کہ بڑے ہونے پر اس کا آپریشن کرالیں۔ اسرار صاحب نے امریکا میں خاصی جائیداد بنائی تھی اور وہاں برسوں سے اتنا پیسہ جمع کر رہے تھے گویا وہ سوراخ طبی آپریشن سے نہیں سونے سے بھرا جانے والا ہو۔ ایک ہفتے کے اندر وہ بصیرہ کو لے کر امریکا جا رہے تھے کہ آج اچانک ایسے سفر پر روانہ ہو گئے تھے جہاں سے واپسی کی کوئی صورت نہ تھی۔ بے چاری بصیرہ!.....اس کی دولت پہلے ہی اس کے لیے کانٹوں کا سیج تھی اب والد کے بغیر شاید وہ جلتا ہوا انگارہ بن جائے۔ مجھے بچپن میں اپنا آگ پر ماتم میں شریک ہونا یاد آیا۔"

''اچھا!.....اس کا قصہ سناؤ، آگ پر ماتم کا۔'' میں نے دلچسپی لی۔

''جب میرے ابو زندہ تھے تو ہم سوسائٹی میں رہا کرتے تھے۔ وہیں نزدیک ہی ایک بڑے سے گھر میں ہر سال محرم میں بڑی شان دار مجلسیں ہوتی تھیں اور آگ پر ماتم بھی ہوتا تھا۔ میں ہر سال اس کا ذکر سنتی تھی اور مجھے آگ پر چل کر ماتم کرنے والیوں کو دیکھنے کا بہت شوق ہو گیا تھا۔ ایک سال عاشورے کے دن فن بی ہمارے ہاں آ پہنچیں۔ وہ اپنے دودھ پیتے بچے کو لے کر ماتم دیکھنے جا رہی تھیں۔ فن بی کے شوہر کی پرچون کی دکان تھی اور وہ خود گھر پر کپڑے سی کر پیسے بناتی تھیں۔ امی کبھی کبھار اُن سے کپڑے سلوا لیتی تھیں۔ میں صبح سے دیکھ رہی تھی کہ جس گھر میں مجلس اور ماتم ہو رہا تھا خلقت ٹوٹی پڑ رہی تھی۔ امی کی مرضی کے خلاف ضد کر کے میں بھی فن بی کے ساتھ ہو لی۔ گھر کے دروازوں پر کالے کپڑے پہنے محرم کے سپاہی کھڑے تھے۔ عورتیں کالے کپڑوں یا برقعوں میں اندر جا رہی تھیں۔ گھستے ہی میں نے دیکھا کہ برآمدے میں اونچی سی کرسی پر ایک چشمے والی خاتون خطبہ پڑھ رہی ہیں۔ فن بی کے ساتھ میں بھی برآمدے کے ستون کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ خاتون اچک اچک کر، پہلو بدل بدل کر بول رہی تھیں۔ ان کی آواز کا زیر و بم، ان کی آنکھوں کی گھٹتی بڑھتی چمک نے ہزاروں کے مجمع کو مسحور کر رکھا تھا۔ میں صرف ان کو دیکھ رہی تھی۔ ان کی تقریر میری سمجھ سے یوں بھی بالاتر تھی۔

فن بی گود میں اپنے بچے کو ہلکورے دیتی رہی اور جب اس گدیلے پر لٹانے لگی جو ساتھ لائی تھی تو دیکھا کہ دو بچے اسے دور گھسیٹ کر لے گئے ہیں اور مزے سے اس پر چڑھے بیٹھے ہیں۔ فن بی نے ٹھنڈے یخ فرش پر بچے کو لٹا دیا۔ جس جگہ ہم بیٹھے تھے وہاں برآمدے کی چھت بھی ختم ہو چکی تھی، صرف انگور کی بیلوں کے لیے بنایا گیا ایک چوکھٹا تھا جس پر کھلے مستطیل تھے۔ میں نے فن بی سے کہا کہ بچے

کو ٹھنڈ لگ جائے گی۔ اس پر برابر بیٹھی ہوئی خاتون نے مجھے گھور کر دیکھا، ''بچی، کچھ نہیں ہوگا۔'' انھوں نے اپنی کھرج دار آواز میں کہا۔ ''مجھے دیکھو، نہ جانے کتنے دن سے آنکھیں آ رہی تھیں، گھر والے روکتے تھے مجلسوں میں نہ جاؤ، روؤ گی تو آنکھیں پھوٹ جائیں گی۔ کئی دن رات جاگی بھی، روئی دھوئی بھی مگر دیکھو آج آنکھیں کیسی تارہ سی صاف ہوگئیں۔ یہ سب اماموں کا صدقہ ہے۔''

میں ان کے پاس سے ذرا سا سرک کر کچے صحن میں جلتے لکڑیوں کے بڑے سے الاؤ کو دیکھنے لگی۔ ایک لانبے چوڑے حوض کے برابر کی جگہ پر درختوں کے تنے لال انگارہ ہوئے پڑے تھے۔ تیز ہوا میں شعلے احاطے کی قدِ آدم دیوار سے اونچے جارہے تھے اور چٹکتی چنگاریاں آم کے درختوں کی شاخوں تک پہنچ رہی تھیں۔ میں انھیں دیکھتی اور حیران ہوتی رہی کہ ان دہکتے شعلوں پر چل کر کیسے ممکن ہے کہ کسی کے پاؤں نہ جلیں۔ شدہ شدہ اندھیرا آسمان سے نیچے اُترنے لگا۔ گہری ہوتی شام میں دہکتے شعلوں کی سرخی اور اُڑتی چنگاریوں کی پھلجھڑیاں میں اِس وقت بھی جوں کی توں محسوس کررہی ہوں۔ لگتا ہے جیسے خطیبہ کی زبان کی تیزی، کاٹ، لپک جھپک اس وقت بھی کانوں کو سنائی دے رہی ہے۔ کربلا کے صوتی منظر جن پر سے کوئی نظر نہ ہٹانا چاہتا تھا۔ فن بی کو محو دیکھ کر میں چپکے سے وہاں سے سٹک لی۔ عمارت کے اندر ایک کمرے میں لڑکیاں آگ کے ماتم کی تیاری کررہی تھیں۔ میں اس کے دروازے سے لگ کر چپ چاپ کھڑی ہوگئی۔ برآمدے کی دُھندلی روشنیوں میں ماتم گزار خواتین سائے سی نظر آرہی تھیں۔ خطیبہ کی گونجتی آواز آسمان کے تاروں تک جاتی معلوم ہوتی تھی۔

یکا یک ایک دبلی پتلی گوری سی خاتون کمرے سے نکلیں اور مجھے دیکھ کر بولیں، ''ارے تم کہاں غائب ہوگئی تھیں، ماتم میں شریک ہونا چاہتی ہو یا نہیں؟'' یقیناً وہ مجھے کوئی اور لڑکی سمجھ رہی تھیں مگر میں نے اثبات میں گردن ہلا دی اور وہ میرا ہاتھ پکڑ کر تیزی سے اندر لے گئیں۔

''جلدی کرو، وقت نہیں ہے۔'' انھوں نے کہا، ''خطبے کے ختم ہوتے ہی نکلنا ہے۔''

جلدی جلدی انھوں نے میرے بال کھولے اور ان میں کنگھی کی۔ سفید کفنی پہنتے ہی میں اپنی ساتھی لڑکیوں جیسی لگنے لگی۔ انھوں نے ہاتھ پکڑ کر مجھے قطار میں دو تین لڑکیوں کے پیچھے کھڑا کردیا۔ اسی وقت چلنے کا اذن ملا۔ ریلے کے ساتھ بہتی میں بھی چلی۔ نہ مجھے قطار کا ہوش تھا نہ اپنے تن بدن کا۔ ساری دنیا کے خوف میرے اندر ایک دم سے سما گئے تھے۔ فن بی مجھے تلاش کررہی ہوں گی..... ابو، امی کیا کہیں گے؟..... امی تو سرے سے مجلسوں میں جانے کے ہی خلاف ہیں۔ اللہ میاں!...... خدا جانے اللہ میاں اچھا سمجھیں گے یا برا...... '' سمن ہنسی۔ ''ہاں سچ مچ، اس وقت ان سارے خوفوں میں لپٹی یا حسینؑ یا حسینؑ کے نعروں اور سینہ کوبی کی آوازوں کے درمیان چلتی گئی...... الاؤ کے اندر

اُترتے وقت اپنے عقیدے کے خلاف آگ پر ماتم کرنے کے ڈر نے پھر سر اٹھایا مگر میں دوسروں کے ساتھ دہکتے کوئلوں کے اس طباق میں اُتر گئی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اوس سے بھیگی، مہندی کے جھاڑ کے پاس زمین پر پڑی تھی۔ میرے بال کھلے ہوئے تھے، سفید کفنی میرے بدن پر تھی اور پیر کے تلووں سے آگ نکل رہی تھی۔ تھوڑی دیر بعد فن بی دو ایک دوسری عورتوں کے ساتھ ڈھونڈتی ہوئی وہاں آ پہنچیں۔ ایک ہاتھ سے مجھے گھسیٹتی، گود میں اپنے بچے کو سنبھالے بمشکل وہ مجھے گھر تک لائیں۔

میرے پیر جل جانے کی بات راز رکھی گئی۔ گھر کے باہر کسی کو پتا نہ چلا کہ میں نے آگ کے ماتم میں حصہ لیا تھا اور میرے پیروں میں آبلے پڑ گئے تھے۔ کتنے ہی دن میں پاؤں کے پھپھولے لیے گھر میں پھدکتی پھری۔ آبلوں کی جلن دل تک پہنچتی تھی اور غم اس بات کا تھا کہ آگ کے ماتم میں میرے ہی پاؤں کیوں جلے، میں کیوں اس امتحان میں پوری نہ اُتری؟ امی تو اس قدر خفا تھیں کہ اس بارے میں بات تک کرنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ابو تسلی دیتے تھے، ''اعتقاد کی بات ہوتی ہے بیٹی! اُن کے دل میں یقین ہوتا ہے۔ تمھارے دل میں وسوسہ ہوگا۔'' انھوں نے کہا۔

پھر سمن نے رازدارانہ کہا۔ ''میں نے یہ بات کسی کو بتائی نہیں، آپ کو بتا رہی ہوں۔''

''اچھا۔'' میں ہنس دی، ''شکریہ!''

''اب میں اپنے بچپن کے زمانے میں جا پہنچی ہوں۔ ابو یاد آ رہے ہیں۔ اسرار صاحب کے گھر کا قصہ سنانے کا موڈ نہیں، کل سہی۔'' سمن نے کہا۔

''جیسی تمھاری مرضی۔'' میں نے کہا۔

''آپ نے کھانا کھالیا؟''

''جب تم لوگ ساتھ ہوتے ہو تو کھانے پینے کا ہوش تھوڑا ہی رہتا ہے۔''

''اچھا اب آپ کیا کریں گی؟'' سمن نے پوچھا۔

''پیٹ پوجا کا سامان کروں گی۔ کمرے میں جا کر آرام کروں گی اور جو قصہ تم نے سنایا ہے وہ لکھوں گی۔''

''ٹھیک ہے یہ لکھ لیجیے باقی پھر......'' سمن نے کہا۔

''یار زندہ، صحبت باقی۔'' کہہ کر میں بھی اُٹھ کھڑی ہوئی۔ ''مگر دیکھو، ضرور آنا، وعدہ رہا۔'' میں نے کہا۔

''پکا۔'' وہ کھلکھلا کر ہنسی۔ چنبیلی کے پھولوں جیسے اس کے سفید دانت چمکے اور وہ غائب ہوگئی۔

میں مسکراتی ہوئی لوٹی۔ دل کی کلی کھلی ہوئی تھی۔ میں صرف دو دن کے لیے موسمِ سرما میں نیاگرا کی بہار دیکھنے گئی تھی مگر میں نے اسی وقت فیصلہ کیا کہ جب تک میرے کردار یوں بلا تامل میرے پاس آتے رہیں گے میں یہاں سے نہ جاؤں گی۔

کچھ لوگوں میں کرید قدرتی ہوتی ہے۔ گرمیوں میں یہ فکر گھلاتی ہے کہ درختوں کے ان بے پناہ جھنڈوں کے پیچھے کیا ہے؟ یہ Exit کہاں جاتا ہے؟ کہاں کیا ہو رہا ہے؟ اس ننھی سی جھیل کے کنارے واحد گھر میں کون رہتا ہے؟ ممکن ہے اس پردے لگی کھڑکی کے پیچھے کوئی شخص اپنے واک مین کا ہیڈ فون کانوں پر چڑھائے کیسٹ پر اُردو نغمے سن رہا ہو:

رنجش ہی سہی دل ہی دکھانے کے لیے آ
آ پھر سے مجھے چھوڑ کے جانے کے لیے آ

مگر اب تک بہت کچھ دیکھ لیا۔ درختوں کے جھنڈ سردیوں میں سوکھ گئے۔ ان کے پیچھے کوئی چیز ڈھکی چھپی نہ رہی۔ وہی گھر، کھیت یا کھلیان ہیں۔ ہر طرح کے ہزاروں Exit دیکھ لیے۔ دیکھے ہوئے شہر کی طرح کسی شہر میں جاتے ہیں یا کسی گاؤں میں یا کسی پارک میں۔ ویسے ہی ہوٹل، ویسے ہی گھر۔ جھیل کے کنارے بھی دیکھ لیے، دریا اور سمندر بھی۔ پہاڑ اور گھاٹیاں بھی جھانک لیں۔ اب جو یہاں آ کر بیٹھی تو کامل اطمینان کے ساتھ، تجسس کم اطمینان زیادہ۔ جلدی سے دیکھ کر بھاگنے کی حاجت نہیں، سکون سے لطف اُٹھانے میں مزہ ہے۔ وہی منظر صبح شام رنگ بدلتے ہیں۔ پل پل نیا روپ دھارتے ہیں۔ صبح سامنے درخت سادھو بنے کھڑے تھے، اس وقت ٹھنڈی ہوا میں آہ و زاری کر رہے تھے۔ چند پتے جو رہ گئے تھے تھر تھر کانپ رہے تھے۔ سردی سے بے چاروں کے دانت بج رہے تھے۔ سارے درخت چاہے بے برگ ہوں خوب صورت ہیں، جیسے کسی بے حد بڑے آرٹسٹ نے ہر درخت کی ہر شاخ کو اپنے ہاتھ سے بنایا ہو، بہت چاہت اور لگن سے کہ کوئی پیڑ دوسرے سے نہ ملے۔ جو پیڑ ٹیڑھے میڑھے ہیں وہ بھی عیب دار نہیں لگتے بلکہ دل رُبا جیسے کوئی بیلے ڈانسر ادا سے جھکی ہوئی ہو۔ سوچا کوئی ہوتا جو میری ان باتوں پر صاد کرتا یا اختلاف کرتا۔ دھیان کی دیر تھی کہ ڈیو ہنستا ہوا آ موجود ہوا۔

''میں صاد کرتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ میں بچپن سے یہ سب دیکھتا آ رہا ہوں لیکن مجھے اب بھی بدلتی رُتیں بہت اچھی لگتی ہیں اور وہ لوگ جن میں کرید ہو کیوں کہ میں خود ہمہ تن کرید ہوں۔''

''اس کا مطلب ہے تم اپنی داستان سنانے کے لیے تیار ہو۔'' میں نے کہا۔ ''بس تو شروع کرو۔''

''بالکل...... تو جناب میں پاکستان پہنچا۔ امریکن قونصلیٹ میں ملازمت شروع کی مگر وہ نوکری میری طبیعت سے لگا نہیں کھاتی تھی، چناں چہ میں نے وہاں سے دیا استعفیٰ، کار زیاں اور کراچی سے

سیدھا لاہور پہنچا۔ لاہور، شیخوپورہ اور نامعلوم کتنے شہروں سے پتا پوچھتا بڑے جھمیلوں کے بعد میں ملتان میں صوفی صاحب کے گھر جا پہنچا۔ ملتان بڑا عجیب شہر لگا مجھے..... الف لیلیٰ کے بغداد کا ایسا ہی تصور میرے ذہن میں تھا۔ کچی سڑکیں، پتلی گلیاں، پراسرار دروازے، اندھے مکان اور مقبرے۔ ایک گلی میں تو میں نے محسوس کیا کہ مرجینا محلے کے سارے دروازوں پر نشان لگاتی پھر رہی ہے۔ ایک احاطے میں وہ چالیس گھڑے اوندھے رکھے تھے جن میں چالیس چور علی بابا کے احاطے میں بند تھے۔ حجام، کبڑے سب مجھے وہاں نظر آئے۔ خیر شہر کی طلسماتی فضا سے نکل کر میں چھاؤنی کی طرف چلا۔ وہاں بہت سا علاقہ ابھی تک بھٹوں اور گوبھی کے کھیتوں سے ہرا بھرا تھا۔ ایسے ہی کھیتوں کے بیچ میں ایک چھوٹے سے گھر میں صوفی صاحب پنشن یافتہ زندگی گزار رہے تھے۔ ان کو تہمد اور بنیان میں کھری کھاٹ پر بیٹھے دیکھ کر محسوس ہوا جیسے ماضی کے کھیت کھلیانوں، رہٹوں اور گڑ بنانے والے گاؤں والوں سے لے کر کچی زمین پر بیٹھ کر پڑھنے والے بچوں کی پوری زندگی اب بھی ان کے ساتھ ہے۔ ان کے انداز میں وہ آسودگی تھی جو اپنے حصے کا کام کر کے آرام سے بیٹھ کر حقہ پینے کا حق بن جانے میں ہے۔

مجھے اُردو بولتا دیکھ کر پہلے پہل کی حیرت کے بعد انھوں نے اپنی عادت کے مطابق مجھے جوں کا توں قبول کر لیا اور میری آمد پر کسی قسم کی کوئی سرگرمی بھی نہ دکھائی۔ میں آن کربان کی چارپائی پر اُن کے برابر بیٹھ جاؤں یا ست رنگی پیڑھی گھسیٹ کر اٹنگا سا بیٹھا رہوں، انھیں کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ صرف پہلی مرتبہ مجھے لکڑی کے تختے لگی ایک سخت کرسی پیش کی گئی۔ بیگم صوفی یعنی عزیزہ خاتون دوپٹے کو پیشانی سے آگے چھجے کی طرح نکالے آئیں۔ ہاتھ بڑھا کر رنگ اُتری کرسی میرے حوالے کی اور صحن کے کونے میں لوہے کے آؤٹ ڈور چولھے پر کھانا پکانے میں مصروف ہوگئیں۔ ملتان گرد، گرما، گدا و گورستان کے لیے مشہور ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ وہاں کی خواتین کے لیے کھلی ہوا میں کھانا پکانا ایک نعمت سے کم نہیں۔ وہاں کھلی جگہ پر زمین اور آسمان تپتے ہیں تو باورچی خانے کی گرمی اور گھٹن کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔ برسات بلبل کے آنسوؤں کی طرح کمیاب۔ سبز درخت نہ صرف مٹی میں اٹے ہوئے تھے بلکہ مکڑی کے جالوں سے لدے ہوئے تھے۔ ہوا میں لو کی تپش اور حبس۔ اس سب کو برداشت کیے بغیر ملتان سے دوستی ناممکن تھی۔ جب تک بن پڑتا ہوٹل کے ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں پڑا رہتا، بالآخر شام کو نکلتا۔ آسمان زمین اس وقت بھی تپ رہے ہوتے مگر بہرحال توڑ کا وقت ہوتا۔ یہی سمے تھا جب میں صوفی صاحب کے ہاں پہنچا۔ راستے میں اپنا پلان بار بار ذہن میں جما لیا تھا۔ کسی بھی شخص سے راز کی کوئی بات پوچھنے کے لیے صبر کی ضرورت ہے۔ اس کا اعتماد حاصل کرنا اوّل، دوسری بات کہ کسی قسم کے غیر معمولی اشتیاق کا اظہار نہ کیا جائے۔

میں نے صوفی صاحب کو بتایا کہ میں ملتان کے بارے میں ایک کتاب لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ جگہ بہ جگہ گھومتا پھر رہا تھا کہ کسی نے آپ کا نام اور پتا بتایا کہ ان سے مدد لو۔ اسی سلسلے میں حاضر ہوا ہوں۔ صوفی صاحب فرشتہ صفت آدمی سمجھے کہ غیب سے کسی نے میری مدد کے لیے ان کا نام بتایا ہے۔ وہ دل و جان سے راضی ہو گئے۔ یوں بھی ملتان جسے وہ ملتان شریف کہتے تھے، ان کے خوابوں کا شہر تھا۔ ہمیشہ سے دل میں ارمان پال رہے تھے کہ ریٹائر ہو کر اس خطۂ پاک میں جا بسیں گے اور اسی کی زمین میں سوئیں گے۔

''تم محض کتابیں لکھتے ہو یا کچھ اور بھی کرتے ہو؟'' صوفی صاحب نے پوچھا۔

''امریکن قونصلیٹ میں کام کرتا تھا، نظریاتی اختلاف کی وجہ سے ملازمت چھوڑ دی۔'' میں نے کہا۔

''نظریاتی اختلاف!'' انھوں نے نگاہیں اٹھا کر میری طرف دیکھا اور میں نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ان کی آنکھوں کی روشنی ان کی ذہنی لہروں کے ساتھ گھٹتی بڑھتی رہتی تھی۔ کبھی وہ بجلی کے ہنڈوں کی طرح جگمگاتیں اور کبھی قندیل کی طرح ٹمٹماتیں۔

''بات یہ ہے.....'' میں نے انھیں ساری بات سچ سچ بتا دی۔ ''کہ اپنے ملک میں ہم انسانی برابری، انسانی حقوق اور انفرادی آزادی کی باتیں بہت کرتے ہیں لیکن جب میں یہاں آیا تو میں نے دیکھا کہ قونصلیٹ کے لوگوں کا رویہ وہی تھا جو کسی زمانے میں انگریز بیوروکریٹس کا تھا۔ ہمارے سفارت خانے قلعے بنے ہوئے تھے۔ عوام سے براہِ راست ہمارا کوئی رابطہ نہ تھا۔ درمیان میں جو ملکی لوگ تھے ان کا رویہ ایسا تھا جیسے امریکا کا ویزا لینے والے بھیک کے کشکول لیے ان کے سامنے کھڑے ہوں۔ وہ اپنے ہم وطنوں سے ان کے پاسپورٹ کے رنگوں کے مطابق بات کرتے تھے۔ بعض لوگوں سے وہ شرافت سے بات کرنا بھی ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ ایک صاحب ایسے بھی تھے جو لوگوں سے انتہائی بدتمیزی سے بات کرنے کے علاوہ ان کے کاغذات پٹختے اور پھینک دیتے تھے۔ میں ان کے رویے کے خلاف احتجاج کیا۔''

''پھر کچھ فائدہ ہوا؟'' صوفی صاحب نے اشتیاق سے پوچھا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے صوفی صاحب کی نظر میں میری کچھ قدر بڑھ گئی۔

''جی نہیں۔'' میں نے کہا، ''میرے دیکھتے دیکھتے قونصلیٹ کا قلعہ اور اونچا ہو گیا۔ جنگلے کی جگہ سنگینیں لگ گئیں۔ چوبیس گھنٹے ہتھیار بند فوج کا پہرہ رہنے لگا۔ چھوٹی سے چھوٹی بات پوچھنے کے لیے لوگوں کو ویزا آفس کے باہر گھنٹوں قطار میں کھڑا رہنا پڑتا تھا۔ اور تو اور لائبریری جانے والے بچوں کو بھی تین تین بار سیکورٹی کے دروازے سے گزرنا پڑتا تھا۔ اُن صاحب سے میری چخ چل ہی رہی

تھی۔ جب مجھے اندازہ ہوا کہ وہ صاحب قونصلیٹ کے لیے بے حد اہم ہیں۔ ان کی ساری زیادتیاں برداشت کرنا عوام کی ہی نہیں ہماری بھی مجبوری ہے تو احتجاجاً میں نے استعفیٰ دے دیا۔ اب امریکن اسکول میں انٹرویو دے کر آیا ہوں۔ یہاں سے مواد لے کر جاؤں گا تو کتاب لکھوں گا اور اسکول میں پڑھاؤں گا۔"

"اچھا۔" انھوں نے حقے کا ایک کش لگایا۔ اپنی قندیل نما آنکھوں سے ماضی کے جھروکوں میں جھانکتے ہوئے بولے، "میاں! ایک زمانے میں ہمیں بھی لکھنے لکھانے کا چسکا لگ گیا تھا مگر بعد میں توبہ کرلی۔"

"کیوں؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔ "آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے کوئی بہت بری لت ہو۔"

"ہاں۔ یہ بھی ہوا و ہوس کی ایک قسم ہے۔ اپنا نام، اپنا کام، اس کی شہرت۔ آدمی نفسِ امارہ پر قابو پانا چاہے تو ہر اس بے زور حس کو قابو میں کرے جو منھ زور گھوڑے کی طرح اس پر حاوی ہو۔" وہ اُٹھے، اندر کمرے میں گئے۔ تھوڑی دیر بعد پرانے رسالے لائے جن میں ان کی چیزیں شائع ہوئی تھیں۔ رسالوں کے اوراق وقت اور ملتانی آب و ہوا نے صحرائی زرد کر دیے تھے۔ چند مضامین اور چند غزلیں تھیں۔

"آپ نے لکھنا چھوڑ دیا، پھر بھی اپنی چیزوں کو سنبھال کر رکھا۔" میں نے بے خیالی میں کہا۔ اُن کی آنکھوں کے ہنڈے یکا یک چمک اُٹھے۔

"ٹھیک تو کہتے ہو۔" انھوں نے کہا، "یہ میں نے کیوں رکھ چھوڑے ہیں۔" انھوں نے رسالے اُٹھا کر چولھے کے پاس پڑے ایندھن کے ڈھیر پر پھینک دیے۔

"اے ہے، یہ کیا؟" عزیزہ خاتون اچھل پڑیں۔ اپنی تھلتھلاتی چھاتی پر ہاتھ رکھ کر انھوں نے حیرت سے ان رسالوں کو دیکھا۔ ظاہر ہے وہ انھیں وہاں دیکھ کر حیران ہوئیں۔ صوفی صاحب یقیناً انھیں حفاظت سے رکھتے ہوں گے۔

"کیوں پھینک رہے ہو انھیں؟" ان کی آواز بھاری اور بے رس تھی۔

"بے کار ہیں۔" صوفی صاحب نے کہا، "بکری کے لیے بیری کے جھاڑ لاتی ہو، اس کی بچی ہوئی لکڑیوں اور اُپلوں کے ساتھ مل کر دو وقت کا کھانا پک جائے گا۔"

میں نے دل ہی دل میں اپنے بے کار سوال پر خود کو ملامت کی مگر صوفی صاحب کے لہجے میں دکھ اور پچھتاوا نہیں تھا۔ شاید وہ ان احساسات کے اُلجھے راستوں سے آگے کہیں سفر کر رہے تھے۔ عزیزہ خاتون نے چپکے چپکے وہ رسالے اُٹھا کر پھر ایک طرف گڈی بنا کر رکھ دیے۔ مجھے تھوڑا سا اطمینان ہوا۔

پچھتاوے کے احساس کو کم کرنے کے لیے میں نے صوفی صاحب سے پھر باتیں شروع کر دیں۔

''وار اینڈ پیس کے خالق نے بھی ایک زمانے میں اپنے سارے لکھے کو رد کر دیا تھا اور کبھی کچھ نہ لکھنے کا فیصلہ کر لیا تھا مگر بعد میں اپنا فیصلہ بدل دیا۔'' میں نے کہا۔

''تمھیں ٹولسٹائی پسند ہے؟'' صوفی صاحب نے پوچھا۔

''جی ہاں، سارے روسی مصنف۔'' میں نے کہا، ''میرا خیال ہے انھیں زندگی اور اس کے دکھوں کا سب سے زیادہ..... کیا کہنا چاہیے۔''

''ادراک.....'' صوفی صاحب نے کہا۔

''جی ہاں ادراک اور علم ہے، ڈکنس سے بھی زیادہ۔''

''جب میں نوجوان تھا۔'' صوفی صاحب نے سفید تہمد میں لپٹی اپنی ایک ٹانگ قدرے پھیلائی۔ میں بھی روسی ادیبوں کی طرح ایسی باتیں سوچا کرتا تھا کہ اگر خدا ہوتا تو کبھی ایسی دنیا نہ بناتا جس میں معصوم بچے ناقابلِ یقین مصیبتیں بھوگتے ہیں اور آدمی آدمی میں اتنا فرق ہوتا ہے جتنا کسی انسان اور جانور میں لیکن جب ذرا ہوش آیا، تصوف سے لگاؤ ہوا تو پتا چلا کہ کسی میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ہم خواہ مخواہ حکومت کو، اِس کو، اُس کو گالیاں دیتے رہتے ہیں جب کہ آپ کی دنیا یہ بے چارے بیوروکریٹ، تحصیل دار، کمشنر، سفیر، وزیر اور سیاست داں چلا ہی نہیں رہے۔''

''تو پھر کون چلا رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نہیں سمجھو گے.......لیکن ہمارے ہاں اسی طرح کے درجے ہوتے ہیں اور قطب ابدال اسی طرح اپنے اپنے علاقے کے ذمہ دار ہوتے ہیں جیسے دنیاوی حکومت کے کارندے۔''

میری سمجھ میں کچھ آیا نہ آیا لیکن جو بات ذہن میں آئی کہے بغیر نہ رہ سکا، ''دنیا داروں کی بے حسی تو سمجھ میں آتی ہے صوفی صاحب!'' میں نے کہا، ''لیکن بقول آپ کے اگر یہ دنیا روحانی حاکم چلا رہے ہیں تو ان کی کارکردگی کا یہ عالم ناقابلِ یقین ہے خصوصاً تمام تیسری دنیا میں۔''

''تمھاری حد تک تمھاری سوچ بھی صحیح ہے۔'' صوفی صاحب بولے، ''مگر ہو سکتا ہے یہ لوگ ان تمام دنیاؤں سے واقف ہوں جو تھیں، ہیں اور آنے والی ہیں، ان تمام زمانوں سے جو تھے، ہیں یا آنے والے ہیں۔ وقت کی تمام تہوں سے، تاریخ کے وہ مختلف دھارے جو تھے، ہیں یا ہو سکتے تھے اور نہ ہوئے یا ہوئے لیکن ہمیں ان کا علم نہ ہوا اس لیے کہ ہم اور ہمارے آباؤ اجداد تاریخ کے ان دھاروں میں نہیں تھے۔ اس کا علم ان لوگوں کو ہوا جو اس دھارے میں بہہ رہے تھے اور انھیں ہماری تاریخ کے بارے میں کچھ معلوم نہ تھا۔''

صوفی صاحب کی باتوں میں مجھے مزہ آرہا تھا اور ان کا اعتماد حاصل کرنا بھی ضروری تھا، چناں چہ میں نے بات بڑھائی، ''ہوسکتا ہے صوفی صاحب ہم کسی آنے والے زمانے کا محض رف ڈرافٹ (rough draft) ہوں..... پنسل اسکیچ، جس پر کوئی بھی زیادہ توجہ نہیں دیتا۔''

''ہوسکتا ہے۔'' صوفی صاحب مسکرائے۔ ان کی آنکھوں کے قمقمے جگمگائے۔ انھوں نے طمانیت سے اپنی دونوں ٹانگیں کھاٹ پر پھیلائیں۔ ان کا رنگ کبھی گورا رہا ہوگا لیکن ملتان کی گرمی نے اسے جھلسا دیا تھا۔ امریکن معیار سے شاید وہ بہترین ٹین ہو۔

''صوفی صاحب! مجھے ایک بات یاد آئی۔'' میں نے کہا، ''ایک مرتبہ میری ڈگری کی ایک کاپی ہماری میڈ کے بچے نے بے کار کاغذ سمجھ کر پھاڑ دی۔ اُس زمانے میں فوٹو اسٹیٹ کاپی نئی نئی چلی تھی۔ بچے کی ماں نے شاید کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہ لرزتی کانپتی پھٹے ہوئے ٹکڑے لے کر میرے پاس آئی۔ میں نے اس کے سامنے وہ کاغذ اور ٹکڑے کر کے پھینک دیے۔ میں نے کہا جانے دو ایسی ہزار کاپیاں بھی یہ پھاڑ دے تو کیا فرق پڑتا ہے، اصل تو میرے پاس ہے..... وہ منھ کھولے میری صورت دیکھتی رہی۔ مجھے کبھی کبھی یہی خیال آتا ہے کہ شاید ہم اصل کی نقلیں ہیں۔ ہوسکتا ہے میں اصل میں وہاں موجود ہوں۔'' میں نے آسمان کی طرف اشارہ کیا'' اور جو شخص آپ سے باتیں کر رہا ہے صرف فوٹو اسٹیٹ کاپی ہو۔''

''ارسطو نے عالمِ مثال میں اسی قسم کے خیال کا اظہار کیا ہے۔'' صوفی صاحب نے کہا، ''فوٹو اسٹیٹ کی حقیقت سے اس وقت وہ بھی ناواقف تھا۔''

عزیزہ خاتون نے آخری روٹی توے سے اُتاری، چھن سے پانی ڈال کر آگ بجھائی اور لکڑیاں بھوبل میں دبا دیں۔ صوفی صاحب کھاٹ سے اُترے۔ جوتیاں پہنیں اور باہر کی طرف چلے۔ میں ان کے ساتھ ہولیا۔ ''ان سے کہیے کھانا کھا کر جائیں، پہلے دن آئے ہیں۔'' عزیزہ خاتون، چولھے کے پاس سے بولیں۔ اس وقت وہ دیا سلائی سے لالٹین کی بتی جلا رہی تھیں۔ چمنی جگہ پر فٹ کر کے انھوں نے کلمہ پڑھا۔

''ہاں بھئی..... میں ذرا نماز پڑھ آؤں۔ تم اتنے میں ہمارے کھیتوں کا چکر لگا لو۔ کھانا کھا کر جانا۔ ہماری بیوی ملتانی حلوہ بہت اچھا پکاتی ہیں۔''

صوفی صاحب نماز پڑھنے چلے گئے۔ میں مولی گاجر کی کیاریوں کے نزدیک ٹہلتا رہا۔ لگا وقت ٹھہر گیا ہے۔ خدا جانے میں کون سی پچھلی صدی میں پہنچ گیا ہوں۔ کچے مٹی کے مکان اور پرانے رسّی ڈول والے کنویں، گائیں، بکریاں اور صدیوں پرانی صدائیں۔ کوئی چڑیا پاس کے درخت سے بولی، تم

کون؟ تم کون؟ تم کون؟ پاس کے کھیت سے رہٹ کی آواز آئی، تم کون؟ تم کون؟ دور کہیں کوئی پن چکی بہت دیر سے پوچھے جا رہی تھی، تم کون؟ تم کون؟ میں نے صبر سے کام لیا اور چپ رہا۔ یہی تو میں جاننا چاہتا تھا کہ میں کون ہوں؟

صوفی صاحب واپس آئے۔ مجھے لے کر اندر آئے۔ ایک چوکی پر انتہائی سادہ کھانا چنا ہوا تھا۔ ہم دونوں نے کھایا۔ عزیزہ خاتون نقشین جگ میں کنویں کا ٹھنڈا پانی لائیں اور ذرا دور پڑی ہوئی ایک کھٹیا پر بیٹھ کر خود کو ہاتھ کا پنکھا جھلتی رہیں۔ کھانے کے بعد ملتانی حلوہ کھایا تو واقعی اس حلوے نے میرے تالو کو ایسا جکڑا کہ ہاتھ روکنے کی کوشش کرتے کرتے کھاتا چلا گیا۔ حلوے کی تعریف کے ساتھ اس کو پکانے کا طریقہ پوچھا۔

''اُستانی جی بتاؤ انھیں۔'' صوفی صاحب نے بیگم سے کہا۔

عزیزہ خاتون نے سفید دوپٹہ ایک بار پھر سر پر سیدھا کیا اور سامنے دیوار کی طرف دیکھتے ہوئے بتایا کہ کچے گیہوں ٹوکری میں ڈال کر رات کو کھلے آسمان تلے اوس میں رکھ دیے جاتے ہیں۔ جب وہ پھوٹ آتے ہیں تو ان کی کچی سبز ڈنڈیوں کو دودھ میں پکا کر یہ حلوہ بنایا جاتا ہے۔ اس عجیب و غریب حلوے نے دل کو موہ لیا۔ میں نے صوفی صاحب سے پوچھا کہ یہ بازار میں بھی ملتا ہے؟ انھوں نے حسین آگاہی کی چند دکانوں کے نام لیے اور میں نے فیصلہ کیا کہ کل ہی جا کر وہاں سے ایک پیکٹ لے کر آؤں گا۔

ابھی زیادہ رات نہ ہوئی تھی لیکن صوفی صاحب انیسویں صدی یا ابتدائی بیسویں صدی کے بغیر بجلی والے زمانے میں زندہ تھے۔ وہ ہمارے حساب سے سرِ شام سونے اور منہ اندھیرے اُٹھنے کے عادی تھے۔ رخصت ہونے لگا تو صوفی صاحب نے دوسرے دن ملتان کی تاریخی جگہیں دکھانے کی پیش کش کی جو میں نے خوشی سے قبول کر لی۔ باہر نکلا تو ریگستان کی رات نے اپنے جوہر کھولنے شروع کر دیے تھے۔ ہوا میں ہلکی سی خنکی آ گئی تھی۔ غیر معمولی گہرے نیلے آسمان پر شفاف تارے چھٹکے ہوئے تھے۔ اگر مما مجھے اپنے ساتھ نہ لے گئی ہوتیں تو عین ممکن تھا کہ میں آج اسی گھر میں ان سادہ دل لوگوں میں رہ رہا ہوتا۔ نیم تاریکی میں رات کا کھانا اور ملتانی حلوہ کھا کر کھری کھاٹ پر چمکتے تاروں تلے سویا کرتا اور ملتان کی پراسرار گلیوں میں قدیم بغداد یا قدیم تر بابل کے لوگوں کی طرح سفید انجان لباسوں میں گھوما کرتا۔ تخت پر بیٹھ کر تصوف پر کتابیں پڑھتا یا اُردو شاعروں کے دیوان اور شاید ملتان شریف پر اُردو میں کوئی کتاب بھی لکھتا۔

دوسرے دن ملتان کے تفصیلی دورے کے بعد صوفی صاحب اور میں قاسم باغ میں ایک بنچ پر جا

بیٹھے۔ قاسم باغ کی بلندی سے ملتان شہر ریلوے اسٹیشن پر لگے ہوئے پوسٹر کی طرح سامنے پھیلا ہوا تھا۔ اسی طرح مٹیالا اور گرد آلود۔ صوفیوں کے مزاروں کے گنبد اور مینار دکھائی دے رہے تھے۔ ان کے مزاروں پر پڑی ہوئی گوٹا لگی سرخ اور سبز چادریں اور لوبان سے اُٹھتا دھواں اور کشکول لیے گداگر میرے ذہن کی تصویر میں تازہ پھولوں کی طرح موجود تھے۔

"لو کھاؤ۔" صوفی صاحب نے مقامی اخبار کے ایک صفحے پر مرمرے رکھ کر مجھے پیش کیے۔ میں نے ملتانی حلوے کے ڈبے سے گہری گلابی ڈوری کھولی جس کا رنگ میری انگلیوں پر لگ گیا اور ملتانی حلوہ انھیں پیش کیا۔ ملتانی حلوے کی پیڑا جیسی ٹکیہ سے بمشکل ایک ٹکڑا توڑ کر صوفی صاحب نے منہ میں رکھا۔ چاروں طرف طمانیت سے دیکھا۔

"کل میں حیران تھا کہ ایک امریکن بلاوجہ گھومتا گھامتا میرے در تک کیوں آیا؟ اور آج یہ مسئلہ حل ہوگیا۔ اللہ کے کام نرالے ہیں۔" انھوں نے ٹھنڈا سانس لیا۔

"مسئلہ حل ہوگیا؟" میں نے حیرت سے پوچھا۔ میں سمجھا میرے ذہن کی گتھیوں میں سے کوئی گرہ شاید صوفی صاحب کے ذہن میں کھل گئی ہے۔ ملتانی حلوے سے ہاتھ کھینچ کر میں نے ٹکٹکی باندھ کر ان کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔

"ہمارے گھر میں ایک زمانے میں ایک لڑکا رہتا تھا زمان۔" انھوں نے کہنا شروع کیا، "ہماری نیک بخت بیوی نے اس سے سوتیلی ماں سے بھی برا سلوک کیا۔ اپنا بچہ تو کیا مانتی سدا ٹرخو، حرام کا جنا اور کیا کیا کہتی رہی۔ بیوی سے کہتا تھا لڑکا ہونہار ہے۔ ایک دن بڑا آدمی بن جائے گا۔ تمھیں ماں کہے گا، تمھارا مان بڑھے گا۔ راج رجوگی مگر اس عورت کی سمجھ میں نہ آیا۔ اسے برا بھلا کہتی رہی۔ ٹونے ٹوٹکے کرتی رہی یہاں تک کہ میں بھی پریشان ہوگیا۔ لڑکا چلا گیا تو بیوی نے کبھی بھولے سے اس کا نام نہ لیا اور کل تمھارے جانے کے بعد اسے ایک دم زمان یاد آ گیا۔ بولی، زمان کی عمر اب اتنی ہی ہوگی جتنی اس امریکن کی ہے۔ ہاں، میں نے مختصراً کہا۔ ٹھنڈا سانس بھر کر کہنے لگی، جانے کہاں ہوگا موا۔ مدت سے خط پتر بھی نہیں بھیجا، ایسا احسان فراموش نکلا۔ میں خاموش رہا۔ دل میں سوچتا رہا۔ خدا کی بندی تو نے کون سے احسان کیے تھے اس پر۔ بے ماں باپ کا بچہ تھا۔ کسی کے ذریعے خدا نے ہم تک پہنچایا تھا۔ ہم اس کی پرورش کرتے تو آج اس سے شرمسار نہ ہوتے....."

صوفی صاحب بول رہے تھے اور میرا دل دھڑک رہا تھا۔ خدا کی قدرت یہ تھی کہ صوفی صاحب نے اسی قسم کی بات چھیڑ دی تھی جو میں پوچھنا چاہتا تھا۔

"تو آپ کو بھی معلوم نہیں کہ وہ لڑکا اب کہاں ہے؟" میں نے پوچھا۔

''مجھے معلوم ہے۔ ایک صاحب کے ذریعے میرا رابطہ اس سے ہمیشہ رہا مگر میں نے بیوی کو نہ بتایا، نہ کل سے پہلے اس نے پوچھا۔ کل پہلا دن تھا کہ بولی، ذرا معلوم تو کرو کم بخت کہاں ہے، کیسا ہے؟ اس امریکن سے پوچھو، شاید اسے کہیں ملا ہو۔ میں نے کہا، بڑی بی ہوش کی دوا کرو اس امریکن کو کہاں ملا ہوگا۔ بڑے یقین سے کہتی ہے۔ پوچھ کر تو دیکھو، یوں ہی باتیں بنا رہے ہو۔ دنیا میں بڑے بڑے اتفاقات ہوتے ہیں۔ خدا کی ذات سے کچھ بعید نہیں ہے۔'' صوفی صاحب کا جملہ جوں جوں آگے بڑھتا جاتا تھا اُن کی آنکھیں پھیلتی جاتی تھیں۔ ان میں روشنی بڑھتی جاتی تھی۔ بات کے خاتمے پر وہ سکڑ کر اپنی اصلی حالت پر لوٹ آتی تھیں۔ میرا دل کہہ رہا تھا اب سوال کرنے کا وقت ہے مگر ذہن اُلجھ رہا تھا کیا پوچھوں، کیسے پوچھوں!

''آپ ڈاکٹر ایلس کو جانتے ہیں؟'' بالآخر میں نے براہِ راست سوال کر ڈالا۔

''ہونہہ....'' صوفی صاحب نے لمحہ بھر آنکھیں میچ کر سوچا۔ ''امریکن ڈاکٹرنی۔ لاہور میں رہتی تھیں، شیخوپورہ میں کلینک تھی۔''

''جی ہاں......'' اس سے پہلے کہ وہ پوچھیں تم انھیں کیسے جانتے ہو، میں نے دوسرا سوال داغا۔'' ان کی کلینک میں ایک پندرہ سولہ سال کی لڑکی کے ہاں بچہ پیدا ہوا تھا جو مر گئی تھی۔ اُس عورت کا نام زینت تھا، اس کے بارے میں آپ کچھ جانتے ہیں؟''

''عورت!......'' انھوں نے کہا، ''خدا معلوم کتنی عورتوں کے بچے ہوئے ہوں گے اور کتنی مری ہوں گی مگر پندرہ سولہ سال کی لڑکی اور زینت!...... یہ سب تمھیں کس نے بتایا؟ میں نہیں سمجھتا کہ یہ بات چند آدمیوں کے سوا کسی کو معلوم ہو۔ کیا زمان واقعی تمھیں کہیں ملا؟''

''جی نہیں۔'' میں نے کہا۔ اپنی پرانی چالیں بھول کر اب ڈر ڈر کر مہرے اُٹھا رہا تھا۔ ''آپ اُس لڑکی یا اُس کے شوہر کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟''

''حاشا.... میں نے اپنی آنکھ سے کسی کو نہیں دیکھا۔ سنا ہے کہ شوہر اسے کلینک میں چھوڑ کر گیا تو پلٹ کر نہیں آیا مگر تم کیوں پوچھ رہے ہو؟'' انھوں نے اپنی روشن آنکھیں میرے چہرے پر گاڑ دیں۔ میں سٹپٹا گیا۔

''میں آپ کو بعد میں بتاؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''ارے عجیب اتفاق ہے۔ اسی زمان کی بات تو ابھی تم سے کر رہا تھا جس کے لیے میری بیوی کل سے بے کل ہو رہی ہے۔ وہ اسی لڑکی کا بچہ تھا۔ ڈاکٹر ایلس نے کسی کے ذریعے ہم سے اپنے ہاں رکھنے کی فرمائش کی تھی کیوں کہ اس کی ماں چند دن ہمارے ہاں رہی تھی۔ اس کا خرچ ایک افسر تھے اسرار

صاحب، وہ اُٹھانے کو تیار تھے۔ اصل میں پہلے وہ ان اسرار صاحب کے گھر ہی رہا۔ مگر ان کی بیگم اور بیٹی دونوں اس سے نالاں تھیں اس لیے وہ ہمارے ہاں آ گیا۔ قدرتی طور پر ذہین اور حساس تھا۔ میرے ساتھ افسروں کے گھروں میں جاتا تھا۔ چھاؤنی میں فلیگ اسٹاف ہاؤس کو دیکھ کر پوچھتا تھا، ''ابا اس میں کس رینک کے افسر رہتے ہیں؟'' میں بتاتا تھا، ''اس میں چھاؤنی کا سب سے بڑا افسر رہتا ہے جبھی تو اس کے گھر پر جھنڈا لگا رہتا ہے۔ کہا کرتا تھا ایک دن میں بھی فلیگ اسٹاف ہاؤس میں رہوں گا۔ خدا کی قدرت اب افسر بن گیا ہے۔ کسی کورس پر باہر گیا ہوا تھا۔ سنا ہے اب آنے والا ہے۔''

صوفی صاحب جو کچھ کہہ رہے تھے میرے ذہن سے چھلکے جا رہا تھا کیوں کہ اس میں پہلے ہی سیکڑوں سوالات اُبل رہے تھے۔ زمان زینت کا بیٹا ہے تو میں کون ہوں؟ کیا مما یہی کام کرتی تھیں کہ کم سن لڑکیوں کے بچے پیدا کروا کے انھیں مناسب گھروں میں بھجوا دیتی ہوں۔ ہوسکتا ہے صوفی صاحب کو ماں کے نام میں مغالطہ ہوا ہو۔

''صوفی صاحب! زمان کی ماں کا نام زینت ہی تھا، آپ کو یاد ہے؟''

''برسوں پرانی بات ہوگئی مگر جو نام میرے ذہن میں پڑا ہے وہ یہی ہے۔ میری بیوی کو شاید یاد ہو مگر تم کیا کرو گے پوچھ کر؟''

''فرض کیجیے کہ ڈاکٹر ایلس نے مجھ سے کہا ہو کہ پاکستان جاؤ تو ان کے بارے میں بھی معلومات کرنا۔''

''ڈاکٹر ایلس سے زیادہ معلومات کس کو ہوں گی، مگر مجھے ایسی باتوں کی کرید نہیں ہے بس اتنا بتا دو کہ کوئی سنگین معاملہ تو نہیں ہے؟''

''نہیں! ایسی تو کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے سر جھکا کر حلوے سے ایک ثابت بادام اُٹھا کر منھ میں رکھ لیا۔

''آپ کی بیگم سے اس سلسلے میں بات کروں تو کوئی حرج تو نہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''حرج تو کوئی نہیں..... انھوں نے کہا، ''مگر وہ پردہ دار خاتون ہیں تم سے اتنی جلد بے تکلفی سے بات نہیں کرسکیں گی دوسرے وہ یہ ضرور پوچھیں گی کہ تمھیں ساری بات کیسے معلوم ہوئی اور تم کیوں پوچھ رہے ہو؟''

''وہ میں دیکھ لوں گا۔'' میں نے کہا، ''اسرار صاحب اب کہاں رہتے ہیں؟''

''کراچی میں۔'' صوفی صاحب نے جواب دیا۔

''اُن کا پتا دے سکیں گے آپ؟'' میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

''ہاں، پتا دینے میں تو کوئی حرج نہیں مگر کوئی ایسی بات نہ ہو جس پر انھیں یا زمان کو اعتراض ہو!''

''آپ بے فکر رہیے۔'' میں نے کہا۔

صوفی صاحب بھلے آدمی تھے۔ سب کو بھلا ہی سمجھتے تھے۔ انھوں نے اسرار صاحب کا پتا بتا دیا جو میں نے اپنی ڈائری میں احتیاط سے لکھ لیا۔

میرے دل کی اس وقت عجیب حالت تھی۔ سر میں سیکڑوں سوال سمائے ہوئے تھے۔ کیا مما نے مجھ سے جھوٹ بولا؟ زمان کون ہے؟ اس کا ذکر میں نے مما سے کبھی نہیں سنا۔ مجھے دیکھ کر عزیزہ خاتون کو زمان کیوں یاد آیا؟ کیا وہ میرا بھائی ہو سکتا ہے؟ میں خیالوں کے جال میں الجھا ہوا تھا۔ صوفی صاحب نے ملتانی معلومات کے سلسلے میں شمس تبریزیؒ اور امیر خسروؒ کی باتیں چھیڑ دی تھیں۔ وہ اس غزل کی باتیں کر رہے تھے جس کا آدھا مصرعہ فارسی اور آدھا ہندی میں ہے۔

''اردو پڑھ اور بول لیتا ہوں لیکن شاعری میری سمجھ میں نہیں آتی۔'' میرے لہجے کی مایوسی اور دکھ کو وہ اُردو شاعری نہ سمجھ سکنے کا غم جان کر مجھے تسلی دینے لگے۔

''دنیا کی کسی بھی زبان کی شاعری اس وقت تک سمجھ میں نہیں آتی جب تک آپ اس کے کلچر، زبان اور روایت کے مزاج داں نہیں ہوتے۔ انگریزی شاعری ہمارے بس کا روگ نہیں کیوں کہ ہم اس کے مزاج شناس نہیں ہیں۔''

''اگر میں چند دن یہاں رہوں تو کیا آپ اپنی شاعری کی چند بنیادی باتیں مجھے بتا سکیں گے؟'' میں نے پوچھا۔

اصل میں، میں زیادہ سے زیادہ ان کے گھر جا سکنے کے بہانے ڈھونڈ رہا تھا۔

''کیوں نہیں۔'' صوفی صاحب سادگی سے بولے، ''لیکن مزاج داں ہونے کے معنی کچھ اور ہیں۔ یہ باتیں کسی کے بتانے سے نہیں آتیں۔ تمھارے پاس وقت ہو، یہاں رہو، یہاں کے مزاروں، گلیوں، بازار اور کوچوں کا چکر لگاؤ تو خود بخود اس شہر کے مزاج داں بن جاؤ گے۔ اُردو شاعری کی گلیوں اور بازاروں میں گھومو گے، پھرو گے تو اس کے مزاج داں بن جاؤں گے۔ میرے پاس غزلوں کے کچھ پرانے دیوان ہیں، لے جاؤ اور پڑھو۔ بات خود بخود تمھاری سمجھ میں آنے لگے گی۔ نہ آئے تو مجبوری ہے۔''

''ضرور پڑھوں گا۔'' میں نے کہا۔

''غزلوں کے ساتھ دوہے بھی ضرور پڑھنا۔ پرانے دوہے پڑھو، زندگی کے گاڑھے میں سے نتھرے ہوئے تجربے ہیں، مقطر، کوئی ملاوٹ کوئی کھوٹ نہیں ہے۔ جوہر ہی جوہر ہے۔'' صوفی

صاحب اُستاد بن چکے تھے۔

''خالص اور بڑی شاعری ایسی ہی ہوتی ہے شاید۔'' میں نے کہا۔

''ہاں...... مگر مقطر چیز مقدار میں کم ہوتی ہے۔ وزن اور مقدار بڑھانے کے لیے کبھی کبھی ملاوٹ کرنی پڑتی ہے۔ بس یہیں اس کی قیمت گر جاتی ہے۔ نظموں اور غزلوں میں اس کی ضرورت پڑتی ہے، دوہوں میں نہیں۔ ہر دوہا ایک الگ اکائی، ایک الگ سچائی ہوتی ہے۔''

''خالص چیز زیادہ قیمتی ہوتی ہے صوفی صاحب تو کیا خالص نفرت ملاوٹی محبت سے بہتر ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میاں میں جوہر کی بات کر رہا تھا۔ کھوٹ نکالنے کے بعد جو چیز رہ جاتی ہے۔ نفرت میں جوہر کہاں؟''

''تازہ ترین تھیوریاں بتاتی ہیں کہ ہر چیز اضافی ہے۔ اس اضافی عہد میں خالص محبت اور خالص نفرت کے شاید کوئی معنی نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔

''میں سمجھتا ہوں جس طرح آواز اور روشنی کی لہریں ایتھر میں پھیلتی جاتی ہیں اسی طرح جذبات کی لہریں بھی ایک انسان سے نکل کر پھیلتی جاتی ہیں۔ جو ان سے متعلق ہوتے ہیں ان پر ان کا ردِعمل ہوتا ہے۔ ان کے ردِعمل دوسروں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس طرح نفرت اور محبت کی چھوٹی چھوٹی لہریں بھی اثر ڈالتی ہیں بالکل اس جڑ کی طرح جو زمین کے نیچے پھیل کر وہاں کی زمین پر اور آس پاس کی زمین پر اثر انداز ہوتی ہے اور یوں دیکھا جائے تو کسی نہ کسی حد تک پوری کائنات میں۔'' صوفی صاحب نے کہا۔ میں اپنی الجھنوں سے کائنات کی الجھنوں تک پہنچنے کے لیے تیار نہ تھا۔

''آیئے صوفی صاحب چلیں۔'' میں نے کہا۔

''تم جاؤ۔ میں ذرا دیر ٹھہر کر آؤں گا۔'' انھوں نے کہا۔

''بہتر۔'' میں اُٹھ کھڑا ہوا۔ پل پل میری الجھن بڑھ رہی تھی۔ میں کون ہوں؟ میں کون ہوں؟ میرے اندر سے آوازیں اُٹھ رہی تھیں میں کون ہوں؟ میں کون ہوں؟ فاختہ الاپ رہی تھی۔ میں کون ہوں؟ دور کہیں کوئی پن چکی پکار رہی تھی۔ دل کہتا تھا جلدی جلدی.... دماغ کہتا تھا دھیرج دھیرج اس تلاطم سے کام نہ چلے گا۔ چناں چہ میں روز صوفی صاحب کے گھر جاتا رہا۔ ان سے باتیں ٹٹولتا بقول عزیزہ خاتون..... شعر اشعار کے معنی پوچھتا۔ آہستہ آہستہ غزلیں سمجھ میں آنے لگیں۔ ان میں مزہ آنے لگا تو ایک کیسٹ پلیئر خرید لیا۔ معلوم ہوا ثریا ملتانیکر اور اقبال بانو اسی شہر میں رہتی ہیں تو پتا پوچھتا پاچھتا اُن کے ہاں جا پہنچا اور اُن سے اُردو غزلیں اور گیت سننے لگا۔ صوفی صاحب کے ساتھ

ملتان کی سیر بھی چلتی رہی۔ شہر جاتا تو حسین آگاہی کے بازار یا مختلف ٹھیلوں سے عزیزہ خاتون کے لیے اونٹ کی کھال کے کڑھے ہوئے سلیم شاہی جوتے، رنگین کھیس یا اُن کے کرتوں کے لیے بٹن خرید لاتا۔ وہ بہت خوش ہوتیں، منع بھی کرتیں۔ صوفی صاحب نے بھی شروع میں ٹوکا۔ میں نے کہا، ''مجھے امریکن ڈالر میں پیسے ملتے رہے ہیں اور یہ چیزیں میرے لیے واقعی دمڑی سے زیادہ کی نہیں ہوتیں مگر انھیں خرید کر اور اُستانی جی کو دے کر مجھے جو خوشی ملتی ہے وہ انمول ہے۔'' صوفی صاحب خاموش ہو گئے۔ شاید وہ سمجھ گئے تھے کہ میں عزیزہ خاتون کا دل جیتنے اور اعتماد حاصل کرنے میں لگا ہوا ہوں۔ ان سے شروع میں کانا پردہ رہا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ کچھ کھلیں۔ ہم میں اچھی خاصی بات چیت ہونے لگی۔ کبھی ان سے مذاق بھی کر لیتا۔ وہ پیار سے جھڑکتیں تب بھی پتھر سا اُٹھا کر مار دیتیں۔ ان کی آواز اور لہجے میں رس نہ تھا مگر چوٹ پھر بھی نہ لگتی کیوں کہ ان کی باتوں میں سچ اور خلوص تھا۔

عزیزہ خاتون کا حلیہ...... ٹھنگنی، موٹی، بھنبھوسی خاتون تھیں۔ یہ لفظ جو میں نے ان کے لیے استعمال کیا، اُن ہی سے سنا تھا۔ وہ اپنی الگ زبان بولتی تھیں۔ عمر میں صوفی صاحب سے بہت کم تھیں۔ ان کی بیٹی نہیں تو بھانجی بھتیجی ہو سکتی تھیں۔ جب اُن سے شادی ہوئی تو صوفی صاحب دو بیویوں اور کچھ بچوں کو مار چکے تھے اور کئی اس وقت بھی زندہ تھے۔ ان خاتون نے ان کو پال پوس کر بڑا کیا تھا اور اب سب اپنے اپنے گھروں کے تھے۔ جوان الھڑ عزیزہ خاتون کے اپنی زندگی کے بارے میں جو بھی خواب رہے ہوں میں نہیں سمجھتا کہ وہ کبھی پورے ہوئے ہوں۔ سہاگ کی چوڑیاں وہ اپنی موٹی کلائیوں میں ہر وقت پھنسائے رکھتی تھیں مگر مجھے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے خوابوں کی کرچیاں ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کی طرح اپنے ملگجے دوپٹے کے پلو میں باندھے پھرتی ہیں۔ صوفی صاحب کی وہ عزت کرتی ہوں یا لحاظ، محبت کبھی کی ہو مجھے اس میں شک ہے۔ صوفی صاحب کا عزیزہ خاتون سے رشتہ ایسا ہی تھا جیسا عزیزہ خاتون کا اپنی بکری سے تھا۔ چہیتی اور لاڈلی بھی تھی۔ ناز بھی اُٹھاتی تھیں اور جھڑکتی اور ڈانٹتی بھی تھیں۔ بقول خود اُن کے پل میں چنور ڈھلتے ہیں، پل میں لاٹھی پونگا، پل میں تولہ، پل میں ماشہ۔ ارے ہمارے ساتھ تو ان کا یہ ہے کہ کانی ہمیں بھائے نا، کانی بن سہائے نا۔''

ایک دن دوپہر گیارہ بجے کے قریب صوفی صاحب کے ہاں گیا۔ ملتان میں گیارہ بجے حبس اور گرمی ایسی ہوتی ہے جیسے سورج سوا نیزے پر آ پہنچا ہو۔ عزیزہ خاتون مچھر دانی لگائے چھوٹے سے برآمدے میں رضائی اوڑھے پڑی تھیں اور تھر تھر کانپ رہی تھیں۔ معلوم ہوا ملیریا بخار نے آ دبوچا ہے۔ جاڑا لگ رہا ہے۔ ہانپتی کانپتی رہیں، ہلہلا کے بخار چڑھا۔ صوفی صاحب نے کہا، ''میاں ڈاکٹر سے حال کہہ کر دوا لے آؤ۔'' آپ کو تو معلوم ہی ہے، حال کہہ کر دوا لے آنا بڑی عام سی بات ہے

وہاں مگر مجھے بڑی عجیب سی لگی۔ خیر صوفی صاحب کے کہنے سے چلا گیا اور چھاؤنی کے بازار کے کسی ٹٹ پونجیا ڈاکٹر سے دوا لے کر آ گیا۔ تھرمامیٹر خرید کر لیتا آیا۔ بخار دیکھا تو ایک سو پانچ ڈگری۔ تب میں نے رضائی اُتار کر پھینکی۔ بھاگ کر برف خرید لایا۔ دونوں نے مل کر سر اور پیروں پر برف کی پٹیاں رکھیں تب جا کر بخار قابو میں آیا۔ شام تک میں وہیں رہا۔ شام کو پسینہ آ کر بخار اُتر گیا تو وہ نڈھال سی پڑ گئیں۔ دوپہر کو کسی نے کچھ نہ کھایا تھا۔

صوفی صاحب کو کھانا پکانے کا تجربہ نہ تھا۔ وہ بازار سے منگانا چاہتے تھے۔ میں ملتان کی گرد اور مکھیوں کا حال دیکھ چکا تھا۔ تجویز کیا کہ گھر ہی میں پکایا جائے۔ مجھے لکڑیوں اور اُپلوں کی آگ کا تجربہ نہ تھا۔ بڑی مشکل سے دو اناڑیوں نے مل کر اپنے لیے دال چاول اور مریضہ کے لیے یخنی تیار کی۔ عزیزہ خاتون نے پی تو پہلے ہی گھونٹ پر پھندا لگ گیا۔ گرم مصالحے کی بھرمار اور دھوئیں کی بو الگ۔ خیر جوں توں کر کے زہر مار کی۔ خیر کھانے کے بعد انھیں تکیے سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا اور ہم دونوں نے کھانا کھایا۔ دال میں نمک کڑوا زہر۔ چاول میں کنی رہ گئی۔ چاول میں نمک نام کو نہ تھا اس لیے دونوں چیزیں ملا کر کھانے کے قابل ہو گئیں۔ پیاز، ٹماٹر، مولی کا سلاد میں نے بنالیا۔ صبر شکر سے کھا رہے تھے کہ عزیزہ خاتون نے کہا، "ارے دو نوالے مجھے بھی دے دو، ایسا منہ بکسا بکسا ہو رہا ہے۔" میں نے مارے فرمانبرداری کے پلیٹ میں چاول اور دال ڈال کر ان کے حوالے کیے۔ پہلا نوالہ کھاتے ہی ان کا ہنسی کے مارے برا حال۔ بولیں، "تم دونوں تو ایسے کھا رہے تھے جیسے آسمان سے من وسلویٰ اُترا ہو۔ میرا جی بھی للچا دیا۔ اے ہے کچے چاول، کڑوی زہر دال اور اُس پر دھوئیں کی چھچھاند۔" ہنستے ہنستے آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ جب ہنسی قابو میں آئی تو صوفی صاحب سے بولیں، "میں مرگئی تو کیا کرو گے؟"

دل میں آیا کہوں، ایک اور شادی کرلیں گے مگر موقع نازک تھا چپ رہا۔ صوفی صاحب ترنگ میں آگئے، بولے، "کریں گے کیا؟ جوگ لے لیں گے۔ کسی پہاڑ کی تلیٹی میں کٹیا بنالیں گے۔ جل میں اُترتے درختوں کی بہاروں کے مزے لیں گے۔ روز باہر آسمان تلے بیٹھ کر چاند کی جوگ دیکھیں گے۔ دریا کی گھمن گھیری میں چاند کی کرنوں کے کھیل دیکھیں گے اور تمھیں یاد کیا کریں گے۔"

"مجھے یاد کرو گے دھول مٹی۔" عزیزہ خاتون شاید دل ہی دل میں خوش ہو رہی تھیں۔

"جب جاہو آ کر دیکھ لینا۔ تمھاری تصویر گردِ بالش ہوگی اور بازو پر چھلے کا گل۔"

"بس بس رہنے دو۔ گدگدائیے وہیں تک جہاں تک ہنسی نہ آئے۔ ساری عمر گدھیڑی سمجھا۔ اب لگے شاعری کرنے۔"

''ارے بھئی خود گدھیلے تھے تمھیں گدھیڑی سمجھا تو کیا برا کیا۔''

میں اس گفتگو کو کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا لیکن لہجے بدلتے دیکھ کر خطرے کا احساس ہوا۔ جھٹ درمیان میں کودا۔ گلاس میں پانی لا کر کہا، ''استانی جی! آپ دوا پی کر اندر جا کر آرام سے سو جایئے۔''

بولیں، ''بیٹے اندر حبس بہت ہے، یہیں سوؤں گی۔''

دوا پی کر وہ آرام سے لیٹ گئیں اور اپنے ہاتھ سے کھجور کا سبز اور سرخ لگی گوٹ اور جھالر کا پنکھا خود کو جھلتی رہیں۔ جی چاہا صوفی صاحب سے کہوں کہ تھوڑی دیر وہ ہی اپنی چہیتی بیگم کو پنکھا جھل دیں جن کے فراق میں جوگی بننے کو تیار ہیں مگر ہمت نہ ہوئی اور میں خدا حافظ کہہ کر چلا آیا۔

دوسرے دن میں بجلی کا ایک پنکھا خرید کر لے گیا۔ عزیزہ خاتون بے حد خوش ہوئیں، ہزاروں دعائیں دیں۔ صوفی صاحب قیمت دینے پر اصرار کرتے رہے مگر میں نے نہ لی۔ اس کے بعد عزیزہ خاتون مجھے برابر بیٹا کہنے لگیں۔ میں نے اُستانی جی کی جگہ انھیں اماں کہنا شروع کر دیا۔

ایک دن چھوڑ کے انھیں پھر بخار چڑھا۔ باری کا بخار تھا۔ کئی دن تک یوں ہی آتا رہا۔ بے چاری زرد ہو کر رہ گئیں۔ آخر کار ایک دن میں اپنے ساتھ ایک بڑا ڈاکٹر لے کر آیا۔ اس نے خون ٹیسٹ کیا، دوا دی۔ خیر خدا خدا کر کے ان کا بخار ٹوٹا مگر کمزوری بہت بڑھ گئی تھی۔ ڈاکٹر نے بھی آرام کا مشورہ دیا۔ اب وہ اپنے بستر پر سے ہمیں ہدایات دیتیں۔ صوفی صاحب اور میں کھانا تیار کرتے۔ صوفی صاحب نے ایسی کڑی کبھی نہ جھیلی تھی۔ عزیزہ خاتون اوّل تو بیمار ہی نہ پڑتی تھیں اگر پڑ بھی جائیں تو بھی گھس گھس کے خود ہی کام کر لیتی تھیں، صوفی صاحب کو پتا بھی نہ چلتا تھا مگر اب میں انھیں ہلنے بھی نہ دیتا تھا۔ شرما حضوری صوفی صاحب بھی کام کرتے تھے۔ دوزخ کی سی گرمی میں لکڑیوں کی کھلی آنچ میں کھانا پکاتے تو میرے علاوہ صوفی صاحب کو بھی چھٹی کا دودھ یاد آ جاتا۔ عزیزہ بیگم کو یہ فائدہ ہوا کہ صوفی صاحب ان کی للو پتو میں لگے رہتے، خاطریں کرتے۔ پھل پھلار اور جوس دیتے کہ جلدی سے بھلی چنگی ہوں اور ڈیوٹی پر ڈٹ جائیں۔

ایک دن اُن کے ہاں پہنچا تو صوفی صاحب کہیں جانے کی تیاری کر رہے تھے۔

''تم بیٹھو، اپنی اماں سے باتیں کرو۔'' وہ بولے، ''میں حکیم جی کے پاس ہو کر آتا ہوں، شاید کوئی طاقت کی دوا یا ٹھنڈائی دیں۔ ڈاکٹری دوائیں تو بہت گرم ہوتی ہیں۔''

''اور کیا میرا کلیجہ پھونک کر رکھ دیا۔'' عزیزہ خاتون بولیں۔ ''اے بیٹا ذرا ایک گلاس ٹھنڈا پانی دینا۔ خدا تمھیں خوش رکھے۔''

''میں کار میں لیے چلتا ہوں۔'' میں نے گھڑے میں سے پانی نکال کر عزیزہ خاتون کو دیتے

ہوئے صوفی صاحب سے کہا۔

''نہیں تم بیٹھو، پیدل چلنے سے ذرا ٹانگیں کھلتی ہیں، گاڑی میں بیٹھنے سے تو اور جڑ جاتی ہیں۔'' صوفی صاحب بولے۔

''جلدی آ جانا۔ یہ نہیں کہ جا کہ بیٹھ رہو'' عزیزہ خاتون پنکھیا ہلاتے ہوئے بولیں۔

''ارے نیک بخت، حکیم جی کے ہاں کیا میرے لیے کھیر ٹھنڈی ہو رہی ہے کہ بیٹھ رہوں گا۔'' صوفی صاحب نے بٹوہ کرتے کی جیب میں رکھا۔

''حقہ تو گرم ہوگا'' عزیزہ خاتون بولیں، ''کھیر ٹھنڈی نہ سہی۔ سدا کی یہی عادت ہے۔ پانچ منٹ کا کہہ کر جاتے ہو پچاس منٹ میں لوٹتے ہو۔''

''اب لگیں تم شاعری کرنے اور شاعری میں مبالغہ جائز ہے مگر اصل بات یہ ہے کہ بڑی بی......'' صوفی صاحب مسکرائے، ''کہ میرے ہجر میں پانچ منٹ تمھیں پچاس منٹ کے برابر لگتے ہیں۔''

''نہ کہیں......'' عزیزہ خاتون ہنسیں۔ ''جس دن تمھیں جانا ہوتا ہے ساری رات یہی سبق پڑھتی ہوں:

سجن سکارے جائیں گے اور نین مریں گے رو
بدھنا ایسی رین کو بھور کبھی نہ ہو!''

''ارے تم تو سچ مچ شاعری پر اُتر آئیں۔ اچھا اب چلا۔ ایک گھنٹے تک آ جاؤں گا۔'' صوفی صاحب دروازہ بھیڑتے ہوئے باہر چلے گئے۔ میں سمجھ گیا کہ انھوں نے مجھے تنہائی میں عزیزہ خاتون سے بات کرنے کا موقع دیا ہے۔ وہ بستر پر دراز تھیں، کام کا بہانہ بھی نہ تھا۔ موڈ بھی معمول سے زیادہ شگفتہ تھا لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ بات کس طرح شروع کروں۔ آخر کچھ دیر سوچ کر ہر چہ بادا باد کہہ کر میں کود ہی پڑا۔

''دیکھیے، میں آپ کو اماں کہتا ہوں اور اسی طرح آپ کی عزت کرتا ہوں۔ اگر میں کسی سلسلے میں آپ کی مدد چاہوں تو کیا آپ میری مدد کریں گی؟''

''اے ہے۔ میں دکھیا، چار دیواری میں رہنے والی، تمھاری کیا مدد کر سکتی ہوں'' وہ بالکل بے بس سی ہو کر تکیے پر پڑ گئیں۔

''آپ یقیناً کر سکتی ہیں۔ پہلے وعدہ کیجیے'' میں نے انگلی پکڑتے پکڑتے پہنچا پکڑا۔

''لو اور سنو!'' وہ ذرا سا بگڑیں۔ ''بات بتاتے نہیں، وعدہ کیجیے، کس بات کا وعدہ؟''

''کہ جو کچھ آپ کو معلوم ہے آپ صاف صاف بتا دیں گی۔'' میں نے کہا۔

''ایل لو......'' انھوں نے ہاتھ چلا کر کہا، ''میں حلوہ خور بیگم، اختو بختو، تین میں نہ تیرہ میں۔ مجھ سے کون سا راز اُگلوا لو گے۔ علمِ کیمیا میں نہیں جانتی، روس کی مخبری میں کرتی نہیں۔''

''مجھے نہ علمِ کیمیا کے بارے میں جاننا ہے نہ روس کے بارے میں۔ بس اُس لڑکی زینت کے بارے میں پوچھنا چاہتا ہوں جو ڈاکٹر ایلس کے پاس آئی تھی اور ایک لڑکے کو جنم دے کر مر گئی تھی۔''

''اوہو...... زمان کی اماں کے بارے میں پوچھتے ہو مگر کیوں؟ تمھیں اس سے کیا دلچسپی ہے؟ خود زمان نے تو کبھی نہ پوچھا۔ میں کبھی بات نکالتی بھی تو فوراً وہاں سے اُڑنچھو ہو جاتا۔''

میں نے اُن کی بات کو نظر انداز کر کے کہا، ''سب سے پہلے آپ نے زینت کو کب دیکھا؟''

''سب سے پہلے کی بات تو یہ ہے......'' وہ کچھ سوچتی ہوئے پھر تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئیں۔ ''ارے اس موئی مچھر دانی کو ہٹا دو بالکل۔ رہی سہی ہوا بھی روک کے دیتی ہے۔''

میں نے اُن کے خیالات میں دخل اندازی کیے بغیر مچھر دانی کو اس کے چاروں ڈنڈوں پر اُلٹا سیدھا لپیٹ کر کونے میں کھڑا کر دیا اور پھر تختے لگی سخت کرسی پر آن براجا۔

''ایک تھے اسرار صاحب، اب کیا کرتے تھے یہ تو مجھے خبر نہیں، ہاں اچھے بڑے افسر تھے۔ یہ سمجھ لو کہ ان کے کوارٹروں کا ایک اچھا خاصا احاطہ تھا جس میں چھ سات چھوٹے بڑے کمرے تھے۔ ہم شروع سے اسی غلام گردش میں رہتے تھے مگر کبھی یہ احساس نہ ہوا کہ کوارٹروں میں رہتے ہیں۔ وجہ یہ کہ ہم نے درمیان میں دروازے نکال لیے تھے۔ اچھا خاصا بڑا گھر بن گیا تھا۔ احاطہ تھا ہی۔ اس کے اندر پانی کا ہینڈ پمپ تھا، بجلی تھی۔ ایک کوٹھری میں گائے بندھی رہتی تھی۔ ایک کوٹھریا میں بکری اور مرغی کے بچے رہتے تھے مگر صوفی صاحب نے مجھے اور لڑکیوں کو اسرار صاحب کی طرف زیادہ ہیرا پھیری سے منع کر رکھا تھا، خاص طور پر جب اسرار صاحب گھر پر ہوں۔ اُن کی شہرت اچھی نہ تھی۔ خیر اُس خدا کے بندے نے ہمارے ساتھ کبھی کوئی زیادتی یا برائی نہیں کی۔ ہاں بیوی سے آئے دن دانتا کل کل رہتی تھی۔ گھر کا فاصلہ زیادہ نہ تھا۔ نہ بھی جائیں تب بھی پتا چلتا رہتا تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔ بیگم صاحبہ بہت اچھی تھیں مگر گھر کے کام کی عادت نہ تھی۔ آئے دن بٹلر خانساماں بدلے جاتے تھے اور جب تک نیا آدمی آئے گھر میں ہاہا کار مچی رہتی تھی۔ صاحب اور بیگم صاحبہ ہر آئے گئے سے رونا روتے تھے کہ ملازم چاہیے، ملازم چاہیے اور جو بھی آتا اسے فوراً رکھ لیا جاتا چاہے دو دن بعد دھکے دے کر نکالنا پڑے۔ ان ملازموں کے کوارٹر الگ تھے۔ اُن کے دروازے بھی دوسری طرف کھلتے تھے۔ آئے دن بدلنے والے لوگوں کو گھروں کی اتنی پروا بھی نہیں ہوتی۔

ایک دن میں کروشیا کی ایک بیل دکھانے بیگم اسرار کے پاس گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ایک کم سن

خوش شکل سی لڑکی جھپا جھپ باریک چپاتیاں اُتار رہی ہے اور ایک ڈڈھیل مرد پاس کھڑا ہے۔ میں منھ کے آگے اوٹ کر کے اندر چلی گئی۔ صاحب صبح کے گئے شام کو آتے تھے مگر آج دوپہر کے کھانے پر وہ بھی موجود تھے۔ ڈڈھیل مرد گول پھولی گرم گرم چپاتیاں میز پر پہنچا رہا تھا۔ صاحب کو حیرت تھی کہ وہ کس پھرتی سے چپاتیاں پکا پکا کر لا رہا ہے۔ صاحب کو دیکھ کر میں اُلٹے پاؤں پھری تو میں نے سنا۔ ڈڈھیل مرد کہہ رہا تھا، ''صاحب جی! یہ زینت ہے، میری بیوی۔ چپاتی یہی پکاتی ہے۔ مجھ سے اتنی اچھی نہیں پکتیں۔''

میں نے بتایا تھا نا کہ ہر ملازم کے جانے کے بعد گھر میں رانی گھن مچ جاتا تھا اور جو پہلا آدمی آتا بلا چون و چرا رکھ لیا جاتا۔ شروع کے دو چار دن ٹرائل کے سمجھے جاتے۔ چل گیا تو ملازم ہے ورنہ جتنے دن کام کیا اس کی تنخواہ دے کر چلتا کر دیا جاتا۔ اب اس آدمی نے جس کا نام شاہ نواز تھا ایسا اُس گھر کا انتظام سنبھالا، جانے کس جنم کے کالے تل چابے بیٹھا تھا۔ اوروں کا تو وہ حال تھا کہ کام کو آس ہاں، کھانے کو ہوں...... اور اس کا یہ کہ نہ خود بیٹھے نہ زینت کو بیٹھنے دے۔ دھوبی کو کپڑے خود دیتا۔ جو اس کو دینے کے نہ ہوتے زینت کو حکم دیتا کہ دھو کر باہر پھیلا دے۔ استری کر، تہہ کر اور بیگم اور صاحب کے کمرے میں رکھ آ۔ ملازم لڑکا جو مشکل سے دس منٹ سارے گھر کی جھاڑ پونچھ پر لگاتا تھا دونوں میاں بیوی روز دو گھنٹے میں چمکاتے تھے۔ ضرورت ہو یا نہ ہو فرنیچر پر پالش ہو رہی ہے، گاڑی دھوئی جا رہی ہے۔ مالی کے ساتھ گملے اُٹھا اُٹھا کر رکھے جا رہے ہیں۔ پودوں کو پانی ڈالا جا رہا ہے۔

آہستہ آہستہ وہ سارے گھر میں بالکل گھر والوں کی طرح پھرنے لگے۔ کہیں کوئی چیز بے جگہ پڑی ہوتی تو اس کو جگہ پر رکھتے۔ باورچی خانے کا سودا اور ریفریجریٹر کی چیزیں سب ان ہی کے کہے پر آتیں۔ مہمان آتے تو شاہ نواز پہلی گھنٹی پر باہر جاتا اور ان کے بیٹھک میں بیٹھتے ہی باورچی خانے میں ناشتے کا کاروبار شروع ہو جاتا۔ جس وقت بیگم چائے کے لیے کہنے آتیں، فرنچ ٹوسٹ، سموسے، پکوڑے، چاٹ میں سے دو چار چیزیں تیار ہوتیں۔ چائے کا پانی چولھے پر چڑھا ہوتا۔ ایسا محرم کا آدمی بڑے بڑے کام کرنے والوں کو کاہل بنا دیتا ہے۔ بیگم اسرار تو تھیں ہی سدا کی کام چور۔ ان کو باہر پھرنے کا چسکا تھا۔ بازار کے چکر لگاتیں یا آس پاس کے گاؤں سے سستے انڈے، مفت برابر مرغیاں، گاجر مولی، ٹماٹر اور پالک ڈھو ڈھو کر لاتیں۔ گنے کا موسم ہوتا تو گنے اور بھٹوں کا موسم ہوتا تو بھٹے۔ گھر میں کیا کھائے جاتے ہم ہی لوگوں میں بانٹ بونٹ دیتیں۔ انھیں خالص دودھ اور گھر کے جمے دہی کا بہت شوق تھا۔ بھینسوں کے باڑے میں جا کر اپنے سامنے دودھ نکلوا کر لاتیں۔ شروع میں انھیں اکیلے کار میں اِدھر اُدھر دوڑتے دیکھ کر لوگوں کو تو ہوئی مگر بعد میں پتا چلا کہ ملا کی دوڑ مسجد تک۔ انھیں سوائے

گھریلو دستکاریوں، چاندی کے زیور اور سستے انڈے، مرغی خریدنے کے اور کوئی شوق نہ تھا۔

اکثر واپس آتیں تو پتا چلتا کہ صاحب دفتر سے کوئی ضروری چیز لینے آئے تھے اور لے کر چلے گئے۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہوتا تو شاہ نواز اصرار سے کھانا کھلا کر بھیجتا خواہ وہ کتنا ہی کہیں کہ دیر ہو رہی ہے۔ بیگم صاحبہ سنتیں اور چپ رہتیں۔ صاحب سے کبھی پوچھ بیٹھتیں تو وہ جوتیوں میں دال بٹتی کہ سارا زمانہ سنتا۔ بندہ بشر ہے کوئی چیز بھی بھول سکتا ہے اور جب بیگم صاحبہ خود ہی گھر پر نہ ہوں تو انھیں کیا حق ہے کہ شوہر سے جرح کریں۔ زینت سے خیر انھیں ایسا ڈر تو نہ تھا مگر اس کی بے وقوفی کی حد تک سادگی سے خوف تھا۔ ایک اطمینان تھا کہ اس کا شوہر چوبیس گھنٹے اس کے سر پر سوار رہتا تھا اور سارے کام خود کرواتا تھا ورنہ وہ تو اتنی کم عمر اور بھولی تھی کہ اس کو تو اپنے تن بدن کا اور دوپٹے تک کا ہوش نہ تھا۔

زینت کبھی دو منٹ کو میری طرف نکل آتی تو شاہ نواز فوراً اُسے واپس بلا لیتا۔ میں نے کئی دفعہ سنا کہ اکیلے میں شاہ نواز اسے زرینہ کہتا ہے۔ میں نے زینت سے پوچھا تو ٹال گئی۔ پھر ایک دفعہ خود ہی بولی کہ میرے ننھیال کا نام زرینہ اور ددھیال کا نام زینت ہے۔ اسے خود زرینہ نام پسند ہے اس لیے کچھ لوگ اسے زرینہ اور کچھ زینت کہتے ہیں اور شاہ نواز کبھی زرینہ اور کبھی زینت کہتا ہے۔

میرے ایک کمرے کی دیوار ان کے کوارٹر سے ملی ہوئی تھی۔ کبھی وہاں جاتی تو دونوں کی باتوں کی آواز کانوں میں پڑتی۔ ایک دن سنا زینت کہہ رہی تھی، ''مجھے لگتا ہے بیگم صاحبہ کو میرا ان کے سونے کے کمرے میں آنا پسند نہیں ہے۔ صبح صبح جب بیڈ ٹی لے کر جاتی ہوں تو مجھے بری طرح گھور کر دیکھتی ہیں اور پوچھتی ہیں، شاہ نواز کہاں ہے۔''

''ارے بیگم صاحبیں اتنے چھوٹے دل کی نہیں ہوتیں۔ ان کو اپنے آرام سے مطلب ہے۔ کام میں کروں یا تو کرے اُن کی جوتی سے۔'' شاہ نواز نے کہا۔

''اور تم عین صاحب کے ناشتے کے وقت کہاں غائب ہو جاتے ہو؟ بیگم تو پہلے ہی سو رہی ہوتی ہیں، مجھے توسوں پر مکھن لگانا پڑتا ہے اور چائے بنا کر دینی پڑتی ہے۔''

''ذرا غسل خانے تک جاتا ہوں اور کہاں جاتا ہوں۔'' شاہ نواز بولا، ''توس پر مکھن لگا دیتی ہے تو کیا گھس جاتی ہے۔''

''نہیں، مجھ سے لگتا ہی نہیں۔ صاحب دیکھتا رہتا ہے، کبھی ہاتھ سے توس گر جاتا ہے کبھی چھری۔ بے چارہ صاحب اچھا ہے جو دیکھتا رہتا ہے اور ہنستا رہتا ہے کوئی اور ہوتا تو لگاتا ایک لپڑ۔'' زینت ہنسی۔

''آہستہ آہستہ لگایا کر، ڈرنے کی کیا بات ہے۔ اچھا آدمی ہے۔ اس سے ڈرنے کی ضرورت نہیں۔'' شاہ نواز نے کہا۔

''پتا ہے......ایک دن مجھے بتانے لگا کہ توس کس طرح پکڑنے چاہییں اور مکھن کس طرح لگانا چاہیے۔ میرا ہاتھ اُس کے ہاتھ سے چھو گیا۔ اللہ قسم، ایسا نرم ہاتھ ہے صاحب کا جیسے کوئی چڑیا کا بچہ۔ ایسے نرم ہاتھ تو اپنے ہاں کی عورتوں کے بھی نہیں ہوتے۔''

''بڑے لوگ جو ہوئے۔ کبھی ہاتھ سے کام نہ کیا۔'' شاہ نواز بولا۔ بس میں نے اتنا ہی سنا۔ اسی قسم کے جملے میرے کانوں میں پڑتے رہتے جس سے اندازہ ہوتا کہ شاہ نواز خود نکما اور کام چور ہے اور زیادہ سے زیادہ کام بیوی سے کراتا ہے۔

انھی دنوں بیگم صاحبہ ایک مہینے کے لیے اپنے میکے چلی گئیں۔ تب تو تقریباً چوبیس گھنٹے زینت اور شاہ نواز بنگلے پر ہی رہتے۔ ایک ماہ بعد لوٹیں تو معلوم ہوا کہ گھر کے انتظام میں کوئی خاص فرق نہیں پڑا تھا بلکہ زینت اور شاہ نواز کے عمل دخل میں کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔ صاحب گھر کے خرچ کے پیسے شاہ نواز کو دے دیتے۔ وہ اُلٹا سیدھا حساب دے دیتا۔ پیسے خرچ ہو جاتے تو وہ یکمشت کچھ اور رقم اسے دے دیتے۔ بیگم نے آ کر اس بات پر جرح کی تو پھر آپس میں تکرار شروع ہو گئی۔ بیگم نے چاہا کسی طرح دونوں کو نکال باہر کریں مگر صاحب کہتے مجھے شاہ نواز کی وجہ سے آرام ہے۔ وہ میری تل تل چیز کی خبر رکھتا ہے۔ خیر اسی طرح کئی ماہ گزر گئے۔

ایک دن دوپہر کا وقت تھا کہ زینت بھاگی ہوئی آئی۔ صاحب اور شاہ نواز میں لڑائی ہو رہی تھی اور صاحب اسے گولی مارنے کی دھمکی دے رہے تھے۔ بیگم اسرار لیڈیز کلب گئی ہوئی تھیں۔ صوفی صاحب اسکول گئے ہوئے تھے۔ برقع کھونٹی سے اُتار میں ہی اس کے ساتھ ہو لی۔ باورچی خانے میں پہنچ کر میں اور زینت ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئیں۔ اسرار صاحب اور شاہ نواز مرغوں کی طرح لڑ رہے تھے۔ ''ابھی میرے گھر سے نکل جاؤ اور آئندہ میں تمھاری شکل نہ دیکھوں۔ اگر کبھی اس علاقے میں دیکھ لیا تو فوراً پولیس بلا لوں گا۔''

شاہ نواز جو باادب تو کبھی نہیں تھا، سینہ تان کر بولا، ''پولیس کی دھمکی کیا دیتے ہو، اس تک تو میں پہنچوں گا۔ بڑے آدمی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ ہماری اور ہماری عورتوں کی عزت نہیں۔''

اتنی دیر میں بیگم اسرار بھی آ گئیں۔ ان کو دیکھتے ہی اسرار صاحب نے اپنا بٹوہ نکالا کچھ نوٹ جس میں سو کے نوٹ بھی تھے اس کی طرف پھینکے اور کہا، ''جاؤ اسی وقت میرا کوارٹر خالی کرو۔''

شاہ نواز نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ کچھ دیر اسی طرح کھڑا اسرار صاحب کو گھورتا رہا پھر

پیسے اُٹھائے اور تیزی سے گھر سے نکل گیا۔

''کیا ہوا؟'' اس کے جانے کے بعد بیگم نے اسرار صاحب سے پوچھا۔

''بہت سر چڑھ گیا تھا۔ کئی دفعہ بدتمیزی کر چکا تھا۔ آج وہ حد سے بڑھا تو میں نے نکال باہر کیا۔''

''مگر اتنے بہت سے پیسے کیوں دے دیے؟'' انھوں نے کہا۔

''اب اس وقت بیٹھ کر پائی پائی کا حساب کرتا؟'' اسرار صاحب نے بیوی کو غصے سے گھورا۔

''مگر تنخواہ تو جب سے آیا ہے مہینہ ختم ہونے سے پہلے ہی لے لیتا ہے بلکہ کچھ زیادہ ہی۔ ابھی تو ہمارا قرض اس پر باقی ہے۔''

''تو یہ بھی قرض سمجھ لو، خاک ڈالو۔ مجھے پہلے بتایا ہوتا تو میں نہ دیتا۔'' اسرار صاحب کا منھ ابھی تک غصے سے لال تھا۔ بیگم چپ ہو گئیں۔ میں اور زینت باورچی خانے سے نکل کر اپنے کوارٹروں کی طرف بھاگیں۔

تھوڑی دیر بعد شاہ نواز ایک تانگا لے کر آیا۔ اپنا سامان اور زینت کو لے کر کہیں چلا گیا......

اے ہے آج کچھ پکانا رِیندھنا نہیں ہے؟ صوفی صاحب آئیں گے تو کہیں گے کہ بیوی نے بیماری اپنے اوپر لاد ہی لی ہے۔'' ایک سانس میں بولے چلی گئیں۔

اُن کی ہدایت کے مطابق میں نے انھیں ایک تھال میں چاول اور دال نکال کر دیے۔ کنکر چن کر نکالتے ہوئے خاصی رد و کد کے بعد انھوں نے اپنی بات کا سرا دوبارہ جوڑا۔ اتنے عرصے میں دل ہی دل میں دعا مانگتا رہا کہ صوفی صاحب ابھی نہ آئیں اور عزیزہ خاتون کو اور کوئی کام یاد نہ آئے۔

''خیر......'' دال میں سے ایک کنکری نکال کر اپنے تکیے پر جماتے ہوئے وہ بولیں، ''کئی مہینے بعد اچانک ڈاکٹرنی ایلس اسے لے کر پھر میرے گھر آئیں۔ اُن دنوں صوفی صاحب کی اماں بہت بیمار تھیں اور یہ کئی ماہ کے لیے ہندوستان گئے ہوئے تھے۔ ڈاکٹر ایلس نے کہا کہ زینت اس شہر میں فقط تمھیں ہی جانتی ہے۔ وہ اسپتال میں داخل تھی۔ اس کا شوہر جب سے گیا ہے لوٹا نہیں۔ جب تک وہ آئے تم اسے رکھ لو۔ کھانے پینے اور دواؤں کا خرچ وہ دیں گی۔ صوفی صاحب کے پوچھے بغیر میں کوئی کام نہیں کرتی مگر یہ معاملہ ایسا تھا کہ ان سے پوچھنا ممکن نہ تھا۔ ڈاکٹر ایلس کے اصرار پر میں نے ہامی بھر لی۔ وہ لڑکی بچہ ہونے تک میرے ہاں رہی۔ نہ کچھ کھاتی تھی نہ پیتی تھی۔ گھل گھل کر ویسے ہی ختم ہو رہی تھی۔ تعجب کیا جو بچہ ہونے میں ختم ہو گئی۔''

''آپ اُس وقت موجود تھیں؟'' میں نے تجسس چھپاتے ہوئے عام سے لہجے میں پوچھنے کی کوشش کی مگر شاید چھپا نہ سکا۔ عزیزہ خاتون نے چاول بینتے بینتے ہاتھ روک کر میری طرف دیکھا۔

"نہیں، میں کیوں ہوتی۔ مجھے اور ہزاروں دھندے کرنے کو تھے۔ ڈاکٹرنی ایلس لائیں، میں نے رکھ لیا، وہ لے گئیں، اللہ اللہ خیر سلا...... مجھے تو لڑکے کی پیدائش کا بھی اس وقت پتا چلا جب ڈاکٹرنی نے یہ بات چلائی کہ کوئی اس بچے کو گود لے لے۔

اسرار صاحب کا ایک بیٹا گزر چکا تھا۔ سنا ہے بیگم کو اس بات کا بڑا صدمہ تھا۔ اسرار صاحب نے اس بچے کو گود لیا۔ بڑا اللہ آمین سے پالنا شروع کیا لیکن جب بیگم صاحبہ کی اپنی بیٹی پیدا ہوگئی تو انھوں نے اس سے سوتیلا پن شروع کردیا۔ وہ اسے کسی طرح اپنے ہاں رکھنے کو تیار نہ تھیں۔ اسرار صاحب نے صوفی صاحب کی خوشامد کی۔ صوفی صاحب کے بچے بڑے ہو چکے تھے، انھوں نے میری خاطر اسے رکھ لیا، مگر وہ جناب ایک تانا شاہ۔ ناک پر مکھی نہ بیٹھنے دے۔ ایسے نخرے کہ شہزادوں کے بھی کیا ہوں گے۔"

"اسے غصہ ہوگا۔" بے اختیار میرے منھ سے نکلا۔ "ہم...... میرا مطلب ہے ایسے بچوں کو اس بات کا غصہ ہوتا ہے کہ اُن کے ماں باپ نے انھیں دوسروں کے حوالے کیوں کردیا۔"

"اوہو...... تو مجھ پر کس بات کی دھونس۔" عزیزہ خاتون کو مرچیں لگ گئیں۔ ایک تو میں اس حرام کے جنے...... چچا کی اولاد کو پالوں اور پھر ان کا غصہ بھی سہوں۔ نہ رے نہ، بی بلی مرغا لنڈورا ہی بھلا۔ وہ حضرت میری پھڑکن کی اولاد تو تھے نہیں جو میں ان کے ناز اُٹھاتی۔ پہلے ہی اتنے ایرے غیرے نتھو خیرے پال چکی تھی، میری کوکھ کا تو کوئی بھی نہ تھا۔ بے دل، بے حواس سارا سارا دن گدھی کی طرح جتی رہتی تھی۔ بس صوفی صاحب دو بول ہنس کر بول لیتے تھے، ان کو بھی چاہے جواب غصے سے ہی دیتی ہوں مگر دل کی کلی کھل جاتی تھی، مگر جب وہ زمان کی طرف داری میں کچھ کہتے تو میرے آگ لگ جاتی۔ لو بھلا وہی مثل تھی کہ کماؤ آئے ڈرتا، نکھٹو آئے لڑتا۔ کمائیں میاں خانِ خاناں، اڑائیں میاں فہیم۔ آخر ایک دن جب انھوں نے بہت جربانکی دکھائی میں نے دھتا بتائی۔ آخر تلاوا تو میں ہی تھی۔ بوجھ تو سارا مجھ پر تھا۔ ہمارے گھر سے نکلا تو بیس ہنڈیوں کا مزہ چکھتا پھرا۔ اگر اسرار صاحب مدد نہ کرتے تو بیٹھا کہیں جوتیاں گانٹھ رہا ہوتا۔"

عزیزہ خاتون کے جملوں کی بوچھاڑ سے اپنے کام کے جملے الگ کرکے ذہن میں بھرتا جاتا تھا مگر درمیان میں ٹوکنے کی ہمت نہ تھی۔ پانی کو نشیب میں بہنے دیا۔ جب روانی خود بخود تھمی تو میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا، "ایک بات بتائیے۔ کیا زمان واقعی وہی لڑکا ہے جو زینت کے ہاں پیدا ہوا تھا۔ ایسا تو نہیں کہ وہ کوئی اور ہو؟......" ابھی میں سوال کو پوری طرح کہہ بھی نہ پایا تھا کہ وہ چیخ گئیں۔

"ایل لو...... یہ تو ایسی ہی بات ہوئی کہ کوئی تم سے پوچھے کہ یہ جو سورج چمک رہا ہے یہ سورج ہی ہے؟ بولو، تم کیا کہو گے؟ یہی نا کہ بھیا میں کیا جانوں۔ ساری دنیا کہتی ہے کہ سورج ہے تو لو سورج

ہی ہوگا......'' ذرا دیر رک کر انھوں نے کہا، ''سچ پوچھو تو مجھے یہ بھی نہیں معلوم کہ زینت جیتی ہے یا مر گئی۔ ہوسکتا ہے ڈاکٹرنی نے بچہ اسی لیے دوسروں کو دیا ہو کہ لڑکی کو واپس گھر بھیج دے جہاں اس کی شادی وادی ہو جائے۔''

''آپ کا مطلب ہے شاہ نواز اس کا شوہر نہیں تھا اسے بھگا وگا کر لایا تھا؟'' میں نے کہا۔

''اور نہیں تو کیا......'' وہ بگڑ کر بولیں، ''خدا کو دیکھا نہیں عقل سے پہچانا ہے۔ کہیں ٹکتا نہیں تھا۔ بھاگا بھاگا پھرتا تھا۔ شروع میں بڑا شکر دہان۔ کہیں سے قرض کہیں سے اُدھار۔ کسی سے سائی، کسی سے بدھائی۔ کسی کو زینت سے بات نہیں کرنے دیتا تھا، مارے نہ کوٹے دل ہی دل میں کھونٹے۔ کئی دفعہ کہتے کہتے زبان دبا جاتی تھی بے چاری۔''

''مگر جب وہ آپ کے ہاں اکیلی رہی.....'' میں نے بولنا شروع کیا۔

''تب ہی تو گن کھلے.... مگر اس وقت کیا ہوسکتا تھا۔ وہ کم بخت بھاگ ہی گیا تھا۔ لڑکی یوں ہی گھل گھل کر مری جا رہی تھی۔ سب خاموش ہوگئے۔ سچ پوچھو تو مجھے بھی اُس خبیث باپ ہی کا غصہ تھا جو میں زمان پر اتارتی تھی۔''

''یہ آپ نے ٹھیک کہا۔'' میں بولا، ''اور اُسے بھی اپنے باپ پر ہی تاؤ آتا تھا جو وہ آپ سے بدتمیزی کرتا تھا۔''

''کبھی کبھی سوچتی تو ہوں کہ میں نے اس کے ساتھ زیادتی کی۔ صوفی صاحب سے ذکر بھی کرتی ہوں مگر وہ اب اس کی بات نہیں کرتے۔ سن کر چپ ہو جاتے ہیں۔ لو، اب تم ذرا اسے دھو ڈالو تو میں کھچڑی چڑھا دوں۔'' انھوں نے دال چاول میرے حوالے کر دیے۔ وہ اب خاصی بے تکلفی سے مجھ سے کام کروانے لگی تھیں۔ کبھی میں سوچتا کہ اگر مما مجھے یہاں ایسے کام کرتے دیکھ لیں تو...... سوچتے ہی میرے ہونٹوں پر ہنسی آجاتی۔ اصل میں قصور عزیزہ خاتون کا نہیں تھا۔ شروع میں انھوں نے میرے کام کرنے پر خاصا احتجاج کیا تھا مگر انسانی فطرت یہ ہے کہ کوئی بے دام کا غلام بننے کو تیار ہو تو مالک کو تامل کیوں ہو!

میں دال چاول دھو رہا تھا کہ صوفی صاحب واپس آئے۔ عرق کی بوتلیں اور مربوں کے مرتبان نکال کر انھوں نے عزیزہ خاتون کے سرہانے جما دیے۔ مٹی کا تیل ڈال کر میں چولھا جلانے لگا تو مجھے منع کر دیا۔ عزیزہ خاتون اُٹھنے لگیں تو انھیں زبردستی لٹا دیا اور خود کاغذ کے ٹکڑوں پر لکڑی کی کھپچیاں رکھ کر پھکنی سے پھونکیں مارنے لگے۔ بڑی مشکل سے آگ جلی تو ہم نے کھچڑی چولھے پر رکھی۔ گھر کا جما ہوا دہی تیار تھا۔ سلاد بنانے کا مجھے تجربہ تھا اس لیے پیاز، ٹماٹر کی چٹنی میں جھٹ پٹ تیار کر لیتا تھا۔

پسینے میں شرابور صوفی صاحب پنکھے کی ہوا سے ذرا ہٹ کر بیٹھ گئے۔ ان کی تھیوری تھی کہ پسینے میں ہوا لگ جائے تو جھٹ پٹ نمونیہ ہو جاتا ہے۔

''ہم ابھی زمان کی باتیں کر رہے تھے۔'' عزیزہ خاتون بولیں، ''خدا جانے نکما، ٹرخو کہاں ہوگا؟''

''فرض کرو تمھیں پتا چل جائے کہ وہ کہاں ہے تو کیا کرو گی؟'' صوفی صاحب بولے۔

''یہی کہوں گی کہ جو ہوا سو ہوا، اب گھر آ جاؤ۔ سب بچوں کی شادیاں ہو ہوا گئیں کوئی کہاں کوئی کہاں۔ کم از کم وہی ہمارے ساتھ رہے۔ اب ہم بھی بوڑھے ہو چلے۔ یہ گھر بار جو کچھ ہے وہی سنبھال لے۔''

''اچھا......'' صوفی صاحب ہنسے۔ ''تو یہ ٹوٹا پھوٹا گھر اور یہ بکری اُسے دینے کے لیے بے چین ہو۔ اور اگر وہ ولایت سے ڈگری لے آیا ہو اور پیسے والا ہو گیا ہو تو یہی سمجھے گا کہ دولت کی گرمی نے تمھارا دل پگھلا دیا۔ مایا کے ہیں تین نام پرسا، پرسو، پرس رام۔''

''اے ہے وہ چربوز کہاں سے بڑا آدمی بن جائے گا۔ وہ سدا کا ست الوجود۔ اس مارے رسائن ہو، پارے کو جلاؤ تو چاندی ہوتا ہے۔ اسے تو خواب و خور کے سوا کوئی کام ہی نہ تھا۔''

''خیر یہ تو نہ کہو، جان مار کر پڑھائی کرتا تھا۔ ہاں ذرا گراں سر تھا۔ تو مجھے اس کی گراں سری بھی اچھی لگتی تھی۔ سارا دن بھوکا رہتا تھا۔ تم اپنے ہاتھ سے نکال کر نہ دو تو کھانا بھی نہیں کھاتا تھا۔''

''یہ احدی پن نہیں تو کیا تھا؟'' عزیزہ خاتون بولیں۔

''خودداری بیگم! اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا۔''

''بھاڑ میں جائے ایسی خودداری۔ ایسے لالوں کے لال نہ تھے کہ میں اپنے ہاتھ سے دانہ چگاتی۔''

''اسی لیے تو بھاگ گیا۔ اب کیوں یاد کرتی ہو۔ کہتا نہ تھا کہ محبت دو گی تو محبت لو گی۔ ایک دن بڑا آدمی بن جائے گا۔ تمھیں ماں کہے گا تو تمھارا ہی مان ہوگا۔ فرض کرو اب وہ بڑا آدمی بن گیا ہو تو......''

''ارے ہمیں اس کے پیسے سے کیا لینا ہے۔ پیسے کا یہی دیکھا کہ جوں جوں چڑیا موٹی، توں توں چونچ چھوٹی۔''

''کراچی جا کر میں اسرار صاحب سے زمان کا پتا پوچھوں گا۔ اگر مل گیا تو آپ کا پیغام پہنچا دوں گا۔'' میں نے کہا۔

''مگر بھیا تم نے یہ نہ بتایا کہ تمھیں اس سے ایسی کیا دلچسپی ہے اور تمھیں اس کی بابت بتایا کس نے؟''

''کسی دن بتاؤں گا، ابھی تو اجازت دیجیے۔ ایک ضروری کام یاد آ گیا۔'' میں نے کہا۔

''کھانا تو کھا کر جاتے۔'' صوفی صاحب نے کہا۔

''اے ہے کھانے کو ہے کیا؟ ایک موئی کھچڑی، وہ بھی اللہ جانے کیسی پکے۔ ذرا اس کو اُٹھ کر دیکھ تو لو۔'' عزیزہ خاتون بولیں۔

صوفی صاحب کھچڑی دیکھنے اُٹھے۔ میں سلام کر کے جلد سے باہر نکل آیا۔ آج کے سوالوں سے بچ گیا تو آئندہ اتنی پریشانی نہیں ہوگی۔ اپنے کمرے میں پہنچ کر میں نے پہلا کام یہ کیا کہ مما کو ایک جذباتی خط لکھا۔ وہ خط جذباتی ضرور تھا مگر میرے اس وقت کے احساسات اور خیالات کی بالکل صحیح عکاسی کرتا تھا۔ میں نے لکھا:

مما جانی......میں سخت ذہنی الجھن میں ہوں اور جب تک کوئی تسلی بخش جواب نہیں ملے گا یہی حالت رہے گی۔ میں نے یہاں اپنی جڑیں کھوجنے کی کوشش کی۔ صوفی صاحب اور ان کی بیگم سے جو حالات معلوم ہوئے ان میں زمان نامی ایک لڑکے کی پیدائش کا قصہ ہو بہو وہی ہے جو آپ نے میری پیدائش کا بیان کیا تھا۔ اگر زمان زینت کا بیٹا ہے تو میں کون ہوں؟ اگر میں اس کا بیٹا ہوں تو زمان کون ہے؟ اور دنیا کیوں اُسے زینت کا بیٹا سمجھتی ہے؟

یقین کیجیے کہ میں کٹی ہوئی پتنگ کی طرح ڈول رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ میں کون ہوں؟ میری آئندہ زندگی کا انحصار بہت کچھ اس بات پر ہے کہ میں کس ملک کا باشندہ ہوں؟ درخت اپنی جڑوں اور اپنے بیج سے پہچانا جاتا ہے۔ اسے دوسرے ملک میں لگایا جائے تب بھی خیال رکھا جاتا ہے کہ وہ کہاں سے آیا ہے کیوں کہ اس کے ملک کی ساری آب و ہوا، ساری خاصیتیں اس کے اندر موجود ہوتی ہیں۔ مجھے بو واپسی ڈاک جواب دیجیے کراچی کے پتے پر۔ میں وہاں واپس جا رہا ہوں۔ باقی باتیں آئندہ۔

............آپ کا فرمانبردار بیٹا ڈیو

خط کو سپردِ ڈاک کرنے کے بعد تھوڑی سی تسلی ہوئی۔ میں نے دوسرے دن ہی ملتان چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ اسرار صاحب سے ملنا ضروری تھا۔ شاید وہ صوفی صاحب سے زیادہ جانتے ہوں۔ دوسرے دن سارا سامان سمیٹ کر کار میں رکھنے کے بعد رخصتی سلام کرنے صوفی صاحب کے گھر پہنچا۔

''آج میں کراچی واپس جا رہا ہوں۔ فی الحال میرا جانا ضروری ہے۔ پھر کبھی دوبارہ آؤں گا۔'' میں نے کہا۔

''وہ تو آنا ہی پڑے گا۔'' عزیزہ خاتون وثوق سے بولیں، ''بزرگوں کو سلام کیے بنا جاؤ گے تو بلوائے جاؤ گے۔ یہ تو یہاں کا قاعدہ ہے۔ بس خدا خیریت سے لائے۔'' میں ان کی بات کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھا۔

''ایک الجھن میں آیا تھا مگر وہ سلجھی نہیں۔'' میں نے کہا۔

''کیا کسی لڑکی وڑکی کا چکر ہے۔'' عزیزہ خاتون دلچسپی سے بولیں۔ ''یوں کرو کہ مزار پر جا کر منت مان لو۔ اللہ ساری مشکلیں خود بخود آسان کر دے گا۔ جب منت پوری ہو جائے مزار پر چادر چڑھا دینا یا مجھے لکھ دینا میں تمھاری طرف سے چڑھا دوں گی۔''

''کیوں تم کیوں چڑھاؤ گی؟ یہ خود چادر چڑھانے آئیں گے۔ تم اپنی اماں کی سی باتیں نہ کرو۔''

''ارے میری ماں غریب کو کیوں بیچ میں گھسیٹ رہے ہو؟'' عزیزہ خاتون ایک دم سے اینٹھ گئیں۔

''ان ہی کی عادت تھی تم سے کہا نہیں کرتی تھیں، میں نے فلاں بات کے روزے مانے تھے ذرا میری طرف سے روزے رکھ لیجیو۔''

''تو کیا کرتیں بے چاری، خود اتنی ضعیفہ تھیں۔''

''تو مانتی کیوں تھیں..... ارے ڈیو میاں! تم جانے ان باتوں کو سمجھتے ہو یا نہیں آخر میں تو یہ حالت ہوگئی تھی کہ انھیں یہ بھی یاد نہ رہتا تھا کہ کس بات کے روزے یا نفل مانے تھے۔ کہتی تھیں میرے نماز کے دوپٹے میں اتنی گرہ لگی ہیں بیٹی تو اتنے نفل پڑھ لینا۔'' صوفی صاحب ہنسے۔

''ارے چھوڑو بھی میری اماں کا پیچھا۔ ہاں بیٹا تم بھی منت مانتے جاؤ۔ اسی بہانے اور ایک بار ہمارے غریب شہر کا چکر لگا لو گے۔'' عزیزہ خاتون میرے جانے سے سچ مچ افسردہ تھیں۔

''خبردار اس شہر کو غریب کبھی نہ کہنا۔'' صوفی صاحب للکارے، ''جس شہر میں ایسے ایسے گنج ہائے گراں مایہ دفن ہوں.....''

''چلو شریف سہی، ملتان شریف۔'' عزیزہ خاتون نے جلدی سے تصحیح کی۔

''خیر منت ونت پر تو تم کیا یقین رکھتے ہو گے۔'' صوفی صاحب بولے، ''مگر ایک بات میری بھی گرہ میں باندھ لو۔ تمھارے کلچر میں جو کچھ بھی ہوتا ہو مگر یاد رکھو شادی سے باہر کسی قسم کا رشتہ ہمارے مذہب اور ہمارے کلچر میں انتہائی برا سمجھا جاتا ہے۔ مذہب میں اس سے بڑا گناہ کوئی اور نہیں اور ہاں..... تمھارے مذہب میں بھی یہی ہے نہ مانو تو اور بات ہے۔''

''ہمارے ہاں کہتے ہیں کہ شادی تو دل کی ہوتی ہے۔ جب دو دل اقرار کر لیں تو تیسرے کی بلا سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''مگر نہیں.......'' صوفی صاحب بولے، ''دل بدل جاتے ہیں، نیتوں میں بھی فرق آ جاتا ہے اور یہ ایسی چیز ہے جس سے نسلیں بنتی ہیں، قومیں بنتی ہیں، پشتیں چلتی ہیں۔ اس کو ریکارڈ پر ہونا چاہیے۔ کچھ چیزوں کا ریکارڈ پر ہونا ضروری ہوتا ہے۔ تمھارے ہاں بعد میں کتنے الجھیڑے پڑتے ہیں۔ خون

ٹیسٹ کروائے جاتے ہیں۔ بچہ کس کا ہے..... بن والدین کے بچوں اور والدین میں سے کسی ایک کے ساتھ رہنے والے بچوں کے مسائل جدا۔ ان سب سے بچنے کے لیے تھوڑی سی دل سے ہٹ کر کارروائی کی بات ہونی چاہیے۔ ایسے فیصلے زیادہ سوچ سمجھ کر کیے جاتے ہیں۔ اس میں ایک دوسرے کی قدر و منزلت بھی زیادہ ہوتی ہے اور دوسروں کی نظر میں بھی زیادہ عزت ہوتی ہے۔''

''اور کیا بیٹے، گرجا کی تو ویسے بھی کوئی قدر عزت نہیں۔'' عزیزہ خاتون بولیں۔

''گرجا..... کون؟'' میں نے پلٹ کر پوچھا۔

''وہ موتی جس میں بال پڑا ہوا اسے گرجا کہتے ہیں۔ عورت کی عزت اور موتی کی آب ہمارے ہاں ایک برابر ہوتی ہے۔'' وہ بولیں۔

''اسے معلوم ہے۔'' صوفی صاحب میرے طرف سے بولے۔

''نہیں، مجھے معلوم نہیں تھا مگر اب ہوگیا ہے۔'' میں نے بوجھل دل سے کہا۔ اب اُن سے کیا کہتا۔ کیا خاک معلوم ہوگیا ہے۔ مجھے تو ابھی تک یہ بھی علم نہیں کہ میں ہوں کون؟

میں نے رخصتی سلام کیا۔ صوفی صاحب نے گلے لگایا۔ عزیزہ خاتون نے سر پر شفقت سے ہاتھ پھیرا۔ پھر دوڑی ہوئی اندر گئیں اور اپنے ہاتھ کا بنا ہوا ملتانی حلوہ پوٹلی میں باندھ کر ساتھ کر دیا۔

کراچی پہنچتے ہی دو کام کیے۔ امریکن اسکول میں اپنے آنے کی اطلاع دی اور اسرار صاحب سے فون پر بات کی۔ انھوں نے دو دن بعد کی تاریخ ملاقات کی مقرر کی۔ مقررہ تاریخ کو ملنے پہنچا تو..... تو معلوم ہوا کہ اسی دن حرکتِ قلب ہونے سے وہ اس دنیا سے رخصت ہوگئے تھے۔ گویا بدقسمتی یہاں بھی ساتھ ساتھ تھی۔ اُسی دن سمن اور اس کی امی بھی مجھے اسرار صاحب کے ہاں ملی تھیں۔ یہ داستان آپ سمن سے سنیں تو بہتر ہے کہ وہ بصیرہ کی دوست ہے۔ میں تو محض ایک تماشائی تھا جو وہاں جا کر خود تماشا بن گیا۔ اچھا اب چلتا ہوں، بہت دماغ کھایا۔ خدا حافظ بلکہ بائی بائی....... اُس نے امریکن انداز سے انگلیاں چلائیں اور غائب ہوگیا۔

میں رین بو پل پر سے ویزا دکھا کر کینیڈا میں داخل ہوئی۔ پل کے بیچوں بیچ امریکا اور کینیڈا کا جھنڈا لگا ہوا تھا۔ اصل سرحد یہی ہے پل اور دریائے نیاگرا کا بیچ۔ دو لڑکیاں باتیں کرتی سڑک کے ساتھ بنے ہوئے پیدل راستے سے گزریں۔ یہ دونوں ایک ملک سے دوسرے ملک میں جا رہی تھیں۔ سرما کا موسم تھا۔ کار پارک تقریباً خالی پڑے تھے۔ ایک جگہ کار کھڑی کر کے اُس جگہ آئی جہاں دریا آبشار بن کر گرتا ہے۔ پانی گر رہا تھا اور برف کی چھوٹی بڑی لکیریں سیاہ دیوار پر IVY کی طرح چمٹی

ہوئی تھیں۔ جی چاہا بلندی سے سارا منظر دیکھا جائے۔ سکائی لون مینار پیچھے تھا۔ دو زرد بجزوں جیسے ایلی ویٹر گول عمارت سے چمٹے ہوئے اُوپر نیچے آ جا رہے تھے۔ میں نے وہاں جانے کے لیے سڑک پر دریا کے ساتھ ساتھ چلنا شروع کیا۔ نیچے دریا سے اُٹھتی بل کھاتی ایک رنگین کمان آسمان تک چلی گئی تھی۔ لوگ اس زبردست قوسِ قزح کی تصویریں لے رہے تھے۔ سدا بہار درختوں کے چھوٹے چھوٹے قطعے اب بھی راہ میں آئے۔ اسکائی لون کے دو ڈیک ہیں۔ ایک میں ریسٹوراں ہے۔ سب سے اوپر کا ڈیک تماشا دیکھنے کے لیے ہے۔ میں اسی پر آئی۔ شیشے کی چڑھتی سیڑھی سے منظر لحہ بہ لحہ صاف تر اور زیادہ تر ہوتا جاتا تھا۔ مجھے برابر یہ احساس تھا کہ سمن میرے ساتھ ہے اور اطمینان سے ایک جگہ بیٹھ کر اس سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔ چناں چہ سوغات کی دکان سے ایک اسٹول لے کر آبشاروں کے عین سامنے بیٹھ گئی۔

''سمن! موضوعِ زیرِ بحث ہے اسرار صاحب کے انتقال کا دن۔'' میں نے گفتگو کا آغاز کیا۔

''یہ وہی منحوس دن چل رہا ہے جس کا قصہ میں آپ کو سنا رہی تھی۔'' سمن نے مجھے یاد دلایا۔ امی اور میں ٹیکسی میں بصیرہ کے گھر کے لیے روانہ ہوئے۔ چند منٹ بعد امی بولیں، ''آج یونی ورسٹی سے واپسی پر دیر کیسے ہوگئی؟'' پھر میرے جواب دینے سے پہلے خود ہی بولیں، ''بس نکل گئی ہوگی۔'' انھیں اندازہ تھا کہ اب اس قسم کے سوال مجھے اچھے نہیں لگتے۔ مجھے بھی معلوم تھا کہ جب تک ان کو خاطر خواہ جواب نہیں مل جائے گا اُن کے دل کو کرید لگی رہے گی۔ چناں چہ میں نے ان کو بتا دینے کا فیصلہ کیا۔

''امی! آج یونی ورسٹی میں سلیم آیا تھا..... امان کا دوست، یہ بتانے کہ امان کی شادی ہو رہی ہے۔''

وہ کچھ دیر خاموش رہیں، پھر آواز دبا کر بولیں، ''ہاں، مجھے معلوم تھا مگر میں نے تمھیں بتایا نہیں۔ تم چاہو تو شادی میں مت جانا، میں کہہ دوں گی کہ تمھاری طبیعت ٹھیک نہیں۔''

''اب لوگوں کو اور باتیں بنانے کا موقع دیں امی! کیوں نہ ہم آپ اسی طرح جائیں جس طرح عام حالات میں جاتے۔'' میں نے کہا۔

''جیسی تمھاری مرضی۔'' انھوں نے کہا، پھر ٹھنڈا سانس بھر کر بولیں، ''کیسا خون سفید ہوگیا ہے۔ تم ذرا سی تھیں، ابھی بولنا شروع نہیں کیا تھا جب سے تمھیں 'میری بہو' کہا کرتی تھی اور اُس دن اسی بہو کی خاطر دوپٹہ پاؤں میں رکھا تو روندتی ہوئی چلی گئی۔''

مجھے یوں لگا جیسے امی نے خنجر میرے کلیجے میں اُتار دیا ہو۔ ''یہ کب کی بات ہے امی؟'' میں نے غصہ دباتے ہوئے پوچھا مگر امی میرے بدلتے رنگ کو دیکھ کر گڑبڑا گئیں۔

''گھبرائیے نہیں۔'' میں نے تسلی کے لیے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھا۔ ''مگر مجھے بتائیے یہ

کب کا واقعہ ہے؟''

''ابھی.....شادی سے پہلے، جب میں نے سنا کہ انھیں ایک لڑکی پسند آ گئی ہے اور پیغام دینے کا سوچ رہے ہیں۔'' امی نظریں جھکائے چور بنی دھیرے دھیرے بول رہی تھیں۔ ''کیا کروں، دل سے مجبور ہو کر گئی مگر کسی نے سیدھے منھ بات تک نہ کی۔ اماں تو کہیں چھپ ہی گیا۔ سامنے ہی نہیں پڑا۔''

''آپ نے بہت برا کیا امی!'' اور تو اُن سے کیا کہتی مگر ان کی اور اپنی توہین کے احساس سے میں روہانسی ہو گئی۔ آواز میرے حلق میں پھنسنے لگی۔ ''آپ مجھ سے پوچھے بغیر اس کے گھر کیوں گئیں؟ آپ کا خیال تھا کہ اماں اور اس کی امی راضی ہو جاتیں تو میں اس شخص سے شادی کر لیتی؟''

امی حیران ہو کر میری طرف دیکھنے لگیں۔ لمحے بھر کی پشیمانی غائب ہو گئی۔ گرج دار آواز میں بولیں، ''کیوں کیا حرج تھا؟ اور کون تم سے شادی کر رہا ہے۔ کیا ساری عمر بیٹھی رہو گی؟''

''شادی ہی سارے مسئلوں کا حل نہیں ہے امی...اور آپ نے تو کبھی اس طرح گرے پڑے کا سودا نہیں کیا تھا۔ آپ کی خودداری تو ضرب المثل تھی۔''

''ارے کہہ تو رہی ہوں دل سے مجبور ہو گئی تھی۔ یہی سوچا میں کتنے دن کی ہوں، آج ہوں، کل نہیں۔ میرے بعد کیا حشر ہوگا.....سوچتی ہوں تو لرز جاتی ہوں۔''

''امی! اب آپ میری طرف سے بے فکر رہیں، میں پہلی سی تیرہ سال کی لڑکی نہیں ہوں۔ مجھے اب کوئی اُلّو نہیں بنا سکتا.....اور ہاں اب ہم دونوں اس شادی میں نہیں جائیں گے۔ دیکھیں کوئی ہمارا کیا کر لیتا ہے۔''

''دنیا باتیں بنائے گی، ابھی خود ہی تو کہہ رہی تھیں.....'' امی بولیں۔

''جب تک مجھے یہ بات معلوم نہیں تھی۔ تعجب ہے کہ آپ اس کے بعد بھی وہاں جانے کو تیار ہیں۔ اب ہم دونوں جو چاہیں گے سو کریں گے۔ دنیا کی آپ نے اتنی پروا کی، مجھے بتائیے اس نے آپ کے لیے کیا کیا؟''

''تو ٹھیک کہتی ہے بچی۔'' امی نے رومال سے آنکھیں صاف کیں۔ ''عزیزوں نے، محلے والوں نے اور دنیا نے ہمارے لیے کیا کیا سوائے بری باتیں پھیلانے کے۔ پہلے میں لوگوں کے کہنے میں آتی رہی مگر اب تم سمجھ دار ہو، جو بہتر سمجھو وہ کرو۔ ہاں میرے سفید چونڈے کا خیال رکھنا۔ دنیا کی باتوں کی اب میں بھی پروا نہیں کروں گی۔''

''یہ ہوئی بات!'' میں نے نعرہ لگایا۔ ''امی میں امریکن اسکول میں انٹرویو کے لیے گئی تھی نا، وہ مجھے ملازمت دینے کو تیار ہیں۔ گھر سے ذرا دور ہے مگر آپ فکر نہ کیجیے گا۔''

''نہیں، کہہ تو دیا، اب جو اپنے لیے مناسب سمجھو کرو۔'' امی کے لہجے میں جو اطمینان تھا اس نے مجھے ڈھارس دی۔ ''تمھاری سہیلی بصیرہ کے ساتھ بہت برا ہوا۔'' چند لمحوں بعد وہ بولیں۔ ''بے چاری کی ماں تو پہلے ہی نہیں تھی۔''

''ہاں امی وہ بے چاری بھی بڑی بدقسمت ہے، کوئی بہن بھائی اس کا بھی نہیں ہے۔'' میں نے کہا اور دل ہی دل میں خدا کا شکر کیا کہ میری ماں حیات ہیں اور ابھی ابھی انھوں نے میرے ساتھ مکمل سمجھوتا کر لیا ہے۔ کٹھور زمانہ آدمیوں کو توڑنے کا کام بھی رفتہ رفتہ کرتا ہے جیسے پانی کی بوند پتھر کی سل کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کا کام دھیرے دھیرے کرتی ہے۔ ایک مسلسل چوٹ۔ جس دن پہلی مرتبہ ان پر یہ بات ظاہر ہوئی تھی کہ میں امان کے ساتھ تنہا سمندر کے ساحلوں پر جاتی رہی ہوں اُن پر کیسا دیوانگی کا دورہ سا پڑا تھا۔ مسلسل دو ہتڑ مارتے ہوئے وہ کہتی چلی گئی تھیں،

''ارے کم بخت، نامراد..... تو اس دن کے لیے زندہ کیوں رہی۔ مر جاتی تو تجھے بھی صبر کر لیتی، اب یہ صدمہ کیسے سہوں گی۔ ارے کلموئی تجھے یہ خبر نہیں کہ عورت کی عزت موتی کی سی آب ہے، ایک دفعہ گئی تو گئی۔''

اور دھاروں دھار روتے ہوئے میں نے کہا تھا ''تو یہ بات آپ نے پہلے کیوں نہیں بتائی تھی؟''

یکا یک مارتے مارتے ہاتھ روک کر انھوں نے حیرت سے مجھے دیکھا تھا۔ ''ارے یہ بھی کوئی بتانے والی بات تھی۔ ہماری عمر کی ساری عورتیں یہی کہا کرتی تھیں، ارے اسکول کالج میں پڑھنے والی لڑکیوں کو تم کیا بتاؤ گی، وہ تم سے زیادہ جانتی ہیں۔''

''آپ کی امی اور ان کی نسل یہی بات آپ لوگوں کے لیے کہتی رہی ہوگی۔ مجھے کیا معلوم ہوتا۔ نہ کوئی بہن، نہ کوئی گہری دوست۔ میں تو ویسے ہی خوابوں کی دنیا میں رہتی تھی۔ میرے لیے تو ساری کتابیں بھی کہانیوں کی کتابیں تھیں۔ تاریخ تو افسانہ تھا ہی، جغرافیے میں پڑھائے جانے والے سارے ملک، پہاڑوں کے سلسلے، سمندر اور دریاؤں کو بھی کہانیاں ہی سمجھتی رہی۔ کبھی خیال نہ آیا کہ یہ سب واقعی دنیا کے پردے پر موجود ہیں۔ یقین کیجیے امی! پڑھانے والے نقشے بھی شاید سال میں ایک آدھ بار ہی دکھاتے ہوں اسی وجہ سے سارے براعظم، کرے اور کہکشائیں بھی خطِ استوا اور خطِ سرطان کی طرح خیالی لگتی تھیں۔'' میں ہنس پڑی تھی، امی کا موڈ بھی شگفتہ ہو گیا تھا۔

امی نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ پھر ایک دم گھبرا گئیں۔

''اے بھائی ٹیکسی والے کس طرف جا رہے ہو؟ بتایا نا، کے ڈی اے اسکیم نمبر ایک جانا ہے۔''

''اُدھر ہی جاتا ہے مائی'' ٹیکسی ڈرائیور بولا ''تجھے اپنے گھر نہیں لے جاتا۔''

''ٹھیک طرح بات کرو۔'' میں نے غصے سے کہا، ''بدتمیزی کیوں کرتے ہو۔''

''ٹھیک طرح تو بات کرتا ہے اور کیسے بات کرے۔'' ٹیکسی ڈرائیور اور بھی اکھڑ پن سے بولا۔

''چپ رہو، چپ رہو۔'' امی مجھ سے بولیں، ''وہ تو جاہل نپٹ ہے تم کیوں اس کے منہ لگ رہی ہو؟'' امی نے آواز دبا کر کہا مگر ٹیکسی ڈرائیور نے سن لیا۔

''خوہ..... ہم جاہل ہے، انسان تو ہے.....'' اس نے اندھا دھند گاڑی چھوڑی۔ ''تم لوگ ہر وخت سمجھتا ہے ہم تمھارے ساتھ فورٹوئنٹی کرتا ہے۔ خوہ ہماری کوئی عزت نہیں ہے، ہم شریف آدمی نہیں ہے؟''

''کیوں نہیں بھائی کیوں نہیں..... معاف کرو۔ تم کسی دوسرے راستے سے لے جا رہے تھے اس لیے میں نے پوچھا۔'' امی دبک کر بولیں۔

''اب آپ اُلٹا اس سے معافی مانگیں گی۔'' مجھے تاؤ آ گیا۔ ''بدتمیزی اس نے کی معافی آپ نے مانگی کیوں کہ وہ مرد ہے۔''

''نہیں بیٹی، آدمی اپنی عزت سے ڈرتا ہے۔'' وہ پھسپھسائیں کہ ٹیکسی ڈرائیور نہ سن لے۔ ''برے تجھ سے ڈروں کہ تیری برائی ہے۔ آدمی نہ کسی کے منھ لگے نہ کسی سے سنے۔''

''اس کا مطلب ہے کہ وہ غلط راستے پر لے جائے تو ہم چپ بیٹھے رہیں۔ امی آخر ہمارے ملک میں کیا بات ہے کہ کوئی کسی سے سیدھے منہ بات نہیں کرتا؟'' میں نے جھلا کر پوچھا۔

''اس لیے بیٹی کہ کوئی کسی پر اعتماد نہیں کرتا۔ وہ بھی ٹھیک کہتا ہے۔ جب مجھے اس پر اعتماد نہیں تو وہ میری عزت کیوں کرے۔ ہاں بھئی اب دائیں کو موڑ لو، یہ پہلا ہی دروازہ ہے جہاں بہت سی کاریں کھڑی ہیں۔''

ٹیکسی ڈرائیور گاڑیاں اور لوگوں کی شکلیں دیکھ کر موقع محل پہچان گیا۔ خاموشی سے گاڑی کھڑی کر دی۔ میں اُتر گئی تو امی سے بولا، ''اماں معاف کرنا، ہم تمھارے ساتھ بدتمیزی سے بات کیا۔''

''بیٹا آئندہ خیال رکھنا۔'' امی میٹھے لہجے میں بولیں، ''ہم بیواؤں کے دل چڑیا سے بھی چھوٹے ہوتے ہیں۔ جوان بچی ساتھ ہو تو ہر وقت دل ڈرتا ہے، اسی لیے میں گھبرا گئی تھی۔''

ذرا دیر پہلے ہی امی نے میرے اُوپر پورے اعتماد کا اظہار کیا تھا مگر ابھی تک وہ مجھے وہی تیرہ سالہ لڑکی جانتی ہیں، اس کا مجھے خوب اندازہ تھا۔ امی نے میٹر کے حساب سے زیادہ پیسے دیے۔ ڈرائیور ریزگاری نکالنے لگا تو کہا، ''بیٹا رکھو۔''

''مہربانی اماں۔'' کہہ کر ڈرائیور ٹیکسی آگے بڑھا لے گیا۔

اسرار صاحب کی بڑی سی کوٹھی کے آگے حدِنظر تک سڑک پر گاڑیاں کھڑی تھیں اور لوگ برابر چلے آرہے تھے۔سماں وہی تھا جو ایسے موقعوں پر ہوتا ہے مگر ذرا بڑے پیمانے پر۔لوگ زیادہ تھے۔ کوٹھی کے احاطے کے اندر شامیانے کے نیچے مرد حضرات بیٹھے تھے۔ جوان گھر کے باہر اور اندر ٹولیوں میں کھڑے تھے۔عورتیں اور لڑکیاں کاروں،ٹیکسیوں اور رکشاؤں سے اُتر کر سر ڈھانپے تیز تیز گھر کے اندر کی طرف جارہی تھیں۔

میں اور امی بھی اسی طرف بڑھے۔شامیانے تلے بیٹھنے والوں میں سب سے آگے دو بارلیش بزرگوں کے برابر میں ڈیو بیٹھا اپنی اُردو بولنے کی داستان سنا رہا تھا،''شیخوپورہ میں پیدا ہوا،شروع میں وہیں کے اسکول میں پڑھا۔امریکا میں غیر ملکی زبان میں اُردو کے کورس لے لیے اور یہاں آ کر ملتان کے ایک صوفی صاحب سے درس لیتا رہا۔''

''جزاک اللہ......'' ایک بزرگ بولے،''مگر میاں برا نہ ماننا، پرسے میں آئے تھے تو کرتا پاجامہ پہن لیتے۔''

''ارے واہ......وہ اپنے لباس میں ہے،خواہ مخواہ کرتا پاجامہ پہن لے۔'' دوسرے بزرگ نے ڈیو کی طرف سے برا مانا۔

''بات تو آپ ٹھیک کہتے ہیں۔میں پیچھے جا کر بیٹھتا ہوں۔'' ڈیو اُٹھ کھڑا ہوا۔پھر اس کی نظر مجھ پر پڑی اور وہ ہماری طرف آیا۔چھ فٹ قد،چمکتی ہوئی سرخ ٹی شرٹ، نیلی جین اور بھٹے جیسے سنہری بال،جو بھی اندر گھستا اسے حیرت سے دیکھتا مگر وہ ان سب سے بے نیاز ہمارے نزدیک آ کھڑا ہوا۔

''آپ یہاں کیسے؟'' اس نے پوچھا۔

اردو بولتا دیکھ کر امی نے بھی اسے حیرت اور دلچسپی سے دیکھا۔ میں نے اس کا تعارف کروایا، ''امی یہ امریکن اسکول میں پڑھاتے ہیں۔دو دفعہ گئی۔دونوں مرتبہ ان سے ملاقات ہوئی۔''

''اتفاق کہ آج تیسری مرتبہ......'' ڈیو نے کہا۔ہم گھر کے اندرونی دروازے تک پہنچ چکے تھے۔

''آپ یہاں کیسے؟'' اس کو واپس نہ جاتا دیکھ کر میں نے پوچھا۔

''میں کسی ضروری کام سے اسرار صاحب سے ملنے آیا تھا۔پہنچا تو معلوم ہوا کہ آج ہی ان کا انتقال ہوگیا۔میں یہاں کسی کو جانتا تو نہیں مگر بیٹھ گیا۔''

''اچھا کل ملیں گے۔شاید کل میں پھر اسکول آؤں۔'' میں نے جان چھڑانے کو کہا۔

''بہتر۔'' ڈیو نے کہا۔اندر گھستے ہوئے میں نے ایک نظر ڈالی تو وہ کرسیوں کی طرف جانے کے بجائے صدر دروازے کی طرف جارہا تھا۔

جس طرح گھر کے باہر کا حصہ مردوں سے پُر تھا اسی طرح محل جیسے گھر کا چپہ چپہ عورتوں سے بھرا ہوا تھا۔ میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ ان کے اتنے عزیز اور رشتے دار تھے۔ جب بھی گھر آتی بصیرہ اور والد کے سوا شاید ہی کوئی اور ہوتا۔ کبھی کبھی اسرار صاحب کے مشیرِ کار ضمیر صاحب نظر آ جاتے تھے مگر اس وقت تو برات کا سا سماں تھا۔ امی تو ایک سپارہ لے کر دوسری عورتوں کے ساتھ ایک کمرے میں بیٹھ گئیں۔ میں بصیرہ کو ڈھونڈنے لگی۔ ایک کمرے میں جھانکا تو دو عورتیں باتیں کر رہی تھیں:

''ارے شروع سے ہی مغرور اور بد دماغ ہے، باپ نے سر پر چڑھا رکھا تھا۔ لو اور سنو، ہمیں کمرے تک میں جانے کی اجازت نہیں سہیلیاں ہی سب کچھ ہو گئیں۔''

''چپ، چپ۔'' دوسری نے ہلکا سا ٹہوکا دے کر کہا۔ ''یہ بھی اس کی سہیلی ہی لگتی ہے کہیں سن نہ لے۔''

''سننے دو، میں ڈروں ہوں..... ٹٹوانی، ذرا سی چھوکری ہے۔'' انھوں نے حقارت سے فرمایا۔

ان کا لہجہ مجھے بہت برا لگا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو شاید لڑتی مرتی مگر اس وقت کان دبا کر چلی آئی۔ ہر کمرے میں تلاش کیا مگر بصیرہ اور ناز کہیں نظر نہ آئیں۔ اس کا مطلب ہے کہ بصیرہ اوپر اپنے کمرے ہی میں ہے۔ میں نے فیصلہ کیا۔ بطخ کی گردن کا سا گھومتا سنگِ مرمر کا زینہ چڑھ کر اوپر جا رہی تھی کہ آدھے زینے پر ناز اپنا مٹکا سا پیٹ اُٹھائے ہانپتی کانپتی ملی۔

''تمھیں ہی دیکھنے آ رہی تھی۔'' اس نے کہا۔ ''بصیرہ اپنے ہوش میں نہیں ہے۔ جانے کیا اول فول بک رہی ہے۔ وہ کسی سے ملنا نہیں چاہتی مگر عورتیں ہیں کہ اسے دیکھنے ٹوٹی پڑ رہی ہیں جیسے کوئی تماشا ہو رہا ہو۔ میں نے اندر سے اس کا دروازہ بند کروا دیا ہے۔ ننھی کو بٹھا آئی ہوں کہ صرف میری آواز پر دروازہ کھولے۔ تمھیں لے کر اندر گئی تو عورتیں جان کھا جائیں گی۔ تم یوں کرو کہ اس کی اسٹڈی کی طرف آؤ میں تمھیں وہیں ملوں گی۔''

میں چکر کاٹ کر بصیرہ کی اسٹڈی کی طرف گئی۔ ناز وہاں پہلے سے موجود تھی۔ جیسے ہی میں اندر آئی اس نے یہ دروازہ بھی بند کر لیا۔ ٹھٹکے قدموں سے میں بصیرہ کی خواب گاہ کی طرف بڑھی۔ وہ بال بکھرائے، پیر پسارے قالین پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اُس کی آنکھیں خون کبوتر ہو رہی تھیں۔ میں اسے گلے لگا کر رو پڑی۔

''دیکھا تم نے.......'' بصیرہ نے ہچکیوں سے روتے ہوئے کہا، ''تمھاری غریب امیر زادی کے پاس کیا تھا۔ ایک باپ ہی تو تھا وہ بھی چھین لیا اُس سے.......''

روتے روتے وہ قالین پر پھیل گئی اور بے ہوش ہو گئی۔ ناز نے ملازمہ لڑکی ننھی کو بھیجا کہ ڈاکٹر کو

اسٹڈی کی طرف سے لے آئے۔ تھوڑی دیر میں وہ آئے۔ بصیرہ کو دیکھا اور کہا ''گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔'' جب وہ ہوش میں آئی تو اسے چند گولیاں کھلائیں اور واپس چلے گئے۔ جاتے جاتے ناز کو کچھ اور گولیاں اور ہدایات دیتے گئے۔

''میں تمھارے غم کو سمجھتی ہوں۔'' میں بصیرہ کا ہاتھ سہلا کر اس سے کہتی رہی۔ حالاں کہ شاید وہ خود بھی اس وقت تک اپنے غم کو پوری طرح سمجھنے کی اہل نہیں تھی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوتا تھا کہ وہ بہک رہی ہے اور اسے پوری طرح یہ احساس بھی نہیں ہے کہ وہ اس وقت کہاں ہے۔ اس کے کمرے کا دروازہ پل پل پر کھٹکھٹایا جارہا تھا۔ ناز یا نخھی جا کر کھولتیں تو کوئی صاحبہ اندر آنے کی کوشش کرتیں اور جب اُن سے پوچھا جاتا تو کھسیا کر جائے نماز کا مطالبہ کرتیں۔ ناز نے جا کر بتایا کہ ساری جائے نمازیں، قرآن شریف اور سپارے نیچے ہی ہیں۔

''میت کا کھانا کہاں سے آئے گا؟'' کسی نے درز میں سے جھانک کر مطالبہ کیا۔

''جب سب کچھ سہیلیاں ہی ہیں تو پھر کھانا بھی انھیں کے گھر سے آنا چاہیے۔'' اُن کے پیچھے کسی کی آواز آئی۔

''یہ ہزاروں لوگ کیا یہاں کھانے کے لیے جمع ہوئے ہیں۔ کوئی تقریب ہورہی ہے؟'' ناز نے غصے سے کہا اور دروازہ پھر زور سے بند کردیا۔

جس وقت اسرار صاحب کی میت اُٹھائی جانے لگی، ناز اور میں بصیرہ کو سہارا دے کر ان کے آخری دیدار کے لیے لے گئے۔ بصیرہ کی بے کلی دیکھی نہ جاتی تھی۔ وہ ماہی بے آب کی طرح تڑپ رہی تھی۔ جنازہ دروازے سے باہر نکلا تو ہمارے ہاتھوں سے نکل کر وہ بے تحاشا اس کے پیچھے لپکی۔ میں نے جا کر اُسے تھاما اور اسی وقت میں نے دیکھا کہ ڈیو جنازے کے ساتھ باہر نکلنے والوں میں پھر شامل ہے۔ اس وقت وہ سفید ریشمی کڑھے ہوئے کرتے شلوار میں تھا۔ جھاگ جیسے نئے سفید کپڑے کے گریبان سے اس کے سنہری بال جھانک رہے تھے۔ خدا جانے یہ کون مخلوق ہے۔ ایسے نازک وقت میں بھی یہ خیال میرے ذہن میں آئے بغیر نہ رہا۔ کہیں کوئی جاسوس تو نہیں جو بھیس بدل کر لوگوں کے گھروں کے حالات معلوم کرتا پھرتا ہو۔ پھر مجھے اپنی امی کی بات یاد آئی۔ ہم کسی پر اعتماد نہیں کرتے تو لوگ ہماری عزت کیوں کریں۔ دل ہی دل میں شرمندہ ہوتی بے حال بصیرہ کو تھامے میں اندر آئی۔ بڑی مشکل سے ایک ایک قدم اور ایک ایک سیڑھی پر سنبھالتی اسے زینے پر چڑھایا۔ جیسے ہی اس کا کمرہ نزدیک آیا وہ لپک کر اندر داخل ہوئی اور کمرہ اندر سے مقفل کرلیا۔ میں باہر کھڑی منہ تکتی رہی گئی۔

ناز کی اور میری خوشامد درآمد کے بعد بھی جب بصیرہ نے دروازہ نہ کھولا تو پھر ڈاکٹر سے مشورہ

کیا گیا۔ انھوں نے خیال ظاہر کیا کہ وہ نیند کی گولیوں کے اثر سے جلد ہی سو جائے گی اس لیے اسے چند گھنٹے کے لیے تنہا چھوڑ دیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کی دوست ناز اس پر نظر رکھ سکتی ہے۔ مجھے اور ناز کو معلوم تھا کہ اس کی اسٹڈی کی کنجی کہاں رہتی ہے۔ اسٹڈی کے ذریعے اس کے کمرے میں جایا جاسکتا تھا۔ چناں چہ فیصلہ ہوا کہ آج رات ناز، بصیرہ کے ساتھ رہے۔ اس کا گھر نزدیک تھا اور وہ آسانی سے آجاسکتی تھی۔ اس کا دیور سلیم اسے خوشی سے جتنی مرتبہ وہ چاہے گھر لے جانے اور واپس لانے کو تیار تھا۔ میری امی چاہتی تھیں کہ میں آج اُن کے ساتھ واپس چلی جاؤں اور دوسرے دن آن کر رات کو بصیرہ کے ساتھ رہوں۔ چناں چہ ہم دونوں ناز کو خدا حافظ کہہ کر گھر جانے کے لیے باہر نکلے۔

اسرار صاحب کے بزنس کے کسی ساتھی نے دیگیں ہوٹل سے بھجوا دی تھیں۔ کرائے کے برتن منگوانے کا کسی کو خیال نہیں آیا تھا۔ چناں چہ گھر کے سیٹ کے سیٹ نکل کر باہر جارہے تھے۔ چند گھریلو قسم کی خواتین نے باورچی خانے میں چھاؤنی چھائی ہوئی تھی جہاں سے بھر بھر سالن کے ڈونگے اور چاول کی ڈشیں باہر جارہی تھیں۔ عورتوں کے لیے کمروں کے اندر دسترخوان بچھا دیے گئے تھے۔ برتن کم پڑے تو کھانے کے کمرے سے نایاب قیمتی برتن اور چاندی کے چمچے اور قابیں نکل آئیں۔ ملازموں کو جو حکم ملتا وہ بجالاتے۔ انھیں کچھ معلوم نہ تھا کہ کون کون ہے۔ سب ہی نہایت قریبی عزیز اور سگے بنے ہوئے تھے۔ آگے بڑھ بڑھ کر کام کروا رہے تھے اور کھانے پر بیٹھے تو سب ہی لمبے لمبے ہاتھ مار رہے تھے۔ کیوں نہ مارتے، کھانا کسی تقریب کے کھانے سے کم نہ تھا۔ دو عدد میٹھے تھے اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ وافر تھا۔ دوسرے دن ناز نے بتایا کہ کھانا چاندی کی قابوں میں بھر بھر کر گھروں میں بھی لے جایا گیا، اب وہ قابیں کب واپس آئیں گی اس کا حساب کون رکھے گا۔

امی اور میں صدر دروازے سے نکلے کہ کوئی ٹیکسی پکڑ لیں کہ ڈیو اپنی کار میں جاتا نظر پڑا۔ ہمیں دیکھتے ہی اس نے کار روک لی۔

''آیئے آپ کو گھر چھوڑ آؤں۔'' اس نے کہا۔

''نہیں بھیا! تم کہاں اُلٹی طرف جاتے پھرو گے، ہم ٹیکسی لے لیں گے۔'' امی نے کہا۔

''میں تو اب زبان دے چکا ہوں۔'' ڈیو بولا، ''یہاں کوئی ضمیر صاحب لوگوں کو گھروں تک پہنچانے کا انتظام کر رہے تھے۔ میں نے ان سے وعدہ کیا تھا کہ کم از کم ایک فیملی کو میں بھی چھوڑ دوں گا۔''

''کیوں، کیا خیال ہے؟'' امی نے میری طرف دیکھا۔

''جیسی آپ کی مرضی۔'' میں نے کہا۔ اور کہتی بھی کیا، مجھے یاد تھا کم بخت اُردو سمجھتا اور بولتا ہے۔

''چلتے ہیں۔ وہ خود ہی اصرار کر رہا ہے۔'' امی بولیں۔ ''سچی بات ہے اس وقت ٹیکسی ملنی اور

بھی مشکل ہے۔''

''ایک خاتون آگے آجائیں۔'' ڈیو نے کہا۔

''سمن، تم آگے بیٹھ جاؤ۔'' امی نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

میں آگے بیٹھ گئی۔

''کس طرف؟'' دونوں کے بیٹھنے کے بعد ڈیو نے پوچھا۔

''فیڈرل بی ایریا۔ معلوم ہے کس طرف کو ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، کچھ اندازہ ہے۔ غلط جاؤں تو بتا دیجیے گا۔'' ڈیو نے کہا اور گاڑی اسٹارٹ کی۔ مغرب کا وقت ختم ہو چکا تھا۔ اُفق کی سرخی سیاہی میں تبدیل ہو رہی تھی۔ کاریں دنادن دوڑ رہی تھیں۔ ''شروع میں مجھے پاکستان میں کار چلانے میں بڑی تکلیف ہوئی۔ ٹریفک رولز کی تو یہاں کوئی پابندی نہیں کرتا۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوتا ہوں کہ زیادہ تر کاریں اپنی لین میں نہیں دو راستوں کے درمیان چلتی ہیں۔'' ڈیو بولا۔

''ارے میاں! یہ تم اتنی اچھی اُردو کیسے بول لیتے ہو؟'' امی نے کہا۔ امی خود کراچی کے ٹریفک اور بطورِ خاص فیڈرل بی ایریا کے ٹریفک سے نالاں تھیں مگر ایک غیر ملکی کی زبان سے انھیں یہ بات اچھی نہ لگی اور انھوں نے فوراً موضوع بدل دیا۔

''آج آپ شاید دسویں ہیں جس نے مجھ سے یہ بات پوچھی ہے۔ روز دو تین مرتبہ یہ سوال کیا جاتا ہے۔ آپ لوگ..... مثلاً اب یہ سمن غیر معمولی اچھی انگریزی بولتی ہیں مگر ان سے کوئی یہ سوال نہیں کرتا، میں نے بھی نہیں کیا حالاں کہ مجھے کرنا چاہیے تھا۔''

''ارے انوکھی بات پر لوگ حیران ہوتے ہیں۔ اچھی بری انگریزی لاکھوں لوگ بولتے ہی ہیں مگر کتنے غیر ملکی تم جیسی صاف اُردو بولتے ہیں۔''

''پہلے سمن بتائیں..... کیوں کہ امریکن اسکول میں انگریزی پڑھانے کی ملازمت بھی ہر ایک کو نہیں ملتی۔'' ڈیو ہنسا۔

''شروع میں ایک انگریزی اسکول کے ہاسٹل میں رہتی تھی۔ انگریزی بالکل نہیں بول سکتی تھی۔ چناں چہ چوبیس گھنٹے خاموش رہتی تھی۔ بقول امی جیسے گونگے کا گڑ کھایا ہو۔ صورتِ حال خاصی تشویش ناک ہو گئی تو ایک مدر نے مجھے پروں کے نیچے لے لیا۔ ہر وقت اپنے ساتھ رکھتی تھیں، انگریزی اوڑھنا بچھونا بنا دی یا گھول کر پلا دی یا کیا کیا کہ اب اکثر امی سے بھی انگریزی ہی میں بات کرنے لگتی ہوں۔''

''اردو بالکل بھول گئی ہے۔'' امی نے مبالغہ برتا۔

''خیر، ایسی بات تو نہیں۔'' ڈیو میرے بچاؤ کو آیا۔ ''آپ کے ہوتے ہوئے اردو بھولنا ان کے لیے مشکل ہے لیکن انگریزی اور اردو کی ملاوٹ تو یہاں اتنی عام ہے کہ شاید ہی کوئی بچا ہوا ہو۔''

''اسی لیے تو تمھاری اردو مجھے اردوئے معلیٰ لگتی ہے بلکہ اردوئے مصفّٰی۔'' امی نے کہا۔

''اب اتنی مشکل اردو سے میرا امتحان نہ لیجیے، بس داستانوں کی دین سمجھ لیجیے یا استادوں کی، میرا کمال نہیں ہے۔''

''کمال تو بہرحال ہے، کیوں سمن؟'' امی نے کہا۔ ''ہاں اس چوراہے سے بائیں لے لینا۔'' ڈیو نے ہونکتے ٹرک اور بچوں کی سائیکلوں سے کار کو بچایا اور گڑھوں سے کیچڑ اُچھالتا کار کو دوبارہ سڑک پر لایا۔

''آپ نے مجھے اور احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا۔'' میں نے انگریزی میں کہا۔ ''میں پہلے ہی بہت سے کمپلیکسوں کا شکار ہوں۔''

''اچھا، یہ بات آپ کو معلوم ہے، یہ بڑی حوصلہ افزا بات ہے۔'' ڈیو نے ہنس کر انگریزی میں جواب دیا۔ ''آپ میری اردو سے متاثر ہیں میں آپ کی انگریزی سے مرعوب ہوں، حساب برابر ہوا۔''

''ہونا چاہیے۔'' امی نے کہا۔ ''کہ تم امریکن اسکول میں اردو پڑھایا کرو۔''

''ہاں...... یہ ذکر بھی ہوا تھا مگر اس اسکول بے چارے کی اردو کا معیار یہ ہے کہ پاکستانی بچوں تک کو اردو حروف کے ہجے انگریزی میں لکھوائے جائیں sheen شین۔ اس کے لیے میں راضی نہ ہوا تو کسی اور کی خدمات حاصل کر لی گئیں۔''

''اب دائیں کو لے لو، آگے جا کر ایک گلی میں لینا ہوگا، بتا دینا سمن۔'' امی نے کہا۔

''جی اچھا۔'' میں نے کہا، پھر ڈیو سے پوچھا ''آپ قبرستان بھی گئے تھے اسرار صاحب کی میت کے ساتھ؟''

''ہاں گیا تھا۔'' ڈیو نے کہا۔

''کیوں؟'' میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔

''اچھا سوال ہے۔'' ڈیو بھی ہنسا۔

''بہرحال، آپ کے لیے لازمی نہیں تھا جب تک کہ آپ کو involve ہونے کا شوق نہ ہو۔'' میں نے کہا۔

''involve کے معنی شمولیت لے رہی ہیں یا پھنسنے کی عادت؟'' ڈیو نے پوچھا۔

''پھنسنا ہی زیادہ صحیح ہے میرے خیال میں۔'' میں نے ہنستے ہوئے دل کی بات کہہ دی۔

''غیر ملک میں آپ دو طرح رہ سکتے ہیں۔'' ڈیو بولا، ''بالکل الگ تھلگ اپنی الگ دنیا میں جس سے آپ کچھ دیکھتے ہیں نہ سیکھتے ہیں۔ سیاحوں کے لیے تو ٹھیک ہے لیکن مجھ جیسے لوگوں کے لیے سو فی صد نہ سہی تو پچاس فی صد شمولیت ضروری ہے۔ آج میں نے پاکستان میں مُردوں کو دفنانے کی رسومات کے بارے میں جو معلومات کیں بیس کتابیں اس کے بارے میں پڑھتا تو نہ ہوتیں اور کنفیوژن الگ ہوتا۔''

''تو تمھیں معلومات حاصل کرنے کا چسکا ہے۔'' امی بولیں۔

''یہی سمجھ لیجیے۔ لکھنے لکھانے کا بھی شوق ہے۔ تجربے، مشاہدے کے ساتھ معلومات بھی ضروری ہوتی ہیں۔''

''اردو میں لکھتے ہو یا انگریزی میں؟''

''انگریزی میں۔ ابھی تک تو میری اپنی زبان انگریزی ہی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ کسی دوسری زبان میں لکھنا بڑا دل گردے کا کام ہے۔''

''ابھی تک کا جواب نہیں۔'' میں نے کہا، ''گویا آپ کی مادری زبان بدل بھی سکتی ہے۔'' میں ہنسی۔

''میرا مطلب ہے اس جنم میں تو اردو میں لکھنا مشکل ہے، شاید اگلے جنم میں.....''

''واہ، جیسے بول لیتے ہو لکھ بھی سکتے ہو۔'' امی بولیں۔

''بولنا اور بات ہے لکھنا اور چیز ہے۔'' اُس نے کہا۔

''شروع میں تو شاید آپ نے اردو ہی پہلے پڑھی تھی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں وہ تو اس لیے کہ میں پیدا یہاں ہوا تھا۔'' ڈیو نے کہا۔

''اچھا تم پاکستان میں پیدا ہوئے تھے؟'' امی نے دلچسپی سے پوچھا۔

''دیکھیے، اگر مرشد نے اجازت دے دی تو کبھی اردو میں لکھنے کی کوشش کروں گا۔ وہ دوسری مرتبہ اردو جاننے اور پاکستان کی پیدائش کی بات ٹال گیا۔ ''دیکھیے ٹھیک راستے پر جا رہا ہوں نا؟''

''بس اگلی گلی میں مڑ جائیے۔'' میں نے کہا۔ پھر اس کی پہلی بات کے جواب میں کہا، ''چھوڑیے کیا کریں گے اردو میں لکھ کر۔ امی کی نسل کے چند لوگ رہ گئے ہیں پڑھنے والے یا اردو میں لکھنے والے، بے چارے ایک دوسرے کی چیزیں پڑھ کر تبصرے کرتے رہتے ہیں۔''

''یہ بھی آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' ڈیو بولا۔

''بس بھئی، یہی گھر ہے جس کے آگے گلِ مہر ہے۔'' امی نے کہا۔

گلِ مہر کے نام پر ایک نیوی بلو کار میرے ذہن میں لپکی پھر نکل گئی۔ کار سے اُتر کر میں نے ڈیو

کا شکریہ ادا کیا۔

''کھانا کھاؤ گے؟'' امی نے شاید تکلفاً پوچھا۔''وہاں تو ہم نے کھایا نہیں۔کوئی موقع تھا،لڑکی رو رو کر مر رہی ہے اور لوگوں کو پلاؤ زردے کی سوجھ رہی ہے۔''

''میں نے تو تھوڑا سا کھایا۔'' ڈیو ہنسا۔''میں سمجھا شاید ضروری ہوگا۔''

''کافی پی لیجیے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں کافی پی لوں گا۔'' ڈیو راضی ہوگیا۔

ہم دونوں کے ساتھ اندر آیا۔ ہمارے چھوٹے سے ڈرائنگ روم میں پیر پھیلا کر شلوار کے پائینچوں کو پنڈلیوں تک چڑھا کر صوفے پر بیٹھا تو یکایک مجھے وہ کمرہ بہت ہی چھوٹا سا نظر آنے لگا اور اس کے مقابل ایکا ایکی اپنا قد بھی بے حد پست لگا۔

کافی بنا کر لائی تو امی نے اس سے پوچھا،''حلوہ کھاؤ گے،حبشی ہے۔''

''حبشی ہو، گورا ہو، کالا ہو۔سب حلوے بڑے شوق سے کھاتا ہوں۔'' اس نے پیر سمیٹ کر دونوں ہاتھوں کو ایک دوسرے سے ملتے ہوئے کہا۔''ایک بات بتاؤں.....اب کبھی ملتان گیا تو نہ اردو کی محبت میں، نہ صوفی صاحب کی چاہت میں، دراصل ملتانی حلوہ میرے منھ کو لگ گیا ہے۔ وہاں سے آتے ہوئے چھ بڑے ڈبے لے کر آؤں گا۔شاید میں addict ہوگیا ہوں۔ addict کی اردو کیا ہے۔؟''

''کچھ بھی ہو۔اب الفاظ کے معنی پوچھ پوچھ کے منھ کا مزہ خراب نہ کرو۔'' میں نے کہا۔

''اوہو......'' ڈیو چہکا۔''تم تو بالکل اُستانی جی کی طرح مجھے ڈانٹ رہی ہو۔بھول رہی ہو کہ یہ ہماری صرف تیسری ملاقات ہے۔امی دوسرے کمرے میں حلوہ لینے چلی گئی تھیں۔'' میں نے موقع غنیمت جان کر اسی انداز میں جواب دیا:

''تو کیا ہوا، آپ بھی تو تیسری ملاقات میں ہمارے گھر بیٹھے حلوہ نوش کرنے کی تیاری کر رہے ہیں۔''

''تم مردوں کو اپنی جگہ پر رکھنا جانتی ہو۔'' ڈیو بولا۔

''بہت اچھی طرح۔'' میں نے کہا۔

''میں یاد رکھوں گا۔'' وہ ہنسا۔

''اسی میں خیریت ہے۔'' میں نے خوش دلی سے کہا۔

''ثمن! ایک بات بتایئے۔'' یکایک وہ سنجیدہ ہوگیا،''آپ تو اسرار صاحب کی بیٹی کی دوست ہیں، کیا آپ کو معلوم ہے کہ زمان کب انگلستان سے واپس آرہا ہے؟''

''زمان؟'' میں نے ذہن پر زور ڈالا۔ ''میں نے یہ نام بصیرہ سے کبھی نہیں سنا...''

''آپ نے یہ نام اسرار صاحب کے گھر کبھی نہیں سنا، تعجب ہے۔'' اس نے کہا۔ تعجب اس کے لہجے سے بھی ظاہر تھا۔

''جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں نے یہ نام اُن کے گھر میں کسی سے نہیں سنا۔ کون ہے یہ؟''

''صوفی صاحب ہیں ایک ملتان میں، انھوں نے مجھے کسی کام سے بھیجا تھا اسرار صاحب کے پاس۔ وہ زمان کی انگلستان سے واپسی کے بارے میں جاننا چاہتے تھے۔ ہوسکتا ہے صرف اسرار صاحب ہی اسے جانتے ہوں کاروباری سلسلے میں۔''

''آپ کہیں تو میں بصیرہ سے بات کروں؟'' میں نے کہا۔ پھر مجھے خیال آیا اور میں نے اضافہ کیا۔ ''اس کی جو حالت ہے اُس کی وجہ سے چند دن تک تو کوئی غیر متعلق بات کرنا مشکل ہی ہے۔''

''اس کی ضرورت بھی نہیں۔ صوفی صاحب کو میں خط لکھ دوں گا۔''

''کیا لکھ دیں گے؟''

''یہی کہ اسرار صاحب کا انتقال ہوگیا اور زمان کا کچھ پتا نہیں چلا۔ وہ بھی کچھ ایسے سنجیدہ نہیں تھے۔''

''آپ ضمیر صاحب سے بات کر کے دیکھیے، وہ اسرار صاحب کے دوست بھی ہیں اور قانونی مشیر بھی۔ انھیں معلوم ہوگا۔''

''ان کا فون نمبر دے دیجیے۔''

''میرے پاس تو نہیں ہے مگر اُن سے ملاقات ضرور ہوگی، میں اُن سے لے کر آپ کو دے دوں گی۔''

''شکریہ۔ یاد رہے گا آپ کو؟''

''یاد نہ رہے تو آپ یاد دلا دیجیے گا۔'' میں نے کہا۔

''یاد دلانے کے لیے آپ کا فون نمبر؟'' ڈیو نے ہنس کر کہا۔

میں نے ایک پرچے پر اپنا فون نمبر لکھ کر اسے دیا۔ پھر اپنی ڈائری میں اُس کا فون نمبر لکھا۔ امی حلوہ لے کر آئیں تو ہمیں فون نمبروں کا تبادلہ کرتے دیکھا مگر ان کے چہرے سے ان کے جذبات کا اندازہ نہ ہوا۔ ڈیو حلوہ کھاتے ہوئے ان سے پرانی اردو کتابوں اور غزلوں کے نئے ٹیپ کی باتیں کرتا رہا۔

''چاہو تو کچھ کتابیں اردو کی لیتے جاؤ۔'' امی نے کہا، ''میں تو اب پڑھتی نہیں۔ آنکھوں میں جان نہیں۔ بچی کو شوق نہیں۔ غزلوں کے کچھ ٹیپ ہیں وہ بھی لے جاؤ۔''

ڈیو نے چند ٹیپ لیے اور امی کی خواب گاہ کی مچان سے چند گرد آلود کتابیں پسند کیں۔

''میں جلد ہی اردو بازار کا چکر لگاؤں گا۔ کچھ اچھی کتابیں مل گئیں تو آپ کی کتابیں لوٹا دوں گا۔''

''رکھے رکھو...... یہاں کون پڑھتا ہے۔ مجھے معلوم ہے میرے بعد سب ردّی میں بکیں گی۔'' امی سنانے کو کہہ رہی تھیں۔

''کراچی میں لائبریریوں کی سخت کمی ہے۔'' ڈیو کہہ رہا تھا، ''اردو کی کتابیں کہیں نہیں ملتیں۔ ایک اچھی لائبریری ہے تو وہ ریفرنس لائبریری ہے۔ وہاں سے آپ کتابیں نہیں لے سکتے۔''

''جبھی تو اردو بولنے والوں کی اور کمی ہوگئی ہے۔'' امی بولیں، ''لوگ امریکن قونصلیٹ کی ایئر کنڈیشنڈ لائبریری اور برٹش کاؤنسل لائبریری کے چکر میں رہتے ہیں۔'' یہ گویا میرے اوپر براہِ راست حملہ تھا۔ میں نے کندھے اُچکا دیے۔

''امی! میں ذرا ناز کو فون کر کے بصیرہ کو پوچھ لوں۔'' میں نے وہاں سے سٹک لینے میں عافیت دیکھی۔

''ہاں ضرور پوچھو، میری طرف سے بھی۔'' امی نے کہا۔

ناز نے بتایا کہ بصیرہ ویسی ہی بے چین اور بے قرار تھی۔ اسٹڈی کی طرف کا دروازہ کھول کر اندر گئی تو وہ بار بار آسمان کی طرف دیکھ کر کہہ رہی تھی، ''یا مولیٰ! اب میں ایک لمحہ بھی جینا نہیں چاہتی۔ مجھے اسی وقت اُٹھا لے۔'' بڑی خوشامد درآمد کے بعد اسے نیند کی ایک گولی اور دی اور اب وہ غافل سو رہی ہے۔ گھر میں ناز نے سب کو بتا دیا ہے کہ کوئی اس کے کمرے کے نزدیک بھی نہ جائے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے گھر جا رہی تھی۔ رات کو آن کر بصیرہ کے گھر ہی سونے کا ارادہ تھا۔ یکایک مجھے صبح کا اپنے بارے میں کہا ہوا ایک لفظ یاد آیا۔

میں لغت کھول کر 'ٹٹوانی' کا مطلب ٹٹول رہی تھی کہ امی کے ساتھ ڈیو برآمدے میں آیا۔ شاید وہ رخصت ہو رہا تھا۔ کتابیں اور ٹیپ اس کی بغل میں دبے ہوئے تھے۔

''آپ تو کہہ رہی تھیں انھیں اردو سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ یہ تو مہمانوں کی خاطر داری چھوڑ کر یہاں کھڑی لغت ملاحظہ کر رہی ہیں۔'' ڈیو کی آنکھوں میں شرارت کی چمک تھی۔

''مجھ سے پیسے ہتھیانے کے لیے کسی لفظ کا مطلب دیکھ رہی ہوگی۔ مجھ سے شرط لگا رکھی ہے کہ آپ ایسے الفاظ اور محاورے بولتی ہیں جو لغت میں نہیں ملتے۔ جب میرا کہا ہوا کوئی لفظ اس کی لغت میں نہیں ملتا تو مجھ سے دس روپے وصولتی ہے۔''

''وصولتی!'' میں نے فوراً امی کو پکڑا۔ ''دس روپے تو اسی لفظ کے لائیے۔''

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ کوئی لفظ اس لغت میں نہ ملے کسی اور لغت میں مل جائے۔'' ڈیو نے کہا۔

''کسی اور لغت کی سند نہیں، اسی لغت کی ہے۔ شرط انھی کی لگائی ہوئی ہے۔ قاعدے قانون بھی انھی کے لاگو ہوتے ہیں۔ وہی مثل ہے، رانی سے کون کہے کہ آگا یا ڈھک۔''

''امی!.....'' میں نے تنبیہاً کہا۔ شرم سے میرے کان تک سرخ ہو گئے۔ امی کو محاوروں کا ایسا چسکا تھا کہ موقع بے موقع بولتی تھیں۔

میں نے کسی کو نہ بتایا کہ میں ٹوائی کا مطلب ڈھونڈ رہی تھی۔ اس کے معنی نے اور ڈیو کے دیو قامتی کے احساس نے مجھے چیونٹی سا بنا کر رکھ دیا تھا۔ ڈیو کے رخصت ہونے کے بعد ہم دونوں نے کھانا کھایا۔ کچھ دیر ٹیلی وژن دیکھا۔ کپڑے بدل کر لیٹی تو دن بھر کے واقعات کی جھلکیاں پے بہ پے نظر آنے لگیں۔ کبھی ڈیو کی کوئی بات، کبھی بصیرہ کا تڑپ تڑپ کے رونا پھر صبح کے ہنگامہ خیز واقعات یاد آئے۔ سلیم کا یونی ورسٹی آنا اور امان کی شادی کی اطلاع دینا۔ یہ ایک دن بہت ہی خراب دن تھا۔

سمن نڈھال سی لگ رہی تھی۔ میں خود بھی تھک چکی تھی۔ اشارے کی دیر تھی کہ سمن غائب۔ میں نے نظر کو ذرا بلند کیا، ایک طرف انٹاریو اور دوسری طرف ایری جھیل اُفق پر لبالب بھرے ہوئے پیالے کی طرح دکھائی دی۔ میں نے مینار کا پورا چکر لگایا۔ گھروں اور بازاروں کے درمیان برف ہر جگہ پڑی تھی۔ گرمیوں میں جس باغ میں سیکڑوں اقسام کی ہریالی اور پھول تھے، وہاں بھی کیاریاں برف سے بھری ہوئی تھیں۔ نیچے آن کر سوغاتوں کی دکان میں شیشے کے لہریے دار برتن بہار کے رنگوں کی یاد دلا رہے تھے۔ چھوٹی سی ایک خوب صورت بچی نے سامنے کے اسٹال کے آگے لگا ایک بٹن دبا دیا۔ بٹن دباتے ہی چودہ طبق روشن ہو گئے۔ ایک بکس برآمد ہوا جس کے اندر اور باہر ہیرے جواہرات اور سونے کے چھوٹے بڑے سکوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ بچی کی ماں بھاگی ہوئی آئی اور بچی کا ہاتھ پکڑ کر بے دردی سے گھسیٹتی ہوئی لے گئی۔ بچی رونے لگی۔ اتنا بڑا خزانہ چھوڑنے کو تیار نہیں تھی۔ اس بے چاری کو کیا معلوم کہ زندگی میں کتنے ہی مصنوعی ہیرے جواہرات اور جعلی سکے اسی طرح رجھائیں گے اور وہ ان کی خاطر روتی رہے گی۔ کھلے خزانے کو اسی طرح روشنی میں چھوڑ کر اس کی داستان سنے بغیر میں چلی آئی۔

صبح سو کر اٹھی تو نہ صرف برف کی دیوار موجود تھی بلکہ لحہ بہ لحہ اونچی ہو رہی تھی۔ خدا جانے کب سے چپ چاپ برف پڑ رہی تھی۔ آبشار کے کنارے گرتی برف سے دھند لائے ہوئے تھے۔ پھواریں برف بن کر ان جگہوں کو اور دبیز کر دیں گی۔ برف کی لٹکتی قاشیں اور لانبی ہو جائیں گی۔ امریکن آبشار کے پار درختوں کی بانہیں برف سے سفید ہو گئی تھیں۔ سدا بہار جھاڑیوں پر برف کی

سونڈیں لٹک رہی تھیں اور باریک شاخوں پر پھنسی برف شگوفوں کی طرح خوب صورت لگ رہی تھی۔ کچھ لوگ گھٹنوں گھٹنوں برف میں کیچ کیچ کرتے اپنے گھروں یا جائے قیام کی طرف جارہے تھے۔ میرے لیے آج باہر نکلنے کا دن نہیں تھا۔ کس کو مدعو کیا جائے..... زمان!

زمان اور ڈیو کی پیدائش کی حکایت یکساں ہونے کے باوجود ان کی شکل وصورت اور شخصیت میں کوئی بات مشترک نہیں تھی۔ ڈیو طویل قامت اور سفید فام تھا۔ زمان کا قد اور رنگ روپ اوسط درجے کا تھا۔ اس کے بال گھنگھریالے سیاہ تھے۔ اس کی شخصیت میں ضد، ہٹ دھرمی کی حد تک تھی۔ خود اس نے کہا کہ وہ کبھی اپنے ماضی کے بارے میں سوچتا ہے نہ سوچنا چاہتا ہے صرف مستقبل کے بارے میں سوچتا ہے۔

میرے اصرار پر اس نے ماضی کے بارے میں کہا، ''مجھے نہیں معلوم میں کون ہوں۔ مجھے اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہے۔ میں ایک بدقسمت، چاہت ناآشنا شخص ہوں۔ میں نے اپنی زندگی خود بنائی ہے۔ اس میں جن لوگوں نے مدد کی ہے ان کا احسان مند ہوں، جنھوں نے روڑے اٹکائے ہیں وہ ظاہر ہے کہ میرے محسن نہیں ہیں۔ زندگی میں بے واسطہ رشتوں اور بلاوجہ دوستیوں کا قائل نہیں ہوں۔ اُلجھے دھاگوں سے دور بھاگتا ہوں۔ اُلجھے پڑیں تو ڈور توڑ دینا زیادہ بہتر سمجھتا ہوں۔

مجھے اپنا بچپن کچھ کچھ یاد ہے۔ مگر وہ بچہ بڑا ہو کر میں، نہیں بنا۔ وہ بدلا ہے، جان بوجھ کر شعوری طور پر بدلا ہے۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انسان کی شخصیت پانچ سال میں بن جاتی ہے، پھر کبھی نہیں بدلتی۔ میں اُن کی بات کو صحیح نہیں مانتا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ انسان کی شخصیت اس کے اندر اسی طرح پیدائشی طور پر موجود ہوتی ہے جیسے بیج میں درخت۔ میں یہ بات بھی نہیں مانتا کیوں کہ میں جانتا ہوں کہ اگر میرے ساتھ وہ کچھ نہ ہوا ہوتا جو ہوا تو میں بالکل مختلف انسان ہوتا۔ بہرحال مجھے یاد نہیں مگر مجھے بتایا گیا تھا کہ میں جس اسپتال میں پیدا ہوا تھا، بہت عرصے تک وہیں رہا تھا کیوں کہ میری والدہ میری پیدائش میں ختم ہوگئی تھیں اور میرے باپ نے مجھے پلٹ کر نہ پوچھا تھا۔ شاید وہ میری پرورش کا بوجھ نہیں اُٹھا سکتے تھے یا اُٹھانا نہیں چاہتے تھے۔ نرسیں اسپتال میں میری دیکھ بھال اچھی طرح کرتی تھیں۔ پیدا ہو کر انھی کے ہاتھوں میں آیا تھا۔ پہلے دن سے انھوں نے ہی بوتل سے دودھ پلایا تھا۔ شاید انھیں مجھ سے کچھ لگاؤ ہوگیا ہو یا ڈاکٹر میری دیکھ بھال کے لیے انھیں کچھ پیسے دیتی ہوں۔

جب میں ایک سال کا ہوا اور پاؤں پاؤں چلنے لگا تو سوال اُٹھا کہ آخر مجھے کب تک اس طرح اسپتال میں رکھا جاسکتا ہے۔ فیصلہ ہوتے ہوتے بھی کچھ وقت لگا اور بالآخر ایک دن مجھے صوفی

صاحب کے گھر پہنچا دیا گیا۔ اس میں صوفی صاحب کی مرضی کا دخل تو ہو سکتا ہے مگر بیگم صوفی کا یقیناً نہیں تھا کیوں کہ جب سے میں نے ہوش سنبھالا اُس خدا کی بندی کو اپنے سے نالاں ہی دیکھا۔ صوفی صاحب کو میں ابا کہتا تھا اور ابا سمجھتا تھا۔ بیگم صوفی کو میں شروع میں اماں کہتا تھا مگر سمجھتا نہیں تھا۔ نہ ہی وہ میرے اماں کہنے پر خوش ہوتی تھیں بلکہ یوں لگتا تھا جیسے ان کی زندگی کا مقصد ہی یہ ثابت کرنا ہو کہ وہ ہرگز میری ماں نہیں ہیں۔ وہ ہر وقت ٹیڑھی نگاہوں سے دیکھتی اور طعنے تشنے دیتی رہتی تھیں۔ ان کی باتوں کا مطلب تو میں نہیں سمجھتا تھا مگر کڑوی نظروں کے معنی سمجھ لیتا تھا۔ جہاں تک ممکن ہوتا ان سے دور اور ابا کے پیچھے پیچھے پھرتا۔

ابا اُن دنوں پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے اور ریلوے لائن پار گندے سے بازار کی طرف ایک کچے اسکول کے پاس بنے چھوٹے سے کوارٹر میں رہتے تھے اور علاقے کے سب سے بڑے جھنڈا لگے گھر میں ایک بچے کو حساب پڑھانے جاتے تھے۔ اس گھر کے دو صدر دروازے ایک دوسرے سے ایکڑوں دور تھے۔ ان کے درمیان ایکڑوں میں اور اطراف کی خالی زمینوں میں لمبے لمبے لان، گلاب کے پھول، بچوں کے پھسلنے کے جھولے اور سبزیوں کے کھیت تھے۔ یوں تو آس پاس کے اور گھروں میں بھی ایسے ہی چمن زار اور پھول تھے مگر جو چیز اس گھر کو سارے گھروں سے ممتاز کرتی تھی وہ صدر دروازے پر بنی ہوئی چوکی دار کی چوکی اور گھر کی عمارت کے سامنے پندرہ فٹ اونچے کھمبے پر لگا ہوا جھنڈا تھا۔

اس گھر کا بچہ یوں تو انگریزی اسکول میں پڑھتا تھا مگر حساب میں بہت کمزور تھا اس لیے ابا کو حساب اور اردو پڑھانے پر مامور کیا گیا تھا۔ مشاہرہ بہت قلیل تھا مگر بابا ہر روز اپنی بوسیدہ، رنگ اُتری سائیکل پر وہاں پہنچتے تھے۔ آندھی آئے منہ برسے بابا کا یہ فرض ناغہ نہ ہوتا تھا۔ یہ اور بات کہ جب بابا وہیں پہنچیں تو پتا چلے کہ صاحب زادی ابھی کلب سے سوئمنگ کر کے نہیں لوٹے ہیں یا فٹ بال کھیلنے چلے گئے ہیں یا سارا گھرانا ہی کہیں پکنک پر گیا ہوا ہے۔ ایسے میں بابا کو لمبے چکنے برآمدے میں آرام کرسی پر بٹھا دیا جاتا۔ چوکی دار، مالی خانساماں، کوارٹر میں رہنے والا دھوبی اور جمعدار سب جمع ہو جاتے اور حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتے رہتے جب تک کہ صاحب زادے تیار ہو کر پڑھنے کے لیے نہ آ جائیں یا ابا واپسی کا ارادہ نہ کر لیں۔

یہ سب میں اس لیے دیکھ سکتا تھا کہ سائیکل کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ کر ساتھ آتا تھا اور سڑک پار کر کے ایک چھوٹے سے باغ میں بیٹھ کر اپنی کتابیں پڑھا کرتا تھا۔ ابا خوش ہوتے تھے کہ میں محلے کے آوارہ گرد بچوں کی صحبت سے محفوظ رہتا ہوں اور میں خوش کہ اماں کے لہنے مہنے سے محفوظ سب سے خوب

صورت گھر کے سامنے بیٹھا خوب صورت خواب دیکھا کرتا تھا۔ وہ خواب یہ تھے کہ ایک دن میں بھی ایسے ہی جھنڈا لگے گھر میں رہنے کے لیے آؤں گا۔ سارے غریب بچوں کو عام اجازت ہوگی کہ وہ اس کے ایکڑوں لان میں دھما چوکڑی مچائیں، جھولے جھولیں، چاندنی راتوں میں دھوپ چھاؤں کھیلیں۔ دوپہر کو درختوں کے بیچ سے گزرتی نہر میں نہائیں، پھولوں کے تختے روندیں۔ سنتولیا، غلام لکڑی، فٹ بال جو چاہیں کھیلیں۔ میں خود بھی ان کے ساتھ آن کر کھیلا کروں گا اور ان کی آنکھوں کی اس چمک سے دل شاد کیا کروں گا جو انھیں جھنڈا لگے گھر میں بلا روک ٹوک آنے جانے سے ملے گی۔

ابا کے ساتھ کھانا نہ کھاؤں تو اماں مجھے کھانا نکال کر نہیں دیتی تھیں اور میں خود کبھی دیگچی سے نکال کر نہیں کھاتا تھا۔ ایسے موقعے پر ابا کے کبھی کبھار کے دیے ہوئے پیسوں سے بھنے ہوئے چنے اور گڑ کے ڈلے خرید کر کھاتا تھا اور یہ دونوں چیزیں میرے لیے بڑی سے بڑی نعمت سے بڑھ کر تھیں۔ میں خواب دیکھتا تھا کہ جب جھنڈا لگے گھر میں آجاؤں گا تو ایک بڑا سا کمرہ بھنے ہوئے چنوں سے اور ایک کمرہ گڑ کے ڈلوں سے بھرلوں گا اور خوب دل کھول کر کھایا کروں گا۔

میں یہ بتانا تو بھول گیا کہ بچپن میں انگوٹھا پیا کرتا تھا۔ انگوٹھا پینے والے بچے خاموش اور بے ضرر سے ہوتے ہیں۔ شرارت کرنے میں انھیں دلچسپی نہیں ہوتی۔ منہ میں انگوٹھا لے کر چوستے رہنا ان کے لیے سب سے بڑی آسائش ہوتی ہے جس کا کوئی بدل نہیں۔ مجھے یاد نہیں کس نے شروع میں انگوٹھا پیتے دیکھا تو یہ سوچ کر کہ بعد میں اس کا چھڑانا جان لیوا بن جائے گا مجھے چُسنی کا عادی بنا دیا۔ ان کا خیال تھا کہ چُسنی آسانی سے چھڑائی جاسکتی ہے۔ انگوٹھا نہ چھپایا جاسکتا ہے نہ پھینکا جاسکتا ہے۔ چُسنی کو ایک دن چھپا کر کہہ دیا جاتا ہے کوئی فرضی جانور، ہو ہو یا بھو بھو لے گیا۔ بچہ رو پیٹ کر، دو چار دن بے چین رہ کر صبر کر لیتا ہے۔ ان دنوں جو اس پر گزر جاتی ہے اس کی خبر کسی کو نہیں ہوتی۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔ ایک دن جب اماں کو احساس ہوا کہ میں چُسنی پینے کی عمر سے گزر گیا ہوں چُسنی کہیں چھپا دی۔ بظاہر چُسنی چھوٹ گئی مگر ہُڑکا اپنی جگہ رہا۔ اب بھی اس چھوٹے سے باغ میں بیٹھ کر پڑھتے یا خواب دیکھتے ہوئے چپکے سے انگوٹھا میرے منہ میں چلا جاتا اور تھوڑی دیر کو یوں لگتا جیسے ساری دنیا کی محرومیوں سے نجات مل گئی ہو۔

اصل میں اُن دنوں میں دو دنیاؤں میں رہتا تھا۔ ایک عملی زندگی تھی جس میں دو اور دو چار روٹیاں ہوتی ہیں۔ ایک طرف خواب تھے جن میں دن دہاڑے ایسی جگہوں پر جاتا تھا جہاں ابنِ بطوطہ کی رسائی نہیں تھی۔ وہ مہمیں سر کرتا تھا جو گولی ایتھ نے نہ کی تھیں۔ منیر شامی کی دشت نوردی میرے آگے گرد تھی۔ وہ وہ خزانے مجھے ملتے تھے جن کے آگے چالیس چوروں کے خزانے مٹھی بھر خاک سے زیادہ نہ

تھے۔ یہ سب اپنی جگہ مگران دونوں دنیاؤں کو خطِ استوا جیسے ایک فرضی خط سے بالکل الگ تھلگ رکھنا ضروری تھا۔ عملی زندگی میں مشکی گھوڑے پر سوار سُورما بنا پھرتا تو بات نہ بنتی۔ خوابوں میں جو بھی ہوں عملی زندگی میں صرف ماسٹر جی کا ہونہار بیٹا تھا جس سے دکان دار اپنا نجی حساب کتاب کرواتے اور پڑوسی پردیسی رشتے داروں کو خط لکھواتے تھے۔

اب تک ابا گویا جھنڈے لگے گھر کے عملے کے ایک باقاعدہ رکن بن چکے تھے۔ جب بھی بڑے صاحب تبدیل ہوکر جاتے اور دوسرے صاحب آتے ابا خود بخود ان کے بچوں کو پڑھانے پر مامور ہوجاتے خواہ وہ تعداد میں ایک ہوں یا چار۔ مہنگائی بڑھ کر کہیں کی کہیں پہنچی مگر ابا کا مشاہرہ وہی رہا۔ ابا کے خیال میں اُستاد کا درجہ اتنا بلند ہوتا ہے کہ پیسے کی بات نکالنا بھی اس کو گھٹانے کے برابر ہے۔ اگر بڑے افسروں کو اور ہزار کاموں میں ان کی تنخواہ میں اضافے کا خیال نہ تھا تو وہ سب سے بڑا افسر آسمان پر بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ وہ افسروں کا افسر، رازقوں کا رزّاق اسے تو ہر ایک کا خیال تھا۔ اس نے ایک دن بھی ہیڈ ماسٹر یا اس کے بچوں کو بھوکا نہ سلایا تھا۔

ایک دن ابا نے ایک چٹھی دے کر مجھے اسرار صاحب کے ہاں بھیجا۔ اسرار صاحب کا بنگلہ بھی جھنڈا لگے گھر کے برابر میں تھا۔ کام کیا تھا یہ تو مجھے یاد نہیں مگر ابا ذاتی کاموں کی عرض داشت نہیں بھیجتے تھے۔ اسکول کی مرمت یا بڑھوتری یا کھیل کے میدان کی کوئی درخواست تھی۔ میں منہ اُٹھا کر صدر دروازے سے اندر گھسا جارہا تھا کہ خانساماں نے جو بازار سے سامان لے کر سائیکل پر آرہا تھا مجھے ڈانٹ پلائی۔ صورتِ حال سمجھانے پر اندر جانے دیا۔ پھر حوض کے پاس بیٹھے مالی نے باز پرس کی۔ اس کے کہنے پر برآمدے میں جاکر گھنٹی بجائی تو اردلی نکلا۔ خاصی پوچھ گچھ کے بعد صرف اس بات پر تیار ہوا کہ دستی خط صاحب کو پہنچادے۔ ابا نے تاکید کی تھی کہ خط اسرار صاحب کے ہاتھ میں دینا۔ یہ اصرار یہاں بے موقع نظر آیا اور میں نے چٹھی اردلی کے ہاتھ میں دے دی۔

اتفاق سے اسی وقت اسرار صاحب باہر نکلے۔ مجھے دیکھا، پوچھا کون ہو، پھر اندر لے جاکر ڈرائنگ روم میں بٹھایا۔ بہت دیر تک میری تعلیم اور صوفی صاحب کے گھر میرے قیام کے بارے میں پوچھتے رہے۔ کچھ دیر بعد اپنی بیٹی بصیرہ کو بلوا کر خاص طور سے مجھ سے ملوایا۔ بصیرہ نے بمشکل ایک آدھ بات کی اور چلی گئی۔ میرے ذہن میں ایک زرد رُو دبلی پتلی لڑکی کا نقش اب تک جوں کا توں موجود ہے۔

یہ وہ دن تھے جب میرے خواب عملی زندگی میں دخل دے کر روزمرہ کے کاموں میں کھنڈت ڈالنے لگے تھے مگر یہ مشکل ایسی نہ تھی جو صاف اور واضح شکل میں سامنے آتی۔ مدت تک پتا نہ چلا کہ

پریشانی کیا ہے؟ کیا چیز گڑبڑ ہے؟ کون سا پرزہ گم یا ڈھیلا ہوا کہ اماں کی اس سلائی کی مشین کی طرح جوأن کے ہاتھوں ٹھیک چلتی تھی مگر مجھے خوب تنگ کرتی تھی۔ زندگی کی سیون کسی طرح ٹھیک نہیں بیٹھتی تھی۔ کبھی دھاگے چھوڑتی چلتی تھی، کبھی پل پل پر دھاگا توڑتی تھی۔ میرا دل پڑھائی سے اُچاٹ ہو رہا تھا۔ سردیوں کی یخ راتوں کو پٹو کا چترالی کوٹ پہن مارا مارا پھرتا تھا۔ آج کی طرح اُن دنوں بھی لاہور کی تاریخی جگہوں میں خود کو گم کر دینا، قلعے کی بھول بھلیوں میں، شاہی مسجد کے نیم تاریک حجروں میں، جہانگیر کے مقبرے کی کھجوروں یا مقبرے کی اندرونی خنکی میں خود کو ڈبو دینا مشکل نہ تھا۔ میں بھی یہی کرتا تھا۔ داتا دربار چلا جاتا جہاں کھانا دینے والے طعنے تشنے بھرے نوالے نہیں دیتے تھے۔ وہاں کی دیگوں سے بالٹیوں کھانا لوگوں کو لے جاتے دیکھتا تھا۔ خود پلیٹ بھر لے آتا تھا۔

شاید ابا کو اندازہ ہو گیا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ میں کتاب ہاتھ میں لیتا ہوں مگر پڑھتا نہیں ہوں۔ دن اور رات میں گھر کم ہی آتا ہوں۔ شاید اس گھر سے بھاگنے کے ارادے کو انھوں نے بھانپ لیا ہو اور اسرار صاحب سے بات کی ہو، یہ مجھے نہیں معلوم۔ اتنا معلوم ہے کہ ایک دن انھوں نے اعلان کیا کہ اسرار صاحب مجھے اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔ بیگم صوفی جو ہر وقت گھر سے دھکے دیتی تھیں، یہ سن کر خوش ہونے کی بجائے جل گئیں۔

''ہاں ہاں، جاؤ شوق سے۔'' تنک کر بولیں۔ ''دیکھوں گی اس دفعہ کتنے دن اُس گھر میں گزارا ہوتا ہے۔ ارے میں کہتی ہوں، غریبوں کا ٹھکانا محلوں میں نہیں جھونپڑیوں ہی میں ہے۔ دیکھ لینا بلٹی پھر یہیں واپس آئے گی۔''

اُس دن پہلی مرتبہ مجھے پتا چلا کہ اسپتال کے بعد جس پہلے گھر میں سب سے پہلے لے جایا گیا تھا وہ اسرار صاحب کا گھر تھا۔ پھر کن حالات میں اس گھر سے نکلا اور صوفی صاحب کے ہاں پہنچا، راوی اس کے بارے میں خاموش تھا۔ اماں نے کبھی تفصیل سے مجھے کوئی بات نہیں بتائی تھی۔ بس جب بھی جلی کٹی سنانے پر آتی تھیں تب کچھ نہ کچھ ایسی باتیں کہہ جاتی تھیں۔ میں نے اس وقت دل ہی دل میں تہیہ کر لیا کہ جو بھی ہو اب اس گھر میں واپس نہیں آؤں گا۔ ابا کی شفقت اپنی جگہ تھی مگر جب بھی اس امرت کو بیگم صوفی کے زہر کے ساتھ تولا زہر کا پلڑا ہی بھاری رہا۔ اب بھی آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ ان کو اماں کہنا چاہتا ہوں مگر بیگم صوفی کہہ جاتا ہوں کیوں کہ ماں کے ساتھ جو تصور وابستہ ہے اس پر وہ کبھی پوری نہیں اتریں۔

اسرار صاحب نے مجھے گھر میں ایک اچھا خاصا کمرہ رہنے کو دیا۔ گھر کے باقی کمروں سے ذرا الگ تھا مگر آرام کی ساری چیزیں اس میں موجود تھیں۔ ملازموں سے میں خود کوئی کام نہ کرواتا تھا

لیکن میرا خیال ہے کہ انھیں میری ہر بات ماننے کا حکم مل چکا تھا۔ بصیرہ سے کہا گیا تھا کہ مجھے بھائی سمجھے اور بھائی کہا کرے لیکن اس نے ایک دن بھی نہ مجھے بھائی سمجھا نہ بھائی کہا بلکہ جب وہ اپنی ہم جماعت لڑکیوں یا سہیلیوں کے ساتھ ہوتی تو جان بوجھ کر ایسے کام کرواتی جیسے وہ جتانا چاہتی ہو کہ اس گھر میں میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔ کبھی باغ کے پھل توڑنے کو کہتی، کبھی کوئی چیز بازار سے لانے کو کہتی۔ اب میں اسی کے اسکول میں پڑھتا تھا مگر وہ کبھی اسکول میں مجھ سے بات نہیں کرتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے اسکول میں ہر شخص میری طرف دیکھ رہا ہے۔ جہاں دو آدمی کھڑے ہیں یہی باتیں کررہے ہیں۔ زمان اسرار صاحب کے گھر کیوں رہتا ہے؟ کس حیثیت میں رہتا ہے؟ کسی نے مجھ سے یہ بات نہیں پوچھی تھی لیکن دل ہولتا رہتا تھا، کوئی پوچھ بیٹھا تو؟ صوفی صاحب کی بیگم کی بات الگ دل میں کھٹکتی رہتی تھی کہ ایک دن بلٹی واپس آئے گی۔

جب چھوٹا سا تھا، ایک دن نہر کے کنارے چند جنگلی پھول نظر آئے۔ توڑ کر جیب میں رکھ لیے کہ گھر جا کر پیتل کے گلدان میں لگاؤں گا مگر راستے بھر محسوس ہوتا رہا جیسے ہر شخص میری جیب کی طرف دیکھ رہا ہے۔ جیب آبِ رواں کی بن گئی ہے آر پار ہر چیز صاف نظر آرہی ہے۔ گھر پہنچنے سے پہلے ہی خجالت سے پسینے پسینے ہوگیا۔ گھر آکر سب سے پہلے آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر دیکھا۔ جیب سے پھول یا ڈنڈیاں جھانک تو نہیں رہیں جب کہ سارے راستے ہاتھ سے انھیں اندر کرتا آیا تھا مگر یہی لگ رہا تھا کہ کوئی مسکرایا تو میری جیب کے پھولوں پر، ہنسا تو میری جیب کے پھولوں پر۔ اب بھی یہی حال تھا۔ اسرار صاحب کے گھر کی آسائش اور اپنی حیثیت بڑھ جانے کی کوئی خوشی نہ تھی۔ ایک کانٹا سا 'کیا' اور 'کیوں' کا دل میں کھٹکتا رہتا تھا۔ خدا جانے کب یہ مراعات بلا سبب جیسے ملی ہیں ویسے ہی چھن جائیں۔

ایک دوست عمر میں بڑا اور تجربہ کار تھا۔ اس نے کہا، امیر لوگ اکلوتی بیٹی بیاہ کر باہر نہیں بھیجتے گھر داماد رکھتے ہیں۔ پہلے سے ہی کوئی شریف زادہ مل جائے تو اور بھی اچھا۔ لڑکا لڑکی ایک دوسرے سے مانوس ہوجاتے ہیں۔ لڑکے کی عادت واطوار کی پرکھ بھی ہوگئی، بزنس کی سوجھ بوجھ بھی آگئی۔ پہلے بھی گھر میں تھا بعد میں بھی وہیں رہا۔ اس لیے گھر دامادی کا فرق محسوس بھی نہ ہوا۔ یہ بات دل کو ٹھک گئی۔ کم عمر تھا، میٹرک بھی پاس نہ کیا تھا۔ رومانی ناول پڑھتا تھا۔ اس نظر سے بصیرہ کو دیکھا تو بری نہ لگی۔ آہستہ آہستہ اور بھی اچھی لگنے لگی۔ اس کے دور رہنے کو اس کی جھجک سمجھنے لگا۔ تغافل کو ادائیں جاننا ہماری پرانی روایت ہے، ساری شاعری اس سے بھری پڑی ہے۔

اس دوران میرے خیال میں اسرار صاحب کو بھی اندازہ ہوا کہ بیٹی کسی طرح مجھے بھائی ماننے پر

آمادہ نہیں۔ جوان لڑکے لڑکی کا ایک گھر میں رہنا بھی مناسب نہ تھا، چناں چہ مجھے ہاسٹل میں بھیج دیا گیا۔ ضمیر صاحب حسبِ ضرورت مجھے پیسے دیتے رہے۔ مجھے سدا یہ احساس رہا کہ میرا کوئی نہیں ہے۔ نہ ماں نہ باپ، نہ بہن نہ بھائی، نہ میری کسی کو ضرورت ہے۔ پھر بھی مجھے اس قابل بننا ہے کہ اپنے محسن کا احسان اُتار سکوں۔ کسی نہ کسی طرح سول سروس کا امتحان دے کر اسسٹنٹ کمشنر بن گیا ہوں۔ جھنڈا لگے گھر میں رہنے کا ارمان باقی ہے اور بصیرہ کو جیتنے کا۔ چند ماہ کے لیے انگلستان گیا تھا واپسی پر اسے شادی کا اشارہ دیا تھا۔

بولی، ''You`ll get over me'' بزرگ بن کر سمجھانے لگی۔ ''ایسا ہوتا ہے کہ بعض دفعہ جو چیز نہ ملے وہ دنیا کی اہم ترین چیز بن جاتی ہے۔ مجھے بھی زندگی میں کتنی ہی چیزوں کے لیے یہ احساس ہوا کہ ان کے بغیر جینا محال ہے مگر جب مل گئیں تو کوڑی برابر ہو گئیں۔ گھر میں ان کو رکھنے کے لیے بھی جگہ نہ رہی، پھینک پھانک دیں۔ اچھ وقت اور گزرے گا تو میں تمھارے لیے دل میں سوراخ لیے پھرنے والی ایک مریض لڑکی بن جاؤں گی جو کبھی سالوں میں ذہن کے کسی جھروکے میں جھانکے گی اور غائب ہو جائے گی۔''

بہرحال، ابھی تو وہ اپنی ضد پر قائم ہے۔ اس کے دل میں یہ خیال بھی بیٹھ گیا ہے کہ وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہے گی۔ میں نے کچھ عرصہ سوچنے کے لیے اسے تنہا چھوڑ دیا ہے۔ ابھی اس کے والد کا انتقال ہوا ہے پھر علاج کے لیے امریکا جانا ہے۔ اس کے بعد ہی وہ کوئی فیصلہ کرے گی اور مجھے یقین ہے کہ وہ فیصلہ میرے حق میں ہوگا۔

کراچی میں ایک امریکن صاحب زادے ڈیوڈ نامی میرے پاس آئے تھے۔ مجھے معلوم نہیں تھا کہ امریکن اتنے اُلجھے ہوئے اور گنجلک بھی ہو سکتے ہیں۔ وہ اپنی اور اپنے والدین کی شناخت کے لیے پریشان تھے۔ میری اور ان کی دلچسپ گفتگو رہی۔

''سناؤ۔'' میں نے کہا۔

انھوں نے پوچھا، ''کیا کبھی صوفی صاحب یا اسرار صاحب یا کسی اور نے تمھیں بتایا کہ تمھارے ساتھ تمھارا کوئی بھائی بھی پیدا ہوا تھا؟''

میں نے جواب دیا۔ زمان نے کہا۔ ''نہیں تو! مجھے یہ بات کسی نے نہیں بتائی۔ اور سنو مسٹر ڈیو یا جن یا جو بھی تمھارا نام ہے اگر کسی نے تمھیں بتایا ہے کہ اسرار صاحب نے مجھے اپنا بیٹا بنا رکھا تھا اور تم جائیداد میں حصہ بٹانے آئے ہو تو تمھاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اگر وہ مجھے اپنا بیٹا بنانا چاہتے تھے تب بھی افسوس کہ وہ اپنی وصیت تبدیل کیے بغیر مر گئے اور اس میں تمھارے اور

میرے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔'' میں نے یہ بات انگریزی میں خاطر خواہ کڑواہٹ سے کہی۔

''اگر تمھیں تلخی سے ہی بات کرنی ہے،'' ڈیوڈ نے جواب دیا، ''تو تم بھی سن لو کہ مجھے کسی کی دولت کی ہوس نہیں ہے۔ میرے فاسٹر والدین کے پاس اتنا پیسہ ہے کہ چاہیں تو تمھیں ڈالر میں تلوا کر اس پیسے کو کوڑے کے ڈھیر پر پھینک دیں۔ میں جس چیز کی تلاش میں آیا ہوں وہ بھائی کا رشتہ ہے اور ایسی دوستی جو صرف بھائیوں میں ہو سکتی ہے۔ اپنی اور والدین کی شناخت اور یہ مسئلہ کون سا ملک اور کون سا کلچر میرا ہے؟''

میں نے کہا، ''تم خوش قسمت تھے کہ تمھیں کسی کھاتے پیتے گھرانے نے مستقل طور پر اور قانونی طور پر اپنا لیا۔ اگر بچپن سے میری طرح دو وقت کی روٹی کو ترستے تو اپنی شناخت وناخت بھول جاتے، دال روٹی کی پہچان کرتے تھے تمھیں محبت ملی اس لیے اب ماں مامتا کے لیے تڑپ رہے ہو۔ اگر ہر طرف سے دھتکارے جاتے تو ہر محبت پر سے تمھارا یقین بھی اُٹھ جاتا۔ تمھارا مسئلہ ملک اور کلچر ہے۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے بچے اتنے جمے ہوئے ہوں، ان کی جڑیں اتنی مضبوط ہوں، بینکوں میں، کانکریٹ کے گھروں میں اور سونے کی اینٹوں میں کہ کسی کو یہ پوچھنے کا خیال نہ آئے کہ اُن کا باپ کس خیراتی اسپتال میں پیدا ہوا تھا، اس نے کہاں اور کس کے پیسے سے پڑھا تھا؟''

''مسئلہ تو ایک ہی ہے محرومی کا،'' ڈیو نے کہا۔ ''تم اسے دوسرا مسئلہ سمجھو تو اور بات ہے۔''

''بات سنو،'' میں نے کہا۔ ''مجھے افسوس ہے کہ میں نے تم سے تلخی سے بات کی مگر یہ تو بتاؤ تمھیں یہ خیال کیسے آیا کہ تم میرے بھائی ہو سکتے ہو؟''

''اس لیے کہ تمھاری اور میری پیدائش کی کہانی یکساں ہے جو دو مختلف ذرائع سے سننے میں آئی ہے۔ ہو سکتا ہے ہم بھائی ہوں۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

''یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی کو یہ بات معلوم نہ ہو کہ بچے ایک تھے یا دو۔'' میں نے کہا۔

''کچھ لوگوں کو معلوم ہوگا مگر کسی وجہ سے انھوں نے ہمیں بتانا ضروری نہیں سمجھا۔'' ڈیوڈ بولا۔

''تو اب ہمیں کیسے معلوم ہو سکتا ہے؟'' میں نے بے پروائی سے کہا۔

''شاید کوئی صورت ہو۔ میرا خیال تھا شاید تم سے بات کرنے سے کچھ پتا چلے۔''

''مجھے کچھ معلوم نہیں، نہ میں جاننا چاہتا ہوں۔ مجھے اب ماضی کی نہیں مستقبل کی فکر ہے۔'' میں نے کہا، ''بہتر ہوتا تم ان لوگوں سے پوچھتے جنھوں نے تمھیں پالا ہے۔''

''میں نے ان سے بھی پوچھا۔ مما کو خط بھی لکھا مگر ابھی تک ان کا کوئی جواب نہیں آیا۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

''اس بات کو یہیں ختم کردو تو اچھا ہے۔'' میں نے کہا، ''بظاہر شکلاً یا عقلاً ہم بھائی نظر نہیں آتے۔ ساری تگ ودو کے بعد پتا چلا کہ ہم بھائی نہیں ہیں تو کیا فائدہ ہوگا؟''

''اگر ہمیں پتا چلا کہ بھائی ہیں؟'' ڈیوڈ نے جوش سے پوچھا۔ اس کا چہرہ گلابی ہوگیا جیسے سچ مچ کسی نے اسے یہ خبر سنادی ہو۔

''تو اس سے بھی ایسا کیا فرق پڑے گا میرے بھائی!'' میں نے روکھے پن سے کہا۔ ''اب ہم عمر کی اُس منزل میں ہیں جب بھائی بھی دور ہونا شروع ہوجاتے ہیں۔ سب کی اپنی الگ زندگی ہوتی ہے، الگ شوق، علاحدہ بال بچے......اور پھر تم تو امریکن ہو، سنا ہے وہاں تو کوئی کسی کو نہیں پوچھتا۔''

''غلط بات ہے۔ جو رشتے ہوتے ہیں وہ اپنی جگہ ہوتے ہیں۔ جب بھی ملیں گے بھائی بھائی ہی رہیں گے چاہے برسوں بعد ملیں۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

''ٹھیک ہے، ہم جب بھی ملیں گے اسی طرح ملیں گے۔ اگر کبھی تمھیں پتا چل جائے کہ تم میرے بھائی ہو تو مجھے اطلاع دے دینا۔'' میں نے کہا۔

''مجھے تم سے مل کر بڑی مایوسی ہوئی۔'' ڈیوڈ نے کہا۔

''مجھے بھی......بھائی......'' میں نے مسکرا کر ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

''خدا حافظ۔'' ڈیوڈ نے مصافحہ کرتے ہوئے بڑی صاف اردو میں کہا۔ ''شاید کبھی پھر ملیں۔''

میں اس کے لہجے کی صفائی پر چونکا۔ اس نے مسکرا کر آنکھ ماری اور مڑ مڑ کر مجھے دیکھتا ہوا چلا گیا۔ میں خاصی دیر تک حیران رہا کہ وہ ایسی اچھی اردو بول سکتا ہے کیوں کہ ہماری ساری گفتگو انگریزی ہی میں ہوتی رہی تھی۔

''اس کے جانے کے بعد تمھیں افسوس ہوا؟'' میں نے پوچھا۔

''جی نہیں۔'' زمان نے کہا، ''جب مجھے والدین، بہن بھائیوں کی اور رشتے داروں کی ضرورت تھی تو کوئی میرا نہیں تھا۔ اب مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے اور سب سے کم ڈیوڈ جیسے بھائی کی۔ ہماری شکل وصورت، عادت وخصلت، آرزوئیں، راستے، منزلیں کوئی بھی چیز نہیں ملتی تو پھر ایک غیر ضروری سا رشتہ قائم کرنا بے کار نہیں ہے؟''

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور وہ میرا جواب سننے کے لیے ٹھہرا بھی نہیں۔

کچھ بچے والدین سے زیادہ گھل مل جاتے ہیں کچھ ان سے فاصلہ رکھتے ہیں۔ بعض کے دل میں یہ وہم بیٹھ جاتا ہے کہ والدین اُن کے دوسرے بہن بھائیوں کو زیادہ چاہتے ہیں۔ مجھے محسوس ہوتا تھا

جیسے میرے کرداروں کا رویہ بھی ایسا ہی تھا۔ سمن اور ڈیوایک اشارے پر دوڑے آتے تھے۔ بصیرہ مشکل سے آئی مگر آ گئی۔ امان ہر دفعہ ٹال گیا۔ آخر ایک دن کھڑے کھڑے آیا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ وہ ابھی کسی تفصیلی گفتگو کے لیے تیار نہیں ہے۔ سلیم اور سمن نے جو کچھ بھی بتایا ہو فی الحال وہ ان بیانات کی تصدیق یا تردید بھی نہیں کرے گا۔ شاید پھر کبھی جب وہ ذہنی طور پر آمادہ ہوگا۔ آ کر اپنی رام کہانی سنائے گا مگر ابھی وہ کسی قسم کا کوئی وعدہ نہیں کر سکتا۔

اس کے بعد میرا انتخاب سلیم تھا۔

میں ہوٹل کے کمرے میں اس طرح بیٹھی کہ آبشار نگاہوں کے سامنے ہو، اپنے پھولوں کے البم دیکھ رہی تھی۔ جب سے آنکھیں باریک بینی سے بچنے لگی تھیں میں نے پھولوں کو پڑھنا شروع کر دیا تھا۔ پھول بھی انسانوں اور الفاظ کی طرح قسم قسم کے ہوتے ہیں۔ ان کے اپنے بھید ہیں جو دھیرے دھیرے کھلتے ہیں۔ کچھ سخت مزاج ہیں، کچھ نازک طبع ہیں اور الفاظ کی طرح آپ ان کو سیکڑوں طرح استعمال کر سکتے ہیں۔ تازہ پھولوں کے گلدستے بنائیے، خشک کر کے سجائیے۔ تازہ پھولوں کو اس طرح سکھانا کہ ان کی شکل وصورت اور رنگ برقرار رہے۔ ان کو کتابوں میں رکھ کر دبانا بھی ایک آرٹ ہے۔ جس طرف چلے جاؤ علم کا ایک بحرِ ذخار ہے کہ جس کی تھاہ نہیں ہے۔ پھولوں کی اقسام، وضع اور رنگ روپ کے بارے میں جتنی معلومات ہوں حیرت بڑھتی جاتی ہے۔ ہر علم میں وقت کے ساتھ نئے شگوفے پھوٹتے رہتے ہیں۔

''بہار اور خزاں میں پھول پتے جمع کرنا اور انھیں سجانا اچھا مشغلہ ہے۔'' سلیم آیا تو میں نے اُس سے کہا۔ ''جب ان کو دیکھتی ہوں ان جگہوں کی یاد تازہ ہو جاتی ہے جہاں سے اکٹھے کیے تھے۔ پچھلی گرمیوں میں ان ہی جھاڑیوں سے چند پھول پتے لیے تھے جہاں اب برف کی ٹیڑھی ترچھی ڈنڈیاں ہیں۔ ان کو دیکھ رہی ہوں اور خدا کی قدرت کو یاد کر رہی ہوں۔ اب تم آ گئے ہو تو تم سے باتیں ہوں گی۔ معاہدہ یہ ہے کہ کردار اپنی باتیں خود سنائیں تا کہ میں اپنی آنکھوں کو زیادہ سے زیادہ آرام دے سکوں۔''

''آپ کیا پوچھنا چاہتی ہیں؟'' سلیم نے پوچھا۔

''تمھارے اور سمن کے تعلقات کے بارے میں۔'' میں نے جواب دیا۔

''کیسے تعلقات؟'' سلیم نے کہا۔ ''سچ پوچھیے تو اپنے اور سمن کے تعلقات کی نوعیت تو خود مجھے آج تک پتا نہیں چلی۔ وہ میرے دوست امان کی منگیتر تھی۔ کم از کم امان اُس وقت سے یہی کہتا آ رہا تھا جب سمن ساتویں آٹھویں کلاس میں پڑھتی تھی۔ وہ اکثر مجھے بھی ان کے گھر لے جاتا تھا۔ سمن کی

امی اماں کی رشتے کی خالہ تھیں۔ ثمن ہم سے بے تکلفی سے باتیں کرتی تھی۔ کبھی ہم ساتھ کیرم اور تاش کھیلتے جس میں ثمن کی امی بھی شریک ہوتیں۔ ان کے اصرار پر اکثر ہم کھانا بھی انھی کے گھر کھالیتے۔ پھر امان نے ہاتھ پکڑتے پکڑتے پہنچا پکڑا۔ تنہائی میں اس سے اُلٹی سیدھی باتیں کرتا۔ یہاں تک کہ وہ سہیلیوں کی بڑی بہنوں کی مہندی اور شادیوں کا بہانہ کر کے اس کے ساتھ کئی کئی گھنٹوں کے لیے باہر جانے لگی۔ میں امان کو سمجھاتا کہ اسے یوں نہیں کرنا چاہیے۔ کبھی جی چاہتا ثمن سے براہِ راست بات کروں مگر وقت گزرتا گیا اور میں کبھی ثمن کو خبردار نہ کرسکا۔ آخر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ ایک رات کسی بہانے سے وہ اسے ساحلِ سمندر پر ہٹ میں لے گیا۔ میں وہ رات کبھی نہ بھولوں گا۔ ہمیشہ کی طرح اُس رات بھی میں اس کے ساتھ تھا۔

ہٹ مرمت طلب تھی۔ دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ امان نے شام کو کہا تھا کہ کھڑکی کے ٹوٹے شیشے سے سمندر کی بے پناہ آواز رات کو انھیں بے آرام کرے گی۔ میں رات بھر اپنے کمرے میں نہیں گیا بلکہ سمندر کی طرف نیچی منڈیر کے سائے میں ٹھنڈی گیلی ریت پر بیٹھا رہا۔ ٹوٹے شیشے کی کھڑکی سے ان دونوں کی باتوں اور ہلکی ہلکی ہنسی کی آواز باہر آ کر مجھے بے آرام بلکہ بے کل کر رہی تھی۔ یہ آوازیں کبھی سمندر کی طرف سے بپھرتی لہروں کی آوازوں میں ڈوب جاتی تھیں، کبھی شہر کی نصف دائرے میں چمکتی روشنیاں ٹوٹی چوڑیوں کی کرچیوں کی طرح میرے دل میں چبھ جاتی تھیں اور کبھی سڑک پر پڑنے والی کسی گاڑی کی تیز دھار دار روشنی چاقو کی طرح میرے سینے میں اُتر جاتی تھی۔ مجھے امان کے ساتھ خود پر شدید غصہ تھا اور کسی نامعلوم بات پر بے حد غم۔ میں کچھ کرنا چاہتا تھا، کوئی انتہائی قدم۔ وہاں بیٹھے بیٹھے میں ان کے بیڈ روم میں جا پہنچتا اور دہاڑ کر کہتا۔ بے وقوف لڑکی! اس شخص کو تجھ سے ذرا بھی محبت نہیں ہے۔ محبت کرنے والے اپنی محبوباؤں کے بدن کے ناپ اور محبتوں کی حکایات دوسروں کے گوش گزار نہیں کرتے۔ کم از کم میں تو یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ کسی کے ساتھ محبت کروں تو کسی اور کو سننے، قدمے لمحے بھر کو بھی اس میں شریک کروں اور دوسرے لمحے مجھے احساس ہوتا کہ میں اب بھی نیچی منڈیر کے سائے میں ٹھنڈی ریت پر بیٹھا ہوں۔ اوس کے قطروں سے ہٹ کر برآمدہ تر بہ تر ہوگیا تھا۔ ہٹ کے نیچے لکڑی کے ٹیڑھے ترچھے ستون اپنے سایوں کے ساتھ مل کر کسی ڈراؤنے خواب کا سا سمجھ میں نہ آنے والا نمونہ بنا رہے تھے۔ سیلی زمین پر بے شکل چکنے جانور بے آواز یا اِدھر سے اُدھر پھر رہے تھے۔ کئی مرتبہ چاہا اندر اپنے کمرے میں چلا جاؤں مگر نہ جا سکا۔ چاند جو سرِ شام کسی اچانک خوش خبری کی طرح سیدھا آسمان سے ہٹ کی کھڑکی میں آ کر جھانکا تھا اب سر پر چمک کر ڈھل چکا تھا۔ صبحدم پاس کی ہٹ سے ایک خوف ناک کتا نکل کر منڈیر کے

قریب کھڑے ہو کر شبہے سے مجھے دیکھنے لگا..... اور تب مجھے اپنے اوپر انتہائی غصہ آیا۔ میں نے کچھ بھی نہ کیا تھا۔ ساری رات وہیں بیٹھے بیٹھے گزار دی۔

اس پاگل لمحے میں، میں نے اپنے آپ کو ہٹ کی چھت کے کالے گیلے چوبی شہتیروں میں سے ایک شہتیر پر سمن کے دوپٹے کے پھندے سے لٹکے دیکھا۔ میرا جسم دُہرا ہو کر جھول رہا تھا۔ دھاری دار قمیص کی پٹیاں پیٹھ پر صبح کی لطیف ہوا میں ہلکے ہلکے ہل رہی تھیں۔ پھندے سے لٹکی گردن کے اُوپر میرا سر بھی آہستہ آہستہ جھول رہا تھا۔ آسمانی رنگ کا گاؤن پہنے، اسی رنگ کے مخملیں چپل پاؤں میں ڈالے بال جھٹکتی سمن بیڈ روم سے باہر نکلی۔ سمن کو میں صاف اس نیلے گاؤن اور نیلے چپلوں میں دیکھ رہا تھا..... کیوں؟ اس لیے کہ امان نے جب یہ نائٹی، گاؤن اور چپل خریدے تھے تو میں اس کے ساتھ تھا۔ سمن نے شہتیر سے لٹکی اس نعش کو دیکھ کر زور کی چیخ ماری اور واپس اندر کی طرف بھاگی۔

ذرا دیر بعد وہ سچ مچ باہر نکل آئی۔ وہ واقعی نیلا گاؤن پہنے ہوئے تھی۔ گاؤن کے طویل V گریبان کے نیچے سی تھرو نائٹی کی سفید نازک بیل جھانک رہی تھی اور اس کی پتلی ریشمی کمر جس پر گاؤن کی بیلٹ لپٹی ہوئی تھی، میں گاؤن اور نائٹی کے پار بھی صاف دیکھ اور محسوس کر سکتا تھا۔ یکایک مجھے کچھ ہوا..... میں نیچی منڈیر کی تر زمین سے اُٹھ کر سمندر کی طرف چلا اور چلتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ سمندر کا نیم گرم پانی گھٹنے سے کمر اور کمر سے سینے تک آ پہنچا۔ میں نے سمن کی آواز سنی۔

''امان..... امان..... جلدی آؤ'' وہ چلا رہی تھی، ''تمہارا دوست پانی میں کتنی دور چلا گیا ہے۔ تم تو کہہ رہے تھے اسے تیرنا نہیں آتا'' میں نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ کیوں کہ سمن کو بالکل اسی انداز میں نیلے گاؤن میں بکھرے بالوں کے ساتھ میں سامنے بھی دیکھ رہا تھا۔ میری نظروں کے آگے سمندر کی لہروں کے اُوپر اُڑتے سفید جھاگ تھے اور سمن کا سراپا........ سمندر کا نیم گرم پانی ماں کی آغوش کی طرح تسکین بخش بانہیں پھیلائے تھا۔

اتنے میں کوئی بھاگتا ہوا آیا اور میری کمر میں ہاتھ ڈال کر گھسیٹتا ہوا پیچھے لے گیا۔

''پاگل ہو گئے ہو، مرنے کا ارادہ ہے؟'' امان نے کہا، ''آؤ چل کر وہاں بیٹھتے ہیں۔''

پانی کے کنارے چلتے ہوئے ہم ہٹ سے ذرا دور چٹان پر آن بیٹھے۔ ہمارے بائیں طرف صبح سویرے آنے والوں کی ایک پوری ٹولی کنارے کی لہروں سے چہل بازی میں مصروف تھی۔ میں اُدھر دیکھتا رہا۔ امان سمجھا شاید میں ان لوگوں کو دیکھ رہا ہوں جب کہ میں امان کی طرف اور اُس ہٹ کی طرف نگاہ نہیں کرنا چاہتا تھا جہاں اس کی نیلم پری موجود تھی۔

ستم ظریفی یہ کہ وہ مجھے رات کا قصہ سناتا رہا۔ وہ سی تھرو نائٹی اس کے جسم پر دستانے کی طرح

چست بیٹھی تھی۔ اس کی کمر امان کے دونوں ہاتھوں کے حلقوں میں سما گئی تھی اور وہ بھولی چڑیا اس کے جال میں بڑی آسانی سے پھنس گئی تھی۔ اس نے صرف یہ کہا تھا کہ ان دونوں کی شادی طے ہے۔ جلد یا بدیر ان کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہے گا تو ابھی کیوں نہ سہی۔ سب کو معلوم ہے کہ محبت میں یوں ہی ہوا کرتا ہے۔ لوگ جانتے بھی ہوں تو نظر انداز کر دیتے ہیں اور بھئی سب ہی ان منزلوں سے گزرتے ہیں کوئی نئی کوئی بری بات نہیں ہے۔ وہ جانے کیا کیا کہتا رہا۔ میں نے اس کی طرف نہیں دیکھا۔ امان نے اصرار بھی نہیں کیا ورنہ وہ جان لیتا کہ میرا چہرہ سمندر کے پانی سے نہیں میرے اپنے نمکین آنسوؤں سے تر بتر تھا۔ اس کی آواز ذرا سی لرزی پھر وہ خاموش ہو گیا۔

چند منٹ خاموش رہنے کے بعد اُس نے کہا، ''اتنی شدید بے بسی کا عالم اس سے پہلے بچپن میں ایک بار مجھ پر گزرا تھا۔''

''تمھیں یاد ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت اچھی طرح۔'' سلیم نے کہا۔

''سناؤ گے؟''

''ضرور۔''

''تو سناؤ۔'' میں نے کہا۔

''میری عمر نو دس سال کی ہوگی۔ والد ایسے محکمے میں تھے کہ اکثر تبادلے ہوتے رہتے تھے۔ رات کو ایک نئی جگہ دیر سے پہنچے۔ پڑ کر سو رہے۔ صبح اُٹھ کر کھڑکی میں کھڑے ہو کر دیکھا۔ ایک عجیب خواب کا سا عالم...... زندگی میں پہاڑ پہلے کبھی نہ دیکھے تھے اور یہاں کھڑکی کے سامنے ایک اونچا سفید برف کا پہاڑ کھڑا دکھائی دیا۔ برف بھی کبھی خوابوں میں دیکھی تھی یا اس کے بارے میں کہانیاں پڑھی تھیں۔ اب برف کا پہاڑ سامنے تھا۔ ہاتھ میں چاندی کا کٹورہ اُٹھایا اور سوچا لاؤ تھوڑی سی برف ہی بھر لائیں۔ جب بہن بھائی سو کر اُٹھیں گے تو ان کو دکھا کر حیران کریں گے۔

حیران کرنے کا ایسا اندھادھند شوق پہلے کبھی نہ ہوا تھا۔ نئی جگہ کی خنک ہوا نے، لالے کے ان پھولوں نے جو اس سے پہلے صرف تصویروں میں دیکھے تھے اور کوہ قاف جیسے پہاڑ نے جہاں یقیناً پریوں کا بسیرا تھا ایسا ڈند مچایا کہ فوراً نکل کھڑا ہوا۔ گمان بھی نہ تھا کہ زیادہ دور ہوگا۔ یہ بس سامنے ہی تو تھا...... چلتے چلتے دوپہر ہو گئی۔ بس یوں ہی لگتا تھا کہ دو قدم اور..... بھوکا پیاسا چلتا رہا۔ پلٹ کر بھی نہ دیکھا کہ کہیں قدم نہ ڈگمگا جائیں۔ اِکا دُکا کھیت، اِکا دُکا راہ گیر ملے جن سے کنی کترا کر نکل گیا یا کسی درخت کے پیچھے چھپ گیا۔ ایک درخت کے نیچے پڑے پہاڑی زرد آلو کرتے کے دامن سے پونچھ

کر کھائے اور پھر چلنے لگا۔ چلتا رہا۔ پھر لگا جیسے دھوپ ڈھل رہی ہو، شام ہو رہی ہو۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کتنی دور چلا آیا تھا۔ کون سا دشت تھا۔ اب نہ کھیت تھے، نہ گاؤں نہ راہ گیر۔ پہاڑ اب بھی سامنے تھا مگر فاصلہ اتنا ہی تھا۔ یوں ہی لگتا تھا جیسے بس دو قدم..... کیا یہ جادو کا پہاڑ تھا؟ کوئی سراب تھا؟ کسی کا پھیلایا ہوا جال تھا؟ نہیں، پہاڑ تو اصلی تھا۔ اب بھی پریشان تھا کہ خالی ہاتھ لوٹوں یا برف لے کر! بھوک پیاس سے نڈھال تھا۔ پیروں کی طرف دیکھا تو کانٹوں کے کھرونچوں سے خون کی پھلواریں قطرہ قطرہ نکل کر جگہ جگہ جمی ہوئی تھیں۔ سورج ساتھ چھوڑ رہا تھا۔ کیا واپس جاؤں؟ خالی کٹورہ ہاتھ میں تھا اور برف کا پہاڑ سامنے۔ وہیں ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ پہلی مرتبہ پلٹ کر دیکھا۔ دشتِ تنہائی کا پہلا احساس۔ گھر سے دور شام پڑ رہی تھی۔ برف کا پہاڑ سامنے تھا۔ گھر کا آرام، آتش دان میں چٹختی لکڑیوں کی آگ سب سپنا تھی۔ بڑھتی رات کی نیم تاریکی اور قطرہ قطرہ ٹھنڈک جو ڈر کے چبھتے ریزوں کے ساتھ جسم میں اُترتی جا رہی تھی۔

کسی مسافر نے تیز تیز اپنے گاؤں کی طرف جاتے ہوئے مجھے دیکھا۔ حیران ہوا، نزدیک آیا۔

''بچہ کہاں سے آیا ہے؟'' اس نے پوچھا۔

ڈرتے ڈرتے جگہ کا نام بتایا۔ وہ شخص پریشان ہو کر میری صورت تکنے لگا۔ ''سچ کہو، کس وقت چلے تھے؟''

''صبح۔'' میں نے کہا۔ ''صبح سویرے۔''

''ناشتا کیا تھا؟''

''نہیں۔''

''بچہ..... تجھے نہیں معلوم تو کتنی دور آ گیا ہے! کہاں جانا ہے تجھے؟''

''پہاڑ پر.....'' میں نے اب بھی پرامید لہجے میں جواب دیا۔

مسافر نے میرے ہاتھ کے خالی کٹورے پر نظر ڈالی۔

''بچہ، واپس جا..... ابھی واپس جا، ساری رات چلے گا تو بھی اس پہاڑ تک نہیں پہنچے گا۔ تجھے نہیں معلوم یہ پہاڑ ابھی یہاں سے بھی بہت دور ہے، پگلا ہے کیا؟''

پھر اس نے اپنی چادر میں بندھے چند سیب اور مکئی کی روٹی مجھے دی۔ اپنی چھاگل سے پانی پلایا۔ آدھے راستے ساتھ آیا۔

''میرا گھر اس پہاڑی کے پیچھے گاؤں میں ہے۔'' اُس نے کہا۔ ''میرا بچہ بیمار ہے، اس کے لیے دوا لے کر جا رہا ہوں تیرے ساتھ گھر تک نہیں جا سکتا مگر تو سیدھا اسی راستے پر چلا جا پہنچ جائے گا۔

راستے میں کوئی ملے اور پوچھے کہ کہاں سے آ رہا ہے تو کہہ دینا قادر خان کے گھر سے آ رہا ہوں۔''

جس وقت گھر پہنچا مجھے یاد نہیں کہ گھر کی چوکھٹ پر گرا یا صحن میں یا امی کی گود میں..... پولیس کو میری گمشدگی کی اطلاع دی جا چکی تھی۔ چھوٹی سی بستی کے تقریباً سارے مرد میری تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔ شاید ریل کی پٹری کے آگے آ کر کٹ مرا ہو۔ کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ پہلے ہی دن بچے کو کون اُٹھا لے گیا۔ ایسا بھی نہ تھا کہ باپ کی کسی سے دشمنی رہی ہو۔ کسی کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ میں کٹورہ اُٹھا کر برف لینے چل دیا ہوں گا۔ دنوں اس مہم کے چرچے رہے۔ اشرف بھائی اب تک اپنے دوستوں کو یہ قصہ سناتے اور ہنستے ہیں۔

دوسرے دن قادر خان بھی میری خیریت پوچھنے آیا۔ ابا نے اس کا شکریہ ادا کیا اور احسان مندی میں اُس کے بیٹے کو اپنے ہاں ملازم رکھا۔ سب حیران اور پریشان ہوتے رہے مگر مجھے غم تھا تو اس بات کا کہ میرا کٹورہ خالی رہ گیا تھا۔ ذرا سی اور ہمت کر لیتا تو شاید پہنچ ہی جاتا۔ اب ایسا بھی کیا تھا...... میں امی کی گود میں پڑا سسکتا رہا۔ امی تسلی دے رہی تھیں کہ اب گھر آ گئے ہو گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے۔ جو ہوا سو ہوا، اب کبھی اُدھر کا رخ نہ کرنا۔ انھیں کیا معلوم تھا کہ میں ڈر اور خوف سے نہیں اپنی بے بسی اور مایوسی پر رو رہا تھا۔ برسوں خالی کٹورہ دیکھ کر میرا دل دُکھتا رہا۔ سمن کو دیکھتا ہوں تو بے بسی کے احساس کے ساتھ ایک مجرمانہ احساس بھی سر اُٹھاتا ہے جیسے امان نے سمن کے ساتھ جو بھی زیادتی کی اس میں میرا بھی ہاتھ ہے۔

میری امی اور بہنیں میری شادی کے شوق میں گھلی جا رہی ہیں۔ سیکڑوں لڑکیاں دیکھ چکی ہیں اور مجھے دکھا چکی ہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ ان میں سے کوئی لڑکی مجھے پسند نہیں آئے گی۔ وہ سمجھتی ہیں میرا معیار بہت اعلیٰ ہے۔ بڑی خوب صورت لڑکیاں تلاش کی جاتی ہیں لیکن وہ مجھے نہیں بھاتیں۔ چینی کی گڑیا ڈرائنگ روم میں سجانے کو جی نہیں چاہتا۔ خانہ داری میں ماہر لڑکیاں ڈھونڈی جاتی ہیں مگر دل نہیں مانتا۔ باورچی خانے کی سجاوٹ بھی نہیں چاہیے تو مجھے کیا چاہیے؟ ہر ایک پوچھتا ہے۔ مجھے خود معلوم نہیں۔ دل کی سجاوٹ کس سے ہوگی؟

سمن کے بارے میں سوچتا ہوں۔ وہ خود مجھ سے ناراض ہے۔ میں اس کے لیے فقط امان کا دوست ہوں۔ اگر میں امان کی دوستی کی قربانی دے دوں؟ اس سوال کے جواب سے پہلے شیشے کی سی سمن کی شفاف کمر امان کے ہاتھوں میں دستانے کی طرح چست، آنکھوں کے آگے اصل حقیقت بن کر دکھائی دیتی ہے اور مجھے یقین ہو جاتا ہے کہ خواہ کچھ بھی ہو میں سمن سے شادی نہیں کر سکتا، ابھی تو نہیں کر سکتا مگر جب سوچتا ہوں کہ وہ کسی اور سے شادی کر لے گی تو یہ بات بھی برداشت نہیں

ہوتی.........بس آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔'' آخر میں اس نے کہا اور رفو چکر ہو گیا۔

میں نے اپنے پھولوں کے البم سمیٹے اور خواب گاہ میں گئی۔ کھڑکی سے باہر دیکھا۔ برف تو وہ دیوار ہوگئی جسے رات بھر چاٹ کر ورق کیا تو صبح پھر ویسی کی ویسی دبیز....دن بھر میں ٹپ ٹپ کر کے پگھلتی ہے پھر رات ہو جاتی ہے۔ درجۂ حرارت گر جاتا ہے۔ صبح اُٹھو تو برف جوں کی توں موجود۔

تنہائی میں اپنے کرداروں کو بلا کر ان سے باتیں کرنے کا تجربہ خاصا کامیاب رہا تھا۔ سب ہی کرداروں نے تعاون کیا تھا لیکن بیگم صوفی آنا کانی کر رہی تھیں۔ ان سے بات کرنے کے بعد ہی اور کسی سے گفتگو کرنا چاہتی تھی۔ کئی دفعہ کی کوشش کے بعد بھی جب بیگم صوفی نے رخ دے کر بات نہ کی تو میں نے واپسی کی ٹھانی۔ آخر کب تک ایک نئی جگہ موٹل یا ہوٹل میں رہ سکتی تھی۔

لمبے لمبے میدانوں میں گھروں کے آس پاس اور جھاڑیوں پر برف پڑی ہوئی تھی۔ ایک قبرستان میں سلیٹی قبروں کے پتھر کھڑے تھے اور قبروں کی درمیانی جگہ برف سے بھری ہوئی تھی۔ درخت ننگے تھے، جھاڑیوں پر برف تھی۔ لمحہ بھر میں ذہن انگلستان کے گاؤں ہاورتھ جا پہنچا۔ نومبر میں جب مشہور ناول نگار ایملی برانٹی آخری سانسیں لے رہی تھی اُس کی چہیتی بہن شارلیٹ گھر کے باہر برف میں بہن کے لیے ہیدر (Heather) کے جنگلی پھول ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔ اس ایک بات سے اس زمانے کے رہن سہن اور ان لڑکیوں کی سوچ کا پتا چلتا ہے۔ آج کے امریکا کے لیے یہ بات کتنی عجیب بلکہ ناقابلِ یقین ہے۔

ایک گھر کے آگے قدموں کے نشانات ایک دوسرے کو کاٹتے چلے گئے تھے۔ نرم برف میں یہ نشان گہرے بھی تھے اور پھیلے ہوئے بھی جیسے صحراؤں میں اونٹوں کے قدموں کے نشانات ہوتے ہیں۔ پل بھر میں ذہن ہزاروں میل کا فاصلہ طے کر کے ملتان کے ریگستانوں میں جا پہنچا جہاں بھری دوپہر کی جلتی دھوپ میں پورے کنبے کے کنبے اونٹوں پر بیٹھے یوں گزرتے ہیں جیسے پھولوں بھری راہ گزر پر سفر کر رہے ہوں، آسمانوں پر گھٹائیں اور سروں پر چھتر چھائے ہوں مگر ہم جیسے سیاح لوگ نہ ان دھوپوں کے عادی ہوتے ہیں نہ ان برفوں کے۔

رات کے گیارہ بجے جس علاقے سے گزری وہاں برف پڑ کر ابھی ابھی رکی تھی۔ ہر چیز برف سے اٹی ہوئی تھی اور بجلی کی روشنیاں اس کی چمک اور خوب صورتی کو بڑھا رہی تھیں۔ آدھی رات کو دن کی سی روشنی تھی۔ ایک گم نام جگہ چھوٹی سی سرائے نظر آئی۔ برف کے میدانوں میں ایک چھوٹا سا گھر جس کی دیوار کی ہر آؤٹ لائن جلتے ہوئے رنگین قمقموں سے بنی ہوئی تھی جیسے کسی بچے نے رنگین چاک

سے کاغذ پر سادہ سا گھر بنایا ہو۔ گھر کے سامنے ایک بڑا سا درخت تھا جس پر کوئی روشنی نہیں تھی۔ جانے کیوں یہ گھر، یہ درخت اور یہ روشنیاں بڑی انوکھی سی لگیں اور رات کے پڑاؤ کے لیے جھٹ پٹ میں نے اسے پسند کرلیا۔

سونے سے پہلے حسبِ عادت ایک مرتبہ اور کھڑکی سے باہر کا جائزہ لیا۔ کئی گھروں میں روشنیاں ہو رہی تھیں۔ سوچا اس وقت لوگ کیا کر رہے ہوں گے؟ ٹی وی دیکھ رہے ہوں گے۔ آتش دان کی آگ کے سامنے بیٹھ کر کتابیں پڑھنا اور کہانیاں کہنا اب کہانی ہو گیا ہے۔ چھپے ہوئے ہیٹر کمروں کو گرم رکھتے ہیں۔ گھر والے اپنے اپنے کمروں میں ہوتے ہیں۔ اگر یکجا بھی ہوں تو ٹی وی جیسے بتِ طناز کے سامنے خاموش بیٹھے رہو۔ اذنِ گفتگو نہیں ہے، ہاں اپنے اپنے خیالوں میں کھوئے رہنے کا اختیار ہے۔ ٹی وی میرے کمرے میں بھی تھا مگر دیکھنے کو جی نہ چاہا۔ کسی سے باتیں ہوتیں۔ اگر بیگم صوفی کسی طرح آ سکتیں......اور اس مرتبہ وہ واقعی آ موجود ہوئیں۔ پستہ قد، فربہ بدن، چست آڑا پاجامہ، لانبا کُرتا، کُرتے میں ملتانی وضع کے چاندی کے بٹن، ہاتھوں میں کانچ کی چوڑیاں جو دنبالہ دار کلائی میں ٹھنسی ہوئی تھیں۔ چاندی کی انگوٹھیوں میں گندھا ہوا آٹا شاید مستقل طور پر بھرا رہتا تھا۔

''میں آپ کو بہت یاد کر رہی تھی۔'' میں نے بڑی گرم جوشی سے اُن کا استقبال کیا۔

''یاد کرنے سے کیا ہوتا۔'' انھوں نے کہا، ''سچی لگن سے بات بنتی ہے۔ سنا نہیں ٹھاکر پتھر، مالا لکڑ، گنگا جمنا پانی۔ جب تک من میں سانچ نہ آئے چاروں وید کہانی۔''

''یہ تو آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔'' میں نے اُن کی ہاں میں ہاں ملائی۔ ان کے لہجے میں ایک تھانے دارانہ قطعیت تھی۔ اختلافِ رائے میں خطرہ تھا۔

''مگر مجھے یاد کرنے کی ضرورت نہیں تھی، جو کچھ معلوم تھا میں نے ڈیو کو بتا دیا تھا۔'' انھوں نے کہا۔

''بہت کچھ، ......پھر بھی کئی سوال اُلجھے رہ گئے تھے اور مجھے آپ سے ملنے کا اشتیاق بھی تو تھا۔''

''اب تم کچی دے رہی ہو مگر بتا دوں کہ مجھے تم سے ملنے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ ایک مصنف کو بھگتے بیٹھی تھی۔''

''اس کو تو آپ نے مار دیا۔'' میں نے لہجے کو شگفتہ رکھنے کی کوشش کی تاکہ امریکنوں کی طرح مذاق (I'm kidding) کا عذر پیش کر سکوں۔

''اللہ نہ کرے......میں صوفی صاحب کی بات کر رہی ہوں۔'' انھوں نے کہا۔ ''اللہ انھیں حیاتی دے۔''

اتنے عرصے ملتان میں رہنے سے ان کی نستعلیق اردو میں مقامی لہجے اور الفاظ کا تال میل

شروع ہو گیا تھا۔

''میں بھی ان ہی کی بات کر رہی ہوں۔'' میں نے کہا،''میری مراد تھی ان کے اندر کے مصنف کو۔''

''اسے انھوں نے خود مارا کوٹا ہو گا۔ میں نے ان کو کبھی لکھنے سے نہ روکا، نہ کوئی کسی کو لکھنے سے روک سکتا ہے، ہاں مگر لکھنے والوں سے دُوری بھلی۔ شاید ہی کسی اللہ کے بندے کے لیے قلم سے اچھے الفاظ نکلتے ہوں۔'' انھوں نے کہا۔

''خیر، ایسا تو نہیں ہے۔'' میں نے صفائی میں بولنا شروع کیا مگر بیگم صوفی نے میری بات کاٹ دی۔

''میں پوچھتی ہوں، سب کے بارے میں لکھتی ہو کبھی اپنے بھید کھولو، اپنی دھجیاں اُڑاؤ......''

''ہاں چاہتی تو تھی مگر جب ایک دن اپنی پونجی لے کر بیٹھی تو پتا چلا کہ اس میں سے بہت کچھ پہلے ہی وقتاً فوقتاً اپنے کرداروں کو سونپ چکی ہوں۔ آپ کے مشاہدے اور تجربے لاشعوری طور پر آپ کے بچوں کی زندگیوں میں داخل ہو جائیں تو ہو جائیں شعوری طور پر وہ کم ہی ان میں دلچسپی لیتے ہیں۔ بزرگ سات پشتوں سے کم کی بات نہیں کرتے۔ زندگی میں دیکھیے تو تیسری نسل کو دادا دادی، نانا نانی کے بارے میں کم ہی واقفیت ہوتی ہے۔ انھوں نے کتنا ہی تیر مارا ہو ایک خاص عمر میں وہ بچوں کے لیے جھکی، سنکی اور خود پرست بن جاتے ہیں۔ بچے ان کو اہمیت نہیں دیتے نہ ان کے بارے میں اپنے بچوں کو بتاتے ہیں نہ ان کے تجربوں اور مشاہدوں کی ان کے نزدیک کوئی اہمیت ہوتی ہے۔ چناں چہ ہوتا یہ ہے کہ ہر شخص اپنے مشاہدے غیروں کو اور دولت چہیتوں کو دے جاتا ہے جب کہ فلسفیانہ طور پر ہونا یہ چاہیے کہ آپ دولت غیروں کو اور تجربے مشاہدے اپنے سگوں کو دے کر جائیں۔ سو بہتر یہی ہے کہ آپ اپنی زندگی کے نکتے مجھے دے دیجیے میں ان کو دوسروں تک پہنچا دوں گی۔''

'ارے کیا ہم اور کیا ہمارے نکتے۔ میں تو سمجھتی ہوں ہم جیسے لوگ چیونٹیوں کی طرح ہوتے ہیں۔ بھرے گھر میں پیدا ہوتے ہیں، کیوں ہوتے ہیں خدا کو معلوم ہو گا۔ شادی ہوتی ہے، بچے ہوتے ہیں یا نہیں ہوتے۔ اپنا وقت پورا کرتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ اس میں کوئی نکتہ میری سمجھ میں تو آتا نہیں، تمھاری سمجھ میں آتا ہو تو تم جانو۔'' ذرا سے وقفے کے بعد انھوں نے کہا۔''ہاں تو بتاؤ کیوں یاد کیا ہے؟''

''آپ نے زمان کو بہت تکلیفیں دیں اور اپنے گھر میں نہ رکھا اس کے پیچھے اصل بات کیا تھی؟'' میں نے کہا۔

وہ کچھ سوچتی رہیں۔ ان کی بڑی بڑی گول آنکھوں میں کالے کالے ڈھیلے گیندوں کی طرح

لڑھکتے رہے۔ پھر انھوں نے ٹھنڈا سانس لیا۔ ''تمھارا یہ خیال کہ میں نے اسے بہت تکلیفیں دیں، صحیح نہیں ہے۔ وہ حساس بہت تھا، ہوسکتا ہے اسے صرف وہی باتیں یاد رہیں جو اسے بری لگیں ورنہ میں نے اس کی ہر طرح خدمت کی۔ بیمار ہوتا تھا تو رات رات بھر ایک ٹانگ پر کھڑی رہتی تھی، صحت کے لیے دُعائیں مانگتی تھی۔ یوں انسان اپنے سگے بچوں کو بھی کچھ نہ کچھ کہہ ہی دیتا ہے وہ تو پھر غیر اور.....''

کہتے کہتے وہ زبان دبا گئیں اور لمحہ بھر توقف کے بعد پھر بولیں، ''تم سچ اُگلوا کر دم لوگی تو مجھے بھی سچ کہنے میں عار نہیں ہے بلکہ ایک طرح کا سکھ ہی ہے، لو سنو..... میرے باپ تھانے دار تھے ریلوے میں۔ ڈھیروں بہن بھائی تھے۔ آمدنی کم تھی خرچ زیادہ جو اُوپری آمدنی، رشوت، بخشش اور داداگیری کے پیسے سے چلتا تھا۔ ہم نے آنکھ کھولی تو یہی دیکھا کہ ابا رومال میں بندھے نوٹ لا رہے ہیں، کبھی گھی کا ٹین، کبھی گندم کی بوری، پھل پھلار بھی مفت آتے تھے۔ ابا نے جیب سے پیسے نکالے سب کو بانٹ دیے۔ ہم باہر گئے کھٹی میٹھی گولیوں اور برف کے گولوں میں اُڑا دیے۔ کہنے کو اسکول سب جاتے تھے مگر پڑھو نہ پڑھو کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ گھر میں بندھی ٹکی آمدنی نہ تھی اس لیے شاید برکت بھی نہ تھی۔ اِدھر آیا اُدھر گیا۔ کسی کے پاس نیا جوتا ہے تو کسی کے پاس نہیں ہے۔ کسی کے پاس نیا جوڑا ہے تو کوئی پھٹا پرانا لٹکائے پھر رہا ہے۔ صوفی صاحب کی بڑی لڑکی مجھ سے ذرا ہی چھوٹی ہوگی۔ صوفی صاحب کے بچے بظاہر تو اچھی طرح ملتے مگر دل میں احساس ہوتا جیسے وہ ہمیں اچھوت سمجھتے ہوں۔ ایک دن صوفی صاحب کی بیٹی نے بتایا کہ تمھارے گھر سے کوئی چیز آئے تو ابا کھانے نہیں دیتے، کہتے ہیں کہ حرام کے پیسے کی ہے پھینک دو۔

ہم سب صوفی صاحب کو بچپن میں چچا کہا کرتے تھے مگر انھوں نے جانے کب سے ہمیں تاک رکھا تھا۔ سچ یا جھوٹ کہتے ہیں کہ انھیں عشق ہوگیا تھا۔ لاگ لگی تب لاج کہاں؟ عمر کا فرق بھی ان کی نظر میں کچھ نہ تھا۔ بیوی بے چاری مرچکی تھیں۔ انھوں نے اُٹھا کر ہمارے لیے ابا کو پیغام دے دیا۔ تمھیں تو معلوم ہے ہمارے ہاں چٹے گورے رنگ کی قدر ہے۔ دو چھوٹی بہنوں کی شادیاں ہوگئیں کیوں کہ وہ گوری تھیں۔ میں بیٹھی رہ گئی کہ سانولی تھی۔ ابا نے سوچا عمر ڈھل رہی ہے بعد میں کوئی ایسا بھی نہ ملے گا۔ صوفی صاحب کے ساتھ نکاح پڑھوا دیا۔

صوفی صاحب کے ساتھ مرتے جیتے گزر ہوتی رہی۔ ہم نے کبھی کسی سے عشق کیا نہ عشق کا مطلب جانا۔ شروع میں تو صوفی صاحب کو ہمیشہ چچا کے برابر ہی جانا۔ اب تک کبھی کبھی ابا کے ہم عمر ہونے کی وجہ سے ان کی شباہت آتی ہے تو منہ پر تھپڑ مار لیتی ہوں کہ وہ تیرا شوہر ہے، چچا تایا نہیں ہے۔ یہ باتیں کسی سے کہنے کی نہیں ہیں مگر تم عورت ذات ہو اور دوسروں کا دکھ سکھ جاننے کا چسکا ہے

اس لیے کہہ دیں۔

ہاں تو......صوفی صاحب کو پہلی فکر یہ تھی کہ میری پرورش حرام کے پیسے سے ہوئی ہے۔ ان کا بس چلتا تو میری آنتیں نکلوا کرنئی آنتیں ڈلوا دیتے کہ ان میں حرام لقمے جاتے رہے ہیں اور شاید میری کھال کھر چوا کرنئی کھال چڑھا دیتے کہ رشوت کی پوشاک بدن پر رہی ہے۔ باقی جسم کی خیر تھی کہ خدا کے فضل سے میں کنواری تھی......'' وہ زہر خند سے ہنسیں پھر بولیں، ''اب چاہتے یہ تھے کہ میں اپنے میکے نہ جاؤں۔ شروع شروع میں اسی بات پر ہمارا جھگڑا ہوتا تھا۔ تم بتاؤ، کچی عمر میں بہن بھائیوں کو چھوڑا، گڑیاں جھولے چھوڑے، چنریاں چھوڑیں، پکوان چھوڑے، بوڑھے صوفی صاحب کے پندو وعظ سنے اور اس پر یہ ظلم کہ میکے نہ جاؤ، پھر حرام تمھارے منھ میں نہ جائے۔ بڑی تو تو میں میں اور فضیحتوں کے بعد فیصلہ ہوا کہ میکے جاؤں گی تو اپنا کھاؤں گی، اپنے بستر پر سوؤں گی اور شوہر کے بنائے ہوئے کپڑے پہنوں گی۔ خیر میں صوفی صاحب سے پیسے لے کر جاتی اور میکے میں خوب گلچھرے اُڑاتی۔ مگر آہستہ آہستہ صوفی صاحب کا رنگ مجھ پر چڑھنے لگا۔ خود ہی ابا کی باتوں اور بہن بھائیوں کی حرکتوں کی طرف سے دل کھٹا ہو گیا۔

''کیا حرکتیں تھیں ان کی؟'' میں نے پوچھا۔

''ارے چلتی گاڑیوں سے سامان کھینچ لیتے تھے۔ بھائی الگ تھانے داری چلاتے تھے۔ بلا ٹکٹ سفر کرنا، خوانچے والوں کو تڑی دے کر سامان لے آنا، دکان داروں سے اُدھار سامان لے آنا۔ مرغی، انڈے، پھل تو یوں ہی آتے ہی تھے..... خیر میں نے ادھر میکے جانا آنا کم کر دیا۔ صوفی صاحب کے بچے اپنے اپنے گھر کے ہوئے۔ اب اس عمر میں ان کے بچہ تو کیا ہوتا، سوچا کوئی بچہ پال لو بیوی کا جی لگ جائے گا۔ میں بھی طوطے اور بلیاں پال پال کر تھک چکی تھی۔ راضی ہو گئی مگر جب وہ زمان کو لائے تو مجھے خار آیا کہ میرے منھ سے حرام کا نوالہ اگلوانے کو تو تم تیار رہتے تھے اور میرے پالنے کو حرام کا جنا ہی رہ گیا تھا۔ چچا بھتیجی کی اولاد.....''

''ذرا ٹھہریے۔'' میں نے چونک کر کہا، ''یہ کیا کہا آپ نے؟''

''کہا...... جو تم نے سنا۔ یوں اختو بختو سہی مگر بات اُول میں چول دہی میں موسل نہیں کرتی، یوں اپنی مرضی سے نہ کہوں لیکن مجھے خوب معلوم ہے وہ نطفۂ حرام ہے، سو فی صد ولدالزّنا۔''

''اوہ...... یہ بات آپ نے ڈیو کو بتائی؟'' میں نے پوچھا۔

''ڈیو اور زمان کو نہیں بتائی۔ ان لونڈوں چھونڈوں کو کیا بتاتی! میں نے تو صوفی صاحب کو بھی نہیں بتایا۔ اس مرحومہ کا راز تھا۔ بس غصے میں یہی کہہ دیا کرتی تھی کہ تم تو کہتے تھے حرام چالیس گھر

لے ڈوبتا ہے، حرام کو ٹھے پر پکارتا ہے۔ اب اس لوطی کی اولاد کو کیوں لائے؟''

''صوفی صاحب کا ردِعمل؟'' میں نے پوچھا۔

''صوفی صاحب نے بھی اسرار صاحب کے بارے میں افواہیں سن رکھی تھیں۔ وہ سمجھتے تھے میرا اشارہ اس طرف ہے۔ کہتے تھے کسی پر اس طرح کا بہتان لگانا سب سے بڑا گناہ ہے۔ تم تو یہی سمجھو کہ وہ غریب مسکین والدین کا بچہ ہے جس کا بوجھ وہ نہ اُٹھا سکے اور اللہ نے امانت ہمارے سپرد کردی۔ میں نے اسے اللہ کی امانت نہ جانا۔ یہی سوچتی تھی کل کلاں کو بڑا ہوگا۔ کس کے گھر بیٹی مانگنے جاؤں گی؟ بات کھل گئی تو میرے منہ پر کالک لگے گی۔ پرائی آگ میں جلنے کی مجھے کیا مصیبت!''

''تو یہ بات آپ نے صوفی صاحب کو نہ بتائی؟'' میں نے کہا۔

''وہ مانتے تھوڑا ہی۔ اُلٹا مجھے کہتے کہ تم مرے ہوؤں پر لم لگاتی ہو، یہ اور وہ....... اسرار صاحب بھی بعد میں تائب ہوگئے، نیک اور دین دار بن گئے مگر آدمی جو کچھ کر چکا اسے کون میٹ سکتا ہے۔ دو زندگیاں بیوی اور بیٹی کی تو انھوں نے خراب کیں، باقی کیا کیا ہوا کون جانے؟''

''ان کے تعلقات آپس میں کیسے تھے، میرا مطلب ہے اسرار صاحب اور بیگم کے؟'' موقع پا کر میں نے کہا۔

''بھئی کچھ عجب ہی طور تھے ان کے۔ اسرار صاحب کو دنیا رنگین مزاج کہتی تھی۔ عورتوں سے ہنس ہنس کر بات کرتے تھے مگر اندر ہی اندر کچھ اور بھی تھا۔ یہ بات مجھے معلوم نہیں تھی۔ جب زینت اور شاہ نواز ان کے ہاں تھے تو ایک دن بیگم اسرار نے مجھے بلا کر کہا میں زینت کو سمجھاؤں کہ وہ ہمارے شب خوابی کے کمرے میں اس طرح بے دھڑک بغیر کھٹکا کیے، بغیر دستک دیے نہ آیا کرے۔ میں نے کہا، بیگم صاحبہ یہ تو آپ بھی اس سے کہہ سکتی ہیں اور اس کے شوہر سے بھی، اس پر وہ کچھ خفیف سی ہوئیں اور مجھے سارا قصہ سنایا۔ اُن کے میاں دوسری عورتوں کے پاس جاتے ہیں۔ یہ بات انھیں پشاور کی ایک پاوندہ لڑکی نے بتائی تھی۔ اس علاقے میں جگہ جگہ ان لوگوں نے جھگیاں ڈال رکھی تھی اور غیر ملکی کپڑا بیچا کرتے تھے۔ ان کی عورتیں اور لڑکیاں گھر گھر گٹھری اور گز اُٹھائے کپڑا بیچتی پھرتی تھیں۔ ایک دن انھوں نے بھی ایک لڑکی کو اندر بلا کر کپڑا دکھانے کو کہا۔ وہ پشواز پھیلا کر آرام سے زمین پر بیٹھ گئی اور گٹھری کھول کر کپڑا دکھانے کے بجائے میز پر رکھی ہوئی اسرار صاحب کی تصویر کو دیکھنے لگی۔

''کیا دیکھ رہی ہو؟'' بیگم اسرار نے پوچھا۔

''یہ کون آدمی ہے؟ اُدھر جھگیوں میں آتا رہتا ہے۔'' لڑکی نے کہا۔

بیگم اسرار نے بتایا کہ بہت سے مرد اپنی بیویوں کے ساتھ کپڑا لینے جاتے تھے لیکن اسرار

صاحب تو اسمگل کپڑے اور جھگیوں کے نام سے جلتے تھے۔ انھوں نے کبھی اُدھر کا رخ نہ کیا تھا۔

''اس آدمی کو تم نے اُدھر جھگیوں میں دیکھا ہے؟ کوئی اور ہوگا۔'' بیگم اسرار نے کہا۔

''کوئی اور ہوگا.....'' لڑکی بدستور تصویر کو گھورتی رہی..... ''مگر مجھے تو یہی لگتا ہے۔ ایک دن پستول لینے کا بہانہ کر کے بابا کے پاس ہمارے گھر بھی آیا۔ بابا نے ڈانٹ کر بھگا دیا۔ بولا، ''بھاگو، ہم لڑکیوں کا کاروبار نہیں کرتا۔ خبردار جو کبھی ہمارے گھر آیا۔ دکان پر جاؤ..... جو لینا ہے اُدھر سے لو۔''

لڑکی کم عمر اور ناسمجھ تھی۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ ایسی باتیں کم از کم اُس شخص کی بیوی کے سامنے تو نہ کہے۔ بیگم اسرار نے کہا کہ اُنھیں فی الحال کچھ نہیں چاہیے۔ لڑکی نے اپنی زبان میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے گٹھری باندھی، کندھے پر ڈالی، جوتے پہنے اور گز اُٹھا کر چلتی بنی لیکن اس کے سفید گز پر پڑتی دھوپ کی چمک خنجر کی طرح اُن کے دل کو کاٹتی رہی۔

بیگم اسرار نے گاڑی نکالی اور اندھا دُھند دوڑانے لگیں۔ بہت دیر بعد جب ذرا ہوش آیا تو وہ ایک گاؤں میں کھڑی تھیں جہاں عورتیں، مرد اور بچے سب انھیں دیکھنے نکل آئے تھے اور ایک نڈر بچہ گاڑی میں جھانک رہا تھا۔

''بیگم صاحبہ مرغی چاہیے، سبزی چاہیے؟''

تب وہ یوں بن گئیں جیسے سستے سودے کی تلاش میں ہی نکلی ہوں۔ مرغی، انڈے، ٹماٹر اور شہد لے کر لوٹیں اور پھر یہ ان کی عادت بن گئی۔ میاں سے انھوں نے کچھ نہ کہا۔ بس جب دل کا درد بہت ستاتا تو وہ نزدیک کے کسی گاؤں کا رخ کرتیں۔ گاؤں کی آزاد فضا میں میلوں تک کھڑے گنے کے کھیت، تازہ سبزیاں اور بہتا پانی ان کے دل کو ڈھارس دیتا تھا۔ گھنٹوں گاؤں کی کھری چارپائیوں پر بیٹھی ان لوگوں سے باتیں کیا کرتیں۔ عورتیں اپنے دُکھڑے انھیں سناتیں، انھیں چائے بنا کر پلاتیں۔ رفتہ رفتہ یہ اپنے شوہر اور بچوں کے گرم کپڑے، سوئٹر اور جوتے ان کے لیے لے جانے لگیں۔ عورتوں کی ہمت بڑھی تو وہ بچوں کے زکام کھانسی کی دواؤں کی فرمائش کرنے لگیں۔ بیگم اسرار کہتی تھیں، جانے کو وہ ہفتے میں ایک دو دن لیڈیز کلب بھی جاتی تھیں مگر وہاں کا مصنوعی ماحول ان کے دُکھوں کا مداوا نہیں تھا۔ وہاں ہر عورت یہ بتانا چاہتی تھی کہ اس کا شوہر کس طرح اس پر فدا تھا۔ گاؤں میں سچے مسائل تھے۔ اُن کا حل اُن کے پاس نہیں تھا۔ اپاہج پنگلے بچے، اندھے بوڑھے، کمزور زچائیں، کئی کئی بیویاں اور اُن کے آپس کے جھگڑے۔ وہ ان کے معاملات کو غور سے دیکھتی اور سنتیں تو اندر ہی اندر دل کو یہ تسلی ہوتی کہ دنیا میں ان سے کہیں زیادہ دُکھی لوگ ہیں۔ ان کے غم اصلی ہیں۔ انھوں نے خواہ مخواہ ایک فرضی غم کو دل سے لگا رکھا ہے۔

پھر دیکھتے دیکھتے یہ فرضی غم اُن کی آنکھوں کے آگے اصلی بننے لگا۔ زینت بغیر چولی کے تنگ قمیص پہنے جوانی سے بھرپور سینہ تھلتھلاتی پھرتی۔ انھوں نے خود کئی مرتبہ اسرار صاحب کو دروازوں کھڑکیوں سے لگے اس کو جھانکتے دیکھا۔ ایک بات جو اُنھیں بطورِ خاص بری لگتی تھی وہ اس کا بلا تکلف بیڈ روم میں چلا آنا تھا۔ بیگم اسرار تنہا ہوں، شوہر کے ساتھ ہوں یا اسرار صاحب تنہا ہوں، اُسے کچھ کام ہوتا تو بلا روک ٹوک اندر چلی آتی۔ چائے کی پیالیاں اُٹھانا، الماریوں میں کپڑے لٹکانا اور کھانے کے بارے میں سوالات پوچھنا ہوں تو شاہ نواز اسی کو بھیجتا تھا۔ کبھی وہ ٹوکتیں یا کہتیں کہ وہ خود باورچی خانے میں آ کر بتائیں گی تو اسرار صاحب یوں مسکراتے کہ وہ بچی ہو جاتیں۔ شاہ نواز اس کو یہ نازک باتیں نہیں بتاتا تھا حالاں کہ بقول اس کے افسروں کے گھروں میں ملازمت کیے ہوئے تھا۔ بیگم اسرار زینت کو سمجھاتی تھیں تو وہ یوں بن جاتی تھی کہ جیسے ان کی بات اُس کے پلے نہیں پڑ رہی یا اُن سے اور اُلٹے سیدھے سوالات شروع کر دیتی تھی۔ بیگم اسرار کی باتوں میں سچائی تھی کیوں کہ یہ سب کچھ میں خود بھی اپنی آنکھوں سے دیکھتی تھی۔ میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ میں اس کو سمجھا دوں گی مگر اس کا موقع ہی نہیں ملا کیوں کہ شاہ نواز اسے پل بھر کو اکیلا نہیں چھوڑتا تھا۔ پھر ایک دن میں نے سنا کہ بیگم صاحبہ چند دن کے لیے میکے چلی گئیں۔ میں سمجھ گئی کہ بات اُن کی برداشت سے باہر ہو گئی ہو گی۔ وہ ایک ماہ وہاں رہیں اور جب واپس آئیں تو دیکھا کہ گھر کے انتظام میں کوئی فرق نہیں پڑا ہے بلکہ شاہ نواز اور بیوی کے عمل دخل میں کچھ اور اضافہ ہو گیا۔

ایک دن جب وہ لیڈیز کلب سے جلد واپس آ گئیں تو انھوں نے اسرار صاحب کو زینت کے ساتھ رنگے ہاتھوں پکڑا۔ تو تو میں میں ہوئی۔ اسرار صاحب نے اپنی بے وفائی کا الزام بھی اُن کے سر ڈال دیا۔ جب انھیں یہ بات معلوم تھی کہ شاہ نواز خود بیوی کو بڑھاوا دیتا ہے اور وہ اسے چھوڑ کر میکے چلی گئیں تو وہ یہی سمجھے کہ ان کی طرف سے اس بات کی اجازت ہے، صرف وہ یہ نہیں چاہتیں کہ جب یہ سب کچھ ہو تو وہ وہاں موجود ہوں۔ اب کہنے سننے کو کچھ نہ تھا۔ بیگم اسرار کو چپ لگ گئی۔ انھوں نے کسی سے بات چیت کرنا اور باہر نکلنا قطعی چھوڑ دیا اور اسرار صاحب نے کوئی غلطی نکال کر شاہ نواز اور زینت کو خود ہی چلتا کر دیا۔ چلتے چلتے وہ اسرار صاحب کو سنا گیا کہ اسے معلوم ہو گیا ہے کہ ان کا معاملہ اس کی بیوی کے ساتھ کئی ماہ سے چل رہا ہے اور وہ کبھی اُنھیں معاف نہیں کرے گا۔

''اصل بات بعد میں زینت نے مجھے بتائی۔ شاہ نواز اس کا سگا چچا تھا اور بچپن سے ہی اسے خراب کر دیا تھا اس کو یہی بتایا تھا کہ یہ ان دونوں کا راز ہے اور وہ اس میں برابر کی شریک ہے۔ کسی کو بتایا تو ان دونوں کی خیر نہیں ہے۔ جب وہ پیٹ سے ہوئی اور معاملہ کھلا تب بھی اس نے شاہ نواز کا نام

نہ لیا۔ چچا نے پیش کش کی کہ وہ اپنی چہیتی بھتیجی کا گلا خود کاٹے گا۔ اس طرح وہ اسے لے کر بھاگا۔ زرینہ کے بجائے اس کا نام زینت رکھا۔ خود اپنا نام ہیبت خاں سے شاہ نواز رکھا۔ داڑھی بڑھائی اور نکل گیا۔ زینت کو اس نے بری طرح ڈرا دیا تھا کہ یہ بات کسی کو بتائی تو اُس سے برا کوئی نہ ہوگا۔ مجھے بھی ہزاروں قسمیں دینے کے بعد اس نے یہ بات بتائی تھی شاید اس لیے کہ اندر سے اُس کا کلیجہ پھنک رہا تھا۔ لگ کر ملازمت کرنا مشکل تھا تو بچے کی پیدائش اور پرورش کیسے کرتا۔ اس کے لیے اس نے یہ ترکیب نکالی کہ بچے کو کسی اور کے سر منڈھے۔ زینت کو وہ نہ صرف مواقع دیتا تھا بلکہ بعض اوقات حکم بھی دیتا تھا کہ وہ اسرار صاحب کے کمرے میں جائے۔ شاید میں یہ بتانا بھول گئی کہ اسرار صاحب کا ایک بیٹا بھی تھا تین سال کا۔

بیگم اسرار کو پہلے بھی لوگ اسرار صاحب کی حرکتوں کا اشارہ دیتے تھے مگر انھوں نے اعتماد اور لاعلمی کے مرہم کی ہلکی سی تہہ اپنے زخموں پر چڑھا رکھی تھی جس سے سکون سا رہتا تھا۔ صرف شبہوں میں زندگی تلخ کرنے سے کیا فائدہ! مگر اب وہ مرہم بھی ہٹ گیا تھا۔ زخم میں نیا کھرونچا لگا تھا اور خون رِسنے لگا تھا۔ وہ دن تھے جب انھوں نے سچ مچ اسرار صاحب کو چھوڑ کر ہمیشہ کے لیے میکے جانے کا سوچا۔ مگر آخر میں یہی فیصلہ کیا کہ اپنے بچوں کو باپ کے سائے سے محروم کرنے سے بہتر ہے کہ وہ ایک خاص قسم کے مصنوعی ماحول میں رہیں جس میں دیکھنے والوں کو ہر بات معمول کے مطابق نظر آئے۔ نہ جانے کتنے ہی لوگ ایسے مصنوعی ماحول میں رہتے ہیں۔'' بیگم صوفی نے ٹھنڈا سانس لیا۔ ''مگر ان کے دل میں چوبیس گھنٹے جو آگ سلگتی ہوگی اس کا تصور تم بھی کر سکتی ہو اور میں بھی۔ بیٹی پیدا ہوئی تو اس کے دل میں پیدائشی سوراخ تھا۔ صوفی صاحب ہنستے ہیں کہ دل میں سوراخ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہوتا جو تم سمجھتی ہو کہ جیسے کپڑے میں سوراخ ہو۔ میں کہتی ہوں مطلب معنی تو میں نہیں جانتی مگر کہوں گی یہی کہ ماں کے دل سے جو چنگاریاں جھڑتی تھیں وہ بیٹی کے دل پر پڑیں یا جو خنجر ماں کے دل میں گڑا تھا وہ بیٹی کے دل کو چھید گیا۔''

''ان کے بیٹے کے بارے میں کچھ بتائیے۔'' میں نے کہا۔

''ارے کیا بتاؤں، اتنا پیارا اور خوب صورت تھا کہ حد نہیں۔ اس کو دیکھتے ہی پہلا خیال یہ آتا تھا کہ خدا خیر کرے۔ اتنے خوب صورت بچے کم جیتے ہیں اور یہی ہوا۔ بیمار ہوا اور مر گیا۔ تعجب نہیں گھر میں میاں بیوی کی تناتنی اور کھچاوٹ کی بھینٹ چڑھ گیا ہو۔ مر گیا تو اسرار صاحب کو ہوش آیا۔ بہت روئے۔ بیوی بھی رو رو ادھ موئی ہو گئیں۔ چالاکی دیکھو کہ اُن کا دل بہلانے کو زمان کو گھر لے آئے۔ بیگم اسرار کو تو یہی اطلاع تھی کہ زینت اور شاہ نواز اپنے گاؤں چلے گئے۔ زینت جتنے دن میرے ہاں

رہی میں نے اس کا سایہ بھی باہر نہ پڑنے دیا۔ خیر، مگر زمان اُن کے بچے کا بدل نہ بنا۔ یوں ہی نوکروں کے سہارے پلتا رہا۔ بیگم سے زیادہ اسرار صاحب اُس کے چاؤ چونچلے کرتے تھے۔ کبھی کبھی جی چاہتا تھا سچ کا پتھر ان کے سینے پر مار کر تڑپنے کا تماشا دیکھوں کہ جسے اپنا جانتے ہو وہ پرایا مال ہے۔ پھر سوچتی تھی بندی تو کیوں کسی کے پھڈے میں ٹانگ اڑاتی ہے اور تیرے پاس ہے کوئی ثبوت؟ بتانے والی بھی مرگئی۔ اب یہ راز کھولے گی تو کس برتے پر! لوگ تیرا ہی چونڈہ موٹڑیں گے......اور وہ کون سا اپنا کہہ کر لائے تھے۔ یتیم ویسیر سمجھ کر اللہ واسطے پال رہے تھے۔

اُن ہی دنوں ایک اور تماشا ہوا۔ ایک دن اسرار صاحب کی ڈاک میں ایک رنگین لفافہ آیا۔ اسرار صاحب کے نام نہیں بیگم اسرار کے نام مگر اسرار صاحب ساری ڈاک خود ہی کھولتے تھے۔ لفافہ کھولا تو اندر سے ایک خوب صورت عید کارڈ نکلا جس پر کسی کا نام نہیں تھا۔ کارڈ لیے وہ بیگم کے پاس آئے اور پوچھا کہ عید کارڈ کس کا ہے؟ بیگم نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ اسرار صاحب کو اس میں دلچسپی ہوئی۔ بیگم سے کہا کہ اپنی دوستوں سے پوچھو کہ کارڈ انھوں نے تو نہیں بھیجا اور جس نے بھیجا ہے اپنا نام کیوں نہیں لکھا۔ بیگم نے اسرار صاحب سے بحث بیکار سمجھی مگر اپنی دوستوں کو فون نہ کیا۔ ان کی ایسی گہری دوستی کسی سے تھی بھی نہیں۔

چند دن بعد ایک اور رنگین خوب صورت کارڈ آیا جس میں انگریزی میں صرف ایک جملہ لکھا ہوا تھا، تمھاری شخصیت مجھے مسحور کرتی ہے۔ اب کی اسرار صاحب نے کارڈ کے بارے میں پوچھا تو انھوں نے کہا، ''آپ کے سوا اور کوئی شخص میری سمجھ میں نہیں آتا جو یہ کارڈ بھیج رہا ہو'' اسرار صاحب نے انکار کیا مگر وہ مصر رہیں۔ دوسرے دن وہ بھی ایک کارڈ خرید کر لائیں اور خوب صورت کارڈوں کا شکریہ لکھ کر اسرار صاحب کے دفتر کے پتے پر بھیج دیا مگر اس کے بعد جو چند کارڈ آئے اُن سے یقین ہوگیا کہ یہ کارڈ اسرار صاحب کی طرف سے نہیں آرہے۔ ایک میں لکھا تھا:

''آپ مجھے نہیں جانتیں اور میں چاہتا بھی نہیں کہ آپ جانیں۔ میرے لیے آپ کو دیکھتے رہنا کافی ہے۔ آپ کو گھر سے نکل کر باغ میں چہل قدمی کرتے دیکھتا ہوں، جھیل کے چکر لگاتے دیکھتا ہوں، بنچ پر بیٹھے دیکھتا ہوں اور سوچتا ہوں کہ آپ کیا سوچ رہی ہیں۔ صرف آپ کی دید کا مشتاق!''

اسی طرح کے خطوط ان کے پاس آتے رہے جنھیں وہ پھاڑ کر پھینکتی رہیں۔ رفتہ رفتہ فون آنے لگے جس میں کوئی شخص بہت محتاط طریقے سے اُن سے ملاقات کی درخواست کرتا۔ آخر انھوں نے اس بارے میں سوچنے کی ہامی بھرلی اور اس کا فون نمبر لے لیا۔

ایک دن انھوں نے مجھے بلا کر یہ داستان سنائی اور اسرار صاحب کو بتائے بغیر میرے سامنے اس

شخص کو فون کیا کہ وہ دوپہر کو دو بجے گھر پر آن کر اُن سے ملے۔ اسرار صاحب اس وقت نہیں ہوں گے۔ مجھ سے انھوں نے کہا کہ وہ چاہتی ہیں کہ جب وہ شخص آئے تو میں گھر میں موجود ہوں۔ پہلے تو میں ڈری۔ پھر ہمت بندھی کہ اگر اُن کے دل میں چور ہوتا تو مجھے کیوں روکتیں۔ ملازموں کے لیے پوچھا تو انھوں نے کہا کہ ہاں وہ بھی گھر ہی میں ہوں گے۔ یہ مجھے معلوم نہیں تھا کہ انھوں نے کچھ اور ہی انتظام کر رکھا ہے۔

ٹھیک وقت پر وہ شخص آیا۔ اس نے آہستہ سے گھنٹی بجائی۔ بیگم اسرار نے اندر سے نام پوچھا اور خود اسے ڈرائنگ روم میں لے کر آئیں۔ پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرنے لگیں۔ میں ڈرائنگ روم کے پاس والے برآمدے میں بیٹھی تھی۔ ان کی باتوں کی ہلکی ہلکی آوازیں آ رہی تھیں مگر گفتگو سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ چند منٹ بعد انھوں نے ڈرائنگ روم کے دروازے پر آن کر پکار کر کہا۔

''صنوبیہ! چائے لاؤ۔''

ابھی میں سوچ ہی رہی تھی کہ صنوبیہ کون ہے؟ یہ نام تو میں نے پہلے نہیں سنا تھا کہ یکایک ڈرائنگ روم سے دھینگا مشتی، لاف وگزاف اور چیخنے چلانے کی آوازیں آنے لگیں۔ میرا دل سنسنا کر منھ میں آ گیا۔ پردے وردے کا خیال بھی نہ رہا۔ ادبدا کر بھاگی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ اردلی، خانساماں اور مالی مل کر ایک شخص کو مار رہے ہیں۔ بیگم اسرار نے ملازموں کو پہلے سے تیار کر رکھا تھا کہ جب وہ پکار کر چائے لانے کو کہیں تو وہ اندر آن کر ملاقاتی کی مرمت شروع کر دیں۔ آنے والا ہاتھ جوڑ رہا تھا۔ عین اُسی وقت کسی پراسرار طریقے سے اسرار صاحب وارد ہوئے۔ اس شخص کو مار کھاتے دیکھا تو بڑے سٹپٹائے۔ بڑی مشکل سے ملازموں کو روکا۔ بھاگتے بھاگتے وہ آدمی کہہ گیا:

''صاحب، مار کھانے کی بات طے نہیں ہوئی تھی، اس بےعزتی کا بدلہ میں آپ سے لوں گا۔''

بیگم اسرار کو پہلے بھی شک تھا مگر اس وقت یقین ہو گیا کہ اس سب کارروائی میں ان کے شوہر کا ہاتھ تھا۔ انھوں نے اب بھی اسرار صاحب سے کچھ نہ پوچھا مگر کئی روز تک اُن سے بالکل بات نہ کی۔ خدا جانے کیا جھوٹ سچ بول کر انھوں نے بیوی کو منایا۔

میرا خیال ہے، وہ یہ سوچے بیٹھے تھے کہ ایک مرتبہ بیوی کی کوئی کمزوری پکڑ لیں تو ان کے اپنے گناہوں کا بوجھ ہلکا ہو۔ بیوی کسی بات پر اعتراض کرے تو ان کے پاس بھی کچھ کہنے کو ہو لیکن اُلٹا پھنس گئے۔ بیوی کی خوشامد الگ کرنی پڑی، بدنامی ہوئی جدا۔ ملازموں نے بات کو خوب اُچھالا۔ اللہ جانے اُس آدمی کو کیا دے دلا کر اس کا منھ بند کیا ہوگا۔

پہلے ہی کون سا ان کا کلیجہ ٹھنڈا تھا۔ لکھ لٹ بھی نہ تھے۔ پیسے کی مار بھی تھی، اس پر یہ چربانکی۔

رفتہ رفتہ بیگم کا دل ان کی طرف سے بالکل کھٹا ہوگیا۔ بچی کی پیدائش میں میکے جانے لگیں تو بظاہر اسی کام کے لیے جارہی تھیں مگر ان کی باتوں سے مجھے اندازہ ہوا کہ اب نہیں لوٹیں گی۔ اپنے بے شمار نئے پرانے کپڑے گاؤں کی عورتوں میں بانٹ گئیں۔ مجھے چاندی کی ایک ٹھسی جو آج تک میرے پاس ہے۔ ملازموں کو بخشش دے کر گئیں۔ بچی پیدا ہوئی۔ ملازموں سے پتا چلتا کہ بیگم صاحبہ جلدی نہیں آسکتیں، بیٹی کے دل میں سوراخ ہے، ٹیسٹ وغیرہ ہورہے ہیں۔

پھر شاید انھوں نے شرط لگادی کہ زمان کو وہ اپنے گھر میں نہیں رکھیں گی۔ یہ بات کہ زمان، زینت کا بیٹا ہے، کتنے دن چھپی رہتی۔ بہت لوگوں کو معلوم تھی۔ ایک دن ڈاکٹر ایلس نے بھی فون کیا تھا۔ ہوسکتا ہے انھی سی پتا چلا ہو۔ تھک ہار کر زمان کو اسرار صاحب نے ہمارے حوالے کیا۔ صوفی صاحب کو ملتان میں رہنے کا شوق تھا۔ اسرار صاحب نے ہمیں وہاں زمین دلوائی اسی لیے میں بھی خاموش رہی۔

زمان ہمارے ساتھ ملتان آ گیا۔ پھر سنا کہ بیگم صاحبہ گھر آئیں مگر جلد ہی اُن کا انتقال ہوگیا۔ اسرار صاحب ملازمت چھوڑ کر کراچی چلے گئے اور بزنس شروع کردیا۔ بچی بڑی ہورہی تھی، اس کے لیے انگریزی بولنے والی مغلانیاں رکھتے تھے مگر خدا نے نیکی دل میں ڈال دی۔ عورتوں کی طرف دیکھنا اور بلاضرورت بات تک کرنا چھوڑ دی۔ نہ کسی سے ملتے جلتے تھے۔ خاندان والوں سے بھی تعلق نہ رکھا۔ شاید پچھلی حرکتوں کی شرم ہو۔ بس وہ تھے اور بزنس۔ ضمیر صاحب اچھے ایمان دار منتظم اُنھیں مل گئے۔ ایک مرتبہ بہت بلانے پر صوفی صاحب مجھے لے کر گئے تھے۔ بڑا شان دار گھر بنالیا ہے۔ بچی اچھی ہے، خدا اس کی حفاظت کرے اور اُسے صحت دے۔'' بیگم صوفی نے بات ختم کی۔

''اچھا یہ بتایئے ڈاکٹر ایلس سے آپ کی کتنی ملاقات ہوئی؟''

''بس ایک مرتبہ، جب وہ زینت کو لے کر میرے پاس آئی تھی۔ ہماری ملاقاتیں کہاں ہوتیں۔ وہ ہم سے بہت دور کہیں فیروز پور روڈ پر رہتی تھیں۔ زینت کو معائنے کے لیے بلانا ہوتا تو گاڑی بھیج دیتی تھیں۔''

''ڈیو کو شبہ ہے کہ زینت کے دو بچے پیدا ہوئے۔ ان میں سے ایک کو ڈاکٹر ایلس نے خود رکھ لیا، دوسرا خود ڈیو ہے۔ اس بات کے بارے میں کیا خیال ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں، مجھ سے بھی اسی قسم کی باتیں کررہا تھا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ زینت نے مجھے کبھی نہیں بتایا، یوں پیٹ کو دیکھو تو دو چھوڑ ایک بھی نہیں لگتا تھا۔ زمان بھی مرجھلا سا ہی ہوگا۔ صوفی صاحب کو کسی نے بتایا تھا کہ شروع میں مشین وشین میں رکھا گیا تھا مگر جو بات معلوم نہ ہو اس کے بارے میں یقین سے کیسے کہوں۔ ڈیوڈ بتا رہا تھا کہ اس نے ڈاکٹر ایلس کو خط لکھا تھا اور فوری جواب مانگا تھا لیکن انھوں

نے کوئی جواب نہ دیا۔ ڈیوڈ نے فون کیا تو انھوں نے کہا، ایسی باتیں فون پر نہیں ہوسکتیں۔ تم گھر آؤ، ہم تمھیں سگوں سے زیادہ چاہتے ہیں۔ تمھارے ابا اب ریٹائر ہونا چاہتے ہیں۔ ان کی خواہش ہے کہ فیکٹری کی ایک شاخ تم سنبھالو۔ لگتا ہے جائے گا۔ رستوں جکڑے اب نہیں ٹھہرے گا مگر وہاں جا کر کیا سنے گا اللہ ہی جانے۔''

''اچھا تو وہ دوبارہ ملتان آیا تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔ اس نے تو جیسے گھر کا قبالہ ہی لے لیا ہے، جب دیکھو، منہ اُٹھائے چلا آتا ہے لیکن لڑکا دل کا برا نہیں۔ مجھے اماں کہتا ہے تو مجھے اس پر بیٹے جیسا پیار آتا ہے۔''

''چلیے آخر کار آپ کو ایک بیٹا مل گیا۔'' میں نے کہا۔

''ارے، کہیں اوس سے پیاس بجھتی ہے۔ سوچا تھا، لاؤ زمان ہی کو اپنا لو، جو ہوا سو ہوا۔ اس بے چارے بچے کا کیا قصور ہے۔ ڈیوڈ نے زمان کو بتایا کہ صوفی صاحب اور اماں تمھارے لیے بے قرار ہیں، طرح دے گیا۔ ہم انتظار کرتے رہے۔ وہ سیدھا ملازمت کی جگہ پر چلا گیا۔ ڈیوڈ کہتا ہے، گولی ماریے اُسے۔ آپ مجھے اپنا بیٹا بنا لیجیے۔ اس مرتبہ پہلے سے بھی زیادہ باؤلی باتیں کر رہا تھا۔ بیٹھا ملتانی حلوہ کھاتا رہتا تھا اور خیالی پلاؤ پکاتا رہتا تھا۔ کہتا تھا، آپ اور صوفی صاحب میرے ساتھ امریکا چلیے۔ تھوڑی زمین خرید لیں گے، کھیتی لگا لیں گے...... وہ آپ کیا کہتی ہیں گھر جوت۔ ایک ننھی سی جھیل ہماری اپنی ہوگی۔ اس کے آگے کاٹھ کا ایک گھر بنا لیں گے۔ یہ نہیں تو چلیے کسی دریا کے کنارے ایک شیک (shack) ڈال لیں گے مگر اس میں آپ کے لیے بہترین نئی وضع کا باورچی خانہ بنا دوں گا۔ آپ کھڑی ہو کر حلوہ پکایا کریں، چپاتی اُتارا کریں۔ صوفی صاحب اور میں دریا سے مچھلیاں پکڑ کر لایا کریں گے۔ شام کو آپ دونوں پیڑوں سے گھری پگڈنڈی پر جسے وہاں ٹریل (trail) کہتے ہیں، چہل قدمی کے لیے جائیں۔ جب میرے بچے ہوں گے، آپ کو دادی کہیں گے۔ وہ درختوں سے جھولتی لمبی داڑھیوں سے لٹک کر جھولا کریں گے اور ہم سب خوش رہیں گے۔''

''پھر آپ نے کیا کہا؟'' میں نے پوچھا۔

میں نے کہا، ''باؤلے ہوئے ہو! وہی بات ہوئی گھر چھوڑ خطیرہ قائم! یہاں میرا کنبہ کم ہے۔ دادی کہنے والوں کی کمی ہے؟ ذرا اشارہ دوں تو جھونٹے پکڑ کر جھولنے آ پہنچیں، میری ہڈی ہڈی ہلا کر رکھ دیں...... اور صوفی صاحب وہاں کیوں جانے لگے! ملتان کی خاک کی خاطر تو یہاں کی دوزخ جیسی گرمی میں آ پڑے۔ ہاں تم جہاں چاہے جاؤ، گھر والے کا ایک گھر، نکھرے کے سو گھر......'' اس آخری بات پر منہ پر مہتاب چھٹنے لگے، بسنت پھولنے لگی۔ میں سمجھ گئی، اُسے برا لگا، مگر بات منہ سے

نکل گئی تھی۔ خیر، بڑی مشکل سے اِدھر سے اُدھر کی باتیں کر کے منایا۔

''منت مانی تھی، پوری ہوئی ہو تو چادر چڑھا دو۔'' تھوڑی دیر بعد میں نے کہا۔

''ابھی نہیں پوری ہوئی۔'' اس نے کہا، ''مگر آپ کو پیسے دے کر جاؤں گا، جب کبھی منت پوری ہوئی، خط لکھوں گا۔ آپ چادر چڑھا دیں بلکہ دو چادریں چڑھائیں ایک منت اور بھی مانی ہے۔''

میں نے کہا، ''تمھاری چادر کی خاطر میں قیامت کے بوریے تو سمیٹنے سے رہی۔ آخر معلوم تو ہو کس کس بات کی منت ہے، کچھ تو کہو۔ آخر منھ میں زبان حلال ہے۔''

جاتے جاتے بیٹھ گیا۔ سارا قصہ سنایا۔ ایک منت اس بات کی تھی کہ اس کے والدین کا پتا چلے۔ دوسری اس بات کی کہ ایک پاکستانی لڑکی کو دل دے بیٹھا۔ اس سے شادی ہو گئی تو دوسری چادر چڑھائے گا۔ عجب خبطی ہے۔ اللہ رسول کو مانتا نہیں بزرگوں کی قبروں پر چادریں چڑھانے کو تیار...... صوفی صاحب سے بحث کرتا رہتا تھا کہ آپ کے ہاں مرد اہلِ کتاب سے شادی کر سکتا ہے تو عورت کیوں نہیں کر سکتی۔ صوفی صاحب نے اسے کئی کتابیں پڑھنے کو دیں۔ انگریزی قرآن شریف خرید کر لایا مگر یہی کہتا تھا کہ کہیں نہیں لکھا کہ عورت اہلِ کتاب سے شادی نہیں کر سکتی۔ جو بھی احکام ہیں مردوں عورتوں کے لیے یکساں ہیں۔ میں نے کہا، اتنے چکروں میں جو پڑتے ہو، مسلمان ہو جاؤ اور شادی کر لو........

کہنے لگا، ''وہ الگ بات ہے مگر یہ بات صاف ہونی چاہیے۔ کتابوں میں لکھا ہے اسلام افضل ترین مذہب ہے۔ عورت کسی غیر مسلم سے شادی کرے گی تو اس کا درجہ کم ہو جائے گا۔ مرد اسے دبا لے گا لیکن سوچیے جو عورت کسی مرد کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کر سکتی ہے وہ خود مجبور کیسے ہوئی؟ وہ تو ہر حالت میں افضل ہی ہے۔ صوفی صاحب نے اسے کئی لوگوں سے ملوایا، بہت کتابیں پڑھائیں مگر وہ نہ مانا۔ کہتا تھا، سارے اسلامی ملکوں میں یہ روایت رہی ہے اسی لیے تاریخی شہادت موجود نہیں ہے لیکن مجھے کوئی اس بات پر قائل کرے۔ اب اسے قائل کون کرتا۔ یہ بھی کہتا تھا کہ کراچی میں لڑکیاں اور عورتیں حکومت کے خلاف مظاہرے کر رہی ہیں دیت اور نصف گواہی کے خلاف! کوئی عورت کو قتل کر دے تو اس کا معاوضہ مرد سے نصف ہوگا اور دو عورتوں کی گواہی ایک کے برابر ہوگی۔ کسی نے مذہب کے بارے میں کچھ پڑھا نہیں، قانون داں جو بتاتے ہیں اس کو لے دوڑتی ہیں۔ مذہب سے الگ ہو کر لڑ نہیں سکتیں، اسلامی حکومت میں سارا معاملہ ہی مذہب کا ہے۔ مردوں سے الگ نہیں ہو سکتیں کہ ان کے بغیر ایک قدم نہیں چل سکتیں۔ میں کہتا ہوں لڑنا ہے تو جم کر لڑو، اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں مارنے سے کیا ہوگا؟ مذہب سے لڑنا ہے تو اس کے بارے میں پڑھو۔ آدمی جس ہتھیار

سے لڑتا ہے اسے چلانا نہ جانے تو کیسے لڑے گا؟ ایک صاحب ملے تھے۔ عورتوں کے حق میں تھے، حدیث اور آیتیں پڑھ رہے تھے۔ میں نے اُن سے کہا، ''عورتوں کی حمایت میں مضمون لکھیے'' کہنے لگے حضرت! جیل جانے کو میں ہی رہ گیا ہوں۔ یہ تو حال ہے۔ امریکا میں عورتیں جس بات پر لڑتی ہیں اسی پر لڑتی ہیں۔ بچہ گرانے کا حق مانگتی ہیں تو مذہب کو بیچ میں نہیں لاتیں۔ کہتی ہیں عورت کو اپنے جسم پر اختیار ہونا چاہیے......''

''اے ہے یہاں کی عورت تو ایسی بات کہنے سے پہلے لاجوں مرجائے۔'' میں نے کہا، ہمارے ہاں صاف بات نہیں کرتے اس لیے کہ دل توڑنے کو برا سمجھتے ہیں۔ سنا نہیں، دل بدست آور کہ حج اکبر است..... تمھارا کیا ہے، سنا ہے، تمھارے ہاں مہمانوں سے صاف کہہ دیتے ہیں کہ ہمارے گھر میں جگہ نہیں ہوٹل میں ٹھہر جاؤ یا ہمارے کھانے کا وقت گزر چکا۔ ایسے سچ پر لعنت۔ ہمارے گھر میں ماگھ تنگی بیسا کھ بھوکی ہو تب بھی کوئی مہمان سے یہ نہیں کہنے کا......'' غرضے کہ ایسی باتیں کرتا آیا اور ایسی باتیں کرتا چلا گیا۔

کیرا ہے مگر آنکھوں میں مروّت ہے۔ خوش نہیں ہے مگر خوش باش ہے۔ اچھی باتیں کرتا ہے، اچھا لگتا ہے۔ صوفی صاحب بھی اس کی کٹھ حجتی برداشت کرتے ہیں اور اسے کچھ نہ کچھ سمجھاتے رہتے ہیں۔ اللہ اس کی دونوں خواہشیں پوری کرے اور اس کو سکھ نصیب ہو۔ ایسے لوگوں کو دیکھ کر لگتا ہے کہ ساری دنیا کے لوگ ایک جیسے ہیں۔ سب کے دکھ سکھ ساجھے ہیں۔ سب کی تکلیفیں ایک سی ہیں۔ سب پیار کے بھوکے ہیں چاہے ماں کا پیار ہو چاہے محبوبہ کا۔ پھانس چبھے تو سب کے جسم میں کھٹکتی ہے۔ زخم لگے تو درد ہوتا ہے۔ دل دکھے تو آہ نکلتی ہے۔ پھر جانے لوگ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں جیسے دوسرے ملکوں کے رہنے والے، دوسرے مذہب کو ماننے والے، دوسری زبانوں میں باتیں کرنے والے کسی اور دنیا کی مخلوق ہیں، ہماری طرح کے نہیں ہیں۔''

''آپ تو بہت اچھی باتیں کر لیتی ہیں۔'' میں نے کہا۔

مسکرائیں، شرمائیں۔ ''بنا رہی ہوں!'' انھوں نے کہا۔

''نہیں سچ مچ۔ میں تو آپ کو محض مسالے پیسنے اور ہانڈی بھوننے والی خاتون ہی سمجھتی تھی۔'' میں نے کہا۔

''دنیا دیکھی ہے۔ صوفی صاحب سے بھی بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ یوں ان کے سامنے نہ کہوں تو اور بات ہے۔'' وہ کھل کر مسکرائیں۔ ''اب چلوں، فی امان اللہ۔'' انھوں نے کہا۔

''خدا حافظ۔'' میں نے کہا۔

بصیرہ پرچھائیں کی طرح میرے ذہن کے پردے پر آتی اور گزر جاتی۔ ایسا محسوس ہوتا تھا جیسے وہ مجھ سے کترا رہی ہو۔ ان ہی دنوں آخر بہت کدو کاوش کے بعد وہ آئی۔ مجھے اندازہ تھا کہ غم کے مارے وہ ویسے بھی اپنے آپ میں نہیں ہے۔ خدا جانے کس حد تک مجھ پر کھلے گی...... مگر بات چل نکلی تھی اور میں چاہتی تھی کہ جتنی بھی چل سکے چلتی رہے۔ یوں یہ دن اور یہ راتیں میرے سارے کرداروں پر ہی بھاری گزر رہی تھیں۔

بصیرہ آتے ہی مجھ پر بگڑنے لگی، ''آپ نے سب سے زیادہ زیادتی میرے ساتھ کی ہے۔ مجھے تنہائی میں مارا سوا لگ، میری ماں کا کام تمام کیا اور میرے والد کی زندگی بھی ختم کردی۔ خدا جانے اس سے آپ کو کیا ملے گا لیکن اگر آپ مجھے طویل عمر دینے اور میری مٹی پلید کرنے کی سوچ رہی ہیں تو میں آپ کو بتادوں کہ میں آپ کے ہاتھ میں کھلونا بننے کو تیار نہیں ہوں۔ میں نے آپ سے بالا بالا ملک الموت سے معاہدہ کرلیا ہے۔ میں بہت جلد اس کے ساتھ چلی جاؤں گی۔'' اس کی انا کا یہ پہلو کہ وہ اپنی تقدیر کی خود مالک ہے، مجھے اچھا لگا۔

''تم خودکشی کا ارادہ کررہی ہو تو اور بات ہے ورنہ کوئی وجہ نہیں کہ تم طویل اور خوب صورت زندگی نہ گزار سکو۔ والدین کس کے رہتے ہیں مگر تم...... سمجھ دار، پڑھی لکھی ہو۔ جادو کی چھڑی جسے دولت کہتے ہیں تمھارے پاس ہے۔''

''دولت!...... ساری دنیا اسی کے پیچھے ہے، آپ بھی اسے جادو کی چھڑی کہہ رہی ہیں۔ اسی لیے میں ملک الموت کے ساتھ جانا چاہتی ہوں کیوں کہ ابھی تک وہی ایک شخص ملا ہے جو میری دولت کے پیچھے نہیں ہے۔''

''مگر وہ تم سے محبت بھی نہیں کرتا اور ساری عمر تمھارے ساتھ گزارنا بھی نہیں چاہتا۔ میری مانو تو اپنے والد کی خواہش کا احترام کرو۔''

''ضمیر صاحب بھی یہی کہتے ہیں مگر میں ملک سے گئی تو صرف سیر کے لیے جاؤں گی۔ آخر اتنی دولت کا مصرف کیا ہے، اگر مرنے سے پہلے آدمی دل بھر کر سیر بھی نہ کرسکے۔'' وہ بیٹھ گئی مگر اُکھڑی اُکھڑی سی۔

''شاید اس کے لیے تمھیں ملک الموت سے اجازت لینی پڑے گی۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔

''جی ہاں۔'' بصیرہ بھی پہلی مرتبہ مسکرائی۔ ''ایک مرتبہ اس نے چند دن کی مہلت دی ہے۔ اب آیا تو کچھ اور مہلت لے لوں گی۔''

''ورنہ...... اس سے چھپ کر یہاں نیا گرا فال آجانا۔'' میں نے کہا، ''بے چارہ ڈھونڈتا پھرے

گا۔ بہت خوب صورت جگہ ہے۔ یہیں وکٹوریہ ریسٹوراں میں بیٹھ کر آبشار کا نظارہ کرنا۔ گرمیوں میں یہ جگہ اور بھی حسین ہو گی۔'' میں نے سامنے دیکھتے ہوئے کہا۔ کینیڈین نیاگرافال کے اپسی نعل کا پانی مسلسل گر رہا تھا۔ ڈھائی ہزار فٹ چوڑی پانی کی اس دیوار کو غور سے دیکھو تو اس میں ایسا ارتعاش نظر آتا تھا جیسے اُون کے کھلے ہوئے بلوں میں یا گھنگریالے بالوں میں ہوتا ہے۔ سفید جھاگ اُڑتا، پھواریں برساتا پانی بغیر رکے دن رات ہر لمحے گرے جاتا تھا۔ سانس کی طرح لگاتار۔

''مجھے ملک الموت کا حال تو سناؤ۔'' میں نے کہا۔

''ابو کے سوئم کا دن تھا۔ شام کا وقت، ڈوبتے سورج کی روشنی کمرے کی کھڑکی سے آن کر دیوار پر ایک گلابی چوکھٹا سا بنا رہی تھی ورنہ کمرے میں اندھیرا تھا۔ شاید بھاری پردے تین دن سے برابر پڑے ہوئے تھے۔ تین دن نیم بے ہوشی کے عالم میں میرے ذہن میں دھندسی بھر گئی تھی۔ اب وہ چھٹی تو ابا کے انتقال کا احساس پوری شدت سے دل پر حملہ آور ہوا۔ انتہائی دکھ اور شاید انتہائی خلوص سے میں نے کہا، ''یا اللہ، کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ تو ابا کی طرح مجھے بھی اُٹھا لے۔ میں اب ایک پل بھی جینا نہیں چاہتی۔'' اپنی آواز کی رقت نے خود مجھے بھی متاثر کیا۔

یکایک میں نے کمرے میں ایک سرسراہٹ سنی۔ کسی تیسری ہستی کی موجودگی کا صاف احساس ہوا۔ پھر اس گلابی چوکھٹے کے عین نیچے سفید ریشم کے لبادے میں سر سے پیر تک لپٹا میں نے اسے دیکھا۔ سفید ریشم اور سفید اُون میری پسندیدہ چیزیں ہیں۔ بازار جاتی ہوں تو بڑی دکانوں سے سفید ریشم اور سفید اُونی لباسوں کے ڈھیر خرید لاتی ہوں پھر چاہے پہنوں نہ پہنوں۔ جس طرح وہ دکان میں سجے اچھے لگتے ہیں اسی طرح میری الماریوں میں رکھے بھی اچھے لگتے ہیں۔ بچپن میں سفید ایرانی بلیاں بھی پالی تھیں۔ امی کو بھی ان کا شوق تھا۔ گول مٹول سفید براق وہ بھی ریشم اور اُون کی ملی جلی سی لگتی تھیں۔ نرم نرم اور گرم گرم۔ امی کے بعد میں نے بلیاں پالنی چھوڑ دی تھیں کیوں کہ وہ مجھے امی کی یاد دلاتی تھیں ...... ہاں تو سفید سایہ دیکھ کر سب سے پہلا خیال تو ابا کا آیا۔ کفن میں لپٹی ان کی نعش میری نظروں میں گھومی مگر یہ کورے کھڑکھڑاتے کفن کی سفیدی نہیں ہلکے پروں کی سرسراتی سفیدی تھی۔

''امی؟'' ...... بے اختیار میرے منھ سے نکلا۔

ریشمی سائے نے نہایت دھیمی آواز میں نرمی سے کہا، ''ابھی آپ نے اپنی موت کی دُعا مانگی تھی وہ قبولیت کی گھڑی تھی۔ آئیے، چلیے ......''

مجھے یکایک پسینہ آگیا۔ تھرتھری چھوٹ گئی۔

''میں منتظر ہوں۔'' سفید سائے نے دوبارہ شفقت سے کہا۔ وہ یقیناً ملک الموت کا ایلچی تھا۔

میں مرنے کو تیار تو تھی مگر اب اتنی جلدی بھی نہیں۔ سیکڑوں باتیں، سیکڑوں کام یاد آنے لگے، مثلاً اب یہ اتنی بڑی جائیداد، اس کا تو کچھ فیصلہ کر کے جاؤں۔

''جی...... وہ ملک الموت سے میرا سلام کہیے گا.....اور کہیے گا کہ..... میں ہکلانے لگی۔ آواز ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ لگتا تھا کہ ابھی سانس اُکھڑ جائے گا۔''

''مجھ سے کہا گیا تھا کہ کوئی ضروری کام ہو تو میں اس وقت تک توقف کروں......'' سائے نے کہا۔

کچھ جان میں جان آئی۔ ''آج ہی ابا کا انتقال ہوا ہے......نہیں میرا مطلب ہے ابھی دو تین دن ہوئے اُن سے کہیے گا......''

''میں خود ملک الموت ہوں۔'' سرسراتے ریشمی سائے سے آواز آئی۔

''اوہ آپ!......'' میں اور گھگیائی مگر دل ہی دل میں حیرت بھی کر رہی تھی کہ احمق لوگ ملک الموت کا کیسا ڈراونا نقشہ کھینچتے ہیں۔ یکایک خیال آیا، موت کا فرشتہ ہر شخص کے پسندیدہ حلیے میں آتا ہوگا تا کہ وہ آسانی سے ساتھ جانے پر آمادہ ہو جائے۔

''گھبرایئے نہیں۔'' سائے نے کہا، ''دُعا آپ نے مانگی تھی، آپ کی دُعا قبول ہوئی۔ چند دن تک آپ ذہنی طور پر تیار ہو جایئے، پھر آ جاؤں گا۔'' یکایک وہ غائب ہو گیا۔ اب دیوار پر گلابی روشنی کا چوکھٹا بہت ہی ہلکا سا رہ گیا تھا اور بہت عجیب سا لگ رہا تھا۔ میں پورے ہوش و حواس میں تھی۔ پہلے سوچا ناز یا ثمن کو بلا کر بتاؤں پھر خیال آیا وہ ہرگز ہرگز میرا یقین نہیں کریں گی نہ مجھے اس سلسلے میں کچھ کام کرنے دیں گی۔ کم از کم جائیداد کا فیصلہ تو کرنا ہی ہوگا مگر اس سلسلے میں مدد کس سے لوں؟ اپنے کنوینٹ کالج کی مدر سپیریر یاد آئی جس نے گریجویشن کی تقریر میں کہا تھا کہ عملی زندگی میں کوئی مشکل آ پڑے تو لڑکیاں ان سے مدد لینے آ سکتی ہیں۔ لیکن فوراً ہی مجھے یاد آیا کہ زندگی میں ان کا ایک مشن ہے۔ وہ تو یہی چاہیں گی کہ سارا روپیا پیسا ان کے ادارے کو دے جاؤں اور چلتے چلتے کہیں عیسائی بنا لیا تو عاقبت بھی خراب ہوگی۔'' وہ ہنسی۔

''گویا تمھیں دنیا میں کسی پر اعتبار نہیں؟'' میں نے کہا۔

''جب ابا کو ہی نہیں تھا تو مجھے کیسے ہو سکتا ہے! ابا کو امی پر اور امی کو ابا پر اعتبار نہیں تھا۔ میں نے تو یہی جانا ہے کہ ہر شخص ناقابلِ اعتبار ہے جب تک کہ وہ خود کو معتبر ثابت نہ کر دے۔''

''موقع نہ ملے تو کوئی کیسے ثابت کر سکتا ہے.....اور پھر کسی کو کیا پڑی ہے کہ تمھاری نظروں میں خود کو قابلِ اعتماد ثابت کرتا پھرے!'' میں نے کہا۔

''ایسے لوگ ہیں جو کوشش کرتے ہیں بلاوجہ یا کسی غرض سے یہ میں نہیں جانتی مگر مجھے یہی سکھایا

گیا ہے کہ کسی کو بے غرض نہ سمجھوں۔''

''پھر تم نے کیا کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''ٹھہریے......'' بصیرہ نے کہا۔''میں ناز اور سمن کی دوستی پر شک نہیں کرتی۔ وہ بے غرض ہے یا غرض ہے تو ہم تینوں کو کہ ہمیں اپنے مطلب کے دوست کم ملے مگر ایسے گمبھیر مسئلوں پر ان کی رائے کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ ناز عمر میں ہم دونوں سے تھوڑی بڑی تھی مگر وہ بے چاری ماں بننے والی تھی اور ہر وقت تھکی تھکی سی نظر آتی تھی اس لیے میں نے اسے اپنے راز میں شریک کرنا بھی مناسب نہیں سمجھا۔ ابا صرف ضمیر صاحب پر اعتماد کرتے تھے۔ چناں چہ میں نے بھی اُن سے ہی رائے لینے کا سوچا۔ یہاں تنہائی میں اُن سے بات نہیں ہو سکتی تھی۔ کسی طرح اُن کے گھر جایا جائے مگر باہر کیسے نکلا جائے؟ خود کار لے کر نکلنا یا ڈرائیور سے کہنا ناممکن ہوگا۔ تین دن سے بے ہوش پڑی تھیں اب ایک دم کہاں جانے کی ذھن سوار ہوئی! ابا کی قبر پر جانے کی بات کی تو کوئی نہ کوئی ساتھ لٹک لے گا۔ پہلے جیسی گہما گہمی نہیں تھی مگر گھر، ہم درد لوگوں سے خالی نہیں ہوا تھا۔ صدر دروازے پر چوکیدار ہوگا۔ خیر اس سے ضروری کام کا بہانہ کر کے نکلا جا سکتا ہے۔ وہ یوں بھی احمق سا ہے مگر وہاں تک پہنچوں کیسے اور اندھیرا ہونے کا انتظار کروں تو رات بڑھتی جائے گی۔ خیر واپسی میں تو ضمیر صاحب ساتھ آ سکتے ہیں۔ بات صرف وہاں تک پہنچنے کی ہے۔ میں خاموشی سے اسٹڈی میں آئی تا کہ باہر جھانک کر صدر دروازے تک جانے کے امکان پر غور کر سکوں۔ اسٹڈی میں کئی دن کی ڈاک دکھائی دی۔ باہر روشنی کی کچھ رمق باقی تھی۔ ایک کوا باورچی خانے کی طرف کے درخت پر بیٹھا نہایت بھدی آواز میں بول رہا تھا جیسے کسی ساز کا تار ڈھیلا پڑ گیا ہو۔ شکر ہے کہ آج اس وقت سمن اور ناز دونوں نہیں تھیں۔

خیال آیا کہ چند دن کی زندگی باقی ہو تو ڈاک دیکھنی بے کار ہے۔ ذہن نے مشورہ دیا کہ دیکھ ڈالو شاید کوئی ضروری خط ہو۔ چناں چہ جلدی جلدی ڈاک دیکھنی شروع کی۔ تعزیتی تار، تعزیتی کارڈوں اور خطوط کا ڈھیر تھا۔ صرف دو لفافے توجہ کے قابل تھے۔ ایک میں سے ایک پرانی ہم جماعت کی شادی کا کارڈ نکلا۔ شادی میں ابھی خاصے دن تھے یعنی شادی میری موت کے بعد ہونا قرار پائی تھی۔ اس کارڈ کو ایک طرف ڈالا۔ دوسرے خط کے لفافے کی تحریر بھی انجانی تھی اور اندر سے خط بھی تماشا نکلا لکھا تھا۔

''یاد ہے تمھیں میں کون ہوں؟..... کسی دن، کسی بھی دن۔ غیر متوقع طور پر تم سے ملنے آن پہنچوں گا اور دیکھوں گا کہ تم مجھے پہچانتی ہو یا نہیں!'' .... یہ تھی کل عبارت۔ نہ نام نہ پتا۔ لمحہ بھر سوچا کہ کون ہو سکتا ہے مگر سمجھ میں نہ آیا۔ تحریر بھی جانی پہچانی نہیں تھی۔ انداز بھی شناسا نہ تھا۔ ہوگا کوئی احمق..... دل

نے کہا۔ ہم مرنے والے ہیں جناب کو مذاق سوجھ رہا ہے۔ کسی دن، کسی بھی دن۔ یہ کوئی بات ہوئی! نہ دن نہ تاریخ۔ ہفتے، دو ہفتے، مہینے، دو مہینے آخر کچھ تو لکھنا چاہیے تھا۔ اس لفافے پر تاریخ دیکھی۔ خط کو آئے ہوئے بھی دو چار دن گزر چکے تھے۔ بہرحال میرے پاس فقط چند روز تھے اور ان قیمتی دنوں میں ایسے بے تکے لوگوں سے ملنے کا کوئی اشتیاق نہیں تھا جن کو خط تک لکھنے کی تمیز نہیں تھی۔ خط وہیں پھینکے۔ اب کیا کیا جائے..... ایک دفعہ اور سوچا۔ بیڈ روم تو اندر سے بند ہی ہے۔ اسٹڈی میں باہر سے تالا لگا کر نکل جاتی ہوں۔ لوگ یہی سمجھیں گے اندر سے بند ہے۔ ناز کے نام ایک پرچہ لکھ جاتی ہوں تاکہ وہ شور نہ مچا دے۔ سوچنے کی حد تک تو بات ٹھیک تھی، بس عمل کرنے کی دیر تھی۔

میں نے بسم اللہ پڑھ کر اسٹڈی کے دروازے پر ہاتھ رکھا۔ غیر ارادی طور پر دیوار پر لگے ہوئے آرائشی آئینے پر نظر پڑ گئی۔ یا اللہ یہ کون؟ اپنی ہی صورت سے میں ڈر گئی۔ سنہری فریم کے وکٹورین آئینے میں اپنا چہرہ کسی بھوت کے پورٹریٹ کی طرح دکھائی دیا۔ بکھرے ہوئے بال، سوجا ہوا چہرہ۔ تقریباً بند آنکھیں..... قمیص پر ان گنت شکنیں، کالر مڑا ہوا، شلوار جیسی برسوں پرانے گھڑے سے نکالی گئی ہو۔ اس حلیے میں تو میں آج تک باہر نہیں گئی تھی مگر اب حلیہ درست کرنے کا وقت تھا نہ دماغ۔ البتہ پرس تو لینا چاہیے شاید ٹیکسی لینی پڑے۔ پرس لے کر بالوں کو ہاتھ سے سنوارتی چوری چھپے نکلی ہی تھی کہ سامنے سے سمن آتی دکھائی دی۔

''کہاں جا رہی ہو؟'' وہ اس طرح مجھے باہر نکلتے دیکھ کر پریشان ہو گئی۔

''تم بہت اچھے وقت پر آئی ہو۔ ذرا میرے ساتھ ضمیر صاحب کے گھر تک چلو بہت ضروری کام ہے۔'' میں نے کہا۔

''کیا کام ہے؟'' اُس نے کہا، ''ذرا سانس تو لینے دو۔ تم نے فون پر ان سے بات کی؟''

''سانس لینے کا وقت نہیں ہے..... اور وہ بات فون پر نہیں کی جا سکتی۔'' میں نے کہا، ''پلیز سمن آؤ۔''

''فرض کرو ضمیر صاحب گھر پر ہی نہ ہوں۔ کم از کم یہ تو معلوم کر لیا جائے کہ وہ گھر پر ہیں یا نہیں۔'' وہ میرا ہاتھ پکڑ کر اندر لائی۔ دیکھو اس حلیے میں تمہارے ساتھ میں نہیں جا سکتی۔ تم منہ ہاتھ دھو کر یا غسل کر کے کپڑے تبدیل کرو اور میں ضمیر صاحب کو فون کرتی ہوں، مجھے ضمیر صاحب کا نمبر دو۔''

''نمبر!..... فون کے نزدیک ڈائری میں لکھا ہوا ہے۔'' میں نے کہا، ''ضمیر صاحب کے نام کے آگے۔''

''چلو مل گیا۔ جاؤ تم اچھی بچی کی طرح تیار ہو جاؤ'' اس نے کہا۔ وہ واقعی مجھے چھوٹی بچی سمجھ کر بات کر رہی تھی۔ مجھے اچھا تو نہ لگا لیکن اس وقت اس کی بات مان لینے ہی میں مصلحت تھی۔

میں غسل کرکے باہر آئی تو اس نے مجھے بستر پر بٹھا دیا۔ خود میرے بال بناتے ہوئے بولی، ''ضمیر صاحب یہاں آنے کے لیے نکل ہی رہے تھے۔ اب تک دونوں نکل بھی چکے ہوں گے۔''

''دونوں، کون دونوں؟'' میں نے کہا۔

''ضمیر صاحب اور زمان۔'' سمن نے کہا۔

''زمان!'' چند لمحے کے لیے بالکل سمجھ میں نہ آیا کہ یہ کس کا نام ہے۔ یوں لگا جیسے قدیم اساطیر یا پرانی داستانوں میں سے کبھی کا سنا سنایا کوئی نام ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اس نام سے متعلق شخصیت کا ہیولہ میری آنکھوں کے سامنے بنا اور میں نے دہشت سے سمن کا دوپٹہ جکڑ لیا۔ ''بات سنو، میں زمان کے سامنے آنا نہیں چاہتی۔ تم اسے کہیں اور بٹھا کر اس سے باتیں کرنا، ضمیر صاحب کو میرے پاس بھیج دینا۔ مجھے جو بات اُن سے کرنی ہے وہ زمان کے سامنے نہیں ہو سکتی۔''

''یہ زمان کون ہے؟'' سمن نے پوچھا، ''اس سے پہلے یہ نام میں نے کبھی نہیں سنا۔''

''ضروری نہیں کہ ہر نام تمھارا سنا ہوا ہو۔'' میں نے جھلا کر کہا، ''بس وہ میرے سامنے نہ آئے۔''

''دیکھیے جناب! اگر آپ اس طرح مجھ سے بات کریں گی تو میں ایک لحہ بھی نہیں ٹھہروں گی۔ میں جانتی ہوں کہ تم پر غم کا بوجھ ہے۔ تم اپنے آپ میں نہیں ہو پھر بھی میں یہ لہجہ برداشت نہیں کر سکتی۔'' سمن نے مجھے ڈانٹا۔

''سمن پلیز...... آئی ایم سوری! میں بالکل ٹھیک ہوں، ذرا بس......''

''تم ٹھیک ویک نہیں ہو۔ فوراً بستر میں گھس جاؤ، چلو۔'' اس نے مجھے تکیے سے ٹیک لگا کر بٹھا دیا۔ چادر میرے پیروں پر ڈال دی اور کہا، ''ہاں یوں ہی بیٹھی رہو گی تو میں ضمیر صاحب کو تمھارے پاس بھیج دوں گی اور زمان یا جو کچھ بھی اس کا نام ہے اس کو کہیں اور پھنسا دوں گی لیکن اگر تم اُٹھیں یا اِدھر اُدھر جانے کی کوشش کی تو میرا تمھارا معاہدہ ختم!''

ذرا دیر بعد ضمیر صاحب میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ اُن کو میں چچا کہتی ہوں۔ وہ میری مسہری کے برابر میں کرسی پر بیٹھ گئے اور شفقت سے میری طبیعت کا حال پوچھا۔ میں نے فوراً ملک الموت سے مڈبھیڑ کا واقعہ سنایا اور یہ بھی بتایا کہ اس سے چند دن کی مہلت ملی ہے۔ وہ دھیرے سے ہنسے۔

''کوئی اور وقت ہوتا تو میں یہ لطیفہ سب کو سناتا اور خوب ہنستا۔'' وہ بولے، ''تم بھی اس بات کو لطیفے سے زیادہ نہ سمجھنا اور کسی قسم کا وہم دل میں نہ لانا۔ ایسا ہوتا ہے بیٹی۔ انتہائی غم اور ہیجان میں تمھیں مسلسل سلانے کی کوشش کی جا رہی تھی۔ اسی کش مکش میں تمھارے ذہن نے کوئی ہیولہ تراش لیا۔''

''نہیں نہیں چچا......'' میں نے اُنھیں یقین دلایا، ''میں نے اُسے کھلی آنکھوں سے بالکل اسی

طرح دیکھا ہے جیسے آپ کو دیکھ رہی ہوں۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں ہے۔ نہ میں ضعیف الاعتقاد ہوں نہ اس قسم کے تجربوں سے پہلے کبھی گزری ہوں لیکن خواب اور حقیقت کا فرق سمجھ سکتی ہوں۔ آپ نہ مانیے لیکن بہت جلد شاید آپ بھی مان لیں گے۔''

''لاؤ، مجھے اپنا ہاتھ دکھاؤ ابھی بتاتا ہوں۔'' وہ مجھے بہلانے کی کوشش کرتے رہے۔ میں نے اپنی ہتھیلیاں اُن کے آگے کر دیں۔ وہ غور سے دیکھتے ہوئے یوں ہوں ہوں کرتے رہے جیسے باقاعدہ پڑھ اور سمجھ رہے ہوں۔ ''تمھاری عمر تو بہت لمبی ہے بھئی..... یہ دیکھو، عمر کی لکیر کہاں سے کہاں نکلی جا رہی ہے۔ یہ دیکھو، یہ تو ہاتھ سے نکل کر آگے جانے کی فکر میں ہے۔ ہاں یہ جو ذرا سا موڑ ہے یہ بس تمھارے آپریشن کا ہے۔''

''یہ موڑ نہیں ہے چچا، توڑ ہے۔ صاف ٹوٹی ہوئی ہے لائن۔'' میں نے کہا۔

''کوئی بھی نہیں، ہلکا سا نشتر کا نشان ہے اور بس۔ اس کے بعد ایک عدد شریف آدمی، تمھارا اپنا گھر اور بچے..... راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔''

''چچا آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔ میں نہیں مری تو کیا میں ساری عمر بغیر ابا کے دنیا میں رہوں گی۔ بالکل تنہا، بے سہارا..... بے آسرا.....'' تازے غم کا ایک کٹیلا نشتر دل کو چیرتا ہوا گزرا اور آنسوؤں کا ریلا میری آنکھوں سے بہہ نکلا۔ ضمیر صاحب نے ازسرِ نو مجھے بہلانا شروع کیا۔

''بری باتیں نہیں سوچتے۔ جو ہونا تھا ہو چکا، ماں باپ کسی کے سدا نہیں رہتے۔ یہ قانونِ فطرت ہے۔ خدا کا قانون ہے وہ ماں باپ کی محبت خود بخود بچوں میں منتقل کر دیتا ہے۔ امریکا جانے کا سارا پروگرام اسرار صاحب بنا کر گئے تھے۔ ہمیں صرف تاریخوں میں تبدیلی کرنی ہے۔ ان کا وہاں فلیٹوں کا ایک کمپلیکس ہے جس میں ایک فلیٹ ہمیشہ خالی رہتا تھا، تم وہاں ٹھہرنا۔ ممکن ہوا تو میں بھی چلا چلوں گا، آپریشن تک رہوں گا پھر واپس آ جاؤں گا۔ تم کوئی میڈ رکھ لینا۔ وہاں کا پیسہ برسوں سے اسی کام کے لیے جمع ہو رہا ہے۔ ٹھیک ہو جاؤ تو امریکا کی سیر و یر کر کے لوٹ آنا۔''

''میرے مرنے کے بعد یہ پیسہ اور جائیداد کس کو ملے گی؟'' میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''پاگل پن کی باتیں مت کرو۔'' انھوں نے ذرا سختی سے کہا، ''دیکھو زمان پُرسے کے لیے آیا ہے۔ دو منٹ کے لیے اس سے مل لو۔''

''جی بہتر۔'' میں نے فرمانبرداری سے کہا۔ ''صرف دو منٹ۔''

ضمیر صاحب کے جانے کے بعد زمان اندر آیا اور السلام علیکم کہہ کر اُسی کرسی پر بیٹھ گیا جس پر سے ضمیر صاحب اُٹھ کر گئے تھے۔ اس کے اندر آن کر کرسی پر بیٹھنے تک میں نے اندازہ لگا لیا کہ اس

کی شخصیت میں بڑا رکھ رکھاؤ آ گیا ہے۔ پُرسے کے موقعے پر اس کے کپڑوں کی بے عیبی اور بے شکنی مجھے اچھی نہ لگی مگر کسی ایسے شخص سے جسے زندگی میں صرف اپنی زندگی بنانے کی دھن ہو، آپ اور کیا توقع کر سکتے ہیں! محرومیوں کا شکار میں بھی رہی ہوں، کڑواہٹیں مجھ میں بھی ہیں لیکن اس میں کچھ زیادہ ہی ہیں۔ وہ مجھ سے محبت کا دعویٰ کرتا تھا لیکن جب بھی موقع ملے اپنی کیٹلی باتوں سے میرا کلیجہ نوچنے سے باز نہیں آتا تھا۔

''تم اللہ میاں کی پالتو ہو......'' وہ کہا کرتا تھا، ''جس طرح انسان کسی جانور کو اس کے قبیلے سے الگ کر لیتا ہے اور پال لیتا ہے۔ اچھا کھلا پلا کر خوش ہوتا ہے۔ بلی کو چاندی کے برتن میں دودھ ملے یا کتے کے گلے میں ہیرے کا پٹا پڑا ہو، اُن سے ان بے چاروں کو احساسِ برتری نہیں ہوتا۔ ہم سب اس کے ہاتھوں میں کھلونا ہیں...... تم ذرا قیمتی کھلونا ہو اور بس۔''

سلام کے بعد اس نے کہا۔

''مجھے بہت افسوس ہے کہ اتنے عرصے بعد ہماری ملاقات ہوئی بھی تو ایسے موقعے پر۔ میں تو تمھیں ایک خوشگوار حیرت میں ڈالنا چاہتا تھا۔''

مجھے القاب و نام کے بغیر لکھا وہ خط یاد آیا۔ کسی دن...... کسی بھی دن تم سے ملنے آ پہنچوں گا۔

''تمھارا خط آج، ابھی میں نے دیکھا۔'' میں نے کہا۔

''چھوڑو، اب سوچ کر بھی شرمندہ ہوتا ہوں۔ وہ خط ایسے ماحول کے لیے نہیں تھا۔''

''اچھا بات سنو۔'' میں نے کہا۔ ''تم سمن سے ملے؟ بہت اچھی لڑکی ہے۔ تم نے انگلینڈ جانے سے پہلے کہا تھا واپس آ کر تم جلد شادی کرنا چاہو گے۔ سمن میری بہت اچھی دوست ہے، امریکن اسکول میں پڑھاتی ہے۔''

''کیسی باتیں کر رہی ہو تم؟ یہ وقت ایسی باتوں کا ہے! زمان نے حیران ہو کر مجھے دیکھا۔

''مجھے معلوم ہے یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں ہے مگر میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔''

''ہاں۔ مجھے معلوم ہے تم امریکا جا رہی ہو مگر میں انتظار کر سکتا ہوں۔''

''تمھیں معلوم ہے، مجھے تمھاری ذات میں اس قسم کی کوئی دلچسپی نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

''اور مجھے اسکول ماسٹرنیوں سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ معاف کرنا، بات تم نے شروع کی تھی، میں نے نہیں۔''

''اچھا...... تو آپ کو بصیراؤں سے یا اللہ میاں کی پالتو لڑکیوں سے دلچسپی ہے۔'' حسبِ معمول مجھے غصہ آ گیا۔ ''میرا خیال تھا تمھیں گھر بسانے کے لیے کسی پڑھی لکھی اوسط لڑکی کی ضرورت ہوگی۔''

''تمھیں معلوم ہے میں نے زندگی میں خاصے مشکل دن دیکھے ہیں۔ اگر میں تھوڑی سی فراغت کی تمنا کروں تو کیا برائی ہے؟ آخر بصیرا ئیں بھی تو کسی نہ کسی سے شادیاں کرتی ہی ہوں گی۔''

''یہ امکان بھی تو ہے کہ بصیرہ سے شادی کرنے والا اس سے بھی زیادہ برے دن دیکھے۔ تمھیں تو معلوم ہوگا کہ دولت مند اکلوتی لڑکیاں بے حد spoiled ہوتی ہیں۔ ان کے نخرے کروڑ پتی باپ بھی مشکل سے اُٹھا سکتا ہے۔''

''مجھے ڈرانے کے لیے کہہ رہی ہو؟'' زمان نے کرسی ذرا سی پیچھے کھسکائی اور ہاتھ گردن کے پیچھے باندھ کر میری طرف دیکھا۔

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ جو لڑکی سدا کسی کی توہین کرتی رہے اس کی محبت کا جذبہ دل میں کیسے پیدا ہوسکتا ہے، نفرت یا انتقام کا جذبہ ہوتا تو میں سمجھ لیتی۔'' میں نے کہا۔

''تم محبت کے بارے میں کیا جانتی ہو؟'' زمان نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''بہت زیادہ تو نہیں مگر میرا نظریہ ہے کہ آپ کو محبت صرف اپنے آپ سے ہوئی ہے۔ جو شخص اس محبت کو مضبوط کرتا ہے آپ کی قدر خود آپ کی نظروں میں بڑھاتا ہے آپ اس سے محبت کرسکتے ہیں، اس وقت تک کے لیے جب تک وہ یہ کھیل کھیل سکے۔''

''اگر ایسا ہی ہے تو تمھارے بارے میں میرا اصرار تمھیں کیوں پسند نہیں ہے۔ وہ تمھاری خود سے محبت کو کیوں جھنڈے پر نہیں چڑھاتا اس لیے کہ تمھارے نزدیک میں اتنا حقیر رہا ہوں کہ جس کی تعریف اور برائی کوئی حقیقت نہیں رکھتی۔ اسرار صاحب مجھے اپنا بیٹا بنانا چاہتے تھے مگر تم سونا پڑی جُھول کے گدھے کو بھائی کہہ سکتی تھیں مگر مجھے نہیں۔''

''اس بات کا دولت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔'' میں نے بگڑ کر کہا، ''جس طرح تمھارے بچپن کے احساسِ محرومی تھے، میرے بھی تھے۔ مرحوم بھائی کی یاد تازہ تھی۔ میں اس کی جگہ کسی کو دینا نہیں چاہتی تھی۔''

''بہر حال...... وہ وقت تو بہت پیچھے رہ گیا۔ میں چند دن میں اپنی نئی ملازمت پر چلا جاؤں گا۔ ممکن ہو تو آخری بار میری درخواست پر غور کر لینا۔'' زمان نے کہا۔ اس کے بعد وہ خاموش ہوگیا۔ میں بھی چپ رہی۔ ذرا دیر بعد دوسرے کمرے سے ضمیر صاحب نے آواز دی۔ زمان خدا حافظ کہہ کر چلا گیا۔

دونوں کو رخصت کر کے ثمن میرے کمرے میں آئی۔ اس نے زمان کے بارے میں پھر کچھ نہیں پوچھا۔ شاید وہ چاہتی تھی کہ میں خود بتاؤں مگر میں نے بھی کچھ نہ بتایا۔ میں نے ثمن سے کہا کہ وہ چاہے تو ڈرائیور سے کہہ کر گاڑی میں گھر چلی جائے، اس کی امی اکیلی ہیں۔ مجھے تو بہر حال اب ساری

عمر تنہا رہنا ہے مگر وہ راضی نہ ہوئی۔ وہ یہی کہتی رہی کہ میری طبیعت ابھی ٹھیک نہیں ہے اور اس حال میں وہ مجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتی۔ وہ مجھے طرح طرح سے بہلاتی رہی۔

کوئی گیارہ بجے کے قریب سمن اور میں شب خوابی کا لباس پہن کر سونے کے لیے لیٹیں۔ جلد ہی سمن گہری نیند سوگئی۔ مجھے ابھی غنودگی بھی نہیں آئی تھی کہ کسی نے باہر کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ ملازمہ لڑکی نے اُٹھ کر دروازہ کھولا۔ میں دیکھنے اُٹھی کہ بے وقت کون آیا ہے اور یکایک میرے منھ سے چیخ نکلی......سفید سرسراتے لبادے میں وہاں ملک الموت کھڑا تھا۔ لمحے بھر میں خوف سے جان نکلنے کو تھی کہ موت کا فرشتہ میرے گلے لگ کر پھسر پھسر رونے لگا۔

وہ ناز تھی۔ ابھی ابھی کینیڈا سے فون پر اُسے اطلاع ملی تھی کہ اُس کے شوہر کی کار کا حادثہ ہوگیا ہے اور وہ شدید زخمی ہوئے ہیں۔ وہ بچے کی پیدائش تک کے لیے یہاں رہنے آئی تھی مگر حادثے کی خبر سن کر فوری طور پر واپس جارہی تھی۔ اپنے نائٹ گاؤن پر سفید چادر اوڑھ کر وہ یہ بات بتانے اور خدا حافظ کہنے آئی تھی۔ سلیم، اس کا دیور دروازے کے باہر کھڑا تھا۔

''تو تم سے یہ آخری ملاقات ہے۔'' میں نے اُس سے گلے ملتے ہوئے کہا۔

''ارے، پاگل ہوئی ہو۔ بری بات منھ سے نہ نکالو۔ امریکا آؤ تو میرے پاس ضرور آنا۔''

ایک دفعہ وہ پھر گلے ملی اور میری پیشانی پر بوسہ دیا۔ اتنی دیر میں سمن بھی اُٹھ کر آچکی تھی۔ ناز نے سارا واقعہ اسے سنایا۔

''سوچ رہی ہوں، جہاز میں دو سیٹیں مل جائیں تو سلیم کو ساتھ لے جاؤں۔ خدا جانے وہ کس حال میں ہوں گے۔'' اس بات کا کسی نے کوئی جواب نہ دیا۔ سمن سے گلے مل کر اور ہم دونوں کو خدا حافظ کہہ کر وہ سلیم کے ساتھ واپس چلی گئی۔

''مجھے ایسے لوگوں پر رشک آتا ہے جو مزے سے ساری دنیا میں گھومتے پھرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''رشک نہ کرو، رحم کھاؤ۔ جو لوگ کسی مجبوری سے گھر سے نکل کھڑے ہوتے ہیں وہ پھر ایک جگہ ٹکتے نہیں۔ پاؤں کا چکر اُن کی تقدیر بن جاتا ہے۔'' سمن واپس آکر دیوان پر بیٹھ گئی۔ ''سنو ہمارے آباؤ اجداد ایران توران کہیں سے آئے تھے۔ ہندوستان میں آباد ہوئے۔ ہندوستان سے ۴۷ء میں ہجرت کی۔ پھر ملازمت کے سلسلے میں پھرتے رہے۔ اب قدم کہیں ٹکتے نہیں اُکھڑے اُکھڑے رہتے ہیں۔ نئی جگہ جانے میں پریشانیاں ہوتی ہیں لیکن سند باد جہازی کی طرح ایک جگہ بیٹھنا مشکل ہوگیا ہے۔ ہمارے بزرگوں کی بعض پہنچے ہوئے صوفیوں تک نہ صرف رسائی تھی بلکہ اچھی خاصی دوستی تھی۔ ہمیشہ حیرت زدہ رہے کہ ان دوستوں نے جو کچھ ان کے پاس تھا اس میں کچھ انھیں نہ دیا۔ پھر خود ہی

کہتے تھے، شاید انھوں نے پرکھ لیا تھا کہ قلندری تو ہے مگر جماؤ اور یکسوئی جو چاہیے وہ نہیں ہے۔''

''تم کیا کہہ رہی ہو، میرے پلّے نہیں پڑ رہا۔'' میں نے کہا۔

''ارے بھئی تمھیں ایک تاریخی حقیقت بتاتی ہوں۔ اکبری عہد میں چتوڑ شہر پر حملہ ہوا۔ چتوڑ گڑھ کا قلعہ ہندوستان میں بہت مشہور تھا۔ ہماری امی نے اس کے آثار بھی دیکھے ہیں۔ وہاں کے چور دروازے سے راجپوتوں کا ایک قبیلہ نکل بھاگا اور قسم کھائی کہ فاتح بن کر اس شہر میں دوبارہ آئیں گے۔ تب تک نہ چھت کے نیچے رہیں گے نہ پلنگ پر سوئیں گے۔ چناں چہ راجپوتوں سے لوہار بن گئے۔ صدیوں تک خانہ بدوشی کی زندگی گزارتے رہے اور بیل گاڑیوں کے سائے میں سوتے جاتے..... شادیاں کرتے اور بچے پالتے رہے۔ آخر کانگریس حکومت کو رحم آیا۔ چار صدیوں بعد ان لوگوں کو دوبارہ وطن جانے کا موقع دیا۔ مفت زمینیں دیں کہ کھیتی باڑی کرو اور گھر بناؤ۔ یہ لوگ گئے، گھر بنائے، کھیتی باڑی کے لیے ہاتھ پاؤں مارے، مگر نہ تجربہ تھا نہ سلیقہ۔ دھونکنی اور اہرن کے عادی تھے۔ کھلی فضاؤں کی تکلیفیں اور گندگیاں برداشت تھیں مگر بند کمروں میں نہ رہ سکے۔ بیوی بچوں کو لے کر پھر نکل گئے۔ سو بی بی! ہم سب مجبور ہیں۔ شاید ڈی این اے کے پیٹرن ہماری زندگی بناتے ہیں یا لوحِ تقدیر میں جو پہلے سے لکھا گیا۔ بچپن سے امی سے یہی تقدیر کی بات سنتی آ رہی ہوں۔''

''اچھا اب سو جاؤ، تم باتیں بہت کرنی لگی ہو۔'' میں نے اُس سے کہا۔

''جو حکم۔'' اس نے کہا اور کروٹ بدل کر وہ گئی۔

''تمھیں زمان کے بارے میں کیا کچھ معلوم ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت کچھ! ایک مرتبہ صوفی صاحب کی بیگم میرے گھر آئی تھیں اور بہت دیر تک دنیا کی اونچ نیچ سمجھاتی رہی تھیں۔ انھوں نے بتایا کہ تمھارے ابو ایک زمانے میں خاصے رنگین مزاج تھے۔ خوب صورت عورتیں اُن کی کمزوری تھیں۔ وہ تو ہر پھول کی طرف لپکتے تھے۔ جو مضبوط قوتِ ارادی یا کردار کی ہوتی تھیں وہ عورتیں بچ جاتی تھیں باقی ان کا شکار ہو جاتی تھیں۔ ان کے خانساماں کی بیوی یقیناً شکار ہوئی ہوگی کہ وہ کم سن اور ناتجربہ کار تو تھی ہی، خود اس کا شوہر اسے بڑھاوا دیتا تھا۔ بیگم صوفی کا خیال تھا کہ وہ لڑکی پہلے سے ماں بننے والی تھی۔ والد نے اسے چچا کے حوالے کیا تھا کہ اُسے ٹھکانے لگا دے یا خود اُس نے یہ پیش کش کی تھی کیوں کہ مجرم وہ خود تھا اس لیے بھتیجی کو لے کر رفو چکر ہو گیا اور دربدر کی خاک چھاننے لگا۔ پیدائشی پوتی تھا، پولیس کا خوف بھی تھا اس لیے کہیں جم کر رہ نہیں سکتا تھا۔ اس صورت میں بچے کی پیدائش کا خرچ اور پالنے پوسنے کی ذمہ داری اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس کے گناہ آلود ذہن نے یہ بات نکالی کہ بچے کو کسی اور کے سر منڈھا جائے۔ اس کے لیے بقول ان کے

اسرار صاحب کے گھر زمین پوری طرح تیار تھی۔ بیگم صوفی نے کہا، کچھ تو تھا جو اسرار صاحب ساری عمر زمان کی بہتری کے لیے کوشاں رہے۔ ایک زمانے میں انھوں نے اسے متبنیٰ بنانے کی کوشش بھی کی اور یہ بھی ممکن ہے کہ اس بات کا شبہ اُنھیں بھی ہو جو بیگم صوفی کو تھا۔ بہر حال انھوں نے مجھے خبردار کیا کہ ''زمان اسرار صاحب کا بیٹا ہے تو تمھارا بھائی ہے اور شاہ نواز کا بیٹا ہے تو چچا بھتیجی کی اولاد ہے۔ یاد رکھنا یہ خبیث لتیں خون میں سفر کرتی ہیں۔ اسرار صاحب نے بعد میں توبہ کر لی اور نیک بن گئے مگر بعد کی نیکیاں پہلے کی برائیوں کو میٹ تو نہیں دیتیں۔ زمان تو جیتا جاگتا انسان ہے۔ اس کے کچھ ارادے ہوں گے، کچھ تمنائیں ہوں گی، وہ شادی بھی کرے گا اس سے نسل بھی چلے گی لیکن جانتے بوجھتے تمھارا کسی طرح بھی اس کو خود سے قریب ہونے دینا مناسب نہیں ہے۔ اس عمر میں تمھیں یہ باتیں بتانا شاید مناسب نہیں تھیں لیکن نہ بتاتی تو میرا ضمیر کبھی مجھے معاف نہ کرتا۔'' آخر میں انھوں نے کہا۔

میں نے بیگم صوفی کے کہنے پر عمل کیا۔ بھائی بنانے کے لیے تو میں واقعی اس لیے تیار نہیں تھی کہ مجھے معلوم تھا وہ میرا بھائی نہیں ہے مگر بعد میں کسی طرح میں نے اس کی ذرہ بھر بھی حوصلہ افزائی نہیں کی، دوستی کی حد تک بھی نہیں۔ شاید میری اس بے اعتنائی کی وجہ سے اسے ضد ہوگئی کہ وہ مجھ سے شادی کرے یا وہ سچ مچ مجھ سے محبت کرتا ہے، مجھے معلوم نہیں۔ شاید زمان کو شک ہے کہ وہ ناجائز اولاد ہے حالاں کہ اسے یہی بتایا گیا ہے کہ ماں کے مرنے کے بعد باپ اس کی پیدائش کا بوجھ نہ اُٹھانے کی وجہ سے اس بات پر تیار ہوا تھا کہ کوئی اس بچے کو گود لے لے مگر اسے یہ شبہ نہیں ہے کہ وہ incest کی اولاد ہے یا ابو کا بیٹا ہو سکتا ہے کیوں کہ جب ہم بڑے ہوئے ابو نہایت پاک باز بن چکے تھے۔ بعض دفعہ میں سوچتی ہوں کہ کیا اتنے بڑے بڑے معاملات یوں رفع دفع ہو جاتے ہیں کہ ایک نسل کی بات دوسری نسل کے قریب ترین لوگوں کو پتا نہیں چلتی۔''

''تم نے کبھی ضمیر صاحب سے پوچھا؟'' میں نے کہا۔

''چچا تو اتھاہ کنواں ہیں۔ اس میں جو چیز چلی گئی، چلی گئی۔ وہ لوٹ کر نہیں آتی۔ میں نے ان سے کہا بھی کہ ہم نے اپنے ابا کو دیکھا تو کچھ اور تھے، پہلے کیا اور کیسے تھے کچھ تو ہمیں پتا چلے مگر وہ ہنس کر ٹال گئے۔''

''ہاں ایسا ہوتا ہے۔'' میں نے کہا، ''تمھاری زندگی اور تمھاری سوچ کا بہت سا حصہ تمھارے بچوں سے پوشیدہ رہے گا، شاید اس میں بھی قدرت کی کچھ مصلحت ہو گی۔''

''آپ نے میرے بچوں کے لیے کوئی جگہ رکھی ہے تو اسے نکال دیجیے ناول میں سے۔'' بصیرہ نے کہا۔

''دیکھا!......اپنے والد کی زندگی کے بارے میں معلوم ہونے سے زندگی کے بارے میں تمھارا رویہ بدل گیا ورنہ کچھ اور ہوتا۔ مگر اب سارے فیصلے خود ہی مت کرو، کچھ دوسروں کے لیے بھی چھوڑ دو۔''

''سب کچھ دوسروں کے ہاتھ میں ہی ہے۔'' اُس نے منھ بنا کر کہا، ''ہمارے ہاتھ میں کیا ہے!''

''اچھا چلو دوستی کا ہاتھ بڑھاؤ۔'' میں نے کہا۔

''چلیے، یہی سہی۔'' بصیرہ نے کہا۔ وہ مسکرائی، ہچکچاتی ہوئی آئی تھی مگر بغیر ہچکچاہٹ کے پل بھر میں غائب ہوگئی۔

گھر آنے اور روزمرہ کے کام شروع ہونے کے بعد ناول کے کرداروں کی آمد اور اُن سے طویل باتوں کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ گھر اور باہر کے کاموں کے دوران کوئی خیال یا اُڑتا ہوا کوئی ٹکڑا ذہن میں آتا۔ کبھی کسی مکالمے کے چند جملے۔ کبھی ناول کا کوئی موڑ اچانک کسی انکشاف کی طرح ذہن کے پردے پر آجاتا۔ میں ان کو اسی طرح ٹکڑوں ٹکڑوں نوالوں میں لکھتی جاتی۔

جب وقت ملتا، آنکھیں اجازت دیتیں دوبارہ دیکھتی۔ جو چیز غلط یا کسی لحاظ سے بے موقع لگتی اُسے نکال دیتی۔ جہاں کمی ہوتی وہاں خانہ پُری کرتی۔

ناول کا باقی حصہ اسی طرح مکمل ہوا۔

سراب سارے

ڈیو محسوس کر رہا تھا کہ صبح سے سمن بے حد جھنجھلائی ہوئی ہے اور وہ اُسے خوش کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تبھی اسکول کی چھٹی کے بعد اُس نے بطورِ خاص کہا، ''سمن آؤ، ٹھیلے سے بھٹے خرید کر کھاتے ہیں۔'' سوفی صد امید تھی کہ سمن انکار کر دے گی مگر جانے کیسے وہ راضی ہوگئی۔ اس لڑکی کی حرکتوں کے بارے میں کوئی پیشگوئی نہیں کی جاسکتی۔ ڈیو نے سوچا۔

امیر خسرو روڈ کی پہاڑی پر بنے محل نما مکان کے زیرِ سایہ، درخت تلے بھٹے والا ٹھیلا لیے کھڑا تھا۔ بھٹے خرید کر کھاتے ہوئے وہ رفیع روڈ کی طرف روانہ ہوئے۔

''ڈیو، آج میرے بوائے فرینڈ کی شادی ہے۔'' یکایک سمن نے کہا۔

''سچ مچ؟'' ڈیو نے چونک کر اُسے دیکھا۔ ''کب کا بوائے فرینڈ؟''

''بہت پرانا، بلکہ قدیم، قبل از مسیح کا۔'' سمن نے بھٹے کا ایک بڑا سا بٹکا بھرا اور گنجی جگہ کو طمانیت سے دیکھا۔

''تو پھر اتنی ہلکان کیوں ہو رہی ہو، مارو گولی۔ میرے ساتھ بازار چل کر کچھ شلوار کُرتے دلوا دو۔'' ڈیو بولا۔

''جب سے تم سے دوستی ہوئی ہے جان اور ضیق میں آ گئی ہے۔'' سمن نے منہ اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا۔ ''میرا جی چاہتا ہے تمھیں ڈیو کے بجائے دیو کہا کروں۔ اپنے مقابلے میں تم مجھے دیو لگتے ہو۔'' چلتے چلتے رُک کر اس نے کہا۔

''ہاں، میں نے بھی تمھیں کسی قلعے کے برج میں قید کرنے کے بارے میں کئی مرتبہ سوچا ہے۔'' ڈیو نے کہا۔

''منہ دھو رکھو۔'' ثمن ہنسی اور دوبارہ چلنے لگی۔ ڈیو کو اس کے ساتھ چلنے میں آدھے قدم اُٹھانے پڑتے تھے۔

''شکر ہے تم ہنسیں تو مگر یہ وہ والی ہنسی نہیں ہے۔'' ڈیو نے کہا۔

''کون سی، کون سی والی؟'' ثمن نے شگفتگی سے پوچھا۔

''وہ۔ جب تم کھلکھلا کے ہنستی ہو تا تو میں سوچتا ہوں کہ یہ ہنسی کسی دن میری جان لے کر رہے گی۔''

''اور میں سوچتی ہوں تمھاری دوستی مجھے خاصی مہنگی پڑے گی۔'' ثمن نے دوبدو کہا۔

''کیوں؟'' ڈیو یکایک سنجیدہ ہو گیا۔

''تمھیں پتا نہیں چلتا مگر تمھارے ساتھ پھرتے ہوئے لوگ جس طرح دیکھتے ہیں اس کو الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایک شریف، فیشن ایبل اسکول میں پڑھانے والی لڑکی کا کسی امریکن کے ساتھ آنا اور ٹھیلے سے بھٹے خرید کر کھاتے ہوئے چلنا حد سے زیادہ غیر معمولی بات ہے۔ ٹھیلے کے آس پاس کھڑے لوگوں اور کوٹھیوں کے ملازموں تک کے چہروں پر عجیب تاثر تھا۔'' ثمن نے ڈیو کی طرف دیکھا۔ ''تم نے نہیں دیکھا؟''

''تو ہونے دو، تمھیں یا مجھے کیا فرق پڑ رہا ہے۔'' ڈیو نے اس کے سوال کے جواب سے بچ کر کہا۔

''تمھیں نہیں، مگر مجھے فرق پڑتا ہے۔'' ثمن نے سنجیدگی سے کہا۔

''بھئی ابھی تک تو ہماری دوستی بچوں کی دوستی سے بھی زیادہ معصوم ہے۔ ایک اسکول میں کام کرتے ہیں، ساتھ باہر نکلتے ہیں تو کبھی ہل پارک کا چکر لگا لیتے ہیں یا امریکن سینٹر میں کوئی بے حد بے ضرر مووی دیکھ لیتے ہیں۔ ایسی بھی کیا بات ہے۔'' ڈیو بالکل بھی سنجیدہ نہیں ہوا۔

''تم نہیں سمجھتے، ہمارے ہاں کسی لڑکے اور لڑکی میں معصوم دوستی کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ابھی لوگ امی کو بتانا شروع کریں گے۔ شہر بھر میں چرچے ہوں گے۔ امی کو میں بتا بھی دوں کہ ہماری دوستی معصوم ہے تو دوسروں کا منہ کون بند کرے گا؟''

''دوسروں کا منہ بند کرنے کی کیا ضرورت ہے؟'' ڈیو نے کہا۔

''بھئی، تمھارے ملک کے کلچرل قانون یہاں نہیں چلتے۔ تم نے اپنی انفرادی آزادی کو اتنا بڑھا لیا ہے کہ وہ گھر سے نکل کر گلی کوچوں اور بازاروں میں پھیل گئی ہے۔ کوئی کچھ کرے، کپڑے پہنے نہ پہنے کوئی کچھ نہیں کہتا۔ ہمارے ہاں ہر شخص دوسروں کے معاملات میں دخل دینے کا مجاز ہے۔ بہت سی

باتیں ملک کے ہر شخص کا مسئلہ بن جاتی ہیں اور گھاٹے میں کون رہتا ہے جناب، عورت اور صرف عورت۔'' سمن نے جوش سے کہا۔

''تو تم میرے ساتھ صدر تک نہیں چل سکتیں؟'' ڈیو نے خوشامدانہ لہجے میں پوچھا۔ ''میں سب کو بتاتا چلوں گا کہ یہ خوب صورت لڑکی صرف اس لیے میرے ساتھ ہے کہ مجھے دکان داروں سے بھاؤ تاؤ کرنا نہیں آتا، وہ مجھے ٹھگ لیتے ہیں۔'' ڈیو سمن کی سنجیدگی کو سنجیدگی سے نہ لینے کا ہنر جان گیا تھا۔

''اچھا چلو، چلتے ہیں۔'' سمن ایک دم ہی راضی ہوگئی۔

دونوں اسکول آئے، کار لی اور زینب مارکیٹ چلے گئے۔ زینب مارکیٹ پاکستانی مصنوعات سے، مغربی ملبوسات اور سیاحوں سے بھرا پڑا تھا۔ دکان دار سیاح کو ڈالروں میں لوٹ رہے تھے۔ بعض سیاح اپنے ساتھ مقامی لوگوں کو لگا لائے تھے جو سیاحوں سے ٹوٹی پھوٹی انگریزی اور دکانداروں سے اردو بول کر درمیانی قیمت لگا رہے تھے۔

''تو تم مجھے ان ایجنٹ نما لوگوں کی جگہ لائے ہو؟'' سمن نے کہا۔

''تمھیں کسی طرح تو گھیروں، تم قابو میں آتی ہی نہیں ہو۔'' ڈیو نے کہا۔

''مجھے قابو میں لا کر کیا کرو گے؟'' سمن نے سرگوشی میں پوچھا کہ آس پاس کے لوگ نہ سنیں۔

''وہی جو جادوگر اور دیو شہزادیوں کے ساتھ کرتے ہیں۔'' ڈیو نے جھک کر اس کے کان میں کہا۔ سمن کے گدگدی ہوئی اور وہ ہنس پڑی۔

''مجھے نہیں معلوم وہ کیا کرتے ہیں، شاید اُن کا کلیجہ نکال کر کھاتے ہوں۔'' سمن نے کہا۔

''مجھے خود نہیں معلوم۔'' ڈیو ہنسا۔ ''چلو فی الحال تو کپڑے خریدتے ہیں۔'' سمن کا ہاتھ پکڑ کر وہ تیزی سے بڑھا۔ دکانوں پر شلوار قمیص کے جوڑوں کا انتخاب کرتے اور اردو بولتے شخص پر کسی کو شبہ بھی نہ ہوا کہ وہ غیر ملکی ہے۔

''بیگم صاحبہ یہ رنگ لے لیجیے۔'' ایک دکان دار نے مونگیا سوٹ دکھایا۔ ''صاحب پر بہت کھلے گا۔'' ڈیو نے سمن کی طرف مسکرا کر دیکھا اور خالص امریکن انداز میں آنکھ ماری۔

زینب مارکیٹ سے نکلتے ہوئے عبداللہ ہارون روڈ پر سمن نے سلیم کی ایک جھلک دیکھی۔ وہ بڑا سا ایک پیکٹ اُٹھائے کار کی طرف جا رہا تھا۔ سمن نے سوچا شاید وہ رک کر اس سے کوئی بات کرے گا مگر وہ پہلو کاٹ کر نکل گیا۔ تب سمن کو سترویں بار یاد آیا کہ آج امان کی شادی ہے اور یہ پیکٹ جو سلیم کے ہاتھ میں ہے ضرور اس کی شادی کا تحفہ ہے۔

''ڈیو! کیا میرے فوری طور پر امریکا جانے کی کوئی صورت نہیں ہے؟'' چلتے چلتے سمن نے کہا۔

ڈیو نے سمن کی طرف غور سے دیکھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی مایوسی اور بے بسی تھی۔

''مجھ سے شادی کرلو اور چلی چلو۔ اس سے آسان اور کوئی صورت نہیں ہے۔ ایک آسانی اور بھی ہے، تم مجھے پتی دیو کہہ سکتی ہو ڈیو کے بجائے۔'' ڈیو نے سمن کی پیٹھ سے کہا۔ وہ آگے تھی۔

''بکواس مت کرو، ہر وقت مذاق اچھا نہیں لگتا۔'' سمن نے پلٹ کر کہا۔ ڈیو ایک قدم بڑھا کر اس کے برابر آ کھڑا ہوا۔

''مذاق کا کیا ذکر ہے، سوچ لو، اگر تمھارا داخلہ کسی یونی ورسٹی میں ہو بھی گیا تو ہزاروں جھمیلے ہوں گے۔ آئی ٹونٹی، ایف ون ویزا۔ بینک کے ایفی ڈیوٹ یہ اور وہ..... اور دوسری طرف دو بول۔ آئی ڈو۔''

''نو، آئی ڈونٹ۔'' سمن نے کہا۔ اب وہ دونوں ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔

''تمھاری مرضی۔ تمھاری آسانی کے لیے کہہ رہا تھا۔ ویسے ملتان جا کر میں نے دو منتیں بھی مانی ہیں۔''

''اچھا، جناب منتیں بھی مانتے ہیں، کس چیز کی؟''

''ایک لڑکی کا دل موم کرنے کی۔''

''مجھے بتاؤ کون ہے۔ میں تمھاری طرف سے اس کا دل موم کردوں گی۔'' وہ اب کھڑی ہوئی گاڑیوں کے آگے پیچھے سے گزرتے اپنی گاڑی کی طرف جا رہے تھے۔ راستہ اتنا تنگ تھا کہ دونوں کا ساتھ ساتھ چلنا مشکل تھا۔ اب کے ڈیو آگے جا رہا تھا۔ چلتے چلتے وہ بولتا رہا، ''نہیں، تم نہیں کرسکتیں، وہ بے حد سخت دل ہے۔ کسی بات کا اس پر اثر نہیں ہوتا۔ دیکھنے میں مُنّی سی ہے لیکن دیو اس کے آگے بونے ہو جاتے ہیں۔''

''کیا کہا؟ ذرا ٹھہرو تو کہاں بھاگے جا رہے ہو؟'' سمن گاڑیوں کے شور میں اس کی بات نہ سن سکی۔

''میں بھاگ رہا ہوں یا تم اس طرح چلتی ہو!'' ڈیو نے چند نہایت مُنّے مُنّے قدم اُٹھائے۔ سمن کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''یہ ہے وہ ہنسی جو کسی دن میری جان لے کر رہے گی۔'' ڈیو نے شگفتگی سے کہا۔

''تم سے منت ماننے کو کس نے کہا تھا؟'' سمن نے ڈیو کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کرتے ہوئے پوچھا۔

''صوفی صاحب کی بیگم جنھیں میں اماں کہتا ہوں، ملتان میں رہتی ہیں۔ میں نے ذکر کیا تو تھا۔'' ڈیو بولا۔

''خدا معلوم کتنی عورتوں کو اماں کہتے ہو۔ میری ماں کو بھی امی کہتے ہو اور تمھاری امی الگ۔''

''انھیں مما کہتا ہوں۔ وہ بھی میری ماں نہیں ہیں، میں لے پالک ہوں۔ اپنے والدین کو کھوج رہا ہوں مگر ان کا پتا نہیں چلتا۔ میری کہانی سنو گی؟''

''نہیں۔'' سمن نے جلدی سے کہا۔

''کیوں؟'' ڈیو حیران ہوا۔

''اپنی کہانی سنانے کے بعد تم میری کہانی سننا چاہو گے جس کے لیے میں تیار نہیں ہوں۔''

''نہ سہی۔ جب تم میری کہانی سننے کے لیے تیار ہو مجھے بتا دینا اور جب اپنی سنانے کے لیے تیار ہو تب اپنی سنانا۔ دونوں کا ساتھ سنایا جانا ضروری نہیں ہے، اب تو خوش!'' ڈیو نے کہا۔

''ہاں، اب گھر جاؤں گی، دیر ہو رہی ہے۔ امی پریشان ہوں گی۔''

دوسرے دن سمن ٹیچرز لاؤنج میں تنہا تھی جب ڈیو اندر داخل ہوا۔ کافی کا مگ کافی میکر سے بھرتے ہوئے اس نے کہا، ''سمن، کل تمھارے بوائے فرینڈ نے مجھے فون کیا۔''

''کون بوائے فرینڈ؟'' سمن لمحے بھر کو گھبرا گئی۔ کیا امان نے اپنی شادی کے دن ڈیو کو فون کیا؟

''نام نہیں بتایا، صرف دھمکی دی۔''

''کیا کہا؟'' سمن کا رنگ اُڑ گیا۔

''اس نے کہا، اگر میں نے آئندہ تمھیں اس لڑکی کے ساتھ کہیں باہر دیکھا تو اچھا نہیں ہوگا۔''

''پھر تم نے کیا کہا؟'' سمن کا رنگ ابھی تک اُڑا ہوا تھا۔

ڈیو اطمینان سے کافی کا مگ بھر کے اس کے پاس آن بیٹھا۔

''میں نے کہا...... بھائی، سامنے آؤ، میں اور تم دونوں کھڑے ہوتے ہیں، لڑکی کے ہاتھ میں جے مالا دیتے ہیں جس کے گلے میں مالا ڈال دے گی وہ جیت جائے گا۔''

''تم نے یہ کہا اس سے؟'' سمن کے لہجے میں شبہ تھا۔

''ہاں کہا اور کیا کہتا؟'' ڈیو نے کافی کا ایک گھونٹ بھر کے اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس کی پریشانی سے یقیناً محظوظ ہو رہا تھا۔

''پھر؟'' سمن نے تشویش سے پوچھا۔

''اُس شخص نے غصّے سے کہا، 'مجھے جو کچھ کہنا تھا کہہ چکا' اور ریسیور رکھ دیا۔''

''تمھیں کہنا چاہیے تھا کہ تم اپنی گرل فرینڈ سے بات کرو، مجھے پتا تو چلتا کون ہے۔''

''تو تمھیں یہ نہیں معلوم کہ تمھارا بوائے فرینڈ کون ہے!'' ڈیو ہنسا۔

''بے وقوفی کی باتیں مت کرو ڈیو، سنجیدگی سے سوچو۔''

''اچھا، کون ہوسکتا ہے؟'' ڈیو نے اپنے اوپر سنجیدگی طاری کی۔ ''وہ قبل از مسیح والا تو نہیں ہوسکتا؟''

''نہیں۔'' سمن نے کہا۔

''تو پھر ہوسکتا ہے یہ بہت سے لوگوں کا مسئلہ بن گیا ہو۔ پاکستانی لڑکی کا امریکن کے ساتھ پھرنا۔اب کسی وقت بھی چاقو کچ سے میرے پیٹ میں اُتر سکتا ہے۔'' اس نے پیٹ میں چاقو گھونپے جانے کا اشارہ کیا اور پیٹ کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر آگے جھکا۔

سمن نے اس کی حرکت کا زیادہ نوٹس نہیں لیا۔ وہ کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔ چند لمحے بعد وہ بولی، ''کل ہم عورتیں ایک جلوس نکال رہی تھیں، میرا خیال تھا تم سے اس میں چلنے کی بات کروں گی مگر اب یہ قصہ......''

''قصہ وصہ کیا! ضرور چلوں گا اگر اور مرد تمھارے ساتھ چل رہے ہیں۔''

''مردوں کو تو ساتھ رکھنا ہی ہے، یہ بتانے کے لیے کہ ہماری جنگ مردوں کے خلاف نہیں ہے اور وہ ہمارے حقوق کے لیے لڑنے میں ہمارا ساتھ دے رہے ہیں اور بھی کئی لوگ ہوں گے زیادہ تر جرنلسٹ۔''

''ٹھیک ہے، میں ضرور جاؤں گا، دیکھتے ہیں کیا ہوتا ہے۔'' ڈیو نے کہا۔

اسکول کا گھنٹا بجا اور وہ دونوں اپنی اپنی کلاسیں لینے چلے گئے۔ اس دن سمن گھر آئی تو دیکھا اس کی امی کچھ اُکھڑی اُکھڑی سی تھیں۔

''بصیرہ کا فون آیا تھا۔'' انھوں نے کہا، ''وہ شکایت کر رہی تھی کہ تم نے اس کے گھر جانا بہت کم کردیا ہے جب کہ اس کا گھر تمھارے اسکول سے اتنا قریب ہے۔ بات کیا ہے؟''

''بات یہ ہے کہ میں سوچتی ہوں ہم دو مختلف دنیاؤں کے رہنے والے ہیں۔ آپ ہی سوچیے چاند اور زمین کے رہنے والوں میں کتنی دوستی ہوسکتی ہے؟'' سمن نے کہا۔

''پہلے تو تم نے یہ بات کبھی نہیں سوچی، اب کہ غریب کا باپ بھی نہیں رہا تمھیں ایسی باتیں سوجھ رہی ہیں۔''

''اُس کے گھر جانے میں احساسِ کمتری پہلے بھی ہوتا تھا۔ وہ ہمارے گھر آئے جب بھی احساسِ کمتری ہوتا ہے۔ یہ اور بات کہ ہم اسے تسلیم نہ کریں۔'' سمن نے آہستگی سے کہا۔

''وہ امیر ہے تو اس میں اُس بے چاری کا کیا قصور ہے، لڑکوں کے ساتھ ماری ماری پھرتی ہو اس سے تو اُس کے گھر چلی جایا کرو۔'' امی نے کڑواہٹ سے کہا۔

اچھا تو یہ بات ہے۔ سمن نے دل میں سوچا۔ ڈیو کے ساتھ جانے کی بات امی کو بھی بتادی گئی ہے۔

''اور کس کا فون آیا تھا؟'' اُس نے پوچھا۔

''سلیم کا۔'' امی نے تڑ سے جواب دیا۔

''تو یوں کہیے کہ انھوں نے آپ کے کان بھرے ہیں۔'' سمن نے کہا۔

''کان بھرنے کا کیا مطلب ہے؟'' امی خفگی سے بولیں، ''وہ کہہ رہا تھا کہ وہ کئی دفعہ فون کرنے کی کوشش کر چکا ہے تم اس کی آواز سن کر فون رکھ دیتی ہو، اب اُس نے کیا قصور کیا ہے؟''

''آپ بھول رہی ہیں امی کہ وہ امان کا گہرا دوست ہے اور میں اس سے بات کرنا ضروری نہیں سمجھتی۔''

''امریکن لڑکوں کے ساتھ بازاروں میں گھومنا ضروری سمجھتی ہو!'' امی کے لہجے میں تلخی برقرار تھی۔

''تو سلیم صاحب نے یہ بتانے کے لیے فون کیا تھا۔ یاد ہے امی، آپ نے کہا تھا اب تم جو اپنے لیے بہتر سمجھو وہ کرو، دنیا کے کہنے سننے کی مجھے پروا نہیں۔''

''اُس نے بھی کسی برے خیال سے یہ بات نہیں کہی۔'' سمن کی امی جھنجھلا کر بولیں، ''زمانے کی ہوا دیکھو، روز عجیب عجیب خبریں سننے میں آ رہی ہیں۔ اُس نے سوچا ہوگا، امان کی دفعہ اس نے تمھیں خبردار نہیں کیا تھا۔''

''اُس وقت میں چودہ سال کی تھی اب چوبیس برس کی ہوں۔ مجھے اُن کی خبر گیری کی ضرورت نہیں ہے۔ رہی ڈیو کی بات تو آپ اُس سے مل چکی ہیں۔ وہ ان لڑکوں میں سے نہیں ہے جو کسی بھی رشتے کا ناجائز فائدہ اُٹھائیں۔''

''شاید...... سلیم بے چارہ امان کی زیادتی کا بدلہ اُتارنا چاہتا ہو۔'' سمن کی امی ابھی تک سوچ میں گم تھیں۔

''کیسے؟'' سمن کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

''ہو سکتا ہے وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہو۔'' امی ابھی تک امیدوں کے جھولوں میں جھول رہی تھیں۔

یکایک سمن کو ڈیو کی بات یاد آئی۔ تمھارے بوائے فرینڈ کا فون آیا تھا، اس نے کہا تھا آئندہ اس لڑکی کے ساتھ دیکھا تو اچھا نہیں ہوگا۔ غصّے سے سمن کا چہرہ خون کبوتر ہو گیا۔

''امی! اب کی سلیم کا فون آئے تو کہہ دیجیے گا کہ آئندہ وہ مجھے فون نہ کرے ورنہ، ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔''

یہ کہہ کر وہ تیزی سے اپنے کمرے میں چلی گئی اور دروازہ اندر سے بند کر لیا۔ امی منھ ہی منھ

میں بڑبڑاتی رہ گئیں۔

دوسرے دن جلوس سے لوٹی تو سمن کا موڈ خاصا بہتر تھا۔ اس کو ایک نئی قسم کی اہمیت کا احساس ہو رہا تھا۔ دوسروں کے ساتھ مل کر اجتماعی کوشش کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ وہ سب پہلے وائی ایم سی اے ہال میں جمع ہوئے تھے۔ وہاں انھوں نے تقریریں کی تھیں اور مذہب کے نام پر عورتوں کے حقوق سلب کرنے کی مذمت کی تھی۔ اس کے بعد ہاتھوں میں بینر لے کر وہ شاہراہِ ایوانِ صدر پر آئی تھیں اور صدر کی طرف بڑھی تھیں۔ پولیس کی گاڑیاں ان کے دائیں بائیں آہستہ آہستہ چل رہی تھیں۔ وہ ان کو قابو میں رکھنے کے لیے تھیں یا ان کی حفاظت کے لیے یا ہجوم کو اُن سے دور رکھنے کے لیے لیکن سمن کو اس وقت وہ اپنے ساتھ جلوس میں شریک لگ رہی تھیں۔ اس پرسکون اور خاموش احتجاج کا ایک حصہ!

راستے بھر لوگ انھیں حیرت سے دیکھتے اور ایک دوسرے کو دکھاتے رہے۔ ایسے بھی تھے جو سب کچھ دیکھتے ہوئے انجان بننے کی کوشش کر رہے تھے۔

اخبار کے رپورٹروں نے ان کی تصویریں لیں۔ یہ خاموش جلوس صدر کا چکر کاٹ کر دوبارہ وائی ایم سی اے ہال پہنچا۔ کچھ دیر جلوس پر تبصرے ہوئے اور پھر سب اپنے اپنے گھروں کو روانہ ہوئے۔ ڈیو اس دن سمن کو پہلی مرتبہ اپنے گھر سی ویو لے گیا۔ سمن چند منٹ سے زیادہ نہ ٹھہری اور اُس کے اصرار پر وہ اُسے اس کے گھر لے گیا۔ باہر سلیم کی گاڑی دیکھ ڈیو اندر نہیں گیا۔ سمن گھر میں داخل ہونے لگی تو اندر سے باتوں کی آواز آئی۔ وہ ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی۔ جھانک کر دیکھا تو سلیم امی کے پاس بیٹھا تھا۔ دونوں کے چہرے سنجیدہ بلکہ ایک حد تک غم ناک تھے۔

''تم ہی بتاؤ میں کیا کروں۔'' سمن کی امی تردّد سے کہہ رہی تھیں۔'' وہ روز بروز ضدی ہوئی جا رہی ہے، کہتی ہے میں اب چودہ برس کی نہیں چوبیس برس کی ہوں۔''

''میرا خیال ہے آپ انھیں سمجھائیں کہ ڈیو کے ساتھ اُن کا پھرنا اچھا نہیں بلکہ وہ امریکن اسکول چھوڑ کر کہیں اور ملازمت کرلیں تو بہتر ہے۔''

''ارے وہ تو ویسے ہی امریکا جا کر پڑھائی کرنے کی کوشش کر رہی ہے۔ کہیں داخلہ مل گیا تو چلی ہی جائے گی۔''

''فی الحال آپ کوشش کیجیے کہ وہ اسکول کے سوا کہیں اور نہ آئیں جائیں۔ اُن کے اسکول آنے جانے کی نگرانی میں چھپ کر اس طرح کروں گا کہ انھیں پتا نہیں چلے گا۔''

''تو تمھیں اپنا کام نہیں ہے؟''

''میں آج کل بے کار ہوں۔ اخباروں میں کام کے اشتہارات دیکھنے ہی جرنلسٹوں کی لائبریری

گیا تھا جہاں سے میں نے جلوس کا منظر دیکھا۔ سمن اس میں بڑے زور و شور سے حصہ لے رہی تھیں۔''

''اچھا بیٹا، خدا تمھاری عمر دراز کرے، تمھارا مجھے بہت سہارا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ تیزی سے کوئی چیز لانے کے بہانے دوسرے کمرے کی طرف بڑھیں کیوں کہ اُن کے آنسو اُن کی آواز میں شامل ہوئے جارہے تھے۔

سمن اندر داخل ہوئی۔ اسے دیکھ کر سلیم کے چہرے پر دھواں سا پھیلا۔

''مجھے یاد نہیں پڑتا کہ میں نے آپ کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی ہو۔'' سمن نے تلخی سے کہا۔

اس کی بات سن کر اُس کی امی پلٹ پڑیں۔ ''ابھی تو میں زندہ ہوں۔'' اُنھوں نے غصّے سے کہا، ''اس گھر میں آنے کے لیے تمھاری اجازت کی ضرورت نہیں۔''

''میں بہت جلد یہ ملک چھوڑ دوں گی پھر آپ کو میرے لیے پریشان نہیں ہونا پڑے گا۔'' سمن نے سلیم سے کہا۔

''کہاں جاؤ گی، امریکا؟'' سلیم کے لہجے میں ہلکی سی مایوسی کی جھلک تھی۔

''کہیں بھی...... ممکن ہے امریکا۔'' سمن نے اکھڑپن سے کہا۔

''تو تمھیں ڈیو کا ملک اور معاشرہ پسند ہے؟'' سلیم نے طنز سے کہا۔

''میرے پاس زیادہ چوائس نہیں ہے سلیم صاحب! میں نے ڈیو کا ملک اور معاشرہ ابھی دیکھا بھی نہیں لیکن مجھے ڈیو کا سچ اور سادگی پسند ہے۔ اسے اپنی بہت سی باتوں پر ناز بھی ہے مگر انکسار کے ساتھ۔ وہ سچے دل سے لوگوں کی مدد کرتا ہے اور اس کے لیے کتنی دور تک جاسکتا ہے آپ سوچ بھی نہیں سکتے۔''

''میں بھی مدد کرنے ہی آیا تھا مگر ہمارے ہاں غیروں پر زیادہ بھروسا کیا جاتا ہے''۔ سلیم نے بگڑ کر کہا۔

''اپنا کون ہے اور غیر کون اس کا فیصلہ بھی تجربے کے بعد ہی ہوتا ہے۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ میری شکایت لے کر میری ماں کے پاس کبھی نہیں آتا۔ جو کچھ کہنا ہوتا ہے مجھ ہی سے کہتا ہے۔'' سمن نے جنگ کا محاذ با قاعدہ کھول دیا۔

''میں بھی تم سے ہی کہنا چاہتا تھا مگر تم نے سنا نہیں...... شانے سے شانا ملا کر چلنے کا حق بھی مجھے نہیں ہے۔'' سلیم نے شکایتاً کہا۔

''بالکل ہے۔ آپ جرنلسٹوں کی لائبریری سے اُترتے اور ہمارے ساتھ چلتے تو یقیناً بڑا اچھا ہوتا۔ اس کے بجائے آپ نے مخبری کو بہتر سمجھا۔'' سمن کی گولا باری جاری رہی۔

''تم نے تو کبھی سیاست میں حصّہ نہیں لیا تھا اب کیوں اس چکر میں پڑتی ہو؟'' سلیم نے صلح کی کوشش جاری رکھی۔

''میری مرضی...... میں عورتوں کے حقوق کے لیے لڑنا ضروری سمجھتی ہوں۔'' ثمن ڈٹ گئی۔

''اور ڈیو صاحب کیوں ہوتے ہیں؟ اُنھیں پاکستانی عورتوں کے حقوق سے کیا دلچسپی ہے؟ ویسے بھی وہ تم جیسی ننھی مُنّی لڑکیوں کے ساتھ چلتے ہوئے اچھے بھی نہیں لگتے۔'' سلیم کے لہجے کا طنز چھپ نہ سکا۔

''جو لوگ شخصیت کی بڑائی چھوٹائی کو نہیں سمجھتے وہ انسان کو صرف قد سے ناپتے ہیں۔'' ثمن نے غصّے سے کہا۔

ثمن کی امی وہیں کھڑی دونوں کی گفتگو بڑے غور سے سن رہی تھیں۔

''تمھیں آج کل کی فضا کا اندازہ ہے؟'' سلیم نے پوچھا۔

''ہاں...... عورتوں اور ان کے ساتھیوں کو دھمکیاں مل رہی ہیں۔ طرح طرح کی افواہیں پھیلائی جارہی ہیں کہ عورتیں کسی طرح گھر سے نکلنا بند کردیں۔ انھیں یقین دلایا جارہا ہے کہ نہ صرف تنہا بلکہ والدین کے ساتھ نکلنے میں بھی ان کے لیے خطرہ ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اسی وطنِ عزیز میں ایک زمانے میں بے برقع نظر آنے والی عورتوں کی چوٹیاں بھی کاٹی گئی ہیں۔ اگر اس وقت ہم عورتیں خاموش رہیں تو ہمارے ساتھ اور زیادتیاں ہوں گی۔ سننے میں آرہا ہے کہ جن عورتوں کے ساتھ جبر اور زیادتی ہوتی ہے اُن ہی کو مجرم بنا کر جیلوں میں ڈال دیا جاتا ہے۔''

''میں تو یہ بتانا چاہتا تھا کہ ان جلسے جلوسوں میں جانے اور ڈیو کے ساتھ پھرنے میں تمھیں نقصان ہوسکتا ہے۔''

''میں اپنا نفع نقصان اچھی طرح سمجھتی ہوں۔'' ثمن نے کہا۔ ''خدا حافظ۔''

''خدا حافظ!'' سلیم تیزی سے باہر نکل گیا۔

''امی! میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ میں سلیم سے ملنا یا فون پر بات کرنا نہیں چاہتی۔'' ثمن ماں سے مخاطب ہوئی۔

''تو نہ کرو...... یہ تو اُس غریب کی بھلمنساہٹ ہے کہ غریب بیوہ کو پوچھنے آجاتا ہے ورنہ اس کی کوئی غرض اٹکی ہوئی نہیں ہے۔'' امی نے ناراضگی سے کہا۔

''آپ کو اس بات کا یقین ہے؟'' ثمن نے تعجب سے پوچھا۔

''ہاں اور کیا...... تم کن ہواؤں میں ہو؟ میں تو کہتی ہوں اگر وہ تم سے شادی کرنا چاہتا تو میں خود کو خوش قسمت سمجھتی......'' اُس کی امی بگڑ کر بولیں۔

''یوں لگتا ہے جیسے آپ نے یہ بات بھی صاف کرلی ہے۔'' ثمن نے آہستہ سے کہا۔

''ہر بات کرنی ضروری نہیں ہوتی۔ قرینے سے بھی اندازہ ہو جاتا ہے۔ اگر اس کو کہنا ہوتا تو اب تک کب کا کہہ چکا ہوتا مگر اس میں اس کا قصور نہیں، اُسے تو ہر بات کی خبر ہے۔'' امی کی ہر بات تیر کی طرح ثمن کے دل کو لگی۔

''ٹھیک ہے، طے ہو گیا کہ اس قسم کا کوئی خدشہ نہیں ہے۔'' ثمن نے تیورا کر جواب دیا۔

''تم جو امریکا جانے کی باتیں کرتی رہتی ہو، تم نے کبھی سوچا کہ اپنی بوڑھی ماں کو کس کے سہارے چھوڑو گی؟''

''بہت سوچا ہے امی اور سوچتی ہی رہتی ہوں۔ ہو سکتا ہے میں آپ کو وہیں بلوا لوں۔''

''ضروری نہیں کہ میں آ بھی جاؤں۔'' ثمن کی امی نے کہا، ''مجھے اپنے ملک کی مٹی ہی میں دفن ہونے دو۔''

''امی ایسی باتیں نہ کیجیے نہ ابھی میں جا رہی ہوں نہ آپ۔'' افسردگی سے یہ جملہ ادا کر کے وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اس کا دل بہت بوجھل تھا۔ امی ہی اس کی سب کچھ تھیں۔ ان سے اس قسم کی کسیلی گفتگو کے بعد کئی دن تک چھاتی پر بوجھ رہتا تھا۔

تیسرے دن وہ اسکول میں داخل ہوئی تو دروازے کے اندر ایک بھیڑ نظر آئی۔ اِدھر اُدھر سے جھانک کر دیکھنے کی کوشش کی تو نظر آیا کہ ڈیو کے چاروں طرف اسکول کے بچوں اور اُستادوں کی بھیڑ لگی ہوئی ہے۔ ڈیو کے ہاتھوں اور پیروں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں اور وہ لنگڑا کر چل رہا تھا۔

ٹیچرز لاؤنج میں پہنچ کر اُس نے ثمن کو بتایا کہ صبح اسکول آنے کے لیے جب وہ اپنے گھر سے نکل کر گیراج کی طرف آیا تو گیراج کے پیچھے چھپے ہوئے آدمیوں نے اسے زدوکوب کیا۔ وہ کسی کو پہچان نہ سکا۔ ظاہر ہے کہ وہ کرائے کے آدمی تھے۔ اُن میں سے ایک نے کہا، ''اب کسی دن اُس لڑکی سے بھی نمٹ لیں گے۔'' یہ کہہ کر وہ بھاگ گئے۔ جب تک شور مچتا اور لوگ اکٹھے ہوتے دور دور کسی کا پتا نہیں تھا۔ ڈیو نے کلینک جا کر پہلے مرہم پٹی کروائی۔ وہاں سے ثمن کو فون کرنے کی کوشش کی مگر وہ گھر سے نکل چکی تھی، چناں چہ وہ اسکول چلا آیا۔

''تمہیں اسکول آنے جانے کا خطرہ ہے۔'' اُس نے ثمن سے کہا۔

''اس کے سوا کیا چارہ ہے!'' ثمن نے کہا، ''میں ملازمت چھوڑ کر گھر تو بیٹھنے سے رہی۔ میرا اور گھر کا سارا خرچ میری ہی تنخواہ سے پورا ہوتا ہے۔''

''کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ تمہیں میں گھر سے اسکول لے آیا کروں اور اسکول سے چھوڑ آیا

کروں؟'' ڈیو نے پوچھا۔

''ارے واہ، اتنی دور روز تم مجھے لینے اور چھوڑنے آؤ گے اور تم بھول رہے ہو کہ جو کوئی بھی تمھارا دشمن ہے میری وجہ سے ہے۔'' سمن اُلجھ کر بولی۔

''مگر ہم کار میں زیادہ محفوظ رہ سکتے ہیں۔'' ڈیو نے کہا۔

سمن نے اس کی طرف دیکھا۔ پٹیوں سے جکڑے ہاتھ پاؤں دیکھ کر اسے ہنسی آ گئی۔ اب بھی تو تم کار ہی میں آتے جاتے ہو۔ اپنا حلیہ ملاحظہ کرو۔ میری وجہ سے اپنی جان خطرے میں نہ ڈالو میاں۔ اب بہتر یہی ہے کہ تمھاری راہ الگ ہماری جدا۔'' سمن نے نصیحت کی۔

''خوب!'' ڈیو تضحیک سے ہنسا۔ ''اس ہمت پر عورتوں کے حقوق کے لیے لڑنے نکلی ہو! ارے لڑنا ہے تو ڈٹ کر لڑو، جم کر لڑو، جان رہے یا جائے۔''

''چاہے میری وجہ سے دوسروں کی جان جائے۔'' سمن تھوڑی سی بگڑی۔

''اور کیا!'' ڈیو نے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر ڈٹ گئے ہم بھی۔

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا وہ آن سلامت رہتی ہے
یہ جان تو آنی جانی ہے اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

''کس کا شعر ہے؟''

''فیض کا۔''

''اور تم کہتی ہو مجھے اردو نہیں آتی۔''

''ارے یہ شعر وعر تو ٹیپ سنتے سنتے بھی یاد ہو جاتے ہیں۔'' سمن نے کہا۔

اتنی دیر میں اسکول کے پرنسپل پولیس کے ساتھ وارد ہوئے۔ ڈیو پولیس میں رپورٹ کرنے کے خلاف تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ بات اخباروں میں آئے۔ اس کے سفارت خانے کے لوگ اس بات کو نہایت سنجیدگی سے لیں گے۔ ملک میں خبر پہنچی تو وہاں ہلہ مچے گا۔ تیسری دنیا میں لاکھوں لوگ بھوک سے مرتے رہیں مگر ایک امریکن شہری کی جان ان کے نزدیک بڑی قیمتی ہے۔ پرنسپل کے اصرار پر اُس نے رپورٹ تو لکھوا دی مگر اس بات کو ہوا دینے سے منع کر دیا۔ اُس نے پولیس والوں سے کہا کہ اسے کسی اور کے دھوکے میں مارا پیٹا گیا ہے۔ اس کی کسی سے دشمنی نہیں ہے اور نہ کسی پر شبہ ہے۔

سمن کے ہزار منع کرنے کے باوجود ڈیو اُسے گھر تک چھوڑنے آیا۔ اس نے یہی کہا کہ زخم اتنے ہلکے ہیں کہ اسے کار چلانے میں کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوتی۔ گھر کے سامنے سلیم کی کار کھڑی تھی۔

اس لیے سمن نے اُس سے اندر آنے کو نہ کہا۔ سمن بلی کی چال چلتی گھر میں داخل ہوئی۔ دو دن پہلے کی طرح اس کی امی اور سلیم پھر بے حد پریشان حال بیٹھے تھے۔

ڈیو کو وہ زیادہ نقصان نہیں پہنچائیں گے۔" سلیم کہہ رہا تھا، "آپ جانتی ہیں کہ بڑی طاقتوں سے سب ڈرتے ہیں مگر سمن...... اُن کے بارے میں سوچتا ہوں تو سچ مچ کانپ جاتا ہوں۔ آپ دیکھ اور سن رہی ہیں ڈاکے کی وارداتیں اور لڑکیوں کو اُٹھا کر لے جانے کے قصے۔"

سمن نے دیکھا اس کی امی کا رنگ سفید موم سا ہو گیا۔ سمن جلدی سے آگے بڑھی۔ "امی! یہ صرف آپ کو ڈرا رہے ہیں، آپ کیوں ان کی باتوں میں آتی ہیں؟" اس نے کہا۔

"تم چپ رہو۔" امی نے اُسے ڈانٹا، "میں اخبار نہیں پڑھتی کیا؟" پھر وہ سلیم سے مخاطب ہوئیں، "آخر وہ کون لوگ ہیں جو میری بچی کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں؟"

"وہ تو آپ کے سامنے بیٹھے ہیں۔" سمن نے آواز دبا کر کہا۔ اسے پتا نہیں چلا کہ سلیم نے اس کی بات سنی یا نہیں۔ شاید سنی ان سنی کر گیا۔

"کچھ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو سارے شہر کے غم میں دبلے ہوتے ہیں۔" سلیم نے کہا۔

"یہ بات آپ نے بالکل ٹھیک کہی۔" سمن نے ہلکے سے طنز سے کہا، "یہ لوگ دوسروں کے اخلاق کے ٹھیکے دار بن جاتے ہیں۔ آزاد اور خود مختار عورتیں انھیں زہر لگتی ہیں کیوں کہ وہ ان کے اور ان کی بہو بیٹیوں کے لیے زبردست خطرہ ہیں۔ وہ غلط مثال قائم کر رہی ہیں...... لیکن کچھ ایسے بھی لوگ ہیں جنھیں یہ بات بھی معلوم ہے کہ ڈیو پر حملہ ہوگا مگر اس پر حملہ کرنے والے محتاط ہوں گے تعجب ہے۔"

"تم سنو تو میں بتا سکتا ہوں کہ یہ بات مجھے کیسے اور کتنی معلوم تھی۔" سلیم نے کہا۔

"کیا ڈیو پر حملہ ہوا؟" امی نے سینے پر ہاتھ رکھ کر تشویش سے پوچھا۔

"ہوا اور جن لوگوں کو معلوم تھا کہ ہوگا انھوں نے اُسے پہلے دھمکی بھی دی تھی۔" سمن نے کہا۔

"اللہ خیر...... وہ خیریت سے تو ہے؟" امی گھبرا گئیں۔

"جی ہاں خیریت سے ہے، مجھے گھر تک چھوڑ کر گیا ہے۔" سمن نے سلیم کی طرف دیکھ کر کہا۔ اس کے چہرے پر شعلے سے اُڑتی چنگاریاں سی جھڑ رہی تھیں مگر آنکھوں میں گرم راکھ کی سلگن تھی۔

"کیا تم میری بھی بات سننے کے لیے تیار ہو؟" سلیم نے پوچھا۔ اس کا چہرہ ابھی تک دہک رہا تھا۔

"افسوس کہ اب میرے پاس وقت نہیں ہے۔" سمن نے لہجے میں بے پروائی پیدا کرتے ہوئے کہا۔

"اچھا خالہ میں چلا۔" سلیم نے کہا، "خدا حافظ۔" وہ تیزی سے دروازے کی طرف بڑھا۔ چوکھٹ پر ذرا سی ٹھوکر لگی۔ وہ سنبھلا اور بغیر پیچھے دیکھے نکلا چلا گیا۔

ثمن تھکے تھکے قدم رکھتی اپنے کمرے میں آئی۔ یکایک بچپن کی دھندلی یادوں سے بونا بابا نکل کر سامنے آن کھڑا ہوا۔

''بیٹا ولایت پڑھنے جائے، پڑھا لکھا دولھا ملے، خود پڑھے، اوروں کو پڑھائے۔ خدا نیکی ہدایت دے، سچ بولنے کی توفیق دے۔''

بونا بابا اُس کے ابو کی زندگی میں روز جھٹپٹے کے وقت ان کے ہاں وارد ہوتا تھا اور کھانا کھا کر جاتا تھا۔ پہلے دن تو وہ اسے دیکھ کر ڈر گئی تھی۔ بڑے سے سر، بڑے بڑے ہاتھ پیروں کے ساتھ تقریباً بے دھڑ کا آدمی مُنّی مُنّی ٹانگوں پر جھومتا ہوا چل رہا تھا مگر رفتہ رفتہ ان کی خوب دوستی ہوگئی تھی۔ وہ اصرار سے خود اس کے لیے کھانا لے جاتی تھی اس لیے کہ وہ روز مٹھی بھر بھر دعائیں اس پر سے نچھاور کرتا تھا۔ جانے کہاں سے نئی نئی دعائیں سوچ کر جمع کرتا تھا جو بڑی بوڑھیوں کی درازِ عمری اور خوش رہو کی دعاؤں سے بالکل الگ ہوتی تھیں۔ بعض اوقات ان پر بھی ہنسی آتی تھی۔ جانے یہ ولایت کیا بلا تھی اور وہاں آدمی پڑھنے کیوں جاتے تھے۔ دولھا اُسے ہمیشہ ہی خوشبوؤں میں بسی ریشمی دلہنوں کے مقابلے میں بڑے بودم سے لگتے تھے۔ پڑھے لکھے بھی ہوئے تو کون سے سرخاب کے پر لگ جائیں گے۔ رہا سچ بولنا تو وہ ایسی کون سی بڑی بات ہے جس کے لیے دعائیں دی جائیں۔ وہ تو ویسے ہی منہ پھٹ مشہور تھی۔ اماں کو اسے یہ بات سمجھانے میں کہ ہر بات ہر ایک کو بتانے کی نہیں ہوتی کتنے دن لگے تھے۔

کپڑے تبدیل کر کے ثمن اپنے کمرے سے باہر نکلی۔ آج اس کی امی نے اُس سے کھانے کے لیے نہیں پوچھا تھا۔ وہ بے حد تھکی ہوئی سی برآمدے میں پڑے تخت پر بیٹھی تھیں۔ آج ان کے آگے نہ مشین تھی نہ سبزی اور چھری۔ ثمن نے انھیں یوں خالی بیٹھے کم ہی دیکھا تھا۔ اس لیے اس نے ذرا غور سے دیکھا۔ اپنی بیوگی کی لمبی تاریک رات جیسی زندگی کا ذکر کرتے ہوئے کہا کرتی تھیں، ''میں تو کبھی کی ختم ہوگئی ہوتی یہ جوان لڑکی کا بوجھ ہے جو مرنے بھی نہیں دیتا۔''

آج وہ بوجھ واقعی ثمن نے ان کے کندھوں پر رکھا ہوا محسوس کیا۔ اُن کے کندھے جھکے ہوئے تھے۔ چہرے پر زردی چھا رہی تھی، آنکھیں بے رونق اور روئی روئی تھیں۔ روکھے بال بے ترتیبی سے پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے دیکھتے دیکھتے جانے کس دن وہ اتنی بوڑھی اور کمزور ہوگئی تھیں۔ کیا اس نئے خطرے نے ان کا یہ حال کر دیا تھا!

وہ اس طرح کھڑی تھی کہ امی اس کا چہرہ پوری طرح نہ دیکھ سکتی تھیں۔ اسے معلوم تھا کہ اس طرح کھڑے ہوئے انھیں اس کی بات سمجھنے میں دشواری ہوگی۔ کہنے یا نہ کہنے کے تذبذب میں وہ خاصی دیر کھڑی رہی۔ کہہ دینا ہی بہتر ہے، اس نے سوچا۔ ڈیو کا کوئی بھروسا نہیں ہے۔ وہ اُٹھا کر امی کو فون ہی

کردے۔اس کے کہنے سے امی کی پریشانی میں اضافہ ہوسکتا ہے۔

''امی! ڈیو کئی دن سے ہمارے ہاں آنے کی بات کررہا ہے، شاید وہ کسی دن اچانک آجائے۔'' سمن نے کہا۔ اُس کی امی نے چہرے کا رخ اس کی طرف کیا اور خاموش رہیں۔''اصل میں وہ آپ سے بات.....میرا مطلب ہے میری شادی کی........وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔'' آخر سمن کہہ ہی گزری۔

یکا یک اس کی امی کا چہرہ اچانک بے ہوش ہوجانے والے شخص کی طرح بے لہو ہوگیا۔

''امی گھبرائیے نہیں۔'' تخت پر بیٹھ کر اُس نے اپنی ماں کا برف سا ہاتھ تھام لیا۔''میں یہ کہہ رہی تھی کہ آپ اسے نرمی سے سمجھا دیں کہ یہ ممکن نہیں ہے۔ اگر وہ ہم سے ملنا جلنا چاہتا ہے تو آئندہ ایسی بات منھ سے نہ نکالے۔''

اُن کا اُڑا ہوا رنگ واپس نہ آیا۔ بغیر کہے سنے وہ تخت کے کنارے سے اُتریں اور پیر گھسیٹتی اپنے کمرے میں چلی گئیں۔

دریائے نیاگرا میں چھلانگ لگا کر آبشار کے ساتھ گرنے اور پھر دریائے نیاگرا کے پانیوں میں بہہ نکلنے والے شخص کے لیے جو ہونکتی ہوئی ایمبولیس آئی تھی اُن میں سے ایک میں بصیرہ کو نیاگرا اسپتال پہنچایا گیا تھا جہاں سے فوراً ہی اُسے ٹورنٹو منتقل کردیا گیا تھا کیوں کہ اس کے دل کا فوری آپریشن ضروری تھا۔

اس جان لیوا رات میں سمن اور سلیم سرجری کے انتظاریہ کمرے میں صوفہ نما کرسیوں پر بیٹھے اونگھ رہے تھے۔ پردوں کے پیچھے بڑھتی تاریکی میں شہر کی روشنیوں کا غبار پھیلا ہوا تھا۔ رات کا بڑھتا سناٹا اسپتال کے قمقموں کو دھندلاتا جارہا تھا۔ نرسوں کی چلت پھرت، فون کی اصرار بھری گھنٹیاں اور آنے جانے والوں کی سرگوشیاں اس سناٹے کو اور بڑھا رہی تھیں۔ سلیم نے سمن کی طرف دیکھا۔ اس کی بادامی آنکھوں میں شربتی ڈورے تیر رہے تھے، آنکھوں کا کاجل پھیل گیا تھا۔ وہ بے حد زرد اور دبلی لگ رہی تھی۔ کمزور بے بس سی بچی۔ سلیم نے گزرتی رات کی چاپ سنتے ہوئے صوفے پر پہلو بدلا، پھر دونوں ہاتھوں کی انگلیوں کو شکنجے کی طرح پھنسا کر سر کے پیچھے رکھ کر چھت کو تکنے لگا۔ کیا کبھی اُس نے سوچا تھا کہ وہ یوں سمن کے ساتھ گھنٹوں کے لیے تنہا ہوگا۔ اگر سوچا ہوتا تو یہ بھی طے کرلیتا کہ ایسے وقت وہ کس موضوع پر بات کرے گا۔ یوں تو ناز کو یہاں ٹھہرنا چاہیے تھا اور اسے اصرار بھی تھا مگر اشرف بہلا پھسلا کر اسے گھر لے گیا تھا۔ آپریشن تو کئی گھنٹے لے گا۔ جلد تو کسی بھی قسم کی اطلاع

ملنے کا امکان نہیں پھر اسپتال کے بجائے گھر ہی میں کیوں نہ انتظار کیا جائے جہاں اُن کی نوزائیدہ بچی ماں کے دودھ کے لیے بلک رہی تھی۔ جب تک ناز اور اشرف دوبارہ اسپتال پہنچیں ثمن نے وہاں ٹھہرنا مناسب جانا اور اشرف نے سلیم کو ثمن کی دوسراتھ کے لیے وہاں چھوڑ دیا۔ ڈیو، مائیکی اور پدما اپنے موٹل کے کمروں میں یقیناً سو چکے ہوں گے۔

ایک رات پہلے اشرف نے سلیم کو اپنی شادی کا قصہ سناتے ہوئے کہا تھا، ”سلیم! میں تو پہلی نظر کی محبت پر یقین رکھتا ہوں۔ ماں بھارت یا مہا بھارت کی قدیم شہزادیاں اپنے گورودیوں کے ساتھ سلطنت کے سفر کو نکلتی تھیں۔ دنیا دیکھتی تھیں، لوگوں سے ملتی تھیں اور اپنے لیے بر ڈھونڈتی تھیں۔ بعض دفعہ بڑے بڑے شہزادوں کو چھوڑ کر جنگل میں بیٹھے ہوئے کسی شخص کو چن لیتی تھیں۔ کس طرح؟ ایسے کہ پہلی ہی ملاقات میں آنکھوں کے ذریعے دل کے سگنل انھیں مل جاتے تھے کہ ہمارا تمھارا سنجوگ بڑا اچھا رہے گا۔ خود پر یقین اور دوسرے پر اعتماد، محبت میں اس سے زیادہ اور کیا چاہیے۔“

سلیم اُٹھا اور ہال کے آخری سرے پر ایک کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ چاند کے گرد روشنی کا ہالا تھا۔ دور ایک پل سیاہ تاروں سے بنے ہوئے رباب کی طرح دکھائی دے رہا تھا۔ ہر چیز دھندلی، غیر حقیقی اور غیر مرئی تھی۔ کیا ثمن واقعی وہاں بیٹھی تھی یا اُس کے ذہن سے نکلا کوئی ہیولہ سکڑا سمٹا تھا۔ کچھ لوگ کیسے پہلی نظر کی محبت پر یقین کر لیتے ہیں؟ اس کے اپنے بھائی نے اپنی عمر کی نصف برابر لڑکی سے شادی کر لی تھی۔ کل ہی تو یہ قصہ اس نے سنایا تھا۔ برف پڑا وہ دن اسے خوب یاد تھا، جب وہ وطن سے پہلی بار اس نئی سرزمین پر اُترا۔ کچھ لوگ لینے آئے تھے، کچھ ان کے ساتھ یوں ہی چلے آئے تھے۔ موٹے سے سفید کوٹ میں برفانی ریچھ بنی آنکھوں پر سیاہ چشمہ لگائے ایک لڑکی بھی تھی جس سے ایئرپورٹ پر تعارف بھی کروایا گیا مگر نئے ملک کی برفیلی زمین پر سب کچھ اتنا نیا تھا کہ فوری طور پر کسی کا نام ذہن میں نہ رہا۔ سب پہلے ایک دوست کے گھر گئے۔ طویل کوٹ، برف کے جوتے، مفلروں اور دستانوں کے تھام جھام اُتار کر آرام سے بیٹھے تب یکایک اس لڑکی پر نگاہ پڑی۔ اس نے اشرف کی طرف دیکھا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ پتلیوں کو دیکھتے ہی زندگی میں پہلی مرتبہ یہ عجیب خیال آیا کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ زندگی گزار سکتا ہے۔ یہ بات جو خدا جانے کب سے اس نے نہیں سوچی تھی۔ اس کی امی نے اور خاندان کے ان لوگوں نے ضرور سوچی تھی جو اپنی بیٹیوں میں سے کسی ایک کو اس کے ساتھ باندھنے کے خواب دیکھ رہے تھے مگر اُس نے تو کب سے فیصلہ کر رکھا تھا کہ شادی اُس وقت کرے گا جب زندگی میں اور کچھ کرنے کو نہ رہے گا۔

ہزاروں میل سے چل کر سرد ملک میں اپنے ملک کی ایک سیاہ چشم لڑکی کو دیکھ کر یہ خیال کیوں

آیا؟ اس کی وجہ یہی تھی کہ وہ پاگل لڑکی سیدھی اس کی آنکھوں میں جھانکتی تھی اور یوں لگتا تھا جیسے کوئی کمرے کی کھڑکی سے جھانکے اور باہر جو کچھ ہے ایک نظر میں دیکھ لے۔

ناز پی ایچ ڈی کر رہی تھی اور ایک دوسرے پروفیسر کے ساتھ اسسٹنٹ شپ، مگر اس کا کمرہ دور نہیں تھا۔ دن میں کہیں نہ کہیں مڈبھیڑ ہو جاتی۔ ناز جہاں بھی ہوتی یوں محسوس ہوتا جیسے اُس کمرے میں زیادہ آرام ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے سردیوں میں آگ جلتے کمرے میں یا گرمیوں میں ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں۔ وہ ہمیشہ مسکرا کر ملتی مگر مسکراہٹ سے گزر کر جب اس کی نگاہ نظروں تک پہنچتی تو لگتا جیسے اُس نے روح میں جھانک کر سب کچھ دیکھ لیا ہے۔ سارا ماضی، سارا حال اور سارا مستقبل! اور ایسے شخص سے اب پردہ ہی کیا ہے۔

اشرف کو اپنی عمر کا احساس تھا اور وہ اسے پہلی نظر کی محبت ماننے کو تیار نہیں تھا، اس لیے الجھنیں بڑھنے لگیں۔ جب بھی وہ ملتی لگتا جیسے کوئی بغیر اس کی مرضی کے اس کی کسی بے حد پرائیویٹ دراز میں جھانک رہا ہو یا اس کی خفیہ ڈائری پڑھ رہا ہو۔ اسے ناز پر غصہ بھی آتا تھا اور الجھن بھی ہوتی تھی اور اس کے ساتھ ایک احساسِ بے بسی کہ اب کیا ہو سکتا ہے اب تو جو راز تھے افشا ہو چکے۔ اُسے سب کچھ معلوم ہو چکا۔ کوئی ایک مرتبہ بھید جان لے تو کیا کیا جا سکتا ہے سوائے اس درخواست کے کہ وہ یہ راز کسی اور پر نہ کھولے۔

پھر ایک دن جانے اسے کیا سوجھی کہ اسی مضمون کا خط ناز کے نام لکھ کر دفتر میں اس کی ڈاک کے خانے میں ڈال دیا۔ سہ پہر کو چھٹی ہونے سے کچھ دیر پیشتر وہ پریشان سی اشرف کے دفتر میں آئی۔ یونی ورسٹی کی عمارت میں ایک چھوٹا کمرہ جس کی میز کے ایک طرف وہ بیٹھا تھا، دوسری طرف دو کرسیاں رکھی تھیں۔ دیوار سے لگے ریک میں اوپر سے نیچے تک کتابیں تھیں۔ دیواروں پر چند تصویریں اور ایک کیلنڈر تھا۔ اس کے اندر داخل ہوتے ہی یوں لگا جیسے اس کمرے میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو نہیں ہونی چاہییں تھیں اور کچھ چیزوں کی سخت کمی تھی۔ ایک خوب صورت پینٹنگ کی، گلدان میں نازک سے پھول کی اور ہلکی نیم خوابیدہ سی روشنی کی۔

بہر حال ناز آئی۔ اشرف نے کھڑے ہو کر ہاتھ سے کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ناز نے دروازہ نیم وا چھوڑ دیا تھا۔ ایک مہربان، نرم دل ہوا کے جھونکے نے آہستہ سے بھیڑا۔ دروازے کے قبضے نے کھٹ سے پٹوں کو دبوچ کر بند کر لیا۔ سنا تھا قاضی کے گھر کے چوہے بھی سیانے ہوتے ہیں۔ اشرف کے دفتر کا دروازہ کم از کم اس معاملے میں خاصا ہوشیار نکلا۔

خط کو ہاتھ میں اونچا تھام کر اس نے کہا، ''اشرف صاحب! مجھے نہیں معلوم کہ آپ نے کن باتوں کی

طرف اشارہ کیا ہے۔ سچ کہتی ہوں مجھے آپ کے بارے میں قطعی کوئی بات معلوم نہیں ہے۔''

''ارے نہیں جناب! اب ایسی باتیں نہ کیجیے۔''

''قسم لے لیجیے۔'' وہ مسکرائی۔ ''اور اگر آپ کسی غلط کام میں ملوث ہیں تو مجھ سے کیوں توقع رکھتے ہیں کہ میں آپ کی خاطر اسے چھپاؤں گی۔'' وہ اب سنجیدہ ہو چلی تھی۔

سچ سچ!..... کی مٹھاس اس کی آنکھوں سے قطرہ قطرہ شہد کی طرح گرتی محسوس ہوئی۔ کون کہتا ہے سچ کڑوا ہوتا ہے۔ اس کی ریشمی جھالر نما پلکوں سے جھانکتی آنکھوں کے حیرت نما سچ میں ذرا بھی کڑواہٹ نہیں تھی۔

''آپ کو یقین ہے کہ آپ کو میرے بارے میں کسی بات کا علم نہیں ہے۔'' اشرف نے پوچھا۔

ریشمی جھالر کو ذرا سا اور اُٹھا کر اس نے کہا، ''ہاں مجھے تو یقین ہے مگر آپ کو کس بات کا شبہ ہے؟''

''مجھے شبہ ہی نہیں یقین ہے کہ آپ کو میرے بارے میں ذرہ ذرہ بات کی خبر ہے۔'' اشرف نے کہا۔

''کیا آپ کا تعلق کسی دہشت پسند جماعت سے ہے؟'' اس نے گھبرا کر پوچھا۔

''اگر ہوتا تو...... یہ بات بھی یقیناً آپ کو معلوم ہوتی۔'' وہ مسکرایا۔

ناز سنجیدہ رہنا چاہتی تھی مگر مسکراہٹ اس کی آنکھوں میں تیری اور پھر ہونٹوں تک آ گئی۔ اُس کے دانت بغیر لپ اسٹک لگے ہونٹوں سے جھانکتے بڑے اچھے لگے جیسے پلاٹینم میں ہیرے جڑے ہوں۔

''خدا جانے آپ کس غلط فہمی میں ہیں اور مجھے کیا سمجھ رہے ہیں۔ میں تو آپ کا بڑا ادب کرتی ہوں۔'' اُس نے کہا۔

''اچھا...... گویا آپ کا اور میرا اور کوئی تعلق نہیں ہے؟''

''نہیں۔'' اس نے کہا۔

''تو کیا آپ میری ایک بات کا جواب دے سکتی ہیں؟''

''ضرور......'' کہتے کہتے اُس نے نظریں چرا لیں۔

''تو یہ بتایئے کہ جب بھی آپ میری طرف دیکھتی ہیں...... پہلے دن کے پہلے لمحے سے مجھے کیوں یہ احساس ہوتا ہے جیسے آپ میری روح میں جھانک رہی ہیں، جیسے آپ سے کوئی بات چھپانا بے کار ہے۔ آپ کو سب کچھ پہلے ہی معلوم ہے۔'' اشرف نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

لمحے بھر کو اس کے چہرے اور لبوں پر مسکراہٹ سی پھیلی۔ یکایک وہ بے حد سنجیدہ ہو گئی۔ ''اگر آپ سچ کہہ رہے ہیں تب بھی میرے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں ہے۔''

''اب آپ ٹال رہی ہیں جب کہ آپ نے کہا تھا کہ میرے سوال کا جواب ضرور دیں گی۔'' اشرف نے کہا۔

وہ کھڑی ہوگئی۔ ''اب آپ اس قسم کے خطوط نہ بھیجیں۔ یاد رکھیے کہ آپ ایک یونی ورسٹی کے سینئر اُستاد ہیں۔ سنجیدگی اس کی رگ رگ سے ٹپک رہی تھی۔

پھر اس نے دروازہ کھولا اور باہر نکل گئی۔ اشرف کو احساسِ شرمندگی نہیں ہوا، توہین کا احساس نہیں ہوا بلکہ احساسِ محرومی۔ اپنا خط اُٹھا کر اس نے دوبارہ پڑھا۔ بظاہر بے ضرر سا خط تھا مگر کسی خاص موقعے پر خطرناک بھی ہوسکتا تھا۔ وہ اسے اس کے خلاف استعمال کرسکتی تھی مگر وہ اوچھی عورت نہیں تھی۔ اوچھے ہتھیار اس پر سج بھی نہیں سکتے تھے، جس کی آنکھوں سے ٹپکنے والا سچ اور غصہ منھ اندھیرے گرنے والی شبنم کی طرح شفاف ہو، جس کی آنکھوں میں فرشتے نے غلطی سے لینس کی جگہ ایکسرے پلیٹ لگا دی ہو وہ عورت اوچھی اور معمولی نہیں ہوسکتی۔

پھر اشرف نے ناز سے دور رہنے کی شعوری کوشش کی۔ جہاں وہ ہوتی وہ نہ جاتا۔ وہ لائبریری میں ہوتا، ناز آتی تو وہ نکل آتا۔ ناز کافی بنا رہی ہوتی تو وہ اپنا مگ بغیر بھرے چلا آتا۔ نہ وہ اس کی طرف دیکھے گی نہ اسے کچھ محسوس ہوگا لیکن ایسا نہیں ہوا۔ احساسِ محرومی دم بہ دم بڑھنے لگا۔ دل بے صبرا ہونے لگا اور اس سے مطالبہ کرنے لگا۔ اِدھر یا اُدھر...... ناز سے دوٹوک بات۔ اظہارِ محبت۔ اگر وہ انکار کردے تو وہ یہ یونی ورسٹی چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے۔ کہیں بھی مگر غیر یقینی کیفیت میں غیر معینہ مدت تک رہنا عذاب سے کم نہ تھا۔

تب اشرف نے اس مضمون کا خط لکھا اور یہ خط لے کر خود اس کے کمرے میں گیا۔ باہر تین دن پہلے پڑی برف آہستہ آہستہ پگھل رہی تھی۔ چھت پر سے ٹپکنے والا پانی جیسے کوئی مسلسل اور متواتر رو رہا ہو۔ اشرف کو ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ ناز کا ردِعمل کیا ہوگا۔ وہ 'گیٹ آوٹ' کہہ کر اُسے باہر نکال دے گی اور ہمیشہ کے لیے دروازہ اُس کی صورت پر بند کردے گی یا چیخے چلائے گی مگر وہ ہر ردِعمل کے لیے تیار تھا۔ جس ردِعمل کے لیے وہ تیار نہیں تھا وہ یہ تھا کہ وہ سکون سے سارا خط پڑھے گی اور پھر دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ چھپا کر سسکیاں لینے لگی گی اور جب وہ ہم دردی سے اس کا کندھا تھپتھپائے گا تو وہ اس کے سینے میں منھ چھپا لے گی اور پھر وہ دونوں لوسیٹ پر بیٹھ کر خوب روئیں گے اور یوں معلوم ہوگا جیسے کیمپس کا سارا علاقہ، ساری چھتیں، سارے لٹکتے برفیلے برف پارے بوند بوند رو رہے ہیں۔ اُس دن اُس نے اشرف کے سامنے اقرار کیا کہ پہلے ہی دن اُسے بھی اشرف کی نگاہوں کا پیغام مل گیا تھا مگر عمروں کے اتنے زیادہ فرق کی وجہ سے اس کو سمجھنے سے انکار کرتی رہی اور

خود کو دھوکا دیتی رہی۔

سلیم واپس آیا۔ سمن نے بھاری پپوٹے اُٹھا کر اُسے دیکھا اور پھر نگاہیں جھکالیں۔ وہ جاگنے اور سونے کے بیچ کی کیفیت میں خاموش اور مطمئن سی تھی۔ اس کی آنکھوں میں اضطراب تھا تو بصیرہ کی طرف سے تھا۔ کبھی کبھی اس کی نگاہیں غیر شعوری طور پر تھیٹر کی طرف جانے والے ہال پر جم جاتیں اور جمی رہتیں۔ خاموشی کا بوجھ بھاری پتھر کی طرح سلیم کے سینے پر دھرا تھا اور لحہ بہ لحہ بھاری تر ہوتا جارہا تھا۔

ناز اور اشرف کے آتے ہی سلیم نے بڑا سا ٹھنڈا سانس لیا۔ سلیم کو حکم ہوا کہ سمن کو فوراً گھر لے جائے۔ وہ اس قدر تھکی ہوئی لگ رہی تھی کہ کہیں دوبارہ بیمار نہ ہو جائے۔ اشرف نے کہا کہ سلیم خود ان کے کمرے میں بچی کے پاس سوئے اور سمن کو اپنا کمرہ دے دے۔

جس وقت دونوں گھر کے لیے روانہ ہوئے صبح کا سورج مشرق سے نکلنے کے لیے بے تاب تھا۔ مطلع لہولہو ہو رہا تھا۔ صبح کی ہوا میں شبنم بھری گھاس کی باس بنی ہوئی تھی اور گھروں کے باہر گلاب، آئرس، للی اور ٹیولپ جھوم رہے تھے۔

''سمن! تم پہلی نظر کی محبت میں یقین رکھتی ہو؟'' سلیم نے یکایک پوچھا۔

''ایں...... مجھ سے کہا کچھ؟'' سمن سوتے سوتے چونک پڑی۔

''نہیں...... کچھ نہیں!......'' سلیم بڑبڑایا۔

گھر تک پھر ان دونوں میں کوئی بات نہیں ہوئی۔ گھر کے اندر داخل ہوتے ہی سمن سب سے پہلے بچی کو دیکھنے گئی اور پھر ناز کے بستر پر گر کر بے ہوش ہو کر سو گئی۔ سلیم اپنے بستر پر پڑا جاگتا رہا اور بہت سی باتیں سوچتا رہا۔

سوال سارے

بصیرہ کو ذرا سا ہوش آیا تو بلی وریا کے گانے کی لہر سی کانوں میں گونجی۔
'پھر تم مجھے نہیں جانتیں...... پھر تم مجھے نہیں جانتیں!
میں تو اُس زمین کو بوسہ دیتا ہوں جہاں تم چلی ہو'
''بصیرہ!'' کسی کی ہلکی سی آواز جیسے کہیں دور سے آئی۔
بصیرہ نے بہ مشکل تمام آنکھیں کھولیں۔ پپوٹوں پر جیسے منوں بوجھ تھا۔
''کیسی ہو؟ مبارک، تمھارا آپریشن سو فی صد کامیاب رہا۔'' بصیرہ نے موت کے فرشتے کی آہٹ سننے کی کوشش کی۔ کیا واقعی اس کا سایہ اس کے اُوپر سے چلا گیا تھا۔ ایک سفید لبادہ ہوا میں اچھلا اور غائب ہو گیا مگر وہ موت کا فرشتہ نہیں موت کو گلے لگانے والا موسیقار تھا۔ بصیرہ پھر غنودگی میں چلی گئی۔ ہوش اور بے ہوشی میں کئی مرتبہ غوطہ کھانے کے بعد جب وہ پورے طور پر اس بھنور سے باہر نکلی تو آہستہ آہستہ نیاگرافال کا منظر اُسے یاد آیا اور پھر کراچی سے اپنی روانگی کا دن۔ ضمیر صاحب زمان کے ساتھ کراچی میں اس کے گھر کو کئی ماہ کے لیے بند کروانے آئے تھے۔ وہ ملازموں کو ہدایات دے رہے تھے اور وہ سوچ رہی تھی ان دونوں کو ذرا بھی شبہ نہیں کہ اب وہ اس ملک، اس شہر اور اس گھر میں کبھی نہیں آئے گی۔ ان دونوں کو یہ احساس ضرور ہوا تھا کہ بصیرہ بے حد خاموش ہے لیکن وہ اس بات کو اجنبی جگہ جا کر آپریشن کروانے کا خوف سمجھے تھے۔
پھر جب وہ اپنے کمرے میں اکیلی تھی، زمان تحفوں کا ایک پیکٹ لیے اس کے کمرے میں آیا تھا۔

پیکٹ لیتے ہوئے بصیرہ کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ اسے کھول کر اس نے بڑے اصرار سے زمان کے لائے ہوئے تحفے واپس کر دیے تھے صرف گانوں کے ٹیپ رکھ لیے تھے۔ زمان نے ایک ٹیپ نکالا تھا اور میوزک ڈیک پر گرد سے بچانے والی چادر ہٹا کر اس پر یہ ریکارڈ لگا دیا تھا۔ سفید چادروں سے ڈھکے، کاغذوں سے ڈھانپے بند کھڑکیوں اور دروازوں والے کمرے میں جہاں سے ساری قیمتی چیزیں اُٹھالی گئی تھیں آرائشی چیزیں غائب تھیں۔ بستر کی جگہ سفید چادریں مسہری پر پڑی تھیں۔ دیواریں تصویروں سے اور گلدان پھولوں سے خالی تھے۔ ماتم زدہ اس گھر میں جہاں ویرانی ابھی سے سر کھولے پھر رہی تھی اور فراق کے ان گنت ماہ و سال چوکھٹ سے لگے بیٹھے تھے، اس گانے نے عجیب رنگ باندھا تھا:

''تم آنسوؤں سے لبریز آنکھیں لیے میرے سامنے کھڑی ہو۔
تم سوچ رہی ہو میں تمھیں کوسوں کاٹوں گا
تمھارا دل دُکھانے کے لیے کچھ کہوں گا
پھر تم مجھے نہیں جانتیں
میں نے کبھی تمھارا دل نہیں دُکھایا
تو کیا اس لمحے تمھارا دل دُکھاؤں گا؟
میں تو اس زمین کو بوسہ دیتا ہوں جہاں تم چلی ہو
کاش میں تمھیں اپنے بازوؤں میں لے سکتا
کاش.......

گانا ختم ہوا تو زمان نے کہا تھا، ''اسی امید میں یہ گانا لے آیا تھا کہ شاید اپنی بات تمھیں سنا سکوں، اِسے اپنے ساتھ لیتی جاؤ، کبھی کبھی سن لیا کرنا اور یاد کر لیا کرنا کہ دنیا میں ایسے پاگل لوگ بھی ہیں جو بچوں کی طرح چاند کی طرف ہمکنا کبھی نہیں چھوڑتے...... جو کبھی بڑے نہیں ہوتے۔ ایسے باؤلے لوگوں کی کچھ زندگی خواب دیکھنے میں گزر جاتی ہے اور کچھ اس بات کا غم کھانے میں کہ وہ کیوں اس قابل بھی نہیں تھے کہ خواب ہی دیکھ سکیں۔''

''زمان!'' بصیرہ نے بڑے سکون سے اپنی آنے والی موت کے پورے تیقن سے کہا تھا، ''مجھے یقین ہے کہ تم بہت جلد اس جذبے پر قابو پالو گے جو میری قربت نے نہیں دوری نے دیا ہے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے کہ جو چیز نہ مل سکے وہ دنیا کی اہم ترین چیز بن جاتی ہے مگر جب مل جائے تو اس کی حیثیت دو کوڑی کی بھی نہیں رہتی۔ چاند بھی تو دور ہی سے اچھا لگتا ہے۔'' بصیرہ نے ہنس کر بشاشت سے اضافہ کیا تھا، ''ورنہ اس میں ہے کیا پتھروں اور گڑھوں کے سوا۔ آکسیجن تک تو ہے نہیں۔ لمحہ بھر تو

کوئی وہاں زندہ نہیں رہ سکتا۔'' پھر اس نے سنجیدگی سے کہا تھا، ''مجھے محسوس ہوتا ہے جیسے اب میں اس گھر میں کبھی واپس نہیں آؤں گی۔''

زمان صرف اداسی سے اسے تکتا رہا تھا۔ بصیرہ نے اسے رحم بھری نگاہوں سے دیکھا تھا۔ اسے معلوم تھا اب تک اس شخص کے لیے ظاہری چیزوں کی بہت اہمیت تھی۔ بچپن سے اس کے دل میں احساسِ کمتری نے گھر بنا رکھا تھا۔ مٹی کے کیڑے کی طرح اس کے مختلف حصے تھے جو وقت کی چکنی مٹی سے اور مضبوط ہوتے جا رہے تھے۔ کج نظر سے دوسروں کے ساتھ موازنہ کر کے قدرت کی ناانصافیوں کے بارے میں اس کا اپنا ایک نقطۂ نظر بن گیا تھا۔ کچھ لوگ ازلی خوش نصیب ہوتے ہیں، خوش نصیبی کی علامت خوش حالی جس کا قدرتی نتیجہ دنیاوی عزت واحترام اور آسائشیں۔ کچھ لوگ ازلی بدنصیب ہوتے ہیں۔ بدنصیبی کے ساتھ نتھی بدحالی جس کا منطقی نتیجہ درجاتی نظام میں نچلا درجہ، قدم قدم پر بند دروازے، حقارت اور ہتک۔ اس نظریے سے وہ اس نتیجے تک پہنچا تھا کہ دن رات کی محنت، کوشش یا ذہانت سے اگر آپ اپنا طبقاتی درجہ بدل لیں تو خوش بختی کے ساتھ دنیاوی مراعات اور آسائشیں آپ کی مٹھی میں ہوں گی۔ شاید کسی بھی قیمت پر یہ سودا گراں نہیں ہے۔ اب چاند کی طرف ہمکنا بچپنے کی ناپختگی نہیں تھی ایک سوچی سمجھی اسکیم تھی۔ خلانوردوں کی چاند پر قدم رکھنے کی مہم جس کے ساتھ بہت سی آگے کی راہیں کھلنے کی امید تھی۔ بصیرہ کو اس پر سچ مچ رحم آ گیا تھا۔

''زمان!'' اس نے واقعی بھرائی ہوئی آواز میں کہا تھا، ''میں نے بچپن میں تمھارے ساتھ بہت زیادتیاں کی ہیں۔ میں خود غرض تھی، کلاس سسٹم میں یقین رکھتی تھی۔ جتنا ابا اس بات پر زور دیتے تھے کہ تمھیں گھر کا فرد جانوں اتنی ہی میری ضد بڑھتی تھی کہ تمھیں جتاؤں کہ یہ تمھارا گھر نہیں ہے نہ کبھی ہو سکتا ہے۔ میں سچ مچ بے حد شرمندہ ہوں اور آج تم سے اُن سب زیادتیوں کی معافی مانگتی ہوں۔''

''تمھاری باتوں سے کچھ فائدہ بھی تو ہوا۔'' زمان نے کہا، ''اس گھر کو چھوڑ کر نہ جاتا تو شاید آج وہاں نہ ہوتا جہاں ہوں۔'' اُس کے لہجے میں فخر تھا، ''یہ بھی تم نے ٹھیک کہا کہ جو چیز نہ ملے وہ بہت اہم ہو جاتی ہے۔ بچپن میں انگوٹھا پیا کرتا تھا۔ ابا نے یہ سوچ کر کہ یہ انگوٹھا بعد میں جان لیوا بن جائے گا انگوٹھے کی جگہ مجھے چُسنی کا عادی بنا دیا۔ انگوٹھا چھڑانا اس لیے مشکل ہو جاتا ہے کہ نہ چھپایا جا سکتا ہے نہ پھینکا جا سکتا ہے۔ چُسنی کو ایک دن چھپا کر بچے سے کہہ دیا جاتا ہے کہ بندر یا بھوبو کوئی فرضی جانور لے گیا۔ بظاہر بچہ رو پیٹ کر صبر کر لیتا ہے مگر ان دنوں جو اس پر گزر جاتی ہے اس کی کسی کو بھی خبر نہیں ہوتی۔ وہ ہُوکا کب تک رہتا ہے، کن کن موقعوں پر، کس کس عمر تک اس کا جی چاہتا ہے کاش چُسنی ہی مل جاتی جسے منھ سے لگا کر سکون مل جاتا۔ بڑے تو سمجھ لیتے ہیں کہ بچہ اب بڑا ہو گیا ہے لیکن

انھیں کیا معلوم کہ احساسِ محرومی کب تک رہتا ہے۔''

ہاں احساسِ محرومی۔ خود اس کے اندر محرومی کے احساس کی جڑیں کتنی گہری تھیں! وہ خود کسی چیز کی تلاش میں تھی مگر نہیں جانتی تھی کہ وہ کیا کھوج رہی ہے۔ آنکھیں کھولے بھی انسان لاشعوری طور پر تمناؤں کی رسّی سے بندھا جانے کون سے پہاڑ سر کرنے کی کوشش میں سرگرداں رہتا ہے۔ اٹکی ہوئی رسّی کا سرا نکل جائے تو وہ دھڑام سے برفیلی گھاٹیوں میں گر پڑتا ہے اور اس کی ہڈی پسلی ایک ہو جاتی ہے۔ زخم بھر جائیں تو وہ انجانے میں پھر اُن ہی راہوں پر چل پڑتا ہے...... یہ سب سوچتے سوچتے غنودگی میں جھولا جھولتی وہ پھر فراموشی کی وادی میں اُتر گئی۔

بصیرہ کی طبیعت بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ اسے اسپتال میں تھوڑا سا چلایا پھرایا بھی جاتا تھا۔ روز کبھی الگ الگ کبھی سب ٹولے کی شکل میں اس سے ملنے چلے آتے تھے۔ کمرے میں بیٹھنے کی جگہ نہ تھی اس لیے تھوڑی دیر گپ شپ کر کے چلے جاتے تھے۔ ایک دن سلیم آیا تو سمن اور ڈیو پہلے سے وہاں موجود تھے۔ وہ ٹھٹھک کر کھڑا ہو گیا۔ ڈیو ہمیشہ کی طرح زور شور سے ہاتھ چلا کر، کندھے اور بھنویں اُچکا کر باتیں کر رہا تھا۔ سمن کا چہرہ پوری طرح سامنے نہیں تھا مگر اس کی ٹھوڑی کا کٹاؤ اور اس کی آنکھوں کا جماؤ اس کی دلچسپی کا غماز تھا۔ سلیم کمرے میں داخل ہوا تو اس کے چہرے پر قدرتی نمکینی کے علاوہ کلونس کی ایک اور تہ بصیرہ سے چھپی نہ رہ سکی۔ ڈیو بے تکان بولتا رہا۔

''اچھا بتاؤ تمھیں اس بات کا یقین ہے یا نہیں کہ وہ شخص جو اُس دن دریائے نیاگرا میں کودا اُس نے تمھاری موت کو گلے لگا لیا۔''

''معلوم نہیں۔'' بصیرہ نے مشکوک لہجے میں کہا، ''مگر مجھے یہ ضرور محسوس ہوتا ہے جیسے میرے اُوپر موت کا جو سایہ منڈلا رہا تھا وہ ہٹ گیا ہے۔''

''دیکھا، یہی ثبوت ہے۔'' ڈیو نے فاتحانہ انداز میں کہا، ''تمھاری خاطر کوئی اور بے چارہ مارا گیا۔''

''مگر یہ کیسے ہو سکتا ہے؟'' سمن نے بے یقینی سے کہا۔

''کیوں نہیں ہو سکتا۔'' ڈیو نے زور دے کر کہا، ''جس زندگی کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں وہاں کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ ہمیں کیا معلوم ان کی فزکس اور کیمسٹری کے اصول کیا ہیں۔ ہم تو یوں سوچ سکتے ہیں کہ کسی وجہ سے موت کے فرشتے نے کمپیوٹر سے تمھارا نام نکال کر اُس کا نام ڈال دیا اور تمھیں معلوم ہے یہ فرشتے کون ہوتے ہیں؟''

''معلوم نہیں۔'' بصیرہ نے کہا۔ ''ہم نے تو یہی سنا ہے کوئی مخلوق ہیں جن کی جنس نہیں، جو معصوم ہوتے ہیں۔ گناہ کرنے کے قابل نہیں۔ مختلف کام اُن کے سپرد ہیں مثلاً کندھوں پر بیٹھے لوگوں کی

زندگیوں کا لمحہ لمحہ حساب۔''

''یہ تو بالکل ہی کمپیوٹر کا نقشہ کھینچا آپ نے۔ پھر اتنی تیزی سے کون عمر بھر کا حساب رکھ سکتا ہے۔'' ڈیو نے کہا۔

''اور یہ بھی تو سنا ہے کہ قبر میں وہ سوال و جواب کرنے آتے ہیں اور اعمال نامے۔'' سمن نے کہا۔ اچھا تو ہو سکتا ہے کہ روبوٹ قسم کی مخلوق ہوں جن کے اندر کمپیوٹر اور کیمرے فٹ ہوں۔ اعمال نامے تو ان کے پاس کمپیوٹر میں موجود ہوں گے ہی اور پوری زندگی کا ویڈیو ٹیپ شاید۔''

''اچھا اب یہ فضول باتیں چھوڑو بصیرہ کو آرام کرنے دو۔'' سمن نے کہا۔

''ہاں تو وہ مسٹر جو تمھارے پیچھے تھے اس دوسرے آدمی کو پکڑ کر لے گئے، کبھی کبھار غلطی بھی تو ہو سکتی ہے۔'' ڈیو نے مکالمے جاری رکھے۔

''غلطی ٹھیک بھی تو کرنی پڑتی ہو گی۔'' بصیرہ نے فکرمندی سے کہا۔

''ارے نہیں، اتنی چھوٹی سی غلطی سے کیا فرق پڑے گا۔ ہم تم جیسے لوگ یہاں ہوں یا وہاں ایک ہی بات ہے۔'' وہ ہنسا۔

''تم تو یوں کہہ رہے ہو جیسے عالم بالا کی ساری کارروائیوں سے واقف ہو۔'' سمن نے کہا۔

''ارے بھئی جب ہمیں کچھ معلوم نہیں تو ہم سارے امکانات کیوں نظر میں نہ رکھیں۔'' ڈیو نے خوش دلی سے کہا۔ سلیم خاموش کھڑا یہ ساری گفتگو سن رہا تھا۔ اسی وقت پدما مائیکی کے ساتھ اندر داخل ہوئی۔

''ہلو..... ہائے......'' کئی آوازیں ایک ساتھ بلند ہوئیں۔

''دیر لگی آنے میں ان کو شکر ہے پھر بھی آئے تو.....'' ڈیو نے کہا۔

''ڈیو! تم یہ شعر پڑھ پڑھ کر مجھے احساسِ کمتری میں مبتلا مت کیا کرو۔'' بصیرہ نے کہا۔

''اور تمھاری دولت جو ہم جیسوں کو ہر وقت احساسِ کمتری میں مبتلا کرتی ہے۔'' ڈیو بولا، ''کبھی کبھی میں سوچتا ہوں تمھارا شوہر کم بخت تو بڑے مزے میں رہے گا۔ سارا دن گھر میں پڑا پلنگ توڑے گا اور.....'' ڈیو نے سلیم کو کمرے سے باہر نکلتے دیکھا تو لپک کر اسے پکڑ لیا۔ ''ارے ٹھہرو کہاں بھاگے جا رہے ہو۔ میں بصیرہ سے ایک بڑی مزے دار بات پوچھنے والا ہوں۔''

''کیا بات؟'' بصیرہ نے دلچسپی سے پوچھا۔

''مثلاً جو شخص تم سے شادی کرے گا، چلو فرض کرو میں یا سلیم تم سے شادی کریں تو تم کتنا پاندان کا خرچ ہمیں دو گی..... پاندان کا خرچ ہی کہتے ہیں نا؟''

''ڈیو! کبھی کبھی تم کیسی باتیں کرتے ہو بغیر سوچے سمجھے۔'' سمن نے اسے ڈانٹا۔ سلیم کا چہرہ یوں

ہو رہا تھا جیسے کسی نے جلتی لکڑیوں کو بھڑکانے کے لیے دوبارہ ہلا دیا ہو۔

''لیکن ایسی باتیں کرنے میں حرج کیا ہے؟ This is a hypothetical question سوال پوچھنا اچھا ہوتا ہے، بزرگوں نے کہا۔'' ڈیو بولا۔

''سوال پوچھنا گدھا پن ہے۔'' سلیم نے طیش میں کہا، ''کیوں کہ کسی کے پاس سوالوں کا کوئی جواب نہیں ہے۔''

''سوالوں کے جواب تو ہیں مگر ہم لوگوں سے چھپا کر رکھے گئے ہیں جیسے اُستاد امتحان کے پرچے بناتے ہیں تو جواب چھپا کر رکھتے ہیں۔ یہ سوال ساری انسانی نسل کے لیے ہیں، قیامت تک کے لیے۔ سارے جواب ہمیں کیسے بتائے جا سکتے ہیں۔'' ڈیو بولا۔

''ہاں۔'' پدما نے کہا، ''مجھے بھی یوں ہی لگتا ہے جیسے کوئی بہت بڑا جگ سا پزل ہے۔ اس کے ٹکڑے سب لوگ جوڑ رہے ہیں۔ بچوں کی طرح غلط سلط لگاتے ہیں، نکالتے ہیں پھر لگاتے ہیں۔ جب تک سب ٹکڑے اپنی اپنی جگہ نہ لگیں سب کو اسی طرح جان کھپانا ہے۔ ہے کہ نہیں؟''

''بالکل۔'' مائیکی نے کہا، ''اچھا خیال ہے۔ ایک نسل مشکل سے ایک یا دو ٹکڑے لگاتی ہے۔ کبھی ایک صدی میں دو تین ٹکڑے لگتے ہیں۔ ظاہر ہے بنانے والا نہیں چاہتا کہ کھیل جلدی سے ختم ہو جائے۔''

''اچھا کسی کو یہ بھی یاد ہے کہ آج ہم نے ٹرپ کے ٹکٹ لے رکھے ہیں؟'' سمن نے پکار کر کہا۔

''ارے ہاں بھئی چلو.... بائی.... خدا حافظ.....'' کرتے باری باری سب نکل گئے۔ صرف سلیم کمرے میں رہ گیا کیوں کہ وہ یہاں سیر کے لیے نہیں آیا تھا۔ اشرف بھائی اور ناز بھابی اس سے یقیناً توقع رکھتے تھے کہ وہ بصیرہ کی تیمارداری نہ سہی، کم از کم اسپتال جا کر دل تو بہلائے گا۔

''سلیم! میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتی تھی۔'' بصیرہ نے مسہری پر تکیہ درست کر کے اپنا سر ٹکا دیا۔

''کہیے۔''

''میں نے اُس دن نیاگرا فالز پر یہ نہیں کہا تھا کہ سمن نے ڈیو سے شادی کر لی ہے۔ میں نے کہا تھا سمن ڈیو سے شادی کر لے گی یا اسی قسم کا کوئی جملہ.... صحیح الفاظ تو اب مجھے یاد نہیں۔'' بصیرہ نے کہا۔

''تو ٹھیک ہے۔'' سلیم نے نظریں جھکا لیں۔ ''ایسی بھی کیا بات ہے کہ آپ صفائی پیش کریں۔ میں نے تو آپ سے کچھ بھی نہیں کہا۔''

''پھر بھی۔'' بصیرہ بولی، ''اس رات شور اور ہنگامے میں سمن نے مجھ سے بہت ڈانٹ کر پوچھا۔''

''اچھا!'' سلیم نے نگاہیں اُٹھا کر حیرت سے پوچھا، ''کیوں بہت برا لگا انہیں۔ مگر میرا بھی قصور نہیں ہے۔ میں نے بھی سنا۔ ڈیو کے ساتھ دیکھا تو مبارک باد دے دی۔''

''بعد میں معذرت کی؟'' بصیرہ نے پوچھا۔

''نہیں۔ اتنے بہت سے واقعات ہوتے چلے گئے۔ مجھے خیال بھی نہیں رہا۔ دوبارہ بات نکالنا مناسب بھی نہیں تھا۔''

''کوئی حرج بھی نہیں تھا۔ شاید سمن اس بات پر آپ سے اب بھی خفا ہو۔'' بصیرہ نے کہا۔

''اُس نے کچھ کہا؟'' سلیم نے جلدی سے پوچھا۔

''نہیں، مجھ سے تو نہیں کہا۔'' بصیرہ نے کہا۔

''مگر وہ شادی کی بات......'' سلیم نے جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔

''ڈیو سمن میں دلچسپی لے رہا ہے، یہ بات کسی سے چھپی نہیں ہے۔'' بصیرہ نے کہا۔ ''میں نے آپ سے اس لیے کہا کہ اگر کبھی وہ دوستی کی اس پہاڑی سے پھسلے تو کیا آپ......'' اُس نے بھی بات ادھوری چھوڑ کر سلیم کی طرف دیکھا۔

یکا یک سلیم کا چہرہ جلتے توے کی طرح سرخ ہو گیا اور پھر جیسے تپا توا حد سے زیادہ گرم ہونے پر دھواں چھوڑنے لگے۔ ''میرا کام ٹھوکر کھائی گیندوں کو کیچ کرنا نہیں ہے۔'' وہ تیزی سے کمرے سے باہر نکل گیا۔

''نہ سہی...... پچھتاتے رہنا۔'' سلیم کے کمرے سے نکل جانے کے بعد بصیرہ نے اس کے پیچھے بلند آواز سے کہا، جیسے آواز نہ سہی خیال ہی اس تک پہنچ جائے گا۔

پھر بستر پر لیٹ کر آنکھیں بند کر لینے کے بعد اس نے سوچا۔ کچھ لوگ ناخوش رہنے ہی میں خوش رہتے ہیں شاید۔

وہ سب اپنے ٹھکانوں پر جانے سے پہلے خدا حافظ کہنے اسپتال آئے تھے۔

''ڈیو، تم آج کل کیا کر رہے ہو؟'' بصیرہ نے پوچھا۔

''شوق پورے کر رہا ہوں۔ بچپن سے ستاروں سے عشق تھا آج کل باقاعدہ ستارہ شناسی پڑھ رہا ہوں یونی ورسٹی میں۔ اس کے بعد ایک کتاب لکھنے کا ارادہ ہے اپنے تجربے کے بارے میں۔''

''خاصی خطرناک کتاب ہوگی۔'' مائیکی نے ہنس کر کہا۔

''مما نے نوٹس دے رکھا ہے کہ باپ کی بزنس میں آنے اور جم کر بیٹھنے سے پہلے پہلے سارے ارمان نکال لو۔'' ڈیو نے کہا۔

''پھر تو شادی بھی کر ڈالو'' پدما بولی۔

''شادی اگر شوق ہے تو پہلے کرلو، جم کر بیٹھنے کا حصہ ہے تو بعد میں کرلینا'' مائیکی نے آنکھ ماری۔

''یہ بات ہی تو ابھی طے نہیں ہے'' ڈیو نے سمن کی نگاہیں ٹٹولنے کی کوشش کی جو اس مکالمے سے لاتعلق بننے کی کوشش میں بستر پر تقریباً ہوا میں معلق ٹیلی وژن کو تک رہی تھی۔ سلیم خود کو بے واسطہ ظاہر کرنے کے لیے بصیرہ کے لیے لائی گئی کسی کتاب کے اوراق اُلٹ رہا تھا۔

''بھیڑ بہت بڑھ گئی ہے اب چلنا چاہیے'' مائیکی نے کہا۔ مرد حضرات خدا حافظ کہہ کر پارکنگ میں کاروں کے پاس چلے گئے۔ صرف سلیم کمرے میں رہ گیا کیوں کہ اسے ان کے ساتھ نہیں جانا تھا۔ لڑکیاں سلیم کی موجودگی سے بے خبر بڑ بڑ باتیں کیے جا رہی تھیں۔

''لانا میرا کڑا دینا'' بصیرہ نے ناز سے کہا۔ ناز نے اپنے ہاتھ سے کڑا اُتار کر بصیرہ کی طرف بڑھایا۔ بصیرہ نے کڑا لے کر سمن کے ہاتھ میں دے دیا۔ ''سمن، لو یہ تم پہن لو۔ آپریشن سے پہلے اُتروا دیا تھا شاید ان لوگوں نے۔''

سمن نے کڑے کو اُلٹ پلٹ کر دیکھا۔ ''سونے کا ہے..... نا بابا، یہ کس خوشی میں دے رہی ہو؟''

''ایسے ہی'' میرے ہاتھ میں تنگ ہوتا جا رہا ہے، ناز کو پسند نہیں۔ تمھارے منے سے ہاتھ میں اچھا لگے گا.... پہن کر دیکھونا!''

سمن نے کڑا کلائی میں ڈالا۔

''واقعی بہت خوب صورت لگ رہا ہے'' ناز نے کہا۔

''بیوٹی فل'' پدما بولی۔

سمن نے کڑا اُتار کر بصیرہ کو واپس دے دیا۔ ''میں اتنا قیمتی تحفہ نہیں لے سکتی بھائی، کوئی تک بھی ہو''

''اس کی شادی کے موقعے پر دے دینا'' ناز نے کہا۔

''اچھا ابھی تو ایسے ہی رکھ لو اُدھار سمجھ کر جیسے آرٹ گیلریوں میں اُدھار تصویریں آتی ہیں۔ اگلی ملاقات پر واپس لے لوں گی'' بصیرہ نے کہا۔

سمن ہچکچائی تو پدما نے کہا، ''لے لو، وہ پیار سے دے رہی ہے۔ ایک دن کے لیے میں بھی تم سے اُدھار لے لوں گی''

''شادی کے لیے؟'' ناز نے پوچھا۔

''ہوسکتا ہے....'' پدما نے گول مول جواب دیا۔

''ارے ہاں تمھاری شادی ہو گی کیسے؟'' بصیرہ نے دلچسپی سے پوچھا۔ ''چرچ میں سفید کپڑوں میں یا سرخ بنارسی ساری باندھ کر بندی لگا کر مندر میں؟''

''بھگوان جانے۔'' پدما نے کہا۔ ''اتنی بہت سی باتیں سیٹل کرنے کو ہیں تبھی تو میں ابھی شادی کرنے کو تیار نہیں۔ جب مائیکی کی اور میری پڑھائی ختم ہو جائے گی تب ہم شادی کریں گے۔ ویسے تم اور ناز شادی میں آنا ضرور!''

''اگر یہاں ہوئی تو آؤں گی۔'' بصیرہ نے کہا۔

''تم شادی کے بعد اس طرف ضرور آنا۔ جانتی ہو نیاگرا تو یوں بھی ہنی مون کیپٹل ہے'' ناز نے کہا۔

اچانک ہی بلا ارادہ سلیم اور سمن کی نگاہیں مل گئیں اور پھر جدا ہو گئیں۔

''ہاں کیوں نہیں.....'' پدما نے ناز سے کہا، ''ہو سکتا ہے ہماری اور ڈیو کی شادی اکٹھی ہو۔''

دفعتاً سمن کو محسوس ہوا جیسے اس موقعے پر اسے کچھ کہنا چاہیے، شاید اس کی خاموشی برمحل نہ ہو۔

''ڈیو کی شادی، کس سے؟'' اس نے بھولپن سے ہنس کر پوچھا۔ اس کی ہنسی میں کھسیاہٹ اور گھبراہٹ کلبلاتی سب نے محسوس کی۔

''ایک نیلم پری سے.....'' پدما نے پلٹ کر اسے سر سے پیر تک دیکھا۔ وہ نیلے رنگ کے لباس میں تھی۔ ہاتھ میں بصیرہ کا دیا ہوا کڑا پڑا تھا۔ وہ پرس کھول کر یوں اس میں جھانکتی رہی جیسے اُس نے پدما کی بات سنی ہی نہ ہو۔

سلیم جواب کھڑکی میں کھڑا تھا غصّے سے کھولتا رہا۔ کسی کے پاس اس کے ماتھے پر پڑے ہوئے بلوں کو دیکھنے کا وقت نہیں تھا۔

''میں تو اس سے کہتی ہوں.....'' پدما نے لہجے کو ذرا سا نیچے اُتارا اور آواز کو سرگوشی کی کیفیت دی، ''لڑکا ہینڈسم ہے، انٹیلی جینٹ ہے اور امیر ہے.... اس کے ساتھ سو جا، بات ختم کر۔ آخر امریکن ہے۔ یہ کس کے نکھرے اُٹھاتے ہیں۔ ایک دفعہ چلا گیا تو پھر ہاتھ نہیں آئے گا۔''

سمن یکا یک سر سے پیر تک سرخ ہو گئی۔ سلیم کو لگا جیسے کمرے میں درجۂ حرارت ۱۰۰ سے اُوپر چلا گیا ہوں۔

''اسے اُلٹا سبق مت پڑھاؤ پدما۔'' بصیرہ نے بھی آواز کا سُر ذرا نیچے رکھا۔ ''تمھیں کیا معلوم کتنے دل اس کی ننھی سی مٹھی میں ہیں۔'' بصیرہ نے سلیم کو دیکھنا چاہا مگر وہ کونے میں کھڑکی کی طرف منہ کیے باہر جھانک رہا تھا۔

پدما نے ہاتھ کا انگوٹھا اُٹھا کر سلیم کی پیٹھ کی طرف اشارہ کیا اور بصیرہ کی طرف سوالیہ نظروں

سے دیکھا۔

بصیرہ نے اثبات میں گردن ہلائی۔

''آئی ایم سوری۔'' پدما نے رسماً کہا۔ اُس کے لہجے میں ذرا بھی افسوس نہیں تھا۔

''خدا کے لیے چلو...... دیر ہورہی ہے۔'' سمن نے کہا اور اپنی کلائی سے کڑا اُتار کر بصیرہ کو دیا۔

''فی الحال اپنے پاس رکھو، ابھی بہت دن زندہ رہو گی۔''

پدما اور سمن، بصیرہ اور ناز سے گلے ملیں۔ پدما نے سلیم سے ہاتھ ملایا جواب آہستہ آہستہ چلتا بصیرہ کے بستر کے نزدیک آ کھڑا ہوا تھا۔ سمن نے سلیم کو خدا حافظ کہا۔

کمرے سے نکلتے نکلتے دونوں نے پلٹ کر دیکھا اور خدا حافظ کہہ کر ہاتھ ہلاتی ہوئی غائب ہوگئیں۔

''کہیں کا اینٹ، کہیں کا روڑا، بھان متی نے کنبہ جوڑا۔'' ہماری امی ہوتیں تو کہتیں۔ ناز نے کہا۔

سلیم اور بصیرہ نے کوئی جواب نہیں دیا۔ چند لمحے خاموشی میں گزرے۔ پھر بصیرہ نے بات شروع کی۔ ''سلیم آپ کب تک ٹورانٹو میں ٹھہریں گے؟'' اس نے پوچھا۔

''اگلے مہینے میرا دوست اپنی بیوی کے ساتھ امریکا آرہا ہے۔ ان کے ساتھ تھوڑی سی سیر کروں گا اور واپس چلا جاؤں گا۔'' سلیم نے کہا، ''میرے پاس شوق پورے کرنے کے لیے سرمایہ نہیں ہے۔'' اس کے لہجے میں خواہ مخواہ کی خفگی تھی۔

''آپ کا دوست؟ امان؟'' بصیرہ نے پوچھا۔

سلیم اندر ہی اندر تھوڑا سا جھلایا۔ اس لڑکی کو کریدنے کی کتنی عادت ہے۔ تھوڑا سا کسمسایا۔

''ہاں۔'' بالآخر اس نے کہا۔

''امان کی بیوی کیسی ہے؟'' بصیرہ نے دوسرا سوال داغا۔

بیمار ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ آپ اس سے ناجائز فائدہ اُٹھائیں اور بے تکان دوسروں کے ذاتی معاملات میں دخل دیں۔ سلیم کا جی چاہا کہہ ڈالے مگر ناز بھابی سامنے کھڑی تھیں اور دونوں کی باتیں نہایت دلچسپی سے سن رہی تھیں۔

''ٹھیک ٹھاک ہیں۔'' سلیم نے بات ہنرمندی سے ٹالی۔

''جب کسی کے بارے میں کچھ نہ بتانا ہو تو کہا جاتا ہے، ''ٹھیک ٹھاک۔'' بصیرہ نے فوراً رگ پکڑ لی۔ ''آپ کوئی اور دو الفاظ کہنے کی کوشش کریں۔''

''دو الفاظ!'' سلیم سوچ میں پڑ گیا۔ آہستہ آہستہ اس کا غصہ بھی زائل ہونے لگا۔ بے ضرری بات ہے۔ وہ خواہ مخواہ برا مان رہا ہے۔ ''یوں سمجھیے...... خوب صورت اور امیر۔'' اس نے خوش دلی سے کہا۔

''ہاں یہ بات ہوئی۔'' بصیرہ بھی خوش ہوگئی۔ ''بہت خوب صورت اور بہت امیر؟'' بصیرہ نے ناز کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھ کر سلیم سے پوچھا۔

''آپ جتنی تو شاید نہیں۔'' سلیم مسکرایا۔ ''مگر کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ شاید نو دولتیے ہوں۔ نیا شان دار سا گھر ہے جیسے آج کل کراچی میں بن رہے ہیں ہزار دو ہزار گز پر۔''

''بہنیں وہنیں بھی ہیں؟'' بصیرہ نے بڑی بوڑھیوں کی طرح پوچھا۔

''ہاں ہیں، ایک تو یقیناً ہے۔'' سلیم ہنسا۔ ''نادرہ جو امان کی بیوی سائرہ سے عمر میں بڑی ہیں مگر غیر شادہ شدہ ہیں۔''

''کیسی ہے؟'' بصیرہ نے بے لاگ پوچھا۔

''ٹھیک ٹھاک۔'' سلیم نے جواب دیا۔

''یعنی خوب صورت اور امیر!'' بصیرہ نے سکون سے کہا۔

''کہہ سکتے ہیں، کیوں؟'' سلیم مسکرایا۔

''امان نے یہ نہیں کہا آپ سے کہ میری سالی سے شادی کرلو۔'' بصیرہ کی جرح جاری تھی۔

''دیکھیے بھابی!.....'' سلیم نے دہائی دی۔ ''آپ کی دوست مجھ سے کس قسم کے سوال کررہی ہیں۔''

''میں کیا کرسکتی ہوں۔'' ناز نے مسکرا کر کہا، ''نہ میں نے اس سے سوال پوچھنے کو کہا نہ روک سکتی ہوں، تم چاہو جواب دو چاہو نہ دو۔''

''اچھا......یہی سہی۔'' سلیم ڈٹ کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ ''کہا تھا، اب کہیے۔''

''پھر آپ نے کیا کہا؟'' بصیرہ نے پوچھا۔

''میں ساری گفتگو نہیں دہراؤں گا، مختصراً یہ کہ میرا ارادہ نہیں ہے۔''

''آپ کو دلچسپی نہیں ہے اس رشتے میں، یہی بات ہے؟''

''جی ہاں......مگر آپ کیوں پوچھ رہی ہیں؟'' سلیم نے حیران ہوکر اس کی طرف دیکھا۔

''اس لیے کہ مجھے دلچسپی ہے اور میں ایک شخص کو جانتی ہوں جس کو یقیناً اس رشتے سے دلچسپی ہوگی۔ امان کی بیوی اور والدین بھی خوش ہوجائیں گے۔ آدمی معقول ہے۔ کیا آپ امان کا پتا دے سکتے ہیں؟''

''ضرور......ابھی لکھے دیتا ہوں۔'' سلیم نے کاغذ اور قلم کے لیے بٹوہ ٹٹولا۔ پھر ایک کارڈ بصیرہ کی طرف بڑھایا۔ ''لیجیے، اتفاق سے امان کا کارڈ ہی نکل آیا۔ کبھی مجھے کچھ لکھ کر دیا تھا۔''

بصیرہ نے ہاتھ بڑھا کر لے لیا۔ ناز ساری کارروائی غور سے دیکھتی رہی۔ ناز نے یہ بھی دیکھا کہ کارڈ دیتے ہوئے سلیم نے اپنی نگاہ نیچی رکھی جب کہ سمن کی طرف اس کی نظریں ہمیشہ جیسے بے

اختیار اُٹھ جاتی تھیں۔

"بھابی آپ ٹھہریں گی؟ میں گھر جا رہا ہوں۔" سلیم نے ناز سے کہا۔

"نہیں، میں بھی چلتی ہوں۔ شام کو اشرف کے ساتھ آ جاؤں گی۔"

شام کو جب ناز دوبارہ آئی تو ضمیر صاحب کے نام بصیرہ کا خط تیار رکھا تھا۔ امان کا کارڈ اس میں تھا اور امان کے سسرال سے زمان کو ملا دینے کی پرزور سفارش تھی۔

آج پھر تاریک، گھٹا ٹوپ دن تھا۔ گیلا نہیں سیلا سیلا، کسی بھی لمحے برس پڑنے کو تیار۔ گلیاں سنسان تھیں۔ سیلن اور سناٹا اور لحہ لحہ بھرتی سرماہٹ دل کو سلگا رہی تھی۔ ہر چیز جیسے بند ہونے کو ہو، آسمان سمٹ رہا ہو، درخت جھک رہے ہوں، گھر ڈوبے جا رہے ہوں۔ سارا شہر دُھند اور بادلوں میں ڈوبا، سُونا سُونا اور اجنبی لگ رہا تھا۔ اتنی اجنبیت تو اس وقت بھی محسوس نہیں ہوئی تھی جب وہ نئی نئی آئی تھی بلکہ وہ اجنبیت کسی نئے اور اچھے دوست کی طرح بڑی بھلی لگی تھی۔ چھوٹے سے شہر میں کھو جانا ممکن نہ تھا مگر وہ جان بوجھ کر راستہ بھولتی تھی۔ بڑے سے ہرے بھرے اسکواڈ کو ہر روز نئی راہ سے طے کرنا، آمری اور جم اور درختوں کے جھنڈوں سے گزر کر راہیں قطع کرنا اور نئی جگہ پہنچ کر حیران ہونا اور راہیں بدل کر ایجوکیشن بلڈنگ تک پہنچنا۔ یونی ورسٹی کی دور دور تک پھیلی سرخ عمارتیں، ان سے چمٹی آئی وی کی بیلیں، پرانے چرچ کی عمارت، اس میں جھولتی بڑی سی گھنٹی اور سامنے چبوترے پر بنے سبز مجسمے اور نارنجی اودے ٹیولپ انگلستان کی یونی ورسٹیوں کی تصاویر میں بارہا دیکھے تھے۔ ان کے درمیان گھومنا پھرنا خوابوں میں گھومنے پھرنے کے برابر لگتا تھا، پراسرار اور ناقابلِ یقین۔ بعض عمارتوں کو صرف اس لیے نہیں پہچانتی تھی کہ ان میں کسی اور طرف سے داخل ہوئی تھی۔ چار منزلہ عمارت کی ساری منزلیں ایک دم سے اسی لیے نہیں کھنگالی تھیں کہ اجنبیت باقی رہے۔ کبھی بس میں بیٹھ کر ویسٹ سائڈ پارک چلی جاتی، کبھی چہل قدمی کرتی ہیل پارک نکل جاتی۔ سایہ دار درخت تلے چہل قدمی کرنے اور تنہائی کے بھرپور احساس کے ساتھ بنچ پر بیٹھ کر دوسروں کو ہنستا کھیلتا دیکھنا بھی اچھا لگتا تھا مگر اب جب کہ وہ اس شہر سے مانوس ہوگئی تھی یہ شہر اجنبی ہوتا جا رہا تھا۔

سمن ڈارم کا کمرہ خالی کرنے سے پہلے اسے رگڑ رگڑ کر صاف کر رہی تھی۔ اگر کمرہ پوری طرح صاف نہ ہوا تو ہرجانہ دینا پڑے گا۔ فیسیں ویسے ہی آسمانوں سے باتیں کرتی ہیں۔ فیس بھرنے، رہنے کھانے کا خرچ اور بل، سب کے لیے پیسا چاہیے۔ سب بے چارے کولھو کے بیل کی طرح کام کرتے ہیں۔ ہرجانہ دینا آسان نہیں ہے۔ کھڑکی کے شیشے صاف کرتے، غسل خانہ دھوتے اسے بے اختیار امی یاد آئیں۔ امی نے کراچی میں حال ہی میں گھر بدلا تھا مگر پڑوسیوں نے اور مزدوروں نے

اور ڈیو کے احباب نے یہ کام آسان کر دیا تھا۔ امی نے اُسے خط میں لکھا تھا، مجھے معلوم ہے کہ ُسی ویؤ کے مکانوں کے کرائے زیادہ ہیں مگر ڈیو مجھ سے اتنا ہی کرایہ لینا چاہتا ہے جتنا میں اب دے رہی ہوں۔ وہ کہتا ہے یہ تو میرے اُوپر احسان ہے کہ آپ اس گھر میں رہنے کو تیار ہوگئی ہیں ورنہ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ کوئی زبردست شخص ہمیشہ کے لیے اسے اینٹھ لیتا۔ میں دور بیٹھا کیا کرسکتا تھا۔ اس کی امی واقعی اس نئی جگہ سے خوش تھیں۔ انھوں نے تفصیل سے اپنے پڑوسیوں کا ذکر کیا تھا جنھوں نے دو دن انھیں کھانا نہیں پکانے دیا تھا اور سامان رکھوانے میں اُن کا ہاتھ بٹایا تھا۔

اور یہاں تیسری منزل سے سامان خود نیچے اُتارنا ہے۔ وہ نیچے استقبالیہ سے ایک پہیے لگا تختہ لے کر آئی۔ تختے پر سامان رکھ کر سیڑھیوں سے نیچے اُتارا۔ دوسری منزل سے ایلی ویٹر لیا مگر ٹھیلا زینے سے لانا پڑا۔ اس پر سامان رکھ کر خود کار دروازوں سے اُلجھتی بہ مشکل نیچے آئی اور سامان باہر ڈھیر کرتی رہی اور پسینے پسینے ہوتی رہی۔ آخری چکر لگا رہی تھی کہ پدما اور مائیکی آئے اور اس کا سامان گاڑی میں رکھ کر نئے اپارٹمنٹ میں پہنچایا۔ اس سے زیادہ وہ اس کی مدد کرنے سے قاصر تھے۔ سب کے اپنے اپنے کام تھے اور وہ اس میں بری طرح جتے ہوئے تھے۔

سامان کمرے میں بکھیر کر اسے جمانے سے پہلے اُس نے ساتھ لائی ہوئی ڈاک کا جائزہ لیا اور ڈیو کا خط کھول کر پڑھا:

''میری پیاری تنہا اُداس لڑکی!

رات آدھی سے ذرا کم، چاند پورا، آسمان اُودا مائل نیلا، ستارے کم کم اور چاند سے دور دور... درجۂ حرارت چورانوے، دو قدم پر بحرالکاہل۔ یہ ہے Lido Marino Village.... گاؤں یا منا سا جزیرہ جہاں میں اس وقت موجود ہوں اور تم نہیں ہو جس کی وجہ سے تمھیں یہ خط لکھ رہا ہوں کہ اس وقت میرا یہاں ہونا بے حد خواب ناک ہے اور تمھارا یہاں نہ ہونا عذاب ناک۔ بڑا پراسرار سا ماحول ہے۔ ایک گلی گول گول گھومتی ہوئی اندھیری سی ہے۔ چھوٹے سے چوک کے ہنڈوں سے روشنی پھوٹتی ہوئی، بند دکانوں کے شوکیسوں میں رنگوں کی بہار، باہر گملوں میں پھول اور بیلوں کی محرابیں، گڑیا گھروں کا عکس پانی میں جھانک رہا ہے۔ پرائیویٹ یاٹ اور کشتیاں اور کیا کیا کچھ...... اِکا دُکا لوگ محبوب دربغل مگر بہت سناٹا ہے۔ ایسے موسم میں یورپ میں روم، فلورنس اور وینس میں بہار دیکھنے کی ہوتی ہے۔ گٹار پر نغمے، نغموں پر ناچ، گنڈولوں کی سیر۔ یوں ہوتا تو تم کتنی یاد آتیں۔ سناٹا اور خاموشی ہے تب بھی تم یاد آرہی ہو۔ شاید سناٹا نہ ہو صرف مجھے ہی محسوس ہو رہا ہو۔ روشنیاں سوئی ہوئی سی ہیں اور سب سے بڑا ہنڈا نیلے بھٹ آسمان پر گول، خوب صورت خرگوش کی پینٹنگ کے ساتھ چمک رہا

ہے۔ سوچتا ہوں اس سے کبھی جی نہیں بھرتا، کبھی اس کا شیڈ بدلنے کو جی نہیں چاہتا اس لیے کہ وہ خود ہی اپنے آپ کو بدلتا رہتا ہے یا قدرت شعبدہ بازی کرتی رہتی ہے۔ گھٹتا بڑھتا چاند فطرت میں جتنی نیرنگیاں ہیں انسان کے بس میں کہاں۔ رات کیسے کیسے رنگ بدلتی ہے، ہر سورج نئے ڈھنگ سے طلوع ہوتا ہے اور نرالے انداز سے ڈوبتا ہے۔

جی چاہتا ہے ایک کتاب لکھ ہی ڈالوں۔ مما نے نیاگرا سے واپسی پر ایک تقریر کی۔ کہنے لگیں، میں خاندانی معاملات میں دقیانوسی ہوں۔ خاندان کا نام اور وقار میرے نزدیک بہت اہم ہے۔ تم میرے گھر میں رہ کر کسی ٹٹ پونجیا یونی ورسٹی میں نہیں پڑھ سکتے۔ باہر کہیں جا کر قلاشوں کی طرح نہیں رہ سکتے۔ تمھیں لباس اور رکھ رکھاؤ میں اپنے خاندان کا خیال رکھنا ہوگا۔ میں نے کہا، میری حیثیت اتنی نہیں ہے اور میں آپ پر ضرورت سے زیادہ بار بننا نہیں چاہتا۔ وہ خفا ہو گئیں۔ کہنے لگیں خاندان کی خاطر تمھاری مدد کرنا ہمارا فرض ہے اور تمھارا فرض ہے کہ بعد میں تم اس قرض کو چکاؤ...... چند ہفتے مجھے دیے گئے ہیں کہ میں اپنی ضروریات انھیں بتاؤں۔ میں انھیں لکھ رہا ہوں کہ Lagoona Beach پر ایک چھوٹا سا گھر مجھے چاہیے۔ یہ الگ مقام ہے جہاں پھولوں سے ڈھکے گھر ساحلِ سمندر سے ذرا سے فاصلے پر ہیں۔ امیروں کے چونچلے، اُوپر نیچے گھاس کے قطعات، ہسپانوی وضع کے مکان، دکانوں میں آرٹ گیلریوں کی بہتات۔ کبھی آرٹسٹوں کا قلاش سا گاؤں تھا اب امیروں کا پھولوں سے ڈھنپا ساحلِ سمندر کا علاقہ ہے جہاں سمندر نیم دائرے میں گھروں کے پاس سے گزرتا چلا جاتا ہے۔ اس علاقے میں چھوٹا سا گھر بھی ملینوں ڈالر کا ہے۔ تم کہو گی کہ میں مما سے اس بات کا بدلہ لے رہا ہوں جو انھوں نے غلط بتائی یا اب تک نہیں بتائی۔

نہیں یہ بات نہیں ہے، جب ان کو دعویٰ ہے کہ وہ لوگ مجھے پیٹر سے زیادہ چاہتے ہیں تو میں بھی اُن آسائشوں کا حق دار ہوں جن کا پیٹر ہے۔ وہ بے دریغ لٹاتا ہے۔ میں بھی تو دیکھوں کہ میرا حق کتنا ہے۔ کیا میں صرف اُن آسانیوں کا حق دار ہوں جن سے ان کو نام بٹا نہ لگے یا تو وہ مجھے اُن خاندانی زبردستیوں سے آزاد کر دیں۔ پاپا اور مما کبھی بہت خرچیلے نہیں تھے، ہوتے تو شاید اتنا پیسہ جمع نہ کر پاتے جو کیا۔ اُن کے اپنے بیٹے کے اخراجات حد سے بڑھے ہوئے ہیں اور وہ اُن کو زہر لگتے ہیں۔ ایسے میں وہ میری فرمائشیں پوری نہیں کر سکتے۔ یہی میں چاہتا ہوں کہ ایک مرتبہ وہ کہہ دیں، بھیا تم کس کھیت کی مولی ہو، جاؤ اپنا رستہ لو۔ مجھے شاید دُکھ ہوگا مگر اصلیت سامنے آ جائے گی۔ تم کہو گی یہ زیادتی ہے۔ میں کہتا ہوں نہیں۔ ایک وقت آتا ہے جب معاملہ اِدھر سے اُدھر ہوتا ہے۔ اُدھر لٹکا نہیں رہ سکتا۔ کبھی نہ کبھی ہر چیز کا، ہر بات کا فیصلہ ہوتا ہے یا کرنا پڑتا ہے۔ جلد یا بدیر۔

بائبل میں ہے:۔

To everything there is a season, and a time to every purpose under the heaven.
A time to be born, and a time to die, a time to plant, and a time to pluck up that which has been planted;
A Time to kill, and a time to heal; a time to break down, and a time to break up;
A time to weep and a time to laugh; a time to mourn and time to dance;
A time to cast away stones, and a time to gather stones together; a time to embrace, and a time to refrain from embracing.

سنو گجر کیا گائے۔ سمے گزرتا جائے۔

"تمہارا ڈیو"

صوفی صاحب ایک دن دو خط لہراتے، جھنڈے کی طرح ہلاتے آنگن میں داخل ہوئے اور بیگم کو خوش خبری سنائی، "اتفاق دیکھو بیگم، تمہارے دو بیٹوں نے ایک ساتھ ہی خط بھیجا ہے۔"

بیگم صوفی حیران ہو کر ان کا منہ تکنے لگیں۔ "کون سے میرے بیٹے، ذرا میں بھی تو سنوں۔" تیوری پر بل ڈال کر بولیں۔

"ارے بھئی ایک وہ تمہارا نالائق بیٹا......" صوفی صاحب بولے، "یا سمجھ لو کہ جسے تم نالائق سمجھتی تھیں، اس نے تمہیں اپنی شادی میں بلایا ہے۔ دوسرا وہ گورا جس کا تم لاڈ کرتی تھیں، حلوے بنا کر کھلاتی تھیں مگر جو تمہیں چھوڑ کر سمندر پار چلا گیا۔ اس کا خط ابھی کھولا نہیں ہے، دیکھتا ہوں کیا لکھتا ہے۔"

"اچھا..... تو زمان کی شادی ہو رہی ہے!" بیگم صوفی نے دوپٹے سے ہاتھ پونچھ کر لفافے کی طرف بڑھایا۔ "اے ہے اتنا بڑا لفافہ! وہ حیران ہوئیں۔

"کارڈ ہے شادی کا۔" صوفی صاحب بولے۔

"کارڈ ہے یا ریکارڈ!" بیگم صوفی منہ پھاڑ کر بولیں۔

"بات تو کبھی تم کمال کی کہہ جاتی ہو بیگم۔" بیگم صاحب ہنس کر بولے، "سچ مچ ریکارڈ ہی کی شکل کا ہے۔ گھما پھرا کر پڑھنا پڑتا ہے۔"

"واہ بھئی واہ۔" بیگم صوفی نے کھینچ تان کر کارڈ نکالا۔ "اس لڑکے کی بھی ہر بات نرالی ہے۔

ویسے شادی ہو کہاں رہی ہے؟''

''ہمیں کیا معلوم!..... نام تو کارڈ میں لکھا ہے مگر نام سے کیا پتا چلتا ہے۔ کسی اچھی جگہ ہو رہی ہوگی۔ وہ خود بھی بڑا افسر ہے بھئی..... تو کیا خیال ہے چلوگی شادی میں؟''

''کہاں ہو رہی ہے؟ کب ہو رہی ہے؟ میں نے تو ابھی کارڈ پڑھا نہیں۔''

''کراچی میں ہو رہی ہے اور جلدی ہو رہی ہے۔ لڑکی کی بہن امریکا جانا چاہتی ہے۔ زمان کو خود بھی جلدی ہے۔ چھوٹا سا خط بھی لفافے میں ہے۔''

''تم دیکھ لو۔'' بیگم صوفی لمحہ بھر سوچ کر بولیں، ''اب میں تو کچھ کہتی نہیں۔ مٹی ڈال دی میں نے جو کچھ ہوا اس پر..... ہاں ڈیو نے کیا لکھا ہے؟''

''بتاتا ہوں، پڑھ تو لوں۔'' صوفی صاحب مونڈھا گھسیٹ کر چھوٹے سے برآمدے میں بیٹھ گئے اور چشمہ لگا کر خط پڑھنے لگے۔ بیگم صوفی دھوپ کی طرف رُخ کر کے چندھی آنکھوں سے کارڈ دیکھنے لگیں۔ ریکارڈ کی طرح گول دائروں میں سرخ، سنہری اور اُودے حاشیے تھے۔ پھر بیلیں، پھول اور تتلیاں تھیں۔ درمیان میں شادی کا بلاوا تھا۔ بیگم صوفی نے ساری عبارت پڑھی۔ پھر الگ مختصر سا پرچہ نکال کر پڑھا جس میں لکھا تھا آپ دونوں شادی میں ضرور آیئے۔ آپ کے ٹھہرنے کا انتظام ضمیر صاحب کے ہاں ہوگا اور آپ کو وہاں کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔ صوفی صاحب کو خط میں شاید اصرار نظر آیا ہو مگر بیگم صوفی کو روکھا سوکھا بلاوا لگا۔ کوئی جذباتی بات نہ تھی۔ شادی میں آگے پیچھے کوئی نظر نہ آیا تو ہم یاد آئے۔ انھوں نے سوچا مگر بات دل ہی میں رکھی، صوفی صاحب سے نہیں کہی۔ چلو اب کب تک روٹھا روٹھی رکھوں۔ روٹھے کو منایئے، پھٹے کو سلایئے۔ اسی بہانے میل ملاپ سہی۔

ذرا دیر بعد ڈیو کے خط کا خلاصہ صوفی صاحب نے سنایا۔

بھئی اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد اس نے لکھا ہے کہ وہ ایک کتاب لکھنے کا ارادہ کر رہا ہے ممکن ہے وقتاً فوقتاً ہماری مدد کی ضرورت ہو۔ فی الحال جس غرض سے اس نے خط لکھا ہے وہ یہ ہے کہ کراچی میں جس گھر میں وہ شادی کرنا چاہتا ہے وہاں رقعہ لے کر ہم تم دونوں جائیں۔

''لو اور سنو..... نئی بات!'' بیگم صوفی بولیں۔ ''جان نہ پہچان بڑی خالہ سلام!''

''ہاں، کہتا ہے وہ خط لکھے گا تو اچھا بھی نہیں لگے گا کیوں کہ آپ کے ہاں کی روایت نہیں ہے۔ دوسرے جس طرح آپ دونوں انھیں مطمئن کر سکتے ہیں میں نہیں کر سکتا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ مجھے پسند کرتے ہیں اور بیٹے کی طرح چاہتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ میرا پیغام لے کر نہ جائیں۔ مجھے یہ بھی یقین ہے کہ آپ کی شخصیت اور باتوں سے سمن کی امی ضرور متاثر ہوں گی اور انکار نہیں کریں گی۔''

''چلو چلتے ہیں۔'' بیگم صوفی کھل گئیں۔ ''بہت دن سے نکلے نہیں ہیں۔ زمان کی شادی میں بھی شرکت ہو جائے گی اور سمن کی ماں سے بھی مل لیں گے۔''

''اوہو...... تم تو جیسے اُدھار کھائے بیٹھی تھیں۔ اور سنو..... پاکستانی بینک کا خاصی بڑی رقم کا چیک اس نے بھیجا ہے کہ کراچی آنے جانے کے اخراجات وہ اُٹھائے گا اس لیے نہیں کہ ہم اس کے کام سے جا رہے ہیں بلکہ اس لیے کہ اس کو بیٹا کہا ہے تو اس کا بھی فرض ہے کہ وہ ہمارے کام آئے..... لکھتا ہے کہ آج کل اللہ میاں اور مما مہربان ہیں اور اس کے پاس وافر پیسا ہے۔ پگلا ہے۔ اسے پتا نہیں کہ اتنا ہمارے پاس بھی ہے کہ ایک چکر کراچی کا لگا آئیں۔''

''تو پھر چلیں؟'' بیگم صوفی بولیں۔

''ارے بھئی سوچنے تو دو، ہزاروں کام نمٹانے کو ہیں۔'' صوفی صاحب واقعی سوچ میں پڑ گئے۔

''ایل لو..... کون سے کام نمٹانے کو ہیں؟'' بیگم صوفی بگڑ گئیں۔ ''کچھ کرنے کو تو ہے نہیں، گھر کے جالے لیتے پھرتے ہو یا پھر باہر والوں کے مشکل کشا بنے ہوئے ہو۔ اُس دن کیا پڑھ رہے تھے، لیٹے ہیں چٹائی پہ مگر کام بہت ہے۔''

''ہاں جو بھی ہے جس سے جو وعدہ کر رکھا ہے وہ تو پورا کرنا ہے، سوچوں گا۔''

''بندی جو تیار ہو گئی تو نخرے دکھانے لگے۔ ناک رگڑواتی تو خوش رہتے۔'' بیگم صوفی صفا اکڑ گئیں۔ ''میں کلموہنی تو ہمیشہ رس میں بس ملاتی ہوں۔'' روہانسی ہو کر باورچی خانے کی طرف بڑھیں۔ ''گھر کی جلی بن گئی بن میں لاگی آگ، بن بے چارہ کیا کرے جو ہیں اپنے بھاگ۔'' چلتے چلتے پلو سے آنکھیں پونچھیں تو صوفی صاحب پسیج گئے۔

''ارے بھلی مانس، کاہے کو کُرکُر کرتی ہو۔ اللہ نے چاہا تو جائیں گے۔ تیاری تو کرو۔ بہو کو کچھ دو دلاؤ گی نہیں...... اپنا نیا گلابی جوڑا بناؤ، مجھ مسکین کے لیے سفید لٹھے کا کُرتا اور ہاں..... میں نے آج حکیم صاحب کو رات کے کھانے کی دعوت دے دی ہے۔ ذرا ڈھنگ کا کچھ کر لینا۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔'' بیگم صوفی طنز سے بولیں۔ ''گھر میں بھونی بھانگ نہیں ہے باہر نیوتے سات!''

''ارے بھلی مانس، کتنی مرتبہ سمجھایا مہمان ہمارا کچھ نہیں کھاتے، اللہ کا دیا کھاتے ہیں۔ اچھا چلو میں یہ چیک تو واپس کر دوں اس پگلے کو۔''

''اے ہے اتنی جلدی بھی نہ کرو، بینک میں جمع کروا دو، ضرورت نہیں پڑے گی تو خیر سے جب آئے گا لوٹا دینا۔''

''اس کا مطلب ہے ضرورت پڑے گی تو خرچ کرلو گی؟''

''کیوں نہیں! اُس نے اپنا سمجھ کر بھیجا ہے۔''

''نہیں، یہ نہیں ہوگا....اس کی امانت ہے۔'' صوفی صاحب بولے۔

''تو امانت سمجھ کر رکھ لو، واپس کر کے اس کا دل کیوں توڑتے ہو، مان بھی کسی کا رکھ لیا کرو۔ اصول ہی سب کچھ نہیں ہوتے دنیا میں۔''

''اچھا چلو......تمھارا کہنا سہی، مگر دانت نہ رکھنا ان پر۔''

''اے ہے، میں نے کون سی تمھاری چیزوں پر دانت رکھے ہیں جو اس امانت پر نظر رکھوں گی۔ دل اتنا چھوٹا ہوتا تو تمھارے ساتھ گزارا بھی نہ ہوتا۔''

''ہاں......'' صوفی صاحب نے ٹھنڈا سانس لیا۔ ''یہ تو تم ٹھیک کہتی ہو۔ چلو اسی بات پر آج تمھیں ایک ریشمی پارچہ تو دلوا ہی دیں زمان کی شادی کے لیے۔''

''ارے اب تم جاؤ۔ مجھے تو بھاڑ ہی میں جھونکو گے، حکیم صاحب کو دعوت جو دے دی۔''

''اچھا چلو کل سہی۔ میں بینک ہو کر آتا ہوں۔''

''فی امان اللہ۔'' بیگم صوفی نے عادتاً کہا۔ ان کا ذہن رات کی دعوت کے پکوانوں میں گم ہو چکا تھا۔

سمن تھکی ہاری پیر پسارے بیٹھی تھی۔ سامان چاروں طرف بکھرا ہوا تھا۔ چولھے اور ریفریجریٹر گھر کے ساتھ آتے تھے۔ ان کے بعد یا شاید ان سے بھی پہلے سب سے ضروری چیز ٹیلی ویژن تھا۔ مائیکی نے ازراہِ عنایت ٹیلی وژن فٹ کر دیا تھا جس کے سامنے وہ بیٹھی ضرور تھی مگر دیکھ کچھ بھی نہیں رہی تھی۔ اس کا ذہن تقریباً سو رہا تھا۔ اس کی بیماری اور سیر کی تھکن نہیں اُتری تھی اِسی لیے سامان سے نظریں چرا رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے ہو جائے گا ایسی جلدی بھی کیا ہے۔ زیادہ تر طالب علموں کے کمرے یوں بھی کباڑ ہی نظر آتے تھے کہ نہ کسی کو فرصت تھی نہ دماغ۔

آنکھوں میں مرچیں سی بھرنے لگیں تو آلکسی سے اُٹھ کر اس نے کھڑکی سے نیچے دیکھا۔ عین نیچے گھاس پر دو لڑکیاں ایک لڑکے کے ساتھ دراز تھیں۔ لڑکے کی چڈی بے حد مختصر تھی اور لڑکیوں میں سے ایک طوطا رنگ ریشمی شمیز میں اور دوسری گہری گلابی شمیز میں تھی۔ دونوں کے کپڑے سینے سے شروع ہو کر رانوں تک پہنچتے پہنچتے معدوم ہو گئے تھے۔ پاس ہی باربی کیو دہک رہا تھا جس سے دھواں اُٹھ کر ان کے کمروں میں آ رہا تھا۔ اُن سے کچھ کہنا ممکن نہ تھا اس لیے سمن نے کھڑکی کے شیشے پوری طرح بند کر دیے اور پھر آن کر قالین کے سامنے نیم دراز ہو گئی۔ ڈیو کا خط آدھا کھلا ابھی تک صوفے پر پڑا تھا۔ وہ اسے دو مرتبہ پڑھ چکی تھی۔ بے دھیانی میں اُٹھا کر ایک مرتبہ اور پڑھنا شروع کر دیا۔

''انمول ثمن!

جواب دو یا نہ دو میں تو خط لکھتا رہوں گا۔ تمھارے اور میرے درمیان جو مصنوعی دیوار کھڑی ہوگئی تھی اب اس میں گزرگاہ بن گئی ہے اور میں اس سے فائدہ اُٹھاؤں گا۔ فون کروں اور تم بات نہ سنو تو مجھے صدمہ ہوگا۔ خط پھاڑ کر پھینک دو گی تو مجھے پتا بھی نہ چلے گا۔

آج خط لکھنے کی وجہ یہ ہے کہ غسل خانے کی الماری کے پٹ میں دو آئینے ہیں۔ آج جلدی میں ایک پٹ دوسرے پر چڑھا چھوڑ گیا تھا۔ واپس آیا اور خالی حصّے پر نگاہ پڑی تو اپنی شکل ندارد۔ حیران ہوگیا کہ ارے میں کہاں گیا۔ ہنسو مت، یقین کرو بالکل سچی بات ہے۔ تم بھی میرے لیے ایک آئینہ ہو۔ تمھارے ساتھ ہوتا ہوں تو اپنے ہونے کا یقین ہوتا ہے، تم نہیں ہوتیں تو اکثر لمحے ایسے آتے ہیں جب خود کو گم پاتا ہوں اور تعجب کرتا ہوں کہ میں کہاں گیا۔ نیاگرا میں اپنی موجودگی بہت بھلی لگی تھی۔ کاش ایسے دن دوبارہ آئیں۔ تب تک کے لیے اپنی تلاش جاری رہے گی۔ یہ تو تم نے سنا ہی ہوگا کہ ہمارے ملک امریکا میں، میرے بچے، تمھارے بچے، اور ہمارے بچے، تو تھے ہی اور یہ صورتِ حال سارے معاشرے میں قابلِ قبول تھی۔ اب ایک نئی ہوا چلی ہے کہ جنھوں نے پیدا کیا وہ والدین اہم نہیں ہیں جنھوں نے پالا پوسا وہ اہم ہیں۔ باوجود پوری کوشش کے بچے اس بات کو تسلیم نہیں کرتے۔ شروع میں بچوں سے یہ بات چھپائی جاتی ہے کہ وہ لے پالک ہیں۔ پھر ایک دن ان کی محفوظ زندگی کے قلعے کو ڈھا کر بتایا جاتا ہے کہ تم تاش کے گھر میں رہ رہے تھے مگر یہ تاش کا گھر پتھر کے قلعے سے زیادہ مضبوط اور محفوظ ہے۔ بچہ جواب بڑا ہو چکا ہے، یہ بات نہیں مانتا۔ اس کا دل کسی طرح نہیں مانتا۔ سب سے پہلا سوال فوری طور پر ذہن میں سر اُٹھاتا ہے، ''میں کون ہوں؟ میرے والدین کون ہیں اور کہاں ہیں؟'' وہ یہ سوال پوچھے تو نالائق اور احسان فراموش ہے۔ زندگی بھر وہ اپنے اصل والدین کے لیے تڑپے گا اور نئے والدین سے یہ بات چھپائے گا کیوں کہ اسے سبق مل رہا ہے کہ بدنی والدین اہم نہیں ہیں۔ پیروں کے نیچے سے زمین کھینچ کر دلدل میں چھوڑ دینا اور کہنا کہ تم اب بھی اتنے ہی محفوظ ہو۔ میرا دل نہیں مانتا۔ شاید کسی کا دل بھی نہیں مانتا۔

موجودہ genes پر تحقیق روز بروز یہ بھید کھول رہی ہے کہ آپ ہر طرح اپنے پرکھوں کی اولاد ہیں۔ آپ کا رنگ روپ، آپ کی آنکھیں اور بال، آپ کی درازیِ عمر، آپ کی بیماریاں سب وہ ہیں جو آپ کو ورثے میں ملی ہیں۔ بڑے بوڑھے کہتے تھے، یہ بات اس کے خون میں ہے یا ہڈیوں میں ہے۔ میں وہ ہوں جو میرے بڑے تھے۔ میں وہ نہیں ہوں نہ ہوسکتا ہوں جو مما ہیں یا جو پاپا ہیں۔ اگر میرا رنگ روپ ان سے ملتا ہے تو یہ اتفاقیہ ہے حقیقت نہیں ہے۔ حقیقت کیا ہے میں نہیں جانتا۔ جو

جانتے ہیں وہ کہتے ہیں یہ بات اہم نہیں ہے۔ تم اس خاندان کے فرد ہو اور ہم تمھیں پیٹر سے زیادہ چاہتے ہیں۔ سنا تم نے؟ ہم تمھیں پیٹر سے زیادہ چاہتے ہیں۔ سو اگلے چند دنوں یا مہینوں میں یا برسوں میں میرے لیے کیا چھپا ہے، کوئی نہیں جانتا۔ یہ غیر یقینی صورتِ حال ہے اور کسی طرف سے کوئی روشنی نظر نہیں آتی۔ ایسے میں کبھی کبھی محسوس ہو کہ میں کہیں کھو گیا ہوں تو کیا تعجب!

........تمھارا ڈیو۔''

خط پڑھ کر رکھ دیا اور یوں ہی بیٹھی رہی۔ دروازے پر دستک ہوئی۔ شاید نئی روم میٹ ہو، وہ بھی ایک دو دن میں پہنچنے والی تھی۔ اُٹھ کر دروازہ کھولا تو پدما کھڑی تھی۔

''کیا کر رہی ہو؟ باہر دیکھا کیا ہو رہا ہے؟''

''نہیں، کیا ہو رہا ہے؟'' سمن نے بھولپن سے پوچھا۔

''سو رہی ہو؟ دیکھو.....'' پدما نے کھڑکی کا پردہ اُٹھایا۔ باربی کیو کرنے والے کب کے جا چکے تھے۔ باہر کھڑا اکلوتا درخت یوں جھوم رہا تھا جیسے اس پر آسیب آ گیا ہو۔ لگتا تھا بالکنی سے چھونے والی شاخ کسی ثانیے ٹوٹ کر گرے گی اور کھڑکی کا شیشہ چور چور ہو جائے گا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' سمن کا ذہن ابھی تک غفلت میں تھا۔ ''مجھے تو کوئی آواز نہیں آئی۔''

''آوازیں بھی آ رہی ہیں۔'' پدما نے کہا۔ ''یہ کھڑ کھڑ، چمنی کی سائیں سائیں تمھیں سنائی نہیں دے رہی؟ اور یہ ٹیلی وژن کے اسکرین پر کیا ٹورنیڈو کا سائن لٹکا ہوا ہے!''

تب سمن کو واقعی حیرت ہوئی۔ اسے سب سے پہلے اسکرین پر طوفانوں کے نشانات نظر آتے تھے۔ آج ٹورنیڈو وارننگ سے بھی غافل بیٹھی تھی۔

''ٹورنیڈو اسی طرف آ رہا ہے۔ برابر ٹی وی میں بتا رہے ہیں اور ابھی ابھی سائرن بجا ہے۔ تم جرور سو رہی ہو گی۔ چلو میرے ساتھ۔''

''کہاں؟'' سمن نے وہیں بیٹھے بیٹھے منھ اُٹھا کر پوچھا۔

''نیچے۔'' پدما نے کہا۔

''نیچے جا کر کیا ہو گا؟'' سمن نے فرش سے آلکسیوں کی طرح اُٹھتے ہوئے کہا۔

''ارے بھئی نیچے کی اسٹوریز سیف ہوتی ہیں۔ یہی کہتے ہیں کہ بیس منٹ میں چلے جاؤ، یا ہال میں۔ اور کچھ نہیں تو ہمارے اپارٹمنٹ میں چلو۔ نیچے سے باورچی خانے کی ڈبل چھت ہے وہاں بیٹھ جائیں گے۔''

''اچھا!'' سمن نے جمائی لی اور سستی سے منھ پر ہاتھ رکھا۔ چپل میں پاؤں ڈال کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگی۔

''ارے بھئی کرکیا رہی ہو، کچھ ساتھ لے کر نہیں جانا ہے۔ بس چلو۔'' پدما نے زور دیا۔

''بھئی اپنا پرس تو لے لوں کم از کم۔ میرا آئی ڈی کارڈ اور.....''

''اچھا اچھا۔'' پدما نے بیزاری سے کہا۔ ''لو، یہ اُٹھالیا میں نے تمھارا پرس۔ تمھیں یہ تک تو پتا نہیں کہ پرس ہے کہاں۔ بس چلو نیچے۔'' پدما پلٹ کر دروازے کی طرف بڑھی۔

سمن نے ہاتھ میں ڈیو کا خط دبوچا اور پدما کے پیچھے چلی۔ سامنے پدما کا اپارٹمنٹ تھا۔ بالکل سامنے دروازہ تھا۔ چار قدم کے اس فاصلے میں محسوس ہوا جیسے ہوا انھیں اُڑا کر دور پھینک دے گی۔ اندر داخل ہوتے ہی سمن نے پدما سے پرس لے کر ڈیو کا خط چپکے سے اندر رکھ دیا۔

پدما کے اپارٹمنٹ میں باورچی خانے میں جاتے ہوئے مائیکی کی جھلک سونے کے کمرے میں نظر آئی۔

''مائیکی! تم بھی یہیں آجاؤ نا۔'' پدما نے کہا۔

سمن اور پدما کھانے کی کرسیوں پر بیٹھ گئیں۔ مائیکی دوڑتا ہوا آیا اور منّے بچے کی طرح اُوں اُوں کرکے پدما کی گود میں منھ چھپانے لگا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟'' پدما نے پیار سے ڈانٹا۔

''مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' مائیکی نے ڈری ہوئی شکل بنائی۔ ''تمھاری گود میں منھ چھپا کر سونا چاہتا ہوں۔''

''گندے بچے مت بنو۔'' پدما نے چند سیکنڈ اسے برداشت کیا پھر اُچھال دیا۔ ''سمن کے سامنے اچھے بچے بن کر بیٹھو۔''

''پھر میں واپس اپنا کام کرنے جاتا ہوں۔'' مائیکی نے دھمکی دی۔ ''میں ان طوفانوں سے کبھی نہیں ڈرتا۔ گاڑی میں ہوتا ہوں تو گاڑی چلاتا رہتا ہوں۔ پیدل ہوں تو اسی طرح چلتا رہتا ہوں اس لیے کہ جب موت آئے گی تو آجائے گی۔ ڈر ڈر کر کہاں تک جیے گا انسان۔''

''خیر، یہ تو کوئی بات نہیں۔'' سمن نے کہا، ''احتیاط تو کرنی چاہیے۔''

''مجھے بصیرہ یاد آ گئی۔'' پدما نے کہا۔ ''اس کو وشواس تھا کہ اس کی موت نیاگرا فالز میں کودنے والے کو آ گئی۔ اس لیے وہ بھلی چنگی ہو گئی۔''

''سوچ ہی کی تو ساری بات ہے۔'' مائیکی نے کہا، ''اس نے سوچ لیا کہ اس کی جگہ دوسرا آدمی مر گیا تو وہ بچ گئی ورنہ اس آپریشن میں شاید مر ہی جاتی۔''

''ہاں پہلے تو اس کو اس آپریشن میں مر جانے کا یقین تھا تب ہی تو اس سے بچتی پھر رہی تھی۔''

سمن نے کہا۔

''وہ اب ہے کہاں؟'' پدما نے پوچھا۔

''چھ ہفتے بعد شاید امریکا آ جائے۔ اس کے والد نے دریائے مسسی پی کے کنارے زمین خرید کر ایک چھوٹا سا گھر بنوایا تھا۔ وہ وہاں جا کر رہنا چاہتی تھی۔''

''سلیم کو چاہیے کہ اب بصیرہ کی خدمت کرے۔'' مائیکی ہنسا۔

''کیوں؟'' پدما نے پوچھا۔

''لڑکی اچھی ہے۔'' مائیکی نے آنکھ ماری۔ ''اور امیر بھی ہے۔ کیا خیال ہے سمن؟''

''سلیم تو اپنے دوست اور اس کی بیوی کے ساتھ امریکا کی سیر کرنے جا رہا ہے۔'' سمن نے کہا۔

''بے وقوف ...'' مائیکی نے کہا، ''مجھے سو فی صد یقین ہے کہ ناز چاہتی ہے سلیم بصیرہ سے شادی کر لے۔''

''تمھیں کیسے یقین ہے؟'' پدما نے پوچھا۔

''بہت سی باتیں ہیں۔'' مائیکی نے کہا۔

''مثلاً؟'' پدما نے جرح کی۔

''مثلاً یہ کہ.....'' مائیکی نے ماتھے پر بل ڈال کر سوچا۔

سمن کے کان میں یکایک پاکستان کا لفظ پڑا اور اس نے ٹیلی وژن پر ہونے والی خبروں پر دھیان دیا۔ بحرِ ہند میں بڑا زبردست طوفان آ رہا تھا جس کی رفتار بڑھتی جا رہی تھی آئندہ چند گھنٹوں میں اس کا ساحل سے ٹکرانے کا خطرہ تھا۔ ابھی صحیح طور پر نہیں کہا جا سکتا تھا مگر اس کی سمت اور رفتار سے اندازہ لگایا جا سکتا تھا کہ وہ پاکستان کی بندرگاہ کراچی کے آس پاس ٹکرائے گا۔''

یہ سنتے ہی سمن کی ساری نیند غائب ہو گئی۔

''سنا تم نے؟'' وہ چلائی۔ ''خبروں میں کیا بتایا انھوں نے؟''

مائیکی اور پدما نے باتوں میں خبر غور سے نہیں سنی تھی۔

''کیا ہوا؟'' پدما نے پوچھا۔

''ڈیڑھ سو میل فی گھنٹا کی رفتار سے طوفان آ رہا ہے جو بہت تباہی لائے گا۔ کراچی کے آس پاس ساحل سے ٹکرانے والا ہے۔'' سمن نے کہا، ''ہائے مجھے تو بہت ڈر لگ رہا ہے۔ امی تو حال ہی میں سمندر کے کنارے اُٹھ گئی ہیں۔ وہ تو وہاں کسی کو جانتی بھی نہیں ہوں گی۔''

پدما اور مائیکی نے دیکھا کہ وہ خوف سے سفید پڑ گئی ہے۔

''تو گھبرا کیوں رہی ہو؟'' پدما نے کہا۔ ''انھیں فون کرلو۔''

''فون بھی نہیں لگا ابھی میرے کمرے میں۔'' سمن نے رونی آواز میں کہا۔

''ارے تو یہاں سے کرلو۔'' پدما بولی، ''ایسی بھی کیا بات ہے۔''

''اچھا، میں یہیں سے فون کر کے پھر اپنے اپارٹمنٹ میں چلی جاتی ہوں۔ یہاں تو خطرہ ٹل ہی گیا ہے۔'' ٹیلی وژن کے کونے پر اب صرف تھنڈر واچ کا نشان رہ گیا تھا۔

سمن نے کراچی کا فون ملایا۔ ٹُوں کی ایک آواز اور بے کراں سناٹا جیسے کسی اور کُرے سے رابطہ ہوگیا ہو۔ ذرا دیر ایسی ہی آواز آتی رہی۔ پھر اس کی ماں کی نیند میں ڈوبی ہوئی ہلکی سی آواز سنائی دی۔

''ہلو......''

''امی!.....'' سمن نے گھبراہٹ میں جلدی جلدی بولنا شروع کر دیا، ''آپ نے سنا بحرِ ہند میں زبردست طوفان آرہا ہے اور کراچی کی طرف بڑھ رہا ہے۔''

''نہیں، میں نے تو نہیں سنا۔ یہاں تو رات کا وقت ہے اور سب سو رہے ہیں۔'' اس کی امی نے کہا۔

پریشانی میں سمن یہ بات بالکل بھول گئی تھی کہ پاکستان میں اس وقت رات ہوگی۔

''میں ٹی وی لگا کر دیکھتی ہوں۔'' اس کی امی نے کہا اور وہیں کھڑے کھڑے ٹی وی کا بٹن دبا دیا۔ ''اس میں تو کچھ نہیں ہے۔ شاید ریڈیو میں..... مگر اب تو ریڈیو کا بھی وقت ختم ہو چکا۔ ہاں سحری کے وقت البتہ......''

''امی! آپ وقت ضائع نہ کریں۔ جتنی جلد ہو سکے یہاں سے چلی جائیں۔'' سمن نے کہا۔

''کہاں چلی جاؤں، رات کے وقت اکیلی؟'' امی کی پریشان آواز آئی۔

''اور بھی لوگ کہیں نہ کہیں جا رہے ہوں گے۔ آپ اپنے پڑوسیوں سے بات کیجیے۔ کوئی نہ کوئی آپ کو ساتھ لے جائے گا۔ اپنے پرانے محلے میں کسی کے گھر چلی جائیے یا کسی رشتے دار......''

اس کی امی نے کچھ کہا مگر سمن کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''میں بھی آپ کا زیادہ وقت نہیں لوں گی کیوں کہ یہ باتوں کا نہیں کام کا وقت ہے۔ سب لوگوں کو وہ جگہ فوراً چھوڑ دینی چاہیے۔ فرض کیجیے طوفان نہیں آیا تو کوئی پریشانی کی بات نہیں لیکن آ گیا تو...... آپ پڑوسیوں سے فون پر بات کر کے دیکھیے۔ انھیں بھی معلوم ہوگا۔ خدا حافظ۔''

سمن نے فون رکھا۔ پدما اور مائیکی کا شکریہ ادا کیا۔ پرس اُٹھا کر چلنے لگی تو مائیکی نے ساتھ چلنے کی پیش کش کی۔ سمن نے کہا اس کی ضرورت نہیں اور دونوں کو بائی کہتی دروازہ بند کرتی باہر نکل آئی۔

طوفانی ہوا خنک خوشگوار ہوا میں تبدیل ہو چکی تھی مگر آسمان بادلوں سے بوجھل تھا جس وقت تک وہ اپنے کمرے میں پہنچی بارش شروع ہو چکی تھی۔

بارش رات بھر ہوتی رہی۔ سمن بند دُہرے شیشوں کے پیچھے سے اس کی تڑاپڑ سنتی رہی۔ دھیمی ہوتی تو یوں پھسر پھسر کرتی جیسے کوئی ضدی بچی صرف رونے کی خاطر رو رہی ہو جب کہ یہ بھول چکی ہو کہ کس بات پر رو رہی تھی۔ جیسے اب بغیر کسی کی خوشامد کے رک جانا اس کی ضد کی توہین ہو۔ سارے دن کے نیند بھرے ذہن سے اب نیند کوسوں دور تھی۔ کراچی کا سی ویو نگاہوں میں پھر رہا تھا۔ آدھی رات کو نئی جگہ اجنبی لوگوں سے امی کیسے کہیں گی کہ انھیں بھی ساتھ لے جائیں۔ ہر ایک کی اپنی مشکلات ہوتی ہیں۔ اس نفسانفسی میں ان کی کون سنے گا۔ شاید انھیں نزدیک کی بستیوں کی پناہ گاہ میں بھیج دیا جائے۔ کسی کو پتا بھی نہ چلے گا کہ وہ کہاں ہیں؟ اسے ویسٹ سائڈ پارک کا وہ شخص یاد آیا جو سرِشام باغ میں بینچ کے نیچے بستر بچھا کر سونے کے لیے لیٹ جاتا تھا۔ اس کے سفید جم جوتے سر کا تکیہ بنے رکھے رہتے تھے۔ ان پر تھیلے میں چند اور کپڑے شاید ایک قمیص اور بنیان، ایک چھوٹا سا پرس جسے وہ کلیجے سے لگائے رکھتا تھا۔ بے گھر لوگ اندر سے کیسے اس کا کلیجہ نوچتے تھے۔ کراچی میں بچپن میں کسی کو فٹ پاتھ پر سوتے دیکھتی تو وہیں کھڑی کی کھڑی رہ جاتی تھی۔ اس کے ابا یا امی جب تک ہاتھ پکڑ کر نہ گھسیٹتے ہلتی نہیں تھی۔ وہ امی کو اس قسم کے حالات کا سامنا کرنے کے لیے بالکل تنہا چھوڑ کر یہاں کیوں چلی آئی تھی؟...... اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس قسم کی سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ کیا قدیم انسان ہم سے بہتر نہیں تھے کہ اُن کے پاس سوال ہی کم تھے۔ نئے انسان کا المیہ یہ ہے کہ سوال بڑھتے جائیں اور جواب کم سے کم تر ہوتے جائیں۔ ہوائی جہاز میں بیٹھ کر ہزاروں میل طے کر لینا تو آسان ہو گیا ہے مگر نئے ملکوں میں اُٹھنے والے کیا اور کیوں کے سوال مشکل تر ہوتے جا رہے ہیں۔ اس نے ایسے لوگ بھی دیکھے تھے جو پندرہ بیس سال سے اپنا ملک چھوڑ کر یہاں آ بسے تھے اور ہر نئے سال کے ساتھ بڑھتی عمر کی لڑکیوں کی ہر سالگرہ کے ساتھ سوچتے تھے کہ کیا وہ کبھی اپنے دیس واپس جائیں گے؟ جائیں گے تو کب اور دیس کے کس حصے میں؟ کیا کوئی خطہ انھیں گلے لگائے گا؟ اجنبی جان کر انھیں پہچاننے سے انکار تو نہ کر دے گا۔ کیا اتنے سال بعد وہ وہاں جم سکیں گے؟ اور وہ جس نے سوچا تھا وہ امی کو بھی یہاں بلا لے گی، کیا انھیں بلا سکتی ہے؟ وہ یہاں کی عمارتوں، باغوں اور دریاؤں کے خوب صورت کارڈوں سے انھیں بہلاتی رہتی ہے۔ اب جان گئی ہے کہ تعلیم یہاں کتنی مہنگی ہے۔ اسسٹینٹ شپ کے ساتھ اور دوسری لڑکی کے ساتھ رہنے کے باوجود گزارا کتنا مشکل سے ہوتا ہے اور پھر اگر اس کی امی یہاں آ گئیں تو یہاں ان کا دل لگنا بھی بہت

مشکل ہے۔ اس عمر میں انسان ہم زبانی اور رفاقت چاہتا ہے۔

بارش سانس لینے کو رکی۔ اُس نے پردہ سرکا کر دیکھا۔ سڑک کے پانی پر روشنیاں ہلدی کے چھینٹوں کی طرح بکھری ہوئی تھیں۔ اِکا دُکا گاڑیاں ہلدی کے چھینٹوں پر اپنے اپنے رنگ بکھیرتے گزر رہی تھیں۔

جلدی اور گھبراہٹ میں اس نے امی کو پدما کا فون نمبر بھی نہیں دیا تھا۔ اپنے کمرے میں فون نہیں تھا ورنہ کم از کم تو یہ معلوم ہو جاتا کہ امی کہیں گئیں یا اب تک وہیں...... سوچتے سوچتے پو پھٹنے کو تھی جب وہ تھکن سے بے دم ہو کر سو گئی۔ کھڑکی سے باہر بہت دور ہوا میں معلق سی ایک روشنی لمحہ بھر کے لیے بجھتی اور پھر جل اُٹھتی تھی۔ ہوائی جہازوں کو راہ سجھانے والی اس روشنی سے ثمن کو ڈھارس سی رہتی تھی اس لیے کہ وہ ہمیشہ وہاں موجود ہوتی تھی۔ دن میں بھی، رات میں بھی، ہمہ وقت۔ بارش میں، طوفان میں...... کبھی کبھی دُھند میں چھپ جاتی تب بھی احساس رہتا کہ وہاں موجود ہے۔ دل کے اور آنکھ کے اندرونی کسی پردے پر یوں ہی جگمگاتی، جلتی بجھتی رہتی، قربت کا، تحفظ کا احساس دلاتی۔ اس یقین کے ساتھ کہ دھند چھٹ جائے گی تو صاف دکھائی دے گی۔ کون جانے یہ روشنی اس کی امی کا بدل تھی یا کیا!...... پاس کے اپارٹمنٹ کی کھڑکی کی روشنیاں بھی اس کی دم ساز تھیں۔ اسے معلوم نہیں تھا کہ اس کے پیچھے کون رہتا تھا مگر جب تک وہ روشنی سفید پردے کے پیچھے جلی رہتی اسے اطمینان رہتا۔ اس کے پیچھے کوئی ہے، پڑھ رہا ہے، جاگ رہا ہے، زندہ ہے۔ اس کمرے کی کھڑکی پر جانے کہاں کہاں کی روشنیوں کے عکس پڑتے رہتے۔ سڑک پر آنے والی روشنیوں کی، ہیرے کی طرح چمکتی سفید اور لعل کی طرح دہکتی پچھلی روشنیاں اس کھڑکی پر سے گزرے چلی جاتیں۔ دور کہیں جلنے والے گول ہنڈے چپکے سے اس شیشے میں سما جاتے۔ اسے پرچھائیوں اور عکسوں کے یہ تماشے ہمیشہ سے پسند تھے۔ بچپن میں ریل گاڑی کے انجن پر لگا ہنڈا گھر کی دیوار پر تماشا دکھاتا گزرتا۔ خود ساری ریل گاڑی، بڑے بڑے درخت اور گاڑی میں بیٹھے کھڑے لوگ بڑی پراسراری خوب صورت زندگی سے بڑی سایوں کی تصویر بنتی گزری چلی جاتی جس کا وہ بونا بابا کی طرح روز انتظار کرتی۔ کیا بونا بابا کا کوئی گھر تھا؟ آج بالکل ایک نیا خیال سوجھا۔ یہ خیال پہلے کبھی نہیں آیا تھا!...... وہ روز ان کے گھر شام کا کھانا کھانے آتا تھا۔ اسے پیاری پیاری کہانیاں سناتا تھا اور ثمن نے کبھی نہ پوچھا کہ وہ رہتا کہاں ہے؟ جب انسان اپنے گھر میں محفوظ ہو تو اسے لگتا ہے جیسے ساری دنیا یوں ہی ماں باپ کے پروں کے سائے میں امن و آشتی سے رہتی ہے۔ تبھی تو بچپن میں عبدل کی بیوی آتی تو وہ پکارتی، ''امی عبدل کی ماں آئی ہے۔'' عبدل کی بیوی منہ پر دوپٹہ رکھ کر ہنستی۔ اس کی امی ڈانٹتیں، ''ثمن، کیا بری عادت ہے، جس کو دیکھو ماں..... عبدل کی ماں، ماسٹر جی کی ماں، ارے کم عقل، عبدل کی بیوی ہے یہ!''

اپنی جانے بلا..... ثمن سوچتی۔ بیوی کیا ہوتی ہے۔ ابا اس کے باپ تھے۔ امی اس کی ماں تھیں، وہ تو یہی جانتی تھی۔ امی اس کے ابا کی بیوی بھی تھیں۔ یہ ٹیڑھا سا رشتہ جاننے کی اسے کوئی ضرورت نہیں تھی۔ اب وہ اس کی امی تھیں صرف اور بیمار پڑی تھیں اور وہ ہزارویں مرتبہ سوچ رہی تھی کہ اس کی امی کی بیماری کا ذمہ دار کون تھا۔

اس طوفانی رات کے بعد ثمن لگاتار کئی دن امی کو فون کرتی رہی تھی۔ گھر میں گھنٹی بجتی تھی مگر فون اُٹھانے والا کوئی نہ تھا۔ خبروں میں اس نے سن لیا تھا کہ بحرِ ہند کا طوفان کراچی تک آتے آتے بہت دھیما پڑ گیا تھا اور پھر رخ بدل کر کسی اور سمت چلا گیا تھا۔ طوفان نے کراچی کو چھوا تک نہ تھا مگر اس کی امی غائب ہوگئی تھیں۔ اصل اُلجھن یہ تھی کہ وہ کس سے رجوع کرے!..... بے یقینی کی عذاب ناک کیفیت میں وہ حسبِ معمول پڑھنے اور پڑھانے کا کام کرتی رہتی اور وقت جوں کی چال رینگتا رہتا۔ آخر ایک دن جب یہ کیفیت ناقابلِ برداشت ہوئی تو ثمن نے ناز کو فون کیا۔ ناز کا پاکستان سے براہِ راست رابطہ رہتا تھا۔ ناز نے اسے یقین دلایا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس کی امی کی خیریت معلوم کرالے گی۔

ناز کی کوششوں سے قسطوں میں یہ اطلاعات آئی تھیں۔ طوفان کی خبر سننے کے بعد جب ثمن کی امی نے پڑوس میں فون کیا تو پڑوسی نے ان کا مذاق اُڑایا۔ ”امریکا سے فون آیا ہے کہ بحرِ ہند میں طوفان آرہا ہے۔ سو جایئے بڑی بی! کسی نے مذاق کیا ہوگا۔“ اُس نے فون رکھ دیا۔

کوئی آدھ گھنٹے بعد جب وہ جائے نماز پر بیٹھی دُعا مانگ رہی تھیں کہ کسی نے بڑے زور زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا۔ بغیر چشمہ لگائے وہ دوڑ کر دروازے پر گئی تھیں اور پوچھا، ”کون؟“

”دروازہ کھولیے بڑی بی..... واقعی طوفان ہے۔ مسجد سے اعلان ہو رہا ہے۔“ پڑوسی کی آواز آئی۔

جس وقت انھوں نے دروازہ کھولا، ہوا اور سمندر کا شور لینڈنگ کے ٹوٹے شیشے سے یکا یک در آیا اور بغیر چشمے کے انھیں یوں محسوس ہوا جیسے سمندر کی بیس فٹ اونچی دیوار کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوگئی۔

دس آدمیوں کے ساتھ ایک کار میں بھر کر چلیں تو انھیں کچھ معلوم نہیں تھا کہ یہ لوگ انھیں کہاں لیے جا رہے ہیں۔ اس وقت کچھ پوچھنے کی ہمت بھی نہیں تھی کہ سب لوگ بے حد ہراساں تھے اور خود اُن کے دل کو نہ جانے کیا ہو رہا تھا۔ وہ دم گھونٹے چپ چاپ بیٹھی رہیں۔ کار میں بیٹھی کسی لڑکی کا ہاتھ ان کے پسینے پسینے بدن سے چپکی تر قمیص سے چھوا تو اس نے پو پھٹتے اُجالے میں ان کی طرف غور سے دیکھا اور اسے شک ہوا کہ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔

راہ میں شہید ملت روڈ پر ایک اسپتال کے آدھے سوتے آدھے جاگتے کارکنوں کو مستعد ہونے میں کچھ وقت لگا۔ میڈیکل کالج سے نکلنے والے نئے نویلے ڈاکٹر نے ان کا معائنہ کیا اور انھیں داخل

کرلیا۔اس وقت ان پر دل کا دورہ پڑ رہا تھا۔

ان کو وہاں چھوڑ کر باقی قافلہ اپنی منزل پر روانہ ہوگیا اور طوفان خیریت سے گزر گیا تو واپس سی ویو آ گیا مگر سمن کی امی بہت دنوں وہاں رہیں۔ اسپتال کا فون نمبر سمن کے پاس تھا مگر ماں سے رابطہ ناممکن تھا۔ ڈیسک والے نہ کسی مریض کی خیریت بتاتے تھے نہ پیغام پہنچاتے تھے۔فون ان کے کمرے میں نہیں تھا اور وہ خود چل کر نیچے آ نہیں سکتی تھیں۔ ناز کے گھر والوں میں سے کوئی بہ نفسِ نفیس جا کر ان سے ملتا۔ پھر ناز کو فون کیا جاتا اور ناز فون پر سمن کو ان کی خیریت بتاتی۔ ان کی حالت بہتر تھی اور مزید بہتر ہوتی جا رہی تھی۔ ہر مرتبہ وہ یہی بات سنتی۔ حسبِ معمول وہ گھر کے پتے پر خط لکھتی جس کا کوئی جواب نہ آتا۔

اور وہ سوچتی رہتی امی کی بیماری کا ذمہ دار کون تھا!

ڈیو.....جس نے انھیں پرانے محلے سے اُٹھا کر طوفان کے بیچ بٹھا دیا تھا۔

وہ خود.....جس نے طوفان کی خبر سن کر بے سوچے سمجھے رات کو فون کر دیا تھا۔

وہ پڑوسی.....جس نے ان کی بات کا یقین نہیں کیا تھا اور فون رکھ دیا تھا۔

وہ چشمہ.....جو فوری طور پر انھیں نہیں ملا تھا۔

وہ پڑوسی.....جس نے اتنے زور سے دروازہ دھڑ دھڑایا تھا کہ وہ ڈر گئی تھیں۔

وہ طوفانی ہوا کا جھونکا.....جسے وہ سمندر کی لہر سمجھ بیٹھی تھیں۔

وہ بچے.....جنھوں نے اسی دن مشترکہ لینڈنگ کی کھڑکی کا شیشہ توڑ دیا تھا۔

یا وہ حکومت......جو سو رہی تھی اور جسے یہ ہوش نہیں تھا کہ وہ ساحل پر رہنے والوں کو خطروں سے آگاہ کرے اور کرتی رہے۔ جب خطرے میں لوگ اپنے ریڈیو اور ٹی وی کھولیں تو انھیں کوئی آواز سنائی دے محض کھڑ کھڑ اور ناچتے ستارے نہ ملیں۔ کوئی بتائے کہ انھیں کیا کرنا ہے اور پہلے سے انھیں معلوم ہو کہ کوئی خطرہ ہوگا تو انھیں کون سا سگنل سنائی دے گا اور انھیں کیا کرنا ہوگا.......

ہر وقت کھڑکی کے پاس کھڑی کیا دیکھتی رہتی ہو؟'' نئی ساتھی سوزی نے کہا،''لو تمھارا خط آیا ہے۔''

ڈیو کا خوشی سے بھرا خط تھا۔

''یار سنو!

مذاق نہیں.....مما سچ مچ وہ گھر خریدنے پر راضی ہوگئی ہیں۔ یہی نہیں گھر دیکھنے کو پہنچ گئیں۔ دیکھ کر بہت خوش ہوئیں۔ میرے انتخاب کی داد دی۔ جائے وقوع کی تعریف کی۔ سمندر عین نیچے چٹانوں سے کھیلتا جاتا ہے اور نیچے تک جانے کے لیے سنگی زینہ ہے۔ گھر کے آگے لان میں جتنے چاہے پھول

لگاؤ۔ ابھی نہ جانے کتنی قسمیں لگی ہوئی ہیں۔ لان کے کنارے پر ایک بڑا مزے دار سا درخت لگا ہوا ہے۔ اُوپر جانے کے بجائے نیچے پھیلتا چلا گیا ہے۔ شاخیں یوں سیدھی ہیں جیسے بیٹھنے کے لیے بینچیں بنائی گئی ہوں۔ مما نے اسے دیکھتے ہی پتا ہے کیا کہا؟

''تمھارے بچے تو یہاں بہت خوش رہیں گے۔''

''ان ہی کے لیے تو لے رہا ہوں۔'' میں نے کہا، ''دیکھا نہیں بیڈ روم سے بڑی نرسری ہے۔ میں چاہتا ہوں میرا گھر بچوں سے بھر جائے۔''

مما بہت خوش ہوئیں۔ ہنس کر بولیں، ''بچوں کا خیال رکھنا پڑے گا۔ سمندر بہت نزدیک اور گہرا ہے۔''

''سمندر!.....'' پڑھتے پڑھتے جھٹکا سا لگا۔ مگر سمن آگے بڑھ گئی۔

میں نے کہا، ''فکر نہ کریں ایسی جاہل جٹ بیوی لاؤں گا جو بس بچے پالا کرے گی اور گھر کے آگے اس درخت پر مینا کی طرح بیٹھی آپ کے بیٹے کے آنے کی راہ تکے گی۔''

بگڑو مت! ماؤں کو خوش کرنے کے لیے بعض اوقات ایسی باتیں کرنی پڑتی ہیں۔

اگلا قدم..... گھر کا جھنجٹ ختم ہو جانے کے بعد پہلے تمھارا غائبانہ اور پھر آمنے سامنے تعارف..... اس دوران تمھارے پاس وقت ہے جو سوچنا ہے سوچ لو۔ رائے لینی ہے لے لو۔ تمھاری امی اور صوفی صاحب کو بھی خط لکھ دیا ہے۔

اس گھر میں فراغت سے بیٹھتے ہی کتاب شروع کرنے کا ارادہ ہے۔ نوٹس عرصے سے لکھ رہا ہوں۔ تمھارے جواب کا شدت سے منتظر..... تمھارا ڈیو۔''

وہ اتنی پریشان تھی اور ڈیو اتنا خوش تھا۔ ڈیو کو نہیں معلوم کہ اس پر کیا گزر رہی ہے۔ اس نے خط اُٹھا کر قالین پر ڈال دیا اور خط کے پاس بیٹھ کر گھٹنوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔

''قدمِ درویشاں ردِّ بلا۔'' ضمیر صاحب نے صوفی صاحب کو دیکھتے ہی کہا۔ انھیں ہاتھوں ہاتھ لیا اور بہت آرام سے اپنے ہاں رکھا۔ دو دن میں اتنی دوستی بڑھی کہ بیگم ضمیر بیگم صوفی سے کراچی آ جانے اور ان کے گھر رہنے کی بات کرنے لگیں۔ بیگم صوفی بہت خوش ہوئیں۔ رات کو سونے سے پہلے میاں سے بولیں، ''اے ہے، دنیا میں کیسے اچھے لوگ ہیں۔ ہمیں تو پتا ہی نہ چلا اب تک!''

صوفی صاحب مسکرائے اور بولے، ''بیوی! یہی ضمیر صاحب ہیں جنھوں نے کوشش کر کے اسرار صاحب سے ہمیں ملتان میں زمین دلوائی تھی۔ وہ تو پہلے ہی بھلے لوگ تھے لیکن تمھاری نظریں نہیں تھیں۔ اب تمھاری آنکھوں سے پردہ ہٹا ہے۔ لوگ اچھے برے نہیں ہوتے، اپنا ہی آئینہ ہوتے ہیں۔ آپ

اچھے ہیں تو لوگ بھی اچھے ہی دکھائی دیں گے۔ آپ برے ہیں تو زمانہ بھی برا ہی نظر آئے گا۔ دیکھ لو وہی زمان ہے جس سے تم کھنچی کھنچی رہتی تھیں۔ آج اس کی شادی میں پھیلی پھیلی پھر رہی ہو۔"

"تم بھی چاہے کتنے ہی بھلے ہو مگر جس دن بیوی کے عیب نہ گنوا لو کھانا ہضم نہیں ہوتا۔" انھوں نے مسکرا کر کہا کیوں کہ آج کل وہ واقعی خوش تھیں۔ ضمیر صاحب کے گھر بالکل لڑکے کی ماں کی حیثیت سے رہ رہی تھیں اور کئی کام ان کے سپرد کردیے گئے تھے۔

مگر جب بارات سسرال پہنچی تو وہاں نقشہ ہی کچھ اور تھا۔ برات میں زمان نے دور دور سے دوستوں کو بلا رکھا تھا جن کی بیگمات بن ٹھن کر، ہیرے جواہرات کے سیٹ پہن کر لمبی لمبی دمکتی کاروں سے اُتر رہی تھیں۔ شٹل کاک نما برقعے سے برآمد ہوتے ہی ان کی عزت دو کوڑی کی رہ گئی۔ کسی نے پوچھا تک نہیں۔ ضمیر صاحب کی بیگم کے ساتھ جا کر پیچھے بیٹھ گئیں۔ ذرا دیر بعد بیگم ضمیر کی کوئی جاننے والی مل گئیں، وہ ان کے ساتھ ہولیں اور انھی کے ساتھ کھانا کھانے چلی گئیں۔ اِدھر اُدھر ڈھونڈا بھی پھر یہ سوچ کر اطمینان کرلیا کہ کہیں نہ کہیں کھڑی بیٹھی کھانا کھا رہی ہوں گی مگر بیگم صوفی اپنی جگہ سے نہ ہلیں۔ اسی انتظار میں غصے سے بھری بیٹھی رہیں کہ دولھا کی اماں ہیں کوئی تو بلانے آئے گا۔ آتا کون، ماں بہنیں دلہن سے زیادہ بجی بنی اپنی تصویریں کھنچوانے اور ویڈیو بنوانے میں لگی ہوئی تھیں۔ ہزاروں کے کپڑوں، سیروں زیوروں اور منوں غرور میں لدی پھندی یہ عورتیں انھیں ذرا بھی نہ بھائیں۔ چہرے پر ذرا روہت نہیں لٹکے دکھاتی پھر رہی ہیں۔ مہمان کھانا کھاتے رہے وہ اپنا ہی گوشت کھاتی رہیں۔ بہنوں میں امان کی بیوی ذرا غنیمت تھی۔ سیدھی سادی اور بھولی۔ اگر دلہن اس جیسی ہوئی تو خیر ہے ورنہ تو میاں زمان گھن چکر بن جاؤ گے۔ اچھے چھچھورے لوگ ڈھونڈے۔ "اڈھی کے لُون کو جاؤں لاؤ میری پالکی......" قسم کے لوگ انھیں ہمیشہ سے ہی زہر لگتے تھے۔

"اے ہے اس کو تو دیکھو لپ چھنخی، لتری کان کتری۔ لپ لپ کھانا کھاتی جائے، لپڑ لپڑ باتیں بناتی جائے۔"

وہ اکیلی بیٹھی بڑبڑاتی رہیں۔ آتے جاتے کسی بیرے نے کہا بھی کہ بڑی بی جاؤ کھانا کھالو مگر وہ سنی ان سنی کرگئیں۔ اب تو وہ زمان ہی کو بتائیں گی کہ شادی کے گھر سے بھوکی پیاسی واپس آئیں مگر اس کا بھی موقع نہ ملا۔ زمان بیوی کو رخصت کرا وہیں سے وہیں کسی بڑے سے ہوٹل میں لے گیا۔ سنا دوسرے دن وہ ہنی مون منانے سنگاپور اور ہانگ کانگ جا رہے تھے۔ واپسی میں وہ اپنے شہر سیالکوٹ چلا جائے گا جہاں جھنڈا لگا گھر اس کا اور بیوی کا منتظر ہوگا۔ ولیمے کی دعوت بھی وہیں ہوگی۔

"لو بھئی یہ نئی سنی۔" بیگم صوفی غصے میں کچھ کہنے والی تھیں مگر پی گئیں۔ "خیر وہ خوش رہیں۔"

غصّے کا غبار دل میں چھپائے بھوکی پیاسی سونے تو لیٹ گئیں مگر نیند نہ آئی۔ کروٹیں بدلتی رہیں۔ اندر ہی اندر جلتی بھنتی رہیں۔ بھوک سے الگ کلیجہ کلپتا رہا مگر انھوں نے کسی سے کچھ نہ کہا۔ ڈر یہی تھا کہ گھر والے اور سب سے زیادہ سر کے تاج، اُلٹا انھیں ہی اُلاہنا دیں گے۔ دل میں سوچتی رہیں۔ ٹھیک کہتے ہیں اپنا اپنا، پرایا پرایا، نہ ہی آتیں تو اچھا تھا۔ اپنی عزت اپنے ہاتھوں خراب کی۔ پرانے لوگ کہہ گئے ہیں، روپیا پرکھن بار بار.... آدمی پرکھن ایک بار۔ میں ہی پاگل تھی۔ آخر اتنا تو مجھے بھی معلوم ہے کہ اصل سے خطا نہیں۔ کم اصل سے وفا نہیں۔

اذان کی پہلی آواز پر اُٹھ، وضو کر جلدی سے نماز پڑھنے بیٹھ گئیں۔

اس دن جب سمن کی ماں سے ملنے جانے لگیں تو دل بجھا بجھا سا تھا۔ ضمیر صاحب نے رائے دی۔ ''فون کر لیجیے، خدا معلوم وہ گھر پر ہیں یا نہیں۔ بصیرہ کے کہنے پر انھیں زمان کی شادی میں مدعو کیا گیا تھا مگر انھوں نے دعوت نامے کا جواب دیا نہ شادی میں شرکت کی۔''

فون کسی نے نہ اُٹھایا تو ناز کے سسرال رجوع کیا گیا۔ معلوم ہوا سمن کی ماں اسپتال میں ہیں۔ صوفی صاحب بولے، ''بیوی، یہ وقت ایسی بات کے لیے مناسب نہیں ہے، چلو چل کر مل آتے ہیں۔ پھر کبھی بذریعۂ ڈاک پیغام بھیج دیں گے۔''

دونوں اسپتال پہنچے۔ سمن کی ماں پہلے سے بہت بہتر تھیں۔ دل کا دورہ تو پڑا تھا مگر طبیعت اب سنبھل گئی تھی۔ ڈاکٹر نے چند دن بعد گھر جانے کی اجازت بھی دے دی تھی لیکن ساری عمر کے لیے چند دوائیں تجویز کر دی تھیں۔ بیٹی پردیس میں پڑھائی کے ساتھ ملازمت کر کے کیسے ان کے لیے پیسے بھیج رہی تھی۔ یہ کہتے ہوئے وہ آبدیدہ ہو گئیں۔ یکایک صوفی صاحب کی ہمت بندھ گئی۔ وہ مطلب کی بات پر آ گئے۔

''بی بی برا نہ مانیے گا۔'' انھوں نے ملائمت سے کہا، ''ہم ایک بات کہنے حاضر ہوئے تھے۔ آپ کی بیماری کا سن کر ارادہ بدل گیا تھا مگر اب جی چاہتا ہے کہہ ہی ڈالوں۔ آپ دل کی مریضہ ہیں، بچی کے سر پر کوئی ہاتھ رکھنے والا نہیں، جلد اس کے فرض سے سبکدوش ہو جائیں تو اچھا ہے۔ ڈیو خواہش مند ہے۔ اچھا لڑکا ہے، زبان، کلچر سے واقف ہے عرصے سے سمن کے پیچھے ہے۔ میرا اندازہ کہتا ہے مذہب بھی تبدیل کر لے گا۔''

سمن کی امی تھوڑی دیر خاموش سوچتی رہیں پھر بولیں، ''دیکھیے آپ تو ہمارے ہاں کی روایتوں سے واقف ہیں۔ میں کیسے غیر ملک میں بچی کو ایک غیر لڑکے کے ساتھ جھونک دوں۔ کتنا بھی اچھا ہو مگر ان کے ہاں شادی کا اعتبار نہ طلاق کا۔ پھر سب سے بڑی بات یہ ہے کہ سمن نے خود کبھی اس بات کا

اشارہ بھی نہیں دیا۔ میری نظر میں ایک لڑکا ہے۔ میرا خیال ہے وہ ثمن سے شادی کرنا چاہتا ہے اور مجھے معلوم ہے ثمن بھی اسے ناپسند نہیں کرتی۔ صرف ضد پکڑ لی ہے۔ ضد ٹوٹے گی تو مان جائے گی۔''

''آپ خود خط میں اس سے پوچھ لیجیے......'' بیگم صوفی بولیں۔

''میں تو ہر حال میں اپنے ہی ملک کے آدمی کو ترجیح دوں گی۔'' ثمن کی ماں نے کہا، ''آپ بتایئے آپ اپنی بیٹی کی شادی امریکن سے کر دیتیں؟ کیوں بھائی صاحب!''

صوفی صاحب اور بیگم صوفی کے پاس اس سوال کا کوئی جواب نہیں تھا۔ اپنے طور پر جتنی سفارش ہو سکتی تھی انھوں نے کر دی تھی۔ باقی ثمن جانے اور اس کی ماں۔ وہ کیا کر سکتے تھے۔

ضمیر صاحب کے اصرار پر دو دن اور ٹھہرے اور واپس چلے آئے۔ بیگم صوفی جتنی خوش خوش گئی تھیں اتنا ہی بوجھ دل پر لیے لوٹ آئیں۔ رہ رہ کر زمان پر غصہ آتا تھا۔ آخر کو پھٹک ہے نا، روپیا دیکھا تو ہنس دیا، لہو دیکھا تو رو دیا......شادی میں روپیا ٹھیکری کر دیا مگر ایک سُوسی کا جوڑا بنا کر اماں کو نہ دیا۔ چلو وہ بھی نہ دیتا ہنس کر بات تو کرتا۔ یہ تو کہتا، اماں کتنا اچھا کیا میری شادی میں آ گئیں۔ اسی پر دل باغ باغ ہو جاتا۔ بنیا گڑ نہ دے گڑ کی سی بات تو کرے مگر اس ناخلف نے تو یہ بھی نہ کیا۔ خیر اس دفعہ تو غلطی ہو گئی آئندہ کبھی کسی موقعے پر تو بلا کر دیکھے، اِدھر کی دنیا اُدھر ہو جائے بندی نہیں جانے کی!

سلیم، اماں اور اس کی کم سن بیوی سارہ ٹینیسی کے اسموکی ماؤنٹین کی سیر کو جا رہے تھے۔ کار سلیم چلا رہا تھا کیوں کہ اماں کو امریکا میں کار چلانے کی مشق نہیں تھی اور یہاں کا لائسنس بھی اس کے پاس نہیں تھا۔ بصیرہ کا اصرار تھا کہ اسموکی ماؤنٹین جانے سے پہلے وہ اس کے پاس چاٹانوگا آئیں کہ وہ نہایت تاریخی جگہ ہے جہاں سول وار میں زبردست لڑائی ہوئی تھی۔ لُک آؤٹ ماؤنٹین اوورز میں دوز روبلی آبشار کا نظارہ کریں۔ ناز نے اس بات پر صاد کیا۔

''بے چاری اتنی دور اکیلی پڑی ہے اس کے پاس ضرور جانا۔'' اُس نے کہا تھا۔ ''اور وہ جگہیں بھی واقعی قابلِ دید ہیں۔''

مگر اکیلے میں اس نے سلیم سے کہا تھا، ''بصیرہ کے پاس جاؤ تو اسے پرکھنا۔ دل کی اچھی ہے بظاہر بے مروّت بنی رہتی ہے۔ کچھ چیزیں کڑوی ہوتی ہیں مگر تاثیر اچھی ہوتی ہے۔ نیم کی مثال لو، پتے کڑوے، نمکولی کسولی مگر فائدے بہت ہیں۔ حکیموں نے کہا ہے کہ نیم کی ہوا میں سانس لینا بھی مفید ہے۔ اب بتاؤ چنبیلی کے جھاڑ کی چھاؤں بھلی یا نیم کی؟''

''چنبیلی کا جھاڑ!......'' سلیم سوچنے لگا۔ اتفاق سے ناز بھابی کی زبان سے نکلا یا ثمن کے نام کی رعایت ہے!......جو بھی ہو، وہ ابھی نیم کی اینٹی سیپٹک چھاؤں میں بیٹھنے کے لیے تیار نہ تھا مگر ناز

بھابی کے اصرار اور امان کی دلی خواہش پر وہاں تک جانے کو تیار ہو گیا۔

رہبرہ نے بتایا کہ چار بلاک کے برابر چلنا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ایک جگہ کھلی آئی جس کی چھت اونچی تھی۔ اسے گول سا کمرہ کہا جاسکتا ہے۔ پانی کی آواز سنائی دی۔ چند قدم آگے ایک اور گول کمرہ تھا اور یہاں چھت پر سے پانی نیچے گر رہا تھا۔ یہ آبشار نیاگرا آبشار سے مختلف تھا کہ زمین کے اندر سے نکل کر زمین کے اندر ہی گرتا تھا۔ سیاح اس کے نیچے سے گول دائرے میں گزرتے پھر اسی راستے سے لوٹ رہے تھے۔

سلیم کھڑا حیرت سے اس گرتے آبشار کو دیکھ رہا تھا۔ گلابی اور زردی مائل دیواریں اور غاروں کے راستے جانے کہاں کہاں جا رہے تھے۔ مصنوعی روشنی نہ ہوتی تو یہاں گھپ اندھیرا ہوتا کہ اتنے نیچے سورج کی ایک کرن کا در آنا بھی مشکل تھا۔ سائرہ اور امان بھی نزدیک ہی کھڑے تھے۔

''سلیم، آپ کو معلوم ہے کہ سمن کی امی دوبارہ اسپتال میں داخل ہو گئی ہیں؟'' بصیرہ نے یکایک کہا۔

سائرہ نے یہ نام یقیناً پہلی بار سنا تھا لیکن امان بھی یوں بن گیا جیسے اس نے یہ نام کبھی نہ سنا ہو۔

''نہیں۔'' سلیم نے مختصراً کہا۔

دائرے سے آگے بڑھ کر وہ پھر تنگ جگہ پر آگے پیچھے چل رہے تھے کہ بصیرہ کی آواز آئی،

''اب تو شاید بے چاری سمن کی امی بھی اس بات پر راضی ہو جائیں کہ وہ کہیں بھی شادی کر لے۔''

سلیم نے اس بات کا کوئی جواب نہ دیا۔ کیچڑ اور پانی سے چکنی زمین پر سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے اس نے اپنی نگاہیں نیچی رکھیں۔

بصیرہ کو گھر پہنچا کر انھوں نے اسموکی ماؤنٹین کا راستہ پکڑا۔ ان میں سے کوئی بھی یورپ نہیں گیا تھا لیکن وادیوں میں ہرے بھرے درخت، پہاڑیوں پر گھر اور پرانی وضع کی عمارتوں کے درمیان چرچ کے نوکیلے گنبد جرمنی اور فرانس کی وادیوں کی تصویریں یاد دلاتے تھے۔ ان کا موٹل ایک پہاڑی چشمے کے کنارے تھا۔ چشمہ سڑک کے دوسری طرف سے بہتا آتا تھا اور گھنے درختوں کے سائے میں ہوٹل کی بغل میں چپ چاپ بہتا پیچھے چلا جاتا تھا۔ چشمے تک جانے والی کائی لگی سیڑھیوں پر پتوں کے ڈھیر پڑے تھے۔ موٹل کے لان میں ایک خوب صورت درخت پر داستانی گانے والے درخت کا شبہ ہوتا تھا کیوں کہ اس کی ایک شاخ پر تین مصنوعی قازیں لگی ہوئی تھیں جو ہوا سے ہلتی رہتی تھیں اور ان کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ نغمہ سا بن جاتی تھی۔

بچن فورج سے گزرے جہاں کی تفریح گاہوں میں بچوں کی فوج پھر رہی تھی۔

''ہم اپنے بیٹے کو لے کر ایک دن پھر یہاں آئیں گے۔'' امان نے آہستہ سے سائرہ سے کہا۔

سلیم نے دیکھا کہ سائرہ کا رنگ ایک دم گلابی ہو گیا۔

ہوٹلوں میں جگہ جگہ، کوئی جگہ نہیں ہے، کے سرخ الفاظ چمک رہے تھے۔

گیٹلن برگ میں دنیا کی سب سے بڑی ایریل ٹرام میں سفر کرتے ہوئے لمحے بھر کو سلیم کی نگاہ سائرہ پر ٹھہری تو اس کا چہرہ چاک کی طرح سفید تھا۔

''تمھاری بیگم کو ڈر لگ رہا ہے شاید۔'' سلیم نے امان سے کہا۔

امان نے سائرہ کا ہاتھ پکڑا اور اسے کار کے درمیان میں لے جا کر کھڑا کر دیا۔ ''ڈر لگ رہا ہے تو یہاں کھڑی رہو، نیچے جھانکنا ضروری تو نہیں۔ پھر وہ سلیم کے برابر آن کھڑا ہوا۔ درختوں کی چوٹیاں، سڑکوں کے جال، جنگل پاتال، درختوں کے بیچ آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے خودرو پھولوں کے جھنڈ سب بہت نیچے ان کے قدموں تلے گزرتے جا رہے تھے۔ درختوں کے درمیان سے عمارتیں نکل کر ان کے دیدار کو کھڑی ہوتیں پھر چھپ جاتیں۔

ایر ٹرام رکی تو سب اُترے اور تین سو گز پر پھیلے بازار میں پھیل گئے۔ بازار سے نکلو تو پھر پہاڑ تھے۔ ہوائی کرسیاں ہوا میں لٹکی لوگوں کو سیر کرا رہی تھیں۔ صبح پہاڑ اور وادیاں سفید بادلوں کے لبادے پہنے کھڑے تھے لیکن اس وقت دھوپ اور درختوں کے سائے سبزے پر خوابیدہ تھے۔ چڑیاں درختوں میں چھپی چہچہا رہی تھیں اور تتلیاں سرِ عام پھولوں پر منڈلا رہی تھیں۔

سب سے اونچی چوٹی پر ایک درخت تنہا کھڑا تھا۔

منظر اِک بلندی پر اور ہم بنا لیتے
عرش سے پرے ہوتا کاش کہ مکاں اپنا

''یہ شعر غالب نے اس جگہ کو دیکھے بغیر کیسے کہہ دیا۔'' سلیم نے کہا۔

''شاید قطب مینار پر چڑھتے چڑھتے کہا ہو۔'' سائرہ نے کہا اور یکایک وہ سرخ پڑ گئی، جیسے اسے یقین نہ ہو کہ جو بات اس نے کہی تھی وہ مناسب تھی۔ آیا اس کا شوہر اس کی بات پر صاد کرے گا یا بے وقوفی جانے گا۔

شام کو گیٹلن ولج میں گھاس کے قطعے پر بیٹھے بیٹھے بھی یوں ہی ہوا۔ درمیان میں اچھلتے گرتے پانی کے برابر میں ایک شعلہ بھی جل رہا تھا۔ چاروں طرف یورپ کی گھریلو مصنوعات کی دکانیں تھیں۔ اسکاٹ لینڈ کی بنی ہوئی انگوٹھیاں اور بروچ، جرمنی کی لکڑی کی چیزیں، سوئٹزر لینڈ کے پنیر۔ دھات کے زمین میں گڑے ہوئے ستونوں میں پرانی وضع کے لیمپ لٹکے ہوئے تھے اور ان کے نیچے کنڈوں میں گملوں میں پھول۔

''یوں لگ رہا ہے جیسے اٹلی میں بیٹھے ہوں۔'' امان نے کہا۔

''آگ پانی کا ساتھ بھی ہے۔'' سائرہ نے فوارے کی طرف دیکھا۔

''اس کے کیا معنی؟'' امان نے پلٹ کر پوچھا۔

سائرہ کا رنگ پہلے سرخ اور پھر زرد ہو گیا۔ یکایک وہ کھسیانی ہنسی ہنس دی۔ ''کچھ نہیں۔'' اس نے کہا۔

''بات سوچ کر کیا کرو۔'' امان نے کہا۔

سلیم کو عجیب سا لگا۔ اسے بہت دن پہلے کی سمن کی بات یاد آئی۔ وہ اپنی عمر سے دس پندرہ سال کم عمر کسی گوری چٹی لڑکی سے شادی کر رہا ہوگا۔ کسی ایسی لڑکی سے جس کے کان میں کبھی میری بھنک پڑی اور میرے بارے میں پوچھ لیا تو اس کے گال پر طمانچہ مار کر کہے گا۔ ''شٹ اپ!''

سمن نے ٹھیک کہا تھا۔ امان نے خوش شکل، کم عمر اور بھولی بھالی لڑکی ہی ڈھونڈی تھی جسے وہ بات بے بات ڈانٹتا تھا اور وہ سرخ پڑ جاتی تھی یا ہنس دیتی تھی۔ شاید کسی نے بتا دیا تھا کہ ایک ہنسی ستر بلائیں ٹالتی ہے۔

اسموکی ماؤنٹین کے سلسلوں سے گزرتے ہوئے سارے پہاڑ دھواں دھار تھے اور جگہ جگہ ''گرتے پتھروں سے ہوشیار رہو'' کے بورڈ تھے کہ اپنے اندر جڑے سمیت پتھروں کے ساتھ ٹیلے بغیر اطلاع گرتے رہتے تھے۔ مستقبل میں یہ مٹی کہاں اور کس پر گرنے والی ہے کون جانے۔ سلیم نے سوچا۔ ایسی جگہوں پر جہاں قدم قدم پر موڑ ہوں اور پہاڑوں میں دھند بھری ہو آدمی کو کار چلاتے ہوئے بہت صاف ذہن ہونا چاہیے۔ اسے خیال آیا مگر اس کا ذہن صاف نہیں تھا۔ اس میں طرح طرح کے خیالات اور آس پاس کے سارے رنگ بھرے ہوئے تھے۔ اودے پھولوں کے، پیلے پھولوں کے، نارنجی لتی، لائی لیک اور زہریلی آئی وی کے موتی ایسے سفید گول پھل..... جوں جوں بلندی بڑھتی گئی درختوں کے رنگ بدلتے گئے۔ بہار سے موسمِ سرما کی ہریالی تک پہنچے، پھر خزاں کے آثار آئے اور اسموکی ماؤنٹین کی انتہائی بلندی پر چیڑ کا پھپھوندی لگا جنگل آیا۔ درختوں سے کھال جھڑ گئی تھی اور وہ برص زدہ مریض کی طرح داغ دار تھے۔ درختوں کی شاخیں کوڑھی کی انگلیوں کی طرح جھڑ رہی تھیں۔ ان درختوں کے درمیان سے رستا پانی بھی کہیں زنگ آلود سرخ تھا اور کہیں کائی آلود سبز۔ اتنی بلندی پر تو درختوں کو خوش باش ہونا چاہیے لیکن شاید وہ اندر سے بیمار ہیں۔ انھیں کوئی گھن لگ گیا ہے۔ تازہ خنک ہوا، ہشاش بشاش سیاح، خوش باش بچے، آسمان پر سے گزرتے بادلوں کے پرے، سنسناتی ہوا کوئی چیز ان پر اثر نہیں ڈالتی۔ کوئی بھی اس سیاہ، از کار رفتہ جلے بھنے جنگل کو ہرا نہیں

کرسکتا کیوں کہ اس کے اندر پنپنے کی طاقت جواب دے گئی ہے۔

بادل آئے، لمحے بھر میں فضا اور بھی دھواں دھار ہوگئی۔ دھوپ نکلی تو نیچے کے جنگل چمک اُٹھے مگر جلا ہوا جنگل اور بھیانک ہوگیا جیسے کوئی بھوت سفید سفید دانت نکال دے۔ نیچے جائیں گے تو پھر بہار آجائے گی۔ سلیم نے سوچا۔ ایک ہی جگہ مختلف موسم بھی ہوسکتے ہیں مگر اس کے دل کے موسم نہیں بدلتے۔ اس میں خزاں جم گئی ہے۔ شاید اصل خزاں دل ہی کی خزاں ہوتی ہے۔ یکایک ایک گاڑی تیزی سے آئی بالکل سامنے..... سلیم نے بچانے کی کوشش کی۔ پھر اندھیرا گھپ...... شاید کوئی سرنگ! اشارہ یہ تھا، مرگ کا، قبر کا۔ ابدی گمشدگی کا، نیست کا۔ نیست کا خیال اور پھر کچھ بھی نہیں۔

مگر جب ہوش آیا تو وہ زندہ تھا اور صحیح سلامت تھا، سائرہ زندہ تھی اور صحیح سلامت تھی۔ اس کے جسم میں پرورش پانے والا بچہ بھی ثابت و سالم تھا لیکن امان شدید زخمی تھا۔ اس نے اسپتال میں اشارے سے کاغذ اور قلم مانگ کر کانپتے ہاتھوں سے لکھا: ''سلیم! میرا بچہ ابھی مجھے نہیں پہچانتا۔ تم اس کے باپ بن جاؤ، ساری عمر تمھیں ہی باپ جانے لگا۔ سائرہ کو بے سہارا نہ چھوڑ......''

اس کے بعد قلم اس کے ہاتھ سے گر گیا۔ اسے دوبارہ آپریشن تھیٹر میں لے جایا گیا تھا مگر ہاتھ پیروں کی حس، آنکھوں کی روشنی، جسم پر ذہن کی گرفت ہاتھ سے نکل گئی تھی۔ وہ کوما میں چلا گیا تھا۔ نہ ہاتھ پیر ہلتے تھے، نہ آنکھیں کھلتی تھیں۔ ڈاکٹروں کا خیال تھا کہ کومے میں مریض سنتا ضرور ہے۔ محبت آمیز الفاظ، اپنے پیاروں کی زبان۔ سائرہ اسے رو رو کر بلاتی رہی، سلیم اسے پکارتا رہا مگر چھ دن اسی طرح بے حس و حرکت رہنے کے بعد وہ دوسری دنیا کو چلا گیا۔

سلیم اپنے دوست کی نعش اور اس کی بیوی کو لے کر پاکستان کے لیے روانہ ہوگیا۔ امان سے اس نے یہ بھی وعدہ کر رکھا تھا کہ وہ اس کے ساتھ ہی واپس لوٹے گا۔

طویل ویک اینڈ پر کیمپس کیسا خالی خالی لگتا تھا۔ کمرے کے پیچھے اس درخت کی طرح جس کے پتے تیزی سے جھڑ رہے ہوں اور جس پر بارش کے قطروں کی ماری ہوئی دو چار چڑیاں پر پھلائے ایک دوسرے سے لاتعلق الگ الگ شاخوں پر بیٹھی ہوں۔ بسیں آدھ گھنٹے کے بجائے ایک گھنٹے کے وقفے سے چل رہی تھیں پھر بھی زیادہ تر خالی تھیں۔ سمن نے باہر نظر ڈالی۔ زمین آتی خزاں میں جگہ جگہ سے جھلسی ہوئی تھی۔ کھڑکی کا چوکھٹا اٹلس کا نقشہ تھا جس میں بھورے، زرد اور سبز قطعے پھیلے ہوئے تھے۔ اگر کنارے پر لگے شوگر میپل کی شاخیں ہل کر جان نہ ڈال رہی ہوتیں تو یہ لینڈ اسکیپ اٹلس کے نقشے کی طرح ساکت اور بے جان تھا۔ ہاں درخت کا سیاہ سایہ بھی زندگی کی علامت تھا۔ ہلتی شاخیں اور ساکت سایہ۔ اس کی اور امی کی زندگی بس اس کھڑکی بھر لینڈ اسکیپ سے زیادہ کیا رہی ہوگی۔ اس

لینڈ اسکیپ پر تڑاتڑ اکتوبر کی بارش پڑ رہی تھی۔ لگتا تھا سب پتے ایک دن میں زرد ہو گئے ہوں۔ زرد جھکی پتیاں دھیرے دھیرے سر ہلا رہی تھیں جیسے کسی بات پر بادلِ ناخواستہ اثبات کر رہی ہوں۔ کھڑکی کے شیشے پر بوندیں جمی ہوئی تھیں۔ کچھ اوپر سے گر کر جمی تھیں کچھ فرش سے اچھل کر۔

بارش تھمی تو وہ چھتری لے کر باہر نکل گئی۔ لائبریری سے چند کتابیں لانی تھیں۔ لمبے راستے سے جانے کے بجائے اُس نے عمارتوں کے درمیان سے راستہ قطع کیا۔ سبزی مائل چھجوں سے ٹپکتی بوندیں سرمئی پتھروں پر برس رہی تھیں۔ سفید اور سرمئی کبوتریاں سمٹے بیٹھے تھے کہ ان کے بدن پھول کر گیندیں سی بن گئے تھے۔ درختوں نے کیسا چولا بدل لیا تھا۔ سبز پتے زرد، گلابی اور بھورے پڑ گئے تھے۔ سامنے سڑک پر ایک لال بھبوکا درخت کھڑا تھا۔ کچھ درخت اب بھی ہرے بھرے تھے مگر گھروں کے کنارے لگی آتش بجاں جھاڑیاں سرخ تھیں۔ بعض درختوں کے پیلے پن میں ایسا حسن تھا جو دلہن کے نوخیز ابٹن لگے رنگ میں ہوتا ہے۔ ایک موٹی دُم کی گلہری لپکتی آئی اور سمن کے پاؤں کو چھوتی گزر گئی۔ سمن بے اختیار ہنس دی۔

لائبریری سے نکلی تو جی چاہا کہیں جائے، کسی کو ساتھ لے، پدما سے بات کرے۔ نہیں، آج تنہا نکلنے کو جی چاہتا ہے۔ اس نے سوچا۔ ایک بس میں بیٹھ کر ویسٹ سائڈ باغ پر اُتر گئی۔ سڑک کے کنارے درختوں کے پتے جھلملاتے رنگوں کی تتلیوں کی طرح جھومتے اِتراتے نظر آئے۔ ان تین دنوں کی بارش میں رنگوں میں لطافت اور تراوٹ سی در آئی تھی۔ باغ میں جانے کے بجائے وہ ان درختوں کی چھاؤں میں چلتی گئی۔ یکایک دھوپ نکل آئی۔ رنگین پتوں سے چھنتی دھوپ اس کے سر پر رنگین پروں والے فرشتوں کا سایہ سی بن گئی۔ یہ بھی ایک انوکھا تجربہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے اچھوتے تجربوں کی طرح۔ اس کے کمرے کے سامنے درخت کے دوشاخے میں ایک بڑا سا گول سوراخ تھا۔ اس روشن دان جیسے سوراخ سے نیلا آسمان، سنہری تارے اور نارنجی چاند جھانکتا بڑا عجیب سا لگتا تھا۔ آتے جاتے رات کو وہ اس منظر کو دیکھنا نہ بھولتی۔ کبھی گول آسمان کاسنی ہوتا اور اس پر بڑے بڑے دو چار نارنجی تارے جڑے ہوتے اور کبھی نیلے آسمان پر صرف ایک چاند ہی اس سوراخ میں سما پاتا۔ اسے ایسے انوکھے تجربوں کی اور ان سایوں کی ضرورت ہے۔ ماں کے سائے کی اور کسی خوب صورت رنگین چھتری کی جس میں دھوپ کے ساتھ ایسے خوب صورت نرم و نازک رنگ بھی ہوں۔

شاید آج ڈیو کا خط آئے..... تلازمۂ خیال نے بلا کوشش اس کی سوچ کا رُخ بدلا جیسے ماں بچے کا ہاتھ پکڑے یکایک کسی طرف کو مڑ جائے۔ ڈیو کا خط؟..... اس نے چونک کر خود سے سوال کیا۔ کیا ڈیو کا خط اس کا نشہ بنتا جا رہا ہے! ماں کا خط یا ڈیو کا خط یا کوئی چیز شاید گھر پر اس کی منتظر تھی کہ سیر میں

اس کا جی اُکھڑا اُکھڑا سا تھا۔ سڑک پر مرمت کی نشان دہی کرنے والی غیر رومانی رکاوٹوں نے رہا سہا سحر بھی توڑ دیا۔ اگلی بس پکڑ کر وہ واپس چلی آئی۔

پہلے بھی ایسا ہوا تھا کہ جب آس پاس کے لڑکے لڑکیاں اپنے ہم وطن دوستوں کے یا والدین کے گھر چلے جاتے تو وہ وقت گزاری کے لیے بستر پر پڑے پڑے ٹیپ ریکارڈر کا بٹن دبا دیتی اور اقبال بانو، فیض کا دشتِ تنہائی سناتیں تو اس کا دل، اس کا کمرہ، سارا شہر اور سارا ملک بھائیں بھائیں کرنے لگتا۔ آج بھی یہی ہوا اور ہمیشہ کی طرح وہ سوچنے لگی کہ وہ اپنا ملک چھوڑ کر اس دیس میں کیوں آئی تھی؟ صرف اس لیے کہ وہ یہاں اور امی وہاں احساسِ تنہائی کی شدید ترین چبھن کو محسوس کرسکیں۔ اگر وہ کسی چیز کی تلاش میں آئی تھی تو کیا وہ چیز اسے واقعی مل گئی تھی؟ وہ کسی چیز سے بھاگ کر آئی تھی تو کیا دراصل اُس سے چھٹکارا مل گیا تھا؟ ان سوالوں کے جواب کے لیے تنہائی کی یہ مسلسل اضطرابی کیفیت مناسب نہیں تھی۔ یہ سوال ایسے ہی وقت سر اُٹھاتے تھے ورنہ دھوپ نکل آتی اور روزمرہ کے کام شروع ہوجاتے تو یہ سوال بھی چھپ جاتے کہ موقعے پر پھر نکلیں اور ہراساں کریں۔ یہ بھی نہیں تو خیال آتا، سلیم واپس گیا یا نہیں؟ ڈیو اس وقت کیا کررہا ہوگا؟ اس نے تھینکس گونگ کی چھٹیوں میں کیلی فورنیا آنے کی دعوت دی تھی مگر اس نے assignment کا بہانہ کردیا تھا۔ جب تک وہ خود کسی نتیجے پر نہ پہنچ جائے خود کو اور ڈیو کو خواہ مخواہ کی پریشانی میں ڈالنا دانائی تو نہیں ہے اور جو کچھ بھی ہو، ڈیو کے ساتھ اس کے تعلقات میں منافقت نہیں تھی۔ ہاں منافقت!

ثمن کو یوں لگا جیسے یہ لفظ پا کر اسے تسکین سی ہوئی ہو، جیسے یہ لفظ وہ بہت دنوں سے ڈھونڈ رہی ہو۔ اس درد کی اصل جگہ کی طرح جو بدن میں دور تک پھیلا ہوا محسوس ہو اور بہت ٹٹولنے کے بعد پتا چلے کہ درد کی اصل نشست کہاں ہے! شاید یہ منافقت ہی تھی جس سے بچ کر وہ یہاں آئی تھی جو اُوپر سے نیچے تک، دائیں سے بائیں تک ہر جگہ پھیلی ہوئی تھی اور سطح سے نیچے بہتی لہر کی طرح ہر جگہ جاری و ساری تھی۔ مذہب میں، سیاست میں، کاروبار میں، رسم و رواج میں، روزمرہ کے تعلقات میں، یہاں تک کہ دوستیوں میں! وجہ کچھ بھی..... کج معاشرہ! اظہار پر پابندی یا اپنے بارے میں غلط رائے۔ خود اپنے ساتھ بھی منافقت کہ دل میں زندگی کی اقدار کچھ ہوں اور ظاہر کچھ اور کی جائیں...... تو کیا صرف ایک وہی تھی جس کے لیے ایسا معاشرہ ناقابلِ برداشت تھا؟ کہیں ایسا تو نہیں تھا کہ منافقت کے کاروبار میں جو منافع دوسرے کما رہے تھے اس میں اس کا ساجھا نہیں تھا اور یہی بات اُسے بری لگی تھی!

گھڑی دیکھ کر ثمن نے پاکستان میں امی کے گھر کا فون نمبر ملایا۔ کبھی کبھی اپنے ملک کا نمبر ملاتے ہی ژن سے یوں آواز آتی جیسے کسی اور کُرے سے رابطہ ہوگیا ہو۔ ایک بے کراں سنسناہٹ

جیسے دو وسیج کرے ایک دوسرے سے متکلم ہونے کو تیار ہوں۔ ایسے ہی بے کراں سناٹے سے اس کی ماں کی پیار بھری آواز اُبھرتی تھی مگر آج گھنٹی بجتی رہی کسی نے بھی نہ اُٹھایا۔ دس پندرہ گھنٹیوں کے بعد تھک ہار کر اُس نے فون رکھ دیا۔ ذرا دیر بعد اس نے بصیرہ کو فون کیا۔ بصیرہ بہت خوش تھی۔

''سنو سمن!'' بصیرہ نے کہا، ''زمان یاد ہے نا، ابا کے انتقال پر ہمارے ہاں آیا تھا۔ میں نے اُس کی شادی کرادی ہے امان کی سالی سے۔ کٹورے کو کٹورہ، پیالے کو پیالہ!''

''اچھا!'' سمن نے کہا، ''یہ شادیاں کروانے کا کام تم کب سے کرنے لگیں؟''

''یہ پہلی ہی کروائی ہے۔'' بصیرہ نے کہا، ''مگر تم چاہو تو تمھارا کام بھی ہو سکتا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' سمن نے تیکھے لہجے میں پوچھا۔

''ناز کا دیور..... اچھا ہینڈسم لڑکا ہے، کھاتا پیتا شریف گھرانا.....''

''اچھا بس..... طویلے کی بلا بندر کے سر نہ ڈالو..... ناز تو تم پر اُدھار کھائے بیٹھی ہے میں خود سفارش کرنے والی تھی۔'' سمن نے کہا۔

''نہیں بی بتو.....'' بصیرہ نے چہک کر کہا، ''آزادی مجھے راس آ گئی ہے۔ میرے ہاں آ کر دیکھو، کیا ٹھاٹھ سے رہتی ہوں، جو دل چاہتا ہے کرتی ہوں۔ گھر کے تین طرف کھائی ہے صرف ایک طرف راستہ ہے۔ سامنے سیب کا ایک درخت ہے۔ یاد پڑتا ہے گالز وردی کے ''سیب کا درخت'' میں ہو بہو یہی نقشہ ہے۔ آج کل پھولوں اور پھلوں کی آخری بہار ہے مگر لدے پڑے ہیں۔ پڑوسیوں کے گھر دور دور ہیں مگر سبزیاں اور پھول لے کر ان کے پاس پہنچ جاتی ہوں، دوستیاں بھی ہو گئی ہیں۔ اچھی گزر رہی ہے۔ دو چار سال تو یوں ہی گزر جانے دو۔''

''ٹھیک ہے میں تم سے کچھ نہیں کہتی، تم مجھ سے کچھ نہ کہو مگر ایک بات بتاؤ امی کے ہاں سے کوئی فون نہیں اُٹھاتا، تمھیں کچھ خبر ہے؟''

''ہاں، ناز نے مجھے بتایا تھا کہ تمھاری امی دوبارہ اسپتال میں داخل ہو گئی ہیں لیکن پریشانی کی بات نہیں ہے۔''

''پریشانی کی بات تو ضرور ہو گی۔ میں ناز کو فون کرتی ہوں خدا حافظ۔''

ناز نے بھی یہی کہا کہ پریشانی کی بات نہیں ہے اگر ایسی بات ہوتی تو وہ ضرور بتاتی۔

''اچھا ایک وعدہ کرو.....'' سمن نے سنجیدگی سے کہا، ''جب بھی تمھیں پتا چلے کہ میری امی کی طبیعت واقعی خراب ہے تو مجھے ضرور بتا دو گی..... ورنہ سمجھ لو کہ میں نہ کبھی خود کو معاف کروں گی نہ تمھیں۔''

''اچھا، وعدہ!'' ناز نے کہا، ''زمان کی شادی کی تصویریں اس کی بیوی نے بھجوائی ہیں اپنی بہن

کے ہاتھ، تمہیں بھیج دوں؟"

"نہیں جناب!" سمن نے کہا، "مجھے ان سے کوئی دلچسپی نہیں ہے، بصیرہ کو بھجواؤ۔ اس نے یہ شادی کروائی ہے اور سمجھتی ہے کہ بڑا تیر مارا ہے۔"

"تو تم کیوں اُلجھ رہی ہو؟" ناز نے کہا۔

"میری امی دوبارہ اسپتال میں داخل ہو گئی ہیں، کیا مجھے الجھنے کا حق بھی نہیں۔" سمن کی آواز رُندھ گئی۔

"یقین کرو، وہ دو ایک دن میں گھر آ جائیں گی، بے فکر رہو۔ میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گی۔"

"اچھا..... شکریہ خدا حافظ!" سمن نے فون رکھ دیا اور بہت دیر تک گھٹنوں میں منہ چھپائے بیٹھی رہی۔

سمن نے تصویروں میں برف دیکھی تھی یا مری میں برف پڑی دیکھی تھی لیکن پڑتی کبھی نہ دیکھی تھی۔ وہ یونی ورسٹی میں کلاس لے رہی تھی جب یکایک برف پڑنی شروع ہوئی۔ چھوٹی چھوٹی پنکھڑیاں آسمان سے گرتیں اور چیزوں پر اور زمین پر بیٹھتی جاتیں۔ ذرا دیر بعد وہ روئی کے گالے سے بن گئے۔ یوں لگا جیسے کوئی آسمان پر بیٹھا سفید مرغیوں کے پر نوچ نوچ کر زمین پر پھینک رہا ہو۔

کام سے فارغ ہو کر باہر نکلی تو ہر جگہ برف ہی برف تھی۔ عمارتوں کے درمیان برف کے میدانوں میں لوگ گھٹنوں گھٹنوں برف میں کھچ کھچ کرتے گھروں کی طرف جا رہے تھے۔ سدا بہار درختوں پر برف سفید سونڈوں کی طرح لٹک رہی تھی اور بید مجنوں کی باریک شاخوں پر شگوفوں کی طرح کھلی ہوئی تھی۔ کاریں پوری طرح برف سے چھپی ہوئی تھیں۔ سڑکیں مسلسل برف باری کی وجہ سے صاف نہیں ہو سکی تھیں اور کاریں ان پر پھسل پھسل جاتی تھیں۔ سمن اپنے آپ کو کوٹ مفلر میں لپیٹے، دستانے دار ہاتھ سے چھتری سنبھالے گرتی پڑتی کمرے تک پہنچی۔ سامنے سڑک پر ٹریفک جام ہو چکا تھا۔ ریڈیو پر اعلان ہو رہا تھا کہ آج بچوں کے اسکولوں کی چھٹی جلد ہو گی۔ شام کو ہونے والی میٹنگ اور پارٹیاں دھڑا دھڑ کینسل ہو رہی تھیں۔ رات تک وہ مسلسل کھڑکی کا پردہ اُٹھا کر منظر دیکھتی رہی۔ روشنی کے کھمبوں کے نیچے پڑتی برف ہزاروں پتنگوں کی طرح لگ رہی تھی۔

برف باری ختم ہوئی تو جوں جوں رات بڑھتی گئی اُجالا بڑھتا گیا۔ برف کے میدانوں پر کہیں پیچھے سے آنے والی روشنی میں بے برگ درخت اور جھاڑیوں کے سائے بڑی بڑی پھلجھڑیوں کی شکل میں پڑ رہے تھے۔ جب بھی سمن پردہ ہٹا کر دیکھتی کہ شاید اب رات گہری ہو گئی ہو گی تو برف کی چکا چوند اُسے حیران کر دیتی۔ بغیر چاند کے بھی رات میں دن کا سا اُجالا تھا۔ دوسرے دن صبح جب وہ تیار

ہو کر یونی ورسٹی جانے کے لیے نکلی تو برف کے میدانوں سے آتی یخ ہوا نے استقبال کیا۔ چند قدم کا راستہ دوبھر لگا۔ تب سمن کو اندازہ ہوا کہ برف کی خوب صورتی اپنی جگہ ہے اور کئی ماہ تک رات دن اسے بھگتنا جدا معاملہ ہے۔

تین دن تک برفیلی ہوائیں حاوی رہیں۔ اس کے بعد ٹمپریچر زیادہ ہوا تو برف کے بجائے آسمان سے مینھ برسنے لگا۔ برف پگھلنی شروع ہوئی۔ رات کی خوب صورتی ختم ہوئی۔ بارش میں بھیگتا اندھیرا گیلے مخمل کی طرح گجگجا سا ہوگیا اور دل بھاری جیسے پگھلتی برف اور برستا پانی دل کے اسپنج میں کہیں جذب ہوتا جارہا ہو۔ ایسے میں فون کی گھنٹی بجی تو سمن کو اچھی لگی.... خبر بھی اچھی تھی۔ مائیکی اور پدما نے اچانک سردیوں کی چھٹی میں شادی کا ارادہ کرلیا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ پدما کے والدین صرف ان ہی دنوں میں امریکا آسکتے تھے۔ شادی کی شاپنگ میں پدما سمن کو ساتھ لے جانا چاہتی تو وہ ہنگامہ مچاتی ''اتنی سردی میں، اس برف باری میں؟''

''پہلی سردی ہے۔'' پدما ہنسی۔ ''دھیرے دھیرے عادت ہوجائے گی۔ سردی میں کام رُکتے تھوڑے ہی ہیں۔ ہمیں دیکھو شادی تک سردی میں کرنی پڑ رہی ہے۔''

لمبے لمبے کوٹ لٹکائے، گھٹنوں تک جوتے چڑھائے، مفلروں میں منھ چھپائے وہ شاپنگ کے لیے جاتیں۔ سب سے زیادہ ترس اسے پدما کی ماں پر آیا جو ہر بات پر ہائے رام ہائے رام کرتیں۔ سمن ان کو دیکھتی تو صاف لگتا کہ وہ اُوپر اُوپر سے اس شادی میں شریک ہیں۔ ایک دن اس نے ہمت کرکے پوچھ ہی ڈالا۔

''اب ہم کیا بولیں....'' انھوں نے پلّو سے آنسو پونچھے۔ ''باپ اور بیٹی کے سامنے ہماری چلتی نہیں۔ بس من ہی من میں روتے ہیں۔ بہت شور مچایا تو ہماری اتنی بات مانی ہے کہ یہاں کی شادی کے بعد دونوں ہندوستان جائیں گے اور وہاں پھیرے بھی پڑیں گے....'' پھر انھوں نے جھک کر سمن کے کان میں کہا، ''اب پدما سے کچھ نہ کہنا، اُسے دکھ ہوگا۔ ہم تو سہ لیں گے۔ اسے کیوں تکلیف دیں۔''

سمن نے اتنی باضابطہ شادی پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ رتی رتی انتظام پہلے سے ہورہا تھا۔ ہر قدم اٹھانے کا ایک وقت مقرر تھا۔ ایک دن ریہرسل ڈنر ہوا جس میں منسٹر نے، والدین نے اور دولھا دلہن کے دوستوں نے باقاعدہ اسی طرح رول کیا جس طرح دوسرے دن شادی میں کرنا تھا۔ پدما نے سمن سے دلہن کی میڈ بننے کے بارے میں پوچھا تھا مگر سمن نے انکار کردیا تھا۔ ریہرسل کے دن بھی ہال سجایا گیا تھا اور یہ سارا انتظام مائیکی کے والدین کی طرف سے تھا۔ ہال کے دونوں طرف سفید آئینہ جیسے اسٹینڈ پر بڑے سے بلوری گلدان میں ایک بڑی شمع روشن تھی جس میں گھنگھریالے بید مجنوں کی

ننگی شاخیں چھت کی طرف اُٹھی ہوئی تھیں۔ نیچے سفید کیسا بلانکا للی، بٹر اسکاچ گلاب، گر بیراڈیزی اور فری سیا کے پھول، دوشیزہ کے بالوں کی بے حد سبز شاخوں کے درمیان سے جھانک رہے تھے۔ بڑے گلدان سے ملتے جلتے چھوٹے چھوٹے پھول دان ڈنر کی ہر میز پر سجے ہوئے تھے۔ خوب صورت مگر سنجیدہ ماحول میں ریہرسل ہوئی۔ فرق صرف یہ تھا کہ پدما نے شادی کا لباس نہیں بلکہ سفید اور سنہری کام کی بنارسی ساری باندھی تھی۔ شادی کا خوب صورت لباس تھیلے میں بند اس کے کمرے میں لٹکا ہوا تھا۔ سمن نے شلوار قمیص پہنی تھی۔ شادی کے لیے اس کی واحد بنارسی پیچ رنگی ساری استری شدہ اس کے کمرے کی الماری میں لٹکی ہوئی تھی۔ پدما کی ماں آج جوگیا رنگ کی ساری پہنے ہوئے تھیں۔ سمن کے برابر میں بیٹھی وہ ٹھنڈی آہیں بھر رہی تھیں اور دوسروں سے نظریں بچا کر بار بار آنسو پونچھ رہی تھیں۔ بیٹی کو منگیتر کے حوالے کر کے آنے کے بعد جب پدما کے والد برابر میں بیٹھ گئے تو وہ یوں سن ہو کر بیٹھ گئیں جیسے سانس لینا بھی بھول گئی ہوں۔ ٹوسٹ کے وقت بیروں کے بے حد اصرار پر بھی ان دونوں نے کچھ نہ لیا۔ سمن نے بھی انکار کر دیا۔ بعد میں مائیکی اور پدما نے انھیں بتایا کہ ٹوسٹ کے وقت جام خالی نہیں ہونے چاہییں۔ وہ نہ بھی پییں تب بھی جام میں شراب ڈالنے دیں۔

شادی کے دن صبح صبح فون پر پدما نے سمن کو وقت پر چرچ پہنچ جانے کی یاددہانی کروائی۔ اس کی ماں کو تیار کروا کے ساتھ لے جانا بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ ان کو لینے کے لیے گاڑی کا انتظام کر دیا گیا تھا۔ شکر ہے کہ اس دن برف باری نہیں ہو رہی تھی۔ سمن نے کھڑکی کا پردہ ہٹا کر دیکھا۔ سڑک کے کنارے پڑا ہوا پانی جما ہوا تھا۔ گاڑی اس پر سے گزری تو وہ بالکل اسی طرح چیخ کر ٹوٹا جیسے شیشہ ٹوٹتا ہے اور پھر اسی طرح کرچیوں کی شکل میں جما پڑا رہا۔ بالکنی میں گملے میں جما ہوا پانی اس کے لیے درجۂ حرارت دیکھنے کے آلے کا کام دیتا تھا۔ پگھل جاتا تو موسم غنیمت ہوتا مگر آج وہ بھی جما ہوا تھا۔

سمن نے تیاری شروع کی۔ ساری بہت دنوں سے نہیں باندھی تھی، مشق نہیں رہی تھی۔ دو چار سیفٹی پنیں لے کر وہ آئینے کے سامنے جا کر کھڑی ہوئی۔ نیلے رنگ کے چھوٹے سے بلاؤز میں اپنی کمر اسے بے حد سبک اور پتلی لگی۔ ہلکے ہلکے میک اپ میں اسے اپنا چہرہ خاصا شاداب اور خوب صورت نظر آیا۔ پیچ رنگی ساری کو ایک مرتبہ لپیٹ کر پلیٹیں ڈال رہی تھی کہ دوبارہ فون کی گھنٹی بجی۔ ساری کی پلیٹیں سنبھال وہ فون تک پہنچی، باقی ساری مور کی دُم کی طرح گھسٹی رنگوں کی بہار دکھاتی اس کے پیچھے ہو لی۔

''ہیلو!'' اس نے کہا۔

''میں سمان سے بات کر سکتی ہوں؟'' کسی شیریں دہن خاتون نے امریکن انگریزی میں کہا۔

''میں ہی سمن ہوں۔'' سمن نے جواب دیا۔

''میں ڈیو کی بہن بول رہی ہوں میگی......'' رسان سے میٹھی آواز میں انھوں نے کہا۔ یکایک سمن کا دل کپکپا اُٹھا۔ آئینے میں اسے اپنی آنکھیں حیران اور پھیلی نظر آئیں۔ بولنا چاہا مگر بول نہ سکی۔

''میں تمھارے پاس آنا چاہتی تھی، ملنے کے لیے.....اگر تم چاہو تو آج کسی وقت.....'' خاتون نے بات جاری رکھی۔

''سوری......'' سمن کے خشک منہ سے بمشکل آواز نکلی، ''میں اس وقت اپنی دوست کی شادی میں جانے کے لیے تیار ہو رہی ہوں۔ شادی کے بعد ریسپشن بھی ہے۔ آج.....آج تو مشکل ہے۔''

''ریسپشن کس وقت ختم ہوگا؟ کس ہوٹل میں ہے؟ تم کہو تو میں وہیں پہنچ جاؤں۔'' میگی نے کہا۔

''مگر.....مگر کس سلسلے میں آپ مجھ سے ملنا چاہتی ہیں؟'' سمن نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ آئینے میں اسے اپنا چہرہ بدلا ہوا لگا۔ تازگی اور شادابی رخصت ہو چکی تھی۔ اتنی ہی دیر میں چہرہ دبلا اور زرد ہو چکا تھا۔

''تمھیں معلوم ہے نا کہ آج کل ڈیو کیلی فورنیا میں ہے۔ میں وہاں جا رہی تھی۔ ڈیو نے کہا میں تمھیں بھی ساتھ لیتی آؤں۔''

''مگر......مگر میں کیسے جا سکتی ہوں بہت مشکل ہے۔'' سمن کی زبان لڑکھڑانے لگی۔

''کچھ مشکل نہیں ہے سمان! بات سنو، ہماری اپنی گاڑی ہے، ڈرائیور چلائے گا۔ صرف میں اور تم ہوں گے۔ راستے میں ہوٹلوں میں ٹھہریں گے۔ سارا انتظام پہلے سے ہوگا اور تمھیں کچھ نہیں کرنا پڑے گا۔'' سمن کچھ کہنے ہی والی تھی کہ میگی نے کہا، ''بات سنو! میں سمجھتی ہوں تم کیوں گھبرا رہی ہوں۔ تم صرف میری دوست کی حیثیت سے جاؤ گی اور میرے ساتھ ہی ٹھہرو گی۔''

''پھر بھی......مشکل ہے۔'' سمن اب تک سنبھل چکی تھی۔ ''یونی ورسٹی کھلنے میں زیادہ دن نہیں ہیں اور میں ذہنی طور پر اتنے لمبے سفر کے لیے تیار نہیں ہوں بلکہ کسی بھی سفر کے لیے تیار نہیں ہوں۔ حیرت ہے کہ ڈیو نے مجھ سے اس بارے میں کچھ بھی نہیں کہا۔''

''سمان، بات یہ ہے.....'' میگی نے آواز میں اور بھی مٹھاس گھولی، ''گھبرانا مت، میں نہیں چاہتی تھی کہ تمھیں فون پر بتاؤں اس لیے آنا چاہتی تھی مگر اب بتانا ہی پڑے گا.....ہے یوں کہ ڈیو کا حادثہ ہو گیا ہے۔''

سمن کی نگاہ بے خیالی میں اب تک آئینے پر جمی تھی۔ یکایک اس نے اپنے رنگ کو چنبیلی کے پھول کی طرح سفید پڑتے دیکھا جیسے کسی نے سرنج سے سارا لہو کھینچ لیا ہو۔

''حادثہ!.....'' چیخ اس کے منہ سے نکلی۔ ساری کی پلیٹیں کھل کر اس کے ہاتھ سے گر گئیں اور اس

نے دل تھام لیا۔

''میں نے کہا تھا نا گھبرانا مت۔'' میگی نے دھیرج سے کہا، ''ڈیو ٹھیک ہے مگر اسپتال میں ہے۔ مما تو پہلے سے وہاں تھیں۔ پہلے بھی ہمارا، پپا کا اور میرا ارادہ جانے کا تھا مگر کار سے..... مما کا خیال تھا کہ اپنی کار ہی وہاں رہے گی مگر اب پاپا آج ہوائی جہاز سے جا رہے ہیں۔ ڈیو نے مجھ سے کہا کہ میں تمھیں ساتھ لیتی آؤں تو میں سمجھ گئی کہ اصل بات کیا ہے، محبت میں لیا ہوا کسی کا نام چھپتا نہیں ہے۔ میں خود تم سے ملنا چاہتی ہوں اور شاید ایسی حالت میں تم بھی ڈیو سے ضرور ملنا چاہو گی۔''

سمن انجانے میں بستر پر ٹک گئی۔ غیر محسوس طور پر اس کا ہاتھ لرز رہا تھا۔

''وہ واقعی ٹھیک ہے؟'' کانپتی آواز میں اس نے پوچھا۔

''یقین کرو وہ ٹھیک ہے۔'' میگی نے کہا، ''تم اس کا فون نمبر لکھ لو اور خود اُس سے بات کر لینا۔ مجھے صرف اتنا بتا دو کہ میرے ساتھ چلو گی؟''

''ہاں چلوں گی..... مگر.....'' بولتے بولتے وہ خاموش ہو گئی۔

''میں سمجھتی ہوں، تمھارے بارے میں کسی سے کچھ نہیں کہا جائے گا سوائے اس کے کہ تم میری دوست ہو اور دوسرا تھ کے لیے آئی ہو یا سیر کے لیے جو تم چاہو۔ ایک مرتبہ مما سے مل لو، وہ تمھیں دیکھ لیں۔ پھر شاید بات آسان ہو جائے۔'' میگی ہلکے سے ہنسی، ''تمھیں معلوم ہے امریکا میں ماں باپ کا اتنا دخل ہوتا نہیں ہے مگر مما دوسری قسم کی خاتون ہیں، اگر ان کو ناراض کیے بنا کام بن جائے تو حرج ہی کیا ہے..... اور سنو سمن! میں بنا دیکھے بھی تمھارے ساتھ ہوں۔''

میں خود بھی اپنے ساتھ کب ہوں۔ سمن نے اپنے دل میں کہا۔

''تم مجھے اپنا پتا لکھوا دو..... اور ڈیو کا فون نمبر لکھ لو۔'' میگی نے کہا۔

سمن نے اپنا پتا لکھوایا۔ اس کی آواز تھرا رہی تھی۔ کانپتے ہاتھوں سے ڈیو کا فون نمبر لکھا اور معذرت کر کے فون رکھ دیا۔ اسے واقعی دیر ہو رہی تھی۔ بغیر سوچے سمجھے اُس نے ساری لپیٹی۔ بال درست کیے۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے اتنی دیر میں اُس کا سارا میک اپ ڈھل چکا ہو۔ آئینے میں اسے اپنی زرد مردہ صورت دکھائی دی۔ آنکھوں کے ڈھیلے آنکھوں میں ڈھیلے ڈھیلے ڈول رہے تھے جیسے جگہ سے بے جگہ ہو گئے ہوں۔ نیچے سے ہارن کی آواز آئی۔ اس نے اپنا لمبا کوٹ پہنا، مفلر لپیٹا، دستانے پہنے اور اُونچی ایڑی کے جوتوں پر لڑکھڑاتی سیڑھیاں اُترنے لگی۔ پدما کی ماں پہلے سے گاڑی میں بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ اس کی مدد کے بغیر ہی تیار ہو کر آ گئی تھیں۔ لہو رنگ ساری اور سرخ بندیا کے باوجود بھی ان کا چہرہ زرد پڑا ہوا تھا۔ پدما کی ماں اور اس کو دروازے پر پھولوں کے 'بوکے' ساریوں پر

لگانے کو دیے گئے۔ پدما کے باپ نے اپنی بیوی کا ہاتھ تھاما اور مائیکی کے دوست نے اپنا بازو سمن کے حوالے کیا۔ موسیقی کی لہر پر نپے تلے قدم رکھتے سجے ہوئے چرچ میں سب سے آگے کی قطار میں بیٹھ گئے۔ سمن بار بار اپنے ذہن کو کھینچ کر اُس جگہ تک لا رہی تھی جہاں وہ بیٹھی تھی۔ پیانو کی ہلکی موسیقی کے ساتھ پدما اپنے باپ کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی آ رہی تھی۔ ہاتھی دانت کے رنگ کے ساٹن، سفید لیس اور سفید موتیوں کے کام کے بے حد خوب صورت لباس میں پدما آسمان سے ابھی ابھی اُترنے والی پری کی طرح لگ رہی تھی۔ بالوں میں سفید نازک پھول جالی کے ربن میں پروئے ہوئے تھے۔ دلہن کی میڈز ہلکے گلابی رنگ میں تھیں۔ پورے چرچ کی سجاوٹ میں سفید اور گلابی رنگ نمایاں تھا۔ پدما کے والد نے اس مرتبہ سچ مچ دلہن کو دولھا کے حوالے کیا۔ وعدے وعید ہوئے۔ انگوٹھی پہنائی گئی اور ولایتی ملاجی نے ان کے میاں بیوی ہونے کا اعلان کر دیا۔ شادی کا سنجیدہ ماحول تمت تک پہنچتے پہنچتے غم ناک ہو گیا۔ پدما کے ماں باپ کے ساتھ مہمانوں کی آنکھیں بھی بھیگی ہوئی تھیں۔ سمن تو جیسے بھری بیٹھی تھی۔ آخر میں جب پدما کو گلے لگا کر اس نے بدھائی دی تو خود بھی پھوٹے چھالے کی طرح بہہ نکلی۔ پدما کی ماں بیٹی کو چھوڑ کر سمن کو گلے لگا کر رونے لگیں۔

ہال میں جاتے ہوئے دولھا دلہن کی کار دیکھ کر ہر کار ہارن بجاتی۔ جواباً شادی کی پارٹی کے لوگ بھی ہارن دیتے۔ آتے جاتے لوگ جھک جھک کر دولھا دلہن کو دیکھنے کی کوشش کرتے۔ ہال، غباروں، رنگین فیتوں اور پھولوں سے سجا ہوا تھا۔ کھانا پُرتکلف تھا۔ ریسپشن کے بعد جب دولھا دلہن کو کار میں جوتوں، ڈبوں اور اُڑتے ربنوں کے ساتھ رخصت کر دیا گیا تو پدما کے والدین کو الوداع کہہ کر سمن اپنے کمرے میں آ گئی۔ سب سے پہلے ڈیو کو اسپتال فون کیا جو ڈیو کی مما نے اُٹھایا اور بتایا کہ وہ سو رہا ہے۔ اس کی طبیعت پوچھنے پر انھوں نے کہا، ''پہلے سے بہتر ہے۔'' پھر سرگوشی میں کہا، ''مجھے ڈر ہے کہ میری باتوں کی آواز سے کہیں اُٹھ نہ جائے۔ بائی۔'' اور فون رکھ دیا۔ دل پر بوجھ لیے سمن ساتھ لے جانے کے لیے سامان اکٹھا کرنے لگی۔

دُھند اور گہرے بادل گاڑی کو لپیٹنے کی کوشش کر رہے تھے مگر راج ہنس کی سی سفید اور شان دار لیموزین اونچی نیچی سڑکوں پر بہتی چلی جا رہی تھی۔ سڑکیں صاف تھیں مگر کناروں پر برف کے تودے جمے پڑے تھے۔ پہاڑوں پر کالی سیاہ مٹی، سیاہ چٹانیں، راکیز کی سرخ مٹی برف میں چھپی ہوئی تھی۔ دریا بہتے بہتے تصویر کی طرح جم گئے تھے۔ سبز پتوں کی اپنی خوب صورتی ہوتی ہے لیکن خشک درخت، سوکھی ٹہنیاں او وداہٹ کا ہلکا سا غبار لیے ہرگز بدصورت نہیں تھیں۔ سمن نے سوچا برف کے پہاڑوں کا میدانوں کا حسن جدا..... جہاں کہیں آبادی کے نشانات آتے وہاں گھر ہوتے، گاڑیاں ہوتیں، کیبل

انٹینا مگر انسان ناپید اور آبادی نابود۔ وہ کہانیاں یاد آتیں جہاں ہر چیز موجود مگر ذی روح کوئی نہیں۔ جب باہر کے حسین مناظر سے بھی آنکھیں تھک جاتیں تو میگی اور ثمن باتیں کرتیں، تاش کھیلتیں یا کتابیں پڑھتیں۔ ریفریجریٹر میں پھل، کولڈ ڈرنک اور اسنیک بھری ہوئی تھیں۔ دن میں زیادہ دیر ٹھہر کر کھانے پینے کی قائل نہیں تھیں۔ دونوں کو پہنچنے کی جلدی تھی مگر رات کا سفر کسی کو بھی منظور نہ تھا۔ چناں چہ باوردی ڈرائیور گاڑی عمدہ سے ہوٹل میں کھڑی کر دیتا جہاں ریزرویشن پہلے سے ہوتا۔ سامان اُتار کر ہوٹل کے قلیوں کے سپرد کر دیتا اور خود گاڑی لے کر غائب ہو جاتا۔ دوسرے دن صبح وہ میگی کے بتائے ہوئے وقت پر آن موجود ہوتا۔

میگی اور ثمن ہوٹل میں کھانا کھاتیں۔ میگی رات کو کچھ دیر کے لیے بار میں ضرور جاتی۔ کبھی زمیں دوز سوئمنگ پول میں نہانے چلی جاتی۔ ثمن اپنے کمرے میں شفاف نرم تکیے ایک دوسرے پر جما کر ٹیلی وژن دیکھتی یا باہر کے نظارے میں گم رہتی اور الف لیلیٰ کے ابوالحسن کی طرح بار بار سوچتی کہ وہ جاگ رہی ہے یا سو رہی ہے۔

صبح نہا دھو، تیار ہو، ناشتا کر وہ پھر اپنے سفر پر روانہ ہو جاتیں۔ راستے میں میگی کار سے مما سے یا ڈیو سے فون پر بات کرتی اور کبھی کبھی فون ثمن کو دے دیتی کہ وہ ڈیو سے بات کرے۔ ثمن ہمیشہ مختصر سی بات کر کے رکھ دیتی۔ ڈیو کی مما اس کے آنے سے خوش نہیں ہیں اس کا اندازہ میگی کی باتوں سے ہوتا تھا۔ وہ سرگوشیوں میں گول مول بات کرتی پھر بھی کچھ نہ کچھ ثمن سن ہی لیتی ہیں، مثلاً:

''مما! وہ میری ذمہ داری ہے آپ کو اس کی کوئی فکر نہیں کرنی پڑے گی۔'' تو ثمن سمجھ لیتی کہ مما نے کیا کہا ہوگا۔

''تم جلد پہنچو..... اور اس ایشیائی لڑکی کو دفع کرو۔ ہم کہاں اس کو entertain کرتے پھریں گے۔ خود اپنی مصیبت میں گرفتار ہیں۔'' یا جب میگی کہتی۔

''ہاں میں سیدھی اسپتال آؤں گی اور میرے ساتھ سامان بھی..... جہاں میں رہوں گی وہاں وہ رہے گی۔'' تو وہ جان لیتی کہ مما نے کیا کہا ہوگا۔

''تم سیدھی اسپتال آؤ تمھارے ٹھہرنے کا بندوبست ہوگیا ہے.... مگر اُس لڑکی کے لیے میں نے کچھ نہیں کیا۔''

اور جب وہ کہتی، ''کوئی بات نہیں مما! وہ میری بہت اچھی دوست ہے، سب باتیں سمجھتی ہے۔ دوست صرف خوشیوں کے ہی شریک نہیں ہوتے مصیبتوں اور مشکلوں کے بھی شریک ہوتے ہیں.....''

تو ثمن کو یقین ہوتا انھوں نے کہا ہوگا۔

''غیر لوگوں کو کیوں ذاتی معاملات میں شریک کرتی ہو۔''

ایسی گفتگو کے بعد میگی مما کی طرف سے صفائی میں کہتی، ''مما تھوڑی سی متعصب ہیں لیکن آدمی نسلوں سے تعصب برتتا ہے، انسانوں سے نہیں، انفرادی سطح پر انسان بہت اچھے لگ سکتے ہیں، بہت اچھے دوست بھی ہو سکتے ہیں اور محبوب بھی۔''

''مگر میں نہیں چاہتی کہ اس قسم کی کوئی بھی بات ان کے سامنے ہو۔'' سمن کہتی۔

''تو ہم کب چاہتے ہیں!'' میگی کہتی اور ہنس پڑتی۔ ''تم تو صرف میری دوست ہو، مجھ سے بہت چھوٹی ہو تو کیا ہوا؟ دوستی میں اتنا فرق چل جاتا ہے نا!''

سمن کو میگی بذاتِ خود بڑی عجیب و غریب شخصیت لگی۔ سوچ میں ڈوبی ہوتی تو لگتی جیسے کوئی بڑی بی ہے۔ اونچا سا اسکرٹ پہن کر منک کوٹ اور ٹوپی اوڑھ کر اٹھلاتی ہوئی چلتی تو لگتا بیس بائیس برس کی لڑکی ہے، اس کی اپنی کیا کہانی تھی!..... کوئی بوائے فرینڈ تھا؟ شادی کبھی ہوئی تھی یا نہیں؟ سمن کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ صرف اتنی بات سمن کو معلوم تھی کہ آج کل وہ اپنے والدین کے ساتھ رہتی تھی اور یہ کہ چند سال پاکستان میں بھی رہی تھی۔ ہر پھر کر وہ پاکستان کی بات نکال لیتی۔

''پاکستان مجھے اور ڈیو کو بہت پسند آیا تھا۔ بات یہ ہے کہ بچپن میں انسان جہاں رہتا ہے وہ جگہ ہمیشہ پیاری لگتی ہے۔ جوں جوں وقت گزرتا جاتا ہے وہ یادیں اور عزیز ہوتی جاتی ہیں۔''

''تو آپ دوبارہ پاکستان کیوں نہیں گئیں؟'' سمن نے پوچھا۔

''اس لیے.....'' میگی نے مسکراتے ہوئے کہا، ''کہ کہیں اب دیکھوں تو مجھے مایوسی نہ ہو، بچپن میں جو جگہیں اتنی اچھی لگی تھیں کہیں ایسا نہ ہو کہ اب وہ اتنی پیاری نہ لگیں اور میں اپنی یادوں سے بھی ہاتھ دھوؤں۔''

''مگر ڈیو تو گیا ہے۔ وہ کیا کہتا ہے؟'' سمن نے پوچھا۔

''وہ اور طرح کا لڑکا ہے۔'' میگی نے کہا، ''وہ چیزوں سے اور طرح مسحور ہوتا ہے۔ مشرق اس کے اندر بسا ہوا ہے، جبھی تو تم نے اسے ڈس لیا۔'' وہ اس کی طرف جھک کر پیار سے ہنسی۔

''میں نے تو اس سے بار بار کہا ہے کہ ہمیں نہیں ملنا چاہیے۔ کم از کم ہمیں دیکھنا تو چاہیے کہ یہ..... یہ کشش وقتی تو نہیں مگر وہ سنتا ہی نہیں ہے۔'' سمن نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

''نہیں، وہ نہیں سنے گا، بہت ضدی ہے اسی لیے تو میں نے سوچا کہ اسے جو کچھ چاہیے وہ مل جائے تو اس کا دل شانت ہو جائے گا.... اور اس کی روح بھی! وہ بہت بے چین روح ہے۔''

''بے حد.....'' سمن نے کہا۔

"تم نے محسوس کیا؟" میگی نے مزید دلچسپی سے پوچھا۔

"پہلے دن سے۔" سمن نے کہا۔

"اس نے کوئی وجہ تمھیں بتائی؟"

سمن نے لحہ بھر سوچا۔ کیا میگی کو بتا دے کہ وہ فاسٹر بچہ بن کر رہنا نہیں چاہتا۔ اسے اپنے اصل کی تلاش ہے لیکن یہ بات کہنی مناسب نہ لگی۔ ڈیو کے حادثے سے وہ سب کتنے پریشان تھے۔ کیا سگی بہن ہوتی تو وہ ڈیو کے لیے اس سے زیادہ کرتی! "تم اُس کے دل اور روح کو شانت کر سکتی ہو سمان!" میگی نے بے اختیار اُس کے ہاتھ تھام لیے اور اس کی آنکھوں میں یوں دیکھا جیسے اس سے التجا کر رہی ہو۔ سمن کو عجیب سا لگا۔ یہ امیر زادی اس سے کیا چاہتی ہے۔ وہ سوچتی رہ گئی۔

اگلی دفعہ فون پر بات ہوئی تو میگی نے کہا، "مما بتا رہی ہیں کہ ڈیو کے حادثے کے بعد سے پیٹر بے حد اپ سیٹ ہے۔ ہر وقت اپنے ہوٹل میں پڑا رہتا ہے۔ اس نے ڈیو کے حادثے کو اپنے اُوپر طاری کر لیا ہے۔ اصل میں لحہ بھر پہلے وہ بھی اسی کار میں بیٹھا تھا۔ ذرا دیر کو اُترا تو کار میں دھماکا ہوا۔ شاید اس پر یہ دہشت طاری ہے کہ اگر وہ اس کار میں ہوتا تو مر بھی سکتا تھا کیوں کہ کار کے اتنے زبردست دھماکے کے بعد ڈیو کا بچ جانا بھی ایک معجزہ ہی ہے۔

لاس اینجلز پہنچ کر وہ سیدھی اسپتال پہنچیں۔ موسم راہ ہی میں دل چکا تھا۔ درجۂ حرارت اسّی تھا۔ ہر طرف پہاڑیوں پر سبزہ تھا۔ سڑک کی ڈھلوانیں زرد، اودے، سفید اور گلابی پھولوں سے پٹی پڑی تھیں۔ اسپتال بھی بہت خوب صورت تھا۔ میگی اور سمن تیز تیز چلتی اسپتال میں آئیں۔ ایلی ویٹر سے چڑھ کر ڈیو کے کمرے میں پہنچیں۔ اندر داخل ہو کر دونوں ٹھٹک گئیں..... ڈیو تکیے سے سر ٹکائے اُن کے لیے ہمہ تن انتظار تھا مگر اس کی دونوں ٹانگیں کاسٹ میں تھیں۔ ماتھے پر بازوؤں پر اور ہاتھ کی پشت پر جگہ جگہ پٹیاں اور ٹیپ لگے ہوئے تھے۔ میگی نے دوڑ کر اسے گلے سے لگایا۔ سمن دھیرے دھیرے چلتی گئی اور ڈیو سے ہاتھ ملانے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ ڈیو نے اس کا ہاتھ کھینچ کر اپنے نزدیک کیا اور کان میں کہا، "دیکھا بلا لیا نا میں نے بہانے سے......"

"بہانے سے.... فار گاڈز سیک۔" میگی نے ڈیو کا ہاتھ پکڑ کر دوبارہ گلے سے لگا لیا۔ سمن نے دیکھا کہ میگی کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسو گر رہے تھے۔

مما آئیں، انھوں نے میگی کے سر پر پیار سے تھپکی دی اور سمن کو ایسی نظروں سے دیکھا جو اسے ذرا بھی اچھی نہ لگیں۔

لیگونا بیچ میں ہسپانوی وضع کے مکان کے سامنے سبز طوطا ایسی گھاس کے کنارے پر بنی ہوئی

کیاریوں میں ڈیفوڈلز، نرگس، اینی مون، بگونیا اور ہیلٹر دمیریا کھلے ہوئے تھے۔ فضا ایک جگہ ایک ہی وقت میں مختلف مقامات اور مختلف موسموں کے مزے چکھا رہی تھی۔ سڑک کے ایک طرف اونچے پہاڑ اور پہاڑیاں اور ان پر ٹکے ہوئے مکانات، دوسری طرف سمندر کے ساتھ چٹانیں اور ریت کے ساحل۔ اس ریگستانی علاقے میں مصنوعی طور پر پانی پہنچانے کے بعد دنیا بھر کے درخت اور پھول شانہ بشانہ موجود تھے۔ ایک ہی جگہ چیڑ، ناریل اور کھجور کے درخت، نرگس، گلاب اور ڈیلیا، چنبیلی اور رات کی رانی۔

ڈیو کو اس مکان کا فوری قبضہ مل گیا تھا۔ میگی اور سمن فی الحال یہاں ٹھہرے تھے۔ ڈیو کے پاپا، مما اور پیٹر ہوٹل میں تھے۔ سمن اور میگی کو بھی یہ گھر پسند آیا۔ آس پاس کے مکانوں سے اس لیے مختلف تھا کہ کمرے کی دیواریں اور چھتیں گول تھیں۔ سرخ ٹائلوں کے نیچے گول دیواروں میں پتلی مستطیل کھڑکیاں تھیں جن میں سیاہ سلاخیں جڑی ہوئی تھیں۔ ان کے نیچے مستطیل دروازے اور وینشن دریچے چھت تک پہنچے ہوئے تھے۔ ان دروازوں اور دریچوں کے شیشوں نے سارے گھر کو شیش محل بنا رکھا تھا۔ ڈرائنگ روم اور کھانے کے کمرے کا قیمتی پریڈ فرنیچر، چھوٹے کمرے میں رکھا پیانو، ہال میں رکھے مجسمے، اسکرین اور پینٹنگز دور سے دکھائی دیتے تھے۔ سمن اور میگی ہال سے نکل کر احاطے کی نیچی دیوار تک آئیں جس کے ساتھ ہی سنتھیا کی باڑ خوب صورتی سے کٹی ہوئی تھی۔ کیاریوں میں پھول کھلے ہوئے تھے۔ سمن نے ایک بار پلٹ کر گھر کی طرف دیکھا۔ درختوں کی ٹہنیاں پیار سے چھت اور اطراف پر جھکی ہوئی تھیں۔ گول دیواروں پر مور پنکھیا کے اوپر سے گزر کر نیلی اور نارنجی گھنٹیوں کے پھول چھائے ہوئے تھے۔ دونوں پکی روش پر چلتی سمندر تک آئیں۔ سمندر کے کنارے بنی ریلنگ کئی اطراف میں گھوم کر وہاں بنی ہوئی کیاریوں کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔

''بیٹھو۔'' میگی نے کہا اور خود ایک سفید بینچ پر ٹک گئی۔ سمن بھی پاس ہی بیٹھ گئی۔ وہ سامنے دیکھی رہی جہاں حدِ نظر تک سمندر پر بادبانی اور دخانی کشتیاں تیر رہی تھیں۔

''تمھاری اور مما کی پہلی ملاقات کیسی رہی؟'' میگی نے پوچھا۔

سمن نے جواب دینے سے پہلے نیچے جھانک کر دیکھا۔ سیاہ چٹانوں کے بیچ پڑتے بھنور، سر پٹکتے، غصّے سے پھنکارتے پانی کے اُتار چڑھاؤ، ان دیوزاد چٹانوں کے بازوؤں سے نکلنے کی جدوجہد میں سر مارتی لہریں۔

''سمندر بہت نزدیک ہے اور بہت گہرا۔'' ڈیو کے خط میں اس کی مما کے الفاظ اسے یاد آئے۔

''ہونہہ..... پہلی ملاقات؟....'' سمن سوچتی رہی۔ ''کوئی خاص نہیں۔ آپ تعارف کرا کے باہر چلی گئیں تو میں ڈیو سے باتیں کرتی رہی جس میں وہ شریک رہیں، بس۔ ڈیو یہ یقین دلاتا رہا کہ کوئی

بھی زخم گہرا یا خطرناک نہیں ہے۔''

''ہاں، زخم واقعی خطرناک نہیں ہیں میں نے ڈاکٹر سے بات کرلی ہے۔ میں اسی لیے باہر نکلی تھی کہ شاید مما بھی میرے ساتھ آجائیں اور تم دونوں بے تکلفی سے باتیں کرسکو۔'' میگی بولی۔

''میں تو.....'' سمن نے جلدی سے کہا، ''ڈیو کو دیکھنے ہی آئی تھی۔ شکر ہے خدا کا کہ وہ ٹھیک ہے۔''

''دیکھو سان، اب مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ۔'' میگی نے اپنا ملائم ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ ''میں پہلے ہی کہہ چکی ہوں کہ میں تمھارے ساتھ ہوں۔''

سمن نے ایک جھرجھری لی۔

''آؤ اندر چلیں۔'' میگی نے کہا، ''شاید تمھیں سردی لگ رہی ہے۔''

سامنے آسمانوں پر تارے چمک رہے تھے۔ سمندر کے کنارے گول گھومتی چٹانوں پر بنے مکانوں کی روشنیاں ان کو سمندر میں تیرتے جہازوں کا تاثر دے رہی تھیں۔ پلٹیں تو واپسی پر وہ پستہ قد درخت نظر آیا جس کی شاخیں مہمان نواز بانہوں کی طرح نیچے ہی نیچے پھیلی ہوئی تھیں۔ شاخوں کی پانچویں منزل میں سبز پتے اور گلابی پھول چھتریوں کی طرح چھائے ہوئے تھے۔ اس کے نیچے ساری شاخیں بل کھائے بازوؤں کی طرح ایک دوسرے کے اُوپر چلی گئی تھیں جیسے قدرت نے بہت سے بنکر بیڈ (bunker bed) بنا دیے ہوں۔ لمحے بھر کو سمن کو لگا، وہاں بہت سے بچے کھیل رہے ہیں۔ بھولی سی شکل اور بھولی آنکھوں والی ہیدر۔ وہ اس کی چنچل باتیں کہ ہر لڑکا اور ہر لڑکی اس کے پاس بیٹھنا چاہتا تھا۔ سامنتھا، لمبے گھنگھریالے اور بڑی بڑی آنکھوں والی بے حد گریس فل لڑکی۔ چلتی تو لگتا جیسے نسائی وقار کی دیوی جا رہی ہو۔ شریر چلبلا اسکاٹی مگر اس کی مسکراہٹ اتنی میٹھی کہ شرارتوں کا سارا غصہ پل بھر میں دھو دیتی۔ گھنے بالوں والا یونانی دیوتاؤں کی شکل کا کیتھ۔ لیکن جب پاس پہنچی تو وہاں کوئی بھی نہ تھا۔ یہ تو سب وہ بچے تھے جو اس نے پچھلے دنوں اسٹڈی گروپ میں دیکھے تھے۔

''ڈیو گھر کب واپس آئے گا؟'' سمن نے پوچھا۔

''ابھی تو کچھ دن اور لگیں گے۔'' میگی نے کہا، ''وہ بے ہوش ہوگیا تھا۔ ڈاکٹروں کو concussion کا شبہ ہے۔ وہ ٹیسٹ وغیرہ لے رہے ہیں۔ پوری طرح اطمینان کر لینے کے بعد بھیجیں گے۔ یہی ہم سب چاہتے ہیں۔''

''ہاں یہی مناسب ہے۔'' سمن نے آہستہ سے کہا، ''میں تھوڑی دیر باہر بیٹھوں گی۔'' پھر وہ بولی۔

''ضرور، جیسی تمھاری مرضی۔ تم ڈیو کے کمرے میں سونا۔ میں مہمان کمرے میں سوؤں گی۔''

''نہیں نہیں.....'' سمن نے کہنا چاہا مگر اس کے حلق سے آواز نہیں نکلی اور میگی چھوٹے سے گیٹ

کو کھولتی اندھیرے میں گم ہو گئی۔

ڈیو کے کمرے میں ڈیو کے بستر پر لیٹے ہوئے نینداس کے نزدیک آنے سے کترا رہی تھی۔ اس نے بیڈ لیمپ جلایا اور اُٹھ کر بیٹھ گئی۔ بادامی رنگ کی دیواروں پر لگی ہوئی پینٹنگز کے نقوش مانوس سے لگے۔ بستر سے اُتر کر اس نے پاس جا کر دیکھا۔ وہ عبدالرحمٰن چغتائی کی پینٹنگز کے خوب صورت پرنٹ تھے۔ 'شیریں'، 'داستان گو' کا سفید مور جس کے پس منظر میں تاج محل واقعی سنگِ مرمر کا خواب لگ رہا تھا۔ سرگوشی کرتی سہیلیاں اور صحرائی اونٹ...... اس نے لیمپ بجھا دیا اور باہر کی کھڑکی کھول دی۔ سمندر کی لہروں کی آواز کمرے میں آنے لگی۔

وہ ننگے پاؤں نیلے رنگ کی پلش کی جھولتی کرسی پر ٹک گئی۔ میوزک ڈیک کی آواز آہستہ کر کے اس نے ٹیپ کا بٹن دبایا:

کیا مجھ عشق نے ظالم کوں آب آہستہ آہستہ
کہ آتش گل کوں کرتی ہے گلاب آہستہ آہستہ

گانے والے کی مردانہ گھمبیر آواز آہستہ آہستہ سمندر کی لہروں کی صدا کے ساتھ ابھر اور ڈوب رہی تھی:

ہوا تجھ عشق سوں اے آتشیں رُو دل مرا پانی
کہ جیوں گلتا ہے آتش سوں گلاب آہستہ آہستہ

باہر چاند کی چاندنی چھٹکی ہوئی تھی اور سمندر کی پرشور آواز نے یکایک اسے سمندر کے کنارے بنی وہ ہٹ یاد دلائی جو لکڑی کے ستونوں پر معلق تھی۔ جہاں اس نے امان کے ساتھ رات بتائی تھی اور صبح دم سلیم کو سمندر میں سفید بگلوں کے تعاقب میں آگے ہی آگے بڑھتے دیکھا تھا اور یکایک اسے خیال آیا کہ اب اسے اپنے بدن کا تقدس بڑا عزیز ہے۔ وہ اب اسے کسی بھی طرح ارزاں نہیں کر سکتی۔

ولی مجھ دل میں آتا ہے خیالِ یارِ بے پروا
کہ جیوں انکھیاں منیں آتا ہے خواب آہستہ آہستہ

نا جانے کب نینداس پر حاوی ہوگئی اور پھر اس نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے اربانا کے گھر میں ہے۔ باہر برف پڑی ہوئی ہے۔ پڑوس کے گھر میں لمبے لمبے بانس نما کھمبوں پر جو چڑیا گھر لٹکے ہوئے ہیں ان کی چھتوں پر گول، مستطیل برف کے قتلے ہوا میں معلق ہیں۔ وہ واک مین کانوں پر لگائے ولی کی غزل سن رہی ہے۔ پھر یکایک اسے کچھ خیال آتا ہے، وہ ریک سے کوٹ اُٹھا کر پہنتے ہوئے سرخ رنگ کے بر فیلے گھٹنوں تک بوٹ پہن کر واک مین کانوں پر جمائے آہستہ آہستہ قالین سی بچھی سفید برف میں پاؤں دھنساتی چلتی جاتی ہے۔ چلتی جاتی ہے یہاں تک کہ وہ ایک ہسپانوی

وضع کے گھر میں پہنچ جاتی ہے۔ سفید برف وہاں بھی موجود ہے۔ وہ اندر جاتی ہے اور ڈیو کی گود میں گر جاتی ہے اور اتنا روتی ہے اتنا روتی ہے کہ وہ پریشان ہو اُٹھتا ہے۔

وہ بار بار پوچھتا ہے، ''کیا ہوا؟ کیا ہوا؟''

وہ بار بار کہتی ہے، ''کچھ نہیں..... کچھ نہیں۔'' چلتا واک مین صوفے پر گر کر بجتا بجتا ٹیپ ختم ہونے پر خود ہی رُک جاتا ہے۔ تب دل ہلکا ہو جانے پر وہ بھی جیسے چپ ہو جاتی ہے۔ پھر ڈیو کو سمندر کے کنارے ہٹ کی ساری داستان سناتی ہے اور یہ بھی کہتی ہے کہ اب اسے اپنا بدن اتنا مقدس لگتا ہے کہ وہ نہیں سمجھتی کہ اپنا دل کسی کو دے دینے اور اپنے جذبات و احساسات کا بہت سا حصّہ نذر گزارنے کے بعد بھی وہ یہ عزیز شے کسی کے حوالے کر سکے۔ ڈیو اسے تسلی دیتا ہے اور کہتا ہے، ''ایسا نہیں ہے، کہیں نہ کہیں کوئی ایسا معبد ضرور ہوگا جہاں اسے لوبان اور عنبر کی طرح سلگتا یہ جسم دان دینے میں رسوائی محسوس نہ ہوگی۔'' اور پھر یکایک اس کی آنکھ کھل گئی۔ دیوار پر چڑھی بیلوں میں چھپی چڑیاں صبح کا راگ الاپ رہی تھیں۔ وہ دیر تک سوتی رہی تھی مگر گھر میں سناٹا تھا۔ وہ باہر نکل آئی۔ سمندر پر بادبانی کشتیاں تیر رہی تھیں۔ اُفق پر سمندر اور آسمان ہم رنگ تھے۔ آہستہ آہستہ وہ ریلنگ کے سہارے آگے بڑھنے لگی۔ پگڈنڈی آگے چل کر فٹ پاتھ سے جا ملی۔ ایک ٹیلے کی اونچی دیوار کے کگر پر لگے گزوں اُونچے درخت کے نیچے بیٹھا ایک آرٹسٹ سمندر کی تصویر بنا رہا تھا۔ ناریل کے اس سیدھے چلے گئے درخت پر ایک اور درخت دور سے جھک کر اس کے کان میں کچھ کہہ رہا تھا۔ یہ منظر خود اتنا دلکش تھا کہ ہمن نے سوچا کسی آرٹسٹ کو اس تصویر بناتے ہوئے آرٹسٹ کی تصویر بنانی چاہیے تھی۔ آگے چٹانیں نیم دائرہ بناتی پیچھے کھسک گئی تھیں اور ریت کے چاند پر اس وقت بھی چند بڑے اور بچے رنگ دار چھتریوں کے نیچے پٹی دار تولیوں پر ننگے بدن دھوپ سینک رہے تھے۔ پہاڑیوں پر ناریل کے درختوں میں چھپے ہوئے مکان جو رات کو پانی کے جہاز لگ رہے تھے اب دوبارہ خوب صورت زمینی آبادیوں میں تبدیل ہو گئے تھے۔ اسے رات کا خواب یاد آیا۔ ڈیو نے کہا تھا کوئی مندر ایسا ضرور ہوگا جہاں اسے عنبر سا سلگتا بدن دینے میں عار محسوس نہ ہوگا۔ کیا یہ مندر اس کی نظر میں یہ ہسپانوی گھر تھا؟ اُونچی کرسی پر بنا ہوا درختوں اور بیلوں میں چھپا ہوا یہ گھر جنگل میں گم کوئی مندر بھی ہو سکتا تھا مگر نہیں یہ بیسیوں صدی کی آسائش سے پُر ایک مکان تھا اور اس وقت وہ خواب کی دنیا میں نہیں تھی۔ حقیقت یہ تھی کہ اس کے اور ڈیو کے ملک اور ماحول میں بے حد فرق تھا۔ امریکن لڑکیاں پاکستان جا کر جینز اور چھوٹی سی کُرتی پر دوپٹہ لٹکا لیتی تھیں، کیا ڈیو اور اس کے گھر والے یہ نہیں چاہیں گے کہ وہ ان کے کلچر کو اپنائے؟ کیا وہ سمندر میں غسلِ آبی کر کے ریت پر اس طرح لیٹ سکتی ہے جس

طرح سامنے یہ لوگ لیٹے ہوئے ہیں؟ لوگ کہتے ہیں مسلمان لڑکی اسی لیے غیر مسلم سے شادی نہیں کر سکتی کہ اس کا مذہب اور اس کا کلچر اعلیٰ ہے۔ اعلیٰ سے ادنیٰ کی طرف جانا کسی بھی شخص کے لیے مناسب نہیں ہے! کیا ڈیو نے کبھی مذہب تبدیل کرنے کے بارے میں سوچا ہوگا؟ ایک مرتبہ کسی سلسلے میں اس نے کہا تھا، ''پھل کو درخت پر ہی پکنا چاہیے۔ کچا توڑ لو تو وہ پکنے کے بجائے سڑ بھی سکتا ہے۔''

لوٹی تو ایک نئی بات..... میگی غائب تھی۔ باورچی خانے میں ایک پرچہ رکھا تھا۔ ''سمن ڈیئر! مما نے فوراً بلایا ہے، میں جا رہی ہوں۔ میگی.....'' میگی اسے ساتھ لیے بغیر یا بتائے بنا ایسے کبھی نہیں جاتی تھی۔ خدا جانے کیا بات ہے۔ سٹپٹا کر سمن نے ڈیو کو فون کر دیا۔ مما اور میگی اس وقت وہاں نہیں تھیں۔

''یاد ہے نا سمن، میں نے تمھیں بتایا تھا کہ پیٹر ایک لمحے کو مجھے برداشت نہیں کر سکتا۔'' ڈیو بڑے اطمینان سے بول رہا تھا۔ ''اور وہ نو ٹریس پاسنگ (No Trass passing) کے بورڈ! تو جناب اب پولیس کو شبہ ہے کہ میری کار میں پیٹر نے بم رکھا تھا۔ پولیس نے پیٹر کو پکڑ لیا ہے۔ پاپا ضمانت کی کوشش میں گئے ہیں مگر میرے خیال میں ضمانت مشکل ہے کیوں کہ قتلِ عمد کا معاملہ ہے۔''

''قتلِ عمد!'' سمن نے دل تھام لیا۔

''ہاں۔ اپنے راستے سے ہٹانے کی آخری کوشش! اس میں بھی بے چارہ ناکام ہوگیا۔'' ڈیو ہنسا۔

''تم امریکنوں کی ایسی بے وقت کی ہنسی میری سمجھ سے بالاتر ہے۔'' سمن نے الجھ کر کہا۔

''کیوں گھبرا رہی ہو۔'' ڈیو نے کہا، ''اب وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ میں تو ہمیشہ سے اُس کی نظریں پہچانتا تھا مگر کوئی میری بات مانتا ہی نہیں تھا۔ خیر اب تو معلوم ہوگیا۔ میں نے بھی تو زیادتی کی۔ اس کی دولت میں سے اتنا بہت سا حصہ اپنی ذات پر خرچ کر دیا۔ مما کہتی ہیں دولت اس کی نہیں ہے، ان کی ہے۔''

''ٹھیک کہتی ہیں۔'' سمن نے کہا۔

''مگر وہ تو یہی سمجھتا ہے کہ آخر میں سب کچھ اسی کا ہوگا، اگر یہ باہر کا آدمی alien کسی طرح مرے، اس کا پاپ کٹے۔''

''اچھا اب زیادہ خود رحمی میں مت پڑو۔'' سمن نے کہا، ''یہ بتاؤ پیٹر کا کیا ہوگا۔ سب لوگ پریشان تو ہوں گے۔ آخر ان کا تو بیٹا ہے۔''

''اس پر مقدمہ چلے گا..... اس میں جو بات بھی نکلے۔'' پھر ڈیو نے آواز دبا کر کہا، ''میگی اور مما آگئی ہیں، مما کا منہ بہت لمبا سا ہے۔''

''خدا حافظ......'' سمن نے گھبرا کر جلدی سے فون رکھ دیا۔

جواب سارے؟

رات کو فون کی گھنٹی..... سمن کا دل دھڑکا۔ نائٹ لائٹ کی روشنی میں کھڑکی پر لٹکے گملے اور دیوار پر لگی ہوئی تصویروں نے عجیب عکس بنا رکھے تھے۔ عبدالرحمٰن چغتائی کا صحرائی اونٹ سارے تھام جھام کے ساتھ تصویر سے نکل کر دیوار کے صحرا میں بھاگا جا رہا تھا۔ دونوں سہیلیاں بھی تصویر کے فریم سے جدا الگ کھڑی کان میں سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ فون کی گھنٹی بجے جا رہی تھی۔ پھر انٹرکام پر میگی کی میٹھی آواز سنائی دی، ''سمان تمھارا فون ہے۔''

''اچھا!'' سمن نے ڈرتے ڈرتے فون اُٹھایا۔

''ہیلو..... ہیلو..... کون ہے کیا کہہ رہا ہے..... ناز؟..... ناز پاگل ہوگئی ہے۔ کیا بک رہی ہے..... امی! میری امی، کیا کہا؟..... نہیں، نہیں..... نہیں.....'' ساری زمین، سارا گھر، سارا آسمان گھوم رہا تھا۔ سارا سمندر چڑھ دوڑا تھا۔ وہ مُٹھیاں مار مار کر کہہ رہی تھی۔ نہیں، نہیں، نہیں۔'' مگر صحرائی اونٹ، دونوں سہیلیاں، سفید مور اور سارے سائے افسوس سے سر ہلا کر کہہ رہے تھے۔ ''ہاں، ہاں..... بے چاری کی امی، ایک ہی تو سایہ تھا سر پر.....''

دروازے پر کوئی دستک دے رہا تھا۔ وہ کہہ رہی تھی۔ ''نہیں، نہیں، نہیں۔''

مگر دستک کہہ رہی تھی۔ ''ہاں، ہاں..... ہاں۔''

میگی پچکار رہی تھی، ''سمان..... سمن ڈیئر..... دروازہ کھولو۔ ڈارلنگ، ہنی! دروازہ.....''

کیا وہ عزیز ترین ہستی جس نے کبھی سمن ڈیئر، سمن ڈارلنگ اور ہنی نہیں کہا تھا، اب اس دنیا میں نہیں تھی۔ اس لمحے سے کیا وہ اس دنیا میں یک وتنہا تھی..... نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔ اگر ایسا تھا تو اس

کے لیے ساری دنیا اور سارے لوگ محض پرچھائیاں تھے.... شاید سب مر چکے تھے۔ شاید کیا یقیناً قیامت آ چکی تھی۔

بچپن میں وہ خاندان کی کسی شادی میں ابوامی کے ساتھ سکھر ٹھہر گئی تھی۔ شادی کے بعد سب لوگ رات کو دیر سے سوئے تھے مگر صبح صبح دیکھا کہ سارے لڑکے لڑکیاں دریائے سندھ کے کنارے ہوا خوری کو جارہے ہیں۔ وہ چھوٹی تھی، طبیعت کسلمند بھی تھی مگر بڑوں کے ساتھ ہولی۔ اس وقت سورج طلوع ہورہا تھا۔ ابنِ عم میں سے کسی شیطان کے چیلے نے شوشہ چھوڑا کہ سورج مغرب سے نکل رہا تھا، یہ بات کہ قیامت کے دن سورج مغرب سے طلوع ہوگا، سب نے سن رکھی تھی۔ پھر کیا تھا، دوسرے لڑکے ''قیامت قیامت'' کا شور مچاتے بھاگ کھڑے ہوئے۔ بڑی لڑکیاں مقابلے پرڈٹ کر پیچھے لپکیں اور وہ گرتی پڑتی سب سے پیچھے.... کم بخت ان شریر بچوں پر اتنا اعتبار کہ قیامت اب آئی کہ آئی، دریا اب اُمڈا کہ اُمڈا۔ زمین اب پھٹی کہ پھٹی۔ آفتاب اب شق ہوا...... کبھی آگے بھاگتی، کبھی رُک کر سورج کو دیکھتی۔ اُڑنے والے پرند اور بادل کے ٹکڑے سچ مچ کے پہاڑ لگتے جو روئی کے گالوں کی طرح اُڑ رہے تھے۔ گھر پہنچتے پہنچتے وہ نڈھال ہو کر گر پڑی تھی۔

سب لوگ ناشتے کے حلوے مانڈے میں فوراً ہی قیامت کو بھول بھال گئے تھے مگر وہ دن آج تک اس کے ذہن کے کسی خلیے سے چمٹا رہا تھا..... حالاں کہ وہ دن قیامت کا دن نہیں تھا، آج کا دن قیامت کا دن تھا۔ اس وقت سورج مغرب سے طلوع ہورہا ہوگا، زمین شق ہوگئی ہوگی اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اُڑ رہے ہوں گے، اگر وہ باہر نکل کر دیکھے تو.... مگر باہر اندر..... اس کی روح کے اندر سب جگہ قیامت کا سناٹا تھا۔ سمندر بھی خاموش ہوگیا تھا۔ صرف میگی کی آواز بہت دور...... کہیں سے ہلکی ہلکی آرہی تھی.... سمان۔ سمان ڈیئر۔ ڈارلنگ ہنی۔ اور پھر شاید وہ بھی بند ہوگئی تھی۔

سمن نے کیلی فورنیا آتے ہوئے اپنے فون کے پاس ڈیو کا نمبر اس لیے چھوڑا تھا کہ کوئی خاص بات بتانی ہو تو اس کی ساتھی لڑکی کو معلوم ہو کہ وہ کہاں ہے۔ اسے کیا معلوم تھا کہ یہ نمبر ناز اور بصیرہ تک بھی پہنچے گا اور سب کو معلوم ہوگا کہ آج کل وہ ڈیو کے ساتھ کیلی فورنیا میں ہے۔ ڈیو کو ایک نظر دیکھنے کا لمحے بھر میں کیا ہوا فیصلہ ایک امتحان بن گیا تھا۔ سمن کے لیے فون پر فون آتے رہے۔ میگی اپنی میٹھی آواز میں ان سب سے منتی رہی، ''آئی ایم سوری۔ سمان غریب اس وقت فون پر بات نہیں کرسکتی۔ میں اسے پیغام دے دوں گی۔'' پرسہ کرنے والے اسے کیا پیغام دیتے۔ سمن کے بارے میں پوچھتے رہے وہ بتاتی رہی کہ سمن پاکستان جانا چاہتی ہے اور وہ خود اس کے جانے کا بندوبست کررہی ہے۔

پاکستان کے سفر کا بندوبست ہوگیا تو میگی اپنی لیموزین میں سمن کو ایئرپورٹ تک چھوڑنے چلی۔

بٹن دبا کر اس نے ہلکے رنگین اس شیشے کو بند کر دیا جو ان کے اور ڈرائیور کے درمیان تھا۔ لیموزین کی چوڑی صوفہ نما سیٹوں پر وہ دونوں برابر بیٹھی ہوئی تھیں۔ سمن نے کھڑکی کے باہر نظر ڈالی۔ کیلی فورنیا کی شہرۂ آفاق دھند ہر طرف چھائی ہوئی تھی۔ سمندر دُھند کے سمندر میں چھپ گیا تھا۔ پہاڑیاں، گھر، پھول پات کچھ نظر نہیں آ رہے تھے جیسے گاڑی کو کسی نے سفید بڑی سی چادر میں لپیٹ دیا تھا۔ اگلی گاڑیوں کی جلتی ہوئی سرخ بتیاں روشنی کا مینار تھیں جس کے سہارے گاڑیاں آگے بڑھ رہی تھیں۔ یہ شاید اس کے مستقبل کی دُھند ہے جو مجسم ہو گئی ہے۔ سمن نے سوچا۔

میگی نے شفقت سے اس کا ہاتھ تھپکا۔ سمن نے نگاہیں اُٹھا کر تشکر سے اس کی طرف دیکھا۔ میگی کی آنکھیں سرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔ وہ یقیناً روتی رہی تھی۔

''جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو چکا سمن۔'' میگی نے کہا۔ ''تم جلدی واپس آ جانا۔ تمھیں معلوم ہے نا کہ اب معاملات بڑے پیچیدہ ہو گئے ہیں....'' اس نے سسکی لی۔ وہ واقعی رو رہی تھی۔

''ہاں.....مجھے بڑا افسوس ہوا۔ ڈیو نے مجھے بتایا۔'' سمن نے دکھ سے کہا۔

''پولیس نے پیٹر کو پکڑ لیا ہے۔'' میگی نے رُندھی ہوئی آواز میں کہا۔ اس الزام میں کہ اس نے ڈیو کو مارنے کے لیے اس کی کار میں بم رکھا۔ اگر اسے کچھ ہو جاتا تو ہم کیا کرتے!.....'' وہ دونوں ہاتھوں میں منھ چھپا کر رونے لگی۔

اب سمن نے اس کے میدہ سے سفید ہاتھ پر تسلی کے لیے ہلکی سی تھپکی دی۔ میگی نے آستین سے ٹشو نکال کر اپنے آنسو پونچھے۔

''سمان! اب یہ بات چھپ نہیں سکتی اور نہ میں چھپانا چاہتی ہوں کہ ڈیو میرا بیٹا ہے۔'' میگی نے صاف آواز اور جمے ہوئے لہجے میں کہا۔

''کیا؟.......'' سمن یوں اچھلی جیسے سیٹ میں چھپے کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہو۔ ''آپ کا بیٹا!......''

''ہاں۔'' میگی نے کہا، ''تم تو یہی سمجھتی ہو گی کہ ہمارے ملک میں ٹین ایجرز کے پیدا ہونے والے بچوں کو عام طور پر تسلیم کر لیا جاتا ہے مگر سو فی صد ایسا نہیں ہے۔ وہ خاندان جو پرانی قدروں میں یقین رکھتے ہیں اور جھوٹی ساکھ رکھنا چاہتے ہیں اب بھی بہت پریشان ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی اٹھائیس سال پرانی ہے۔ ہمارے گھر میں تو بہت اودھم مچا۔ مما نے فیصلہ کیا کہ بچہ ایسی جگہ ہو کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہو.......اور پھر اس بچے کو مما اور پاپا نے گود لے لیا۔ یوں ڈیو ہمارے ہی گھر میں میرا اور پیٹر کا بھائی بن کر رہا......سب کے خیال میں یہ بہت مناسب انتظام تھا لیکن پیٹر نے اسے

کبھی قبول نہ کیا۔ وہ ڈیوکو اپنے حق کا غاصب اور باہر کا آدمی سمجھتا رہا۔ جب اسے پتا چلا کہ مما اسے اتنا قیمتی گھر خرید کر دینے کو راضی ہوگئی ہیں تو وہ خود بھی اس علاقے میں کوئی اچھا سا گھر دیکھنے کے بہانے مما کے ساتھ چلا آیا لیکن دل میں اس نے ڈیو کو مارنے کا عہد کرلیا۔ اب سوچتی ہوں تو لگتا ہے کہ شاید وہ بہت دنوں سے اس چکر میں تھا۔ وہ تو شکر ہے کہ ڈیو خود ہی اس کی وجہ سے گھر سے دور دور رہتا تھا۔'' جملہ ختم کرتے کرتے پھر میگی کی آواز بھرا گئی۔

خیالات کے ہجوم نے سمن کے ذہن پر ایک دم ہلّہ بول دیا۔ میگی کو اب بھی احساس نہیں تھا کہ اس انتظام نے ڈیو کو اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔ ڈیو کی اپنے آپ کو، اپنی جڑوں کو کھوجنے کی جدوجہد۔ جڑوں کی تلاش میں شیخوپورہ اور ملتان تک جانے کی تگ و دو جب کہ اس کی جڑیں اس آنگن میں تھیں جہاں وہ کھیل کر بڑا ہوا تھا۔

''ڈیو کو یہ سب معلوم ہوگیا؟'' سمن نے پوچھا۔

''نہیں، ابھی نہیں۔'' میگی نے کہا، ''مگر معلوم ہو جائے گا۔ اب کوئی بات نہیں چھپائی جاسکتی۔ میں نے اس راز کی بھاری قیمت دی ہے۔ سب ہی نے دی ہے۔ میں سوچتی ہوں، پیٹر نے ڈیو کی پوری زندگی میں زہر گھولے رکھا اور وہ بے چارہ برداشت کرتا رہا۔ میں بھی خاموش رہی، کتنی پاگل تھی میں...... اگر اس حادثے میں وہ مر جاتا؟ سوچتی ہوں تو کانپ جاتی ہوں۔'' میگی واقعی سر سے پیر تک کانپ گئی۔ کچھ دیر وہ خاموشی سے روتی رہی۔

''سمان!.....'' یکایک بولی، ''اب میں اس سے کوئی خوشی نہیں چھینوں گی۔ وہ تم سے شادی کرنا چاہتا ہے تو یہ شادی ہوگی۔ دیکھتی ہوں مما کیسے روکتی ہیں۔ دنیا کہیں سے کہیں نکل گئی ہے۔ امریکا میں چھوٹے چھوٹے بچے من مانی کرتے ہیں، مگر ہمارے ہاں اب تک مما کا کوڑا سب پر چلتا ہے۔ اب یہ نہیں ہوگا۔ تم فکر مت کرنا۔''

سمن سُن بیٹھی تھی۔ باہر کی دُھند ویسے بھی کئی دن سے اس کے ذہن میں بھری ہوئی تھی۔ سمندر کی اونچی نیچی لہریں جن میں وہ چند دن گزار کر آئی تھی، چٹانوں اور ٹیلوں پر بنے مکان، ریلنگ، پھول پتے، پگڈنڈیاں سب دُھند میں لپٹے ہوئے خواب تھے۔ یہ سب ہی حقیقت سے دور تھے۔ وہ کہاں ہے اور کون ہے جو اسے ایسی انہونی کہانیاں سنا رہا ہے؟ شاید یہ خواب ہی تھا۔ بچپن سے اسے اُلجھے اور پیچیدہ خواب دکھائی دیتے تھے..... یہ بھی ان میں سے ایک تھا۔

وہ دونوں خاموش تھیں۔ راستہ لمبا تھا۔ باہر دُھند میں دیکھنے کو کچھ نہ تھا۔ اندر ٹی وی اور وی سی آر رکھا تھا مگر یہ بے کار کھلونے اس وقت ان دونوں میں سے کسی کا دل نہیں بہلا سکتے تھے۔ پھر حقیقت

آفتابِ سحر کی طرح آہستہ آہستہ سمن کے ذہن پر طلوع ہونی شروع ہوئی۔
ڈیو alien نہیں ہے، وہ دوسرے سیارے سے آیا ہوا انسان ہے نہ کسی اور ملک کا باشندہ ہے۔ وہ تو پیدائش سے اپنے ہی لوگوں میں رہ رہا ہے۔ فرق صرف رشتوں کا پڑا ہے۔ وہ کون ہے؟ کیا ہے؟ کہاں سے آیا ہے؟ سب کے جواب اسے مل جائیں گے۔ اس کی اجنبیت ختم، اس کی تلاش ختم..... اس کی روح کی پیاس بجھ جائے گی.....اور وہ کون تھی؟ اس کی تلاش میں صرف ایک ہمراہی۔ اب نہ جنگل رہا نہ تلاش.....اب وہ نگھرا نہیں ہے۔ اس کی نانی نے اس کے لیے سمندر کے کنارے منھ مانگا گھر خریدا ہے۔ اس کو ماں مل گئی ہے شاید باپ بھی مل جائے اور وہ ہنسی خوشی رہنے لگے۔ پیٹر بورڈ لگاتا تھا: ''ناپسندیدہ حضرات کو علاقے میں گھس آنے پر سزا ملے گی، زبردستی داخل ہونے والوں کو گولی سے اُڑا دیا جائے گا۔ یہ شارع عام نہیں ہے مداخلت کرنے والوں پر کتے چھوڑ دیے جائیں گے۔'' اب تو صرف وہ ناپسندیدہ، زبردستی گھس آنے اور مدخلتِ بے جا کرنے والی رہ گئی ہے!
اُس نے چاروں طرف دیکھا۔ سامنے ٹی وی اور وی سی آر کے پاس چند میگزین رکھے تھے۔ کوئی ایسی چیز نہ تھی جس پر وہ چند سطریں لکھ سکے۔ البتہ فون کے پاس ایک خوب صورت قلم اور کار کی دیوار پر رنگین کاغذوں کی ایک ڈائری یادداشت کے لیے چپکی ہوئی تھی۔ سمن نے ایک پرچی الگ کی اور جلدی جلدی لکھا:

''ڈیئر ڈیو!

مجھے میگی نے ساری بات بتا دی ہے۔ تم اور alien باہر کے آدمی نہیں ہو، میں ہوں۔ اگر قدرت نے میری واپسی کا یہ انتظام نہ کیا ہوتا تب بھی میں وہی کرتی جو اب کر رہی ہوں یعنی تمھاری زندگی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چپ چاپ نکل جاتی۔

.......سمن

اُردو میں یہ پرچہ لکھ کر سمن نے میگی کے حوالے کیا۔ تازہ لگی چوٹ کی طرح وہ اسے بڑی ہمت سے سہار رہی تھی۔
''اچھا کیا تم نے اسے تسلی کا خط لکھ دیا۔ تم نے لکھ دیا نا کہ اپنی ماں کے سارے انتظامات سنبھالتے ہی تم واپس آ جاؤ گی؟''
لیموزین ایئرپورٹ کے عین سامنے ٹھہر گئی تھی۔ پیچھے اور گاڑیاں بھی تھیں۔ ڈرائیور تیزی سے اُترا اور جلدی سے سمن کا سامان اُتارا۔ سمن اور میگی اُتریں۔ ڈرائیور نے سامان قلیوں کے حوالے کیا اور گاڑی پارکنگ میں کھڑی کرنے چلا گیا۔ سمن نے دیکھا ڈھند میں تھوڑی سی کمی آ گئی تھی مگر اب بھی

ذرا دور چلتے ہوئے ہر شخص پر بھوت یا روح کا گمان ہوتا تھا۔ خود کار دروازہ کھلا۔ میگی اور سمن لاس اینجلز ایئر پورٹ کی عمارت میں داخل ہو گئیں۔

وہی کے ایل ایم کا جہاز تھا، وہی ایمسٹرڈم کا ہوائی اڈہ۔ اُس وقت سمن امریکا جا رہی تھی اب واپس آ رہی تھی۔ اُن دنوں بھی امی کو چھوڑنے کا غم تھا مگر فردا کے پردے کے پیچھے چھپی نئی امیدوں کے چراغ بھی تو تھے جن کی جھلملاہٹ بڑی سہانی تھی، آج ماں کا تازہ لہو رِستا زخم تھا، کبھی نہ بھر سکنے والا گھاؤ۔ یہ مجرمانہ احساس الگ کہ جاتے ہوئے وہ اسے ایک نظر دیکھنے کو کیسی کیسی تڑپی ہوں گی۔ حالاں کہ بتانے والوں نے بتایا کہ وہ نہایت پُرسکون اور خاموشی سے گئیں مگر اسے یقین نہ تھا۔ اُوپر سے پانی پُرسکون ہو تو کیا معلوم تہہ میں کہیں بھنور پڑ رہے ہوں۔ رو رو کر اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں، دماغ ماؤف تھا اور ذہن سُن! خود کار پٹریوں کے لمبے لمبے سفریوں طے کر رہی تھی جیسے وہ بھی کوئی خود کار مشین ہو۔

ایمسٹرڈم کا بازار اسی طرح ہیروں سے، گھڑیوں، پھولوں اور چاکلیٹ کے ڈبوں سے بھرا پڑا تھا۔ خریدار بھی تھے اور طالبِ دیدار بھی مگر وہ اس ہجوم سے الگ تھلگ بیٹھی تھی۔ اسے لمحے بھر کے لیے بھی یہ محسوس نہ ہوا کہ یہ وہی جگہ ہے جہاں وہ ڈیو کے ساتھ ٹہلتی پھری تھی۔ جہاز کے وقت سے بہت پہلے جا کر جہاز کی لابی میں اور جہاز کے چلنے کا وقت ہوا تو چپ چاپ جا کر جہاز میں بیٹھ گئی۔

جہاز اُڑا اور چلتا رہا۔ وہی شربت اور کھانے کے دور۔ پاس بیٹھی ایک خاتون نے اپنا تعارف کرایا کہ وہ اٹلی کے شہر ''میلانو'' میں رہتی ہیں اور اس وقت انڈونیشیا جا رہی ہیں۔ سمن نے خوش اخلاقی برتنی چاہی مگر دل نے ساتھ نہ دیا۔ وہ خاموشی کو بیزاری سمجھ کر فلم دیکھنے لگیں۔ سمن اونگھتی رہی اور چپکے چپکے چلے آنے والے آنسو پونچھتی رہی۔ وقت کا حساب ایک دفعہ پھر گم ہو چکا تھا۔ اس کی گھڑی میں امریکا کا وقت تھا۔ خاتون کی گھڑی میں میلان کا وقت تھا جہاز میں نہ جانے کیا بجا تھا۔ جہاز کی گھما گھمی میں وہ تھوڑا سا وقفہ جب ہوائی میزبان مرد عورتیں بھی آرام کر لیتی ہیں۔ تشنہ دہن گھنٹی بجانے کے بجائے خود اُن کے حجرے تک جا کر پیاس بجھا رہے تھے۔ قیمتی شرابوں کے ناؤ و نوش میں جب سمن نے پانی مانگا تو سب ہنس پڑے۔

''خاتون! بہت مہنگا مشروب ہے، دیکھیے کوشش کرتے ہیں کہ آپ کی مدد کر سکیں۔'' ایک ادھیڑ باوردی اسٹوارٹ نے مذاق کیا۔ سمن نے مسکرانے کی کوشش کی کہ اس کے حسِ مزاح پر حرف نہ آئے۔ ایک نیم مست نے آگے بڑھ کر پوچھا۔

''کون سا ملک؟'' سمن نے اسے غور سے دیکھا۔ وہ ڈیو کی طرح لمبا چوڑا تھا۔

''پاکستان۔''

''بہت خوب!'' کہہ کر وہ سمن کے ساتھ ہولیا۔ سمن گلاس لے کر تیزی سے آگے بڑھی اور جہاز کے درمیان سے راستہ بدل کر دوسری طرف چلی آئی۔ اپنی سیٹ پر پہنچ کر وہ بیٹھنے کے بجائے آگے نکل گئی۔ لمبا چکر لگا کر لوٹی تو وہ شخص غائب ہو چکا تھا۔ جہاز کی یہ تھوڑی سی چہل قدمی بھی سمن کو غنیمت لگی۔

رات کا کھانا بھی اس نے نہ کھایا۔ جی تڑپ رہا تھا کہ کسی طرح منزل آجائے حالاں کہ اسے خوب معلوم تھا کہ منزل پر پہنچنے کے بعد بھی اس کے لیے کچھ نہیں ہے۔ خدا خدا کر کے ''کراچی'' کے نام کا اعلان ہوا۔ پاکستانی خواتین نے وہیں بیٹھے بیٹھے بچوں کے لباس تبدیل کروائے، تھوڑی پکڑ پکڑ کر بال بنائے، خود کنگھی چوٹی سے درست ہو چادریں سنبھال کر بیٹھ گئیں مگر سمن نے منہ تک نہ دھویا اور اسی طرح بال بکھرائے بیٹھی رہی۔

جہاز نے پاکستان کی زمین کو چھوا تو پاکستانی بچوں نے تالیاں بجائیں۔ مسافر زیرِلب معنی خیز انداز میں مسکرائے۔ میلانو کی خاتون نے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا۔ سمن نے مسکرانے کی کوشش کی تو آنسو نکل آئے۔ جہاز کا در کھلا، سمن باہر نکلی تو ایک گرم جھونکے نے بے تکلف دوست کی طرح چپت رسید کی۔ دوست سے جو بھی مل جائے غنیمت ہے۔ سمن نے سوچا۔

انٹرنیشنل عمارت کے اندر آن کر سامان لینے کھڑی ہوئی تو محسوس ہوا کہ واقعی وہیں آ گئی ہے جہاں سے چلی تھی۔ امریکا اور ایمسٹرڈم کی چمکتی دمکتی چیزیں غائب ہو چکی تھیں۔ سامان کے لیے خوب صورت خود کار پٹریوں کی جگہ لکڑی کی ایک پٹی تھی جس پر پتوں کی شکل کے ربر برابر برابر رکھے ہوئے تھے۔ اپنی جگہ چپکے ہوئے بھی نہیں تھے۔ کناروں سے نکلے ہوئے پھونسڑے چغلی کھا رہے تھے کہ عمر گزار کر ریٹائرمنٹ کی زندگی گزارنا چاہتے تھے مگر زبردستی بے گار پر لگا دیا تھا۔ سامان آنے میں دیر ہوئی تو وہ غسل خانے چلی گئی۔ بال پڑے کموڈ نے پہلے سے بھی زیادہ بے تکلف دوست بن کر ران میں چٹکی کیا لی بوٹی نوچنے کی کوشش کی۔ شکر ہے کہ پانی تھا مگر کاغذ کی تولیاں یا رول کچھ نہ تھا۔ ہاتھ دھونے کے بعد سکھانے کی کوشش کی تو مشین ذرا سی سرسرا کر رک گئی۔ اس سے پہلے کبھی کہیں مشین نے ایسی دغا نہ دی تھی۔ دوپٹے سے ہاتھ پونچھتی، تر دامن، شرمساری واپس آئی۔ امریکا سے لوٹنے والے سارے ہی ہم وطن ایک دوسرے سے آنکھیں چار کرتے ہوئے شرما رہے تھے جیسے کھاتے پیتے رشتے دار کسی نادار عزیز کے گھر جائیں تو ایک دوسرے کی طرف دیکھتے ہوئے گھبرائیں۔

مسافر لانبی لانبی کسٹم کی قطاروں میں کھڑے انتظار کرتے رہے۔ وہ اپنے سامان کی ٹرالی

دھکیلتی سبز روشنی کے دروازے سے نکلتی چلتی گئی۔ آگے بڑھ کر ٹیکسی لینے کا سوچ رہی تھی کہ سلیم نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔

"آپ؟ کسی کو لینے آئے ہیں؟" ثمن نے پوچھا۔

"تمھیں!" سلیم نے جواب دیا، "ناز بھابی نے مجھے اطلاع دے دی تھی اور کہا تھا کہ میں تمھیں ایئرپورٹ جاکر لے آؤں۔ امی نے کہا ہے کہ تمھیں اپنے گھر لے کر آؤں۔"

سلیم کے ساتھ کھڑے کسی شخص نے آگے بڑھ کر ٹرالی ثمن کے ہاتھ سے لے لی تھی۔ سلیم نے ثمن کے سوجے پپوٹے اور اُترا چہرہ دیکھا۔

"تمھاری امی کے انتقال کا بے حد افسوس ہوا ثمن۔" سلیم نے ساتھ چلتے ہوئے کہا۔ "میں چند دن پہلے ہی ملنے گیا تھا۔"

"اچھا!" ثمن نے افسردگی سے کہا۔ اس کا جی چاہا، پوچھے امی سے کیا باتیں ہوئیں مگر یہ جگہ مناسب نہیں تھی اور وہ اس کے ہاتھ سے سامان لے کر جانے والا شخص کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔

"جس شخص نے میرے ہاتھ سے ٹرالی لی وہ آپ کے ساتھ تھا؟" ثمن نے پوچھا۔

"نہیں۔ میرے ساتھ تو کوئی نہیں تھا، میں تو اکیلا آیا ہوں۔" سلیم نے کہا، "کوئی اچکا نہ ہو۔" یکایک وہ پکارا اور آگے لپکا۔ ثمن تیز تیز قدم بڑھاتی اس کے ساتھ چلی۔

"وہ جارہا ہے۔" ثمن نے اشارہ کیا۔ "اسے پکڑیے۔"

سلیم نے تقریباً بھاگ کر اسے پکڑا۔ وہ شخص وہیں کھڑا ہوگیا۔ "کہاں بھاگے جارہے تھے؟" سلیم نے پوچھا۔

"بھاگتا کہاں؟" اس نے دیدہ دلیری سے کہا، "ٹیکسی کے پاس لے جارہا تھا۔"

"پوچھا تو ہوتا، میرے پاس گاڑی ہے۔" سلیم نے کہا۔

"گاڑی ہے تو گاڑی میں رکھ لو۔ میرا بھاڑا تو دو۔"

"کتنا؟"

"پچاس روپیہ۔"

"پچاس!" سلیم نے غصے سے کہا، "تم سے کہا کس نے تھا ٹرالی لینے کو۔ زبردستی ہاتھ سے ٹرالی لی۔ نہ تمھارے پاس وردی ہے نہ نمبر۔"

"لو بھئی اتنی دور سامان لے کر آگیا تو وردی اور نمبر یاد آنے لگے۔ کیا بھاڑا بھی نہیں دو گے؟" آدمی اکڑنے لگا۔

''میرے پاس روپے ہیں میں دے دیتی ہوں۔'' ثمن نے پرس کھولا۔

''نہیں، پیسے میں دوں گا۔'' سلیم نے اپنے بٹوے میں سے پیسے نکال کر دیے۔ وہ آدمی جھک جھک کرتا رہا۔ سلیم اور ثمن کے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد وہ بڑبڑاتا ہوا چلا گیا۔

تو اب وہ واقعی اپنی دنیا میں آ گئی تھی۔ ثمن نے سوچا۔ زندگی میں تھوڑے دنوں کو ایک چھوٹا سا پیوند لگا تھا۔ سو اتنے بڑے لباس میں ایک پیوند کی کیا حقیقت!

''ایک بات سنیے۔'' ثمن نے کہا۔

''میں بے حد تھکی ہوئی ہوں، میں کہیں نہیں جاؤں گی، مجھے میری امی کے گھر پہنچا دیں پلیز!'' ثمن کے خوشامدانہ لہجے میں آنسوؤں کی آمیزش بھی تھی۔ سلیم نے اس وقت زور دینا مناسب نہ سمجھا۔

''اچھا، جیسی تمھاری مرضی، گھر کی کنجی کس کے پاس ہے؟''

''پڑوس میں ہے، وہاں سے لے لیں گے۔'' ثمن نے کہا۔

''ٹھیک ہے، اگر تم سمجھتی ہو کہ تمھیں اپنے گھر میں زیادہ آرام ملے گا۔'' سلیم نے کہا۔

''مجھے آرام سے زیادہ سکون اور تنہائی چاہیے۔'' ثمن نے کہا۔

''میری امی اس بات سے اتفاق نہیں کریں گی مگر میں انھیں سمجھا لوں گا۔'' سلیم نے کہا۔

''شکریہ..... اور آپ امریکا سے واپس کب آئے؟'' ثمن نے سوچا کہ اس کی اتنی دلداری کا اور کچھ صلہ نہیں دے سکتی تو کم از کم کوئی بات ہی کرے۔

''اماں کے حادثے اور موت کے فوراً بعد بلکہ ساتھ ہی۔'' سلیم نے پرسکون مگر غمگین لہجے میں کہا۔

''اماں!..... اماں مر گیا!.....'' وہ حیرت سے آنکھیں پھاڑے سلیم کو تکنے لگی۔

''تمھیں نہیں معلوم؟'' سلیم نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا۔

''نہیں۔''

''ناز بھابی یا بصیرہ نے نہیں بتایا؟'' سلیم اب تک حیران تھا۔

''نہیں۔'' ثمن نے آہستہ سے کہا۔ دل میں وہ سمجھ گئی کہ ان دونوں نے جان بوجھ کر اس سے یہ بات چھپائے رکھی۔ اس نے نظریں جھکا لیں اور خاموش رہی۔

سلیم آہستہ آہستہ رک رک کر حادثے کے حالات سناتا رہا۔ پھر کس طرح وہ اماں کی نعش اور اس کی بیوی کو لے کر پاکستان آ گیا۔ اس کی بیوی کے قبل از وقت لڑکا ہوا۔ بچہ کمزور مگر زندہ ہے لیکن سائرہ کی حالت ٹھیک نہیں۔ کسی سے کچھ کہتی سنتی نہیں مگر سوکھ کے کانٹا ہو گئی ہے۔ اب زبردستی اس کی بہن نے چند دنوں کے لیے اسے اپنے پاس سیالکوٹ بلا لیا ہے۔

ثمن چپ چاپ سنتی رہی۔ سلیم نے اس کی سانس لینے کی آواز بھی نہیں سنی۔ ایک مرتبہ اس کے چہرے کے تاثرات سے دلی جذبات کا اندازہ لگانے کی کوشش کی مگر جو چہرہ پہلے ہی اتنا ستا ہوا، رویا ہوا اور غمگین ہو اس سے کیا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ثمن خود بھی سوچتی رہی، کیا اسے امان کے مرنے کا دکھ ہوا؟...... کاری زخم لگتا ہے، بھر جاتا ہے تو چکنی سی جگہ بن جاتی ہے، وہ جگہ پہلی جیسی کبھی نہیں ہوتی مگر اس میں درد اور ٹیس بھی نہیں اٹھتی۔ وہ زخم کبھی ہرا نہیں ہوگا مگر وہ جگہ اسی طرح بنجر رہے گی۔ بے جان اور مردہ۔ دل کے ایک خانے میں کوئی ایسی بے جان مردہ سی جگہ ضرور ہوگی مگر اب اس کے ہرا ہونے کا امکان نہیں۔ اگر غم ہو بھی تو امی کے شدید غم میں امان کا غم بھی چپکے سے سما گیا ہوگا۔ جب تاریک رات سارے میں چھائی ہو تو اندھیری جگہیں الگ کیا دکھائی دیں گی!

''جھنڈا لگا گھر'' اس کی منزل، عارضی طور پر ہی سہی، زمان کو مل گئی تھی۔ کسی دن مستقل طور پر بھی مل جائے گی۔ وہ دن اب اتنی دور نہ تھا کہ اس کی پہنچ سے پرے ہو۔ یہ شہر کا خوب صورت ترین بنگلہ تھا جس کے دو صدر دروازے ایک دوسرے سے ایکڑوں دور تھے۔ ان ایکڑوں میں اور گھر کے اطراف کے ایکڑوں میں لمبے لمبے سبز لان، گلاب اور ڈیلیا کے پھول، بچوں کے جھولے اور باورچی خانے کا باغ تھا۔ یہ سب اور بھی کئی گھروں میں تھا۔ آفیسرز کلب کی عمارت اس گھر سے بڑی تھی۔ وہاں کے گلاب اور ڈیلیا اس گھر کے پھولوں سے زیادہ بڑے تھے مگر جو چیز اس گھر کو سارے گھروں سے ممتاز کرتی تھی وہ گھر کے عین سامنے طویل کھمبے پر پھڑ پھڑاتا ہوا جھنڈا تھا۔ یہ جھنڈا اس کی شان اور شناخت کا سمبل تھا۔ اس کے اندر احساسِ کمتری کا جو سانپ کنڈلی مارے بیٹھا تھا جب کبھی بے وقت پھن اٹھاتا تو وہ اس جھنڈے تلے آن کھڑا ہوتا۔ پھڑ پھڑاتے جھنڈے کی ہوا سانپ کے پھن کو ہلکے ہلکے بٹھا دیتی۔ اس وقت بھی وہ جھنڈے کے سائے میں کھڑا تھا۔ پاس ہی حوض کے لبالب بھرے کٹورے سے پانی چھلک کر چادر کی شکل میں نیچے گر رہا تھا۔ مالی اور اس کے بالی موالی ہاتھوں میں پائپ لیے نہر کا ہفتہ وار پانی چمن زاروں، سنتھیا کی باڑوں اور غلام گردش کی کھٹے مالٹے کی حد بندیوں میں بھرنے میں مصروف تھے۔ صاحب کو دیکھ کر اپنی موجودگی اور کارکردگی دکھانے کو بلند آواز سے ایک دوسرے کو مقامی زبان میں ہدایات دے رہے تھے جس سے اس کے ذہن میں چلنے والی ماضی کی فلم ٹوٹ جاتی تھی اور کسی اور جگہ سے چلنی شروع ہو جاتی تھی۔ ایک مرتبہ ابا نے اسے چھاؤنی کے فلیگ اسٹاف ہاؤس میں بھی بھیجا تھا۔ ابا کی اس تاکید کے باوجود کہ خط بریگیڈیئر صاحب کے ہاتھ میں دینا وہ یہ چٹھی ان کے اردلی کو تھما آیا تھا۔ واپس پہنچا تو وہ کسی طرح ابا کو جھنڈا لگے گھر کی

ہیبت اور جبروت کا تو قتل نہ کرسکا۔ اس گھر میں پہنچ کر اردلی سے یہ اصرار کرنا کہ وہ چٹھی خود صاحب کو دے گا۔ بے حد بے موقع بات تھی، یہ وہ کبھی نہ سمجھ سکے۔ وہ اسے زمان کی کاہلی یا بزدلی سمجھتے رہے۔ انھیں یقین تھا کہ وہ عرضداشت ان تک نہ پہنچی ہوگی اسی لیے ان کا کام نہ ہوا..... ورنہ پڑھے لکھے افسران کو معلوم ہوتا ہے کہ اُستاد کا کیا درجہ ہے اور جب وہ کسی بات کی درخواست کرتے ہیں تو اس میں کتنا وزن ہوتا ہے۔ کچھ وزن اس عرضداشت میں یوں بھی تھا کہ انھوں نے چھانٹ کر انگریزی کے بڑے بڑے وزنی الفاظ استعمال کیے تھے مگر افسوس کہ بیٹے کی غفلت کی وجہ سے اس چٹھی کی رقت خیز اور اثر انگیز انگریزی بریگیڈیئر صاحب کی نظروں سے اوجھل رہی اور کام بھی نہ ہوا۔ کام جو ہرگز ان کا ذاتی نہ تھا، اسکول کی بہتری کے لیے تھا۔

کام ہوا یا نہ ہوا، فلیگ اسٹاف کی ساری خوب صورتی، اس کی عمارت کی سنگ مرمر کی سی سفیدی، اس کے پھولوں کی بہار بھری رنگینی اور سبزے کی ساری طراوٹ اس کی روح کو کئی دن سیراب کرنے کے بعد ذہن کے کسی شیلف میں نہایت قیمتی نادر سوغات کی طرح محفوظ ہوگئی۔

چھناکے سے کوئی چیز ٹوٹی اور اردلی دونوں ہاتھوں پر شیشے کے چند ٹکڑے سنبھالے شرمسار بنا زمان کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ ملازم چھوکرے نے جھاڑ پونچھ کرتے ہوئے ایک گل دان شہید کردیا تھا۔

''ہنہ، پھینک دو'' زمان نے کہا۔ گلدان قیمتی نہ تھا۔ اس کی یہ شانِ بے نیازی ملازموں پر اچھا اثر ڈال سکتی تھی۔

اردلی نے بے کار ٹکڑے اس طرح احتیاط سے اُٹھائے جیسے کسی ملک کا ایلچی سفارت کے فرمان لیے جارہا ہو، اُلٹے پاؤں لوٹ گیا۔ چھناکے کی آواز سن کر اس کی بیوی نادرہ کہیں دور پینٹری کے چار کمروں سے گزر کر کھانے کے کمرے اور درمیانی کاریڈور سے جھومتی جھامتی اپنی توند ہلاتی باہر آئی۔ زمان نے اپنا منھ دوسری طرف کرلیا۔ اتنے بہت سے مردوں، خصوصاً اپنے ملازموں کے سامنے اسے اپنی بیوی کا نکلا ہوا پیٹ بہت ہی بے ہودہ لگتا تھا۔

اردلی نے ترنت ملازم لڑکے کو بیگم صاحبہ کے حضور حاضر کیا۔ چہرہ دوسری طرف کیے کیے زمان نے سنا۔ بیوی اس لڑکے کو بری طرح جھڑک رہی تھی۔ پھر اس سے ابھی ابھی نکل جانے اور اپنی منحوس شکل کبھی نہ دکھانے کا حکم ہوا۔ لڑکا منھ لٹکا کر چلا گیا۔ زمان کو یاد آیا، وہ سوچا کرتا تھا جب وہ جھنڈا لگے گھر میں رہنے آئے گا تو سارے غریب بچوں کو دعوتِ عام ہوگی کہ وہ اس کے ایکڑوں لان پر دھما چوکڑی مچائیں، جھولے جھولیں، چاندنی راتوں میں دھوپ چھاؤں کھیلیں اور وہ ان کی آنکھوں کی اس چمک سے دل خوش کیا کرے گا جو انھیں اس گھر میں بلا روک ٹوک آنے سے ہوگی..... مگر یہ تو ماضی

کے خواب تھے جو اُس نے فرعون کے مقبروں کی طرح مہر بند کر کے ماضی کی ٹھنڈی ریت میں دفن کر دیے تھے۔ ہاں آئندہ کے خواب حقیقت کی سرحد تک کھینچ کر لانے تھے۔ زندگی میں ترقی کرنے کے لیے مختلف داؤ پیچ، مختلف نقشے بنانے اور ان کے مطابق کام کرنا تھے۔ وہ رات کو دیر تک جاگتا اور کام کرتا۔ اس کی موٹی بیوی توند نکالے ایسے خراٹے لیتی کہ اسے اپنے مطالعے کا کمرہ بند رکھنا پڑتا۔ اس نے کبھی نادرہ سے نہیں پوچھا کہ اس نے بھی کبھی کوئی خواب دیکھے تھے، اس کی بھی کبھی کوئی چسنی تھی جس کے چھن جانے کا داغ دل پر لگا تھا؟ وہ اپنے خوابوں میں اتنا اُلجھا ہوا تھا کہ کبھی خیال ہی نہیں آیا کہ اس کی بیوی اگر زندہ انسانوں کی طرح ہے، کھاتی پیتی اور سوتی جاگتی ہے تو اس کی بھی چند آرزوئیں، چند خواب ضرور ہوں گے۔

بظاہر نادرہ بھی مطمئن تھی۔ اسے اچھے کپڑوں اور اچھے کھانے کا شوق تھا۔ اچھا گھر میسر تھا۔ اس کے شوہر کو بھی لوگ ''اچھا'' ہی کہتے تھے تو اسے اور کیا چاہیے تھا۔ یہ تو جب سے اس کی بہن سارہ آئی تھی اس نے ناطقہ بند کر رکھا تھا۔

''آپا! آپ کو کیا ہو گیا ہے۔ آپ کو کیا پتا نہیں کہ یہ کیک اور پیسٹریاں اور یہ میٹھے آپ کو موٹا کر رہے ہیں؟''

''اچھا!......'' وہ بھولپن سے کہتی۔ ''یہ خوب صورت کیک پیسٹریاں، مٹھائیاں تو میری دوست ہیں، محبوب ہیں۔ مجھے دور دور سے بھی لبھاتی ہیں۔ کھاتی ہوں تو مزہ آتا ہے، چسکا بڑھتا جاتا ہے کم نہیں ہوتا۔''

''مگر چربی کی تہیں جو چڑھ رہی ہیں۔'' سارہ کہتی۔

''یہ چربی کی تہیں مجھے تحفظ کا احساس دلاتی ہیں۔ سنو، جب تمھارے بھائی جان کسی کام کا بہانہ کر کے، سج بن کر اپنے خفیہ خزانے سے پیسے نکال کر اپنی راہ لیتے ہیں تو میں بھی ریفریجریٹر سے اپنی محبوب مٹھائیاں نکال کر، چٹخارے لے لے کر کھاتی ہوں اور سمجھتی ہوں کہ میں بالکل محفوظ ہوں، مجھے کوئی خطرہ نہیں ہے۔ میری جگہ اس گھر میں ہمیشہ محفوظ رہے گی، ان مٹھائیوں کے ساتھ۔ انھیں لے کر میں بیڈ روم میں چلی جاتی ہوں۔ گانے سنتی جاتی ہوں، مووِیز دیکھتی جاتی ہوں، شربت چائے پیتی جاتی ہوں اور کھاتی جاتی ہوں۔ بعض اوقات آدھی رات تک، بعض اوقات تین چار بجے تک! تمھارے بھائی جان آتے ہیں تو جلدی سے چھپا دیتی ہوں۔ اگر میں ان کے سامنے کھاتی رہوں تب بھی شاید وہ اعتراض نہ کریں کہ انھوں نے کبھی میرے چربی کے غباروں پر تمھاری طرح اعتراض نہیں کیا مگر مجھے ان سے چھپا کر کھانا ہی اچھا لگتا ہے کیوں کہ اس میں بھی مزہ آتا ہے۔ وہ مجھے آنکھ مارتی ہیں، میرے

ساتھ ہنستی ہیں، میرے رازوں کی شریک اور امین ہیں۔ وہ مجھے کسی بھی بات پر ٹوکتی نہیں اور ان کے لیے مجھے اتنی تنگ و دو نہیں کرنی پڑتی جتنی بے چارے زمان کو کرنی پڑتی ہے۔ میں سوچتی ہوں، بے چاری عورتوں کو لت بھی تو حلال ہی لگانی پڑتی ہے۔" اپنی بات پر وہ اتنا ہنسی کہ آنسو نکل آئے۔

"کوئی آپ کو ٹوکتا نہیں؟" سائرہ افسردگی سے پوچھتی۔

"میاں نہیں ٹوکتے تو اور کون ٹوکے گا!" نادرہ کہتی، "ماتحتوں کی بیویوں کی ہمت نہیں۔ ان سے کہوں کہ وزن بڑھ رہا ہے تو غریب کہتی ہیں، 'آپا جی آپ پر جچتا ہے۔ بڑے افسر کی بیگم کو بھاری بھر کم ہی ہونا چاہیے۔' برابر کی بیگمات سے تمھیں پتا ہے چلتی پھرتی دوستیاں ہوتی ہیں، انھیں کیا غرض کہ ٹوکتی پھریں۔"

"گویا آپ بھائی جان سے ان کی بے وفائی کا بدلہ لے رہی ہیں۔" ایک مرتبہ سائرہ نے بگڑ کر کہا، "مگر یہ کیسا انتقام ہے جس میں نقصان سراسر آپ کا ہے۔ دل کے دورے کا امکان تو آپ کے بڑھ رہا ہے نہ کہ اُن کے!...."

"صحت یا بیماری کا خیال نہ انھیں ہے نہ مجھے....." نادرہ نے بظاہر لاپروائی سے کہا، "وہ اپنی کسی کمی کو پورا کر رہے ہیں۔ بچپن سے کسی لڑکی سے محبت تھی، اس کی محبت کا گڑھا کسی بھی ایندھن سے نہیں بھرتا۔ ان کی اس کمی نے میری زندگی میں جو خلا پیدا کر دیا ہے وہ میں کھانے سے پورا کر رہی ہوں۔ مجھے ان سے کوئی شکایت نہیں ہے۔ انھوں نے بھی تو کبھی نہیں پوچھا، 'کیا کھاتی رہتی ہو؟ کبھی وزن کیا؟ پھول کے کپا ہو رہی ہو۔'"

"آپ چاہتی ہیں کہ وہ پوچھتیں؟" سائرہ نے کہا۔

"شاید اندر سے دل چاہتا ہو۔" نادرہ نے نگاہیں جھکا لیں۔

"شاید اُن کا بھی دل چاہتا ہو کہ آپ کڑھیں، کریدیں کہ راتوں کو کہاں رہتے ہو؟ خزانے کے پیسے کس پر لٹاتے ہو؟!"

"لیکن پہل کون کرے؟ خاموشی کی دیوار اتنی اونچی ہو گئی ہے کہ اسے پھلانگتے ہوئے ڈر لگتا ہے اور میں اتنی موٹی ہوں کہ کوشش بھی کروں تو دھڑام سے گروں گی۔" نادرہ بے تحاشا قہقہے لگانے لگی۔

سائرہ کو اپنی بہن پر رحم آیا۔

"آپا تم اپنا وزن سو پونڈ کرلو۔ بھائی جان دیکھیں گے کہ ایک انہونی ہو سکتی ہے تو دوسری بھی ممکن ہے۔"

"عورت ہمیشہ عورت ہی کو نصیحت کرتی ہے۔" نادرہ ناراض ہو گئی، "وہ تمھارے بہنوئی ہیں ان

سے بات کیوں نہیں کرتیں؟''

''نہ بابا، میں ان سے کیا کہوں!'' سائرہ نے کانوں پر ہاتھ رکھے۔

''نہ کہو'' نادرہ بولی۔ ''میں نے تو کہہ دیا ہے تمھاری محبوبہ جہاں کہیں ہو، جب کبھی مان جائے، اسے لے آنا، شادی کر لینا..... میری فکر نہ کرنا۔ میں ہر حال میں خوش ہوں۔ ذرا وہ کیک کی پلیٹ تو بڑھاؤ۔''

''بھائی جان کیا کر رہے ہیں؟'' سائرہ نے بالآخر موضوع بدلا۔

''پہلے تو باہر کھڑے تھے، اب تک اندر نہیں آئے تو اخبار پڑھ رہے ہوں گے۔'' نادرہ نے ایک اور ٹکڑا کیک کا اٹھایا۔ ''یہ اخبار بھی کتنی مشکلوں سے بچاتا ہے۔ تازہ اخبار ایسا ہے جیسے آسمانی صحیفہ ہو۔ کوئی بھی آسمانی صحیفہ انھوں نے الف سے ی تک نہیں پڑھا مگر اخبار روز الف سے ی تک چاٹتے ہیں۔ ایک دن اخبار نہ ملے تو ایسی پریشانی رہتی ہے جیسے چالیس سال سے کوئی نماز ناغہ نہ کرنے والے شخص کو ایک نماز ناغہ کرنے سے ہوتی ہوگی۔'' نادرہ پھر ہنس رہی تھی۔

''آپا آپ ایسی باتوں پر ہنستی ہیں کہ مجھے رونا آتا ہے۔'' سائرہ نے کہا۔

''لو، اس میں رونے کی کون سی بات ہے!'' نادرہ نے کہا، ''اتنے مزے کی تو میں نے بات کہی۔ کچھ لوگوں کا عقیدہ ہے کہ نماز صرف وقت پر پڑھی جا سکتی ہے، اسی طرح ہمارے میاں بھی اخبار قضا پڑھنے کے قائل نہیں۔ آج کا اخبار آج ہی ختم کرنا ہے، کل اللہ اور دے گا۔''

''کسی دن اللہ نے نہ دیا تو؟'' سائرہ نے پوچھا۔

''پھر غم غلط کرنے کے اور بھی طریقے ہیں۔'' نادرہ نے ہنسنا شروع کیا۔

''ہش۔ بھائی جان آ رہے ہیں..... آیئے بھائی جان کیک لیجیے۔'' سائرہ نے کیک کی پلیٹ بڑھائی۔

''نہیں بھئی تم کھاؤ۔ اپنی آپا کو کھلاؤ۔'' زمان نے کہا۔

''آپا کو تو آپ اتنا کھلاتے ہیں، خود نہیں کھاتے۔'' سائرہ نے مسکینی سے کہا۔ زمان کو پھر بھی محسوس ہوا جیسے اس جملے میں اور بھی کچھ ہے۔

''سب اپنی اپنی قسمت کا کھاتے ہیں۔'' وہ بولا اور ان کے پاس سے گزرتا اندر چلا گیا۔

''آپا، سچ پوچھیے تو ہم بڑی بدقسمت بہنیں ہیں۔'' سائرہ نے کہا، ''میں نے کبھی کہا نہیں لیکن مجھے لگتا تھا جیسے اماں بھی بس مجھے اوپری اوپری چاہتے ہوں۔ ان کے ساتھ رہنے میں اچھا تو لگتا تھا مگر پتا نہیں کچھ کمی سی تھی۔ وہ کہیں باہر جانے لگتے تو آپا..... بری بات ہے مگر مجھے تھوڑی دیر کو

اطمینان سا محسوس ہوتا جیسے شریر بچے باہر چلے جائیں تو ماؤں کو سکون ملتا ہے..... واپس آتے تو دل خوش بھی ہوتا مگر ڈرا ڈرا بھی رہتا۔ اب وہ نہیں رہے تو میں اپنے آپ کو کوستی ہوں کہ کیوں میں ایسا کرتی تھی۔ وہ تو مجھے کچھ بھی نہیں کہتے تھے۔" سائرہ نے رونا شروع کر دیا۔

"مت رو بہن!" نادرہ نے کہا "تیرا دُکھ بھی مجھ سے نہیں دیکھا جاتا اور تجھے معلوم ہے میرے پاس دُکھ کا صرف ایک ہی علاج ہے۔ تو روئے گی تو میں کیک کے دو ٹکڑے زیادہ کھاؤں گی۔" نہایت سنجیدگی سے یہ بات کہتے کہتے نادرہ پھر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ سائرہ نے اپنے آنسو پونچھ لیے۔

آپا تو واقعی جھلی سی ہو گئی ہیں۔ سائرہ نے سوچا۔ خاندان میں ان کی خوش قسمتی کا کیا شہرہ ہے! جھنڈا لگے گھر میں، جھنڈا لگی کار میں، سرکاری ملازموں کی ریل پیل میں بیگم بن کر مزے سے رہتی ہے۔ سائرہ کا شوہر مر گیا وہ کتنی دُکھی ہے۔ سب اس کے ساتھ ہمدردی کرتے ہیں۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ جس کا شوہر زندہ ہے وہ سائرہ سے بھی زیادہ دُکھی ہے۔ ٹھیک ہی تو کہتی ہیں بے چاری آپا، صرف میٹھی چیزیں ہی ان کی رفیق ہیں۔ رات کے دو بجے اُٹھ اُٹھ کر ان کے ساتھ غم بانٹتی ہیں بے چاری!

"آپا! میں ذرا سنی کو دیکھ آؤں، بہت دیر سے سو رہا ہے کہیں اُٹھ نہ گیا ہو" سائرہ اُٹھ کر اپنے کمرے میں گئی اور کمرے کی تنہائی میں بہت دیر تک روتی رہی۔

پاکستان سے سلیم نے ناز کو اپنے سفر کا حال، امان کو دفنانے کے حالات اور اپنی خیریت کے بعد لکھا تھا: جس دن میں سائرہ اور امان کے ساتھ امریکا کی سیر کو نکلا تھا اس دن مجھے دو پانسے ملے تھے۔ میرا ماتھا ٹھنکا تھا کہ شاید کچھ ہونے کو ہے، قسمت میرے ساتھ کوئی جوا کھیلنے والی ہے۔ وہی ہوا۔ امان نے آخری وقت میں میرے لیے جو سطریں لکھیں اس کی کاپی آپ کے اور اشرف بھائی کے ملاحظے کے لیے بھیج رہا ہوں۔

سوچتا رہتا ہوں کہ زندوں کی خواہش کا احترام لازم ہے یا مُردوں کی۔ لوگ مُردہ لوگوں کی خواہشات کو زندوں کی خواہشات پر ترجیح کیوں دیتے ہیں؟ کیا اس لیے کہ زندوں کے لیے آس ہوتی ہے کہ ان کے ساتھ کی گئی زیادتیوں کا مداوا کر سکیں گے اور مرے ہوئے لوگوں کے ساتھ یہ آس بھی مر جاتی ہے اس لیے ان کی خواہشات بہت اہم ہو جاتی ہیں۔

آج کل یہ کرتا ہوں کہ دو پرچیاں بناتا ہوں۔ ایک پر لکھتا ہوں "زندوں کی خواہش"، دوسری پر لکھتا ہوں "مرے ہوئے شخص کی خواہش"۔ ان کو تہہ کرتا ہوں۔ ہاتھوں کے پیالے کو بند کر کے پرچیاں اُچھالتا ہوں اور میز پر اُلٹ دیتا ہوں۔ ایک پرچی اُٹھاتا ہوں، اسے کھولتا ہوں اس پر لکھا ہوتا ہے "مرے ہوئے شخص کی خواہش" پھر دونوں پرچیاں اُٹھا کر ہاتھ کا پیالہ بنا کر پرچیاں میز پر ڈالتا

ہوں۔ ایک پرچی اُٹھاتا ہوں اس پر لکھا ہوتا ہے "زندوں کی خواہش"۔ کسی بھی پرچی پر دل نہیں ٹھکتا۔ آخر تو اتفاق ہی ہے کہ ایک پرچی آئے یا دوسری.... مگر ہر چیز اتفاق ہی تو ہے..... اتفاق کہ میں ایک خاص وقت، ایک خاص لمحے اپنی ماں کے پیٹ میں پڑا۔ اس خاص وقت سے پہلے جانے کتنے اتفاقات ہوئے ہوں گے کہ میرے والدین کی آپس میں شادی ہوئی اور اس سے پہلے ان کے والدین اور اُن سے پیشتر اُن کے والدین کے ساتھ اتفاقات۔ ایسے نہ جانے کتنے ہی اتفاقات کے مرکب سے میرا اور میرے جیسے کروڑہا لوگوں کا قبل از تاریخ سے لے کر آج تک کے سارے زندہ اور مرے ہوئے لوگوں کا وجود بنا اور جب ایک آدمی فیصلہ کرتا ہے تو کیا اس میں ساری سوچ ہی ہوتی ہے کوئی اتفاق نہیں ہوتا۔ شعوری یا لاشعوری اتفاق! جذباتی اتفاق یا پریشانی اور فیصلوں کے رد و کد سے اُکتا کر عجلت میں کیا جانے والا اتفاقی فیصلہ.... سمن کی امی جب بات کرتی تھیں یہی کہتی تھیں، "میں ڈرتی ہوں سمن انتظار سے اُکتا کر کوئی غلط فیصلہ نہ کرلے۔" اب تو وہ بھی مر چکی ہیں۔ ان کی خواہش کا احترام بھی تو لازم ہوگا۔ پھر میرے والدین کی خواہش جو ایک کنواری، خوب صورت، خوب سیرت اچھے گھرانے کی نیک اور خدمت گزار لڑکی کی آرزو کلیجے سے لگائے جی رہے ہیں۔ آپ کی اور اشرف بھائی کی خواہش جو جانتے ہیں کہ میرے لیے کیا اچھا ہے اور کیا برا اور پھر اس مرے ہوئے شخص کی آخری وصیت جو میرا بہترین دوست تھا اور اپنی کم عمر، الھڑ بیوی اور ہونے والے بچے کو میرے حوالے کر گیا۔ قرعۂ فال اس دیوانے کے نام نکلا جس نے قرعہ ڈالا بھی نہ تھا۔ اب اس میں اس دیوانے کا کیا قصور! شاید مجھے شروع سے اندازہ تھا کہ اب بات کا فیصلہ قسمت کا پانسہ ہی کرے گا۔

سائرہ بچے کو آخری دودھ کی بوتل رات کو بارہ بجے دے کر سوتی تھی۔ بچہ کمزور تھا اسے تھوڑا مگر جلد جلد دودھ دینا پڑتا تھا۔ دودھ کی بوتل بنا کر اپنے کمرے میں لائی تو ٹھٹک گئی۔ وہاں اکلوتے صوفے پر زمان بیٹھا تھا۔

"بھائی جان!" سائرہ نے دروازے میں کھڑے حیرت سے کہا۔

زمان نے سرخ سرخ آنکھیں اُٹھا کر اس کی طرف دیکھا اور وہ سمجھ گئی کہ وہ کلب سے پی کر ابھی واپس آیا ہے۔ "میں اس لیے آیا تھا......" زمان نے کہا۔ اس کی آواز میں ہلکی سی لکنت تھی اور وہ سنبھل سنبھل کر بات کر رہا تھا، "تم صبح مجھے کیک کھلا رہی تھیں نا بڑی محبت سے مگر میں نے منع کر دیا۔ اب مجھے خیال آیا کہ میں نے تمھارے ساتھ زیادتی کی۔"

"نہیں بھائی جان، کوئی بات نہیں۔" سائرہ دل ہی دل میں کانپ رہی تھی۔ کاش نادرہ آپا

آجائیں۔ بظاہر وہ پرسکون بننے کی کوشش کر رہی تھی۔ ''آپ اُدھر سے گزر رہے تھے نا تو میں نے ویسے ہی رسماً پوچھ لیا تھا۔''

''نہیں، نہیں۔'' زمان نے زور دے کر کہا، ''تم نے کہا تھا آپا کو اتنا کھلاتے ہیں خود کچھ نہیں کھاتے۔ تمھارے لہجے میں شکایت تھی۔ میں نے کہا تمھیں بتا دوں کہ جب انسان بڑا ہو جاتا ہے نا تو اسے کچھ چیزوں کی ضرورت نہیں رہتی۔ ایک وقت تھا جب میں گڑ اور چنوں کو ترسا کرتا تھا اب کیک کو اسی لیے لات مارتا ہوں کہ میرے لیے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ اب شراب پیتا ہوں اس لیے کہ ایک وقت تھا کہ لوگ انگوٹھا نہیں پینے دیتے تھے، چُسنی تک نہیں پینے دیتے تھے۔'' وہ روہانسا ہو گیا۔

''اچھا بھائی جان! رات زیادہ ہو گئی ہے۔ آپا اپنے کمرے میں آپ کا انتظار کر رہی ہوں گی۔'' سائرہ بوتل لیے ابھی تک دروازے میں کھڑی تھی اور زور زور سے بول رہی تھی کہ کسی طرح نادرہ اس کی آواز سن کر آ جائے۔

''تم بھی اب بھائی جان بھائی جان کرتی ہو۔'' زمان نے برا سا منہ بنایا۔ ''میں نے جب اس کو بہن بنانا چاہا تو اس نے بہن بننے سے انکار کر دیا۔'' زمان نے اس کی طرف جھک کر انگلی اُٹھا کر کہا۔ ''جب محبوبہ بنانا چاہا تو اس پر بھی راضی نہیں ہوئی۔ دیوی بنا کر پوجا کرنی چاہی تو اس پر بھی تیار نہیں ہوئی......'' وہ یکایک کھڑا ہو گیا۔

''تمھیں پتا ہے جب مجھے باپ چاہیے تھا تو باپ نہیں تھا، جس کو اماں کہتا تھا تو وہ ہر وقت دھت....دُھتکارتی تھیں۔ میں چھپ چھپ کر روتا تھا مگر کسی کو پروا نہیں تھی۔ بھائی بھی کوئی نہیں تھا جس کے ساتھ کھیلتا...... پھر جب بڑا ہو گیا تو ایک دن ایک صاحب آئے بولے، میں تمھارا بھائی ہوں۔ میں نے کہا، جاؤ میاں جاؤ میرا کوئی بھائی وائی نہیں ہے..... میرا کوئی بھی نہیں ہے۔'' اس نے ایک قدم سائرہ کی طرف بڑھایا۔ ''سنو سائرہ! تم مجھے بھائی جان مت کہا کرو، مجھے اچھا نہیں لگتا۔ مجھے کوئی رشتہ اچھا نہیں لگتا۔ صرف عورت اچھی لگتی ہے۔ سب عورتوں کو صرف عورت سمجھتا ہوں۔'' اس نے سائرہ کی کمر میں ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی۔ سائرہ بھڑک کر پیچھے ہٹی اور کمرے سے نکل کر جلدی جلدی سیڑھیاں چڑھ کر زور زور سے نادرہ کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ نادرہ نے دروازہ کھولا تو اس نے صرف اتنا کہا، ''آپا! بھائی جان آ گئے ہیں۔ آپ جا کر انھیں اُوپر لے آئیں۔''

آگے نادرہ اور پیچھے سائرہ نیچے اُتریں تو زمان زینے کے پاس کھویا کھویا کھڑا تھا۔ نادرہ اسے سہارا دے کر اُوپر لے جانے لگی تو سائرہ نے سوچا۔ آپا کا تن و توش آخر ایک کام تو آتا ہے۔

دوسرے دن سائرہ نے اچانک کہا، ''آپا! اب میں واپس جاؤں گی۔ عدت بھی گزار لی،

کب تک رہوں گی۔''

''جب تک جی چاہے رہو بلکہ میرے ساتھ ہی رہو، میرا دل بھی بہلا رہے گا۔'' نادرہ نے کہا۔

''نہیں آپا! اب کراچی جا کر اماں کے پاس رہوں گی، وہ مُنّے کی دیکھ بھال کرلیں گی، میں کوئی ملازمت ڈھونڈوں گی، ایسے کیسے کام چلے گا!''

''رات کو زمان نے کوئی بدتمیزی کی؟'' نادرہ نے اچانک پوچھا۔

''نہیں تو!......'' سائرہ جھوٹ بول گئی۔ ''مگر میں نے انھیں جس حالت میں دیکھا مجھے بڑا رنج ہوا۔ آپا آپ کوشش کریں کہ انھیں رشتوں پر یقین آجائے۔'' اس کا لہجہ پرخلوص تھا۔

''کچھ فرما رہے تھے؟'' نادرہ نے پوچھا۔

''ہاں کہہ رہے تھے، مجھے کسی رشتے پر یقین نہیں ہے۔ میرا خیال ہے وہ اندر سے بہت دُکھی ہیں۔ آپ بھی کتنی رنجیدہ رہتی ہیں۔ آپ دونوں ایک دوسرے کے دُکھ ہی بانٹ لیں نا۔''

''تم دو دن کے لیے آئیں تو تم سے یہ بات کہی، مجھ تو کبھی کچھ نہیں کہا۔ گھنٹوں، مہینوں، سالوں بھی ساتھ رہیں تو چپ کی تلوار بیچ میں دھری رہتی ہے۔''

''آپ ہی اسے اُٹھالیں۔'' سائرہ نے کہا، ''ورنہ وہ اسی طرح اندر ہی اندر گھلتے رہیں گے۔''

''میرے سامنے شراب پی کر بھی زبان نہیں کھلتی، تالا ہی لگا رہتا ہے، آخر اس میں میرا کیا قصور ہے؟'' نادرہ نے دُکھ سے کہا۔

''قصور تو شاید کسی کا نہیں، حالات ہی کا ہے۔'' سائرہ نے کہا، ''لیکن آپ کوشش کریں گی تبھی کچھ ہوگا۔''

اردلی چند رسالے اور خطوط نادرہ کے پاس میز پر رکھ کر چلا گیا۔ آج بھی نادرہ اور سائرہ دھوپ میں بیٹھی تھیں۔ خانساماں ابھی ابھی تازہ چائے اور گاجر کا حلوہ رکھ کر گیا تھا۔

نادرہ نے خط دیکھے اور لفافہ سائرہ کی طرف بڑھایا۔

''تمھارے نام ہے۔'' اس نے کہا۔

''میرے نام؟'' سائرہ حیران ہوئی۔ ''اماں کا ہوگا۔''

''اماں کا خط تو میں پہچانتی ہوں۔'' نادرہ نے کہا، ''کسی اور کا ہے۔''

سائرہ نے لفافہ چاک کیا۔ ایک پرزہ اس کی گود میں گرا۔ لفافے میں سلیم کا خط تھا۔ وہ پہچان گئی یہ پرزہ وہ تھا جو امان نے کومے میں جانے سے پہلے لکھا تھا۔ سلیم نے اس سے پیشتر کئی مرتبہ پوچھنے کے بعد بھی نہیں بتایا تھا کہ امان نے کیا لکھا تھا۔

''ننھا کسمسا رہا تھا، میں اسے دیکھ آؤں۔'' سائرہ نے کہا۔ لفافہ خط اور پرزہ ہاتھ میں داب وہ اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

سب سے پہلے اس نے امان کا پرزہ پڑھا اور بہت دیر تک کھوئی کھوئی بیٹھی رہی۔ پھر اسے خیال آیا کہ سلیم کا خط تو پڑھ کر دیکھے، وہ کیا کہتا ہے۔ کیوں اتنے دن اس نے یہ سطریں چھپائے رکھیں اور اب مانگے بنا بھیج دیں۔ سلیم نے لکھا تھا۔

''امان کی لکھی ہوئی آخری تحریر تمھیں بھیج رہا ہوں۔ تمھارے پوچھنے پر میں ٹال گیا تھا کیوں کہ اُس وقت اس کا موقع نہ تھا۔ میں خود بھی تذبذب میں تھا۔ امان نے جو بات لکھی تھی اس وقت میں اس کے بارے میں سوچ بھی نہ سکتا تھا مگر اب غور کرنے کے بعد میں واقعی اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ امان نے جو کچھ لکھا ہے وہ غلط نہیں ہے۔ امان کی بیوہ اور اُس کے بیٹے کو میری ضرورت ہے۔ میں دل سے ان دونوں کے ساتھ چلنا چاہتا ہوں کہ ان کی راہ کے کانٹے نکالتا چلوں۔ اگر تم بھی اس نتیجے پر پہنچو تو امان کا یہ پرچہ میرے پاس واپس بھیج دینا۔ جب بھی یہ پرچہ مجھے ملا، میں جان لوں گا کہ ہماری تقدیر کے ستارے مل گئے ہیں۔

میں نے ملازمت کے لیے خلیج فارس کی ریاستوں میں سے کسی ایک میں جانے کا ارادہ کر لیا ہے۔ وہاں پہنچنے پر تمھیں اپنے پتے سے آگاہ کروں گا۔''

سائرہ بہت دیر تک اپنے کمرے سے باہر نہیں نکلی تو نادرہ اس کے پاس آئی۔ وہ بچے کو گود میں لیے خاموش بیٹھی تھی۔ خط اور امان کا لکھا ہوا پرزہ بستر پر پڑا تھا۔ سائرہ نے نادرہ کو اشارہ کیا کہ وہ خط اُٹھالے۔ نادرہ نے دونوں چیزیں پڑھیں۔

''کیسا آدمی ہے یہ سلیم؟'' نادرہ نے پوچھا۔

''اچھے ہیں۔ امان کے بچپن کے دوست ہیں۔ کہتے ہیں امان نے آج تک مجھ سے کوئی بات نہیں چھپائی۔''

''تمھاری طرف سے میں سلیم کو خط لکھ دوں؟'' نادرہ نے پوچھا۔ سائرہ نے حیران ہو کر اس کی طرف دیکھا پھر بات کو پا گئی۔ آپا سوچ رہی ہیں کہ اسے لکھتے ہوئے تعجب ہوگی۔

''لکھ دیجیے۔'' سائرہ نے آہستہ سے کہا۔

''مبارک باد بھی دے دوں؟'' نادرہ نے کہا۔

''نہیں، نہیں! مبارک باد کس بات کی؟'' سائرہ نے جلدی سے کہا۔

''امان کا یہ پرچہ تو واپس بھیج دوں۔ اُس کے جانے سے پہلے مل جائے تو اچھا ہے۔'' نادرہ نے کہا۔

''نہیں، آپ نہ بھیجیں......'' سائرہ نے نظریں جھکا لیں۔ ''میں جاؤں گی تو دے دوں گی۔''

نادرہ نے جھک کر مذاق میں کچھ کہنا چاہا تو دیکھا سائرہ موٹے موٹے آنسوؤں سے رو رہی تھی۔

''اب کیا ہوا؟'' نادرہ نے حیران ہو کر پوچھا، ''شکر نہیں کرتیں کہ اتنی جلدی اتنا اچھا آدمی مل گیا۔''

''آپا! خدا کے لیے چپ رہیے۔'' سائرہ نے سسکی لی۔ ''آپ نے اپنی شادی کا نتیجہ دیکھ لیا۔ پھر بھی آپ چاہتی ہیں کہ میں کسی بھی شخص سے شادی کر لوں جو ہمدردی جتائے یا جس شخص سے چلتے چلتے میرا میاں میرا ہاتھ پکڑنے کو کہے۔ وہ غریب دوست کی وصیت کی پابندی کر رہا ہے مگر میں اس کی پابند نہیں ہوں۔''

''تم نے خود ہی تو کہا تھا کہ پرچہ خود اسے دو گی۔ میں سمجھی......'' نادرہ نے معذرت آمیز لہجے میں کہا۔

''پرچہ اس کے دوست کا ہے۔ دوست اسے بہت عزیز تھا۔ شاید اس کی آخری تحریر بھی پیاری ہو، اس کے نام ہے اسے لوٹا دوں گی۔'' سائرہ نے کہا۔

''سوچ لو......'' نادرہ نے کہا، ''آخری وقت میں اماں نے تمھاری بہتری کے لیے کچھ سوچا ہوگا۔''

''آپا! میں نے کہا نا!......ایسی شادی مجھے راس نہیں آئے گی۔ آپ نے کی تو کیا پایا۔ آپ کے میاں ہر عورت کو عورت سمجھتے ہیں مگر آپ کو کیا سمجھتے ہیں کاٹھ کی گڑیا؟......''

''کاٹھ کا اُلو!......'' نادرہ نے کہا، ''یا شاید ریت کا بورا۔'' اور ہنسنے لگی۔ ویسی ہی ہنسی جس میں ہنستے ہنستے آنسو نکل آئیں۔

''اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ میں کاٹھ کا اُلو یا ریت کا بورا بننے کو تیار نہیں ہوں۔'' سائرہ نے کہا، ''آپا! زندگی کا تجربہ کچھ تو سکھاتا ہے نا۔ آپ نے تو کھا کھا کر ہنس ہنس کر گزارا کر لیا مگر میں نہیں کر سکوں گی۔''

''تو پھر میں اسے خط میں کیا لکھوں؟''

''لکھ دیجیے کہ تمھاری پیش کش کا شکریہ لیکن سائرہ اسے قبول کرنے سے معذور ہے۔''

''سوچ لیا اچھی طرح؟''

''جی ہاں، بہت اچھی طرح!''

''اچھا لکھ دوں گی۔'' نادرہ نے ٹالنے کے انداز میں کہا۔

''آج ہی بلکہ ابھی لکھیے.....وہ کاغذ قلم رکھا ہے۔'' سائرہ نے میز کی طرف اشارہ کیا۔ ''اگر آپ نہ لکھنا چاہیں تو لکھنا مجھے بھی آتا ہے۔'' سائرہ نے جمے ہوئے لہجے میں کہا۔

نادرہ نے حیران ہو کر اسے دیکھا۔ سائرہ اس کی چھوٹی، الھڑ، بھولی اور بیوہ بہن اسے اپنے سے دس سال بڑی لگی۔

میں سلیم اور زمان کی الجھنوں میں گرفتار تھی مگر مجھے محسوس ہو رہا تھا جیسے ڈیو اور سمن بے قرار ہوں کہ پہلے ہماری سنیے..... جیسے بچے بعض اوقات ماؤں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں کہ ہماری بات پہلے سنی جائے، یہ جانے بغیر کہ ماں کو معلوم ہے کہ پہلے کس کی بات سننی ہے اور کیوں۔

میرے ایک اشارے پر وہ دونوں بے تابی سے دوڑے آئے۔

''سناؤ، تم پر کیا گزری؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت بری گزری۔'' سمن کے بولنے سے پہلے ڈیو بول اٹھا، ''ان بیگم صاحبہ نے پاکستان میں اپنا فون تک کٹوا دیا۔ جوگ لے لیا۔ شام کو سمندر کے کنارے کھڑی رہتی تھیں اور کہتی تھیں:

ندی کنارے دھواں اٹھے میں جانوں کچھ ہوئے
جس کارن میں جوگن بنی کہیں وہی نہ جلتا ہوئے

''ارے بے چاری عورتیں کہاں جوگ لے سکتی ہیں۔'' سمن نے کہا، ''یہ عیش بھی تو مردوں کے لیے تھے۔ چار آشرم، طالب علمی کا زمانہ، گھر گرہستی کا زمانہ۔ پھر اپنے تجربے اور تعلیم دنیا کے حوالے کرو اور سکون کی تلاش میں جنگل میں نکل جاؤ۔ عورتوں کے لیے زندگی بھر وہی چولھا چکی۔ پتی دیو کی خدمت اور بعد میں پوتے پوتیوں اور نواسے نواسیوں کی سیوا.....''

''پھر بھی کچھ عورتیں فنا فی الصنم ہو کر جوگنیں بن جاتی تھیں اور ایسے جاں گداز دوہے لکھتی تھیں جیسے میرا نے لکھے۔'' میں نے کہا۔ ''مگر اب اصل کہانی سناؤ۔ ادھر ادھر کی باتیں بہت ہوئیں۔''

''ہاں اصل کہانی۔'' ڈیو نے کہا۔ ''کون شروع کرے؟''

''تم کرو۔'' سمن نے کہا، ''جہاں جھوٹ بولو گے میں ٹوک دوں گی۔''

''اچھا، تو ٹیلی فون کا رابطہ ہو گیا بند..... خط لکھا مگر خط کے جواب کی امید ویسے بھی نہیں تھی۔ چناں چہ بالکل صحت مند ہو جانے تک صبر کیا اور اپنی ماں کی چھاتی سے لگا ناز اٹھواتا رہا۔ جب ناز نخروں سے ناک تک پیٹ بھر گیا تو اپنی نار کی تلاش میں نکلا۔ ڈر یہی تھا کہ کھوپڑی الٹی ہے کہیں گھر ہی نہ بدل لیا ہو..... مگر شکر ہے کہ موجود تھیں۔''

سمن نے چھوٹے بچوں کی طرح کچھ کہنے کے لیے ہاتھ اٹھایا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا۔

''پہلی بات یہ ہے کہ میں فیڈرل ایریا کے گھر میں جا کر کچھ دن رہی۔'' سمن نے کہا۔ ''وہ ان

دنوں خالی تھا۔ اس کی مالکہ جنھیں میں خالہ کہتی ہوں پرانے تعلقات کی بنا پر گھر دینے کو تیار ہو گئیں۔ ایک تو یہ بات تھی کہ سمندر وہاں سے بہت دور تھا مگر سیاسی ہنگامے ہو رہے تھے۔ آئے دن کرفیو لگ جاتا تھا۔ باہر نکلنے میں خطرہ تھا۔ مجھے ملازمت کی تلاش تھی، کب تک گھر میں گھسی بیٹھی رہتی۔ آخر جھک مار کر سی ویو آ گئی۔ امی کی چیزیں جوں کی توں رکھی تھیں۔ پہلے دن ان کی چیزوں سے لپٹ لپٹ کر روتی رہی۔ ان کا چشمہ لگا کر آئینے میں اپنی شکل دیکھتی تو لگتا جیسے امی مجھے دیکھ رہی ہوں۔ امی کی ایک دراز میں سارا حساب کتاب، ساری ہدایات تھیں۔ کس بینک میں گھر کا کرایہ جمع کرانا ہے، کتنا پیسہ کہاں ہے، زیور کہاں ہے؟ ایک مرتبہ انھوں نے کہا تھا مجھے فون کی ضرورت نہیں ہے تمھاری خاطر لگوا رکھا ہے ورنہ ہزاروں لاکھوں لوگ فون کے لیے ترس رہے ہیں۔ میں نے کہا، 'امی اب مجھے بھی فون کی ضرورت نہیں کیوں کہ آپ جہاں چلی گئی ہیں وہاں سے تو فون کرنے سے رہیں۔' اسی لیے میں نے فون کٹوا دیا۔ ڈیوکا اور ناز کا ایک ایک خط ملا بھی۔ ان دنوں ہنگامے بھی تھے، ڈاک خانوں کی ہڑتال بھی تھی۔ جب حالات بہتر ہوئے تو ڈاک تقسیم ہوئی۔ ناز کا خط آدھا جلا ہوا تھا مگر پڑھا جا سکتا تھا۔ ڈیوکا خط ایسا جلا ہوا تھا کہ کچھ بھی نہیں پڑھا گیا۔"

"وہ تو میں نے خود جلا کر بھیجا تھا کہ تمھیں پتا چلے کہ میرا دل کیسا جلا ہوا ہے۔" ڈیو نے کہا۔ سمن نے اسے گھورا تو بڑا سا ہاتھ اُٹھا کر بولا، "جسٹ کڈنگ!"

"خط تو تم پھر بھی لکھ سکتی تھیں۔" میں نے کہا، "کہ تمھارا جلا ہوا خط ملا وغیرہ!"

"جی ہاں.... مگر میں تو رابطہ توڑ کر آئی تھی۔ اب تو دیکھنا یہ تھا کہ جو شخص پہلے اپنی پہچان کے لیے نکلا تھا اب وہ کسی اور کے لیے آتا ہے یا نہیں؟"

"تو جناب ہم آئے، سر کے بل آئے۔" ڈیو نے کہا، "دروازہ کھٹکھٹایا تو اس حلیے میں باہر نکلیں کہ میں ڈر گیا۔ گھر کے اندر آنکھوں پر سیاہ چشمہ۔ ایجنٹ سات سو سات..... ارے بھئی یہ کیا؟ میں نے پوچھا تو بولیں، 'دور دور..... آنکھوں کا infection ہے، تمھیں بھی لگ جائے گا، جیسے پوری تیاری کر رکھی ہو کہ کسی سے گلے نہ ملنا پڑے یا بوسہ......'"

"حدِ ادب!" سمن نے ٹوکا۔

"خیر، مجھے یقین نہیں آیا، میں نے کہا چشمہ اُتار کر دکھاؤ۔ چشمہ اُتارا آنکھیں دکھائیں تو ایسی سرخ جیسے ابھی ابھی خون میں نہلائی گئی ہوں۔"

"میں ڈیو کو دیکھ کر خود حیران تھی۔" سمن نے بات اُچک لی، "سوچ رہی تھی کہ ڈیو ہی ہے یا میری بیمار آنکھیں دھوکا دے رہی ہیں، نہ خط، نہ پتہ چلے آ رہے ہیں۔ ان دنوں پورے کراچی میں

آنکھوں کی بیماری پھیلی ہوئی تھی۔ کراچی میں کوئی نہ کوئی وبا تو رہتی ہی ہے۔ سیاسی بے اطمینانی بھی اور وبائیں بھی اور میں ہمیشہ دونوں کا شکار ہوئی۔ روتے روتے آنکھیں پہلے بھی لال رہنے لگی تھیں ان ہی دنوں پُرسے کے لیے کوئی آیا گیا۔ اپنا مرض لگا گیا۔"

"اچھا جناب! اب ہم باہر کھڑے ہیں اور یہ دروازے میں کھڑی ہیں۔ تنگ آ کر میں نے ہی پوچھا، اندر آ جاؤں؟ جواب ملا گھر تو تمھارا ہے میں منع نہیں کرسکتی مگر میں آنکھوں کی وبا میں مبتلا ہوں۔ بڑا موذی مرض ہے، بے کار میں تمھیں بھی لگ جائے گا۔ میں نے کہا، پھر کیا کروں، ہزاروں میل دور سے آیا ہوں۔ دور رکھنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈ ہی لیتی ہو۔ بولیں، ٹھہرے کہاں ہو؟ میں نے کہا انٹر کانٹی نینٹل ہوٹل میں۔ فرمایا، کیسے آئے؟ میں نے کہا ایک لڑکی سے ملنے جس کی ماں نے کہا تھا کہ میری بیٹی راضی ہوئی تو اس کی شادی کسی غیر ملکی سے بھی کردوں گی۔ بولیں، مگر ماں نے یہ بات بیٹی کو تو نہیں بتائی!...... مگر ان لوگوں سے کہی تھی جو پیغام لے کر گئے تھے، وہ لوگ موجود ہیں اور قابلِ اعتبار ہیں۔" ڈیو نے کہانی جاری رکھی۔ "پھر میں نے پوچھا، یہ بتاؤ کہ تمھارا آنکھوں کا مسئلہ کتنے دن کا ہے؟ ثمن نے کہا، آج زور سب سے زیادہ ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کل سے بہتر ہونا شروع ہوں گی، دو چار دن میں ٹھیک ہو جائیں گی۔ تب میں نے کہا، اچھا میں چلتا ہوں، مجھے بھی شادی کے کچھ انتظامات کرنے ہیں۔ 'کس کی بات کر رہے ہو؟' ثمن نے بھولپن سے پوچھا۔ اب زیادہ دُکھ نہ دو ثمن! میں نے دُکھ بھری آواز میں کہا۔ میرا یہ کہنا تھا کہ وہ تو بکھر گئیں۔ 'تم نے میری امی کو پوچھا تک نہیں۔ اُن کا ذکر تک نہیں کیا' اور جناب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ میں نے کہا، تمھاری دُکھتی آنکھیں دیکھ کر میں نے ذکر نہیں کیا۔ اب ان کو اور دُکھ کیوں دیتی ہو۔ تمھاری امی مجھے بار بار یاد آتی ہیں۔ جب سے یہاں آیا ہوں میرے اندر ان کا ذکر ہو رہا ہے وہ یہاں موجود ہیں، موجود رہیں گی، تم میں موجود ہیں اور پھر ہمارے بچوں میں۔ میں نے جھٹ سے اس کی آنکھیں چوم لیں۔ وہ بھڑک کر الگ ہوگئی، 'بیماری لگ جائے گی۔' اس نے کہا..... بیماری تو اب لگے گی ہی۔ آؤ، اوپر چھت پر چلیں۔ چھت پر کراچی شہر کی روشنیاں جگر جگر کر رہی تھیں۔ سمندر کنارے پھنسا بارج اور پانی کا جہاز اب بھی ایسے ہی کھڑے تھے جیسے میں چھوڑ کر گیا تھا۔"

"تمھیں پتا چلا کہ تمھارا باپ کون تھا؟" یکایک ثمن نے براہِ راست ڈیو سے پوچھا جیسے وہ میری موجودگی بالکل بھول گئی ہو۔

"نہیں!...... میری ماں نے نہیں بتایا۔ اس نے بھی پھر کبھی بتانے کا وعدہ کیا۔ اس سے میں سمجھ گیا کہ وہ ضرور کوئی پاکستانی ہوگا۔ پاکستانی مصور جو میری ماں کو جہانگیر کے مقبرے کی غلام گردشوں

میں، شاہی مسجد کے حجروں میں، ہرن مینار کے مینار پر اور زمیں دوز بادلیوں میں لیے پھرتا تھا۔ تب ہی تو میں کہتا تھا یہ جگہیں میری دیکھی ہوئی ہیں، یہ بو باس میرے اندر کہیں بسی ہوئی ہے۔ سنو ثمن! جب صوفی صاحب ہمارا نکاح پڑھا دیں گے نا تو ہم ملتان جا کر چادر چڑھائیں گے..... اور جب ہمارے بچے ہوجائیں گے نا تو ایک دن ہم سب جا کر ابا سے ملیں گے۔ میں کہوں گا، میں تمھارا بیٹا ہوں اور یہ اتنی پیاری بہو اور یہ خوب صورت پوتے پوتیاں لے کر آیا ہوں، بولو، انھیں گلے لگاتے ہو یا نہیں؟ کیا وہ نہیں کہہ سکیں گے بتاؤ؟''

''تم صرف خواب ہی نہیں دیکھ رہے بلکہ ڈرامے بازی بھی کر رہے ہو!'' ثمن نے ہنس کر کہا۔

''یہ ڈرامے امریکا میں عام ہیں۔ آئے دن بچے، بڑے ہونے کے بعد کھوئے ہوئے والدین کے پاس اسی طرح پہنچتے ہیں۔ رہی خواب کی بات تو دیکھو میری ماں مجھے مل گئی۔'' ڈیو نے ثمن کے کان کی لو سے ہونٹ لگا دیے۔ ''سنتی ہو، میں اپنی ماں کو امی کہتا ہوں تو بڑی خوش ہوتی ہیں۔ انھوں نے تمھیں پیغام بھیجا ہے کہ ان کے ساتھ جا کر رہو، وہ آج کل سمندر کے کنارے لیگونا بیچ والے گھر میں ہیں۔''

''میرا دل چاہتا ہے کہ کسی آبشار کے قریب رہوں۔ سمندر کا سحراب ختم ہوگیا۔ آبشار کا باقی ہے، اتنا ڈھیر سا پانی متواتر دن رات گرتا رہتا ہے پھر نہ جانے کہاں غائب ہوجاتا ہے۔''

''ہر پانی بالآخر سمندر ہی میں مل جاتا ہے۔'' ڈیو نے کہا، ''آبشار کے نزدیک رہنا چاہتی ہو تو رہو، نیاگرا فالز...... یا سوات یا کاغان؟''

''ڈیو! میرے والد ریلوے میں ڈپٹی سپرنٹنڈنٹ تھے۔ جب تک وہ زندہ تھے تبادلوں پر بہت جگہ رہنا ہوا۔ ایسی جگہوں پر بھی رہے جہاں ڈھنگ کے اسکول نہیں تھے تو میں ہاسٹلوں میں رہی۔ ریلوے میں مفت کے پاس ملتے تھے اس لیے بہت جگہوں کی سیر کی۔ جب ابو کا انتقال ہوگیا تو زندگی میں زوال آنا شروع ہوا۔ کبھی امی سے کہتی، 'امی جی چاہتا ہے، گرمیوں میں پہاڑوں پر اور سردیوں میں کراچی میں رہیں تو وہ جل کر کہتیں، رہیں جھونپڑی میں اور خواب دیکھیں محلوں کے۔' کیا ایسا ہوتا ہے ڈیو کہ جس طرح بچھڑے ہوئے لوگ برسوں بعد مل جاتے ہیں اسی طرح کھوئے ہوئے خواب بھی دوبارہ مل جائیں۔''

''اور کیا، کہہ تو رہا ہوں جہاں تمھارا دل چاہے رہو، پاکستان میں یا امریکا میں۔'' ڈیو نے کہا۔

''مشکل یہ ہے.....'' ثمن نے آہ بھری ''کہ مشکلات یہاں بھی ہیں، مشکلات وہاں بھی ہیں۔ اتنے دن رہے تو پتا چلا کہ کلاس سسٹم بھی ہے، نسلی تعصب بھی ہے، دنیاداری بھی ہے، مصلحتیں وہاں

بھی عزیز ہیں۔''

''ہاں...... میں نے تو تم سے خود ہی کہا تھا کہ سب سے بڑا جھوٹ تو میں خود ہوں۔ بات یہ ہے سمن کہ بس بڑے ملکوں کا اعتبار بڑا ہوتا ہے جیسے عزیز رشتے داروں میں معتبر کون ہوتا ہے جس کی جیب بھاری ہو اور آسانیاں ہوتی ہیں۔ یہاں بھی تو لوگ غریب بستیوں کو چھوڑ کر پُر آسائش بستیوں میں جا کر بسنے کے خواب دیکھتے ہیں مگر اب یہ پتا چل گیا کہ دنیا میں جنت کہیں نہیں ہے۔'' ڈیو نے کہا، ''اور سنو تم حیران ہو گی کہ اندر سے میرا جی جتنا لیگونا بیچ میں رہنے کو چاہتا ہے اتنا ہی شیخوپورہ کے کھجور کے درخت، گھاس کے میدان اور ہرن مینار مجھے کھینچتے ہیں۔ شاید پیدائشی بین الاقوامی باشندہ ہوں اس لیے کسی ایک ملک میں رہنے کے خواب بھی نہیں دیکھے۔ ساری خوب صورتی میرے نزدیک تین چیزوں یا ان کے مرکب میں ہے۔ پانی، پہاڑ اور ہریالی...... یہ تینوں ہوں، یا دو ہوں یا ان میں سے ایک، میں وہاں خوش رہ سکتا ہوں بشرطے کہ میرے لوگ میرے ساتھ ہوں۔''

''سچ مچ؟'' سمن نے چمک کر پوچھا۔

''تو اور کیا اب اتنی دور جھوٹ بولنے تمھارے پاس آیا ہوں؟'' ڈیو نے برا مانا۔

''تمھاری کتاب کا کیا ہوگا؟'' سمن نے پوچھا۔

''میری کتاب!'' ڈیو نے کہا، بالآخر میں یاد آئی۔ ''میری کتاب کا کیا ہوگا؟'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''کتاب..... اس وقت لکھی جاتی ہے جب اس کا موضوع، اس کے جملے، اس کے کردار خود چل کر تمھارے پاس آئیں جیسے تم میرے پاس آئے تھے.... اور کاغذ پر لکھنے سے پہلے دل میں لکھی جاتی ہے۔ سو انتظار کرو......''

''انتظار، مزید انتظار...... اور کچھ؟'' ڈیو نے پوچھا۔

''اپنا ذاتی تجربہ بتاؤں؟'' میں نے کہا۔

''جی ہاں!'' ڈیو بولا۔

''تو سنو! بعض تحریریں پڑھتے ہوئے یوں لگتا ہے جیسے لکھنے والا اپنے کچھ کرداروں کا تو طرف دار ہے اور کچھ کے خلاف ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ یا تو وہ سچ مچ برے ہوتے ہیں جن کے وہ خلاف ہوتا ہے یا زندگی میں جو لوگ کسی وجہ سے اس کے ناپسندیدہ رہے ہوں ایسے لوگ تحریر میں بھی واضح طور پر ناپسندیدہ ہو جاتے ہیں مگر میرے اس ناول کے کردار اچھے اور برے نہیں ہیں۔ اچھائی اور برائی کا آمیزہ ہیں اور ایسے لوگوں کا چربہ بھی نہیں ہیں جو مجھے برے لگتے ہوں۔ جیسے بھی ہوں مجھے عزیز

ہیں۔ میں کسی ایک کی طرف داری نہیں کر سکتی۔ تخلیق کار اپنی تخلیق اور کرداروں سے محبت ہی کرلیں یہ کافی ہے۔ ان کے بارے میں فیصلہ دینا دوسروں کا کام ہے۔'' ڈیو اور سمن غور سے سن رہے تھے۔ میں نے بات جاری رکھی۔

''میرے کردار میرے دوست، محسن اور مہمان ہیں۔ جب تک ساتھ رہتے ہیں ان کی رفاقت بڑی غنیمت رہتی ہے۔ ایک نہ ایک دن رخصت تو کرنا ہی ہے اس لیے کہ مہمان ہیں مگر جی چاہتا ہے کہ پوری طرح قطعِ تعلق نہ ہو۔ اچھے دوستوں سے ملاقات نہ بھی ہو تو دوستی رکھنے میں کیا حرج ہے۔ جب ملیں یوں ملیں جیسے ابھی کل ہی تو ملے تھے، یہی دوستی کی پہچان ہے، ہے نا۔''

''جی ہاں۔'' دونوں نے ایک ساتھ کہا۔ مجھے محسوس ہوا جیسے انھیں جانے کی جلدی ہو۔

''آؤ سمن، چلیں۔'' ڈیو نے کہہ ہی دیا۔

سمن چپ چاپ آئی اور ڈیو کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔ پھر اپنا سر اس کی طرف جھکایا شاید اس کے کندھے پر سر رکھ دیتی اگر اس کا سر وہاں پہنچتا۔ ڈیو نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس کا ننا سا ہاتھ تھام لیا۔ میں دیکھتی رہ گئی۔

میرا ارادہ ناول کو یوں ختم کرنے کا نہیں تھا مگر بعض اوقات تخلیق کار بھی تو تخلیق کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے۔

''خدا حافظ۔'' انھوں نے مجھ سے کہا۔ وہ جانے لگے تو مجھے محسوس ہوا جیسے ان کے وعدے کے باوجود ان سے ملاقات کی امید کم ہے۔ امریکا کے بچوں کی طرح کہ ایک دفعہ گھر چھوڑ دیا تو بس چھوڑ ہی دیا۔ سو پیارے کردارو، فی امان اللہ۔

اور پیارے قارئین! جن میں سارے دوست، پرستار، محققین، مبصرین، مومنین اور منافقین شامل ہیں......خدا حافظ!

TWO NOVELS
(Fiction)
By: Razia Fasih Ahmad

رضیہ فصیح احمد کی کتابوں کی نئی اشاعت

آبلہ آپا	۲۵۰/روپے
چار ناول	۵۰۰/روپے
○ انتظار موسم گل ○ اک جہاں اور بھی ہے	
○ متاع درد ○ آزارِ عشق	
مجموعہ رضیہ فصیح احمد (افسانے)	۶۰۰/روپے
○ بے سمت مسافر ○ بارش کا آخری قطرہ	
○ کالی برف	
دو ناول	۷۰۰/روپے
○ صدیوں کی زنجیر ○ یہ خواب سارے	
ورثہ (افسانوں کا نیا مجموعہ)	۲۰۰/روپے



